قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں

مؤلف

انجینئر ایم اویس خان درّانی

قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں

سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ(41:53)

خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مِثلِ کوہسارت می کند

گر زمینی آسمان سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دلِ آہن رباید زنگ را

چوں مسلماں گرداری جگر
در ضمیرِ خویش او در قرآن نِگر

صد جہاںِ تازہ در آیات اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

یک جہانش عصر حاضر را بس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست

(اقبالؒ)

مؤلف

انجینئر ایم اویس خان درّانی

Email:awaisdurrani49@yahoo.com

ناشر

منزل پرنٹرز، اسلام آباد

قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں

مؤلف: انجینئر ایم اویس خان درّانی

اشاعت: جولائی 2016ء

قیمت : -/1200 روپے

مطبع:

کمپوزنگ اینڈ ڈیزائننگ: ایچ آر گرافکس، لاہور

نمبر 1 تاریخ 15/7/16

رجسٹریشن نمبر 013 جاری کردہ 10-02-2014

قاری عطاء اللہ

★ ایف۔اے (اسلامیات) ★ تجوید حفص ★ قراءت سبعہ ★ قراءت ثلاثہ ★ تفسیر قرآن ★ حفظ قرآن مجید

رجسٹرڈ پروف ریڈر

سرٹیفکیٹ تصحیح

تفسیر، ''قرآنِ کریم جدید تحقیقات کی روشنی میں''، مَیں نے اس کے قرآنِ کریم کے عربی متن کو حرف حرف غور اور امعانِ نظر سے پڑھا ہے۔ مَیں پورے وثوق سے تصدیق کرتا ہوں کہ اس میں لفظی، اعرابی اور رسم الخط کی کوئی غلطی نہ ہے

حافظ قاری عطاء اللہ

قاری عطاء اللہ
15/7/16

فہرست

تمہید

مدنظر رہے کہ اس کاوش میں قرآن کی مجموعی تفسیر کی بجائے چیدہ حیدہ تحقیقاتِ حاضرہ کی روشنی میں قرآنی تعلیمات پیش کی گئی ہیں جن کا مطالعہ ایک صاحب علم قاری کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ سائنس اور نفسیات کی دنیا میں نئے نئے انکشافات کی بدولت قرآن کی حقانیّت مزید نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔ جو مروّجہ اور روایتی قرآنی تفسیر سے بالکل الگ تھلگ تفسیر ہے۔ اور اہم ترین موضوعات یعنی جو قرآن کی حفاظت کے دعوے کو مزید استحکام وثبات دینے میں ممّد ومعاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان سب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور اس تغیّر کے آخر میں تمام چیدہ چیدہ اسلامی زعماء وسکالر کے نظریات پر بحث کی گئی ہے۔ کہ وہ کیسے یونانی علم کے آشکارا ہونے کے بعد، قرآن کے اصل پیغام اور تعلیمات سے دور ہو گئے تھے۔ آخر میں علامہ اقبال پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کے فلسفہ کے تمام گوشوں کو قرآنی نقطۂ نظر سے ایک تنقیدی معیار سے پرکھ کر پیش کیا گیا ہے۔

اقبال نے مغربی تہذیب کا وہ گوشہ جس میں عقل انسانی کو ہی معراج ٹھہرایا گیا ہے شدید تنقید کی ہے۔ اور عقل کو وحی کے تابع رکھنے کی وکالت کی ہے۔ ''مثنوی چہ باید کرد'' میں ؎

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

اقبال کے ہاں آپ کو عقل وعشق۔ خرد وجنوں۔ خبر ونظر۔ ذکر وفکر جیسی تقابلی اصطلاحات عام ملیں گی۔ اور انہوں نے اس طرح ابن عربی کی گمراہ کن اصطلاحات عشق، جنوں، نظر، ذکر وغیرہ کو قرآن کی روشنی میں قرآنی معانی پنہائے ہیں۔ ان اصطلاحات سے مراد وحی خداوندی ہے۔ جبکہ عقل وخرد۔ خبر وفکر سے مفہوم وہ فکر آزاد جو سرکش ہے اور مغربی تہذیب کا ماحصل ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں فلسفیانہ ذوق رکھنے والا طبقہ اس سے کچھ اور مراد لے کر قدیم متکلمانہ بحث میں الجھ کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

فلسفہ کی دنیا میں دو سرچشمے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ایک عقل اور دوسرا وجدان۔ صوفیانہ کشف والہام وجد وحال۔ یہ تمام

وجدان کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ جبکہ وحیٔ نبوّت اس سے یکسر ایک الگ حقیقت ہے۔ وجدان کے حامی عقل کے مخالف ہیں۔ یہ فلسفی اور صوفی کی جنگ بڑی قدیم ہے۔ صوفی پائے استدلال کو سخت بے تمکین قرار دیتا ہے جبکہ استدلالی فلاسفہ صوفی کی باطن کیفیّت کو واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ چونکہ اقبال بھی باطنی واردات کا قائل ہے۔ تو لوگ اقبال کو وجدانیوں کی صف میں کھڑا کر کے عقل کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں۔ جبکہ اقبال کی پوزیشن اس باب میں منفرد ہے۔ وہ عقل کے مقابل عشق لاتے ہیں۔ تو اس سے مراد وحیٔ نبوّت ہوتی ہے نہ کہ صوفیانہ واردات۔ اور عقل سے مراد وہ عقل جو وحی سے سرکشی برتے نہ کہ مجرّد عقل۔

اس لیے کہ قرآن کشف والہام جیسے وجدان کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ اکتسابی علم کا ذریعہ عقل اور اس کے مشاہدات کو قرار دیتا ہے۔ اور غیر اکتسابی علم کا ذریعہ وحی کو جو صرف اور صرف خاصۂ نبوّت ہے۔ رسولؐ پر ختم ہوگئی ہے۔ اس لیے اب علم کا ذریعہ قرآن اور اس کی روشنی میں کام کرنیوالی عقل کے سوا کچھ اور نہیں۔ قرآن عقل کو بلند مقام عطا کرتا ہے۔ اور عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کو بدترین مخلوق بلکہ جہنّمی قرار دیتا ہے۔

اقبال کا دعویٰ:

اقبال کا دعویٰ کہ اس نے جو کچھ سمجھا وہ اس قرآن سے سمجھا اور جو کچھ کہا ہے اس کی روشنی میں کہا ہے۔ اس لیے ہو نہیں سکتا۔ کہ اقبال اس قدر اہم اور بنیادی مسلّمہ میں قرآنی تعلیمات کے علی الرّغم عقل کی تنقیص کرے۔ اور وجدان کو اس کے مقابل میں یقینی علم اور قابل اعتماد راہ قرار دے۔ یہ پیش نظر رہے کہ علامہ دانش کی ایسی بلندیوں کے باوجود بالاخر انسان تھے۔ اور ہر انسان کی طرح غلطی ان سے بھی ہوسکتی ہے۔ اس سے ان کے مقام کی بلندی میں فرق نہیں آجاتا۔ انہوں نے بحیثیت مجموعی جو کچھ کہا ہے وہ عین قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے۔ اقبال اور قرآن کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں عشق ونظر وغیرہ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور عقل سے مراد مغرب کا وہ نظریہ جو وحی کی رہنمائی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ان کی ساری تنقید وتنقیص اس نظریۂ حیات پر ہے۔ اور اس سے وہ دین کے متقضیات کو خطرہ میں سمجھتے ہیں۔ اور امت مسلّمہ کو اس تباہ کن اور انسانیّت سوز نظریہ سے آگاہ کرتے ہیں اور قرآنی دلائل سے اس کا رد کرتے ہیں ؎

زمانہ ہیچ نہ داند حقیقتِ اُو را
جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است

لوگ خواہ مخواہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ عقل اور وحی دو متضاد عناصر ہیں۔ جو ایک دوسرے میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ یہ صحیح بات نہیں۔ وحی کی قبا ایسی ہے کہ عقل کی قامت پر موزوں آتی ہے۔ وحی خود کو عقل سے منواتی ہے۔ لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ انسانی عقل کی جو سطح بھی ہو۔ وہ اس کے مطابق دلائل دے کر اسے حقیقت کا قائل کراتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ عقل،

زندگی کے غیر متبدّل اصول کو دریافت کرنے سے عاجز ہے۔ یہ کام صرف وحی کرسکتی ہے۔لیکن جو اصول وحی نے پیش کئے ہیں۔ وہ عقل کی رو سے ہی سمجھے جاسکتے ہیں۔ اس لیے عقل اور وحی میں وہی رشتہ ہے جو انسانی آنکھ اور سورج کی روشنی میں ہے۔انسانی آنکھ سورج کی روشنی کے بغیر بے کار ہے۔اور جس روشنی سے فائدہ اٹھانے والی آنکھ نہیں وہ روشنی اپنا مقصد پورا نہیں کرتی ہے۔

بآں مقام رسیدم چوں در برش کردم

طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

(میں وحی سے اپنی فکر کو ہم آہنگ کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ عقل میرے درو بام کے طواف کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتی ہے۔ برش یعنی ہم آہنگ ہو گیا۔ہم رنگ ہو گیا۔)

حقیقت یہ ہے جب عقل وحی کے پیش کردہ حقائق کا ادراک کر لیتی ہے تو اس کی عظمتوں سے آشنا ہو جاتی ہے۔تو وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ کس قدر باعظمت اور بلند ہوگئی ہے۔عقل کے لیے وحی کا اتباع باعث ہزار فخر و مباحات ہے۔ اس قوم کے مقام کے کیا کہنے! جو وحی کی رہنمائی میں کام لے کر سفر حیات طے کر لے۔ یہی قوم امامت اقوام کی سزاوار ہے۔ وحی ہر مقام پر عقل کی نگرانی کرتی ہے۔ کہ وہ کہیں غلط موڑ نہ مڑ جائے۔ یا کہیں گڑھے میں نہ جا گرے۔ اس لیے اگلے شعر میں کہا ہے۔

گماں مبرد کہ خرد را حساب و میزاں نیست

نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

اگر عقل کو انسانی معاملات میں آخری اتھارٹی تسلیم کیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو اس کا فیصلہ کر سکے کہ عقل نے جو قدم اٹھایا ہے۔ وہ صحیح ہے یا غلط،لیکن اگر اسے وحی کے تابع رکھا جائے۔تو وحی قدم قدم پر اس کا احتساب کرتی رہتی ہے۔اس لیے قرآن نے جماعت مومنین کو ''شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'' (2:143) کہا ہے۔یعنی اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی دراصل وحی کی نگرانی ہے۔

اگر عقل کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو انسانی جذبات، رجحانات،میلانات و مفادات کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس طرح ایک فرد یا گروہ کے مفادات کا ٹکراؤ دوسرے فرد یا گروپ کے مفادات سے ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ فساد فی الارض ہے۔ لیکن عقل اگر وحی کے متعیّن راستہ پر گامزن ہو جائے۔تو وہ نوعِ انسانی کی ربوبیّت کی ضامن بن جاتی ہے۔جس سے یہ دنیا جنّت بن جاتی ہے۔ یہ ہے اقبال کے پیغام کا نچوڑ جو انتہائی ایجاز و جامعیّت سے ان کی فارسی شاعری میں اجاگر کیا ہے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است   در بحرفم غیرِ قرآن مضمر است

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا | بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام | با مسلماں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا | آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ (2:127)

انجینئر ایم اویس درّانی
Email:awaisdurrani49@yahoo.com

پیش لفظ

❁ پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

خود کو بیان کرنا ایک نئی تفریح ہے جو آج کی فیس بک (Facebook) نے مہیا کی ہے۔ یہ مرد و زن میں یکساں طور پر پائی جانے والی ایک طاقتور قوّت (Homogenizing Force) ہے جو اس سے قبل شاید انسانی فکر کو کبھی میسر نہ تھی۔ اس میں فکری اختلافات بھی ہیں مگر کوئی بھی ان کی پروا نہیں کرتا اور اس طرح اپنی تحریروں میں مذہبی جنونی کیفیات کا احاطہ کرنے والوں، سیاسی و سماجی ہل چل پیدا کرنے والوں، ناول لکھنے والوں، مصوری کرنے والوں، اور شاعروں کو بہت سے ایسے احمق مل جاتے ہیں جو بقول آرتھر شوپن آور (Arthur Schopenhauer) ''ان کی تحریروں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یوں ان کی نگاہ کا زاویہ معقولیت (Rationality) پر مبنی نظر آنے لگتا ہے۔ یہ جنون، فیس بک کی اس نئی تنظیم (Organization) کی شدت سے ابھرنے والی پہلی ترجیح ہے''۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ زندگی کے لطیف پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ انسان سے لٹھ بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں انتہا پسند مذہبی دیوانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے ان افراد کو وہ خشک لکڑیاں کہا ہے جنہیں سوٹ پہنا دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں لس لی پال (Leslie Paul) اپنی کتاب، فناءِ انساں (Annihilation of Man) میں یوں رقم طراز ہے: ''ڈارون اپنے خطوط میں لکھتا ہے کہ ایک مدت سے ایک ہی سمت میں سوچنے سے اس کی طبیعت نے ان تمام چیزوں سے حظ اٹھانا چھوڑ دیا جو بچپن اور جوانی سے اسے بہت محبوب تھیں۔ مثلاً شاعری، مصوری، موسیقی، مذہبی رسوم کی سختی سے پابندی، کٹر پن وغیرہ''۔ اپنی طبیعت کی اس تبدیلی کو ڈارون بہت بڑا نقصان قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد یہی لس لی پال (Leslie Paul) لکھتا ہے کہ جو کچھ ڈارون کے ساتھ ہوا، وہی کچھ مغرب سے ہو گیا۔ اس نے ایک عرصے تک محض مادّیت (Materiality) کے نقطۂ نگاہ سے کائنات کا مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادّیت کے علاوہ انسانی زندگی کی تمام سوتیں خشک ہو گئیں۔ قرآنِ کریم کی تفہیم کے لیے یہی کچھ ہمارے ساتھ مشرق میں ہوا، جس سے انسان انفرادی اور معاشرتی طور پر ایسا بن کر ابھرا کہ گویا اُس میں علیحدگی

❁ پروفیسر (ر) کلیہ تعلیم، ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، جامعہ سندھ، جام شورو سندھ، پاکستان 0300-8377505

(Isolation) اور انفرادیت (Individualization) کے رجحانات پیدا ہو گئے اور آج مادیّت کے دور میں تشت و انتشار عرّ وج پر لگتا ہے، انسان اپنی فکر کی زنجیروں میں بندھ گیا ہے خواہ وہ معاشی و معاشرتی و سیاسی ہوں یا مذہبی۔ وہ انہیں ذریعۂ نجات سمجھ بیٹھا ہے۔

اس دور میں یوں لگتا ہے کہ مصلحینِ زمانہ کی فہرست میں ایم اویس درانی صاحب ایک ایسے انسان ہیں جو کہ پیشے کے لحاظ سے تو انجینئر ہیں مگر معاشرتی طور پر ایک ایسا نظام لانے کے لیے کوشاں ہیں جو معاشرہ میں جذب وادغام کے لیے باہمی مؤدت، ایثار، خلوص، احسان، مروت، جھکاؤ، سپردگی اور دوسروں کے جذبات کی رعایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سب کا تعلق انسان کے حسیات لطیفہ سے ہے، حسابی فارمولوں، منطقی مفروضوں طبیعات کے میکانکی نظریوں اور کیمسٹری کے غیر نامیاتی قاعدوں کلیوں سے نہیں۔

یوں لگتا ہے کہ ایم اویس درانی صاحب فہم قرآن کریم کے سلسلے میں عقل اور وحی میں تصادم نہیں سمجھتے بلکہ دونوں ہی ان کے نقطۂ نظر سے لازم وملزوم ہیں۔ وہ قرآنِ کریم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ انسان اپنے زمانے کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہی نہیں بلکہ لسانی لحاظ سے ان ماخذات پر اس کی نگاہ گہری ہو کہ عربی زبان کے وہ الفاظ قرآن حکیم کے نزول کے وقت کیا معنی رکھتے تھے اور پھر عباسیوں کے دور میں عجمی اثرات سے متاثر ہو کر کیا سے کیا ہو گئے۔ اس لیے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کو محاورۂ عرب اور تصریف آیات کی روح سے سمجھا جائے کہ فلاں لفظ سے زمانۂ نزولِ قرآن میں کیا مفہوم لیا جاتا تھا اور اس پر خارجی عناصر کو قطعاً اثر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مغرب کے غلط تصوّرات (Concepts) کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت لیے ہو۔ اس لیے انہوں نے اُن تصوّرات کی گہرائیوں کی جانچ پرکھ پر قلم اٹھایا ہے جن کی وجہ سے فہم قرآنِ کریم کے راستے سازشیں بھی ہوتی رہیں اور وہ تصوّرات بھی قلوب واذہان پر چھائے رہے جن سے اسلام بطور ایک نظام ابھر اور نکھر کر نئی نسل کے سامنے نہ آسکا مثلاً اعراب القرآن۔ اس سلسلے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ اعرابِ قرآن کا کام رسولِ اکرم ﷺ نے نہ صرف بہ نفسِ نفیس سرانجام دیا بلکہ حکم بھی دیا کہ ''قرآن پر اعراب لگاؤ''۔ نقاط القرآن کے اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد حوالوں سے بھی ثابت کیا ہے کہ اعراب اور نقاط بہت پہلے سے عربوں میں متعارف تھے اور یہ بھی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ عربِ جاھلیہ کے اشعار اور کھدائیوں سے برآمد ہونے والے کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط حمیری، جو عربی خط کا ماخذ تھا کے ذریعے عرب اسلام سے پانچ سو سال قبل ہی نقطوں اور دیگر فنی ضروریات سے آگاہ تھے۔ قرآنِ کریم نے بجا طور پر اُن کی زبان کو فصاحت وبلاغت کی زبان تسلیم کر کے ''عربیٔ مبین'' کے اعزاز سے نوازا تھا اور ان شعرائے جاہلیّہ کو قادر الکلام اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کے ہاں اسالیبِ سخن کی فراوانی تھی۔ اس طرح ''عربی حروف کے لیے نقطے کب ایجاد

ہوئے'' کے عنوان پر تاریخ، لغت، ادب اور اشعار جاہلیت کے تناظر میں انہوں نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔

عربوں کے ہاں بات کہنے کے کئی اسلوب اور کئی طریقے مروّج تھے مثلاً استعارہ، تمثیل، قلب، تقدیم، تاخیر، خزف، کنائیہ، تکرار، فحوائے کلام، اخفاء، اظہار، تعریض، افصاح، ایضام، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جمع کو واحد کے صیغے سے، خاص لفظ سے عام معنی مراد لینا اور عام لفظ سے خاص، مشاکلات اور تشبیہات۔ درّانی صاحب نے قریباً ان سب کا احاطہ کیا ہے کیونکہ قرآنِ کریم کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔

محمد اویس درّانی صاحب نے گرامر کی غلطیوں کی سازش کو بھی تشت از بام کیا ہے۔ ان کا '' جہالت اور کم علمی کی بناء پر قرآنی گرامر میں غلطیاں'' ایک ایسا باب ہے جس کا مطالعہ فہمِ قرآنِ کریم کے لیے بڑا ہی مفید ہے۔ اس کتاب میں جمع القرآن اور ترتیب قرآن کے عنوانات بڑے ہی غور طلب ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وحی کی دس خصوصیات قرآنِ حمید میں تدّبر سے سامنے آتی ہیں اور یہ کہ وحیٔ خداوندی آج صرف قرآنِ کریم میں ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصوّر بالکل باطل ہے۔

اویس درانی صاحب فہمِ قرآنِ کریم کی روشنی میں ایک نظام کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں جس میں معاشی، معاشرتی، عبوری دور کے احکام، وراثت کے قوانین اور انسان کی تمدّنی زندگی پر جنسیاتی اثرات ان کے چند ایک وہ موضوعات ہیں جو ان کے قارئین کو گہری سوچ پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ علمی دنیا کے مسلّمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئے ہیں جن کی صحت عمومی طور پر لوگوں کے نزدیک مسلمات میں سے نہیں ہے۔ اور یوں وہ علمی تصوّرات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شستہ بناتے ہیں۔

جب وہ عموماً پائے جانے والے فلسفیانہ خیال کی تردید کے لیے جن قرآنی تصوّرات کو صحیح سمجھ کر کام میں لاتے ہیں تو وہ اپنے ہی اس مؤقف پر قائم رہتے ہیں اور نہ ہی معاشرے میں پائے جانے والے غلط تصوّرات کو قبول کرتے ہیں۔ وہ اپنی اس تمام تحقیق و تدقیق میں جذبات کو غالب نہیں آنے دیتے۔ عقل اور جذبات کو وحیٔ خداوندی کے تابع رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر عمل جو ارادتاً سرزد ہو، بظاہر کتنا ہی معقول اور عقل پر مبنی کیوں نہ نظر آئے، درحقیقت وہ ہمارے ہی مفاد پر مبنی ہوتا ہے اس لیے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ عقل و فکر کا وہ عمل وحی کے تابع ہو۔

مصنف کی یہ کتاب صرف آج کے نوجوان کے لیے مختص ہے نہ کہ ان افراد کے لیے جو پہلے سے قائم کیے گئے نقطۂ ہائے نظر کی روشنی میں قرآنِ کریم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کی یہ کتاب آنے والے نسل کے سامنے فہمِ قرآنِ کریم کے وہ تمام موانعات دور کردے جو ان کے خیال میں اس راہ میں حائل ہیں کیونکہ ان کی اس کتاب میں تبدیلیٔ نظر و فکر کا کافی مواد موجود ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (حیدر آباد)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

فاش گویم آں چہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

پوری تاریخ نوع انسان، تعمیر وتخریب کی عبرت انگیز داستان، آبادی وویرانی کی حدیث خونچکاں سے لبریز ہے۔ ہر دور کا انسان جدوجہد وکاوش سے ایک عظیم الشان تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اور اس فلک بوس عمارت کے لئے ہر قسم کے نوادرات جمع کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس ایوانِ رفیع الشان کی تکمیل میں ارتقائے انسانیّت کا راز پوشیدہ ہے۔ اس کے خیال میں اس کا وجود مظلوم انسانوں کے لئے پناہ گاہ ہے۔ وہ ایک عرصہ تک ان تصوّرات کی دنیا میں محو اور اس قصرعظیم المرتبت کی تکمیل وتزئین میں سرگرداں رہتا ہے۔

جوں جوں اس کی دیواریں اوپر کو ابھرتی ہیں تو نگاہوں میں چمک اور مسرتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ لیکن ابھی یہ عمارت ہنوز تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشہ کو بصد حیرت دیکھتی ہے۔ کہ وہی انسان، اس عظیم وحسین عمارت کو اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرادیتا ہے۔ اور یوں اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ شگفتہ وشاداب مرقع، خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کے کھنڈرات خوابِ پریشاں کی نشاندہی کے لئے باقی رہ جاتے ہیں۔ بابل ونینوا، مصر ویونان، چین وترکستان، روم وایران کی تہذیب کے کھنڈرات کا مشاہدہ کریں۔ کیسے کیسے عظیم المرتبت تمدّنوں کے مدفن ہیں۔ جن میں انسانی ناکامیوں اور نامرادیوں کی تاسف انگیز اور جگر پاش داستانیں محوخواب ہیں۔ جو ہر قلب حساس سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ (16:92) اس بڑھیا کی طرح نہ ہو جانا جس نے بڑی محنت سے سوت کا تا اور پھر اسے ادھیڑ دیا۔

1- تہذیبِ حاضر:

اگر تاریخ کی ان کہنہ داستانوں کی ورق گردانی اور اقوام سابقہ کے اجڑے ہوئے کاشانوں کی عبرت سامانی سے، انسانی کوشش کے اس مال وانجام تک پہنچنے کی فرصت نہیں تو موجودہ زمانے کے قصرِ تہذیب وتمدن پر نگاہ دوڑائیے۔ جس کی چمک دمک نے اقوام عالم کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ یہ دور مغرب کی تہذیب کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور کی سطوت وثروت اور دبدبہ وطنطنہ کا یہ عالم ہے کہ انسان نے فطرت کی بڑی بڑی مہیب قوّتوں کو مسخّر کر رکھا ہے۔ رسل ورسائل اور ذرائع آمدورفت کی محیّر العقول برق رفتاری سے زمین کی طنابیں کھینچ گئی ہیں۔ سمندر اس کے تابع فرمان ہیں۔ پہاڑ اس کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ زمین اس کے پاؤں کے ٹھوکروں سے اپنے دبے ہوئے خزانے اگل رہی ہے۔ آسمانی بجلیاں اس کے اشاروں پر محوِ رقص ہیں۔ ایٹم کی غیر مرئی جناتی قوّتیں اس کی مٹھی میں ہیں۔ چاند و دیگر اجرام فلکی کو دام میں لا رہا ہے۔ انسان کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی اس قدر کائنات گیر قوّت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ابھی اس کی عمر، نصف صدی سے یعنی زیادہ نہ ہونے پائی تھی۔ کہ ان بے پناہ قوّتوں کا حامل انسان پکار اٹھا ہے کہ:

> ''ہم نے زندگی کی ابتدا سائنس کی کاریگری سے کی اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔

''D.W.T Mason in Creative freedom''

بلکہ یہاں تک کہ ہماری موجودہ تہذیب اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبہ میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔

"G.A Dorsey "in civilisation۔ چنانچہ اس فلک بوس قصر کی بنیادیں بری طرح سے لڑکھڑا رہی ہیں۔ اور ہر قلبِ حساس متوحش ہے۔ کہ اگر گزشتہ دو عالمگیر لڑائیوں کے بعد ایک اور دھچکا لگا۔ تو نہ صرف یہ کہ اس کاخ بلند کا نام ونشان تک مٹ جائے گا بلکہ اسکے سائے کے نیچے بیٹھی ہوئی انسانیت بھی کچل کر رہ جائے گی۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

2- ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

ظاہر ہے ہے دور قدیم کے تمدن کے ایوانات ہوں یا عصر حاضر کی تہذیب کے محلات، نہ انہیں پاگلوں نے بنایا تھا اور نہ انہیں دیوانوں نے تعمیر کیا ہے۔ یہ نظامہائے تمدن وتہذیب ہر دور کے انسانوں کی عقل ودانش کا ماحصل، اور ان کی تدبیری اور انتظامی

صلاحیتوں کا نچوڑ تھے۔اس سے ظاہر ہے کہ انسانیّت کی تاریخ کے مطالعہ کے بعد ہر صاحب علم وبصیرت اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ:

ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گھتیاں تنہا عقل کی رو سے نہیں سمجھ سکتیں۔اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنالینا چاہئے۔اس خدا کے عضلات (Muscles) تو بہت مضبوط ہیں۔لیکن اس کی ذات نہیں ہے۔عقل اسباب وذرائع پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد واقدار کی طرف سے اندھی ہوتی ہے۔ Albert Einestine "out of my later days"۔یعنی عقل انسانی ، فطرت کی قوّتوں کو مسخّر تو کرسکتی ہے۔مگر انسانی معاملات کا تسلی بخش حل دریافت نہیں کرسکتی۔ یہ اس کے دائرہ منصب سے باہر ہے۔انسانی معاملات کے حل کے لئے ضروری ہے کہ یہ متعیّن کیا جائے کہ انسانی زندگی کا مقصد اور نصب العین کیا ہے؟ افراد اور اقوام کے مفاد میں تصادم کیوں ہوتا ہے؟ اور اس کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟ کونسی چیز عالمگیر انسانیّت کے لئے منفعت بخش ہے؟ اور کونسی مضرت رساں۔نوع انسان میں مشترک اقدار کونسی ہیں؟ اور ان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ ان اقدار کی حفاظت کیوں ضروری ہے؟ انسان کے بنیادی حقوق کیا ہیں؟ اور ان کا کس طرح ممکن ہے۔ان امور کا تعین، عقل اور اس کے مظاہر، علوم سائنس کے بس کی بات نہیں۔

یہ سائنسدان آئن سٹائن فرماتے ہیں ''سائنس صرف یہ بتاسکتی ہے کہ ''کیا ہے'' وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ ''کیا ہونا چاہئے'' اس لئے اقدار کا متعیّن کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رو سے، اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کردیں۔(یہ ہے ان کی غلطی) سائنس کے نزدیک بس ''ایک شئے'' ہوتی ہے۔اس کی دنیا میں اقدار، آرزو، خیر وشر، نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔سائنس نہ اقدار متعیّن کرسکتی ہے اور نہ انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کرسکتی ہے۔

3) اگر عقل ان کا تعین نہیں کرسکتی تو کیا عقل کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ علم بھی ہے۔جس سے ان امور کا تعین ہوسکے۔اور کاروان انسانیّت راستہ کے تمام خطرات سے محفوظ ومصئون اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتا جائے۔

ہدایت خداوندی:

اس سوال کا جواب عقل انسانی کی رو سے نہیں مل سکتا۔اس لئے کہ عقل اپنے علاوہ کسی اور سرچشمہ علم کا جانتی ہی نہیں۔اس کا جواب ہمیں ایک اور گوشہ سے ملتا ہے۔جو پورے حکم ویقین سے کہتا ہے رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾ (20:50) جس نے ہر شے کی تخلیق کی اور یہ بھی انتظام کررکھا ہے کہ ان کی منزل مقصود کونسی ہے۔وہ اس منزل تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔یہ رہنمائی وحی کہلاتی ہے۔جو خدا سے براہ راست ملتی ہے۔

وحی کا سلسلہ:

اشیائے کائنات میں وحی کا یہ سلسلہ از خود جاری وساری ہے۔ہر شے کی تخلیق کے ساتھ اس کے اندر اس حقیقت کا علم

رکھ دیا گیا ہے کہ اس کی نشوونما کے ذرائع کون سے ہیں۔اور انہیں کس طرح حاصل کرنا ہے۔ان کے فرائض زندگی کیا ہیں۔اور انہیں کس طرح سرانجام دیا جائے گا۔خارجی کائنات میں اس ہدایت کوقوانین فطرت کہا جاتا ہے۔حیوانات کی دنیا میں اسے جبلّت (Instinct) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر شے ان قوانین یا جبلّت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔اوران کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور وَ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ (16:49) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں تمام اشیاء قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ۝ (16:49) وہ سرکشی نہیں کرسکتیں۔کائنات میں کہیں بھی فسادوفتور نہیں ہے۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط (67:3)

انسانی رہنمائی:

جبکہ انسان کواختیار وارادہ دیکر آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

آدمی اندر جہاں خیر و شر
کم شناسد نفعِ خود را از ضرر
کسی نداند زشت و خوب کار چیست؟
جادۂ ہموار و ناہموار چیست؟

انسان کے اندر یہ رہنمائی اس لئے نہیں رکھی گئی کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح اس رہنمائی کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا۔صاحب اختیار وارادہ نہ رہتا۔یہ اختیار وارادہ تو وہ شرف عظیم ہے جس سے یہ دیگر اشیائے کائنات سے ممتاز ومتمیز ہے۔یہی اس کی سرفرازی اور سربلندی کا باعث ہے۔اس سے یہ مسجود ملائکہ اور مخدوم خلائق ہے۔اگراس میں سرکشی کی استعداد نہ ہوتی تو اس کی اصول پرستی کبھی وجہ شرف اور باعث تحسین نہ ہوتی۔اس لئے کہ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قوّت رکھتے ہوئے کی جائے۔اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود اختیار کی جائے۔اس سر کے جھکنے میں خوبی ہے۔جس کی پیشانی میں سرفرازیاں جھلک رہی ہوں۔جس میں انتقام کی قوّت نہیں۔اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ پر کنٹرول رکھنا ہی وجہ شرف انسانیّت ہے۔اس سے تو اس میں ارتقائی منازل طے کرنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ تھا تقاضا اختیار وارادہ کا کہ اس کے اندر رہنمائی ودیعت کر کے نہیں رکھی۔اس کو بھی رہنمائی دی دی گئی۔لیکن اس کے لئے طریقہ دوسرا اختیار کیا گیا۔یہ وحی انبیاء کرام کی وساطت سے دی جاتی رہی ہے۔چونکہ وہ وحی مختلف حوادث کی وجہ سے محفوظ نہ رہی۔اب یہ وحی محفوظ شکل میں چودہ صدیاں قبل رسول اللہ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچی۔اور مکمل اور آخری

شکل میں اس مجموعہ کا نام القرآن العظیم ہے۔

قرآن کریم:

خدا کی طرف سے بتدریج نازل ہوتا رہا۔رسول ﷺ نے اس کی کتابت اور حفاظت کا پورا اہتمام و بندوبست کیا۔رسول ﷺ کی وفات کے وقت یہ کتابی صورت میں موجود تھا۔اور اس کے سینکڑوں حافظ تھے۔اور یہی کتاب اپنی اصلی شکل اور ترتیب کے ساتھ اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔اور اپنے اور غیروں کی تاریخی شہادات سے ثابت ہے کہ ان چودہ صدیوں میں اس میں ایک حرف کا بھی تغیرّ وتبدّل نہیں ہوا۔اس کی حفاظت کا ذمہ خود ربِّ جلیل نے لیا ہے۔یہ عظیم المرّ تبت کتاب ابدی حقائق کا مجموعہ اور مستقل اقدار کا صحیفہ ہے۔جو زندگی کے ہر گوشہ کی رہنمائی کرتی ہے۔یہ فضا اور ماحول کے اثرات سے بلند اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔نہ تو اس کی تعلیم کبھی پرانی اور فرسودہ ہوتی ہے۔نہ ہی یہ انسان سے کہتی ہے کسی مقام پر کہ میں اس سے آگے نہیں جاسکتی۔وہ ہمیشہ زمانے کی امامت کرتی ہے۔اور انسانی زندگی کے ہر تقاضہ کا اطمینان حل بتاتی ہے۔اس میں افراد اور اقوام کی نشوو ارتقا کے ابدی اصول ہیں اور اقوام کے عرّ وج وزوال کے اٹل اصول بھی۔آخری ضابطہ حیات ہونے کی وجہ سے ہر حیثیت میں مکمل اور ہمہ گیر ہے۔

انسانی ناکامیوں کی وجہ:

یہ کتاب کہتی ہے کہ انسان کی ناکامیوں،مصائب،ہلاکتوں،خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کی وجہ صرف اس کا نظریۂ مادی تصوّرِ زندگی ہے۔جس کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان،حیوان کی ہی بڑھی ہوئی شکل ہے۔اور مادی جسم کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔اس کی زندگی طبعی قوانین کے تابع ہے۔اس لئے اس کے سامنے نہ حیوانی تقاضوں سے بلند کوئی تقاضا اور نہ طبعی مقاصد کے علاوہ کوئی اور مقصد۔

عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان حیوانی تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرے۔اس لئے ان کے سامنے جنگل کا قانون یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' سے بلند کوئی قانون نہیں ہوسکتا۔یہ ہے افراد اور اقوام کے اندر تصادمات اور خونریزی کی وجہ جس سے دنیا کا ہر گوشہ جہنّم بن کر رہ گیا ہے۔اس لئے عقل کی امامت میں جو بھی راستے اپنائے،وہ اس کو سکون واطمینان کی جنّت کی بجائے تباہی اور بربادی کے جہنّم کی طرف لے گئے۔ایک مغربی سکالر کا کہنا ہے''انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد ہی باطل پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔خواہ اس نظام کو کیسے ہی حسن تدّبر اور دانش سے کیوں نہ چلایا جائے۔اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم وضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہوسکتی۔"Robbert Briffault "in the Making of Humanity

قرآنی تصوّر حیات:

اس کے برعکس قرآنی تصوّر حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔اسے جسم کے علاوہ غیر

نشوونما یافتہ شکل میں ذات، پرسانلٹی بھی ملی ہوئی ہے۔اگر انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جائے تو اس سے انسان موت کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کر کے اگلی جنّتی زندگی کا حق دار ہوجاتا ہے۔جس طرح بدنی زندگی کے لئے قوانین ہیں اس طرح ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعیّن ہیں۔ یہ وحی کے ذریعے دیئے گئے ہیں جو قرآن میں محفوظ ہیں۔

معاشرہ کی تشکیل:

ذات کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی بلکہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے ہوسکتی ہے۔اس لئے قرآنی اقدار پر معاشرہ کی تشکیل ہی قرآن کا مقصد ہے۔اسی طرح اس کو ساری انسانیّت پر پھیلاتے جایئے۔تو نہ افراد کا باہمی تصادم اور نہ اقوام کے مقاصد میں تزاحم۔ چونکہ جو شخص جس قدر دوسروں کے لئے خیر کے کام کرے گا اس قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔اس میں ہر فرد دوسروں کے لئے منفعت کا کام کرے گا۔تمام تصادمات اور الجھنیں ختم ہوجائیں گی۔جس کی وجہ سے انسانی تاریخ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ (2:30) عالمگیر فساد اور خونریزیوں کا مرقع نہیں ہوئی تھی۔ان قوانین میں کوئی تبدّل و تغیّر نہیں ہوسکتا۔اور نہ حک و اضافہ۔اس روشنی کی انسان کو اس قدر ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

جنّتی معاشرہ:

ان اقدار کے تحت آج سے چودہ صدیاں قبل سرزمین حجاز میں قرآنی معاشرہ تشکیل پایا۔اس معاشرہ نے جس قدر انسانیّت ساز اور جنّت بداماں نتائج مرتب کئے انسانی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔(لا مارٹائن، Lamartine) رقمطراز ہے "History Dela Turquie" ''دنیا کے بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون اور سلطنتیں پیدا کیں۔زیادہ سے زیادہ مادی قوّتوں کی تخلیق کرسکے۔جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے ڈھیر ہوکر رہ گئیں۔لیکن اس انسان (محمد ﷺ) نے صرف جیوش و عساکر، مجالس قانون ساز، وسیع سلطنتوں قوموں اور خاندانوں ہی کو حرکت نہیں دی۔ بلکہ ان کروڑوں انسانوں کے قلوب کو بھی جو اس زمانے کی آباد دنیا کے ایک تہائی حصّہ میں بستے تھے۔اس نے ایک کتاب کی اساس پر، جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ایک ایسی قومیّت کی بنیاد رکھی جس نے دنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزّاج سے ایک امت واحدہ پیدا کردی۔ یہ لافانی امت باطل کے خداؤں سے سرکش اور متنفر اور خدائے واحد کے لئے والہانہ جذب وعشق۔ یہ ہیں دنیا میں اس عظیم ہستی کی یادگاریں۔

بہت بڑا مفکر، بلند پایہ خطیب، پیغامبر، مقنن، سپہ سالار، معتقدات کا فاتح، صحیح نظریۂ حیات کو علی وجہ البصیرت قائم کرنے کا ذمہ دار۔اس نظام کا بانی جس میں باطل خدا ذہنوں کی دنیا تک میں بار نہ پاسکیں۔بیس دنیاوی سلطنتوں اور ان پر ایک آسمانی بادشاہت کا بانی۔''

یہ بادشاہت انہی اقدار اور قرآنی اصولوں کی حکمرانی تھی۔جن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے قرآنی معاشرہ اپنا نظم و نسق سرانجام دیتا ہے۔اور جس سے انسانیت کا ہر گوشہ سیراب ہو کر حیات نو حاصل کرتا ہے۔

اس کے بعد:

جب تک یہ نظام قائم رہا تو نوع انسانی اس کی منفعت بخشیوں سے متمتع ہوتی رہی۔اس کے بعد جب اس کا دامن چھوڑ دیا تو حیوانی سطح زندگی کے تقاضے پھر غالب آ گئے۔اور انسانی ذات کا تصوّر ان کے نیچے دب گیا۔نتیجہ یہ کہ بربادیوں کے جس عذاب میں باقی اقوام مبتلا تھیں۔اسی میں یہ قوم بھی ماخوذ ہوگئی۔اس لئے کہ قانون خداوندی میں نہ کوئی قوم چہیتی ہے ،نہ سوتیلی ،جو قوم اپنی زندگی ان اقدار کے تحت گزارے گی تو خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی جنّت سے بہرہ یاب ہوگی۔اور جو ان کے خلاف جائے گی تو ذلت و زبوں حالی اس کا مقدر ہوگی۔

اس دور ہمایوں کے بعد یہ نظام دنیا میں کہیں قائم نہیں ہوا۔مگر خدا کا کائناتی قانون دنیا کو بتدریج قرآنی اقدار سے قریب تر لا رہا ہے۔آہستہ آہستہ، کیونکہ یہ انسانی اعداد وشمار کے لحاظ سے سست رفتار ہوتا ہے۔اس کا ایک دن ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال یعنی ایک طویل عرصہ کے برابر ہوتا ہے۔دنیا کیسے ان اقدار کے قریب آ رہی ہے اس کو مندرجہ ذیل مثالوں سے اندازہ لگائیے۔

مثالیں:

نزول قرآن سے پہلے ذہن انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیّت عین انسانی فطرت کے مطابق نظام جہاں بانی ہے۔قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا کہ انسان کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں سے اپنا حکم منوائے۔اور حضور ﷺ نے اسی تصوّر پر نظام کی تشکیل کر کے دکھا دیا۔

آپ دیکھیئے کہ وہی ذہن کس طرح اپنے سابق تصوّر کو چھوڑ کر قرآنی تصوّر مملکت کی طرف آ رہا ہے۔اس وقت غلامی کو معاشرے کا جز ولاینفک سمجھا جاتا تھا۔قرآن نے پیدائش کے اعتبار سے سب کو واجب التکرّیم قرار دیا۔اس لئے کسی انسان کا غلام بنانا خلاف انسانیّت ہے۔اب انسان نے غلامی کے خلاف بغاوت کی۔اور اسے لعنت قرار دیا۔اس وقت یہ تصوّر کہ رنگ ونسل کے اعتبار سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت حاصل ہے۔قرآن نے اس کی تردید کی کہ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہر ذاتی سے ہے نہ کہ نسبی اعتبار سے۔اب دیکھیئے کس طرح سے قرآنی تصوّر جگہ پا رہا ہے۔

قرآن نے رزق کے سرچشموں کو مشترکہ مفاد انسانی قرار دیا۔اس لئے جاگیرداری، سرمایہ داری کو فساد کی جڑ قرار دیا۔یہ تمام وسائل یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں اور معاوضہ محنت کا ہونا چاہیے۔نہ کہ سرمایہ کا۔کس طرح سے آج ساری دنیا اس نظام سے بلبلا اٹھی ہے۔اس زمانے میں عالمگیر انسانیّت کا تصوّر ہی ناپید تھا۔قرآن نے ساری نوع انسانی کو

ایک عالمگیر برادری قرار دیا۔اوراس کی عملی تشکیل کا طریقہ یہ ہے کہ ساری دنیا کا نظام حکومت ایک ہو۔اور یہ نظام وحی کی اقدار کے تابع ہو۔ یہ بات اس زمانہ کے محدود ذہن میں نہ سما سکی ۔مگراب دنیا اقوام کی تفریق سے تنگ آ کر ایک عالمگیر نظام کی تلاش میں مضطرب اور بے قرار ہے۔اوراس کی بنیاد کی تلاش میں سرگرداں ہے۔جو قرآن میں ہے۔ایسی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔بغرض اختصارانہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عقل کا تجرباتی طریق:

وحی نے صدیوں پہلے بتادیا کہ نوع انسانی کے لئے صحیح نظام زندگی کونسا ہے۔جنہوں نے اس کی صداقت پر یقین کیا تو اسے متشکل کردیا اوراس نظام کے تعمیری نتائج نے وحی کی صداقت کو سچا کر دکھایا۔باقی انکار کردیا اور تنہا عقل کی رہنمائی کو کافی گردانا۔عقل نے بھی بالاخراسی سمت کو صحیح پایا۔جس کی نشاندہی وحی نے کی تھی۔مگراس تک آنے میں ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ لگ گیا۔اوراس کے لئے بھی جن جگر پاش مصائب سے گزرنا پڑا۔اس کی شہادت تاریخ دے رہی ہے۔

عقل کا طریق تجرباتی ہے۔یہ کسی عقدہ کے حل کے لئے ایک تدبیر سوچتی ہے۔اس پر عمل شروع ہوجاتا ہے۔یوں مسلسل ناکام تجربوں کے بعد ہزاروں سالوں میں عقل صحیح نتیجہ تک پہنچتی ہے۔مگر انسان کواس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔اس کے برعکس ،وحی پہلے ہی دن حقیقت کو بے نقاب کر کے سامنے لے آتی ہے۔اس طرح سے ایک طرف انسان کا قیمتی وقت بچاتی ہے۔دوسری طرف ان تمام تباہیوں اور ہلاکتوں سے بچاتی ہے۔جواس عقل کے تجرباتی طریق کالازمی نتیجہ ہیں۔

گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہے کہ انسان آخرالامراسی نظام کو اختیار کرے گا۔جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔اس کے سوا اسے کوئی چارہ ہی نہیں۔لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ انسان نے جن عفریتی قوتوں کو فضا میں منتشر کرنا شروع کردیا ہے اور جس تیزی سے انسانی زندگی کو یہ تباہیاں اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں تو کیا اس سے اسے اتنی مہلت ملے گی کہ یہ عقل کے تجرباتی طریق سے قرآن نظام تک صحیح سلامت پہنچ جائے۔واقعات اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔

نزول قرآن کے وقت دنیا کی حالت کیا ہو چکی تھی۔اس کا نقشہ ایک مؤرخ دیتے ہیں جو اقبالؒ نے اپنے ایک لیکچر میں بیان کیا ہے۔

''اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے تھے۔منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔اورنوع انسانی پھراس بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی۔ جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا۔اور آئین وضوابط کوکوئی جانتا تک نہیں تھا۔ ہر طرف فساد ہی فساد تھا۔تہذیب کا بلند و بالا درخت جس کو

پروان چڑھانے میں چار ہزار سال صرف ہوئے تھے، لڑکھڑا رہا تھا۔ اندر سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جنگ وجدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یک جا کھڑے تھے۔ اور خطرہ یہ تھا کہ اب گرے یا اب۔ کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا۔ جو نوع انسانی کو ایک نقطہ پر مرکوز کردے؟ یہ امر موجب حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا۔ اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

قرآن اب بھی سنبھال سکتا ہے:

آج دنیا کی حالت اس سے زیادہ تشویش انگیز ہو چکی ہے۔ جو زمانہ نزول قرآن کے وقت تھی۔ لیکن جس طرح قرآن نے انسانیت کو اس وقت تباہی کے جہنّم میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ آج بھی اس میں اتنی قوّت اور صلاحیت ہے کہ گرتی ہوئی انسانیت کو سنبھال لے۔ اور انسانیت کو ان پرخطر گھاٹیوں سے بچا کر صحیح وسلامت منزل مقصود تک پہنچا دے۔ اور دنیا ایک بار پھر اس عظیم حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے۔

فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ (2:38)

عملی طریق:

ایک خطہ زمین کو اس نظام کی تجربہ گاہ بنا کر اسکے درخشندہ، تابناک نتائج کو دنیا کے سامنے لایا جائے۔ اور ان سے کہا جائے

چارہ ایں است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

تم نے تنہا عقل کی رہ نمائی کو آزما کر دیکھ لیا۔ اب ذرا وحی کی شمع نورانی کو دلیل راہ بنا کر دیکھو اور یہی نوع انسانی کا آخری ملجا و ماوٰی ہے۔ اور اس نظام والوں کا استقبال نوامیس فطرت یوں کریں گے۔

وَلَکُمۡ فِیۡهَا مَا تَشۡتَهِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَلَکُمۡ فِیۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَ ﴿۳۱﴾ؕ (41:31)

اور نشاط آور بشارتیں سَلٰمٌ ۟ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ ﴿۵۸﴾ (36:58)

اور جنّت سے نکالے ہوئے آدم سے کہا جائے گا

وَتِلۡکَ الۡجَنَّۃُ الَّتِیۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۲﴾ (43:72)

یہ تو خود تمہاری محنت کا ماحصل ہے۔ اب اس میں سے کوئی تم کو نہیں نکالے گا۔ قرآن یہ کچھ کر سکتا ہے۔

گر زمینی! آسماں سازد ترا
آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

خستہ باشی استوارت می کند
پختہ مثلِ کوہسارت می کند
صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دل آہن رباید زنگ را
نوعِ انساں را پیام آخریں
حاملِ اُو رحمۃ العلمین

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (17:9)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾(2:127)

انجینئر اویس خان درّانی
اسلام آباد
اگست2015ء
Email:awaisdurrani49@yahoo.com

’’قرآن کا مفہوم (ق۔ر۔أ) میں مضمر ہے‘‘

چوں مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیرِ خویش و در قرآن نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

قرآن:

(ق رأ) بنیادی معنی ’’قَرَأَ‘‘ کے جمع کرنا اور محفوظ رکھنا‘‘ جمع اور حفظ بھی عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ اور قرآن نے بھی ان کو اپنے ہاں استعمال کیا ہے۔ پھر اس کے مادہ (ق رأ) میں کیا خصوصیّت ہے کہ قرآن کا لفظ اس مادہ سے لیا گیا ہے۔ جَمَعَ یا حَفَظَ ‘‘ سے نہیں لیا گیا۔ قرآن مجید کا اعجاز لفظوں کے انتخاب میں ہے۔ اور یہ انتخاب خود پکار کر کہتا ہے کہ

ایں کتابِ نیست چیزے دیگر است

(ق ر ء) کے معنی ہوتے ہیں کہ کسی چیز کو اس طرح جمع کرنا اور محفوظ رکھنا جس طرح رحم مادر میں نطفہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ نطفہ تو اس طرح جامد نہیں ہوتا جیسا کہ تھیلی میں چند سکے محفوظ ہوں۔ بلکہ نطفہ تو رحم کے اندر بڑھنے، نشوونما پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قرآن تمام انسانوں کے لئے قیامت تک کے لئے محفوظ ہے۔ تو اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہئے اور ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے بڑھتے ہوئے تمام تقاضوں کا ساتھ دیتا جائے۔ ہر زمانے میں انسانی فکر کی امامت کرے۔ یہ ہر مقام پر چراغ رہ ہو اور کسی مقام پر یہ نہ کہہ دے کہ مجھ میں اب آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ مقام تو اس ذات کو حاصل ہوسکتا ہے جس میں علم انسانی کی نسبت سے بڑھنے اور پھولنے کی صلاحیت ہو۔

یہ ان حقائق کے متعلق ہے جو قرآن نے بتا دیئے ہیں ان الفاظ میں سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (41:53) جوں جوں انفس و آفاق میں پوشیدہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ قرآن کی صداقت مزید نکھر کر سامنے آتی جائے گی۔ سائنس کا ہر یقینی انکشاف اور علم انسانی کی ہر تحقیق قرآنی دعووں کی تصدیق کرتا چلا

جائے گا۔اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (38:87) یہ عالمگیر انسانیت کے لئے ضابطہ ہے۔اس لئے وَلَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعۡدَ حِيۡنٍ (38:88) اس کے تمام حقائق ایک ہی وقت میں، سب کے سب، سامنے نہیں آ جائیں گے۔ یہ کچھ وقت کے بعد بے نقاب ہونگے۔اور ہوتے جائیں گے۔

بعض نے کہا کہ یہ قرآن عبرانی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی اعلامیہ، اعلان ہے۔

قرآن کو کتاب بمعنی ضابطۂ حیات:

کتاب کا مادہ (ک ت ب) سے ہے۔حکم دینا، کسی بات کو واجب قرار دینا۔فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾ (98:3) اس میں نہایت محکم یعنی غیر متبدّل قوانین ہیں۔

اس میں دو قسم کے قوانین ہیں۔جن کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔جن کا حاصل کرنا ایمان کا جز وقرار دیا گیا ہے اور دوسرا حصّہ وہ قوانین جو انسان کی تمدّنی زندگی کے لیے، اس کی ذات کی نشوونما کے لیے قرآن میں دیئے گئے ہیں۔ یہ قوانین فطرت بھی انسانوں نے نہیں بنائے۔وہ صرف ان کو پڑھ سکتے ہیں لکھ نہیں سکتے۔ان کا انکشاف کر سکتے ہیں۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ فوز وفلاح صرف ان قوانین پر عمل کرنے سے مل سکتی ہے۔اور یہ بھی قوانین فطرت کی طرح خدا سے ملنے چاہئیں۔

قوانین فطرت سے اعراض کا نتیجہ جہنّم یعنی تباہی اور ذلت ہے:

دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔دونوں کی پابندی کرنا لازمی ہے۔ان قوّتوں کی نتیجہ اور ان کا استعمال عالمگیر انسانیت کے لیے فلاح و بہبود ہی قرآن کا مقصد ہے۔اگر ان میں سے کسی ضابطہ قوانین سے اعراض برتا جائے تو وہ خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ (2:85) ذات وخواری کی زندگی اس دنیا میں۔اس لیے اس جہنّم کے شعلے ساری دنیا کو لپیٹے ہوئے ہیں کیونکہ ان کو اقدار کے تحت استعمال سے اعراض برتا گیا ہے۔ یہ روش زندگی کتاب کے ایک حصّہ سے انکار یعنی خارجی قوانین کو مسخّر ہی نہ کرنا اس کو وحی کے تابع نہ رکھنا قرآن نے کفر قرار دیا ہے۔اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾ (2:85) تاریخ اس پر شاہد ہے کہ تسخیر فطرت اور مستقل اقدار کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا۔تو اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔انسانی زندگی ناقابل وحدت ہے (indivisible unit) ہے اس لیے اس کی مختلف حصوں میں تقسیم یعنی قوانین فطرت اور مستقل اقدار میں بے گانگی۔ایک حصّہ پر عمل اور دوسرے سے اعراض برتنا، اسی کا نتیجہ ذلت و خواری ہے جو ہم صدیوں سے بھگت رہے ہیں۔ یہ ہی وہ لوگ ہیں جو ایک طرف ہی نکل جاتے ہیں۔اِنَّ الَّذِيۡنَ يُلۡحِدُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا لَا يَخۡفَوۡنَ عَلَيۡنَا ؕ (41:40) یہ نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔دوسری جگہ ہے۔

وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ (7:180) یہ قرآن کتاب کی شکل میں تھا۔ جب منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے ان میں لوہے کا کڑا پرو دیا جاتا تھا تو اسے وہ کتاب کہتے تھے۔ یہ مدون شکل میں تھا۔ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ (3-52:2) یہ کتاب سطروں میں لکھی ہوئی تھی۔ پہلے اسے منتشر اوراق پر لکھا جاتا تھا پھر اس کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی۔ ہرن کی کھال یا پارچمنٹ کی شکل میں قرطاس کو رَقٌّ کہا جاتا تھا۔ جب تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا انہیں اس پر قلم بند کر لیتے تھے۔ حضور ﷺ کی زندگی ہی میں اس ترتیب اور شکل میں مدون قرطاس پر موجود تھا۔ اس میں ایک لفظ بھی کمی، بیشی نہیں ہوئی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (15:9) اس کا کوئی لفظ تبدیل نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لے لیا ہے۔

ختم نبوّت:

اب ضابطۂ حیات مکمل اور غیر متبدّل دے دیا گیا۔ قیامت تک کے لیے محفوظ شکل میں تو ایسی کتاب کی موجودگی میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن کی اکملیّت۔ خاتمیّت، ابدّیت اور عالمگیریت خود ختم نبوّت کی دلیل ہے۔ قرآن کی رو سے کوئی نبی یا رسول بغیر کتاب کے نہیں آیا۔ جب خدا نے اس کتاب کو آخری کتاب خود کہہ دیا تو اس کا لانے والا خود بخود آخری رسول ہو جائے گا۔

قرآن حکیم کے لیے عربی زبان کی خصوصیّت کی خاص ہدایت:

اس کتاب کے بارے میں کہا گیا۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (26:195) اس کی زبان عربی مبین ہے۔ خود عربی کے معنی بھی ''فصیح'' اور واضح کے ہیں۔ جب اس کے ساتھ مبین کا اضافہ ہو گیا تو اس سے مراد ''واضح تر'' ہو گیا۔ غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (39:28) اس میں کوئی پیچ وخم نہیں ہے۔ ابہام نہیں۔ صاف۔ واضح نکھری اور سدھی کتاب اسے نور یعنی خود بھی روشن اور دنیا کو روشن کرنے والی جس طرح روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ اسی طرح قرآن بھی اپنے مطالب و مفاہیم و اصول و پیغام کو واضح کرنے کے لیے کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں ہے۔

قرآن صرف اپنے الفاظ میں قرآن ہے:

قرآن کی زبان اس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے۔ تو اس رسول کا پیغام، اسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول ﷺ کے اوّلیں مخاطب عرب تھے اس لئے قرآن انہی کی زبان میں آیا اور انہی کی زبان میں آنا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیت کے پروگرام میں کچھ ایسا تھا۔ کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا ایسی جامع، عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم الالسنہ کے ماہرین بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب ابراہیمؑ کو بیٹے اسماعیلؑ

کے گلہ پر چھری چلانے سے روک دیا گیا اور کہا کہ ہم نے اس کو ایک عظیم قربانی کے محفوظ کرنا ہے۔ بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے ان کو اس مملکت کا وارث ہونا تھا۔ مگر حکم ہوا کہ ان کو وادی غیر ذی زرع مکہ میں بسایا جائے تا کہ یہ اس گھر کی تولیت سنبھالیں۔ جبکہ اسحٰق کی اولاد امور جہانبانی میں رہی اور ان کے حصّہ میں شوکت سلیمانی اور سطوت داؤدی آئی جبکہ ذریت اسماعیل اس وادی غیر ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اور صرف عربی زبان کی تشکیل اور تعمیر کرتے رہے اور یہ اس مقام پر پہنچ گئی جہاں دنیا کی کوئی زبان ان کا مقابلہ نہ کرسکی۔ دنیا کے سارے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ یہ کوئی عقیدت مندانہ رائے نہیں۔ ڈاکٹر Bucke (بک) نے مشہور کتاب ''Cosmic Consciousness'' مشہور محقق مشرق ''Max Muller'' کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے'' کہ جس زمانے میں تمام انڈو یورپین زبانوں میں مادی تصوّرات (Root-Concepts) کی تعداد ''12'' تک پہنچ پائی تھی۔ عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے تضمنات میں (5744) الفاظ موجود تھے۔ اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

عربی زبان کے مادوں کی تعداد 25 ہزار کے قریب ہے:

یہ عربی بڑی ہی سائینٹیفک زبان ہے۔ اس میں مادہ تین حرف پر مشتمل ہوتا ہے۔ (ثلاثی مجرّد) اس مادہ کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیّت ہوتی ہے۔ جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی جاتی ہے۔ جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد 25000 ہے۔ (پچیس ہزار) تو ان مادوں سے جو الفاظ بنائے گئے ہوں تو ان کی تعداد کتنی ہوگی۔ دوسری خصوصیّت اس کے مختلف ابواب اور اوزان ہیں۔ ہر باب کی الگ الگ خصوصیّت ہوتی ہے۔ یعنی ایک مادہ (Root) جس کی ایک متعیّن خصوصیّت ہے۔ وہ خصوصیّت ہر لفظ میں پائی جائے گی۔ جو اس مادہ سے تھے اور پھر وہ الفاظ ان ابواب کے مطابق بنیں گے۔ تو ہر باب کی الگ خصوصیّت ہوگی۔ اس لئے جو لفظ بھی سامنے آئے تو اس کے مادہ کو دیکھئے۔ اس کے باب کو دیکھئے۔ ان دونوں کو ملانے سے اس کا ایک متعیّن مفہوم سامنے آجائے گا۔ یہاں تک کہ یہ ترتیب اس مادہ میں فلاں اور فلاں حرف اکٹھا آئے تو اس کی یہ خصوصیّت ہوگی۔ یعنی جتنے بھی مادے (Roots) ایسے ہونگے۔ جن میں وہ دو حرف آجائیں۔ ان میں وہی خصوصیّت ہوگی جو ان دو حرفوں کے اکٹھا ہونے سے بتائی گئی ہے۔ کیا دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ اور اس میں قرآن نازل ہوا ؟

قرآن کی عربی زبان آسان ترین بھی ہے اور نہایت عمیق و وسیع بھی:

پہلے تو یہی بات یہاں سے سمجھ میں آتی ہے کہ یہ زبان بڑی سائینٹیفک واقع ہوئی ہے۔ اس لئے اس کا سمجھنا بڑا آسان ہے۔ جو اس زبان کو ہوا بنا کر رکھا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے۔ تا کہ عام مسلمان قرآن کو براہ راست سمجھنے نہ لگ جائے۔ اور خاص طبقہ کی اجارہ داری رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عربی ادب پر حاوی ہونا تو واقعی بڑی محنت چاہتا ہے۔ بڑی وسعت و معلومات چاہتا ہے۔ تعلیم میں بھی آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ لیکن قرآن اس قدر آسان ہے۔ یعنی عجیب چیز ہے کہ زبان

کے اعتبار سے اتنا جامع، اتنا وسیع، اتنا عمیق اور سمجھنے کے اعتبار سے اتنا آسان۔ جو خود اس کا دعویٰ ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (54:17) تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89)

قرآن کو سمجھنے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ آئے ہیں۔ پہلے (Roots) یا مادہ کی رو سے ان کے معانی متعیّن کئے جائیں۔ پھر دیکھا جائے کہ زمانہ نزول قرآن میں عرب ان الفاظ کے معنی کیا لیتے تھے۔ ایک لفظ کی شکل وساخت کے اعتبار سے کئی ایک معنی اور مفہوم ہوتے ہیں۔ یعنی جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا۔ عرب اس سے کیا معنی لیتے تھے۔؟

ہزار سال سے مرتب کی جانے والی لغات کی ایک بنیادی کمزوری:

قرآن کے متعلق یوں تو ہزارہا کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن حیرانگی اس بات پہ ہوتی ہے کہ قرآن مجید کا کائی لغت ایسا نہیں جو اس انداز سے مرتب کیا گیا ہو۔ یعنی جو چیز قرآن کے سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ چیز اس پورے لٹریچر میں کبھی مرتب ہی نہیں ہوئی۔ لے دے کے ایک امام راغب اصفہانی (متوفی 502ھ) کی لغت ''المفردات فی غریب القرآن'' ہے۔ اس کا بھی سرقلم کر دیا گیا 1327۔1409ء) لیکن یہ بھی بڑا مختصر سا لغت ہے۔ مروّجہ کتب لغت میں تین کتابوں کو شہرت حاصل ہے۔ لسان العرب۔ تاج العروس اور قاموس۔ اس کے علاوہ دیگر لغات خاص خاص شعبوں میں ان سے بھی زیادہ ممتاز ہیں۔

1) اس لئے پرویز (ر) کی لغت کی بنیاد تاج العروس'' کو بنایا گیا۔ تاج العروس قاموس کی شرح ہے۔ اور چونکہ یہ لسان العرب کے بعد مرتب ہوئی ہے اس لیے اس میں لسان کی ضروری تفصیلات بھی آ گئی ہیں۔ تو اس اعتبار سے تاج العروس آخری (Latest) مفصل اور مستند لغت ہے جس میں اس سے پہلے کی شائع شدہ قریباً ساری مستند لغات کا خلاصہ آ گیا ہے۔ ان کا مصنف محب الدین وفات (1791ء،1605ھ) میں ہوئی۔ یہ دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور مصر میں مدون ہوئی۔ اس میں لسان العرب کے علاوہ ایک سو مستند کتب لغت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مشہور لغت (Lane Lexicon) تاج العروس پر مبنی ہے۔

2) تاج العروس کے ساتھ دوسری امام راغب اصفہانی (502ھ) کی کتاب کو بھی رکھا گیا ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا لغت ہے۔ یہ نہایت مختصر سی کتاب ہے۔

3) تیسری اہم کتاب ابن فارس (395ھ) کی مقاییس اللغہ ہے۔ جس میں ہر لفظ کا مادہ اور اس کے بنیادی معنی دیئے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس لغت سے نمایاں استفادہ کیا گیا ہے۔

4) اس کے بعد زیادہ استفادہ پطرس بستانی کی لغت محیط المحیط جو مختصر کتاب دو جلدوں میں ہے۔

5) دیگر اور بھی لغات کا استفادہ کرنے کے علاوہ ابن ورید کی کتاب الاشتقاق جو مادہ کے بنیادی معنی معلوم کرنے کے لئے بہت مفید ہے۔ اگرچہ مقابیس اللغہ جیسی مفصل نہیں۔

6)نواب صدیق حسن خان مختصر رسالہ جس میں مادوں کے حروف کی بنیادی خصوصیات عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔اس طرح کی دیگر بیسیوں لغات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس لغت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد قرآنی طالب علم کسی تفسیر کا محتاج نہیں رہتا۔اس کا نام لغات القرآن اس لئے رکھا گیا ہے تاکہ دوسرا نام رکھنے سے اس کی بنیادی خصوصیّت یعنی قرآنی الفاظ کے معانی نظر سے اوجھل ہوجانے کا امکان تھا۔یہ یادرکھیں کہ یہ صرف قرآنی الفاظ (مفردات) کا لغت ہے۔پوری عربی زبان کا نہیں۔اس میں ہر لفظ کے متعلق اس حد تک بحث کی گئی ہے۔جس حد تک قرآن نے اسے لیا ہے۔نہ ہی قرآن کی ساری متعلقہ آیات دی گئی ہیں البتہ جداگانہ مفہوم کی آیات اسی لفظ سے متعلق دیدی گئی ہیں۔

7)اس میں حقیقی اور مجازی معانی کا فرق بھی دیکھنا ضروری ہے۔بلند پایہ تصانیف میں اور بھی بہت سے طریق اور اسالیب بیان ایسے ہوتے ہیں جن میں الفاظ کے مجازی معنی مقصود ہوتے ہیں۔عام طور پر یہ انداز بیان تشبیہات اور استعارات پر مشتمل ''Symbolical'' ہوتا ہے۔اس ضمن میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے۔عرب کے ہاں کلام میں مجازی معنی بھی لیتے ہیں۔بات کہنے کے کئی طریقے اور کئی اسلوب ہوتے ہیں۔چنانچہ استعارہ ،تمثّیل ،قلب ،تقدیم ،تاخر ، حزف ،تکرار ،اخفاء ،اظہار ،کنایہ واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جمع کو واحد کے صیغہ سے۔خاص لفظ سے عام معنی مراد لینا اور عام لفظ سے خاص۔غرضیکہ بہت سے اسلوب ہوتے ہیں۔جو آپ کو مجاز کے ابواب میں مل سکتے ہیں۔قرآن کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔اس لئے قرآن کا ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا۔کیونکہ عجمی زبانوں میں مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے۔مثلاً آیت فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿11﴾ (18:11) اگر اسے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں تو اس سے وہ مفہوم نہیں سمجھا جاسکتا جو ان الفاظ سے سمجھا جاسکتا ہے۔اگر آپ ترجمہ کریں کہ ہم نے ان کو چند سال تک سلائے رکھا تو مفہوم کا ترجمہ تو کردیا الفاظ کا ترجمہ نہیں کرسکتے۔

یہ انداز بیان عام کتابوں میں بھی ہوتا ہے۔لیکن جس کتاب عظیم کو کیفیّت یہ ہو کہ اس کے حقائق کو تمام نوع انسانی کے لئے۔ہر زمانے میں مشعل ہدایت بننا ہو۔اس کا وہ حصّہ اسی انداز کا ہونا چاہیئے۔جس کا تعلق حقائق سے ہو۔اس سے ہر دور کے ارباب علم وبصیرت اور اصحاب فکر وتدبیر ،اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ،الفاظ کے مجازی معنی سے ،قرآنی حقائق کو سمجھتے چلے جائیں گے۔اور یوں ،جوں جوں انسانی عقل کی سطح بلند ہوتی جائے گی۔قرآنی حقائق بے نقاب ہوکر سامنے آتے جائینگے۔لہٰذا قرآنی الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ متعلقہ آیت میں فلاں لفظ کے معنی حقیقی لینے چاہئیں یا مجازی۔پہلے اس کے حقیقی معنی متعیّن کر کے پھر اس کے حقیقی یا مجازی جو معنی زیادہ موزوں نظر آئیں۔انہیں اختیار کرنا چاہئے۔ان لغات میں جو قرآنی تعلیمات کے بارے میں دی گئی ہیں۔جو ان اشخاص کی ذاتی استعداد ،رجحانات ،نیز خود اس

زمانہ کی علمی سطح اور عام فضا کا نتیجہ ہوتی ہیں۔اس لئے دوسروں پر ان آراء کی پابندی لازم نہیں ہے۔ان مقامات پر اپنی فہم و بصیرت اور علم کی موجودہ سطح پر جو بہتر ہوا اختیار کرنا چاہئے۔مگر وہ قرآن کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ ہو۔

اردو زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ داخل ہیں۔مگر یہ الفاظ اردو میں ان معانی سے مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔جن معنوں میں عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔

بعض حروف کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ زائد' ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ بلاضرورت استعمال گیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حرف کے (اس مقام پر) الگ معنی کچھ نہیں لیکن اہل زبان اسے ایسے مواقع پر استعمال کرتے ہیں۔اور اس سے کلام میں خاص وزن پیدا ہوجاتا ہے۔اگر اس موقع پر قرآن اسے استعمال نہ کرتا تو قرآن کا انداز غیر فصیح ہوجاتا۔

عربی الفاظ کے مادے بالعموم سہ حرفی (ثلاثی مجرّد) ہوتے ہیں۔لیکن بعض اوقات چار حرفی (رباعی) اور رباعی مزید فیہ،ثلاثی مزید فیہ۔بھی مستعمل ہیں۔

قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا:

جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے۔بلکہ دیگر مشترقین کا بھی کہنا ہے کہ قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔تو اس کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا جائے۔جو ترجمہ اور تفسیر کے بین بین ہے یعنی (Paraphrasing) اردو میں مفہوم۔

قرآن پر غور و فکر کی شرط ہر دور کے لئے لازم ہے:

ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ (75:19) اس کی وضاحت ہمارے ذمہ یعنی قرآن کی وضاحت خود قرآن ہے۔یہ عام کتابوں کی طرح نہیں کہ ہر باب کا خاص موضوع ہو بلکہ یہ مختلف خطبات کا مجموعہ جو 23 سال کے عرصہ میں نازل ہوتا رہا۔اسے یوں سمجھئے۔اس میں ایک بات ایک مقام پر اور تفسیر کسی اور مقام پر۔مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں دہرایا گیا ہے۔اسے تصریف آیات یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ وَ لِيَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ وَ لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ (6:105) قرآن فہمی کے لئے دو بنیادی چیزیں،عربی زبان کے الفاظ کا وہ مفہوم جو عرب لیتے تھے۔ان سے واقفیت۔ہر موضوع کے متعلق تمام آیات کا بیک وقت سامنے آنا۔یعنی تبویب القرآن ان دو شرائط سے زیادہ اہم شرط وہ ہے تدّبر فی القرآن (4:82) اور تدّبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لئے اور نہ کسی خاص زمانے کے لئے ہے۔یہ تو تمام افراد اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔

اس لئے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔اور نہ ہی کسی ایک فرد کا تدّبر دوسرے کے لئے سند اور حجّت ہوسکتا ہے۔تو کسی خاص زمانہ کی تفسیر کافی نہیں ہوسکتی۔

قرآن فہمی کے لئے وقت کے تقاضوں سے آگاہ ہونا ضروری ہے:

قرآن پر غور کرنے کے لئے یہ بھی از حد ضروری ہے کہ اس زمانے میں جس سطح پر علم انسانی پہنچ چکا ہے۔اس پر اس کی نگاہ

ہو۔قرآن تو انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔اگر کسی کومعلوم ہی نہ ہوز مانے کے تقاضے کیا ہیں تو وہ قرآن سے کیا رہنمائی لے گا؟ جس طرح ایک فرد کا تدّ بر فی القرآن دوسرے کے لئے سند اور حجّت نہیں ہوسکتا اس طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانہ میں سمجھا گیا ہو وہ بھی حرف آخر نہیں ہوسکتا۔ جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا۔نت نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآن کی کسی بات میں تضاد نہیں:

قرآن کہتا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ (4:82) کیا انہوں نے قرآن پر تدّ بر نہیں کیا۔من جانب اللہ ہونے کی دلیل قرآن دے رہا ہے۔قرآن کے سارے نسخوں میں یہی الفاظ ہیں۔تو ان کی تعبیرات کیسے مختلف ہوگئیں۔بات تو ساری تعبیرات کی ہے۔اگر کیفیّت یہ ہو کسی کتاب کی، کہ زاہد کو کوئی مفہوم دیں اور بکر کو اس سے بالکل متضاد تو کیا اہل علم کے نزدیک کتاب کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے؟ یاد رکھیں قرآن کی کسی بات میں تضاد نہیں ہے۔تدّ بر شرط ہے۔قرآن سمجھنے کے لئے جو شرائط خود قرآن نے مقرر کی ہیں اگر انکے مطابق تدّ بر کیا جائے تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیرات ہو نہیں سکتیں۔اس لئے اگر لغت قرآن کو اپنی سمجھ اور حجّت اور آخری دلیل تسلیم کرے تو امت میں کسی قسم کا تفرقہ اور اختلاف پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔

قرآن میں کچھ تو احکام وقوانین ہیں اور کچھ حقائق۔احکام وقوانین کے لئے ایسے الفاظ استعمال کیئے گئے ہیں۔حق کے معنی ٹھوس اور متعیّن ہیں۔لیکن حقائق، جن کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے۔ان کو تشبیہات کے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔اور اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات و استعارات سے شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصوّر قائم کرسکتا ہے۔ان میں اختلاف ہوگا۔ جہاں تک ہدایات کا تعلق ہے ان کی دو تعبیریں نہیں ہوسکتیں۔یہ اسلامی نظام کی طرف سے نافذ ہونگے۔اس لئے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔یوں امت میں وحدت فی العمل پیدا ہوجائے گی۔اور قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے فکری آزادی بھی قائم رہے گی۔

شرط اوّل قلب وذہن کی پاکیزگی:

ان تمام شرائط سے زیادہ گہری شرط ایک اور ہے۔اور وہ یہ ہے کہ جب تک اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصوّرات سے پاک نہیں کرلیا جائے گا قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ (56:79) جس کا قلب ونگاہ انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک نہ ہوا سے قرآن سے کوئی مس نہیں ہوسکتا۔جب تک ان تراشیدہ بتوں کو دماغ سے باہر نہ نکالا جائے تو قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اہل عرب بھی قرآن کو نہیں سمجھ پاتے:

پہلے ان بتوں کو دماغ سے نکالیں اور پھر دیکھیں کہ قرآن کس طرح جلوہ پیرا ہو کر اس میں داخل ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے

کہ اہل عرب کی زبان تو عربی ہے تو وہ بھی قرآن کو پھر کیوں سمجھ نہیں پاتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کو غیر عرب مسلمانوں کی طرح تقلیداً سمجھتے ہیں۔ یعنی کسی زمانے میں جس شخص نے قرآن کو جس طرح سمجھا وہ آنے والوں کے لئے سند اور حجّت بن گیا۔ اس کے اور قرآن پر سارا غور وتدبّر ختم ہوگیا۔ یہ تقلیدی قرآن عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعہ ان کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ وہ۔ اس لیے اس باب میں عرب اور عجم کی بھی کوئی تفریق نہ رہی۔ تمام تفسیر کی کتابیں جو الازھر میں پڑھائی جاتی ہیں وہی دیوبند اور ساری دنیا کے دارالعلوموں میں زیر تدریس رہتی ہیں۔ فکر وبصیرت نہ وہاں ہے نہ یہاں۔

قرآنی رموز کو جاننے اور سمجھنے میں صدیوں سے حائل رکاوٹ:

قرآن سمجھنے کے لئے سوال اہل زبان ہونے کا نہیں ہے۔ سوال زبان دانی کے بعد اہل فکر ونظر ہونے کا ہے۔ اپنے غور وفکر اور علم وبصیرت کی رو سے قرآن کو سمجھنے میں ایک بہت بڑی دشواری حائل ہوتی ہے۔ متقدمین (اسلاف) نے جو تفاسیر لکھیں اگر ان کے متعلق یہ کہا جاتا کہ ان کا اپنا خیال، اپنا فہم اور اپنی رائے ہے تو ان سے اختلافات کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ ایک انسان سے دوسرے انسان کا اختلاف نہ کوئی جرم ہے نہ گناہ۔ مگر ان تفاسیر کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

پہلی تفسیر طبری کی ہے۔ کوئی تین صدی بعد میں مدون ہوئی۔ ہر آیت کی تفسیر کے متعلق کہا کہ یہ رسول ﷺ کی تفسیر ہے۔ تو طبری کی تفسیر رسول اکرم ﷺ کی تفسیر قرار پائی۔ اس کے بعد اس سے اختلافات تو مرتد بنا کر گردن کٹوانا ہے۔ چناچہ آج تک جتنی تفاسیر معنویت کے اعتبار سے لکھی گئیں ان میں الفاظ کا فرق ہوگا انداز بیان کا فرق ہوگا، اسلوب کا فرق ہوگا لیکن معنویت کے اعتبار سے نہ اس سے کوئی اختلاف کر سکتا تھا اور نہ کیا ہے۔ چونکہ قابل اعتماد اور صحیح تاریخ موجود نہیں ہے۔ بخاری نے حدیث اور طبری نے پہلی تفسیر لکھ کر ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ طبری نے قرآن کی تفسیر کے ساتھ اسی زمانے کی تاریخ بھی بغیر کسی لکھے ہوئے مواد پر 13 جلدوں میں لکھ دی۔ اختلاف امت ان کتابوں کی وجہ سے ہے۔ اور یہ سارا ظنّی ہے۔ کَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللہِ، خود ہی اس کا ثبوت فراہم کر دیا۔ صرف قرآن ہی اس امت کو ان اختلافات سے نکال سکتا ہے۔

حصّہ اوّل

سورۃ الفاتحہ

ربطِ قرآن:

قرآن الحمد سے الناس تک ایک مربوط کتاب ہے۔ سورتوں کے الگ الگ نام حوالوں کی آسانی کے لئے ہیں۔ جیسے آیتوں کے الگ الگ نمبر ہیں اور قرآن کی تیس پاروں میں تقسیم بھی کوئی خصوصی نہیں ہے۔ یہ تلاوت کے لئے حفاظ نے قرآن کو آسانی کے لئے حصوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر حصّہ کا نام ایک پارہ رکھ دیا۔

سورتوں کے الگ الگ نام بھی حوالوں کی سہولت کی غرض سے ہیں۔ ہر سورہ میں بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ بڑے اہم الفاظ ہیں۔ چونکہ یہ الفاظ جب ملکہ سبا کو سلیمانؑ نے خط لکھا۔ اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَ اِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۳۰﴾ (27:30) چونکہ یہ اس طرح قرآن کے متن کے اندر آگئے ہیں اس لیے یہ الفاظ وحی خداوندی ہیں۔ اور ہمارے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۳۰﴾ (27:30) کا حقیقی مفہوم اور اس کی وضاحت:

اس کا مروّجہ ترجمہ ہے ''میں شروع کرتا ہوں پاک نام اللہ کے، جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے''۔ بِسۡمِ اللّٰہِ '' میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کے معنی ''میں شروع کرتا ہوں''۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس میں اس سے پہلے ''اِقۡرَاۡ'' کا لفظ محذوف ہے۔ اگر گہرائی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نہ تو اس سے پہلے کوئی لفظ محذوف ہے اور نہ ہی اس کے معنی ''میں شروع کرتا ہوں'' ہیں۔ کیونکہ باسم اللہ میں ''ب'' کا حرف آیا ہے۔ جس کے معنی ''ساتھ'' کئے جاتے ہیں۔ ساتھ نام اللہ کے'' ٹھیک اس کے معنی ''ساتھ'' بھی ہیں۔ لیکن عربی زبان میں تو ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف کے متعدد معانی ہوتے ہیں۔ اور اس میں سے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کونسا معنی موضوع، مفہوم اور مضمون کے اعتبار سے اس آیت میں صحیح طور پر فٹ بیٹھتا ہے۔ یعنی اس سے پہلے اگر کوئی لفظ محذوف نہ مانا جائے تو ''ب'' کے معنی ساتھ'' کی بجائے دوسرے لینے چاہئیں۔ اور اس کا دوسرا اہم معنی ''مقصد، غایت'' ہے۔ یعنی جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کی غایت یہ ہے، اس کا سبب یہ ہے۔ اس کی علّت یہ ہے۔ میں اس لئے یہ کر

رہا ہوں ۔تو بسم اللہ کے معنی میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں یا اس کے بعد کہا جائے گا اسکا مقصد،اس کی غایت یہ ہے ۔اب ''ب'' کے ساتھ پہلا لفظ ''اسم'' ہے جس سے مراد نام یا صفت ہے۔(س م و) اسم کوئی ایسی علامت جس سے متعلقہ چیز پہچانی جائے۔اللہ کی ذات تو تصوّر سے ماوراء ہے۔ یہ جو الاسماء الحسنی ۔ یہ صفات کا کچھ انداز کیا جا سکتا ہے جو نہایت حسن وخوبی سے کامل توازن لئے ہوئے ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ: اللہ کی صفت کو مشہود کرنے کے لئے یہ کام شروع کیا جا رہا ہے۔یعنی رحمن ورحیم یعنی اس کی صفت رحمانیّت اور رحمیت کا ظہور اور نمود ہو جائے۔یعنی خدا کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو اس لئے نازل کیا ہے کہ ہماری ''صفات رحمانیّت اور رحمیّت کی عام نمود ہو جائے۔

جب مرد مومن اپنے کسی کام کی ابتداء ان الفاظ سے کرے تو معنی ہونگے''میں اس کام کو اس لئے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ اس سے خدا کی صفت رحمانیّت اور رحمیّت کی نمود ہو جائے۔بسم اللہ کی غایت یہ ہے کہ خدا کی ان دو صفات کو معاشرے میں عملاً بروئے کار لایا جائے۔ یا اگر فاعل کا ذکر نہ ہو تو اس سے مصلحت یہ ہے کہ ہر لمحہ میں جب بھی اس کا کام کو کوئی بھی ہاتھ میں لے گا تو وہ نیا فاعل ہوگا۔اگر اِقۡرَأۡ کو حذف سمجھ لیا جائے تو پھر یہ جملہ ناقص نہیں رہتا۔

خدا کے نزدیک نزول قرآن کا اصل مقصد:

قرآن کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسانی دنیا میں اس کی صفت رحمانیّت اور رحمیت عام ہو جائے۔اس کے بندے جس پروگرام کو بھی لیں اس پروگرام کی غرض وغایت یہ ہونی چاہئے ۔ یہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۳۰﴾ (27:30) تو ایک بڑے پروگرام کا اعلان ہے۔جس کا بروئے کار لانا اس امت کا فریضہ ہے۔اس میں تعاون وشرکت کرنا ہر عبد مسلم کا فریضہ حیات ہے۔ پہلے رسولؐ نے کیا اور اب ہم نے کرنا ہے۔

سورۃ فاتحہ کی حیثیت قرآن حکیم کے ''پیش لفظ'' کی سی ہے:

سورۃ فاتحہ قرآن (Preface) پیش لفظ۔تعارف (Introduction) ہے۔ان سات چھوٹی چھوٹی آیات قرآن کی ساری تعلیمات کا ملخص آ گیا ہے۔ یہ قرآن کا افتتاحیہ (Opening) ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ (1:1)

اَلۡحَمۡدُ کا عام ترجمہ تعریف کیا جاتا ہے۔اور غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ یہ عجیب خدا ہے جو کہتا ہے کہ تمام تعریفیں میرے لئے ہیں۔یعنی اس کا اپنے منہ سے کہنا کچھ زیب نہیں دیتا۔ یہ اعتراض دراصل غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کہ وحی خداوندی یعنی قرآن انسانوں کو ایسی تعلیم دیتا ہے کہ وہ ایسا کہیں ۔ یہ تو ہدایت ہے جو دی گئی ہے۔الحمد سے مراد یہ نہیں کہ وہ اپنی تعریف کراتا ہے۔ وہ تو اس سے مستثنٰی ہے۔اس نے انسانوں سے کہا کہ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ ساری ''حمد'' خدا کے لئے

ہے۔اصل یہ ہے۔

حمد کے مفہوم کی شرط اوّل:

تعریف کے لئے عربی زبان میں اور الفاظ بھی ہیں۔اور خود تعریف بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔مگر قرآن میں وہ الفاظ خدا کے لئے استعمال نہیں ہوئے۔اس کے لئے ''حمد'' کا لفظ ہی آیا ہے۔لہٰذا اس کے بنیادی اور حقیقی مفہوم کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

حمد کے معنی کیا ہیں؟ زمانہ نزول قرآن کی عربی میں اس کا مفہوم کیا لیا جاتا تھا؟ جب وہ مفہوم سامنے آئے گا۔تو آپ کو علم ہوجائے گا کہ خدا کے لئے یہی لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔اور یہ بھی کہ اس کے معنی یہ نہیں ہیں'' کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے'' اس کا مفہوم کہیں بلند اور اس سے کہیں وسیع تر ہے۔''عربوں کے ہاں کسی نہایت حسین تناسب اور نادر شاہکار کو(Master Piece) دیکھ کر انسان کے دل میں جو جذبات تحسین، جو ستائش(Appreciation) کے جذبات، بے ساختہ بیدار ہوں اور خود دل سے اٹھیں تو اس والہانہ اظہار کو''حمد'' کہتے ہیں۔حمد کے لئے چند شرائط عائد کرتے تھے۔کہ ''حمد'' کن چیزوں کی جائے اور کس انداز سے کی جائے گی۔پہلی شرط یہ ہے کہ جس حسن ورعنائی اور شاہکار کی ستائش کی جارہی ہے وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہیے۔غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذبات تحسین وستائش پیدا نہیں ہوسکتے۔مثلاً کسی مصوّر کی تعریف اس کی ان تصاویر کے ذریعہ ہی کرسکتے ہیں۔جو مرئی طور پر(Visible) سامنے آجائیں۔قرآن نے ان نمود ونمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے۔جو بغیر تعمیر اور نفع بخش کام کئے اپنی ستائش چاہتے ہیں۔

يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:188) محض کسی نظریہ یا خیال وتصوّر کے لئے حمد'' کا لفظ تو نہیں بولا جائے گا۔جب وہ Idea یا خیال محسوس پیکر میں سامنے آئے گا تو اس وقت اس کی تحسین وستائش کے لئے''حمد'' کا لفظ بولا جائیگا۔اس سے پہلے نہیں۔یہ ہے پہلی شرط۔

دوسری شرط:

جس بات کی یا کام کی حمد کی جارہی ہو۔وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہئے۔بے اختیاری یا میکانکی انداز سے کسی فعل کا سرزد ہوجانا''حمد'' کا مستحق نہیں بناتا۔حتیٰ کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو۔یعنی وہ اسکا اکتسابی (Acquired) نہ ہو۔اس کے لئے بھی''حمد'' کا لفظ نہیں بولا جاتا۔مدح کا لفظ بولا جاتا ہے۔جس طرح رقص طاؤس میں یعنی مور خود مستحق حمد نہیں ہوتا۔بلکہ اس کا خالق مستحقِ حمد ہوتا ہے۔جبکہ طاؤس''مستحق مدح'' ہوتا ہے۔خالق سزاوار حمد ہوتا ہے۔جس نے یہ خصوصیّت طاؤس میں پیدا کی۔

تیسری شرط:

حمد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ''حمد'' کرنے والے کے دل کی آواز سے وہ حمد نکلے۔کسی کی دباؤ میں آ کر وہ ''حمد''،نہیں بلکہ مدح'' کہلائے گا۔حمد میں ملّمع کاری، نمائش، منافقت کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔جذبات تحسین بے ساختہ زبان پر آ جاتے ہیں۔کسی مصور کے نادر شاہکار کو دیکھ کر بے ساختہ تحسین و آفرین کے اچھے جذبات کا اظہار''حمد'' کہلاتا ہے۔

چوتھی شرط:

جس چیز کی''حمد'' ہو رہی ہے اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔محض گمان کی بنا پر حمد نہیں ہو سکتی۔مبہم تصوّرات، دھندلے نقوش، شکوک و تذبذب والے خیالات کبھی''حمد'' کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔یہ تو اہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی۔اس کا سرچشمہ وہ یقین محکم ہوتا ہے جو علی وجہ البصیرت حاصل ہو۔

پانچویں شرط:

جن نفع بخشیوں، کشش انگیز رعنائیوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی حمد کی جا رہی ہو۔ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ درجہ کمال تک پہنچ چکے ہوں۔اور ان کے فوائد محسوس ہوں۔آرٹ برائے آرٹ مضر رساں تو ہو سکتا ہے۔سزاوار حمد نہیں ہو سکتا۔

دنیا کی کسی زبان میں بھی لفظ''حمد'' کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا:

محاورہ عرب کی رو سے لفظ''حمد'' کے اس مفہوم کی روشنی میں آپ بتائیے کہ کیا دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔کیا اردو زبان میں''تعریف'' اور انگریزی زبان''Praise'' اس مفہوم کا حامل ہو سکتا ہے۔قرآن نے تو الحمد'' کہا ہے۔اس پر آل (الف لام) آ گیا تو مفہوم ہوگا کہ ہر قسم کی حمدیت اپنے انتہائی درجہ میں صرف خدا کے لئے ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

الحمد'' کی وسعتوں کا اندازہ تسخیّر کائنات سے ہی ممکن ہے:

خدا کی ذات تو انسان کے قیاس و خیال و گمان سے ماوراء ہے۔اس لئے اس کی ذات کا محض ذہنی تصوّر تو حمد'' کے جذبات پیدا نہیں کر سکتا۔حمد کی تو پہلی شرط ہی یہ ہے کہ وہ شے محسوس طور پر ہو۔جس طرح کسی تصویر کی تحسین سے درحقیقت مصور کی حمد مقصود ہوتی ہے۔اسی طرح اس کی حمد اس کائنات کی نفع بخشیوں کو کام میں لانے سے ہی ہو سکتی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (17:44) کائنات کی ہر شے اس کے خالق کی حمد کی منہ بولتی تصویر ہے۔اور اس لئے مومن کی صفت ان پر غور و فکر سے ہی ممکن ہے اور یہ الْحٰمِدُوْنَ (9:112) کہلاتے ہیں۔تا کہ وہ ان کی تسخیر کر کے ان کو انسان کے مفاد میں استعمال میں لا کر وجہ حمد و تحسین بنائیں۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (3:190-191)

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳﴾ (45:3) لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ ﴿۶﴾ (10:6) خدا نے اس وحی کو بھی مظہر حمدیت قرار دیا ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ﴿۱﴾ (18:1) ان کو تسخیر کرنے کے بعد ان کو وحی کے تابع استعمال کرے جو حمد کا موجب ہو۔ نبی ﷺ نے سب سے پہلے اس حمد کو عام کیا تو اسے احمد کہہ کر پکارا گیا (61:1)۔ اور ان کارناموں کی وجہ سے وہ مقام محمود پر فائز ہوا۔ (17:79) اس انقلاب عظیم کو قائم کیا جو ساری دنیا کے لئے وجۂ حمد وستائش ہو گیا۔ اور ظالموں کی جڑ کٹ گئی۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۵﴾ (6:45) خدا کی ذات جلال و جمال کا امتزاج ہے۔ قوّت وتحسین دونوں کا (64:1) لَهُ الۡمُلۡکُ وَلَهُ الۡحَمۡدُ ۫

اللہ کا قرآنی مفہوم:

ہر مذہب کا خدا دوسرے مذاہب سے مختلف ہے۔ یہ کہنا کہ رام بھی وہی رحیم بھی وہی۔ یہ بے خبری کی دلیل ہے حقیقت سے۔ یہودیوں کا یہودا، عیسائیوں کا فادر، ہندو دھرم کا ایشور، پرماتما، مجوسی یزداں، یہ ایک دوسرے سے مختلف اور قرآن کا اللہ ان سب سے مختلف ہے۔ خدا کا تصوّر وہی صحیح ہے جو قرآن نے خود دیا ہے۔

''اللہ۔ اَلۡ اِلٰهُ'' یعنی کوئی اور نہیں ہوسکتا الٰہ صرف اللہ ہوسکتا ہے۔ اِلٰہٌ کا مادہ ''ا ل ہ'' ہے۔ اس کے متعدد معنی ہیں۔ گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا اسے پناہ دینا۔ دوسرا ''متحیّر ہونا'' بلند مرتبہ اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا'' چوتھا جو بنیادی چیز ہے ''کسی کی غلامی یا محکومیّت اختیار کرنا۔ الٰہ، صاحب اقتدار، صاحب اختیار، قانون دینے والا۔

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ کائنات میں کوئی بغیر اللہ اقتدار نہیں رکھتا۔ یعنی صاحب اقتدار جس کی محکومیّت اختیار کی جائے۔ لہٰذا ان سب کو دعوت دی گئی۔

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ (2:137) اس اللہ پر ایمان لاؤ جس طرح تم لوگ لائے ہو تو تب بھی یہ ہدایت پر ہوں گے۔ احکام وقوانین بھی اس کی طرف سے اور ان احکام کی اطاعت سے مراد اس کی اطاعت ہوگی۔

وَلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (18:26) وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) خارجی اور تمہاری تمدّنی زندگی میں بھی اس کے قوانین ہونے چاہئیں۔ وَهُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ ؕ (43:84)۔ خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں بھی اللہ کے قوانین کی حکمرانی۔

اللہ تعالیٰ کی ذات حمد کی کیوں مستحق ہے؟:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) وہ کیوں اس حمد کا مستحق ہے۔اس لئے کہ وہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) ہے۔یعنی یہ ربوبیّت وہ بنیادی علّت ہے جس کی وجہ سے وہ قابل حمدیت ہے۔

رَبٌّ۔(رب ب)رَبٌّ، بنیادی معنی نشوونما دینا،یعنی کسی چیز کوئی نئی تبدیلیوں سے اس طرح گزارنا کہ وہ بتدریج نشوونما پاتی ہوئی نقطہ آغاز سے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔یہ طریق ربوبیّت اور ایسا کرنے والے کو رب کہا جاتا ہے۔اس نشوونما میں اصلاح، درستگی اور استحکام کے پہلو بھی مضمر ہوتے ہیں۔چونکہ نشوونما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے۔اَلرُّبَّةُ،ان پودوں کو کہا جاتا ہے جن کی سرسبزی اور تازگی سردی، گرمی ہر موسم میں یکساں رہتی ہے تو اس سے رَبٌّ کے معنی ''کسی شے کو نقطہ آغاز سے نشوونما دیتے ہوئے پایہ تکمیل تک پہنچانے والا، اصلاح کر کے آگے بڑھانے والا اس انداز سے کہ اس شے کی تازگی اور شادابی موسم کے تغیّرات سے بھی متاثر نہ ہو۔اور جو کچھ اس نے بننا ہے بطریق احسن بن جائے۔

یہ لامحدود کائنات عدم سے وجود میں لاکر اس میں قانون علّت ومعلّول جاری ہے۔طبعی سائنس ان (Cause and Effect) کی کڑیوں کو دریافت کرنے کا نام ہے۔اور یہ سائنس دان محو حیرت ہیں کہ یہ کس طرح وجود میں آگئی؟ یہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (35:1) اور بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:101) کی مرہون منت ہے۔علّت ومعلّول سے پہلے جو مقام ہے وہ عالم امر ہے جبکہ محسوس شکل میں تخلیق عالم خلق ہے۔وہ الْبَارِئُ (59:24) ہے یعنی حشو وزوائد کو الگ کرنے والا۔پھر الْمُصَوِّرُ (59:24) پھر نقشہ کے مطابق پیکر تصویر کا بنا دینے والا ہے۔اسی طرح انسانی زندگی کا آغاز ایک لائف سیل سے کر کے اسے مختلف گردشیں دینے کے بعد اس مقام تک سے آیا ہے۔انسان کہتے ہیں یہ ہے ربوبیّت کا مظہر اور مرنے کے بعد مزید ارتقائی منازل میں سے اس زندگی نے گزرنا ہے۔کائنات میں ربوبیّت کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔انسان کو حیوانات سے متمیّز کر کے ذات عطا کر دی۔غیر نشوونما یافتہ صورت میں اب ''رَبّ'' کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور انگریزی ترجمہ ''لارڈ'' کیا یہ قرآنی مفہوم ادا کرسکتا ہے؟ یہ تو بالکل الٹ ہو جاتا ہے۔یہ سارے تراجم اور الفاظ عیسائیّت کے تصوّرات ہیں۔اللہ کے لئے God یا فادر ترجمہ کرنے سے تو مفہوم سارا الٹ جائے گا۔قرآن کے تمام تصوّرات جب بھی آپ ان کو انگریزی زبان میں منتقل کریں گے۔تو گویا پھول کی پتی کو مسل کر رکھ دیں گے۔

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1): ربوبیّت بھی عالمینی ہے۔عَالَمِيْنَ کا مادہ (ع ل م) جاننا، پہچاننا، عَالِمٌ، صاحبِ علم، کسی بات کا جاننے والا، پہچاننے والا، جب عَالَمٌ'' ہو تو وہ چیز جس کے ذریعہ کسی کی پہچان ہو۔یعنی علامت، نشانی، جھنڈا (علم)۔

خدا کی ذات انسانی ادراک میں نہیں آسکتی۔لیکن اس کائنات کا وجود اس امر کی علامت ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔لہٰذا یہ محسوس کائنات، خدائے غیر مرئی، غیر محسوس کو پہچاننے کا ذریعہ یا علامت کہلائے گی۔قرآن نے کائنات کو عَالَمٌ کہا

ہے۔یعنی یہ کسی کا ذریعہ ہے کسی کے پہچاننے کا۔اور خود انسان کے اپنے مقام کے پہچاننے کا اور آگے اس امر کے پہچاننے کا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے۔جس کی عظیم القدر سکیم کے تابع یہ سارا نظام سرگرم عمل ہے۔اس لئے یہ کائنات مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار پاتی ہے۔یہ تو Expand ہوتی جارہی ہے۔

دیگر کروں میں بھی زندگی موجود ہے۔اگر عَالَمِیْنَ کا لفظ سمٹا کر صرف اس دنیا کے انسانوں تک محدود کردیں تو اس سے مراد عالمگیر انسانیت یا اقوام عالم ہوجائے گا۔تو اس لحاظ سے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ① (1:1) سے مراد ''تمام انسانوں کی نشوونما کا ذمہ دار''۔اس طرح یہ اُمت بھی ساری عالمگیر انسانیت کو نشوونما دینے کا نظام قائم کرے گی۔

وَمَامِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (11:6) یہ امت زیادہ سے وسائل مہیا کر کے تقسیم اس انداز سے کرے گی کہ کوئی محروم نہ رہ جائے۔یہ ہے وجہ مستحق حمد باری تعالیٰ کی صرف ربوبیّت عالمینی کی وجہ سے۔آگے رحمن ورحیم ہے۔دونوں کا مادہ ''رح م'' ہے۔رحم مادر کے لئے بھی یہی لفظ ہے۔ذرا اس زبان کی گہرائیوں وسعتوں اور لطافتوں کا اندازہ لگایئے۔ایک لائف سیل غیر مرئی رحم مادر میں جس میں ایک انسان بننے کی تمام مضمر صلاحیتیں موجود ہیں۔اب اس کی نشوونمایوں ہورہی ہے کہ نقطہ آغاز سے تکمیل تک درجہ بدرجہ پہنچ جائے۔سارا سامان نشوونما پہلے دن سے آخری وقت تک بچہ کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق ملتا ہے۔اور اس میں اس قدر لوچ اور لچک کہ بچہ جوں جوں بڑھتا اور نشوونما پارہا ہے تو اس خول میں بھی وسعت اور لچک پیدا ہوتی جارہی ہے۔اتنا نرم اور گداز کہ بچہ کو کروٹ تک لینے میں بھی کسی قسم کی کوئی زحمت رکاوٹ نہیں ہوتی۔یہ ہے انداز بچہ کی نشوونما کا اور بلا مزد و معاوضہ،کوئی صلہ دینا نہیں پڑتا۔اب نشوونما کے اس تصوّر کو ذہن میں رکھیئے۔کیا ان کے تراجم مہربان،بہت مہربان اور انگریزی تراجم Merciful Beneficiant اس کا مفہوم ادا کرسکتے ہیں؟۔رَحِیْمٌ، فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے یعنی بتدریج مسلسل نشوونما ہوتے چلے جانا جبکہ رحمن وزن پر ہے فَعْلَانُ کے۔اس باب کی خصوصیّت کہ اس صفت کا شدت سے ہنگامی طور پر ایک کو پروگریسو اور دوسرے کو ایمرجنٹ ایولوشن کہا جاتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ کے سلسلہ میں مغرب کی ریسرچ:

مغرب کے محققین کے مطابق وہ ایک شے ایک ہی جست میں مختلف کڑیاں پھاند کر ایک نئی شکل اختیار کرلیتی ہے۔اسے فجائی ارتقا (Emergent Evolution) کہتے ہیں۔اس نظریہ کا امام C.L.Morgan ہے۔لکھتا ہے کہ یہ فجائی ارتقاء ہے؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں؟ تو ان کی خصوصیات کے متعلق اتنا ہے کہ ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ان کی خصوصیّات کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔اس لئے اسے ہم ایمرجنٹ ایولوشن کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔اسی باب میں Viscount Samuel کا کہنا

ہے کہ علّت ومعلّول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں۔جنہیں صرف دست قدرت ہی ظہور میں لاسکتا ہے۔کتاب کا نام(Belief of action) ہے۔

یہ نظریہ صرف عصر حاضر کا نہیں ہے بلکہ ہمارے متقدمین حکماء میں بھی یہ نظریہ ملتا ہے۔ابن مسکویہ،ابوعلی احمد(421ھ) میں ایک سائنسدان اپنے مشہور رسالہ ''الفوز الاصغر'' میں رقم طراز ہے۔نباتات کے تدریجی ارتقائی مراحل کا ذکر کرکے لکھتا ہے۔اب یہی تدریجی ترقی کرکے خرما کے درخت میں بغایت شرف ظہور کرتا ہے اور نباتات کو مرتبہ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے۔اگر اس مرتبہ سے ذرا آگے بڑھے تو حد نباتاتی سے نکل جائے اور صورت حیوانی اختیار کرلے۔خرما میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور زیادہ ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہوجاتی ہے۔ایک تو مثل حیوان سے اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں۔اور بارآور ہونے کے لئے نر کو مادہ سے ملانا ضرور ہے۔اس ملاپ کو ''تلقیح'' کہتے ہیں۔جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے۔پھر خرما کے درخت میں علاوہ درخت اور جڑ کے رگوں کے ایک مثل دماغ حیوانات ہوتی ہے۔یہ اس کے لئے ایسی ضروری ہے کہ اگر کوئی آفت لاحق ہوجائے تو درخت خرما ضائع ہوجاتا ہے۔انہوں نے اس فجائی ارتقاء پر بھی بحث کی ہے۔اس کی رو سے پیدا ہونے والے خلا کو جست یا سَفراً'' کہتے ہیں۔یعنی ایک تو ارتقاء کا سلسلہ مسلسل چلا آتا ہے۔اس میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ جو انتظام کی کڑیاں ہیں۔وہ چیخ اٹھتی ہیں۔اور سلسلہ ارتقاء وہ جست پھاند کر ہنگامی طور پر آگے کی منزل میں جا پہنچتا ہے۔

انسانی تخلیق اور رحمانیّت اور رحمیّت :

سورۃ المومنون میں ہے کہ تخلیق انسانی کی ابتداء جامد مادہ سے ہوئی پھر ہوتے ہوتے نطفہ کے ذریعہ رحم مادر میں حمل قرار پایا۔پھر جونک کی شکل،پھر گوشت کا لوتھڑا،ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھرا اور اس پر گوشت کی تہہ چڑھادی گئی۔یہ طریق تولید اور نشوونما تدریج حیوانوں اور انسانوں میں مشترک چلا آرہا ہے۔یہ ہے صفت رحمیّت۔اس کے بعد انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق جو سابقہ کڑیوں کے ارتقاء کا طبعی نتیجہ نہیں ہوتا وہاں یک لخت ایک تبدیلی آتی ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ (23:14)اب ایک نئی قسم کی مخلوق بنا دیا جو فجائی ارتقاء تھا۔اسے ذات عطا کردی جو اختیار وارادہ کی بنیادی خصوصیّت کی حامل ہے۔تا کہ یہ مزید نشوونما ارتقائی منازل طے کرسکے۔یہ ہے رحمانیّت جبکہ بتدریج نشوونما کے لئے ''رحیم'' کا لفظ آیا تھا۔اب اس ذات کی نشوونما تو اقدار سے ہوسکتی ہے۔تو اقدار دیدیئے كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (6:54)اس رحمت میں طبعی نشوونما کے ساتھ ذات کی نشوونما کا سامان بھی شامل ہے۔صفت رحمانیّت کا اور گوشہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ؕ (96:5)اب اس میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی جو انسان مشاہدہ،تجربہ مطالعہ سے بتدریج حاصل کرتا ہے۔یہ ہے رحمیّت۔اب وحی کا عطا کرنا اَلرَّحْمٰنُ ۝۱ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝۲ (55:1-2)۔یہ یک لخت طور پر رسول ﷺ کو دیا گیا۔یہ ہے رحمانیت۔وحی کو رحمت کہا گیا ہے۔

صفت رحیمیّت میں ’’رحم‘‘ کا تصوّر:

خدا کی صفت رحیمیّت میں ’’رحم‘‘ کا تصوّر بھی موجود ہے مگر قرآن کے مفہوم اور رائج مفہوم میں فرق ہے۔اس تصوّر کو عیسائیّت نے عام کیا۔اسی سے بہت سے غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں جن کا شکار مسلمان بھی ہوگئے۔ان کے ہاں یہ تصوّف کے ذریعہ پھیلا ہے۔عیسائیّت کا بنیادی نظریہ کہ ہر بچہ اپنے ماں باپ (آدم وحوا) کے گناہ کی آلائشیں لیکر پیدا ہوتا ہے۔اسے اوریجنل Sin‘‘ کہتے ہیں۔اس آلائیش سے پاک ہونا ممکن نہیں۔نجات کا مدار اب انسان کے اعمال پر نہیں بلکہ خدا کے رحم پر ہے۔اور یہ رحم صرف مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے سے ہوتا ہے۔اس نظریہ کو عام کیا گیا۔یہ ہے وہ عیسائی عقیدہ کہ خدا رحم اور محبت کا مجسّمہ ہے۔اسی سے قرآن کے انگریزی تراجم میں رحمن اور رحیم کے لئے Benificient اور Merciful کے الفاظ آتے ہیں۔یعنی رحم کرنے والا ،ترس کرنے والا۔جبکہ قرآنی تعلیمات کا تصوّر مکافات عمل پر ہے۔(Law of Requitial) ہر انفرادی یا اجتماعی عمل کا نتیجہ اس کے قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔مثلاً سنکیا کا نتیجہ ہلاکت اور صاف پانی ممد حیات ہے۔یہی قانون طبعی کائنات میں اور جو طبعی زندگی سے آگے بڑھ کر انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ہر غلط کام کا نتیجہ تخریبی اور اچھے کام کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے خدا کا عدل کا نظام جو غیر متبدّل اور اٹل ہے۔ظاہر ہے عدل میں تو رحم کا کوئی تصوّر نہیں آسکتا اگر رحم کی بنیاد پر اس میں کچھ کیا جائے گا تو یہ عدل کے منافی ہوگا۔

عدل کے ساتھ رحم کا قرآنی تصوّر:

خدا کی صفتِ رحیمیّت میں عدل کا تصوّر بھی شامل ہے۔تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عدل اور رحم دو متضاد (بظاہر) صفات میں مطابقت کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ رحم کے قرآنی مفہوم سے یہ تضاد باقی نہیں رہتا۔اس میں عدل بھی رہتا ہے اور رحم بھی۔مثلاً آگ میں انگلی ڈالی تو وہ جل گئی اور شدت سے تکلیف ہونے لگی۔یہ ہے قانون عدل کی رو سے،جس میں رحم کا کوئی شائبہ نہیں۔جو بھی انگلی آگ میں ڈالے گا جلے گی اور شدید تکلیف ہوگی۔لیکن جس نے یہ قانون بنایا ہے اس نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کردی ہیں جن کے استعمال سے یہ تکلیف رفع اور انگلی کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔یہ سامان مدافعت یا علاج کی تخلیق خدا کی رحمت یا اس کا رحم ہے۔یہ قانون عدل ہر انسان، ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے ہے اور دوسرا قانون رحمت (تخریبی عمل کا ازالہ بذریعہ علاج) یہ بھی یکساں طور پر ہر فرد، ہر زمانہ اور ہر قوم پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے۔ان میں اس قانون کے مقرر کرنے والے کی صفتِ رحمانیّت کارفرما ہے۔

توبہ، یہودیوں اور عیسائیوں کے عقائد:

غلط راستے سے واپس آکر اس دوراہے پر آجانا جہاں سے چلا تھا۔یہ صحیح دوراہے پر واپس مڑآنا توبہ کہلاتا ہے۔اب صرف واپسی تو ازالہ نہیں کرسکتی جب تک کہ آپ اس دوراہے سے صحیح راستہ پر گامزن نہیں ہونگے۔اب صحیح راستہ پر چلنا اور

منزل کی طرف رواں دواں ہوجانا ''یہ عمل صالح'' کہلاتا ہے۔اس سے انسانی لغزشوں کی تلافی ہوجاتی ہے۔اس طرح کی بازآفرینی اور تلافیٔ مافات کا قانون بنادینا یہ خدا کی رحمت کہلاتا ہے۔

یہودیوں کے ہاں توبہ کا تصوّر ہی نہیں ہے۔ان کے ہاں لغزش ناقابل تلافی ہے۔اور اسی طرح عیسائیت میں بھی اعمال کے ذریعہ گناہ کی آلائیش دور نہیں ہوسکتی۔وہ مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے سے ہی ہوسکتی ہے۔ہندودھرم میں انسان اپنے سابقہ اعمال کے نتیجہ میں جس جنم میں آ گیا، چوہا، کتا، وغیرہ۔موجودہ جنم میں اسے بدلا ہی نہیں جا سکتا۔

قرآن نے بازآفرینی سے مایوسی کو کفر قرار دیا ہے۔یہ تمام مذاہب اس کی اس رحمت سے انکار کرتے ہیں۔ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴿۸۷﴾ (12:87) رسول ﷺ سے کہا گیا قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴿۵۳﴾وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ (39:53-54) چار الفاظ میں لغزشوں کا ازالہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ (11:114)

ہماری تعلیم ،نظریات اور زندگی پر عیسائیت کے عقائد کے اثرات :

ہمارے ہاں بھی عیسائیّت کا رحم کا تصوّر آیا۔کہ عدل واعمال سے کچھ نہیں ہوتا۔سب کچھ خدا کے فضل سے ہوتا ہے۔ انسان جو جی میں آئے کرے کچھ نہیں ہوتا۔عدل اور رحم کو کس قدر غلط معنی پہنا دیئے گئے ہیں۔ ہر جگہ ہمارے ہاں رحم کا یہ تصوّر ہے۔ ہر طرف اس سے بخشش کی التجا ہے۔ ہر کام اس کی رحمت سے ہوتا ہے۔انسان اپنی محنت سے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ تو قوم کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔حالانکہ رحم کا تصوّر تو ایک قانون کا تصوّر ہے۔اس قانون پر عمل کریں تو نقصان کا ازالہ ہوجائے گا۔اور مزید بازآفرینی کے امکانات بھی مرتب ہوجائیں گے۔یہ ہے رحم کا تصوّر۔اب آیئے ان آیات پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴿۱﴾الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴿۲﴾ (1:1-2) ساری حمدیت اس ذات کے لئے جو ہر طرح کے اقتدار کا مالک ہے۔اس کا اقتدار تخریب کے لئے نہیں بلکہ ربوبیّت کے لئے ہے۔ربوبیّت کسی قوم کی نہیں بلکہ تمام عالم انسانی کی۔اس میں رحمانیّت ہے۔رحیمیّت ہے۔رحیمیّت بلا مزد و معاوضہ،ضرورت کے مطابق، ہر منزل پر۔نہایت لطافت اور محبت سے ضروریات پوری ہوتی ہیں۔اگر کبھی ہنگامی ضرورت پڑے تو فوری ضرورت کے لئے صفت رحمانیّت کا ظہور ہوجاتا ہے۔جس کا ظہور خدا رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1 : 1) قرآن ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۲۷﴾ (81 : 27) اور رسول رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۷﴾(21:107) ہے۔اب قانون مکافات اٹل قانون ہے۔یہ ہیں اگلے الفاظ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴿۳﴾(1:3) اس سے پہلے صفات ربوبیّت، رحمانیّت، رحیمیّت آ چکی ہیں۔بنیادنشوونما دینے کی ہے۔کسی شے کے نقطۂ آغاز سے اس کے تکمیل تک بتدریج پہنچائے چلے جانا اور عندالضرورت ایمرجنسی کے طور پر فجائی طور پر، ہنگامی طور پر سامان مہیا کرنا۔اب یہ نشوونما وہی کرسکتا ہے جس کا سامان نشوونما پر کنٹرول ہو۔اقتدار ہو، اتھارٹی ہو۔

مَالِكِ کا مفہوم:

مَلَكَ (م پر تین حرکات) مالک کے ساتھ ملکیت اور ملکوت بھی ہے۔ بنیادی معنی ''کسی چیز پر قادر اور متولی ہوجانا۔اوراس پر قبضہ ضروری ہے۔ دوسرے معنی ''اختیار اور ارادہ یا اتھارٹی۔ جب اس اختیار وارادہ کا لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو وہ انسانوں کی ملک یا ملکیت سے الگ ہوگا۔اور تیسری خصوصیّت وہ بنیاد، وہ سہارا جس پر کوئی عمارت استوار ہو۔خدا اس کائنات کا مالک ہے۔لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57 : 2) مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (7:185) کائنات کی ملکیّت ملکوت، ملک خدا کے لئے ہے۔یعنی اس پر پورا اختیار وارادہ اسی کا ہے۔ یہ اسی کے قبضہ کے اندر ہے۔یعنی اس کی اتھارٹی، اس کا اختیار وارادہ اس لئے ہے کہ وہ اشیائے کائنات کی زندگی اورنشوونما کا سہارا بننے کے لئے ہے۔عربوں کے ہاں ''مَلَاك'' گارے کو کہتے تھے۔یعنیCementing Effect جس سے اینٹ اور پتھر آپس میں معاملہ کی درستگی ،اس کا تکمیل تک پہنچ جانا اور دو چیزوں کے درمیان تقویت کا موجب بن جانا تو لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:2) سے مراد، کائنات میں اتھارٹی اس کی ہے۔اس میں بنیادی مفہوم بھی مضمر ہوگا کہ یہ اقتدار تمام اشیاء کی زندگی اورنشوونما کا سہارا ہے۔جس سے اجزائے کائنات آپس میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ایک وحدت بن گئے ہیں۔اس امتزاج سے یہ کائنات کا نظام اس خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ یہ کشش باہمی اسی صفت سے ہے۔اس سے وہ نشوونما دیکر ارتقائی منازل طے کرا کر تکمیل تک پہنچا تا ہے۔

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں!

یہ ساری کائنات ایک نا قابلِ تقسیم وحدت ہے۔اس لئے اسے Universe کہتے ہیں۔ یہ وحدت خدا کی صفتِ مالکیّت ہے۔ یہ اتھارٹی سامان نشوونما بہم پہنچانا اوراس وحدت کو قائم رکھنا ہے۔

يَوْمُ : دن، دور، زمانہ، مرحلہ، پیریڈ، Age، Stage۔یعنی وہ دور، وہ مرحلہ،جس میں یہ دین کا نظام قائم ہوگا۔یعنی اس دور میں اتھارٹی اقتدار خدا کے لئے ہوگا کہ وہ اشیائے نشوونما اور ارتقاء کے ذرائع پر کنٹرول رکھے تا کہ تکمیل ہوسکے وحدت پیدا کردے۔

اَلدِّيْنُ کا مفہوم:

یہ بڑا وسیع المعنی ہے۔غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم ونسق، فیصلہ، جزاوسزا، ٹھوس نتیجہ، مکافات عمل وغیرہ۔ایک طرف تو یہ معنی ہوئے۔ دوسری طرف کتاب، محکومیّت۔ جب خدا کی طرف نسبت ہوگی تو پہلے معنی ہونگے اور جب انسانوں کی طرف تو متضاد معنی یعنی خدا کے احکامات کی فرماں پذیری، خدا کی اطاعت ومحکومیّت، دین خداوندی کی اطاعت، محکومیّت یا فرماں پذیری اور جب خدااور انسان دونوں کی طرف جامع طور پر ہوگی تو معنی ہونگے قوانین خداوندی کی

اطاعت جس کا نتیجہ متعیّن قوانین کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔یعنی جزاوسزااور مکافات عمل بھی ہیں۔

دین کے قیام کے لئے آزادمملکت کی ضرورت:

دین وہ نظام جس کو قوانین خداوندی کے مطابق تشکیل کیا جائے جس میں ہر فرد ان قوانین کی اطاعت کرے۔تو اس عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر عمل کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب ہوتا چلا جائے گا۔اب اس کے لئے آزادمملکت کی ضرورت ہے۔یہ مملکت قوّت کے زور پر دوسروں سے چھینی نہیں جاتی۔بلکہ یہ نتیجہ ہوتی ہے ایمان اوراعمال صالح کا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) یہ استخلاف اس لئے ہے کہ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (24:55) اس کا مقصد کیا ہے يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ (24:55) کسی اور کے قوانین کی شرکت اس میں نہیں ہوگی۔وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۵۵ (24:55) اس قدر وضاحت کے بعد بھی جس نے انکار کیا تو وہ صحیح راستہ سے نکل گیا۔اب مملکت کے قیام کے بعد اس کے اہم گوشے ایتائے زکوٰۃ اوراقامت الصلوٰۃ ممکن ہوسکے گا۔وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝۵۶ (24:56) جہاں یہ نظام نہ ہوتو وہاں تو ایتائے زکوٰۃ اوراقامت صلوٰۃ تو ہو نہیں سکتے۔دوسروں کی محکومیّت میں بھی اور خود اپنی مملکت میں بھی۔اگر الدین کا نظام نہ ہوتو وہاں بھی ایتائے زکوٰۃ اوراقامت صلوٰۃ نہیں ہوسکتی۔سورۃ الحجّ میں تو شرط ہی یہ بتائی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۝۴۱ (22:41) اور قوانین صرف خدا کے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) اللہ سے مراد کتاب خداوندی وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝۴۴ (5:44) رسول ﷺ کو حکم ہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) یہ ہے الدِّيْن اس کی اطاعت کرنے والے مسلم ہیں۔وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۝۱۷ (82:17)۔اس میں حکمرانی صرف قرآن کی ہوگی۔

سازش:

ملوکیّت نے آکر مذہبی امور کو پیشوائیّت کے ہاتھ میں دیدیا اور دنیاوی امور اپنے ہاتھ میں لے لئے۔یہ ہے سیکولر نظام جس میں حکومت مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔ابھی تک یہی اسلام چلا آرہا ہے۔صدر اوّل کے بعد، نماز وروزہ وحجّ ہر حکومت کے تابع ہوسکتا ہے۔اس لئے اسلام کا منشا پورا ہوجاتا ہے۔باقی رہا خدا کا اقتدار تو اس کا دائرہ آخرت کی زندگی ہے اس دنیا کی نہیں۔اب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝۳ (1:3) کا ترجمہ ''مالک روز جزاء'' کیا جاتا ہے۔یعنی قیامت کے دن، اس دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝۳ (1:3) ''وہ زمانہ جب اقتدار اور اختیار صرف خدا کو

حاصل ہوگا‘‘۔ لا الہ الا اللہ۔ کوئی صاحب اقتدار نہیں سوائے اللہ کے یہ نظری حکم کا عملی مشہود مسلمانوں کی آزاد مملکت جس میں اقتدار و اختیار صرف خدا کا یعنی اس کی کتاب قرآن کا ہوگا۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ (1:4):

اس آیت سے قبل اس عظیم سورہ کے پہلے کچھ الفاظ جو عمدگی سے دین کے پورے نظام کو مربوط شکل میں سامنے لاتے چلے گئے ہیں۔ یعنی حمدیّت اپنی مکمل شکل میں تماماً اور اکملاً صرف اللہ کے لیے ہے۔ جو مکمل ترین اقتدار کا مالک ہے۔ اس کی حمدیت اس لئے ہے کہ وہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ① (1:1) ہے۔ اور ایسی نشوونما دینے والا ہر چیز کو اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج ارتقائی منازل طے کر کے نقطۂ تکمیل تک جا پہنچانا۔ نشوونما کا یک پروگرام تو رحیمیّت ہے یہ تو عام پروگرام ہے۔ جس کے تحت نشوونما مسلسل، تدریجاً ہوتی جاتی ہے۔ لیکن دوسرا گوشہ رحمانیّت کا جو عندالضرورت ہنگامی طور پر سامان نشوونما کا پہم پہنچا تا ہے۔ لیکن یہ سامان نشوونما تو وہی پہنچا سکتا ہے جس کو اس سامان پر مکمل دسترس اور کنٹرول ہو۔ اگر یہ سامان نشوونما کسی اور کے قبضہ میں ہوں تو پھر یہ نشوونما رک جائے گی۔ اس لئے مالک یوم الدّین ہے۔ اقتدار اور کنٹرول اس کا ہے۔ یہ ہے وہ اللہ اور یہ ہے وہ پروگرام جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ تو اب اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے۔ اس پر ایمان لے آئے ہو۔ کہ دراصل یہی نظام ہے جو نوع انسانی کو اس کی درخشندہ منزل سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ جس میں ہر فرد کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے گی اور اس درجہ تک کہ اگلی زندگی کی ارتقائی منازل بھی طے ہوتی جائینگی۔ تو پھر علی وجہ البصیرت بتاؤ کہ تم کس کی محکومیّت اختیار کرو گے۔ اگر غور کر کے دل و دماغ کی رضامندی سے اس کی صداقت کا قائل ہو گیا ہے تو اس کی زبان سے اس کے سوا کچھ اور آ ہی نہیں سکتا۔ کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ۔۔۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) کی تفسیر:

اِیَّاكَ: تیری اور صرف تیری۔ محکومیّت اختیار کریں گے۔ کوئی اور اس کے شایان شان ہے ہی نہیں‘ یہ ہے عبد مومن کا اقرار کہ میں ان قوانین کے تحت زندگی بسر کروں گا۔ عہد کر کے پروگرام بناتا ہے۔ کتنا عظیم پروگرام ہے۔ جو دین کا پروگرام تھا اور مذہب میں آ کر پرستش ہو گیا۔

عبادت کا مادہ ’’ع ب د‘‘ ہے۔ پرستش کا تو تصوّر ہی قرآن میں نہیں ہے۔ اسی سے عَبْدٌ‘‘ ہے یعنی غلام محکوم، اطاعت گزار، یَعْبُدُ، اطاعت۔ محکومیّت اختیار کرنا۔ سورۃ کہف میں محکومیّت اور عبادت کے الفاظ مرادف معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۲۶ (18:26) جو زندگی خوشگوار بنانا چاہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وَّلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۱۱۰ (18:110)۔ اب ایک جگہ حکمہ اور دوسری جگہ اس کے لئے عبادۃ آیا ہے۔ تو عبادت سے مراد حکم، حکومت۔ اب اللہ کی محکومیّت کوئی ڈکٹیٹر کی حکومت نہیں بلکہ قوانین کی حکومت ہے۔’’Rule Of Law‘‘ وہ آئین کی

پاسداری ہے۔انسانوں کی دنیا میں بھی اگر اتنا ہی کہہ دیا جائے کہ اس ملک میں تو قانون کی حکمرانی ہے تو وہ اس نظام کو باعث رحمت قرار دیتے ہیں۔سب بہترین نظام اس کو قرار دیا جاتا ہے جس میں قوانین کی حکمرانی ہو۔ملوکیّت میں تو ہر آن قانون بدلتے رہتے ہیں۔انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین بھی بدلتے رہتے ہیں۔آج ایک قانون بنایا اور 51 فیصد کی مجارٹی سے اس کو بدل دیا دوسرے ہی دن۔جبکہ وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ (6:115) لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115)۔ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ان کو پرکھ لو تو معلوم ہوجائے گا کہ زندگی کتنی خوشگوار ہوجائے گی۔کتنا امن اور اطمینان نصیب ہوجائے گا۔کہ ان قوانین کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔دوسری طرف یہ اعلان اِيَّاكَ نَعۡبُدُ (1:4)۔ہم صرف اور صرف تیری اطاعت کریں گے۔کسی اور کی نہیں۔اس عبدیّت میں ایک اور نقطہ بھی مضمر ہے۔عربی میں تَعۡبِيدٌ کے معنیٰ ''اونٹ یا گھوڑے کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنادینا''یعنی وحشی جانور کو اس طرح سدھانا کہ وہ اپنی قوّتوں اور صلاحیتوں کو خاص قاعدے اور قوانین کے تحت صرف کرے''اگر ان قوّتوں کا استعمال سرکش جذبات یعنی اپنے مفادات کیلئے کرے گا تو نتیجہ فتنہ وفساد ہوگا۔برعکس اس کے کہ اپنی صلاحیتوں کو مقرر کردہ قوانین الٰہی کے تحت صرف کرے تو نتیجہ عالمگیر ربوبیّت اور اس کی اپنی ذات کی تعمیر ہے۔ساحل کے اندر بہنے والا پانی تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے۔جبکہ ساحلوں کو توڑ کر سیلاب بن جاتا ہے تو تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔تو ایسی تربیّت کرنا کہ قانون کے اندر رہ کر سرگرم عمل ہو تو ان اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔دین کا تمکّن اطمینان قلب اور آسودگی دیتا ہے(24:55) نزول قرآن سے قبل ہر جگہ، ہر سطح پر عبادت کا مفہوم پرستش ہی تھا۔مذہب میں تو خدا کی محکومیّت کا تصوّر ہی نہیں ہوتا۔صرف پرستش کا تصوّر ہوتا ہے۔اس اعتبار سے اہل عرب مشرکین اور اہل مذاہب عبادت کے اس لفظ کا مفہوم پرستش لیتے تھے۔یہودی، عیسائی، مجوسی ان سب کے ہاں پرستش کا تصوّر تھا۔اور قریش میں بھی ان کی دیکھا دیکھی اس لفظ کا تصوّر پرستش ہوگیا تھا۔وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔اس لئے قرآن میں جہاں ان کی نسبت ہوگی تو اس سے مفہوم پرستش اور جب خدا کی طرف، یا مومنین کی طرف نسبت ہوگی تو اس سے مراد محکومیّت اختیار کرنا ہوگا۔

محکومیّت کی بجائے پرستش کے اس تصوّر نے ہماری نفسیات تک کو تبدیل کردیا ہے:

مذہب میں خدا کے متعلق یہ تصوّر آتا ہے کہ یہ کرو، یہ نہ کرو، یہ سارا کچھ جو خدا کا اپنا کوئی پروگرام ہے۔ہمارا تو اس میں کچھ حصّہ ہی نہیں ہے۔اور ہم جو کریں گے اس کا صلہ دے گا۔کوئی معاوضہ ملے گا۔اگر نہیں کریں گے تو سزا دے گا اور کھال ادھیڑ دے گا۔جس طرح مکان بنوانے کے لئے معماروں کو ٹھیکہ دے دیا گیا کہ مکمل کرو تو یہ معاوضہ ملے گا۔اس میں ان کی کوئی غرض وغایت نہیں ہوتی۔ان کا انٹرسٹ صرف وہ معاوضہ ہے۔مذہب میں پوجا پاٹ سے انسان خدا کو خوش کرتا ہے۔اس میں اس معمار کی طرح اس کی کوئی اپنی غرض نہیں ہوتی بس اس کا صلہ، معاوضہ مل جائے گا۔یعنی ان کاموں سے ان کا کچھ نہیں سنورتا بلکہ معاذ اللہ خدا کا کچھ سنورتا ہے۔یہ ہے خدا کا گھڑا ہوا تصوّر! جبکہ دین میں تو کہا گیا کہ اگر اس نہج پر زندگی

گزاروگےتو اس سے خدا کا کچھ نہیں سنورتا کہ اس کا کوئی کام رکا ہوا ہے۔ یہ تو سارا تمہارے بھلے کے لئے ہے۔ جس طرح ڈاکٹر ہدایات مریض کے بھلے کے لئے دیتا ہے اگر وہ ان کے مطابق عمل کرے تو اس کی صحت ٹھیک ہوجائے گی۔ یہ تمام ہدایات ہیں۔(Directives) ہیں۔ اس میں ہماری کوئی غرض نہیں ہے۔

شکر کا مفہوم انسانی صلاحیتوں کو قوانین خداوندی کے تابع صرف کرنا:

شکر سے مراد اپنی صلاحیتوں کو قوانین خداوندی کے تحت یوں استعمال کرنا کہ ان کے بھرپور نتائج پیدا ہوسکیں۔ اللہ کا حکم لقمان کو دیا جارہا ہے کہ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ (31:12) متعیّنہ مقصد کے لئے شکر کرو۔

وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑫ (31:12) تو خدا کی ذات ان چیزوں سے مستغنی ہے۔ وہ توحمد وستائش چلا آرہا تھا اس وقت بھی جب یہ کائنات نہ تھی اور نہ تم انسان موجود تھے۔ تو تم موجود نہیں تھے تو اس وقت اس کے سارے کام رکے رہتے۔ قطعاً نہیں۔ وہ تم سے بھی مستغنی ہے۔ ان ہدایات سے تو تمہاری زندگی سنورنی ہے۔ اس ضمن میں بہت سی آیات ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ (6:104) اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ⑥ (29:6)

> اگر اس کے سامنے سر جھکا دیا جائے اس میں خدا کا کوئی غرض یا فائدہ نہیں ہے۔ اس میں تو انسانی ذات تا حد بشریّت صفاتِ خداوندی کا عکس بنتی جاتی ہے۔ یہ اطاعت تو ذات کو سنوارنے اور نشوونما دینے کے لئے ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمران ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

نہ وہ نظام ہے، نہ وہ پروگرام، یہ تمام نماز وروزہ وقربانی وحجّ۔ ان چیزوں کو ہم اس شکل میں قائم رکھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ ہم دین کے نظام پر چل رہے ہیں یہ سارے ایک پروگرام کے اجزاء تھے۔ یہ مقصود بالذّات نہیں تھے۔ یہ تو اقدار کے تحت اخلاق حسنہ پیدا کر کے بلند مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھے سرکش گھوڑے کو سدھانے کے بعد اس کی صلاحیتوں کو ایک مقصد کے لئے استعمال کرنا تھا۔ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④ (1:4)

قرآن میں ہر لفظ کا انتخاب بذات خود ایک ایسا اعجاز ہے کہ اس کا ترجمہ ممکن نہیں:

اب ذات کی نشوونما سے کیا ہوگا۔ ایک معتدل اور متوازن شخصیت بن جائے گی۔(Balanced Personality) نَسْتَعِيْنُ ④ (1:4)۔ مادہ ''ع ون'' ہے۔ عَوَانٌ۔ وہ جانور یا انسان جو بھرپور شباب کے عالم میں ہو۔ اس کی توانیاں بھرپور

نشوونما پا چکی ہوں۔اس شرط کے ساتھ کہ اس میں پورا پورا اعتدال ہو۔لہٰذا اِسۡتِعَانٌ سے مراد' اپنی ذات کے لئے پوری پوری نشوونما اور اعتدال کی آرزو کرنا۔اس مقصد کے لئے کسی کی مدد طلب کرنا' 'اسی نہج سے اللہ کو اَلۡمُسۡتَعَانُ (21:112) کہتے ہیں۔اس مقصد کے لئے بھرپور توانیاں خدا کے قوانین سے طلب کرنا تاکہ صحیح منزل تک پہنچ سکوں۔اب یہ دلی آرزو لب پر دعا بن کر آئی۔اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ﴿۵﴾(1:5) ہماری ذات نشوونما حاصل کر کے ایک متوزن شخصیت بن جائے تاکہ ارتقائی منازل طے کر کے انتہائی منزل تک پہنچ جائے۔وہ منزل کیا ہے؟ وہ مقصد کیا ہے؟ ایک تو اس دنیا کی کامیابیاں اور کامرانیاں اور بلندیاں بھی ایک مقصد ٹھہرا۔اور بعد کی زندگی میں بھی ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اس منزل مقصود تک رسائی یہ بھی نصب العین ہوا۔ان دونوں میں راستہ طے کرنے کا تصوّر مشترک ہے۔راستہ طے کئے بغیر تو منزل مقصود تک نہیں پہنچا جا سکتا۔اب صلاحیتیں تو نشوونما پا گئیں۔متوازن شخصیت ہوگئی۔تو اس سے مقصد منزل تک پہنچتا ہے۔اور راستہ ضروری ہے۔راستہ کا علم ہوئے بغیر تو سفر نہیں طے کیا جا سکتا۔تو اگلی بات یہ ہونی چاہیے اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ﴿۵﴾ (1:5) ارادہ کیا ہے کہیں قدم غلط راستوں پر نہ پڑ جائیں۔آرزو یہی ہے کہ سیدھا راستہ خطرات سے محفوظ سامنے آئے تاکہ منزل تک پہنچ جائیں۔یہاں اِهۡدِنَا (1:5) جمع کا صیغہ ہے۔یہ تو ایک اجتماعی کارواں در کارواں محو سفر ہے۔یہ انفرادی سفر نہیں ہے۔راستہ ایسا کہ ابھر کر سامنے آجائے۔ھادیۃ۔اس کتاب کو کہتے تھے جو دور سے ابھری ہوئی نظر آئے۔جو مخفی ہو۔اسے تلاش کرنا پڑے۔مشکوک ہو تو اسے ''ہدایت''نہیں کہتے تھے۔ہدایت کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ رہنمائی واضح ،مبین ،روشن اور ابھری ہوئی ہو۔جیسا کہ کتاب ابھری ہوئی ہوتی ہے۔یہ ہے خدا کی طرف سے ملنے والی رہنمائی جو روشن اور ابھری ہوئی ہے۔اسے تلاش نہیں کرنا پڑتا اور جو بھی اس رہنمائی کو اختیار کرتا ہے ان میں اختلاف یا تضاد نہیں ہوسکتا۔یہ تو چٹان کی طرح ابھری ہوئی سامنے آجاتی ہے۔الصِّرَاطَ (1:5) تو معنیٰ''سیدھا راستہ''صراط کے ساتھ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ﴿۵﴾(1:5) بھی کہا ہے۔مادہ اس کا''ق وم''ہے۔یہاں سے''قِيَامٌ''ہے یعنی کھڑا ہونا۔کھڑا وہی رہ سکتا ہے جس کا توازن برقرار ہو۔ذرا توازن بگڑا تو کوئی اپنے مقام پر کھڑا رہ سکتا ہے۔توازن بگڑا تو گرا۔

مستقیم کے معنی توازن بدوش''یعنی ایسا راستہ جس میں اس قسم کے نشیب وفراز نہ ہوں کہ انسان چلے تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔اس سے پاؤں میں لغزش آئے اور وہ گر جائے۔یہ ہے صراط مستقیم۔ہموار اور کوئی پیچ وخم نہ ہو' قرآن اس کے ساتھ ساتھ باطل نظریات کی تردید کرتا جاتا ہے۔یہ دونوں باتیں الصّراط' کے اندر پنہاں ہیں۔

زندگی کی حرکت کے متعلق نظریہ دوری گردش:

(Cyclic movement and transmigration of soul)

یونان کے مفکرّین نے جب اجرام فلکی پر غور کیا تو ان کو گول پایا۔اس سے ان کے ذہن میں گولائی یا دائرہ کی عظمت قائم ہوگئی۔اس سے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات اور انسانی زندگی کی حرکت دوری ہے۔یعنی زندگی ایک دائرے کے اندر

گردش کر رہی ہے۔ دائرہ کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ جس نقطہ سے کوئی شے حرکت کا آغاز کرتی ہے۔ پورا دائرہ طے کرنے کے بعد وہ اس مقام پر آ پہنچتی ہے۔ آگے نہیں بڑھتی بلکہ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی راستہ پر چکر کاٹتی رہتی ہے۔ مسافت تو طے کرتی ہے مگر سفر کے باوجود کسی منزل تک نہیں پہنچتی۔ پورا چکر کاٹنے کے بعد اس کا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا۔ بلکہ پھر اس مقام پر آ جاتی ہے۔ قیامت تک وہ اس دائرے میں چکر کاٹتی رہے وہ آگے نہیں بڑھے گی۔ اسی مقام پر حرکت کرتی رہے گی۔ یہ تھا تصوّر دوری حرکت کا (Cyclic Movement) اسی سے تناسخ کا نظریہ اواگون (Transmigration of Soul) Pythogoras (فیثاغورث،580ق م) نے دیا۔

اس نظریہ کے تحت انسان ایک جنم لیکر اس دنیا میں آیا تو گناہوں کی آلائیشوں سے ملوث ہوگیا۔ اس کی موت کے بعد اس کی روح کو پھر کسی دوسرے پیکر میں بھیجا جاتا ہے۔ تا کہ وہ اس آلائیش کو دور کر سکے۔ یہ عمل ایک آدھ پیدائشی چکر میں ختم نہیں ہوتا۔ اس کے لئے کروڑوں، اربوں نئے نئے جنموں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تا کہ انسان پھر سے اپنی پہلی ہیئت یعنی (As you were) ہو جائے۔ جب ایسا ہو جائے تو اس وقت یہ چکر ختم ہو جاتا ہے۔ ان تمام چکروں کا مقصد انسان جیسا تھا ویسا ہو جائے۔ یہ دوری حرکت کا منتھی۔ زندگی کا یہ دوری نظریہ تناسخ تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام مذاہب میں نجات کا نظریہ (Salvation) اسی تصوّر کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائیت میں ہر بچہ اپنے اوّلیں ماں باپ کی آلائش لیکر آتا ہے۔ تو اس Original Sin سے نجات کے لئے مسیح کے کفارہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ (Atonement) اس ایمان سے پھر وہ پاک اور صاف ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ یعنی وہی تناسخ کا نظریہ کہ پھر سے پہلے کی طرح بن جانا۔ کسی قدم کا آگے نہیں بڑھنا اور چکروں میں سفر کئے چلے جانا اور پھر سے ویسا ہی بن جانا۔ جہنّم کی مثال دھوبی کی بھٹی سے دی جاتی ہے یعنی کپڑا پہلے صاف تھا۔ اس پر میل کچیل جم گئی۔ دھوبی کی بھٹی پر چڑھایا اس سے اس کی میل الگ ہوگئی۔ اس کے بعد پھر وہی صاف ہوگیا جیسا کہ پہلے تھا۔ اس کا نام نجات ہے۔ اس میں بھی دوری حرکت کا تصوّر کارفرما ہے۔ اہل تصوّف نے اسے ایک اور رنگ میں پیش کیا۔ ہندوؤں کی ویدانیّت کی رو سے کہا یہ گیا انسانی روح یا آتما دھرما کی روح پرماتما کا جزو ہے۔ یہ روح اپنی اصل سے الگ ہو کر دلدل میں پھنس گیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے آلائیش سے پاک اور صاف کر دیا جائے۔ تا کہ پھر سے یہ اصل میں مل جائے۔ اسے نجات کہتے ہیں۔ بدھ مت کا نروان یہودی تصوّف اور عیسائیّت کی رہبانیّت میں بھی آیا۔ اور وہیں سے لیکر اس کا نام اسلامی تصوّف رکھ دیا۔ اس طرح انسانی ذات کا ذات خداوندی سے مل جانا وصال کہلایا۔ تخلیق کائنات، انسان کی پیدائش آسمانی سلسلہ رشد و ہدایت، انبیاء کرام کی بعثت، غرضیکہ خدا کی طرف سے یہ وسیع و عریض پروگرام کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان جیسا تھا پھر سے ویسا ہی ہو جائے۔ (As you were)

قرآن ان تمام تصوّرات کی نفی کرتا ہے:

اس قسم کا بے کار، بے مقصد پروگرام کی صورت میں بھی خدا کے شایان شان نہیں ہوسکتا۔قرآن نے ان تمام تصوّرات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ یہ حرکت دوری نہیں بلکہ صراطی ہے۔زندگی کا کارواں سیدھے راستے پر گامزن ہے۔دائرے کے اندر چکرنہیں کاٹتا۔سیدھے راستہ سے مراد یہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔اس سفر کی غایت پھر سے وہیں پہنچ جانا نہیں جہاں سے آغاز ہوا تھا۔اس کا مقصداس منزل تک پہنچنا ہے۔جواس کے نقطہ آغاز سے بہت آگے اور بہت بلند ہے۔زندگی کا سفر (Cyclic) نہیں بلکہ (Evolutionary) ہے۔پہلے سے زیادہ بہتر بن جانا اور بلند ہوجانا ہے۔قرآن نے اسے نجات نہیں بلکہ فوز (Achievement) قرار دیا ہے۔

کسی ذات کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔قرآن کے تصوّر کی رو سے انسانی ذات ذات خداوندی کا جز نہیں۔ذات، پرسانالٹی نا قابل تقسیم وحدت کا نام (Indivisible Unit) جس شے کا کوئی جز الگ ہوجائے تو وہ ناقص رہ جاتی ہے۔نامکمل رہ جاتی ہے۔اس سے تو وہ ذات ذات ہی نہیں رہتی۔اس لئے انسانی ذات خدا کی ذات کا الگ شدہ حصّہ نہیں۔یہ ذات انسان کو غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملی ہے۔تاکہ اسے نشوونما دیکر اس قابل بنایا جائے کہ مزید ارتقائی منازل طے کر کے منزل اخروی میں سامنے آتی ہے۔لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾ (84:19)

کائنات صراطِ مستقیم کی طرف جانب رواں دواں ہے:

اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٦﴾ (11:56) عام ترجمہ تو یہ ہے کہ میرا رب صراط مستقیم پر چل رہا ہے۔لیکن مفہوم یہ ہے کہ پورا نظام کائنات قوانین خداوندی کے مطابق صراط مستقیم پر چلتا ہوا منازل ارتقائی طے کر رہا ہے۔سب سے پہلے خدا کا رسول ﷺ اس پر گامزن ہوتا ہے۔کہا آپ ﷺ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤٣﴾ (43:43) مومنوتم بھی یہ مسلک اختیار کرو اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٥١﴾ (3:51) محکومیّت اختیار کرنے کا دوسرا نام صراط مستقیم ہے۔صراط مستقیم یعنی شاہراہ اعظم۔High Way ایک ہی ہے۔صراط مستقیم تو واحد ہے مگر:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ (29:69)

سُبُلٌ: سَبِيْلٌ کی جمع ہے۔یعنی راستے'' جمع کا صیغہ ہے۔پگڈنڈیاں اور چھوٹے چھوٹے راستے ضروری ہیں جو آخر میں جا کر اس شاہراہ اعظم سے مل جاتے ہیں۔اس سُبُلٌ اور صراط مستقیم کو خود ہی وضح کر دیا۔يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٦﴾ (5:16) جو اس وحی کا اتباع کرتا ہے تو خدا اس کو ''سلامتی کے راستوں کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔سبل سے مراد متعدد راستے جو آخرالامر یہ صراط مستقیم کے اندر مل جاتے ہیں۔

سُبُلَ، سَبِیۡلٌ کی جمع:

آیت (5:16) میں اس مثال کا کیا مطلب ہے؟ دین تو شروع ہی سے ایک چلا آ رہا ہے۔لیکن اسے عملاً متشکل کرنے کے لئے مختلف زمانوں میں، اس زمانے کے تقاضے کے مطابق طریق اور پروگرام مختلف رہا ہے۔یعنی اصولی قوانین تو شروع سے ہی غیر متبدّل رہے ہیں لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، زمانے کے تقاضے، ضروریات کے اعتبار سے، بدلتے رہیں گے۔انہی کو سُبُلَ کہا جائے گا۔یعنی وہ پگڈنڈیاں جو آخرالامر شاہراہ اعظم میں جا کر مل جاتی ہیں۔اس لئے سُبُلَ السَّلٰمِ (5:16) کے بعد کہا وَیَہۡدِیۡہِمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۶﴾ (5:16)۔اس طرح خدا ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کر دیتا ہے۔یعنی دین پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو طریقے بھی اختیار کئے جائیں ان کی غایت یہی ہو کہ وہ انسان کو اصل دین کی طرف لے جائیں۔ یہاں سے اسلام کا سیاسی نظام کی بنیادی خصوصیّت واضح ہو جاتی ہے۔اس میں ایک تو صراط مستقیم، شاھراہ اعظم یعنی قرآنی اصول واقدار جو غیر متبدّل ہیں۔انہی کے مطابق سفر کرنے سے انسان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی رو سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جزوی قوانین بنائے جائیں گے۔لیکن شرط یہ ہے ایک تو وہ سُبُلَ السَّلٰمِ (5:16) ہوں یعنی وہ راستے، پگڈنڈیاں سلامتی کو لئے ہوئے ہوں۔ان میں فساد اور گمراہی نہ ہو۔وہ بھی اسی اصول کے تابع ہوں جو اصول شاہراہ عظیم کا ہے۔اور ان کا ٹیسٹ یہ ہے کہ وہ راستے صراط مستقیم میں آ کر مل جائیں۔اگر دین کے مطابق عمل ہے تو وہ سُبُلَ السَّلٰمِ (5:16) میں آئے گا۔اگر وہ جزئیات ایسی ہیں جو ان کے خلاف جاتی ہیں۔تو ان پر سفر کرتے جایئے تو آپ کبھی بھی شاہراہ عظیم تک نہیں آئیں گے۔ یہ شاہراہ عظیم مستقل ہے۔اس میں ثبات ہے اس میں جو پگڈنڈیاں آ کر مل جاتی ہیں یہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنے والی جزئیات ہیں۔

جو اسلامی مملکت اپنے اپنے تقاضوں کے مطابق وضع کرے گی۔ یہ جزئیات نہایت ضروری ہیں یہ نہ ہوں تو اس کلیہ پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔شاہراہ عظیم بھی ضروری ہے۔اگر یہ موجود نہ ہو تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم منزل مقصود تک پہنچنے والے راستہ پر گامزن ہیں۔ یہ ثبات وتغیرّ کا امتزّاج ہے۔اب اس راستہ کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی ہے۔صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ (1:6) قرآن کا انداز یہ ہے کہ جہاں وہ ایک کلیہ یا نظریہ پیش کرتا ہے۔وہ اسے تصوّراتی نہیں رہنے دیتا بلکہ محسوس انداز سے اس کی خود وضاحت کرتا ہے۔تا کہ کوئی خود فریبی میں مبتلا نہ ہو جائے۔اور اپنے طور پر سمجھ لے کہ میں اس کلیہ کا اتباع کر رہا ہوں۔ یا کوئی دوسرا اسے دھوکہ نہ دے۔کہ وہ غلط طریق پر چلا جا رہا ہو اور کہہ یہ رہا ہو کہ وہی چیز ہے جو خدا نے کہی ہے۔دونوں قسم کی گمرائیاں دنیا میں موجود ہیں۔خود فریبی کی بھی اور فریب کاروں کی پھیلائی ہوئی بھی۔قرآن نے ان دونوں سے بچانے کیلئے محسوس شکل میں مثالیں سامنے لے آتا ہے۔تا کہ پرکھنے میں کوئی شبہ نہ رہے کہ

جس چیز کی ہم آرزو رکھتے ہیں۔ یہ وہی ہے۔ کہیں فریب تو نہیں، التباس تو نہیں۔

اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ (1:6)۔ ماضی کا صیغہ ہے قرآن ان صداقتوں کے لئے تاریخی شواہد پیش کرتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کرو کہ جس قوم نے اس اصول پر عمل کیا تو اسے کیا کچھ نصیب ہوا اور جس قوم نے اسکی خلاف ورزی کی وہ کس طرح تباہیوں اور ذلت کے عذاب میں مبتلا ہوگئی۔ تو چونکہ یہ ماضی کی سرگذشتیں ہیں اس لئے اسے ماضی کے صیغہ میں پیش کرتا ہے۔

قرآنی شواہد، استخلاف فی الارض:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۖ (24:55) یہ تھے وہ جن کو ہم نے زمین استخلاف عطا کیا تھا۔ یہ تھے اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ (1:6) اور جو منعم علیہ تھے ان اقوام کی داستانوں سے معلوم ہو جائے گا کہ ان کو کن کن انعامات سے نوزا گیا تھا۔ قرآن کے دعاوی کا معیار ماضی کی تاریخ ہے۔ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ (1:6)۔ یہ ہے وہ صراط مستقیم جس پر چلنے سے وہ انعامات خداوندی کے مستحق ہوئے۔ ان انعام یافتہ قوموں کی پہچان کیا ہے؟

نَعَمۡتَ: مادہ اس کا ''ن ع م'' ہے۔ ایک پودا تَنۡعِيۡمَةٌ'' ہوتا ہے۔ اس کے پتے نرم ونازک اور سرسبز وشاداب ہوتے ہیں۔ وہ پانی پر اگتا ہے۔ اس کی تروتازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اس کے بعد وہ پودا بلند بھی ہوتا ہے۔ تو اس مادہ ''ن ع م'' بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اَنۡعَامَةٌ وہ عمارت جو پہاڑ پر تعمیر کی گئی ہو نیز کسی اونچے نشان یا جھنڈے کو بھی، جس سے راستہ کا پتہ چلایا جائے۔ تو معنی واضح ہو گئے۔ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، بلند اور سرفراز ہونا نعمت کا مظہر ہے۔ ایسی زندگی رکھنے والے ''منعم علیہ'' کہلاتے ہیں۔ وہ جنہیں خدا کی نعمتیں حاصل ہیں۔

بنی اسرائیل کا تذکرہ قوموں کی موت وحیات کا آئینہ:

اس داستان کو متعدد مقامات قرآن میں دہرایا گیا ہے۔ اس میں قوموں کے عرّوج وزوال کے ابدی اصول مضمر ہیں۔ ساری دنیا میں ان کی ذلت ورسوائیاں سامنے تھیں اور یہ قوم عربوں کے خود سامنے تھی۔ یہ تاریخ میں ان کا نام خانہ بدوش ہو کر رہ گیا۔ ایک زمانے میں یہ قوم شوکت داؤدی اور سطوتِ سلیمانی کی حامل تھی۔ یہ تھا ان کا عرّوج اور یہ زوال بھی انہی کا تھا۔ جو خدا کے اٹل قوانین کی رو سے ہوا۔ اس قوم کے عرّوج وزوال میں یہ قوانین نظر آتے ہیں۔ وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ (2:40) یہ قوم فرعون کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی تو ان کو وہ کونسی نعمت کی یاددہانی کرائی گئی تھی۔ وہ نعمت یہ ہے وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ (2:49) اب جو پہلی چیز سامنے آئی کہ کسی قوم کا غلامی کے

استبداد سے آزادی حاصل کرنا نعمت خداوندی ہے۔ یہ تو ہوا منفی پہلو۔ اب مثبت پہلو کیا ہوا۔ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾ (2:47) تو دوسری نعمت یہ ہوگی کہ وہ قوم اپنی ہم عصر اقوام میں ممتاز ترین حیثیت کی مالک ہوگی۔

مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او برنتابد ہمسرے

انسانی غلامی میں ہونا ہی غلامی کہلاتا ہے۔ چاہے وہ خواہ خوشحال کیوں نہ ہو۔ اگر وہاں احکام خداوندی نافذ نہ ہوں تو پھر بھی غلامی ہوتی ہے تو پہلی شرط یہ ہے کہ غیر خداوندی احکام اور حاکمیّت سے آزادی۔ انعام یافتہ قوم کی دوسری شرط کہ وہ اپنی ہم عصر اقوام میں سب سے بلند و بالا ہو۔

صراط مستقیم کی سب سے بڑی نشانی احکام اللہ کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے آزاد ہونا:

صراط مستقیم کی پہلی منزل، پہلا نشان یہ ہے کہ وہ قوم آزاد ہوتی ہے۔ خدا کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے وہ اقتدار رکھتی ہے اور ہم عصر اقوام میں سب سے بلند ہوتی ہے۔ یہ افضلیت داوٗدؑ اور سلیمانؑ کے دور میں نکتہ کمال تک پہنچی۔ سلیمانؑ کی یہ دعا رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ (27:19) مجھے اور میرے والدین کو جو نعمت عطا کی ہے۔ اب اس شان و شوکت کو نعمت کہا ہے۔

انسانی پیکر ذات انسانی کی نشوونما کا ذریعہ ہے مقصود بالذّات نہیں:

مقصود بالذّات تو ذات یا خودی ہے جس کی ایسی تربیّت اور نشوونما ہو جائے کہ وہ اس زندگی کے مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ مگر یہ اس کرہ ارض پر مادی سطح پر ہو سکتا ہے۔ یہ جسم اس کا ذریعہ ہے۔ ایک گھوڑا جو سفر کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ تو سفر کے لئے گھوڑا تو اتنا تندرست اور تربیّت یافتہ ہونا ضروری ہے۔ یہ گھوڑا مقصود بالذّات نہیں مگر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس لئے تو مومن کے لبوں پر یہ دعا ہوتی ہے رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2:201) اس دنیا کی حسنات، نعمتیں، تمام سامان ذرائع و وسائل کی فراخی اور آسانی سے مل جانا بھی خدا کی نعمت ہے۔ قدم قدم پر بکھری ہوئی یہ نعمتیں وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا (16:80) یہ خانہ بدوش کی زندگی کے لئے ہلکے پھلکے مکان، جہاں چاہو لے جاوٗ۔ وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ اَکۡنَانًا وَّجَعَلَ لَکُمۡ سَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمُ الۡحَرَّ وَسَرَابِیۡلَ تَقِیۡکُمۡ بَاۡسَکُمۡ ؕ کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعۡمَتَہٗ عَلَیۡکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾ (16:81) یہ تمام نعمتیں اس لئے ہیں کہ تم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرو یعنی ان کو اقدار خداوندی کے تحت استعمال کرو۔ یہ فرق ہے مومن اور کافر میں۔ خدا کی حمد یہ ہے کہ تم اوروں کو بھی شریک

کرو اور اس ربوبیّت کو عام کرو۔اسی سورۃ میں آگے بتایا ہے کہ ان نعمتوں کا چھپا دینے والا بالاخر تباہی کا شکار ہوجاتا ہے۔(16:112) نعمتوں کامل جانا آسانی اور فراغت سے یہ خدا کی نعمت ہے۔اوران کا چھن جانا عذاب ہے جوبھوک اور خوف کی شکل میں مسلط ہوجاتا ہے۔

اب آگے نعمتوں کے دائرے کووسیع کردیا اس کی وسعتیں حدودفراموش کردیں۔کہا اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ وَاَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ؕ (31:20) جومحسوس طور پر سامنے آگئی ہیں اس وقت۔اوروہ نعمتیں بھی جوابھی پردہ کائنات میں ابھی مستور ہیں۔ان نعمتوں کوکثرت اور فراغت سے دیا۔

پوری کائنات کوقانون کی زنجیروں میں باندھ دیا ہے تاکہ تم تسخیر کرسکو:

یہ ہیں نعمتیں اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ (14:32) پھل،کھیتیاں یہ سارارزق،نعمت ہے۔وَسَخَّرَ لَکُمُ الۡفُلۡکَ لِتَجۡرِیَ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِہٖ ۚ(14:32) یہ قانون فطرت ہے کہ ہزاروں ٹن وزنی جہاز بط کی طرح چلا جارہا ہے۔وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ دَآئِبَیۡنِ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَالنَّہَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡہُ ؕ وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ (14:33-34) تمام ضروریات زندگی کی چیزیں۔آگے کہا وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ (14:34) جب تک یہ نعمتیں اقدار کے تحت استعمال کرتے گئے تو زندگی کی شادابیوں سے متمتع ہوتے رہے جونہی ان سے اعراض برتا تو یہ تمام نعمتیں چھن گئیں۔

ان نعمتوں کا حصول کس طرح ممکن ہے:

یہ نعمتیں بغیرمحنت کے نہیں ملتیں۔جنّتی معاشرہ میں ان نعماء سے متمتع ہونے والوں نے کہا وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ صَدَقَنَا وَعۡدَہٗ وَاَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّۃِ حَیۡثُ نَشَآءُ ۚ (39:74) ایسی جنّت کہ جو چاہیں مرضی سے کریں۔جیسا چاہیں رہیں اس میں کامل آزادی ہے۔فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۷۴﴾ (39:74) کام کرنے والوں کا صلہ کس قدر نعم ہے۔یہ نعماء تومحنت کرنے کے بعد کام کرنے کے بعد ملتی ہیں۔اس جنّتی معاشرہ کے حصول میں تو متواتر تگ وتاز کرنا ہوگی۔بڑے بڑے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہاں تک کہ میدان جنگ میں بھی جانا پڑتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ (3:173) مقابلے میں ایک بڑا لشکر ہے۔فَاخۡشَوۡہُمۡ فَزَادَہُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ (3:173)۔مگر ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا۔ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ﴿۱۷۳﴾ (3:173) فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡہُمۡ سُوۡٓءٌ ۙ (3:174) نعمتوں کی جھولیاں بھربھر کر بغیر نقصان اٹھائے واپس لوٹے۔وَّاتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۷۴﴾ (3:174) اللہ کی نعمتیں تو

لا انتہا ہیں۔

قرآنی نظام اور سیکولر نظام میں بنیادی فرق:

ایک تو محنت سے، جان جوکھوں میں ڈال کر نعمتیں حاصل کرتا ہے جبکہ دوسرا گروہ ایک نظام کے ذریعہ سلب ونہب ،ظلم وزیادتی سے غریبوں کا تمام مال لوٹ کر لے جاتا ہے۔

دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

امتے بر امتے دیگر چرد

بیج یہ بوتا ہے فصل وہ کاٹ کر لے جاتا ہے۔اور اس کے بعد ان کو اپنے اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔اور اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا۔یہ ہے سیکولر نظام۔یہ ہے خود مختار ریاست جو اپنا حساب کسی کو نہ دے۔سورۃ تکاثر غلط نظام کے نتائج کو بتایا ہے۔

لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ ۝ (102:6-7) یہ جحیم انسانی صلاحیتوں کو جلا دینے والی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔پھر یقین ہو جائے گا۔کہ واقعی ہمارا نظام کس قدر ظلم پر مبنی تھا۔مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ،زنجیریں پہنی ہوئی پھر باز پرس کے لئے عدالت خداوندی میں حاضر کئے جائیں گے۔پھر پوچھا جائے گا ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ ۝ (102:8) ان نعمتوں کے بارے میں (قانون مکافات کے ذریعہ) پوچھا جائے گا۔عمرؓ نے خلافت کی تعریف یہ کی''کہ کہاں سے آیا اور کہاں خرچ کیا؟ جس میں یہ پوچھا جائے۔خدا کی نعمت کا ذکر مومنوں کے بارے میں وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ (3:103) یہ نعمت ہے کہ بھائی بھائی بنا دیا جبکہ حالت یہ تھی وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا ؕ (3:103) حبل اللہ کے ساتھ متمسک رہنے سے امت واحدہ بن جاتی ہے جبکہ فرقوں میں بٹ جانا شرک عظیم ہے۔

اِيَّاكَ نَعۡبُدُ (1:4) کا عملی ثبوت یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کو کھلا رکھو:

اِيَّاكَ نَعۡبُدُ (1:4)۔صرف تیری محکومیت وَّاشۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ ۝ (16:114) اگر واقعی تم اس کی اطاعت کرنے کا دعوی کرتے ہو تو اس کا عملی ثبوت یہ ہے تو یہ تمام نعمتیں اس کے بتائے ہوئے طریق سے استعمال کرو۔یاد رکھو! وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَـئِنۡ شَكَرۡتُمۡ (14:7) یہ اعلان ہے اگر تم نے ان نعمتوں کو ان اقدار کے تابع خرچ کیا تو نہ صرف ان کی رسائی جاری رہے گی بلکہ لَاَزِيۡدَنَّـكُمۡ (14:7)۔ہم زیادہ کرتے جائیں گے۔وَلَـئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ ۝ (14:7) خدا کی ان نعمتوں کو کیسے حاصل کیا جائے یاد رکھو! ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ۙ (8:53) خدا ان نعمتوں کو نہیں چھینتا تاوقتیکہ وہ قوم اپنے آپ میں ایسی

تبدیلی پیدا نہ کرلے۔اس لئے نفساتی تبدیلی پیدا کر کے دوبارہ چھینی ہوئی نعمتوں کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔اور یہ تبدیلی آسکتی ہے۔وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط (2:129) اور جن سے یہ نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾ (1:7) اس کا عام ترجمہ جو کرتے ہیں کہ نہ ان کی جن پر تیرا غضب نازل ہوا یا جو گمراہ ہوئے۔اس ترجمہ سے تو بڑا غلط تصوّر خدا کے بارے میں آتا ہے۔یعنی خدا سے یہ کہنا کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا جن پر تیرا انعام ہوا اور یہ بھی ان لوگوں کی راہ نہ دکھا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔معاذ اللہ خدا ان انعامات کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ان کی طرف بھی جو غضب کا شکار ہو کر گمراہ ہو گئے۔تو ہم کہہ رہے ہیں کہ ہماری رہنمائی اس طرف کرنا جن پر انعامات نازل ہوئے۔اور خیال کرنا ان کی طرف رہنمائی نہ کرنا جن پر تیرا غضب ہوا اور گمراہ ہوئے۔کس قدر غلط اور گمراہ کن تصوّر ہے کہ خدا ان لوگوں کی طرف رہنمائی کرے گا جن پر اس کا غضب ہوا اور وہ گمراہ ہوئے۔انہوں نے تو خدا کی ایک صفت اَلْمُضِلُّ یعنی گمراہ کرنے والا'' بھی ترجمہ کی ہوئی ہے۔جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کر دے۔یہ ترجمہ غلط اور گمراہ کن ہے۔قرآن اپنے حقائق کو اضداد کے دلنشین اور موثر انداز سے واضح کرتا ہے۔مثلاً نور وظلمت، تاریکی و روشنی، دھوپ اور سایہ، نابینا و بینا، اس قسم کے الفاظ سامنے لا کر اپنے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔اس آیت میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ان دو آیات کے صحیح معنی یہ ہیں''ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا جو منعم علیہ تھے۔وہ مغضوب اور گمراہ نہیں تھے''ایک طرف ان کی مثبت خصوصیّت کہ وہ منعم علیہ تھے۔ان پر تیرے انعامات کی بارش ہوئی۔دوسری طرف منفی طور پر وہ ایسے نہیں تھے کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور وہ گمراہ ہوئے۔ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کے راستہ سے بچنا چاہتے ہیں۔جو غضب کا شکار ہوئے یا صالحین کا راستہ مل جائے۔

''غَضَبٌ''۔بنیادی معنی''شدت، قوّت، حرارت، غلبہ، گرفت کی محکمیت''جب یہ لفظ انسان کے لئے آئے گا تو اس سے غصہ اور غضب آلودہ جذبات ہونگے۔اللہ تو انسانی جذبات سے منزّہ ہے۔جب اس لفظ کی نسبت خدا کی طرف کی جائے گی تو اس سے مراد''خدا کی قانون مکافات کی محکم گرفت''

حذر اے چیرۂ دستاں
سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

تعزیرات فطرت کو خدا کی غضب کہا گیا ہے۔اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾ (85:12) فرعون کے بارے میں کہا فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾ (73:16) محکم گرفت، یہ ہے خدا کا غضب۔قانون مکافات کی گرفت میں آکر مغضوب علیہ ہو گئے۔بنی اسرائیل کے بارے میں کہا وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط (2:61) ذلت و مسکنت کا عذاب یہ ہے غضب۔مزید وضاحت کر دی ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط (7:152)۔اسی دنیا میں ذلت یہ

ہے غضب خداوندی۔ ذلت کا لفظ تو ہر قسم کی محتاجی، کمزوری، محکومی، بے بسی، بے چارگی کے معنوں میں آتا ہے۔ وہ قوم ذلیل ہوگئی۔ دوسرا لفظ ''مسکنت'' ہے۔ زندگی حرکت وحرارت کا نام ہے۔ یعنی شاھراہ حیات پر مسلسل رواں دواں چلتے رہنے کا نام، اس کو سعی پیہم یا جدوجہد دوام کہا جاتا ہے۔

حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

چلتے چلے جانا۔ ارتقائی نازل طے کر کے منزل مقصود کی طرف بڑتے جانا۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے۔ جو قوم کسی مقام پر آ کر رک کر کھڑی ہوجائے وہ زندگی کی حرارتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ پیچھے ہٹ رہی ہوتی ہے۔ چونکہ چلنے والی قومیں تو اس سے بہت آگے بڑھ جاتی ہیں۔ مسکنت کسی قوم کی اس حالت کا نام ہے۔ قرآن اسے جحیم یعنی راستے کی روک جہاں کوئی آگے بڑھنے سے رک جائے۔ اس سے مراد نہیں کہ وہ قوم چلتی پھرتی نہیں اس سے مراد ان میں فکری جموّد پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ سوچنا سمجھنا چھوڑ کر تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ اور اس مسلک کے لئے وہ اباؤ اجداد کو بطور سند پیش کرتی ہے۔ یہ قوم غضب الٰہی کا موجب ہوجاتی ہے۔ یہ ہے مسکنت'' اور ھودؑ نے اس روش کے بارے میں کہا وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ (7:71) تم مغضوب علیہ ہو چکے ہو۔ چونکہ تم اسلاف کے مسلک کو چھوڑ نا نہیں چاہتے۔

جنگِ بدر میں منعم علیہ قوم کی لازوال مثال:

مختصر سی جماعت، بے کس و بے بس یہ دشمن کے مقابلے میں بنیان مرصوص، ان کے متعلق کہا: وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ (8:16) اگر فوجی ٹیکنیک کے خیال سے پینترا بدلے یا جماعت سے مل جائے اگر پٹھ پھیر کر بھاگا تو نتیجہ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ (8:16) اب اس میں منعم علیہ کون تھے۔ اور مغضوب علیہ کون۔ یہ واضح کر دیا۔

ایک مومن کا قتل مغضوب علیہ بنا دیتا ہے۔ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ (4:93) تو ایسی قوم مغضوب علیہ ہوجاتی ہے۔ اور منعم علیہ تو وہ قوم ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے بھائی اور ان کے دل باہم جڑے ہوئے ہوں۔

قرآن کی موجودگی میں خودساختہ قوانین پر چلنا:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85) تو اس کا نتیجہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (2:85) یعنی ثنویّت کو شرک کہا ہے۔

رزق کی مساویانہ تقسیم نہ کرنے پر غضب:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ (28:58) كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ

فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ (20:81) تو میرا غضب اس کو پستیوں اور ذلت میں ڈال دے گا۔اور یادرکھو!

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (60:13) تومغضوب علیہ کے ساتھ دوستی مت کرو۔

الضَّآلِّيْنَ ﴿٧﴾ (1:7) کا مفہوم:

جس طرح قرآن ''منعم علیہ'' کے مقابل ''مغضوب علیہ'' لایا ہے اس طرح ''ہدایت'' کے مقابل ضلالت'' کا لفظ لایا ہے۔اس کے معنیٰ ''سرگردان پھرنا۔حیران و پریشان بھرنا۔کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہوجانا۔مختلف چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ پھران کو الگ الگ نہ کیا جاسکے۔جس طرح دودھ میں پانی مل جاتا ہے۔چونکہ صحرا میں راستہ کھودینے والا اپنی تمام تگ وتاز کے باوجود منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔اس لئے محنت کے رائگاں جانے کے لئے بھی یہ بولا جاتا ہے۔ضَلَّ سَعْيُهُمْ (18:104) ان کی تمام کوششیں ضائع ہوگئیں۔

سراب کو پانی سمجھنے والا۔سراب کو اَلْمُضِلُّ کہتے ہیں۔گمراہ کرنے والانہیں بلکہ اس طرح اپنے آپکو دکھانے والا کہ حقیقت میں وہ ایسا نہ ہو۔اس لئے دیکھنے والا حیران Confuse رہ جاتا ہے۔ابہام التباس کے معنوں میں آتا ہے۔راستہ کی تلاش میں سرگرداں رہنا۔

مغضوب علیہ'' تو وہ ہوگئے جن کے سامنے دونوں راستے،صحیح اور غلط آگئے،غلط راستہ کو دانستہ چنا اور تباہ برباد ہوگئے۔دوسرے وہ جن کے سامنے راستہ نہیں ہوتا لیکن تلاش کی تڑپ ان کے دل میں ہوتی ہے جو راستے کی تلاش میں اس طرح سے پھرے اس بھی ضالاً کہا گیا ہے۔حضور ﷺ کے بارے میں ہے وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿٧﴾ (93:7) دل حاظر وموجود سے بیزار ہوتا ہے۔تڑپ اور تلاش کی آرزو اس کے دل میں شدت اختیار کرجاتی ہے۔ہمارے ہاں کے فلاسفر (Erich Fromm1980) کا کہنا ہے کہ اپنے دور کے مروّجہ معتقدات ونظریات کو علی ھذہ تسلیم کر کے ان پر جم کر بیٹھ جانا بت پرستی کہلاتا ہے۔یہ عجیب بات ہے کہ خود عربوں کے ہاں بھی بت پرستی میں یہ مفہوم مضمر تھا۔بت کے لئے وثن کا لفظ استعمال کرتے تھے۔جمع ''اَوْثَانٌ'' ہے۔وَثَنٌ'' کے معنی غیر متحرک،جامد،اس کو تقلید یا جموَد کہتے ہیں۔ایسی روش کا پیروکار کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کرسکتا۔اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھوجاتی ہے۔اور یہی ہیں جہنّمی لوگ۔تقلید پرستی کا دوسرا نام جہنّم ہے۔وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٧٩﴾ (7:179) وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ (27:81) عقل وفکر سے کام نہ لینے والے گمراہی سے نہیں نکل سکتے یہ ہیں بھیڑ چال والے۔اسلاف کے راستے پر گامزن،تو جہنّم میں چلے جاتے ہیں جب ان سے پوچھا گیا کہ تمہاری یہ حالت کیوں ہوئی؟

وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾ (33:67) ان بڑے بڑے بزرگوں، مذہبی پیشواؤں اور لیڈروں نے گمراہ کیا۔ جو جذبات کی رو میں بہہ کر عقل وفکر سے محروم ہوجاتے ہیں۔تو وہ گمراہ ہوتے ہیں۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ (45:23) جو جانتے بوجھتے بھیڑ چال کی طرح چلتے ہیں کیونکہ وہ جذبات پرستی میں، اندھی عقیدت میں۔ حالانکہ جذبات تو قابل قدر شے ہے اگر وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50) وحی کے بغیر جذبات کی پیروی گمراہی ہے۔

جمہوریت ایک خطرناک گمراہی ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿١١٦﴾ (6:116) یہ تو قیاسات والا سسٹم ہے۔حق کا معیار یہ ہے اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿١١٧﴾ (6:117) خدا اور صحیح کا معیار صرف خدا کی رہنمائی یعنی قرآن ہے۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ (20:123) مذہبی پیشوائیت جو گھڑے ہوئے افسانوں سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ قوم ذلت کا شکار ہوجاتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٦﴾ (31:6) اپنے داستانوں اور فریب انگیز گفتگو سے لوگوں کو فریب میں رکھتے ہیں۔ یہ مذہبی پیشوائیت ہے۔ ہوتے ہیں جاہل مگر اپنے آپ کو بڑا عالم پیش کرتے ہیں۔ سب کچھ روٹی کی خاطر کرتے ہیں۔ وہ بڑا مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ جو قوم ایسا کھیل کھیلے دین کے ساتھ تو ذلت وتباہی ان کا مقدر ہوجاتی ہے۔ یہ ضلالت کی پست ترین شکل ہوتی ہے۔

مذہب والے غریبی اور امیری کا خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ یہ ہے گمراہی:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ (36:47) ان سے کہو اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٧﴾ (36:47) یہ ہے گمرہی اور فریب دہی۔ اس لئے مومنوں کو تاکید کی گئی۔ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٧٧﴾ (5:77) یہ تابع اور متبوع دونوں گمراہ ہوگئے۔ یعنی پیروی کرنے والے اور لیڈران گمراہ ہوگئے۔

متحرّک نفسیات ''Dynamic Psychology'' اور قرآن

قرآن پر تدّبر اور تفکّر کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔ اسلوبِ تصریف الایات سے۔ ایک آیت ایک مقام پر تو وضاحت دوسرے مقام پر۔ اضافہ کسی اور جگہ استثنا۔ یعنی مختلف حقائق کے متنوع گوشوں کو، مختلف موضوعات کے ضمن میں لوٹا لوٹا کر لایا جاتا ہے۔ یہی تصریف آیات کہلاتا ہے (6:105)۔ قرآن کو سمجھنے کی ایک خود قرآن کی عائد کردہ شرط تدّبر فی القرآن'' ہے۔ یعنی عقل وبصیرت اور علم وشعور سے سمجھنا (4:82)۔ یہ تدّبر کسی خاص زمانہ یا کسی ایک فرد کا تدّبر کسی دوسرے زمانہ یا انسان کے لئے سند نہیں ہوسکتا۔ بے شک علم نوعِ انسانی کی وراثت ہے۔ دوسرے کے غور وفکر سے استفادہ تو کیا جا سکتا ہے مگر وہ نہ تو سند ہوسکتا ہے اور نہ حرف آخر۔ لہٰذا علم بالوحی اور انسانی علم میں کاملیّت اور ارتقائیّت کے فرق کو ذہن سے محو نہیں کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنی تعلیمات کی صداقت اور حقانیّت کے ثبوت کے لئے فرمایا ہے'' جوں جوں خارجی کائنات اور خود انسان کی نفسیاتی زندگی (انفس وآفاک) میں پوشیدہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ توں توں یہ بات ابھر کر واضح ہوتی جائے گی۔ کہ قرآن کے تمام دعاوی فی الحقیقت حق اور مبنی بر صداقت ہیں (41:57)

اور ان چودہ صدیوں میں خارجی کائنات کے متعلق جو حقائق بے نقاب ہوئے ہیں۔ اور خود انسان کی تمدّنی زندگی میں جو انقلابات رونما ہوئے ہیں وہ قرآنی صداقت کے شاہد ہیں۔ ایسا ہی اس وقت تک ہو رہا ہے، اور ایسا ہی آگے ہوگا۔ اس آیت میں خارجی کائنات کی طرح انسانی نفسیاتی زندگی کی اہمیّت اجاگر کی گئی ہے۔ خارجی کائنات کے نظم وضبط پر تو تحقیقات نزول قرآن سے پہلے بھی جاری تھیں۔ لیکن عالمِ نفس یعنی نفسیاتی دنیا کے اسرار ورموز انسانی نگاہوں سے تقریبا اوجھل تھے۔

نفسِ انسانی غیر نشوونما یافتہ شکل میں عطا کیا گیا ہے۔ زندگی کا مقصد قرآن نے یہ قرار دیا ہے

کہ اقدارِ خداوندی سے اس ذات کو اس قدر نشوونما یافتہ بنا دیا جائے کہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ اس کے لئے مومنین اللہ سے سیدھا اور توازن بدوش راستہ مانگتے ہیں۔ وہ راستہ جس کے ذریعہ وہ نعمتوں کے مستحق

ہو جائیں (6-1:5) لہٰذا نعمت ایک بڑی دولت ہے یعنی دین پر عمل پیرا ہونے سے اس کے درخشندہ ثمرات محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ یہ تو محسوس شکل کا ایک کھلا ہوا معیار ہے۔ جس سے پرکھا جا سکتا ہے کہ ہمیں وہ نعمائے خداوندی حاصل ہیں یا نہیں۔ اگر حاصل ہیں تو ایمان اور اعمال قرآنی میزان پر پورا اترتے ہیں۔ اگر نہیں تو بقول ابوالکلام آزاد ''خدا پرستی اور نیک عملی'' کہہ کر دل کو جھوٹا اطمینان دلا کر خود فریبی کا شکار ہونگے۔ اس چیز کے حصول و محرومیّت کا انحصار زیادہ تر انسانی نفسیات پر ہے۔ مثبت نفسیاتی تبدیلی سے یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور منفی تبدیلی سے چھن جاتی ہیں۔ یہ ہے قرآن کا ایک محکم اصول۔ اور جو نعماء کسی قوم کو حاصل ہوں تو خدا ان میں کبھی تغیّر نہیں کرتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے اندر نفسیاتی و ذہنی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ اللہ کے فیصلے یونہی اندھا دھند نہیں ہوتے۔ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (13:11) (8:53)

جب تک وہ صلاحیت کسی قوم میں موجود ہو وہ ان نعماء سے محروم نہیں ہوتی۔ یہ ہے غیر متبدّل قانون، اور جب اعمال بد کے نتیجہ تباہی کی آخری ساعت آجاتی ہے۔ تو اسے کوئی روک نہیں سکتا (10:49)

منفی نفسیاتی تبدیلی سے ایک قوم خوشگواریوں سے کیسے محروم ہوتی ہے؟ اس کی مثال قوم سبا ہے۔ قوموں کا عرّوج وزوال قسمت و اتفاق کا رہین منت نہیں ہوتا بلکہ لگے بندھے اٹل قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ اس قوم کا عرّوج 1100 ق م سے 550 ق م تک ہے۔ سلیمانؑ کے دور کی ملکہ سبا اس دور سے متعلق ہے۔ ان کا زوال کا دور 525ء میں اپنے اختتام تک پہنچا۔ سیل عرم اور قوم سبا کا انتشار اور سورہ ق میں اصحاب تبع، ان سب کا تعلق اسی دور سے ہے۔ سبا کے عرّوج کے زمانہ میں سونے اور جواہرات کی کانیں تھیں حضرت موت اور یمن کا علاقہ خوشبودار اشیا کے لئے بڑی منڈی تھی۔ عمان اور بحرین کے موتی دنیا میں لاثانی سمجھے جاتے تھے۔ یمن کے ساحل تمام علاقوں کے لئے تجارتی منڈی تھی۔ شام، مصر، جزیرہ نما عرب، افریقہ، ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارت کے واحد اجارہ دار اہل سبا ہی تھے۔ تورات میں اہل سبا کی دولت، ثروت اور تمدن کے واقعات بکثرت موجود ہیں۔ قرآن میں (19-34:15) ان کو بے شمار نعمتیں حاصل تھی۔ یہ قوم ایک وادی میں آباد تھی جس کے دونوں طرف باغات کا سلسلہ تھا۔ آب و ہوا نہایت خوشگوار کہا گیا تھا کہ ان نعماء کی قدر شناسی کرنا۔ معیشت کے اس زمانہ کے معتدل ہوا، سرد و خنک پانی، عمدہ پھلوں کی بکثرت پیداوار اور خوشبودار اشیاء کی پیداوار۔ اور عقل و فہم سے کام لیکر انہوں نے آب رسانی کا بہترین نظام قائم کر رکھا تھا۔ دارالحکومت مارب میں سب سے بڑا بند سد مارب'' ان کی انجینری اور علم ہندسہ میں کمال کا ثبوت تھا۔ ان کے بندوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اور ان سے تین سو مربع میل تک دائیں بائیں باغات اس کثرت سے ہوگئے کہ سارا علاقہ چمنستان بن گیا تھا۔ ''سبا'' لفظ کے مفہوم میں تجارت کے معنی داخل ہیں۔ یہ ایک تاجر پیشہ قوم تھی۔ انہوں نے یمن سے شام تک ہر قسم کی سہولت کا انتظام کر رکھا

تھا۔ دونوں جانب دار چینی کے خوشبودار درخت کا سایہ تھا۔ قریب قریب فاصلے پر کارواں سرائے بنائی گئی تھی۔ جو شام تک ان کو اس آرام سے پہنچا دیتی تھی کہ ٹھنڈا اور شفاف پانی، میوؤں اور پھلوں کی بہتات اور فرحت بخش ہوا۔ یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ اپنے گھروں میں ہیں یا دشوار گزار سفر میں۔ راستہ متمدن شہروں سے آباد تھا۔ جہاں تجارتی منڈیاں تھیں۔ راستہ پرامن اور آباد تھا۔ اس میں قافلے دن رات نہایت حفاظت سے آتے جاتے رہتے تھے۔(34:18) ان کے کارواں سراؤں میں ٹھہرتے میوے اور پھلوں سے ان کی تواضع کی جاتی۔ سرد و شیریں پانی پیتے ہوئے حجّاز و شام تک آمد و رفت رکھتے۔ تو ہمسایہ قومیں رشک و حسد سے ان پر نگاہیں اٹھاتیں۔ اور حیرت و تعجب سے ان کے عیش و عشرت پر انگشت بدنداں رہ جاتے۔ بالکل ایسے ہی جیسے موجودہ دور میں ایشیا افریقہ کی غریب اقوام کے لوگ امریکہ اور یورپی لوگوں کی عیش و عشرت دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اہل سبا ایک طویل عرصہ تک اس جنّت ارضی کی نعمتوں سے لطف اٹھاتے رہے لیکن تمول، خوش عیشی اور ہر قسم کے تنعم سے آہستہ آہستہ ان میں بھی وہی منفی نفسیاتی تبدیلی آتی گئی۔ جو ان نعمتوں سے محرومی کا باعث بنتی ہے۔ تکبر و غرور میں آ کر انبیاء کے پیش کردہ دین حق سے سرکشی اختیار کر لی۔ اس دوران ان کے پاس تیرہ نبی آئے تھے۔ مگر انہوں نے مطلقاً توّجہ نہ دی۔ کیونکہ یہ اپنی مثبت نفسیاتی حالت کو منفی حالت میں تبدیل کر چکے تھے۔ معاشرتی اور اخلاقی برائیوں میں پڑ کر مادی ذرائع سے غفلت برتنی شروع کر دی۔ چنانچہ دیکھ بھال نہ کرنے کی وجہ سے ان کا سب سے بڑا ڈیم ٹوٹ گیا۔ اور سیلاب کی صورت میں ہر چیز کو بہا کر لے گیا۔ پانی اترا تو باغوں کی جنّت کی جگہ جنگلی جھاؤ اور بدذائقہ بیروں نے لے لی۔(34:16-17) تو یہ منتشر ہو کر دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ وہاں بھی آرام دہ سفر پر بھی ناک بھوں چڑھا کر سرکشی کرنی شروع کر دی۔ تو پھر یہ یمن کی شاہراہ اعظم تباہ برباد ہو گئی۔ تمام سرائیں اور منڈیاں اجڑ گئیں اور امن فتنوں کی نذر ہو گیا۔ سیلاب نے طبعی نقصان پہنچایا اور غلط استحصالی معاشی نظام نے تمدّنی نقصان (34:18-19) پہنچایا۔

اس سرگذشت میں ویسے تو عبرت کی کئی باتیں ہیں مگر دو باتیں بڑی اہم ہیں۔ کہ قوموں کو زندہ رہنے کے لئے کہ وہ ملک کے نظم و نسق اور فطری قوانین سے غافل نہ ہوں۔

اور دوسرے یہ کہ معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے تحت رکھ کر ناہمواریوں سے پرہیز کریں۔ خدا تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں میں سے ایک نعمت مومنین کے دلوں میں الفت اور اتحاد پیدا کرنا ہے۔ اور یہ نعمت بھی نفسیاتی تغیّر سے ہی مل سکتی ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ جانے والی قوم کبھی منزل مراد کو نہیں پا سکتی۔ قرآن میں اس نعمت کا

جگہ جگہ ذکر موجود ہے۔ کہا گیا کہ اس ضابطۂ حیات کو مضبوطی سے تھام کر معاشرہ کی صورت میں رکھو۔ اور تفرقہ سے بچو۔ اور اس نعمت کو بھی یاد کرو کہ تمہارے دل آپس میں پیوست کر دیئے۔ قرآنی تعلیمات سے یہی انسان میں نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ جو مستقل اور دیر پا ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی خواہ ایجابی ہو یا سلبی، انسان خود شعوری طور پر کرتا ہے۔ اور ان نعماء کا حصول نفسیاتی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ مثلاً کسی قوم کا ظلم واستبداد سے نجات پانا خدا کی نعمت ہے۔(2:48) اور یہ نعمت قوم کی مجموعی نفسیات میں تبدیلی لا کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس طرح ہم عصر اقوام پر معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور دفاعی لحاظ سے افضلیت (2:47) بھی نعماء خداوندی ہیں۔ زندگی کی تمام ضرورتوں کا مہیا ہونا (16:80) ارض وسماوات کی برکات کا مسخّر ہونا (31:20)۔ وحی جیسی نعمت سے زندگی کی کامیابی وکامرانی، ان تمام نعماء کا حصول نفسیاتی تغیّر کے بغیر ناممکن ہے۔(13:11)

نعمتوں کا مل جانا اور چھن جانا'' کی بنیادی شرط اس قوم کی نفسیاتی تبدیلی ہے۔ اگر یہ تبدیلی صحیح سمت میں ہو۔ وحی کے مطابق ہو۔ تو یہ ایمان کا نتیجہ ہوگی۔ غلط سمت کی طرف ہو تو یہ کفر کہلائے گا۔ یہ نعماء دعاؤں سے نہیں ملتیں۔ بلکہ ایمان اور عمل صالح جو مثبت نفسیاتی سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں، فطری نتیجے ہیں۔ جبکہ کفرانِ نعمت یعنی منفی نفسیاتی تغیّر سے اطمینان ورزق کی فراوانی کی جگہ بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے (16:112) یہ عذاب منفی سوچ کے تحت کرتوتوں کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے پوچھا جائے گا کہ خدا کی ان نعمتوں کو کس طرح استعمال کیا تھا (102:8)۔

یہ تو تھی نعمائے خداوندی اور انسانی نفسیات کے باہمی تعلق کی ایک مختصر سی جھلک۔ اس کے علاوہ بھی قرآن میں انسانی نفسیات کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے کٹ حجتیاں کرنی شروع کر دیں۔ کیونکہ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ قبطیوں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی گائے یا بیل کو معبود بنا لیا تھا۔(2:93) گوسالہ پرستی کا یہ جذبہ ان کے لاشعور کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔(2:51)

ان کے ہاتھوں سے اسے ذبح کرا کر دراصل اس نفسیاتی بیماری کا ازالہ کرنا تھا (2:54)

ان کے ہاں ایک قتل ہوگیا۔ مجرم کی تلاش کے لئے تفتیش شروع ہوگئی۔ کہا گیا کہ مقتول کے ایک حصّہ کو اس کے دوسرے سے مس کرو (2:72-73)۔ دراصل اس میں تفتیش کا ایک نفسیاتی طریقہ بتایا گیا تھا۔ کیونکہ میت خصوصاً مقتول کی میت کی دہشت ہر ایک پر طاری ہوتی ہے۔ اور قاتل کے اوپر تو ہر وقت سوار۔ آج کل بھی تفتیش کے لئے ایسے آلات تک ایجاد ہو چکے ہیں۔ جو تفتیش کے دوران ملزمان کا بلڈ پریشر، نبض کی رفتار، چہرے کے علامات اور آثار کو ریکارڈ کرتے

ہیں۔اب تو''Pyschology of crimes'' کے الگ ادارے بن چکے ہیں۔اس میں جرم کے محرکات اور مجرم کی پہچان کی شناخت کے لئے متعدد نفسیاتی طریقے وضع کئے گئے ہیں۔یہ بھی ایک تفتیش کا نفسیاتی طریقہ تھا۔اور مجرم کے چہرے،خوف،اضطراب اور بے معنی حرکت سے اس کی شناخت ہوگئی۔یاد رکھیں ذبیحہ گائے کے واقعہ سے اس کا کئی تعلق نہیں ہے۔یہ الگ واقعہ ہے۔

قرآنی تعلیمات میں مبشرات کا نفسیاتی پہلو:

قرآنی تعلیمات دلوں کی مضبوطی کا باعث بنتی ہیں۔جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی طور پر حق وصداقت کی راہ میں آنے والی ہر مشکل،تکلیف،اور سازش کا صبر وحکمت،جرات،حوصلے اور استقامت کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ایمان ان کے دلوں کی گہرائیوں میں (نفسیاتی) اتر چکا ہے۔وحی خداوندی ہر گوشہ میں ان کے لئے وجہ تقویت بنتی ہے۔یہ ان کے دلوں کو مضبوط کر کے ان کی رہنمائی صحیح منزل کی طرف کرتی ہے۔اور ان کو خوشگواریوں کی مبشرات (16:102) اور حق و باطل کی کشمکش میں ثابت قدم رہنے کا نفسیاتی تغیّر پیدا کرتی ہے۔(8:11) لڑائی کے دوران ملائکہ کی بشارت مومنین کے دلوں میں نفسیاتی طور پر اطمینان وسکون کا سبب بنتی ہے (8:10)۔اور گذشتہ اقوام کی تاریخ بھی دل کے ثبات کے لئے (11:120) یہ سکون اور اطمینان کائناتی قوّتوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔اور ان کے غیر مرئی لشکر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں (9:26)۔

انقلاب یونہی اتفاقیہ طور پر، یک لخت رونما نہیں ہوتا۔اور یہ سارا عمل انسانی نفسیات کے تحت پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔اور اس کے لئے ایک طویل عرصہ درکار رہتا ہے۔نفسِ انسانی کی تین صلاحیتیں یا گوشے نفس (امّارہ) نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ،نفسِ انسانی کی وسوسہ انگیزیاں نفسِ امّارہ اور اس کے تحت غلط کام کے بعد نفس لوامہ کے تحت احساس ہوتا ہے۔جو کئے پر نادم ہوتا ہے۔یہ بھی انسان کی منفرد نفسیاتی کیفیّت ہے۔جو حیوان میں نہیں اور جب اس کشمکش میں خیر کی قوت شر پر غالب آجاتی ہے تو اسے نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔دورِ حاضر کی اصطلاح میں متوازن شخصیت (Balanced Personaltiy)۔انسانی جذبات کو نہ تو فنا کیا جاسکتا ہے نہیں دبایا جاسکتا ہے۔ان کو دبانے سے انسان نفسیاتی عوارض کا شکار ہوجاتا ہے۔جن کے نتائج فرد اور معاشرے کے لئے بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔قرآن ان کو دلوں کی بیماریاں یعنی''Mental Disorders'' کہتا ہے (2:40)، (8:49)، (3:7) وغیرہ۔دلوں میں وسوسے،شکوک وشبہات،ان کو کشمکش پیہم اور اضطراب مسلسل میں رکھتے ہیں۔(16:5-16) ان اخلاقی بیماریوں سے انسانی ذات انتشار اور درماندگی کا شکار ہوجاتی ہے۔اس سے ضد،تعصّب،فریب کاری،کینہ،بغض،حرص ولالچ عداوت،خفیہ سازش،نخوت

وتکبر، غیبت، جھوٹ، تہمت بازی اور بہتان جیسے گھناؤنے امراض شامل ہیں۔ انسان اور قوموں پر ان نفسیاتی بیماریوں کے بڑے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ اور انہی کی وجہ سے انسان سرکش ہوجاتا ہے۔ اور سارا معاشرہ بدنظمی کا شکار ہوکر رہ جاتا ہے۔ ڈر، خوف اور توہم پرستی ذہنی الجھن (Complex) کا سبب بنتی ہیں۔ قرآن نے ان تمام دل کی بیماریوں کا ذکر کرکے اس کا علاج قرآن پر عمل کرنا بتایا ہے۔ (10:59) اس کے برعکس ان سے سرکشی سے دل پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ (2:7)(7:10)

قرآن نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً عہد کی پابندی نہیں کی۔ احکام خداوندی کا کھلا انکار سرکشی اور انبیاء کی تذلیل۔ اور فخر سے کہا کہ ہمارے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔ (4:155) یعنی اعلان کر دیا کہ ہمیں مزید علم کی ضرورت نہیں۔ تو ان اعمال کی وجہ سے اللہ کی لعنت یعنی علم کی برکات وسعادتوں سے محروم ہوگئے۔ ماہرین نفسیات نے انسان کی ذہنی پریشانیوں جنسی معاملات، کاروباری تعلقات اور اختلال ذہنی (Psychotic Condition) وغیرہ کے علاج کے لئے مختلف علاج وضع کئے ہیں۔

دلوں پر مہر اس وقت لگتی ہے جب انسان غور وتدّبر سے کام نہ لے۔ ضد اور تعصّب کی بناء پر بات ہی نہ سنے۔ تو فکر کی صلاحیت معطل ہوجاتی ہے۔ جیسے محفل میں آکر بیٹھتے تو ہیں مگر بات کو غور سے سنتے ہی نہیں تھے۔ تو اس سے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے۔ اور کانوں میں ڈاٹ لگ جاتی ہیں۔ اور یہ تالے خود ہی کے لگائے ہوتے ہیں۔ کہیں خارج سے نہیں لگتے۔ ان کے اپنے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ جاتے ہیں۔ (83:14)

دلی امراض (Mental Disorders):

دلوں کے عوارض (قُلُوْبٌ مَّرَضٌ) کو ماہرین طب نفسی (Psychiartists) نے ذہنی ونفسیاتی امراض سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی اقسام اور درجہ بندی کی ہے۔ ابتداء امریکی ماہرین نفسیات نے کی۔ اور تشخیص اور شماریاتی کتابچہ برائے ذہنی امراض کی تین فہرستیں شائع کیں۔ ''Diagnositcs and Statistical Manual of Mental Diseases'' مگر پھر بھی اتفاق نہ ہوسکا۔ UNO نے بھی تمام موجود ذہنی اور جسمانی بیماریوں کی جامع درجہ بندی کی۔ اس پر ماہرین نے سات برس لگائے۔ اور تمام موجودہ ذہنی امراض کی ایک مکمل فہرست سامنے آئی۔ اس فہرست کو International Statistical classification of diseases in Injuries and cause of Death. ''بین الاقوامی شماریاتی فہرست برائے امراض، زخم وموت'' کہا جاتا ہے۔ مخفف طور پر اسے ''ICD-9'' کہا جاتا

ہے۔اس فہرست کا ایک حصّہ ذہنی نفسیاتی امراض کی درجہ بندی پر مشتمل ہے۔ICD-9 تمام ذہنی بیماریوں کو چار گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اوّل۔ عضوی اختلالِ ذہنی(Organic Psychotic Conditions)

دوم۔ دیگر اختلالِ ذہنی۔(Other Psychoses)

سوم۔ اعصابی خلل،شخصیاتی خلل،دیگر ذہنی خلل(Neuratic Disorders,Personality Disorders or other Non-Psychotic Mental Disorders.

چہارم۔ ذہنی ابطاء(Mental Retardations)

اس میں چندقابل ذکر نیوراتی امراض تشویش(Anxiety)بے جاخوف(Fobic State) خبط (Obsession) اجبّار(Compulsion)ہسٹیر یاوغیرہ۔

اوران میں شدید بیماری حزن وخوف ہے۔(Fear and Grief)

جبکہ قرآن نے اتباع وحی کا نتیجہ خوف حزن سے مامونیّت بتایا ہے۔(2:36)عرب حزن کو معاشی پریشانی کے لئے استعمال کرتے تھے۔علم النفس کی تحقیق کے مطابق بھی اکثر نفسیاتی عوارض کا بنیادی سبب خوف ہے۔اس سے ذات میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔اس کا لازمی نتیجہ حزن ہوتا ہے۔

قرآن نے منافقت کو بھی نفسیاتی مرض قرار دیا ہے۔(2:10)جبکہ ماہرین نفسیات کی ریسرچ کی رو سے جب تک نفسیاتی مرض کی علّت معلوم نہ ہو جائے نہ صرف یہ کہ ان کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ ہر غلط علاج سے مرض بڑھتا جاتا ہے۔جیسے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے دس اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔یوں بڑھتے بڑھتے کذب اور جھوٹ ان کا شعار بن جاتا ہے۔کفر کا بنیادی تعلق انسانی فہم وادراک (نفسیات) کی غلط نگہی سے ہے۔اس لئے اس نفسیاتی بیماری سے پیدا ہونے والے کرب واضطراب کو قرآن نے عذاب الیم کہا ہے۔(2:10)اگر کفر کا نتیجہ دردسر تو منافقت کا نتیجہ دردجگر ہے۔

ماہرین کے مطابق خوف وتشویش نیوراتی امراض کی اوّلیں اور سب سے زیادہ تعداد میں پائی جانے والی قسم ہے۔بعض اوقات خوف وفکر کوئی مخصوص شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔مثلاً اگر کسی کو یہ کھٹکا لگا رہے کہ وہ اپنی عزیز ترین متاع سے ہاتھ دھو بیٹھے گا تو یہ ذہنی عمل(Neoratic Disorder) کہلائے گا۔کسی حقیقی خطرہ کو سامنے دیکھ کر تشویش تو ایک قدرتی عمل ہے۔اوراس سے بچاؤ کی تدبیر کرنا بھی لازمی امر ہے۔یہ بیماری کے زمرے میں نہیں آتا۔ماہرین نے ان

دونوں قسم کی تشویش میں فرق کیا ہے۔ عام تشویش تو حالات کے تبدیل ہونے سے ختم ہوجاتی ہے جبکہ نیوراتی مریض پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح بے جا خوف (Phobic State) میں مبتلا مریض فرضی چیزوں یا خطرات سے ڈرتا ہے۔ مثلاً سرخ پھول دیکھ کر، کتاب کا صفحہ 19 دیکھ کر۔ اونچی بلڈنگ سے نیچے دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ بے جا خوف ہزاروں صورتیں اختیار کرسکتا ہے۔ ابھی تک صورتیں خوف وتشویش کی مختلف شکلوں کی باقاعدہ فہرست سامنے نہیں آئی۔ اس کی وجہ سے Neorosis نیوراسس (شدید جذباتی پیچان) پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کا اخراج ونکاس نامعلوم رہتا ہے۔ اور تشویش کی بڑھی ہوئی کیفیّت سے انسان پر جذباتی آزادی وجذباتی کیف وانبساط کی راہیں بالکل بند ہوجاتی ہیں۔ تشویش کی خاصیت ہی یہ ہے کہ فرد کو نہ اس کے منبع کا شعوری احساس ہوتا ہے اور نہ اس پر قابو پانے کی قدرت ہوتی ہے۔ یہ مجبوری اور بے بسی اس کیفیّت کو مزید پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے زیر اثر منفی جذبات مثلاً غصہ، چڑچڑاپن، مخاصمت، عداوت وغیرہ کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جو مزید پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ مریضانہ منزل ہے۔ اور اس کی طرف توّجہ دینا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ ورنہ شدید صورت میں خلل دماغ (Psychosis) کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس بیماری کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ ہر عمر کے نارمل جذبات اور تقاضات کا اندازہ کر کے ان کی صحت مند نکاسی اور نشوونما کی طرف خصوصی توّجہ دی جائے۔ ذہنی نشوونما کا بڑا وسیلہ ہمارا ادارک ہے۔ اور ہمارے ادراک کی نوعیّت کا بڑی حد تک تعین ہمارے شوق ودلچسپی سے ہوتا ہے۔ اگر ذہن پر کوئی فکر یا تشویش چھائی ہوئی ہو اور اس کا جذباتی آہنگ مجروح ہو چکا ہو تو ہو عموماً اپنی دلچسپی کی چیزوں کا بھی پورے طور پر ادراک نہیں کرسکتا۔

اس طرح علم کی تمام شاخیں سیاسیات، معاشیات، سائنس ان تمام علوم کا مبتداء ادراک بالحواس اور عقل ہیں۔ (Percepts and Concepts) اگر مشاہدہ یا ادراک درست نہ ہوگا تصوّرات بھی غلط ہونگے۔ تو پورا علم ہی مشکوک ہوجائے گا۔ ان نفسیاتی مریضوں کا ذہنی ادراک مسخ شدہ صورتوں میں ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں تو یہ تمام ذہنی عوارض موجود ہیں۔ یعنی جذباتی گھٹن، جذباتیت، ذہنی کشمکش، دماغی خلل اور دیگر عوارض وغیرہ وغیرہ۔ ملک میں دہشت گردی کرپشن اور ہوشربا مہنگائی کی وجہ سے ذہنی اختلال (Psychoses) میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ BBC کی ایک رپورٹ کے مطابق اگر ایک عام آدمی کے ذہن میں غیرارادی طور پر خیالات آتے رہتے ہیں۔ مگر ایک ہی سوچ باربار آئے۔ اور چاہنے کے باوجود نکال نہ سکے۔ تو یہ شخص سائنسی اصطلاح میں خبطی (Obsessional) کہلاتا ہے۔ بعض اوقات یہ خیالات ڈراونے بھی ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات بالکل لغو اور بے سروپا بھی۔ اور مناسب علاج نہ کرنے

سے یہ مرض شدت اختیار کر لیتا ہے۔دوسرا مرض نفسیاتی اصطلاح میں اجبار(Compulsion) کہتے ہیں۔اس میں مبتلا شخص کوئی ایک حرکت یا ایک سے زیادہ حرکات بار بار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔مثلا بار بار صابن سے ہاتھ دھونا، بجلی کے بٹن کو بار بار اونچے نیچے کرنا۔پاؤں بار بار دھونا۔کپڑے بار بار استری کرنا۔برتنوں کا بار بار دھونا۔حالانکہ شعوری طور پر وہ ان افعال کو لامعنی اور لغو سمجھتا ہے۔لیکن وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔وہ یوں محسوس کرتا ہے، گویہ یہ عمل کوئی بیرونی انجانی قوت اس سے کرا رہی ہے۔

ایک اور مرض اختناق (Hysteria) ہے۔اس بیماری کی بہت سی علامات ہیں۔اس بیماری میں حافظہ کا کھونا (Amnesia)ضعف اعصاب اور دیگر تمام ہوتے ہیں۔(Neoratic Disorders)اس سلسلے میں کتاب ''نفسیات''، حمید ہاشمی وغیرہ کی تصنیف کا مطالعہ مفید رہے گا۔دوسری اہم کتاب پروفیسر ساجدہ زیدی کی''انسانی شخصیت کے اسرار ورموز''جو علی گڑھ سے صدر شعبہ تعلیم سے ریٹائر ہوئی ہیں۔اس میں شعور اور لاشعور کی ایک پراسرار دنیا سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔دوسرا فرائیڈ کی نفسیات از شہزاد احمد۔نفسیات اور اخلاقی اقدار یا عقائد کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔اصل میں انسان وحی خدا اور اقدار سے انکار کرتا اس لئے ہے کہ اسے ظلم وستم کی کھلی چھوٹ مل جائے۔اس میں انسانی نفسیات کا بڑا دخل ہے۔سارتر نے کہا میری آزادی یہ معلوم کر کے آزادی سے دوچار ہوتی ہے۔کہ یہ قدروں کی ایسی بنیاد ہے جس کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہے۔اس پر علی عباس تنقید کر کے کہتے ہیں''یہ بات موجب حیرت ہے کہ آزادی کا وہ تصوّر جس کی اپنی کوئی بنیاد نہ ہو۔قدروں کی بنیاد کیسے بن سکتا ہے؟

اور تعقل جو خود ارتقائی مراحل میں ہے اس لئے اسے حق وباطل کو جانچنے کے لئے کیسے معیار بنایا جاسکتا ہے۔(Mental Process)فریڈرک نطشے (1844) بھی صداقت کو تغیّر پذیر کہتا ہے۔اس کے ہاں خیر وشر کا معیار ہے کہ جو کچھ بھی قوّت سے حاصل ہو وہ خیر ہے۔جو کمزوری سے ظاہر ہو وہ شر ہے۔خدا مر چکا، ایسا فوق الانسان خدا تیرا سب سے بڑا خطرہ تھا۔وہ قبر میں گیا اور تم اٹھ بیٹھے۔اس کے نزدیک جذبات ہمارا نصب العین متعیّن کرتے ہیں۔اور عقل ان کے حصول کے لئے وسائل فراہم کرتی ہے۔

قرآن کا موقف:

علامہ اقبال کے نزدیک قدیم یونانی فلاسفہ کا طریق کار قیاسی تھا۔یہ حضور ﷺ تھے جن پر زندگی کے علم وحکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے۔جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔علامہ کے نزدیک اسلام کا ظہور عقل استقرائی اور تجرباتی (Inducive and expeirmental) کا ظہور ہے۔علامہ پرویزؒ لکھتے ہیں''نزول قرآن کے بعد عقل کے

اس تجرباتی طریق (41:53) ساتھ ایک اور عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ وسائل نشر و اشاعت کی ہمہ گیری کی وجہ سے قرآنی حقائق بھی فضائے عالم میں عام ہو چکے اور ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ ہے انسانی فکر شعوری، غیر شعوری طور پر ان سے متاثر ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل اپنے تجربات سے پہلے، جس مقام تک صدیوں میں جا کر پہنچتی تھی اب وہ نسبتاً قلیل ترین عرصہ میں پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے علی رؤس الاشہاد کہا جا سکتا ہے کہ بزم ہستی میں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے۔ وہ اسی آفتابِ جہاں تاب کی ضیا باریوں کا تصدق اور گلشن عالم جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اس جانِ بہار کی نکہت بیزیوں کا رہین منت ہے ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یاز نورِ مصطفیٰ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور صاحب اقتدار نہیں ہے۔ اس لیے اس کے دیئے ہوئے اقدار و احکامات کی محکومیّت اختیار کی جائے۔ اس قرآن میں تمہارے شرف و مجد کا راز مضمر ہے۔ اگر اس سے روگردانی کی تو تم بھی اقوام سابقہ کی طرح ذلّت و رسوائی کا شکار ہو جاؤ گے۔ ہر طرف سے کٹ کر صرف اس کے قوانین کی پیروی کرو اور اس میں کسی اور کے فیصلے شامل کر کے کا ارتکاب نہ کرو۔ خدا کا قانون اس قدر بلند اور عظیم المرتبت ہے کہ کوئی اور قانون اس سے بہتر ہو نہیں سکتا (31:20) جو لوگ ان قوانین کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی تخریب سے محفوظ بھی رہتے ہیں اور ان کو ان کی محنت کے بھرپور نتائج بھی ملتے ہیں۔

قرآن میں تناقض و تضاد

تناقض و تضاد کی فنی تعریف یہ ہے کہ کسی شے میں ایک ہی وقت میں دو متضاد صفات کو سمو دیا جائے۔ یا اثبات ونفی کو ایک ہی مقام پر جمع کر دیا جائے۔مثلاً: یہ کہنا کہ آسمان ہے اور اس کی بابت واضح کرنا کہ نہیں ہے۔

اب ظاہر ہے کہ دونوں وضاحتیں کارآمد نہیں ہوسکتیں۔ یا تو معدوم کو مانا جائے یا غیر معدوم۔ وہ ہیئت بھی ہونیست بھی ہو۔ یہ ناممکن ہے۔تناقض بقول امام جبّار ہمدانی (1025) دو باتوں میں سے ایک کی نفی یا اثبات کا نام ہے۔یعنی جو تاثر ایک بات کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہو دوسری بات اسے زائل کر دے۔قرآن میں تناقض و تضاد ناممکن ہے۔

❁❁❁

کائنات کی تسخیر ایمان کا بنیادی حصّہ ہے

کاروانِ زندگی بے منزل است　　در نگاہش آدمی آب و گل است

یہ ہے بےمقصد زندگی اس آوارہ قوم کی جبکہ سفر میں تو ایک متعینہ منزل ہوتی ہے۔ مغربی تہذیب کا بنیادی فلسفہ۔

۞ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ (3:190)

۞ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ (3:191)۔

۞ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ (3 :192)

۞ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۴﴾ (29:44)

عقل کا مقام:

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست　　نورِ افرشتہ و سوز دل آدم با اوست

فقر بخشی؟ باشکوہ خسرو پرویز بخش　　یا عطا فرما خرد بافطرت روح الامین

(دو عالم یعنی دونوں دنیائیں)

قرآن تو ذرّہ کو آفتاب بناتا ہے:

اگر یک قطرۂ خون داری، اگر مشتِ پرِی داری　　بیامن باتو آموزم طریق شہبازی را

''ہجرت'' قرآن کی نظر میں:

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است　　ایں از اسبابِ ثباتِ مسلم است

معنی اُو از تنک آبی رم است　　ترکِ شبنم بہرِ تسخیریم است

(یعنی جب پانی ختم ہو جائے تو اس تالاب سے تو مویشی اٹھ جاتے ہیں)

عقلِ انسانی کو قرآن کے تابع کر دو:

عقل بے مایہ امامت کی سزا وار نہیں　　رہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ　　تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

جنّت کی کہانی، اقبال کی زبانی:

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی　　عجب ایں کہ تو ندانی رہ و رسمِ آشنائی
چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد　　دل ناصبور دارم چوں صبا بہ لالہ زارے
چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے　　تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
زشرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے　　سرِّ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں را کہ نہایتے ندارد　　بہ نگاہے ناشکیبے بہ دل امید وارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے　　نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

......☆......

ارتقاء اور جفاکشی:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغ مصطفوی ﷺ سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز　　سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی　　ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما، تپ و خراش و تراش　　زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید　　میانِ قطرۂ نیساں و آتش عنبی
اس کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام　　یہی ہے رازِ تب و تاب ملتِ عربی
نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے　　مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

صلوٰۃ کی قرآنی تفسیر

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (29:45)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ (24:41)

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ (24:41)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ (1:5)

اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ (11:56)

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (19:59)

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ (19:59)

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ (7:170)

شرطِ صلوٰۃ:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ (22:41)

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ (30:31-32)

فرقوں کی موجودگی میں صلوٰۃ نہیں ہو سکتی:

صلوٰۃ کے لئے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص (42:38)

یعنی پورے دین کو قائم کرنا نظام کو قرآنی شکل دینا۔

فَحْشَآءِ بخل کرنا۔ اپنے لئے سمیٹ لینا، اَلْمُنْكَرِ۔ عقل فریب کی حیلہ کاریاں۔

نظریہ کا فرسودہ ہوجانا:

علامہ اقبال: جس قوم نے اپنے ہاں کے بلند تصوّرات کو اس طرح فرسودہ کر دیا ہو تو وہ تصوّرات اس قوم کے اندر دوبارہ وہ طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ کسی نئی قوم میں حاصل کرینگے۔ تاریخ کا یہ فیصلہ ہے جس قوم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بلند آئیڈیاز کو فرسودہ کر دیا ہو تو وہ فرسودہ آئیڈیاز اس کے ہاتھوں دوبارہ اور یجنل آئیڈیاز بن کر طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔

لیکن قرآن مایوسی سے منع کرتا ہے اور مجھے یہ کب حق حاصل ہے کہ میں مایوس ہوجاتا ؎

یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں

اگر تاریخ کا یہ فیصلہ ہے تو وہ قوم ان کو صحیح مفہوم نہیں پہنائے گی جس نے اپنے ہاتھوں سے ان کو فرسودہ کر دیا ہو۔

......☆......

قرآن کا کافی ہونا:

اَوَلَمۡ یَکۡفِہِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ ؕ (29:51)

ایک حدیث ہے "مَنۡ لَّمۡ یَتَغَنَّ بِالۡقُرۡاٰنِ فَلَیۡسَ مِنَّا۔۔۔

''جس شخص کو قرآن اور چیزوں سے مستغنی نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے''

یہ حدیث قرآن کی اس آیت کی تفسیر ہے۔

عربی میں ''غَنی'' اگر غ زبر کے ساتھ ہو تو اس کے معنی مستغنی ہیں۔ اگر غ زیر کے ساتھ ہو تو ''غِنی'' گانے کو کہتے ہیں۔ جس کا معنی یعنی'' گانے والا'' اس کا ترجمہ کرتے ہیں جو قرآن کو گا گا کر ہی پڑھے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کے قول: حَسۡبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ۔

جو قوم غنی کے یہ معنی کرے۔ تم ان سے کیا توقع کرتے ہو۔ اَوَلَمۡ یَکۡفِہِمۡ (29:51) کہا تھا۔ اس کے بعد کونسی دلیل رہ جاتی ہے۔ دلیل مانگتے ہو۔ کَفٰی بِاللّٰہِ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکُمۡ (29:52)

وَمَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی ۔(17:72)

سخن زنامہ و میزان دراز تر گفتی ہزار حیف نہ بینی قیامت موجود

نداند آں غلام احوال خودرا کہ دوزخ را مقام دیگرے گفت

......☆......

بارٹر سسٹم کے بعد سکّے کی ایجاد، جس کو طاغوتی قوّت بنا یا دیا گیا:

دنیا کا پہلا سکہ (Lydain lion) لیڈئین لائن 610-600 ق م میں لیڈیا، ایشیاء کوچک (موجودہ ترکی) نے بنوایا تھا۔ 600 ق م چین نے بھی سکہ بنایا۔ 550 ق م یونان میں بھی بنا جبکہ سب اس پر متفق ہیں کہ پہلا سکہ لیڈئین لائن تھا۔ یہ ایجاد تو ایک

ضرورت کے تحت ہوا تھا کہ کون من بھر غلہ اٹھائے پھرے؟ ان کی بجائے ایک روپیہ جیب میں ڈالا تو برابر ہو گیا۔ یہ ایک ضرورت تھی۔ جو ابلیسی نظام میں بدل گئی اب ضرورت سے زیادہ سمیٹنے کی کوئی حد نہیں۔ ہموار تقسیم نہیں ہے بلکہ اربوں ڈالر سمیٹتے جایئے۔ وہ فرق جو اس ابلیسی لعنت نے دنیا میں پیدا کر رکھا ہے۔

قرآن کے معاشی نظام کی دلکش مثال:

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ دَآبَّةٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَهَا ‌ۖ (29:60)

دیکھو ذی حیات جتنے بھی ہیں وہ اپنے رزق کو اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے نہیں ہوتے۔ یعنی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتے۔

اَللّٰهُ يَرۡزُقُهَا وَاِيَّاكُمۡ ‌ۖ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۞ (29:60)

سب کو خدا کے قانون ربوبیّت کے تحت رزق ملتا ہے۔ اگر تم بھی اپنے ہاں ایسا نظام نافذ کر دو جس میں انفرادی لوٹ کھسوٹ اور ذخیرہ اندوزی چھوڑ دو تو تم سب کو اس طرح سے رزق ملتا رہے گا۔ وہ اس لئے کہ وہ سب کی سنتا اور ان کی ضروریات سے واقف ہے۔ (11:62)

......☆......

عقل وفکر کے بغیر ایمان، ایمان نہیں کہلاتا:

وَالَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِّرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ لَمۡ يَخِرُّوۡا عَلَيۡهَا صُمًّا وَّعُمۡيَانًا ۞ (25:73)

وحی کے بغیر انسان: اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ كَفَّارٌ ۞ (14:34)

وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ كَفُوۡرًا (17:67) هُوَ خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ ۞ (16:4)

وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ اَكۡثَرَ شَىۡءٍ جَدَلًا ۞ (18:54)

وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ۞ (17:11) وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا ۞ (17:100)

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۞ (70:19) اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَـكَنُوۡدٌ ۞ (100:6)

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ۞ (33:72)

اب اگر اسے علیٰ خالہ چھوڑ دیا جائے تو یہ کچھ بنے گا۔ یہ ہے انسانی فطرت کی تردید ایسا کیوں ہوتا ہے کیونکہ اس میں 9/10 حصّہ حیوان کا ہوتا ہے کیونکہ اوّل سے لیکر موجودہ پیکر انسانی اور حیوانی میں کوئی فرق نہیں ہے اس کے اور (وَ نَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ) (32:9) اختیار وارادہ مل گیا تو یہ "خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ۬ؕ (13:5)" ہو گیا باقی مخلوق سے الگ تھلگ۔ اب اگر اس کو خارج سے ہدایت نہ ملے تو وہی حیوان کا حیوان ہے۔ الانسان سے مراد "وہ جو وحی پر نہ چلے" جس کے سامنے وحی نہ ہو۔ یونان کے مفکروں نے انسان کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہیں۔ حیوان ناطق یعنی بولنے والا حیوان اور اوزار بنا سکتا ہے۔

ان لامحدود صلاحیتیں پر اگر وحی کا کنٹرول نہ ہو تو ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ (30:41)

حرکتِ ما کمتر از فرعون نیست لیک اورا عون مارا عون نیست

"عون سے مراد ساز وں سامان" قوّت اور ذرائع۔

انسانی جبلّت۔(Instinct)

قرآن نے کہا کہ جوحیوانات کی جبلّتیں (Instincts) وہ ساری انسان کی طبعی زندگی میں موجود ہیں اور سایئکالوجسٹ نے بھی ان کوتین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔تحفظ خویش جذبۂ غلبیت اور جذبۂ تولید۔

i) Self preservation ii) Self aggression iii) Self procreation

یہ تینوں خصوصیات ہرانسان میں موجود ہیں۔لیکن چونکہ اس کی قوّتیں لامنتھیٰ ہیں اس لئے اگر اسے علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو پھر وہ ایسا حیوان بن سکتا ہے جوتصوّر میں ہی نہیں آتا۔اس لئے اس کیلئے حد بندی کی ضرورت تھی۔اس لئے وحی کی ضرورت پڑی۔ یعنی یہ تصوّر کہ انسانی فطرت ہے۔اسلام دینِ فطرت ہے اور انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔یہ بالکل باطل اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کے بالکل خلاف اور برعکس ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ (11:118)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ (10:99)

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ (10:99)

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾ (90:10) فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (18:29)

اب تصوّف نے آکرتو ان جذبات کی نفی کر کے نفس کشی کا سبق دیا جبکہ سیکولرزام تو ان حدودو قیود کوتسلیم نہیں کرتا جس طرح جی چاہے تم تسکین کرتے چلے جاؤ۔لیکن قرآن

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ (30:29)

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ (30:30)

توصیح دولت زندگی یہ ہے کہ تمام غلط راستوں سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہات کا مرکز اس نظام کو بنالے جو اس قانون تخلیق کا تقاضا ہے۔جس پر اس نے تمام انسانوں اور کائنات کو پیدا کیا ہے اور اس کے قانون تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور یہی

صحیح توازن بدوش اور سیدھا راستہ ہے۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ نگاہِ اُو بہ شاخِ آشیانہ

وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝۳۱ (30:31) مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ۝۳۲ (30:32)

اب انسانوں کے پاس جو ہے تو وہ معیار تو ہو نہیں سکتا ہر انسان اپنے آپ کو سچا کہتا ہے باہر کی کوئی کسوٹی ہونی چاہئے۔ جس پر سارے جا کر اپنے اپنے مسلک کو پرکھیں۔

1- یعنی زندگی گزارنے کا وہ متوازن راستہ جو خود قائم ہے اور تمہیں قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس میں اعتدال و توازن ہے۔ لغزش اور لڑکھڑاہٹ نہیں ہے۔

خارجی کائنات کے تمام کرّے، یہ اختلافِ لیل و نہار ''تکویرِ شمس و قمر'' خزاں اور بہار ایک ایک ذرہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ وہ قانون کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

1- یعنی پہلی بات یہ کہ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ (30:30) کے قانون کے تحت زندگی گزارتا ہے۔

2- دوسری بات یہ قوانین خود ساختہ نہ ہوں بلکہ وحی پر مبنی ہوں۔ جس طرح کائنات کا سلسلہ کسی حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔

3- اس کائنات میں ارتقاء جاری ہے ہر شے پہلے دن سے بنی بنائی ہوئی تکمیل تک پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ ایک لائف سیل کروڑوں سال تک ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ بالآخر انسان کی شکل میں آجاتا ہے یہ ہے۔ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ (30:30)

4- خدا نے اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کئے۔

5- انسان کو بھی اس طریقہ تخلیق کے ذریعہ پیدا کیا گیا ہے جس طرح باقی کائنات کی تمام مخلوقات اور اشیاء ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان کے سامنے دو امکانات نہیں رکھے گئے۔ وہ ایک قانون پر چلنے کیلئے مجبور ہوتے ہیں۔ یہ ان کی فطرت کہلاتی ہے جبکہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ اسے اختیار و ارادہ کی لازوال دولت سے نوازا گیا ہے۔ اگر وہ تباہی اور بربادی سے بچنا چاہتا ہے تو اپنے اِرادے سے خدا کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق زندگی گزارے۔ تو یہ ہے ''الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ''۔

6- خواہ کوئی فرد ہو، قوم ہو یا نوع ہو۔ ''اِبۡتِلَآءٌ'' یعنی اپنے آپ کو ٹیسٹ کرنے کیلئے پہلو بدلنا ''مواقع پیچانا'' اگر رکاوٹوں کو عبور کرنے کے قابل ہوئے تو آگے بڑھو گے۔ یہ ہے دین القیم اور جو انواع اس ٹکراؤ میں مغلوب ہو جاتی ہیں تو وہ ایک مقام پر رک جاتی ہیں یا پھر ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے جہنّم۔

حضرت لقمان علیہ السلام

لقمان علیہ السلام کا ذکر زمرۂ انبیاء میں قرآن میں کہیں بھی نہیں ہے ان کی بہت سی ضرب الامثال عربوں میں مشہور تھیں۔ جنہیں حکمت کی باتیں کہا جاتا ہے۔

یہ ھود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام کے درمیانی شخصیت ہیں قرآن کے مطابق، جن کی تعلیمات کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ ھود علیہ السلام جو اپنے تابعین کی تباہی کے بعد اپنے دیار سے نکل کر حجاز کی طرف آ گئے تھے اور اس علاقہ میں ان کی نسل عادِ ثانیہ بڑھی اور پھیلی ان میں ایک نیک سیرت حکمران گزرے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران ھودؑ کی شریعت کا متبع تھا اور اپنی حکومت اور دانائی کے لحاظ سے حکیم لقمان کے نام سے مشہور تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ داؤدؑ کے زمانے میں تھے اور ایک ہزار سال تک زندہ رہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مصر کے رہنے والے ایک حبشی غلام تھے۔ مستشرقین بھی اس باب میں کوئی حتمی رائے نہیں رکھتے۔ اس کی چند باتیں جو قرآن نے محفوظ کر لیں۔

۞ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ ۔۔۔(31:12) شکر ''وہ طریق جس سے کسی کی محنت بھرپور نتائج پیدا کر دے'' عرب فلاسفی یعنی نظری چیزوں سے واقف نہیں تھا بلکہ وہ صرف محسوسات سے واقف تھا۔ قرآن یا عربی زبان کے تمام الفاظ وہ تصوّراتی یا نظری نہیں ہوتے بلکہ وہ محسوس چیزوں پر ان کا اطلاق کرتے تھے۔ وہاں سے پھر ایک تصوّر لیتے تھے۔ بات اس لئے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وہ محسوس چیزوں پر اس کا اطلاق کرتے تھے۔

شکر۔ جس کی محنت بھرپور نتائج پیدا کرے'' وہ بکری، اونٹ یا بھیڑ جس کے تھن دودھ سے اتنے بھرے ہوئے ہوں کہ ان میں سے خود دودھ ٹپک رہا ہو۔ یہ جو تھن تھا اسے ''مشکور'' کہتے ہیں۔ اب اس محسوس چیز کیلئے جب یہ لفظ بولتے تھے تو پھر بات آگے چلتی تھی۔

''کوئی ایسا طریق جس سے انسان کی محنتیں ایسے بھرپور نتائج پیدا کریں کہ وہ دودھ کے قطروں کی طرح ٹپکتے ہوئے نظر آ جائیں۔''

اللہ شکر'' سے مراد وہ کام جو خدا نے متعین کیا ہوا ہے، خدا کے راستے میں بھرپور محنت کر کے اس طرح کے نتائج اخذ کرنا۔''

فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۱۲﴾ (31:12)

خدا ان تعریفوں سے ماورا ہے مستغنی ہے اسے حمد کی ضرورت نہیں ہے مذہب میں ہر عمل خدا کیلئے یعنی خدا کے نام پر جبکہ دین وہ تو شروع سے آخر تک حمید ہی حمید ہے۔ ''فعیل'' کے وزن پر ہے۔

جس میں انسان کا ہر فعل اپنی ذات کیلئے ہوتا ہے۔ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۷﴾ (3:97)

حکایتِ قد آں یارِ دلنواز کنم　　بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

جب یہ سب کچھ نہیں تھا تو تب بھی وہ حمید تھا۔

دین اور مذہب میں بنیادی فرق، تقلید وارتقاء:

وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ؕ (31:21)

یہ تو مسلمانوں کا حال ہے جبکہ دوسری مذہب گزیدہ قومیں جن کے پاس نہ تو کتاب اصلی شکل میں ہے نہ ہدایت ہے اور نہ ہی علم۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا ہُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ ﴿۲۰﴾ (31:20)

ہمارے ہاں تو مقلد وہ ہیں جو ائمہ فقہ میں سے کسی ایک امام کی اتباع کرتے ہیں۔ جو بخاری وغیرہ کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو غیر مقلد کہتے ہیں حالانکہ رسول ﷺ بھی اس پر ایمان لاتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ (2:285)

اور یہ آیت (71:21) ہمارے لئے بھی ہے کہ یہ امت بھی اس طرح ہو جائے گی جہاں اہل کتاب پہلے سے گئے ہوئے ہیں حالانکہ بنیاد یہ ہے۔ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ (7:2) اگر قدرت انسان کو ارتقائی صلاحیتوں سے نہ نوازتی تو آج اس کا حشر بھی حشرات والارض یا جنگلی جانوروں جیسا ہوتا۔ یہ تو خدا کا احسان ہے کہ اس نے ان کو تقلید پر رہنے نہیں دیا۔ ورنہ تخلیق تو ایک جرثومہ حیات سے بڑھی تھی تو جو مگر مچھ، چھپکلیاں تھے اگر سلسلہ تقلید کا چلتا تو چھپکلی کے آگے چھپکلی ہی پیدا ہوتی تھی۔ اس لئے تقلید کے بجائے ارتقاء کا راستہ دکھایا۔ ورنہ انسان غاروں سے آگے ہی نہ جاتے۔ درختوں پر رہائش ہوتی اور ستر پتوں سے ڈھانپا جاتا۔

زمانہ کے تقاضے قدم قدم پر بدلتے چلے جاتے ہیں لیکن صرف اس کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہوتی اور انہی دائروں کے اندر وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے بائی لاز بناتے جاؤ۔ ان کے ہاں تو کُلُّ بِدۡعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَّ کُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ...

یہ پھر صراط مستقیم کی بجائے ایک cylic order دائروں میں ترتیب ہے۔ قرآن نے تو اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ صراط مستقیم میں تو ہر قدم پچھلے قدم سے آگے بڑھے گا۔ ارتقائی منزل طے کرے گا۔ خدا تو ذی المعارج ہے۔ خدا کے رنگ میں رنگنا سیدھا بھی جاتا ہے اور بلندیوں پر بھی جاتا ہے۔ اگر کیفیّت یہ ہو کہ ہزار سال پہلے جس مقام پر بڑے بوڑھے تھے آج اس مقام پر ہم کھڑے ہیں۔ تو یہ صراط مستقیم تو نہیں ہے بلکہ (cylic order) ہے جس کی قرآن مذمت کرتا ہے۔

ٹیکسلا میں میوزیم میں 5 ہزار سال پیشتر رکھی ہوئی اشیاء اور آج وہاں گاؤں کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے پھر اس کا نقصان صرف مذہب کے دائرہ تک نہیں رہتا بلکہ زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کرتا ہے۔ٹیکسلا کے اس میوزیم میں پانچ ہزار سال پرانی روزمرہ کے استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً عورتوں کے زیورات، کپڑے، اوزار، ہتھیار، چولہا چمٹا، توا وغیرہ دیکھا اور باہر نکلے سامنے گاؤں تھا۔بستی سے جب عورتیں نکلتی تھیں انہوں نے وہی کچھ پہن رکھا تھا۔لوہار کی دکان پر گئے، ترکھان کی دکان پر بھی، وہی کچھ ہے جو اس میوزیم میں تھا۔ چولہا، چمٹا اور توا تو وہی ہے جو ہمارے گھروں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دنیا چاند پر چلی گئی ہے مگر ہم اس مقام پر کھڑے ہیں۔ یہ قوم پتھروں کی طرح چٹانوں کی طرح، مردوں کی طرح اس مقام پر کھڑی ہے۔ یہ افراد ممی شدہ لاشیں ہیں۔ یہ تمام رسومات وہی ہیں جو ہزار سال پہلے ہوتی تھیں۔شادی یا فوتگی کی رسومات ملاحظہ کریں۔

بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ط (31:21)

سفر ہوائی جہاز میں کر رہے ہیں۔گاڑیوں میں گھوم رہے ہیں۔موبائل اور کمپیوٹر استعمال کر رہے ہیں۔اس میں تو اسلاف کا راستہ یاد نہیں رہتا۔لیکن اسلاف کی تلواریں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ یہ زندگی کا تضاد ہے۔قرآن نے تو صراط مستقیم کیلئے کا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (31:21) ایک کسوٹی دیکر ان کو مکمل اور غیر متبدّل کر دیا۔سارا سفر اس کی حدود میں وقت کے تقاضوں کے مطابق کرنا تھا۔جو ایک ارتقائی سفر ہے۔صراط مستقیم پر چل کر آگے بڑھنا ہے۔دائرے میں سفر نہیں کرنا۔وہ حدود مقرر کرتا ہے مگر جزئیات طے نہیں کرتا۔اس کیلئے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص (42:38)

مشاورات کی تفصیلات تو خود طے کرنی ہیں۔"اِعْدِلُوْا" کہہ کر اس کے طریقے اور تفاصیل نہیں بتاتا کیونکہ یہ زمانے کے تقاضوں سے بدلتے جائینگے اور اصول ہیں تو وہ غیر متبدّل رہیں گے۔ ہاکی یا فٹ بال کا کھیل سامنے رکھیں اس کیلئے قواعد وضوابط اپنے مقام پر ہوتے ہیں اس کے بعد دونوں ٹیمیں آزاد ہوتی ہیں لیکن اس آزادی میں ایک پابندی ہوتی ہے ان کے سامنے ایک نصب العین یعنی گول ہوتا ہے۔تمام کھلاڑیوں کی توجہ چاہے دائیں ہوں یا بائیں یا آگے یا پیچھے کہ گول کی طرف گیند پہنچانی ہے۔ کیپٹن کے سامنے بھی یہی گول ہوتا ہے۔ یہ تمام چاہے کپتان ہو، ان حدود یعنی حدود اللہ کا خیال کرے گا ان سے تجاوز نہیں کرتا اس کے قریب بھی نہ جانا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ذرا زور سے گیند لگ جائے اور وہ باہر چلا جائے۔ وَلَا تَقْرَبُوْا (6:152)۔ ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔لیکن ان باؤنڈری لائنز کے اندر آزادی ہے۔ ان کے اندر کھلاڑیوں کو آزادی ہے۔ زور سے ہٹ لگائیں یا آہستہ جس طرح وقت کا تقاضا ہو دائیں کر دیں یا بائیں کر دیں، یہ ہی جو حدود قرآن نے مقرر کر دی ہیں کہ ان کے تابع رہ کر زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود طے کریں تو ایسی قوم تو اِمامُ النَّاس کے درجہ پر فائز ہو جاتی ہے۔مشرق تو مذہب زدہ ہے دائرہ کے اندر ہے اور مغرب نے حدود ہی توڑ دیں۔اب حدود ہی نہ رہیں تو پھر اس میدان کا نتیجہ ملاحظہ کریں کہ دونوں ٹیمیں ہاتھوں میں سٹک لیئے ہوئے آئیں اور کوئی حدود و قیود نہ ہوں تو پھر انجام وہی ہوتا ہے جو اقوام مغرب کا ہو رہا ہے۔خلفشار کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

❁❁❁

ایک آیت جس کا غلط ترجمہ مغالطہ پیدا کر دیتا ہے(31:34)

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾ (31:34)

اب اس سے پچھلی آیت میں تھا کہ غلط اعمال کے نتائج مرتب ہو کر کب سامنے آئیں گے قرآن نے اس کو "السَّاعَةِ " سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ گھڑی، وہ لمحہ، وہ وقت جب تباہی مخصوص شکل میں سامنے آئے گی چاہے وہ یہاں آجائے یا مرنے کے بعد۔ کیونکہ زندگی تو ایک وحدت ہے۔ جوئے رواں ہے۔ آخرت اور اس جہاں کی زندگی الگ الگ نہیں ہیں۔ چاہے وہ نتائج اس دنیا میں سامنے آجائیں یا مستقبل میں إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (31:34) اس ساعۃ کا علم اس کے پاس ہے یعنی اس کے حساب سے ہوتا ہے۔ اس کے قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے آہستہ آہستہ وہ نتائج مرتب ہوتے ہیں اس کے بعد وہ مخصوص شکل میں ایک وقت پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ ہے السَّاعَةِ۔

اب نتائج مرتب ہونے کیلئے دو مخصوص مثالیں:

وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ (31:34) بارش کو دیکھئے۔ بارش تو پہلے سے بننا شروع ہوا ہوتا ہے جب سورج کی تمازت سمندر سے بھاپ کی صورت میں پانی کشید کر کے لے جاتی ہے تو وہاں سے اس سلسلے کی ابتداء ہوتی ہے۔ یہ ایک پروسیس ہے پھر اوپر بادل کی شکل میں ہوائیں ان کو اڑاتی پھرتی ہیں۔ پھر جہاں ٹھنڈک اتنی ہوتی ہے کہ بھاپ پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے پانی ہوا سے وزنی ہوتا ہے تو نیچے گرتا ہے یعنی بارش تک پہنچنے کیلئے ان سارے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے یہ اس وقت نہیں شروع ہو جاتی بلکہ بننے کیلئے ایک وقت درکار ہوتا ہے۔

دوسری مثال لے لیں: وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ (31:34)

رحم مادر میں جنس ایک دن میں نہیں بن جاتا۔ بلکہ وہ تو ایک اوّلین جرثومہ سے لیکر ایک پورے بچے کی شکل میں بڑی منازل طے کرتا ہے۔ تمہارے سامنے تو بچہ جیتا جاگتا پیدا ہو کر آتا ہے۔ تم تو اس وقت اس بچے کو دیکھ رہے ہوتے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کن منازل اور مراحل سے سے گزر کر آیا ہے۔

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (31:34)

کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا؟

وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ؕ (31:34)

نہ کوئی جان سکتا ہے کہ اس کی موت کہاں پر واقعہ ہوگی؟

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ﴿۳۴﴾ (31:34)

خدا ہی ہے جو علیم بھی ہے اور خبیر بھی۔

اس آیت میں پیدا کئے گئے الجھاؤ:

کہتے ہیں کہ پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا علم صرف خدا کو ہے انسان کو اس کا علم نہیں ہوسکتا۔

(1) علم الساعۃ، (2) بارش کب ہوگی، (3) جنین، (4) کل انسان کیا کرے گا، (5) انسان کی موت کہاں واقع ہوگی؟

آج سائنس کے انکشافات نے بارش کا سارا پروسیس کمپیوٹر پر بھاپ اڑنے سے آخر تک انہوں نے Calculate کیا ہوا ہے اب جہاں بارش برسانا مطلوب ہوتو وہ وہاں برسا دیتے ہیں۔ وہاں جو سرحدیں قریب ہیں۔ وہاں بارش کی چوری کے مقدمات ہو رہے ہیں کہ میرا مینہ چرا کر لے گیا ہے۔

اور جنین کے متعلق تو رحم مادر کے اندر بچہ بننا شروع ہوا تو اس کا سیکس (SEX) تک بتا دیتے ہیں کہ بچہ ہوگا یا بچی۔

یہ ہیں وہ دو چیزیں جن پر یہ مغرب کے لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ یہ سارا کچھ بخاری میں ہے۔ قرآن میں ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ۚ (31:34) یعنی یہ ساعت بارش اور ارحام یہ تمام خدا کے قانون کے مطابق ہو گیا۔ خدا نے نہیں کہا کہ اس کا علم صرف خدا کو ہے انسان کو نہیں ہوگا۔ قرآن میں یہ بات نہیں ہے۔

وَیُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ ۚ وَیَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ ؕ (31:34)

وہ قانون کے مطابق بارش برساتا ہے اور جانتا ہے کہ ارحام میں کیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ تم نہیں جان سکتے۔

وہ بھی جانتا ہے اور تم بھی جان سکتے ہو۔ یہ کہاں کہا ہے کہ ان کا علم صرف اس کو ہے اور تم نہیں جان سکتے۔ سوال یہ ہے کہ ایک چیز جو واقعہ کے خلاف جاتی ہے اس کو تو چھوڑ دیں۔ لیکن قرآن میں کہیں بھی نہیں ہے کہ تم نہیں جان سکتے۔ ہاں جو چیز ہم نہیں جان سکتے۔ وہ اگلے دو لفظوں میں آ گئی ہے جو آج کا سائنسدان بھی مانتا ہے اور قیامت تک مانے گا۔ اس کے فوراً ہی بعد کہا ہے۔

وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا ؕ (31:34)

کوئی فرد بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں مستقبل یعنی کل کو کیا کروں گا اور آگے کہا۔

وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ؕ (31:34) کس جگہ موت واقع ہوگی؟

دنیا کا کوئی سائنسدان ان دو باتوں کو جھٹلا نہیں سکتا۔ جھٹلانا تو ایک طرف یہ فلسفہ اور نفسیات آگے بڑھتے ہوئے ان کی تائید کر رہے ہیں۔

اختیار و ارادہ:

اب سوال یہ ہے کہ کوئی کسی کے متعلق یا اپنے متعلق کیوں نہیں بتا سکتا کہ میں ''کل'' کیا کرونگا؟ مچھلی کو خشکی پر رکھیں تو ہر

6/74

شخص بتادے گا کہ کہیں ذراسی چھلانگی تو پانی کی طرف چلی جائے گی جبکہ انسانی بچہ کدھر ہاتھ مارے گا یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ یہ اس لئے کہ اسے اختیار وارادہ حاصل ہے۔ اختیار دینے سے مراد یہ ہے کہ اس کا مستقبل متعین ومقرر نہیں ہے۔ وہ جامد نہیں ہوتا اور نہ مستقبل طے شدہ ہوتا ہے اس کے سامنے ہمیشہ دو امکانات ہوتے ہیں۔ اب ان میں سے کون سی امکانیّت اختیار کرے گا۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ جو صاحب اختیار ہے اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اس کے مستقبل کے بارے میں کہا جا سکتا ہے جو صاحب اختیار نہیں ہے ایک روش پر چلنے کیلئے مجبور ہے۔ جس طرح بکری کے پاس گھاس کھانے کیلئے دوسرا راستہ نہیں ہے۔ سائنسدان سورج ''گرہن'' کے بارے میں ہزار برس کے بعد کا بھی بتا سکتے ہیں کہ کس دن کس وقت اور کتنا حصّہ ہوگا مگر ایک مکھی کے بارے میں نہیں بتا سکتے کہ یہ اس چیز سے اڑ کر اس کے بعد کہاں بیٹھے گی؟ صاحب ارادہ کا مستقبل متعین ہو نہیں سکتا۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ تو خاک زندہ ہے تابعِ ستارہ نہیں

یہ تو خاک زندہ ہے یہ تو اپنے متعلق بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ وہ تو ہر آن اپنا ارادہ بدل سکتا ہے۔

اور زندگی کا سارا لطف ہی اس میں ہے کہ اپنے لئے کل کے متعلق پتا نہ ہو اگر ہم میں سے کسی کو پتہ ہو کہ آئندہ زندگی میں میرے ساتھ کیا کیا ہونا ہے تو وہ یہ اس کی بڑی رحمت ہے کہ اس نے انسان کو اس کے مستقبل سے آگاہ نہیں کیا زندگی کی ساری رنگینیاں، کیفیات اس چیز کے اندر ہی ہے مگر اسے مستقبل کا پتہ نہیں ہے اگر اس لڑکے کو پتہ ہو کہ جس نے امتحان میں فیل ہو جانا ہے تو اس کی مت ماری ہوئی ہے کہ راتوں کو جاگ جاگ کر محنت کرتا پھرے اگر پہلے سے پتہ ہے کہ پاس ہونا ہے تو سارا دن کرکٹ کھیلتا رہے۔

اگر انسان کو معلوم ہو جائے کہ ''کل'' کیا ہونا ہے تو زندگی اجیرن ہو جائے۔ ساری مشینری جامد ہو کر رہ جائے اور کوئی کچھ کرے ہی نہیں۔ یہ تو انسان کیلئے بڑی رحمت ہے کہ اس کے ''کل'' کے متعلق کچھ پتہ نہیں ہے۔

انڈیا اور پاکستان کا میچ ہو رہا تھا تو سارا انہماک اور توجہ سٹروک پر تھی کہ پلک جھپکنے نہ پائے کہ پتہ نہیں سٹروک کس طرف لگ جائے اور گول ہو جائے۔ میچ ختم ہو گیا پتہ چل گیا کہ پاکستان نے پانچ اور انڈیا نے دو گول کر دیئے ہیں۔ اس میچ کی ریکارڈنگ جب دو تین دن بعد چلی تو دس منٹ تک بھی نہ دیکھ سکا کیونکہ اس کی ایک ایک پلنٹی سٹروک اور نتیجہ کا پہلے سے پتہ تھا۔

اس طرح اگر زندگی کے تمام میچوں کا پتہ چل جائے تو زندگی میں کوئی لذت باقی نہ رہے یہ ہے اس کا کرم کہ مستقبل کا علم ہمیں نہیں دیا۔

اور اگر پتہ چل جائے کہ میری عمر اتنی ہے تو زندگی دشوار ہو جائے۔ موت کے متعلق اگر پتہ چل جائے تو وہ درمیان والے لمحات کس طرح گزرتے ہیں ذرا اس پھانسی والے مجرم سے پوچھو کہ تمہیں منگل کو پھانسی دی جائے گی تو وہ مرنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ یہ تمام پیشین گوئیاں کرنے والے حضرات جھوٹ اور فریب کے سوا کچھ نہیں کرتے۔

نظریۂ ارتقاء اور قرآن اور سپیشل کریشن

کتابِ فطرت F.J.Sheen نے اپنی کتاب "Philosophy of Religions" کہ سائنس، کتاب فطرت کو صرف پڑھتی ہے۔ اسے لکھتی نہیں ہے۔ اس کتاب میں اس کی حقیقت کا علم اس کے اندر ہے ہی نہیں اور نہ ہوسکتا ہے۔ پروفیسر جیمز کہتا ہے کہ نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیّر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کیلئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔

سائنس ان حقیقتوں کو ایجاد نہیں کرتی بلکہ Discover کرتی ہے ان کے اوپر جو پردہ پڑا ہوتا ہے اس کو اٹھاتی ہے، اسے بے نقاب کرتی ہے۔

صدیوں سے ایک غلط العام تصوّر:

ہر چیز پہلے دن سے مکمل شکل میں پیدا کر دی گئی ہے۔ چودہ سو سال پہلے ہی نہیں، اس سے بھی بہت پہلے تک؟ مختلف مذہبی کتابوں تورات اور دیگر مذہبی کتابیں کائنات کے بارے میں یہی تصوّر رکھتی ہیں کہ ''کن'' کہا اور کائنات وجود میں آ گئی۔ زمین، چاند، سورج، ستارے، درخت، مویشی، پہاڑ، سمندر، حیوانات اور انسان بھی، خدا نے حکم دیا اور یہ تمام چیزیں اس شکل میں پیدا ہو گئیں اور اسی شکل میں اس طرح سے پہلے دن سے آج تک چلی آ رہی ہیں۔ یہ چودہ سو سال پہلے نہیں بلکہ دو صدیاں قبل ہی تخلیق کائنات کا ہی تصوّر تھا یہ تمام یورپی مفکّرین بھی یہی تصوّر رکھتے تھے۔ کل تک یہ مذاہب کی دنیا اور فکر کی دنیا کا یہ ایک مسلّمہ تھا۔

کوئی دو تین صدیاں قبل تحقیقات شروع ہوئیں۔ تو یہ Evolution کا نظریہ بے نقاب ہوا کہ جو بھی خارجی کائنات انسانوں سمیت، یہ پہلے دن سے ہی اس شکل میں سامنے نہیں آ گئی تھی۔ بلکہ ہر شے کا آغاز بڑی خام سی شکل میں، بڑے پست درجہ میں ہوا۔ یعنی اس کی ابتداء اس طرح سے ہوئی تھی وہ ہزاروں، لاکھوں سال کی منزلیں طے کرتی آئی Evolve کرتی یعنی بنتی اور ابھرتی ہوئی موجودہ شکل میں پہنچی۔ یہ تخلیق By Revolution نہیں ہوئی بلکہ Evolution یعنی ارتقاء سے ہوئی ہے۔ یعنی

بننے اور ابھرنے کے معنی یہ ہیں۔یعنی ایک شے جو پست درجہ کی ہے اس میں سے کوئی بہتر شے نکلے اور وہ آگے بڑھے اور اس طرح سے رفتہ رفتہ بتدریج مختلف منازل طے کرکے وہ آگے پہنچے۔

یہ نظریۂ ارتقاء تو ڈارون (82-1809) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس سے پہلے بھی تھا۔اس کے اوپر ان دوسو سالوں میں بہت کام ہوا ہے بڑی گراں قدر تحقیقات ایک ایک شے پر ہوئی ہیں۔یہ تمام تحقیقات قرآن کی ایک ایک آیت کی تصدیق کئے جاتی ہیں۔یہ نقطہ آغاز کیسے ہوا؟ اس کے متعلق نہ سائنس کچھ کہہ سکتی ہے اور نہ آئندہ کچھ کہہ سکے گی۔لیکن سائنس نے ہر موجود شے کا نقطہ آغاز کیسے کیا اور جو مختلف مراحل ہیں، ان مراحل کو بے نقاب کرتے گئے ہیں۔

یہ تحقیقات تمام شعبہ جات پر محیط ہیں۔

''Special Creation vs Evolution''

خارجی کائنات کا یہ عظیم القدر اور محیّر العقول سلسلہ جس حسن وخربی سے چل رہا ہے۔اس کی وجہ ان چیزوں کا اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کیلئے مسلسل اور پوری شدت سے مصروف عمل ہونا ہے۔آیات دیکھیے (13:15)، (57:1)، (59:1)، (61:1)، (62:1)، (64:1) ان اشیائے کائنات کو جبلی طور پر ہدایات ملی ہیں اور وہ ان ہدایات پر پوری طرح سے عمل پیرا ہیں کیونکہ ان کے پاس اختیار وارادہ نہیں ہے جبکہ انسان کو ہدایات انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر انبیاء علیھم السلام کی وساطت سے اختیار وارادہ ہونے کی وجہ سے دی گئیں۔عمل کرنا نہ کرنا اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔آیات ملاحظہ ہوں: (73:19) (76:3) (90:19)۔اگرچہ انسان طبیعی دنیا میں اپنے اس اختیار وارادہ کو منفی طور پر زیادہ استعمال نہیں کرتا کیونکہ اس کی خلاف ورزی سے اکثر فوری سزا مل جاتی ہے۔مگر اخلاقی اقدار کی خلاف ورزی کے نتائج فوری طور پر سامنے نہیں آتے کیونکہ عمل اور ظہور نتائج کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے۔اس لئے انسان نڈر ہو کر ان اقدار کی خلاف ورزی کرتا رہتا ہے۔

وحی کے نظام کی ابتداء ایمان سے ہوتی ہے۔یعنی اس حقیقت کا اعتراف کہ تمام انفرادی اور اجتماعی الجھے ہوئے مسائل کو تنہا عقل سے نہیں سلجھایا جاسکتا ہے۔اس لئے عقل انسان کی رہنمائی کیلئے وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ تمام انسانوں کی جملہ صلاحیتوں بشمول ذات کی پوری نشوونما ہوتی جائے تاکہ یہ اجتماعی طور پر ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتی جائے اور بلند ہوتی جائے۔قرآن ہی وہ رہنمائی ہے جس میں انسان کی رہنمائی کیلئے طبیعات، فلکیات، کیمیا، معاشات، اخلاقیات، تمام تر انسانی معاملات سے متعلق اصولی ہدایات موجود ہیں۔اس لئے قرآنی ہدایات کا ادراک حاصل کرنے کیلئے کسی ایک علم کی نہیں بلکہ بہت سے تحقیقی علوم میں اختصاص کی ضرورت ہے۔

تخلیق وہدایت دونوں اللہ کی طرف سے ہیں (20:50) قرآن نے حقائق کی تفہیم کیلئے متعدد طریقے وضع کئے ہیں۔مثلاً قرآن پر غور وتدّبر، اس کے بیان کردہ تصوّر کو پوری طرح سمجھنے کیلئے تصریف آیات سے کام لینا۔مترادف الفاظ کی باریکیوں کو سمجھنا۔

مجرّد حقائق کی تفہیم کیلئے عربی زبان کی تشبیہات، تمثیلات، مجازات، استعارات و کنایات کو سمجھنا اوران کا لغوی مفہوم تک ہی بات کو محدود نہ کر دینا۔

قرآن نے حقائق اور معارف کی وضاحت کیلئے اضداد سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً ظلمت ونور، اعمٰی وبصیر، طیبّ وخبیث، حق و باطل، حق سے مراد جو ٹھوس نتیجہ برآمد کرے جبکہ باطل سے مراد جو کسوٹی پر پوری نہ اترے اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ حق کے مقابلہ میں ظن کی کوئی حیثیت نہیں (53:28) کائنات کو باطل سمجھنے والے کافر ہیں۔ (38:27) کائنات کو ٹھوس نتائج مرتب کرنے کیلئے بنایا گیا ہے تاکہ ہرایک کو اس کے اعمال کا ٹھیک نتیجہ ملے اور کسی پر ظلم وزیادتی نہ ہو۔ (64:2) (45:22) کائنات حق ہے۔ یہ کھیل تماشہ نہیں ہے اقدار خداوندی پر عمل کے ساتھ ساتھ کائنات پر غور وتدبر لازمی قرار دیا گیا ہے۔

''وحدت الوجود یا باہمہ اوست'' کا نظریہ خالصتاً آریائی نظریہ ہے۔ جو تمام آریائی قوموں میں مروّج ومقبول رہا ہے۔ ویدانت، واشراقیت، وتصوّف یہ سب قرآن کے خلاف نظریات ہیں جبکہ مادہ پرست مادی کائنات میں مادہ کے سوا کسی چیز کے معبود ہی تسلیم نہیں کرتے۔ بعض کے نزدیک کائنات کس طرح محض ہنگامی طور پر وجود میں آئی ہے نہ غرض وغایت اور نہ منزل ومقصود نہ اس کے پیچھے کوئی بصیر وخبیر قوّت ہے یہ تمام تصوّرات زمانہ قدیم سے چلے آرہے ہیں۔

قرآن نے کائنات کو حق کہہ کر ان شعبدہ بازی و باطل نظریات تردید کر دی اور حصول علم کیلئے حواس Perception اور ''تعقّل (Conception) دونوں کے استعمال کو ضروری قرار دیا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات (عالم خلق) کی جملہ موجودات کی کیفیات، ماہیّت اوران کے خواص وجوہر کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کو ودیعت کر رکھی ہے۔ اس لئے اس کے ذہن میں کائنات اور خود انسان کے بارے میں سوالات ابھرتے آئے ہیں کہ اس عالم محسوس اور خود انسان کی حقیقت کیا ہے؟ چیزیں ہمیشہ اپنا وجود کیوں برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ نئی اشیاء کہاں سے اور کس طرح وجود میں آتی ہیں؟ انسان کا کائنات میں مقام کیا ہے؟ کیا کائنات بامعنی بامقصد ہے یا اس کا کوئی مقصد نہیں۔ کیا یہ ازل سے موجود ہے اور ابد تک موجود رہے گی یا اسے کسی وقت تک کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ ذہنی اور مادہ کا باہمی تعلق کیا ہے؟ انسانی اعمال کا محرک لذات وخواہشات کی تکمیل یا اصول نصب العین ہیں۔ انسان مجبور یا مختار، موت، غم، جبر وقدر، خیر وشر، روح اور ضمیر کیا ہیں؟ انسان اور کائنات کی تخلیق فوری طور پر ہوئی ہے یا مرحلہ وار موجودہ حالت تک پہنچتے ہیں۔ یہ ہیں وہ سوالات جس نے تجزیہ اور تحلیل میں بعض بہترین دماغوں کا وقت اور توانائی صرف ہوئی ہے۔ ہماری فلسفیانہ تاریخ کا بڑا حصّہ انہی سوالات کے جوابات کے گرد گھومتا ہے۔ قرآن نے ان تمام سوالات کیلئے رہنمائی فرمائی ہے۔ لیکن قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۞ (67:23)

پہلی بار کائنات کی تشریح:

شعور انسانی عہد طفولیت میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ کائنات کس طرح وجود میں آ گئی۔ اس لئے ان حقائق پر صدیوں تک سحر و

طلسم، توہم پرستی، جادوٹونہ اور جہالت کے دبیز پردے پڑے رہے چھٹی صدی ق م میں IONIA شہر کے ایک سائنسدان طالیس نے اوہام اور خرافات کے پردوں کو چاک کے پہلی بار کائنات کی سائنسی تشریح کی سٹیفن کے مطابق:......

اس کے بعد یونانی فلسفہ میں Static جامد اور ساکن کائنات کا تصوّر صدیوں تک رہا۔ یہاں تک کہ 1600ء میں کوپرنیکس اور بعد میں جوہانیز کیپلر، گلیلیو اور نیوٹن نے ارسطو، بطلیموس کا کائناتی ماڈل کا خاتمہ کر کے جدید نظریات متعارف کرائے۔لیکن مطلق وقت اور ساکن کائنات کے تصوّرات باقی رہے۔ بعد میں آئن سٹائن نے ان نظریات کو ختم کر دیا۔ انہوں نے وقت کی ایک Dimension اور خلا کی تین جہتوں کو ملا کر Space Time four Dimensional کی اصطلاح واضح کی۔ان کی مساوات نے وقت اور خلا کو حرکی حیثیت دیکر انہیں خاموش پس منظر سے نکال کر کائنات کی حرکی دنیا میں ایک اہم شراکت دار کی حیثیت دی۔

کائنات کے بارے میں انسانی تصوّرات میں ایک انقلابی تبدیلی اس وقت رونمائی ہوئی جب ایڈون ہبل نے کائنات کے پھیلنے کا اعلان کیا۔وسعت پذیر کائنات کے تصوّر نے چند مزید نظریات کو جنم دیا۔

جن میں دو اہم نظریہ کہکشائیں اور بگ بینگ شامل ہیں۔کائنات کی تخلیق کے بارے میں نظریۂ ارتقاء اور نظریۂ خصوصی تخلیق کے درمیان ہمیشہ ٹکراؤ رہا ہے۔ پہلے نظریہ کے مطابق خدا ہر شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے پیدا کر کے پھر اسے مختلف ارتقائی مراحل سے گزار کر نقطۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے جبکہ دوسرے نظریہ کے تحت کائنات کی ہر شے، ہر قسم کا پودا یا حیوان موجود ہے وہ بالکل اس شکل میں معرض وجود میں آیا۔جس شکل میں وہ آج نظر آرہا ہے۔انواع غیر متبدّل ہیں 19 صدی میں بہت سے لوگ چند سائنسدانوں کے علاوہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انواع الگ الگ تخلیق کی گئی ہیں۔مگر 20 صدی میں بگ بینگ کے نظریہ سے خصوصی تخلیق کے نظریہ کو دھچکا لگا اور بگ بینگ نظریہ سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ابتداً کائنات موجودہ شکل میں نہیں تھی۔کائنات کوئی ساکن اور جامد وجود نہیں بلکہ متحرک اور ارتقاء پذیر ہے۔اس میں منظم اور مربوط طریقے سے تبدیلیوں کا ایک سلسلہ جاری ہے۔ ہر شے ایک خاص قانون کے تحت نشوونما وارتقاء کے مدارج طے کر رہی ہے اور اس طرح ایک ادنیٰ حالت سے دوسری اعلیٰ حالت میں تبدیلی ہو رہی ہے لیکن یہ تحول اور تقلّب کچھ ایسے غیر محسوس انداز میں ہو رہا ہے کہ سطح بین آنکھ اسے محسوس طور پر نہیں دیکھ سکتی پھر یہ تبدیلیاں اتنے طویل عرصہ کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ انسانی یاداشت کیلئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے۔

انسان کی داخلی دنیا ہو یا خارجی کائنات ہر جگہ قوانین کی کارفرمائی ہے۔ یہ قوانین واشیائے کائنات کے وضع کردہ ہیں اور نہ ہی انسانوں کے مرتب کردہ۔ یہ قوانین ہی خدا کے متعین کردہ ہیں جس نے ان اشیائے کائنات اور انسان کو پیدا کیا ہے۔

نظریۂ ارتقاء:

اس کی تاریخ بہت پرانی ہے گزشتہ چند صدیوں میں اس کے متعلق کئی تصوّرات سامنے آئے۔جن میں خصوصی تخلیق کا نظریہ بھی

شامل ہے۔ جو وسعت پذیر کائنات اور بگ بینگ کے نظریات کے سامنے آنے کے بعد یہ نظریہ خصوصی تقریباً مسترد ہو چکا ہے لیکن ہمارے ہاں آج بھی اس نظریہ کی حمایت میں کافی لوگ موجود ہیں۔ دو کتابوں کا ذکر ضروری ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے موقف کے حق میں سائنس اور قرآن کے حوالے دیئے ہیں۔ پہلی کتاب انجینئر فتح اللہ خان ''God universe and man'' ہے۔ دوسری کتاب ہارون یحییٰ ارتقاء فریب "The Evolution is a deceit" ہے۔ ہارون یحییٰ نے چند قرآنی آیات کا حوالہ ضرور دیا ہے مگر ان آیات کا تعلق ہی اس موضوع سے نہیں بنتا۔ ان کتابوں کے گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان حضرات کا اصل اعتراض بذات خود نظریۂ ارتقاء پر نہیں بلکہ ان تصوّرات پر ہے۔ جو اکثر فلسفیوں اور سائنسدانوں نے ارتقاء کے بارے میں وضع کئے ہیں۔ مثلاً کہ کائنات بغیر کسی خالق کے وجود میں آ گئی تھی۔ اب اس کا ارتقاء بھی بغیر کسی منزل اور مقصود اندھی قوتوں کے تحت بغیر کسی شعوری عمل کے جاری ہے۔ حیوانی اور انسانی ارتقاء میں شعوری مماثلت اور یہ تصوّر کہ انسانی نفس یا روح مادہ ہی ایک صورت اور اس کی نشوو ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ یہ باطل نظریات بالکل قابل اعتراض ہیں۔ ان غلط تصوّرات کا تعلق خود ارتقاء کے عمل سے پہلے ہی نہیں۔ لہٰذا ان تخیلات کی آڑ لیکر خود ارتقائی عمل کی مخالفت کرنا ایک بہت بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ جو کسی پہلو سے بھی مناسب نہیں۔

قرآن اور علم جدید:

ارتقاء حیات و کائنات کی ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کرنا اور نظریں چرانا نفی حیات کے مترادف ہے کائنات اور اس میں موجود ہر شے ایک دوسرے کے ساتھ زنجیر کی کڑیوں کی صورت میں اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ کہیں بھی خلا واقع نہیں ہوتا۔ کائنات کی ہر شے مسلسل تغیرّ و تبدّل کے عمل سے گزرتی ہوئی بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی شکل و ساخت، حالت و کارکردگی کے اعتبار سے ارتقائی منزل کی جانب گامزن رہتی ہے۔ کوئی چیز اچانک بغیر علت کے وجود میں نہیں آتی۔ بلکہ اس کے پیچھے اس کی حیاتیاتی تاریخ ہوتی ہے۔ ساری کائنات ایک مسلسل ارتقاء کا نتیجہ ہے یہ مسلسل مختلف شکلیں بدلتا ہوا یہاں تک آیا ہے اس کی آخری کڑی انسان ہے۔

نظریۂ ارتقا کا موضوع اتنا آسان اور سادہ بھی نہیں بلکہ خاصا مشکل ہے اس کی پیچیدگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بیک وقت فلسفہ مابعدالطبعیات، سائنس اور مذہب سے منسلک رہا ہے۔ مشرق و مغرب کے حکماء اس موضوع پر اپنی فکر کے نتائج پیش کرتے رہے ہیں۔

فکرِ اقبال کی تمام تر بنیاد ان کے تصوّر و ارتقاء پر مبنی ہے ان کے نزدیک اسلام ارتقا کو ایسی آفاقی حقیقت قرار دیتا ہے کہ جس کی روح سے کائنات اور اس میں موجود کوئی شے اس سے مبرا نہیں۔ ہر شے قانون ارتقاء کی زد میں ہے۔ کائنات کی ہر شے میں روانی اور حرکت ہے۔ وہ تنہا ہی مگر اضافہ پذیر ہے۔ انہوں نے قرآن کی روح کو فلسفہ یونانی کے منافی قرار دیا۔ کیونکہ قرآن کا زور محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور یونان کا حقائق کی بجائے نظریات پر۔ لہٰذا یونانی فلسفے سے انحراف کے بعد ہی اسلامی تہذیب و ثقافت کی حقیقی روح برسر کار آئی۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق اور نظمِ ارتقا

("The world of Direction / Planning and Creation")

قرآن میں ایک ''عالمِ امر'' ہے اور دوسرا ''عالمِ خلق'' ہے۔ یورپ کے مفکر کا قول ہے (Pattison 1856 -1931) کہ عربی زبان انگریزی کے مقابلے میں فائدہ مند (advantageous) پوزیشن میں ہے کہ ہماری زبان میں تخلیق کے لیے صرف ایک لفظ ''Creation'' ہے جبکہ ان کے ہاں دو الفاظ ہیں۔ عالمِ امر ہے اور عالمِ خلق ہے۔ اس نے کہا کہ زبان یہ بتا رہی ہے کہ ان لوگوں کا ذہن کہاں تک پہنچا ہوا تھا۔ اب سمجھنے کے لیے تو مثال انسانوں ہی کی دی جائے گی ورنہ یہ کہنا کہ خدا کے ذہن میں یہ تصوّر تھا۔ سمجھنے کے لیے تو یہ بات انسانوں کی ہے۔ کسی آرکیٹیکٹ نے کوئی چیز تخلیق کرنی ہو تو پہلے اس کے ذہن میں ایک تصوّر آتا ہے۔ ایک ڈیزائن، نقشہ، سکیم ہوتی ہے جبکہ وہ چیز فی الواقعہ موجود نہیں ہوتی۔ اس کی مخصوص شکل نہیں ہوتی۔ مگر اسکا نقشہ سکیم سازی، خالق کے ذہن میں ہوتی ہے۔ تو وہ اسے ڈرائنگ کے ذریعہ کاغذ پر لاتا ہے اس کے بعد اس کی تعمیر کرتا ہے۔ تو یہاں سے تخلیق کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی سکیم کا مخصوص شکل میں آنے کا جو مرحلہ ہے وہ ہے جسے خلق یعنی تخلیق کیا جائے گا۔ اب پہلا حصّہ اس کا ''عالمِ امر'' کہلائے گا۔ اب جو چیز قاعدہ اور قانون کے تحت وجود میں آئیگی تو اس کے لیے یہ عالمِ امر یعنی سکیم کا جو عالم ہے۔ نقشہ بنانے کا جو مرحلہ ہے۔ یہ کتنا اہم مرحلہ ہے۔ یہیں سے یہ بات سامنے آگئی کہ جو کہا جاتا ہے کہ کائنات کسی طرح سے اتفاقاً (By Chance) وجود میں آگئی تو ہر چیز اس طرح سے کسی سکیم کے ماتحت سوچے سمجھے تصوّر کے تحت تخلیق یا مخصوص شکل میں سامنے آئے۔ تو اس کو بائی چانس یا اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن نے اس تصوّر کو کہ ہر چیز پہلے دن سے مکمل شکل میں پیدا کر دی، کاٹ کے رکھ دیا۔ عدم سے وجود میں آنا، اس کے متعلق ذہن انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اس لئے سائنسدانوں نے کہا کہ یہ (Somehow) کسی نہ کسی طرح سے وجود میں آگئی قرآن کسی نہ کسی طرح سے نہیں کہتا بلکہ اس کیلئے ان کے ہاں ''عالمِ امر'' ہے وہ کہتا ہے کہ یہ یونہی اتفاقاً وجود میں نہیں آگئی۔ بلکہ اس کے خالق نے ایک سکیم بنائی۔ نقشہ اور ڈیزاین بنایا۔ وہ سارا اس کے سامنے تھا۔ پھر اس کے مطابق اس کی تخلیق کی ابتداء کی۔ گویا یہ بائی چانس نہیں ہوئی بلکہ ایک سکیم کے تحت ہوئی ہے۔ علمِ انسانی اب اس مقام تک پہنچا ہے۔

چودہ سوسال قبل نظریہ ارتقاء کی وضاحت اور لفظ تدبیر کے مفہوم:

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا (32:4)

اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے۔

یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۵﴾ (32:5)

امر، سے مراد تو وہ سکیم مرتب کرتا ہے۔ تدّ بر۔ (د ب ر) مادہ ہے کسی شے کا آخری حصہ۔ انجام۔ تدّ بر یعنی کسی شے کے آخر تک، نقطہ تکمیل تک کی جو پوزیشن ہے اس کو سامنے رکھ کر بات شروع کرنا۔ یعنی آغاز سے تکمیل تک تمام مراحل کو پیش نظر رکھ کر ارض سے سماء کے سفر کی روئداد ہے یہ۔ لفظ ''تدّ بر'' سے ساری بات حل ہو جاتی ہے۔ یعنی انجام کار اس شے نے بننا کیا ہے؟ وہی سکیم کامیاب ہوگی ہے جس میں سکیم بنانے والا یہ دیکھے کہ آخر میں اس نے کیا بننا ہے؟ اسے سامنے رکھ پھر اسے چلائے۔ اب جو اس کا الامر ہے، سکیم ہے کائنات کی تخلیق کی۔ وہ اس آخری نقطہ تکمیل کو سامنے رکھ کر اس کی ابتداء کرتا ہے۔

بنیادی طور پر سماء سے مراد بلندی اور ''ارض'' پست کو کہتے ہیں کہا کہ یہ سکیم بلندی کے اوپر مرتب ہوتی ہے۔ تو اس سکیم کو مخصوص شکل دینے کیلئے وہ ارض یعنی پست ترین نقطہ سے شروع کرتا ہے۔ نقطہ آغاز پست ترین درجہ سے شروع ہوتا ہے۔ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ (32:5)۔ پھر وہ اسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ہاں کہیں خدا کا جو نظام ہے وہ صراط مستقیم بھی ہے اور بلند بھی ہوتا جاتا ہے۔ اس میں دوری گردش یعنی Cyclic order نہیں ہے۔ یہ عرّ وج سے (ع ر ج) سڑھیوں کی طرح درجہ بدرجہ بلند ہونا۔ درجہ سیڑھی کا ایک ڈنڈا۔ بلندیوں کی طرف مگر مدارج میں اس لئے سیڑھی کو معراج کہتے ہیں۔ خدا کے متعلق اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۵۶﴾ (11:56) اور ''ذی المعارج'' بھی ہے۔ س نے اپنے آپ کو ''رَفِیۡعُ الدَّرَجٰتِ'' (40:15) کہا ہے۔ درجہ سیڑھی کا ڈنڈا ہوتا ہے گو یا عرّ وج میں بلندیوں لیکن بتدریج، یکلخت نہیں Evolution کے تو معنی ہی یہی ہیں۔ اس میں ارتقاء تو ہے بلند تو ہونا ہے یکلخت نہیں بلکہ نقطہ آغاز سے آہستہ آہستہ اس نے تکمیل تک پہنچنا ہے۔ یہ ہے بلندیاں یا عرّ وج۔ یکلخت بلند نہیں ہوتی بلکہ بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے۔

مراحل:

فی یوم ''وہ طویل المعیاد مراحل''

کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۵﴾ (32:5)

وہ ایک ایک مرحلہ تمہارے حساب سے ایک ایک ہزار سال ہے۔ دوسری جگہ

کَانَ مِقۡدَارُہٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ ﴿۴﴾ (70:4)

پچاس پچاس ہزار سال کا مرحلہ ہے۔

وہ سیڑھی کا ایک زینہ تمہارے حساب وشمار سے پچاس پچاس ہزار سال کا ہے۔ جس میں یہ شے بتدریج بلند ہوتی ہوئی اب نقطہ تک پہنچتی ہے جو اس سکیم میں اس نے مقرر کیا تھا۔

کسی منزل کے حصول کیلئے سمت ''Direction'' کی اہمیّت :

اب اس ارتقاء میں بتدریج جانا بھی ہے اس کیلئے لفظ ''اِلیہ'' ہے یہ سمت ہے ''Driection'' ہے۔ کیونکہ کسی شے کا کسی منزل کی طرف پہنچنے کیلئے سمت ضروری ہے۔ ایک مغربی سکالر کا کہنا ہے کہ ترقی بے معنی ہو جاتی ہے اگر اس کیلئے سمت کا تعین نہ کیا جائے اور سمت بے معنی ہوتی ہے تاوقتیکہ نصب العین کا تعین نہ کریں۔ یہاں ''الیہ'' کی اس ''ہ'' نے بات واضح کر دی ہے کہ یہ نقطہ تکمیل ہے جو اس کیلئے وضع کیا گیا تھا۔ یہ اس شے کی جو آگے بڑھنے اور بلند ہونے کی جو ڈائریکشن ہے اس نقطہ تکمیل تک ہے۔ یہ ادھر بلند ہوتی ہے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں ترقی کیلئے لفظ ''ارتقاء'' کہا ہے۔ ''ترَقِی'' سے مراد بھی بلندی ہے لیکن قرآن نے بلندی کیلئے عرّ وج کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح طور پر اس چیز کو Depict کرتی ہے اس نے بتدریج بلند ہونا ہے۔

سائنس کی تحقیقات کے مطابق زندگی کا نقطہ آغاز (پہلا جرثومہ) وہاں سے اس کی تشکیل کا آغاز ہوتا ہے۔ ہزار ہا سال میں کہیں ایک مرحلہ طے ہوتا ہے۔ اس پر جرثومہ آگے بڑھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر شے کے زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کیلئے حرکت اور جدوجہد ضروری ہے۔ سخت کوشش ضروری ہے۔ ارتقاء کا سلسلہ کچھ اس طرح سے ہے کہ اس کے راستے میں رکاوٹیں آتی ہیں۔ ٹکراؤ ہوتا ہے جو شے ان پر غالب آ جاتی ہے وہ زندہ رہتی ہے جب راستے میں اس رکاوٹ کو توڑ دیتی ہے تو پھر آگے بڑھتی ہے ایک قدم، اسے ارتقاء کہتے ہیں۔ یہ تھیوری آف Evolution کی بنیاد ہے۔ جو پرانے زمانے کے Fossils (آثار متحجّرہ) جو نیچے زمین، برفوں میں دبے ہوئے پنجرے نکلے ہیں۔ وہ بڑے بڑے عظیم الجثّہ جانوروں کے ہیں پھر بتایا جاتا ہے کہ ان میں کون سے ایسے تھے جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں تھی اور وہ ان موانعات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ تو وہ وہیں جامد ہو کر یعنی جہیم یا ''جہنّم'' ہو گئیں یا ان کے اوپر موت وارد ہو گئی اور جن میں صلاحیت تھی وہ ایک درجہ (ڈنڈا) آگے بڑھ گئیں۔

نظم ارتقاء (بانگِ درا): اقبال نے انہی آیات سے اخذ کیا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشا جفا طلبی
سکوتِ شام سے تانغمہ سحر گاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکش زم و گرما، تپ و تراش و خراش — زخاک تیرہ دروں تابہ شیشۂ عنبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید — میان قطرہ نیساں و آتشی عنبی

الی یعنی سمت پر''ہ''، منزل یا نصب العیّن متعین کر دیا۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ﴿۶﴾ (32:6)

یہ سارا عمل کون کرار ہا ہے؟ یعنی اس کے ایک نقطہ میں جو صلاحیتیں پنہاں تھیں۔ مضمر تھیں یعنی وہ صلاحیتیں جب تک مشہود نہ ہوں تو اسے غیب کہا جاتا ہے۔

وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس شے نے کیا بننا ہے۔ اس لئے اسے وہاں تک لے جائے گا۔ جہاں عزیز کے ساتھ رحیم آیا ہے۔ ذرۂ ناچیز کو پہاڑ بنانے کیلئے بڑی قوّت کی ضرورت ہوتی ہے۔ غلبے کی ضرورت ہے اور اس ارتقاء کے راستے پر چلانے کیلئے قوّت کی ضرورت ہے مگر اس کا یہ غلبہ سامانِ نشو و نما دینے کیلئے ہے۔ یہ اس کی سکیم ہے جو کائنات میں اس طرح سے کارفرما ہے۔

اب ''الیہ'' کی طرف ہر چیز سفر کر رہی ہے۔ آم کی گٹھلی کے اندر صلاحیت ہے کہ پودا اُگے۔ درخت بنے پودے میں خوشے آ کر آم لگے تو یہ آم کا پھل اس کی انتہا ہے سکیم میں اس کیلئے یہی رکھا گیا تھا۔ شیر کا نصب العین شیر بننا تھا۔ وہ خود نقطہ تکمیل تک پہنچ کر شیر بن جاتا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ دس لاکھ سال پہلے بھی شیر کا بچہ شیر بن کر ختم ہو جاتا تھا اور آج بھی وہاں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے نقطہ تکمیل ہی یہ ہے۔

انسان کو ایک نئی منزل سے روشناس کرانا:

یہ آیت انسان کو حیوانات کے زمرے سے نکال کر ارتقاء کی دوسری منزل میں پہنچا رہی ہے۔

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (32:7)

ویسے تو خدا نے کائنات کی ہر شے کو بہترین حسن و توازن سے پیدا کیا ہے۔ ہر شے میں اعتدال اور حسن ہے۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ﴿۷﴾ (32:7)

انسان کی ابتداء وہ بھی باقی حیوانات کی طرح جمادات سے ہوئی ہے۔ بے جان مادے سے ہوتی ہے۔

یہ نظریۂ ارتقاء بتایا جا رہا ہے جن جن مراحل سے یہ حیوانات گزرے ہیں انہی منازل سے انسان کا بچہ ''جنین'' رحم مادر تک گزرتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ﴿۸﴾ (32:8)

پھر مختلف منازل طے کر کے اس منزل میں آ گیا جس میں عورت اور مرد کے اختلاط سے افزائش ہوتی ہے یہ حیوانی سطح ہے۔ یہاں سے انسان اور حیوان میں فرق شروع ہو جاتا ہے۔ یہیں سے دین، وحی اور رسول اور ہدایت کی ضرورت شروع ہو جاتی ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ (23:14)

پھر اس کی دوسری قسم کی مخلوق بنا دیا۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ؕ﴿۱۴﴾ (23:14)

پھر بابرکت ہے وہ ذات جو سب سے زیادہ حسین شاہکار تخلیق کرنے والی ہے۔

وَقَدۡ خَلَقَكُمۡ اَطۡوَارًا ﴿۱۴﴾ (71:14)

اس کے بعد یکلخت انسان نہیں بن گیا بلکہ درجہ بدرجہ ہوا۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ (32:9) الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ (59:24)

ان تخلیق کے بعد اس سے حشو و زوائد الگ کرتا گیا یعنی تخلیق کے بعد الۡبَارِی ہے۔ تراشا، الگ کرتا چلا گیا۔ سَوّٰىهُ۔ یعنی حشو و زوائد الگ کرتا گیا خاص اعتدال پر لے آیا۔

وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ (32:9)

اس میں اپنی توانائی کا شمہ ڈال دیا اب اس میں خدائی توانائی پیدا ہو گئی۔ یعنی اس کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا جو اوپر خدا کو ہے اور نیچے انسان کو پھر

وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۚ﴿۱۰﴾ (90:10)

اسے دو راستے دکھا دیئے اور کہا گیا اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ (41:40) اب تم اپنی مشیت کے مطابق کام کرو۔ یہ ہے خدا کی روح یعنی صاحب مشیت ہونا، اختیار ہونا، یہ جو توانائی تھی یہ خصوصیّت کبریٰ تھی۔ اس میں سے کچھ حصّہ اس کو دے دیا اور پھر کہا:

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ (32:9)

دیکھنے اور سننے کی صلاحیت بھی دی دیں یہ تو حیوان میں بھی تھیں مگر اس سے بڑھ کر "وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ (32:9)" وہی شے دی دی جو فیصلہ کرتی ہے۔ جو حیوان کے پاس نہیں ہے۔ قرآن نے اسے "نفس" کہا ہے یعنی ذات عنایت کر دی۔ اب ان آیتوں میں سارا تھرڈ پرسن سے خطاب ہے۔

وَ بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ ۚ﴿۷﴾ (32:7) ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ (32:8) ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ (32:9)

توانائی کے بعد:

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ (32:9)

یہاں "ہ" ضمیرِ غائب کی جگہ "کُمۡ" ضمیرِ مخاطب آ گیا۔ یہ سکینڈ پرسن پروناؤن ہے۔ اب خطاب کے قابل ہو گیا۔ کائنات میں کسی دوسری شے کو خدا نے مخاطب نہیں کیا۔

؎ کہاں میں اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ!

کائنات کی کوئی شے اپنے آپ کو "میں" نہیں کہہ سکتی اس لئے وہ خدا کو "تو" نہیں کہتی۔ یہ انسان کہہ سکتا ہے اگر وہ اس

674

توانائی یعنی ارادہ کو استعمال نہیں کرتا۔ اپنے فیصلے خود نہیں کرتا تو ''کُم'' کہنے کے قابل نہیں ہے۔ اسے حق نہیں ہے کہ وہ خدا کو مخاطب کرے ہماری دعائیں اس لئے قبول نہیں ہوتیں کہ ہم میں ''میں'' نہیں اور منزل ہماری اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (53:42) منزل تمہاری پروردگار تک ہے۔

بخود محکم گذر اندر حضورش   مشو ناپید اندر بحرِ نورش

اس کی صفات اپنے اندر پیدا کرتے چلو۔ جب خدا کے سامنے کھڑا ہو کر تو اپنے کو ''میں'' کہے۔ یورپ کے مفکرین اور سائنسدان بھی اس ارتقاء میں یہاں تک پہنچے۔ اس دور میں تو اس کی ابتداء ہی انہوں نے کی اور بنیادی غلطی کر گئے کہ جس طرح باقی حیوانات اور اشیائے کائنات طبیعی قوانین کے تحت زندہ رہتے ہیں اور انہی کے تحت زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے متعلق بھی انہوں نے یہی فارمولہ نافذ کیا کہ زندگی کا بس یہی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اب اس نظریہ حیات سے جو ساری دنیا میں فساد اور تباہیاں پھیلی ہوئی ہیں اور انسانوں کے پاس بے انتہا قوتیں ہوں تو پھر اس بے رہروی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ تمہاری غلط فہمی ہے ارتقاءِ جسمانی اب ذات کے ارتقا کے روپ میں مزید آگے چلتا ہے۔ اصل انسان تو اس کا یہ نفس ہے یعنی روح خداوندی۔

اقبال نے اسے ''خودی'' کہا ہے۔ انسان کی اصل زندگی تو یہی ہے اور یہ طبعی جسم اسی ذات کی نشوونما اور آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اصلی ذات یا خودی آگے چلتی ہے۔ اقبال نے ساری زندگی اس کا پرچار کیا ہے اور مغرب کے اس غلط نظریہ کی ہر جگہ تنقید کی ہے کہ ان کی تہذیب تو فریب ہے۔ اس تصوّر سے تو دنیا مزید جہنّم کا شکار ہوگی۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾ (29:64)

یعنی ایسی زندگی جو پچھلی کڑیوں سے یکسر مختلف ہو یعنی Progressive Evolution کی بجائے Emergent Evolution کا ظہور ہوتا ہے۔ ''فعلان'' کا وزن یعنی کوئی شے جو ہنگامی طور پر، ایمرجنسی کے طور پر نمودار ہو جائے اور پچھلی کڑیوں کا نتیجہ نہ ہو اس کے خلاف کوئی چیز نمودار ہو جائے یعنی جو طبعی قوانین کے تابع نہ ہو۔ یہ ہے اَلْحَیَوَانُ ۘ (29:64) جو فعلانُ کے وزن پر ہے۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾ (29:64)

کاش یہ علم کی بارگاہ سے پوچھتے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے؟

زمین خاکِ درِ میخانۂ ما   فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

اصل مقصد تو مہ خانہ ہے مہ خانہ کی مٹی نہیں ہے کوئی مٹی تو نہیں چاٹتا۔ اس طرح فلک یعنی کائنات ایک گردش ہے۔ اصلی مقصد نہیں ہے۔

حدیثِ سوز و ساز ما دراز است   جہاں دیباچۂ افسانہ مارا
مانند سحر صحنِ گلستان میں قدم رکھ   آئے تۂِ پا گوہر شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ بیاباں سے ہم آغوش، ولیکن   ہاتھوں سے تیرے دامن افلاک نہ ٹوٹے

برگساں کہتا ہے کہ انسان ارتقاء کی اگلی منزل ان مادی محدود سے آگے بڑھ جانا ہے۔ طبعی کائنات کے فاصلے تو میلوں سے

ماپے جاسکتے ہیں جبکہ اس نئے سفر کے فاصلے تو محسوسات کے دائرے سے آگے بڑھنے والی بات ہے جو نہیں ماپے جاسکتے۔ وہ صرف اس کے قانون کے سامنے جھک جانے سے خدا کا قرب حاصل ہوگا۔

إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ ﴿٤٢﴾ (53:42) وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ ﴿١٩﴾ (96:19)

یہ ہے سارا پروگرام:

تو اے اِسیر مکاں! لامکاں سے دور نہیں — وہ جلوہ گاہ تیرے خاکداں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے — قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

؎ آنچہ حق می خواہد آں سازد تُرا

أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (55:33) سے آگے بھی ان اقدار کے ذریعہ جاسکتے ہو۔

زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

❁❁❁

"EGO AND SELF"

Self اور Ego دونوں ہی ''میں'' ہوتے ہیں۔ سائیکالوجی میں تو اس میں فرق ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں اقدار کا تصوّر نہیں ہے۔ اس میں قرآن فرق کرتا ہے۔ Self تو ایک آستانہ کے سامنے جھک جانا اور ساری دنیا سے بلند ہوجانا یعنی چھوٹے پیمانے پر رب ہوجاؤ تا کہ ساری کبریائیاں تمہارے حصے میں آجائیں۔

''میں'' کو صرف اس کے قوانین کے سامنے جھکاؤ تو اس جھک جانے میں ساری دنیا کی سرفرازیاں آجائینگی۔ اس آستانے پر ''وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ'' (32:15) ادھر تکبر نہ کرنا، سرکشی نہ کرنا۔ Ego۔ جو کہیں نہ جھکنا ہے یہ ہے اور یہ نہ جھکنا ان اقدار کے سامنے ''تکبر'' ہے۔ شیطنیت اور ابلیسیّت ہے۔

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ (2:34)

جو ابلیس نے کہا: کیونکہ اس کے Ego نے اسے جھکنے سے منع کیا۔ ''Ego'' پندارِ نفس جو قوت کے بھروسے پر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ علو یا استکبار بغیر حق کے غلط ہے۔ یعنی جو محض قوت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو بڑا سمجھے تو یہ شیطنت ہے جبکہ مومن اقدار کے سامنے جھکتا ہے تو یہ اِستکبار مومن کا حق ہے۔

أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (46:20)

یہ جو دنیا میں بغیر حق کے استکبار تھا یہ غلط تھا۔ یہ (Ego) تو ان کو

أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ (2:206)

یعنی غلبہ کا زعمِ باطل ان کو پکڑتا ہے اور جھکنے سے روکتا ہے جو ان کو کمزور اور ان میں اضمحلال پیدا کرتا ہے اور یہ پھر ساری قوموں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ ان کی پندار نفس۔ جھوٹی عزت False Prestige۔ ان کے آڑے آجاتی ہے۔

’’انسانیّت کی تقسیم‘‘، ’’پاسپورٹ وویزہ کی پابندی‘‘

انسانیّت کی تقسیم:

کرۂ ارض کے متعلق کہا تمہارے لئے مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٢٣﴾ (7:24) یعنی پورا کرۂ ارض بنی آدم کا ہے جہاں جی چاہے رہو۔ انسانوں نے اس کرہ ارض پر لکیریں کھینچ دیں۔ جغرافیائی حدود بنا دیں کہ نہ لکیر سے ادھر جا سکتا ہے اور نہ اس لکیر سے کوئی آ سکتا ہے یعنی اب یہ ارض مستقر نہیں رہا انسان کیلئے۔ کہا گیا تھا اب اگر ایک خطہ زمین حالات تنگ ہو جائیں تو پاؤں توڑ کر مت بیٹھنا بلکہ زمین وسیع ہے۔ دوسری جگہ جا کر ساز گار حالات میں اس نظام کو نافذ کرنا لیکن اب تو یہ پاسپورٹ، ویزا اور نیشنلٹی کی پابندیاں! جگہ جگہ رکاوٹیں ہی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔

ایک خطہ زمین کتنا ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو جائے اگر وہ اس میں سے نکلنے کا ارادہ کرے گا تو قرآن کہتا ہے۔

اُعِيْدُوْا فِيْهَا (32:20)

دھکا دیکر وہیں لوٹا دیا جائے گا۔ تو تم اس جہنّم سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتے۔ یہ اذیت ترین عذاب ہے کہ اس پر زمین تنگ ہوگئی۔

1970ء کی بات ہے کہ یوگنڈا یا کینیا میں نئے قوانین بنے تھے۔ ساری دنیا کے لوگ غیر ملکی وہاں تھے۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ ایک واقعہ ایسا تھا کہ ان پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ وہاں کی زندگی سے تنگ آ کر ایک ہندوستانی لڑکی ایک انگلینڈ جانے والے جہاز میں چوری چھپے بیٹھ گئی۔ جب وہ انگلینڈ پہنچی تو اسے وہاں اندر آنے سے روک دیا گیا کہ تمہارے پاس ویزہ نہیں ہے۔ وہاں سے وہ لڑکی کسی اور جہاز میں بیٹھی نو دن تک وہ اسی طرح مختلف جہازوں میں جاتی رہی۔ ہر جگہ سے دھکا دیکر لوٹا دیا گیا۔ اس دوران اس نے ستر ہزار میل کا سفر طے کیا۔ واپس دوبارہ اسی جہنّم کینیا جانا پڑا۔ جہاں انہوں نے اسے قید کر دیا تو اخبارات نے بڑی تنقید کی کہ تمہاری کالونیاں تھیں اور وہاں سے لوگ آتے ہیں تو ان پر راستے مسدود کرتے ہو کہ اپنے قوانین میں ترمیم کرو۔ اس لڑکی کا آخری بیان تھا کہ مجھے آٹھ دن ہو گئے ہیں کہیں ڈبل روٹی کا ٹکڑا ملتا ہے تو میں کھا لیتی ہوں میں آٹھ دن تک نہیں سوئی یہ وہی

674

ساڑھی جو میں پہن کر نکلی تھی۔ میرے بدن پر ہے۔

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا (32:20)

یہ تو روز کا قصّہ ہے یہ ویتنام والے مظالم سے تنگ آ کر چوری چھپے بھاگتے ہیں تو ان کشتیوں کو بندرگاہوں پر اترنے نہیں دیا جاتا اور ان کشتوں کو ڈبا دیا جاتا ہے کوئی ملک قبول نہیں کرتا۔ اب یہ ساری زمین جو انسان کیلئے مستقر تھی۔ تو آج انسان کو کسی جگہ پناہ نہیں ملتی یہ قرآن تھا جس نے اعلان کیا۔

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط (3:97)

جو بھی اس نظام میں داخل ہوگا تو اس کو امن مل جائے گا۔ یہ تھا اعلان سارے بنی نوع کیلئے اور یہ جہنّم خود اپنے خود ساختہ نظام کی وجہ سے بنی نوع انسان نے اپنے لئے تراشا ہے۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس   خاور کے ثوابت ہوں یا افرنگ کے سیّار

صرف یہ نظام یعنی قرآنی نظام ساری دنیا کیلئے امن کی ضمانت دیتا ہے۔

❁❁❁

حق و باطل میں مصالحت نہیں ہوسکتی

حق اور باطل میں تو مصالحت ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ اگر حق بھی دو اور دو پانچ مان لے تو پھر وہ باطل پر آ گیا۔ یہ تو اصول کی جنگ ہوتی ہے۔

باطل دوئی پرست، حق لاشریک ہے شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

ضد اور اصول پرستی میں فرق ہی یہی ہے۔ ضد تو باطل پر ہوتی ہے اصول پرستی حق پر ہوتی ہے اس لئے رسول ﷺ کو تاکید کی گئی تھی کہ چونکہ اب ان میں دوبار شکست کھانے کے بعد ہمت نہیں تھی اس لئے یہ مفاہمت کے حربے پر آ گئے تھے۔ اس کی وجہ قرآن نے جو بتائی ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْہُ ؕ (10:15)

جواب دیا گیا:

قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾ (10:15)

یہاں تو شکست کھا گئے۔ جب صدرِ اوّلیں دور ختم ہوا تو قرآن میں تو کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ناممکن تھا۔ دوسرے راستے اختیار کئے گئے۔ نئے نئے عقائد وضع کئے۔ ''مثلہ معہ'' قرآن کے ساتھ چپکا دیا سنی اور شیعہ کے 10 مستند ترین مجموعے 14 لاکھ روایات پر مشتمل ہیں۔ روایات کے بعد فقہ کے احکامات بنا دیئے۔ وہ جو ہڈیوں میں چوٹ لگی تھی۔ اس کا یہ بدلہ لیا۔

رسول ﷺ سے کہا گیا تھا۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (11:112)

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ (11:113)

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ (11:113)

''جیسا حکم دیا گیا ہے اس پر جم جاؤ اور ان کفّار کی طرف ہرگز نہ جھکنا ورنہ تم بھی جہنّم کا ایندھن بن جاؤ گے۔ اور کوئی

مدد کو نہیں آئے گا۔''

یہ بار بار یہ کوشش کرتے تھے۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٨﴾ (68:8) ''ان جھٹلانے والوں کی باتوں میں نہ آجانا۔''

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿٩﴾ (68:9) ''چاہتے ہیں کہ تم حق سے ادھر ادھر ہو جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (33:1) ''صرف اس وحی کا اتباع کرتے جاؤ۔''

وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط (33:2)

بار بار کا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ (33:2) یہ اصرار ہے۔

قرآن میں مذکّر اور مؤنّث کے صیغوں کا استعمال

یہ ایک اصول اور قانون ہے کہ جہاں جہاں بھی مذکّر کی ضمیریں یا صیغے آئینگے تو اس سے مقصود دونوں مرد اور عورت ہیں۔ مرد اور عورت دونوں ساتھ ساتھ، دوش بدوش چلتے ہیں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں جو کچھ مرد کر سکتا ہے وہ عورت نہیں کر سکتی۔ سوائے بائیولوجیکل یعنی حیاتیاتی لحاظ سے کہ دونوں کے وظائف زندگی میں فرق ہے اس کے بعد ایک انسان کی حیثیت سے دونوں برابر ہیں۔ قرآن کے عام انداز میں مذکّر کا صیغہ جہاں استعمال کرے تو مؤنّث ان کے اندر شامل ہوتی ہے چونکہ نمایاں طور پر بتانا تھا اس لئے مومن اور مومنات، مسلم اور مسلمات کا نام الگ الگ دیکر ذکر کیا گیا ہے مندرجہ ذیل آیت میں

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾ (33:35)

❁❁❁

کیا عورت امورِ مملکت میں حصّہ لے سکتی ہے؟

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (9:71)

اب اسلامی مملکت کا فریضہ کیا ہے؟ مرد اور عورت دونوں مملکت میں شریک کار ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (22:41) وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ (9:71)

یعنی ایک دوسرے کے ماتحت نہیں ہیں بلکہ ساتھی اور مددگار ہیں۔ اس کے بعد اسی آیت کا اگلا ٹکڑا ہے۔

يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (9:71)

وہی چاروں فرائض جو مرد کیلئے ہیں عورت کیلئے بھی ہیں۔ مومن مرد اور عورت دونوں کا فریضہ قرار دیا ہے اب تو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ عورت حصّہ لے سکتی ہے یا نہیں۔ اس آیت میں حکومت کا فریضہ گنا کر مومنین اور مومنات دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ مقامِ عورت کا جو قرآن دے رہا ہے نہ کہ اسے نمائش کیلئے بطور جنسی استعمال کیا جائے۔ اس نظام میں اطاعت تو کسی فرد کی نہیں ہے بلکہ قوانین کی اطاعت ہے۔

❁❁❁

''ختمِ نبوّت کے بعد آپ ﷺ کے مقرّبین کا رتبہ اور فریضہ اللہ کے نزدیک''

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ (33:56)

یقیناً خدا اور اس کی تمام کائناتی قوتیں نبی ﷺ کے اس پروگرام کی تائید و تحسین اور مدد کرتی ہیں اس لئے اے مومنو! تم بھی اسی طرح اس کی تائید و حمایت کرو اور اسے قائم کرو اور ان قوانین کے سامنے دل کی گہرائیوں سے جھک جاؤ جو قرآن کی دفتین میں ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ (33:43)

یہ الفاظ اوپر والی 56 آیت میں خصوصی طور پر رسول ﷺ کیلئے تھے اور یہی الفاظ 43 آیت میں خدا اور ملائکہ کی طرف مومنوں کیلئے آتے ہیں۔ نبوّت تو ذات مآب ﷺ سے مختص تھی اور وہی اس کا اختتام ہو گیا۔ مگر رسالت یعنی اس پیغام کے مطابق عملی نظام قائم کرنا یہ فریضہ حضور ﷺ کے بعد امت کے سپرد کیا گیا ہے۔ نبوّت کو چھوڑ کر یہ تمام فرائض زندگی پر تمام خصوصیات کبریٰ کی حامل اب یہ امت ہو گئی۔ متبعینِ رسول ﷺ ہوئے۔ یہی ختم نبوّت ہے کہ یہ تمام فرائض اب یہ امت ادا کرے گی۔ اس لئے قرآن نے ان کو وارثِ کتاب جو مکمل، غیر متبدّل، قیامت تک کیلئے سارے انسانوں کیلئے ضابطہ حیات اور محفوظ ہے۔ اس لئے خدا کی طرف سے اب کسی وحی کی ضرورت نہیں رہی۔ یوں ختم نبوّت ہوئی مگر یہ وحی، یہ قرآن تو الفاظ، حروف اور نقوش میں لکھی ہوئی ہے۔ اب یہ الفاظ زندہ نظام کی شکل میں زندہ انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوتا ہے۔ یہ وہی ہیں جن کو امت یا مومنین کہا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں رسول ﷺ کے متعلق اللہ اور اس کے ملائکہ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ (33:56) ہیں اور وہی الفاظ یہاں امت کیلئے آئے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43)

خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہیں۔

لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ (33:43)

تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔

اب اسی امت نے اس نظام کو آگے نافذ کرنا اور جاری رکھنا ہے۔ حضور ﷺ نے اس نظام کی بنیاد رکھ دی اس کی عملی شکل دکھا دی۔ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس کے بعد فریضہ امت کے سپرد ہو گیا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾ (33:45-46)

''ہم نے تجھے اس لئے بھیجا کہ تم وحی کا یہ نظام قائم کر کے اس کا نگران بن جاؤ تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اس کے مطابق چلنے سے کس قدر زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کے عواقب کس قدر تباہ کن ہوتے ہیں۔ ہمارا یہ رسول ﷺ تمام نوع انسانی کو اس نظام کی طرف دعوت دیتا ہے اور تاریک راتوں میں سورج کی طرح جگمگاتا ہے''۔

اب یہ مومن کی جماعت ظلمت سے نور کی طرف تو آ گئی۔ ابھی معاملہ ختم نہیں ہوا۔

اَوَمَنْ كَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (6:122)

''یہ قوموں کی حیات و ممات کی بات ہے۔ اسلام سے پہلے کی حالت ہے اسے خدا نے موت سے تعبیر کیا ہے سانس تو لیتے تھے مگر انسانیت مردہ تھی پھر ان کو زندہ کیا قرآن مردہ اقوام کو حیات نو عطا کرتا ہے''۔

وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا (6:122) اور اسے آسمانی قندیل دے دی جائے وہی قرآن جس کی روشنی میں خود بھی رہیں اور تاکہ یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (6:122) اس قندیل کو لے کر لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ اس طرح سے ان کے راستوں کو اس نور سے روشن کرتے چلے جائیں۔ یہ اس امت کا فریضہ ہو گیا۔

رسول ﷺ کی بعثت میں وہ جو ایام جاہلیہ میں مردہ قوم زندہ ہوئی تو جماعت مومنین کہلائی۔ یہ تاریکی سے روشنی میں آ گئے۔ اب حضور ﷺ کے بعد اس امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس روشنی کو چار سو پھیلائیں۔ یہ ہے ایک بڑا فریضہ جو اس قوم کے اوپر عائد ہوتا ہے تو کیا وہ اس کے برابر ہو سکتی ہے۔

كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ (6:122)

کیا یہ لوگ ان لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں کہ وہ ان تاریکیوں سے نکلنے نہ پائیں۔

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ (2:167) لاکھ چاہنے کے باوجود اس جہنم کدہ سے نہیں نکل سکیں گے۔

اس لئے کہا گیا کہ تم اس روشنی کو لے کر اس تمام انسانیت کو ان اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ۔ ذمہ داری تو اس کے اوپر عائد ہو گئی جو روشنی میں آ گیا۔ اس لئے کہ:

زُیِّنَ لِلْكٰفِرِیْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (6:122)

674

پھران کوان تاریکیوں کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ وہی ان کوخوش نما اور حسین لگتی ہے یہ تمام جرائم پیشہ افراد کیلئے تاریکی بڑی خوش آئند ہوتی ہے۔ جاؤ اوران سازشیوں کے ہاتھ توڑو جو اس انسانیت کو اندھیروں میں رکھنا چاہتے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۝۱۲۳ (6:123)

جو تاریکی مٹانے آئے تھے۔ یہ خود اپنے کمرے میں دیا سلائی جلانے نہیں دیتے کہ اس سے ان کی نیندیں اچاٹ ہوتی ہیں۔حالانکہ ان کو تو اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا (33:45)

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143)

خلفائے راشدین کے دور کے بعد پھر یہ روشنی کا مینار نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

❁❁❁

ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت

جنّت کی زندگی گھر سے شروع ہوتی ہے:

قرآن نے گھر کی زندگی پر بہت زور اور تاکید کی ہے۔اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر گھر کی زندگی اطمینان بخش نہیں ہے تو باہر کی زندگی میں بھی کوئی کام اطمینان سے نہیں کر سکتے۔اس لئے باہر جو نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا آغاز چھوٹے پیمانے پر گھر سے کریں۔تو اگر تمام گھر اس طرح سے قرآنی تعلیمات میں ڈھل جائیں۔تو پورا معاشرہ اس میں ڈھل جاتا ہے۔معاشرہ ہوتا کیا ہے؟ دن کے وقت جب ہم نکلتے ہیں تو معاشرہ بن جاتا ہے تاکہ گھروں کو لوٹتے ہیں تو یہ اجزاء میں بٹ جاتا ہے یہ وہی معاشرہ ہوتا ہے جس کے حصے ہر گھر کی صورت میں ہو جاتے ہیں۔یہ دو الگ الگ زندگیاں نہیں ہیں گھروں کی زندگی اگر قرآنی نظام کے مطابق ہو جائے۔تو باہر معاشرہ خود بخود اس کے مطابق ہو جاتا ہے۔قرآن کی رو سے اصولاً وحدت زوج یعنی Monogamy کا حکم ہے یہ جو ایک وقت میں دو تین تین اور چار چار کی اجازت دی گئی تھی اس میں صرف ایک استثنا (Exception) تھی۔سرایہ اور غزواۃ تقریباً 82 بنتی ہیں۔جنگوں کے اس نتیجہ میں جوان کام آجاتے ہیں تو بچے اور بوڑھے رہ جاتے ہیں۔اب یہ جوان لڑکیاں جو شادی کے قابل ہیں، بیوہ ہو جاتی ہیں ان کے یتیم ہیں۔عورتیں اپنے مردوں کو چھوڑ کر مدینہ آ رہی تھیں۔جو صرف مسلمانوں سے ہی شادی کر سکتی تھیں۔اس سے تعداد زیادہ بڑھ گئی۔یہ ایک مختصر سی جماعت تھی قرآن نے ان عورتوں کو ''یتمیٰ'' یعنی وہ عورت جسے خاوند نہ مل رہا ہو یا شادی نہ ہوئی ہو یا بیوہ ہو۔تو ان حالات سے نپٹنے کیلئے ان کو کہا گیا کہ

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانْكِحُوۡا مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ‌ۚ (4:3)

یہ اس مسئلہ کے حل کیلئے ایک استثنیٰ دیدی گئی تم چاہو اور تمہاری پہلی گھر والی چاہے تو تب باہمی رضامندی سے ایک سے زیادہ شادی کر لو۔کیونکہ ان عورتوں کا گھر میں ویسے لانا خرابی کا موجب ہو سکتا ہے اور عورت بھی اس گھر میں کوئی عزت محسوس نہیں کرتی۔ان کی بھی عزت خویشی کیلئے یہ حل بتایا گیا ہے یہ بھی صرف اس وقت تک جب تک کوئی حل نہ ہو۔

شرط یہ ہے ''اِنۡ خِفۡتُمۡ '' (4:3) اگر صورت ایسی پیدا ہو جائے اور کوئی حل نہ ملے، ابتدائی دور میں مسلمانوں کے گھروں میں ایک سے زیادہ بیویاں وہ اس ضرورت اور مصلحت کے تحت تھیں اور حضور ﷺ کے گھر میں بھی انتہائی معزز خاندان کی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ جب معاشرہ نارمل حالات پر آ گیا۔ ہنگامی حالات ختم ہو گئے تو پھر ان عورتوں کو اجازت دیدی گئی کہ اگر جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ رہنا چاہو تو شوق سے۔

وَ سَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ۝۴۹ (33:49)

ان کو حسن کارانہ انداز سے گھر سے رخصت کرو۔ اگر میرے گھر کی زندگی پسند ہے تو رہو۔ یہی صورتحال باقی مسلمانوں کی تھی۔ انہوں نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔

انسان کا اعمالنامہ اس کی گردن میں
یعنی نفسِ غیر شعوریہ کی شکل میں لپٹا ہوا ہے

ایک عظیم نفسیاتی ڈسکوری:

كُلُّ نَفۡسٍ تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا (16:111)

یہ دو نفس، یعنی شعوریہ اور غیر شعوریہ جھگڑتے آئینگے۔ یعنی شعوری نفس یہ چاہے گا کہ یہ باتیں سامنے نہ آئیں جبکہ نفس غیر شعوری اپنے سٹور سے اس کو باہر لائے گا۔

وَكُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓٮِٕرَهٗ فِىۡ عُنُقِهٖ‌ؕ (17:13)

وَنُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلۡقٰٮهُ مَنۡشُوۡرًا ﴿۱۳﴾ (17:13)

پر کہا جائے گا۔

اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ‌ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ؕ﴿۱۴﴾ (17:14) یہ سارا سزا و جزا کا عمل سائنٹفک ہے۔

❋ ❋ ❋

سب سے بڑا شرک انسان کا انسان پر حکومت کرنا

انسانیّت کی دنیا میں سب سے بڑا شرک ''انسان کا انسان پر حکومت کرنا ہے'' اس سے تو انسان اپنے مقام پر نہ رہا اور نہ خدا الوہیت کے درجہ پر رہا۔ اس لیے کہا گیا۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝۱۳ (31:13)

جونہی کسی انسان نے کسی انسان کی حکمرانی قبول کی تو شرک ہو گیا۔ انسانوں میں مساوات ہے۔ سب برابر ہیں۔ اپنے ہی جیسے کسی اور انسان کو حاکم تصوّر کیا تو یہ انسانیّت سے گر گیا اور جسے حکمران بنایا تو وہ خدائی درجہ تک پہنچ گیا۔ دونوں اپنے مقام پر نہیں رہتے۔ اس لیے یہ شرک ظلم عظیم ہو گیا۔ ساری بات حکومت اور محکومیت کی ہے۔ قرآن نے تو نبی کے حکم ماننے سے بھی نبی کا مقام متعین کر دیا۔

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (18:110)

میں تو صرف اس کا حکم پہنچاتا ہوں یہ ہے توحید۔(Monotheism)

❁❁❁

جنوں کی پرستش ''اٰخِرَۃِ پر بھی تفکّر کا حکم''

جنوں کی پرستش:

جہالت کے زمانہ میں انسان فطرت کی غیر مرئی قوّتوں کی پرستش کرتا تھا۔ کوئی ان کو فرشتہ کہتا۔ کوئی جنات سے تعبیر کرتا۔ اب انسانی علم نے آکر ان توہم پرستوں کو توختم کر دیا۔ لیکن ان کی جگہ ''نئی قسم کی توہم پرستیاں آگئیں۔ آج کا انسان خدا سے انکاری ہے اور فطرت کی قوّتوں کی پرستش کر رہا ہے۔ اگر ان قوّتوں کو وحی کے تابع رکھا جائے تو وہ ''ملائکہ'' بن جاتی ہیں جو امن وسلامتی کا پیامبر ہیں اگر ان کو آزاد اور سرکش چھوڑ دیا جائے تو وہ ''جنات'' ہو جاتی ہیں اور چارسو تباہی پھیلا دیتی ہیں۔ آج دنیا پر انہی ''جنات'' کا قبضہ ہے۔

آخرت کی دنیا پر بھی تفکّر:

قرآن میں توہم پرستیاں اور اسلاف پرستیاں یہ دو بیماریاں ہیں۔

قرآن تو آخرت کی تماثیل پر بھی غور کرنے کا کہتا ہے جو قرآن نے دی ہیں۔

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ (2:219) فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ (2:220)

صرف دنیاوی معاملات میں بھی نہیں بلکہ آخرت میں بھی۔ یہ ہے وہ امتیازی شے جو قرآن کو ممتاز کرتی ہے۔

ملائکہ پیغام رساں قوّتیں اور طبعی قوانین

جو قوّت پانی کو بھاپ اور برف بنا دیتی ہے۔ اسے ملائکہ کہتے ہیں۔ عربی زبان میں ملائکہ کے دو مادے (Roots) ہیں ایک تو (ا ل ک) اور دوسرا (م ل ک) ملک یعنی قوّت اور ''ایک'' پیغام پہنچانا۔ ان دونوں چیزوں کو ملک یا ملائکہ کہتے ہیں۔ یہ Communicate کرنے کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ عام الفاظ میں یوں کہئے کہ ایک بیج آم کی گٹھلی کا بو دیا پہلے ایک شگوفہ نکلتا ہے پھر پودا بنتا ہے اب یہ چیز کہ ایسے پتے بناتا، ایسی شاخیں بناتا، اس میں اس قسم کا پھل لانا، ایسی خوشبو اور ذائقہ لانا اس میں یہ خاصیت پیدا کرنا۔ یہ پیغام یہ قوّتیں ان کو پہنچاتی رہتی ہیں کہ یوں کرو اور یوں کرو، اب ملائکہ کی خصوصیّت یہ ہے کہ ''لَمْ تَرَوْهَا'' (9:26) وہ عام محسوسات میں نہیں آتے۔ یعنی یہ کائنات میں سارا سلسلہ یونہی اتفاقاً نہیں ہوجاتا۔ بلکہ یہ وہ پیغامات ہیں جو ان تک پہنچائے چلے جاتے ہیں اگر یہ ہنگامی طور پر ہوتا تو کبھی جامن کی گٹھلی میں سے کیکر پیدا ہوجاتا اور کبھی انگور۔ پیغام کے بغیر قرآن کی بات سمجھ ہی نہیں آتی۔ اب یہ جو جسم انسانی سے ماورا نفس انسانی ہے۔ یہ جو فیصلہ کرتا ہے تو بڑی تیزی سے اندر سے فیصلہ کرتا ہے۔ اس کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ اس کے اندر کے تغیّرات حیران کن ہیں۔ کبھی پانی کا گلاس اٹھاتا ہے کبھی پی لیتا ہے یہ جو میرے مائنڈ کا فیصلہ ہے یہ کیا چیز ہے۔ جو Communicate کرتی ہے سائنس تو دھرا کر ختم ہوگئی کیونکہ یہ طبعی تھا ہی نہیں۔

کائنات کے ذرے ذرے کا علاوہ انسانی جسم کے پیکر کو حکم دینے والے اس فنکشن کو قرآن نے ملائکہ قرار دیا ہے۔ سائنس تو یہ نہیں بتاسکی کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے۔ پانی کا گلاس اٹھانا ہے یا تھپڑ مارنا ہے۔ یہ تو طبعی جسم کی بات ہی نہیں۔ اس نے کسی کا حکم ماننا ہے اور وہ حکم دینے والا کون ہے؟ وہ حکم اس کو کون پہنچاتا ہے اور کیسے پہنچاتا ہے؟ کہتے ہیں کہ اندر ایک (ابلاغ) (Communication) کرنے والی قوّت ہے جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ قرآن کہتا ہے کہ انہی کو ہم ملائکہ کہتے ہیں۔ جن کو ''لَمْ تَرَوْهَا'' تم نہیں دیکھ سکتے۔

اس محسوس کائنات کے اندر اس کی جو کارفرمائی ہے وہ ساری ان قوتوں کے ذریعہ ہے۔ جو خدا نے پیدا کر رکھی ہیں۔ جو ہمارے محسوسات کے دائرے میں نہیں آتیں یہ ان کو ''ملائکہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ ملائکہ کے بنیادی معنوں میں (Communication) یعنی پیغام رسانی محفوظ ہے۔ قرآن نے اس کے ساتھ ''الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا'' (35:1) کہہ کر اس خصوصیّت یعنی پیغام رسانی کی

خصوصیّت بتادی۔

اب یہ تیزی سے پہنچانے والی چیز تھی اسے سمجھنے کیلئے کہا''اُولِیۡۤ اَجۡنِحَةٍ''(35:1)اَجۡنِحَةٍ کا واحد ''اَلۡجَنَاحُ'' ہے۔ جہاں سے ہم نے فرشتوں کا مخصوص تصوّر لیا''جَنَاحٌ''، کسی شے کے دونوں سائیڈز، جانبین، ادھر کا ادھر کا کہتے ہیں اس لئے انسان کے دونوں بازوں کو بھی''جناح'' کہتے ہیں۔ پرندے کے دونوں پروں کو بھی کہتے ہیں۔''خود حفاظت'' کو بھی کہتے ہیں۔

''اَنَا فِیۡ جَنَاحِهٖ''میں اس کی حفاظت میں ہوں''۔یعنی اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴿۸۸﴾(15:88)

یعنی رفقاء کے سر پر دست شفقت رکھ اب اس کے مجازی معنی ہیں''حفاظت والی چیز''جَنَاحٌ۔یعنی وہ چیز جو حفاظت کے لیے استعمال ہو۔تخریب کے لیے نہیں۔

جَنَاح کی جمع''اَجۡنِحَةٌ''ہے یعنی حفاظت میں لینے کی بہت سی چیزیں ہیں ہر ایک کے اندر دو، تین تین اور چار چار مختلف چیزیں یعنی خواص ہوتے ہیں۔ یہ پیمانوں کے متعلق ہوتے ہیں یعنی ذرہ کے برابر سنکھیا اگر ڈاکٹر دے تو وہ توانائی دیتا ہے وہی سنکھیا اگر اس مقدار سے زیادہ ہوجائے تو موت کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ مقدار کا فرق ہے۔، پیمانے کا فرق ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ﴿۱﴾(35:1)

اب کہا کہ یہ چیز پیمانوں کے مطابق ہوتی ہے تم ریسرچ کر کے معلوم کرسکتے ہو کہ یہ مقدار کتنی ہے مثلاً یہ کہ سنکھیا اتنا کھانے سے مہلک ہوتا ہے۔ اتنا کھانے سے توانائی دیتا ہے۔ اتنا پانی پینے سے زندگی بنتی ہے یہ تمام پیمانے غیر متبدّل ہیں۔

عالمِ امر سے عالمِ خلق کی طرف مختلف منازل کیلئے ان گنت قوّتوں کا نزول:

ملائکہ کے بارے میں''فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا﴿۵﴾''(79:5)یعنی عالم امر جو خلق سے پہلے ہے جہاں ساری چیزوں کی ڈائرکشن مقرر ہوتی ہے۔ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا﴿۵﴾(79:5)ملائکہ ہیں۔یعنی تخلیق کر دی۔ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ(65:12) ارض و سماء میں ہم اپنا امر یعنی Directions پیمانے مقرر کئے تھے ان کو بھیجتے چلے جاتے ہیں کہ یہ امر آ گیا کہ اس سمت کو جا کر ، اس شے نے فلاں مقام تک پہنچنا ہے تو اس طرح سے کوئی پہنچانے والا بھی ہونا چاہئے۔ یہ ہیں فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا﴿۵﴾ (79:5) یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ(65:12)

کائنات کے اندر ہم اپنا امر نازل کرتے چلے جاتے ہیں۔ بھیجتے چلے جاتے ہیں اس امر کو جو ہماری Follow up کرنے والی قوّتیں ہیں۔ ملائکہ کہا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیات یہ ہیں۔''یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ''(66:6) ہمارے امر کے مطابق کرتے چلے جاتے ہیں۔ کارگاہ کائنات متحرک ہے۔ ارتقاء جاری ہے۔

اس کو جاری رکھنے کیلئے اپنا امر بھیجتے ہیں کہ کس شے کو کیا بننا ہے اس بیج کو آم کا درخت بننا ہے۔ یہ ڈائرکشن ہم نے ہر شے

674

کے اندر رکھ دی ہے۔ ان Directions کو جو Follow up کرنے والی قوتیں ہیں ان کو ملائکہ کہا جاتا ہے کوئی ایک خاصیت کی مالک ہوتی ہے کوئی متعدد خاصیتوں کی مالک ہوتی ہے۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۞(66:6) اس طرح سے وہ اپنی تخلیقی چیزوں میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞(35:1)

یہ اُن مقرر کر دہ پیمانوں کے مطابق ہوتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۞(35:43)

ان میں کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔

یہ تمام فطرت کے قانون معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ تبدیل نہیں کئے جا سکتے۔ (شین کے الفاظ) قرآن نے اپنے طور پر آدم کے قصے کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے یعنی یہ ذکر فطرت کے تمام قوانین کا Cause اور Effect معلوم کرے گا۔ کہ پانی 100 سینٹی ڈگری گریڈ پر اُبلتا ہے۔ اب اس بھاپ سے سٹیم انجن بنا کر ہزاروں ٹن وزن کو کئی میل کی رفتار سے کھینچتا چلا جا رہا ہے۔ آدم نے ان تمام قوتوں کو قابو کر لیا اور وہ ساری اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ اب کسی کے سامنے جتنے ملائکہ زیادہ سجدہ ریز ہونگے۔ اتنا ہی وہ مقام آدمیت پر پہنچ جائے گا۔ مومن سے پہلے مقام آدم کا حصول ضروری ہے۔ ان فطرت کی قوتوں کو تسخیر کر کے "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" (13:17) کیلئے استعمال کرے گا۔ تو یہ مقام مومن ہو گا خدا کی اقدار کے تحت ان قوتوں کے استعمال کرنے والا مومن کہلاتا ہے۔ ان قوتوں کو کائنات کے حسن سے حسین تر بنانا ہی اعمال صالحہ کہلاتا ہے۔

”شَیۡطٰنُ“ اور ابلیس

"Discovery of Theory of Aggression and Frustration"

شیطان:

یہ شر، شرر یا چنگاری یعنی شیطان ”ش ط ن“ بھڑک اٹھنے والا شعلہ جذبات کی وجہ سے انسان غصہ میں آ جاتا ہے۔ عربی میں غضب کے معنی ”شعلہ، حرارت اور سرکشی“ غصہ آتا ہے تو درجہ حرارت دو ڈگری بڑھ جاتا ہے۔ دل و دماغ کو ماؤف کر دیتا ہے۔ جو اس کیلئے اصول یا قدر مقرر ہے اسے چھوڑ کر سرکش ہو جاتا ہے۔ اسے ان جذبات کو تعمیری کاموں میں استعمال کرنا تھا مگر یہ اسے سرکشی میں برت رہا ہے۔ اس میں تندی، تیزی، شعلہ صفتی ہے۔ اگر ان جذبات کو ایک حد سے بڑھنے دیا جائے تو شیطٰن ہو جاتا ہے یعنی شعلوں کا مشتعل ہو جانا۔ انسان کے اپنے جذبہ کی بات ہے یہ ہر فرد کی اپنی چیز ہے یہ ہر فرد کے اندر ہوتا ہے۔ یہ تمام سرکش جذبات کا نام شیطان ہے۔

جارحیت(Aggression):

قرآن میں اس کیلئے دو الفاظ آئے ہیں شیطان بھی اور ابلیس بھی۔ یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک ہی چیز کے دو الگ الگ نام کیوں ہیں؟ اب نفسیات کی ایک تھیوری ہے۔ جارحیت اور مایوسیت کا نظریہ (Theory of Aggression and Frustration)

انسان کا غصہ، جسے جارحیّت کہتے ہیں۔ استبداد یعنی قوّت کا حدود فراموش ہو جانا یہ انسان میں ایک شے ہے جو نفسیاتی ہے کہ جب جارحیت ختم ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ Frustration ہوتا ہے۔ عربی میں ابلیس کے معنی ”مایوس ہونا“ پھر جارحیت کے بعد اس کا انجام مایوسیت ہوتا ہے۔

غصہ میں ابھرنے والا جذبہ، اشتعال ”شیطان“ ہوتا ہے۔ غصہ میں آ کر پاگل ہو جاتا ہے۔ جب یہ اشتعال کا درجہ پیچھے لوٹتا ہے تو وہ اپنی سطح سے بھی نیچے یعنی 98F° سے بھی کم ہو کر 96F پر آ جاتا ہے یہ درجہ حرارت کا کم ہو جانا ہے اس کی ندامت یا مایوسی ہے۔ یہ ہے ابلیس، جسے قرآن کبھی شیطان کہہ رہا ہے جب اس کا غصہ مشتعل ہو کر سرکشی اختیار کرتا ہے اس کے بعد ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ اس کو ابلیس کہتا ہے۔ یہ قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتے۔ شیطان کوئی خارج میں نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے اپنے ارادے کا نام

674

ہے۔ جو اقدار خداوندی سے سرکشی ہو جائے۔ تو اس کا شیطان اس وقت کارفرما ہوتا ہے اور جب یہ ان حدود کے سامنے جھک جائے تو وہ مومن ہوتا ہے۔ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (7:20) شیطان نے وسوسہ پیدا کیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ (50:16)

یعنی اس کا نفس اس میں وسوسہ پیدا کرتا ہے یعنی شیطان اس کا نفس ہے اس میں نفس بطور فاعل موجود ہے۔ یہ خود انسانی کی صفت ہے۔

عمر کا تعیّن

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ (35:11)

نہ عمر والے کی عمر میں سے زیادہ کیا جاتا ہے اور نہ کم بلکہ یہ سب کچھ اس کے قوانین کی رو سے طے ہوتا ہے۔اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑪(35:11)

یہ بات ہی ہمارے لئے مشکل نہیں تھی۔مشکل اس وقت ہوتی کہ ہم ایک عمر لکھ دیتے، پر کہتے کہ یہ اٹل ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی پھر تو مشکل ہوتا کہ اس میں تبدیلی کر دیتے۔جو بات ہمارے قانون کے مطابق ہوتی ہے اس میں ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ (3:145)

اصل زندگی اور موت کا درمیانی وقفہ ہے۔لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ㊳(13:38)

عمل اور اس کے نتیجہ میں جو وقفہ ہے۔اس کیلئے قانون مقرر ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ (7:34)

ہر قوم کیلئے زندگی اور موت یعنی عرّوج اور زوال کے قوانین مقرر ہیں۔جو وہ خود گھٹاتی یا بڑھاتی ہے۔اعمال کے ذریعہ۔

❁❁❁

قرآن کو سمجھانے کا رسول ﷺ کا طریق

قرآن کا سمجھنا:

ایک روایت ہے کہ نبی ﷺ قرآن سمجھاتے تھے۔ہم اس طرح سمجھتے تھے کہ جب تک دس آیتیں پوری طرح سمجھ نہیں لیتے تھے۔گیارہویں آیت تک ہم آگے نہیں جاتے تھے۔یہ تھا انداز حضور ﷺ سمجھانے والے اور صحابہ کرامؓ سمجھنے والے، یہ متعدّد روایات ہیں۔یہ امام غزالی (1058-1111) سے لیکر تھانوی (1867-1947) تک درود و وظائف اور عملیات ہیں۔ان میں تعویز، گنڈے اور درود وظیفے ہیں۔

❁❁❁

حروفِ استثناء

اِلَّا ۔ غَیْرَ ۔ سِوٰی ۔ خَلَا عَدَا ۔ حَاشَا، ان سب کے معنی ''مگر یا سوا''۔

استثناء سے مراد کئی چیزوں سے ایک یا کسی چیز کو الگ کرنا۔ یعنی اِلَّا کے مابعد یعنی مُسْتَثْنٰی کو اس کے ماقبل یعنی (مُسْتَثْنٰی مِنْہُ) کے حکم سے خارج کر دی جائے۔ جیسے حساب میں عمل تفریق سے کیا جاتا ہے۔ اِلَّا اپنے مابعد اسم کو نصب دیتا ہے۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْہَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ (19:62)

یعنی کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے سوائے سلام کے۔

نوٹ: اگر مُسْتَثْنٰی مِنْہُ مذکور ہو۔ اور جملہ مُثبت تو مُسْتَثْنٰی (اِلَّا کے بعد والا اسم) لازماً منصوب ہوگا۔ اگر مُسْتَثْنٰی مِنْہُ مذکور ہو لیکن جملہ منفی ہو اس میں نفی والا استفہام ہو تو مُسْتَثْنٰی منصوب بھی ہوسکتا ہے اور مُسْتَثْنٰی مِنْہُ کے اِعراب کی مطابقت میں مرفوع، منصوب یا مجرور بھی ہوسکتا ہے۔

مَا جَآءَ التَّلَامِیْذُ اِلَّا وَاحِدًا یا وَاحِدٌ مُستثنٰی مِنْہُ اَلتَّلَامِیْذُ کے اعراب کے مطابقت میں۔

2- مَارَاَیْتُ التَّلَامِیْذَ اِلَّا وَاحِدًا۔

اب مُستثنٰی وَاحِدًا، حرف استثناء اِلَّا کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ مُستثنٰی مِنْہُ کے اعراب کی وجہ سے منصوب ہے۔

3- مَا مَرَرْتُ بِالتَّلَامِیْذِ اِلَّا وَاحدًا یا وَاحِدٍ، مُستثنٰی مِنْہُ۔

کے اعراب کی مطابقت میں اور اگر مُستثنٰی مِنْہُ مذکور نہ ہو تو اِلَّا کا مابعد ماقبل عوامل کی مطابقت میں اعراب پائے گا۔ یعنی وہی صورت میں اِلَّا کا بطور حرف استثناء عمل باقی نہیں رہے گا۔

1- مَا اَخْطَأَ اِلَّا وَاحِدٌ اِلَّا وَاحِدٌ مُتَسَرِّعٌ۔

2- مَا سَمِعْتُ اِلَّا بُلْبُلًا صَدَّاھَا۔

مثال میں اِلَّا کا مابعد فاعل ہونے کی وجہ سے موضوع ہے جبکہ دوسرا مثال میں مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

❁❁❁

سورۂ یٰسین تو زندگی کی نوید ہے، صورِ اسرافیل ہے

به بندِ صوفی و ملا اسیری　　حیات از حکمتِ قرآں نه نگیری
بآیاتش تیرا کارے جز ایں نیست　　که از یٰسین او آساں بمیری

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70)

بجلی ہوں، نظر کوہ بیاں پہ ہے میری　　میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

پہلا مرحلہ کہ اس بنجر زمین کو قابل کاشت بنانا ہے پھر اس میں بیج ڈالنا ہے تو اس سے کھیتی اور پھل ملیں گے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا (36:33)

یہ ہے پہلا مرحلہ بنانے کے بعد

وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝۳۳ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ (36:33-34)

''پہلے اسے اس قابل بناؤ پھر جو بوؤ گے تو اس کی نمود ہوتی جائے گی۔ کھیتی باڑی، باغات اور پھل پھول، ہر چیز حاصل کرتے جاؤ اگر اس کو مَيْتَةً چھوڑ دیا۔ تو بیج کا ستیاناس ہو جائے گا''۔

جس طرح رسول ﷺ نے مکی زندگی کے تیرہ سال اس زمین مردہ کو بارآور بننے میں صرف کر دیئے۔ اس میں سوال تعداد کا نہیں ہے۔ انسان بنانا تھا اور ماڈل سامنے یہ رکھا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ (2:138) اور صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ
کا ماڈل رسول ﷺ تھے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21)

اس لئے کہا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (8:24)

قرآنی نظام کیلئے انسانیت سازی کی تشکیل قدم اوّل ہے۔ انسانوں کے اندر روح پھونکنے کا کام خدا تعالیٰ نے انسانوں کے سپرد کر دیا ہے۔

بھوک، خوف اور امریکی ماہرِ نفسیات

ایک امریکی ماہرنفسیات کہتا ہے کہ انسانی زندگی کا پہلا تقاضا رزق کا ہے جو نہایت شدید ہوتا ہے۔ اگر انسان اس تقاضے میں الجھا رہے تو اس سے بلند سطح کی جو کوئی چیز ہے تو اس کو اس طرف سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

سعدی کہتا ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق که یاراں فراموش کردند عشق

''یعنی روٹی کا تقاضا انسان کو عشق بھی بھلا دیتا ہے''۔

اگلا تقاضا اس کو تحفظ کا، سکیورٹی کا ہوتا ہے اگر روٹی ملی ہے اور حفاظت نہیں ہے تو وہ کچھ اور سوچ نہیں سکتا ہر وقت اسے خوف دامن گیر رہے گا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ دو بنیادی تقاضے پورے ہو جائیں تو ہر انسان Values کی طرف سوچ سکتا ہے۔ صرف وعظ و نصیحت سے جرائم کم نہیں ہو سکتے۔ جو جی میں آئے کرتے رہو۔ جس شخص کو ان دو تقاضوں میں روٹی اور حفاظت کی طرف سے یقین کامل نہ ہو جائے تو وہ اقدار کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔

قرآن نے چودہ سو سال پہلے روٹی کی اس اہمیّت کو پیش کر دیا تھا۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (16:112)

اور قریش کو جو فوائد بتائے کہ

الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ (106:4)

قرآن بات ہی روٹی اور حفاظت کی کرتا ہے جو بنیادی تقاضے ہیں۔ اب چونکہ سامان زیست کی فراوانی ہے اور تمام خطرات سے حفاظت تو اب ان کو چاہیے کہ اقدار کو لپک کر سینے سے لگائیں۔

''SOLAR APEX''المستقر

یعنی سورج صبح طلوع ہوتا ہے تو مغرب میں ڈوب جاتا ہے وہ اس کا ''مُسْتَقَرٌّ'' حالانکہ یہ تو ہمارا فریب نگاہ ہے۔ وہاں جا کر رک تو نہیں جاتا وہ تو مغرب ہماری نگاہ کی رو سے ہے۔ جو نیچے والے یعنی امریکہ والے، وہ تو ان کا مشرق ہوتا ہے اس لئے قرآن نے مشرقین اور مغربین کہا ہے۔ ادھر مستقر یعنی کوئی شے حرکت کرتی ہوئی ساکت ہو جائے جسے فلکیات میں Settled Place جس کا نام ''The Solar Apex'' رکھا ہے۔

❁❁❁

تقدیر کا وہ عقیدہ جو کفر پر مبنی ہے

تقدیر کا عقیدہ مبنی بر کفر:

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ ۖ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (36:47) اللہ براہ راست رزق نہیں دیتا۔

سَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكۡنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَىۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۔(6:148) اور نہ ہی اللہ کسی کے ارادہ واختیار میں مداخلت کرتا ہے۔

اسلامی مملکت کی ذمہ داری۔ اللہ کی ذمہ داریاں اسلامی مملکت پوری کرتی ہے۔

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا (11:6)

اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ (41:40) تو اب یہ رزق انسانی ہاتھوں سے ملے گا۔

❁❁❁

ساری دنیا جہنّم کا نمونہ

ارب ہا انسانوں کے انگوٹھے کے نشانات الگ الگ ہیں

اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ ‌ۚ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۙ‏ ﴿۶۰﴾ (36:60)

کیا تمہیں تاکید/حکم نہیں دیا گیا تھا۔ مختلف انبیاء کے ذریعہ کہ یاد رکھو! کبھی بھی ان مفاد پرست جذبات یا مفاد پرست گروہوں کی اطاعت نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ یہ معاہدہ عہد کی بات نہیں ہے بلکہ انہیں بھیجی گئی رہنمائی کا احساس دلانا ہے۔ یعنی شروع سے ہی مختلف انبیاء کی وساعت سے یہی تاکید کرتے رہے کہ ان بڑے بڑے سرغنوں کی باتوں میں نہ آنا کیونکہ یہ تمہاری ذات کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اَنِ اعۡبُدُوۡنِىۡ ؕ (36:61) صرف میرے احکامات کی پیروی کرنا۔ جس کیلئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ‏ ﴿۵﴾ (1:5) وَلَقَدۡ اَضَلَّ مِنۡكُمۡ جِبِلًّا كَثِيۡرًا ‌ؕ (36:62)

ان سرکشوں نے تمہاری بڑی بڑی قوموں کو غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔

اَفَلَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡقِلُوۡنَ‏ ﴿۶۲﴾ (36:62)

کیا تم ذرا بھی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ انسان کے جذبات عقل کے تابع ہوں اور عقل ہدایت خداوندی کے تابع، تو یہ اسلام کہلاتا ہے یہ ہے صراط مستقیم۔ یہ ہے صحیح مسلک اس کے خلاف جاؤ گے تو هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ‏ ﴿۶۳﴾ (36:63) پھر یہ جہنّم کی زندگی ہے جس کی بار بار تم سے آگاہی کی جاتی رہی۔ جس طرح آج ساری دنیا جہنّم بن گئی ہے یہ تمام خوشحال قومیں بھی عذاب میں گرفتار ہیں۔ کوئی ایک فرد بھی سکون میں نہیں ہے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ‏ ﴿۶۳﴾ (36:63)

اس میں داخل ہو جاؤ یہی جہنّم کی زندگی اب تمہاری زندگی ہوگی کیونکہ تم نے صحیح روش پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اس جہنّم سے یہاں کی عدالت کی طرح جھوٹ بول کر کوئی نہیں چھٹکارا پا سکتا۔ انسانی جسم کا ایک ایک انگ خود گواہی دے گا۔

اَلۡيَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰٓى اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيۡدِيۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ‏ ﴿۶۵﴾ (36:65)

زبان سے اقرار کی ضرورت نہیں پڑے گی۔اس کے ہاتھ اور پاؤں ایک ایک انگ شہادت دے گا۔

ہاتھ اور پاؤں کی شہادت پر غور کریں یہ ہمارے عدالتی نظام میں انگوٹھے کے نشانات اور پاؤں کے نشانات سے کھوجی کسی مجرم کا پیچھا کر کے اس تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تمام نشانات شہادت ہوتی ہے۔اگر کسی جگہ ہاتھ لگ گیا ہے تو وہ ان نشانات کو محفوظ کر لیتے ہیں اور گاؤں میں یہ پاؤں کے نشانات تو تفتیش کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتے ہیں اور آج ساری دنیا کے ہاتھ گواہ ہونگے، پاؤں ہونگے قرآنی اعلانات پر انگشتِ بدنداں ہے۔

❁❁❁

اربہا انسانوں کے انگوٹھوں کے نشانات کی کیفیّت ایک دوسرے سے مختلف ہے

دنیا کے بڑے بڑے مفکراس پر انگشت بدنداں ہیں کہ ازل سے لیکر کروڑوں، اربوں لاتعداد انسان آئے اور چلے جا رہے ہیں۔ قیامت تک کتنے آئیں گے۔ مگر کسی انسان کے انگوٹھے کی لکیریں کسی دوسرے انسان کے انگھوٹوں کی لکیروں سے مل ہی نہیں سکتیں۔ یہ منفرد ہے۔ دماغ چکرا جاتا ہے یہ لکیریں کتنی ہیں اوران میں اس قدر تغیرّ، اس قدر انفرادیّت، چند لکیریں اربہا ارب انسانوں کے انگوٹھے، اس شہادت کی خاطر، خالق نے بنائے۔

انگوٹھے کی شہادت سب سے بڑی شہادت ہے۔ عدالت میں ایکسپرٹ مجرم کا سراغ انہی لکیروں کی مدد سے لگا لیتے ہیں۔ ایک کی لکیریں دوسرے سے ملتی ہی نہیں۔ کسی بڑے سے بڑے آرٹسٹ سے کہئے دو چار بنانے کے بعد وہ عاجز آجائے گا۔

اتنا تغیرّ، اتنا تنوع، محدود ذہن، اتنی لامحدود تغیرّ کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔

وَلَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰٓى اَعۡيُنِهِمۡ (36:66)

اگر ہماری مشیت میں ہوتا تو ہم ان کی بینائی سلب کر لیتے۔

فَاسۡتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبۡصِرُوۡنَ ۝٦٦ (36:66)

تو راستے کی تلاش میں مارے مارے پھرتے لیکن ان کو کچھ دکھائی نہ دیتا۔

وَلَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰهُمۡ عَلٰى مَكَانَتِهِمۡ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مُضِيًّا وَّلَا يَرۡجِعُوۡنَ ۝٦٧ (36:67) کہ اس تمام طاقتوں کے باوجود ان کو کمزور کر دیتے کہ نہ آگے بڑھ سکتے نہ پیچھے چل سکتے۔ ہم ان کی تمام مخالفتوں کو روک سکتے تھے۔ مگر یہ ہماری مشیت کا تقاضا نہیں تھا۔

وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۝١٠ (90:10)

ہم نے قوانین دیئے جس کے تحت افراد کی اور اقوام کی بھی یہ کیفیّت ہے کہ قوموں کا بچپن کا زمانہ ہوتا ہے آہستہ آہستہ سے ترقی پاتی ہیں پھر شباب پر پہنچتی ہیں پھر آہستہ آہستہ انحطاط کی طرف یہی ایک فرد کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

674

وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِی الۡخَلۡقِ ؕ اَفَلَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۸﴾ (36:68)

جو شخص بوڑھا ہوتا ہے تو اس قویٰ مضمحل ہو جاتا ہے۔ اوندھا پن آ جاتا ہے۔ جسمانی طور پر۔ اس کیلئے تو وحی کی ضرورت نہیں ہے یہ تغیرّات تو عقل کے ذریعہ سمجھے جاسکتے ہیں۔ اس طرح سے قوموں میں زوال آتا ہے اور جو قومیں اقدار خداوندی کے تحت چلتی ہیں تو ان میں اضمحلال نہیں آتا۔ کیونکہ اقدار کے تحت تو ان قوموں کی خودی مستحکم ہوتی ہے۔ اب اگلی زندگی میں اس ذات کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس میں تو اوندھا پن نہیں ہوگا۔

❁❁❁

مغرب قرآن کی طرف، حیاتِ جاوید

اہلِ یورپ کے مفکّر عقل کی بنیاد پر خراماں خراماں قرآنی تصوّرات کی طرف:

اب یہ فلاسفر اس چیز پر آ رہے ہیں کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ یہ آگے بھی چلتی ہے۔ جسے ''Immortality'' کہتے ہیں یعنی حیات جاوید (Dr. jones1879-1958) تو صرف ''Survival'' تک پہنچا تھا۔ کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے۔ میں آگے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ڈاکٹر سر اولیور لاج ہیں جن کی دو کتابیں 1- Survival of Man (1909)،

2- Immortaliaty of the soul (1908)

پروفیسر لیو کی کتاب The Science and Immortality ہے۔ جس کو قرآن ایمان کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ (36:80)

زندگی حرارت کا نام ہے۔ اس آیت پر وجد آ جاتا ہے۔ یہ (دورانِ خون) سرکولیشن آف بلڈ جو ٹمپریچر دیکھتے ہیں۔ حرارت ہے۔ اس کا نام حرارت ہے۔ انسان مر جاتا ہے تو اس میں یہ حرارت نہیں ہوتی۔ ساری بات حرارت کی ہے۔ کہا کہ ''درختوں کی سرسبز ٹہنیاں ہیں'' کیا ان میں تم کو حرارت نظر آتی ہے؟ کس قدر عام سی مثال ہے۔ جو دہقان سے شروع کر کے فلاسفر تک پہنچا دیتا ہے۔ اس میں تو نمی اور پانی ہوتا ہے۔ وہی جب سوکھ جاتا ہے تو کیا باہر سے ہم اس میں حرارت لاتے ہیں؟ وہ پوری کی پوری مشعل ہوتی ہے۔ آگ اس کے اندر کہاں سے آ گئی؟ یہ اس سبز ٹہنی کے اندر ایک تغیّر سے اس کا پورا پانی حرارت بن جاتی ہے۔ آگ بن جاتی ہے۔

گر نگاہِ کرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

بس یہ بات ہے کہ وہ صلاحیت پھر اسی صورت کے اندر نہاں ہو جائیگی تو جو سبز ٹہنی کے پانی کو شعلے میں تبدیل کر سکتا ہے کہا کہ وہ اس جسم کے اندر کی حرارت جو تمہیں نظر نہیں آتی وہ یہ حرارت پیدا کر دے گا۔

اَوَلَيْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ (36:81)

’’یہ کائنات تو عدم تھی۔ موجود ہی نہیں تھی۔ تو پھر بغیر مصالحہ کے اسے وجود دیا گیا۔ تمہای ساری سائنس یہاں ناکام ہو جاتی ہے۔ اب تمہیں اس کا ’’Cause‘‘ معلوم نہیں ہوتا تو اسے اتفاق کہہ دیتے ہو۔ تو کیا تمہاری مثل بنانا اس کیلئے مشکل ہے‘‘۔ لیکن ان کا عقیدہ تو یہاں تک ہے کہ:

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشان ہونا
یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ
بااضطراب موج سکون گہر بدہ
زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر دخودگرو خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

وحی کے سرچشمہ سے ایک انقلابی اعلان
لیکن مسلم ابھی تک عہدِ سحر میں

وحی کا سرچشمہ علمِ خداوندی ہے جو براہِ راست ایک برگزیدہ ہستی کو ملتا تھا۔ بس اتنا سا حصّہ مذہب کا ہے کہ اسے آپ فوق البشر یا فوق الفطرت کہیئے۔ یہ اس لئے کہ یہ ماورائے فکر انسانی ہے اس کا ثبوّت یہ ہے کہ یہ فکر انسانی کی تخلیق نہیں ہے۔ غیر مسلم محققین بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ قرآن مومن اسے قرار دیتا ہے جو علیٰ وجہ البصیرت قرآن کی اس حقیقت پر ایمان لے آئے۔ اس پر علم وبصیرت کی رو سے ثابت ہو جائے کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے تو اب اس درجے میں یہ عنصر بھی فوق الفطرت نہ رہا۔ وہ تو فکر انسانی کے تحت آ گیا۔ تمام توہم پرستیوں کی تاریکیاں قرآن نے آ کر مٹا دیں۔ اب اس مخصوص کائنات جسے Physical کہتے تھے۔ آج کی سائنس وہ ان طبعی حدود سے بھی تجاوز کر رہی ہے۔ یعنی عالم محسوسات تو حواس خمسہ میں آ کر مشہود ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض قوّتیں ایسی ہیں جن کو نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پہلے ایٹم کو سب سے چھوٹا ذرا سمجھا جاتا تھا مگر اب اس کے مزید 32 سے زیادہ ذرات دریافت کر لئے گئے ہیں۔ جو عالم محسوسات میں نہیں آ سکتیں۔ مگر ایک ایٹم بم سے تو آپ اب پوری دنیا کو تحس نحس کر سکتے ہیں۔ یہ مواصلات کی دنیا کے انقلابات۔ یہ جسے توانائی خالص کہتے ہیں، مثلاً بجلی کا ہمیں کیسے معلوم ہو؟ بلب یا کوئی مشین چلا کر اس کا احساس ہوتا ہے جب وہ توانائی مخصوص چیزوں میں آئے تو محسوس ہوتا ہے اگر وہ ان مخصوص چیزوں میں نہ آئے تو آپ کو علم ہی نہیں ہو سکتا۔

اب بجلی کی توانائی کو دیکھا تو نہیں جا سکتا۔ اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شکل ایسی ہے کہ وہ حواس کی گرفت میں نہیں آتیں۔ لیکن اس کے مظاہر ایسے ہیں کہ جن کو آپ چھو بھی سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں پھر وہ ان حواس خمسہ میں آ جاتی ہے۔

اب ایسی قوّتوں کیلئے لفظ ''جن'' ہے۔ یعنی نگاہوں سے اوجھل'' یا ملائکہ یعنی ''قوّت'' توانائی'' یہ خدا کے پروگرام کی تدبیریں کرنے والے ہیں۔ یہ ساری کائنات ان Invisible قوّتوں کے سہارے چل رہی ہے۔ یہ تمام کُرے مرکز مائل قوّت جسے دیکھا ہی نہیں جا سکتا ان کے سہارے ان کروں کا توازن قائم ہے۔ سمجھنے کیلئے نام رکھ دیا ہے۔ عرب ان نیک کام کرنے والی قوّتوں کو ملائکہ کہتے تھے کہ یہ معصوم ہیں۔ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ جو تخریبی قوّتیں تھیں۔ بیماریاں، آندھیاں، طوفان، وہ ان کو ''جن''

کہتے تھے۔ یہ وہی Invisible قوتوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ تو عہد طفولیت میں انسان ان سے ڈر کر ان کو دیوی دیوتا بنا کر پوجا پاٹ کرنے لگ جاتا تھا۔ یہ تھا عہد پرستش کا پہلا دور۔ اب مذہبی پیشوائیت نے آ کر کہا کہ یہ قوتیں ہمارے قبضہ میں ہیں۔ یہ لو تعویز، منتر، وظیفہ اور ان دیوتاؤں کو نذر و نیاز دیدو۔ ہم ان کیلئے مانگتے ہیں۔ ان قوتوں سے ہمارے ذریعہ کام کراؤ۔ اب یہ کاروبار ہوگیا۔ یہ تھا دوسرا دور (عہد سحر)''Age of magic''

اسلام نے آ کر ان تمام توہم پرستیوں کے خلاف نعرہ لگایا اور ان تمام زنجیروں اور بیڑیوں کو ایک ایک کر کے اتارا۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط (45:13)

کہہ کہ کسی چیز کی استثناء ہی نہیں رکھی۔ یہ تھا وہ انقلابی اعلان جس کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا۔ قرآن نے ان توہمات کا ذکر کیا ہے کہ یہ فرشتوں اور جنوں کو بیٹیاں اور شریک سمجھتے ہیں تو ان توہمات کی تردید کردی۔ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ط (37:158)

مسلمان قوم ابھی تک Age of Magic یعنی عہدِ سحر میں:

قرآن جن چیزوں کو مٹانے آیا تھا یہ مسلمان ان چیزوں کے ثبوت کیلئے قرآن سے دلائل لاتے ہیں۔ مفہوم یا معنی نہیں لاتے۔ آیات لاتے ہیں کہ الفاظ اپنے اندر ایک تاثیر رکھتے ہیں۔ اس کو اتنی دفعہ دہراتے چلے جایئے کہ وہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ کے معنی یہ اثر نہیں کرتے یہی تو جادو ہے۔ جو درود و وظائف میں ہوتا ہے۔ اس آیت کا اتنی دفعہ ورد کرو ان کی یہ کرامات، درود و وظائف سب عہد طفولیت میں لے گئے ہیں۔ قرآن نے ایمان کے بعد اعمال پر زور دیا ہے۔ ایمان تو صحیح فارمولا ہے۔ تو اس فارمولے کے مطابق عمل کرو تو اس کا نتیجہ لیبارٹری کے نتیجہ کی طرح نکلتا ہے۔ عمل کی جمع اعمال ہے۔ ان تمام علماء حضرات کی کتابوں میں ان آیتوں کے درود اور وظائف لکھے ہوئے ہیں اور ان کا نام ''اعمال قرآنی'' ہے اور اس طرح سے یہ عامل جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اب اس عامل کے معنی قرآن کے مطابق عمل کرنے والا نہیں بلکہ درود وظیفہ کرنے والا، تعویز گنڈے دینے والا عامل ہے۔ یہ سب عملیات ہیں۔

ان تمام جید علماء کی ''اعمال قرآنی'' موجود ہیں۔ قرآن کو یہاں تک لے آئے۔ قرآن کہتا ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ (37:160-161-162)

تم اور یہ سارے جن کی پرستش کرتے ہو کہ یہ بڑی بڑی قوتیں ہیں۔

سب مل کر بھی میرے مخلص بندوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔

اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ (37:163)

جو خود جہنّم میں جانا چاہے ہاں اسے ورغلایا جا سکتا ہے۔ ہم تو سب اس کے اندر آ جاتے ہیں۔ جہنّم کی طرف خود لپک کر جانے والے ہیں۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ (37:164-165-166)

674

جواللہ کے بندے ہیں ان کو پتہ ہے کہ ان کا مقام کیا ہے۔اس لئے وہ توصرف اس کے پروگرام کیلئے صف بستہ ہیں اوراس میں سرگرمی سے لگے ہوئے ہیں۔شدت اور تیزی سے مصروف ہیں۔

رہ مدہ در کعبہ اے پیرانِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دار دخداوندے دگر
می تراشد فکر ما ہردم خدا وندے دگر
رست از یک بندا تا افتاد در بندِ دگر

❁❁❁

مقصدِ تخلیقِ کائنات

وہ گوشہ جس پر ابھی تک تحقیقات بھی نہیں ہوئی

مقصدِ تخلیقِ کائنات:

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ (45:22)

ابھی اس پر تحقیقات نہیں ہوئیں۔ یہ مغرب اس کی طرف آرہا ہے کہ یہ ساری مشینری دیگر طبعی فوائد کے علاوہ اعمال انسانی کے نتائج بھی مرتب کر رہی ہے اور جو اس مواخذہ کو نہیں مانتا۔

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾ (38:27)

جدید تحقیقات کی رو سے انسان یہ کائنات 3-Dimensional protographs لے رہی ہے۔ اسے ''نظریۂ Hologram'' کہتے ہیں۔ یہ کائنات فوائد کے ساتھ ساتھ قوموں اور افراد کے اعمال کا مواخذہ بھی ریکارڈ کر رہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جو اسے ظن سمجھتے ہیں اصل میں یہی لوگ کافر ہیں (38:27)

❁❁❁

''حکومت بصیرت کے ساتھ''

اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ (38:45)

''قوّت وبصیرت'' کی ثنویّت ملوکیّت کے اقدار کا خاصہ ہے:

سب سے بڑی لعنت وہ قوّت اور اقتدار ہے جس میں بصیرت نہ ہو اور دوسری طرف بصیرت ہو مگر اقتدار نہ ہو اور ملوکیّت میں کوشش ہوتی ہے کہ ان اہل بصیرت کو اقتدار میں شریک نہ کیا جائے یہ ہے ثنویت ''Dualism''۔

رائے بے قوّت ہمہ مکرو فسوں
قوّتِ بے رائے جہل است و جنوں

اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ (38:45) یہ ہے قرآن کی عظمت۔ جو صرف انبیائے کرام کا خاصہ تھا۔ یہاں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء کرام پوجا پاٹ کیلئے نہیں آئے تھے۔ رائے اور قوّت یعنی اقتدار ایک مقام میں جمع ہوتے ہیں اور نصب العین ذِکْرَی الدَّارِ (38:46) قوانین خداوندی کی بلندی دنیا میں۔

اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ (38:46)

یعنی نصب العین کے اوپر ان کی نگاہ تھی اس لئے ان کو باقی لوگوں سے الگ کر کے ایک خاص جماعت بنا دیا تھا۔ ''اَلدَّار'' اس کے ساتھ یعنی خدا کا متعین کردہ نصب العین، بصیرت اور قوّت کے بل پر وہ کاروان انسانیّت کو اس متعین کردہ مقصد کی طرف لے جاتے تھے۔

وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾ (38:47)

''یہ ہمارے نزدیک مصطفٰی یعنی برگزیدہ، چن کر الگ کر دینے والے، صاحب اختیار لوگ تھے۔ یہ تھے منتخب افراد انسانیہ قوّت واقتدار و اختیار والے''۔

❁❁❁

قصّۂ آدم وابلیس کا صحیح تصوّر

آدم وابلیس:

ابلیس نے کہا کہ: قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿٧٦﴾ (38:76)

یہ ہے بنیادی نقطہ ابلیس یہ انسان کے جذبات ہیں اور یہ طین سے انسانی اعضاء ہیں اور یہ سارے اعضاء جذبات کے تحت کام کرتے ہیں۔ مثلاً ''میں'' نے فیصلہ کیا کہ بولنا ہے تو زبان بولنے لگ گئی میں نے فیصلہ کیا کہ گھڑی اٹھانی ہے تو میرا ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ یہ میں ''میرا'' ہے۔ یہ ایک ایسی چیز کے تابع چلتے ہیں جن کو ''جذبات'' کہہ لیں۔ نفسیات نے اسے ''Self'' کہا ''Ego'' کہا۔ ہم نے اسے خودی، ذات اور نفس کہا۔ یہ جسم انسانی، یہ خود صاحب اختیار و ارادہ نہیں ہے۔ یہ جذبات کے تحت چلتا ہے۔ یہاں ابلیس یعنی انسان کے سرکشی جذبات نے کہا کہ یہ طین سے بنا ہوا جسم تو میرے حکم کے تابع چلتا ہے۔ اس لئے میں اس سے افضل ہوں۔ غلطی اس نے یہ کی کہ اس نے کہا کہ میں صاحب اختیار ہوں اور جس طرح جی چاہے گا کرونگا۔ تو اس پر اسے خدا نے سرکش قرار دیدیا۔ تو بات کیا ہوئی کہ انسانی جذبات خدا کے حکم کے تابع رہیں اور اس کے تابع اس جسم سے کام لیا جائے۔ کہا کہ سجدہ کرو تو اس نے استکبار کیا۔ سرکشی برتی تو کہا گیا کہ:

اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿٧٥﴾ (38:75)

کہ تم میں بڑی انا تھی۔ تم نے بڑا بننا چاہا۔

یعنی یہ ''Self'' نفس جب قوانین خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو اسے نفسیاتی رو سے ''Ego'' کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسے ''انا'' کہتے ہیں۔ یہ انا کوئی بُری شے نہیں ہے۔ یہی تو اصل انسان ہے۔ یہ اعضاء تو اس کے ذرائع ہیں۔ اس کے کام کرنے کیلئے۔

اب پابندی یہ ہے کہ اگر وہ فیصلہ احکام خداوندی کے تحت کرے تو اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔ تعمیری پہلو ہے خارجی کائنات کے حسن میں بھی اضافہ ہوگا اگر ان احکام سے سرکشی برتے گا تو ٹھیک ہے اس جسم سے جو کام بھی لینا چاہے لے سکتا ہے۔

یعنی یہ جو سیکولر تصوّر ہے کہ یہ کسی کے تابع نہیں ہے جو جی میں آئے فیصلہ کرے۔ یہ ''Ego'' ہے اور مغرب کا سارا نظام اس پر چلتا ہے۔ تو اس فیصلہ کرنے والی قوّت پر کوئی پابندی نہیں رہتی۔ اگر اس کو اقدار خداوندی کے تحت کر دیا جائے تو پھر کائنات کے

حسن میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا حسن بھی نکھرتا جاتا ہے۔

نفس کشی یہ ناممکن ہے، جذبات کو مارا نہیں جا سکتا۔ وہ شعور سے تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ شعور میں تو پھر بھی فطرت کے چینل کے مطابق باہر نکل جاتے ہیں مگر دبانے سے تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں تو پھر غیر فطری راستے تراش تراش کر باہر نکلتے ہیں۔

اصل تربیّت اس خودی کی ہونی چاہئے کہ قانون خداوندی کی اطاعت کرے تو یہ ہے دین اگر اس کو بے باک چھوڑ دیا جائے تو پھر یہ الحاد و سیکولرزم ہے۔ جس کے تحت ان کی سیاست، معیشت، معاشرت اور دیگر اقوام سے تعلقات ملتے ہیں۔ یہ بے باک تغیرّ یعنی ''Ego'' کا انسان کے سامنے جھکنا نہیں بلکہ خدا کے قانون کے سامنے جھکنا ہے۔ اب اس میں غلطی کو تسلیم کر لینا اور اپنے آپ کو اقتدار کے تحت کر دینا یہ ہے دین اسلام کا مقصد و منتہیٰ۔

❁❁❁

''انا یعنی Ego ''

Ego (پندارِ نفس) میں تو استکبار تھا وہ نہیں جھکتا ہے۔ یہ جو اپنی غلطی تسلیم کرنا ہے تو اعتراف ہے کہ غلطی کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ تو ٹھیک ہے آئندہ نہ کرنا۔

قَالَ فَبِمَآ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ﴿۱۶﴾ (7:16)

یعنی تیرے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ یعنی ہر شے کو خدا کی مرضی اور مشیت قرار دیا میں ذمہ دار نہیں بلکہ تو نے بہکا دیا۔ مجھے کیوں ملعون قرار دے رہا تو قیامت تک تیری اصلاح ہو نہیں سکتی کیونکہ تو اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور کسی اور کو ذمہ دار قرار دیتا ہے اور تو خدا پر ذمہ داری ڈال رہا ہے اپنے کیئے کی۔

ہمارے ہاں تو قدم قدم پر اللہ کی مرضی سے یہ سارا کہنے والے مقربین خداوندی قرار پاتے ہیں۔ راضی بہ رضا ہونا تو ایمان کا حصّہ قرار دے رہے ہیں۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ یہ جواب تو ابلیس نے دیا تھا۔ یہ ہیں بہانے اپنی ذمہ داری کے نہ نبھانے کے۔ حالانکہ ان کو کائنات بنا کر دیدی اور کہا گیا۔ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ (41:40) کہہ کہ اختیار و ارادہ کی آزادی دیدی۔ (اقبال نے ابلیس و یزداں کا) مقالمہ دیا ہے۔

حرفِ استکبار، تیرے سامنے ممکن نہ تھا — ہاں، مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
کب کھلا یہ راز، انکار سے پہلے کہ بعد — بعد، اے کہ تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود
پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے — کہتا ہے تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام — ظالم اپنے شعلہ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

یعنی اپنی آزادی کو مجبوری یا قسمت کا نام دے کر اس کے خطرناک نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ جب نتیجہ سامنے آیا ان جرائم کا تو مایوس ہو کر سارا الزام قسمت پر دھر دیا۔

وحی کی چند قرآنی اصطلاحات

(1) تَنۡزِيۡلٌ:

یعنی نازل ہو رہی ہے خارج سے۔ اوپر سے ایک علم نازل ہو رہا ہے۔ انگریزی زبان میں انہوں نے اس کیلئے ''Revealation'' پردہ کشائی کرنا، پردہ اٹھانا یعنی یہ چیزیں پہلے سے موجود تھیں۔ ان پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ تو وہ پردہ اٹھا دیا۔ یعنی خارج سے نہیں بلکہ اس کیلئے اس شے کے پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے۔ قرآن اس کیلئے ''تنزیل'' یعنی اوپر سے کسی شے کا بتدریج آنا، آہستہ آہستہ آنا جبکہ پردہ اٹھانے میں پھر تنزیل نہیں رہتی۔ قلب نبوی ﷺ پر بتدریج تیئیس سال تک آتا رہا۔ تو اس کا ترجمہ ''تنزیل'' کا تو کوئی زبان نہیں کر سکتی۔ یہ Revealation تو عیسائیوں کے ہاں ان کے تصوّف کی چیز تھی۔ جسے کشف والہام Inspiration کہتے ہیں۔

وحی کا تصوّر تو بالکل منفرد ہے۔ پھر یہ ''تنزیل'' عجیب انفرادیّت لئے ہوئے ہے۔ جس طرح بارش کا نزول جس میں زمین کا ذرا بھر دخل نہیں ہوتا پھر اگلی چیز یہ ہے کہ صرف وہ زمین جو اس مقصد کیلئے تیار ہو تو صرف وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ دیکھئے اس ایک لفظ میں کس قدر جامعیّت ہے۔ پھر اس کا ترجمہ ''Sent down'' یعنی کتاب کا اوپر سے آنا تو یہ اسی طرح سے کتاب تو نہیں آئی تھی اوپر سے۔ اس سے بھی اس کا تصوّر اجاگر نہیں ہوتا۔ وحی کی ماہیّت اور حقیقت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کہ یہ کیسے ملتی تھی؟ وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ؕ‏ ﴿۳﴾ (53:3) اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۚ ﴿۴۰﴾ (69:40) یعنی ان باتوں کا کہنے والا ہمارا ایک معزز قاصد ہے۔ یہاں قول محمد ﷺ نہیں کہا یعنی رسول، قاصد کہا جو دوسروں کا پیغام پہنچاتا ہے۔ وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ (69:41) یہ شاعر کے تخیلات نہیں ہیں بلکہ ہمارا ہی قول ہے جو آگے پہنچا رہا ہے۔ یعنی قاصد ہے جو میرا پیغام جو اس کی زبان میں ہے وہ آ کر یہی کہے گا کہ یہ اس رب کی طرف سے ہے۔ تو پوچھا جائے کہ کیا تم اپنی طرف سے کہہ رہے ہو۔ تو فرمایا نہیں میں تو ان کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔ یہ الفاظ کا دہرانا ''یہ قول رسول ﷺ'' ہے اس کی حیثیت آگے قاصد یعنی پیغمبر کی ہے۔ جس میں اس کا فکر و تدبّر شامل نہیں۔ یہ خارج سے ''Objectively'' ملتی ہے۔

یہ پیغمبر امین ہے یعنی یہ الفاظ اس کے نہیں ہیں بلکہ وہ تو امین ہے۔اس کے الفاظ پہنچا رہا ہے۔اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔ یہ ہے وحی۔خدا کی طرف سے نزول اب خدا کا کلام بعینہٖ ہم تک آ گیا تو یہ ہوئی رسالت۔ جو خدا سے ملنا اور آگے پہنچانا تھا یہ تھی وحی، یہ تھی نبوّت، جواب ختم ہوگئی۔

(2) عِزَّۃ:

اقتدار۔قوّت والا، چونکہ ہر صاحب اقتدار عزت کراتا ہے۔اس لئے اس کے معنی ''عزت و تعظیم'' کے ہو گئے۔ورنہ اس کے اصل معنی ''اقتدار'' کے ہیں۔جب عزت و اقتدار ختم ہو جاتا ہے تو پھر عزت و تعظیم بھی ختم ہو جاتی ہے۔کہ ''اَلْعَزِیْزُ'' وہ جو صاحب اقتدار ہو۔

(3) اَلْحَقُّ:

جو اپنے مقام پر اٹل ہو۔محکم بھی ہو اور ضروریاتِ زمانہ اور تقاضے کے ساتھ ساتھ بدلتی بھی رہے۔جامد نہ ہو۔متحرّک بھی ہو۔تو وہ اسے ''حق'' کہتے تھے۔دروازے کو اَلْحَقُّ کہتے تھے کہ وہ اپنے مقام پر ہمیشہ کھڑا رہے اور ضرورت کے مطابق جب چاہو وہ بند ہو جائے۔جب چاہو کھل جائے۔اقدار، اصول، حدود اپنے مقام پر اٹل ہیں مگر ساتھ ساتھ وقت کے تقاضے بھی پورے ہو رہے ہیں۔

اگر دروازہ کی چول (قبضہ) ڈھیلی پڑ جائے یا زنگ آلود ہو جائے تو مصیبت پڑ جائے وہ کھلے ہی نہیں یا بند ہی نہ ہو تو پھر وہ دروازہ دروازہ نہیں رہتا۔وہ دیوار ہو جاتا ہے۔جب دروازہ کے قبضے زنگ آلود ہو جائیں نہ کھلیں اور نہ بند ہوں۔اپنے مقام پر جامد ہوں۔تو وہ مذہب ہوتا ہے۔ہزار سالہ کا پہلے کا بنا ہوا دروازہ آثار قدیمہ ہوتا ہے۔الحق تو Permanance اور Change کا امتزاج ہے۔اسے ''دین'' کہا جاتا ہے۔

......☆......

(4) قیام وسجدہ ورکوع:

اس وقت دو سپر پاورز کسریٰ اور قیصر تھے اور اس مٹھی بھر جماعت کا ان کے ساتھ تصادم تھا۔عرب کے قبائل کے ساتھ بھی تصادم تھا۔بے سروسامانی کا عالم۔اب اتنے بڑے پروگرام کو عملی جامعہ پہنانے کیلئے دن میں تو پروگرام کو لاگو کرتے تھے اور فارغ ہونے کے بعد اس پروگرام پر نظر ثانی کرتے تھے۔اس پروگرام کی دو شقیں تھیں جن میں سے ایک کو قیام اور دوسرے کو سجدہ کہا جا رہا ہے۔

دو گیتی را صلا از قرأت اوست

مسلماں لایموتِ از رکعتِ اوست

نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز
کہ قیامت ہا در قد قامتِ اوست

اس پروگرام کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کا نام تھا ''قیام وسجدہ''۔ زندگی میں دو ہی مقامات آتے ہیں۔ ۔1 کسی مقام پر کھڑے ہونا۔ ۔2 اور کہیں جھک جانا۔ ساری زندگی ان دو مقامات سے عبارت ہے۔ اب قیام اور سجدہ کے مقامات کیلئے غور وخوض چاہیئے کہ قیام کا کونسا مقام ہے؟ اور سجدہ کا کونسا مقام ہے؟ یہ تو چند سال کا ٹکراؤ تھا نہ قیصر باقی رہا اور نہ کسریٰ اَمَّنۡ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيۡلِ سَاجِدًا وَّقَآٮِٕمًا يَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ وَيَرۡجُوۡا رَحۡمَةَ رَبِّهٖ ؕ (39:9) دن کے ہنگاموں سے فارغ ہوکر رات کی گھڑیوں میں فارغ ہوکر اس پروگرام کے بارے میں سوچتے ہیں کہ یہ سَاجِدًا وَّقَآٮِٕمًا کا ہے کے لیے ہے۔ یہ۔ يَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ مستقبل کے پروگرام طے کرنے کے لیے اور تمام خطرات پر بحث ومباحثہ۔ وَيَرۡجُوۡا رَحۡمَةَ رَبِّهٖ ؕ۔ سامان نشوونما کا حصول کیسے ہوگا اور اس کی تقسیم کیسے ہوگی۔ جب کہ دوسری جماعت وہ ہے جو آسائشیں ملیں تو خدا ہی کو بھول گئے۔ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا حَسَنَةٌ ؕ (39:10) اگر توازن صحیح رکھا یعنی قیام کے وقت قیام اور سجدہ کے وقت سجدہ تو ان کا موجودہ حسین معاشرہ مزید حسین اور تمام خامیاں دور ہوجائیگی۔ خوش الحالیاں اور مرفہ الحالیاں ہوں گی۔ اس دنیا میں حسنات کی بات ہورہی ہے۔ اَجۡرَهُمۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۝۱۰ (39:10) انسان پیمانوں سے بڑھ کر صلہ دیا جائیگا۔ ہم کچھ لیتے نہیں بلکہ دیتے جاتے ہیں۔ اگر حساب کرنے بیٹھ گئے تو ایک دن بھی کھانا نہ ملے۔

مہلّت کا وقفہ جو ظالم کو دلیر اور مظلوم کو فریب میں مبتلا کر دیتا ہے

لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾ (39:20) اس کے قانون میں، اس کے وعدے میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہوتی یعنی مستحکم، ابدی اور غیرّ متبدّ ل ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ (6:21)

ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ یہ قانون غیر متبدّ ل ہے اب یہاں فطرت کے قانون میں یہ چیز از خود ڈال دی ہے جبکہ انسان کو اس کا اختیار وارادہ دیدیا گیا ہے کہ تم اگر اس کے مطابق کرو گے تو یہ نتیجہ نکلے گا اور اگر اس کی خلاف ورزی کرو گے تو یہ ہوگا۔ اب چونکہ یہ چیز کہ ظالم کی کھیتی کبھی بھی پنپ نہیں سکتی یہ چیز بڑی غیر محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس عمل اور اس کا نتیجہ نکلنے میں ایک مدت، مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ یہ چیز ظالم کے دل میں فریب پیدا کرتی ہے کہ کون ہے جو اس کی کلائی مروڑ دے؟ اور مظلوم کے دل میں ہے کہ تم کہتے ہو کہ اس کی کھیتی پنپ نہیں سکتی مگر یہ تو دن بدن ترقی کرتا جا رہا ہے۔ تو کہا گیا کہ اس میں مہلت کا وقفہ ہے۔

آہ کو چاہئے ایک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

مظلوم کے دل میں یہ فطری چیز ہوتی ہے کہ ہم تو ساری عمر یہ مصیبتیں برداشت کرتے کرتے ہی مر جائیں گے اگر اس کے بعد بھی اثر ہوا تو مجھے اس سے کیا حاصل؟

لیکن وہ مہلت کا وقفہ تو ہر صورت ہے قانون فطرت میں بھی ہے اب یہ غیر محسوس طور پر ہے۔ آدمی محسوس طور پر دیکھ نہیں سکتا کہ واقعی یہ مستبد حکمران اور ظالم تباہ ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ساتھ ساتھ ان کی تباہی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن وہ ظاہری آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس لئے انسان اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ واقعی کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن یہ یقین ہونا چاہئے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ مگر مجھے اس وقت محسوس نہیں ہو رہا ہے تو کوئی بات نہیں۔ وہ محسوس اسی طرح سے نہیں ہوتا۔ دیکھنے کی بیسیوں چیزیں ہیں جو محسوس نہیں ہوتیں۔ مثلاً اگر گھڑی کی منٹ اور سکینڈ کی سوئیاں اگر اُکھڑ گئی ہوں اور گھڑی چل رہی ہو تو اس نے وقت تو دینا ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد جو گھنٹے والی سوئی ہے۔ وہ ایک ہندسے کے بعد دوسرے پہ جاتی ہے۔ لیکن آپ کو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا حالانکہ وہ اس

وقت چل رہی ہوتی ہے۔ دوسری مثال دانہ زمین میں بو دو۔ اس کی نشوونما تو ہو رہی ہوتی ہے مگر محسوس نہیں ہوتا۔ تو قرآن ان قوانین کیلئے محسوس مثال سامنے لاتا ہے کہ دیکھو ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی اور اس کے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اَلَمْ تَرَ یعنی تم آنکھوں سے دیکھتے ہو۔

اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ (39:21)

کھیتی میں خوشے لگ کر دانے آتے ہیں۔ کہتے ہیں زرد ہو جاتے ہیں۔ بھوسہ الگ اور دانے الگ یعنی قانون کی نتیجہ خیزی کو سامنے لایا ہے۔ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾ (39:21) ان میں صاحبان بصیرت کیلئے صحیح بات تک پہنچنے کا سامان موعظت ہے۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (39:22) رسول ﷺ کو جو پہلا ''قیام'' کا حکم ملا تھا یہ تھا۔ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمْ (74:1-2) یہ ہے قیام، اس میں اس پورے انقلاب کا تصوّر دیا ہے یعنی یہ گلشن کائنات خزاں دیدہ ہو چکا ہے تو ان کی بہار اور شگفتگی کیلئے ''قُمْ'' کہا۔ اب یہ سارا پروگرام اس ''قُمْ'' میں ہے آگے کہا۔ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾ (74:3) یعنی خدا کی کبریائی کا نظام قائم کرنے کیلئے ''قیام'' کا کہا گیا۔

آپس میں جو قیام اور سجدہ ہے۔ اس مقام کی کیفیت یہ ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29)

دشمن کے مقابل چٹان کی طرح ''مقام'' اور آپس میں ایک دوسرے کیلئے ریشم کی طرح جھک جانا، یہ ہے سجدہ ہے۔

اور اس ٹکراؤ میں جو چند سال کا تھا اس کے بعد نہ ایران باقی رہا اور نہ قیصر اور نہ یہ مخالفین عرب۔ صرف ہلاکتیں ہی نہیں بلکہ تہذیبیں تک ختم کر کے رکھ دیں۔ اگر ساری رات وہ نفل پڑھتے رہتے تو وہ اس عظیم پروگرام کو کس طرح سے کر سکتے تھے۔

دو گیتی را صلا از قرأت اوست مسلماں لایموت از رکعت اوست

نداند کشتۂ اس عصر بے سوز کہ قیامت ہادر قد قامت اوست

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

یہ جو ''قیام و سجدہ'' ہے اس کا غلط انتخاب اور غلط وقت تو آج ہمارے سامنے ہے۔ اپنوں کے سامنے تلواریں، جہاں سجدہ یعنی جھکنا تھا جبکہ اسلام کے مخالف کی جوتیاں چاٹنے کیلئے ''سجدہ'' دیا جا رہا ہے۔ جہاں کہ قیام کی ضرورت تھی۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ (39:9)

یعنی یہ ہیں وہ لوگ جو رات کی گھڑیوں میں جب دن کے ہنگاموں سے فارغ ہوتے ہیں تو پھر اس پروگرام کے بارے میں سوچتے ہیں کہ ''یہ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا (39:9)'' کا ہے، کیلئے ہے۔ یہ ''يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ (39:9)'' کیلئے یعنی مستقبل کیلئے

پروگرام بنانا ہے اوران تمام خطرات پر بحث وتمحیص کرتے ہیں۔ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ (39:9) شوونما دینے والے کا جو سامان نشوونما ہے اس کے متعلق سوچتے ہیں کہ کیسے حاصل ہوگا اور کیسے تقسیم ہوگا؟

یہ ہے وہ جماعت جبکہ دوسرے وہ بتائے ہیں کہ ذراسی تکلیف آئی تو دہائی مچادی اور جب آسائشیں ملی تو خدا سے فراموشی اختیار کرلی۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ (39:10) گرانہوں نے صحیح توازن رکھا یعنی قیام کے وقت قیام اور سجدے کے وقت سجدہ تو ان کا موجودہ معاشرہ متوازن اور خوبصورت ہوجائے گا۔ کوئی ناہمواری نہیں رہے گی۔ خوشحالیاں اور مرفہ الحالیاں ہونگی۔ اس دنیا میں حسنات کی بات ہورہی ہے۔

اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑩ (39:10) یعنی تمہارے اندازوں سے بھی زیادہ ان پیمانوں سے جو خدا کے ہیں۔ تمہارے پیمانوں سے بڑھ کر یعنی تم سے کچھ لیتے نہیں ہیں بلکہ دیتے چلے جاتے ہیں۔

دین اسلام کیلئے دل کی کشاد اس طرح سے ہوتی ہے کہ قوانین فطرت پر غور کرو کہ یہ قوانین بھی اس طرح سے انسانی زندگی پر منطبق ہوتے ہیں اوران کا بھی اس طرح سے یقینا نتیجہ نکلے گا کہ ظلم کا نتیجہ کامرانیاں نہیں ہوسکتا۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (39:22) اسلام کیلئے سینہ کے کھل جانے کا طریق یہ ہے کہ ان قوانین پر غور کریں۔ یعنی قوانین فطرت پر غور وغوض کے بعد شرح صدر ہوجاتا ہے اس نتیجے پر پہنچ جانا کہ یہی قوانین جو انسانی زندگی کیلئے دیئے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کے نتیجہ خیز ہونگے۔ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (39:22) پھر قرآن کی شمع اس کے ہاتھ میں ہو۔ يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (6:122) اسے لے کر ساری انسانیت کو روشن کرتا جائے۔ کشادقلب میں پہلی چیز تو قوانین فطرت پر غور کرنا ہے لیکن آج جس مقام پر ہم کھڑے ہیں تو ہمارا شرح صدر کس طرح سے ہوسکتا ہے کہ اسلام کے بارے میں جانیں کہ قوانین فطرت کس طرح سے کارفرما ہیں۔ کیسے اٹل ہیں۔ یہ تو ہم نہیں جانتے۔

اب مغرب والے تو قوانین فطرت سے آگے ہی نہیں بڑھے۔ جو قوانین انسانی زندگی کیلئے دیئے ہیں۔ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (39:22)، تو وہ عقل کو وحی کے تحت چلائے۔ مشاہدات فطرت سے عقل کی پختگی پہلی شرط ہے یہ نہیں ہے تو اگلی شرط بے کار ہے۔ سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھانے کیلئے آنکھوں کو کھولنا ضروری ہے۔

مغرب کے پاس وحی نہیں ہے تو اس لئے یہ تباہی ہے مگر ہمارے ہاں تو آنکھیں بند ہیں تو سورج کی روشنی سے کیسے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مغرب نے تو کم از کم عقل سے قوانین فطرت پر غور کر کے دنیاوی فطرت کو حاصل کرلئے ہیں۔

اگلی شے وہ شمع ان کے ہاتھ میں نہیں ہے تو زندگی کی راہیں تاریک ہیں۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ۔ ہم تو اس میں مبتلا ہیں۔ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72) جہاں مذہب کا غلبہ ہو۔ تو وہ قوم کہیں ترقی نہیں کرسکتی۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ㉒ (39:22) جن کے دلوں میں احساس تک نہ ہو کہ یہ قوانینِ خداوندی کیسے کارفرما ہیں؟ کیا کچھ ہورہا ہے وہ تو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی راہ راست پر آ ہی نہیں سکتے۔

نفس نینداور موت میں یعنی شعور نینداور موت میں (39:42)

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾ (39:42)

یعنی نیند کی حالت اور موت کی حالت میں نفس کو روک لیتے ہیں۔ نیند کی حالت میں بیدار ہونے پر یہ واپس کر دیتے ہیں جبکہ موت کی حالت میں اپنے پاس روک لیتے ہیں۔ نفس معدوم نہیں ہوتا۔ فنا نہیں ہوتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ یعنی موت اور نیند کی حالت میں شعور کو معطل کر دیتے ہیں۔

نیند کی حالت میں جس کو جان کہتے ہیں یعنی لائف اس میں تو سارا جسم کام کر رہا ہوتا ہے۔ ویسا ہی سانس آ رہا ہوتا ہے گویا جو روکی گئی ہے۔ وہ اس کی جان یا زندگی نہیں ہے۔ جو نیند کی حالت میں بھی برقرار رہتی ہے۔ نیند کی حالت میں جو چیز نہیں ہوتی وہ انسان کا ''شعور'' نہیں ہوتا۔ Consciousness نہیں ہوتا بیدار ہونے پر واپس آ جاتا ہے۔ اس مردے کے پاس واپس نہیں آتا بلکہ روک لیا جاتا ہے۔ یعنی نیند کی حالت میں یہ شعور معطل ہو جاتا ہے جب انسان بیدار ہوتا ہے تو جسم تو پہلے ہی زندہ ملتا تو پھر شعور کام کرنے لگ جاتا ہے۔ مرنے کے بعد انسان کا شعور کسی صورت میں واپس نہیں آتا۔ زندگی تو نام ہی شعور یا ذات کے زندہ رہنے کا ہے۔ اب یہ شعور مرنے کے بعد وہاں کارفرما ہوتا ہے اس کا جسم تو مر چکا تھا مگر ذات زندہ رہتی ہے۔ شعور فنا نہیں ہوتا وہ زندہ ہوتا ہے موت کی حالت میں روک لیا جاتا ہے اور نیند کی حالت میں واپس آ جاتا ہے اور زندگی نام ہے شعور انسانی کا، ذات انسانی کے زندہ رہنے کا یاد رکھیں یہاں ''یتوفی'' یعنی فوت ہونا صرف انسان کیلئے استعمال ہوا ہے۔ حیوانات کیلئے نہیں بولا جاتا۔ ''يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ'' (39:42) یعنی انسانوں کی بات ہو رہی ہے کیونکہ حیوانوں کیلئے ''یتوفی'' ہو نہیں سکتا۔ حیوان ذی حیات تو ہوتے ہیں مگر ان میں شعور نہیں ہوتا Self consciousness نہیں ہوتا بلکہ Simple consciousness ہوتا ہے اور یہی چیز انسان کی ذات یا خودی کہلاتی ہے۔ قرآن نے نیند کی حالت اور موت کی حالت میں مماثلث بیان کی ہے۔ نیند کی حالت میں انسان زندہ تو ہوتا ہے۔ مگر اس کا شعور نہیں ہوتا وہ شعور عارضی طور پر معطل ہو جاتا ہے۔ وہ بیداری کی حالت میں واپس مل جاتا ہے جبکہ موت کی حالت میں ہم اسے واپس نہیں بھیجتے۔ گویا موت اور زندگی میں جو مماثلث ہے وہ شعور کی کارفرمائی کا تعطل عارضی

طور پر اور مستقل طور پر اور وہ فنا نہیں ہوتا۔

خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

اب تو یورپ کے محققین Survival اور Immortatity حیات ابدی تک پہنچ رہے ہیں۔ مرنے کے بعد زندگی یا شعور کا تسلسل یہ مانتے ہیں۔ قرآن نے مثالوں سے سمجھایا ہے کہ یہاں کی تمام یادداشتیں، حافظہ، واقعات ایک دوسرے کے ساتھ تعارف، سب کچھ گن گن کر قرآن نے ذکر کیا ہے۔

نیند کی حالت میں کچھ بھی یاد نہیں ہوتا لیکن بیداری کے بعد ہر چیز واپس آ جاتی ہے۔ یہ کیا ہے؟ جو ہمارے جذبات، احساسات' حسیات کو واپس لاتی ہے۔ یہ شعور ہے جونہی انسان بیدار ہوتا ہے یہ ساری چیزیں انسان کے اندر آ جاتی ہیں جو ایک لمحہ پہلے موجود ہی نہیں تھیں۔ اس طرح موت کے بعد یہ شعور یہ ساری چیزیں واپس لے آئے گا جب کارفرما ہوگا۔ بلکہ دل میں گزرنے والے خیالات تک کا علم ہوگا۔

یہ غور وفکر کرنے والی قوم کیلئے اس میں حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں تو وہ حقیقت یہی ''شعور'' ہے اس لئے وہ تمام اعمال نتیجہ خیز ہو کر سامنے آئینگے اور ہر انسان کو نتائج بھگتنا ہونگے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے کوئی انسانی فکر یہ چیزیں نہیں کہہ سکتی تھی۔ یہ مت سمجھو کہ بس جس نے غلط کام کیا تو بھی اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ مرنے کے بعد معاملہ ختم ہو جائے گا۔ دیکھو کیسے سمجھایا کہ نیند کا عالم سامنے لایا جسے ہم روز دیکھتے ہیں۔ جاگنے کے بعد یہ ساری چیزیں واپس آ جاتی ہیں۔

قرآن کے معاشی نظامِ سے انکار گویا خدا سے انکار ہے

فَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ (39:49) جب اس انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پھر اسے خدا یاد آتا ہے۔

ثُمَّ اِذَا خَوَّلۡنٰهُ نِعۡمَةً مِّنَّا ۙ (39:49) اور جب اسے یہ تمام مال و دولت اور آسائشیں مل جاتی ہیں۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ ؕ (39:49) پھر کہتا ہے کہ یہ تو سب میری کاریگری اور ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔

بَلۡ هِىَ فِتۡنَةٌ (39:49) فساد کی جڑ یہ ذہنیت ہے کہ اب تو اس کی کمائی میں کوئی بھی مداخلت نہیں کرسکتا جیسے چاہے خرچ کرے۔

وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۹﴾ (39:49) اصل بات یہ ہے کہ لوگ اصل بنیاد پر نگاہ نہیں رکھتے بلکہ یہی دلیل ناسمجھی کی وجہ سے دیتے ہیں۔

حالانکہ وَلَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (16:52) کائنات میں سارا کچھ اس کی ملکیت ہے اور اس کے پروگرام کی تکمیل میں مصروف ہے۔ یہ زمین، یہ صلاحیتیں اور یہ سارا کچھ جو زمین سے یہ معاشی حاصل کرتے ہیں۔

حالانکہ وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ ۚ (16:71) یعنی صلاحیتوں کے فرق کی وجہ سے کمانے کی استداد تو مختلف ہوتی ہے۔

فَمَا الَّذِيۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰى مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۷۱﴾ (16:71)

یعنی عملاً اس سے انکار کرتے ہیں کہ یہ ساری صلاحیتیں بھی اس کی دی ہوئی ہیں۔ ذرا ان سے پوچھو ان صلاحیتوں کے بارے میں۔

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَاَبۡصَارَكُمۡ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰـهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِهٖ ؕ (6:46)
اگر یہ ساری صلاحیتیں سلب کر لی جائیں۔

ملکیت زمین کی حقیقت:

اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ﴿۶۴﴾ (56:63-64) تَحۡرُثُوۡنَ، کاشتکاری

674

کرنا، تَزۡرَعُوۡنَ، کھیتی کو بارآور بنانا۔ جبکہ تم صرف کاشتکاری کرتے ہو۔

لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰهُ حُطَامًا فَظَلۡتُمۡ تَفَکَّهُوۡنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَیۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِیۡ
تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡهُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ ﴿۶۹﴾ لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰهُ اُجَاجًا فَلَوۡلَا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَیۡتُمُ
النَّارَ الَّتِیۡ تُوۡرُوۡنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ ﴿۷۲﴾ نَحۡنُ جَعَلۡنٰهَا تَذۡکِرَةً
(56:65-66-67-68-69-70-71-72-73) یہ تمام ذرائع ہمارے ہیں۔

یہ حقیقت کا تذکرہ ہے تا کہ اس پر غور کرو اور اس رفاقت کے کاروبار میں اپنا حصّہ تم لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ (53:39) لے کر باقی وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِیۡنَ ﴿۷۳﴾ (56:73) ضرورت مندوں میں تقسیم کردو۔ تو ہمیں حصّہ مل جائے گا۔

❁❁❁

زمین پر جنّتی نظام کی آمد کی بشارت

''جنّتی نظام کی آمد'':

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (39:63) یہ سماجی یعنی خارجی کائنات میں تو قانون خداوندی کی کارفرمائی تو مانتے ہیں مگر انسانی دنیا میں الگ الگ ''اِلٰہ'' بنائے ہوئے ہیں۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ (39:67) اصل میں خارجی کائنات اور زمین میں تمام اشیاء پر اس کی ملکیت اور قانون کی کارفرمائی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۴﴾ (43:84)

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (21:22)

می تراشد فکر ماہردم خداوندے دگر

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

اس کی کیفیّت تو یہ ہے۔لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ (21:23) یعنی اس نظام میں اقتدار اس کو ہوگا اور هُمْ میں ساری دنیا آ جاتی ہے سب جوابدہ ہونگے۔ کوئی فیصلہ اس کے خلاف جائے گا تو قابل مواخذہ ہوگا۔ جس طرح خارجی کائنات میں غیر متبدّل قوانین کتنی شدت سے نتائج پیدا کرتے جاتے ہیں۔ تو انسانوں کی دنیا میں بھی جب وہ کارفرما ہونگے تو اس نقشہ کا نام ''الْقِيٰمَةِ (39:67)'' رکھا ہے۔ یعنی ''قام'' سے ۃ لگنے کے بعد ''یعنی یکلخت کھڑے ہو جانا یا ظہور نتائج کی گھڑی۔ تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ یہ ہوگا۔

وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (39:67)۔ یعنی جو نقشہ جو معاشرہ خدا کے قانون کے مطابق مشکل ہو۔ تو اس کا نقشہ اس طرح کا ہوتا ہے۔ جب کہ مرنے کے بعد کی زندگی کا۔

یعنی ہر بات کا فیصلہ قانون اور عدل کے مطابق اعمال حسنہ کے خوشگوار نتائج اور اعمال بد کے تباہ کن عواقب اس آیت سے

674

اس دنیا کا ذکر ہو رہا ہے۔ اب اس آیت سے ذرا آگے وراثت ارض کا ذکر ہے۔

سماوات میں ساری قوّتوں کا قبضہ خدا کا ہے اس کی ارضی زندگی خدا کے قبضے میں نہیں ہے یہاں انسان جس طرح جی چاہے نظام قائم کرے۔ تو کہا کہ پھر اس کے دائیں ہاتھ میں سماوات اور بائیں ہاتھ میں ارض ہوگی۔ یہ سمجھانے کیلئے کیا ہے کہ پھر یہ نظام توحید قائم ہوجائے گا۔

وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾ (39:67) یعنی کائنات میں تو اسے الٰہ مانتے ہو مگر اپنی تمدّنی زندگی یعنی ارض پر نہیں مانتے تو یہ شرک ہے اور وہ اس شرک سے بہت بلند ہے۔

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾ (83:6) وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (39:68) یہ تو غلط نظام کے خلاف عالمگیر بغاوت کا ذکر ہے۔ صور جمع ہے صورت کی یعنی پیکروں میں جو زندہ انسانوں کی بجائے پیکر آب وگل رہ گئے ہیں اور نفخ یعنی ''روح پھونک دینا'' یہ پہلی دفعہ ہجوم کر کے کھڑی ہو جائے گی۔ صَعِقَ۔ یعنی حواس باختہ ہو جائینگے۔ اگر انسانوں نے یہ غلط نظام نہ روکا تو پھر یہ پوری عالمگیر کچلی ہوئی انسانیّت کھڑی ہو جائے گی۔

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ (39:68) بجز ان کے ہم اپنے آپ کو ان قوانین سے ہم آہنگ رکھیں گے اور ان کو پتہ ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى (39:68)۔ تو اس کے بعد دوسری دفعہ جب پیکروں میں توانائیاں پھونک دی جائیگی۔ فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾ (39:68) یہ ہوگا وہ انقلاب جس کیلئے یہ سب دیکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہونگے۔

پھر کائناتی قوانین خدا کے ایک ہاتھ اور دوسرے ہاتھ میں ارض ہوگی تو پھر توحید کا دور دورہ ہوگا۔ یعنی دونوں جگہ خدا کے قوانین نافذ العمل ہونگے۔ یہ نظام اس وقت دنیا میں قائم ہوگا۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) تو زمین خدا کے نظام پر ربوبیّت کی روشنی سے جگمگا اٹھے گی۔ یہ ارض کی بات ہو رہی ہے۔ اس قیامت کی نہیں۔ اس وقت تو ہر قسم کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔

وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ (89:22) خدا اور اس کے ملائکہ صف در صف آئیں گے موقع پر فیصلہ کیا جائے گا۔

وَّجَآءَ رَبُّكَ (89:22) تیرے رب کا نظام زمین پر متمکّن ہوجائے گا۔

وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ (89:23) اور جہنّم کو بھی ساتھ لے آئے گا یعنی اس وقت تو یہ عوام ان کی سلگائی ہوئی آگ میں جل رہی ہے اور یہ لوگ اپنی فریب کاریوں سے اصل حقیقت کا علم نہیں ہونے دیتے۔ تو ان کا فریب یعنی جہنّم بے نقاب ہوجائے گا۔

وَقَالُوا۔ (39:74) اس وقت لوگ اعمال کے درخشندہ نتائج دیکھ کر کہیں گے۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (39:74) درخور حمد و ستائش ہے یہ ذات یہ نظام جس نے تمام وعدے سچ کر دکھائے۔

وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ (39:74) ہمیں اس زمین کا مالک بنا دیا۔ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ (39:74) اور ایسی

جنّت مل گئی جس میں ہم اپنی آزادی سے رہ سکتے ہیں۔ جہاں چاہیں رہیں یہ ہوگی حقیقی فریڈم پہلی Freedom from all wants یعنی محتاجی سے چھٹکارا۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ (20:118) وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ (20:119) قرآن کا ضابطہ ہوگا۔ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ (39:69) ہر نبی کو یہ قرآن دیا گیا تھا جس سے انہوں نے شان وشوکت حاصل کی تھی۔

اور تاریخ ان کی اس پر بشارت دیتی ہے کہ حق کے ساتھ ہر ایک کا فیصلہ ہوا۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾ (39:69) تو اس نظام کے تحت ظلم کسی پر نہیں ہوگا۔

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (39:70) ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا یہ ہے عدل۔

''خدااور کائنات''

تصوّر ماورائیّت (Transcendence) :

یعنی کائنات بنانے کے بعد کائنات سے ماوراء یعنی الگ تھلگ بیٹھا ہے یعنی اس مشین یعنی کائنات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ مشین اس کے وضع کردہ اصولوں کے تحت خود بخود چلتی رہتی ہے۔ یہ ہے De-ism یعنی ایسا خدا جو کائنات سے باہر اپنے تخت پر متمکن ہے۔اس سے تجسیم یعنی صاحب جسم ہونے کا تصوّر ہے۔اس کے برعکس دوسرا گروہ اس کے خیال میں کائنات اور خدا ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ نہ خدا کائنات سے الگ اور نہ کائنات خدا سے الگ۔ اسے فلسفیانہ انداز میں Immanence of God جس کا نتیجہ وحدت الوجود یعنی ''Pantheism ہے یعنی ہر شے خدا ہے۔قرآن ان دو تصوّرات کورد کرتا ہے اس کی رو سے خدا Immanence بھی ہے۔اور transcendant بھی۔کائنات کے اندر ہے مگر مخصوص نہیں۔ کائنات سے باہر مگر اس سے خارج نہیں۔وہ کائنات کا خالق ہے مگر اس کی مخلوق (کائنات) اس کی الوہیاتی توانائی کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔اسے خدا کا امر Directive کہا جاتا ہے۔اسے Time میں ابدیت Eternity حاصل ہے۔هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (57:3) وہ مکان میں لامحدودیت کا حامل ہے۔(Infinity) اس لئے وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3) ہے کہ کائنات سے الگ تھلگ نہیں بیٹھا ہوا ہے اور نہ ہی کائنات کی ہر شے خدا ہے۔اس لئے تجسیم اور وحدت الوجود کے دونوں نظریات غلط ہیں۔اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴿۵۴﴾ (41:54)

وہ لامحدود یعنی infinite محدود کے اندر نہیں آسکتا۔فلسفہ کی زبان میں اسے (مابعد الطّبیعاتی) کہتے ہیں۔فزکس کے معنی عالم محسوسات یعنی محسوس کائنات جس کو حواس کے ذریعہ (Perceptual) علم حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ علم بالحواس کہلاتا ہے۔ محسوسات سے ماوراء چیزیں تو ہمارے حواس کی زد میں نہیں آسکتیں۔ اس لئے اس کو میٹا فزکس، ماورائے محسوسات ماوراء طبیعات کہتے ہیں۔ اس لئے خدا کی ذات، عالم امر یا عالم مشیت کیا ہے؟ وہاں کیسے فیصلے ہوتے ہیں۔ جونہی ہر چیز محسوس

کائنات کے دائرے میں آ ئیگی۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (2:31)اس میں ہر چیز سمجھی جاسکتی ہے۔ جو ابھی تک نہیں سمجھا گیا ہے۔ وہ علم انسانی کا نقص ہے۔ ہم وہاں تک نہیں پہنچے۔ ورنہ یہ جو''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (2:31)'' قرآن میں آدم کی صفت بتائی گئی ہے کہ اسے کائنات کی ہر شے کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت دی گئی ہے۔ اب انسان اس میں جس حد تک ترقی کرتا جائے گا تو اس حد تک یہ ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ (2:31)'' کو حاصل کرتا جائے گا۔ ''کُلَّهَا'' (2:31) سے مراد ہے یعنی محسوس کائنات کے متعلق کلی علم حاصل کرسکتا ہے۔ آگے انسان قیاس و اندازہ کرسکتا ہے۔

وہ لفظ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ (6:91) یہ تو صحیح اندازہ لگانے کی بات ہے۔ معرفت کی بات تو نہیں ہے۔ قرآن میں تو معرفت کا ذکر تک نہیں ہے اس کا عرفان یعنی ''پہچانا جانا'' یہ تو ناممکن ہے اس کا اندازہ کچھ صرف اس کی دی ہوئی صفات سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ ورنہ ذہن انسانی اس کے بارے میں جو کچھ کہے گا وہ ان سے بلند ہے۔ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ (37:159)

❀❀❀

’’ملائکہ‘‘(عالمِ امر والے)’’حاملینِ عرشِ خداوندی کی ذمہ داری‘‘

’’ملائکہ‘‘:

عالمِ امر جہاں یہ پروگرام بنتے ہیں قوانین طے ہوتے ہیں ملائکہ کا یہ حصّہ قرآن کی رو سے عالمِ امر سے متعلق ہے۔ جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ملائکہ کا دوسرا حصّہ عالمِ محسوسات سے ہے۔ یعنی وہ چیز جب عالمِ محسوسات میں آتی ہے تو پھر وہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھنے سے قرآن میں جہاں جہاں ملائکہ آیا ہے۔ وہاں بات سمجھ میں آتی ہے۔ ملائکہ میں سے وہ جو خدا کا امر یا وحی لاتے ہیں اور انبیاء تک پہنچاتے ہیں۔ یہ حصّہ ’’عالمِ امر‘‘ سے ہے۔ جو ہمارے ادراک سے ماوراء ہے۔ یہ میٹا فزکس ہے۔ لیکن جو کائنات سے متعلق ہے تو غور وغوض سے سمجھ میں آتا ہے۔

حاملینِ عرشِ خداوندی:

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ (39:75)

یعنی یہ وہ ملائکہ ہیں جن کو تم دیکھ سکتے ہو۔ جبکہ جو ملائکہ نصرت اور تقویت کیلئے بدر وحنین کے میدانوں میں آئے تھے وہ تھے۔

جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (9:26) اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ (40:7) یعنی عرش اور اس کے اردگرد جو ہے اس کو اٹھائے ہوئے ہونگے۔ یعنی وہ جماعت جو خدا کے اقتدار کو دنیا نافذ کرنے کیلئے اٹھتی ہے۔ یہ جماعت جو عرش خداوندی بھی اقتدار اعلیٰ کی حامل ہوتی ہے۔ وہ خود عرش پر نہیں بیٹھتی۔ یعنی جو اس نظام کو نافذ کرتے ہیں ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ کیسی حسین اصطلاح ہے کہ عرش کے اوپر، تخت کے اوپر یہ نہیں بیٹھتی۔ یہ جماعت اس تخت کو اٹھائے ہوئے ہے۔ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ۔ (40:7) وہ اس کے نظام ربوبیّت کو عام کرنے کیلئے رات دن اپنی تمام کاوشوں سے اسے نافذ کرتی ہے تو لوگوں کی زبان سے واہ واہ نکلی جاتی ہے۔

وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (40:7) وہ اس کی صداقتوں پر پورا پورا یقین رکھتی ہے۔

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ (40:7) وہ صرف اپنا تحفظ نہیں کرتے بلکہ جہاں جہاں دنیا میں زیادتی ہو رہی ہے تو ان کمزوروں کی بھی حفاظت کرتی ہے۔ رسول ﷺ نے قیصر وکسریٰ کو جو خطوط لکھے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اس میں یہ فقرہ ابھی تک موجود ہے اور یہ نظر آرہا ہے کہ ان ہی کا ہوسکتا ہے کہ یاد رکھو! یہ کسانوں اور محنت کشوں پر اگر ظلم نہ بند کیا گیا تو ان کا بدلہ لینے کیلئے ہم آئیں گے۔ وہ مسلمان بھی نہیں ہیں صرف انسان ہیں مگر مظلوم۔

یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی دعوت دی تھی۔ یہ تھی دعوت کہ یہ ظلم وستم بند کردو یہ تھا فریضہ اس قوم کا جو حاملین عرش تھے کہ جہاں سے بھی دنیا میں ظلم واستبداد کی آواز سنوتو وہاں ان کی مدد کیلئے پہنچوتو پھر کیا کرو؟

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ (79:1-2-3-4-5) یعنی جو اس قدر ناتوانی اور کمزوری میں غرق ہیں تو ان کو کھینچ کر باہر لاتے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کو سطح انسانیت پر لاکر ''نشاط''یعنی ان تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں جو ان کی آزادی میں حائل ہوں۔ سَبْحًا۔ تاکہ یہ اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ آگے بڑھیں۔ سَبْقًا۔ پھر یہ تمام اقوام سے آگے بڑھ جائیں۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (79:5) تاکہ یہ اپنے امور کی خودنگرانی کریں۔ جب یہ جماعت وہاں پہنچے گی تو۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۗ (79:6-7) یعنی جھٹکا دینگے۔ تو ہر جھٹکے میں جو نیچے والا ہے وہ اوپر آجائے گا۔ اتنی آسانی سے تو وہ ان کو بھی چھوڑتے نہیں جن کی وجہ سے ان کے عیش کدے آباد ہیں۔

یہ ہیں حاملین عرش خداوندی جو مستبد قوتوں سے ان کو آزاد کراتے ہیں۔ پھر ان کی صلاحیتوں کو ابھار کر دونوں قوموں سے آگے لے جاتے ہیں اور یہ جھٹکا دیئے بغیر نہیں ہوتا ہر جھٹکے میں آزاد ہو کر ان سے گلوخلاصی ہو جاتی ہے۔

قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ (79:8-9) ان کو جھٹکے دینے سے دل کانپ اٹھیں گے اور نگاہیں ندامت کے مارے زمین میں گڑی ہونگی۔

''پہلی حالت میں واپسی'':

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۗ (79:10) کیا جو پہلے ہماری حالت تھی ادھر پہنچا دیا جائے گا۔ جو لوٹ کھسوٹ سے جمع کیا تھا ان مجرموں نے۔

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۗ (79:11) تو پھر یہ ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے۔ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ (40:7) یہ ان لوگوں کی حفاظت کے سامان بھی کرینگے۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (40:7) بار الہا تیرا علم اور رحمت تو سارے جہاں کو محیط ہے کسی ایک قوم یا رقبے تک محدود نہیں ہے اس کو اور وسیع کر یہ مظلوم بھی ان کے مستحق ہیں۔ ان کو ان رحمتوں سے محروم نہ کر۔ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا (40:7) ان کی حفاظت کا انتظام تاکہ یہ وہاں لوٹ کر جائیں جہاں سے ان کو اس سطح پر بھیج دیا گیا تھا۔ وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ (40:7) تاکہ تیرے راستے پر چل سکیں۔

وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ (40:7) تو ان کو تباہیوں سے محفوظ رکھ یعنی ان کو جامد زندگی سے محفوظ رکھ۔ وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ (40:8) ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (40:9) ہے سب سے بڑی ''Achievement'' جو ان حاملینِ عرش کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ جن کی ذمہ داری ہے کہ جہاں بھی کسی قوم کو مستبد قوتوں نے کچل کر رکھ دیا ہو۔ تو وہاں جا کر ان کو چھوڑ کر سطح انسانیت پر لائیں اور اس قابل بنا دیں کہ اپنے امور کی آپ تدبیر کریں۔

''لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا''

خدا ارتقا سے بلند و بالا ہے

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ (40:15) زبان اور گرامر کے لحاظ سے ترکیب یعنی Construction سمجھنے کی ہے۔ ''رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ (40:15)'' ایک عام معنیٰ ''درجات کو بلند کرنے والا'' یعنی قرآنی نظام میں جو لوگ اطاعت کرینگے۔ ان کے درجات بلند ہوتے چلے جائینگے۔

لیکن یہ خود خدا کے متعلق قرآن نے ایک اہم چیز بیان کی ہے۔ ساری کائنات اور اس کی تمام چیزیں نہایت ناقص اور کمزور حالت میں تھیں۔ زندگی کا ایک جرثومہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اوپر ایک درجہ بلند ہوا سیڑھی کے ڈنڈے جب اوپر جائیں تو ان کو درجات جبکہ نیچے اتریں تو انہی ڈنڈوں کو ''درکات'' کہتے ہیں۔ سیڑھی وہی ہے۔ یہ انسان جو اسے اوپر کیلئے یا نیچے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ اسی قرآن سے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ (2:26) اب ہر شے ان درجات، مدراج کی رو سے۔ ارتقاء کی رو سے اپنے نقطہ آغاز سے عرّوج تک پہنچتی ہے۔ لیکن اللہ تعالی کی ذات گرامی کی ارتقائی مراحل کی محتاج نہیں ہے۔ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ (40:15) وہ اس ارتقائی عمل سے بلند ہے۔ یوں نہیں کہ پہلے ایک کمزور اور ناقص سی حالت کے اندر تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کر کے خدا ہو گیا۔ پھر وہ عرش کے اوپر جا بیٹھا۔ یہ قطعاً ایسا نہیں ہے۔ وہ درجات کے ذریعہ سے عرش پر نہیں بیٹھا۔ وہ اس تصوّر سے بلند ہے۔ بالا ہے اور اس ساری کائنات کا ''ذی العرش'' یعنی مرکزی کنٹرول اس کے پاس ہے۔ انسانوں کے ساتھ اس کا تعلق۔

يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ (40:15) وہ اپنے بندوں میں سے وحی کیلئے عالم امر سے جس کو چاہے تو چن لے۔ اب ہمارا اور خدا کا تعلق اس کتاب کے ذریعہ ہے۔

❁❁❁

قوموں کا عروج وزوال

The Making of Humanity by Briffault Robert

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ (40:85)

رابرٹ برفو:

''فال آف رومن ایمپائر'' پر لمبی چوڑی گفتگو کی ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو، کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی مدبّر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ یہ ہے سنّت اللہ۔

اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظام وضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے۔ اس کیلئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت، عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص طبقہ کو متموّل بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس سوداگری کو نہایت قابلیت اور مدبّر، خلوص اور دیانتداری سے چلایا لیکن حسن انتظام کی یہ تمام خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچاسکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رو ورعایت نتیجہ خیز ہوکر رہے۔ اس کے بعد (اقدار) Values کے بارے میں لکھتا ہے۔

''اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہوگئی ہے۔ نہ ہی ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کو تولنے کے قابل بھی ہوجائے اور علم وفنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے۔ تب بھی اس کے جوہر ذاتی میں قلب ماہیّت پیدا نہیں ہوسکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔ قوّت، تہذیب، کلچر بے معنی چیزیں ہیں۔ اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر وقیمت ماپی جاسکتی ہے۔ اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ باطل نظام کے مآل کے بارے میں کہتا ہے۔

وہ نظام تہذیب جس میں حق وصداقت کو عادی طور پر نظر انداز کردیا جاتا ہو آخر کار تباہ ہوکر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے۔ وہ اجتماعی نظام کا وہ جزو ہے۔ وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے۔ اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار برباد ہوجاتی ہے۔ انتخاب طبعی کے اٹل قانون کی بناء پر گناہ کی اجرت موت ہے۔

امریکی مورخ (Dorsey) ڈار سے اپنی کتاب ''Civilization'' میں کہتا ہے۔ ''ہماری تباہی کے باعث نہ تو بڑے بڑے مجرم ہیں۔ جن سے ہم لرزاں رہتے ہیں اور نہ ہی ہماری افلاس، جس پر ہم نادم ہیں۔ اس کا اصل باعث وہ معاشرتی نظام ہے۔ جو منافقت اور فریب کی بنیادوں پر قائم ہو اور ساتھ یہ قانون ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' تو اس قانون میں نظام کے مقدر میں تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ (40:85) یہی قانون شروع ہی سے چلا آ رہا ہے۔

یہ تمام دانشور ایسے نظام کی تلاش میں ہیں۔ جو ان اقدار پر مبنی ہو۔ وہ کہتے ہیں ''اس وقت چرچا ہے کہ یہ ایٹم بم دنیا کو تباہ کر دے گا۔ یہ تو صرف انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔ یہ کوئی تباہی نہیں ہے۔ تباہی تو وہ ہے کہ انسان زندہ رہیں اور تباہ ہوں اور یہ تباہی ہمارے غلط نظام کی بناء پر آئے گی۔ اس میں انسانیت مرجاتی ہے اگر انسانیت مرجائے اور انسان زندہ رہے تو اس سے زیادہ بڑا عذاب کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ (40:85) اس قانون سے انکار انسانوں کے لیے تباہی ہی تباہی ہے۔

اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (1:2)

مودودی کی تفسیر کی جھلک:

مودودی کی تفسیر پہلے صفحہ پر رحمٰن ورحیم کا ترجمہ کرتے ہیں۔رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہے۔یعنی جب دراز قد کے ذکر میں جب ''لمبا'' کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے بعد ''تڑنگا'' بھی کہتے ہیں۔(تفہیم القرآن جلد اوّل، 1993، صفحہ:34)

یعنی یہ لفظ مہمل ہے ''جس کے معنی کچھ نہ ہوں۔''

تیری نگاہ فرومایہ، ہاتھ ہے کوتاہ
تیرا گناہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

یہ زبان تو خود سمجھاتی ہے صرف تقلید کی رٹ سے نکلنا ہوتا ہے۔دوسری طرف ''لَا آمَةَ الْاَئِمَۃ''یعنی کسی ''پبلک رائے'' سے ڈرنا کہ ہزار برس سے یہی معنی چلے آرہے ہیں۔یہ مقبولیت عامہ یہ آدمی کو صحیح معنوی تک نہیں پہنچنے دیتی۔

عربی زبان میں کسی لفظ کے ''مادہ'' کا باب یا وزن بدلتا ہے تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔''رحمن ورحیم'' کا مادہ ایک ہی ہے۔''رح م'' پھر اس سے رحم مادر بنا، رحم مادر میں نشوونما میں کئی مراحل ہوتے ہیں۔اس میں بظاہر ماں کی کوششوں کا کوئی داخل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ساری نشوونما اندر خود سے ہورہی ہوتی ہے۔وہاں ہڈیاں بن رہی ہیں۔گوشت بن رہا ہے۔اعصاب اور دل بن رہے ہیں۔سانس تک لینے کیلئے کوئی ذریعہ نہیں اور نشوونما غیر شعوری طور پر ہر چیز یعنی آنکھ، دماغ، خلیے،قلب کی ہو رہی ہے۔ماں کو کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔وحی یہ ہوتی ہے کہ نبی کو کچھ پتہ نہیں کہ یہ کیسے ہو رہا ہے؟۔جس سے انسانیّت کی نشوونما درکار ہوتی ہے۔ حالانکہ اس کیلئے ان کے ہاں رزق، ربوبیّت اور دیگر الفاظ بھی تھے۔جس میں بظاہر مخصوص طور پر کوئی نہ کوئی ذریعہ ہوتا ہے۔ایک ایسی چیز جس میں مخصوص طور پر آپ کو نظر نہ آئے کہ روٹی کھا رہے ہیں۔ پانی پی رہے ہیں اور نشوونما ہو رہی ہے۔اب سوال تو انسانیّت کی نشوونما کا ہے اور وہ اقدار جو قرآن نے دی ہیں وہ تو صرف ان سے نشوونما ہو سکتی ہے۔اس (رح م) سے ہی رحیم اور رحمن کی دو شکلیں ہیں۔صرف باب بدل کر ایک رحیم ہے تو دوسرا رحمٰن ہے۔

اب یہ جو Theory of Progressive Evolution ہے کہ زندگی مختلف مراحل میں سے آہستہ آستہ ارتقاء کے مراحل طے کر کے موجودہ پیکر انسانی میں آئی۔ یعنی کڑی سے کڑی ملتی گئی۔ بتدریج ہوتا گیا۔ اب ان کی تحقیق میں بعض مقامات ایسے آئے جن میں ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کیسے بن گئی؟ درمیان کی کڑی نہیں تھی۔ ان کے ہاں یہ Missing Links گمشدہ کڑیاں کہلاتی ہیں۔ یعنی درمیان سے کڑیاں پھاند کر کوئی چیز آگے جا پہنچتی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ اس کا ہمیں علم نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے ''فجائی ارتقاء'' یعنی ہنگامی طور پر یکلخت ہو گیا (Emergent Evelution)۔

بدلے کچھ ایسے کہ طور سے بے طور ہو گئے
تم شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے

''یہ کچھ اور ہو گئے'' پرگرویسو ارتقاء کی نارمل کڑی نہیں ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ بعض ایسے Links ہمیں نظر آتے ہیں کہ درمیان میں پتہ نہیں چلتا کہ بتدریج تبدیلیوں کے بعد کیسا ہوگا۔ وہاں ''کچھ اور'' ہو جاتا ہے۔

یہ ہے انکے ہاں کا Emergent Evolution یعنی ہنگامی طور پر کچھ اور ہو جانا یعنی نشوونما پا کر ارتقاء کے ذریعہ کسی چیز کا ''کچھ اور'' بن جاتا ہے۔

اگر یہ کڑی در کڑی آتے تو اس کیلئے عربی زبان میں ''رَحِيْمٌ۔ فَعِيْلٌ'' کے وزن پر آئے گا۔ یعنی بتدریج کسی شے کا کڑی در کڑی نشوونما پانا۔

رحمٰن۔ خدا کی وہ صفت ہے کہ وہ بتدریج وہاں تک نہیں پہنچا جس طرح فکر انسانی پہنچتی ہے۔ یہ درمیان میں بتدریج کی کڑیوں کو پھلانگ کر کسی چیز کا یکلخت ہنگامی طور پر اس طرح سے ابھر کر آجانا۔ اس کیلئے ''فَعْلَانُ'' کا وزن ہے۔ ''رحمن'' اس پر آیا ہے۔ یعنی کسی شے کا شدت سے یکلخت ہو جانا اب جو ''رحمٰن'' ہے وہ بتدریج ارتقاء کے ذریعہ وہاں تک نہیں پہنچتا۔ جس طرح انسان کسی چیز پر بتدریج پہنچتا ہے۔ اسے Detecting knowledge (علم شناخت) یعنی تحقیق کی پھر پہنچے۔ جس طرح بلڈنگ کو بنیادوں سے شروع کیا۔ پھر اس کا ڈھانچہ بتدریج اٹھتا چلا جائے گا۔ یہ سارا پروسیس، بتدریج کسی تک پہنچنے کا، اس کیلئے ''رحیم'' کا وزن آئے گا۔ جس طرح وحی ملنے سے پہلے نبی کو اس کا علم اور احساس تک نہیں ہوتا تھا اور جس کو اتنا بھی علم نہ ہو اور یکلخت اس کو ایسا علم ملے جو ساری کائنات کو مشہود کرنے والا ہو۔ یہ ہے ''فجائی ارتقاء'' اگر آج کی کوئی اصلاح کیلئے یکلخت ہو جانے والی بات استعمال کرنی ہے تو یہ ہے وہ چیز۔ اَلرَّحْمٰنُ ۝١ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝٢ (55:1-2) وحی ملنے کا خاصہ رحمانیت ہے۔ رحمیّت نہیں ہے۔ یعنی رحمن جس نے قرآن کا علم نبی کو سکھایا۔ یہ خاص صفت رحمٰن کیوں آئی۔ اس لئے کہ اس کے اندر فجائی ارتقاء کی بات ہے۔ یہ کوئی بتدریج سے، اپنے فکر و اکتساب سے، سوچ و بچار کا نتیجہ نہیں ہے اسے جس نے سکھایا ہے وہ رحمن ہے یعنی وہ اسے ''ا۔

674

ب۔پ۔سے ایم اے'' تک لیکر نہیں گیا۔یہ تو رحمیت کا خاصہ ہے کہ بچے کو پہلی کلاس سے ایم اے تک لے جاتے ہیں یہ تو رحمیت کے اندر آئے گا۔

رحمانیّت تو وحی کیلئے تھی۔اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ (55:1-2) وحی کی خصوصیّت یہ ہے کہ یہ فکر انسانی کا نتیجہ نہیں ہے۔یہ شناختی علم نہیں ہے جس کے ذریعہ نبی ﷺ اس نتیجے پر پہنچتا ہے۔یہ تو رحمن کا سکھایا ہوا ہے اور سکھانے والے نے اسے بتدریج نہیں سکھایا ہے کہ یہ ابجد سے ایم اے تک پہنچا ہے۔آگے اس کی تعلیم وہ رحمیّت کی رو سے، بتدریج نتائج پیدا کرے گی۔ اب اس نے آہستہ آہستہ، بتدریج،کڑی در کڑی منزل تک پہنچنا ہے۔

نبی ﷺ نے وحی کا علم رحمانیّت کے طریق پر حاصل کیا اور رحمیت کے تحت لوگوں کی رہنمائی کی۔یہ اسے ہنگامی طور پر، یکلخت ملا ہے۔جس میں اس کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں تھا۔یہ اب وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ (2:129)ان کو بتدریج سکھائے گا۔پڑھائے گا اور رحمیّت کے ذریعہ ان کو آخر تک لے جائے گا۔

این کتابِ نیست چیزے دیگر است

❁❁❁

قرآن کا جواب کارل مارکس (Karl Marx) کو

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (41:6-7)۔ یہ ہیں جن کو آخرت کی زندگی پر یقین نہیں ہوتا تو سارا کچھ سمیٹ کر رکھتے ہیں۔

کارل مارکس (81-1818):

''ہر شخص اپنی پوری محنت سے کمائے اور صرف اس کی ضروریات کا اس کو دیا جائے اور باقی سب کا سب دوسروں کی نشوونما کیلئے دیدے یہ تھا کمیونزم۔ عربی میں ایسی نشوونما کیلئے لفظ ''زکوٰۃ'' آتا ہے''۔

کارل مارکس کا خیال تھا کہ نوع انسانی کی مشکلات کا حل اس قسم کے نظام میں ہے۔ لیکن یہ ہوگا کیسے؟ کیوں وہ اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس میں سے صرف اپنی ضروریات کیلئے رکھ کر باقی سارا دوسروں کی زکوٰۃ یعنی نشوونما کیلئے دیدے؟ اس کا جذبہ محرّکہ کیا ہوگا؟ اس کے ساتھیوں نے کہا کہ اسے شروع کرو۔ اس نے کہا کہ مجھے اس کا جذبہ محرّکہ ''incentive'' نہیں مل رہا ہے تو اس کے ساتھی اس بات پر اس کا ساتھ تک چھوڑ گئے۔ کہ بھئی سارا نظریہ دیکر اسے یہ جذبہ محرّکہ نہیں مل رہا ہے اب جذبہ محرّکہ کی پہلی چیز یہ ہے کہ اسے ''مشرک'' نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے نظریہ میں جو چیز حائل ہو رہی تھی سنیئے ذرا:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ (45:23)

جو اپنے مفاد کو خدا بنالے جو میں کماؤں میری ذات کیلئے ہے اس میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے یہ اپنے مفادات کو خدا بنا لینا، یہ ہے شرک۔ اگر خدا کے قانون کو اپنا خدا بنائے تو پھر اسے وہ جذبہ محرّکہ مل گیا۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) اب جو اپنے مفاد کو خدا بنالے تو وہ کیسے ضرورت سے زیادہ دے سکتا ہے؟ کارل مارکس نے ٹھیک کہا تھا۔

یہ وہ کرے گا جو یہ مانے کہ میں تو خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور اپنے جذبات کو درمیان میں نہ آنے دے۔ میں کیوں ایسا کروں تو پھر جسم کا یہیں پر موت کے بعد ختم ہو جائے گا۔ تو انسان کا معاملہ ختم۔ تو وہ دوسروں کی نشوونما کیلئے نہیں دے گا۔ جس کا یہ نظریہ ہو تو اس کو جذبہ محرّکہ نہیں مل سکتا۔ اس کیلئے تو ایمان کی ضرورت ہے۔ انسان کو جسم کے ساتھ ذات بھی دی گئی ہے۔ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ (41:7) تو زندگی آگے بھی چلتی ہے۔ وہ تو خدا کا بھی قائل نہیں تھا۔ تو اسے جذبہ محرّکہ کہاں سے ملتا؟ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (41:6) پھر تباہی ایسے مشرکوں پر۔

الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (41:7) یہ زکوٰۃ نہیں دے سکیں گے۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (41:7) یہ تو تسلسل حیات کے قائل ہی نہیں ہیں۔

معاوضہ اور ماحصل میں بنیادی فرق

(Wages and Production)

معاوضے سے مراد کے زمین کسی اور کی ہو اور یہ اسے کاشت کرے اور ساری پیداوار زمین کا مالک لے جائے اور اس کو بدلے میں طے شدہ معاوضہ دے۔ اس زمین کی پیداوار سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اسے محنتانہ کہتے ہیں مزدور کو اگر پچاس روپے کا کام کرے تو طے شدہ دس روپے دیدے۔ یعنی معاوضہ جبکہ دوسری چیز محنت کا ماحصل ہے۔ یعنی محنت کے ذریعہ جو کچھ پیدا کیا جائے۔ یہ ہے قرآن کی اکنامکس میں بنیادی فرق۔ آج کی اکنامکس وہ یہ قرآنی فرق دیکھ کر جھوم اٹھتے ہیں۔ نظام سرمایہ داری میں فیکٹری کا مالک جو سرمایہ لگاتا ہے تو کروڑوں کے سالانہ پروڈکٹس میں وہ طے کردہ اجرتیں دے دی جاتی ہیں اور باقی سرمایہ دار سارے کا سارا لے جاتا ہے اب سرمایہ دار وہ معاوضہ بھی اپنی مرضی سے مقرر کرتا ہے اور اس میں مزدور کی کوئی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ یہ مزدور کو بھوکا مار کر اپنی شرائط پر اسے کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ماحصل کے سلسلہ میں قرآن زراعت کی مثال پیش کرتا ہے۔ یعنی زمین میں جو بھی پیدا ہوگا۔ وہ اس محنت کرنے والا کا ہوگا۔ آج کی ماڈرن اکنامکس نے اس ماحصل اور اجرتوں میں فرق کیا ہے۔ وہ پرڈکشن میں اور Wages میں فرق کرتے ہیں یہ اکنامکس کے دو الگ الگ سسٹم بنتے ہیں اور قرآن اس محنت کے ماحصل کو احسان نہیں کہتا بلکہ اسے اس کا حق تسلیم کرتا ہے۔ یعنی یہ سارا نقطۂ عمل کا مضمر ہے۔ اب کہا گیا کہ یہ زمین اور اس کی صلاحیتیں وہ خدا کی تخلیق ہے اور ہم اس کے مالک ہیں۔ اس لئے وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ (41:9)

پہلے کہا کہ اس کو دو مراحل میں بنایا اور پھر کہا کہ تم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کر سکتے۔ چونکہ اس کے بنانے میں کوئی اور شریک نہیں تھا ہم اس کے واحد مالک ہیں تو اس میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے۔ تو گویا زمین کو ذاتی ملکیت میں لینا شرک ہے۔ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97) یہ لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے ہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۱۰ (41:10) اس لئے اسے یکساں طور پر سب کیلئے کھلا ہونا چاہئے۔

❁❁❁

ایمان کے تین اجزا

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾ (41:33)

مگر ہم تو مسلمان بن گئے۔ جو عربی زبان کا لفظ ہی نہیں ہے اور پھر فرقوں میں بٹ گئے۔ قوموں، برادریوں میں تقسیم در تقسیم ہوگئی۔ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ (41:33) سے مراد خدا کی کتاب کا عملاً نفاذ عَمِلَ صَالِحًا (41:33) اس قرآن کی پیروی اور هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (22:78)

اس کے بعد کام اور اعمال میں فرق پیدا کر رکھا ہے۔ شریعت کی رو سے نماز، روزہ اور وظائف اعمال کہلاتے ہیں۔ اس کو یہ اعمال کہتے ہیں۔

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

قرآن نے ساری بات تین لفظوں اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾ (41:33) میں کردی۔

❁❁❁

قرآن میں سزا کا تصوّر

اگر معاشرے میں خراب کام ہیں تو منافع بخش کام زیادہ سے زیادہ کرتے چلے جاؤ قوّت کا استعمال تو کہیں آخر میں جا کر ہوتا ہے۔قوّت کا،سزا کا استعمال تو صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو نفسیاتی طور پر نا قابل اصلاح (incorrigible) ہوتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر کچھ ذہنیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو صرف خوف کے ذریعہ ہی سے روکا جا سکتا ہے وہ بڑی مستثنیات ہوتی ہیں۔ وہ آخری مرحلہ ہوتا ہے۔

یہ احکامات سزاؤں کے قرآن میں آخری دور میں جا کر نافذ کئے گئے تھے۔رسول ﷺ کے زندگی کا پورا تیئس سالہ دور سیّاٰت کو حسنات سے دور کرنے کی بات تھی۔اس پورے دور میں کبھی بھی تشدّد آمیز طریقے یا ڈنڈا کے ذریعہ شراب یا زنا یا چوری نہیں چھڑائی گئی تھی۔معاشرے میں زیادہ سے زیادہ حسن کارانہ کاموں نے لوگوں کی تکلیف اور پریشانیوں کو دور کر دیا اور حسنات اس قدر دلوں میں جاگزیں ہو گئے تھے کہ معاشرے میں جرائم خود بخود ختم ہوتے گئے۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114) اگر کسی کا توازن بگڑا ہے تو اس میں حسن پیدا کرو۔بھوکے کا توازن روٹی دیکر قائم کرو خوف اور پریشانیوں کے بگڑے توازن کو ان کی وجوہات ختم کر کے توازن صحیح کر دو۔اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (41:34) اسے انفرادی طور پر کر کے دیکھو نتیجہ خود بتا دے گا۔فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾(41:34) تو دشمنی گہری دوستی میں بدل جائے گی۔وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ (41:35) یہ توفیق تو ان کو ملتی ہے جو استقامت دکھاتے ہیں۔وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾(41:35) اور یہ توفیق تو بڑے نصیب والوں کو ملتی ہے۔

''تقدیر'' کا مسئلہ قرآن نے ایک لفظ میں طے کر دیا

خدا کیلئے عالم امر میں کوئی قاعدہ اور قانون نہیں ہے۔

یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ① (5:1) یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ (42:49) یہ ساری آیات عالم امر سے متعلق ہیں۔ نمک کو نمکین، شہد کو مٹھاس اور سنکھیا کیوں مہلک اور پانی کیوں ممدِ حیات ہے؟ یہ ساری چیزیں خدا کی مشیت یعنی عالم امر میں طے ہو گئی ہیں۔ یہ چیزیں قاعدے قانون، توجیہات سے بالا ہیں۔ اس عالم امر کے بارے میں ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے جب اپنی اس سکیم کو عالم امر سے مخصوص دنیا میں، مخصوص پیکروں کے اندر بھیجتا ہے تو پھر قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ③ (65:3) تو پھر کائنات کی ہر شے کیلئے قانون بنا دیا۔ مثلاً اتنا پانی ممدِ حیات ہے اس پانی میں ڈوب کر مر جانا ہے۔ اب ایک خاص ''قدر'' یعنی پیمانے سے زیادہ پانی پیو گے تو مہلک ہوگا۔ یہ پانی کی تقدیر ہے اب ان چیزوں کو قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور اس کے مطابق چلنے کیلئے مجبور ہیں۔ یہ ہے فطرت جس کو بدلا نہ جا سکے۔ جو اس کے اندر ہو کسی سے سیکھی ہوئی نہ ہو۔ فطرت اشیاء کی ہوتی ہے انسان کی نہیں ہوتی۔ یہاں آ کر انسان کے معاملے میں ایک استثناء ہوتا ہے کہ قوانین اس کیلئے بھی دیئے مگر اس کو صاحب ارادہ بنایا۔ جی چاہے تو چلو اور اگر جی نہ چاہے تو نہ چلو اب اس عمل کا نتیجہ عالم امر میں طے ہے۔ وہ نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔ عالم امر کا فیصلہ یہ ہے کہ غلط نظام تباہی اور صحیح نظام خوشگواریاں دے گا اور وہ جس قسم کا نظام قائم کریں۔ نتیجہ پھر اس کی خواہش کے مطابق نہیں نکلتا کیونکہ یہ اس کے بس سے باہر ہے۔ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا ③ (76:3) دو امکانات دیدیئے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ ۙ (18:29) اب کائنات میں قوانین کے دو حصے ہو گئے۔ اشیائے کائنات کو ان قوانین پر چلنے کیلئے کوئی اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا جبکہ انسانوں کو اختیار و ارادہ دیکر آزاد چھوڑ دیا گیا چاہے تو ان قوانین کو اپنائے اور نہ چاہے تو نہ اپنائے۔ ہم اس میں قطعاً دخل نہیں دیں گے۔ خارج سے دخل دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر وہ صاحب اختیار نہ رہا۔ لِهٰذا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ⑥ (33:62) اب خدا اپنے عالم امر کو یہ کہہ کر الگ کر دیا ہے کہ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ⑧ (36:82) یہ عالم امر میں ہماری مشیت ہے جبکہ ''اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ'' (41:40) اپنی دنیا میں

تم اپنی مشیت سے کام کرو۔ سارے دنیا کے لٹریچر میں یہ دو الفاظ کہیں نہیں ملیں گے۔ ساتھ کہا کہ عمل کی دنیا میں تو مرضی انسان کی ہے لیکن نتائج پر کنٹرول خدا کا ہے۔

اِنَّهٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۴۰﴾ (41:40) اب جس قوم کو اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ (41:40) کہا گیا تھا تو انہوں نے چند ہی دنوں میں قیصر و کسریٰ کو زمین بوس کر دیا۔

سازش:

اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴿۲۹﴾ (76:29) اب اس شَآءَ میں تو گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ انہوں نے آگے اگلی آیت میں یہ گنجائش نکالی۔ یہاں تو تھا جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرے۔ آگے ہے۔

وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (76:30) اب آگے بالکل اس کے الٹ ہو گیا۔ تم اپنی مرضی سے کچھ نہیں چاہ سکو گے۔ تم وہی چاہ سکو گے جو ہم چاہیں گے۔ اب ساتھ والی آیت میں یہ الفاظ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴿۲۹﴾ (76:29) تو اب اسے کیسے مسخ کیا جائے۔ وہ سوچتے ہوئے معنی تو لانے ہیں یہ سوچتے ہوئے کہ مجوسیوں والا ایمان کہیں چلا نہ جائے۔ تو کہا۔ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (76:30) تم خود کچھ بھی نہیں چاہ سکتے۔ تم وہی چاہ سکتے ہو جو خدا چاہے یعنی تمہارے چاہنے کے اوپر بھی کنٹرول، یعنی تمہارے اعمال پر نہیں کہ تم کچھ کر نہیں سکتے بلکہ تم کچھ چاہ ہی نہیں سکتے۔ بجز اس کے جو ہم چاہیں۔ اب ایسے خدا کے بارے میں کیا کہیں گے جو ایک سانس ہی کہے کہ ''جس کا جی چاہے تو صحیح راستہ اختیار کرے اور دوسرے ہی سانس میں کہے کہ تم کچھ چاہ نہیں سکتے۔ بجز اس کے جو ہم چاہیں۔

اس کے معنی ہیں۔ ''جو ہم چاہتے ہیں وہی تم چاہو۔'' ٹھیک ہے۔ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴿۲۹﴾ (76:29) ٹھیک ہے یہ تو تمہاری مرضی ہے کہ جس راستہ پر چلنا چاہو لیکن فائدہ اس میں ہے کہ وہ راستہ اختیار کرو جو خدا چاہتا ہے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اب سامنے دوراہا آ گیا۔ آزاد چھوڑ دیا۔ جو راستہ چاہو اختیار کر لو۔ اگر ہمارا بتایا ہوا راستہ اختیار کرو گے تو بڑے فائدے میں رہو گے۔ یہ ہے۔ صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ (2:138) خدا کے رنگ میں رنگ جانا۔

رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ؕ (5:119) مومنوں نے اپنے آپ کو خدا کے قانون سے ہم آہنگ کیا اور ہماری مشیت یا قانون ان کے نتائج ان کے عمل سے ہم آہنگ ہو گئے۔

وحی کے الفاظ اور خیالات دونوں ہی خالصتاً خدا کی طرف سے تھے اور جدید تحقیق/ وحی کے الفاظ وخیالات دونوں مُنَزَّل مِنَ اللہ تھے

یہ بقول ہمارے فلاسفر کہ وحی خدا کی طرف سے ''خیالات'' القاء ہوتا تھا اور الفاظ نبی کے ہوتے تھے یہ چیز بنیادی طور پر، فلسفے کے اعتبار سے بھی اور لسانیات کے اعتبار سے بھی غلط ہے۔ کوئی خیال پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک اس کیلئے الفاظ ساتھ نہ ہوں۔ یعنی یہ ایک مسلّمہ ہے کہ خیال بغیر الفاظ کے پیدا نہیں ہوتا لفظ بغیر خیال کے نہیں آ سکتا۔ بشرطیکہ وہ شخص پاگل یا دیوانہ نہ ہو جو صاحب ہوش ہے صاحب شعور ہے اس کیلئے لفظ اور معنی دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ''مبہم اور بے زبان احساس اپنے مقصد تک پہنچنے کیلئے تخیّل کی شکل اختیار کرتا ہے اور تخیّل اپنا لباس آپ بن کر لفظ کی صورت میں مرئی طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ تخیّل اور الفاظ دونوں احساس (Feelings) کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منطقی انداز فہم کا نقص ہے جو یہ تصوّر کرتا ہے کہ تخیّل اور لفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح اپنے لئے آپ مشکلات پیدا کر لیتے ہیں۔ (Dr. Bucke) اپنی تصنیف (شعور) ''Consciousness'' میں تصوّر اور لفظ کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں لکھتا ہے۔ ہر لفظ کیلئے ایک تصوّر ہوتا ہے اور ہر تصوّر کیلئے ایک لفظ ایک دوسرے سے الگ رہ کر، ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ کوئی نیا لفظ معرض وجود میں نہیں آ سکتا جب تک وہ کسی تصوّر کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو اور کوئی تصوّر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لیے نیا لفظ وجود میں نہ آ جائے یہ تحقیق قرآن حمید کی اس دعویٰ کی تائید کرتی ہے کہ قرآن بالفاظہٖ ہی قرآن ہے یہ جو کہا جاتا ہے کہ خیالات خدا کی طرف سے آئے تھے اور الفاظ خود نبی ﷺ کے ہوتے تھے۔ ایک غلط خیال ہے قرآن اپنے الفاظ میں قرآن ہے ان الفاظ کی جگہ اگر عربی زبان کے بھی دوسرے الفاظ رکھ دیئے جائیں اور وہ معنوی اعتبار سے بھی وہی ہوں جو قرآن کریم کہتا ہے تو بھی قرآن کا بدل نہیں ہو سکتے۔ جس طرح باپ اور بیٹا (جلالین) نے اس طرح کے مرادفات سے اس کو مذاق بنا دیا تھا اس کی زبان خود ایک معجزہ ہے۔ زبان کے معاملے میں تو عرب اتنے زیادہ متشدّد واقع ہوئے تھے کہ ذرا سی زیر زبر کی غلطی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

قرآن کو دیکھ کر خود وہ حیران ہو گئے تھے کہ ہم خود نہیں سمجھ سکتے کہ یہ اسلوب نظم ہے یا نثر۔ بلاغت اور فصاحت میں نقطہ

674

کمال تک پہنچا ہوا ہے اور اعتراف کیا کہ ہم اس اسلوب یعنی اسٹائل کے اندر کچھ لکھ نہیں سکتے۔ انہوں نے اسے ایک اعجاز قرار دیا ہے۔ بڑے بڑے عربی دان بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ چودہ سو سال میں عجیب بات ہے کہ عربی کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے۔ صرف عربوں یا مسلم دنیا میں نہیں بلکہ وہ انگلینڈ میں اتنے بڑے بڑے ماہر عربی زبان کے، جن کے لغت ہمارے ہاں مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس لغت کے بدل نہیں ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ الفاظ کے معانی کا تو ہم بتا سکتے ہیں لیکن ان الفاظ کو بولنے کے بعد جو اس کا فقرہ بنتا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا کہیں ؎ اماں تو چیزے دیگری۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتاب نیست چیزے دیگر است

قرآن کیلئے قلب کی ضرورت ہے

ءَاَعۡجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ ؕ قُلۡ هُوَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا هُدًی وَّشِفَآءٌ ؕ (41:44)

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا
لغت غریب، جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

قرآن سے استفادہ کا راز براہ راست جذبات پر اثر انگیز ہوتا ہے۔ جب تک دل گواہی نہ دے یہ لا الہ الا لغتِ غریب ہے۔ یہ جذباتیت (Emotions) کا براہ راست قلب کے اوپر اثر ہوتا ہے۔ قلب اور دل سے مراد جذبات ہوتا ہے۔ جس میں دماغ، علم، فکر، شعور اور تدّبر کا تعلق نہ ہو۔ بلکہ وہ براہ راست جذباتی چیز ہو۔ جس طرح کوئی موسیقی کا سچا سر براہ راست دل کے اوپر جا کر بجلی کی طرح گرتا ہے۔ اس میں کوئی استدلال نہیں دے سکتے۔ عقلی لحاظ سے اسے بیان نہیں کر سکتے۔ اس میں فکر انسانی کی induction یعنی نفوذ پذیری نہیں آتی۔

دوسرا طریق مذہب کے اندر ہے وہ بھی خالص جذباتی چیز ہے جو تصوّف میں کیوں کا جواب نہیں دے سکتے ؎

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

یعنی اس کا نشہ سمجھایا نہیں جا سکتا جب تک کہ خود نہ پیا جائے یعنی جو شے براہ راست قلب پر آ کر اثر انداز ہو اس کا تعلق عقل و شعور سے نہیں ہوتا یہ براہ راست دل پر، جذبات پر آ کر اور جذبات پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔

دوسرا طریق فلاسفروں کا ہے جو ہر چیز کو عقل و فکر اور تدّبر سے سمجھتے ہیں آپ ایسے فلاسفروں کو دیکھیں گے تو نظر آتا ہے کہ گویا آسمان سے بول رہے ہیں۔ مگر جب آپ ان کی زندگی میں جھانکیں گے تو ایک عجیب صورت نظر آئے گی۔ ایسے ایسے بھی تھے جن سے کہا گیا۔

یَدۡعُوۡا لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ ؕ (22:13)

ایسی چیزوں کو پکارتے ہیں جن کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ قریب ہوتا ہے یعنی کہا کہ میٹھی چیزیں نہ کھاؤ۔ شوگر کے

مریض ہو کر مرجاؤ گے۔ لیکن خود ہی وہی کچھ کرتے ہیں۔

یعنی پہلی چیز انسان کے جذبات پر بغیر جانے ہوئے اثر ہو جانا اور دوسری چیز اس سے دل کا متاثر نہ ہونا ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کے یہی معنی ہیں۔ پھر یہ قرآن کی دوسری چیز کہ اسے فکری طور پر، فلسفیانہ طور پر سمجھا جائے ؎

تیرے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

قرآن خود فکری طور پر، ذہنی طور پر (The why of it) علت۔ غرض وغایت بتاتا ہے۔

لیکن وہ اسے اس طرح سمجھنے کی آخری منزل قرار نہیں دیتا۔ اگر قرآن دماغ کے راستے سے دل تک پہنچتا ہے تو پھر اس کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ براہ راست صرف دل تک پہنچے تو یہ جذباتی چیز بن جاتا ہے۔ اگر یہ صرف ذہن تک محدود ہو کر رہ جائے۔ تو اس کا فہم وہ فلسفہ بن کر رہ جاتا ہے انسانی کیریکٹر پر نہ یہ چیز اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ وہ چیز۔ یہ انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ جو محض ذہنی طور پر سمجھی جائے۔ قرآن کا مقصود آپ کی نفسیات میں، آپ کی فکر، میں آپ کے کردار میں ایک تبدیلی پیدا کرنا ہے ؎

آنچہ حق می خواہد آں سازوترا

اس شے کیلئے ضروری ہے کہ اسے فکری طور پر سمجھا جائے۔ یہ تمام شکوک واعتراضات فکری طور پر پہلے دور ہونے چاہئیں۔ اگر وہ باقی ہیں تو وہ دل میں نہیں اتر سکتا۔ اس کے علاوہ اگر اس کی طرف آؤ گے تو وہ جذباتی چیز یعنی تصوّف ہو جائے گا۔ مگر قرآن نہیں رہے گا۔ اگر ان تمام کے بعد بھی دل پر نہیں اترا تو قرآن کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ مقصد اس وقت حاصل ہوگا جب ؎

لغتِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

دل کی گواہی دینے کے بعد قرآن نیچے اترے گا۔ آپ کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرے گا۔ آپ کے کردار اور ذہنیّت کو بدلے گا۔ براہ راست جذباتی طور پر متاثر ہونے کا تو سوال ہی نہیں آتا یہ ضروری چیز ہے کہ اسے فکری طور پر عقلی لحاظ سے سمجھا جائے اور اس کی ہر کیوں کا جواب آپ کے پاس ہونا چاہئے۔

یہ بھی آخری منزل نہیں ہے یہ سمجھنے کا پہلا درجہ ہے۔ اس کے بعد قلب میں تبدیلی پیدا کرے، یہ دونوں کا ذہن وفکر اور قلب وجذبات کا امتزاج ایمان کہلاتا ہے۔ قرآن ایمان کو ایمان نہیں مانتا جو فکری طور پر نہ لایا جائے ؎

لا دینی و لاطینی کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا لَا غَالِبَ اِلَّا هُوَ

اس کے اندر زبان کا کیا سوال ہے۔ یہ جو اس کے الفاظ محفوظ ہیں ان کا بدل نہیں ہے خواہ عربی زبان ہی میں کیوں نہ ہو۔ وحی کی آخری منزل قلب ہے۔

اگر ذہنی طور پر سمجھنے کے بعد پھر بھی طبیعت ادھر نہیں آتی تو قرآن کا مقصد پورا نہیں ہوا عرب اور عجم دونوں الفاظ دہراتے ہیں۔ حجّاز اور مصر والے آکر راگ بھیرویں پھر ان کے قاری جادو کر دیتے ہیں ہندو اس راگ سے اپنے دیوتاؤں کو جگاتے ہیں جو بڑا پرکشش ہے نہ قاری کو پتہ کہ کیا کہا جا رہا ہے اور نہ سننے والے کو۔

ءَ اَعۡجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ ؕ (41:44)۔ کیا یہ قرآن نکھری زبان میں ہے یا مبہم زبان میں۔

اصل میں بات یہ نہیں ہے چونکہ ان کی نیّت خراب ہے۔ اس لئے اس میں یہ نقص نکالتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ تو ان لوگوں کیلئے ہے جو اسے منجانب اللہ قرار دیتے ہیں اور صحیح راستے کی طرف گامزن کرنے والا ہے اور تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج ہے۔

سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ از خود قرآن پر ایمان کا اعلان:

وَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ ۚ (42:15)

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ (2:285)

یہ بڑا غور طلب ہے کہ حضور ﷺ پر ایک کتاب نازل ہو رہی ہے اس کے وحی ہونے میں کیا کوئی شبہ ہو سکتا ہے وہ بھی اس کتاب پر ایمان لانے کے بعد مومن ہوتا ہے جو کتاب کسی کی فکر کی تخلیق ہو تو اس پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جو اپنے فکر کی تخلیق نہ ہو تو اس کے متعلق تو پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا تو نے وہ کتاب پڑھی ہے؟ اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ میری اپنی کتاب کے بارے جو میں نے لکھی ہے تو کوئی نہیں پوچھے گا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ دوسرے کی کتاب کے متعلق پوچھا جا سکتا ہے کہ تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو میں کہونگا کہ بڑی غلط کتاب ہے۔

اس قرآن پر تو حضور ﷺ سے بھی کہا گیا کہ ایمان لاؤ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضور ﷺ کی کتاب نہیں تھی۔ کیونکہ یہ کسی دوسرے کی کتاب تھی۔ جو حضور ﷺ کو ملی۔ جس کو لینے کے بعد آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ میں بھی اس پر ایمان لاتا ہوں صرف ایک لفظ سے ساری حقیقت واضح ہوگئی۔

❁❁❁

رشتہ داروں سے محبّت کا غلط مفہوم

قُل لَّآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى ؕ (42:23) کوئی نبی بھی اپنی دعوت کے اجر کا طلب گار نہ تھا۔ نوحؑ سے لیکر شعیبؑ تک سب پیغمبروں نے یہی کہا۔

يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ (7:59) وَمَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۞ (26:109) اِلَّا یہاں استثنا ہے۔ یعنی پہلے جو کہا گیا ہے یہ بالکل نفی کر کے ایک نئی بات ہوتی ہے۔ اب رسول ﷺ نے بھی کوئی اجر کی بات نہیں کی۔

قُل لَّآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى ؕ (42:23) ''قُربیٰ'' کا ترجمہ: ''رشتہ داری'' ہوتا ہے نہ کہ رشتہ دار۔ ذی القربیٰ سے بھی مراد ''رشتہ داری کے تعلقات'' اس ''فی القربیٰ'' سے مراد یہ نہیں کہ ''میرے رشتہ دار'' یہاں ''میرے'' کا تو کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ یاد رکھیں کہ رسول ﷺ کو سب سے زیادہ اذیتیں آپ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں نے پہنچائی تھیں اب قریش نے وہ باہمی رشتہ داروں کے ان تعلقات کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا قرآن اس کی شہادت دیتا ہے جب حضور ﷺ ان کے ظلم وستم سے تنگ آ کر چھوٹی سی جماعت کو لے کر ہجرت کر گئے تھے یہ ان مسلمانوں کے اتنے شدید مخالف اور دشمن بن گئے تھے۔ قریش نے اپنے ان رشتہ داروں کے ساتھ یہ صورت پیدا کر دی تھی کہ قرآن نے خود کہا۔

لَا يَرۡقُبُوۡنَ فِىۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡمُعۡتَدُوۡنَ ۞ (9:10) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جو اپنے ہاں معاشرے کی انسانیّت کی حدود کو بھی پھاند گئے ہیں۔ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ (9:10) یعنی جو معاہدہ کے ذریعہ ضمانت دیتے ہیں اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور نہ رشتہ داری کے تعلقات کی پرواہ کرتے ہیں۔

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ ''میں تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا سوائے اس کے جو رشتہ داروں سے ایمان لائے ہیں۔ کم از کم قریشی خصوصیات یا معاشرہ کی جو ذمہ داریاں ایک انسان کی دوسرے انسان پر عائد ہوتی ہیں۔ ان کو تو فراموش نہ کرو۔ یا یہ جو تمہارے رشتہ دار مسلمان ہو جاتے ہیں۔ چچا، بھائی وغیرہ تو یہ قریش ان کو تکلیفیں دیتے تھے تو کہا کہ کس جرم میں تم ایسا کرتے ہو کم از کم وہ فرائض یا حقوق جو عام انسانوں کو معاشرہ میں حاصل ہوتے ہیں ان کا تو کچھ لحاظ کر لو۔

674
یہ مکہ کی ابتدائی زندگی سے وہاں یہ سارے اکٹھے رہتے تھے۔قریش نے اپنے ان عزیز رشتہ داروں کے اوپر زندگی اجیرن بنا دی تھی۔تو کہا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا کم از کم ان کو اس قدر تکلیف نہ دو۔گھروں سے نہ نکالو۔صرف معاشرتی تعلقات کا تقاضا کیا گیا ہے۔جب انہوں نے یہ رعایت نہیں مانی تو پھر آخر میں ان کو کہا گیا کہ ان سے تم بھی تعلقات منقطع کرلو۔لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب یہ سارے پا بجولاں حاضر کر دیئے گئے تو۔

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط (12:92) کوئی مواخذہ نہیں کہہ کر چھوڑ دیا گیا۔ان میں سے کوئی بھی مسلمان نہیں ہوا تھا اور تقاضا یہ تھا کہ آپس میں جو تو کافر سے معاشرتی تعلقات کو رکھ رہا ہے وہ تعلقات تو کم از کم رہنے دو۔

پھر سازش کے ذریعہ یہ رشتہ دار سمٹ کر پھر آل محمد ﷺ اور اہل بیت کے جھوٹ گھڑ لئے گئے پھر یہ چیزیں کیسے پیدا کر کے پھیلائی گئیں۔تاریخ کا ایک حصّہ ہے۔

❁❁❁

کشمکشِ حق و باطل میں غلبۂ حق کی شرط
یعنی قوانینِ خداوندی کی رو سے

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ط (42:24)

حق اور باطل کی کشمکش۔ اس دنیا میں جاری رہتی ہے باطل مٹ جاتا ہے اور حق غالب آ جاتا ہے، قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے بِكَلِمٰتِهٖ ط (42:24) ''یعنی قوانین خداوندی کی رو سے ہو'' یہ حق اور باطل کی کشمکش دوسرے مقام پر بھی آ گئی ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ط (21:18) ہم باطل کے سر پر حق سے ضربیں لگاتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ یہ حق اس باطل کا بھیجہ توڑ دیتا ہے۔ اس کا دماغ توڑ دیتا ہے۔ پھر وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے یہ وہ عظیم حقیقت ہے جو چودہ سو سال پیشتر صرف قرآن ہی کہہ سکتا تھا۔ یہ تمام نظام جو قائم ہو رہے ہیں غلط یا صحیح ان کی بنیاد یہ کلیہ ہے۔ ساری Evolution اس پر مبنی ہے اور قدرتی انتخاب Natural Selection جاری ہے۔ زندگی کا اوّلین جرثومہ کن کن مراحل میں سے گزرا۔ تخریبی اور تعمیری قوّتیں آپس میں باہمد گر کشمکش کے اندر رہیں۔ یہ ''Species'' جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی تو ان تخریبی قوّتوں کا مقابلہ کرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ اگر ان میں یہ قوّت نہیں تھی تو وہ نوع وہیں ختم ہو گئی۔ متحجّر ہو گئیں۔ آج کھدائیوں سے برفوں کے نیچے سے، چٹانوں کے نیچے دبے ہوئے کروڑوں، لاکھوں سال پہلے کے جانوروں کے ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آتے ہیں کہ کس طرح سے زندگی ایک مقام پر جامد ہو کر رک گئی۔ تخریبی قوّتوں کا مقابلہ نہ کر سکی اور جو نوع آگے بڑھ سکی۔ تو گویا اس میں صلاحیت تھی۔ یہ تھا ''حق'' جو آگے بڑھا ہے باطل کی تخریبی قوّتیں مغلوب ہو گئیں یہ سلسلہ کروڑوں سال تک جاری رہا اور ساری کائنات میں زندگی میں یہ ٹکراؤ جاری ہے۔ زندگی جس شکل میں بھی ہے اس کی پوری داستان اسی ٹکراؤ کی داستان ہے اور یہ حق سے مراد تعمیری قوّتیں لیتے ہیں اور حق کے بھی یہی معنی ہیں۔

اور ان کی تحقیق کا بھی ماحصل یہ ہے حق یعنی تعمیری قوّتیں جو ٹکراؤ میں غالب آتی ہیں۔ جو تخریبی قوّتیں باطل ہے وہ مغلوب

ہوجاتا ہے اور زندگی اپنے ارتقائی منازل میں ایک قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔

یہ جو قرآن نے کہا تھا: وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ (42:24) یہ کوئی نظری سی چیز نہیں ہے۔ہم نے سمجھا کہ ہم حق پر ہیں اور ہندو باطل پر ہیں بس وہ تو مٹ جائینگے اور ہم غالب آئینگے۔ ایسا قطعاً نہیں ہے یہ ایک عظیم حقیقت ہے جو کارگاہِ کائنات کی زندگی کی پوری کشمکش ہے۔

ہیگل Dialectic:

ڈارون (1809-1867) نے تو صرف طبعی طور پر زندگی کے متعلق یہ تحقیق کی اور آگے بڑھے۔ ہیگل (1730-1831) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کشمکش تصوّرات کی کشمکش جاری ہے۔ یعنی تعمیری اور تخریبی تصوّر میں ایک ٹکراؤ جاری ہے۔ اسے ''Dialectic'' کہا ہے اس میں تخریبی نظریہ حیات کو شکست ہوتی ہے اور تعمیری نظریہ غالب آکر زیادہ نکھر کر صاف وشفاف ہوکر آگے بڑھتا ہے۔ اس کی تحقیق ''سائنس آف ہسٹری'' پر ہے اس کی کتابیں۔

1- Encychlopedia, 2- Phillosophical Sciences, 3- Phillosophy of Right

یعنی اس سائنس آف ہسٹری کے تحت چیزیں ایک سسٹم یعنی نظم سے آگے بڑھتی ہیں۔ اس نے Ideas یعنی تصوّرات کی بات کی تھی۔ ہیگل کا شاگرد کارل مارکس (1818-1883) اس نے کہا کہ یہ ٹکراؤ محض تصوّرات میں نہیں ہوتا بلکہ یہ نظام زندگی (System of Living) میں ہوتا ہے اس میں جو نظام انسانوں کیلئے نافع ہے وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ قرآن نے ''مَا يَنْفَعُ النَّاسَ'' کہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ قرآن کی آیات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ ان کے سامنے قرآن نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ الفاظ بھی نہ ہوں لیکن وہ حقائق تو کائنات کی فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ جو ساری نوع کیلئے ینفع ہے اس کو بقا ہوگی۔ یعنی ہیگل سے ایک قدم آگے بڑھا وہ شخص تصوّرات کو نہیں بلکہ مخصوص نظام زندگی سامنے لایا۔ وہ تصوّرات کے ساتھ نظام کو بھی لیتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر نظام کسی نہ کسی تصوّر پر قائم ہے۔ یعنی کلمات پر ہوتا ہے جب قرآن چند بنیادی نظریات کی صداقت کو ایمان سے تعبیر کرتا ہے۔

قرآن نے Ideas یعنی تصوّرات اور نظام دونوں کا امتزاج پہلے دن سے پیش کیا جبکہ ہیگل صرف تصوّرات کو لے کر چلا۔ کارل مارکس نے نظام کو لیا۔ ہیگل کا فلسفہ کچھ دیر چلنے کے بعد وہیں جامد ہوکر ختم ہوگیا۔ کارل مارکس بھی آگے نہ چل سکا۔ کیونکہ ہیگل کے ''تصورات'' نظام کے بغیر تھے اور کارل مارکس کا یہ نظام تصوّرات کے بغیر تھا۔ قرآن نے جو نظام دیا وہ تصوّرات پر مبنی تھا۔ جو غیر متبدّل اور ابدی تصوّرات تھے۔ یہاں بِكَلِمٰتِهٖ ؕ (42:24) کا اضافہ ہے۔ یعنی حق کا یہ نظام جو خدا کی کلمات یا نظریات پر قائم ہوتا ہے۔

دوسری جگہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) یہ وہی کلمات یعنی نظریات۔ (Ideas) کی بات ہے۔

ابن مسکویہ نے اسے ''سَفَرًا'' کہا ہے۔اب ان کی جو تحقیقات ہیں اس سلسلہ ارتقاء کی دو شکلیں سامنے آتی ہیں۔ایک تو یہ Natural Evoluation یعنی کڑی در کڑی اور مسلسل اس طرح سے زندگی ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچنے میں لاکھوں کروڑوں سال لگ جاتے ہیں۔جس طرح قرآن نے خدا کا ایک دن ہزار ہزار، پچاس پچاس ہزار سال کہا ہے۔یہ دن یہی منازل کے ٹکڑے ہیں۔جس میں زندگی نیچری ارتقاء کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔دوسرا طریق فجائی ارتقا ہے۔جو ان کی تحقیق کی گرفت میں نہیں آئی۔ایسا نظر آتا ہے کہ ایک نوع درمیان کی کئی کڑیاں پھاند کر جو مسافت پچاس ہزار سال میں طے کرنی تھی۔وہ چند دنوں میں طے کر کے آگے جا پہنچتی ہے۔حکیم ابن مسکویہ (421ھ) میں ''الفوز الاصغر'' میں اس نظریہ پر خصوصی بحث کی ہے۔فارابی، ابن سینا، ابن ماجہ نے بھی اس نظریہ پر روشنی ڈالی ہے۔ابن مسکویہ اسے ''سَفَرًا''کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں یعنی ''مسافت'' جو ہزاروں سال کی چند دنوں میں طے پا جاتی ہے۔

قرآن کے نزدیک یہ حق و باطل کا معرکہ اگر اسے علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو یہ کائناتی قوتیں، زندگی کے تقاضے، پھر ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔یہ وائٹ ہیڈ کی تصنیف ہے''Adventures of Ideas'' کہ تصوّرات کس طرح سے از خود سفر کرتے رہتے ہیں۔عقل انسانی Trial and Error ایک پروگرام تجویز کرتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ناکامی کی صورت میں چھوڑ دیتی ہے اور پھر دوسرا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔پھر نقصانات اٹھا کر ہڈیاں تڑوا کر۔

يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (2:30) آخر لاامر حقیقت پر پہنچ جاتی ہے۔لیکن یہ لمبا عرصہ لیکر عقل کا سعی و خطا کا عمل ہے۔ارتقاء کے سلسلے میں میدان جنگ بدر کی مثال ایک زندہ شہادت ہے کہ ایک جماعت ابدی اصولوں کی روشنی میں ایک نظام کیلئے جب اٹھتی ہے تو وہ سالوں کی مسافت دنوں میں طے کر لیتی ہے۔اگر کوئی جماعت یہی حق پر مبنی نظریہ لیکر اٹھ کھڑی ہو۔تو اس کے دست و بازو کی قوت سے یہی فارمولا سینکڑوں سالوں کی مسافت دنوں میں طے کرلے گا۔یہ ہے فجائی ارتقاء۔دین تو نوحؑ سے شروع ہوا۔تو رسول ﷺ نے ایک جماعت تیار کی اور اس جماعت سے پہلے یہی کائناتی قوتیں غیر محسوس طور پر کرتی چلی جا رہی تھیں۔یہ تھا Emergent Evoluation جو مدینہ میں ہوا۔کچھ عرصہ بعد یہ جماعت نہ رہی اور سطح بین نگاہوں نے دیکھا کہ اسلام تو ختم ہو گیا۔حالانکہ حقیقت میں یہ ختم نہیں ہو گیا۔بلکہ فجائی ارتقاء وہ فطری ارتقاء میں بدل گئی۔مغرب کے ایسے محقق بھی ہیں جنہوں نے تاریخی تحقیقات کیں اور کہا کہ انسان غیر محسوس طور پر انہی راستوں کی طرف آ رہا ہے جو اسلام نے چودہ صدیاں پیشتر دیئے تھے۔یہ قرآنی تصوّرات جو نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔لیکن وہ زمانے کے تقاضوں یا کائناتی قوتوں کی رو سے غیر محسوس طور پر آگے چلتے چلے آ رہے ہیں۔حق غالب آتا جا رہا ہے اور باطل مغلوب ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویٰ ﷺ سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

سکوتِ شام سے تا نغمہ سحر گاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی
کشاکش زم وگرماتب وتراش وخراش — زہ خاک ِتیرہ دروں تابہ شیشہ حلبی
مقام بست وشکست وفشار وسوز وکشید — میان قطرۂ نیسان و آتش عنبی
اس کشمکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملت عربی

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ط (42:24) ہوگا یہی زود ہو یا بدیر ہو۔

باطل کی تکنیک:

Erick Fromm (1900-1980) کہتا ہے کہ باطل کبھی بے نقاب ہوکر سامنے نہیں آتا اس کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کا نقاب اوڑھ لیتا ہے۔ اگر وہ بے نقاب ہوکر کرے گا تو کامیاب رہ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح سے اس جماعت کے بعد مذہب جو باطل ہوتا ہے یہ دین کے نقاب میں آتا ہے۔ اس کی حقیقت باطل ہوتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ عام ہوکر معاشرے کا چلن بن جاتا ہے اور معاشرہ اسی کو حق سمجھنے لگ جاتا ہے اور قرآن نے وہ تمام حربے جو یہ باطل اپنے نظریات کے پھیلانے میں کرتا ہے، دیئے ہوئے ہیں۔ ابلیس نے کہا۔

لَاَحْتَنِكَنَّ (17:62) وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (17:64)

لیکن جب فطری طریقہ سے یہ ارتقاء آ رہا ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا وہ ہوکر رہے گا۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ (9:33) اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط (35:10) اس نظریہ میں خوداتنی قوت ہے کہ زورِ دوروں سے اوپر کو اٹھے لیکن اگر انسانوں کے اعمال صالحہ اس کے ساتھ ہوجائیں تو صعود پھر ترفع میں بدل کر وہ لمبا سفر دنوں میں طے کر لیتا ہے۔ یہ سست روی سے حق کا غلبہ محسوس نہیں ہوتا جس طرح گھڑی میں سکینڈ کی سوئی تو دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر سکینڈ اور منٹوں کی سوئیاں نہ ہوں۔

پھر اس گھڑی کے متعلق محسوس بھی نہیں کر سکتے کہ چل رہی ہے۔ یہ ہے حق کی باطل پر آنے کی کائناتی ارتقاء۔ دنیا آہستہ آہستہ اس طرف آ رہی ہے۔ اگر لمبے عرصے پر پھیلے ہوئے واقعات کو ذرا سمٹا کر (مرتکز) کر کے دیکھا جائے۔ تو پھر معلوم ہوگا کہ واقعی یہ باطل کی چیزیں کس طرح حق کے تابع چلی آتی رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان کا ارتقاء تو ختم ہوگیا۔ ان کو نظر نہ آئے تو اس کا کیا علاج ہے؟ غار میں بسنے والا انسان اور آج کا آسٹریلیا اور افریقہ کا جنگلوں میں رہنے والا انسان اس غار والے انسان کی طرح ایک ہی مقام پر کھڑا ہے اور آج چاند پہ جانے والوں کو بھی دیکھئے۔ کیا ذہنی اعتبار سے یہ دونوں ایک ہی نوع کے فرد ہیں۔ اب ارتقاء اس طرح شروع ہوا ہے لیکن یہ اتنا غیر محسوس ہے اگر شکلیں بدلتیں تو ان کا تو پتہ چلتا کہ کل اس شخص کا اس قسم کا حلیہ تھا اور آج اس کا چہرہ

یوں ہو گیا۔ یہ انسانوں کے اندر کا ارتقاء محسوس نہیں ہوتا۔ یہ سلسلہ گھنٹوں کی سوئی کی طرح چل رہا ہے۔ یہ بڑے سے بڑا دیدہ ور بھی نہیں بتا سکتا کہ تاریخ کے فلاں دور میں ایک ایسی لائن آتی ہے۔ جس میں پچھلا انسان اور اگلا انسان متمیز ہو کر آجاتا ہے۔ اس طرح دین کو مذہب کا لبادہ جب پہنایا گیا ہے تو وہ بڑا ہی غیر محسوس طور پر ہوا اس لئے یہ تمام مسلمانوں کے عقائد جو اصلی اور حقیقی عقائد کے خلاف ہیں۔ یہ کس طرح سے عام ہوئے۔ بڑی مشکل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ لوگ اس مقام پر بھی حیران تھے کہ وہ کونسا معیار ہے جس سے حق اور باطل کا فرق کیا جا سکتا ہے، قرآن نے اس کا حل دیا ہے۔ قرآن نے حق پر مبنی نظریات دیدیئے۔ وہ کہتا ہے کہ اب انسان کو اس مخمصے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ عقلی تاریخی اور فلسفی انداز پر تحقیق کرے اس میں مغالطہ لگ جائے گا۔ کہا کہ ان اصولوں کو سامنے رکھ کر تاریخ کا مطالعہ کریں جہاں کوئی نظریہ، کوئی قوم آہستہ آہستہ روبہ زوال ہو کر فنا ہو گئی۔ وہ ان ابدی حقائق کے خلاف گئی تھی اور جہاں کسی قوم کو فروغ ملا ہے۔ اس قوم کا نام کچھ بھی ہو۔ تو اس کا مطالعہ کریں۔ تو نظر آجائے گا کہ انہوں نے اپنے بنیادی تصوّرات میں تبدیلی کی تھی۔ پچھلے تصوّرات کو چھوڑ کر نئے تصوّرات اختیار کئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اسے زمانہ کا تقاضا کہا تو وہ وہی ہونگے جو قرآن نے دیئے ہیں یا ان سے ملتے جلتے ہونگے۔

The Making of humanty میں دراصل History of Civilization ہے۔ جب بھی کوئی تہذیب زوال پہ آئی۔ فنا ہوئی تو وہ یہ تھی کہ جس نے یہ اقدار چھوڑ دیئے تھے۔ اس کے برعکس جو تہذیب آگے بڑھی تو انہوں نے ان قرآنی اقدار پر عمل کیا گو کہ وہ اس کا حوالہ اور سند نہیں دیتے وہ اس طرف اس لئے نہیں آتے کہ ان کے سامنے مسلمانوں کی تاریخ غلط ہے اور وہ اسلام کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ یہ تو تمام ساری عباسیوں کی سرکردگی میں مرتب ہوئی ہے جس کا اسلام سے ذرا بھر کوئی تعلق نہیں تھا۔

دنیائے انسانیّت میں ایک عالمگیر انقلاب

ایک عالمگیر انقلاب:

قرآن ایک پیغام آفریں کتاب ہے جو انقلابات آخری پاروں میں پیش کئے گئے ہیں۔ وہ قریباً تین قسموں کے ہیں ایک وہ جو خارجی کائنات میں واقع ہوگا۔ جس میں کرے آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیگی۔ سورج اور چاند مدھم اور ستارے جھڑ جائیں گے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ انقلاب کس قسم کا ہوگا یہ مغرب کے سائنسدان وہ آہستہ آہستہ اس طرف آ رہے ہیں۔ ان کا یہ اندازہ ہے کہ اگر حرارت میں کچھ زیادہ فرق آیا۔ تو کشش ثقل جس کی وجہ سے یہ کرے آپس میں معلق ہیں اگر اس کشش ثقل میں کروڑویں حصّہ کا بھی فرق آیا تو ٹکرا کے پاش پاش ہو جائینگے۔ لیکن ہم اس پر کیوں سر کھپائیں کیونکہ اس وقت تو ہم ہونگے بھی نہیں اور اگر ہوئے تو ایک ٹکڑا آ کر سب کچھ بھسم کر رکھ دے گا اور نہ ہی قرآن کا مقصود ان چیزوں کی طرف توجہ دلانا ہے بلکہ وہ تو ایک نصیحت ہے۔

قرآن دوسرا انقلاب عالمگیر قسم کا بتا رہا ہے۔ یہ انسانیّت کے اندر ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوگا اور انسانیّت قرآنی نظام پر آ جائے گا۔ اور تیسرا انقلاب جو مرنے کے بعد آئے گا۔ جسے ہمارے ہاں قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

❁❁❁

حروف ابجد کے سلسلے میں حرف ''ن'' کی توجیہات

حرف ''ن'' کی توجیہات:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿١﴾ (68:1) دوات اور قلم اور جو کچھ تم ان سے لکھتے ہو یعنی علم کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ شہادت دینگے کہ (جس کو تم دیوانہ مجنوں کہتے ہو کیا وہ اس قسم کی عظیم تعلیمات دے سکتا ہے؟)

یہ حروف ابجد کے متعلق (اب پ...... ن) کے متعلق دو تین توجیہات آئی ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ حروف ابجد یعنی (Alphabits) (اب پ......) اس شکل میں نہیں ہوتے تھے۔ یہ تصویروں کی شکل میں لکھے جاتے تھے اور اس زمانے میں ''ن'' کی شکل ایک پتلی سی لمبی مچھلی کی طرح ہوتی تھی۔ تو اسے عربی زبان میں مچھلی کے معنوں میں لیا جانے لگا۔ جیسے یونسؑ کو ذوالنون کہا گیا ہے پھر آگے چل کر انہوں نے اس کے معنی اجمالی علوم کیلئے جن میں تفاسیر نہ ہوں، علامات یا تورات کی رو سے خود علم کے معنوں میں لینے لگ گئے۔ تو اس علم کو پھر قلم سے ملایا تو اس کے معنی (ink) یعنی روشنائی کر دیئے گئے۔ تو پھر قلم اور دوات لئے جانے لگے۔ تو اس کے بعد پہلی لمبی سی باریک شکل کو یعنی ''ن'' کو تلوار کے معنوں میں استعمال کرنے لگ گئے۔ اب تدبّر فی القرآن سے یہ طے کیا جا سکتا ہے۔ عربی میں ایک لفظ کے متعدد معنی ہیں۔ لیکن وہ اس لفظ کے مترادفات نہیں ہوتے کہ ایک کی جگہ دوسرا لفظ لے لیا جائے تو معنی بالکل وہی ہوں یہ فارسی والوں نے شاعری میں یہ انداز اختیار کیا تھا کہ شہد بھی ہے انگبین بھی ہے کیونکہ شعر کی نسبت سے مختلف الفاظ چاہئیں۔ عربی میں ایک ایک چیز کیلئے سینکڑوں الفاظ ہیں۔ لیکن انکے معانی میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی لفظ بعینہٖ انہی معنی میں دوسری جگہ استعمال نہیں ہوتا۔ یہ مترادفات کہلاتے ہیں۔ تو ان میں تدبّر کر کے یا تصریف آیات سے کام لیکر قرآن نے اس کے معنی خود متعین کر دیئے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہوگا کہ کونسے معنی وہاں Fit (لاگو) ہوتے ہیں۔ ایک تو لفظی معنی کی سند ہونی چاہئے۔ جو لغت سے طے ہوگا اور جو معنی قرآن نے منتخب کئے ہیں تو یہ سند قرآن کے اس مقام پر ہونی چاہئے۔ یعنی دو سندیں ایک تو لغت اور قرآن کی دوسری آیات سے اس کے معنی تو پھر یہ دو چیزیں تدبّر یا اجتہاد کہلائے گا۔ چونکہ تدبّر کی نئی نئی راہیں کھلتی رہتی ہیں۔ کسی اور مقام پر اس نے دیکھا کہ یہ دوسرے معنی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں تو وہ اسے اختیار کر سکتا ہے۔ اسے اختلاف نہیں کیا جائے گا اور تیسری چیز کہ قرآن کی

من حیث الکل تعلیم کے خلاف نہ ہو۔یعنی قرآن کا کلی اصول کے جہالت کی کہیں بھی تعریف نہیں کی جائے گی۔ یہ تینوں چیزیں تدّبر فی القرآن کہلائی گی۔اب چونکہ مَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ (68:1) تحریر کی بات ہے۔تو اگر ''ن'' کے معنی روشنائی (Ink) لیتا ہے تو چونکہ یہ قلم کے ساتھ ہے تو اس اعتبار سے یہ ٹھیک ہونگے۔اب اگر کوئی اس کے دوسرے معنی یعنی ''تلوار'' لیتا ہے تو اس کی تائید قرآن سے ہی ہوگی۔

قلم کی اہمیّت:

ایک تو عام تحریر کی جو خصوصیّت قلم کے ذریعہ علم کی دنیا میں عطا کردی اور وحی اسے نہ تو قوّت گویائی کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی تحریر بلکہ وہ تو ایک حصّہ بھی پھر جو قلب نبوی ﷺ پر نازل کی گئی تھی۔یعنی یہ وحی بمعہ الفاظ یعنی عبارت بھی خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ پہلے تو حضور ﷺ نے اسے لوگوں تک گویائی کے ذریعے پہنچایا۔ پھر صحابہؓ نے اسے یاد کیا۔اب قلم سے اس کو تحریر میں بھی لایا گیا قرآن نے ان کا تعین وحی کو معزز قابل اعتبار اور دیانتدار قرار دیا ہے۔تو قلم سے مراد اگر تحریر لیا جائے تو اس سے تائید ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ کے قلب پر جو الفاظ القاء ہوتے تھے۔تو صحابہ کرامؓ ان کو دہرانے کے بعد لکھ لیا کرتے تھے۔تو ''ن'' کو روشنائی بعد قلم کو تحریر تو پھر مَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ (68:1) کے ساتھ یہ تینوں چیزیں آجاتی ہیں۔

اب ''ن'' ''تلوار اور اس کی عظمت اور اہمیّت تو قرآن کے ایک ایک صفحہ سے واضح ہے۔ جسے جہاد یا قتال کہا جاتا ہے۔ جہاد تو ساری زندگی جدوجہد میں گزارنا جہاد ہے جبکہ اس کی آخری منزل جو میدان جنگ میں ہے اسے قتال کہا گیا ہے۔ جسے عام معنوں میں جنگ یا War کہا جاتا ہے۔

قرآن کی پہلی شرط دلائل و براہین ہیں اور اس کیلئے ضابطہ قوانین دیا گیا تا کہ لوگوں کے معاملات عدل وانصاف کے ساتھ کئے جائیں۔

اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ ۚ (6:135) عمل کا نتیجہ خود سچائی واضح کردے گا تلوار کا استعمال صرف منفعت انسانی کیلئے ہوگا یعنی ظالم کے ہاتھ کو روکنے کیلئے اور اپنی مدافعت کرنے کیلئے۔

وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25) اس کا مقصد صرف نوع انسان کی منفعت کیلئے ہے اب یہ تمام جنگیں مدافعت کیلئے تھیں ؎

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہودیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق
مومناں راتیغ با قرآن بس است ایں دو قوّت حافظ یک دیگراند

زندگی کی ساری کائنات ان دو قوّتوں یعنی صداقت ابدی کی حفاظت کیلئے تلوار کی قوّت نہایت ضروری ہے۔ بشرطیکہ وہ قرآن کے حصار کے اندر ہو۔ساتھ اگر یہ معنی بھی لئے جائیں ''ن'' کے تو پھر قرآن اور لغات عربی اس کی تائید کرتے ہیں۔تینوں اسناد کا ہونا ضروری ہے۔لغات کی سند، قرآن کے دوسرے مقامات کی سند اور تیسری سند قرآن کی کلی تعلیم کی ہے نہ یہ کہ فلاں

674

محدث، فلاح مفسر، فلاں امام اور عالم نے یہ لکھا ہے۔ یہ سند نہیں ہے بلکہ سند وہ جو قرآن نے خود بتائی ہو۔ انسانی علم کو چونکہ وقت کے ساتھ ساتھ مقیّد نہیں کیا جا سکتا تو کسی ایک دور کا تدّبر بھی حرف آخر نہیں ہوتا۔ ہر ایک کو تدّبر کا حق ہے ان اسناد کے ساتھ۔ علم تو بڑھ رہا ہے قرآن کے محکمات تو اپنی جگہ چٹان کی طرح مضبوط ہیں۔ جو محور ہے ہر چیز اس کے گرد گھوم رہی ہے اور تدبر و تفکّر ان کے گرد گھومتا رہے۔ تو پھر تدّبر کی راہیں علم کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائینگی۔ انفس و آفاق سے پردے بے نقاب ہو کر قرآن کے ان فرمودات کو صداقت سے ہمکنار کر دے گا۔ اس صدی میں اتنی تبدیلیاں اور تغیرّات ہوئے ہیں۔ دور بڑا تیز ہو گیا ہے اور انسانی علم کی ترقی کی رفتار بھی تیز تر ہو گئی ہے۔ تو اس اعتبار سے قرآن کے مفاہیم بھی، میں نئے نئے انکشافات ہوتے رہیں گے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے اس طرح کے معنی کے ساتھ یہ سند موجود ہے کسی دوسرے کا سمجھا ہوا قرآن، کسی دوسرے کیلئے سند نہیں ہو سکتا۔

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ﴿٣﴾ (68:3) اے رسول ﷺ! تیری کوششوں کا صلہ ایسا ہوگا جو کبھی ختم نہ ہو بشرطیکہ محنت شامل ہو اور واقعی یہ تمام مفادات قیامت تک برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ غیر منقطع نہیں ہونگے۔ بلکہ ہمیشہ ہمیشہ ثمر بار ہونگے۔ یہ قرآن کی صداقتیں تو مسلمانوں میں موجود ہی نہیں ہیں۔ ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٢٧﴾ (81:27) یہ کچھ اصول اور صداقتیں دی ہیں۔

یہ تمام اقوام یورپ اس وقت اس عذاب سے نکلنے کیلئے جو نظام مانگ رہے ہیں جو ہو بہو قرآن ہے۔ وہ تڑپ رہے ہیں۔ ان کو کوئی قرآن دینے والا نہیں ہے۔ ان میں تڑپ اور اضطراب ہے۔ انہوں نے سارے اصول دستاویز بنائے۔ ان میں سے ایک سے ایک فیل ہوتا چلا گیا ہے جب ان کی نگاہ اس ناکامی پر گئی تو معلوم ہوا کہ یہ فعل تو قرآن کے خلاف تھا۔ یہ باشعور لوگ ہیں۔ ہماری نئی نسل اس پروپیگنڈے کا شکار ہوتی ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ مغرب کے سارے دانشور جس زندگی کی تلاش میں ہیں۔ وہ تو سارا قرآن ہے چلے ہوئے کارتوس کی تو یہ صورت نہیں ہوتی۔ اصلی میں ہمارا جرم یہ ہے کہ ہمارے ہاں کہیں بھی قرآن نہیں ہے۔

وہ امانت تو ساری نوع کیلئے ہے انسانیّت تو اس سے انکار اور تکذیب نہیں کر رہی ہے وہ اس کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے یہ ہے صداقت اور کوئی صداقت ہے ہی نہیں۔ یہ چیز غیر ممنون ہے۔ یعنی احسان کے طور پر اس کا اجر نہیں ملتا بلکہ اس پر عمل پیرا ہو کر اس کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ممنون تو بلا مزدو معاوضہ مل جانے کو کہا جاتا ہے۔

تخلیقی مدارج اور Missing Link

انسانی زندگی ارتقا کرتی ہوئی بن مانس تک آئی تو اس کے بعد چپانزی تک آ گئے۔ اس کے بعد انسانی پیکر۔ یعنی ایک گم شدہ کڑی جو ابھی تک سامنے نہیں آئی اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ان Fossils کے جوڑ کر گمشدہ کڑی کی تلاش میں ہیں۔ قرآن نے اسے ''جن یا جان'' سے تعبیر کیا ہے۔ وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۶﴾ وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ﴿۲۷﴾ (15:26-27) یعنی انسان کو ابتداء طین لازب۔ سیاہ کیچڑ جو سوکھ کر کھنکھنانے لگتا ہے۔

''جن'' آگ سے تخلیق کیے گئے:

جن جو ایک گمشدہ کڑی ہے۔ سائنس کے انکشافات کے مطابق یہ کرہ ارض بھی کبھی آتشیں گولہ ہوتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اوپر کا حصّہ ٹھنڈا ہوا جبکہ اس کے اندر ابھی تک وہی پگھلی ہوئی دھاتیں جو گا ہے گا ہے آتش فشاں پہاڑ کی شکل میں نکلتی ہیں۔ جب یہ اوپر کا حصّہ بہت گرم تھا تو اس وقت ایسی مخلوق آباد تھی جو اس قسم کے درجہ حرارت کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی تھی گویا یہ اس سے پہلے کی زندگی کی ایک کڑی تھی۔ جو اب انسانی نگاہوں سے اوجھل ہے اور یہی وہ ''جن'' ہے جسے قرآن نے کہا تھا کہ آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن اب وہ موجود نہیں ہے۔ نگاہوں سے اوجھل ہے غالباً یہ وہی Missing Link ہے جس کو تلاش کیا جا رہا ہے۔

مک مکا سے قرآن نے منع کیا ہے

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝٨ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝٩ (68:8-9) یہ خطرناک قسم کے اور بڑے چھوٹے لوگ ہوتے ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ تھوڑا تم اپنے حق سے ہٹو اور پھر ہم ہٹیں۔ اس طرح سے باطل پر آ کے مصالحت ہوجائے۔

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ جو دعوت لے کر آئے ہیں انتہائی درجہ کے پست ذہنیّت اور Characterless لوگ ہوتے ہیں۔ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝١٠ (68:10) پست ذہنیّت کا، ہر بات پر جھوٹی قسمیں اٹھانے والا، ان کا نمائندہ۔ بار بار قسمیں کھا کر اپنے جھوٹ کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ هَمَّازٍ (68:11) کچوکے مارنے والا، کمینی حرکتوں سے جماعت میں تفریق پیدا کرنے والا۔ اسے ہر جگہ نقص ہی نقص نظر آتا ہے۔ گندگی اور غلاظت کو مکھی کی طرح پسند کرنے والا ہر ایک کے عیب کی تلاش کرنے والا۔ نکتہ چینی کرنے والا۔

مَّشَّآءٍ (68:11) ہر وقت چلتا پھرتا رہنے والے۔ لگائی بجھائی کرنے والا۔ پروپیگنڈہ کرنے والا۔

بِنَمِيْمٍ ۝١١ (68:11) اپنی باتوں میں جھوٹ ملا کر برانگیخت کرنے والا۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (68:12) بھلائی کے کاموں میں شدید ترین روڑے اٹکانے والا۔

مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝١٢ (68:12) مُعْتَدٍ یعنی برائی کے کاموں میں تو سب سے آگے۔ حدودوں کو پار کرنے والا۔ زَنِيْمٍ (68:13)۔ اور نیکی کے کاموں میں سب سے پیچھے رہنے والا۔

عُتُلٍّ (68:13) ایسا جھگڑالو، تشدد، سخت گیر، سب کچھ ہڑپ کرنے والا۔

بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝١٣ (68:13) یونہی کسی کے ساتھ چپکا ہوا۔ شادابی اور خوشحالی سے محروم۔ دوسروں کا خون پینے والا۔

''قَدْقَامَتِ الصَّلٰوۃُ'' کے بعد انقلابِ معکوس

آخری دو پاروں میں اس انقلابی پروگرام کا ذکر ہے جو نرم خرامی سے چلا آ رہا تھا۔ اب اس میں سرعت آ گئی۔ پروگرام تو ایک ہی تھا مگر مکی زندگی میں یہ تیاریاں سست رفتاری سے تھیں۔ یہ پروگرام تناسب اور صحیح تناسب سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آخری دن تک اس پروگرام کی آخری منزل رسول ﷺ کو بتا دی گئی تھی۔ تاریخ میں غلطی سے یہ چیزیں مٹانا بھول گئے۔ (یہ سازشی) جب قوم سے پہلے ہی خطاب میں کہا کہ میں عرب وعجم کی ان مملکتوں کو الٹنے کیلئے ایک پیغام لے کر اٹھا ہوں۔ مجھے کچھ رفقاء کی ضرورت ہے۔ بتاؤ! تم میں سے کون میرا ساتھ دے گا۔ قریش نے اس کی شدید مخالفت کی۔ سات سال کے عرصہ میں 82 جنگیں لڑیں گئیں۔ تا آنکہ مکہ فتح ہو گیا۔ وہ اتنی مخالفت کیوں کر رہے تھے؟ کہ آپ ﷺ نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ نماز پڑھنے والے تو خود حنیف کے نام سے ان عربوں میں موجود تھے ؎

دو گیتی را صلا از قرأتِ اوست   مسلمان لایموت از رکعتِ اوست
نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز   قیامت ہا در قدقامت اوست

''حنیف'' کے نام سے ان عربوں میں پہلے سے موجود تھے۔ جن کا دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ بت پرست نہیں تھے۔ بلکہ وہ اپنے زعم کے مطابق خدا کی عبادت کرتے تھے۔ جیسے ہم کرتے ہیں۔ ان میں بھی حضور ﷺ کی مخالفت کرنے والے تھے۔ لیکن یہ عرب ان کو تو کچھ نہیں کہتے تھے۔ یہ لوگ میدان جنگ میں گئے۔ اس قدر خونریزیاں کیں تو اس کی کیا وجہ تھی؟ اس قدر شدید مخالفت پر آپ ﷺ مدنیہ تشریف لے گئے۔ یہ مکہ سے اٹھ کر مدینہ لشکروں کے ساتھ آخر وقت تک حملہ آور ہوتے رہے ان کو پتہ تھا کہ اگر کسی جگہ بھی یہ نظام قائم ہو گیا۔ تو آس پاس کوئی بھی باطل نظام پنپ نہیں سکتا۔ مدنی زندگی میں انہوں نے زندگی اجیرن بنا رکھی تھی قریش کی اتنی قوّت اور ساز و سامان جبکہ یہ قلیل التعداد، نہ سامان نہ ہتھیار۔ مدینہ میں مہاجر کی حیثیت۔ دوسرے سال ہی ان پر ہجوم کر کے حملہ کر دیا۔

ان حالات میں بھی قیصر و کسریٰ کو خطوط لکھے جا رہے ہیں کہ اپنے مزدوروں اور کسانوں پر ظلم بند کرو۔ ورنہ تم سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔ یہ ہے انقلاب محمدی ﷺ اور یقینِ محکم۔ صدیوں سے قیصر و کسریٰ ہی دو طاقتیں تھیں اور جو کچھ کہا گیا اس کو کر کے دکھا دیا۔ ان کا نظام الٹ کے رکھ دیا۔ یہ تھی ''قَدْقَامَتِ الصَّلٰوۃُ''

؎ قیامت ہا در قد قامت اوست

نہ ملوکیّت باقی، نہ سرمایہ داری، نہ نسلی تفاخر: زندگی کے ہر شعبہ کو الٹا کر رکھ دیا سارے غلاموں کو اٹھا کر بڑے سے بڑے قریش کے ہم مرتبہ کر دیا۔

''انقلابِ معکوس''

قرآن کی رو سے جو حیرت انگیز انقلاب رسول ﷺ لائے تھے۔لیکن اس کے بعد جو انقلاب معکوس آیا یہ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔جس نے ملوکیت، سرمایہ داری اور برہمنیّت کی تمام شعبدہ بازیوں کو ختم کر دیا اور انسانیّت کو صحیح آزادی سے سرفراز کر دیا۔اس انقلاب کے بعد ملوکیّت اور اس کے ساتھ یہ تمام لعنتیں جو تمام کی تمام مٹ گئی تھیں۔وہ تمام کی تمام بارِ دگر، پہلے سے بھی زیادہ جوش وخروش سے اس معاشرے کے اندر، اس قوم کے اندر آ ثبت ہوئیں۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ واقعی تعجب انگیز بات ہے۔امیہ کے دور (661-750) (132ھ) میں تو یہ چیز ایسے نہیں ہوئی تھیں۔ بچ بچا کر موروثی بادشاہت تو آ گئی تھی۔لیکن اس دور میں قرآن کے سوا عربوں کے پاس کوئی اور کتاب ہی نہیں تھی۔ یہ عرب ملوکیّت تھی۔اس کے بعد عباسیوں کا دور (132-656ھ) شروع ہوا۔

750-1258ھ) نہ قرآن باقی رہا اور نہ عربیّت۔ان کی بادشاہت ایرانیوں کی مرہون منت تھی۔ یہ ایرانی زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے۔عجمی اسلام کی ابتداء یہیں سے شروع ہوگئی۔ملوکیّت، سرمایہ داری اور برہمنیّت کے جذام در آئے۔ چونکہ قرآن کی موجودگی میں، ان میں سے کسی کیلئے بھی تائید و دلیل ملنا تو ایک طرف رہا۔ان کے جواز کیلئے بھی کوئی وجہ ہی نظر نہیں آتی تھی۔ قرآن کی موجودگی میں نہ تو ملوکیّت، سرمایہ داری اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کا جواز مل سکتا تھا۔

قرآن کا مفہوم بدل دیا گیا:

سازش یہ کی گئی کہ قرآن کے الفاظ تو اسی طرح رہیں لیکن قرآن کا مفہوم بدل دیا جائے۔ نبی ﷺ کی حیات طیبہ اس انقلاب کی زندہ شہادت تھی۔اگر وہی سیرت، روش سامنے آتی رہی ہوتی تو بھی یہ انقلاب معکوس کبھی نہ آتا۔خدا نے خود رسول ﷺ کی سیرت قرآن میں محفوظ کر دی۔اس کے برعکس روایات سے سیرت رسول ﷺ کو کیا سے کیا بنا دیا گیا۔آج کی فضا میں قبول کرنا تو ایک طرف رہا، کوئی اس کو سننے کیلئے بھی تیار نہیں ہوگا۔ یہ عجمی سازش عباسیوں کے دور میں پوری طرح سے اٹھی انہوں نے اس شکست کا بدلہ قرآن سے لیا۔تو اس انتقام کیلئے ایسا انتظام کیا گیا کہ نہ تو قرآن اپنے الفاظ میں رہے اور نہ قرآن کا مفہوم قرآنی رہے اور نہ سیرت رسول ﷺ قرآنی رہے۔ پھر ان سب سازشیوں نے مل کر تاریخ، حدیث، اور تفسیروں کے انبار لگا دیئے۔

تصوّف، تمدّن، شریعت، کلام — بُتانِ عجم کے پجاری تمام
یہ اُمت روایات میں کھو گئی — حقیقت خرافات میں کھو گئی

غیر مسلّم موؤرّخین انگشت بدنداں ہیں کہ پتہ نہیں ان کے پاس کونسی قوّت تھی کہ چند سال میں ایران اور روما جیسی عظیم طاقتوں کے صرف تختے ہی نہیں الٹے بلکہ ان کے تمدّن کو جڑ سے اکھڑ دیا۔ ایک فرد عرب کی سرزمین سے اٹھا اور اس نے یہ سب کچھ کر کے دکھا دیا۔ اتنا عظیم انقلاب! تاریخ انسانیت اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اتنے تھوڑے عرصے میں، اتنے محدود ذرائع کے ساتھ، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ:

''رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣'' (74:3) کی حیرت انگیز ساخت:

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ (74:3) ادھر سے پڑھیئے تو بھی وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ (74:3) اور پیچھے کی طرف لوٹائیے تو پھر بھی وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ (74:3) بنتا ہے دائرہ بنتا ہے تم اس کی کبریائی قائم کرو تو وہ تمہاری کبریائی قائم کرے گا۔ اس طرح اس قوم کی کبریائی سارے عالم میں قائم ہو گئی تھی۔

❁❁❁

صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ (74:52) یعنی

''آزاد تجارت'' FREE TRADE

نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی individual Enterprise اور آزاد تجارت پر ہوتی ہے۔ یعنی افراد کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں جیسا چاہیں، جس قدر چاہیں دولت سمیٹتے جائیں اجتماعی نظام حکومت ان کے کاروبار میں داخل اندازی نہیں کرے گا۔ مندرجہ ذیل آیت میں اس طرف اشارہ ہے۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ (74:52) ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اجتماعی بات نہ کرو بلکہ ہر ایک فرد کا اپنا اپنا منشور ہونا چاہئے۔ صرف فرد کا مفاد ہونا چاہئے۔ جبکہ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط (13:17) نوع انسانی کیلئے اجتماعی طور پر جو ہوتو بقا صرف اس کو ہے جبکہ اس کے مقابلے میں یہ چاہتے ہیں کہ ہر فرد کا الگ الگ پروگرام ہونا چاہئے لیکن خدا کا ارشاد ہے۔

كَلَّا ط بَلْ لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿۵۳﴾ (74:53) یہ قانون مکافات عمل سے نہیں ڈرتے اور نہ ہی آخرت پر ان کو یقین ہے بلکہ ہر فرد دوسرے کی محنت کو لوٹ کھسوٹ کر لے جانا چاہتا ہے۔

''نفسِ انسانی'' کی تین خصوصیات

نفسِ انسانی اَمَّارَۃٌ-لَوَّامَۃٌ-اَلْمُطْمَئِنَّۃُ

ضمیر کی آواز خیر اور شر:

قرآن میں تین نفس گنے جاتے ہیں۔نفسِ امّارہ (12:53)،نفس لوامہ(75:2) اور نفس مُطمَئِنہ (89:27) اور ان کا ذکر موجود ہے ہمارے ہاں کی اصطلاح اور قرآن کی اصطلاح میں تھوڑا سا فرق ہے ہمارے ہاں تو ان کو الگ الگ سمجھا جاتا ہے۔ ''نفس امارہ'' برائی کیلئے آمادہ کرتا ہے۔نفس لوامہ برائی پر ملامت کرتا ہے۔نفس مطمئنہ اس اضطراب اور کشمکش سے آگے گزر جاتا ہے اور وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا ہے۔ہمارے ہاں ان کا الگ الگ تصوّر ہے۔یہ بات نہیں ہے۔یہ تینوں اسی ایک ہی نفس انسانی کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔الگ الگ Aspects گوشے ہیں۔الگ الگ characteristics ہیں۔الگ الگ Functions ہیں۔یہ ایک نفس کی مختلف خصوصیات ہیں۔

نفسِ اَمّارہ:

اس کا ذکر سورہ یوسف میں قول عزیز کی بیوی سے منسوب ہے۔

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ (12:53) قرآن نے اس عورت کے الفاظ کوٹ کئے ہیں کہ نفسِ اَمّارہ انسان کو برائی پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔اکساتا رہتا ہے۔مگر اپنی لغزش کا اعتراف بھی کیا تھا۔وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ (12:53) میں اپنے آپ کو بری الذ مہ نہیں ٹھہراتی۔اب یہ بات خواہ خدا نے پڑھائی ہے یا عزیز مصر کی بیوی کی طرف سے ہے۔

اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ (12:53) اگر خدا کا رحم ہو تو وہ یہ نہیں کرتا۔برائی کی طرف وہ نفس لے جاتا ہے۔جو رحم خداوندی میں یعنی وحی کے تابع نہ ہو۔اب یہ عیسائیّت کے عقیدہ کو کہ ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہگار پیدا ہوتا ہے،کاٹ کر رکھ دیا۔

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ (12:53)۔اَمَارَۃٌ۔مبالغہ کا صیغہ ہے۔بڑی شدت سے اکسانے والا۔اس کے بعد

قرآن نے فوراً کہہ دیا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نفس کرتا ہی یہ ہے۔ وہ صرف گناہ کیلئے آمادہ کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ ''اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ط (12:53)'' وہ شخص اس سے محفوظ رہ سکتا ہے جس پر خدا رحم کرے یعنی وہ اقدار کو سامنے رکھے اور عمل کرے۔

نفس مُطمَئِنہ:

یہ تیسری سٹیج ہے جو قرآن کی اصلاحات ہیں۔ یہ وہ نفس ہے جو انسان کو جنّت میں جانے کیلئے کوالیفائی کرتا ہے۔ کہ ہاں یہ ہے اصل مستحق جسے جنّت میں جانا ہے۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝۲۷ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝۲۸ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝۲۹ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝۳۰ (89:27-28-29-30) جس نے قوانین خداوندی سے دل کا صحیح اطمینان حاصل کر لیا۔ یعنی جس کی ذات میں صحیح نشوونما سے پورا پورا توازن آ چکا۔ (91:9)(13:281)

تیرا طرزِ زندگی خدا کے قوانین سے ہم آہنگ تھا۔ اس لئے تیری زندگی خوشگواریوں کی حامل ہوگی۔ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے حسب منشاء آسائشیں حاصل ہونگی۔ (لیکن اے رسول) ان کو بتا دو کہ یہ چیز انفرادی طور پر نہیں مل سکتی بلکہ اجتماعی زندگی سے ملتی ہے۔

اس لئے ضروی ہے کہ ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے خدا کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی جماعت مومنین میں اور اس طرح جنّتی معاشرہ میں داخل ہو جاؤ۔ جو اس کے قانون کے تحت وجود میں آیا ہے۔ (اس دنیا میں بھی جنّتی زندگی اور آخرت میں بھی جنّتی زندگی)۔

جنّت ہو یا جہنّم اس میں اجتماعی طور پر ہی جانا ہوتا ہے یہ انفرادی چیز نہیں ہے۔ اجتماعی ہے یہاں نجات ہر فرد کی الگ الگ نہیں ہوتی۔ نفس مطمئنہ تو ہر فرد کا الگ الگ ہے۔ سیرت کی بلندی تو قرآن کا بھی مقصود ہے۔ لیکن وہ سارا کچھ ایک جماعتی شکل میں پابندی لگا دیتا ہے۔ تنہا نہیں بلکہ جماعت کے ساتھ جنّت میں بھی اور جہنّم میں بھی اگر کوئی یہ چاہے کہ جہنّم میں کوئی ایک فرد جنّتی ہو جائے تو وہ ہو نہیں سکتا۔ وہ تو پوری جماعت کو یا جنّتی یا جہنّمی ہونا ہوگا۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝۲۹ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝۳۰ (89:29-30)۔ یہ ہے نفس مطمئنہ کا جنّت میں جانے کا اصول۔

نفس لوّامہ:

لَوَّامَةٌ، یعنی ملامت کرنے والا کہتے ہیں کہ ضمیر کی آواز پر چلنا چاہئے۔ جو حقیقت کی بات کہتی ہے۔ یعنی انسان کے اندر ایک ایسی چیز رکھی ہے۔ جو غلط، صحیح، حق اور باطل میں تمیز کرتی ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو مفاد حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ تو پھر وحی کی کیا ضرورت ہے؟ رسول کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بات حیوانات کے اندر ہے۔ مرغی کے نیچے کچھ بطخ اور کچھ مرغی

کے انڈے رکھ دیں کچھ وقت کے بعد مرغی کے چوزے خشکی کی طرف جبکہ بطخ کے چوزے پانی کی طرف بھاگیں گے۔ یہ ان کے اندر رکھی ہوئی چیز جبلّت (instinct) ہے جبکہ انسانی بچہ ذرا گھٹنوں چلنے لگے تو ماں کیلئے مصیبت کھڑی کر دیتا ہے۔ مرچیں کھا لیں۔ آنکھوں میں مرچیں لگا دیں بجلی سے چھیڑ رہا ہے، پانی میں ڈبکیاں لگا رہا ہے۔

اس لئے اسے خارج سے رہنمائی کی ضرورت پڑ گئی۔ وحی کے ذریعہ حق اور باطل کا فرق بتا دیا گیا۔ دراصل Absolute اور Relative میں فرق ہوتا ہے۔ دوسرے موقع محل کے لحاظ سے وہ اچھا ہے۔ جس گاؤں جانا ہے اگر چورا ہے پر وہ راستہ اختیار کیا جو گاؤں لے جاتا ہے تو وہ صحیح راستہ ہے۔ اگر آپ دوسرے راستہ پر چل پڑے جو اس طرف نہیں جا رہا تو یہ راستہ غلط ہوگا۔ راستے تو دونوں ایک جیسے ہیں۔ ان میں نہ تو کوئی غلط ہے اور نہ صحیح یہ تو اس لحاظ سے صحیح اور غلط ہو جاتا ہے کہ آپ نے خود جس طرف جانا ہے یہ ہے اضافی (Relative)۔ اب یہ ہے اضافی شر اور خیر اس نے خود یہی فیصلہ کیا میں نے شہر کی طرف جانا ہے یہ سڑک سیدھی جا رہی ہے تو یہ اس کیلئے صراط مستقیم بن جائیگی۔ اگر اس نے فیصلہ کیا کہ ماڈل ٹاؤن کی طرف جانا ہے تو راہ گمراہی ہو جائے گی۔

مگر ایک چیز وہ ہے جو فی الواقعہ صراط مستقیم ہے یہ اضافی نہیں بلکہ Absolute ہے۔ اس طرح سے یہ کہ رزق حلال یہ صحیح جبکہ رزق حرام جو ہے باطل ہے اور یہ ہمیشہ ہے اور ہر حال میں ہے ہر شخص کیلئے ہے ہر زمانے میں ہے۔ بدل نہیں سکتا۔ یہ Relative نہیں ہو سکتا۔

آپ جس دوست کی آج عزت کرتے ہیں وہ کل کو دشمن ہو جائے تو اس کی عزت نہیں کرتے۔ یہ جو عزت کی ہے یہ ہے Relative۔

قرآن نے کہا کہ ہر انسان واجب التکریم ہے یہ مطلق ہے۔ اب اس میں یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ یہ دشمن ہے یہ دوست ہو گیا ہے۔ اپنا ہے یا بے گانہ۔ میری قوم کا ہے یا دوسری قوم کا یہ مطلق خیر ہے۔ یہ مطلق خیر اور شر انسان کے اندر نہیں ہوتا بلکہ وحی کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔

ضمیر کی آواز:

جسے آپ ضمیر کی آواز کہتے ہیں مسلمان کا بچہ گائے کا گوشت لذت لے لے کر کھا جاتا ہے جبکہ ہندو کو اس سے قے آتی ہے۔ کیا یہ ان دونوں کے ضمیر کی آواز ہے؟ کیا ہے یہ آواز؟ اس ہندو نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے تو بچپن سے اس کے کان میں یہ بات ڈالی گئی اور آہستہ آہستہ یہ چیز اس کے تحت الشعور میں آ گئی کہ گائے کا گوشت نہیں کھانا۔ مسلمان بچے کے کان میں نہیں پڑی بلکہ گائے کا یہ گوشت اس کے گھر میں پکتا تھا اور اس نے اپنے ماحول کا یہ اثر لیا تھا۔ تو ضمیر اسی کا نام ہے۔ حق مطلق، شر مطلق کیلئے یہ فیصلہ کن چیز نہیں ہے۔ وہ تو جس ماحول میں یہ ضمیر پرورش پائے گی تو اس قسم کا اس کا ضمیر بن جائے گا۔ ضمیر کی آواز حق اور باطل کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ جس قسم کے معاشرے میں کوئی پرورش پائے گا۔ اسی قسم کی اس کا ضمیر ہو جائے گا۔ جب اس کے خلاف

کوئی کام ہوگا تو اس کی ضمیر اس کے خلاف اباء کرے گی نفرت کرے گی۔ یہ ہوا ''لوامہ'' انسانی نفس کے اندر کہ وہ ملامت کرتا ہے۔

نفسِ لوّامہ:

جب آہستہ آہستہ اس اِباء کی پرواہ نہیں کرتے۔ اسے دباتے چلے جاتے ہیں تو پھر وہ ملامت بھی نہیں کرتا۔ جرائم اس طرح عام ہو جاتے ہیں۔ پھر ان جرائم پیشہ افراد کو ان کا ضمیر ملامت نہیں کرتا۔ بلکہ وہ انہیں قابل ملامت سمجھتا ہی نہیں ہے۔ وہ جن چیزوں کو قابل ملامت سمجھتا ہے وہ وہی ہوتی ہے جو شروع سے اس کے ذہن میں ڈالی گئی ہیں کہ یہ قابل ملامت ہے کہ یہ غلط ہیں نفس لوامہ یا ضمیر ان چیزوں پر ملامت کرتا ہے جن کے متعلق پہلے سے اس کو بتایا گیا ہے کہ یہ بری ہیں۔ ٹھگوں کا بیٹا اس کی مثال ہے کہ کالی دیوی کا حکم بچپن سے بتا دیا گیا ہے کہ جب تک تم ایک آدمی نہیں مارو گے تو تمہاری شادی نہیں ہوسکتی۔ اب تو ساری دنیا ٹھگ ہوگئی ہے وہ اس سلب ونہب کے نظام کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس سے ان کو کرک نہیں آتی۔ خون نچوڑ کر ان کا ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتا یاد رکھیں! ضمیر حق و باطل کا فی الواقعہ فیصلہ نہیں کرسکتا۔ وہ جس بات کو حق سمجھتا ہے اس کی تائید کرتا ہے جبکہ جسے باطل سمجھتا ہے تو اس پر ملامت کرتا ہے جب وہ جرم عام ہو جائے تو ''امّارہ'' بن جاتا ہے اسے آمادہ کرتا رہتا ہے جرائم کی طرف لوّامہ اسی حد تک رہتا ہے۔ جب تک جس چیز کو وہ برا سمجھے اس پر وہ ٹوکتا رہے۔

نفس کے متعلق قرآن کی تعلیم:

قرآن کے مطابق بچپن سے ہی بچے کو یہ تعلیم دو۔ ایسا معاشرہ دو، جس کو قرآن نے برا کہا ہے اسے برا سمجھے اور جسے اچھا کہا ہے اسے اچھا سمجھے۔ اب اس کے ضمیر کی آواز صحیح آواز ہوگی۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جب شیطان کا کوئی گھومتا گھامتا خیال بھی آجائے تو فوراً ہی ''قانون خداوندی کے اندر پناہ لے لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ معاشرہ اقدار خداوندی پر تشکیل ہوتا ہے۔ جہاں مطلق حق اور مطلق شر کا فرق ملحوظ خاطر ہوتا ہے۔

یونہی ایسا خیال آیا تو فوراً اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ یعنی خدا کے قوانین کے پروں کے نیچے پناہ لیتے ہیں۔ اب تو یہ ''تعوذ'' محض رسمی رہ گئی ہے۔

''عوذ'' مادہ ''ع و ذ'' جب مرغی کے چوزے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں تو مرغی ساتھ ہوتی ہے وہ ان کو چھوڑ بھی دے تو ادھر ادھر دانہ دنکا چن رہے ہوتے ہیں اگر چیل کا سایہ اوپر آئے تو بھاگ کر مرغی کے پروں کے نیچے آجاتے ہیں اس طرح ان بچوں کا مرغی کا پروں کے نیچے آنا ''تعوذ'' کہلاتا ہے۔ اس طرح بچہ کی نشوونما ایسے ماحول میں کروتا کہ اس کے نفس غیر شعور یہ میں یہ باطل اور یہ حق ہے آجائے۔ یہ شر ہے۔ یہ ناجائز ہے۔ تو ارادہ کے ساتھ کبھی یہ نہیں کرے گا۔ یہ ہوگی ضمیر کی آواز۔ اگر کہیں بھول چوک یا بے خیالی میں کوئی غلط قدم اٹھائے گا تو پھر وہ خدا کے قوانین کے پروں تلے آکر وہیں رک جاتا ہے تو غلط راستے پر قدم چل کر واپس

آ تا ہے فوراً لوٹتا ہے اسے ''توبہ'' کہتے ہیں۔ یہ ہے ''نفس لوامہ'' جسے اس نے اسے روک دیا تھا کیونکہ اس کے اندر صحیح تربیّت سے یہ اقدار راسخ کر دی گئیں تھیں کسی نے خود فیصلہ کر کے نہیں دی تھیں۔ مطلق خیر اور شر وہی ہے جو قرآن کا دیا ہوا ہے اس کی تعلیم و تربیّت دی جائے۔ یہ تو سانس کی طرح ایک چیز ہے۔ معاشرے میں یہ خیالات عام کئے جائیں۔ اب تو ہر گھر سے رشوت، چوری اور دغا بازی کی آواز آ رہی ہے۔ تو اس ماحول میں نہ بچہ اور نہ بیوی یہ چیزیں برداشت کریں گے تو معاشرہ کا ضمیر ان اقدار کے تحت تعمیر کرو۔ تا کہ جب وہ بڑا ہو تو غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہے۔ ضمیر کو معاشرہ، تعلیم اور تربیّت بناتی ہے۔ ماں باپ بناتے ہیں۔

وعظ و پند سے نہیں بنتی یہ احوال، ماحول اور کام سے بنتی ہے، جہاں ضمیر کا غلط تصوّر ہو۔

تو ایسے معاشرہ کا ضمیر انسان کو برائی سے نہیں روک سکتا تو وہ امارہ ہی بن جاتی ہے جبکہ قرآنی معاشرہ میں نفسِ لوّامہ وہیں روک دیتا ہے کہ غلط قدم اٹھ گیا ہے پھر واپس چورا ہے پر آ کر توبہ کرتا ہے تو پھر صحیح راستہ پر قدم رکھ کر عمل صالح کرتا ہے۔

اقبال نے نفسِ لوّامہ کیلئے (Consciousness) یا ضمیر ایک Internalised Society یعنی معاشرہ جو سینے کے اندر سمویا ہوا ہے۔ یہ ہے ضمیر کا استعمال۔

❁❁❁

اطاعت واتباع کا قرآنی فرق

آں چہ حق می خواہد آں ساز دتُرا:

اطاعت واتباع کا مفہوم قرآن میں ''اطاعت'' ''طوع'' کا لفظ آرہا ہے۔ طاع۔ وہ پکی ہوئی کھجور جو از خود اوپر سے نیچے گرے۔ چھانپل سے کچی کھجوروں کا گرانا وہ ''اَطَاعَ النَّخَلَ'' نہیں کہلاتا۔ پک کر خود گرے۔ تو اَطَاعَ النَّخَلَ کہلاتا ہے۔ یہ ہے اطاعت دوسرا اس کیلئے ''اتباع'' ہے۔ گائے، اونٹ یا بکری کا نوزائیدہ بچہ کے آگے آگے اس کی ماں جارہی ہے وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا جارہا ہے وہ کسی زنجیر میں بندھا ہوا نہیں ہے۔ ماں اس کو کوئی حکم نہیں دے رہی ہوتی یہ اپنی چوائس سے ایک کشش کے تحت اس کے پیچھے جارہا ہے ؎

در پہ بیٹھا ہوں تیرے بے زنجیر

یعنی اتباع میں وہ اتنی کشش محسوس کرے کہ خود اپنی مرضی سے جارہا ہو۔

ایک اور لفظ ہے ''اَلْبِرُّ'' وہی اطاعت اور اتباع اہم چیز ہے۔ ''طاع'' میں تو کسی کے حکم کی پسندیدگی سے اطاعت کرنا ہے اور اتباع میں کسی خارجی کشش کے پیچھے چلنا ہے۔ اس میں پھر بھی خارج کی چیز ہے۔ ان دو کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے۔ آپ سانس لیتے ہیں۔ یہ نہ کسی کے حکم کی اطاعت ہے اور نہ خارج سے چلنے کی بات ہے۔ یہ زندگی کو برقرار رکھنے کی پوری آزادی ہے۔ اس کیلئے ایک عمل خود بخود جاری رہتا ہے۔ یہ آزادی کا عمل ہے۔ اس ''بِرّ'' میں تو خدا کی محکومیت بھی نہیں آتی۔ آزادی، انسان کے اختیار و ارادہ کے چوائس کی ہے۔ قرآن انسان کو یہ بنانا چاہتا ہے۔ کہا مَاشِئْتُمْ ۙ (41:40) اس لئے دو ممکنات دیدیں۔ دو Choices دیدیں۔ اگر ڈاکٹر کی وہ ہدایات اس کے سامنے ہیں تو وہ دیکھ لے گا کہ یہ کھاؤں یا نہ کھاؤں۔ مجھے اندر سے فیصلہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر کی خواہش کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ خواہش اور اختیار میرا ہے جسے میں نے اس ہدایت کے تابع ڈھال لیا ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۝۲۹ (81:29)۔ جب آپ ایسا کرتے ہیں تو یہ محکومیت نہیں ہے بلکہ آزادی سے ایسا کر رہے ہیں۔ آپ اس ہدایت کے خلاف بھی کرسکتے ہیں آپ نے خود وہ راستہ اختیار کیا جو خدا چاہتا ہے یعنی اپنے ارادے کو اس سے ہم آہنگ کرلیتا ہے۔ بندہ مومن قضائے حق شود۔

کیا قرآن ہے! سب سے زیادہ محبوب ترین کتاب:

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

الحمد سے الناس تک آئیں تو اختتام کا اور ابتداء کا مزہ اور لذت دوبالا ہو جاتی ہے۔

وداع و وصل جداگانہ لزتے دارو
ہزار بار بِرو صد ہزار باربیا

ہر ابتداء میں نئے نئے دریچے کھول دیتا ہے۔ نئے اور تازہ تازہ خیالات کی ایک دنیا استقبال کرتی ہے۔

خوابیدہ قوّتوں کی نمود کیلئے ٹکراؤ ضروی ہے

''ٹکراؤ''(Clash)

انسان کے اندر بہت ساری مضمر Potentialities صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ جن کا اسے خود بھی علم نہیں ہوتا۔ ان کی نمود ٹکراؤ سے ہوتی ہے چقماق کے اندر سویا ہوا شعلہ، پتھر کے ساتھ رگڑتے ہیں تو پھر اس کی نمود ہوتی ہے۔ پھر خوابیدہ قوّت کیلئے ٹکراؤ ضروری ہے۔ انسان کی ان مضمر صلاحیتوں کا نمود عملی زندگی میں محسوس طور پر ہونا مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔ جسے خودی ''یا نفس'' کہتے ہیں اپنی خوابیدہ قوّتوں کے نمود سے اس کی آہستہ آہستہ نشوونما ہوتی ہے۔ یہ کہیں خارج سے نہیں آتیں۔ بلکہ انسان کے اندر ہوتی ہیں۔ رگوں میں پنہاں ہوتی ہیں۔ ان کی نمود کیلئے ٹکراؤ ضروری ہے۔ اس طرح سے زندگی کے یہ پہلو بدلتے رہتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو آزماتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ احتساب خویش کیلئے مخالف قوّت، تصادم اور ٹکراؤ والی قوّت کا ہونا لازمی امر ہے۔ یہی زندگی کی ساری کشمکش کا راز ہے۔ مخالف قوّت نہ ہو تو یہ صلاحیتیں بیدار نہیں ہو سکتیں ان خوابیدہ قوّتوں کی نمود ٹکراؤ سے ہوتی ہے۔

ابلیس و جبریل کا مکالمہ اسی ٹکراؤ کا نام ہے:

اگر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے — قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کسی کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح — تو فقط اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو

یہ سارا فلسفہ قانون ارتقاء ہے۔ ہر نوع کے دوسری نوع سے ٹکراؤ اگر اس میں اتنی قوّت ہے تو اسے مغلوب کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔ تمام ابلیس قوّتوں کو راستے سے ہٹانا اسلام ہے۔

❁❁❁

دنیا کی سب سے انوکھی اور نرالی قوم

''دنیا کی سب سے بلند ترین قوم جسے ساری دنیا کے فائدے کیلئے چنا گیا'' ایک نرالی قوم، دنیا میں افراد کو لے لیجئے۔ اگر وہ مذہب پرست ہے تو وہ نجات کے فکر میں غلطاں و پیچاں ہے اسے کسی دوسرے کی نجات کی فکر نہیں ہوتی۔ دنیادار ہے تو اس کیلئے اپنی زندگی، خوشحالی، کامیابی اور فارغ البالی کی زندگی کی فکر ہے۔ اب اقوام کو ملاحظہ کریں۔ تو ہر قوم اپنے استحکام، غلبہ اور خوشحالی کیلئے سرگرم ہے چاہے اس کیلئے اسے دوسری اقوام کا خون کیوں نہ چوسنا پڑے۔ قوم کا ہیرو یا محب وطن وہ کہلاتا ہے جو اپنی قوم کے مفاد کیلئے ہر غیر قوم کا گلا گھونٹتا ہے۔ یہ تمام بڑے بڑے لوگ اور ان کے بڑے بڑے مجسمے، تاریخ میں جن کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جو ہر قسم کی مفاد پرستیوں کی تلاش میں مصروف تگ و تاز رہتے ہیں۔ جو حق اور باطل کی تمیز سے بیگانہ ہو کر اپنی قوم کیلئے کرتے ہیں اور جو یہ وطن کیلئے کرتے ہیں اگر وہی کچھ نجی طور پر کریں تو کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔ شیطان تو وہ پھر بھی کہلاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی یہ قوم ان کو ہیرو بنا کر ان کی پرستش کرتی ہے۔ ان کے مجسمے کھڑے کرتی ہے پتہ نہیں ان کے ان کارناموں میں کتنے لوگوں کا خون شامل ہے۔ جو اپنے غلبہ اور تسلط میں یہ بہاتی ہیں۔ فرد آگے بڑھا تو پھر خاندان کی فکر اور اس سے آگے تو پھر اپنی قوم کی فکر۔

تاریخ کے انہی ادوار میں ہمیں ایک اور قوم نظر آتی ہے جس کو سارے جہاں سے نرالا عرب کے معمار نے بنایا! یہ ایک ایسی نادر، انوکھی، استثنیٰ رکھنے والی قوم ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) جو صرف انسانیت کے بھلائی کیلئے وجود پذیر ہوئی ہے۔ یہ اس قوم کا فریضہ حیات ہے کہ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ (7:157) پوری نوع انسانی ملوکیّت پشوائیت اور سرمایہ داری کی زنجیروں اور سلوں سے آزاد کرنے والی قوم۔ اب یہ قوم خود آزاد تو ہوگئی ہے مگر اس کا فریضہ کیا ہے؟ قرآن نے جگہ جگہ یہ خوبصورت تصویر اس کی دی ہے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ (79:1) جو پانی کے اندر قوم میں غرق ہیں جو نہ دیکھ سکتی ہیں اور نہ سن سکتی ہیں۔ محکوم قوم کو جو غلامی کی

674

خوگر ہیں ان کو بالوں سے کھینچ کر نکالنے والی یہ جماعت ہے۔ کیونکہ ان کو سطح آب پر لاکر اپنے برابر کرنا ہے۔ صدرِاوّل کی یہ تمام جنگیں اسی مقاصد کیلئے تھیں۔ اسی دور کے قیصر وکسریٰ سے ان محکوم قوموں کو آزاد کرنے کیلئے یہ تمام جنگیں لڑی گئیں۔ جو خطوط لکھے جا رہے تھے ان سپر پاورز کو کہ کسانوں اور مزدوروں پر ظلم بند کرو۔

وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝۲ (79:2) اب ایسے سیارے جو ایک قانون کے تحت حرکت کریں یہ ان پابندیوں کے ساتھ آزادی کے ساتھ حرکت کرتا ہے یعنی آزادی کو اقدار کے تحت کرنا صحیح آزادی ہے۔ یہ ہے نشاط، خوشی اور انبساط آزادی فکر اقدار کے تحت۔ یہ ہے وہ جماعت اور آزادی کی، یہ تعریف دنیا کے کسی لٹریچر میں ایسی نہیں ملتی۔ یعنی ان کو کھینچ کر سطح آب پر لانے کے بعد ایسی آزادی کہ یہ اقدار خداوندی کے تحت زندگی گزاریں۔ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝۳ (79:3) اور پوری گرمجوشی سے تیر کر چلیں تا کہ راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴ (79:4) پھر آگے بڑھتے جائیں سب اقوام سے۔ یہ ہے وہ صحیح آزادی جسے نشاط اور آزادی کہتے ہیں۔ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵ (79:5) اور اپنے معاملات کی خود تدبیر اور تنظیم کرتے ہیں لیکن ہر معاملے کا فیصلہ خدا کے قانون کے تحت۔

یہ تھا فریضہ اس ملّت کا دین کا اور رسالت کا

قرآن کی کتابی شکل میں شہادت

قرآن کی شہادت کتابی شکل میں:

چونکہ خداعالم الغیب ہے اسے پتہ تھا کہ انہوں نے کیا کیا سازشیں کرنی ہیں تو اس لئے خدا قرآن کے بارے میں فرماتا ہے۔ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ (80:11) یہ ایک واضح اور کھلی ہوئی ہدایت ہے جس پر چل کر شرف و مجد مل سکتا ہے۔ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ (80:13) ہم نے اسے چھپا کر نہیں رکھا بلکہ نہایت باعزت اوراق میں لکھوا کر دے دیا ہے۔ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ (80:14) اس میں بلندی فکر اور پاکیزگی کی تعلیم دی گئی ہے اور ہر ایک آمیزش سے دور اور پاک ہے۔ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ (80:15) اس کے لکھنے والے، پھیلانے والے بھی نہایت بلند اخلاق کے حامل تھے۔ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾ (80:16) صداقت اور شرافت کے بلند ترین معیار والے اور کریم النفس و کشادہ ظرف اور خارجی اثرات سے آزاد، یہ تمام خارجی اثرات سے مبرہ تھے۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿١٧﴾ (80:17) ایسے سازشی انسان جو اسے چھپاتے ہیں ان کا ستیاناس ہو۔

بسیار خوباں دیدہ ام
اما تو چیزے دیگری

لَآ کا محاکاتی اور شاندار قرآنی اسلوب

عربوں کا انداز گفتگو:

لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ (90:1)

عربوں کے پاس یہ انداز بڑا ہی خاص ہوا کرتا تھا یعنی جو بات چلی آ رہی ہے تو اسے دہراتے نہیں تھے۔ اس کی تردید کرنا مقصود ہوتا تھا تو دہرائے بغیر اس کے متعلق ایک ''لا'' کہہ دیا کرتے تھے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ ''نہیں'' بات یوں نہیں ہے جسے تم سمجھتے ہو، بات یوں ہے اس ''لا'' میں یہ سارا انداز آ جاتا تھا۔ ان کے ہاں مخاطب کی اس ساری چیز کی تردید کیلئے وہ کلام کی ابتداء ''لا'' سے کیا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں بعض شعراء نے بھی اس سے یہ انداز لیا ؎

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

اس مصرعہ میں ''نہیں'' بظاہر زائد نظر آتی ہے لیکن یہ بڑی دقیق چیز ہے۔ اس کے معنی اور انداز یہ ہے کہ کوئی گفتگو ہو رہی تھی تو اس پر مخاطب نے اعتراض کیا کہ تم یہ بھی نہیں مانتے اور یہ بھی نہیں۔ یہ عربی انداز ہے کہ اس کا ذکر کئے بغیر ہی بات ''نہیں'' سے شروع کر دی۔ یہ بڑا ابلیغ انداز ہے قرآن ''لا'' سے یہی انداز اختیار کرتا ہے کہ تمہارا یہ دعویٰ کہ یہ مٹھی بھر جماعت کیا کرے گی اس کعبہ کو دوبارہ اس نظام کا مرکز بنایا جانا ہے۔ جس میں تمہاری برہمنیّت اور سرمایہ داری ختم ہو جائے گی۔ میں اسے شہادت میں پیش کرتا ہوں۔

”کائنات میں قدم قدم پر تنوّع صرف تقسیم کار کیلئے ہے یعنی Diversity

کائنات، اس کے مظاہر اور مخلوق! میں بڑا تنوع ہے۔ باہر کی دنیا کا تنوع تو چھوڑ دیجئے۔ خود انسانوں کو دیکھ لیں۔ اگر چہ نوع انسانی ایک ہے مگر اربوں انسان موجود ہیں اور چہروں کے خدوخال، دو آنکھیں، ایک ناک، دو ہونٹ اور پیشانی، یہ اتنا سا کچھ ہے لیکن تنوع کا یہ عالم کہ ایک چہرہ دوسرے چہرے سے نہیں ملتا۔ اگر انسانوں میں یہ تنوع نہ ہو تو اس دنیا میں ہم ایک دن کیلئے بھی نہیں رہ سکتے۔ ایک گھر میں جڑواں بچے ماں کیلئے پریشانی کا باعث ہو جاتے ہیں تو ان کو پہچاننے کیلئے رنگ دار رومال ڈالنا پڑتا ہے۔ مگر اس تنوّع کے پیچھے اصل انسان ایک ہی ہے اور سائنسدان دو ہی بنیادی قوانین خارجی کائنات کے بتاتے ہیں۔

Law of Cause and Efect and uniformity of Law of nature

اس تنوّع کے ساتھ وحدت بھی یعنی اصلِ کائنات وحدت ہے۔

یہ سارا تنوّع کاروباری سہولتوں کیلئے ہے اور یہ کاروباری دنیا میں تنوّع کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ معاملات اور کاروبار کیلئے ہے مگر اس کی اصل ایک ہے قرآن نے ان کو دو شقوں میں تقسیم کیا ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ① وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ② وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ③ (92:1-2-3)

رات اور دن کا اختلاف باہم تفاوت، تضاد، تنوّع۔

حالانکہ دن اور رات زمین کی گردش ہے زمین کا جو پہلو سورج کے سامنے آئے تو دن کہلاتا ہے اور جب وہی پہلو سورج سے اوجھل ہو جائے تو رات کہلاتی ہے۔ وہی زمین دن ہوتی ہے اور وہی زمین رات۔ اس تضاد کے پیچھے وحدت ہے۔ تاریکی امتیازی خطوط کو مٹا دیتی ہے اور دن کی روشنی پھر اس کو الگ الگ کر دیتی ہے۔ ”اَلْجَلَاء“ الگ الگ کرنا یعنی روشنی نہ ہو تو تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس طرح سے یہ مرد اور عورت اصل میں تو ایک ہیں۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ④ (92:4) اس لئے تمہاری سعی و عمل کا رخ بھی مختلف سمتوں کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی کام الگ الگ۔ پیشے الگ الگ۔ فرق صرف ایمان اور کفر کا ہے ایک متقی دوسرا بخیل ہے۔

یہ پہلی وحی نہیں ہو سکتی

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ (96:1) مروّجہ روایات کے تحت وحی کی ابتداء اس آیت سے ہوئی تھی۔ خود اس سورت میں چار ہی آیات آگے چل کر ایک ایسی داخلی شہادت ملتی ہے۔ جو اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ پہلی وحی نہیں ہو سکتی۔

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡہٰی ۙ﴿۹﴾ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ؕ﴿۱۰﴾ (96:9:10) کیا دیکھا کہ جب وہ فرائض منصبی کیلئے اٹھا تو وہ اسے روکتا ہے۔

اگر یہ پہلی وحی تھی تو حضور ﷺ کا اپنے فرائض کی ادائیگی یا صلوٰۃ میں قیام سے ان لوگوں کے روکنا تو اس سے پہلے کی بات تو ہو نہیں سکتی۔ ان کی مخالفت تو بعد کی چیزیں ہیں۔ یہ تو نبوّت کے احکامات جب بعد میں آئے تو اس وقت کی باتیں ہیں۔ تصادم اور مزاحمت تو بعد کی چیزیں ہیں۔ پہلی وحی میں تو روکنا یا تصادم تو نہیں ہو سکا تھا۔ اس داخلی شہادت کے بعد یہ کنفرم ہے کہ یہ پہلی وحی ہو نہیں سکتی۔

”لیلۃُ القدر“
شبِ برات کی سازش

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (44:3) یعنی ایک مبارک رات میں کیا۔ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴ۙ (44:4) جس میں ہر ایک امر میں تفریق ہو جاتی ہے۔ یعنی باطل اور حق الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ یعنی حکمت کی رو سے۔ دلائل کی رو سے قرآن رمضان کے مہینے میں نازل ہوا اور یہ اسے شب برات کی چودہ کہتے ہیں۔ تو قرآن تو رمضان کا مہینہ بتا رہا ہے جبکہ آپ اسے شعبان کا مہینہ کہہ رہے ہیں۔ کہتے ہیں یہ گہری بات ہے شب برات کے مہینے میں عرش اعظم سے پہلے آسمان پر نازل ہوا۔ پھر اسے زمین تک آنے میں مہینہ لگ گیا۔ یہ دو دفعہ نازل ہوا یہ وہی لیلۃ المبارک ہے جسے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ۚۖ (97:1) انسان کو اقدار دیں، نئے پیمانے دیئے، حیوان کو ان پیمانوں، اقدار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں ”لیلیٰ“ رات سے بھی زیادہ وسیع مفہوم ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝۱ۙ (14:1) فِيْ لَيْلَةِ (97:1) سے مراد تاریکیوں کے دور تھا اور وحی کے ذریعہ انسانیّت کو نئی اقدار سے روشناس کرایا۔ اگر یہ قدر نہ ہو تو انسان حیوانی سطح پر ہوتے ہیں۔ حیوانی سطح زندگی کو انسانی سطح زندگی سے آشنا کر دیا۔

”ہم نے یہ اقدار اس تاریکی کے دور میں دیں جبکہ ساری دنیا وحی سے محروم تیرہ تار ہو چکی تھی۔ وہ رات ایک جہان نو کی رات تھی۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ۛ (97:4) تیرے نشوونما دینے والے کے قانون کے تحت ایک طرف سے فطرت کی قوّتیں اور دوسری طرف سے وحی خداوندی یکساں طور پر آہستہ آہستہ بتدریج (تنزل) ہم آہنگ ہوتی جائینگی۔ جونہی ان کا امتزاج ہوگا تو مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ (97:4) تو زندگی کے ہر گوشے میں ”سَلٰمٌ ۛقف (97:5)“ سلامتی اور سلامتی ہو جائے گی۔

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵ۧ (97:5) تا آنکہ رات کی ساری تاریکیاں چھٹ جائیں اور مشرق سے سورج نمودار ہو جائے گا۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) اور زمین نشوونما دینے والے کے درخشدہ نظام سے جگمگا اُٹھے گی۔

؎ شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے   یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

انسانی آبادی کا اوّلین سرچشمہ

انسانی آبادی کا اوّلین سرچشمہ:

آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں انسانوں کی آبادی نظر آتی ہے لیکن دنیا شروع سے اس طرح آباد نہیں چلی آئی۔ علمائے تاریخ الاُمم رفتہ رفتہ اثری انکشافات سے اس نتیجہ پر آرہے ہیں کہ نسل انسانی کا اوّلین سرچشمہ ایک مقام پر تھا جہاں سے اس کی سوتیں پھوٹیں اور ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں اطراف عالم میں بہہ نکلیں۔ قیاس ہے کہ آبادی کا اوّلین سرچشمہ Capsian sea کے اطراف وجوانب میں تھا۔ اس لحاظ سے علم الاقوام والسنہ کے محققین اقوام عالم کو مختلف مماثلث ومشابہت کی بناء پر تین شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

1- آریائی (ایران) ایرانی، فرنگستانی۔

2- تورانی (منگولین) ترکستانی/چینی۔

3- سامی (سیمٹیک) عرب۔ آرامی، عبرانی، کلدانی وغیرہ۔

جبکہ بعض رنگ کی بنیاد پر یعنی سفید فام: مثلاً ام سامیہ، فرنگی وغیرہ۔

سیاہ فام وسرخ فام:

باشندگان افریقہ، زردفام، جاپانی/چینی وغیرہ جبکہ اس کے برعکس تورات کا بیان ہے کہ طوفان نوح کے بعد نسل انسانی نوح کے تین بیٹوں یافث (Jepeth)۔ حام (Ham) اور سام (Shem) سے آگے بڑھی۔ اور موجودہ اقوام عالم انہی کی نسل سے ہے۔ تورات کو صرف سامی سے تعلق ہے۔ کیونکہ تورات کے انبیاء کا سلسلہ اسی نسل سے تھا۔ اب یہ بات تحقیق تک پہنچ چکی ہے کہ بنی سام کا مولد ومسکن یعنی ام سامی کا اوّلین وطن ملک عرب تھا۔ جہاں سے نکل کر وہ بابل، شام اور مصر تک پھیل گئے۔ یعنی مصر وشام و فلسطین وعراق وغیرہ کی تمام قومیں جن کو الگ الگ نسل سمجھا جاتا ہے۔ دراصل ایک درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔

جو سرزمین عرب سے ابھری اس اعتبار سے ان تمام اقوام کی زبان کی اصل یعنی عربی زبان کی قدیم شکل قرار پائے گی۔ یہ امور ہنوز ان انکشافات کا نتیجہ ہیں۔ جو معرض شہود میں آ چکے ہیں۔ کیا معلوم آگے چل کر ان میں کیا کیا اضافے ہوں۔ ان سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قرآن نے بالتخصیص انہی اقوام وانبیاء کرام کا کیوں کہا ہے؟ ہوسکتا ہے اور قرائن اس پر شاہد ہیں کہ مزید انکشافات سے انسانی آبادی کی موجودہ تقسیم سمٹ سمٹا کر اس نقطہ پر مرکوز ہو جائے کہ ان تمام اقوام عالم کی ابتداء ریگستان عرب سے ہوئی جہاں کے شہر ''مکہ کو اُمّ القریٰ'' آبادیوں کی ماں کہا گیا ہے۔

قوم عاد:

جس طرح تورات کی رو سے اقوام عالم کی تقسیم نوحؑ کے تین بیٹوں (یافث۔حام۔سام) کی نسل کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ تاریخی حیثیت تورات کے اس بیان کی کچھ ہی کیوں نہ ہو۔لیکن جدید تحقیقات اس نتیجہ پر ضرور پہنچ گئی ہیں کہ عرب اور اس کے ارد گرد شام و مصر وغیرہ میں ام سامیہ ہی پھیلی ہوئی تھی ان میں سب سے اہم اور مقتدر قبیلہ ''قوم عادؔ'' کا تھا۔قبیلہ کیا! وہ تو ایک عظیم الشان قوم تھی۔ایک طرف حضرموت اور یمن سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک پہنچ گئی تھی۔ دوسری طرف مصر اور شام پر حکمران تھی۔تقریباً 2500-2000 (ق۔م) ان تمام علاقوں پر اس قوم کا تسلط اور اقدار نظر آتا ہے۔سام کے بیٹے ''ارم'' کی نسبت سے اس قوم کو ''عاد ارم'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ 2500 (ق۔م) اس قوم کا ستارہ عرّوج پر تھا۔تو اس زمانے کے ''قوموں کے عرّوج وزوال'' کی رفتار سے سمجھ لینا چاہئے۔

جب یہ علاقہ تباہی کے بعد دوبارہ آباد ہونا شروع ہوا ہے تو ''بنی سام'' کی پہلی ترقی اس قوم ''عادؔ'' سے ہوئی ہے اس کی طرف ھودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ان کا مقام بعثت اور تبلیغ احقّاف کا علاقہ تھا۔احقّاف صحرا کو کہتے ہیں۔ جو جزیدۂ نمائے عرب کا وہ طویل وعریض ریگستان ہے اب ''رُبع خالی'' کہا جاتا ہے۔احقّاف کا علاقہ تھا۔ جہاں کوہ تمثال کے ریت کے ٹیلے خوف ودہشت کے بھیانک عفریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے۔لیکن جب آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اس طرح نیچے دبا لیتے ہیں کہ پھر محکمہ آثار قدیمہ والے ہی سراغ لگائیں۔ یہ قوم اپنے غلط نظام یعنی تکذیب قانون الٰہی کے جرم میں تباہ ہوگئی۔ یہ تھے عاد اولیٰ۔ جو بچ گئے وہ تھے عاد ثانی۔

قوم مدین:

وہ قوم جس کی طرف شعیبؑ کو بھیجا گیا تھا۔جن کی دعوت کا مرکزی نقطہ معاشیات کا تھا اس فرق کے ساتھ کہ صالحؑ کا زمانہ زرعی معیشت کا تھا جبکہ شعیبؑ کا زمانہ کاروباری معیشت کا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ''قطورا'' کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی ان میں سے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔اسمٰعیلؑ ارض حجّاز جبکہ

اسحٰق فلسطین میں متمکن ہوئے جبکہ مدین حجّاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہوگیا۔ جو تاریخ میں قوم مدین کے نام سے مشہور ہوا۔ ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ 2200-2100 ق م ہے۔ اس لئے قوم مدین کا زمانہ 2000 ق م تصوّر کرنا چاہئے۔ جو قافلہ یوسفؑ کو چاہ کنعان سے بازار مصر میں لے گیا تھا۔ کہا جاتا ہے وہ انہی مدیانیوں کا تھا۔ یہ قوم اسی علاقہ میں بڑھی، پھلی اور پھولی۔ تقریباً 4 صدیوں تک یہی حالت رہی تا آنکہ شعیبؑ کی بعثت ہوئی جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر نکلے تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔ انہوں نے ایک کبیرسن بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کی تھی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھالی اور ان کی بیٹی سے عقد کیا قرآن نے اس بزرگ کا نہیں بتایا مگر محققین کا خیال ہے کہ آپ شعیبؑ تھے۔

تورات میں کبھی ان کا نام ''شیرو اور کہیں ''جوباب'' آیا ہے یہ دراصل القاب تھے۔ یہی جوباب قرآن میں شعیبؑ کے نام سے موسوم ہیں۔ اس اعتبار سے شعیبؑ اور موسیٰؑ کا زمانہ ایک ہی ہے۔ یعنی 1700-1600 ق م۔

اصحٰب الایکہ:

تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام ''یشقان'' تھا۔ اس کا بیٹا ''ودان'' اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہوگیا۔ علاقہ سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے پٹا پڑا تھا۔ قرآن کے مطابق شعیبؑ مدین کے علاوہ ''اصحب الایکہ'' کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ بنو ددان ہی اصحب الایکہ تھے۔ ''ایکہ'' کے معنی جنگل۔ جو اس شاہراہ مبین پر واقع تھی۔ جو حجّاز سے شام کی طرف جاتی ہے۔ جس کا ذکر قوم لوط کی برگزشت میں آچکا ہے۔

شاہراہ مبین:

یمن سے لیکر بحر احمر (Red sea) کے کنارے کنارے ایک قدیم تجارتی قافلوں کی سڑک مجاز و مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سام کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی۔ قرآن نے اسے ''امام مبین'' کہا ہے علاقہ بحر میّت (Dead Sea) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بڑا حصّہ سمندر کے نیچے آ گیا۔ لوطؑ اسی قوم کیلئے معبوث ہوئے تھے۔

قوم ثمود:

ام سامیہ میں سے جن قوموں نے اندرون عرب کی حکومتیں کیں۔ ان میں مشہور قوم ثمود تھی۔ اس کے عرّوج کا زمانہ عاد اولیٰ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصّہ پر حکمران تھی۔ جسے وادی قریٰ کہتے تھے۔ حجّر ان ان کا دارالحکومت تھا۔ جو اس قدیم راستہ پر واقعہ تھا جو حجّاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادی قریٰ کے گردو پیش کے علاقے سرسبز و شاداب تھے۔ لیکن آتش فشاں سے لبریز۔ یہ قوم عاد کی جانشین تھی۔ اسے دارالخلافہ حجّر ان کی وجہ سے ''قوم حجّر'' بھی کہا جاتا ہے۔

دنیااوردین کاارتباط

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰٓى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَـفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ (7:96)

دنیا کی زندگی اور وحی میں ربط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔یعنی اسلام نہ سیکولرزم ہے۔جس کا منتھی حیاۃ الارض ہے اور نہ مذہب جس میں دنیا کو قابل نفرت گردانا جاتا ہے۔

غربیاں رازیر کی سازِ حیات — شرقیاں را عشق راز کائنات
زیر کی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں بازیرکی ہمبر شود — نقشبند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگرنبہ — عشق با زیر کی آمیز دہ

عشق وزیرکی کے آمیزہ کوقرآن:ارض وسماء'' کاارتباط'' کہتاہے۔یہ اسلام ہے
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

اسلاف کے بارے میں ایک ہی دلیل
کہ ان کے اعمال تمہارے سلیبس میں نہیں

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٤﴾ (2:134) فرعون نے موسیٰؑ سے جب پوچھا:

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾ (20:51) تا کہ تمام لوگ اور درباری جواب موسیٰ پر اس سے بدظن ہو جائیں۔ تو موسیٰؑ نے نہایت خوبصورتی سے جواب دیا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾ (20:52)

❁❁❁

چند اہم کتابیں

دلائلِ نبوّت محمد ﷺ:

1-عبدالجبار فاطمی (101ھ) طبری سے 150 سال قبل ان کے مطابق عائشہؓ بیوہ تھی صالح بن صالح الطیب۔ 48 سال کی عمر میں نکاح کیا اور حضرت ابوبکرؓ کی بہن تھیں۔

2-ازواج النّبی والاصحٰب۔ (شیخ احمد بن حکم)

3-حدیث۔''A big fogery'' دارالا فاق بیروت۔

4-درادوار تجلیاتِ روحِ ایرانی از حسین کاظم زادہ۔

5-میزان الفارس۔ حجّت اللہ عبدالقادر موسوی۔

6-ڈائری: گورنر ہسپانیہ کی (90ھ)

ضروری نوٹ: ابن اسحٰق ایک یہودی تھا جس نے سیرت النّبی لکھی اور حشام ان کا ایک پارسی شاگرد تھا۔

7-محدّثین و مفسرین کے جرائم کی قبولی۔ حدیث القرآن (علامہ مشرقی) 1955ء صفحہ (275)

8-ادراک زوال امت۔ ڈاکٹر راشد شاذ

9- کربلا کی حقیقت:۔ ڈاکٹر شبیر احمد

10-اسلام کے مجرم: ڈاکٹر شبیر احمد

11-برہان القرآن۔ از علامہ رحمت اللہ طارقؒ

12-مفہوم القرآن۔ از علامہ غلام احمد پرویزؒ

Evolution vs special creation

اقبال کے نزدیک ارتقاء ہی زندگی ہے اور زندگی ارتقاء کا نام ہے۔ڈارون کو اس نظریہ کا بانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ارتقاء کے صرف ایک حصّہ نامیاتی (Organic Evolution) پر ڈارون نے جدید نظریات پیش کئے تھے۔لیکن ان کو اس نظریہ کا بانی قرار دینا قطعاً خلاف حقیقت ہے علامہ نے اسلام کے ابتدائی دور کے مسلم مفکرین کے نظریات ارتقاء کو پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ ڈارون سے صدیوں پہلے مسلم حکماء ارتقاء کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کر چکے تھے۔ان میں علامہ حافظ ابن مسکویہ، علامہ فخر الدین عراقی، نصر الدین طوسی، برہان الحق، ریحان البیرونی، شہاب الدین سہروردی، رومی، ابن خلدون وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان مفکرین کے خیالات سے ایک ایسا حرکی تصوّر ابھرتا ہے۔جو مسلم ذہن وفکر کو کائنات وحیات کے ایسے متحرک تصوّر کی جانب لے جاتا ہے۔جو قرآن کی روح کے عین مطابق ہے ان سائنسدانوں نے کائنات میں کارفرما قوانین کو سمجھنے کیلئے تحقیق کا آغاز کیا تھا۔انہوں نے سائنسی طریقہ کار کے تحت اپنی تحقیقات کو قدرت کے ان قوانین سے شروع کیا۔جو بالکل آشکارا اور پیش پا افتادہ ہیں۔یونانیوں سے الگ طریقہ جو صرف محض خیالات اور تصوّرات سے کام لیتے تھے۔اس کے بعد ان مسلم حکماء نے تجربات اور مشاہدات کو وسعت دیکر سائنسی علوم کے ذخیرے میں اضافہ کیا جاتا ہے بعد میں تحریری شکل میں آنے والی نسل کو منتقل کیا جاتا ہے۔جب مسلمانوں نے غور وتدّبر چھوڑ دیا تو دوسری اقوام نے یہ سلسلہ شروع کر دیا اور یہ ہمیشہ جاری رہے گا جبکہ سائنس کے اس تدریجی طریقہ کار کے برعکس وحی یا نبوّت کی طرز تعلیم کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔وحی بنیادی اور اساسی حقائق بیان کرتی ہے۔تفصیلات اور جزئیات میں نہیں جاتی کیونکہ اللہ کو علم ہے کہ انسان صلاحیتوں کو نمو دے کر ان جزوی تفصیلات کا بتدریج علم حاصل کرتا جائے گا۔مثلاً انسانی پیدائش کا چند ارتقائی مراحل کا ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کی ابتداء مٹی کے خلاصہ سے کی۔پھر یہ تخلیقی پروگرام اس کڑی تک جا پہنچا جہاں افزائش نسل بذریعہ تولید ہوئی ہے۔اس طرح ہم نے اسے نطفہ بنا دیا۔جو رحم میں ٹھہر گیا۔پھر نطفہ کو علقہ (خلیوں کا گچھا) میں تبدیل کیا پھر گوشت کا لوتھڑا (مضغہ) بنا دیا۔پھر ہڈیوں کا ڈھانچہ پر گوشت کی تہہ چڑھا دی اب یہ تمام مراحل حیوانی زندگی کے قانون طبعی کے مطابق ہوتے ہیں۔پھر اس کے بعد توانائی ڈال کر خَلۡقًا اٰخَرَ ط (23:14) بالکل ایک نئی قسم کی مخلوق بنا دیا۔(23:12-44) جدید قسم کی مخلوق حیوانی زندگی سے یکسر مختلف ہے۔

ان آیات میں صرف بنیادی قوانین کا ذکر ہے۔دیگر ذیلی قوانین مثلاً مٹی سے انسانی تخلیق کن کن مراحل سے گزری یا رحم

کے مادر میں جنین (مضغہ) کی تفصیلات کیا ہیں۔ ان کا ذکرنہیں کیا گیا۔ ان تفصیلات کا ذکر نہ کرنے میں ہی حکمت ہے اگر ان جزئیات کا ذکر کر دیا جاتا تو وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ وحی نے اپنے اس طریقہ کار کے مطابق ارتقاء کے بارے میں بھی چند اساسی اور بنیادی قوانین کا ذکر کیا ہے۔تفصیلات انسانی شعور پر چھوڑ دی ہیں۔

ارتقاء کے ناقدین:

ان ناقدین کے اعتراضات وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے اس غلط فہمی کو نہ صرف دور کیا ہے بلکہ اس کا ایک حل بھی پیش کیا ہے۔

یہ حضرات ارتقاء کے نظریہ کی اس لئے نفی کرتے ہیں کہ یہ نظریہ کائنات کو بے مقصد قرار دیتا ہے اور اس کا کسی کو بھی خالق تسلیم نہیں کرتا۔ ہر چیز اندھے قوانین کے تحت خود بہ خود پیدا ہو رہی ہے۔ محض اتفاق سے، جس سے نہ کوئی مقصد ہے اور نہ منزل اور سب سے اہم کہ یہ نظریہ مادہ پرستی پر قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے 19 صدی میں مادہ پرستانہ تصوّرات کو جنم دیا۔ جس کے نتیجے میں علمی حلقے مذہب و روحانیت کے سخت مخالف ہو گئے اور حقائق کی روحانی توجیہہ کو غیر علمی، مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا نتیجہ قرار دینے لگے۔ ڈارون کا نظریہ اس ذہنی رجحان سے پیدا ہوا اور یہ نظریہ 19 صدی کی مادیّت کا پہلا ثمر ہے۔ ان کے نزدیک الحاد کی جڑ ہے۔ یہ کلیہ بالخصوص کارل مارکس، فرائیڈ، میکیاولی کے نظریات پر حاوی ہے۔ انہوں نے مادِیّین کے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے ایک حیوان کو انسان کی سطح پر لاتا ہے۔ دوسرا انسان کو حیوان کی سطح پر لاتا ہے۔ ان کے نزدیک مغربی مادی فلسفیانہ نظریات کے سدباب کیلئے ڈارون کے نظریات کی غلطیوں کو آشکار کرنا اور اس کے درست اور صحیح عناصر کو ان کی مناسب جگہ پر رکھنا ضروری ہے ڈاکٹر صاحب نے خود ارتقائی عمل کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس سے وابستہ ان نظریات کو مسترد کر دیا ہے جو کچھ مادہ پرست لوگوں نے ارتقاء سے جوڑے رکھے ہیں۔ ارتقاء کے صحیح ادراک کیلئے ڈاکٹر صاحب نے ڈارون کے نظریہ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔

ڈارون کا نظریہ (ڈاکٹر رفیع الدین):

اوّل: حقیقت ارتقاء: یعنی یہ کہ ارتقاء فی الواقعہ ہوا ہے اور زندگی کی ادنیٰ حالتیں اعلیٰ حالتوں سے متواتر تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

دوم: سببِ ارتقاء: کہ ارتقاء کا مقصد قدرت کی بے مقصد کاروائیاں ہیں۔ جنہیں ڈارون کش مکش حیات اور قدرتی انتخاب اور بقائے اصلح کا نام دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے لازم و ملزم نہیں ہیں اگر پہلا حصّہ درست ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرا حصّہ بھی درست ہو۔ اگر ہم ایک فعل یا عمل کے وقوع کا علم رکھتے ہوں تو ضروری نہیں کہ ہم اس کے وقوع کا سبب بھی جانتے ہیں۔ مثلاً ٹرین میں سفر کرنے والے شخص کیلئے ضروری نہیں کہ وہ جانتا ہو کہ ٹرین کا انجن کیسے حرکت کرتا ہے اس طرح اگر نظریہ کا دوسرا حصّہ غلط ہو تو ضروری نہیں کہ پہلا حصّہ بھی غلط ہو۔ اگر بعض لوگوں کو سبب ارتقاء کا صحیح علم نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ

ارتقاء ہوا ہی نہیں۔ اگر کوئی شخص ریڈیائی نقلی صوت کے اصول نہ جانتا ہو تو اسے یہ کہنے کا حق نہیں کہ لندن سے ریڈیو پر خبریں سننا ممکن ہی نہیں۔ بدنصیبی یہ ہے بعض لوگوں نے ان دونوں حصّوں کو ایک دوسرے سے غلط ملط کر دیا ہے۔ یہ لوگ پہلے حصّہ کو درست پا کر فوراً ہی اس کے دوسرے حصے کی صحت کے بھی قائل ہو جاتے ہیں اور بعض دوسرے حصے کی خامیوں سے آگاہ ہو کر پہلے حصے کو بھی مسترد کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں مخالفین ارتقاء کا زیادہ تر تعلق انہی لوگوں سے ہے۔

پہلا حصّہ وہ دنیا کے علمی مسلّمات میں شمار ہوتا ہے آج کوئی بھی حکیم اس سے انکار نہیں کر سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈارون کے زمانے سے لیکر اب تک اس کے خلاف ایک بات بھی معلوم نہیں ہو سکی بلکہ اس کے برعکس بے شمار دلیلیں اور شہادتیں اس کے حق میں پیدا ہوئی ہیں۔ یہ شہادتیں بالخصوص حیات، عضویات اور جنسیات سے متعلق ہیں۔ آج بھی ہمارے سامنے ارتقا ہو رہا ہے۔ حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ تاریخ کا رخ ایک خاص منزل کی طرف جاتا ہے اور تاریخ کا عمل ایک ارتقائی عمل ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب ارتقاء کے تین مرحلے بتاتے ہیں پہلا مرحلہ کائنات کی ابتداء سے موجودہ حالت تک کا ہے۔ جب اس میں زندگی کا ظہور ہوا دوسرا مرحلہ پہلے زندہ حیوان (Cell) کے ظہور سے نسل انسانی کے ظہور تک اور تیسرا مرحلہ انسان کے ظہور سے لیکر انسان کی نفسیاتی تکمیل تک، یہ مرحلہ ابھی جاری ہے۔ اگر یہ تصوّر روح قرآنی کے مطابق ہے تو ہمیں اس تصوّر کو رکھا رہنا چاہئے اور اسے قرآنی تشریح و تفسیر کیلئے کام میں لائیں۔ اس کے برعکس اگر یہ تصوّر غیر قرآنی ہے تو اسے فوراً چھوڑ دیں اور اسے یعنی تدریجی ارتقاء کی علمی اور عقلی براہین سے غلط ثابت کریں۔ جو علمی تحقیق سے پے در پے صحیح ثابت ہو چکا ہے ہو اس کے خلاف علمی اور عقلی دلائل بہم پہنچانا ازبس ضروری ہے۔

قرآن پر غور کرنے سے آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ یہ تصوّر روح قرآنی کے عین مطابق ہے۔ یہ ارتقاء کائنات کے حیاتیاتی مرحلہ کا ارتقاء یا اس کے کسی ایک مرحلہ کا ارتقا نہیں بلکہ کائنات کا مجموعی ارتقاء ہے۔ دیگر مسلم مفکرین کی طرح ڈاکٹر صاحب بھی ارتقاء کے حق میں اللہ کی صفت ''رب'' سے کرتے ہیں یعنی کسی چیز کو ادنیٰ حالت سے ترقی دیکر اعلیٰ حالت میں پہنچانا جس طرح سیپ ایک بارش کا قطرہ لے کر اسے مختلف مراحل میں سے گزار کر موتی بنا دیتی ہے۔ خدا کی ربوبیّت کا نتیجہ ارتقاء ہے۔ کسی شے کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس لئے اور اس طرح گزارنا کہ وہ بتدریج نشوونما پاتی ہوئی اپنے نقطہ آغاز سے تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ طریق نشوونما ربوبیّت کہلاتا ہے۔ اس میں اصلاح، درستگی اور استحکام کے پہلو بھی مضمر ہوتے ہیں۔

اسلام میں تصوّرِ ربوبیّت حیات و کائنات کے ارتقاء کی سب سے بڑی اور محکم دلیل ہے۔

خلیفہ نصیر الدین:

The quality of being Rabb implies a process of nourishment providing from one stage to other for the fullest development of the creation

علی موسیٰ رضا مہاجر رب کے بارے میں۔

who creats a thing and developes it from stage to stage to its fullest state of perfection . Rabubiyyat is another expression of evolution

اسلام میں ارتقاء کوئی نیا تصوّر نہیں بلکہ ہمہ گیر اور جامعہ اصول ہے جس کا فطرت اور قدرت کے ہر پہلو پر اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن میں ارتقاء کو قانون الٰہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔(32:5-6)

علامہ پرویزؒ کہتے ہیں کہ تدبیر (خدا کی سکیم) کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علم الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں جب ان میں سے کسی سکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہو تو مشیت کے مطابق زمین کی پستیوں سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر وہ ارتقائی مراحل طے کر کے اپنے مقام تکمیل کی طرف اُٹھتی ہے یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفہ ہوتے ہیں جس میں ہر ایک پیریڈ ایک ایک ہزار سال یا پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ یہ اس قانون کے مطابق ہوتا ہے جو ہر چیز کی موجودہ شکل سے بھی واقف ہے اور اس کے مضمر ممکنات سے بھی۔ اس قانون میں اتنی قوّت ہوتی ہے کہ وہ ہر شے کو مناسب نشوونما دے کر اس کے نکتہ تکمیل تک پہنچا دے۔ گو یا ارتقاء ایک ایسا قانون قدرت ہے کہ اس کا اطلاق ہر شے پر ہوتا ہے کوئی شے بڑے بڑے ارتقائی مراحل سے گزرے بغیر حیات کے اگلے مرحلے میں داخل نہیں ہوتی۔ یہ ایک تدریجی ترقی کا نام ہے۔ یوم عربی زبان میں ایک دن کیلئے آتا ہے اور لمبے لمبے مراحل کے لیے بھی ہزار سال سے مراد ایک ریاضیاتی اصطلاح نہیں ہے بلکہ محاورۃً استعمال ہوئے ہیں جس سے مراد ایک طویل مدت۔ جن کے مقابلہ میں دنوں کی اکائیاں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ (ڈاکٹر مورس بکائے)

بنیادی لحاظ سے کائنات میں ارتقائی عمل کے دو مراحل ہیں۔ ایک کائنات کا ارتقاء دوسرا زندگی کا ارتقاء اس میں انسان اور اس کی نفسیاتی زندگی بھی شامل ہے۔ یہ دونوں مرحلوں کی بنیاد اللہ کی تخلیق اور ربوبیّت ہیں۔ ناقدین ارتقاء کو تخلیق سے الگ سمجھتے ہیں۔ یحییٰ (ترکی مفکر) یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ارتقاء سے چیزیں قدیم شکل سے نئی شکل میں آتی ہیں لیکن ارتقائی عمل میں بھی تخلیق کا کردار نہیں مانتے۔ ان کے مطابق جاندار بذریعہ ارتقاء وجود میں نہیں آئے۔ بلکہ ان کو تخلیق کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ارتقائی عمل ابتدا ہی کی چیز یا جاندار کی تخلیق کے بعد ہوتی ہے۔ تخلیق اور ارتقاء کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا یہ تو صفت خالقیت کو ماننا اور ربوبیّت سے انکار ہے خدا تخلیق کے ہر مرحلہ کو جو ربوبیّت سے حاصل ہوتا ہے تخلیق ہی کہتا ہے گو یا تخلیق اور ربوبیّت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں رحم مادر میں جنین کی تربیّت کا ذکر کر کے جب وہ تربیّت مکمل ہو جائے تو اسے احسن تخلیق کا نام دیتا ہے۔

کائنات کی ابتداء اور اس کے تدریجی ارتقاء:

کائنات کی موجودہ شکل یکدم نہیں آ گئی بلکہ اس کی تخلیق چھ ادوار متنوّع منازل سے گزر کر موجودہ سطح پر آئی۔ (57:3 - 10:53) ایام سے مراد کروڑوں سال پر محیط طویل المیعاد پریڈ ہے۔

674

عالم خلق اور امر تمام اس کے قانون کے مطابق مصروف ہیں۔ کائنات کی تخلیق کے دو ادوار جن کو قرآن ''یومین'' کہتا ہے۔ وہ ان ادوار میں شامل ہیں۔ ان ادوار میں ابھی زندگی کی نمود نہیں ہوئی تھی۔ سائنسدان ان کو AZOIC ERA'' کہتے ہیں۔(41:9-122)

باقی چار ایام میں زندگی کی نمود ہوئی اور زندہ اشیاء بمعہ انسان ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ جب تمام اجرام فلکی دھویں کی شکل (Nabula) تھے یہ تمام کرے اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو جدا کر دیا اور تمام چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔(21:21) دھویں کے اندر گیس اور ٹھوس بادل ذرات بھی جو انتہائی گرم ماحول میں مائع شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ تمام کرے جو الگ الگ دکھائی دیتے ہیں ابتدائی دور میں یہ سب ایک ہی ہیولا تھے۔ جو بعد میں الگ الگ ہوئے۔

پیدائش کے اعتبار سے یہ عظیم الجثہ کرے زیادہ سخت ہیں یا تم؟ ان کروں کو بلند کر کے ان میں اعتدال اور توازن رکھ دیا۔ پھر رات اور دن بنایا پھر اس ہیولا سے زمین کو یوں الگ کر دیا جس طرح گوپئے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ پھر زمین کے مادہ سے پانی کو الگ کر دیا اور خشکی کے قطعات سے نباتات نکالے۔ پھر تمہارے لئے اور مویشیوں کیلئے سامان زیست۔

تخلیقی مراحل کو سلسلہ وار بیان کیا یعنی رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ (79:29) زمین کے لیے دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ (79:28-29-30-31-32)

یہ ہے وہ آیت ڈاکٹر بکائے کے مطابق جس میں تخلیق کے مختلف واقعات کے درمیان ایک واضح تطابق دکھائی دیتا ہے۔

علامہ اقبال اور البیرونی:

پہلے خطبہ میں علامہ اقبال کائنات کے بارے یں فرماتے ہیں کہ کوئی جامد کائنات نہیں نہ ایسا مصنوع جس کی تکمیل ہو چکی ہو جو بے حرکت اور ناقابل تغیّر اور تبدّل۔ اس کے برعکس اس کے بطن میں ایک نئی آفرینش کا خواب پوشیدہ ہے اور اس کی ترکیب بھی اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں مزید وسعت کی گنجائش ہے۔ اس لئے وہ کائنات میں نئے نئے اضافے کر رہا ہے۔(35:1) پانچویں خطبہ میں اسلامی فکر نے جو راستہ بھی اختیار کیا اس کی انتہا جس رنگ، جس پہلو میں دیکھئے کائنات کے حرکی تصوّر پر ہوئی ہے۔ پھر ابھی مسکویہ کا یہ نظریہ کہ زندگی ایک ارتقائی حرکت سے عبارت ہے، مزید تقویت کا باعث ہوا۔ ابن خلدون بھی قرآن سے استفادہ کر کے اقوام کے عرّوج وزوال کو بھی اسی ارتقائی نظر سے دیکھتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ غور طلب امر خود قرآن کا وہ مطمع نظر کہ زندگی جموّد نہیں بلکہ حرکت ہے۔ ظاہر ہے جب کتاب کا مطمع نظر ایسا ہوگا۔ اس کی روش ارتقاء کے خلاف کس طرح ہو سکتی ہے؟ بیرونی وہ پہلا شخص ہے جس نے جدید ریاضی کے فنکشنز کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے خالص علمی نقطہ نظر سے ثابت کیا کہ کائنات کو ایک وجود ساکن ٹھہرانا بڑا ناقص ہے۔

کائنات کوئی بنی بنائی ہوئی شے نہیں بلکہ ابھی بن رہی ہے یعنی اس کی نگاہیں کون کی بجائے تکوین پر ہیں۔ علامہ اقبال بھی

تخلیقی ارتقاء کے قائل ہیں اس لئے وہ برگسان کے نقطۂ نظر کو تعریفی انداز سے دیکھتے ہیں۔ وجود کی تقویم کا راز ہی ''ذوق پرواز'' میں پوشیدہ ہے۔ چونکہ خدا کا علم اس قدر بسیط ہے کہ مستقبل خدا کی نامیاتی تخلیقی زندگی میں پہلے سے موجود ہے۔ تاہم خدا کے علم بسیط میں مستقبل کی موجودگی کھلے امکانات کی صورت میں ہے۔ ایسا نہیں کہ مستقبل مقررہ اوقات اور مخصوص خدوخال کے حامل حوادث پر مبنی متعینہ نظام کی صورت میں موجود ہو۔ اگر ایسا ہو تو پھر تازہ آفرینی، خلاقی اور ارتقاء پذیری سب تصوّرات بے معنی ہو جاتے ہیں اور خدا کے بارے میں یہ تصوّر علم اسے تخلیقی ارتقائی سرگرمیوں سے عاری اور محروم کردے گا۔ جو دراصل اس کا وصف اوّل ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے صدا دم بدم کن فیکون

میرے خیال میں علامہ نے یہاں عالم امر کا حوالہ دیا ہے۔ خدا کے تخلیقی پروگرام میں عالم امر اور عالم خلق دو تخلیقی پروگرام ہیں۔ دونوں پر مکمل کنٹرول ہے۔ انسان کو صرف محسوسات (عالم خلق) کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اس لئے وہ عالم امر کے احوال و واقعات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکتا۔ ہم خدا کا یہ 'کن'، ارادہ نہیں جان سکتے۔ وہاں اللہ کا پروگرام کیسے مرتب ہوتا ہے۔ اشیائے کائنات کیلئے قوانین وضوابط کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ وہاں خدا کا تخلیقی پروگرام کیسے طے ہوتا ہے؟ یہ تمام امور علم انسانی سے ماوراء ہیں۔ وہ اپنے اختیار وارادہ سے جیسے چاہے کرتا ہے۔ (11:107) اس سے یہ پوچھا نہیں جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے سوا ہر ایک سے پوچھا جا سکتا ہے۔ (21:23) ہاں جب کوئی شے اللہ کے امر کے مطابق عالم خلق (مادی کائنات) میں آجاتی ہے تو پھر وہ خدا کے قوانین وضوابط (پیمانوں) کی پابند ہو جاتی ہے۔ (22:38)

ارتقاء دولابی (Cylic) یا جدلیاتی انداز کی حامل نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح ارتقائی حرکت سے جدت اور نئے پن کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے اور تخلیقی عمل کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ارتقاء تو ایک مرحلے سے دوسرے اعلیٰ مرحلہ میں قدم رکھنے کا نام ہے۔ مسلسل آگے بڑھنے والی حرکت ہی کائناتی قانون ہے ارتقاء ایک میکانکی عمل نہیں بلکہ تخلیقی عمل ہے۔ جس کے تحت فطرت اور معاشرے میں ہر لحظہ خوب سے خوب تر کی تخلیق ہو رہی ہے۔ ارتقاء کے مادی تصوّر کو علامہ نے مسترد کر دیا۔

مادے کا تعلق تو فزکس سے ہے جو کہ صرف عالم محسوسات کا مطالعہ کرتا ہے۔ مادہ میں وہ تمام اشیاء شامل ہیں جن کو ہم اردگرد دیکھتے ہیں۔ اس میں مظاہر فطرت اور خود انسان بھی شامل ہے۔

آئن سٹائن:

مادہ کے پرانے روایتی تصوّر کو سب سے کاری ضرب آئن سٹائن کے نظریۂ عمومی اضافیت کے ہاتھوں لگی۔ اس نے ابدی اور جامد مادے کے تصوّر کو ختم کیا کہ مادہ اگرچہ حقیقی ہے جو زیادہ تر انرجی پر مشتمل ہے۔ لیکن مشاہد کی نسبت اس کی ہستی اضافی ہے۔

علامہ بھی جدید سائنسی نظریات کی مدد سے مادہ کے قدیم جامد وساکت تصوّر کو رد کر کے مادہ کے حرکی ارتقائی اور ہر دم تخلیقی بہاؤ کے حامل تصوّر کے حامی ہیں۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ بھی نیچر کو جامد نہیں کہتے جو خلا میں معلق ہو۔ بلکہ فطرت واقعات کے ایسے مربوط نظام کا نام ہے جس میں مسلسل ایک تخلیقی بہاؤ ہے۔ ہماری عقل چونکہ نظام فطرت کو بہ حقیقت کل مشاہدہ کرنے سے قاصر ہے اور مربوط واقعاتی نظام تک اس کی رسائی نہیں جو دراصل مادہ کی تخلیقی اور ارتقائی حرکت کو ظاہر کر سکے۔ چنانچہ یہ فطرت کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیتی اور ان کو غیر متحرک محسوس کرتی ہے۔ مغرب کے ہاں حیات بعد الموت کا تصوّر نہیں اس لئے ان کے ہاں ظاہریت اور مادیّت کے علاوہ کوئی اور منتہیٰ نہیں جبکہ اس کے مقابلے میں قرآنی تصوّر ارتقاء انسانی مستقبل کے بارے میں مایوسی اور اضطراب ختم کر کے اسے حیات ابدی کی بشارت بھی دیتا ہے۔

جدید سائنس:

ارتقاء کا ہمہ گیر سلسلہ کائنات کی تخلیق کے بعد شروع ہو گیا تھا جدید سائنسی نظریات کی رو سے اس مادی عالم کی ابتداء تقریباً 13.47 بلین سال قبل بگ بینگ سے شروع ہوئی تھی۔ اس نظریہ کی پیش گوئی ایک روسی سائنسدان ڈاکٹر فرائیڈ مین نے کی تھی۔ بعد میں ایک سابقہ باکسر بعد میں ایک معروف ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے 1929ء نے ثابت کیا کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ یہاں خیال پیدا ہوا کہ اگر کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہٹ رہی ہیں۔ تو یقیناً ماضی میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہونگی اور ان کے درمیان فاصلہ صفر ہو گا۔ یوں بگ بینگ کے تصوّر کو تقویت ملی۔ اس کے بعد ایک اور روسی سائنسدان جارج گیمو نے گرم بگ بینگ کا تصوّر دیکر کہا کہ انتہائی گرم کائنات سے خارج ہونے والی شعاکاری (فوٹون کی شکل میں) اب بھی موجود ہونی چاہئے۔ گو اس کا درجہ Micro Rediations Cosmic Backgrourd کہا جاتا ہے اور دو امریکی ماہرین فلکیات ولسن اور بینز بیاس نے 1962ء میں زمین پر دریافت کر کے بگ بینگ کے نظریہ کو ثابت کر دیا۔ اس کے بعد 1992ء میں اسے خلا میں دریافت کر لیا گیا تھا۔

ماہرین کونیات:

ابتداء میں کائنات کا سارا مادہ، ساری توانائی اور سارے کا سارا خلاء ایک ریاضتی نقطہ پر مرکوز تھا۔ ریاضی نقطہ سے مراد کوئی ایسی شے جس کا حجم صفر ہو یعنی حجم نہ ہو۔ یعنی بالفاظ دیگر ریاضتی نقطہ نہ ہونے یا ''عدم'' کی ترجمانی کرتا ہے۔ یعنی کائنات عدم سے وجود میں لائی گئی۔ اس نقطہ کی کثافت لامتناہی تھی۔ بگ بینگ والے لمحے کو صفر وقت T=o بھی کہا جاتا ہے۔ بگ بینگ کے بعد کائنات کا سارا مادہ جو اس وقت ابتدائی گیسی حالت میں تھا، پھیلنا شروع ہو گیا۔ یعنی ارتقاء کا آغاز ہو گیا۔ اس ارتقاء کے دوران مادے کے بنیادی ذرات بھی الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران وجود میں آئے۔ تاہم مادے کے انتہائی گرم ہونے کی وجہ سے یہ ابھی آزاد حالت میں تھے کیونکہ بہت زیادہ درجہ حرارت پر ایٹمز اپنے سارے کے سارے الیکٹرانز سے محروم ہو جاتا ہے۔ صرف ان کے (Nuclei) مرکزے باقی رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی کیمیائی عمل ممکن نہیں رہتا۔

اسٹیفن کے مطابق بگ بینگ کے وقت کائنات کی جسامت صفر سمجھی جاتی ہے۔یعنی لامتناہی طور پر گرم رہی ہوگی۔مگر کائنات کے پھیلنے کے ساتھ شعاعی درجہ حرارت کم ہوتا گیا اور بگ بینگ کے ایک سکینڈ کے بعد یہ تقریباً دس ارب درجہ تک گر گیا ہوگا اور ایک سو سکینڈ بعد درجہ حرارت ایک ارب ڈگری تک گر چکا ہوگا اور چند ہی گھنٹوں کے اندر ہیلیم اور دوسرے عناصر کی پیداوار رک گئی ہوگی۔ جب درجہ حرارت چند ہزار درجہ تک گر گیا ہوگا۔تو الیکٹرانز اور دیگر (Nuclei) اتنی توانائی کے حامل نہیں رہے ہونگے کہ اپنے درمیان برقی مقناطیسی کشش پر قابو پا سکیں۔اس لئے ان عناصر نے ایک دوسرے تعامل سے ایٹم تشکیل دینے شروع کر دیئے ہونگے۔

کہکشائیں اور سیارے:

اگلے ارتقائی مرحلہ میں ایٹموں نے یکجا ہو کر اوّلین ستاروں کی شکل اختیار کی اور کھربوں ستارے باہمی کشش ثقل کی وجہ سے جھرمٹوں کی صورت میں آ گئے یہ تھیں اوّلین کہکشائیں جن میں ستاروں کے علاوہ گرم پلازما والے گیسی بادل بھی تھے۔انہیں سحابیہ (Nebula) کہا جاتا ہے۔

ٹھیک بگ بینگ کے لمحے (T = o) پر سارے کے سارے قوانین ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جسے واحدیّت (Singularity) کہتے ہیں۔یعنی قوانین فطرت اپنے بارے میں پیش گوئی کئے جانے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں یا یہ قوانین اس وقت بھی حسب معمول کارفرما رہتے ہیں۔اس پر سائنسدانوں میں بحث جاری ہے۔اسٹیفن کا خیال ہے کہ صرف نظریہ اضافیت کی رو سے کائنات کی ابتدا کو نہیں سمجھا جا سکتا۔کیونکہ نظریہ انتہائی چھوٹے پیمانے پر مبنی مادے کے ڈھانچہ کی وضاحت نہیں کر سکتا یہاں کوانٹم تھیوری کے قوانین لاگو ہوتے ہیں۔بگ بینگ کے بارے میں مختلف سائنسدانوں نے مختلف تصوّرات وضع کئے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے مگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ ارتقاء کا آغاز یہاں سے ہی ہوتا ہے بلکہ ارتقاء کے ناقدین بھی اکثر ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ہارون یحیٰی نے تو اپنی کتاب میں بگ بینگ کا ذکر ہی نہیں کیا۔

ہبوطِ آدم، حیاتِ جاوید بوساطتِ اولاد

یہ تھا فریب جو ابلیس نے آدم کے کان میں پھونکا کہ خبردار عالمگیریت کے چکر میں نہ پڑنا یعنی اس درخت کے پاس جانا جو اختلافات یعنی انسانیّت کو مختلف گروہی، نسلی، قومی اور دیگر خانوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس سے خدا نے وحی کے ذریعہ آدم کو منع کیا تھا۔

مگر ابلیسی فریب نے اسے بہکایا کہ خبردار اس طرح تم عالمگیریت کے اژدھام میں اپنی انفرادیت اور تشخص کھودو گے۔ حیات جاوید صرف اولاد کے ذریعہ اس جنس اختلاط سے حاصل کر سکتے ہو پھر اولاد در اولاد کا سلسلہ اور نسلی تقسیم ہی تمہارا نام ہمیشہ کیلئے زندہ رکھ سکے گی۔

قرآن نے جنسی اختلاط کی رعایت سے اسے بیان کیا ہے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا (7:20)

پھر ان کے سرکش جذبات نے ان دونوں کو یہ فریب دیکر ان کے شرمناک مقامات کو ظاہر کر دیا جو ان دونوں سے چھپا دیئے گئے تھے۔

وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ (7:20)

شیطان نے کہا کہ تمہارے رب نے اس لئے تمہیں عالمگیریت کا سبق دیا ہے تا کہ تم اولاد کے ذریعہ حیات جاوید اور پھر قبیلوں، نسلوں کی شکل میں طاقتور نہ ہو جاؤ عالمگیریت کے اژدھام میں پھنس کر تم اپنا تشخص بھی کھودو گے۔ اس طرح زندگی کے بلند مقصد کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ (7:21) اور بار بار قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں بلکہ میں تم دونوں کی خیر خواہی چاہتا ہوں۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ (7:22) پھر اپنی فریب انگیز باتوں سے ان دونوں کو کھینچ لیا۔ گرا دیا گیا ان کو ان کے مقام بلند سے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (7:22) تو جب انہوں نے اس درخت کا ذائقہ چکھا تو ان کے شر کے مقامات بے پردہ ہوگئے۔

وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ (7:22) چونکہ انسانی سطح پر حیاء کا جذبہ نمودار ہوجاتا ہے۔تو انہوں نے ان ستر کے مقامات کو پتوں سے چھپانے کی کوشش کی۔یعنی جب افزائش نسل کو ہی مقصود حیات سمجھ لینے کے بعد ان کے مذموم نتائج سامنے آئے۔تو بجائے اس کے ان گناہگاروں کو ترک کرتے الٹا کرنے کے ان عیوب برہنگی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔یعنی ذاتوں، برادریوں اور نسلوں کے جتنے فوائد بیان کئے جاتے ہیں وہ انہی عیوب کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے۔خوشگواریوں کے متعلق قرآن نے تو کہا تھا کہ ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہنا اس سے تمہاری زندگی جنّت کی حامل رہے گی۔اگر نسل پرستی میں آگئے تو اس سے یہ جنّت تم سے چھین لی جائے گی اگر تم نے اس نسل پرستی کو منطقی دلائل سے چھپانے کی کوشش کی۔

وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ (7:22)

اس پر خدا نے کہا کہ میں نے تمہیں پہلے ہی وارن کر دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے فریب میں آ کر نسلوں اور ذاتوں میں تقسیم نہ ہوجانا۔

یہ تھے وہ پست جذبات (شیطان) جس نے بلند انسانی سطح سے گرا کر حیوانی سطح پر پہنچایا یاد رہے کہ جنسی جذبات کی تسکین اور افزائش نسلی معیوب وممنوع نہیں۔قرآن نے تو ان کو وجہ زینت قرار دیا ہے۔(18:46) مگر ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اگر مال واولاد تمہارے بلند مقاصد کے راستے میں حائل ہوجائیں۔یہ بہت بڑا فتنہ بن جاتے ہیں۔(88:28)

نسل پرستی کی بنیاد پر انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے اور اس انسان بلند مقصد (عالمگیریت) سے گر کر پستیوں میں گر جاتا ہے اسے ہبوط آدم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی سرگذشت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ﴿١٧٥﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۚ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث ۚ ذَّٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴿١٧٦﴾ سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَنفُسَهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ﴿١٧٧﴾ (7:175-176-177)

تو یہ اس نظام سے یوں نکل گیا جس طرح سانپ، کنچلی اتار کر نکل جاتا ہے۔

پھر ایسی قوم پر عذاب:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ ۗ (6:65)

- وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴿١٢٩﴾ (6:129)
- ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ (23:96)
- إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ (11:114)
- إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ﴿٤٣﴾ (50:43)
- لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ (42:11)

چٹیل میدان، کَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ (24:39)

۞ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَـيْــــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ؀ (24:39)

سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے لوگ:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ؁ۭ (18:103) بہت کچھ کرنے کے باوجود سب سے زیادہ نقصان میں رہیں گے۔

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؀ (18:104) (بڑے بڑے کاریگری کے مگر مصنوعی کام) وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (18:104)

منکر حق نزدِ ملا کافر است
منکر خود نزدِ من کافر تر است
شاخِ نہالِ سدرۂ خار وخسِ چمن شو
منکر او اگر شدی، منکر خویش مشو
می تراشد فکر ماہر دم خداوندے دگر
رست از یک بندتا افتاد دربندِ دگر

۞۞۞

بہائیوں کی غلط نگہی

آیت لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ (13:38) سے نگاہ بہائیوں کی غلط نگہی یا کوتاہ فہمی کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ دو کاذب مدعیان نبوّت۔ ایک مرزا غلام احمد اور دوسرا بہاء اللہ۔ مرزا صاحب نے تو کہا کہ وہ نبی ہیں۔ لیکن کوئی کتاب نہیں لایا اس کے برعکس بہاء اللہ نے کہا کہ قرآن ایک خاص مدت تک نافذ العمل رہنے کیلئے دیا گیا تھا۔ وہ مدت ختم ہوگئی اور میں اس کی جگہ نئی کتاب لایا ہوں۔ اس کیلئے سند اس کی آیت سے پیش کی۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ (13:38)۔ ترجمہ کیا کہ ہر کتاب کیلئے ایک اجل (مدت) مقرر ہوتی ہے۔ علاوہ دیگر امور خود اس آیت کے الفاظ اس ترجمہ کی تردید کرتے ہیں۔ یعنی آیت کے یہ الفاظ نہیں۔ لِكُلِّ كِتَابٍ اَجَلٌ ﴿۳۸﴾ (13:38)۔ یعنی ہر کتاب کیلئے اجل مقرر ہے۔ بلکہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ (13:38)۔ ہر میعاد کیلئے ایک قانون مقرر ہے اور قرآن تمام نوع انسانی کیلئے ضابطہ ہے۔

اس لئے جب تک نوع انسانی کا ایک فرد بھی کرہ ارض پر زندہ رہے گا۔ قرآن زندہ و پائندہ رہے اس کیلئے کوئی مدت مقرر نہیں کی۔ یہ بات بنی آدم سے شروع ہی سے کہہ دی گئی تھی۔ کہ تمہارے پاس رسول آ کر ہمارا پیغام لاتے رہیں گے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ (7:35)

روشنی صرف وحی ہے۔

ایمان کا ترجمہ Conviction ہے Faith نہیں ہے

وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾ (24:40) اگر آسمانی روشنی نہ ہوتی تو پھر روشنی کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ ساری دنیا سامنے ہے۔ بزعم خویش خدا کے ماننے والے بھی اور خدا کے منکر بھی۔ مگر کہیں بھی وہ روشنی نہیں۔

طَاعَةٌ مَّعۡرُوۡفَةٌ ؕ (24:53) اطاعت کا مخصوص نتیجہ۔ یعنی عمل مخصوص سے اپنا تعارف آپ یعنی پہچانی جانیوالی چیز کہ واقعی اطاعت ہو رہی ہے تو یہ اس کے نتیجہ سے پہچانا جائے گا۔

وَاِنۡ تُطِيۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا ؕ (24:54) اگر تم اسی قرآن پر چلو گے تو منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾ (4:141) خدا کبھی یہ نہیں کرے گا کہ مومنین پر کفار کو غالب کر دے۔

حَقًّا عَلَيۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۴۷﴾ (30:47)

فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ ؕ (61:5) اللہ کا قانون انسانی اعمال کا اتباع کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾ (2:62)

ایمان کا ترجمہ (Conviction) ہے ''Faith'' نہیں ہے:

وَالَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِّرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ لَمۡ يَخِرُّوۡا عَلَيۡهَا صُمًّا وَّعُمۡيَانًا ﴿۷۳﴾ (25:73)

اور رسول ﷺ بھی ایمان لاتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ (2:285)

اور اعلان کہ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۱۶۳﴾ (6:163)

وحی اور محدود عقل انسانی:

عقل محدود شر اور خیر میں تمیز کر ہی نہیں سکتی۔

وَعَسٰۤی اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ (2:216) حق اور باطل کا فیصلہ وحی خداوندی سے ہی ہوسکتا ہے۔

باز آفرینی:

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (25:70)

یعنی جرم کرتے وقت ایمان نہیں تھا تو اس کی تلافی صرف اٰمَنَ دوبارہ تجدید ایمان کرے کتنی باریک بات ہے۔ جب خلاف ورزی کی تو اس وقت ایمان نہیں تھا۔ ایمان قلب کی گہرائیوں میں اتر جانے کا نام ہے۔ محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے ایمان ایمان نہیں کہلاتا۔

اہل ایمان کی حسین دعائیں:

بارالٰہا! باہر کے معاشرے میں تو آپ نے بتادیا کہ یہ کرو اور وہ کرو۔ اس کے بعد پلٹ کر شام کو گھر آئیں تو گھر ایسا بنادے۔

وَالَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا هَبۡ لَنَا مِنۡ اَزۡوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعۡیُنٍ وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ (25:74)

میں نہیں کہتا کہ یہ کچھ کر کے میں نے بڑی کاریگری کی ہے میں نے حتیٰ المقدور کوشش کی ہے مگر ایسے عناصر بھی ہیں کہ ان کے اوپر پورا کنٹرول نہیں ہے۔ میری دعا ہے کہ تو اسے اپنی طرف سے پورا کردے۔ اس گھر میں رہنے والے بیوی اور بچوں کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے اور میری زندگی کو ایسا بنادے کہ مجھے دیکھ کر دوسرے اپنی زندگی کی پیمائش کریں۔ جو غلط روش کی تباہیوں سے بچنا چاہیں ان کی امامت یعنی لیڈر شپ میرے حصّہ میں آئے۔

دعا:

وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا یَسۡتَجِیۡبُوۡنَ لَهُمۡ بِشَیۡءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیۡهِ اِلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الۡكٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ (13:14)

قرآن میں موسیقی کا ذکر:

فَهُمۡ فِیۡ رَوۡضَةٍ یُّحۡبَرُوۡنَ ﴿۱۵﴾ (30:15) نغمات محظوظ ہونگے۔

اُدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ اَنۡتُمۡ وَاَزۡوَاجُكُمۡ تُحۡبَرُوۡنَ ﴿۷۰﴾ (43:70) جہاں بہترین قسم کی موسیقی سے لطف اندوز ہوگے۔

❁❁❁

صحابہ کرامؓ کا مقام اعلیٰ، مومنِ حقّا

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ (8:74)

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ (53:32)

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ (7:201)

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29)

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ (48:29)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ (8:74)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ (8:73)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ (8:75)

جو اسلامی مملکت کی طرف نہ آئیں۔ اس نظام کا حصّہ نہ بنیں تو ان کی اعانت و رفاقت کی کوئی ذمہ داری تم پر عائد نہیں ہوتی۔

سب سے زیادہ بدترین مخلوق، جو عقل سے کام نہ لیں

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ (8:22)

بدترین خلائق جو بہرے اور گونگے ہو کر عقل وفکر سے کام نہ لیں۔

يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (8:24)۔ انسان کے پست جذبات جو عزم راسخ کو زائل کرتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ (8:24)

اے جماعت مومنین (تم کہیں ایسا نہ کرنا۔ پچھلی آیات سے ربط) بلکہ نظام خداوندی کی دعوت پر لبیک کہو جب تمہیں وہ دعوت دے کیونکہ وہ تو تمہیں زندگی عطا کرنے والا ہے۔

(دَعَاكُمْ میں ضمیر واحد جبکہ اللہ اور رسول تثنیہ ہیں)

یاد رکھو اس کیلئے عزم راسخ اور بلند ہمتی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن انسان کے پست جذبات اس عزم راسخ اور حوصلہ کو پست کر دیتے ہیں۔ یعنی خدا کا حکم ان جذبات اور اس کے جرات مندارادوں کے درمیان گھر جاتا ہے۔ اس طرح وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم نے نظام خداوندی کے مرکز کے گرد ہی جمع ہونا ہے۔ اسے چھوڑ کر کہیں اور نہ نکل جانا اور تمہارے ہر اقدام کی جواب طلبی ہونی ہے۔ (یہ خیال اگر تمہارے دل میں جاگزیں ہوا۔ تو یہ ذاتی جذبات تمہارے حوصلوں کو پست نہیں کر سکیں گے)۔

عمر اور زندگی میں فرق:

خطاب ان سے ہے جو طبیعی طور پر (عام مضمون میں) زندہ ہیں۔ زندہ انسانوں سے یہ کہنا کہ یہ پروگرام تمہیں زندگی عطا کرے گا۔ زندگی اور زندگی کے نازک لطیف اور عمیق فرق کو سامنے لاتا ہے۔ ایک زندگی تو محض نفس شماری کی زندگی ہے۔ اس میں حیوان اور انسان سب سانس لیتے ہیں۔ دوسری زندگی اقدار خداوندی کے تحت زندگی ہے۔ جس میں موت سے بھی حیات جاوید

حاصل ہوجاتی ہے ۔

جی لیا چار دن جوانی میں
زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

زندگی اور عمر کا فرق قرآنی مفہوم میں موت اور حیات میں ہے۔عمر سانس لینے کی طبعی حیات ہے۔ جسے سو سال سے ماپا جاتا ہے۔اس عمر میں ''زندگی'' اس حصّہ کا نام ہے۔ جو شرف انسان کی سطح پر کسی بلند مقصد کیلئے گزاری جائے۔موت کے بعد عمر تو ختم ہو جاتی ہے۔لیکن زندگی آگے (ساتھ) جاتی ہے۔اس آیت کا آخری حصّہ بڑے غور کا متقاضی ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (8:24)

قرآن کے مطاق مجاہدانہ (سعی وعمل) کی زندگی بسر کرنے کیلئے عزم راسخ کی ضرورت ہوتی ہے اگر اس میں ذرا بھی تذبذب ہوگیا تو وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔اس قسم کے عزم راسخ کے راستے میں انسانی مفاد پرستی کے جذبات حائل ہوجاتے ہیں جو کبھی ادھر اور کبھی ادھر لے جاتے ہیں۔ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''المرء اور قلب'' کے الفاظ انہی بنیادی معنوں میں آئے ہیں المرء (م را) سے مراد کمال مردانگی انسانی جذبات اسے ایک مقام پر ٹکنے نہیں دیتے۔ان دونوں میں کشمکش جاری رہتی ہے۔مومن کے ایمان کا تقاضا کمال مردانگی یعنی عزم واستقلال ہے کہ وہ تزلزل نہ ہو تذبذب کا شکار نہ ہو۔اس استقامت کیلئے ضروری ہے کہ یہ افراد اپنے مرکز کے گرد جمع رہیں اور ادھر ادھر نہ ہوں اور یہ بات قانون مکافات پر یقین محکم سے پیدا ہوسکتی ہے۔ورنہ ایسی تباہی آتی ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (8:25)

(اگر تم میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو اس تذبذب کا شکار ہوں) تو اس سے جو تباہی آتی ہے وہ پھر ان مجرموں تک ہی مخصوص نہیں رہتی بلکہ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے کیونکہ خدا کا قانون نتیجہ خیزی میں بڑا شدید واقع ہوا ہے۔ اجتماعی اعمال کے نتائج بھی اجتماعی ہوتے ہیں اس لئے محتاط رہو اور اپنے ہاں ایسی صورتحال مت پیدا کرنا۔

❁❁❁

اجتماعی تباہی،عرّوج وزوال کے غیر متبدّل اصول

یعنی تمام حوادث کا تعلق تو طبیعی قوانین سے ہے۔وہ کافر و فاسق و مومن میں تمیز نہیں کرتے۔ان سے حفاظت بھی طبیعی قوانین سے رجوع کر کے ملتی ہے۔سیلاب مسجد و مندر میں تمیز نہیں کرتا مومن اور کافر کا فرق آگے آتا ہے۔جو ایمان کی قوّت کے ساتھ پر عزم حوصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔جس طرح احد میں شکست کے اسباب کا ازالہ کر دیا گیا مایوس نہیں ہوئے پھر تازہ ولولوں کے ساتھ مسلسل جدو جہد کی۔اور کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

قوموں کے عرّوج وزوال وفنا وبقاء کا عظیم اصول جو کشمکش حق و باطل کا آخری مرحلہ میدان جنگ میں ہوتا ہے:۔جنگ کا مقصد صرف اور صرف۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ (8:8)

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ (9:40)

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ (8:42)

تا کہ جن نے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہے اور جسے ختم ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ختم ہو۔یہ ہے قوموں کے عرّوج وزوال و بقا وفنا کا عظیم اصول یعنی کوئی کام خدا کی چہیتی نہیں ہے جو جی میں آئے کرتی رہے۔زندگی کی کامیابیاں اور کامرانیاں اس کے ہمرکاب رہیں گی اور نہ کوئی قوم سوتیلی اولاد کہ وہ کتنی صلاحیتّوں کی مالک ہو اور وہ راندہ درگاہ ہو جائے۔یہاں ایسی دھاندلی نہیں ہے جو قوم یہ دلائل و براہین ثابت کر دے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے وہی زندہ رہے گی جو ایسا ثابت نہ کر سکے تو وہ زندہ نہیں رہ سکے گی۔کشمکش حق و باطل کا مقصد یہی ہے جس کا آخری مرحلہ میدان جنگ میں ہوتا ہے جہاں یہ صلاحیتیں نکھر کر،ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

نفسیاتی تبدیلی سے خارجی احوال بھی بدل جاتے ہیں

اِذْ یُرِیْکَھُمُ اللّٰہُ فِیْ مَنَامِکَ قَلِیْلًا ؕ (8:43) جب تمہاری نگاہوں میں دشمنوں کی تعداد کو تھوڑا کر کے دکھایا۔

وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ (8:43) اگر تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو پھر تم ہمت ہار دیتے اور جنگ کے معاملے میں باہم جھگڑنے لگتے۔ لیکن خدا نے تمہیں اس صورت حال سے محفوظ رکھا اس لئے کہ خدا کو معلوم ہے کہ انسان کے دلوں میں کیا کیا خیالات گزرتے ہیں۔ یعنی تم جان گئے تھے کہ ان کی کثرت ان کے کسی کام نہیں آئے گی۔

وَاِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّیُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ (8:44) اور جب تم دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو ان کی نگاہوں میں تم کم دکھائی دیتے تھے۔ (یعنی دو چند تم سے حالانکہ وہ تم سے سہ چند سے بھی زیادہ تھے 3/12) چونکہ تم استقامت وخلوص کے ساتھ میدان میں آئے تھے۔ اس لئے دشمن کی کثیر تعداد تمہیں مرعوب نہ کر سکی۔ (3:172) ان کی نگاہوں میں تمہیں تھوڑا کر کے دکھایا گیا۔ (کیونکہ وہ قوّت کے نشہ میں بدمست تھے اور تمہیں خاطر میں نہیں لاتے تھے)۔ یعنی زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے خارجی حوادث میں کس طرح تبدیلی واقع ہو جاتی ہے یہ ہے نفسیاتی تبدیلی (8/53) ملائکہ کی نصرت کو عصر حاضر میں نفسیاتی تبدیلی کہا جاتا ہے جس سے اطمینان میسر آجاتا ہے۔ اس سے مجاہدین کی نگاہوں میں دشمن جچتے ہی نہیں تھے وہ تعداد سے بھی کم نظر آتے تھے۔ دوسری طرف مخالف نشہ قوّت میں بدمست تھے جس سے ان میں احساس برتری پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجاہدین کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ دونوں کی نگاہوں میں فریق مقابل کم نظر آتا تھا۔ مجاہدین میں یہ تبدیلی اطمینان قلب کی وجہ سے تھی جبکہ مخالفین میں تبدیلی قوّت کے نشہ کی پیدا کردہ اس نفسیاتی تبدیلی کا جذبہ محرّ کہ بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ اسے اگلی آیات میں بتایا گیا ہے۔

چھوٹی جماعت کس طرح سے بڑی جماعت پر غالب آتی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۴۶﴾ (8:45-46) بڑی جماعت پر چھوٹی جماعت

کیسے غالب آتی ہے۔ یاد رکھو کہ ہر حالت میں ثابت قدم رہو اور قوانین خداوندی کو شدت سے ملحوظ رکھو۔ (ہر قدم اس کی روشنی میں اٹھاؤ) یہ کرو گے تو یقینا کامیابی ہوگی۔

ہر معرکہ میں قوانین خداوندی کی نگہداشت، مصائب و مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرنا سربراہ کی اطاعت کرنا۔ آپس میں جھگڑنا نہیں ایک تبدیلی اس طرح سے ہوگی۔ تو فتح و کامرانی یقینا تمہارے ساتھ ہوگی۔

دوسرا گروہ (جذبہ محرّکہ):

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (8:47)

انداز نگاہ اور مقاصد کا فرق دونوں فریقوں کا مجاہدین کا بلند مقصد نہ صلہ کی امید، نہ ستائش کی تمنا۔ صرف بلند اقدار کا حصول جذبہ محرّکہ جبکہ دوسرے فریق کا جذبہ محرّکہ قوّت و دولت کی نمود اور ان بلند مقاصد کو طاقت اور دھاندلی سے روکنے کی تمام کوششیں۔

نفسیاتی تغیرّ کا عظیم اصول جس کی بنیادوں پر افراد اور اقوام کی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (8:53) یہ سب اس لئے ہوا کہ خدا کا یہ محکم قانون ہے کہ وہ کس قوم کو جو زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں اس میں اس وقت تک تبدیلیاں نہیں کرتا جب تک کہ وہ قوم اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلیاں پیدا نہ کرے جن سے وہ ان خوشگواریوں کی اہل نہ رہے۔ یہ عرّوج و زوال یونہی اندھا دھند واقع نہیں ہوتا یہ سب اس کے محکم اصولوں کے مطابق ہوتا ہے جو سب جانتا اور سنتا ہے۔

نفسیاتی تغیرّ کے بغیر خارج سے انقلاب ممکن نہیں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝ (13:11) نہ اسے کوئی روک سکتا ہے اور نہ پھر کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔ یعنی جس قسم کا زاویہ نگاہ اس قسم کی زندگی ہے

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا میرا دل ہے
بدل جانے سے ان کے رنگ ہر چیز کا بدلا

ان تغیرّات کا تعلق تو جذبات سے ہے قرآن کے پیش نظر تو اقدار کا تغیرّ ہے یہ ہے تعمیر خودی جس کے احاطہ میں جذبات اور اقدار دونوں آجاتے ہیں۔

قرآن خودی کو مسلمان کرنے کو ایمان کہتا ہے، یہ دل کی تبدیلی کا نام ہے۔

674
وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ‌ؕ (49:14) دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو پھر اقدار بدل جاتی ہیں۔ یہ ہے تغیرّ نفس۔ جس طرح صدر اول میں اس جماعت کا۔ اشیائے کائنات کی قدر و قیمت بدل گئی تھی۔ جس طرح ان کی معیشت کا سارا دارو مدار مال غنیمت اور جنگ میں گرفتار شدہ غلام اور لونڈیاں تھیں۔ معاشرے میں تمام کام غلام کرتے اور لونڈیاں بے محابہ جنسی خواہش کی تسکین کا سامنا پہنچاتیں۔ یہ مفاد اور جاذبیتیں ان کیلئے جنگ کے محرکات بنتے۔ قرآن نے یک جنبشِ قلم ان دونوں محرکات کو ختم کر دیا۔

مال غنیمت مملکت کی تحویل میں اور جنگ کے قیدیوں کے متعلق بتا دیا کہ آج سے غلامی بند ہے۔ جنگ کے ان محرکات کو ختم کر کے دیا تو جنگ کیلئے ان کا جوش و جذبہ ختم ہونا چاہئے۔ تھا۔ لیکن ان کی بہادری اور جرأت کی مثال نہیں تھی۔ یہ کس طرح ہوا کیونکہ ان کا زاویہ نگاہ بدل دیا گیا۔ جذبہ محرّ کہ اعلائے کلمۃ الحق بن گیا اور ان کی نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت اتنی بلند ہوگئی کہ مال غنیمت اور غلام لونڈیوں کی کشش اس کے مقابلے میں ہیچ نظر آنے لگی۔ یہ تھی ایمان کی رو سے قدر و قیمت کی تبدیلی۔ اس تغیرّ نفس سے خارج میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی جس کے تصوّر سے ہم نہیں، ساری دنیا کو حیرت ہے کہ یہ تغیرّ نفس کس طرح پیدا ہوگیا۔

رسالت کا فریضہ:

وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ (62:2) تعلیم کتاب وحکمت وتزکیۂ نفس یعنی انسانی ذات کی نشوونما اور تطہیر ذات۔ ایسی تعلیم کہ ان افراد کے دل میں ان احکامات کی غرض و غایت گہرائیوں میں اتر جائے تا کہ اشیائے کائنات کی اقدار کے پیمانے بدل جائیں۔ تیرہ سالہ مکی دور میں ان نو مسلموں میں یہ تغیرّ نفس پیدا کر دیا۔ جو اس سے پہلے ہر قسم کے جرائم اور معائب سے معمور تھے۔ ایسی تبدیلی پیدا کر دینا کہ فرد اور خدا اور ملائکہ تحسین و آفرین کے پھول نچھا کریں۔(33:43)

نگاہ کی تبدیلی کا احساس تو سیکولر قوموں میں بھی ہے جو وطن پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرتی ہیں اپنی نسل میں۔ اس لئے یہ افراد قومی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں اور وطن کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

اسلام کی خصوصیات:

اسلام بھی امت مسلّمہ کو ''مفاد طلبی'' کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن وہ انفرادی مفاد کے مقابلہ میں اپنے وطن اور قوم کے مفاد کو ترجیح دینے کی بجائے عالمگیر انسانیت کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے یہ ہے اس کی تعلیم۔

وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ‌ ؕ (13:17) وطنیت کا نتیجہ تمام اقوام سے عداوت اور نفرت ہوتا ہے سوائے اپنی قوم کے۔

موجودہ حالات:

یہاں تغیرّ نفس کے بغیر تغیرّ احوال کی کوشش کی جاری ہے اسے بدقسمتی سے احیاء اسلام کہا جاتا ہے۔ تغیرّ نفس کے بغیر تغیرّ

احوال کی کوشش کرنا اور سمجھنا کہ اس میں ہمیں کامیابی حاصل ہو جائے گی درحقیقت خدا کو چیلنج دینے کی بات ہے۔ارشاد ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ (8:53) یہ تو خدا بھی نہیں کرتا۔ تغیرّ نفس کے بغیر احوال کی تبدیلی کا دعویٰ کرنے والے فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۔(18:105)

ساری کوششیں رائیگاں جائینگی۔ ہم دنیا کو باور کرا رہے ہیں کہ اس طرح سے اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔ جب یہ کوششیں ناکام رہ جائینگی تو دنیا اسلام کے بارے میں یہ رائے رکھنے میں حق بجانب ہوگی کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے اور اس میں دوبارہ زندہ ہونے کی سکت اور صلاحیت نہیں۔ فقہ کے صدیوں فرسودہ اور ناقابل عمل قوانین میں قدرے ترمیم کر کے ان کو اسلام قوانین کے نام سے نافذ کرتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ساتھ ساتھ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ یہ ناقابل عمل ہیں۔ اگر قوانین کا احترام دل میں نہ ہو۔ تو ان پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

قرآن کا طریق یہ ہے کہ پہلے ان قوانین کی وضاحت کر کے اس کی غرض و غایت، مقصود و منتہیٰ بتا کر ان کے فوائد بتائیں جائیں کہ اس طرح سے دنیا و عاقبت سنورے گی۔ اس سے تغیرّ نفس پیدا ہوگا اور قانون کا احترام اعماق قلب سے ابھرے گا۔ تغیرّ نفس کے بغیر قانون سازی یا نفاذ قانون کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ ادھر قانون مرتب کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور قوانین شکن عناصر ان قوانین سے گریز، اغماض یا فرار کی راہیں تراش رہے ہوتے ہیں۔

جرائم کس طرح سے ختم ہو سکتے ہیں؟:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ (4:65) قانون کے مطابق فیصلہ سے دل میں گرانی محسوس نہ کرنا تغیرّ نفس کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لئے تو جرائم کی تعداد بڑھ رہی ہے کیونکہ قانون کا احترام اٹھ گیا ہے اور یہ احترام تغیرّ نفس کے بغیر ناممکن ہے اور تغیرّ نفس صحیح تعلیم و تربیّت اور ارباب اقتدار و اثر کی سیرت و کردار کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے چائے کیلئے پتیلی سارے سامان کے ساتھ چولہے پر رکھیں اور آگ نہ جلائیں۔

❁❁❁

جنگ کے سنہرے اصول

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِىۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ﴿۶۲﴾ (8:61-62)

کس قدر بلند پایہ اور بے مثال اصول ہے۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کا مقصد جنگ کرنا نہیں بلکہ امن وسلامتی کی فضا پیدا کرنا ہے میدان جنگ میں جب دشمن پسپا ہورہا ہو، غالب فریق تو اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھے گا۔

اگر اسے درخور اعتنا سمجھ بھی لے تو دشمن سے ذلت آمیز شرطیں منوائے گا۔ قرآن کا حکم ہے کہ جن حالات میں بھی مخالف آمادہ بہ صلح ہو اس کی پیش کش کو قبول کرو۔ اگر یہ سمجھو کہ وہ شکست کے نقصانات سے بچنے کیلئے صلح کی پیش کش کو بطور حربہ استعمال کر رہے تو بھی اسے یونہی مسترد نہ کرو۔ دشمن اگر دھوکہ بھی دینا چاہے گا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس سامان تقویت قوانین خداوندی سے عطا ہونیوالی نصرت اور جماعت مومنین کی رفاقت ہے۔

وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۳﴾ (8:63) آپس میں اس قدر محبت اور الفت اس جماعت کا وطیرہ بن گئی۔

قیدیوں کے بارے میں لازوال اور بے مثال اصول:

مَا كَانَ لِنَبِىٍّ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗۤ اَسۡرٰى حَتّٰى يُثۡخِنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ تُرِيۡدُوۡنَ عَرَضَ الدُّنۡيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۷﴾ (8:67) لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۶۸﴾ (8:68)

یاد رکھو! کہ تم دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمی گرفتار کرلو تاکہ ان کے زرفدیہ سے تمہارے پاس بہت سامال جمع ہوجائے۔ (47:4) جنگ کا مقصد دولت حاصل کرنا نہیں بلکہ نظام خداوندی کا قیام ہے۔ اس کیلئے ملک میں ایسا غلبہ اور اقتدار ہو کہ مخالفین بے دست پا ہوجائیں۔ تم قریبی پیش پا افتادہ مفاد حاصل کرنا چاہتے ہو جبکہ قانون خداوندی کی نگاہ مستقبل پر ہے۔ یاد رکھو! اس قانون میں غلبہ اور حکمت دونوں شامل ہیں۔ تم غلطی سے ایسا کرنے لگے تھے یعنی جنگ میں کامیابی پر نگاہ کی بجائے اپنی نگاہ دشمن کے

قیدیوں پر گرفتاری پر رکھنا۔تم یہ غلطی کرنے لگے تھے۔ یہ بات نبی کے شان شایان نہیں لگی۔

اگر قانون میں پہلے سے یہ گنجائش نہ رکھی ہوتی اس قسم کی غلطی سے درگزر کرنے کی گنجائش۔ تو جو کچھ تم کرنے لگے تھے۔ اس پر تمہاری سخت گرفت ہوجاتی۔(68)

مال غنیمت کو مملکت کی تحویل میں دیدیا گیا۔جنگی قیدیوں کے متعلق کہہ دیا گیا کہ تمہاری نگاہ اس پر نہیں ہونی چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ قیدی گرفتار ہوں مقصد جنگ کا یہ ہے کہ مخالفین سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔

قیدیوں کے بارے میں احکامات:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى (8:70)

اے نبی ﷺ! جو قیدی تمہاری گرفت میں آچکے ہیں ان سے کہہ دو۔

اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (8:70) ہم قانون خداوندی کی رو سے دیکھیں گے کہ اگر تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات ہیں تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے کہیں بہتر دیا جائے گا اور تمہیں ہر قسم کی حفاظت دی جائے گی۔

اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (8:70) اگر خیانت کے جذبات پائے گئے جس طرح اس سے قبل خیانت کے نتائج تمہیں مل چکے۔ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ (8:71) تو حشر یہ تھا کہ جماعت مومنین کو ان پر غلبہ دیدیا گیا تھا۔

کسی قوم سے معاہدات کی صورت میں مسلمانوں کی بھی مدد نہیں کی جاسکتی:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾ (8:72)

یعنی ان لوگوں سے جو مسلمان ہونے کے باوجود نظام کیلئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہیں آئے تو ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنا۔ جو اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔ دنیا کے معاملہ البتہ مدد مانگیں تو پھر لازماً ان کی مدد کرو۔لیکن اگر یہ مدد اس قوم کے خلاف ہو جن سے کوئی معاہدہ کیا ہے تو پھر نہیں کرسکتے۔ یہ ہے معاہدات کی اہمیّت قرآن کی نظروں میں۔

درمیانی راہ چلنے والے یعنی مُّقۡتَصِدٌ

ایک تو واضح ہے ٹھیک ہے اور مستقیم راہ ہے۔ جس وَعَلَى اللّٰهِ قَصۡدُ السَّبِيۡلِ (16:9)

راغب کے مطابق اَلۡاِقۡتِصَادُ۔ دو طرح کا ہے ایک محمود اور دوسرا مذموم۔ محمود وہ راستہ جس میں افراط و تفریط کے دونوں سرے ''Extremes'' چھوڑ کر درمیانی راستہ اختیار کیا جائے جیسے ''وَاقۡصِدۡ فِىۡ مَشۡيِكَ (31:19) چال میں میانہ روی اختیار کرو۔ یہ محمود روش ہے کیونکہ رفتار میں تیزی اچھی ہے اور نہ سستی۔ مثلاً عدل اور ظلم کے بین بین رہنا۔ ایسا شخص جو ان دو ایکسٹریمیز (سروں) کے بین بین چلے تو اسے مُّقۡتَصِدٌ کہتے ہیں۔ مثلاً ایک طرف اسراف اور دوسری طرف (بُخل) ہے یہ دونوں سرے مذموم ہیں۔ محمود روش ان دونوں کے بین بین ہے یعنی جود و سخا۔ نہ بے جا فضول خرچی اور نہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لینا۔ یہ اِقۡتِصَادُ (میانہ روی) قابل محمود ہے۔ دوسری مثال حق و باطل ہے۔ ان میں حق محمود جبکہ باطل مذموم ہے۔

ان دونوں کے بین بین چلنا خوبی کی بات نہیں۔ قابل ستائش وہی ہے جو حق پر چلے نہ وہ جو درمیانی راہ چلے۔ حق تو اٹل ہے جو ایک انچ بھی ادھر سے ادھر ہو تو وہ باطل پر آ گیا۔

اس طرح عدل اور ظلم اگر دو سرے ہوں۔ ایک شخص جو درمیانی راہ چل کر کبھی عدل، کبھی ظلم یا نہ وہ عدل کرے اور نہ ظلم بلکہ لاتعلق رہے۔ تو اس کا یہ عمل قابل ستائش نہیں ہوگا۔ اگر عدل کے پیمانے سے ماپا جائے اگر ظلم کے پیمانے سے ماپا جائے تو بحر حال یہ ظلم سے بہتر ہوگا۔ قرآن نے وارثین کتاب کی مثال دی ہے۔

فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ (35:32)

ظالم، میانہ رو اور نیکیوں میں سبقت لے جانے والا۔ ان میں قابل ستائش تو نیکیوں اور اچھائیوں والا ہے اور ظلم کرنے والا بدتر جبکہ بین بین جو نہ بھلائی کرتا ہے اور نہ ہی ظلم۔ یہ طبقہ گروہ اوّل سے ذرا اونچا ہے۔ تیسرے گروہ سے نیچے لیکن یہ روش قابل ستائش نہیں ہے۔ قابل ستائش تو صرف ''سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ (35:32)'' ہونگے۔

یہ جو اسلام کو اعتدال کا راستہ اور ''اُمَّةً وَّسَطًا (2:143)'' تو حق پر چلنے والی جماعت نہ کہ حق و باطل اور عدل و ظلم کے درمیان چلنے والی جماعت بلکہ ایسی جماعت جو دنیا کی ہر قوم سے یکساں فاصلے پر ہو نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی اور نہ اس سے دور بلکہ سب پر نگراں ایک جماعت۔

عدل وانصاف کا ایک درخشندہ اصول

ذرا تصوّر میں لائیے اس منظر کو مخالفین کے ساتھ جنگ ہورہی ہے۔ان کا کوئی فرد مسلمانوں کے ہاں پناہ کا طالب ہے۔اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا۔فرمایا۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ (9:6) ان مشرکین میں سے اگر کوئی (جن سے معاہدات کالعدم ہو چکے ہیں) تمہارے پاس آ کر پناہ مانگے تو اسے پناہ دو پھر اسے قرآن کے ذریعہ یہ سمجھاؤ کہ اس میں کیا کیا خوشحالیاں ہیں اگر وہ اسے قبول نہ کرے اور وہ جانا چاہے تو بہ حفاظت اس کی پناہ گاہ تک پہنچاو۔

کھلا دشمن ہے۔جنگ کر رہا ہے مگر یہ ساری عداوتیں بھول جاؤ اور اسے پناہ دیدو اور اس کے بعد کیا زبردستی مسلمان کرلوں؟ کہا قطعاً نہیں۔اس کے سامنے یہ تعلیمات پیش کرو اگر وہ اسے قبول نہ کرے اور واپس جانا چاہے تو اسے حفاظت سے پہنچادو۔یہ ہے مذہبی آزادی۔الزام لگاتے ہیں کہ اسلام زورِ شمشیر پھیلا ہے۔یہ پناہ گزین،غیر مسلم،ہر طرح سے مسلمانوں کے قبضہ میں۔اس سے تو جو جی چاہا منوایا جاسکتا تھا۔

”یَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَکۡبَرِ“ (9:3)
”حجِّ اکبر“

سورۃ التوبہ:

قرآن کے اسلوب وترتیب کے مطابق ہر ہر سورۃ کے آغاز میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ لکھا جاتا ہے۔لیکن اس سورۃ کے آغاز میں ”بسم اللہ“ نہیں لکھی جاتی۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ حتمی طور پر معلوم نہیں تھا کہ یہ سورۃ سابقہ سورۃ انفال ہی کا حصّہ ہے یا الگ سورۃ ہے اس اختلاف میں تطبیق کی صورت یہ پیدا کی گئی کہ اسے تسلیم تو الگ سورۃ کیا گیا لیکن اس کے آغاز میں ”بسم اللہ“ نہیں لکھا گیا۔حالانکہ آغاز بسم اللہ کی چنداں اہمیّت نہیں رہتی۔ یہ نویں سورۃ ہے۔

کعبہ کی اہمیّت ”یَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَکۡبَرِ (9:3)“:

اسلام کے نظام میں کعبہ کو کس قدر اہمیّت حاصل ہے۔ پورا قرآن شاہد ہے ہجرت کے بعد اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی گئی۔ وہ آہستہ آہستہ مستحکم ہو کر پھیلتی گئی۔ منشائے خداوندی کے مطابق کعبہ کو انسانیّت کی عالمگیر اجتماعیت کا مرکز بنتا تھا۔اس کا آغاز تو آغاز مملکت اسلامیہ سے ہونا چاہئے تھا جبکہ مدنی زندگی ابتدائی آٹھ سال میں مدینہ اس کا دارالخلافہ تھا۔لیکن کعبہ غیر مسلموں کے قبضہ میں تھا۔ 8ھ میں کعبہ فتح ہوا۔ 9ھ حجّ کا اعلان ہوا۔حضور ﷺ تو شریک نہ ہو سکے۔ اپنی جگہ امیر حجّ ابوبکرؓ کو مقرر کیا۔ پورے 23 سال اس روز سعید کے انتظار میں گزرے تھے۔اس اجتماع کی اہمیّت کا اندازہ لگائیے۔

حجّ اکبر:

اس اعتبار سے قرآن میں اسے اَلۡحَجِّ الۡاَکۡبَرِ (9:3) کہا گیا ہے جس کے ایجنڈے میں سرفہرست یہ حکم تھا کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ اب سے کعبہ کی تولیت خالصتاً امت مسلم کے ہاتھوں میں رہے گی اور کوئی غیر مسلم ان میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ فتح مکہ کے بعد وہاں کے مشرکین اسلام آئے تھے۔لیکن ہنوز قبائلی اطراف وہ ایک جوانب میں مشرک تھے۔لیکن مملکت مدینہ کے ساتھ ان کے معاہدات تھے۔ان کی اطلاع کیلئے اس تبدیلی کا اعلان مملکت اسلامیہ کی طرف سے تھا۔

مشرکین سے مراد:

یہ وضاحت ضروری ہے کہ قرآن میں جہاں مشرکین کے ساتھ معاہدات ان کی تنسیخ یا ان کے خلاف اعلان کا ذکر ہے۔ اس سے مراد اس زمانے کے مخالفین اسلام تھے نہ کہ ساری دنیا اور مستقبل کے مشرکین۔ کعبہ کی تولیت بھی ان کے نظم ونسق میں غیر مسلموں کو شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔لیکن ان کو مخصوص شرائط کے ساتھ کعبہ میں آنے کی اجازت تھی تا کہ وہ مبصرین کی حیثیت سے اس اجتماع میں شریک ہو کر اس نظام کی منفعت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ عمرؓ کے زمانے میں غیر مسلم کعبہ میں آتے جاتے تھے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (9:1) اے جماعت مومنین! تم ان مشرکین عرب کے متعلق جن کے ساتھ تم نے معاہدات کئے تھے۔لیکن وہ اپنے معاہدہ پر قائم نہیں رہے۔(3:4) اعلان کر دو کہ نظام خداوندی ان تمام معاہدات کو کالعدم قرار دیتا ہے یہ اعلان دبدبہ اور طظنہ کے ساتھ ایک ایسی مملکت کی طرف سے ہے جو اپنے معاملات میں بلاشرکت غیرے صاحب اقتدار ہے۔ ایسا نہیں کہ اعلان ہوا کہ پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ بلکہ کہا۔

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝ (9:2) چار ماہ تک بلا روک ٹوک اس مملکت میں رہ سکتے ہیں۔ اگر یہ پر امن شہری بن کر رہیں تو فبہا ورنہ ان سے جنگ ہو گی اور یہ نظام خداوندی کو اپنی حرکتوں سے بے بس نہیں کر سکتے۔ اس نظام میں اتنی قوت ہے کہ ان کو نیچا دکھا دے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْۗءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ڏ (9:3) آج اس عظیم اجتماع کے دن مملکت کی طرف سے تمام لوگوں کی اطلاع کیلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ نظام مشرکین کے تمام معاہدات سے بری الذمہ ہے۔

فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ (9:3) ان سے کہو کہ اگر سرکشی سے باز آ جاؤ تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ (9:3) اگر تم نے روگردانی کر کے سرکشی اختیار کی تو یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم اس نظام کو بے بس کر دو گے۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (9:3) تو ان کو المناک سزا دی جائے گی۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا (9:4) بجز ان مشرکین نے جن کے ساتھ معاہدات تھے اور انہوں نے ان کے پورا کرنے میں نہ تو کمی چھوڑی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی۔

فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (9:4) تو ان کے ساتھ جتنی مدت کا معاہدہ ہوا ہے اس مدت کو پورا کرو۔ کیونکہ قانون خداوندی اپنے معاہدات کی نگہداشت کرنے والوں کو پسندیدہ قرار دیتا ہے۔

حجّ کا عالمگیر اجتماع اور اس کی غایت

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مومن وہ ہے جب قتال فی سبیل اللہ ہو رہا ہو تو اس میں شامل ہو جائے جب وہ نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین ہوتا ہے یعنی نظام خداوندی کو تمام باطل نظاموں پر غالب کرنا۔ تو اس کی ساری زندگی اس کے قیام اور اس کے بعد اس کے تحفظ اور بقاء کیلئے وقف جدوجہد ہوتی ہے ان کو عام الفاظ میں عبادات کہا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت اس پروگرام کی مختلف کڑیاں ہیں۔ صیام اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مہینہ بھر کے اس تربیّتی کورس کی تکمیل کے بعد جشن مسرت عید الفطر منایا۔ پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی کا آغاز ہو گیا۔ یہ کڑی ہے ''حجّ'' یہ دراصل نمائندگان امت کی ''سالانہ عالمگیر کانفرنس'' ہے جس میں اس نظام کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ دلائل و براھین کی رو سے تمام امور مملکت پر بحث و تمحیص ہوتی ہے اور آئندہ سال کا پروگرام مرتب کیا جاتا ہے۔ ان نمائندوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی مبصرین کی حیثیت سے دعوت دی جاتی ہے کہ وہ آکر دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کیلئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

زمانہ قبل از اسلام حجّ:

عربوں کے ہاں یہ اجتماع ہوتا تھا قریش جو کعبہ کے متولی تھے وہ اس کا اہتمام کرتے تھے اور دور ونزدیک کے لوگ جوق در جوق شریک ہوتے تھے۔ کعبہ بتکدہ تھا۔ جس میں مختلف قبیلوں کے بت نصب تھے۔ یہ قبائل اپنے اپنے بتوں کی پوجا کرتے۔ ان کے استھانوں (آستانوں) پر جانور ذبح کرتے۔ اوہام پرستی کے عجیب و غریب مظاہرے ہوتے۔ میلہ کا سماں ہوتا یہ میلہ تجارتی مرکز کا بھی کام دیتا۔ یہ بین القبائل اجتماع کا اہتمام تو ذی الحجّہ کے مہینے میں کرتے لیکن رجب کے مہینے میں اجتماع ہوتا تھا جسے وہ عمرہ سے تعبیر کرتے۔

چونکہ عرب ایک بے برگ وگاہ ریگستان پر مشتمل تھا اور اب بھی ایسا ہی ہے اس لئے ان کی ساری معیشت کا دارومدار زیادہ تر لوٹ مار پر تھا یہ لوٹ مار قزاقی اور رہزنی کی شکل میں بھی ہوتی اور جنگ میں مال غنیمت کی صورت میں بھی۔ اس لئے اس ملک میں سفر کرنا بڑے خطرات کا سامنا کرنا تھا۔

بین القبائلی معاہدہ:

حجؔ کے اجتماع کی اہمیّت کے پیشِ نظر انہوں نے ایک بین الاقبائلی معاہدہ کر رکھا تھا۔ آج کی اصطلاح میں (Convention) کہہ لیجئے۔اس معاہدہ کی رو سے حجّ سے پہلے (ذی قعدہ) حجّ کی تقریب پر (ذی الحجّہ) اور حجّ کے بعد (محرم) تین مہینے اور ادھر عمرہ کے سلسلے میں (رجب) کا مینہ (شھر الحرام) تسلیم کئے جاتے تھے۔یعنی ایسے مہینے جن میں ہر قسم کی کی لوٹ مار اور جنگ وجدال حرام ہوگی۔کعبہ کے متولیوں نے اسے بھی کسی طرح کا کاروبار کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔اسلام میں بھی حجّ کے اجتماع کیلئے ''ذی الحجّہ'' کا مہینہ رہنے دیا گیا اور حرمات کے چار مہینوں میں جنگ پر پابندی کو بھی قائم کر رکھا۔لیکن اس اجتماع کی روح اور مقصد کو یکسر بدل دیا۔

❁❁❁

قمری اور شمسی کیلنڈر، قرآن کا اعلان شمسی کیلنڈر

قمری اور شمسی کیلنڈر:

''اِهلال'' کے معنی آواز بلند کرنا۔ چونکہ عربوں کے ہاں مہینے کی ابتداء چاند کی پہلی تاریخ سے ہوتی تھی۔ اس لئے جو شخص سب سے پہلے چاند دیکھ لیتا وہ اونچی آواز سے لوگوں کو مطلع کرتا۔ اس سے نئے چاند کو ہلال کہنے لگے۔ اس لئے ان کے ہاں قمری مہینے اور قمری سال کا رواج تھا۔ حالانکہ قرآن نے ماہ وسال کے حساب کیلئے چاند کی کوئی تخصیص نہیں کی۔ شمسی اور قمری دونوں قسم کے سال رکھے جاسکتے ہیں۔

وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ حُسۡبَانًا ؕ (6:96) اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۙ﴿۵﴾ (55:5)

چاند کی منزلیں یعنی گھٹنا بڑھنا۔

وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَالۡحِسَابَ ؕ (10:5)

یعنی قرآن کی رو سے تقویم یعنی کیلنڈر شمسی بھی ہوسکتا ہے اور قمری بھی۔ عربوں کے ہاں قمری تقویم زیادہ آسان تھی۔ (کیلنڈر) لیکن زرعی نظام میں ایک دقت پیش آجاتی ہے۔ زراعت کے پروگرام موسموں سے وابستہ ہوتے ہیں اور موسموں کا تغیرّ سورج کے حساب سے ہوتا ہے نہ کہ چاند کے حساب سے۔ رمضان کا مہینہ کبھی سردی میں آتا ہے اور کبھی گرمی میں لیکن گندم کی کٹائی کیلئے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ کبھی سردی کے مہینے میں ہو اور کبھی گرمی کے اس لئے زرعی نظام سورج سے وابستہ رہ سکتا ہے۔ ویسے بھی سورج کی رو سے زمین سورج کے گرد 365 دنوں میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ جسے سال کہا جاتا ہے اور اس طرح ہر مہینہ اسی موسم میں آتا ہے۔ زمین کے اس چکر کو پورا کرنے میں جو تھوڑا سا فرق رہ جاتا ہے۔ اسے ہر چار سال کے بعد فروری کے مہینے میں ایک دن کا اضافہ کر کے پورا کرلیا جاتا ہے۔ اسے Leap year کہتے ہیں۔ لیکن قمری سال تو شمسی سال سے دس دن کم ہوتا ہے جس کے معنی ہر تین سال کے بعد ایک مہینے کا فرق اور ہر چھتیس سال کے بعد ایک سال کے فرق کے ہیں۔ زرعی معیشت میں اگر قمری سال رائج ہو تو انہیں ہر تین سال کے بعد ایک ماہ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ تا کہ قمری سال موسموں کے لحاظ سے شمسی سال کے برابر ہو جائے۔

قرآن کا اعلان شمسی کیلنڈر:

یہودیوں کے ہاں بھی ایسا ہوا تھا اور عرب جاہلیہ میں بھی ایسا ہی۔ ہندوؤں کے ہاں ابھی تک یہی سسٹم جاری ہے۔ ان کے ہاں ہر تین سال کے بعد قمری سال بارہ کی بجائے تیرہ ماہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ اسے لوند کا سال کہتے ہیں۔ لیکن عربوں کے ہاں زراعت کے علاوہ مہینوں کا تعین ایک اور نقطہ نگاہ سے بھی اہم بلکہ اہم ترین تھا۔ وہ ان کے ہاں سال میں چار مہینے حرام یعنی واجب الاحترام تھے۔ جن میں جنگ وجدل بھی بند اور لوٹ مار بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مہینے متعین ہونے چاہئیں اور ہر ایک کو معلوم بھی۔ دو سال تک تو یہ مہینے متعین اور معلوم تھے۔ لیکن تیسرے سال جب ایک مہینہ کا اضافہ ہوتا۔ جس کا کوئی نام نہیں ہوتا تھا۔ تو مذہبی پیشواؤں کیلئے کاروبار کا بڑا عمدہ موقع ہاتھ آجاتا۔ سوال یہ ہے کہ ان تیرہ مہینوں میں کون کونسے چار مہینے حرام سمجھے جائیں۔ یہ انتظام بنو کنانہ کی ایک جماعت ''نساۃ'' کے سپرد تھا۔ ''نَسَاءٔ نَسِیءٔ'' کسی چیز کو پیچھے کرنا، موخر کرنا۔ چونکہ ان مہینوں میں تغیّر واستبدال کا اثر بڑے بڑے سرداروں اور تاجروں پر پڑتا تھا۔ اس لئے ان کے مفاد کی خاطر ''نساء'' کرتے کہ کسی سال کسی مہینے کو حرام قرار دیدیتے اور کسی سال کسی دوسرے مہینے کو۔ اس سے معاشرہ میں بڑی گڑبڑ مچتی۔

یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِئُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ (9:37) تو قرآن نے ان کی چالبازیوں کو یہ کہہ کر ختم کر دیا۔ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (9:37)

قرآن کا اعلان شمسی سال کیلئے: بارہ مہینے کا سال:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ (9:36) یہی محکم قانون رائج رہے گا۔ چونکہ تخلیق کائنات سے ہی سال بارہ ماہ کا قانون خداوندی نے طے کر دیا ہے۔

یہ اعلان حجّ کے عظیم اجتماع میں نظام خداوندی کے نمائندے ابوبکرؓ کی طرف سے ہوا۔ جس نے اس نظام کہن کی بساط الٹ دی۔ کہا گیا کہ قانون فطرت کے مطابق سال کے بارہ مہینے ہونے چاہئیں۔ قانون فطرت یہ ہے کہ زمین سورج کے گرد سال میں ایک چکر پورا کرتی ہے۔ اسی مدت کو بارہ پر تقسیم کرنے سے کیلنڈر فطرت کے مطابق ہوجاتا ہے۔ تو یہ مقصد تو صرف شمسی کیلنڈر سے ہی پورا ہوسکتا ہے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ قرآن نے شمسی کیلنڈر'' تجویز کیا تھا۔ جس سے موسموں کا تعین بھی ٹھیک ٹھیک ہوجاتا ہے اور حرمات کے مہینوں کا بھی۔''

❁❁❁

قمری اور شمسی کیلنڈر

ہمارے ہاں:

ہمارے ہاں سال کے بارہ ماہ تو مقرر کر لئے۔لیکن کیلنڈر قمری رہا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سابقہ قمری کیلنڈر میں ہر تیسرے سال ایک ماہ کے اضافہ سے، شمسی اور قمری سالوں میں جو ہم آہنگی ہو جاتی تھی۔ وہ بھی باقی نہ رہی اور شمسی حساب سے بارہ مہینوں کے سال سے جو فوائد حاصل ہونے تھے وہ بھی حاصل نہ ہو سکے اور ہمارے ہاں یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور یہ امر باعث حیرت ہے کہ قرآن کے اس اعلان کے بعد جس سے شمسی تقویم ہی ثابت ہوتی ہے تو بارہ مہینوں والا قمری سال کس طرح سے رائج ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ سن ہجری عمرؓ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا۔لیکن یہ بات کہیں سے معلوم نہیں ہو سکی کہ بارہ مہینوں والا قمری سال کیسے رائج ہوا؟ ہمارے ہاں جو روش جتنی پرانی ہو جائے تو وہ اتنی ہی مقدس ہو جاتی ہے اسے چھوا تک نہیں جا سکتا اور ہمارے ہاں قمری کیلنڈر کو اسلامی کیلنڈر جبکہ شمسی کیلنڈر کو غیر اسلامی قرار دیدیا گیا اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ مذہبی تقاریب کیلئے قمری جبکہ دنیاوی امور کیلئے شمسی کیلنڈر اس تضاد کو دور ہونا چاہئے۔

توہم پرستی:

اوہام پرستی جہالت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ان لوگوں میں بھی جو اپنی نسبت کسی معروف مذہب کی طرف نہ کرتے ہوں۔ جیسے ہم آج کل کے مسلمان جبکہ اسلام علم وبصیرت کا دین ہے اور ہر حکم کی غرض وغایت بتاتا ہے کہ کیوں اور اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ جہالت اور دین یکجا نہیں ہو سکتے۔ دوران جاہلیت عرب حجؒ کے دوران کسی ضرورت کیلئے اگر آنا پڑتا تو گھر کے پچھلے دروازے سے آتے تھے یا دیوار پھاند کر۔ اسلام کے بعد ان تمام اوہام پرستیوں کو ترک کرنے کا حکم ملا۔ یہی وہ راہ ہے جس میں کشاد ہے۔جس طرح زمانہ جاہلیت کی رسمیں توہم پرستی ہیں اسی طرح دین جب مذہب بن جائے تو اس کے ارکان واحکام بھی توہم پرستی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔قرآن ہر حکم کے ساتھ "لَعَلَّكُمْ (6:151)" یعنی ایسا کرنے سے یہ ہوگا جبکہ مذہبی رسوم واعمال اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟ دین کے احکام پر بھی محسوس شکل میں عمل پیرا ہوا جاتا ہے۔اس کے مظاہر کو "شعائر اللہ" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ان شعائر کی نگہداشت اور مذہبی اوہام کی میکانکی طور پر ادائیگی میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دین کے شعائر ورسوم، اس کے نظام کی مختلف کڑیاں اور اس کے بلند وبالا نصب العین کے حصول کے ذرائع ہوتے ہیں۔ مذہب میں یہ ارکان مقصود سمجھے جاتے ہیں۔

حجّ کے ارکان

اسی کو توہم پرستی کہتے ہیں۔ان کی اہمیّت اندھے اعتقاد پر مبنی ہوتی ہے۔علم وبصیرت پر نہیں ہر وہ عمل جو کیوں؟ کا جواب نہ دے سکے۔وہ توہم پرستی کہلاتا ہے۔

حجّ کا رکن:

حجّ کا اجتماع اسلامی نظام کا رکن رکین ہے۔اس لئے اس کا انتظام وانصرام امت مسلّمہ کے ذمہ ہوگا اور یہ اساسی طور پر مختص ہوگا اس امت کے نمائندگان کیلئے ابراہیمؑ کو جو کہا گیا کہ عالم انسانیّت کو اس کی دعوت دو۔تو وہ مبصرین کی حیثیت سے اس میں شریک ہونگے اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ یہ نظام ان کی فلاح وبہبود کیلئے کیا کررہا ہے۔

وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ ۝٢٧ لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ (22:27-28) اعلان کرو لوگوں میں کہ وہ حجّ کی تقریب میں شریک ہوں دنیا کے دور دراز علاقوں سے لمبی مسافتیں طے کرے یا پیادہ یا ایسی سواریاں جو مشقت کی وجہ سے چور ہو جائیں اور آکر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ یہ نظام ان کی منفعت کیلئے کیا کچھ کررہا ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا ؕ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝٩٧ (3:97) جو بھی اس مقام تک پہنچنے کی راہ پائیں تو آکر جمع ہوں۔شرطیکہ ان کا اجتماع خالصتاً خدا کیلئے ہو۔اوّلین مقصد (للّٰہ) انسانیّت کی بہبود ہو۔کسی کی تخریب اور مخالفت نہ ہو۔

جَعَلۡنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالۡعَاكِفُ فِيۡهِ وَالۡبَادِ ؕ وَمَنۡ يُّرِدۡ فِيۡهِ بِاِلۡحَادٍۢ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝٢٥ (22:25) یہاں کے رہنے والے اور باہر سے آنے والوں کیلئے یہ اجتماع یکساں طور پر کھلا ہے لیکن جو شخص، قوم یا گروہ اس ارادہ سے آئے کہ ایسا جتھہ قائم کیا جائے کہ کمزور اقوام پر ظلم کیا جائے زیادتی کی جائے تو یہ اس موقعہ سے روگردانی ہوگی اور اسے اس نظام کی طرف شدید سزا ملے گی یہ ہیں وہ شرائط جو اس اجتماع کیلئے نافذ ہونگی اور ان چھوٹے چھوٹے اجتماعات کیلئے بھی عند

الضرورت منعقد کئے جائیں یعنی عمرہ۔خواہ اس اجتماع کی ذیلی کمیٹیاں ہوں یا دوسرے اوقات میں منعقد ہونے والی کمیٹیاں۔ (2:196)

چونکہ اس اجتماع میں شرط یہ عائد کی گئی ہے کہ اس میں ظلم اور زیادتی کرنے والے شامل نہیں ہونگے۔جبکہ قریش مکہ یعنی مشرکین اس نظام اور اس کے مقاصد کے شروع سے مخالف تھے۔اس لئے اعلان کر دیا گیا کہ وہ اس میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔(9:3 , 9:28)

حجّ کے ارکان

یہ اعلان اس وقت کیا جا سکتا تھا جب مکہ اسلامی نظام کی تحویل میں آ گیا ہو۔اس سے پہلے تو یہی مشرکین مسلمانوں کو کعبہ کے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔(48:25) اس اعلان کو یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ (9:3) سے تعبیر کیا گیا۔

حجّ کا مقصد:

غور فرمایا اس اجتماع (حجّ) کا حقیقی مفہوم۔آج اقوام عالم جن مقاصد کی تلاش اقوام متحدہ جیسے اداروں میں کر رہی ہے قرآن نے اس کا تصوّر چودہ سو سال پیشتر پیش کر دیا تھا۔اس فرق کے ساتھ جمعیت اقوام کی جگہ جمعیت آدم کا تصوّر دیا تھا۔جمعیت اقوام کمزور قوموں کے خلاف ظلم و زیادتی کیلئے وجود میں آئی ہے جبکہ جمیعت آدم (حجّ) کمزور اقوام کی حفاظت اور منفعت کیلئے ہے۔جو بھی ظلم و زیادتی کرے گا نہ صرف یہ کہ اسے نکال دیا جائے گا بلکہ اسے عبرت انگیز سزا بھی دی جائے گی۔

خورد و نوش زمانے کے حالات کے مطابق:

اس زمانے کے حالات کے مطابق ان افراد کیلئے جو خورد و نوش کا انتظام کیا گیا ہے۔تمام شامل ہونے والوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے ساتھ فالتو جانور لائیں جو ان کے کھانے پینے کے کام آئیں اور جو شریک نہ ہو سکیں تو وہ اپنے ان بھائیوں کیلئے جذبہ خیر سگالی کے طور پر تحائف ان لوگوں کے ہاتھوں بھیجیں۔

رسوم و شعائر:

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ (2:196)۔نظام عدل و مساوات کے قیام اور استحکام کیلئے شدید جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لئے وقتاً فوقتاً یہ اجتماعات ضروری ہیں جن میں باہمی مشاورت سے اس پروگرام کی تکمیل کے طریقوں پر سوچا جائے۔انہی اجتماعات کا نام حجّ و عمرہ ہے۔جن کا مرکز کعبہ ہے۔نظام کا مرکز" لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ تم روک دیئے جاؤ وہاں پہنچنے میں۔تو تم سے جو آسانی سے ہو سکے تو تحفۃ وہاں بھیج دو۔(تا کہ وہ ان لوگوں کے کام آئے جو اس مقصد کیلئے وہاں جمع ہیں) جب تک یہ تحائف اپنی منزل تک نہ پہنچ جائیں تم بھی

(قلبی ہم آہنگی قائم رکھنے کیلئے) حجّامت مت بنواؤ۔ پھر جہاں پہنچ جائیں تو پھر ان بھائیوں کی مطابقت میں حجّامت بنوالو۔

فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ بِہٖۤ اَذًی مِّنۡ رَّاۡسِہٖ فَفِدۡیَۃٌ مِّنۡ صِیَامٍ اَوۡ صَدَقَۃٍ اَوۡ نُسُکٍ ۚ (2:196) لیکن تم میں سے اگر کوئی مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ اس کے بدلہ میں روزے رکھ لے یا کوئی عطیہ دیدے یا کوئی عمل خیر جو اپنے اوپر واجب کر دے۔ فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ ٝ (2:196) جب تم حالت امن میں ہو (یعنی اس اجتماعات میں شریک ہوسکو)۔ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَۃِ اِلَی الۡحَجِّ (2:196) تو پھر جو حجّ اور عمرہ دونوں سے مستفید ہونا چاہے۔ فَمَا اسۡتَیۡسَرَ مِنَ الۡہَدۡیِ ۚ (2:196) تو جو تحفہ میسر آئے ساتھ لے جائے۔

فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ فِی الۡحَجِّ وَ سَبۡعَۃٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ ؕ (2:196)۔ جسے تحفہ کی استطاعت نہ ہوتو وہ حجّ کے دوران تین دن کے اور واپسی پر سات دن کے روزے رکھ لے۔ یوں دس دن کے روزے پورے کرے۔

ذٰلِکَ لِمَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ اَہۡلُہٗ حَاضِرِی الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ (2:196) یہ اس کیلئے ہے جس کے اہل وعیال کعبہ میں اس کے ساتھ موجود نہ ہوں۔ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ (2:196) یادرکھو ان اجتماعات سے مقصد تو قانون خداوندی کی نگہداشت ہے ان اجتماعات میں بعض رسوم بطور ملی شعائر اختیار کر لی جاتی ہیں۔ اس سے مقصد باہم ہم آہنگی اور ہم رنگی سے جس کا مظاہرہ محسوس شکلوں میں ہوسکتا ہے سو اپنی نگاہ اصل مقصود یعنی قوانین خداوندی کی نگہداشت پر۔ اگر ایسا نہیں کرو گے۔ (محض رسومات کو اصل مقصود سمجھنے لگ جاؤ گے) تو نتیجہ ذلت ورسوائی ہوگا۔

اَلۡحَجُّ اَشۡہُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِیۡہِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوۡقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِی الۡحَجِّ ؕ (2:197) میں بتایا گیا ہے کہ کیلنڈر کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس سے اجتماعی حجّ کی تاریخوں کا تعین ہوسکے۔ یہ بتایا کہ حجّ کا اجتماع ذی الحجّہ کے مہینے میں مقرر ہوا تھا۔ لیکن اس سے ایک قبل اور ایک ماہ بعد بھی حرمات کے مہینے مقرر کر دیئے گئے تھے۔ تاکہ لوگ امن وامان سے سفر کرسکیں حجّ کا "نَسِیۡٓءُ" کی رسم کو ختم کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ان مہینوں میں تغیرّ وتبدّل نہ کیا جاسکے۔ اس لئے مندرجہ بالا آیت میں کہا۔

حجّ کے اجتماعات کے مہینے معلوم ومعین ہونے چاہئیں پھر جو اس فریضہ کو اپنے ذمہ لے لے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ اس کی تمام شرائط پوری کرے کہ ان اجتماعات میں کوئی بات پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی نہ ہو۔ نہ فحش کلامی یا دیگر جنسی میلانات کی باتیں نہ درشت کلامی یا کوئی معیوب حرکت نہ باہم مشاورت میں دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کیلئے یونہی مناظرہ کر کے جنگ وجدال پر اتر آنا۔ ان تمام باتوں سے پرہیز ہوگا بلکہ یہ اجتماعات تو نوع انسان کی منفعت بخشیوں کی سوچ بچار کیلئے ہے۔ (22:28) سو ان میں سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جو ان مقاصد سے دور کر دے۔

وَ مَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یَّعۡلَمۡہُ اللّٰہُ ؕ (2:197) یادرکھو کہ تمہارا ہر عمل خدا کی نگاہ میں ہے۔ وَ تَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَیۡرَ الزَّادِ

674

التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾ (2:197) اور اس سفر کیلئے زادِ راہ بھی ضروری ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ تم وہاں بھیک مانگنے کی ذلت سے محفوظ رہو گے۔ نیز ان اجتماعات میں ان کو شریک ہونا چاہئے جو عقل و بصیرت کی رو سے سوچ سکیں کہ قانون خداوندی کے کس طرح نافذ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تقویٰ کیلئے صاحب عقل و بصیرت ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اَللُّبُّ۔ تیز اور خالص عقل جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو جمع الباب ہے۔

تجارتی ترغیب:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (2:198) یہ اجتماعات کوئی یاترا قسم کی چیز تو نہیں ہے کہ وہاں دنیاوی معاملات کی بات نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ملت کیلئے سامان زیست اور معاشی مسائل کے طلب و اخذ کیلئے جدوجہد کرو ؎

از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد

اس اجتماع میں اپنے اقتصادی مسائل کو بھی پیش نظر رکھو۔ مصنوعات کی نمائش لگاؤ دوسری قوموں کے ساتھ معاشی ور تجارتی معاہدات کرو۔ (222:37)

جو جانور ساتھ لاؤ ان پر مال تجارت اور مصنوعات وغیرہ بھی لاؤ۔ (2:20) اب اس آیت (2:198) کا باقی حصّہ۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿١٩٨﴾ (2:198) جب ان مسائل کو طے کرنے کے بعد عرفات کے میدان سے واپس آ جاؤ۔ تو مَشْعَرُ الْحَرَامِ میں پھر جمع ہو کر جو ہدایات دی گئی ہیں۔ عقل و شعور کی روشنی میں ان پر غور کرو۔

اس سے پہلے تمہارا یہ خیال تھا کہ حجّ محض ایک یاترا ہے۔ یہ تمہاری غلط نگہی تھی۔ یہ تو نظام خداوندی کا وہ گوشہ ہے جس کا تعلق تمہاری تمدّنی، معاشرتی اور معاشی زندگی سے ہے۔

غور طلب بات:

حجّ کی پوری غرض و غایت اس آیت کے اندر مرکوز ہے باقی تمام رسوم و مناسک اس کے لوازمات ہیں۔ اس میں عرفات اور مشعر الحرام کی اصطلاحات انتہائی غور و فکر کی متقاضی ہیں۔ انہیں سمجھنے کیلئے بات پیچھے سے شروع کی جائے گی۔

رمضان کے مہینے میں اسلامی نظام کے قیام و استحکام کیلئے تربیّتی کورس کا اہتمام ہوا۔ اس میں سپاہیانہ زندگی کے خوگر ہونے کے علاوہ، خصوصی نشستوں میں ''عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ (2:187) کیا گیا۔ یعنی اپنے اپنے مقامی مسائل پر غور و فکر کیا گیا۔ جشن نزول قرآن (عید الفطر) کے اجتماع میں ان نمائندگان کو چنا گیا جو ملت کے اجتماع عظیم (حجّ) میں شرکت کریں گے۔ یہ نمائندگان اور ان کے علاوہ اپنے طور پر مبصرین عازم حجّ ہوئے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد کانفرنس کا اصل سیشن ایک وسیع و عریض میدان

میں طے ہونا قرار پایا۔ وہاں سب سے پہلے دور دراز سے آئے ہوئے نمائندگان کا باہمی تعارف ہوا اس باہمی تعارف کی نسبت سے اسے ''عرفات'' کا میدان کہہ کر پکارا گیا۔ عرفات، عرف، تعارف، کے بعد سیشن کے صدر نے جو سربراہ یا اس کا نمائندہ ہوگا۔ خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اس میں اس نے مملکت کی ساری گزشتہ کی کارروائی پر روشنی ڈالی اور آئندہ سال کے بنیادی خدوخال کی وضاحت کی۔

مشعر الحرام:

اس پروگرام کو ساتھ لیکر یہ نمائندگان مشعر الحرام میں جمع ہوئے۔ مشعر الحرام سے مراد وہ مقام جہاں عقل و شعور کی رو سے معاملات پر بحث و تمحیص کی جائے۔ چونکہ ان معاملات کا تعلق نظام خداوندی سے ہے اس لئے اسے حرام یعنی قابل احترام قرار دیا۔ یہ نمائندگان حسب ضرورت دو یا تین دن تک قیام کرینگے۔ اس قیام کے دوران اس پروگرام کی عملی جزئیات اور اس سلسلے میں باہمی تعاون و تناصر کے سلسلے میں بحث و تمحیص بھی ہوگی۔ ایک دوسرے کی ضیافتیں بھی۔

حجّ کے ارکان

آج دوپہر کا کھانا نمائندگانِ پاکستان کی طرف سے، رات کا کھانا دوسرے کسی علاقے کے نمائندوں کی طرف سے (وقس علی ذالک) ان ضیافتوں میں وہ جانور ذبح ہونگے جو اس مقصد کیلئے ساتھ لائے ہیں یا جو دوسرے لوگوں نے تحفتاً بھیجے تھے۔ جانور ہی نہیں دوسری اشیائے خورد و نوش بھی جو بطور تحفہ بھیجی گئی تھیں۔ اس تفصیلی تبادلہ خیالات کے بعد یہ لوگ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جائینگے۔ (مشعر الحرام یعنی منیٰ میں چند روز کا قیام)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ (2:203) اس مقام پر چند دنوں کا قیام رہے گا۔ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ (2:203) جن لوگوں کو عجلت ہو تو وہ دو دن میں واپس چلے جائیں جو ٹھہر سکیں تو واپسی میں تاخیر کر دیں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں یا ویسا کرنے میں مقصد تو پروگرام کی تکمیل ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ (2:203) دیکھنا چاہئے کہ تمہارا ہر قدم اس طرف اٹھ رہا ہے جس مقصد کیلئے تم اکٹھے ہوئے ہو۔

سورۃ الحجّ میں ہے کہ مشعر الحرام کے قیام کے دوران کھاؤ پیو اس کے بعد۔ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾ (22:29) باہمی مشاورت ان تدابیر پر غور کریں جن سے ان کی ملی زندگی کی کثافتیں دور ہو جائیں تا کہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآمد ہو سکیں جو انہوں نے انسانی بہبود کیلئے لے رکھی ہیں۔ اس طرح یہ ملت اس مرکز کی نگہبان بن جائے جو دنیا میں انسانی کی حریت و آزادی اور قوت و اقتدار خداوندی کا نشان ہے جسے اس میں شرف اوّلیت اور سبقت حاصل ہے۔

تَفَثٌ:

میل کچیل، کثافت کو دور کرنا۔ اس سے یہ لوگ ناخن اتروانا، بغل اور زیر ناف کے بال صاف کرانا۔ سر کے بالوں کی میل کچیل دور کرنا لیتے ہیں تو چونکہ یہ مشعر الحرام میں مختلف تجاویز زیر غور ہیں تو اس سے مراد ملت کی کثافتیں دور کرنے کی تدبیر پر غور و غوض کرنا ہے۔ چونکہ یہ حجّ کا اجتماع ہی ملی مسائل کا حل سوچنے کا Forum ہے۔

بیت العتیق:

اَلْعَتِیْقُ ''جامع لفظ ہے۔ معنی حریت، آزادی، شرافت، عزت، حسن و جمال تو اس لحاظ سے کعبہ کے بیت العتیق سے مراد اس نظام کا مرکز جو نوع انسانی کیلئے ان خصوصیات کا حامل ہو۔ وہ نظام جو عالمگیر انسانیّت کو ان خصائص کبریٰ کی ضمانت دے۔ نیز ایسی آزادی جس پر کسی کا اثر وغلبہ نہ ہو۔ اس کے معنی ''قوّت، سبقت سب سے آگے ہونا بھی ایک اعلیٰ خصوصیّت ہے تو اس کے معنی سبقت اور قدیم کے بھی آتے ہیں۔ غور فرمایئے ایک لفظ میں سارا کچھ بیان کر دیا جس کا ضامن نظام خداوندی ہے۔

بیت المعمور:

کعبہ کو الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ④(52:4) بھی کہا گیا ہے آباد گھر، برکات وسعادات سے معمور گھر۔ الْبَیْتَ الْحَرَامَ بھی (5:2) یعنی واجب الاحترام گھر۔ اسے بیتی یعنی ''میرا گھر'' بھی کہا گیا ہے۔

شعائر اللہ:

خیالات اور جسمانی حرکات کا تعلق: انسان کی کیفیّت یہ ہے کہ جب اس کے دل میں کوئی جذبہ ابھرتا ہے تو اس کا اظہار زبان کے ذریعہ بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے دیگر اعضائے بدن سے خود بخود ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں جو اس جذبہ یا خیال کا مظہر بن جاتی ہیں۔ مثلاً جب دل میں جذبات مسرت موجزن ہوں۔ تو اس کی لہریں مسکراہٹ کی شکل میں چہرے پر پھیل جاتی ہیں۔ سلام کرتے وقت ہاتھ خود بخود ماتھے کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ کسی کی تعظیم کرتے ہیں تو سر جھک جاتا ہے اور خود سپردگی کے عالم میں یہ جھکاؤ انتہائی شکل میں سر کا سجدہ میں چلا جانا ہوتا ہے۔ خیالات اور اعضاء کی اس یکبارگی ہم آہنگی کو متوازیت یا (Psycho-Physical Parallelism) کہتے ہیں۔ اعضاء کی ان حرکات کا تقاضا ایسا غیر شعوری اور بلا ساختہ ہوتا ہے کہ آپ اسے روک نہیں سکتے۔ اگر کسی مقرر پر پابندی لگا دیں کہ وہ تقریر تو جیسی چاہے کرے لیکن دوران تقریر وہ ساکن کھڑا رہے نہ تو حرکت کرے اور نہ چہرے پر علامات کا اظہار ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اوّل تو وہ تقریر ہی نہیں کر سکے گا۔ مگر وہ بندھے الفاظ بولے گا تو ان کی تقریر غیر موثر اور بے نتیجہ رہ جائے گی۔ اعضائے جسمانی کی ان محسوس اور مرئی حرکات کو (Formalism) ''شعائر و مناسک'' کہتے ہیں۔ قرآن نے اس داخلی تقاضہ کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ اس کے ظہور ونمود کی اجازت دی ہے۔ صلوٰۃ میں قیام و رکوع وسجود اور مناسک حجّ میں طواف وغیرہ اس تقاضے کی تسکین کی مختلف شکلیں ہیں۔

ظواہر پرستی:

اگر ان مرئی شکلوں کو ترک کر دیا جائے تو باقی یا تو فلسفیانہ تخیلات رہ جاتے ہیں یا خانقاہیت کی کیفیات۔ یہ دونوں انفرادی کیفیات ہیں۔ اجتماعیت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اسلام تو ایک اجتماعی نظام ہے لہٰذا اس میں یہ محسوسات بھی باقی رہتی ہیں۔ ان میں یکسانیّت اور ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ ہم آہنگی امت میں وحدت کا مظہر ہوتی ہے۔

دوسری طرف جب ان محسوسات سے غرض وغایت مفقود ہو جائے اور صرف ظواہر کی ادائیگی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو اسے پرستش کہتے ہیں۔ جو ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ملتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی صلوٰۃ کو نماز کے محسوس ارکان تک سمجھ لیا گیا اور عبادت کا مفہوم پرستش سمجھ لیا گیا اور انہی ظواہر کو اسلام کی غایت سمجھ لیا گیا۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ۚ (42:38) باہمی مشورہ سے غور کرتے ہیں کہ فریضہ انفاق کیلئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ جب ''نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ (62:9)'' کی منادی ہوتی تو لوگ اس اجتماع میں شرکت کیلئے جمع ہو جاتے تھے۔ جس شکل میں ہم نماز ادا کرتے ہیں ان کی جزئیات وتفاصیل کا ذکر قرآن میں نہیں آیا اس کا تعلق خود دین کی اصل سے ہے۔

اصول اور دین کی جزئیات:

اصول اور ان کو بروئے کار لانے کیلئے طور طریقے اصول تو ہمیشہ غیر متبدّل رہتے ہیں۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے اسلوب و طریق حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ طبیعی زندگی کی رو سے اسے یوں سمجھو کہ انسانی زندگی کا مدار خوراک پر ہے۔ یہ ناقابل تغیرّ اصول شروع سے آج تک یکساں چلا آ رہا ہے۔ لیکن غذا کی کیفیّت اور نوعیّت بدلتی چلی آ رہی ہے۔ غاروں کے انسانوں کی غذا اور تھی اور آج کے انسان کی اور آج بھی مختلف ممالک میں انسانوں کی غذا میں فرق ہے۔ جو بیشتر فرق آب وہوا کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ آگے بڑھیئے جو ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار اور حالات ہیں۔ بچہ کی غذا اور ہوتی ہے اور جوانی کے زمانہ کی اور بڑھاپے میں اس سے بھی مختلف۔ تندرست کی غذا اور مریض کی غذا میں فرق ہوتا ہے۔ اگر قاعدہ یہ ٹھہرا دیا جائے کہ غذا میں کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تو زندگی دو قدم بھی نہ چل سکے۔ یہی کیفیّت ان اصول واقدار کی ہے جو خدا کی طرف سے ملے ہیں۔ پہلے چھوٹے چھوٹے قواعد وضوابط بھی وحی کے ذریعہ دیئے جاتے تھے مثلاً نوح کی کشتی وغیرہ جوں جوں علم انسانی میں وسعت ہوتی جاتی تھی۔ ان جزئیات میں کمی اور تبدیلی کر دی جاتی تھی اس حقیقت کی وضاحت اس آیت میں کی گئی ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ (2:106) اصل میں جزئیات کا تعین کا طریق ''وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ ۚ'' (3:159) یعنی ان جزئیات کا تعین وتغیرّ وتبدّل باہمی مشاورت سے ہوگا۔ وحی کی رو سے نہیں اور یہ شورائیت کا نظام حضور ﷺ کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا اور نہ ہی اسے رسول ﷺ کی زندگی تک محدود رہنا ہے اسے آپ ﷺ

کے بعد بھی علیٰ حالہ قائم رکھا جانا مطلوب تھا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (3:144) صرف انہی لوگوں کی کوشش ثمر بار ہونگی جو اس نظام کو قائم رکھیں گے۔ جس طرح رسول ﷺ کی مشاورت کا حکم تھا اس طرح جماعت مومنین کو بھی کہا گیا۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ (42:38) اقدار و قوانین تو غیر متبدّل مگر تفاصیل کا تعین حالات کے مطابق جماعت خود طے کرے گی۔ ثبات اور تغیرّ کا یہ حسین امتزاج انسانی کارواں کو شاداں و خرماں آگے لیتا جائے گا۔ رسول ﷺ کے بعد یہ امتزاج باقی نہ رہا اس نظام کا یہی وہ زور دروں تھا جس کی وجہ سے اس امت نے چند برسوں میں وہ وسعتیں اور بلندیاں حاصل کر لیں۔ جن کی نظیر تاریخ انسانیّت میں نہیں ملتی۔ اس کے بعد نظام نہ رہا تو اصولی احکامات کی جزئیات کا تعین بھی باقی نہ رہا اور بعد میں انہی جزئیات کو جو اس زمانے میں رائج تھیں اصول کی طرح ناقابل تغیرّ قرار دیا گیا اس پر زمانے کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا ناممکن ہو گیا اور ظواہر پرستی سے کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ تو اعمال کو نتائج کی رو سے پرکھنے والے لوگ اس ظواہر پرستی پر قائم نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے مسلمانوں کی نئی نسل سے شکایت ہے کہ یہ اپنے دین سے بے گانہ ہو رہی ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ (2:158)

حجّ:

بنیادی معنی (i) ارادہ کرنا، (ii) روکنا، iii) جھگڑا کرنا، iv) دلائل پیش کرنا آخری معنی کے اعتبار سے قرآنی دلائل کو ''الحجّة البالغة'' حقیقی دلیل (6:50) کہا گیا ہے یعنی حجّ کا مقصد وہ اجتماع جہاں نظام خداوندی سے متعلق جملہ اہم معاملات کا فیصلہ دلائل و حجّت کی رو سے کیا جائے۔ مشاورتی نظام میں اس قسم کے اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ اس لئے اس نظام نے ایک سالانہ عالمگیر نظام ضروری قرار دیا۔

عمرہ:

سال بھر میں چھوٹے چھوٹے اجتماعات عندالضرورت اس پر مستزاد ان اجتماعات کو عمرہ کہا جاتا ہے۔ عمرہ: (ع م ر) آبادی کرنا۔ باقی رکھنا، خرابی سے محفوظ رکھنا۔ یعنی معنی سے ظاہر ہے کہ ان اجتماعات پر اس بات پر غور و فکر کیا جائے گا کہ یہ نظام ہر قسم کی خرابی اور کمزوری سے محفوظ رہ کر مستحکم تر ہوتا جائے۔

صفاوالمروۃ:

صفا اور مروہ مکہ سے ملحق دو پہاڑیاں ہیں ان پہاڑیوں کے درمیان ''سعی'' یعنی سات چکر لگانا ''بین الصفا والمروۃ'' کہلاتا ہے۔ حجّ کے ارکان میں شمار ہوتا ہے۔ دراصل تورات کے اتباع میں روایات کا حصّہ بنا دیا گیا ہے کہ جب اس مشکیزہ کا پانی بی بی

حاجرہ اور شیر خوار بچہ کے پاس تھا، ختم ہو گیا۔ کیونکہ ابراہیمؑ ان کو لق و دق صحرا میں چھوڑ گئے تھے۔ تو بی بی حاجرہ پانی کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھی۔ کبھی ایک پہاڑی پر چڑھتیں، کبھی دوسری پر "سَعْیٰ بَیْنَ الصَّفَا وَ الْمَرْوَۃ" کو سنّت ہاجرہ کے اتباع میں ارکان حجّ میں واجب سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس آیت میں یہ تو نہیں کہا گیا کہ ان پہاڑیوں پر چڑھنا لازم ہے بلکہ یہ کہا گیا کہ اس میں گھومنا پھرنا میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ عرب جاھلیہ میں عقیدہ عام تھا کہ یہ ایسے مقدس مقامات ہیں جن میں گھومنا پھرنا منع ہے۔ قرآن نے اس باطل عقیدہ کی تردید کی کہ ان میں گھومنے پھرنے میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ یعنی یہ عقیدہ کہ یہ ارکان حجّ میں سے ہے۔

طواف ان پہاڑیوں کا یہ تو قرآن آیت کے خلاف ہے ایک دوسری توجیح یہ ہے کہ قریش نے ان پہاڑیوں پر بھی دو بت نصب کر رکھے تھے اور وہ ان کی تعظیم کیلئے ان کا طواف کرتے تھے۔ اسلام نے بت اٹھوائے تو مسلمانوں کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جس طرح بت پرستی ممنوع ہے اس طرح ان پہاڑیوں کا طواف بھی ممنوع ہے۔ اللہ نے ان کی تردید کی اور کہا ایسا نہیں ہے ان کا طواف ممنوع نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اسے ارکان حجّ میں شامل کر کے لازم قرار دیدیا گیا یعنی کہا گیا کہ جس طرح کفر کی حالت میں تم ان کا طواف کرتے تھے۔ اسے اب بھی ضروری سمجھو۔ کہا کہ ان پہاڑیوں میں تقدیس کی کوئی بات نہیں اس تو ہم پرستی میں نہ آؤ بلکہ ان میں چلو پھرو۔ قرآن نے صفا اور مروہ کو حجّ کے جانوروں کی طرح (22:96) شعائر اللہ (2:158) اور ان کا ادب ملحوظ رکھنے کی تائید کی ہے یعنی یہ کسی نظریہ مملکت کی محسوس علامات ہوتی ہیں۔ جیسے مملکت کا جھنڈا واجب الاحترام ہوتا ہے وہ ڈنڈا اور کپڑا واجب التکریم نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ پہاڑیاں اور ان کے اردگرد زمین یا پتھر مقدس نہیں ہو جاتے کہ ان میں چلنا پھرنا ممنوع ہو۔ حجّ میں ساتھ جانے والے مویشی بھی شعائر ہیں ساتھ کہہ دیا گیا کہ ان کو مقدس نہ سمجھو۔ ان کا گوشت کھاؤ۔ سواری اور دیگر کام لو۔ (22:72-73)

ان پہاڑیوں کو شَعَآئِرَ اللّٰہِ (5:2) کیوں کہا گیا ہے یوں نظر آتا ہے کہ خانہ کعبہ کی طرح ان کی تعظیم بھی ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔ اگرچہ ظہور اسلام کے وقت ان کے مقاصد مسخ ہو چکے تھے قرآن نے ان مقاصد کا صحیح تعین کر دیا۔ لیکن ان کے محسوس علامات ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھا۔ تو بعد میں یہ مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور ان علامات کی تعظیم مقصود بالذات ہوگئی۔ ان کو شعائر قرار دینے کے بعد قرآن نے واضح کر دیا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ تم اپنے دل کی رضامندی سے خیر کے کاموں میں کتنا حصّہ لیتے ہو۔ جن کے بھرپور نتائج خدا کے قانون مکافات کی رو سے حاصل ہونگے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تم کار خیر میں کس قدر حصّہ لیتے ہو اور ان رسوم و مناسک کی میکانکی تعظیم کس قدر کرتے ہو۔ حجّ کے ضمن میں بعض چیزوں کو شَعَآئِرَ اللّٰہِ (5:2)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْیَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ (5:2)

احرام:

حجّ کے اجتماع میں احرام باندھا جاتا ہے اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے البتہ شکار کرنے کی ممانعت ہے۔

وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ (5:1) جب تک تم حالت احرام میں ہو یعنی اس اجتماع میں شریک ہو۔

حجرِ اسود:

حجّ کے سلسلہ میں اس پتھر کو بھی اہمیّت حاصل ہے۔ مگر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ واعظ کہتے ہیں کہ بی بی حوا جنّت سے لائی تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سیاہ رنگ کا پتھر اس لئے لگا دیا تھا کہ اس سے طواف کے وقت چکروں میں آسانی رہے۔ کچھ اور کہتے ہیں کہ سامی اقوام میں معاہدہ کو محکم طور پر استوار کرنا ہوتا تو فریقین ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ حجّ کی تقریب میں حاجی اپنا عہد استوار کرنے کیلئے قدیمی رواج کے مطابق اپنا ہاتھ اس پتھر پر مار کر اطمینان کر لیتے کہ ہم نے خدا سے اپنا عہد استوار کر لیا ہے۔ یہ دو توجیہات قرین قیاس ہے۔ دوسری تحقیق یہ ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں ایک عرب تاجر فلسطین جا کر وہاں ابراہیم علیہ السلام سے منسوب قبر سے ایک پتھر تبرکاً اٹھالایا اور اسے دیوار کعبہ میں لگا دیا۔ پہلے تو صرف اس کی تعظیم ہوتی رہی۔ پھر پرستش شروع ہوگئی۔ پتھر کی پرستش شروع ہونی تھی کہ مختلف قبائل نے اپنے اپنے بت کعبہ اور اس کے حطیم میں نصب کر دیئے اور یوں خدا کا گھر بتکدہ بن گیا۔ بحر حال جو بھی توجیہہ ہو۔ قرآن نے اسے شعائر اللہ میں شمار نہیں کیا۔

تین شیطانوں کو پتھر مارنا:

اس رسم کا بھی قرآن میں کہیں ذکر نہیں۔ واعظ روایت کرتے ہیں کہ ابراہیمؑ جب بیٹے کو قربان کرنے کیلئے چلے تو شیطان نے ورغلایا وہ قریب آتا تھا تو ابراہیمؑ اسے پتھر مار کر بھگا دیتے۔ سات مرتبہ ایسا ہوا تا آنکہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اسی سنّت ابراہیمی کے اتباع میں ہر حاجی ان تین شیاطین کو سات سات کنکریاں مارتے ہیں۔ یہ وضعی روایت ہے۔ قرآن میں سورہ الفیل یمن کے گورنر نے کعبہ کو مسمار کرنے کیلئے پہاڑوں کے پیچھے خفیہ راستہ اختیار کیا ہاتھیوں کے ساتھ اہل مکہ کے تین غداروں نے اسے یہ راستہ بتایا تھا۔ قوم نے ان کو اس سازش کی پاداش میں سنگسار کر دیا تھا۔ تو انہوں نے آنے والی نسلوں کیلئے یہ رسم جاری رکھی کہ غداروں کا کیا انجام ہوتا ہے۔

ذبح عظیم، سنّت ابراہیمی، قربانی کا قرآنی مفہوم:

وَانۡحَرۡ سے یہ قربانی کا مفہوم لیتے ہیں۔ النَّحۡرُ۔ اَلنَّحِرِیۡرُ، ماہر، عقل مند۔ ہر بات کو سوچ سمجھ کر اختیار کرنے والا۔ نحر سینے کا اوپر کا حصّہ اونٹ کو کھڑے کھڑے حلق کے قریب نیزہ مارتے ہیں۔ نَحَرَ الۡبَعِیۡرَ اس نے اونٹ کو اس طرح ذبح کیا۔

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾ (108:1) فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ (108:2)

خدا کے مقرر کردہ پروگرام ربوبیّت کیلئے احسن طریقے سے عقل وبصیرت سے ادا کر۔

وَانۡحَرۡ سے قربانی کا مفہوم لینا بعد از کار سی بات ہے۔ اگر وَانۡحَرۡ سے اونٹ کا ذبح کرنا لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ مدینہ میں ہجرت کے وقت انصار اور مہاجر دونوں غریب تھے جبکہ یہودیوں کا بڑا زور تھا۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈتی ہیں اور اس کیلئے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں یہودیوں

کے ہاں اونٹ حرام تھا۔ مسلمانوں کے ہاں حلال۔ وہ اونٹ کے ذبیح کو قابل اعتراض سمجھتے تھے وہ اپنی قوت کی بناء پر یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہیں گے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے قرآن نے عین اسی وقت یہ حکم دیا کہ مدینہ میں ''اونٹ ذبح'' کرو۔ یعنی دین کے معاملہ یہودیوں سے مفاہمت نہ کرو۔ چنانچہ یہ کمزور جماعت تھوڑے ہی دنوں میں اس قدر طاقتور ہوگئی کہ یہودیوں، جو اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے۔ ان کو مدینہ چھوڑنا پڑا۔ بعض کہتے ہیں کہ عبرانی زبان میں الکوثر ہم نے تجھے (اونٹ) بطور ذبح عطا کیا ہے مگر یہ معنی نہیں جچتے۔

اگر وَانْحَرْ ۝۲ (108:2) سے قربانی مراد بالضرور ہے تو ان شرائط کو قرآن کی رو سے پورا کرنا ضروری ہے ایک تو نحر صرف ذبیحہ اونٹ کو کہتے ہیں کہ کسی اور جانور کو ذبح کرنے کو نہیں۔ اس لئے قربانی صرف اونٹوں کی ہوگی کسی اور جانور کی نہیں ہوگی اور ذبح کرنے کا مقام قرآن نے کعبہ بتایا ہے اس لئے یہ قربانی صرف حجّ کے مقام پر ہوگی۔ تیسرے، قرآن نے کہا ہے کہ اس کا گوشت تم خود بھی کھاؤ اور وہاں کے محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ لہٰذا صرف اتنے اونٹ ذبح ہونگے۔ جن کا گوشت کام آسکے۔ آج کل حجّ کی تقریب پر لاکھوں کی تعداد جانور ذبح کر کے ان کا گوشت زمین میں دبا دیا جاتا ہے تمام دنیا میں عیدالاضحیٰ کی تقریب پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ قرآن نے ان کی تائید نہیں کی۔

سنّت ابراہیمی:

قربانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سنّت ابراہیمی ہے اور بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝۱۰۷ (37:107) کے واقعہ سے اس کی سند لائی جاتی ہے قرآن میں یوں مذکور ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے ہاں کبر سنی میں ایک لڑکا اسمٰعیل پیدا ہوا۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (37:102) تو آپؑ نے خواب کی رو سے سمجھا کہ بچہ کو قربان کر دینا چاہئے۔ بیٹے سے کہا۔

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّىْٓ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ (37:102) بیٹے نے جواب دیا۔ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِىْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰۲ (37:102) باپ نے بیٹے کو لٹایا اور چھری ہاتھ میں لی۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝۱۰۳ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝۱۰۴ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۰۵ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝۱۰۶ (37:103-104-105-106) تو نے خواب کی حقیقت سمجھ کر اپنے بیٹے کو سچ مچ لٹا دیا۔ (یہ ہمارا حکم نہیں تھا)۔ یونہی تمہارا خواب تھا۔ ہم نے تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اس نقصان سے بچا لیا) جو لوگ ہمارے قوانین کے تحت اس طرح کے حسن کارانہ کام کرتے ہیں اس قسم کے نقصان سے بچا لیا کرتے ہیں۔ یہ خدا کی طرف سے ابراہیم کیلئے واضح انعام تھا۔

بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝۱۰۷ (37:107):

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝۱۰۷ (37:107) ہم نے اسے بچا لیا ایک بڑی قربانی کیلئے اس طرح تو جان دینے سے تو قربانی ایک ثانیہ میں ختم ہو جاتی تھی۔ ہم نے اسے اس سے ایک بڑی قربانی لی اور وہ قربانی ملک شام کی بادشاہت کے بجائے ہم اپنے گھر

کی پاسبانی اس کے سپرد کرنے والے تھے۔ جو عرب کی بے برگ و گیاہ وادی میں واقع تھا اور جسے قیامت تک توحید پرستوں کا مرکز بننا تھا۔ پھر جو قربانی ابراہیم دینا چاہتا تھا وہ تو اس کے بیٹے اسمعیلؑ تک محدود ہوتی۔ لیکن جس قربانی کیلئے ہم نے اسے زندہ رکھا۔ اس کا سلسلہ اس کی نسل میں بھی جاری رہنا تھا۔ اسماعیل کے بعد اس کا پاسبان بننے والا تھا۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ (37:108) ذریت اسحق۔ اور اولاد اسمعیلؑ کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اوّل الذکر کے مقابلہ میں حضرت اسمعیلؑ اور ان کی اولاد کی یہ قربانی کس قدر عظیم تھی تو اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ جو قربانیاں حجّ اور عید الاضحیٰ کی تقریب پر دی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے وہ کیسے سنّت ابراہیمی قرار دی جاسکتی ہیں؟

صرف رسوم پر چلنے والوں کو راہ گم کردہ ظالم قرار دیا گیا:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (9:19)

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ حاجیوں کیلئے پانی کی سبیلیں لگا دینے سے اور خانہ کعبہ کی آبادکاری، تزئین و آرائش کے مختلف کام کرنے والا اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے۔ جو قوانین خداوندی پر ایمان رکھے اور مکافات عمل پر بھی اور خدا کے مقرر کردہ مقصد کو استحکام دینے کیلئے پوری پوری کوشش کرے۔ یہ دونوں معیار خداوندی کے مطابق برابر نہیں ہو سکتے۔ یاد رکھو خدا کبھی بھی ایسے لوگوں کو سعادت کا راستہ نہیں دکھاتا جو ظلم سے باز نہ آئیں یعنی اس قسم کے خیراتی کام کر کے اپنے آپ کو فریب دے لیں کہ ہم نے تو بڑا تیر مارا ہے۔ حقیقی عمل تو اس نظام کے قیام و استحکام کیلئے مسلسل جدوجہد ہے تاکہ دنیا سے ظلم وستم مٹ جائے۔ (سِقَايَةَ الْحَآجِّ (9:19) سے مراد کھانا پلانا ہوتا ہے)

مذہبی مراسم کی ادائیگی:

مذہب نام ہے پرستش کی چند رسومات ادا کرنے کا اور دین سے مراد ہے پورے کا پورا نظام زندگی (2:179) زیر نظر آیت میں اس کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ایک زاویہ نگاہ یہ ہے کہ مذہبی رسوم وشعائر کو ادا کر دینے سے فریضہ خداوندی ادا ہوجاتا ہے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ خدا کے ہر مقرر کردہ پروگرام کیلئے مسلسل جدوجہد دین کا مقصود ہے خدا نے کہا کہ یہ دونوں تصوّرات اس کی نگاہ میں یکساں نہیں ہیں۔ اوّل الذکر حاملین کو ''راہ گم کردہ ظالم'' قرار دیا ہے۔ اسلام کو مذہب قرار دینے والوں کیلئے یہ نکتہ قابل غور وفکر ہے کہ وہ انہیں ''راہ گم کردہ ظالمین'' قرار دیتا ہے۔ اگلی دو آیات میں اس اجمال کی تفصیل دیدی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾ (9:20-21-22)

مذہبی پیشوائیّت اور نظامِ سرمایہ داری
سب سے بڑا ناقابل معافی جرم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ وَ الَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍۙ۝۳۴ یَّوْمَ یُحْمٰى عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۝۳۵ (9:34-35)

احبار و رھبان و علماء و مشائخ کے دو جرم:

ان کے خلاف قرآن دو جرم عائد کرتا ہے۔ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (9:34)۔ اور دوسرا وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ (9:34)۔ قرآن کا عظیم اعلان اگر تم ان کو خدا تک لے جانے والے راستے کا قائد سمجھ رہے ہو یہ تو درحقیقت اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ان کو راستے سے ہٹا دو تو خدا تک پہنچ جاؤ گے۔ قرآن نے انسانیّت کی دشمن تین قوّتیں فرعون، ہامان اور قارون کو قرار دیا ہے۔ دوسرا جرم کہ مذہب کو ذریعہ معاش بنایا ہوا ہے۔ مذہبی پیشوائیت ہے ہی معاشی مسئلہ ان کا یہ ذریعہ بند کر دو تو اپنے لئے ایک وقت کی روٹی نہیں کما سکتے۔ کروڑوں کی تعداد کا یہ گروہ جو پراسائٹ بنکر ملک کی پیداوار میں کوئی حصّہ نہیں لیتا۔ پھر عوام کی مہینے کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کریں۔ یہی تو ملک کی اقتصادیات کا تباہی کا سبب ہے۔ خود ہی شریعت کے احکام وضع کر کے ان کو احکام خداوندی کہہ کر فتوؤں کی شکل میں عوام کے ہاتھ بیچتے ہیں۔

دولت کا ارتکاز:

اس سے واضح ہو گیا کہ دولت جمع کرنے کو ایک سنگین جرم قرار دیکر اس کیلئے سزا بھی سنگین ہے۔ قرآن نے مذہبی پشوائیت اور نظام سرمایہ داری کو ایک ہی آیت میں کر کے واضح کر دیا کہ دونوں ایک ہیں۔

❁❁❁

اس نظام میں رسول ﷺ کی ذاتی پوزیشن بھی کچھ نہیں تھی بلکہ پوزیشن ساری نظام کی ہوگی

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۫ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (9:95-96)

یہ چاہتے ہیں کہ ان سے درگزر کرو۔ کیونکہ نفاق ہے دل میں اس لئے ایسے لوگ کیسے اس جماعت کا حصّہ ہوسکتے ہیں۔

یہ تمہیں راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کو علم نہیں ہے کہ یہ معاملہ تمہاری ذات سے متعلق نہیں ہے کہ ذاتی طور پر راضی کرنے سے معاملہ رفع دفع ہوجائے گا۔ اس کا معاملہ تو قانون خداوندی سے ہے تو قانون خداوندی ان لوگوں سے کیسے راضی ہو سکتا ہے۔ تمہارا ذاتی طور پر راضی کر لینا تو مسائل کا حل نہیں ہے۔ نظام خداوندی میں محبت یا عداوت ذاتی جذبات کی رو سے نہیں ہوتی نظام کے نقطہ نگاہ سے ہوتی ہے۔ (9:23-24,9:62)

اس نظام میں افرادِ مملکت یا سربراہ کی بھی ذاتی پوزیشن کچھ نہیں ہوتی۔ پوزیشن ساری نظام مملکت کی ہوتی ہے۔ جس فیصلہ کو قانون کی تائید ہوگی۔ وہ قابل قبول ہوگا۔ جو اس کے نقطہ نگاہ سے قابل قبول نہیں ہوگا۔ وہ کسی کے نزدیک بھی درخورِ اعتناء نہیں ہوگا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (6:162) لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (6:163) اور یہ تو قطعاً نہیں ہوسکتا۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا ...... (6:164) کسی دوسرے کو رب بنا دینا تو شرک اور اس نظام سے غداری کا نام ہے۔

مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (9:107)

سازش:

ایسی سازش جسے اسلام کی جڑ بنیاد کو اکھاڑنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ یہ مسجد ضرار کے نام سے مشہور ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ (9:107) (ایک مسجد منافقین نے تعمیر کر ڈالی کہ پکے مومن اور نظام کے خدمت گزار رہیں) تا کہ ان لوگوں کی کمین گاہ بن سکے جو پہلے سے نظام خداوندی کے خلاف پیکار ہیں اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے تو اسے نیک نیّتی سے بنایا ہے۔ کوئی مسجد یا عقیدہ جو فرقہ بندی کا باعث ہو کفر اور خدا اور رسول کے خلاف بغاوت ہے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ (9:108) جو گروہ بندیوں کے شرک سے صاف اور پاک ہوں وہی ایسی مسجد میں آتے ہیں۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ (9:109) بنیاد ریت کے ایسے تودے پر رکھی ہو جو کٹ کٹ کر دریا میں گرتے چلے جا رہے ہیں اس طرح وہ عمارت بنانے والے کو ساتھ جہنّم کے گڑھے میں جا گرے۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ (9:110) یہ عمارت جس مقصد کیلئے انہوں نے بنائی ہے ان کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ اضطراب اور بے چینی بڑھتی رہے گی۔ ان کے غصہ کی آگ میں کمی نہیں ہوگی تآنکہ ان کے دل شدت اضطراب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔

کُتُبِ سابقہ میں نظامِ خداوندی کے آثار

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾ (9:111)

یہ معاہدہ سابقہ آسمانی کتب تورات وانجیل میں بھی مذکور تھا اور اب اس کی تجدید قرآن میں کر دی گئی ہے۔ اس عہد کا پورا کرنا خدا نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ ظاہر ہے اللہ سے بڑھ کر تو کوئی اور اپنے وعدے کو پورا کرنے والا نہیں تم اس سودے سے جو تم نے اس نظام سے کیا ہے جتنی مسرت مناؤ کم ہے۔ (کس قدر سستا سودا ہے!)۔

کُتُبِ سابقہ میں اس نظامِ کے آثار:

عہد نامہ عتیق (تورات) کتاب استثناء میں ہے موسیٰؑ نے کہا اے اسرائیل سن لو! اس کے کرنے پر دھیان رکھ تا کہ تیرا بھلا ہو اور تم نہایت فراواں ہو جاؤ۔ اس زمین میں جس میں شیر اور شہد بہتا ہے اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو درست رکھ۔ استثنا باب (6) آیت (3-5)۔

انجیل میں ہے ایک شخص عیسیٰؑ کے پاس آیا کہ جو احکام آپ نے دیئے اس پر عمل کر کے اب میں کیا کامل ہو گیا ہوں اس پر؟ یسوع نے کہا اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا! اپنا اسباب و مال بیچ کر غریبوں کو دے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا اور وہ نوجوان غمگین ہو کر چلا گیا کیونکہ وہ بڑا مالدار تھا۔

اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور تم سے پھر کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو، اور شاگرد حیران ہوئے کہ پھر کون خدا کی نجات کیسے مل سکتی ہے۔ یسوع نے ان کی طرف دیکھ کر کہا یہ آدمیوں میں سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے تو پطرس نے کہا کہ ہم تو سب کچھ چھوڑ کر تیرے پیچھے ہو لئے ہیں۔ پس ہم کو کیا ملے گا؟ جواب دیا کہ جب آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تحت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے اور جس نے بھی گھروں، بھائیوں، ماں باپ یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اسے سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔ متی باب 19 آیات (29 تا 20)

ان کو اس دنیا کی جنتی زندگی اس نظام کی شکل میں ملی تھی جیسے احکام خداوندی کی رو سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ تھا خدا کے ساتھ بیع و شریٰ کا عملی معاہدہ۔

‘‘Evolution vs Special Creation’’

انسان اور زمین کے بارے کہا جاتا ہے کہ جب تک بطلیموس اور اس کے پیشوروں کی زمین مرکز "Cosmology" Geo-centric کا تصوّر باقی رہا۔تو یہ دونوں بڑے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔لیکن جب سے اس تصوّر کی جگہ ’’سورج مرکزی‘‘ Hillo-centric کا تصوّر سامنے آیا ہے اس وقت سے زمین اور انسان دونوں اپنے اعلیٰ مقام سے گر چکے ہیں۔اب یہ بے وقعتی کے دن کاٹ رہے ہیں۔اسٹیفن اور برٹرینڈ رسل بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔حالانکہ یہ بات خود ان کی تحریروں کے مطابق بھی درست نہیں لگتی۔ انسان کی طرح خدا نے زمین میں بھی کچھ ایسی خصوصیات رکھی ہیں۔جن کی وجہ سے یہ جہاں ہونگے۔انسان کی باقی جاندار مخلوق سے اور زمین کی باقی کائنات سے امتیازی خصوصیّت برقرار رہے گی۔سوائے ان سیاروں کے جہاں زندگی ممکن یا موجود ہو۔یحییٰ ہارون کے ایک مضمون میں جو زمین سے متعلق ہے انہوں نے جو تخلیق کے سائنسی ثبوت دیئے ہیں۔مگر خود یہ ان کے موقف کے خلاف ہیں۔ان معلومات کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ہماری زمین ارتقائی منازل سے گزر کر موجودہ شکل میں آئی ہے ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ ’’زندگی صرف اور صرف اس وقت وجود میں آسکتی ہے جب موزوں ترین حالات اور عناصر بیک وقت دستیاب ہوں۔‘‘

یہی بات تو ارتقاء کے قائل لوگ بھی کہتے ہیں بلکہ وہ اس حقیقت کو ارتقاء کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ تدریجی ارتقاء کے ذریعہ ہی وہ موزوں ترین حالات اور یہ عناصر ظہور پذیر ہوئے ورنہ ابتداء میں یہ زمین انتہائی گرم تھی۔جہاں کیمیائی عمل ممکن ہی نہ تھا۔کروڑوں سال بعد جب زمین کا درجہ حرارت مناسب حد تک گر گیا۔تو زمین کی بیرونی سطح پر چار قسم کے نسبتاً ہلکے ایٹمز ہائیڈروجن آکسیجن، کاربن اور نائٹروجن کے باہمی ٹکراؤں سے مرکبات وجود میں آنے شروع ہوگئے۔انہی بے جان عناصر سے نامیاتی سالمات یا مرکبات وجود میں آئے۔ہارون یحییٰ نے کاربن کے بارے میں لکھا ہے کہ کاربن پیریاڈک ٹیبل میں چھٹا عنصر ہے۔یہی زمین پر زندگی کی اساس بھی ہے۔کیونکہ تمام نامیاتی (سالمے) مثلاً نیوکلک ایسڈز، امانیو ایسڈز، پروٹینز، روغنیات، شکریات وغیرہ کاربن کے مختلف عناصر کے ساتھ مل کر مختلف انداز میں تشکیل پاتے ہیں۔کاربن، نائٹروجن، H2، ور 02 سے ملکر لاکھوں مرکبات بناتا ہے یہ پورا عمل ہی ارتقاء کا عمل ہے جس میں کروڑوں سال کا عرصہ لگتا ہے اور یہ سارا عمل جادو کی چھڑی سے نہیں بلکہ خالق کائنات کے متعین کردہ قوانین کے مطابق ہورہا ہے۔زمین کی تخلیق میں سائنسی ثبوت کی بات صرف یحییٰ نے نہیں کی۔بلکہ یہ تو ایسی حقیقت ہے جس کو ارتقاء کے قائلین زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔کیونکہ ارتقاء کی ابتداء تو بحر حال حیات و کائنات کے انہی مادی و

عنصری ربط و نظام سے ہوتی ہے۔ دیگر سائنسدانوں کے علاوہ اسٹیفن نے بھی زمین کی منفرد خصوصیات پر اپنی کتاب ''گریٹ ڈیزائن'' میں ایک پورا باب شامل کیا ہے۔ وہ زمینی خصوصیات سے اتنے متاثر ہیں کہ انہیں معجزہ سمجھتے ہیں بلکہ اسے ایک ''The apparent miracle'' کا عنوان دیا ہے۔ اس باب میں اس نے زمین کی منفرد اور ذاتی خصوصیات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ پہلی اور بہت ہی اہم خصوصیّت ''زمین کا سورج سے مناسب فاصلہ'' ہے۔ اگر یہ فاصلہ دو منٹ سے کم یا زیادہ ہوتو پھر دو صورتوں میں زندگی کی موجودگی ناممکن ہو جاتی۔ پھر اس کا مدار اگر سرکولر کی بجائے لمبائی میں زیادہ ہوتا تو بھی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ کیونکہ Circular orbits are friendly to life

اس کے علاوہ سورج کی کمیت:

زمین کا قطبین پر جھکاؤ، اس کی گردشی رفتار، اس کی زمینی کمیت، زمینی کشش ثقل، اس کا اندرونی ڈیزائن، اس کرۂ کیمیائی، زمین کی اپنی جسامت، چاند سے اس کا موزوں فاصلہ، زمینی کیمیائی چکر اس کے پانی کو مائع حالت میں برقرار رکھنے کیلئے موزوں درجہ حرارت، اس کی فضا میں اوزان کی مناسب سطح اور اس کا موزوں مقناطیسی میدان، یہ تمام باتیں زندگی کیلئے اشد ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ سٹیفن کے مطابق اگر کمزور نیوکلیئر فورس کائنات کے آغاز کے وقت کم ہوتی موجودہ قوّت سے، تو کائنات میں تمام ہائیڈرون، ہیلیم میں تبدیل ہو جاتے اور جس کے نتیجہ میں ستاروں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ اگر پروٹانز 2-0 فیصد بھی بھاری ہوتے تو وہ نیوٹرانسز میں ڈھیر ہو جاتے۔ جس سے ایٹمز غیر مستحکم ہو جاتے۔ اگر کوارک کی مجموعی کمیت دس فیصد بھی تبدیل ہو جاتی تو مستحکم ایٹمز نیوکلی جن سے ہم بنے ہیں، بہت ہی کم مقدار میں موجود ہوتے۔ یحییٰ فرماتے ہیں کہ یہ اور ایسی لاتعداد تفصیلات بار بار ایک ہی سادہ اور واضح حقیقت کی تصدیق کر رہی ہیں کہ اللہ نے ان تمام اشیاء کی بہترین انداز میں تخلیق کی ہے۔

ناقدین ارتقاء کا اصل اعتراض ارتقاء کے ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظریہ پر ہے کہ جس کے مطابق کہ کائنات کسی خالق کے بغیر اتفاقاً خود ہی وجود میں آ گئی ہے اور اب یونہی کسی مقصد اور منزل کے بغیر سرگرم عمل ہے۔ ناقدین کہتے ہیں کہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کائنات کی ہر شے میں تخلیق کا جو عمل دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس کائنات کے خود بخود میں آ جانے سے ممکن نہ تھا۔ اگر وہ اس عمل تخلیق کا گہرائی میں جائزہ لیں تو تخلیق کے ساتھ ارتقاء بھی یوں اتفاقاً یا خود بخود نہیں ہو رہا بلکہ یہ عمل بھی ایک خاص پروگرام اور قوانین کے تحت جاری ہے جس کا مقصد اور ایک منزل ہے۔ اگر کچھ لوگ کائنات تخلیق یا ارتقاء کو بے مقصد اور بغیر کسی خالق کے سمجھتے ہیں تو ان کے موقف کو درست سمجھ کر کائنات تخلیق یا ارتقاء سے انکار کر دینا بھی درست نہیں ہے یا ان ناقدین کا یہ کہنا ہے کہ ''جب جاندار خلئے کی ساخت اور اس کی کارگزاری کے بارے میں زیادہ تفصیلات سامنے آئیں تو یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ جاندار خلیہ، ایک سادہ طریقہ سے تشکیل ہونے والی شے نہیں لیکن آپ اسے ارتقائی عمل کی تردید میں کیسے پیش کر سکتے ہیں۔ اتفاق اور الگ تصوّرات ہیں اور خود ارتقائی عمل دوسری حقیقت ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے مخلوط نہیں کرنا چاہئے جبکہ جاندار خلیہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے بھی غیر نامی ارتقاء جاری تھا۔ اس کے بعد نامی (Organic) ارتقاء جاری ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین اپنی کتاب غیر نامی ارتقاء کی تشریح یوں کرتے ہیں۔

The world did not come into existance suddenly as a finished product but it was created to acquire its present shape gradually by evolution, creation took the form of evolution .

ارتقائی سلسلہ اس وقت تک جاری رہاتا آنکہ پہلا جاندار خلیہ منظر عام پر آ گیا جو ایک اہم واقعہ ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سارے سائنسدانوں کا تخلیق یا ارتقاء کے بارے میں نظریہ مادہ پرستانہ نہیں ہے بلکہ وہ اسے اللہ کی صفت خالقیت سے منسلک کرتے ہیں ان میں کوپرنیکس، کیپلر، گلیلیو، نیوٹن، آئن سٹائن، نیل بور، میکس پلانک، سر آرتھر ایڈنلسن، سر جیمز جینز، پال ڈیولیز وغیرہ درجنوں بڑے بڑے سائنسدان ہیں۔

نیوٹن کے بارے میں اسٹیفن کا کہنا ہے۔

Newton believed that our solar system did not arise out of chaos by mere the laws of nature instead the order of the universe was created by God at first by him to this day in the same state and condition

سٹیفن نے بعض سائنسدانوں کے خیالات کو تو دیانتداری سے نقل کر دیا ہے مگر وہ خود کسی ہستی کو خالق کائنات نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت چونکہ نیوکلیر فزکس اور دیگر کائناتی قوانین کے متعلق کم معلومات میسر تھیں اس لئے انہوں نے ایسا کہہ دیا تھا۔ جناب یحییٰ کا یہ کہنا درست ہے ''کہ ایک خلیہ کا اتفاقی امکان ناممکن'' ہے۔ لیکن ان کا یہ کہنا کسی بھی پہلو سے بجا نہیں ہوسکتا۔ کہ ''نظریۂ ارتقاء دعویٰ کرتا ہے کہ یہ خلیہ جسے انسان اپنی تمام تر ذہانت، علم اور حاصل کردہ ٹیکنالوجی کے باوجود بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اتفاقاً وجود میں آ گیا۔ نظریۂ ارتقاء اس قسم کے دعوے نہیں کرتا۔ وہ تو اللہ کی ربوبیّت کا عملی اظہار ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کے بقول یہ کائناتی قانون تو ربوبیّت کا قانون ہے اور سائنس کی زبان میں ارتقاء یا نشوونما کا قانون ہے یعنی خدا بتدریج ہر مخلوق کی تربیّت اس کی مناسبت سے کرتا رہے اور کمال پر پہنچا دے۔

کیمرج کے مشہور فلکیات فریڈ ہائل ابتداء میں وہ کسی خالق کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ نے ان کو ارتقاء پسند کہا ہے یہ غلط ہے وہ تو کائنات کو بنی بنائی اور ازلی سمجھتے تھے۔ انہوں نے بگ بینگ کے مقابلے میں Steady state کا نظریہ دیا۔ جو کائنات کو بنی بنائی شے قرار دیتا تھا۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ایسی رہے گی۔ ان کا نظریہ مات کھا گیا بعد میں انہوں نے خالق کائنات کو تسلیم کر لیا تھا ان کا یقین تھا کہ ہر چیز کو خدا نے پیدا کیا ہے اور کوئی چیز اتفاقیہ وجود میں نہیں آئی۔ برائن اپنی کتاب ''تاریخ موجودات'' میں امینوایسڈ کی پیچیدگی پر لکھتے ہیں۔

''بے ترتیب حالات اور طوائف الملوکی کی کیفیّت میں ایک امینوایسڈ کا بننا بھی محال ہے۔'' اس نے فریڈ ہائل کا حوالہ دیا کہ یہ ایسے ہی ہوگا کہ ہوائی جہازوں کے پرزوں کے گودام میں آندھی چلے اور جب اس کا زور ٹوٹے تو وہاں تیار شدہ جہاز کھڑے ہوں۔''

فتح اللہ اور یحییٰ دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ سارے سائنسدان مادہ پرستی کا شکار نہیں اس لئے انہیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ

674

ارتقائی عمل اور مادہ پرستانہ فلسفے کا باہم کسی قسم کا اتفاق نہیں کائنات کے اتفاقیہ طور پر وجود میں آنے کی تردید صرف ناقدین ہی نہیں کرتے بلکہ اکثر بڑے اہم اور مشہور سائنسدانوں نے بھی اس تصوّر کو مسترد کر دیا ہے اس کے علاوہ بگ بینگ پر سب سے پہلے تحقیق کرنے والے پولینڈ کے لامیترے خود ایک پادری تھے۔ اس طرح سورج مرکز نظام شمسی کے بانی کوپرنیکس بھی لاٹ پادری تھے۔ اس طرح لائیڈ مارگن، فلسفی پسکال، پروفیسر کوبن، کارلائل، ڈاکٹر ملین، پروفیسر راشڈل، نفسیات دان ڈاکٹر ژنگ، پکتھال درجنوں دیگر فلاسفہ اور دانشور جو اتفاقات کے قائل نہیں بلکہ ارتقاء کے قائل ہیں۔ اس لئے تدریجی ارتقاء کو ملحدانہ اور مادہ پرستی کے تصوّرات سے نہ جوڑا جائے بلکہ اسے خدا کی صفت ربوبیّت کا عملی مظہر سمجھنا چاہئے۔ جبھی ہم ملحدانہ نظریات کا دلائل کے ساتھ توڑ کر سکیں گے۔ انہی لوگوں میں عظیم سائنسدان آئن سٹائن بھی شامل ہیں۔ انہوں نے بھی ان اتفاقات کو تسلیم نہیں کیا۔ سٹیفن کے مطابق انہوں نے کوانٹم کے تصوّر پر اہم کام کیا۔ اس نے کوانٹم میکینکس کو کبھی پوری طرح قبول نہیں کیا۔ اس کا اظہار مشہور جملے میں ہوا۔ ''کہ خدا پانسہ نہیں کھیلتا'' ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ کائنات کا سلسلہ اتفاقات پر نہیں بلکہ شعوری طور پر مرتب کردہ قوانین کے مطابق چل رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے نیل بور سے پوچھا تھا۔ Do you believe that God who plays dice with universe.

تو نیل بور نے زچ ہو کر جواب دیا تھا۔

Do'not tell God what to play?

پوچھنے سے مقصد یہ تھا کہ کائنات کا نظام ایک خاص پروگرام کے تحت چلایا جا رہا ہے نہ کہ جوے سے لیکن سٹیفن نے آئن سٹائن کے اس مؤقف کو قبول نہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسی بات نہیں کیونکہ آئن سٹائن نے کائنات کے بارے میں کہا تھا۔

God does not play dice but also sometimes throws them where they Can't be seen.

آئن سٹائن نے کائنات کے بارے میں کہا تھا۔

The incomprehensible about the universe is that it is comprehesnisble.

تو سٹیفن نے یوں وضاحت کی۔

univese is Comprehensible becuse it is governed by scientifie laws

یہاں تضاد ملاحظہ کریں جو اپنے موقف کے برعکس کہہ رہے ہیں کہ کائناتی نظام جوئے خانہ کی طرح چل رہا ہے۔ اب فتح اللہ اسٹیفن سے متفق ہو کر کہتے ہیں۔

غالباً ان کا اشارہ بلیک ہولز کی طرف ہے۔ ساری کائنات مرئی ہو یا غیر مرئی ہر جگہ اللہ کے قوانین لاگو ہیں۔ پتہ نہیں فتح اللہ نے ہاکنگ کے ان غلط موقف کی تائید کیوں کی اور Seen اور unseen کی تفریق کیسے کی جو خدا کی نظر میں تو غائب نہیں۔

انسانی جسم میں کارفرما کیمیائی عناصر یا مرکّبات:

ان ناقدین ارتقاء نے انسانی جسم میں کارفرما عناصر اور مرکبات مثلاً خلیات، ڈی این اے، آر این اے، جینز، پروٹینز

وغیرہ کو نظریۂ ارتقاء کی تردید میں پیش کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یہ عوامل اتفاقیہ طور پر نہیں بن سکتے۔ دلیل تو درست ہے کہ یہ مرکبات خود بخود نہیں بن سکتے۔لیکن ارتقائی عمل سے اس دلیل کا قطعاً کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ تو خود ارتقاء والے حکماء بھی کہتے ہیں کہ یہ اشیاء خود بخود وجود میں نہیں آسکتیں۔ بل برائین نے ان کیمیائی مرکبات کی پیچیدگیوں کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے کہ تمام اشیاء اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آسکتیں۔ وہ بات کو پروٹینز سے شروع کرتے ہیں کہ ''شاید ایک کروڑ پروٹینز میں سے ہر ایک مکمل طور پر منفرد ہے'' اور ہر ایک کا آپ کو خوش وخرم زندگی عطا کرنے میں اہم رول ہے اور یہیں سے سلسلہ چلتا ہے۔ پروٹین کی افادیت اس صورت میں ممکن ہے جب امینوایسڈز کی اجزائے ترکیبی صحیح ہوا و راس پر طرہ یہ کہ اسے ایک مخصوص شکل وشباہت کا ہونا چاہئے۔ ساخت کی اسی پیچیدگی کے اصول کے بعد بھی پروٹین بے کار ہے اگر اس میں خودمختار پیدا واری صلاحیت نہیں لیکن پروٹینز اس خواص سے محروم ہیں۔ جب تک DNA نہ ہو اس کو اس میں ید طولیٰ ہے اور یہ سینکڑوں سے بھی زیادہ کم عرصہ میں اپنی فوٹو کاپی بنا سکتا ہے۔علاوہ ازیں اسے کوئی کام نہیں آتا۔اس طرح تضاد کی ایک انتہائی کیفیت پیدا ہوگئی۔ پروٹینز DNA کے بغیر کچھ نہیں اور DNA پروٹینز کی غیر موجودگی میں بے کار ہے تو کیا اس سے ہم یہ مفروضہ قائم کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ دونوں ایک ہی وقت میں پیدا ہوئے اگر ایسا ہوا تو؟ وہ مزید کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور بھی چاہئے۔DNA، پروٹینز اور دیگر اجزاء افزائش کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ جب تک ایک جھلی میں سب کو یکجا نہ کیا جائے۔

قابل توجہ:

کسی جوہر یا سالمے نے اپنے طور پر زندگی کا حصول نہیں کیا آپ ایک ایٹم یا سالمہ کو اپنے جسم سے الگ کرکے دیکھ لیں اس کی حیثیت ریت کے ذریعہ جیسی ہوگی۔اس کی بقاء اور نشوونما کا راز اس میں ہے کہ وہ ایک خلیہ کی مہربان آغوش میں محصور ہوں اور اس وقت ہی یہ مختلف اجزائے ضروری، زندگی کے اس حیران کن رقص میں شمولیت کے مجاز ہوتے ہیں۔ خلیے کے بغیر ان کی اہمیّت نہیں وہ محض دلچسپ کیمیائی جزاء بن جاتے ہیں۔لیکن کیمیا کی غیر موجودگی میں خلیہ بھی بے وقعت ہے۔ پال ڈیویز ارتقاء کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''اگر ہر چیز کو دوسری چیز کی ضرورت نہیں تو پھر خلیوں کا خانوادہ کیسے ظہور پذیر ہوا۔اس لئے وہ اسے زندگی کا معجزہ کہتے ہیں۔

یحییٰ نے بتدریج ارتقاء کے خلاف ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ DNA خود بخود اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آسکتا۔اس دلیل کا تعلق بھی ارتقاء کے تصوّر سے نہیں ہے۔ کیونکہ ارتقاء کا آغاز کسی چیز کی تخلیق کے بعد ہوتا ہے۔تقریباً سارے متفق ہیں کہ DNA ہی نہیں بلکہ کوئی بھی کیمیائی جز اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آسکتا۔جس طرح بھی برائین پروٹیز کی پیچیدگیوں پر کہتے ہیں۔'' پروٹینز اس وقت بنتے ہیں جب ہم امینوایسڈز کو ایک رسی کی صورت میں پروتے ہیں۔جس کیلئے بہت سے امینوایسڈز درکار ہیں۔انسانی

جسم میں ایک ملین سے زیادہ پروٹینز موجود ہوتے ہیں۔جن میں ہر ایک اپنی حیثیت میں ایک معجزہ ہے۔ کہتے ہیں گو مے جن، جو ایک عام پروٹین ہے کے بنانے میں 1055 امینوایسڈز کو ایک خاص ترتیب دینا ہوتا ہے۔لیکن سب سے اہم امر یہ ہے کہ آپ اسے بنا نہیں سکتے۔ یہ خود بنتا ہے اچانک اور بغیر کسی ہدایت کے اور اس جگہ ''ناممکن'' کا ظہور ہوتا ہے۔ یہاں برائین غیر محسوس انداز میں تسلیم کررہا ہے کہ ان اجزاء کو کوئی نادیدہ ہستی ہدایات دیتی ہے۔جبھی تو وہ بنتے ہیں۔ ورنہ انسان کیلئے یہ ناممکن ہے 1055 عناصر کا خاص ترتیب اختیار کرنا ناممکن اصول ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔اس کا وجود ایک کرشمہ ہے۔

اسٹیفن DNA کے بارے میں کہتے ہیں کہ کائنات اور زندگی کا ظہور ایٹم کے تعامل سے اتفاقیہ طور پر ہوا۔

"some very premitive form of life arose Spantaneously on earth from chance combination of atoms."

لیکن DNA کے بارے میں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ اتفاقیہ طور پر نہیں بن سکتا۔

"This early form of life was probably a large molecule but it was not DNA as forming DNA is impossible by random Combination.

بل برائسن کہتے ہیں'' کہ آپ ان تمام اجزاء پر نظر ڈالیں۔ جو انسانی جسم میں شامل ہیں۔ کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن وغیرہ ان کو برتن میں ڈال کر پانی ڈالیں۔ پھر زور سے ہلائیں کیا یہ ممکن ہے کہ ایک صحیح سلامت انسان اس برتن میں نکل آئے یہ انتہائی حیران کن ہوگا۔

ڈاکٹر ڈاکنز ان لوگوں کی تردید کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ پروٹینز آناً فاناً ظہور میں آئے۔ پروٹینز ایک دم نہیں بنتے۔ لازمی طور پر کوئی ایسی اجتماعی انتخابی تحریک موجود ہوگی جس کے زیر اثر امینوایسڈز نے ایک خاص ترتیب اختیار کی۔

بل برائن نے ایک واقعہ جو 1953ء میں شگاگو یونیورسٹی کے ایک طالب علم سٹینلے ملر نے چند ضروری کیمیائی اجزاء مثلاً میتھین، امونیا اور ہائیڈروجن سلفائڈ گیسز کے آمیزہ پر تجربہ کرکے زندہ خلیہ بنانے کی کوشش کی تھی۔جس کے بعد کچھ دنوں میں پانی ایک سبز رنگ کے مواد میں تبدیل ہوگیا۔جس میں امینوایسڈز فیٹی ایسڈز شوگر اور دوسرے نباتی مرکب شامل تھے۔ اخبارات نے اسے بڑا اچھالا۔ یوں تاثر دیا کہ مندرجہ بالا مرکب تیار کریں اسے ذرا ہلائیں تو جاندار رینگ کر سامنے آئینگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اندازہ ہوگیا کہ معاملہ اتنا سادہ نہ تھا پچاس سالوں تک اس مسئلہ پر کام کرنے کے باوجود ہم اس حقیقت کے انکشاف سے اتنے دور ہیں جتنے 1953ء میں فرض کیا تھا۔

حضرت یونسؑ یعنی یوناہ، جو عربی میں یونس ہو گیا

یونسؑ کا ذکر صرف ایک آیت (10:98) میں آیا ہے۔ ان کا تذکرہ دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے۔ یہ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ ان کا عبرانی نام ''یوناہ'' تھا جو عربی میں آکر ''یونس'' ہو گیا تورات میں ان کا صحیفہ ''کتاب یوناہ'' کے نام سے موجود ہے۔ قیاساً 700ء ق م کے قریب ان کا زمانہ ہے۔

ایک نرالی قوم:

اس سے پہلے جن اقوام وملل کے حالات قرآن میں آئے ہیں کہ وہ خدا کے راستہ سے بتانے کے باوجود سرکشی اختیار کرتے اور پھر وہ تباہی و ذلت کا شکار ہو جاتے۔ لیکن یونسؑ کے معاملہ میں معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے انہوں نے سوچ بچار کے بعد روش بدل دی اور ہدایت کا راستہ اختیار کیا۔ یونسؑ نے اس کا انتظار نہ کیا کہ ان پر عذاب نازل ہونے والا ہے اور وہاں سے چل نکلے۔

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۳۹ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝۱۴۰ (37:139-140) ہم اس وقت کی بات کر رہے ہیں جب وہ فرائض منصبی کو چھوڑ کر ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف دوڑا۔ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا (21:87) فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۝۱۴۱ (37:141) وہ دوسری سواریوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گیا اس کی یہ اجتہادی غلطی تھی کیونکہ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا (21:87) کے بعد ہے فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (21:87)۔ اس کا یہ اقدام قابل مواخذہ نہیں ہو گا۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ۝۱۴۲ (37:142) اسے ایک بڑی مچھلی نے منہ میں دبوچ لیا اور اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا کہ عجلت میں، میں نے کیا کیا؟ اس کی تائید اگلی آیت سے ہو رہی ہے کہ دبوچ لیا۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۝۱۴۳ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۴۴ (37:143-144)

فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۷ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ

مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸ (21:87-88)

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝۱۴۷ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۱۴۸ (37:147-148)

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۹۸ (10:98)

لَوْ حرفِ گرامر:

لَوْ:۔ 1-اِن (اگر) کے معنوں میں فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۲ (26:102) سو اگر ہمیں ایک بار لوٹ جانے کا موقع مل جائے۔ لو بالعموم ایسے امور کیلئے آتا ہے جن کا وقوع میں آنا ممکن نہ ہو۔ یعنی محض فرضی طور پر ایسا کیا جائے اور پر ''اِن کا آنا ممکنات میں سے نہیں'' تو اس کا ترجمہ ''بفرض محال'' کیا جائے تو بہتر ہے۔

2- ''اگر'' کے ساتھ۔ اے کاش (تمنا) کے معنوں میں مندرجہ بالا آیت میں تمنا بھی ہے۔ ''اے کاش'' ایسا ہوتا'' جیسے لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۲ (15:2)

3- اَنْ (کہ) کے مفہوم میں۔ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ښ (2:109) اصل کتاب میں سے اکثر یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر کردیں۔ (اگرچہ اس میں ''کاش'' کا مفہوم بھی ہے)

4- لَوْ کے ساتھ لائے نفی۔ لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳۱ (34:31) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔

5- ''کیوں نہیں'' لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ (25:7) اس کی طرف فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔

6- لَوْلَا۔ ''نہیں'' کے معنوں میں فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ (10:98) ایسی کوئی بستی نہیں ہوئی۔

7- بعض اوقات لَو لَا کی بجائے لَومَا بھی آتا ہے۔ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷ (15:7) اگر تم سچے ہو تو تمہارے پاس فرشتے کیوں نہیں آئے؟

قانونِ خداوندی یہ ہے کہ ایک شے دوسری سے مل کر نتیجہ پیدا کرتی ہے

مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ ؕ (10:3) قانونِ خداوندی یہ ہے کہ وہ (کائنات میں ایک شے دوسری شے ملکر ایک نیا نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ ملاپ اس کے قانون کے مطابق نہ ہوتو پھر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوسکتا)۔اس طرح اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی حمایت وتائید کیلئے اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تو اس کی تائید وحمایت بھی اسی صورت میں مفید نتائج کی حامل ہوگی۔ جب وہ قانون خداوندی کے مطابق ہو۔یعنی جس خدا کے قوانین خارجی کائنات میں بھی کارفرما ہیں تو یہ رسول خدا کے قوانین جو پیش کرتا ہے تو اس کا انسان ہونا ان قوانین کے جھوٹا ہونے کی دلیل کس طرح ہوسکتا ہے۔ پوری آیت:

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۳﴾ (10:3)

تسخیرِ فطرت والے اور ان کے برعکس

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ﴿٦﴾ (10:6)

یعنی کائنات پر تحقیق صرف طبعی مفاد کا حصول نہیں بلکہ مقصد انسانی ذات کی نشوونما اور تزکیہ ہے یہ ہے فرق ایک سیکولر سائنسدان میں اور مومن محقق میں۔ اس فرق کو اگلی آیت میں واضح کر دیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ﴿٧﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨﴾ (10:7-8)

تسخیر فطرت:

ان کے برعکس (1) جو لوگ قانون فطرت کا علم تو حاصل کر لیں مگر زندگی کو صرف یہاں تک محدود سمجھیں اور اخروی (مکافات عمل) کے منکر ہوں اور طبعی مفاد پر مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں یا

(2) جو ان قوانین سے یکسر غافل ہوں۔ یہ دونوں گروہ ناکام و مراد ہونگے۔ ان کا دنیوی معاشرہ بھی جہنّم ہوگا اور اخروی زندگی بھی۔

اس لئے کہ دنیا اور آخرت کی کامرانیاں انہی کے حصّہ میں آتی ہیں۔ جو ان قوّتوں کو تسخیر کر کے انہیں اقدار خداوندی کے تحت عالمگیر انسانیّت کی فلاح کیلئے استعمال میں لائیں۔

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (13:17) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٩﴾ (10:9)

جنّتی معاشرہ دنیا میں:

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ۚ (10:10) یہ معاشرہ ان کی دعوت کا زندہ ثبوت ہوگا کہ یہ چیز خدا کے قانون سے بہت دور ہے کہ وہ صحیح کوششوں کے تخریبی نتائج پیدا کر دے۔

وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ (10:10) اور ان میں ہر فرد دوسروں کیلئے حیات بخشی آرزوئیں اور سلامتی کی تمنائیں لئے ہوئے ہوگا۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠﴾ (10:10) اور ان کی دعوت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص اس ربوبیّت کے خوشگوار نتائج دیکھ کر حمد و ستائش کے صد ہزار نغمات اپنی زبان سے گانا شروع کر دے گا۔

قانونِ مہلّت

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ (10:11) دیکھو! جس طرح انسان اپنے فائدے حاصل کرنے کیلئے جلد بازی کرتا ہے۔ اگراللہ کا قانون مکافات بھی اسی طرح نقصان پہنچانے (مواخذہ) میں جلدی کرتا۔

لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ (10:11) تو ان لوگوں کا بھی وقت پورا ہو چکا ہوتا جو غلط راستے پر چلتے ہیں۔ (لیکن اس نے تخم ریزی اور ثمر باری کے درمیان ایک وقفہ مقرر کر رکھا ہے۔ لہٰذا اس کی رو سے ہوتا یہ ہے کہ)

فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۱ (10:11) کہ جو قانون مکافات پر یقین نہیں رکھتے تو ان کی فوری گرفت نہیں ہوتی بلکہ ان کو ان کی سرکشی میں حیران و سرگرداں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر غلط اقدام پر فوری گرفت ہو جائے تو ہم نے جو یہ اصول مقرر کر رکھا ہے کہ انسان بلا جوروا کراہ صحیح راستہ اختیار کرے اپنی مرضی سے۔ تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ مثلاً کسی ظالم کا ہاتھ مظلوم کے خلاف اٹھے اگر وہ وہیں پتھر بنا دیا جائے۔ تو ساری دنیا ایمان لے آئے لیکن یہ ایمان غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہوگا۔ تو ایسا ایمان عقل سے ماؤف کر دینے سے ایمان ہی نہیں کہلاتا وہ تو جبری اکراہ کا نتیجہ ہوگا۔ جب کہ مومن تو عقل وفہم سے ایمان لاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝۷۳ (25:73) قوموں کی حیات وموت اور اعمال کے نتائج کیلئے قرآن نے تخریبی اور تعمیری پلڑے کا ذکر کیا ہے۔ اس ثقل اور خفت میں بحر حال وقت لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک قوم کے اعمال کے تخریبی پلڑہ میں ذرا جھکاؤ پیدا ہو یعنی تعمیری اعمال تخریبی کے مقابل کم ہو جائیں۔ تو اس کی وجہ سے کچھ خفیف سے جھٹکے لگیں تو وہ سنبھل جائے اور اپنے حسن عمل میں اضافہ کرے۔ اور تباہی رک جائے یہ جو اقوام میں ہم دیکھتے ہیں ایک قوم میں خرابیوں کے باوجود زوال آمادہ ہونے پر بھی تباہ نہیں ہوتی۔ تو وجہ یہ ہے کہ سے اصلاح خویش کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ یونسؑ کے تذکرہ میں مہلت کی طرف اشارہ کی یہ اہمیّت بھی ہے کہ یہ قانون ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فیصلہ میں اجتہادی سہو ہو گیا۔ قوم نے اس واقعہ میں اصلاح کر لی اور وہ تباہی سے بچ گئی۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱ (101:6-7-8-9-10-11)

تباہی سے قبل دو شرائط اور قرآن کو سمجھنے کیلئے شرائط اور رزق کا انتظام نظام پر ہے

وَلَقَدۡ اَهۡلَكۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا ۙ وَجَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳﴾ (10:13)

روش کے انجام سے پہلے آگاہ کر دیا جائے اور ان میں تنذیر کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳﴾ (10:13) یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارا قانون ابدی ہے اس معاملہ میں۔

قرآن کو سمجھنے کے لیے شرائط، قرآن پر ایمان کے لیے تین شرائط کہ یہ عقل سے ماوراء سرچشمہ کا پیغام ہے:

بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۳۹﴾ (10:39)

بات یہ نہیں کہ یہ لوگ علم و بصیرت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن منجانب اللہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ قرآن کی صداقت کو سمجھنے اور پرکھنے کا جو صحیح طریقہ ہے۔ وہ اسے اختیار ہی نہیں کرتے جبکہ اس کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ i) انسان کی علمی سطح اتنی بلند ہو کہ اس کے حقائق کا احاطہ کر سکے یا ii) قرآن جو عملی نظام پیش کرتا ہے اس کے محسوس نتائج اس کے دعاوی کا ثبوت بنتے ہیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ انسان اس کا انتظار کرے کہ وہ نظام متشکل ہو اور اس کے نتائج سامنے آجائیں۔

iii) اگر کوئی یہ بھی نہ کرنا چاہے تو کم از کم تاریخ کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس سے پہلے جن قوموں نے ان اصولوں کو جھٹلایا تھا ان کا انجام کیا ہوا؟

صرف قرآن کا سننا وہ بھی رسول ﷺ کی مجلس میں بھی کیوں نہ ہو اور پھر بصارت کا نہ ہونا خود فریبی اور اپنے آپ پر ظلم ہے۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡظُرُ اِلَيۡكَ ؕ اَفَاَنۡتَ تَهۡدِى الۡعُمۡىَ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۴۳﴾ (10:43) جو عقل و بصیرت سے کام نہ لیں تو اندھوں کو تو راستہ نہیں دکھایا جا سکتا۔

جشنِ نزولِ قرآن، عید الفطر:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝58 (10:58) اس قسم کا ضابطہ حیات کامل جانا خدا کے فضل ورحمت سے ہے۔ ہمیں تو اس پر جشن مسرت منانا چاہئے۔ یہ سب ان چیزوں سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے رہے ہو۔ نزول قرآن کا آغاز رمضان کے مہینے میں ہوا تھا۔(2:185) اس عظیم القدر واقعہ کی یاد میں عید الفطر کا تیوہار منانے کا حکم دیا گیا۔ جو درحقیقت جشن نزول قرآن ہے۔

''رزق کا ذمہ خدا کے نظام پر ہے'':

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝98 (6:98)

وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝6 (11:6)

روئے زمین کوئی ذی حیات ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے نہ لے رکھی ہو۔ اس لئے وہ جانتا ہے کہ اسے ایک منزل میں ٹھہرنے، پھر قانون ارتقاء کی رو سے اگلی منزل تک پہنچنے کیلئے کس قدر اور کون کون سا سامان نشوونما کی ضرورت ہے اور یہ سب کچھ قانون مشیت میں واضح طور پر درج ہے۔

اس لئے منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا نظام وہی ہوسکتا ہے جس میں ہر ذی حیات کو اس کی نشوونما کا ہر قسم کا ضروری سامان ملتا رہے۔ جو نظام ان ضروریات کو پورا کرے گا وہاں نظام خداوندی کہلائے گا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝47 (36:47)

يَسْــَٔــلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝29 (55:29)

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝10 (41:10)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَاۗبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝60 (29:60)

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (6:151)

ارتقاء

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ط (6:98)

نظریہ ارتقاء کی بنیاد یہ ہے کہ زندگی جامد نہیں بلکہ متحرک ہے یہ اپنے اوّلین جرثومہ سے حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے لیکن مسلسل حرکت نہیں کئے جاتی۔ ایک منزل میں آکر تھوڑی دیر کیلئے رکتی ہے۔ وہاں کے ماحول سے سامان نشوونما اپنے اندر جذب کرتی ہے اور جب اس میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے تو پھر چلنا شروع کر دیتی ہے اس طرح وہ رکتی اور چلتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلتی جاتی ہے۔ یہ ہیں فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ط (6:98) ۔ جو بڑی جامع اور لطیف اصطلاحات ہیں۔ جب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی کسی جگہ رک جائے تو اسے قرار کہتے ہیں۔ رکی ہوئی تو منجمد شے بھی ہوتی ہے لیکن اس کیلئے قرار کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ یہ لفظ صرف متحرک اشیاء کے عارضی طور پر رک جانے کیلئے بولا جاتا ہے۔ اس رکنے کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہوجاتی ہے۔ قرآن نے اسے مُسْتَوْدَعٌ ط (6:98) سے تعبیر کرتا ہے یعنی کسی کی امانت کسی کے سپرد کر دینا'' یعنی یہ چیز اس منزل کے پاس جو اس کا فَمُسْتَقَرٌّ (6:98) تھا۔ فطرت نے بطور امانت رکھی تھی اس نے وہ امانت اس کے سپرد کر دی جس کی وہ امانت تھی اس طرح فَمُسْتَقَرٌّ (6:98) اور مستودع کی منزلیں طے کرتی ہوئی، زندگی سلسلہ ارتقاء کی آخری حدود تک پہنچ گئی۔ سائنس کے اس مشکل مضمون کو بھی قرآن نے کس قدر شاداب وشگفتہ انداز میں پیش کر دیا۔ لیکن یہ حقائق صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جو تفقہ (غور وفکر سے کام) لیں۔

زندگی کی اگلی اور بلند منزل مُسْتَوْدَعٌ ط ہے اگر جدوجہد جاری رکھے تو یہی مُسْتَوْدَعٌ ط اس کا مستقر بن جاتا ہے اور اسے اگلی منزل میں پہنچا دیتا ہے۔ (83:26,74:27,74:38)

❁❁❁

حیاتِ جاوید پانے والا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (8:24)

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿٦٩﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٠﴾ (36:69-70)

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿٦﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿٧﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ﴿٨﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴿٩﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴿١٠﴾ (92:5-6-7-8-9-10)

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾ (92:18)

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ﴿٢﴾ (67:2)

لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿٣٧﴾ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿٣٨﴾ (74:37-38)

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿٢٦﴾ (83:26)

آگے بڑھنے کی صلاحیت، ذات کی علم النفس کی اصطلاح میں متوازن ذات کو کہتے ہیں۔ جسے قرآن نے اَحْسَنُ عَمَلًا کہا ہے جس کا نام ہی توازن کا ہے۔ متوازن شخصیت میں مرنے کے بعد آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے اور دوسروں کی نشوونما کیلئے دنیا سرفہرست عمل ہے۔ تو ادھر بھی اور ادھر بھی اس کی زندگی میں توازن پیدا ہوجاتا ہے۔

عقلِ انسانی بچپن سے جوانی تک ارتقاء:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ (11:37-38)

جزائے اعمال:

نوحؑ اور متبعین کو اس سیلاب سے محفوظ رکھنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا۔ تو اس کیلئے طبعی ذریعہ کشتی اختیار کیا گیا۔ کسی فوق الفطرت ذریعہ سے انہیں محفوظ نہیں رکھا گیا۔ اس پر مخالفین تمسخر اڑاتے تھے اگر وہ عقل سے کام لیتے تو کشتی بنا کر اس سیلاب سے محفوظ رہ سکتے

تھے۔اس سے واضح ہے کہ جوتباہی طبیعی اسباب کے ذریعہ آتی ہے (سیلاب) اس سے حفاظت بھی طبیعی اسباب (کشتی) کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔تیسری بات اس زمانے میں انسان کی تمدنی حالت ایسی تھی کہ نوحؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی بذریعہ وحی سکھائی گئی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ عصر حاضر کی تحقیقات کی رو سے زمانہ قبل از تاریخ کی اقوام کے ہاں جو بعض نادر اشیاء برآمد ہوئی ہیں۔تو ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انہیں ان کا علم ان انبیاء کی وساطت سے ہوا ہوگا۔بعد میں ان انبیاء کے تذکرے تو محو ہو گئے یا مسخ ہو کر افسانوی یا توہم پرستانہ حیثیت اختیار کر لی۔لیکن وہ معلومات روایتی طور پر آگے منتقل ہوتی رہیں۔عصر حاضر کی اثری تحقیقات اور حضریات کے دوران ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں پہنچ کر محققین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ اس دور کے انسانوں نے یہ کچھ کیسے کر لیا تو اس مقام پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے نوادرات کا سرچشمہ علم وحی تھا۔

❁❁❁

قومیّت کے اشتراک کا قرآنی نظریہ

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ۝۴۵ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۝۴۶ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِىْ وَتَرْحَمْنِىْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۝۴۷ (11:45-46-47)

❁❁❁

اختلافات صرف وحی سے ہی ختم ہو سکتے ہیں

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ (11:118-119)

(اس سے شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ خدا نے ایسا سلسلہ کیوں کر دیا کہ لوگ باہمی کشمکش میں لگ کر حق وصداقت کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان سب کو ایسا کیوں نہیں کر دیا کہ سب ایک راستے پر چلیں۔(5:48)

خدا کیلئے مشکل نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو بھی کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح بلا اختیار وارادہ پیدا کر دیتا۔ اس طرح وہ مجبوراً ایک راستہ پر چلتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس نے سب انسانوں کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے وہ باہم دگر اختلاف کرتے ہیں۔

ان اختلاف سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ قانون خداوندی کا اتباع کریں۔(2:36-38) ایک صاحب اقتدار ہستی کا اتباع کرنے سے اختلافات خود بخود مٹ جاتے ہیں۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ایسا قانون بھی دیا ہے۔ انسان کو اس انداز سے پیدا کرنے کا مقصد ہی یہی تھا۔ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ (11:119) یعنی وہ صاحب اختیار پیدا کئے گئے ہیں نہ کہ اختلاف کرنے کیلئے یہ آخر لامر ایک امت بنکر رہیں گے۔(43:23) وہ تباہیوں اور بربادیوں کے جہنّم میں جائیں گے۔ خواہ وہ شہر میں مہذب آبادیوں ہوں یا صحرائی آبادیاں۔ ہمارا اٹل قانون ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ (11:119) سے مراد یہ نہیں کہ خدا نے ایسا فیصلہ کر رکھا ہے بلکہ خدا کے قانون مکافات نافذ کر رکھا ہے جس کے مطابق جنّت اور جہنّم میں جانے کے فیصلے اعمال کی رو سے کئے جاتے ہیں۔ چونکہ اختیار وارادہ دیا ہوا ہے تو ایک دوسرے سے اختلاف کریں یا چاہیں تو اتفاق واتحاد سے رہیں اور باہمی اتفاق و مؤدت سے رہیں۔ تو ان پر خدا کی رحمت اور اختلاف والے جہنّم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کا عروج صرف ذاتی کردار کی وجہ سے ہوا

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن مالوف سے ہجرت کر کے شام اور کنعان میں آ کر مملکت قائم کی۔ جو آل ابراہیم تک رہی (4:54) چھوٹا بیٹا اسحٰق اس مملکت کا نگران جبکہ بڑا بیٹا اسمٰعیل کعبہ کی تولیت کیلئے حجاز میں آ کر لیا۔ اسحٰق کے بیٹے یعقوب بھی کنعان میں رہے یوں نظر آتا ہے کہ ان کے زمانے میں مملکت سمٹ کر قبیلہ کی سرداری تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ یوسفؑ ان کے بیٹے تھے۔ داستان یوسف میں کس قسم کے تضاد یا انقلاب کا تذکرہ نہیں۔ یہ ہے وہ حقیقت کہ کس طرح ایک فرد کے جوہر ذاتی، سیرت کی بلندی و کردار اسے خاک نشین سے اٹھا کر مدارج ومناسب انسانیت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن اس راستے میں قدم قدم پر ایسی صبر آزما اور نظر فریب کی گھاٹیاں آتی ہیں کہ اگر پاؤں پھسلا تو سیدھا ذلت وخواری کے جہنّم میں گرا۔ ان پر آشوب راستوں سے دامن بچاتے ہوئے مردانہ وار صحیح سلامت آگے بڑھ جانا یقیناً من العزم الامور ہے۔ یہ ہے وہ راستہ جس میں ہر چشم بصیرت کو قدم قدم پر جہاں یوسفی کی رعنائیاں جلوہ بار نظر آتی ہیں۔ اس عظیم مقصد کو بیان کرنا ضروری ہے جس کیلئے قرآن نے اس داستان کو اس تابندگی سے پیش کیا ہے۔ مساعد حالات اور موافق ماحول میں راست بازی اور دیانت داری کی زندگی بسر کرنا چنداں دقت طلب نہیں۔ مشکل وہاں پڑتی ہے جہاں حالات مخالف اور نا مساعد ہوں۔ ایسے وقت میں حق وصداقت کو ہاتھ سے جانے نہ دینا یقیناً ''من عزم الامور'' ہے اور کسی انسان کی سیرت و کردار کا اندازہ ہی ایسے ناموافق حالات میں لگایا جا سکتا ہے۔ چاروں طرف جھوٹ، مکر وفریب کے جال بچھ رہے ہیں۔ جھوٹ اور ملمّع کاری کا فروغ ہے۔ جو جس قدر زیادہ زمانہ ساز اور فریب کار ہے اتنا ہی کامیاب وکامران صداقت اور راست اطواری کا ہر طرف گلا گھونٹا جا رہا ہے اس طرز زندگی سے قدم قدم پر مصائب وتکالیف کا سامنا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں مسابقت ''تصنع اور فریب کاری سے حاصل ہو رہی ہے۔ سچے اصولوں پر کاربند رہنے سے ناکامی ہی ناکامی ہے۔ اس دوراہے پر کشمکش میں پڑ کر رک جاتے ہیں۔ کامیابیوں کا لالچ فریب دے رہا ہے کہ جن حربوں سے دوسرے کام نکال رہے ہیں۔ مجھے بھی وہی استعمال کرنا چاہئے۔ دوسری طرف اقدار کا تحفظ ہے۔ جو اس فریب کارانہ روش میں ہر مقام پر عناں گیر ہوتی ہے۔ ان حالات میں جن لوگوں کا نصب العین صرف مفاد ہوتا ہے۔ خواہ اس کیلئے کسی قسم کے ذرائع بھی استعمال کرنا پڑیں کہ یہ جو کچھ لوگ کر رہے ہیں ہمیں بھی وہی کچھ کرنا چاہئے۔ نفس کا فریب یہ خوش آئند دلیل دیکر یہ اطمینان دلا دیتا ہے کہ ایک فرد کی

674

اصول پرستی سوائے اس کے اس کی تباہی کا باعث بن جائے اور کیا نتیجہ پیدا کرسکتی ہے صرف عوام ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے مفکرین بھی اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یورپ کا فلسفۂ اخلاق کا علمبردار لکھتا ہے۔

''مثالی زندگی بسر کرنے والے انسان کیلئے دوسری قسم کے انسانوں کے اندر مثالی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ ان فریب کار لوگوں میں جن کا کوئی اصول نہ ہو۔ خالص سچائی اور صاف دلی یقیناً ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ ایسی روشن زندگی جو عام مروّجہ مسالک زندگی کے خلاف ہو۔ کامیابی کے لحاظ سے قائم نہیں رہ جا سکتا۔ آخر کار اس انسان کی اپنی یا اس کی نسل کی یا دونوں کی موت کا باعث ہوتی ہے''۔ ان لوگوں کے فیصلے ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ لیکن جن کے سامنے حقیقت بے نقاب ہوتی ہے۔ وہ ناموافق حالات اور نامساعد احوال وظروف کے سامنے چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں۔ پھر دنیا دیکھتی ہے کہ اخرالامر (ان کے اپنے سامنے یا ان کے بعد) ماحول کو ان کی روش کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ ان کی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ اس حقیقت کبریٰ کا آئینہ دار ہوتا ہے ؎

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ باتو نہ نسازد تو بازمانہ ستیز

یوسفؑ کی داستان اس حقیقت کی پردہ کشا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک شخص کا کردار باطل کے نظام کو الٹ کر حق کا نظام قائم نہیں کرسکتا۔ اس کیلئے ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس شخص کا مثالی کردار اس قسم کی جماعت پیدا کرنے کیلئے بڑا ممد ومعاون اور First crystal بن جاتا ہے۔ کنعان کے اس چرواہے کو اتنی بلندیاں کہ اس کے سامنے چاند اور سورج جھک جائیں۔ اندھے کنوؤں، مصر کے بازاروں اور قید وبند کی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ جو بلندیاں ملتی ہیں اس استحکام خودی کے نتیجے میں ہیں۔ جن کا مظاہرہ ان نامساعد حالات میں ہوتا ہے۔

تَأْوِيْلُ الْاَحَادِيْثِ اور خوابوں کی دنیا

تاویل الاحادیث:

چونکہ حضرت یوسفؑ نے خوابوں کی تعبیر بتائی تھی اس لئے عام طور سے یہ سمجھ لیا گیا کہ تاویل الاحادیث سے مراد خوابوں کی تعبیر کا علم ہے۔خوابوں کا تعبیر کا علم بھی تاویل الاحادیث میں شامل ہوسکتا ہے۔لیکن اس سے مراد ''تعبیر علم المنام'' نہیں ہے۔ تاویل کے معنی نتیجہ اور مآل کار اور حدیث سے مراد ''باتیں''یعنی کسی سے بات معلوم کر لینا کہ اس کا صحیح صحیح مطلب کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ معاملہ فہمی کہلاتا ہے۔یعنی جب کوئی معاملہ سامنے آئے تو اس کے سیاق وسباق اور متعلقات پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

ایک عام انسان اور ایک صاحب تدّبر اور فراست کا فرق کیا ہوتا ہے۔معاملات و واقعات ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ایک عام ذہنی سطح کا انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔لیکن ایک دیدہ ور کی نگاہیں، ہواؤں کے رخ سے،طوفان کی آمد کا اندازہ کر لیتی ہیں۔قوموں کی زندگی، ان کے مفکرین کی دیدہ وری اور مآل اندیشی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ یوسفؑ ایک گلہ بانوں کے گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ ہر چند کہ وہاں کی سرداری ان کے گھرانے میں تھی۔لیکن ان کو وہاں حضریت کی سیاست،عمرانیات و معاشیات کے معاملات سے متعلق کوئی بھی تعلیم نہیں مل سکتی تھی۔ چونکہ ایک بلند پایہ فراست عطا ہوئی تھی اور پھر ایسے مواقع، جن میں آپ نے عملی طور پر معاملات کے نظم ونسق کا سلیقہ سیکھ لیا۔جس طرح موسیٰؑ کو بچپن سے فرعون کے محلات میں پہنچ کر وہاں کی داخلی سیاست سے آگاہ کیا گیا۔جس سے انہوں نے بعد میں دوچار ہونا تھا۔

عزیز مصر نے آپ کو اپنی مملکت کا معتمد علیہ بنا دیا۔اس طرح ان امور کا عملی تجربہ ہوگیا۔جو تمدّنی زندگی کی خصوصیات میں تھے اور اس طرح سے آپ نے تاویل الاحادیث کا علم حاصل کیا۔خوابوں کے علم کیلئے تو تمکن فی الارض کی ضرورت نہیں تھی۔ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۫ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ (12:21) آپ نے حسن وتدّبر سے ان امور کا انتظام کیا کہ سب آپ کے گرویدہ ہوگئے۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ (12:101) تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اختیار واقتدار کا مالک بنا دیا اور مجھے تدّبر امور اور عاقبت اندیشی کا علم وسلیقہ عطا فرما دیا۔سو تاویل الاحادیث سے مراد پیش نظر احوال وکوائف سے استنباط نتائج کی صلاحیت ہے۔

خوابوں کی دنیا

خوابوں کی دنیا:

چونکہ داستان یوسف میں خوابوں کے تذکرے کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔خواب کی حقیقت کیا ہے؟ عصر حاضر میں تجزیہ نفس کے ماہرین بالخصوص فرائڈ اور اس کے مکتب فکر نے اسے خاص طور پر اپنے تحقیق و تفتیش کا موضوع بنایا ہے۔ چونکہ یہ علم ہنوز اپنے عہد طفولیت میں ہے۔اس لئے یہ روشنی ابھی دھندلی سی ہے۔لیکن بااین ہمہ اس کے کچھ گوشے سامنے ضرور آچکے ہیں۔اس علم کے مطابق انسان میں نفس شعوریہ کے ساتھ ساتھ نفس غیر شعوریہ بھی کارفرما ہے۔انسانی زندگی کے بہت سے احوال نفس شعوریہ کچھ وقت تک یاد رکھتا ہے۔لیکن اس کے بعد یا تو ان واقعات کو یکسر بھلا دیتا ہے یا ان کے خصوصی تاثرات کو اپنی لوح سے مٹا دیتا ہے۔ لیکن غیر شعوریہ ان واقعات کے اہم حصص اور خصوصی تاثرات کو گرہ میں باندھ لیتا ہے اور یہ تاثرات نفس شعوریہ کے ساتھ متصادم ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح نظام عصبی کو غیر محسوس طور پر متاثر کر کے ایسے عوارضات لاحق ہوجاتے ہیں۔جس کا طبیعی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔نفس نیم یا غیر شعوریہ اس وقت حرکت میں آتا ہے جب شعوریہ کی فعالیت معطل ہوجاتی ہے۔مثلاً نشہ کی حالت، ہسٹریا، غشی وغیرہ میں لیکن غیر شعوریہ کو اپنی کارفرمائی کیلئے ان ہنگامی مواقع سے بھی زیادہ فرصت اس وقت ملتی ہے جب انسان سو رہا ہو اور نفس شعوریہ کی حرکت معطل ہوجائے۔تو غیر شعوری اپنے جادو کے البم کو کھول کر بھولے ہوئے افسانوں کی تصویریں ذہن کے پردہ سیمیں پر لاتا ہے۔ واقعات میں ترتیب اور ان کے نتائج وعواقب میں ربط وضبط نفس شعوریہ کا منصب ہے جبکہ غیر شعوریہ جن واقعات کے ٹکڑے سامنے لاتا ہے۔ان میں کوئی باہمی ربط اور ترتیب نہیں ہوتی۔اس لئے اس کی پیش کردہ فلم بے ربطی کا مجموعہ ہوتی ہے۔اگرچہ بعض اوقات وہ ٹکڑے بھی آجاتے ہیں۔جو اچھے خاصے مربوط ہوتے ہیں۔اس کا نام ''خواب'' ہے۔ان تاثرات میں جنہیں نفس شعوریہ بھلا دیتا ہے اور نفس غیر شعوریہ یا نیم شعوریہ اپنے سٹور میں رکھتا ہے۔ہزار محوِ گشتہ آرزوئیں، سینکڑوں پامال شدہ تمنائیں، حسرتیں خوابیدہ ہوتی ہیں۔نفس شعوریہ کی دنیا سوتی ہے تو یہ خوابیدہ حسرتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ بے ربطی کی ایک فلم چلنے لگتی ہے۔ جب شعوریہ کی آنکھ کھلتی ہے تو اس افسانے کے بعض ٹکڑے کسی بھولے ہوئے واقعہ کی یادوں کو تازہ کرا دیتے ہیں۔ جیسے بانسری کی آواز دور سے دل میں میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتی ہے۔اکثر و بیشتر خواب کا افسانہ بے ربطی کی نذر ہوجاتا ہے۔علم تجزیہ نفس کے ماہرین خوابوں کے ان بے ربط ٹکڑوں سے غیر شعوریہ نفس کی تہ میں چھپے ہوئے رازوں کی ٹوہ لگاتے ہیں۔جس کیلئے ان کو بڑی

صبر آزما محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ خواب والے کی سابقہ زندگی کے احوال وکوائف معلوم کرتے ہیں اوران پھانسوں کی تلاش کرتے ہیں جو رگِ جاں میں ڈوب کر پھرنہ ابھری ہوں۔ اس طرح وہ اس شخص کے خیالات کی رو سے ذہن کی افتاد کا مطالعہ کرتے ہیں پھر بعض نتائج اخذ کرتے ہیں لیکن یہ سارا کچھ قیاسی ہوتا ہے۔ حتمی طور پر وہ بھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔

خواب کا بعض اوقات تعبیر کے مطابق ہوجانا:

بعض اوقات یہ محقق اپنے قیاسات سے خواب کے معاملات کو آنے والے واقعات سے وابستہ کردیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ مستقبل کے واقعات خواب یا اس کی تعبیر کے مطابق نکل آتے ہیں۔ لیکن یہ محض اتفاقی امور ہیں۔ ان کو حقائق سے کچھ واسطہ نہیں۔ بیداری کے وقت جو کچھ خواب کے متعلق یاد رہتا ہے۔ وہ سب کچھ وہی نہیں ہوتا جو نفس غیر شعور یہ حالت خواب میں سامنے لاتا ہے۔ جو کچھ خواب میں سامنے آتا ہے۔ تجزیہ نفس کی رو سے اسے Latent content کہا جاتا ہے اور حالت بیداری میں جو کچھ یاد رہتا ہے تو اسے Manifest content کہتے ہیں۔ latent content سے Manifest content کا سراغ لگانا خواب کی تعبیر کہلاتا ہے۔

مثلاً آپ کی شدید تمنا ہے کہ آپ کا مستقبل فلاں سانچے میں ڈھلے۔ لیکن حالات اور واقعات آپ کو ادھر جانے نہیں دیتے۔ آپ کا نفس شعور یہ حالات اور واقعات کے مطابق کام کرتا ہے۔ لیکن جونہی آپ سوتے ہیں نفسی غیر شعور یہ آپ کی تمنا کی سوئی ہوئی دنیا کو بیدار کردیتا ہے اور وہ ایک حسین خواب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جب آپ جاگتے ہیں تو پھر اپنے احوال وظروف کے مطابق مصروف کار ہوجاتے ہیں۔ اب آخیر میں دوصورتوں میں سے ایک صورت پیدا ہوگی یا تو آپ کا مستقبل آپ کی آرزوؤں کے خلاف عام احوال وظروف کے قلب کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ محض واہمہ بن کررہ جائیں گے۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا کہ آپ نے احوال وظروف کے علی الرغم اپنے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطاق متشکل کرلیا۔ تو اس صورت میں آپ کے خواب حرف بحرف سچ بن کر سامنے آجائینگے۔ تو اس وقت آپ کہیں گے کہ مجھے پہلے ہی خواب میں اشارہ ہوگیا تھا کہ میرا مستقبل کیا بننے والا ہے اور اس طرح یہ خواب ''پیش گوئی'' ''Prophetic'' ہوجائینگے۔ اس پر دیگر واقعات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ بہت سی باتیں اتفاقی امور سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہ تحقیقات ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ خواب انسان کے اپنے ہی گم گشتہ خیالات وتصورات اور دبی ہوئی آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ انہیں کسی اور دنیا سے تعلق نہیں ہوتا۔ جس قسم کے خیالات اس قسم کے خواب ہونگے۔ جن لوگوں کے خیالات اور مقاصد پاکیزہ ہونگے۔ ان کے خواب بھی آئینے کی طرح مصفّٰی ہونگے۔ اس لئے انبیائے کرام کے خواب بھی رفعت وبلندی میں انسانی امکان کی بلندترین سطح پر ہوتے تھے۔

خواب کی تعبیر:

اس کا تعلق انسانی فراست سے ہے جو مختلف احوال وظروف کی روشنی میں قیاساً کسی نتیجے پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسی تعبیرات محض ظنی اور قیاسی ہوتی ہیں۔ اس میں نبی اور غیر نبی کا فرق نہیں ہوتا۔ نبی بھی اس باب میں جو کچھ کہے گا وہ اس کی ذاتی (بشری)

فراست پر ہوگا۔ وحی پر مبنی نہیں ہوگا۔

اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ (12:44)، (پریشان خیالی):

یعنی پریشان خیالی بعض اوقات طبیعت کے اثر سے بھی خواب مرتّب ہوجاتے ہیں۔ مثلاً سوتے میں پیاس لگے تو انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگ میں جھلس رہا ہے یا پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے۔ یہ خواب محض مزاج کے اثرات ہوتے ہیں ان کو اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍ (12:44) طب کی دنیا میں کہا جاتا ہے۔

نبیوں کے خواب:

پہلا خواب یوسفؑ کا ہے حالانکہ وہ ان کے بچپن کا زمانہ ہے لیکن خانوادۂ نبوّت کا چراغ اور خود بھی ہونے والا نبی، اس لئے خواب بھی انہی بلند خیالات کا آئینہ دار تھا۔ جن کی آماجگاہ آپ کا قلب و دماغ تھا۔ شمس وقمر اور ستارے سجدہ ریز! یہ تھا خواب اور اس کی تعبیر بتانے والے یعقوبؑ جن کو بیٹے کا طالع بلند اس کی سیرت کی پیشانی میں درخشاں نظر آرہا تھا۔

قید خانہ کے ساتھیوں کا خواب:

دوسرا قید خانہ کے ساتھیوں کا خواب تھا۔ جس کی تعبیر کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ کچھ وقت تک ساتھ رہنے سے فراست یوسفی نے بھانپ لیا ہوگا کہ ان میں سے ایک واقعی بے گناہ اور دوسرا مجرم۔ خود ان کے خیالات کی رو سے پہچان لینا بھی مشکل نہ تھا۔ اس لئے ان کے خوابوں کی تعبیر چنداں دشوار نہ تھی۔ یہ دراصل آپ کی صلاحیت تاویل الاحادیث کا ہی ایک مظاہر تھا۔ یعنی اس میں معاملہ فہمی کو زیادہ دخل تھا۔ لیکن اس سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک جگہ قرآن نے اس تعبیر کا ذکر اس انداز میں ہے کہ جس سے سوچ کا رخ اس طرف جاسکتا ہے کہ خدا نے اس کا علم آپ کو بذریعہ وحی دیا ہے۔ تعبیر بتانے کے بعد فرمایا۔

قُضِيَ الۡاَمۡرُ الَّذِيۡ فِيۡهِ تَسۡتَفۡتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ (12:41) یعنی فیصلہ ہو چکا ہے۔ دوسری جگہ۔

وَقَالَ لِلَّذِيۡ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنۡهُمَا (12:42) ظَنَّ یعنی اندازہ لگایا تھا کہ وہ چھوٹ جائے گا۔ یعنی یہ تعبیر یوسف کا ظن تھی۔ قیاس اور اندازہ تھا۔ یعنی بات یقینی نہیں تھی۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ آپ کی اپنی فراست کا نتیجہ تھی۔ وحی کی صورت میں اسے ظن نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وحی تو یقین کی انتہائی شکل ہے۔

تیسرا خواب بادشاہ کا:

حضرت یوسف جیسے دیدہ ور، صاحب فراست کیلئے جو اس ملک کا یقیناً گہری نظر سے مشاہدہ اور مطالعہ کر رہے ہونگے۔ یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا کہ ملک کی زرعی معیشت کس طرف جارہی ہے۔ اس کا آئینہ دار بادشاہ کا خواب تھا۔ اس میں قرآن نے یہ نہیں کہا کہ اس کی تدبیر اور تعبیر کی بنیاد وحی کا علم تھی۔

ابراہیم علیہ السلام کا خواب:

ابراہیم خواب میں بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں انہوں نے اسے خدا کا حکم سمجھ لیا اور بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس میں خدا نے کہا کہ یہ تو محض خواب ہے حقیقت نہیں ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا خواب:

دوسرا خواب نبی ﷺ کا ہے صلح حدیبیہ سے متعلق کہ آپ ہجرت فرما کر مکہ سے مدینہ تشریف لے آئے۔ مشن کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی چونکہ اس نظام کا مرکز کعبہ تھا جس کی تولیت کی آرزو دل میں شدت سے رہتی تھی۔ اسی شدت آرزو کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ نے 6 ھ میں خواب دیکھا کہ آپ ﷺ مکہ میں صحابہؓ کے ساتھ طواف کر رہے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں میں حجّ فرض نہیں ہوا تھا لیکن زمانہ قبل از اسلام عرب حجّ اور عمرہ بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عمرہ کے ارادے سے مکہ کا قصد فرمایا تو شدت شوق میں صحابہؓ کی ڈیڑھ ہزار کی جماعت ہم رکاب ہوگئی۔ ابھی مکہ سے ایک منزل دور حدیبیہ کے مقام پر تھے کہ قریش نے پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اگلے سال آئیں۔ چنانچہ معاہدہ ہو گیا اور آپ ﷺ مدینہ آ گئے۔ اس سے دل میں کھٹک سی ہوئی کہ جب آپ ﷺ نے خواب کی بناء پر عزم کیا تھا تو پھر کامیابی کیوں نہ ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہم اس سال حجّ کریں گے۔ قریش نے آپ ﷺ کی ناکامی اور خواب کا مذاق اڑایا۔

وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡيَا الَّتِىۡۤ اَرَيۡنٰكَ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلنَّاسِ (17:60) اور جب فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ فاتح و مقصود داخل ہوئے تو کہا لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوۡلَهُ الرُّءۡيَا بِالۡحَـقِّ ۚ (48:27)

علم المنام کا دروازہ:

خواب انسان کے اپنے ہی خیالات و تصوّرات کا پریشان سا عکس ہوتے ہیں کسی اور دنیا سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا خوابوں کی دنیا ایک مستقل عالم قرار دیکر اس پر حقائق کی بنیاد رکھ دینا، افسانہ طرازی سے کچھ زیادہ نہیں۔ حقائق کا تعلق علم سے ہے۔ عام آدمی کسب و ہنر سے حاصل کرتا ہے جو یقینی بھی ہوتا ہے ظنی بھی۔ یکسر یقینی علم وحی سے حاصل ہوتا ہے۔ خوابوں کا ان دونوں اقسام کے علم سے تعلق نہیں ہوتا۔ نہ کسی کا خواب کسی دوسرے یا خود خواب دیکھنے والے کیلئے حجّت ہو سکتا ہے اور نہ اس کی تعبیر کوئی خدائی سند رکھتی ہے۔ حقائق سے منہ موڑنے سے ہمارے ہاں اوہام پرستی کے سینکڑوں اور دروازے کھل جانے کے علاوہ خوابوں کی توہم پرستی بھی شامل ہوگئی ہے کہ فلاں بزرگ خواب میں آ کر یہ فرما گئے ہیں اب اس کی تعمیل آیات خداوندی سے بھی مقدم ہی نہیں بلکہ ان کا وہ اشارہ اگر شریعت کے خلاف بھی ہو تو یہ کہہ کر اس کو ترجیح دی جاتی ہے کہ شریعت تو ظواہر پرستی ہے اور وہ بزرگ حقیقت شناس۔ ان کے ارشاد میں پنہاں راز ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ قیامت یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر بھی علم المنام کی رو سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن کی کسی آیت کا مفہوم اگر ان کے مفید مطلب کا نہ ہو تو کہیں گے کہ اس میں فلاں فلاں لفظ کے متعلق تعبیر نامہ میں لکھا ہے

674

جبکہ تعبیر ناموں میں ایک ایک لفظ کے بیس بیس مفہوم درج ہیں تا کہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کا مفہوم لے لے۔ ان کے نزدیک قرآن گویا خدا کے خوابوں کا مجموعہ ہے جس کی تفسیر نہیں بلکہ تعبیر تعبیر المنام ''خوابوں کے تعبیر نامے'' کی رو سے کی جائے گی۔ حقائق کی تفسیر ایسے ظنیات وخرافات کی رو سے! دعویٰ یہ کہ اس قرآن فہمی کا سرچشمہ خالص علم الٰہی ہے وحی کا دروازہ تو بند کر دیا گیا مگر انہوں نے ان کے دریچے کھول دیئے۔ ان میں ایک دریچہ خواب بھی ہیں۔ جنہیں مبشرات کہا جاتا ہے اور ان مبشرات کو نبوّت کا چالیسواں حصّہ قرار دیا جاتا ہے۔

کاذب مدعیان نبوّت اپنے دعوے کی بنیاد خوابوں پر رکھتے ہیں۔ مسلمان قرآن کو چھوڑ کر جہل اور اوہام کی کیسی کیسی تاریک وادیوں میں ٹھوکریں کھا کر ذلیل وخوار ہو کر رہ گیا ہے۔

قرآن کا مقصد انسانی عقل کو جِلا دینا ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (12:2) اس آیت میں ایک عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا (12:2) قرآن کا بیان نہایت واضح، صاف اور سلجھا ہوا اس میں کوئی پیچ وخم نہیں ہے۔ یہ تو ہے اسلوب بیان کی خصوصیّت۔ اس کے بعد ہے۔ لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (12:2) اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اسلوب بیان ایسا نہیں کہ خودبخود سمجھ میں آجائے اور طالب علم کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جس طرح خارج میں روشنی سے استفادہ کیلئے آنکھ کا کھلا رکھنا ضروری ہے تو اس کے بعد سب کچھ خودبخود نظر آنے لگتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (12:2) کا یہ مفہوم قرآنی منشاء کے خلاف ہے۔ قرآن خودبخود سمجھ میں نہیں آتا اس کیلئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے ایک لفظ میں ''سمو'' کر رکھ دیا۔ ''تَعْقِلُوْنَ ۝ (12:2)'' فعل کا صیغہ ہے اور فعل اس امر کا متقاضی ہے کہ فاعل وہ کام کرے۔ جہاں تک نگاہ یاوری کرتی ہے۔ لفظ عقل کو فعل کے طور پر کسی زبان میں استعمال نہیں کیا گیا۔ کم ازکم اردو میں تو قطعاً نہیں۔ اس لئے ''تَعْقِلُوْنَ ۝ (12:2)'' کا ایک لفظ میں ترجمہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس قبیل کے دیگر الفاظ کا ترجمہ ہوسکتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (2:266) بہرے، گونگے اندھے ہوکر عقل سے کام نہیں لیتے قرآن کی رو سے ''عقل'' ایک صلاحیت ہے۔ جو خودبخود کام نہیں کرنے لگ جاتی۔ اس سے کام لیا جائے تو وہ اپنا منصب ادا کرتی ہے۔ کام نہ لیا جائے تو بیکار رہتی ہے۔ اس صلاحیت کو قرآن نے قلب کہہ کر پکارا ہے۔

فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ (22:46) تاکہ ان کی عقل سے کام لینے کی صلاحیت بیدار ہو۔ گویا قلب وہ ذریعہ ہے جس سے انسان عقل کو بروئے کار لاتا ہے۔ مقصد اس بحث کا یہ ہے کہ عقل انسانی یا سماعت کی طرح ایسی صلاحیت نہیں جو خودبخود بروئے کار آجائے۔ اسے بروئے کار لانا پڑتا ہے جو ایسا نہیں کرے گا۔ تو قرآن کے اسلوب بیان کی وضاحت اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ اس قوم کیلئے فائدہ مند ہے جو عقل کو بروئے کار لائے گی۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (30:28)۔ جس طرح لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ (12:7)

علم وبصیرت اور برہان سے دین کی تبلیغ:

یوسف اور اس کے بھائیوں کی اس داستان میں ان لوگوں کیلئے عبرت وموعظت کی نشانیاں ہیں۔ جو حقیقت اور صداقت کے متلاشی ہوں۔ جن کو اس کی احتیاج ہو۔ یعنی دل میں طلب ہو تو اس سے عقل کی صلاحیت بیدار ہوگی اور قرآنی مفاہیم سمجھ میں آئینگے۔ ہم تو نہ سائلین کے زمرے میں ہیں اور نہ عاقلین کے۔ تو قرآن سے کیسے نفع یاب ہوسکیں گے؟ قرآن انہی کی سمجھ میں آئے گا۔ جو انسان علم تجربہ، مشاہدہ۔ جس سطح تک وہ پہنچ چکا ہے اس کی روشنی میں قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کیلئے دوسروں کے علم وادراک سے فائدہ تو لیا جاسکتا ہے لیکن اسے اتھارٹی نہیں سمجھا جاسکتا قرآن کی اتھارٹی خود قرآن ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١٠٨
(12:108)

خدا کی طرف برہان ودلائل کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا کریں گے۔ وہ اس سے بہت بلند ہے کہ کائنات کو چلانے کیلئے اور قوتوں کو شریک کرے اس لئے میں ان میں سے نہیں ہوں جو قانون خداوندی کو بھی تسلیم کریں اور اس کے ساتھ اوروں کو بھی اس کے اقتدار میں شریک سمجھ کر ان کی اطاعت کرنے لگ جائے۔ یوں مسلم کہلوا کر مشرک کے مشرک رہیں۔

علم وبصیرت کی رو سے دین کو پیش کرنا اور دلیل و برہان کی رو سے اسے ماننا۔ یہ ہے ارشاد خداوندی اور یہ ہے سنّت رسول ﷺ۔ یہ ہے مومنوں کا طریق اور شیوہ۔

دین میں جو یہ طریق اختیار نہ کرے۔ وہ ارشاد خداوندی سے سرکشی برتا ہے اور سنّت رسول ﷺ کی مخالفت کرتا ہے۔ کسی کو اسلام چھوڑنے پر مردود قرار نہیں دیا جاسکتا۔

فطرت کی قوّتوں کو ملائکہ کہا گیا ہے

سورۃ الرّعد، وَيُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِهٖ (13:13):

انسان نے عہد طفولیت میں مظاہر فطرت کو الوہیاتی مقام دے رکھا تھا وہ انہیں دیوی دیوتا قرار دیکر ان کی پرستش کرتا تھا۔ عربوں کے ہاں یہ عقائد شدت سے موجود تھا۔ قرآن نے ان عقائد کی شدت سے تردید کر دی کہ یہ فطرت کی قوّتیں ہیں جن کو الوہیاتی اقتدار حاصل نہیں۔ یہ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ ان کے سمجھنے کی صلاحیت انسان میں رکھ دی گئی ہے۔ جو قوم ان کو تسخیر کرے گی تو وہ ''مسجودِ ملائک'' ہو جائے گی۔ رعد (بادل کی گرج) بھی انہی ملائکہ میں شامل ہے ایک روایت ہے۔ ''الرَّعۡدُ بِحَمۡدِهٖ وَالۡمَلٰٓٮِٕكَةُ'' کہ رعد ملائکہ میں سے ایک ملک ہے۔ غالباً اسی اہمیّت کے پیش نظر اس سورۃ کا نام ''سورۃ الرعد'' رکھا گیا ہے۔

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا (13:2) اتنے عظیم الشان کرے ہوا میں بغیر کسی ستون کے محو گردش ہیں جس طرح تم دیکھ رہے ہو۔ ستون تو ہیں لیکن غیر مرئی۔ تم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ پرسکون پر کشش اور جذب باہمی ہے جو غیر محسوس قوّت ہے۔

كُلٌّ يَّجۡرِىۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (13:2) یہ تمام مظاہر فطرت ایک معینہ مدت کیلئے رواں دواں ہیں۔ یعنی یہ کائنات مخلوق ہے اس لئے ابدی نہیں اور نہ ازلی ہے۔

يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ (13:2) یہ سلسلہ خود بخود نہیں چلا جا رہا بلکہ اس کی خالق کی تدابیر کے مطابق سرگرم عمل ہے اور وہ اس کے پیچھے ہے۔

بنیادی نقطہ:

لَعَلَّكُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّكُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ۝۲ (13:2) بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ کوئی سائنس کی کتاب نہیں یہ تو ایک عظیم مقصد تک لے جانے کا ذکر ہے جس طرح نظام فطرت ایک ضابطہ کے تحت نتیجہ خیز ہوتا ہے اس طرح انسانی اعمال بھی ان اقدار کے تحت تعمیر نتائج مرتب کریں گے۔ قوانین فطرت کے تذکرہ سے مراد توجہ قانون مکافات کی طرف منتقل کرانا ہے۔

ساری اقوام کا اور قیامت تک کے لیے رسول:

وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ۝۷ (13:7) اعلان ہے کہ رسول ﷺ کی پیش فرمودہ رہنمائی ہر قوم کیلئے ہے جو مکمل اور محفوظ ہے۔ اس لئے کسی قوم کیلئے بھی کسی اور کی ضرورت نہیں۔

کائنات میں حق و باطل کا ٹکراؤ زندگی کے ہر شعبے میں

قانونِ اضداد، Law of Contradiction

قانون محو وثبات:

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ؕ﴿۱۷﴾ (13:17)

اب رہی یہ بات کہ کائنات میں سب کچھ اس کا پیدا کردہ ہے تو پھر کیا بات ہے کہ یہاں صاف ستھرے پانی کے ساتھ خس و خاشاک بھی ہے۔ خوشگواریوں کے ساتھ ناخوشگواریاں، خیر کے ساتھ شر اور حق کے ساتھ باطل بھی ہے۔ ان سے کہو کہ یہ اس لئے ہے کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش کا قانون کارفرما ہے اور اس کشمکش سے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھو کہ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ تو پانی کے بہاؤ زمین کا میل کچیل جھاگ بن کر سطح آب پر آجاتا ہے۔ تو سیلاب کی رو اسے بہا کر لے جاتی ہے (اور زمین صاف ستھری رہ جاتی ہے)۔

یا یوں سمجھو کہ کسی دھات کو آگ میں پکا کر اس سے زیورات یا دیگر ضروریات کی چیزیں بنائی جائیں تو اس کا کھوٹ جھاگ بنکر اوپر آجاتا ہے (خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے)

اس طرح کائنات میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے تو تخریبی قوتیں جھاگ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں اور جو کچھ نوع انسانی کیلئے نفع بخش ہو تو وہی باقی رہ جاتا ہے یہ ہے خدا کا قانون محو وثبات۔

ساری انسانیّت کو جوڑنے کا حکم

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾

(13:21) یہ انسانی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم خدا نے ان کو دیا ہے اور وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کے نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔(2:27) اس کے برعکس فاسقین اور مفسدین وہ انہیں توڑتے ہیں جنہیں جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ منشائے خداوندی تمام انسانوں کو ایک برادری بنانا ہے اور ان تمام اختلافات برادری، قومیّت، رنگ ونسل کو مٹا کر ایک عالمگیر برادری کی شکل دیتی ہے یہ امت مسلم کا فریضہ تھا۔ یہی اسلام کا منتھیٰ اور دین کی غایت تھی۔ جو خود ذاتوں اور برادریوں اور قومیّتوں میں بٹ جائے۔ وہ بھلا انسانیّت کو کیسے جوڑے گی!

❁❁❁

حق و باطل کی کشمکش کا نام، یعنی حق و باطل کی تاریخ

اَیَّامُ اللہِ، حق و باطل کے کشمکش کی تاریخ:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵ (14:5) اور ہم نے اس طرح موسیٰ کو اپنے ضابطہ قوانین کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اپنی قوم کو موت کی تاریکیوں سے نکال کر زندگی کی روشنی میں لے آئے اور ان کو ان تاریخی سرگوشتوں کی یاد دلائے جس میں نظام خداوندی کو غلبہ اور تسلط حاصل ہوا تھا۔ ان سرگزشتوں میں ان لوگوں کیلئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں جو مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے کام لے کر اپنی کوششوں کو تعمیری نتائج سے ہم کنار کرتے ہیں۔

قوموں کے تصادم کو ''بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ (14:5)'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ تو دراصل حق و باطل کی کشمکش ہے۔ اسی نہج سے اسے ''بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ (14:5)'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اسلام کی تاریخ اور باقی دنیا کی تاریخ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اسلام کی تاریخ حق و باطل کی تاریخ ہوگی۔ یہ ہے ''بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ (14:5)'' صرف باقی دنیا کی تاریخ ہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی تاریخ (ایک قوم کی حیثیت سے) بھی ''بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ (14:5)'' نہیں کہلائے گی۔ وہ بھی دیگر اقوام کی تاریخ کی طرح ایک قوم کی تاریخ ہوگی۔ صدر اوّل کے بعد حق و باطل کی کشمکش کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تو ''بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ (14:5)'' کا دور میں باقی نہ رہا۔ اس کے بعد تو اسلام کی تاریخ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اس فرق کو پیش نظر نہ رکھنے سے بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سلاطین کا عہد اسلامی تاریخ نہیں گردانا جا سکتا۔ ''بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ (14:5)'' تو اس کے بعد وجۂ فروغ دیدہ ہوئے ہی نہیں۔ دنیا میں جس قدر کتابیں اسلام کی تاریخ کے نام سے متداوّل ہیں۔ وہ تو مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اسلام کی تاریخ تو آج تک مرتب نہیں ہوئی ہے یہ جب بھی مرتب ہوگی۔ اس کا انداز یہ ہوگا کہ اسلام اصل اور ابتداء میں کیا تھا۔ اب اس کی شکل کیا ہو چکی ہے یہ تبدیلی کیسے ہوئی۔ ''بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ (14:5)'' تو ہر صبّار اور شکور کیلئے ہے۔ جن میں ایسی قوم کیلئے سفر حیات کامیابی سے طے کرنے کیلئے عظیم نشانات

راہ ہونگے۔

سارے پیغمبروں نے نظام خداوندی قائم کیا تھا:

فَاَوْحٰۤی اِلَیۡہِمۡ رَبُّہُمۡ لَنُہۡلِکَنَّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسۡکِنَنَّکُمُ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَافَ مَقَامِیۡ وَخَافَ وَعِیۡدِ ﴿۱۴﴾ وَاسۡتَفۡتَحُوۡا وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ ﴿۱۵﴾ (14:13-14-15)

(تم ان کی دھمکیوں سے نہ گھبراؤ) اور ان کو بذریعہ وحی کہہ دیا گیا تھا کہ یہ انسانیت کے مجرم تباہ و برباد ہو جائینگے اور اس کے بعد تمہیں ان ملکوں کا اقتدار مل جائے گا۔ یہ کوئی ایسا نہیں ملے گا کہ تم خدا کے چہیتے ہو۔ ہر اس قوم کے حق میں ایسا ہوگا۔ جو قانون خداوندی کا صحیح مقام جانتی ہے اور اس سے سرکشی کا نتیجہ بھی اور اس نتیجہ سے خائف رہتی ہے۔

تو دلائل و براہین سے نہ ماننے اور ایک فیصلہ کن بات چاہی تو وہ آ گئی تو پھر ہر ظالم سرکش (جنہوں نے قانون خداوندی کا مقابلہ کیا تھا) ناکام و نامراد رہا۔

کہا جاتا ہے کہ بعض رسولوں نے تو مملکت قائم کی تھی اور بعض ایسے تھے جنہوں نے یہ نظام قائم نہیں کیا تھا۔ اس میں سارے رسولوں کی بات ہو رہی ہے کہا یہ جا رہا ہے کہ مخالفین کی تباہی کے بعد ان کو متمکن کیا گیا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ ان تمام رسولوں کی اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اقتدار کی وسیع و عریض مملکت میں قائم ہو۔ یہ کسی محدود خطہ ارض میں بھی ہو سکتا تھا۔ قرآن کی یہ شہادت یقینی ہے۔ اگر کسی مقام پر تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ تو یہ تاریخ کی کوتاہی ہے اگر قرآن میں ہر رسول کی تفصیل نہیں آئی تو یہ اس وجہ سے کہ قرآن کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے یہ تو کتاب ھدیٰ ہے یاد رکھیں جب بھی عام تاریخ اور قرآن کے بیان کردہ کسی اصول میں تضاد ہو تو قرآن کے بیان کو مبنی بر صداقت سمجھنا چاہئے۔ ہمارا ایمان تو قرآن پر ہے نہ کہ تاریخ پر۔

جنّت اور جہنّم کا آغاز اسی دنیا سے ہوجاتا ہے

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾ (14:16-17)

پھر یہ عذاب مستقل طور پر ان کو لگ جاتا ہے اور موت چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے لیکن موت چاہنے کے باوجود نہیں ملتی۔ بلکہ موت کی بجائے ذلت ورسوئی کا عذاب دوچند ہوجاتا ہے۔

یہ ہے محکوم قوم کا نقشہ جو قرآن کھینچتا ہے دنیاوی نقطہ نظر سے اگر ایک قوم پر کوئی دوسری حاکم ہو تو وہ محکوم کہلائے گی۔ لیکن قرآن کہتا ہے اگر کسی قوم پر کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی حکمرانی ہو تو وہ بھی محکوم ہے خواہ وہ حکمرانی اپنی قوم ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی تمام قومیں ہزار سال سے محکوم کی محکوم چلی آرہی ہیں۔ اسلام میں انسانوں کی انسانوں پر حکومت خواہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو، محکومی اور غلامی ہے آزادی صرف قوانین خداوندی کا نام ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتانِ آزری

خوشگوار اور تخریبی نظریہ حیات:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ (14:24)

ذرا غور کر دو متضاد نظریہ حیات کو ایک مثال سے واضح کر رہا ہے کہ خوشگوار نظریہ حیات کی مثال یوں سمجھو گویا ایک پھل دینے والا درخت ہے جس کی جڑیں محکم اور استوار پاتال میں ہوں اور اس کی شاخیں فضا کے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔

یعنی اسے معاشی زندگی میں تمکن حاصل ہو اور ساتھ ہی اقدار سماوی سے بھی لیس ہو۔

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ (14:25) اور یہ درخت ہر موسم میں خدا کے قانون کے مطابق پھل دیتا ہے۔ خدا غیر محسوس حقائق کو محسوس مثالوں سے واضح کرتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی

طرح سمجھ لیں۔

اس جامع مثال میں اسلام کی اصل واساس سمٹ کر آ گئی ہے قوموں کی زندگی کا راز اس نظریہ میں مضمر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں ایک نظریہ حیات وہ ہے جو مادی کائنات اور اقدار خداوندی کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کو اقدار خداوندی کے تحت ساری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کام میں لانا ہے اور اس کے زندگی بخش نتائج مستقلاً برآمد ہوتے رہتے ہیں جبکہ وہ قوم اس پر عمل پیرارہ کر، اس کی برکات سے فیضیاب ہوتی رہتی ہے۔ دوسری جگہ سے "اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ "(13:35) اس کی سایہ اور پھل بھی اپنے اندر ہمیشگی رکھتے ہیں اور قُطُوۡفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾(69:23) ان پھلوں کی خصوصیّت یہ ہوتی ہے کہ وہ بلاتفریق چھوٹا بڑا ہرایک کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ گویا ہرایک جھولی میں یعنی ازخود تمام معاشرہ تک پہنچتے ہیں۔

وَّفَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّلَا مَمۡنُوۡعَةٍ ﴿۳۳﴾(56:32-33) پھل کثیر تعداد میں اور ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ ہرایک کو اس کی ضرورت کے مطابق میسر ہونگے۔

جبکہ جہنّمی معاشرہ میں پھل تو بکثرت ہیں مگر باغوں پر پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں کہ کوئی ضرورت مند ان کے قریب نہ آنے پائے۔(18/32- 68/17-24) میں باغ والوں کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ یہ ہے قرآنی معاشرہ کا نقشہ۔

❁❁❁

باطل اور تعمیری نظریہ حیات

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ (14:26) باطل نظریہ زندگی کی مثال ایک ایسے نکمے درخت کی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ زمین کے اوپر ہو جب چاہو اسے اکھڑ کر پھینک دو کیونکہ اس میں استحکام نہیں ہے۔

غلط نظام اقدار خداوندی سے ہم کنار نہیں ہوتا تو پائیداری نہیں ہوتی ایسے نظریہ حیات کی۔ان دونوں نظریات میں فرق یہ ہے کہ طیب نظریہ حیات پر جب تک کوئی قوم عمل کرتی رہے گی۔تو وہ اسے اپنے ثمرات سے متمتع کرتا رہے گا جبکہ خبیث نظریہ حیات پر عمل پیرا ہونے کے باوجود قوم حقیقی خوشگوار ثمرات سے محروم رہتی ہے یعنی نہ امن واطمینان ہوگا اور نہ سلامتی۔يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾ (14:27) اس طرح اس محکم نظریہ کی رو سے خدا مومنوں کو ان کی دنیاوی اور آخری زندگی دونوں میں ثبات اور تمکن عطا کر دیتا ہے اور جو سرکشی برتے ان کی تمام کوششیں بے کار چلی جاتی ہیں اور یہ سب کچھ اس کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

دنیا بھی حسین اور بلند مقامات اور آخرت درخشندہ وتابندہ۔ یہ ہنگامی طور پر نہیں ہوتا بلکہ سارا کچھ اس کے قانون مشیت سے ہوتا ہے۔لیکن ''كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ (14:26)'' خود ہی کچھ نہیں کرتا جب اس پر عمل پیرا ہوں تو پھر اپنے نتائج مرتب کرتا ہے۔ اس عمیق حقیقت کو بڑے برجستہ انداز سے واضح کیا گیا ہے۔اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10) اس نظریہ میں اٹھنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے اپنی منزل مقصود کی طرف لیکن اسے بلند انسان کے اعمال صالح ہی کرتے ہیں۔وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ (8:17) یہ نظریہ اور بندہ مومن کی رفاقت۔اس کے برعکس باطل نظریات کے لیڈران کے عوام کو بربادی کی طرف لے جاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ (14:28-29) ذلت وخواری، بے قدری، خستہ حالی قوموں کی۔ یہ ہے جہنم جس میں ان کے لیڈران کو ڈالتے ہیں۔

باطل معاشرہ میں اصلاح سے کام نہیں چلتا بلکہ بالکل ایک نیا معاشرہ تمام دکھوں کا مداوا ہے

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ (14:48) جب اس انقلاب سے یہ زمین وآسمان بدل جائینگے اور ایک نیا معاشرہ وجود میں آجائے گا اور ہمارے لوگ نکھر کر اس خدا کے سامنے آجائیں گے جس کے سامنے کسی کا قانون نہیں چل سکتا جو بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

اس انقلاب سے باطل کا سابقہ نظام کا نام ونشان تک نہیں رہے گا۔ یہ ہوگا ''لا'' اور اس کی جگہ حق کا نظام تومتمکن ہوجائے گا۔ یہ ہوگا ''اِلاَّ'' ؎

خاکِ ماخیز و کہ سازد آسمانے دیگرے

دوسرے مقام پر کہا'' جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (11:82) غیر مسلم مورخین سے رسول ﷺ کے اس انقلاب کا پوچھئے کہ کس طرح سے یہ زمین وآسمان بدل گئے تھے۔ یہ پیوند سازی نہیں تھی۔ تعمیر نو تھی۔ تجدید نہیں تھی۔ تاسیس تھی۔ یہ نظام معاشرہ سے مصالحت یا مفاہمت نہیں کرتا وہ تو اسے جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ یکسر نیا معاشرہ قائم کرتا ہے۔ لا الہ کی رو سے تو ہر نظام آہنی کی بنیادی اینٹوں تک اکھیڑنا ہوتا ہے ؎

ہر بنائے کہنہ کہ باداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

باطل معاشرہ میں اصلاح احوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی اصلاح نہیں ہوتی اس کو تو جڑ سے اکھیڑنا ہوتا ہے۔ جبھی تو اس کی جگہ ایک نیا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

674

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ
وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٥٢﴾ (14:52)

(یہ تمام واقعات اس لئے بیان کئے گئے ہیں) کہ انسانیّت ان کی روشنی میں اس منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ لوگ آگاہ ہو جائیں کہ غلط روش کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے۔

اور جان لیں کہ کائنات جس اقتدار و اختیار اس کا ہے اور کسی کا نہیں اور صاحبان عقل و بصیرت ان حقائق کو سامنے رکھیں۔

❁❁❁

’’سورۃ الحجر‘‘
علمِ نجوم، ستاروں کے ساتھ انسانی قسمت کی وابستگی

اصحٰب یعنی قوم ثمود آلحجر ان کے دارالخلافہ کا نام تھا۔

علمِ نجوم:

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٦﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿١٧﴾ (15:16-17) (ان کا یہ دعویٰ کہ قرآن میں جو بتایا گیا ہے ان کو کاہن، نجومی۔ ستاروں کے علم کی رو سے بھی بتا سکتے ہیں) تو ستاروں کی کیفیّت تو یہ ہے، ہم نے فضا کی بلندیوں میں مختلف قسم کے ابھرے ہوئے کرے پھیلا رکھے ہیں اور ان سے روشنی منعکس ہوتی ہے تو دیکھنے والوں کو بڑا خوشنما لگتے ہیں (حالانکہ یہ ایسے نہیں ہے بلکہ ان کو خوشنما دیکھنے میں کر دیا گیا ہے)۔

اور ان کو ہر قسم کے تخریبی قوتوں سے محفوظ کر رکھا ہے۔ (اس لئے تو یہ کارگاہ کائنات اس قدر حسن وخوبی سے چل رہا ہے) یہ ہے ستاروں کی حقیقت جن کو یہ انسانی مقدرات اور واقعات کے متعلق پیش گوئیوں کا ذریعہ سمجھتے ہیں)۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨﴾ (15:18) (دور جہالت میں تو ان کا یہ کاروبار چل رہا تھا مگر اب علم کی روشنی یعنی قرآن کے نزول کے بعد یہ آہستہ کاروبار بند ہو جائے گا) ان کی حقیقت صرف قیاس آرائیاں ہیں (جو دور جہالت میں تو چل سکتی تھیں جب علم کی روشنی عام نہیں تھی) اب تو اس قسم کے قیاس وتخمین کے پیچھے علم ویقینی کا ایک چمکتا ہوا شعلہ یعنی قرآن موجود ہے۔ جو اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

علم نجوم، پیش گوئیاں:

قرآن کی اس نظری تعلیم کی تشریح خود حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ نے کروی جب یہ عقیدہ عام تھا کہ جب کسی سردار قوم کی وفات

ہوتی ہے تو چاند اور سورج کو گہن لگ جاتا ہے حضور ﷺ کے ایک صاحبزادے کی وفاتِ صغرسنی میں ہوئی تو اتفاق سے اس دن سورج کو گرہن لگ گیا تو مشہور ہو گیا کہ یہ گرہن بیٹے کی وفات کی وجہ سے ہوا ہے تو آپ ﷺ نے سختی سے تردید کر دی کہا کہ یہ تو قانون خداوندی سے ہوتا ہے۔ اس کا کسی کی موت و حیات سے کوئی تعلق نہیں۔ یوں حضور ﷺ نے توہم پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔

قرآن نے ان توہمات کے بتوں کو توڑا تھا۔ ہم نے ان کو جوڑ کر اپنے اسلامی عقائد کے محرابوں میں سجا دیا۔ اس نے نجوم (ستاروں کے ساتھ انسانی قسمت کی وابستگی) کو توہم پرستی اور نجومیوں کو باطل پرست قرار دیا تھا۔ ہم نے اس نجوم کو علم حقیقی اور اس کی بناء پر پیش گوئیوں اور تقدیر کو اپنا عقیدہ بنا لیا۔ ایک صاحب اختیار کیسے ان چیزوں کا پابند ہو سکتا ہے ؎

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند
تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں
ستارہ کیا تیری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

اور نجم شناسی کے متعلق:

تیرے مقام کو انجم شناسی کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

......☆......

قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ (16:22) عقلِ خود بیں اور جدید سائیکالوجی:

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾ (16:22) تمہارا خدا بھی وہی ہے جس کو تم کائنات کا خدا مانتے ہو۔ اس لئے زندگی کو صرف طبعی زندگی نہ مانا جائے۔ جسم تو طبعی قوانین کے تحت موت کے تحت ختم ہو جائے گا مگر اس فرد کا، انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ آگے چلے گا اور یہ سارا فساد تمہاری زندگی میں اس عقیدے کی وجہ سے ہے کہ جو قوت حاصل کرے تو اسے صرف اقتدار، قوت اور زندہ رہنے کا حق ہے اور ان کے اوپر کوئی اور طاقت نہیں ہے یہ ہے شرک عظیم، خدا پر ایمان سے مراد ہی آخرت پر ایمان رکھنا ہے۔ جزا و سزا، ان اعمال کا سارا بدلہ اس کے بعد کی زندگی میں بھگتنا

پڑے گا۔ مجھے ایک ایک پل کا حساب دینا پڑے گا۔ یہ ہے ایمان آخرت پر۔اس لئے وحی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ خدا پر ایمان کی کوئی وقعت نہیں اگر اس وحی پر ایمان نہیں ہے تو پھر "قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ (16:22)" یعنی ایسی عقل جو صرف اپنا مفاد سوچے یعنی عقل خود بیں۔ باقی ساری دنیا ذبح ہو جائے لیکن اس کا اپنا مفاد محفوظ رہے۔

اس عقل بے باک کو قرآن نے شیطان کہہ پکارا ہے جدید سائیکالوجی نے اسے دو حصّوں یعنی Rational and Irrational passions میں تقسیم کیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ جذبات بری چیز نہیں ہے مگر جو اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50) جذبات کی پیروی بری نہیں ہے ان کو بے باک اور سرکش چھوڑ دینا خطرناک ہے۔ تو پھر یہ معاشرہ کو تباہی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ قرآن ان کو "قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ (16:22)" کہتا ہے۔

❁❁❁

Personality کے دو پہلو Ego and Self

یہ صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ دوسرے ساتھ والے کا نہیں۔ ان کی Welfare بھی اس لئے ہے کہ کل کو مجھ پر مصیبت پڑی تو یہ میری مدد کرے گا۔ کیونکہ عقل اپنا تحفظ دوسروں کے ذریعہ چاہتی ہے۔ عقل اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔ اسے قرآن نے ''مُّنكِرَةٌ (16:22)'' کہا ہے۔

عقلِ خود بیں غافل است بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیندِ سوِ غیر
وحیٔ حق بنیندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبود ہمہ

کام تو عقل ہی کرتی ہے مگر اس کی پشت پر جذبات ہوتے ہیں۔ اگر ان کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو صرف اس فرد کے مفاد کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہ عقل کی کوئی تنقیص نہیں ہے بلکہ اس کا تو فریضہ ہی یہی ہے اسے اگر اقدارِ خداوندی کے تحت کر لیا جائے تو گویا پہاڑوں کے پانی کو آپ ساحلوں کے اندر لے آئے تو پھر تعمیر ہی تعمیر ہوگی۔ نہروں کی شکل میں خوشحالیاں اور زندگی کی علامت۔ اگر آزاد چھوڑ دیا تو سیلاب بن کر پورے کے پورے گاؤں کو بہا کر لے جائے گا۔ قرآن اس عقل کو جو حدود میں نہ رہے۔ ''قُلُوبٌ مُّنكِرَةٌ'' (16:22) کہتا ہے۔

Self اور Ego یعنی قُلُوبُهُمْ مُّنكِرَةٌ (16:22) جدید نفسیات کی روشنی میں:

سائیکالوجسٹ ایک نئی چیز لائے ہیں کہ ''انا'' تو ہر انسان کے اندر ہے جو شخصیت یا ''میں'' کہلاتی ہے اس کو ''Self'' کہا جاتا ہے۔ Selfless کی ٹرم ہی غلط ہے۔ کیونکہ Self تو کبھی مٹ ہی نہیں سکتا۔ Selfless یا Selfish کو غلط معانی پہنائے گئے ہیں۔ یہ ''انا'' میں سیلف ہی تو انسانی زندگی بنیاد ہے اس کو درمیان سے ہٹا دیں تو Animal رہ جائے گا۔ ایک کا نام Self جبکہ دوسری کا نام ''Ego'' رکھا ہے۔ یہ ہیں دو پہلو۔ جب یہ دوسرے کے فائدے کیلئے کوئی کام کرے اور اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو تو یہ ہے اس کے Self کا action اور جب ایسا کام کرے جس میں اپنا فائدہ مقصود ہو تو یہ اس کی Ego کا فنکشن ہوگا۔

جب رسول ﷺ پہلے دن یہ کہتا ہے کہ

وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ (26:180) تو یہ اس کا Self پکار رہا ہوتا ہے۔ رسول ﷺ کی زندگی میں کہیں بھی Ego نہیں آ رہا بلکہ Self آ رہا ہے۔ سائیکالوجسٹ کہہ رہے ہیں کہ تمام الجھنیں اور لڑائیاں Self اور Ego کے اندر ایک کشاکش ہوتی ہے۔ باہر کی دنیا میں بھی تباہیاں اس لئے ہیں کہ Ego کا Ego سے ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ اگر ایسے انسان پیدا ہو جائیں کہ جن کی Ego کو Self سے بدل دیا جائے تو ساری دنیا جنّت کا نمونہ ہو جائے گی۔ رسول ﷺ کی ساری زندگی انہوں نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا اور آخری عمر تک ان کو ان جنگوں میں شریک ہونا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود کیفیّت یہ ہے کہ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا ۝٦ (18:6) اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے جان گھلائی جا رہی ہے کہ یہ کیوں ایمان نہیں لاتے تا کہ یہ اس ہولناک تباہی سے بچ جائیں ان کو اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰى هُدٰىهُمۡ (16:37) کس قدر گہری اور شدید خواہش ہے۔ یہ ہے Self رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔

❁❁❁

مارکس کے لیے جذبہ محرّ کہ اور نظام سرمایہ داری
مومن وعدہ سے پھر گئے

وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ(16:53)، کمیونزم کا معاشی نظریہ کارل مارکس نے پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ تمام پریشانیاں الجھنیں جو دنیا میں نظر آ رہی ہیں۔ یہ رزق کی غلط تقسیم کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں۔ وہ اسے طبقاتی امتیاز کہتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ نظام سرمایہ داری کے خلاف ایک دوسرا محاذ ہے۔ یہ ٹکراؤ ہے دو نظریات کا، دو نظاموں کا۔ کہا کہ اگر اس مسئلہ کا صحیح حل دریافت کر کے نافذ کر دیا جائے تو یہ تمام تزاحمات ٹکراؤ ختم ہو جائیں گے اور امن کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اصول یہ ہونا چاہئے۔

"From each according to his eapacity and to each according to his need."

یعنی ہر آدمی اپنی صلاحیت کے مطابق کام کر کے جو فاضلہ ہو۔ ضرورت سے زیادہ وہ اس سے چھین لیا جائے۔ لے لیا جائے۔ اس نے کہا کہ میرے نزدیک تمام پریشانیوں کا حل یہی ہے لیکن عملاً رکاوٹ جو ہے۔ وہ جذبہ محرّ کہ کیا ہو جس کی بناء پر ایک شخص جان مار کر کام کرے اور ضرورت کے مطابق لیکر باقی دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کیلئے دیدے۔ جذبہ محرّ کہ کا کیوں، کا جواب میرے پاس نہیں ہے تو مارکس عاجز رہ گیا اور اس سے وہ پیچھے ہٹا اور اس کے ابتدائی سٹیج پر آ گیا۔ جسے سوشلزم یا اشتراکیت کہتے ہیں کہ اس سے ابتداء کرو اور تمام وسائل پیداوار، خواہ زمین، کارخانہ، خواہ انفرادی جائیداد ہو ان سب کو نیشنلائز کر لو۔ اس کے بعد ہر شخص کو کام مہیا کر کے اسے اس کی اجرت مقرر کر دی جائیں۔ یعنی Wages کا نظام اسے تو ہم نافذ کر سکتے ہیں۔ سو انہوں نے اسے نافذ کر دیا۔

سوشلزم اور کمیونزم میں فرق:

خود پارٹی میں اس اس سوشلزم (اشتراکیت) پر اعتراض ہوا کہ یہ تو کیپٹل ازم کی ایک شکل ہے۔ ذرا سی بدلی ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ اسے ویلفیئر کہہ سکتے ہیں۔ اصل سوال تو ان معاوضوں کے مقرر کرنے کا اصول ہے وہ کیا ہو؟ لیبر، انجینئر، سپروائزر کی تنخواہوں

میں بھی اگر فرق رکھا گیا۔انہوں نے کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام بھی تو یہی کچھ کرتا ہے اس میں کارخانہ کا مالک ہوتا ہے جبکہ یہاں کچھ افراد پر مشتمل سٹیٹ ہے تو دونوں میں پھر فرق کیا ہوا؟ وہاں مالک Wages مقرر کرتا تھا تو یہاں سٹیٹ نے مقرر کر دیں۔

بات اس حد تک آگے بڑھی کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔لینن نے آ کر (1870-1924ء) یہ سوشلزم عملاً نافذ کیا۔ دنیا میں کہیں بھی کمیونزم نافذ نہیں ہوا۔چونکہ جذبہ محرّ کہ نہ ملا تو اس لئے سوشلزم ہی نافذ ہوا اور جو ساری دنیا میں اب فیل ہو چکے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ وہی کیپٹل ازم کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے صرف مالک بدلتا ہے اور اس کی جگہ سٹیٹ لیتی ہے۔لوگوں کا ایک گروپ پرسنلٹی کلٹ کی وجہ سے لینن اور ماؤ تک یہ نظام چلتے رہے ان میں سے کسی کو بھی اس ''کیوں'' کا جواب نہ ملا۔

قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد ''وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ'' (16:53) پر ہے:

اس کا حل تو 14 صدیاں قبل قرآن نے پیش کیا تھا لہٰذا یہ مارکس کے ذہن کی اختراع نہیں بلکہ رسول ﷺ نے اس نظام کو عملاً نافذ کیا تھا۔پوری قوم جو کام انہیں دیا جاتا ہے کرتی تھی اور ہر ایک کو سٹیٹ کی طرف سے وظائف دیئے جاتے تھے۔اس کا معیار ''ہر فرد کی ضروریات'' جو مجرّد ہوتا تھا اس کا وظیفہ شادی اور بچوں والوں کے مقابلے میں کم ہوتا تھا اور سب کو ان کی ضروریات کے مطابق ملتا تھا۔وہاں اس ''کیوں'' کا جذبہ محرکہ کا کیا جواب دیا گیا تھا۔اس سارے مسئلے کی یہی بنیاد ہے قرآن تو ہر آیت کے ساتھ حکمت یعنی ''کیوں'' کا جواب دیتا ہے اور وہ ان چار لفظوں پر ہے۔''وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ''(16:53) نعمت سے مراد ''ہر قسم کی خوشگواریاں، صلاحیتیں رزق کا سامان، ضروریات زندگی، بلا مزدور معاوضہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہیں یہ سارا کچھ نظام فطرت سے حاصل ہوتا ہے۔زمین اس میں معدنیات، پیداواری صلاحیت پانی، ہوا، روشنی، ان میں سے کوئی چیز بھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔سب فمن اللہ ہیں اب آجایئے انسانی صلاحیتوں پر۔یہ اس کی خریدی ہوئی نہیں ہیں۔بلکہ یہ خدا ہی کی طرف سے بلا مزدور معاوضہ ملی ہوئی ہیں۔یہ تمام عقل و فہم، کمانے کی استعداد یہ ساری اس میں Potentially (مضمر) ہوتی ہیں، جن کی نشوونما باہر کے نظام کی رو سے ہوتی ہے۔قرآن ان تمام چیزوں کو ''فمن اللہ'' کہتا ہے۔یہ ذہن، یہ سوچ جہاں آ کر ایک فرد اور دوسرے فرد میں فرق پڑتا ہے کام کرنے کی صلاحیتیں کہ جو زیادہ عقل کا مالک ہے۔کچھ نچلے درجے پر ہے۔اس کے بعد اسے حاصل کرنے کی استعداد انجینیئر نے تعلیم حاصل کی جبکہ مزدور اس سے محروم رہ گیا۔یہ ساری صلاحیتیں ان کا منبع ''فمن اللہ'' ہے یہ ہے ایمان جبکہ کمیونسٹ کا ایمان ہے کہ یہ اسٹیٹ کی ملکیت ہے جبکہ میرا ایمان یہ ہے کہ یہ سارا کچھ فمن اللہ ہے۔کہتے ہیں کہ یہ تو ایک نظری سی Abstract سی چیز ہے۔لیکن سٹیٹ بھی تو ان قوانین کو منانے کا حق رکھتی ہے کیونکہ یہ اس کی ملکیت ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ سارا کچھ خدا کی ملکیت ہے اس لئے اسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے جو بھی قوانین بنانا چاہے، بنائے۔انہی کو تو ''وحی'' کہا جاتا ہے۔سٹیٹ کے قوانین کا ماننا آپ کے نزدیک تو نہایت معقول بات ہے۔ایسا آرٹیکل آف

Faith تو بری بات نہیں ہے۔لیکن اگر ہم کہیں کہ ہم سٹیٹ کی جگہ خدا کو مالک قرار دیتے ہیں۔سٹیٹ کو جو اختیارات حاصل ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کا اختیار خدا کو حاصل ہے۔تمہارے ہاں سٹیٹ کے جو اختیارات ضوابط قوانین میں آتے ہیں ہمارے نزدیک وہ قوانین خدا کی کتاب میں دیئے گئے ہیں۔بتاؤ دونوں میں کیا فرق ہے؟ ہمیں مطعون کرتے ہو اور خود بڑے Rationalist بنتے ہو۔

نظریہ اور ایمان کمیونزم پر رکھتے ہوئے اسے قابل عمل قرار نہیں دیتے۔کیونکہ ہمارے پاس جذبہ محرّکہ نہیں ہے اور ہم اتنا ماننے کے بعد ان کو اگلا قدم ''جذبہ محرّکہ'' کا دیتا کہ وسائل پیداوار خدا کے ہیں۔

اسلام نہ تو اشتراکیت ہے اور نہ سرمایہ داری:

''میرا ایمان ہے'' وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔سارے ذرائع پیداوار اور صلاحیتیں اس کی عطا کردہ ہیں۔ تمہارا ایمان وہاں ختم ہو گیا۔سب کچھ سٹیٹ کی ملکیت میں آ گیا۔خود اعتراف کرتے ہو کہ یہ تو Capitalism کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے جبکہ ہمارے ایمان کے مطابق تو نہ کیپٹل ازم رہتا ہے اور نہ سوشلزم اب میں جا کر محنت کرتا ہوں ان صلاحیتوں کے ساتھ۔دوسرا نہیں کرتا۔کہا۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾ (53:39) فرد صرف اس کا مالک ہے جس کیلئے محنت کرتا ہے۔یہ محنت اس کی ہے۔ عدل کے مطابق صرف وہ اپنی محنت اس کی ہے یہ اس کا مالک ہے انصاف وعدل کا تقاضا یہ ہے۔اس سے زیادہ ڈیمانڈ نہیں کرسکتا۔ اب عدل کے ساتھ احسان بھی ہے۔احسان یہ ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) تمہاری ضرویات پوری کرنا ہمارے ذمہ ہے۔کون سا نظام چاہئے کہ محنت کر کے اپنا حصّہ لے لو۔اگر اس سے بال بچوں کا پیٹ نہ بھرے تو پھر ہمارے ذمہ کوئی دوش نہیں ہے یا وہ نظام جس میں تمہارے بال بچوں بلکہ ہر ذی نفس کو سامان نشوونما اس کی ضرورت کے مطابق ملتا جائے۔تو پھر سیدھی سی بات ہے تو پھر ان صلاحیتوں کو پورا کرنے میں اس کام کے،صرف کرو۔بڑھتے چلے جاؤ۔اس کے بعد ہمارا کام ہے گھر آؤ گے تو سب کچھ موجود پاؤ گے۔تو پھر یہ دردسر لینے کی ضرورت کیا ہے کہ کیا کام کیا؟ کیا محنت کی؟ کہاں رکھوں؟ کہا بیچوں اب بتاؤ مل گیا نا جذبہ محرّکہ!

ذات کی نشوونما کیلئے جذبہ محرکہ:

اور سب سے زیادہ بنیادی چیز اس ذات یا نفس پر ایمان جس نے مکافات عمل کا سامنا کرنا ہے اور جسم دیا ہے۔اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ اقدار خداوندی کے تحت ذات کی نشوونما ہو سکے۔جتنا زیادہ سے زیادہ محنت کر کے دوسروں کو دو گے۔تو اس قدر زیادہ سے زیادہ تمہاری ذات کی نشوونما ہوتی جائیگی۔تمہاری جسم کی طبیعی ضروریات کی ذمہ داری تو اس نظام پر ہے۔ذات کی

674

نشوونما تم خود کروگے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے دوسروں کی ضروریات کیلئے اس نظام کے مرکز میں جمع کراؤ اور ذات کی نشوونما تم کرو جبکہ تمہاری اور تمہارے بچوں کی نشوونما ہم کریں گے۔ یہ ہے وہ جذبہ محرّ کہ جو مارکس کو نہیں ملا۔ جس کی بنیادوں پر یہ سماوی معاشی دسترخوان استوار ہوتا ہے۔ یہی جذبہ ایمان تھا کہ جس نے جان مار کر زیادہ سے زیادہ محنت کی تو جب وظیفہ دوسرے ضرورت مند کے مقابلہ میں کم ملا۔ تو اسے قطعاً کوئی گرانی کشیدگی محسوس نہیں ہوئی۔ یہ ہے تزکیۂ نفس، تثبیتِ نفس۔

جو کمانے کے قابل نہیں، ان کی ضروریات کون پوری کرے گا:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿٧٠﴾ (16:70) ذرا اپنے گھر پر نگاہ ڈالو۔ آج تمہارے ہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے ظاہر ہے وہ کمانے کے قابل نہیں ہے تو پھر اگر اصول یہ ہو کہ جو کمائے گا اس کو اتنا ہی ملے گا۔ جو نہیں کمائے گا اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ تو بچہ پھر کسی کمانے کے قابل نہیں تو پھر اسے سامان زیست سے محروم کر کے جیتے جی مار دو۔ اس کیلئے تو گھر والے بھوکے رہ کر اپنی ساری ضروریات پس پشت ڈال کر دودھ کا انتظام کرتے ہو۔ تو پھر وہ اصول کہاں گیا محنت والا۔ اس بچے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے جو خود کچھ بھی نہیں کماتا۔ جب تم درمیانی عمر کو پہنچتے ہو تو تم بہت زیادہ کماتے ہو پھر بڑھاپے کی عمر میں کمانے کی استعداد ختم ہو جاتی ہے اور اس عمر میں بچوں جیسی حرکتیں شروع کر دیتے ہیں تو پھر اس بوڑھے والدین کے ساتھ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (2:83) کمانے والے افراد کی یہ ذمہ داری ہے کہ پہلے بچے کی ذمہ داری پوری کرے۔ کہا کہ یہی نقشہ گھر کی چار دیواری کا تو ان دیواروں کو گرا کر اسے ''بَوّ'' کشادہ کر لو تاکہ ایسا نظام پورے معاشرے کو محیط ہو جائے۔ جب گھر میں یہ اصول اپناتے ہو تو معاشرہ میں اس کو کیوں نہیں وسعت دیتے۔

اکتساب رزق کی صلاحیتیں:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ (16:71) اکتساب رزق کی صلاحیتوں کا فرق، کسی کو زیادہ استعداد اور کسی کو کم (جو بچہ میں ابھی نہیں ہوتیں) یہ بھی خدا کی دی ہوئی ہیں۔ آگے فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ (16:71) تو تم پھر ایسا کیوں نہیں کرتے جو ضرورت سے زیادہ ''فاضلہ'' تو ان ماتحت کام کرنے والوں کی طرف کیوں نہیں لوٹا دیتے۔ بِرَاۗدِّيْ (16:71)۔ یعنی جس کی کوئی چیز ہو۔ تو اسے لوٹا دینا، تم فرق کرتے ہو انجینئر اور لیبر میں۔ رِزْقِهِمْ (16:71) وہ تو اسی کا تھا۔ یہ تو مشترکہ کاروبار تھا اس کی طرف اس لئے نہیں لوٹاتے کہ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ (16:71) تو پھر گھوڑا اور گدھا برابر ہو جائیں گے۔ اس طرح لوٹانے سے تو ہم سب برابر ہو گئے۔ تو یہ جو تمہارے پاس فاضلہ کمائی آ گئی ہے تو اگر اسے کم استعداد والے کو لوٹا یا یہ اس لئے۔ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿٧١﴾ (16:71) تو کیا تم اس سے انکاری ہو کہ یہ زیادہ صلاحیت بھی خدا کی عطا کردہ نہیں ہے۔ تو تمہارا ایمان اس بات پر نہ رہا کہ یہ فَمِنَ اللّٰهِ ہے۔

وسائل رزق کا مالک اللہ ہے:

سائل رزق، مال و دولت، رزق پیدا کرنے کی صلاحیت کو قرآن نے نعمت کہا ہے جب یہ فَمِنَ اللّٰہِ ہے تو اس میں سے بھی جو پیدا ہوگا تو وہ فَمِنَ اللّٰہِ کہلائے گا۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾ (43:32) یہ جو کمانے میں صلاحیتوں کا فرق ہے کہ معاشرہ میں تقسیم کار کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف لوگ مختلف قسم کے کام کریں۔ یہ صرف تقسیم کار کیلئے ہے۔ مختلف صلاحیتوں والے مختلف قسم کے کام کریں۔ ایسا تو صرف تقسیم کار کیلئے ہے اور تم زعم باطل میں یہ سمجھ لیتے ہو کہ چونکہ میری صلاحیت زیادہ ہے۔ اس لئے میں اس کا مالک ہو گیا یادرکھو کہ

وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾ (43:32) (صرف اتنی سی چیز ہے یہ کہ چونکہ یہ میری صلاحیت کی بنیاد پر ہے اسے اپنے لئے جمع کر لیتے ہو) یادرکھو جو خدا کی رحمت یعنی اس کے قوانین کے ذریعہ رزق وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم اپنے لئے جمع کر کے رکھتے ہو کم بختو! اس کو آگ لگ جائے گی کوئی لوٹ لے گا۔ سیلاب آ کر بہا دے گا اگر ایسے حالات ہوں تو پھر نظام سب کی کفالت کرے گا تو پھر کاہے کیلئے جمع کرتے ہو۔

نظام سرمایہ داری:

سرمایہ دارانہ نظام میں ملکیت کا جذبہ ہے وہ زیادہ سے زیادہ حاصل کر کے اسے میری ہنر مندی کہتا ہے۔ ہر فرد اس نظام میں کہتا ہے کہ یہ تو میری ہنری مندی کا نتیجہ ہے۔ یہ ہے بنیاد اس کیپٹل ازم کی اور کسی کو اس میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس نظام میں کیونکہ یہ میری محنت اور ہنر مندی کا نتیجہ ہے بالکل متضاد ہوگئی اس اعلان سے فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)

قرآن قارون اور قوم موسیٰ کے ذریعہ اسے بیان کرتا ہے۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى (28:76) خود اپنی قوم کے سرمایہ دار تو دوسروں سے بھی زیادہ خون آشام ہوتے ہیں۔ سب کچھ حاصل تھا۔ بڑے بڑے خزانے تھے۔ تو اسے اٹھانے کیلئے کئی کئی لوگ ساتھ ہوتے تھے۔ دولت کے نشہ نے اسے بدمست کر دیا۔ تو کچھ باہوش لوگوں نے اسے سمجھایا۔

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ (28:76) وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ (28:77) یعنی آخرت کی بھی فکر کر۔ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (28:77) جو دوسری کمیاں ہیں ان کو پورا کر و جس طرح خدا نے تمہیں باقیوں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے۔ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ (28:77) یعنی رزق کی غلط تقسیم سے جو طبقات پیدا ہوتے ہیں اس کو فساد امن ناہمواری کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۷۷﴾ (28:77)

سرمایہ داری کی ذہنیّت ،نظریہ:

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ اَوَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا یُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾ (28:78) قرآن نے اسے یہ کہہ کر ختم کر دیا اس سرمایہ دارانہ ذہنیّت کو وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) اور یہ ذمہ داری اس نظام کی ہوگی ۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) قرآن نے سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ انہوں نے سٹیٹ کی شکل میں ایسا خدا بنایا جس کے نام پر قوانین نافذ کئے جاسکیں۔ ورنہ لوگ مانیں گے نہیں جبکہ وہ سٹیٹ کہیں Exist ہی نہیں کرتی۔ ارباب اقتدار کا نام ہی سٹیٹ ہوتا ہے۔ یہ تو سارے ڈاکوؤں کا گروہ ہے قرآن نے ان کو ''قوم المجرمین'' کہا ہے۔ اس سٹیٹ کے تصوّر میں نہ فرد کو حق ہے اور نہ افراد کو بلکہ ایک گروہ کو یہ حق ہوتا ہے اور ان کے اوپر سٹیٹ کی شکل میں معبود ہوتا ہے حالانکہ یہ حق تو ان سے بالاتر ایک ہستی کو حاصل ہے کسی فرد کو سٹیٹ یہ صلاحیتیں نہیں دے سکتی یا زمین نہیں بنا سکتی ان کو چاہئے کہ آبادی بڑھ رہی ہے تو اس زمین کے ساتھ دوسری زمین بنالیں یہ اس کے مالک ہونگے مگر خدا کی بنائی ہوئی زمین پر یہ تم نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تو کھلی دھاندلی ہے اختیارات کا غلط استعمال۔

جب یہ تسلیم کر لیا کہ تمام صلاحیتیں اور ذرائع اس کی ملکیت ہیں تو اسے اپنی ملکیت میں تصرف کیلئے قاعدہ اور قانون بھی بنانے کا حق ہے اور ہمیں اس پر ایمان ہے اسے وحی کہتے ہیں جس طرح تمہارا ایمان سٹیٹ کے اوپر ہے۔ جب آپ سٹیٹ کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے۔ قرآن نے کمیونزم اور کیپٹل ازم دونوں کی جڑیں کاٹ کر رکھ دی ہیں۔

اللہ پر ایمان کے معنی:

ایمان یہ ہے کہ ''فَمِنَ اللّٰهِ (16:53)'' کے مطابق نظام استوار کرو۔ فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ (16:54) شرک کرتے ہیں کیسے؟ لِیَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَیْنٰهُمْ ؕ (16:55) اللہ کے اس دیے ہوئے سے انکار کرتے ہیں جو فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸﴾ (2:8) یعنی اس کی کمائی کو ملکیت سمجھتے ہیں یہ شرک ہے۔ آج ساری دنیا کفر یا شرک میں مبتلا ہے اللہ پر ایمان اس وقت ہوگا جب ۔ وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) قرآن تو ان مسائل کو حل کرنے کیلئے آیا ہے۔ حکم یہ ہے کہ وَیَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ (2:219) یعنی ضرورت سے زیادہ جتنا ہے سارے کا سارا اس نظام کے حوالے کرو۔ تم نے کا ہے کیلئے رکھنا ہے۔ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219)۔

وَ یَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ (16:56) دیکھیں قرآن کیسے فرق کرتا ہے۔ وہاں تھا '' قُلِ الْعَفْوَ ؕ ''(2:219) مذہب کی دنیا میں آکر مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ (16:56) تھوڑا سا دیتے ہیں کوئی بتوں کے آستانے پر، کوئی

حضرت صاحب کے پاس گیا، دیدیا۔ کسی نے ارباب شریعت کو دیدیا۔ دین کے کاموں میں۔ چیرٹی کے کاموں میں۔ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ (16:56) ہر جگہ آئے گا۔ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) نہیں ہوگا۔ اب جب اسلام نہ رہا تو قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) کی بجائے نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ (16:56) پھر اسے 2½% کر دیا۔ پہلے تو بتوں کی بات تھی مگر دین جب مذہب بن جائے تو پھر یہ تبدیلی ہوجاتی ہے ہمارے دیئے ہوئے میں سے بڑا قلیل حصہ۔ حالانکہ دولت جمع کرنا تو سب سے بڑا جرم قرار دیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ (9:34) ان کا انجام المناک تباہی ہے تو اس آیت کی روشنی میں دولت جمع کرنے کا کوئی بھی جواز نکل سکتا تھا۔ تو انہوں نے آ کر ایک حصہ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ (16:56) 2½ فیصد نکال دو تو سارا حلال وطیب ہوجائے گا۔ حالانکہ مومنوں کا تو یہ اس نظام سے روزِ اوّل کا عہد ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (9:111) تو اپنا جان ومال دے چکے ہیں تو جمع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو یہ ان میں 2½ فیصد الگ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾ (16:56) یعنی قسم تیرے خدا کی! تم سے ضرور یہ پوچھا جائے گا کہ دین میں افتراء ''نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ (16:56)'' والی بات تم کیسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہو تمہیں تو حکم قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) کا دیا گیا تھا۔

دلیل کے مقابل دلیل:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ (16:75) یہ ہے اختیار وارادے کی قدر ومنزلت۔ کہا کہ جو زرخرید غلام ہو جو اپنے اختیار وارادہ کو ہی استعمال نہ کر سکے یہ بھی ایک انسان ہے جبکہ دوسرا اپنے اختیار وارادہ سے اعلانیہ دوسروں کو دیتا ہے۔ ایمانداری سے بتاؤ کیا بننا چاہو گے۔ تم کہتے ہو کہ اگر ظلم خدا کو منظور نہیں تو ظالم کا ہاتھ پتھر کا کیوں نہیں کر دیتا۔ اگر تمہیں اس طرح پتھر کا زرخرید غلام بننا چاہتے ہو۔ مجبورِ محض، جس طرح کمیونزم میں تو ڈنڈا کا استعمال ان کو کام پر مجبور کر دیتا ہے۔ کہا یہ ہے وہ نظام سوشلزم یا کمیونزم اور دوسرا وہ ہے جس میں وہ جان توڑ محنت کر کے طیب خاطر شہد چھتے میں جمع کر دیتا ہے۔ شہد کی مکھی تو مجبوراً کرتی ہے انسان کو اختیار وارادہ استعمال کرنا ہوگا تو یہ crcdible ہوگا۔ ظاہر اور پوشیدہ ربوبیّت عام کیلئے صرف کرے اور دوسرا کمیونزم کے تحت کرے تو کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ (16:75) مشکل یہ ہے کہ تم سمجھتے نہیں ہو یا تو نظام سرمایہ داری ہو یا جبر کے نظام میں اس قسم کے عبدِ مملوک جن کا کوئی اختیار نہ ہو وہ تو ایک ایسا نظام دے رہا ہے جو قابل حمد وستائش ہے۔

خدا کے ساتھ معاہدے کے بعد یہ
مسلمان پھر گئے، تو وہ نظام ختم ہو گیا

معاہدہ:

یہ ایک معاہدہ تھا۔ ایگریمنٹ تھا۔ دو فریقوں کے مابین۔ ایک طرف یہ جماعت اور دوسری طرف خدا تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ (9:111) یہ ہے وہ عہد۔ وعدہ۔ وَاَوۡفُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ اِذَا عٰہَدۡتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِہَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰہَ عَلَیۡکُمۡ کَفِیۡلًا ؕ (16:91) اب فرق مقابل قرآنی نظام میں خدا ہے اور اگر وہ اس معاہدہ کو پورا نہ کرے تو اس سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا ﴿۱۶﴾ (25:16) یہ ہے اسلامی نظام کہا کہ وعدہ پورا نہ ہو تو پوچھا جا سکتا ہے کسی طرح سے خدا اور انسان کو برابر کی سطح پر کھڑا کر دیا۔ تو پہلی شق تو پوری نہیں کی گئی جس کا نتیجہ جنّت کی زندگی اور ساری دنیا پر غلبہ کا وعدہ تھا۔ چونکہ وعدہ پورا نہیں کیا اس لئے یہ نظام آگے نہ چل سکا۔ صدر اوّل میں تو انہوں نے یہ پہلی شق پوری کر دی تھی۔ اس لئے یہ نظام قائم ہو گیا تھا۔ یہ تو مشروط تھا۔ وعدہ پورا نہ کیا تو۔

وَضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ ٭ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ؕ (2:61)

وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّتِیۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَہَا مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّۃٍ اَنۡکَاثًا ؕ (16:92) کتنی قربانیوں سے حاصل کر کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تو ذلت اور تباہی مقدر بن گئی۔

❁❁❁

سائیکالوجی اور سوشیالوجی کا پھندا اور دیگر تمام پھندے

سائیکالوجی کے مختلف ڈیپارٹمنٹس اور سوشیالوجی اور پولیٹیکل سائنس یہ سب انسان کے بارے میں کہتی ہیں۔Instinctiveism والا آتا ہے۔ کہتا ہے کہ پیدا ہونے سے پیشتر ہی یہ ساری چیزیں ابلیس ہی لیکر پیدا ہوتا ہے دوسرے انتھروپالوجی والے کہتے ہیں یہ وراثتاً آتی ہیں۔ پھر Behaviourism والے کہتے ہیں کہ معاشرہ ان تمام برائیوں کو منتقل کرتا ہے۔ یہ مختلف پھندوں کی اشکال ہیں۔
سوشیالوجی والا آ کر کہتا ہے کہ بچے کی جس قسم کی تربیّت اور تعلیم ابتدائی طور پر ہو جاتی ہے۔ ساری عمر ویسا ہی رہتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس نتیجہ پر پہنچا تا ہے کہ پھر اس کا بدلنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ یعنی ہمارا ہر نوجوان اس پھندے میں آ کر ابلیس بن جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جرائم آپ کر ہی نہیں رہا۔ یہ تو میرے بس کی بات ہی نہیں۔ آپ ہمیں کیسے مجرم قرار دے رہے ہیں۔ آپ نے جو بنایا۔ ہم بن چکے۔ سائیکالوجی کہتی ہے۔ اس کا بدلنا ہمارے بس میں نہیں اب ان سب نے مل کر ایک ایک کو ابلیس بنا دیا۔ اب بس کی بات ہی نہیں رہی۔ اب تو اصلاح ناممکن ہے نوجوان کو فرسٹریشن میں اس مقام تک پہنچا دیا۔ ابلیس کے معنی ''نا امید شدہ'' مایوسی اب ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔ اس کیلئے کہا۔ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٩٨﴾ (16:98) اب تو مرغی ہے ہی نہیں۔ جس کے پروں تلے آ کر محفوظ ہو جائے۔ اس نے تو ان کے وجود کا انکار کر دیا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ قرآن ان تمام مسلمات کی تردید کرتا ہے کہ ہم نے اس آدم میں اتنی بڑی قوت رکھی ہے۔ اگر یہ قوّت بیدار ہو گئی اور کام کرنا شروع کر دیا تو تیرے ایک ایک حربہ کو توڑ کر رکھوں گا۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ (17:65) تیرا بس میرے ان بندوں پر نہیں چل سکے گا۔ جو میرے قوانین کو پیش نظر رکھیں گے۔
اب ایک Theory of Pragmatism کی بناء پر ولیم جمیز (1842-1910) نے پیش کیا اور ان کو مسلمات کے طور پر مانا گیا۔

غلط مسلّمات کے سامنے انسانی عزم:

ابھی اسی دور میں انہی ملکوں سے بلند پایہ سائیکالوجسٹ نے ان تمام مسلمات کو غلط قرار دیا ہے۔ انسان ایک زبردست بلا واقع ہوا ہے۔ اس کے عزم کے سامنے ان میں سے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی۔ Frich Fromn(1900-1980) کی ایک Latest

674

کتاب ہے۔ جو امریکہ کا سائیکوانالسٹ ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تمام نظریات غلط ہیں۔ فرسٹریشن کا کوئی مقام انسان کیلئے نہیں۔ فرسٹریشن یہ ہے کہ یہ اپنے اندر کی اتنی بڑی قوّت کو بھلا دیتا ہے قرآن نے بھی آدم کے متعلق یہی کہا فَنَسِيَ (20:115) کہ اس نے اپنے آپ کو بھلا دیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ اس پر شیطان غالب آ گیا۔ چونکہ اس نے اپنے اندر کی بڑی قوّت کو بھلا دیا۔

سائیکالوجی یہاں تک پہنچی ہے۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ (17:65) فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ (16:98:99) تیرا غلبہ ان پر ہو ہی نہیں سکتا۔

❁❁❁

نفسیاتی تضادات،شیطان کی تعریف نفسیات میں

اِنَّمَا سُلۡطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يَتَوَلَّوۡنَهٗ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ ۝۱۰۰ (16:100)

ابلیس یا شیطان:

جب انسان کے جذبات وحی کے تابع نہ رہیں تو انہیں شیطان کہا جاتا ہے اور اسی کا نام ابلیس ہے۔علّم النفس کی رو سے انسانی جذبات بے باک ہو کر سرکش ہو جاتے ہیں اور اس سرکشی میں وہ تباہی مچاتے ہیں۔تو اس کے بعد انسان پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ جسے Aggressiveness and frustration کہتے ہیں۔یعنی معاندت اور یاسیّت ۔ دراصل یہ ایک ہی چیز ہے۔ Aggressivenessابتدائی ہے۔جبکہ ''انتہا'' Frustration ہے

قرآن نے ایسی سرکشی کو شیطان کہہ کر پکارا ہے۔شیطان یعنی بھڑک اٹھنے والی بات اور جب عواقب سامنے آئیں تو مایوس ہو جاتا ہے۔قصہ آدم میں تو شیطان نے خدا سے یہ کہا کہ اس مٹی کے مادھو کو مجھ پر ترجیح تو دی جا رہی ہے تو مجھے بھی اجازت ہونی چاہئے تا کہ میں اسے تگنی کا ناچ نچواؤں۔اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی حربے یہ ہونگے۔بِصَوۡتِكَ (17:64) پروپیگنڈے کے ذریعہ یا فوج کے ذریعہ چڑھائی کر کے وَشَارِكۡهُمۡ فِى الۡاَمۡوَالِ (17:64) فنانشل ایڈ کے ذریعہ۔ان کی نسل میں ایسی فحاشیاں پھیلاؤں گا۔ان کی تعلیم وتربیّت کا نقشہ بدل کر رکھ دونگا۔ایسے رجّانات پیدا کرونگا کہ اس کے بعد شاید میری ضرورت ہی نہ رہے۔اس لئے وارن کیا گیا تھا۔

فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ (16:98) اس سے بچنے کا ایک طریق ہے کہ جب بھی کوئی قرآن پروگرام لیکر اٹھو تو حفاظت خداوندی میں آ جاؤ۔تو پھر اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔اِنَّهٗ لَيۡسَ لَهٗ سُلۡطٰنٌ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (16:99) اِنَّمَا سُلۡطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يَتَوَلَّوۡنَهٗ (16:100) لوگوں پر غلبہ ہوگا۔جو تیری رفاقت اختیار کر کے تجھے اپنے اوپر مستولی کر لیں گے۔ یعنی ذرا سی غفلت برتی۔تو پھر وہ مومنیٹم پیدا ہو جائے گا۔اگر وہ روکا نہ گیا تو مستولی ہو جائے گا۔تو یہ روکنا گربہ کشتن روزِ اوّل سے ہونا چاہئے یہ نہ ہو کہ سستی سے کام لو کچھ عرصہ کے بعد ہٹ جائے گی۔ ہونے دیجئے۔اس عمر کے اندر ایسا ہوتا ہے بڑا ہو کر عقل وشعور آ جائے گا۔خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔اس قرب سے مستولی کی منزل آ جاتی ہے۔ایک لفظ ولایت کے اندر یہ سب کچھ پوشیدہ ہے۔

674

اگلی چیز (16:100) میں یہ بتائی کہ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِہٖ مُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ (16:100) اس کا ترجمہ مبہم سا ہے کہ اس کو شرک کی وجہ بناتے ہیں۔ شرک تو ہمارے ہاں صرف بت، قبر پرستی، نذر و نیاز وغیرہ کو کہتے ہیں۔ بات اور ہے۔ اس سے بھی آگے!!

یورپ کی مذہب کے خلاف بغاوت:

یورپ میں جو Revolt آیا۔ جس سے سائنس کی طرف اتنا بڑا رجحان ہوا۔ یہ اس توہم پرستی کے خلاف شدید ردعمل تھا۔ عقل انسانی نے اس کے خلاف بغاوت کر دی مذہب تو ہوتا ہی توہم پرستی ہے۔ تو پہلے ردعمل کے ساتھ یہ تو ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہاتھی مع ہودج غائب ہو جاتا ہے۔ مذہب کو پھینکا تو اس کے بعد خدا۔ وحی اور ساری صداقتوں سے انکار کر دیا یہ ردعمل ہوتا ہے۔ اگر کوئی قرآن سامنے لانے والا ہوتا تو کعبہ سے بتوں کو نکالنے کے بعد جھٹ سے خدا اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو گھر خالی کا خالی رہ جاتا ہے مگر یہ خالی گھر اس کرائے دار سے تو بہتر ہے جو نکلتا ہی نہیں۔ اس یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ (2:256) کی منزل تو طے کر لی ہے اب نیا کرایہ دار بسانے کی بات رہ جاتی ہے۔

فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ (41:53):

یہ دراصل نفسیات انسانی میں مضمر آیات ہیں۔ سائیکالوجی کے اس انکشاف کے بعد یہ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِہٖ مُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ (16:100) سمجھ میں آ گئی ہے جو پہلے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ (41:53)

نفسیاتی تضادات:

یہ سائیکالوجسٹ اس شیطان یعنی Devil یا کچھ کہہ لیں، اس Phenomenon کی تعریف کرتا ہے۔

Battle between two tendencies within an individual.

ایک فرد میں دو قسم کے متضاد رجحانات کی کشمکش کو شیطان کہتے ہیں۔ ساری بات توحید کی واضح ہو گئی۔ انسانی ذات تو Unity چاہتی ہے۔ وہ ہوتی ہی وحدت ہے۔ اس میں اگر دو متضاد رجحانات پیدا ہو جائیں تو ان میں ہمیشہ باہمی کشمکش ہوتی ہے۔ باقی رہیں بظاہر ایسی بیماریوں تو قرآن نے فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ۙ (2:10) نفسیاتی امراض کہا تھا۔ ان کا تجزیہ کر کے وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ دو رجحانات کونسے ہیں جو ٹکرا کر اس کو توڑ دیتی ہیں۔ دو رجحانات Tendencies کا نام تو شرک ہے۔ توحید تو یہ ہے۔

اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا (6:79) صرف ایک اور ایک صرف ایک Tendency۔ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ (6:79)۔ وجہ تمام توجہات کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا یعنی توحید۔ اس کے بعد حَنِیۡفًا (6:79) کوئی دوسری Tendency نہیں میرے اندر۔ وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿ۚ۷۹﴾ (6:79) اس طرح سے میں مشرکین کی صف میں سے نکل جاتا ہوں۔

وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿ۚ۷۹﴾ (6:79) کہہ کر میں مشرکین کی صفوں سے نکل گیا یعنی دوسری Tendency کو بھی اس میں

شریک کر کے Two tendencies ہوگئیں۔ کفر میں بھی ایک Tendency ہوتی ہے باطل کی ہی سہی۔ توحید میں بھی ایک ہی Tendency ہوتی ہے۔ یہ درمیان میں انسان کے سرکش جذبات آجاتے ہیں۔ یہ کیفیّت اس وقت ہوتی ہے کہ ایک طرف کچھ خدا کا خیال ہو اور دوسری طرف یہ چیز بھی غالب آئے۔ یہ ثنویت (Dualism) ہے جسے Dichotomy کہتے ہیں۔ یہاں آکر مذہب میں پرسنل لاز ایک طرف جبکہ پبلک لاز دوسری طرف۔ سیاست ایک طرف اور مذہب دوسری طرف۔ تو اس میں توحید، دین کی وحدت پیدا نہیں ہوسکتی۔ ملوکیّت کے یہی معنی ہیں زندگی کے دوٹکڑے، ایک کا تعلق ریاست، حکومت، سیاست سے ہوگیا اور دوسرے کا تعلق مذہب سے۔ دین داری سے، عبادات سے، اعتقادات سے ہوگیا۔ یہ سیاسی تقسیم نہیں نفسیاتی تقسیم ہے۔ زندگی دو حصّوں میں بٹ گئی۔ Two Tendencies پیدا ہوگئیں۔ خارجی دنیا میں تو اتنا خطرہ نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر ہونا خطرناک ہے۔ مذہب میں دین کے حقائق اور اس کی روح کے نام، اصطلاحات، رسومات، شکلیں باقی رکھتے ہیں۔ اعلانیہ تو کوئی مسلمان اپنے آپ کو ہندو کہلوانا نہیں چاہتا۔ دہریہ کہلوانا نہیں چاہتا مگر خدا کی حکومت بھی نہیں چاہتا اور مسلمان بھی رہنا چاہتا ہے۔ یہ ہے فریب نفس۔

نماز کے وقت نماز پڑھتا ہے مگر دکانداری انگریز یا ہندو سے بھی کم ایمانداری سے کرتا ہے۔ وہاں وہ سب کچھ کرتا ہے جو شیطان کہتا ہے۔ اذان کی آواز سن کر انگریز اور ہندو نہیں جائے گا مگر یہ وہاں بھی چلا جاتا ہے۔ اس انگریز، ہندو میں پھر بھی یونٹی قائم تھی۔ مگر اس میں دورجحّانات آگئے۔ ننگی کا ناچ شیطان مذہب میں آکر نچواتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جرأت مفقود ہوجاتی ہے۔ کسی میں بھی جرأت نہیں کہہ دے کہ سارے قوانین حدود اللہ کے اندر ہونگے اور مملکت کا تمام کاروبار بھی حدود اللہ کے اندر ہوگا۔ اگر یہ نہیں ہوسکتا تو دیانتداری سے سیکولرازم لے آئیں۔ تو یہ Two Tendencies کے درمیان کشمکش ختم ہوجائے گی۔

؎ یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

معاشرہ کا خلفشار:

منبر ومحراب سے اسلام کی خدمت ہو رہی ہے کونسا اسلام ہے وہی جس کی دوسری Tendency ابھی باقی ہے۔ اس کے لبادے کو اتار پھینکنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ کثیر آبادی ایماندار اور مذہب پرست رہنا چاہتی ہے۔ معاشرہ رہنے نہیں دیتا۔ دورجحّانات موجود ہیں۔ تحت الشعور تو ایمانداری کو اچھا گردانتا ہے مگر معاشرہ کے تقاضے اسے اس سے دور ہٹاتے ہیں۔ یہ چیز چل نہیں سکتی۔ بیک وقت دورجحّانات آرہے ہیں اس میں کشمکش ہوتی ہے۔ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۝۱۰۰ (16:100)۔ یہ ہیں وہ سرکش جذبات جو شرک پر لا رہے ہیں۔ کفر اور چیز ہے۔ جن قوموں نے دھریت اختیار کی وہ کم از کم دنیاوی معاملات میں بہت آگے چلے گئے۔ فطرت کی قوتوں کو مسخّر کر کے بڑی قوتوں کے مالک ہوگئے۔ انہی کا غلبہ ہے۔ ان کے برعکس مذہب پرست قوم بہت ہی پیچھے ہے۔ خواہ کوئی مذہب ہو۔ اس میں بھی بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۝۱۰۰ (16:100) ہے۔ دورجحّانات کارفرما ہوتے ہیں

ایک طرف غیر شعوری طور پر خدا کا خوف اور دوسری طرف سے غیر خداوندی جاذبیتیں، دلکشیاں ساری کی ساری تیندوے کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ہے کشمکش دورجحّانات کی اس معاشرے کے ہر فرد کے اندر۔

اِنَّمَا سُلۡطٰنُہٗ عَلَى الَّذِيۡنَ (16:100)۔ شیطان کا غلبہ ان لوگوں پر ہوگا۔ جہاں یہ دو متضاد رجحانات آپس میں باہم دست و گریباں ہوتی ہیں۔ پرسنالٹی تو Unity چاہتی ہے۔ اس کے نہ ہونے سے یہ متضاد رجحانات شخصیت کو توڑ دیتی ہیں۔ شخصیت یوں Disintegrate پرسنالٹی بن جاتی ہے۔

ذات انسانی کے اندرونی امکانات:

فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰٮهَا ۞ (91:8) دونوں امکانات انسانی ذات Disintegrate اور Preserve رہنا۔ الوقی ہر وہ چیز کو کہتے ہیں۔ جس کے اندر کوئی چیز رکھی جائے تو محفوظ رہتی ہے۔ پرسنالٹی پر ہی شیطان کا تسلط ہوتا ہے۔ جہاں مذہب ہو وہاں یہ Split-up پرسنالٹی کی کیفیت ہوتی ہے۔

جن قوموں نے جرأت کی انہوں نے اعلانیہ سوشلزم کے ساتھ دوسری چیزوں کو نہیں ملایا۔ لیکن یہاں ایمان تھا تو سوشلزم کو اسلامک سوشلزم کہنے کی بھی ضرورت پڑ گئی۔ پھنس گئے دو متضاد Tendencies میں۔ اس کو تو بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ ۞ (16:100) کہا یا تو اسلامک ہو یا سوشلزم۔ دونوں میں سے ایک چیز۔ لیکن دونوں کو اکٹھا کر کے بِهٖ مُشۡرِكُوۡنَ ۞ (16:100) ہو گئے۔

قرآنی تعلیمات کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا، نتیجہ دنیا و آخرت کی ذلت و خواری:

اب اس آیت کے معنی کس طرح صاف ہو جاتے ہیں۔

اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ‌ ۚ (2:85) نظر آتا ہے کہ کچھ مارکس تو ملنے چاہئیں کہ ایمان کے ان حصّوں کی تو جزاء ملے گی اور دوسرے کی سزا ملے گی۔ لیکن فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ‌ؕ (2:85) یعنی سوا اس کے اور کوئی نتیجہ ہو نہیں سکتا کہ ادھر بھی ذلت و خواری اور آخرت میں بھی شدید تباہی کا سامنا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ''دو متضاد رجحانات میں کشمکش'' ہو گئی۔ جونہی اضداد آئے تو سینہ آماجگاہ بن گیا منافقت کا۔ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ (2:10)۔

ارتداد توحید کی ضد ہے:

یہ لوگ ارتداد کی سزا قتل کہتے ہیں۔ یعنی کوئی شخص اسلام چھوڑ کے دوسرا مذہب اختیار کرے۔ اس سے آگے بڑھے اور کہا کہ جس شخص کے عقائد اسلام کے مطابق نہ رہے۔ خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بھی مرتد ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ عقائد ان کے اسلام کے مطابق نہ رہے تو حنفی مرتد۔ بریلوی مرتد۔ اہل حدیث مرتد۔

كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ۞ (23:53)

قرآن کے مطابق ارتداد:

آؤ قرآن سے پوچھتے ہیں۔ اسلامی نظام کے خلاف بغاوت ارتداد کہلاتی ہے۔ اِنَّ الَّذِيۡنَ ارۡتَدُّوۡا عَلٰٓى اَدۡبَارِهِمۡ مِّنۡۢ

674

بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الۡهُدَی ۙ الشَّیۡطٰنُ سَوَّلَ لَهُمۡ ؕ وَاَمۡلٰی لَهُمۡ ﴿۲۵﴾ (47:25) جو پھر گئے۔ مرتد ہو گئے۔ جنہیں شیطان نے اس روش کو بڑا جاذب اور خوشنما بنا کے دکھا دیا تھا اور لمبی لمبی امیدیں دلائیں۔ اب ارتداد۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لِلَّذِیۡنَ کَرِهُوۡا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ (47:26) کتاب اللہ کو ناپسند کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

سَنُطِیۡعُکُمۡ فِیۡ بَعۡضِ الۡاَمۡرِ ۚ (47:26) یعنی کچھ باتوں میں ہم پرانی روش پر اور کچھ باتوں میں تمہاری اطاعت کریں گے۔ یعنی دین اسلام ہوگا۔ سیاست جمہوریت ہوگی اور معیشت سوشلزم ہوگی۔ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ اِسۡرَارَهُمۡ (47:26) ان کے تحت الشعور میں جو مضمر بات ہے وہ ہم جانتے ہیں۔ الشَّیۡطٰنُ سَوَّلَ لَهُمۡ ؕ (47:25) یہ ہے شیطان جو بِهٖ مُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ (16:100) ہے مرتد ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو قرآن کو ناپسند کرتے ہیں۔ جن کے ہاں یہ ضابطہ نہیں اسلامی نظام کے خلاف جو بغاوت ہے۔ اسے قرآن ارتداد کہتا ہے۔ اس کی سزا تو میدان جنگ میں دی جاتی ہے جو پکڑا جائے سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ پھر ابو بکرؓ کی مثال سامنے لاتے ہیں۔ وہ تو جنہوں نے ریونیو دینے سے انکار کیا تھا۔ وہ تو عقائد کی بحث ہی نہیں تھی۔ یعنی صوبوں سے ریونیو مرکز میں جمع ہوتا تھا جبکہ کچھ صوبوں نے یہ جمع کرانے سے انکار کیا تھا کہ ہم اپنے خزانے میں جمع کر کے اسے اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کریں گے۔ سوال تو اس مرکزی قانون کا تھا کہ صوبوں کو یہ اختیار ہی نہیں دیا جا سکتا یہ تھی بغاوت اسلامی مملکت کے خلاف۔ جسے یہ زکوۃ سے انکار کہتے ہیں اور ان کے خلاف فوج کشی کر دی۔

❁❁❁

ناسخ ومنسوخ کا فریب

ناسخ ومنسوخ، یہودیوں کو قرآن کا جواب:

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ (16:101) جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم بدلتے ہیں، لاتے ہیں تو ان لوگوں کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہ تو خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا بلکہ تم نے اپنی طرف سے بنا کر خدا کی طرف نسبت کردی ہے تیرا دعویٰ غلط ہے۔ تو جھوٹا ہے۔

یعنی بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ ایک حکم کے خلاف دوسرا حکم ہے تو یہ تضاد ہے تو تم تو وحدت کی طرف بلاتے ہو اور اس متضاد حکم سے تو دو رجحّانات ہو گئے۔ تو یہ تو تضاد ہو گیا تو یہ کیسے منجانب اللہ ہو سکتا ہے اور قرآن کی منجاب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ یہ اعتراض یہودیوں کی طرف سے ہوتا تھا۔ یہاں تصریفِ آیات سے بات سمجھ میں آئیگی۔

اہم اعتراض جو غلط فہمی پر مبنی ہے:

قرآن میں بہت سے اعتراضات ان کی طرف سے تھے کہ خود آپ تسلیم کرتے ہیں کہ انبیاء سابقہ خدا کے رسول تھے سابقہ کتابیں بھی خدا کی طرف سے تھیں لیکن قرآن کے کئی احکام ان احکام کے خلاف ہیں، جو تورات میں تھے۔ ان دو متضاد احکام تو خود ہی ثابت ہو گیا کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتے۔

اعتراض کا جواب:

قرآن سلسلہ وحی کا انداز بتا رہا ہے کہ وحی میں ایک اصولی چیز ہے وہ اس کا اصولی اور بنیادی قانون۔ خارجی قوانین فطرت ہوں یا قرآن میں انسانی ہدایت کیلئے دیئے گئے قوانین، وہ ہمیشہ غیر متبدّل ہوتے ہیں۔ ان غیر متبدّل اصولوں پر عمل کرنے کے طور طریقے وقت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں نوحؑ سے لیکر نبی ﷺ تک یہ تمام اصول ایک ہی تھے۔ دین شروع سے تمام انبیائے کرام کو ایک ہی دیا جاتا رہا ہے۔ اگر ان اصولوں کو دینے والی اتھارٹی ایک ہو تو متضاد قسم کے اصول تو نہیں ہو سکتے۔ اگر ان میں واقعی تضاد ہے تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ واقعی ایک اتھارٹی کی طرف سے نہیں ہو سکتے۔ ان کا سرچشمہ ایک نہیں۔

674
ایک تو اصول اور بنیادی قوانین ہوتے ہیں اور دوسرا ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریق انداز۔عملی پروگرام۔جن کو قانون کی اصلاح میں Bye-Laws کہتے ہیں۔

جزئیات:

تفصاصیل،منہاج،شریعت،مناسک وغیرہ۔اصول تو دین کے ہمیشہ شروع سے آخر تک ایک ہی ہیں لیکن یہ جزئیات،مختلف ادوار میں مختلف ہوتے رہے۔ ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ہر ملک میں انبیاء آتے رہے۔تو ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کیلئے وہاں کے لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق اور حالات کے مطابق یہ طور طریق دیئے جاتے تھے۔نوحؑ سے کہا گیا کہ طوفان سے بچنے کیلئے تدبیر کرو تو اس قوم کو اس سے بچنے کی تدبیر معلوم نہیں تھی۔ذہن انسانی اس سطح پر تھا۔تو وحی کے ذریعہ کشتی کا بنانا، بتانا پڑا۔تو گویا وہاں ابھی تمدّنی زندگی اور انسان کی بلند زندگی کے متعلق جزئیات تو ایک طرف رہے۔عام طبعی زندگی کے بارے میں بھی وحی کے ذریعہ بتانا پڑا کہ کشتی کیسے بنتی ہے؟

قانون میں تغیرّ:

یقینا جب انسان کا علم آگے بڑھا ہوگا تو ابتدائی قسم کی کشتیوں کی جگہ نئی قسم کی کشتیاں آئی ہونگی۔اگر کشتی بنانے کا علم خدا کی طرف سے تھا تو پہلے جو ہدایات دی گئی تھیں۔وہ دوسری ہدایات سے مختلف ہونگی۔پہلے بادبانی کشتیاں، پھر سٹیم شپ اور پھر لوہے کے جہاز آئے۔یہ جو چیز ہے کہ اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں تغیرّ نہایت ضروری ہے۔

مثلاً طبعی زندگی میں اصول حیات یہ ہے کہ غذا پر انسانی زندگی کے قائم رہنے کا اور آگے بڑھنے کا دارومدار ہے۔جس دن پہلے انسان، اس کرۂ ارض پر نمودار ہوئے۔اس دن بھی یہی اصول تھا اور آج بھی یہی اصول ہے۔اصول میں تغیرّ و تبدّل نہیں ہوا۔لیکن اس اصول پر عمل پیرا ہونے کیلئے آپ سوچئے۔کیا جو خوراک غاروں میں رہنے والے کھاتے تھے۔وہی خوراک ان تمام ادوار میں قائم رہی۔ان میں کوئی تغیرّ نہیں ہوا۔زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ غذا کی نوعیّت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔پھر ہر ملک میں وہاں کی آب و ہوا کے لحاظ سے تبدیلیوں کی ضرورت پیش آئی۔علم انسانی جوں جوں ترقی کرتا گیا۔اس کے اعتبار سے تبدیلیاں پیش آئیں۔آج بھی مختلف ممالک میں خوراک کی نوعیّت میں تبدیلیاں ہیں۔

پھر ایک فرد کی زندگی میں دیکھئے۔پیدا ہونے کے بعد بچہ کی غذا اور ہوتی ہے۔دو تین سال کے بعد غذا میں تبدیلی آجاتی ہے۔جوانی کے عالم میں غذا اور جبکہ بڑھاپے میں جاکر اس میں تبدیلی آتی ہے۔صحت کے زمانے میں اور بیماری کے زمانہ میں اور۔مگر اصول ایک ہی قائم ہے کہ زندگی کا دارومدار غذا پر ہے۔اس لئے ان اقدار پر چلنے کیلئے تغیرّ حالات کے تحت جو طور طریقے یعنی شریعت، منہاج میں تبدیلیاں لازم ہیں۔اگر کہیں اصول بدل دیئے تو زندگی کا باقی رہنا ناممکن ہوگا۔اگر ان پر عمل پیرا ہونے کے

طریق کسی ایک دور کے یا کسی ایک حالت کے طریقے کو غیر متبدّل قرار دیدیا تو بھی زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔ غار کے انسانوں کی خوراک اور آج کے انسانوں کی خوراک مختلف رہی جبکہ انسان تو وہی ہیں۔ بچہ کی خوراک لطیف اور لذیذ ہوتی ہے لیکن عمر کے مختلف ادوار میں مختلف ہوتی ہے۔ حالانکہ بچہ کی خوراک میں زندگی کو سپورٹ کرنے کیلئے سارے اجزاء موجود ہوتے ہیں۔ اسے ساری عمر کیلئے غیر متغیرّ کر دیجئے۔ صحت کے زمانے والی خوراک کے متعلق کہہ دیجئے کہ انسان کو ہر وقت یہی غذا کھانی ہو گی۔ خواہ وہ کتنا ہی بیمار کیوں نہ ہو۔ بیمار کی خوراک میں تغیرّ وتبدّل شریعت کی رو سے حرام کردو پھر دیکھئے صحت کا حال۔

ثبات وتغیرّ کا حسین امتزاج:

ملاحظہ کیا کس طرح زندگی ثبات اور تغیرّ کے حسین امتزاج سے آگے چلتی ہے۔ یہ ہے Permanence and change اقدار واصول غیر متبدّل اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق، حالات کے مطابق بدلنے والے۔

قرآن کہتا ہے کہ وحی کے سلسلہ میں ہم یہ اصول بھی دیتے تھے اور اسی دور کے ماحول کے مطابق اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق بھی دیئے جاتے تھے۔ رسول چلا جاتا تو اس کے نام لیوا، خود اس تعلیم کے اندر آمیزش کر دیتے تھے۔ بعض اوقات حوادث ارض وسماوی کی وجہ سے بھی وہ تعلیم علی حالہ باقی نہیں رہتی تھی۔ بعض اوقات خود حالات کا تقاضا ہوجاتا تھا کہ پہلے دور کے دیئے ہوئے ایک جزئی حکم میں تبدیلی کی جائے۔ تو اس کے بعد دوسرا رسول آجاتا تھا۔ وہ رسول کہا کرتا تھا پہلے رسول کی دی ہوئی تعلیم میں جو غیر متبدّل اصول علی حالہ نئی وحی کے ذریعہ دے دیتا تھا۔ یعنی خدا ان کو اس طرح سے دے دیتا تھا اور ان میں کچھ جزوی احکام جس کو باقی رکھنا مقصود ہوتا یعنی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہنوز ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں آتی تھی، ان کو دہرا دیا جاتا تھا۔ جو قابل تغیرّ وتبدّل ہوتے تو ان سے بہتر اور احکام دیئے جاتے۔ کہا یہ تھا وحی کا اسلوب وسلسلہ جو جاری رہا۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ (2:106) کسی حکم کی جگہ جب دوسرا حکم لایا جاتا رہا ہے تو اگر پہلی تعلیم سے جو کچھ لوگوں نے فراموش کر دیا ہوتا اور وہ باقی نہ رہا ہوتا اور اگر ان کو باقی رکھنا مقصود ہوتا تو مِثۡلِهَا ؕ (2:106)۔ تو ان کی مثل وہ احکام دہرا دیئے جاتے اور جو احکام وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہ دیتے تو ''بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ'' (2:106) ان سے بہتر احکام ہم دیدیتے اور جو زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے۔ وہ حکم اپنے دور میں خیر تھا۔ بہتر تھا۔ بدلے ہوئے تقاضوں کے بعد اب اس کا انداز ''خیر'' نہیں رہا۔ اب اس انداز کا جو خیر ہوتا وہ دیدیا جاتا۔ یہ سلسلہ مسلسل اور متواتر جاری رہا۔ تآنکہ انسانیّت اس دور میں داخل ہوگئی۔ جہاں مشیت کے پروگرام نے دیکھ لیا کہ اب ایسے غیر متبدّل احکام دے دینے چاہئیں کہ جو باقی زندگی، قیامت تک کیلئے ان اصولوں میں تغیرّ وتبدّل کی گنجائش نہ رہے اور ان کو محفوظ کر دیا جائے تاکہ نہ کوئی سازشی ان میں تحریف کر سکے اور نہ ہی ان کو گردش ارض وسما مٹا سکے نہ اس میں تنسیخ وتحریف ہو سکے۔ خدا کا علم تو قیامت تک کا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے اس کلی علم کی بناء پر ایسا ضابطہ ہدایات دیدیا۔ جس میں مزید تغیرّ کی ضرورت نہیں تھی کہا۔ وَ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ

لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨ (15:9) كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (34:28) یہ ہے، اب ہر دور کے انسانوں کیلئے۔

وحی کا انداز:

یہودیوں کے اس اعتراض کا کس قدر معقول، مثبت اور جامع جواب دیا گیا ہے اب اس جامع کتاب میں قیامت تک کیلئے کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے صرف اصول دیدیئے ہیں۔ ان کے بائی لاز خود مرتب کر کے نہیں دیئے۔ سورہ مائدہ میں کہیں یہ سوال اٹھایا گیا تھا جزئیات کا تو جواب دیا گیا ہے کہ جن چیزوں کو ہم نے خود نہیں دیا تم کرید کرید کر مت پوچھو۔ اب جبکہ قرآن نازل ہورہا ہے اور بفرض محال وہ چیزیں تمہارے تقاضوں کے مطابق دیدی جائیں اور وہ کل کو بدلے ہوئے حالات کا ساتھ نہ دیں۔ تو اس کے اور تمہارے ساتھ بھی وہی ہوگا جو باقی سابقہ اقوام نے مانگ مانگ کر شریعت لی۔ تھوڑے عرصے بعد وہ ناممکن العمل ہوگئیں تو اس قوم نے دین کا لبادہ ہی اتار کے پھینک دیا کہ یہ ناممکن العمل ہے تم یوں نہ کرو۔ جو چیزیں نہیں دی جارہی ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ معاذ اللہ خدا بھول گیا ہے وہ دانستہ نہیں دی گئیں۔ یہودیوں کی طرح مشکلات میں پڑ جاؤ گے۔

یہودیوں کی مثال:

ان کو کہا گیا کہ تم سانڈ کو اپنا معبود مانتے ہو اس کی پرستش کرتے ہو تو اس شرک سے نجات دینے کیلئے کہا گیا کہ اس کی قربانی کرو۔ مصر میں بیل کی پرستش ہوئی تھی جب کہا گیا کہ تم بیل کی پرستش کرتے ہو تو کہا کہ ہم تو نہیں کرتے یہ وہی مصر کا دیوتا عزیز بچھڑا تھا۔ جس کی یہ پرستش کرتے تھے۔ اس کو ذبح کرو۔ جی ہاں، بات سمجھ میں نہ آئی۔ اس کی عمر کا پتہ کر کے بتاؤ۔ اب کس رنگ کا ہونا چاہیئے۔ سینگ کیسے ہوں۔ گردن کیسی ہو پوچھتے گئے، بتائے گئے۔

اب وہ اتنی خصوصیات ہوگئیں۔ ڈھونڈنے نکلے تو اس قسم کا بچھڑا نہ ملے۔ خود کردہ را علاج نیست تمہیں کہا تھا کہ ایک بچھڑا لو اور اسے ذبح کرو۔ بات ہوجاتی۔ ہم نے تو یہ ذبح کرا کے چھوڑنا ہے۔ اب جاؤ اس قسم کا بچھڑا ڈھونڈو۔ یہ ہی جزئیات جو خدا نے خود نہ دی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بھول گیا ہے۔ اس میں مصلحت ہوتی ہے۔ سورہ مائدہ میں ایک قوم کا کہا کہ جب وہ جزئیات کے ان مطالبوں میں پھنسی تو اصل دین سے ہی انکار کردیا۔

تقاضوں کے مطابق احکام:

سابق ادوار میں تو اس قسم کے احکام دیئے جاتے تھے اب تو نبوّت کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ اگر قرآن میں بھی ایسی تفاصیل و جزئیات دیدی جائیں تو وہ ناممکن العمل ہوجاتا۔ تو پھر قرآن کو اٹھا کے پھینکنا تھا۔ جو غذا کل تک صحت کے حالت میں کھائی جاتی تھی وہ اب بیماری کی حالت میں کیسے ہضم ہوسکتی ہے اس میں تو حالات کے مطابق تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اصول قرآن نے دیئے۔ غیر متبدّل اور یہ ہے۔ ختم نبوّت کا کہ اصول اور قوانین تو غیر متبدّل اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقہ اسلامی مملکت۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ (42:38) کے ذریعہ وضع کرے گی۔ اب یہ دین قیامت تک کیلئے چلنے والا تھا۔

نفسِ شعوریہ وغیر شعوریہ، یَوۡمَ تَاۡتِیۡ کُلُّ نَفۡسٍ تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا (16:111)
اللہ کی نشانیاں انفس وآفاق میں

نفسیاتِ انسانی:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ؕ (13:11) ہم انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائینگے تآنکہ یہ حقیقت مشھود ہو کے سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اللہ نے قرآن کریم کے دعاوی کی صداقت کیلئے انفس وآفاق کی نشانیوں کو بطور ثبوت پیش کیا ہے۔ آفاقی دنیا یعنی خارجی کائنات میں تو خدا کی نشانیاں بڑی تیز رفتاری سے سترھویں، اٹھارویں صدی سے شروع ہوئیں اور اتنی تیزی سے یہ دھما کہ ہو رہا ہے کہ ہر انکشاف قرآن کے کسی نہ کسی دعوے کی شہادت بن رہا ہے۔

عالمِ نفس:

انسان کی داخلی دنیا میں ابھی اتنی تیزی سے کام نہیں ہوا۔ اس کی ابتداء ہمارے دور میں شروع ہوئی۔ ویسے یہ سائیکالوجی کا علم، فلسفہ کے ایک حصے کے علم کے طور پر چلا آرہا تھا۔ اس کا دائرہ محدود تھا۔ اس دور میں آکر اس پر بڑی تیزی سے تحقیقات ہوئی ہیں۔ اب یہ سائنس کی شکل اختیار کر رہا ہے اب قرآن کے وہ مقامات، جن کا تعلق نفس انسانی سے ہے۔ ان سے موجودہ دور میں آکر پردے اٹھ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں ہوسکتی جبکہ انسان کی داخلی دنیا کے اندر تبدیلی نہ ہو۔ داخلی دنیا کا تعلق اب اس دور کی اصطلاح میں سائیکالوجی سے ہے۔

ظہورِ نتائج کے وقت کیا ہوگا؟ ایک عظیم آیت:

یَوۡمَ تَاۡتِیۡ کُلُّ نَفۡسٍ تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا (16:111) یعنی نفس کے ساتھ تجادل کا معنیٰ ''کچھ کرنا۔ اس کا جھگڑنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ موجودہ دور میں اس سائیکالوجی نے آکر کہا۔'' نفس شعوریہ اور غیر شعوریہ کہا کہ یہ غیر شعوریہ نفس بہت اہمیّت کا حامل

ہے۔اسے ''Master of the main personality'' کہتے ہیں۔ یہ نوحصّے تحت الشّعور ہے یہ ہے وہ اسٹور جس کے اندر یہ سارے احساسات، یہ جذبات، یہ آرزوئیں، نامرادیاں، حسرتوں کی پوری دنیا اور پھر وہ تمام عقل فریب کار کے جواز کی الجھائی ہوئی کئی چیزیں، جس میں شعور کے نفس کو فریب دے لیا ہے۔ یہ ہے نفس غیر شعوریہ۔

نفسِ شعوریہ وغیر شعوریہ:

اصل حقیقت کہ یہ ''جرم'' ہے۔ اسے غیر شعوریہ نفس اپنے اندر چھپا کر رکھ لیتا ہے۔ یہ عقلِ شعوریہ نفس کو مطمئن کر لیتی ہے کہ ضرورت میں جھوٹ بولنا پڑا۔ نفس شعوریہ مطمئن ہوجاتا ہے اور غیر شعوریہ اصل حقیقت کو اپنے ہاں رکھ لیتا ہے کہ اس وقت جھوٹ کیوں بولا تھا اور یہ اس وقت ''ظہور نتائج'' کے وقت سب کچھ بیان کر دے گا۔ تو اس وقت اعمالنامہ جو گلے میں لٹکا ہوگا کھول دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ﴿۱۴﴾ (17:14) قرآن نے نفس شعوریہ میں چھپے ان حقائق کو يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ (86:9) چھپی باتیں ظاہر ہوجائینگی۔ اب جو اس نے اپنے کو دھوکہ دیکر مطمئن کیا ہوا تھا۔ وہ حقیقتیں سامنے لے آتا ہے ان دونوں میں جھگڑا شروع ہوجاتا ہے۔ جس طرح گواہ عدالت میں ملزم پر جرح کرتا ہے تو قرآن کہتا ہے کہ اس وقت مجرم بھی یہی ہوگا۔ مستغیث بھی یہی ہوگا اور ملزم بھی۔ گواہ بھی یہی۔ یہ دو نفس ہونگے شعوریہ اور غیر شعوریہ نفس غیر شعوریہ - اپنے چھپے ہوئے حقائق باہر لے آئیگا۔ ان دونوں کے اندر جھگڑا ہوگا۔ يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا (16:111) اس طرح سے۔ وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (16:111) اگر نفس غیر شعوریہ کی گواہی کے بغیر کوئی سزا دی جاتی تو یہ ظلم ہوتا۔ خود گواہی کے بعد (اپنی) تسلیم کرے گا۔ اس وقت عمل کا پورا یوں نتیجہ سامنے آجائے گا۔

Cause and Effect کا باہمی تعلق

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ (33:21) کردار کا سارا دارو مدار Cause بننے پر ہے نہ کہ Effect پر:۔ کسی چیز کے کرنے والا ایک Cause ہوتا ہے۔ پھر اس کا Effect ہوتا ہے۔ کائنات کی تمام مجبور چیزوں میں جو بظاہر Cause ہے۔ وہ بھی ایک جانور ہے مثلاً شیر نے بکری کو پھاڑ دیا بظاہر وہ شیر اس عمل کا Cause ہے۔ لیکن اس کا تجزیہ کریں کہ شیر میں تو اس کی صلاحیت نہیں نہ اس کے ارادے کو اس میں عمل دخل ہے اور نہ ہی وہ اس کیلئے مجرم گردانا جاسکتا ہے چونکہ اس عمل میں وہ شیر اس کا Cause نہیں بنتا۔ اس لئے اسے اس کا کریڈٹ نہیں جاتا۔ تو جتنا کوئی شخص کسی Effect کا Cause بنتا ہے اتنا ہی اس کا کیریکٹر بنتا ہے۔ اتنی ہی اعلیٰ اس کی سیرت بنتی ہے۔ مجرم کو اس لئے مجرم سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس جرم کا Cause ہوتا ہے اور انسان کا نامہ اعمال انہی کاموں کے اس کے Cause بننے پر ہوگا۔ جتنا Cause اعلیٰ و ارفع ہوگا۔ اتنا ہی اس کا کیریکٹر اعلیٰ ہوگا۔ اگر کسی اور Cause کا یہ Effect ہوگا۔ یعنی کسی دوسرے کے کرنے پر Effect ہوگا تو اس کا کریڈٹ اس کو نہیں جائے گا۔ کسی چیز کا Effect ہونا کریڈٹ ہی نہیں دیتا۔ صرف کسی چیز کا Cause ہونا ہی کریڈٹ دیتا ہے۔ یاد رکھئے کائنات کی جتنی مجبور چیزیں ہیں وہ کسی چیز کا Cause نہیں ہوتیں اس لئے انہیں کریڈٹ نہیں جاتا۔

انسانی سیرت و کردار کا انحصار اس کے Cause کے پیدا کرنے میں ہے:

انسان صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ جتنی چیزیں وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے۔ وہ ان کا Cause ہوتا ہے اور اس سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ اس کے Effect ہوتے ہیں تو گویا انسان کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ کسی چیز کا کتنا Cause بنتا ہے۔ محکوم قوم، مغلوب قوم، ڈکٹیٹر کے ماتحت قوم، ملوکیّت کی ماری قوم تو بیچاری Effect ہی Effect ہوتی ہے۔ Cause نہیں ہوتی اور اس کی ذلت و پستی محکوم ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کھانا اس سے بھی بہتر کھائے جو یہ سب کچھ کرا رہا ہے۔ یہ محکوم و غلام اپنے آقا کے احکام کے Effect ہوتے ہیں۔ آقا Cause ہوتا ہے۔ اس نے ان سے یہ کرایا۔ ملازم جو چھٹی ڈالتا ہے اور یہ پہنچی ہے یہ Effect جس کا Cause وہ آقا ہے۔ یہ ملازم اس کا Cause نہیں ہے۔

ذاتِ خداوندی کسی Cause کی Effect نہیں:

یاد رکھیں! زندگی میں جتنا ممکن ہو۔ Cause بنئے۔ یہ ہوگا مقام انسانیت اور کم از کم Effect بنئے۔ یہ محکومی کی دلیل ہوگی یہ

کوئی اور کررہا ہوگا۔ خدا کی قدرت کاملہ یا خدا کا عظیم مقام یہ ہے کہ وہ خود کسی Cause کا Effect نہیں ہے۔ وہ تو ہر Effect کا Cause ہے۔ انسان جتنا زیادہ Cause بنتا جائے گا۔ اتنا ہی خدا کی صفت اس کے اندر آتی چلی جائے گی۔ خدا کے رنگ میں رنگتا چلا جائے گا۔

یہ مقام تو مقام خداوندی ہوگا کہ وہ کسی Cause کا Effect نہ ہو۔ ہمارے ہاں مسبب الاسباب ایک قرآنی اصطلاح تھی۔ یعنی سارے Cause کا انتہائی Cause جو کسی Cause کا Effect نہیں ہے یہ ہے خدا کی ایک Defination خدا کے بندے وہ ہونگے جو دنیا میں کسی چیز کا جتنا زیادہ Cause ہونگے۔ اتنا ہی وہ خدا کے مقرب ہونگے۔ اتنا ہی خدا کا رنگ ان کے اندر آیا ہوگا۔ اس کے برعکس جتنا Effect ہوتے چلے جائیں۔ اتنا ہی وہ کائنات کی مجبور چیزوں میں داخل ہو جائینگے۔ وہ Effect بن جائینگے۔ انسان نہیں رہیں گے۔ تو خدا اس لئے خدا ہے کہ کسی اور Cause کا Effect نہیں ہے بلکہ وہ Effect کا Cause ہے۔ یہ ہے خدا کی عظمت۔

موت کے وقت Cause بطور زادِ راہ ہوگا:

انسان کی کامیابی اور فلاح اس میں ہے کہ مرتے وقت بتا سکے کہ میں کتنے اچھے Effect کا Cause رہا ہوں۔ اگر برعکس ہوا کہ میں کتنے Cause تھے جن کا Effect رہا ہوں تو یہ دنیا کے اندر ذلیل ترین زندگی ہوگی۔ نبی ﷺ وحی کے معاملہ میں Effect ہوتا ہے۔ Cause خدا ہوتا ہے۔ یہ کلام اللہ ہوتا ہے جو اسے ملتا ہے۔ اس کا کلام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کلام کے معاملہ میں نبی ﷺ Effect ہوتا ہے۔ اگر نبی ﷺ کے معاملہ میں یہ تسلیم کرلیا جائے کہ خدا کی طرف سے بولتا ہے۔ ہر کام اس کی طرف سے ہوتا ہے تو یہ All Effect ہوگیا۔ وہ تو کسی عمل کا Cause نہ رہا۔ اگر یہی چیز اسوہ حسنہ بنتی ہے۔ تو ہمارے لئے تو اور بھی دشواری ہو جائے گی۔ کیونکہ عام انسانوں سے نہ خدا کہلواتا ہے اور نہ کراتا ہے آپ خود تو اس نے کچھ کرنا نہیں تو وہ تو رسول ﷺ اللہ کی اس زندگی کے خلاف چلا جائے گا۔ جس کا تصوّر قرآن دے رہا ہے۔ خدا آپ سے کچھ کراتا نہیں بس یہ ہوا کہ ہم مسلمان ہو گئے نہ ہم خود کچھ کرتے ہیں نہ خدا ہم سے کچھ کراتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ روٹھا ہوا ہے اپنے مالک کو منالو۔ ایک تصوّر کے بدلنے سے ہم کہاں سے کہاں جا پہنچے۔

مذہب کے خودساختہ تصوّرات:

یہ مذہبی دنیا اپنے رسول ﷺ بزعم خویش جن عظموں کا مالک قرار دیتی ہے۔ ذرا اس کا تجزیہ کیجئے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس میں رسول ﷺ کی اپنی حیثیت، اپنی ذات، اپنا کردار، اپنی سیرت، اپنی بصیرت، کچھ بھی نہیں رہتی۔ وہ تو معاذ اللہ ایک آلہ بن کررہ جاتا ہے جو خدا کہلائے کہتا ہے۔ جو کرائے کرتا ہے۔ ایسی بات قطعاً نہیں ہے۔ یہ وحی خدا نے دی رسول ﷺ نے پہنچائی۔ اس حد تک تو یہ رسول ﷺ کی پوزیشن تھی۔ اس لئے مخالفین کے لاکھ دباؤ کے باوجود کہ قرآن کے بدلہ میں دوسرا قرآن یا اس میں تبدیلی تو میرے حیطہ ادراک سے باہر ہے۔ چونکہ یہ میری فکر کا نتیجہ نہیں تو میں اس میں تبدیلی کیسے کرسکتا ہوں؟ اِنْ اَتَّبِعُ اللہ میں بھی باقیوں کی طرح اس کا

674

اتباع کرتا ہوں اور اس کی خلاف ورزی سے ڈرتا ہوں۔ یہ ہے عظمت رسول ﷺ۔ پھر اس سے رسول ﷺ اپنے ہر فیصلے، ہر عمل کی ذمہ داری قبول کرے گا اور کہے گا کہ "میں نے یہ کیا ہے اس کے برعکس ابلیس تو کہتا ہے کہ میں نے تو نہیں کیا بلکہ خدا نے کرا دیا ہے۔"

غلط عقیدت مندیاں:

روما کے ایک بڑے گرجہ میں عیسیٰؑ کی ایک نہایت نادر تصویر تھی۔ ہر عقیدت مند جاتا اور اس کے نیچے اپنی عقیدت کی ایک موم بتی، شمع روشن کر دیتا۔ خواہ وہ شمع کافوری کیوں نہ ہو۔ آہستہ آہستہ ان عقیدت مندوں کی موم بتیوں کے دھویں سے وہ ساری تصویر ہی دھندلا گئی۔ تصویر کا پتہ ہی نہ چلا۔ یہ ہیں عقیدت مندوں کے دھویں جو تصویر کو بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے کہا۔ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۛ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (12:108) علی وجہ البصیرت میں بھی اور متبعین بھی لوگوں کو مدعو کرتے ہیں۔ لہٰذا عقیدت کی نہیں دین میں بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقیدت کی شمعیں تو تصویر کو گدلا کر کے مشکوک بنا دیتی ہے جبکہ بصیرت کی روشنی تو تصویر کو جگمگا دیتی ہے۔ سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ اور دنیا میں اس کی تبلیغ بصیرت کی بناء پر کیجئے کہ دیکھئے انسان ہوتے ہوئے ایک شخص اپنی طرف سے یہ کچھ کر کے دکھا سکتا ہے۔ یہ ہوگی صحیح عظمت رسول ﷺ۔ یہ ہے اسوہ حسنہ۔ یہ ہے ان کا کیریکٹر۔ حسین ترین نمونہ عمل پر اتنے سے عرصہ میں وہ کچھ کر کے دکھا دیا وہ واقعی ہی محیّر العقول ہے: بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس کی کہیں تاریخ عالم میں مثال نہیں ہے۔

❁❁❁

فحش یعنی بخل کے نتیجہ میں قوائے اقتصادی کے علاوہ وسعتِ خیال بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے

فحش یعنی بخل:

فحش کے نتیجے میں جتنے بھی قوائے اقتصادی ہیں کمزور ہوتے جاتے ہیں پھر اقتصاد رزق کی استعداد، قوّت پر اثر پڑتا ہے۔ رزق میں کمی شروع ہو جاتی ہے پھر یہیں سے ''بخل'' کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بخیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عرب اس ابتدائی چیز کو فحش یعنی بے حیائی کہتے تھے اور بخل اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسے ہی فحشہ کہتے ہیں۔ جس کا شیطان حکم دیتا ہے۔ یعنی جب تم جنسی جذبات کو بے باک کر دو تو یہ ہو گیا شیطان اور اخر الامر اس سے فاحشہ پیدا ہو جائے گی اب دیکھئے اقتصادی مسائل میں قرآن زنیٰ کو لایا ہے۔ جس کا معاشیات سے کتنا گہرا ربط ہے یعنی اس کے قریب بھی نہ جا۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ (17:32) یعنی اس پتھر کو پہاڑ کی چوٹی کے مقام پر رکھا اگر بے احتیاطی برتی تو یہ اپنے مومنٹم (زور دروں) سے نیچے آنا شروع ہو جائیگا۔ پھر تم اسے روک نہیں سکو گے۔ قرآن چور کی بجائے چور کی ماں کو مارتا ہے۔ وہ ان محرّکات کو جو اس تک لے جانے کا سبب بنتے ہیں وہ انہیں وہیں سے روکنا شروع کر دیتا ہے۔ عصمت کی حفاظت کا قوموں کے عرّوج و زوال سے گہرا تعلق ہے یہ تو نہ انفرادی ہے اور نہ ہی نجی معاملہ۔ اگر جنسی بدنہادی کو نہ روکا جائے تو انفرادی طور پر جس قدر نفسیاتی عورض پیدا ہوتے ہیں وہ کچھ نہیں ان کے مقابل وہ قوم زیادہ سے زیادہ سو سال تک بلندیوں تک رہتی ہے پھر زوال کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن حفاظت عصمت پہلے لا کر پھر حفاظت جان لایا ہے۔

علّت و معلول کا قانون اور حالت معدوم:

یہ سائنسدان ہر بات کی تحقیق کیلئے دلیل اور ثبوت مانگتے ہیں۔ زندگی کے تسلسل کو دیکھنے کیلئے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کائنات میں سلسلہ علت و معلول کی بنیاد پر ہر چیز وجود میں آتی ہے۔ پیچھے ایک Cause ہوتا ہے۔ اس Cause کا ایک Effect ہوتا ہے۔ پھر وہ Effect، Cause بنتا ہے پھر وہ Effect میں آتی ہے ساری سائنس اس پر ہے کہ یہ موجود تھی اس میں

سے یہ ہوئی۔ عربی میں یہ تخلیق کہلاتی ہے۔ یعنی موجود چیزوں میں ایک خاص ترکیب اور تناسب سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ یہ جب پیچھے جاتے ہیں تو وہاں Origin of Universe ہوتا ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو شے تھی جس کے بعد یہ سلسلہ آگے چلا، وہ شے کیسے وجود میں آ گئی۔ پانی کا تو پتہ چلا کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا تو یہ ہائیڈروجن اور دیگر عناصر یہ Basic Elements کہاں سے آ گئے۔ یہ تو تخلیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تخلیق تو وہ ہے جو دوسری موجود چیزوں کے اس طرح سے ملنے سے دوسری چیز وجود میں آئے۔ تو یہ عناصر کہاں سے آ گئے؟ یہ ہے وہ مقام جہاں خَلَقَ کا لفظ نہیں آتا بلکہ "فَطَرَ" "بَدَعَ" وہ ہے یعنی Nothingness سے Beingness بنانا۔ "جس شے کا وجود ہی نہیں ہے اس کو وجود میں لے آنا تم اس پر تعجب کرتے ہو اور اسے ناممکن بتا رہے ہو۔ کہتے ہو کہ یہ جو منتشر اجزاء ہیں۔ ان میں دوبارہ تکوین Integration کیسے پیدا ہوگی؟ یہ تو مان لیا کہ یہ کچھ موجود ہے اب کہتے ہو کہ اس کی تکوین کون کرے گا؟ کہا یہ وہ کرے گا۔ جب کچھ بھی موجود نہیں تھا تو اسی نے پھر موجود کر دیا۔

آئن سٹائن اور دہقان ایک مقام پر کھڑے ہیں:

یہ ہے وہ مقام کہ جہاں آئن سٹائن بھی یہ کہہ رہا ہے کہ ہم "کائنات کی ابتداء کیسے اور کس طرح ہوئی" اس مقام پر ہم بھی اس طرح حیران و ششدر کھڑے ہیں جس طرح ایک ہل چلانے والا دہقان۔ جس طرح 2½ ہزار سال قبل یونی حکماء تھے۔ وہیں ہم بھی آج کھڑے ہیں۔ جواب دیا گیا کہ "علم انسانی اس سے پیچھے جا ہی نہیں سکتا۔ جو صرف ان جاہل عربوں کو ہی نہیں آج بھی یہی ہے آج بھی سب سے بڑا مفکر اور سائنسدان جو ہر بات کو دلیل سے مانتا ہے اسے بھی کہئے کہ جواب دے۔ مَنۡ يُّعِيۡدُنَا ؕ (17:51) کون دوبارہ منتشر اجزاء کے بعد پیدا کرے گا۔ وہ بھی دوبارہ پیدا کرنے کے اعتراض پر حیران و ششدر کھڑا ہے۔ جس طرح کائنات کی ابتداء کی علت معلوم کرنے پر کھڑا تھا۔ قرآن نے جواب دیا۔ قُلِ الَّذِىۡ فَطَرَكُمۡ (17:51) وہی کرے گا جو تمہیں عدم سے وجود میں لایا۔ جب کچھ بھی نہیں تھا ہر طرف معدوم ہی معدوم تھا۔ یہاں موت کے تو پھر بھی کچھ موجود ہے۔ کہئے کیا اس دلیل میں وزن ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خدا سے انکار کرنے والا بھی یہاں آ کر بے بس نظر آئے گا۔ سائنس یہاں آ کر ختم ہو گئی۔ یہ بات تو علت و معلول میں نہیں آتی۔ یہاں ساری سائنس ختم ہو گئی۔ یہ حیرت کدہ ہے جہاں یہ سارے حیران و ششدر کھڑے ہیں "کہ کچھ موجود نہ ہو اور وہاں کچھ موجود ہو جائے" تم میں اور ہم میں یہ فرق ہے۔ فَطَرَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ (17:51) چونکہ دلیل نہیں ہوتی تو پہلے بھی اور آج بھی۔

فَسَيُنۡغِضُوۡنَ اِلَيۡكَ رُءُوۡسَهُمۡ (17:51) سر لٹکائے ہوئے مذاق سمجھ کر یونہی چلے جاتے ہیں۔

علمِ نفسیات اور قرآن کا باہمی ربط
دنیائے دانش میں انقلابِ عظیم

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:53)

قرآن کو سمجھنے کے لیے تصریف آیات، عربی مبین اور اضداد کے علاوہ ایک تیسری شرط بھی ہے اگر اس خارجی کائنات میں اور خود انسان کی نفسیاتی دنیا کے اندر جو حقائق پوشیدہ ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جونہی بے نقاب ہوتے جائینگے تو قرآن کی صداقت ان حقائق سے ثابت ہوگی یہ شرط انسان کی علمی سطح سے متعلق ہے۔ آج کے انسان کی علمی سطح آج سے ہزار سال پیشتر کے انسان کی علمی سطح سے بہت بلند ہے۔ یہ قصہ آدم و ابلیس کو قرآن نے جو اتنی بار دہرایا ہے یہ بڑا اہم قصہ ہے۔

خارجی کائنات سے متعلق جو بہت سے حقائق سامنے آنے سے قرآن کے کئی دعاوی ثابت ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ قرآن کے بہت حقائق کا تعلق انسان کی نفسیاتی دنیا سے ہے تو ان کی تحقیقات قرآن کے کسی نہ کسی دعویٰ کی تصدیق کر رہی ہیں۔ لاریب یہ انسان کا کلام نہیں ہوسکتا آج کا سائیکالوجسٹ جو کہہ رہا ہے تو اس سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

کائناتی قوّتیں:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ط (17:61) یہ انسان کی داستان ہے۔ ملائکہ کائنات کی خارجی قوّتیں ہیں جو امرِ الٰہی کو تدبیری شکل دیکر بروئے کار لا رہی ہیں۔ یہ عالم امر کے ملائکہ کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ صرف عالم خلق میں خدا کی یہ تخلیق کردہ قوّتیں کس طرح کارفرما ہوتی ہیں یہ ہے ہمارے ہاں وہ قانون جو ’’قانونِ فطرت‘‘ ہے یہ قوّتیں کس طرح سے کام کر رہی ہیں۔ خدا کے امر یا تدبیر کو کس طرح سے بروئے کار لا رہی ہیں۔ یہاں عالم خلق کے ان ملائکہ کا ذکر ہے۔ ابتدائی دور کا انسان تو ان سے خوفزدہ ہو کر ان کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا۔ بارش کا دیوتا، اگنی کا دیوتا، برف، چمک، چاند سورج، سیلاب، زلزلے حتیٰ کہ شیر اور سانپ یہ سب انسان پر گویا غالب ہیں اور انسان ان کے سامنے بے بس

اور مجبور ہے۔

قرآن کا ایک عظیم ترین انقلابی اعلان:

قرآن نے آ کر اعلان کیا کہ یہ تمام فطرت کی قوتیں آدم کے سامنے مسجود ہیں تو ان کے سامنے سجدہ ریز ہو کر شرف انسانیّت کی تذلیل کر رہا ہے۔

قرآن نے اس تصوّر کو الٹ کر رکھ دیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13) یعنی جو کائنات ابھی مشہود ہے اور وہ بھی جو ابھی تمہارے حیطہء تصوّر میں بھی نہیں جاؤ ان کو مسخّر کر دیا گیا ہے اور ان سے کام لو۔ یہ کہہ کر مذہب کی دنیا الٹ کر رکھ دی۔ یعنی ان قوتوں کو اپنے سامنے جھکانا ہے اب سائنس نے یہ بتا دیا ہے کہ جس کے سامنے یہ قوتیں سر بسجود نہیں ہوتیں وہ مقام آدم تک ہی نہیں پہنچا۔ مقام مومن تو بہت دور کی بات ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ (17:61) اِلَّآ جو استثنا کیلئے آتا ہے۔ اِلَّآ سے مراد ''لیکن'' یعنی یہ دوسری نوع ہے اِلَّآ بتا رہا ہے کہ وہ ملائکہ میں سے نہیں ہے جس کو مسخّر کر دیا گیا ہے۔ ان کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ خدا ان کو کہے کہ جھک جاؤ اور وہ نہ جھکیں آگے ہے۔ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ (17:61) یہ تو طین سے پیدا کیا گیا ہے اور میں نار سے اور نار افضل ہوتی ہے میں کیوں جھکوں اس کے سامنے۔ اس نے اس کا Reason دیا۔ اس لفظ طین سے انہوں نے طینت بنا یا اسے وہ فطرت کے معنوں میں لیتے ہیں اور جبلت یعنی فطرت انسان۔ Nature بھی کہا گیا ہے۔ جبکہ قرآن نے تو انسان کی فطرت سے انکار کیا ہے۔ فطرت تو مجبور کی ہوتی ہے۔ صاحب اختیار کی کوئی فطرت نہیں ہوتی اور آج سائیکالوجسٹ بھی متفق ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی جبکہ طینت کا مسئلہ ان کے ہاں بھی زیر غور ہے۔

ابلیس نے کہا۔ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ؗ (17:62) مٹی کا بنا ہوا اور مجھے کہا جا رہا ہے کہ اس کے سامنے جھک جاؤں۔ آدم اور ابلیس میں واجب التکریم کون ہے کہا ٹھیک ہے مجھے اس آدم کی وجہ سے دھتکار دیا گیا۔ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ (17:62) ابلیس کے یہی معنی عرب کا بدو بھی اور ایرک فرام بھی سمجھ رہا ہے یعنی میرے مقابلہ میں اسے زیادہ تکریم وفضیلت دی ہے تو جواباً کہا کہ میں اسے ذلت کے ساتھ لئے پھروں گا۔ یعنی یہ انسان کے پست جذبات كَرَّمْتَ کے مقابل اِحْتِنَاكَ آیا ہے یعنی انسان جب اپنے پست جذبات کے تابع مجبور ومحکوم ہو جاتا ہے تو جس ذلت کے ساتھ وہ اپنے مقاصد کا حصول کرتا ہے وہ تو پوچھو نہیں۔ انسان اور حیوان میں غیرت کا فرق ہوتا ہے پست جذبات کے تابع جو عزت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ قَالَ اذْهَبْ (17:63) کہا جاؤ تمہیں کھلی چھوٹ ہے۔ Fairplay ہو گا۔ ہم نے دخل نہیں دینا۔ لیکن

یاد رکھو۔ فَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمۡ جَزَآءً مَّوۡفُوۡرًا ﴿۶۳﴾ (17:63) جو اپنے مفادات کے تحت ذلیل ہوگا تو وہ رسوائی کے جہنّم میں ڈالا جائے گا۔

جہنّم:

جہنّم عربانی زبان کا لفظ ہے۔ عربی الاصل ہے اور دو لفظوں کا مرکب ۔ جی ۔ جس کے معنی وادی اور هَنُّوۡم ایک آدمی کا نام تھا۔ یہ یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی ۔جس میں زمانہ قدیم میں مولوک (عَمُّوۡنِیۡنَ کے دیوتا) کے حضور آدمیوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی ۔لہٰذا ''جی هَنُّوۡم '' سے مراد وہ وادی جہاں انسان ذبح کئے جاتے تھے اور انہیں جلایا جاتا تھا۔اس جی هَنُوۡم سے لفظ جہنّم بنا۔

یعنی وہ مقام جہاں انسانیّت کو جلا دیا جائے تو ابلیس انسانیّت کو جلانے کیلئے اِحۡتِنَاك کے ذریعہ کیا کیا حربے استعمال کرتا ہے۔وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ (17:64) سب سے زیادہ موثر ہتھیار آواز یعنی پروپیگنڈے،تمام نشریاتی ذرائع استعمال کر کے موجودہ دور اس کی ایک بین مثال ہے کہ آواز سے کیا کیا تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں اور جو زیادہ سخت جان ہوں۔تو وَ اَجۡلِبۡ عَلَيۡهِمۡ بِخَيۡلِكَ وَ رَجِلِكَ (17:64) اگر پروپیگنڈہ سے نہیں مانا تو پھر ضرورت پڑی تو فوجوں کی چڑھائی سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔اس کے ساتھ وَ شَارِكۡهُمۡ فِى الۡاَمۡوَالِ (17:64) معیشت میں شریک ہو کر ان کو نان شبینہ کیلئے محتاج کر دونگا۔ وَ الۡاَوۡلَادِ (17:64) ان کو تعلیم کے ذریعہ قابو کروں گا۔کہا کہ اگر ان Tactics کا اگر اس کو علم ہو گیا تو پھر وَعِدۡهُمۡ ؕ (17:64) تو ان کو وعدے پر وعدے پر لمبی چوڑی امیدیں دلا کر۔وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۶۴﴾ (17:64) وعدے تمام جھوٹے مگر دلکش اور جاذب نظر۔ چونکہ میرے مقابلہ میں اسے كَرَّمۡتَ زیادہ فضیلت جو دی ہے جس طرح ایک ایک کر کے ابلیس سارے حربے استعمال کر رہا ہے۔

ان حربوں سے حفاظت کچھ ممکن ہوسکتی ہے:

کیا کوئی ایسی صورت ہے جو ان ابلیسی حربوں سے بچا جا سکے سب سے بڑا انقلاب تو کائناتی قوتوں کا انسان کے سامنے سر جھکا دینا تھا۔ یہ تھا کائنات میں آدم کا مقام دوسرا چیلنج نفسیاتی ہے۔وہ جھک جانا آفاقی چیلنج تھا۔کہا کہ ہر ایک پر تو قابو نہیں پا سکے گا۔اِنَّ عِبَادِىۡ لَـيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ ؕ (17:65) جو لوگ اپنے جذبات کو یعنی ابلیس کو اپنا الٰہ بناتے ہیں ان کو تو تگنی کا ناچ نچا سکتا ہے۔لیکن عِبَادِىۡ (17:65) یعنی جنہوں نے مجھے اپنا الٰہ بنایا ہے تو ان پر تیرا غلبہ وتسلط نہیں ہو سکے گا یہ ہے دوسرا بڑا انقلاب۔وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيۡلًا ﴿۶۵﴾ (17:65) تو جن کو خدا پر بھروسہ ہوگا تو ان پر تیرا بس نہیں چل سکے گا۔

عیسائیّت کا تصوّرِ حیات:

عیسائیّت کے تصوّر کے مطابق ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے گناہگار پیدا ہوتا ہے۔اپنے اوّلیں ماں باپ کا گناہ اپنی پشت پر لاد کر پیدا ہوتا ہے وہاں سے یہ مسلّمہ ہوا کہ انسان کی فطرت ہی بد ہے اگلا تصوّر یہ کہ یہ آلائش محنت اور کاوش سے مستقل طور

674
پر نہیں ڈھل سکتے۔ یہ تو بچپن سے ہی اس کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔یعنی Evil اس کی نیچر کے اندر ہے۔یعنی مستقل طور پر ابلیس سوار ہو گیا تو اس عقیدے کی رو سے انسان مجبور قرار دیدیا گیا۔یعنی یہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔پھر اگلا عقیدہ ان کے جبر کا آ گیا تو دو مسلّمہ ہو گئے۔Evil by Nature اور Determinism کہ فطری طور پر نہ صرف یہ کہ ''بدٗ'' ہے بلکہ ''مجبور'' بھی ہے۔یہ عقیدہ عیسائیت نے کہاں سے لیا؟ یہ تو ایک لمبی تفصیل چاہتا ہے۔

یورپ کے سائنسدانوں کا عیسائیت سے چھٹکارا:

یورپ کے مفکّرین اور سائنسدانوں نے عیسائیت کو چھوڑ دیا۔ جب سائنس کی تحقیقات شروع کیں۔تو خود عیسائیت نے ان کو مرتد قرار دیدیا۔انہوں نے خالی الذّہن ہو کر ریسرچ شروع کی۔ ذہنی طور پر انہوں نے مذہب کا لبادہ تو اتار لیا مگر اندر خلا موجود رہا اور ان کو اس کا دوسرا بدل نہ ملا اور خلا رہا چونکہ فطرت کے کارخانے میں کوئی چیز خالی نہیں رہ سکتی تو عقیدہ جبر کو چھوڑنے کے باوجود اور بظاہر عیسائیت کو چھوڑ کر دہریت اختیار کرنے کے باوجود، یہ عقیدہ کتنی گہرائی میں گیا ہوا تھا سولھویں صدی میں وہاں ریسرچ کا آغاز ہوا تو ڈارون نے ان تمام پتلا بننے والے نظریات کو مسترد کر دیا۔ ڈارون نے کہا کہ انسان نے حیوان سے اس سطح پر آنے کے بعد انسانی پیکر تو اختیار کر لیا مگر وہ حیوانی جبلّت اس کے اندر موجود رہی جنہیں کوئی حیوان بدل نہیں سکتا نہ چھوڑ سکتا ہے۔اس نے ان کو Determinism کہا وہی عیسائیت کا عقیدہ ٹھہرا۔آگے چلیئے تو اس پہلو کو Behaviourism کہا کہ انسان ان حیوانی جذبات کی وجہ سے مجبور نہیں ہے بلکہ بچپن ہی سے کچھ عادات کچھ Behaviour فارم کر لیتا ہے اور تین سال کی عمر تک کے بچہ میں یہ سارا کچھ ہوتا ہے۔ یہی اس کے عقائد ہوتے ہیں انہیں یہ چھوڑ نہیں سکتا۔شعور تک پہنچنے میں یہ عادات اتنی پختہ ہو جاتی ہیں کہ وہ اس Behaviour کو چھوڑ نہیں سکتا۔ پھر انسان مجبور محض ہوتا ہے۔

دیکھئے ان کا دعویٰ اپنی تہذیب پر کہ ہم نے انسان کو مادر پدر آزاد چھوڑ دیا ہے ایسا با اختیار کہ وہ کوئی قاعدہ اور قانون مان ہی نہیں رہا۔ لیکن ان کے ہاں کی سائنسی تحقیقات ان کو اس نتیجہ پر پہنچا رہی ہیں۔ جہاں عیسائیت کے عقیدہ نے پہنچایا تھا کہ مجبور محض ہے۔اب آ گئے (ماہرین علم الانسان) کہا کہ غاروں میں رہنے والا یہ انسان ترقی کرتا کرتا آہستہ آہستہ یہاں تک پہنچا ہے۔ٹھیک ہے خارجی دنیا میں اس نے ترقی کر لی ہے لیکن وہ اوّلین غاروں والے انسانوں کی جبلّت وراثتاً ایسی چلی آ رہی ہیں کہ یہ انہیں نہیں بدل سکتا۔

اب آئے Socialogists انہوں نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ جس قسم کا معاشرہ ہوتا ہے یہ اس قسم کا انسان بن جاتا ہے۔حتیٰ کہ جسے آپ Human consciousness کہتے ہیں۔انسانی شعور۔دلیل انسانی اس کیلئے باہر کا معاشرہ خود اس کا نفس انسانی بن گیا ہوتا ہے وہ اسے اندر نگل لیتا ہے۔ Internalise کر لیتا ہے۔اس طرح یہ مکمل طور پر ماحول کا پیدا کردہ ہو جاتا ہے۔پھر وہی بات آ گئی کہ یہ اس سے نکل ہی نہیں سکتے یہ مجبور محض ہے۔

پہلا سائیکالوجسٹ فرائڈ (1856-1939):

پہلا سائیکالوجسٹ جس نے بڑی تحقیق کی تھی اس نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہے انسان میں نفسِ شعور یہ اور دوسرا غیر شعور یہ یا تحت شعور یہ ہوتا ہے۔ شعور یہ وہ جو عقل سے Reason سے باتیں کرتا ہے۔ فیصلے کرتا ہے جبکہ تحت الشّعور خالص جذبات کا ہوتا ہے اس کے اندر 9:10 تحت الشعور ہوتا ہے اور صرف 1:10 اس کا نفسِ شعور یہ نفس غیر شعور یہ کیلئے فرائڈ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ نفسِ شعور تو اس کا خادم ہوتا ہے اور جو کچھ نفس تحت الشعور میں ہے اس کو نفس شعور بدل نہیں سکتا پھر وہ بات کہ انسان تو مجبور محض ہے۔

کارل مارکس:

مارکس (1818-83) اس نے ان تمام باتوں کو غلط قرار دیا جس قسم کا معاشی ماحول ہو۔ اس کے مطابق انسان بن جاتا ہے پھر وہی بات کہ انسان تو مجبور محض ہے۔ انسان خود اپنا معاشرہ نہیں بنا سکتا بلکہ اس کا معاشرہ معاشی ماحول سے ہی بنتا ہے۔ ایک فرد کے خود کچھ بن جانے کا تو سوال ہی نہیں ہے اس نے اسے Historical Necessity کہا۔ جس کے معنی تم کچھ ہی کرلو، یہ ہو کے رہنا ہے تو پھر انسان تو مجبور محض ہوا پھر وہی۔ Determinism آئی۔

ڈارون نے مارکس تک ساری تحقیقات انسانی یہاں تک پہنچی ہیں کہ انسان مجبور محض ہے تو پھر اسے کسی قسم کا اختیار ہی نہیں ہے۔ ڈارون سے لیکر مارکس تک آ جایئے تو جو ابلیس نے کہا تھا کہ میں اسے تگنی کا ناچ نچاؤں گا۔ تو سارا انہوں نے اس نتیجے پر پہنچا دیا۔

قرآن کا بصیرت افروز اعلان:

قرآن نے ان تمام مفروضوں کو غلط قرار دیا اور اعلان کیا۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ (17:65) یہ تو صاحب اختیار ہے۔ مجبور محض نہیں ہے۔ ساری فکر انسان کی بساط الٹ کے رکھ دی۔ تم اسے مجبور کہہ رہے ہو۔ مجبور ہونے کا اعتراف ابلیس کرتا ہے۔ دونوں کو ایک حکم دیا گیا۔ ابلیس سے کہا گیا کہ جھک جاؤ۔ اس نے انکار کر کے معصیت کی۔ آدم سے کہا۔ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (2:35) اس نے بھی اس سے انکار کیا۔

ابلیس کا اپنی غلطی سے انکار اور آدم کا اعتراف:

ان تحقیقات پر غور کریں اور پھر قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور کریں۔ بڑی اہم چیزیں آ رہی ہیں۔ ابلیس سے انکار کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ میں تو مجبور محض ہوں۔ تیرے حکم کے بغیر تو یہاں پتہ نہیں ہل سکتا۔ مجھ میں انکار کی جرأت کہاں؟ یہ تو تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔ یہ میں تو نہیں۔ خدا خود کرتا ہے۔

تو اس پر اسے دھتکار دیا گیا اور کہا کہ جاؤ تمہاری اصلاح ناممکن ہے۔ جو اپنے آپ کو مجبور قرار دے۔ وہ اپنے کسی فیصلہ اور عمل کی ذمہ داری قبول ہی نہیں کرتا اور جو ذمہ داری قبول نہ کرے تو اس کی اصلاح کی کوئی شکل ہو نہیں سکتی۔ اصلاح اس کی ہو سکتی ہے جو غلطی تسلیم کرے اور ذمہ داری کو قبول کرے جبکہ آدم نے کہا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا

لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ (7:23)

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

ہاں اصلاح ممکن ہے:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ (2:38)

قرآن کے برعکس سائنس اور مذہب دونوں نے انسانوں کو مجبور قرار دیا:

قرآن نے ساری فکر انسانی کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ دنیائے سائنس ہو یا دنیائے مذہب ہو۔ یہ دونوں انسان کو مجبور محض قرار دے رہے ہیں۔ دراصل یہ جذبات تھے جنہیں یہ دونوں غالب قرار دے رہے تھے۔ قرآن نے آ کے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ قرار دیا۔ چنانچہ اس طرح وہ بساط الٹ کے رکھ دی۔ پہلا عظیم اعلان کہ یہ ساری کائناتی قوتیں آدم کے سامنے سربسجود ہیں اور دوسرا اعلان انسان کی نفسیاتی دنیا کے اندر تبدیلی کہ وہ صاحب اختیار ہے اور یہ قوتیں اس کے اوپر صاحب اختیار نہیں ہیں۔

قصہ آدم انسانی نفسیات کا ہی ترجمان ہے:

یہ جو انسان کے اندر سے بدی Evil نکلتا ہے اس کیلئے قرآن نے دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ ایک ابلیس دوسرا شیطان۔ یہ دونوں الفاظ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ عربی زبان کی رو سے ''ابلیس'' کے معنی مایوس ہو گیا یعنی Frustrated اور شیطان کے معنی Aggressive دھاندلی پر اتر آنے والا۔ بظاہر یہ دو متضاد چیزیں نظر آتی ہیں۔ مایوس تو بڑا افسردہ اور دھاندلی باز تو بڑا سرکش اور متکبر ہوتا ہے۔

قرآن دراصل انسانی نفسیات کا ہی ذکر کر رہا ہے۔ ابلیس کوئی باہر کھڑا نہیں ہے۔ یہ آدم ہی کا ذکر ہے۔ جس کی کدوکاوش کا نتیجہ فرسٹیشن اور مایوسی ہے پھر اس کا اگلا نتیجہ Aggressive ہونا ہے۔ جو غلبہ کی قوت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ تو جس میں یہ قوت نہ ہو یعنی کمزور تو پھر یہ اس پر Aggression کرتا ہے۔ یہ جو Aggressiveness ہے یہ انسان کے اندر ہے جس کا نتیجہ تخریب ہے اس طرح سرگذشتِ آدم دراصل نفسِ انسانی کا ہی ترجمان ہے۔ Aggression کی حالت میں انسان توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ انسانوں کو، باہر کی دنیا کو توڑتا پھوڑتا ہے تو پھر خودکشی کر کے اپنے آپ کو بھی توڑتا ہے ابلیس اور شیطان مایوسی اور تشدّد، استیلاء و تغلب کا مسجمہ ہیں۔ اس ایگریشن کا نام Evil شر یا بدی رکھا ہے۔ ہر قسم کا بدی یا شر کی بنیاد Aggression پر ہوتی ہے۔ اس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ Aggression ہی ہوتا ہے اس کو انہوں نے Evil کہا ہے یہی بدی اور شر ہے جو انسان کے اندر آتا ہے یہ کیسے آتا ہے ان کے ہاں ایک تھیوری ہے کہ مایوسی ایگریشن کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ابلیس اور شیطان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

انہوں نے حیوانات پر ریسرچ کر کے وہاں سے انسانوں پر آئے کہ اگر آپ راستہ کھلا رکھیں تو وہ کبھی بھی Aggression پر نہیں آتا۔ وہ اس وقت ایگریشن کا راستہ اختیار کرتا ہے جب آپ تشدد کے ذریعہ اس پر امیدوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ ایسی مایوسی کو قرآن کفر قرار دیتا تو یہ سارا قصہ منتج ہوا Aggression اور Frustration پر۔ قرآن نے کہا لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ

674
(7:49) تو یہ باہر کے خطرات سے محفوظ رہنے کیلئے فرمایا۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴿۳۵﴾(7:35)۔ اور اندرونی طور پر کوئی خطرات نہیں ہونگے۔ Frustion نہیں ہوگی۔ اس معاشرہ میں کوئی شخص بھی مجبور فلہٰذا مایوس نہیں ہوگا۔ اس پر ابلیس کو للکار کر کہا۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ط (17:65) تمہاری کوئی چال ان پر نہیں چل سکتی۔

معقول جواب کا فقدان اور بہانہ سازی:

ابلیس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے Reason دیا تھا کہ اسے طین سے جبکہ مجھے نار سے پیدا کیا ہے یہ جو raional اور Irrational کی بات ہوتی ہے چونکہ Irrational تو کوئی معقول بات نہیں ہوتی۔ بظاہر وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوتا ہے کہ میں raional گفتگو کر رہا ہوں۔ یہ دراصل ابلیس اندر سے اپنے آپ کو Justify کر رہا ہے۔ قرآن نے کہا کہ وہ دراصل اپنے جذبات کو مطمئن کر رہا تھا۔ جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کی Irrational کا منطقی جواب ہے۔ پھر اس Reason دینے کے بعد کہا میں اس کے سامنے کیوں جھکوں۔ میں اونچا ہوں اور یہ نیچا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ صاحب! میں نے کیا کیا ہے؟ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے تو یہ تو آپس میں متضاد باتیں ہوگئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو Irrational کرتے ہیں کہ جب وہ نتیجہ ان کے سامنے آجاتا ہے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تو اس طرح ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ یہ اپنے آپ کو مجبور ظاہر کریں۔ کیونکہ پھر بچنے کا راستہ نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ اپنے آپ کو مجبور ظاہر کریں۔ اصل میں اس کا پہلا Reason تھا وہ Irrational تھا۔ کیونکہ معقول Reason والا آخر تک یہ نہیں کہتا کہ صاحب بات یوں نہیں تھی کیونکہ اس کی بات معقولیت کے مقام پر پوری اترتی چلی جاتی ہے۔

مسئلہ تقدیر اور اقبال:

یہ مجبور محض کہنا تو ابلیسیت ہے۔ تو نے مجھ سے یہ کچھ کرایا آدم نے یہ طریق اختیار نہیں کیا کہ پہلے Reason دے اور پھر اسے Justify کرے اور اپنے ایکشن کا جواز دے کہ میں نے یہ اس لئے کیا ہے اور جب بات نہ بنے تو کہے کہ میں تو مجبور ہو گیا تھا یہ تو ابلیسیت ہے۔

تقدیر، ابلیس و یزداں (ضربِ کلیم):

(ابلیس)

اے خدائے کن فکاں! مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ وہ زندانی نزدیک و دور و زیرو زود
(وہ تو مجبور محض تھا تو وہ باعث ذلت تھا۔ میں اسے اپنا مدمقابل سمجھ کر اس سے یہ دشمنی کرتا)
حرف استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں، مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

(یعنی میں تو مجبور تھا یہ سجدہ کرنا تو تیری مشیت میں ہی نہیں تھا) یزداں کہتا ہے۔

کب کھلا تجھ پر یہ راز
انکار سے پہلے کہ بعد

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر یزداں نے کہا)

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے
کہتا ہے تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

یعنی پہلے یاد نہیں تھا کہ میں مجبور محض ہوں۔ جب اس کے نتائج سامنے آئے تو تب یہ راز کھلا کہ میں تو مجبور محض ہوں۔ یہ عقیدہ جبریّت اسلام میں اس سے تمام لٹریچر بھرا ہوا ہے۔

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلہ سوزاں کو خود کہتا ہے دود!

(خود کہا کہ میں تو آگ سے پیدا کیا گیا ہوں۔ اپنے شعلہ سوزاں کو دھواں کہہ رہا ہے جب انکار تو اپنے ارادے سے کرتا ہے تو نتائج سامنے دیکھ کر ان کو Justify نہیں کر سکتا تو عافیت اس جبریّت کے عقیدے میں ڈھونڈتا ہے یہ ہے وہ چیز جو عیسائیّت نے اختیار کی تھی۔

Erich Fromn ایرک فرام (1900-1980ء) کی تحقیق:

عقیدۂ جبریّت سارے یورپ کے اندر پھیل گیا ہے ان کی تمام تحقیقات نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا کہ انسان بھی مجبور محض اور مجبور محض ہو کر رہ گیا۔ انہی کے ہاں یہ علم آگے بڑھا ایک اور سکول آف تھاٹ پیدا ہوا اور اس پر ریسرچز ہو رہی ہیں۔ ان میں سرفہرست امریکہ کا ایک نامور اور عظیم سائیکالوجسٹ ایرک فرام ہے اس کی Latest کتاب (1977) میں منظر پر آئی۔ کہ انسان تخریب پر کیوں اتر آتا ہے؟ یہ ایک بڑی کتاب ہے آخر میں وہ لکھتا ہے۔

سوال تو یہ تھا کہ انسان فطرتاً بد ہے اور اس کے مقابل دوسرے کہتے تھے کہ نہیں فطرتاً نیک واقع ہوا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انسان کلین سلیٹ لیکر پیدا ہوتا ہے اسے اختیار و ارادہ دیدیا گیا ہے نہ فطرت کی کوئی قوّت اس سے بالا ہے جس کے یہ تابع آئے اور نہ اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کے اوپر اپنے ایمانی قوّت کی رو سے یہ غالب نہ آ سکے۔ یہ عبادی ہے یہ ہے ایک زبردست قوّت اس کے اندر، مجھ پر ایمان لاکر عبودیت اختیار کرنے کی قوّت اس سے یہ بااختیار رہتا ہے۔ مجبور نہیں ہوتا۔ ایرک فرام کہتا ہے۔

The statement Human natrue is evil is not a bit more realistic than the statement Human

674 nature is good.

یہ دونوں بیانات یکساں ہیں ان میں کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔

آگے کہتا ہے کہ یہ عقیدہ پھیلانا کہ انسان فطرتاً بد ہے بڑا آسان ہے۔ کیونکہ اس بناء پر اسے اپنے جرائم کے متعلق ایک وجہ جواز بنی بنائی مل جاتی ہے کہ انسان تو مجبور محض ہے۔ اس کی فطرت کے اندر یہ لکھی ہوئی ہے۔ اس طرح اور اس حالت میں ہوتا کچھ نہیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو مجبور کہتا ہے اگر باطل کا نتیجہ ہمیشہ تخریب ہوتا ہے تو پھر تخریب ہمیشہ مایوسی کو جنم دیتی ہے۔

اس سے جو مایوسی پیدا ہوتی ہے یہ بجائے خویش تخریب ہے۔

باطل کے تو معنی ہی تخریب ہے جس طرح ہر باطل تخریب ہے اور ہر تخریب میں مایوسی کا عقیدہ جبریّت کا عقیدہ پھیلایا جائے۔ یہ چونکہ Untruth ہے اس لئے destructiveness ہے۔

It discourages and Confuses

ایسی سوچ حوصلوں کو بھی پست کرتی ہے پھر سوچنے کی قوّت میں گجلا پن اور کنفیوژن پیدا ہو جاتا ہے۔ مایوسیاں عام کرنا، پھر اس کیلئے The false قسم کے مسیحوں کو معمور من اللہ اتارنا یہ سب کچھ کرنا، اس سے جو Falsehood پھیلتی ہے جو Untruth پھیلتا ہے وہ بجائے خویش تباہی ہے انسانی جرأتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ حوصلے پست اور پھر خود کچھ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہتی یہ ہے وہ جو ابلیس کرتا ہے۔

قرآن نے ایک ہی فقرے میں زندگی کی بساط الٹ کر رکھ دی کہ خارج کی کوئی قوّت ایسی نہیں جو تجھے مجبور کر دے۔ بلکہ تیری نفسیاتی قوّت اس پر غالب ہے ابلیس ایسی قوّت نہیں کہ انسان پر غالب آجائے۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ط (17:65)

ایک ہی فقرہ میں دنیائے مذہب اور دنیائے فکر دونوں کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ خارجی کائنات میں بھی اور نفسیاتی دنیا کے اندر بھی۔

ابلیس و آدم کی کشمکش:

یہ جو ابلیس و آدم کی کشمکش ہے یہ دراصل انسان کے اندر کی جبر اور اختیار و ارادہ کی کشمکش ہے یہ عقیدے کی چیز ہے جس میں یہ کشمکش ہے۔ ملخص یہ ہے کہ جا جو جی میں آئے کر لے قیامت تک چھوٹ ہے۔ لیکن جب اس میں ایمان کی قوّت آتی ہے تو ابلیس کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿٦٥﴾ (17:65)۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا ط (2:256) ایسا سہارا جو ٹرخ تک نہیں کرتا۔

توکّل کا مفہوم وَ کَفٰی بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾ (17:65)

قوانینِ خداوندی کا اتباع ایسا ہے کہ جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے:

ہمارے ہاں ''توکّل'' اپنے اصل معنی کھو چکا ہے توکّل اللہ سے مراد جب کوئی اور طریقہ، تدبیر، سہارا نہ اختیار کیا جائے تو اس کے بعد اسے کہتے ہیں توکّل پھر یہ فقر اور درویش کی انتہائی شان بتاتے ہیں۔ یہ سب سے اچھا کھاتے پیتے ہیں دوسرے کماتے ہیں اور یہ عیش کرتے ہیں۔ اس کا نام توکّل علی اللہ رکھا ہوا ہے۔ ذرا ان مریدوں، خدام کا آنا جانا بند کر دیں پھر حضرت صاحب سے پوچھئے کہ وہ توکّل علی اللہ پھر چھپّر پھاڑ کے کیسے دیتا ہے کہ خدا نے رزق دینا ہوتا تو خود دیتا جواب دیا گیا کہ ان سے کہو کہ وہ چھپّر پھاڑ کے خود نہیں دیا کرتا۔ عالم انسانیت میں، عالم اسباب سے اسباب اور وسائل کے ذریعہ دیتا ہے اور یہ ہیں کہ انہوں نے ہر قسم کے وسیلہ اور سبب کو توڑنے کا نام توکّل علی اللہ رکھا ہوا ہے جبکہ اس سے مراد قوانینِ خداوندی پر کامل بھروسہ کہ وہ دغا نہیں دیا کرتے۔

توکّل کے سلسلے میں خدا کے قانون کی ایک محسوس مثال:

قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کا قانون بھروسے کے قابل ہے تو اسے کیسے سمجھایا جائے۔ وہی انداز کہ ہر دعویٰ کو جو محسوس اور مرئی نہ ہو تو اسے محسوس مثال سے سمجھاتا ہے۔ رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾ (17:66) دیکھو ان بڑی بڑی کشتیوں کو کیسے اتنا سامان لاد کر سمندر میں تیرتی جاتی ہے تاکہ تم ان کے ذریعہ تلاش معاش کرسکو۔ یہ قانون کس قدر قابل بھروسہ ہے اور تمہارے لئے نشو ونما کا موجب۔ ایک باریک سوئی پانی میں ڈالو تو ڈوب جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہزاروں ٹن لوہے کا جہاز اتنا لاکھوں ٹن سامان لئے ہوئے پانی کے اوپر تیزی سے منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ قانون یہ ہے اگر یہ اتنا پانی Displaced کردے تو اس کی حد تک تیرتا رہے گا۔ وہی پانی جو ڈوبنے کا ذریعہ تھا اس کے قانون پر چلنے سے زندگی کا سہارا ہوگی۔ اگر اس کے قانون کی خلاف ورزی کروگے تو جہاز ڈوب جائے گا۔ اگر کشتی میں گنجائش سے زیادہ آدمی بٹھاؤ گے تو وہ ڈوب جائیگی۔ یہ قانون شکنی کا نتیجہ ہوتا ہے اگر کشتی اور اس کے وزن کو اس مقرر کردہ حد تک رکھو گے تو وہ کبھی نہیں ڈوبتی۔ اسے توکّل کہتے ہیں۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ (17:67) جب وہ کشتی مصیبت میں گھرتی ہے تو اس وقت

صرف وہی تدابیر کام آتی ہے جو قانون خداوندی کے مطابق اختیار کی جائیں تو ان قوانین کے خلاف کسی اور قوت کی تدبیر جسے تم حالت سکون میں پکارتے ہو کارساز نہیں ہوسکتی۔ پھر وہ گیارھویں والے کی دعائیں اسے نہیں بچا سکتیں۔ پھر خدا کے علاوہ سب کچھ بھول جاتے ہو۔ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ط (17:67) پھر جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر اس کے قوانین کو بھول جاتے ہو۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾ (17:67) یہ حقیقت ہے کہ انسان وحی کو چھوڑ کر جذبات پر چلے تو بڑا ناسپاس گزار ہوتا ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا (17:68) اب کشتی ساحل پر لگی تو خشکی پر آ گئے پھر قوانین خداوندی کو بھول گئے حالانکہ وہ ساری کائنات کو محیط نہیں کیا وہی طوفان جو سمندر میں آ کر تمہیں خطرے سے دو چار کر گیا تھا کیا خشکی میں ایسا طوفان نہیں آ سکتا۔ پھر آندھی آ کر اس میں کنکر آ کر تمہیں دھنسا دے۔ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾ (17:68) پھر خدا کے قانون کے علاوہ کوئی بھی تمہیں نہیں بچا سکتا۔ یعنی کبھی اسباب کا ذکر کرتا ہے اور کبھی قوانین کے تابع خود خدا کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ہلاک کر دے گا۔ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ (17:69) کیا دوبارہ ایسا نہیں ہوسکتا کیا سمندر کے طوفان سے نکل کر تم ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گئے ہو تم کیا دوبارہ سمندر کی طرف نہیں جاؤ گے۔ وہاں تو یہ کشتی والے بار بار جاتے ہیں تو پھر طوفان آ کر تمہاری کشتی کو توڑ کر رکھ دے اور تم ڈوب جاؤ۔ اس لئے کہ وہاں تم نے اس کی قانون کی کسی شق کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس لئے ساحل پر آئے اس کے قوانین کی حفاظت کرو۔ مگر اس کے پرزوں کو بھی دیکھو کہ کوئی چیز نظر انداز تو نہیں ہوگئی۔ اس لئے تو ان ریلوے، جہازوں میں ایگزامنر روانگی سے قبل ایک ایک چیز چیک کر کے پھر سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں۔ جو بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کرے گا وہ ڈوب جائے گا۔ اگر خشکی میں آ کر ٹھیک کر لو گے تو پھر یہ سمندر میں بھی جا کر درست رہے گی۔ یعنی جب تم بظاہر حفاظت میں ہو، کوئی خطرہ بھی نہ ہو تو اس وقت بھی اس کا خیال کرو۔

آج کی دیکھ بھال کل کی حفاظت کی ضامن ہے:

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (2:132) زندگی کے ہر سانس، موت تک ان قوانین کے سامنے جھکے رہو۔ شفا کے بعد آدمی بھول جاتا ہے اور یہ احتیاط کرتا ہے تو بیماری کا حملہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہا کہ پانی سے آنے کے بعد خشکی میں بھی ان قوانین کا خیال رکھو کیونکہ دوبارہ بھی تم نے پانیوں میں جانا ہے۔ اس کے قوانین زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہیں اسلئے حالت امن میں بھی ان کو نظر انداز نہ کرو۔ اگر دوبارہ وہی صورتحال پیش آ گئی تو پہلے سے بھی زیادہ شدید حملہ ہوسکتا ہے۔

انسان کا طبعی شبہ ہو یا انسانیّت کا، دونوں قانونِ خداوندی کے محتاج ہیں

ہوسکتا ہے تم اسی اِبتلاء میں دوبارہ جاؤ پھر وہی صورتحال ہو جائے۔ یہاں وہ لفظ آیا ہے۔فَیُغۡرِقَكُمۡ بِمَا كَفَرۡتُمۡ ۙ (17:69) کفر سے مراد کشتی یا سواری کے متعلق یہ نہ دیکھنا کہ قانون طبعی کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ کفر ہے۔ زندگی کا طبعی شعبہ ہو یا انسانیّت سے متعلق کوئی شعبہ، جہاں بھی اس کے قوانین ہے اگر اُن سے بے اعتنائی برتی وہ کفر ہوگا۔ سرکشی برتی تو وہ انتہا درجے کا کفر ہے تو پھر یہ ڈوب جائے گی۔ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَكُمۡ عَلَيۡنَا بِهٖ تَبِيۡعًا ﴿۶۹﴾ (17:69) تو اگر خلاف ورزی کی تو کشتی ڈوب جائے گی تو پھر کوئی ہمارے خلاف پیروی نہیں کر سکے گا۔یعنی پھر ان قوانین کے خلاف اپیل نہیں ہوسکتی کسی عدالت میں بھی۔

انسانی بلوغت کا اعلان:

پہلا انقلاب کہ اس نے انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کیا۔ حیوانوں کے اندر الہام ہوتا ہے ان کو غلط اور صحیح کی تمیز دی ہوئی ہے انسانوں میں یہ چیز نہیں ہے۔ ان کو یہ چیز وحی کی شکل انبیاء کے ذریعہ باہر سے ملتی تھی۔ جو رسول ﷺ تک آ کر ختم ہوگئی اس کے بعد دوسرا انقلاب عظیم یہ ہے کہ اس غلط اور صحیح کی تمیز کیلئے شخصیتوں پر انحصار ہوتا تھا وحی ہوتی نہیں تھی۔ جو اسے صحیح راستہ پر چلائے۔ چنانچہ اسے صحیح راستہ پر چارٹ دیکر انسان کو درمیان سے نکال دیا گیا۔ کیونکہ اب یہ بچہ جوان ہو گیا ہے اب وہ باپ کی انگلی پکڑ کر نہیں چلے گا۔ اب جوان ہو کر اسے انگلی پکڑنے میں شرم محسوس ہوتی ہے یہ تو انسانیّت کی توہین ہے کہ بلوغت کے بعد بھی اس کو بچہ سمجھا جائے۔ یہ تو طفلانہ پن ہے۔ عقل وفکر کی رو سے فیصلہ کرنے میں بڑی کاوش درکار ہے۔ بچہ میں تو اس کی استعداد نہیں ہوتی اور دوسرا اس میں Dependability ہوتی ہے۔

اب جوان ہو کر اپنے فیصلے آپ کرتا ہے یہ ہے وہ ذمہ داری جس سے انسان بھاگتا ہے۔ دوراہے پر کھڑا ہو کر غلط اور صحیح راستہ کا فیصلہ کرنا، بڑی ذمہ داری چاہتا ہے۔ یہ Sign post چاہتا ہے یہ چیز کہ ایک رہرو کو ساتھ لیا جائے جو اسے یہاں سے وہاں لئے چلا جائے، دراصل دوسرے پر ذمہ داری ڈالنا ہے۔وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَهُمُ الۡهُدٰٓى اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۴﴾ قُلۡ لَّوۡ كَانَ فِى الۡاَرۡضِ مَلٰٓـئِكَةٌ يَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَـئِنِّيۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۵﴾ (17:94-95) اب انسان

اس بلوغت کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہے تو اس نے آپ پر ذمہ داریاں ڈال دیں۔ زندگی کے رہنما اصول دیدیئے لیکن تفصیلات نہیں دیں۔ تفصیلات تو بچوں کیلئے چاہئیں۔ بالغ کیلئے نہیں چاہئیں۔ انسان کو بچوں کی سطح پر رکھنا مذہبی پیشوائیت کے فائدے میں ہے۔ وہ ہر بات میں ان کے محتاج رہیں۔ ہم تو ھُدًی دیتے رہے مگر یہ کرامات مانگتا رہا ہم تو اس کی عقل وفکر کو اپیل کرتے رہے مگر یہ اپنے جذبات کی تسکین چاہتا رہا۔

❁❁❁

مومن انتہا کی فکر میں ہوتا ہے ابتداء کی نہیں

آج سے چودہ صدیاں قبل ایک بدو کیلئے بھی یہ دلیل اور آج سب سے بڑے سائنٹسٹ کیلئے بھی یہ دلیل۔ کیا خوب ہے! آج کا سائنسدان بھی اس سے انکار نہیں کرتا کیونکہ وہ اسے تسلیم کرتا ہے کہ یہ کائنات Nothingness سے Being میں آئی ہے۔ یہ سائنسدان ابتدائے آفرینش کی بات اس لئے مانتے ہیں کہ اس سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور انتہا کی بات سے اس لئے انکار کرتے ہیں کہ اصل بات تو ذمہ داری کی ہے۔ اس سے یہ ساری ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں ؎

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتداء کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں، کہ میری انتہا کیا ہے

فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾ (17:99) کچھ تو یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں کی باتوں سے نفرت اور انکار بڑھتا ہے ان کے اس فعل کی بناء پر تو کہا کہ ظلم کی بناء پر پکڑے جائیں گے ان کا انکار، ضد، نفرت اور ہٹ دھرمی انہیں یہاں آنے تک نہیں دیتی ورنہ عقل وفکر کی بناء پر تو بڑے سے بڑا سائنسدان بھی یہاں آ کے مجبور ہو کر اسے تسلیم کرے گا۔

❁❁❁

خانقاہیّت اور اصحٰبُ الرَّقِیۡم، اصحب الکھف جونظامِ ربوبیّت کا علم لے کراٹھے

یہ چندنوجوانوں کی جماعت تھی جو غار میں چھپ گئے تھے۔ دراصل یہ عیسائیّت کے مسلک خانقاہیت کی تردید ہے یہ خانقاہیت یہودیوں میں تو آگئی تھی لیکن اس شدومد سے نہیں آئی تھی۔ جتنی یہ عیسائیّت میں آئی۔ انہوں نے یہ رنگ بدھ مت سے حاصل کیا۔ ترک دنیا کیلئے مسلک خانقاہیت اختیار کیا۔ یہ خانقاہیں عموماً غاروں میں ہوتی تھیں۔ خانقاہیت کا تصوّر خدا کی حمدیت کے تصوّر کے برعکس ہے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ (18:1) قرآن نے حمدیت سے بات ہی اس لئے شروع کی ہے کہ اگر ترک دنیا یا خانقاہیت کا مسلک اختیار کیا جائے۔ تو خدا کی حمدیت کا تصوّر ختم ہوجاتا ہے۔ حمدیت اور تعریف میں فرق ہے۔ حمدیت سے مراد کسی عظیم خالق کے نادر شاہکار پر غور وفکر کے بعد جو بے ساختہ تحسین کے الفاظ زبان پر آجائیں۔ غور وفکر اس کیلئے ضروری ہے تاکہ بے ساختہ کہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ (3:191) اگر یہ ساری کائنات، تخلیق اور حسن وزیبائش قابل نفرت اور ترک کردینے کے لائق ہیں۔ تو وہ کب خدا کی حمدیت کا قائل ہوگا۔ یہ بات حمدیت سے شروع کرنا تو اس مسلک کی نقیض ہے۔ قرآن تو انسان کو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، کائنات کی تخلیق پر غور وفکر کی تاکید کرتا ہے۔ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ۚۙ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ (3:190-191) اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ اور جس مسلک میں یہاں کی ہر شے کو آلائش و قابل نفرت قرار دیا جائے تو خالق کے متعلق حمدیت کے جذبات دل میں کیسے ابھر سکتے ہیں؟ اب وہی حمدیت اس کتاب کی وجہ سے آئی اور وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾ (18:1) اس میں کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ تصوّف کے خلاف بات آگئی۔ یعنی باطنی علم میں ہر شے پیچ وخم کی ہوتی ہے۔ راز، سرِّ مستور۔ صدری علم، علم لدنی۔ جو کسی کو بتانے کیلئے نہیں ہوتے۔ حالانکہ کہا گیا کہ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَہٗ ؕ (5:67) جبکہ باطنی علم تو صرف ان خواص کیلئے ہے۔

حسنِ کائنات:

ایک ہی مثال سے ساری بات واضح کر دی ہے۔ اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّہَا لِنَبۡلُوَہُمۡ اَیُّہُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ (18:7) ہم نے تو یہ حسن ساری کائنات میں بکھیر دیا ہے۔ زیبائش وآرائش کی چیزیں، تمام چیزیں روئے زمین پر وجہ زینت بنا دیا کہ ان کے استعمال سے کون توازن اور اعتدال سے کام لیتا ہے؟ کون ہے جو اسے حسن کارانہ انداز سے استعمال کرتا

ہے؟ ترک دنیا کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے۔ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ⑧ (18:8) اگر تم اپنی کھیتوں کی نگہداشت نہیں کرو گے تو کچھ عرصہ بعد وہ ساری کی ساری چٹیل میدان رہ جاتی ہے۔ سب کچھ چورا چورا ہو جاتا ہے۔ پیداواری صلاحیت ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔ خانقاہیت میں تو یہی ہوتا ہے جس میں ساری صلاحیتیں خشک ہو کر رہ جاتی ہے۔ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ (7:32)

شام میں پہلی خانقاہ بنانے والے کا نام ہی عثمان تھا:

ہمارے ہاں تصوّف اور خانقاہ کی بنیاد عثمان نامی شخص نے رکھی تھی۔ وہ عیسائیت سے مسلمان ہوا تھا۔ یہی فلسطین اور شام کا علاقہ خانقاہوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے 153ھ میں بنیاد رکھی تھی۔ یہ رقیم نبطی حکومت کا دار الخلافہ تھا۔ جب شام کو رومیوں نے فتح کیا تو انہوں نے اس شہر کا نام Petra رکھا۔ عربوں نے اسے ''بطرہ'' کر دیا۔ خود رومنز بھی عیسائیت کے شدید مخالف تھے۔ ان کا بادشاہ دقیانوس یہ تیسری صدی کا زمانہ ہے۔ چونکہ یہ رومن بڑے سخت گیر تھے۔ تو ان نوجوانوں نے اس سخت گیر لوگوں سے بچاؤ کیلئے غار میں پناہ لی تھی۔ بعد میں جب رومن عیسائی ہو گئے۔ تو اس وقت عیسائیت کا اصل دین ختم ہو چکا تھا۔ اس دین کا جو شروع ہی سے بیڑا غرق کر دیا تھا۔ یہ یہودی سے عیسائی ہوا تھا۔ عیسائیوں کے سب سے بڑے Saints ہیں جس طرح ہمارے ہاں Converts نے کچھ کم قیامت نہیں ڈھائی۔

یہ ابتدائی دور کے عیسائی نوجوان جنہوں نے پیشوائیت اور رومن امپائر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ یہ دین عیسیٰؑ والے تھے۔ مذہب عیسائیت والے نہیں تھے۔ ان کی سخت مخالفت ہوئی تو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تا کہ پوری طرح سے مقصد کے حصول کیلئے تیاری کریں۔ یہ اس جماعت کے سرکردہ لیڈر تھے جو زیر زمین چلے گئے تھے ان کا اعلان یہ تھا۔ فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ⑭ (18:14)

اعلان کہ زمین کی ملکیت کی اتھارٹی کسی کے پاس نہیں:

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ (18:15) یہ اتھارٹی نہیں ہے کہ زمین ان کی ملکیت میں ہے۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ⑮ (18:15) ایسا کہنا تو خدا پر جھوٹ منسوب کرنا ہے جو سب سے بڑا ظلم ہے۔

ہجرت کا مقصد:

اب چونکہ مقاصد الگ الگ ہو گئے۔ تو تصادم لازمی ہو گیا یہ چھوٹے پیمانے پر غار کی ہجرت وہی ہے جو بڑے پیمانے پر غار کی ہجرت ہے۔ یہ فرار Escapism نہیں ہے۔ اپنے پروگرام کی تکمیل کیلئے نیا طریقہ کار ہے اور جب ان کی جماعت کامیابی سے ہم کنار ہو گئی تو ان کی وفات ہو گئی۔ پھر مذہب اور خانقاہیت کو موقعہ مل گیا۔ پھر یہ مجاور پرست آ گئے قبریں بنا دیں اور ان کی حیات کے کارناموں میں رنگ آمیزیاں کر کے ان کی کرامات بتانے لگے۔ پھر آپس میں ان کی یادگار پر تنازعہ شروع کر دیا۔

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ㉑ (18:21) اس کے بعد قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ (18:22)

اصل سوال تو عمل کا ہے۔ پیغام کا ہے، نہ کہ تعداد کا:

فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ (18:22) تم بھی ان کی تعداد کے جھگڑے میں نہ پڑنا بجز اصل بات کے کہ ان کا پیغام کیا تھا جو ظاہر ہے۔ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ (17:22) اب تحقیقات نہ شروع کر دینا ان کی تعداد کے بارے میں۔ یہ لوگ تو نظام ربوبیّت کے علمبردار تھے اور اس انقلاب کے داعی بن کر خطرات کو مول لیا۔ اس لئے قرآن نے ان کو اتنا بلند مقام دیکر ان کی سرگذشت کی اصل حقیقت کے ساتھ محفوظ کر لیا اور داستان سے کسی نتیجہ تک پہنچانا مقصود ہے۔ کہا یہ تو ماضی کے قصے ہیں۔ یقینی طور پر تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اصل واقعہ تو تحقیقات کے بعد پتہ چلے گا۔ پھر یہ مجاور ان مزاروں پر بیٹھ کر قسمت کا حال بتاتے ہیں کہا۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ (18:23) انسان یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ مستقبل میں کیا کرے گا جب تک قانون خداوندی کے مطابق جو شرائط عناصر اور جزویات مقرر کی ہیں وہ پوری ہو جائیں تو یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔ یہ قانون مشیت ہے۔ ہاں یہ کہو کہ اگر یہ قانون خداوندی کے مطابق ہوا تو یقیناً ہو کر رہے گا۔ آگے کہا۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ (18:24) (اگر وہ تمام سامان قانون مشیت پر جو مقرر کیا ہے تو یہ ہو جائے گا) اگر بالفرض ان میں سے کوئی ایسی بات ہے جو تم بھول گئے ہو تو اسے یاد کر لو۔ تو پھر یہ پورا ہو جائے گا۔ اگر ان اسباب میں سے کوئی کڑی بھول جائے تو پھر اس کڑی، وجہ کو یاد کر لو۔ ہمت ہار کر مت بیٹھ جاؤ۔ اگر یوں متعلقہ کڑیوں کو ایک ایک کر کے سامنے رکھو گے تو منزل سے قریب تر راستہ مل سکتا ہے۔ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ (18:24) تو کڑی یاد آنے پر اور عمل کرنے کے بعد خدا پھر سے تمہیں کامیابی سے قریب تر (لِاَقْرَبَ) کر دے گا۔ یعنی دوبارہ پورا کر لو تو کامیابی سے قریب تر ہو جاؤ گے۔''

اس کے بعد وہی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ (18:25) یہ مجاور بلا علم قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔ پہلے کوئی کہتا تھے۔ تین تھی، چار تھے اور پانچواں کتا ان کا۔ یا وہ غار میں کتنا عرصہ رہے کوئی کہتا ہے کہ تین سو سال تک، کوئی زیادہ محقق بنتا ہے تو کہتا کہ تین سو نو سال تک، ہوسکتا ہے اس قسم کے سوالات تم سے بھی کریں۔ اے رسول ﷺ۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (18:26) یہ کوئی ایسی اہمیّت والی بات نہیں ہے اور نہ مجھے علم ہے کہ اس کی تحقیقات کرتا پھروں۔ وہ تو کائنات کی ساری چیزوں کے متعلق علم رکھتا ہے۔

اس سرگذشت کا اصل مقصد:

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ۫ وَّلَا يُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (18:26) خدا کی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کیا جائے گا۔ یہ دعویٰ وہ لیکر اٹھے جو اس کے خلاف اٹھے انہوں نے شکست کھائی اور یہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ کتنے تھے ساتھ کتا تھا اور کتنا عرصہ رہے۔ سوال یہ نہیں ہے ان کو یہ بتاؤ کہ وہ کیا دعوت لے کر اٹھے تھے۔ پھر اس کا انجام کیا ہوا۔

عبادت کا مفہوم ہی حقِ حکومت ہے
جرأت کا دوسرا نام ہی اعترافِ حقیقت ہے

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (18:26) حکومت اور اقدار میں۔وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ (18:110) قرآن خود اپنے معنی بیان کرتا ہے۔ یہاں ''عبادت'' وہاں ''حکم'' ہے۔عبودیت سے مراد محکومیت اختیار کرنا اس کے معنی بندگی نہیں۔ پوجا پاٹ نہیں۔ایک ہی سورۃ میں دو آیتوں میں بات واضح کردی۔لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (18:27) جو ایسا نہیں کریں گے۔وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ (18:27) اس کے ساتھ اور قوانین بھی شریک کرلو۔کہیں بھی دنیا میں پناہ نہیں ملے گی۔

جرأت کا دوسرا نام ہی اعترافِ حقیقت ہے:

لفظ انشاءاللہ کا استعمال

یعنی ذمہ داری کو قبول کرنے کی بجائے خدا کی طرف لوٹا دینا یہ اعتراف شکست ہے کہ میں نے تو انشاءاللہ کہا تھا مگر نہیں ہوا۔ کیونکہ خدا نے نہیں چاہا تو نہیں ہوا۔ یہ چیز جس نے بھی کہی تھی اس کے اندر بڑی مکاری اور سازش تھی۔ وعدہ کرکے اسے خود پورا نہ کیا اور انشاءاللہ کی شرط لگا دی کہ چونکہ خدا کو منظور نہیں تھا۔اس لئے نہیں ہوا۔تو ہر وہ چیز جس میں ذمہ داری قبول نہیں کی جاسکتی تو اس میں اصلاح کا امکان نہیں ہوتا۔ یہ یونہی مذاق کی بات نہیں ہے کہ انشاءاللہ یہ ٹال دیا کہ خدا کو منظور نہیں تھا۔اس لئے نہیں ہوا اس کے بعد تو یہ مسلّمات میں سے ہوگیا کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔کوئی ذمہ داری ہی نہ رہی۔ یہ ذمہ داری سے فرار کی راہیں ہیں یہ تو ابلیسیّت ہے جس کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ ہمیشہ کیلئے راندۂ درگاہ ہوگیا۔ جو کوتاہیوں کے بعد اعتراف کرے۔رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23)، میں ذمہ دار ہوں تو اس کی اصلاح ہوجاتی ہے۔سارا راز اس میں ہے کہ انسان اپنے فیصلوں کا خود ذمہ دار ہے اگر اعتراف کرے تو اصلاح ممکن، نہ کرے تو یہ چیز پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

جرأت کا دوسرا نام ہی اعترافِ حقیقت ہے:

سائیکالوجی کی رو سے اگر ایک غلط قدم اٹھے اور اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔تو پہلے تو وہ چیز Suppressed حالت میں ہوتی

ہے۔یعنی یہ اس کے شعور میں موجود ہوتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے اسے اعتراف کی جرأت نہیں ہوتی۔قرآن بھی یہی بات کرتا ہے کہ اس میں جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سے تمہاری جلد اصلاح ہو جائیگی۔جب یہ قرآن کی شہادتیں سایئکالوجی سے مل رہی ہیں۔ماہرین تحلیل نفسی کا خیال ہے کہ اگر کچھ عرصہ یونہی گزار دیا جائے تو Suppressed (اندر کی بات کو اندر ہی دبے رہنا دینا) تو اس سے وہ Repressed (خود اس دبی ہوئی بات کا مطیع) ہو جاتا ہے۔

انسان کی نفسیاتی کیفیّت اور توبہ:

یہ دبایا ہوا امواد نفس شعوریہ کی بجائے تحت الشّعور کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے۔اسے کہتے ہیں ''کہ آدمی بھول گیا'' تو اس کی اصلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔وہ مواد تو آپ کو اب یاد نہیں رہا۔یہی مواد ہے جو بھول جاتا ہے۔اس طرح سے وہ غلطی یاد نہیں رہتی۔کیونکہ وہ نفس غیر شعوریہ میں چلی جاتی ہے۔وہاں وہ دباؤ کی حالت میں Repressed میں رہتی ہے۔یعنی نفسیات کی زبان میں Repressed رہ گئی ہمارے الفاظ میں وہ یاد نہیں رہی۔اس کا نقش زائل تو نہیں ہو جاتا۔وہ رہتی ہے اس کا اثر زائل نہیں ہوتا ہے۔یہ جمع شدہ نقوش ہیں جو باہر ابھریں گے۔جو اعمالنامہ بن کر سامنے آئیں گے آج علم انسانی یہاں تک آ گیا ہے۔ان ماہرین کے نزدیک انسان کا ہر خیال Suppressed تک کو بدل سکتا ہے۔آپ کو معلوم ہے جو قرآن نے کہا کہ لغزش ہو تو فوراً توبہ کی طرف آ جاؤ۔کیونکہ اس طرح اس کی توبہ بڑی جلدی قبول ہوتی ہے۔یہ قبولیت کیا چیز ہے اور یہ توبہ کیا چیز ہے قرآن نے کیوں کہاں کہ فوراً اس کی طرف آ جاؤ فوراً۔کیونکہ جب تک یہ Supressed حالت میں ہے تو اس کا ازالہ آسان ہے۔لیکن جب بات آگے چلی جائے اور Reppressed ہو جائے اور وہ احساس نفس غیر شعوریہ میں چلا جائے۔تو وہ نفس غیر شعوریہ کو ستا تا نہیں ہے۔یہ ہے گم گشتہ ہوئی وہ چیز۔اس کے بعد تو انسان ذمہ داری ہی نہیں لیتا اور ساری بات ذمہ داری لینے کی ہے۔

گہری سازش:

یہ ابتداً جن لوگوں کی تھیں انہوں نے جہالت کی بناء پر نہیں کی تھیں کیونکہ تاریخ کا بغور مطالبہ اس نتیجہ پر پہنچا تا ہے کہ ایسی باتیں کن حالات میں کی گئی تھیں سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ تصوّر کہاں سے آ گیا؟ کہ انشاءاللہ کے معنی اگر خدا نے چاہا ہو جائیں گے تو یہ ذمہ داری سے فرار ہے جو اختیار کی گئی ہے اور یہ دانستہ کی گئی ہے۔بعد میں یہ چیزیں جہالت کی بناء پر مروّج کر دی گئیں۔اب جہالت سے اگلا مرحلہ Indifference کا آ گیا اب محاورہ ہی ہو گیا ہاں بھئی میں آ ؤ نگا انشاءاللہ یہ بڑی گہری سازش تھی۔جس کا کردار پر گہرا اثر پڑتا ہے شاء کے معنی چاہا کر دیا۔پس اس چاہا والی بات نے ہر چیز کو الٹ کر رکھ دیا جبکہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

پہلے عمل بعد میں اجر

Responsibility and Right

حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (18:31)، وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا (18:29)

اجر ہمیشہ عمل سے مشروط ہوتا ہے:

''اجر'' کسی کام کا عمل کا فطری نتیجہ ہے۔ جنّت فی سبیل اللہ قطعاً نہیں ملتی

جنّت تیری پنہاں ہے، تیرے خون جگر میں

قرآن نے ہر جگہ کہا ہے۔ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ (29:58) لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ (18:30) یہ چیز اور مسئلہ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں انسان ذرا بھر کمی بیشی نہیں کرسکتا۔ ہم ڈنڈی نہیں مارتے۔ صحیح صحیح اجر دیتے ہیں۔

پہلے مزدوری بعد میں معاوضہ:

حقوق اور ذمہ داریاں قرآن کی رو سے اس وقت تک آپ کا کوئی حق متعین نہیں ہوتا۔ جب تک آپ ذمہ داری پوری نہ کرلیں ذمہ داری پوری کی تو اس سے آپ کا حق متعین ہوگا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) پہلے ہے اس کے بعد ہے۔ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ (1:4) قوانین کی اطاعت کے بعد، ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد اسے حق حاصل ہے کہ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾۔ اب ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ جس نے دن بھر کام ہی نہ کیا ہو تو اسے شام کو دھکوں کے علاوہ مزدوری تو نہیں مل سکتی۔ تو بات یہ ہوئی کہ ہر پوری کی گئی ذمہ داری ایک Right کو متعین کرتی ہے۔ یہ ساری دنیا میں جو فساد ہے کہ ذمہ داری اور حق میں تعلق متعین نہیں ہو رہا ہے ہر ایک کو حقوق، حقوق کا سکھایا جاتا ہے۔ ذمہ داری کا سبق کہیں بھی نہیں ہے۔ نتیجہ فساد ہے پہلے ذمہ داری پوری کرو پھر حق کا تعین ہوجاتا ہے یہ ہے قرآن کا سنہرا اصول جو فطری طور پر متعین ہوجاتا ہے۔ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ (18:30) اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ (18:31) نعمائے خداوندی۔ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ (18:31) ہوکر بلندیاں اور ارتقاء کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر اقدار کے تحت ان نعماء کو استعمال نہ کیا جائے تو پھر یہی وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ (18:29) ہوجاتی ہے۔

اِفۡتِرَاقٌ۔ رَفَقَ۔ رَفِقٌ۔ ہر وہ چیز جس پر کہنی ٹیک کر اونچے اٹھیں یعنی یہ سہارا تمام نعمائے خداوندی مقصود بالذات نہیں ہیں یہ تو تمہاری ذات میں ارتقاء کا ذریعہ ہیں۔ ایک ہی لفظ میں قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ لاریب یہ خدا کا کلام ہے۔ جس نے مُرۡتَفَقًا ﴿۲۹﴾ (18:29) کا مفہوم سمجھ لیا۔ تو اس دن زندگی کا بھید کھل گیا۔ سب کچھ دینے کے بعد کہہ رہا ہے کہ ان نعماء کو مقصود بالذات سمجھ لینا۔ یہ تو کرسی کا وہ بازو ہے جس سے ٹیک دیکر تم کھڑے ہو سکتے ہو۔ یہ تو بلندی اور اوپر اٹھنے کا سہارا ہیں۔ ورنہ میٹیلرزم (مادیّت) کے اندر اٹھا ہوا انسان بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ یہ تو از حد ضروری چیزیں ہیں اس ایک آیت میں سب کچھ کہہ گیا ہے۔ اس سے آگے انسان کیا تصوّر کر سکتا ہے آپ کی خوشحال ترین سوسائٹی میں یہی کچھ ہوگا۔ یہی نعماء ہونگی۔ حریر و اطلس، چاندی کے برتن، مزین اور آراستہ سندیں اور عزت و وقار کے کنگن۔ یہ تمام نعماء کو اوپر اٹھنے کیلئے ہیں۔ مُرۡتَفَقًا ﴿۲۹﴾ (18:29)۔ اگر کرسی سے ٹیک لگا کر اٹھیں اور کرسی کا توازن بگڑ جائے تو یہی سہارا آپ کے گرنے کا اور موت کا سبب بن جائے۔ وَسَآءَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۲۹﴾ (18:29) جس کا توازن بگڑ جائے اس سہارے سے۔ یہی ارتفاقات کی چیز جو تمہارے اوپر اٹھنے کی چیز ہے اگر توازن بگڑ گیا۔ تو موت کا باعث ہو گی۔ حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۳۱﴾ (18:31) ایسا سہارا جس سے توازن قائم ہو جائے۔ خیر اور شر کے مسئلہ کو حل کر دیا۔ مادے کی تمام اشیاء، سامان زیست و آرائش و زیبائش کو وجہ لطافت بنا دیا ان تمام چیزوں کا مقصود ایک ہی لفظ میں بیان کر دیا۔ مُرۡتَفَقًا ﴿۳۱﴾ (18:31)۔ ان سہاروں میں کوئی فرق نہیں۔ فرق حَسُنَتۡ (18:31) اور وَسَآءَتۡ (18:29) کا ہے۔ اگر توازن صحیح ہے تو اوپر اٹھنے کا اور توازن بگڑ گیا تو یہی سہارا موت کا باعث ہے۔ ایک جنّت اور دوسرا جہنّم ہے۔

سہارے دونوں ہیں ایک اٹھانے کا اور دوسرا گرانے کا۔ زینت کی چیزوں، نعمائے خداوندی سے نفرت تو تصوّف نے دیا ہے اب بھلا اس کا قرآن سے کیا واسطہ!

محسوس مثال سے وَسَآءَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۲۹﴾ (18:29) کا مفہوم۔ آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ وَسَآءَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۲۹﴾ (18:29) کیسے بنتی ہے۔ وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ (18:32) بات اونچی تھی جھٹ اس کی سطح پر آ گیا۔ جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّحَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ وَّجَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ﴿۳۲﴾ (18:32) كِلۡتَا الۡجَـنَّتَيۡنِ اٰتَتۡ اُكُلَهَا وَلَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ شَيۡـًٔـا ۙ وَّفَجَّرۡنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ (18:33) وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ (18:34) فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ (18:34)۔ جو برابر کی سطح پر اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ اَنَا اَكۡثَرُ مِنۡكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ (18:34) خیال سے چل دیکھتا نہیں کہ میں کس قدر دولت مند اور مضبوط پارٹی والا آدمی ہوں۔ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ (18:35) باغات تو تھے مگر جو زیادتی یہ اپنے آپ کر چکا تھا یہ اس کی نگاہ میں نہیں تھی۔ کسی نے کہا ہوگا کہ حسن اخلاق تو خیال کرو۔ یہ سب کچھ تمہارا نہیں ہے بلکہ اس کا دیا ہوا ہے تکبر بری بات ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ سارے کا سارا تباہ و برباد ہو جائے۔

قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ ﴿۳۵﴾ (18:35) بڑا انتظام کر رکھا ہے یہ کبھی بھی تباہ نہیں ہو سکتا۔ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ (18:36) کہاں کا مکافات عمل اور کہاں کی بربادی اگر قیامت ہوئی۔ وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰى رَبِّىۡ لَاَجِدَنَّ خَيۡرًا مِّنۡهَا

مُنۡقَلَبًا ﴿۳۶﴾ (18:36) مجھے وہاں بھی بہتر ریٹرن ملے گا اور تم یہاں کی طرح وہاں بھی دھکے کھاؤ گے۔ دنیا بھی امیر کی اور جنّت بھی امیر کی۔ یہ عجیب چیز قرآن لایا ہے خدا کی جنّت تو اعمال سے ملتی ہے جبکہ مذہب کی جنّت تو بیچی جاتی ہے۔ حجّ کرآؤ تو سارے گناہ دھل گئے، مسجد بنادو، تو جنّت میں موتیوں کا محل، یہ تو صرف امیر لوگ ہی جنّت خرید سکتے ہیں اس لئے غریب بیچارہ خالی نفل پڑھ چھوڑتا ہے یہ ہے جہالت۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرۡتَ بِالَّذِىۡ خَلَقَكَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰٮكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰـكِنَّا۟ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ (18:37-38) کیا تو اس کے قانون مکافات سے انکاری ہے اور جو کچھ تمہیں حاصل ہے اس میں صرف تمہاری ہنر مندی کو دخل ہے اپنی حیثیت کو دیکھ ایک قطرہ آپ کو جیتا جاگتا انسان بنا کر اس نے ساری صلاحیتیں دیں۔ میں تو اسے سامان نشوونما دینے والا سمجھتا ہوں اور اس دینے میں کسی کو شریک نہیں کرسکتا یہ تو ساری اس کی دین ہے تو جیسا وہ کہے تو اس طرح اسے خرچ کرنا چاہئے۔ وَلَوۡلَاۤ اِذۡ دَخَلۡتَ جَنَّتَكَ قُلۡتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنۡ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنۡكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿ۚ۳۹﴾ (18:39) یہ تو سارا اس کے قوانین کے تحت ہو رہا ہے اور تو مجھے اس لئے حقّارت سے دیکھتا ہے کہ میرے پاس مال و دولت اور جھتہ نہیں ہے۔ یہ نفرت اور حقّارت اس لئے ہے کہ تو سمجھتا ہے کہ وہ میری صلاحیتوں کا ثمر ہے۔ حالانکہ تجھے یہ صلاحیتیں تو خدا نے دی ہیں اور اس کے قوانین سے تمہارے باغات اور کھیتیاں ثمر بار ہو گئیں۔

وَاُحِيۡطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصۡبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيۡهِ عَلٰى مَاۤ اَنۡفَقَ فِيۡهَا وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا (18:42) باطل مال آنے سے محنت ختم تو پھر اس طرح خبر گیری نہ کرنے سے تباہی آجاتی ہے فراوانی سے آجاتا ہے پھر یہ تمام باغات اجڑ کر رہ جاتے ہیں۔ وَيَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِىۡ لَمۡ اُشۡرِكۡ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ (18:42) کاش میں اس کی ربوبیّت میں کسی اور کو شریک نہ کرتا۔

وَلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ فِئَةٌ يَّـنۡصُرُوۡنَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنۡتَصِرًا ﴿ؕ۴۳﴾ (18:43) هُوَ خَيۡرٌ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ عُقۡبًا ﴿ع۴۴﴾ (18:44) بہترین صلہ تو اس اقدار کے تحت ہی ملتا ہے اور اس محنت کا انجام بھی خیر و برکت ہے جو اس کے قوانین کے تحت کی جائے۔ یہ ہے وَسَآءَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿۲۹﴾ (18:29) اور حَسُنَتۡ مُرۡتَفَقًا ﴿ع۳۱﴾ (18:31)۔ ان میں دو آدمیوں کی مثال سے اس بات کو واضح کیا کہ ایک شخص صرف طبعی قوانین پر بھروسہ کرتا تھا اور مستقل اقدار کو کوئی اہمیّت نہیں دیتا تھا اور اگر مذہب کی بات تھی تو بتا دیا کہ دولت مند کسی طرح سے اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں کہ ہم چند ٹکے خیرات دیکر جنّت حاصل کرلیں گے اور مذہب کے اجارہ داران کو اطمینان دلاتے ہیں۔ یہ سیکولرسٹ تھا۔ جو قیامت پر بھی یقین نہیں رکھتا تھا۔

شفاعت کا نظریہ

شفاعت کا غیر قرآنی نظریہ:

شَفْعٌ۔ بنیادی معنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا اور اس طرح ایک کو دوسرے کا جوڑا (زَوْجٌ) بنا دینا جبکہ وَتْرٌ اکیلا رہنا۔ طاق ہونا۔ شَفْعٌ سے مراد زوج (جفت) (راغب) شَفْعٌ سے مراد کسی چیز کو اس جیسی چیز سے ملا کر ضم کر دینا۔ اور شَفَاعَةٌ سے مراد دوسرے کے ساتھ اس کی مدد کرتے ہوئے یا اس کی خبر گیری کرتے ہوئے مل جانا۔ شُفْعَةٌ سے مراد کوشش کر کے مطلوبہ شے کو اپنی چیزوں میں ملا دینا اور اس طرح سے اپنی چیز کو بڑھا لینا۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ خاص حق ملکیت ہوتا ہے جس کو رکھنے والا وہ قیمت دیکر جائیداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔ جو قیمت دوسرے لوگ اس جائیداد کی لگائیں۔

عَيْنٌ شَافِعَةٌ۔ وہ آنکھ کمزوری کی وجہ سے ایک چیز کو دو دیکھے۔ نَاقَةٌ شَفُوعٌ۔ وہ اونٹنی جو ایک مرتبہ دودھ دینے میں دونوں وقت کا دودھ اکٹھا دیدے۔ اَلشَّفَائِعُ۔ مختلف قسم کے گھاس جو دو دو ہو کر اکٹھے اگیں۔ اَلشَّاةُ الشَّافِعُ وہ بکری جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہو۔ ان مثالوں سے شَفْعٌ کا بنیادی مفہوم واضح ہو گیا کہ کسی چیز کا دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور ایک سے دو ہو جانا اور اس کے بعد شَفَاعَةٌ کے معنی سفارش اس لئے ہو گئے کہ اس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کی معاونت کیلئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں سفارش کرتا ہے۔ شَفَعَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ۔ جب کوئی شخص کسی کے ساتھ اس کا مددگار بن کر آئے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے حصول کا طلب گار ہو۔

قرآن اجتماعیت کی بات کرتا ہے کیونکہ فرد کی صلاحیتوں کی نشوونما اجتماعی نظام میں ہی ممکن ہے۔ اس اعتبار سے اس معاشرہ کا ہر فرد دوسرے کا شَفِيْعٌ ہوتا ہے۔

یعنی اس کی معاونت کیلئے ہر وقت اس کے ساتھ اور ان کا امیر ہر ایک کا شَفِيْعٌ وہ افراد کارواں میں سے کسی کو بھی تنہائی محسوس

نہیں ہونے دیتا۔ یہی باہمگی (شفاعت) اس کی بنیادی خصوصیّت ہے۔ یہ شَفَاعَةٌ اس جماعت کی (معاونت) اپنے حلقہ سے باہر بھی ہوتی ہے۔ چونکہ ان کا فریضہ تو تمام نوع انسان کی ربوبیّت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو کہا گیا کہ وہ برّ وتقویٰ میں تو ایک دوسرے سے تعاون کریں لیکن اِثْمٌ وَّعُدْوَانٌ میں تعاون نہ کریں۔ اس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا۔ مَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنۡ لَّهٗ نَصِيۡبٌ مِّنۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنۡ لَّهٗ كِفۡلٌ مِّنۡهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقِيۡتًا ﴿۸۵﴾ (4:85) اچھے کاموں میں ساتھ دینا تو اس کا حصّہ مل جاتا ہے اور برے کاموں میں ساتھ کھڑا ہونا تو اس کا حصّہ اس میں سے ملتا ہے۔

ہمارے ہاں مروّجہ غیر قرآنی عقیدہ شفاعت:

ہمارے ہاں یہ خود ساختہ عقیدہ کہ رسول ﷺ مجرمین کی سفارش کر کے ان کو دوزخ کے عذاب سے نجات دلا دیں گے اور یہ عقیدہ تو قانون مکافات کی ساری بنیادی منہدم کر دیتا ہے۔ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ﴿۷﴾ (99:7) وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾ (99:8) نظر آتا ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ دور ملوکیّت کا خود ساختہ ہے جب مستبد حکمرانوں کے مقربین ان کے پاس مجرموں کی سفارش کر کے معافی دلا دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کو عیسائیوں کے اس کفارہ کے عقیدہ نے بھی تقویت دی کہ ہمارے عیسیٰؑ کو دیکھو کہ جو کفارہ پر ایمان لے آئے تو وہ جہنّم سے محفوظ کر دیا جاتا ہے اس کے برعکس تمہارا رسول ﷺ اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا تو اس اعتراض کے پیش نظر یہ روایات وجود میں آ گئیں۔ قرآن سے اس عقیدہ شفاعت کی کوئی سند نہیں ملتی نہ ہی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس میں تو قانون مکافات کی رو سے لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـــًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ (2:48)

شفاعت کے عقیدے کیلئے قرآنی سند:

اس خود ساختہ عقیدہ کی تائید میں اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں۔

مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ (2:255) یعنی اس کی اجازت سے شفاعت کی جا سکتی ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ ایسا عقیدہ تو قانون مکافات کے خلاف ہے اگر اس کے ساتھ شفاعت کا عقیدہ بھی قرآن میں موجود ہو تو معاذ اللہ پھر تو قرآن میں تضاد آ گیا۔ حالانکہ اس آیت سے پہلی آیت یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے ربوبیّت عامہ کیلئے کھلا رکھو قبل اس کے کہ وہ وقت آ جائے۔ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ (2:254) اس کے بعد مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ (2:255) تو اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ سفارش اس کی اجازت سے ہوگی تو یہ تو ایک کھلا تضاد ہوگا۔

قانون مکافات کی رو سے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے لیکن قرآن نے جزا و سزا کی مجرّد حقیقت کو سمجھانے کیلئے تشبیہاً ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزم عدالت میں پیش ہوتے ہیں اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم ہوتا ہے حاکم کے علاوہ ملزم، مستغیث، گواہ، پولیس کے سپاہی اور ہتھکڑیاں وغیرہ وغیرہ عدالت میں موجود ہیں۔ مثلاً جس کا احتساب ہو رہا ہے وہ اکیلا کھڑا ہے۔

وَلَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّتَرَکۡتُمۡ مَّا خَوَّلۡنٰکُمۡ وَرَآءَ ظُهُوۡرِکُمۡ ۚ وَمَا نَرٰی مَعَکُمۡ شُفَعَآءَکُمُ (6:94) تنہا پیش ہونگے اور ساتھ کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔ پولیس کا سپاہی ہانکتا ہوا لائے گا۔ وَجَآءَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِیۡدٌ ﴿۲۱﴾ (50:21) اس کے علاوہ گواہ بھی ہونگے۔ وَّشَهِیۡدٌ ﴿۲۱﴾ (50:21) یہ گواہ خود بخود کھڑے نہیں ہونگے۔ ان میں سے جن کو بلایا جائے گا اسے گواہی دینے کی اجازت ہوگی۔ یہ ہیں وہ شَفِیۡعٌ (ساتھ کھڑے ہونے والے) جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے مَنۡ ذَا الَّذِیۡ (2/255) کہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کھڑا ہو سکے۔ یہ گواہ رسول بھی ہونگے۔ یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَآ اُجِبۡتُمۡ ؕ (5:109) تمہاری دعوت کا کیا ریسپانس ملا تھا۔ کائناتی قوتیں بھی اسی طرح بلائی جائینگی۔

یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ۚ لَّا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ (78:38) روح اور ملائکہ صف باندھے کھڑے ہونگے اور کوئی بات نہیں کر سکیں گے سوائے اس کے جس کی اجازت رحمٰن دے اور بات درست کہے۔ ان آیات میں شفاعت سے مراد سچی شہادت ہے کس کے حق میں سچی شہادت دینا اس کی بہت بڑی مدد ہے۔ شفاعت سے مراد شہادت ہے۔ اس التباس کو رفع کرنے کیلئے رسول اللہ کو شَهِیۡدًا (16:89) کہا گیا ہے۔ شَفِیۡعٌ کہیں نہیں کہا گیا اور دوسرے مذاہب کے اس عقیدہ شفاعت کی تردید کر دی گئی۔

فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیۡنَ ﴿ؕ۴۸﴾ (74:48) قانون تو یہ ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۚ (6:164) تِلۡکُمُ الۡجَنَّۃُ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ (7:43) سفارش سے تو جنّت کے ملنے کے عقیدہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ جنّت کا وارث صرف عمل صالح والا ہوگا۔ غلط روش والا نہیں۔

شفاعت:

ان تصریحات سے ظاہر ہے۔

1) اس دنیا میں شفاعت سے مراد کسی کے کام میں مدد کیلئے اس کے ساتھ ہو جانا۔ اگر کام اچھا ہے تو ساتھ دینے والے کو بھی اس کا اجر ملے گا اگر بُرا ہے تو اسے اس کا برا اجر ملے گا۔

2) آخرت میں شفاعت سے مراد جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچی شہادت دے۔ یہ تمثیلی بیان ہے۔

3) مجرموں کا سفارش سے چھوٹ جانا قرآن کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جہاں یہ لفظ آئے تو سیاق و سباق کے لحاظ سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں کونسا مفہوم مقصود ہے۔

❁❁❁

بنی اسرائیل کا شجرۂ نسب

ابراہیم علیہ السلام کی بیوی قطورا سے جو اولاد پیدا ہوئی ان میں سے ایک بیٹا ''مدین'' حجاز کے قریب بحر احمر کے ساحل کے پاس، شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا۔ موسیٰؑ جو یوسفؑ کی اولاد میں سے تھے جو بنی اسرائیل میں سیٹل ہو گئی تھی پھر یہ سلسلہ آگے چلتا ہے ان میں پھر دو نمایاں ہستیاں داؤدؑ اور سلیمانؑ کی آتی ہیں۔ پھر درمیان میں وقفہ ہے پھر بنی اسرائیل کے انبیاء یونس علیہ السلام کے بعد ذکریاؑ کا ذکر آتا ہے۔ پھر یحییٰؑ جن کو انجیل میں یوحنا اور John the Baptist بھی کہا جاتا ہے اور انہی کے زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ انجیل میں عیسیٰ علیہ السلام کا جو شجرہ نسب ہے وہ ان کو داؤدؑ تک ملا دیتے ہیں اور انہیں ابن اللہ بھی کہا جا رہا ہے۔ یعنی خدا کا بیٹا اور انجیل میں شجرہ نسب داؤدؑ سے جا کر مل جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن اعلان کر رہا ہے کہ اس کی قدرت اور قوت تو یہ ہے کہ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ (6:101) پھر قوانین مقرر کر دیئے عالم خلق میں اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ اولاد مرد اور عورت کے جنسی اختلاط سے پیدا ہوگی اور یہ قانون مجھ پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ (6:101) قرآن کسی بحث میں نہیں الجھتا۔ یہ کوئی فزکس یا مابعد الطبیعاتی دلائل نہیں ہیں روزمرہ کی ایک محسوس چیز ہے۔ جب خدا کی بیوی نہیں ہے تو بیٹا کیسے ہو سکتا ہے یعنی کتنی عظیم چیز ہے کہ وہ ساری کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ تو اس نے نہیں کہا کہ ہم اتنی قوتوں کے مالک ہو کر بن بیوی کے بچہ دے سکتے ہیں اگر وہ یہ کہتا تو برحق تھا۔ لیکن اس نے یہ کہا کہ عالم خلق کے قوانین کی ہم بھی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ ہم بھی قانون جنسی اختلاط کے بغیر بچہ پیدا کرنے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ جب بیوی نہیں تو بیٹا کیسا؟ اگر عورت ہو اور مرد نہ ہو۔ تو وہی قانون اس پر بھی لاگو ہوگا۔ اگر مسیح علیہ السلام کو بن باپ مان لیا جائے لیکن خدا کو اپنے لئے بھی اس قانون میں استثنا نہیں چاہتا۔ تو ان کیلئے کیسے کہے گا؟ اسی دلیل کو الٹا دیجیے۔ اگر بیوی کے بغیر تنہا مرد کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہو سکتی تو مرد کے بغیر تنہا عورت کے ہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ خدا کو یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش نہیں آئی کہ انہوں نے خدا کو باپ قرار دیا تھا۔ باپ قرار دیتے ہو تو بیٹے کے لیے تو بیوی کی ضرورت ہوتی ہے اگر خدا کو ماں قرار دیتے تو وہ یہ دلیل دی جاتی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا تو خاوند نہیں ہے۔ چونکہ یہ بات نہیں کہی گئی اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلیل تو یکساں ہے کہ اگر عورت کے بغیر مرد بچہ پیدا نہیں کر سکتا تو مرد کے بغیر عورت بھی بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی تو دلیل دی ہے باوجود اس کے کہ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ (6:101) ہے۔ اس کے لیے کیا مشکل ہے مگر عالم خلق میں بھی وہ اپنے نافذ کردہ قوانین سے مبرا نہیں ہے۔ کہ اولاد مرد اور عورت کے باہمی جنسی اختلاط سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

نیّت کا خلوص صداقت کی دلیل نہیں ہے، بلکہ صداقت کی دلیل صرف خدا کی سند ہے

نیّت کا خلوص Sincerity صداقت کی دلیل نہیں ہے بلکہ صداقت کی دلیل خدا کی سند ہے۔ بت پرستی میں ہندوؤں جیساSincereاورکون ہوسکتا ہے؟ رتھ (ایک قسم کی گاڑی جس کے اوپر ایک بر.جی سی بنی ہوتی ہے) اوراس گاڑی کے نیچے اتنا اتناRool-barہوتا ہے وہ صرف رتھ ہی نہیں ہوتی۔اس کے نیچے آنے والے یہاں سے وہاں تک، جلوس کی طرح سے لیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔وہ رتھ ان کی پسلیوں کے اوپر کڑک کڑک کرتی ہوئی چلتی ہے۔اس تصوّر سے ہی روح کانپ اٹھتی ہے مگر یہ ہنستے ہوئے خوشی خوشی اس کے نیچے لیٹتے ہیں۔اس سے زیادہ خلوص اور کہاں ہوسکتا ہے تو کیا اسے صداقت کی دلیل مانا جاسکتا ہے!

❁❁❁

رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾ (19:51) اکٹھے کیوں آئے،

اور مرزا غلام احمد کا دعویٰ نبوّت

رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾ (19:51) کا اکٹھا آنا انسان کو وجد میں لے آتا ہے۔ یہ کیا تخصیص ہے۔ عربی مبین کی کتاب ہے۔ الفاظ وہی ہیں جو اس دور کے عرب اپنے ہاں استعمال کیا کرتے تھے۔ جب وہ عام لفظ ہوگا۔ تو اس کے معنی وہی ہونگے جن معنوں میں وہ لوگ استعمال کرتے تھے۔ جب وہ اسم معرفہ بن جائیگا تو پھر اصطلاح قرآنی (Term) ہوجائے گی اور اس کے معنی مختص ہوجائینگے۔ رسول کا لفظ عربوں کے ہاں عام (قاصد) پیغام رساں کیلئے بولا جاتا تھا۔ آج بھی انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں حالانکہ ہمیں احتیاط کرنی چاہئے اور اسے عام معنوں میں استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن بحرحال ان کی تو زبان کا لفظ ہے۔ جب قرآن اسے اسم نکرہ کے اعتبار سے استعمال کرے گا تو اس کے معنی ہونگے عام قاصد، پیامبر یہاں رَسُوۡلًا کہا ہے۔ الرسول بھی نہیں۔ اگر رَسُوۡلُ اللّٰہِ کہا جائے تو پھر یہ اسم معرفہ بن گیا۔ تو یہ خدا کا پیغمبر ہوگیا اس لئے اسے ''ال'' کے ساتھ کہا جائے گا تو پھر یہ بھی مختص معنی ہو جائینگے۔ اگر رسول کہا جائے تو پھر اس کے عام معنی ہونگے۔ اس پیامبری میں دو باتیں شامل ہوجاتی ہیں کہ کس کا پیغام کس تک پہنچا دیا جائے۔ وہ بھی پیامبر ہے یہ ایک چیز ہے خدا کی وحی کسی نبی پر نازل ہوئی اس وحی کو کسی شخص نے، ان سے لیکر آگے پہنچا دیا۔ یہ بھی پیامبر ہوا۔

تو خیال یہ ہے کہ جنہیں خدا نے رسول کہا ہے۔ ان کیلئے رَسُوۡلًا کا لفظ آیا ہے پیامبر تو ہوسکتا تھا کہ یہ خود صاحب وحی نہیں تھے۔ بلکہ یہ کسی کا پیغام لائے تھے۔ اس پیغام کو دوسروں تک پہنچایا۔ خالی رسولاً کے تو یہی معنی ہوجائینگے۔ لیکن اس نے ساتھ ہی فوراً کہا ''نَبِیًّا'' یعنی خدا سے براہ راست علم حاصل کرنے والا تو پیامبر تھا خدا سے براہ راست علم پا کر، اس وحی کو، اس پیام کو دوسروں تک پہنچانے والا''۔ تو رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾ (19:51) کے معنی واضح ہوگئے کہ ہر پیامبر نہیں صرف وہ پیامبر تھا کہ جو خدا کے ہاں سے نبوّت پاتا تھا۔ وحی پا کر دوسروں تک پہنچا رہا تھا۔ تو رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾ (19:51) میں دونوں چیزیں اکٹھی آگئیں۔ یہ نبی کے ساتھ رسول کیوں؟ کیونکہ یہ نبی کا لفظ بھی عام معنوں میں استعمال کیا ہے اور یہ پھر رسولوں کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ رسول کے متعلق تو بات جلدی سے سمجھ میں آگئی۔ جو فوراً نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾ (19:51) کہا تو اس سے مراد کہ وہ خدا سے وحی پا کر دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ نبی کے ساتھ رسول کیوں؟ اور یہی وہ اہم لفظ ہے۔ جس کیلئے تدّبر فی القرآن کی ضرورت پڑ گئی۔

قرآن کی رو سے جسے اس نے رسول، رَسُوۡلُ اللّٰهِ (48:29)، اَلرَّسُوۡلُ'' کہا وہ وہی تھا جو خدا سے نبوّت پا کر اس وحی کو دوسروں تک پہنچاتا تھا۔

نبی کے الفاظ میں ہیکل کا منصب:

نبی کے متعلق یہ اصطلاح اس سے پہلے یہودیوں کے ہاں استعمال ہوتی تھی۔ ان کے ہیکل میں ایک منصب نبی کا تھا۔ وہ نبی اپنے آپ کو سلسلہ انبیاء میں شامل نہیں کرتے تھے۔ یعنی ان رسولوں کے سلسلے میں اپنے آپ کو شامل نہیں کرتے تھے۔ جنہیں انبیاء اسرائیل کہا جاتا ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، داوٴدؑ وغیرہ۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمیں خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ یہ دوسروں کی قسمت بتایا کرتے تھے۔ یہ ان کا ٹیمپل، ہیکل کے اندر بہت بڑا منصب تھا۔ قرآن نے جہاں یہود کے انبیاء کہا ہے ان میں بعض مقامات پر انکی طرف بھی اشارہ ہے جو یہ ٹیمپل میں نبی کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ اصطلاحی نبوّت تو نہیں تھی مگر وہ دعویٰ کرتے تھے۔ قرآن کے کچھ الفاظ پہ زیادہ گہرائی میں جانے سے نظر آتا ہے کہ خدائے علیم وخبیر نے جو اس امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر باطل عقائد آنے تھے۔ ان کی بھی تردید ساتھ کے ساتھ کر دی۔ یہ اپنے آپ کو ایسا نبی موسیٰؑ، داوٴدؑ کی طرح سمجھتے نہیں تھے مگر دعویٰ یہ تھا کہ ہمیں یہ علم براہ راست خدا کی طرف ملتا ہے۔

رسالت کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا:

خدا کی طرف سے علم ملنے کا سلسلہ یعنی نبوّت ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا یہ ہے ختم نبوّت۔ اس لئے قرآن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النّبیین کہا ہے عام معنوں میں تو یہ ختم المرسلین نہیں ہوگا۔ یعنی اس نبوّت کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانا سلسلہ رسالت تو قیامت تک رہے گا۔ یہ وحی جو رسول اللہ پر آئی اسے دوسروں تک پہنچانا، اسے عام اصطلاح یا عربوں کی زبان میں پیامبر کہیں گے۔ اسے کہیں گے رسالت ہی لیکن نبوّت ختم ہوگئی۔ خدا کی طرف سے علم ملنا بند ہوگیا۔ اب یہ فریضہ رسالت امت کا فریضہ قرار پایا۔

امتّ میں دعویٰ نبوّت:

اب اس امتّ میں اس امر کے دعویدار پیدا ہو گئے کہ ہمیں براہ راست خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ اس دعویٰ نے ختم نبوّت کو بھی توڑا اور خدا سے براہ راست علم پانے کے عقیدہ کو فروغ ملا۔ یہ تو یہودیوں کے ہاں ٹیمپل میں یہ نبی کہا کرتے تھے کہ ہم ویسے نبی تو نہیں ہیں لیکن ہمیں خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ اس علم میں تو اپنی فکر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ Objectively خدا کی طرف سے حاصل ہوا ہے۔ وہ علم کو آگے پہنچاتا ہے۔ تو انہوں نے بھی تو یہی دعویٰ کیا تھا کہ ہمیں خدا کی طرف سے علم آتا ہے تو یہ نبوّت ہو گئی۔ ہم تو اسے کشف والہام کہتے ہیں۔ نام بدلنے سے تو حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت تو موجود ہے نبوّت اس کے سوا کیا ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے براہ راست علم ملتا ہے جس میں علم پانے والے کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ نبوّت اور وحی کی تعریف سے بعینہ اس کے مطابق کہنا کہ علم ملتا ہے۔ تصوّف کی ساری عمارت اس بنیاد پر ہے۔ محی الدین ابن عربی کی ''فتوحاتِ مکیّہ''

اٹھایئے جوان صوفیا کا سرخیل ہے۔ کہتے ہیں ''کہ جہاں سے رسول اور نبی لیتا تھا یعنی جس سرچشمہ علم سے وہ علم حاصل کرتا تھا۔ یہ اولیاء، ابدال، اوتار بھی وہیں سے علم حاصل کرتے ہیں اور یہ علم ہماری ذات تک محدود ہوتا ہے۔ اسے آگے پہنچانے کا حکم نہیں ہوتا۔ منصب نہیں ہوتا۔ یعنی اس لئے ہم رسول نہیں نبی ہیں۔

مرزا غلام احمد آف قادیان (1835-1908):

انہوں نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ من نیستم رسول بلکہ میرے پاس نبوّت ہے۔ یہ بات کہاں سے آئی تھی۔ یہ ساری ٹامک ٹوئیاں ہمارے لٹریچر میں تھیں یہ سارا کچھ انہوں نے وہاں سے مستعار لیا۔ ان کی پہلی ساری زندگی سیالکوٹ کے زمانے کی تصوّف میں گزری۔ خود ان کی داستان میں موجود ہے۔ وہاں یہ مراقبے، ریاضتیں مکاشفے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں رسول نہیں ہوں۔ تصوّف کا علم ان کے اپنے لئے ہوتا ہے اور نبوّت کا علم جو نبی کو ملتا ہے تو اسے حکم ہے۔ بَلِّغۡ مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ط (5:67) وہ تمام انسانوں کو پہنچائے۔ اس جہت سے وہ رسول ہے۔ انہوں نے یہ فرض کیا کہ یہی دوسروں تک پہنچانا ''کتاب'' کہلاتا ہے۔ یہ وہیں یہودیوں کے ٹیمپل والا تصوّر ہے کہ جو علم خدا کی طرف سے ملتا ہے تو ہم وہ علم دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے۔ تصوّف کا علم باطنی علم ہے اور سینہ بہ سینہ چلتا ہے۔ اسے عام نہیں کیا جاتا۔ ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی! اس کا علم تو صرف شراب چکھنے سے ہی ملتا ہے۔

میں نے تو نبوّت کا دعویٰ کیا ہے رسالت کا نہیں:

اس شراب کا نشہ نہ تو ہم کسے پلا سکتے ہیں نہ شریک کر سکتے ہیں اور نہ پڑھا سکتے ہیں۔ مرزا صاحب نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میرا یہ دعویٰ رسالت کا نہیں۔ بلکہ نبوّت کا ہے۔

احادیث وروایات:

یہ سارا لٹریچر ان کیلئے ایسا کھلا ہوا دروازہ تھا کہ جہاں خدا تعالیٰ سلسلہ وحی کو ختم کرنے کے بعد جو دروازہ بند کیا۔ تو انہوں نے اس کمرے میں اتنی کھڑکیاں کھول دیں کہ دروازے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ یہ کھڑکیاں یہودی روایات تھیں۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے مجھے دو برتن دیئے۔ ان کے منہ بند تھے۔ یہ جو رسول ﷺ کی آخری زندگی میں ایمان لائے تھے۔ صرف تین سال کا عرصہ پایا۔ کہا کہ ان میں سے ایک برتن کو کھول کر عام کر دیا۔ یعنی یہ روایات جو تھیں وہ عام کر دیں اگر دوسرا برتن عام کروں تو اس پر میرا گلا کاٹ دیا جائے۔ یہ ہے وہ برتن جو سینہ بہ سینہ، باطنی علم کے ذریعہ، صدری علم، علم لدنی، تصوّف کی خلوت گاہوں میں آگے چلتا ہے۔ اسے عام نہیں کیا جاتا۔ یہ نبوّت ہے۔ رسالت نہیں۔ غور فرمایا قرآن کے ان دو لفظوں پر۔

چلہ کشیاں اور ریاضتیں:

ختم نبوّت کے بعد براہ راست علم حاصل کرنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے تو وحی کا دعویٰ ہے اس کا

نام کشف والہام رکھ دینے سے یہ کچھ وحی سے الگ نہیں ہوسکتا۔ایسا کرنا تو نبوّت کو توڑ نا ہے۔

جسے یہ خدا کی طرف سے علم سمجھتے ہیں وہ دراصل انسان کی اپنی ہی بعض ریاضتوں سے Will Power کو مرتکز کرنے کا نتیجہ ہے۔یہ چلہ کشیاں ایک خاص تکنیک ہے۔یہ خالص ٹیکنیکل (فنی) چیز ہے۔انسانی صلاحیتیں مرتکز ہوجاتی ہیں۔پھر وہ سمجھتا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔یہ وجدان یا(Intuition) یہ بھی انسان کی اپنی مرتکز صلاحیتیں ہوتی ہیں۔جب وہ فکری طور پر اپنے آپ کو،فکر کو،ایک نقطہ پر مرکوز کرتا ہے۔تو بہت سی پھیلی ہوئی قوتیں مرتکز ہوجاتی ہیں۔شاعر بھی اسے آور سمجھتا ہے۔ ؎

آتے ہیں غیب سے مضامین خیال میں

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

سروش۔یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے معنی ہے۔آواز غیب۔الہام،صریر،عربی زبان کا معنی ہیں۔صدا۔قلم چلنے کی آواز، خامہ بمعنی قلم۔

سروش وہی جبریل کی بجائے ایک فرشتہ ہے جوانہوں نے مقرر کیا ہے۔یونان والے اسے Muse کہتے تھے جہاں سے میوزک ہے۔فرشتہ ہے نازل ہوتا ہے۔آورنہیں ہے یعنی جس میں اپنی کوششوں کو دخل ہو۔اصل شعر تو آمد ہے۔کہتے ہیں کہ ہمیں پتہ نہیں کہ کیسے آجاتا ہے۔بس وہ ایک خیال ہوتا ہے اس سے صریر خامہ نوائے سروش ہے۔غنیمت ہے وہ اسے نبوّت نہیں کہتے۔یہ وجدان کو اس سے الگ کر دیتے ہیں۔وجدان بھی حقیقت میں یہی ہوتا ہے جس میں انسان کی فطری قوّتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہوتی ہیں۔اس سے فریب میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ یہ تو میری فطری چیز نہیں کیونکہ جب وہ اس عادت سے الگ ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اس قسم کے خیالات نہیں آرہے تو اس فریب میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ یہ کچھ دانستہ نہیں ہے۔اگر دانستہ ہوا تو پیغمبری کا دعویٰ کر کے اپنا کاروبار چلاتے ہیں اور اس وہم میں مبتلا ہوتے ہیں۔یہ تمام بزرگ،اولیاء،مقرب الٰہی،کشف والہام یہ سارے الفاظ ہی الفاظ ہیں۔یہ سارا نوائے سروش ہے۔

مرزا صاحب کے نزدیک نبی اور رسول میں فرق:

کہا کہ رسول صاحب کتاب ہوتا ہے مگر میں صاحب کتاب نہیں ہوں۔ان کا دعویٰ براہ راست خدا سے علم کا ہے۔اس کو دعویٰ وحی کہتے ہیں اور ذہنی قابلیت یہ ہے کہ اتنی واضح آیات ہیں کہ ہم نے رسولوں کو کتابوں کے ساتھ بھیجا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ(57:25)كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (2:213) نبیوں کو کاہے کیلئے بھیجا۔وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ(2:213) ہر نبی بھی صاحب کتاب ہوتا ہے جبکہ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ نہیں صاحب!وہ نبی تو ہوتا ہے مگر اسے کتاب نہیں ملتی اور کتاب صرف رسول کو ملتی ہے اور اسی غلط بات پر اکڑے ہوئے ہیں۔

نبی ہے اور وہ رسالت کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے:

ان دو لفظوں پر آیئے اور وجد میں آجائے۔ ان کے بارے میں کہا رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾ (19:51) نبی ہے۔ رسالت کا فرض بھی ادا کر رہا ہے کوئی رسول ایسا نہیں ہوسکتا جو نبی نہ ہو۔ کوئی نبی ایسا نہیں ہوسکتا جو رسول نہ ہو ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور ایک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

نبوّت اور رسالت الگ الگ منصب نہیں ہیں۔ وحی ملنے کے بعد حکم ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (5:67) تبلیغ کا فریضہ ادا نہ کیا۔ تو یہ رسالت کا فریضہ ادا نہ ہوا۔ ہر نبی رسول ہوتا تھا اور ہر رسول نبی۔ ان دونوں فرائض میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں کہ رسولاً نبیاً۔ تا کہ کوئی یہ دعویٰ نہ کر دے کہ ہاں علم تو خدا کی طرف سے ملتا ہے اور یہ جو علم اپنی ذات تک رکھے تو سمجھو کہ وہ ہماری طرف سے بھیجا ہوا نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی دعویٰ رسالت لے کر آئے تو اسے ہماری وحی تم تک پہنچانی چاہیئے۔

اگر وہ وحی نہیں پہنچاتا۔ تو وہ الرسول نہیں ہوسکتا۔ اسے وحی کو پہنچانا ہوگا اور محض وحی کو آگے پہنچانے والے جو بھی اشخاص ہیں ان میں سے ضروری نہیں کہ ہر شخص نبی بھی ہو اور اس وحی کا دوسروں تک پہنچانا ہمارا فریضہ ہے یہ ہے اصل تبلیغ۔ یہی رسول کا فریضہ رسالت تھا اور یہ اس امت کا فریضہ تھا لیکن یہ امت اس فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ رسولاً نبیاً نہیں ہو سکے گی۔ یعنی تبلیغ کو رسالت کے معنوں میں لیا جائے۔ یہ نبوّت والا فریضہ رسالت نہیں ہے نبوّت تو وہ ہے جو وحی خداوندی عطا کر رہی ہے۔ اسے دوسروں تک پہنچانا تبلیغ ہے۔ وہ تو ایک شخصیت میں دونوں چیزیں تھیں رَسُوۡلًا نَّبِیًّا ﴿۵۱﴾ (19:51)

مرزا صاحب کا آسمان سے مینارہ پر اور مینارہ سے زمین پر اترنا، منارۃُ المسیح:

قادیان سے آکر یہ ربوہ بنایا یہ نام وہیں سے اخذ کیا گیا کہ مریمؑ جو ربوہ گئی تھیں اور ولادت مسیح جو وہاں ہوئی۔ اب یہ جو روایات بنائی ہوئی ہے کہ عیسیٰؑ دمشق میں جامع مسجد کے مینار سے اتریں گے۔ آگے سیڑھی کا مطالبہ کریں گے۔ کہا جائے گا کہ آسمان سے تو وہ ویسے اتر آئے تو اس کے بعد سیڑھی کا تقاضا تو کہیں گے کہ وہاں تک تو قانون خداوندی تھا اس کے مطابق آیا اب میں شریعت محمدی کے تابع ہوں اور شریعت میں تو کوٹھے سے سیڑھی کے ذریعہ ہی اترا جاسکتا ہے۔

قادیان کو پہلے دمشق قرار دیا اور پھر مینار کی تعمیر کی:

اور قادیان کو انہوں نے اصل دمشق قرار دیا ہے۔ یہ منیارہ بعد میں بنا دیا۔ ''مبارک مسجد'' اس کا نام ہے اب یہاں انہوں نے مسجد اقصیٰ بنائی ہوئی ہے۔ یہ تمام پرانے نام انہوں نے وہاں رکھے ہوئے ہیں۔ اگر چہ وہ مرزا صاحب کے بعد بنایا ہے تاہم اس

پر جلی حروف میں ''مینارۃ المسیح'' لکھا ہوا ہے۔ دیکھیں تاریخ کیسے بنتی ہے! آنے والی نسل میں تاریخ کی رو سے یہ دو چیزیں دیں گے اس میں وہ یہ نہیں لکھیں گے کہ یہ مینارۃ المسیح بعد کا بنایا ہوا ہے۔ وہ یہی کہیں گے کہ یہ مینارہ وہی ہے جو حدیثوں میں مسیح موعود کا بیان فرمودہ تھا۔ جن میں لکھا تھا کہ وہ یہاں آکے اترے تھے۔ وہاں مینارالمسیح بن گیا۔

مرزا صاحب کی ایک مشکل کا تذکرہ، (احمدیّت اور ختم نبوّت):

اب نبی صاحب یعنی مرزا صاحب کی ایک چھٹی اپنے دوست کے نام موجود ہے'' کہ یاروحی آگئی زبان پر مگر اس میں گرائمر کی غلطیاں ہیں۔ یعنی اللہ میاں نے گرائمر بھی نہیں پڑھی ہوئی۔ معاذ اللہ کہا کہ میری دشواری یہ ہے کہ مجھے انگریزی نہیں آتی اور یہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کہا کہ یہاں ایک لڑکا غالباً دیوان داس نامی، ہندو ہے۔ اس سے پوچھا تو میرا اطمینان نہیں ہوتا۔ ذرا مجھے بتا دیجئے کہ وہ جو وحی خدا نے میری طرف کہی ہے اس کے معنی کیا ہیں؟ اندازہ کریں معیار زبان اور فہم وحی کا! اندازہ لگائیں مذہب کی گرفت کا۔ اس شخص کو بھی لاکھوں متبعین مل گئے۔ مسلمانوں ہی سے۔ وہ جن کے پاس یہ قرآن تھا۔ اب وہی مسلمان اسے نبی مان رہا ہے کیونکہ قرآن تو جلد میں رکھنے سے نہیں آجاتا۔ اب ان کو وحی آرہی ہے جن کو اردو کے فقرے بھی صحیح لکھنے نہ آئیں ورنہ معنوی اعتبار سے تو چھوڑیئے۔ محض ادبی ذوق کے اعتبار سے بھی، لٹریچر کی دنیا میں قرآن سے اونچی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔

مسیح موعود کا دعویٰ، وفات مسیح کے متعلق دو مختلف متضاد وعقائد اور بن باپ کا تصوّر:

عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰؑ وفات پا گئے اور انہوں نے واپس آنا ہے ہر دو چیزیں کیسے اکٹھی ہوگئیں۔ وفات تو یہ قرآن سے ثابت کرتے ہیں اور ''واپسی'' روایات سے ثابت کرتے ہیں۔ اب دو باتوں میں تدویق کیسے ہوگئی یعنی غور وفکر سے باریک بات نکالنا تدویق کہلاتا ہے۔ یعنی جو مر چکا ہے وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس کی مثل کوئی ایک مسیح آئے گا اور وہ میں ہوں یعنی وفات مسیح کا عقیدہ یوں ثابت کیا۔ کیونکہ مرزائی عقل وفکر کی رو سے Rational اسلام پیش کرتے تھے حالانکہ بن باپ مسیح کا عقیدہ ان کے پاس بھی موجود ہے تو اس طرح تو یہ وہیں کے وہیں رہے اب وفات کے مسئلہ میں انہوں نے یہ بات کیوں پیدا کی؟ یہ ہے قابل غور بات! جو مسیح کو آسمان پر زندہ تصوّر کرنے والے ہیں تو اس عقیدہ کے رو سے انہیں زمین پر جسم کے ساتھ آسمان سے نازل ہونا ہے اور دنیا اترنے والے کو دیکھے گی۔ دمشق کے مینارہ سے اتریں گے تو دنیا ان کو دیکھے گی۔ یہ سارا کچھ حدیث میں موجود ہے اب دعویٰ کرنے والا مسیح ان حدیثوں کی رو سے اترتا ہوا نظر آئے گا اور یہ تو اس طرح آسمانوں سے نہیں اترے تھے۔ تو اس نے مسیح ہونے کے دعویٰ کے ثبوت میں یہ کہ وہ یوں اتر کر نہیں آئے گا۔ وہ ایسے ہی انسانوں کی طرح ہوگا اور مثل مسیح ہوگا۔ اس لئے مثل مسیح ہونے کا عقیدہ منوانے کیلئے انہوں نے وفات مسیح کا عقیدہ اپنے ہاں داخل کر دیا۔ اب جو ان کو نہ مانے تو دائرہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ بات تو وہی ہوگئی۔ ختم نبوّت تو توڑ دی۔

قرآن کے خلاف گہری سازش کہ سات زبانوں میں نازل ہوا تھا

فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِيۡنَ وَ تُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ (19:97)۔ یہ نظام کس طرح سے قائم ہوگا۔ کہا۔
فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِيۡنَ وَ تُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ (19:97) یہ سب اس قرآن کے ذریعہ ہوگا ہم نے اسے تیری زبان میں سمجھنے کیلئے بڑا آسان کر دیا ہے۔

یہ لِسَانِكَ (19:97) ہے تیری زبان میں ہے یہ اس لئے کہ رسول سے پہلے انہیں قوم کی طرف آتا ہے اس لئے یہ وحی اس کی زبان میں ہونی چاہیئے۔

ان کی روایات میں ہے کہ قرآن سات زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ انہی سات زبانوں میں رسول ﷺ نے آگے لوگوں کو دیا تھا۔ عثمانؓ کے زمانے تک یہ سات زبانوں میں تھا۔ پھر آپس میں جھگڑے ہونے لگے اور سات مختلف قرآن ہو گئے۔ یعنی زبان الگ ہو گئی۔ تو وہ تو، الگ کتاب ہوتی ہے تو پھر اس میں اختلافات پیدا ہوئے۔ یہ شوشہ مودودی نے چھوڑا تھا۔ ترجمان القرآن میں یہ لکھا ہوا ہے۔ ان اختلافات کو مٹانے کیلئے عثمانؓ نے چھ زبانوں والے قرآن تو جلا دیئے اور ایک زبان والا باقی رکھا۔ بھئی! کس کی اتھارٹی سے؟ صرف ایک زبان والا رکھا باقی چھ کیوں نہ رکھے۔ خدا نے سات زبانوں میں نازل کیا۔ رسول ﷺ نے امت کو سات زبانوں میں دیا تو ان کو کس نے اتھارٹی دی کہ ایک زبان والا باقی رکھا۔ باقی چھ والا کیوں نہ رکھا؟ کہ جی! یہ تو ان کی اپنی زبان میں تھا قریش تھے یہ تو ان کی زبان میں تھا۔ یعنی یہ سارا تصوّر امام ابن تیمیہ اور احمد بن حنبل سے یہ سارا من گھڑت تصوّر آیا۔ ان کے متعلق یہ جدید مفسر لکھ رہے ہیں بقول ان کے یہ ایک قرآن باقی رکھا۔ اس کیلئے تو لمبی بحث کی ضرورت نہیں یہ صرف لِسَانٌ کا لفظ واحد ہی کافی ہے۔

بِلِسَانِكَ (19:97) لِسَانٌ عربی مبین میں واحد کا صیغہ ہے۔ جمع اَلۡسِنَةٌ ہے۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ ہم نے اسے سات زبانوں میں نازل کیا۔ يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ (19:97)

یہاں بھی لسان جو صیغہ واحد ہے۔ خود عربی زبان میں ایک ایک لفظ کیلئے سو سو الفاظ ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قرآن جو عربی زبان کا لفظ ہے اس کی جگہ عربی زبان کا دوسرا لفظ رکھ دیں تو بھی خدا کا قرآن نہیں رہتا۔ کسی ترجمہ کا قرآن کا نعم البدل ہونا تو ایک طرف رہا، وہ خدا کا قرآن ہی نہیں رہتا۔

تفسیرِ جلالین:

عربی زبان میں جلالین ہمارے ہاں ایک تفسیر ہے۔ باپ بیٹا تھے۔ انہوں نے کیا ہی یہ ہے کہ قرآن کا ایک لفظ لکھا ہے اور اس کے بعد قوسین کے اندر عربی زبان کے جو اس کے اور مترادف ہو سکتے ہیں۔ سمجھانے کیلئے وہ رکھ دیئے ہیں پھر انہیں آپ یوں اکٹھا کریں گے تو ایک طرف قرآن کا عربی متن ہوگا اور اس متن کے سامنے عربی مترادفات ہونگے۔ اس میں یہی کیا گیا ہے صاف نظر آجاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ اور وہ دوسرے الفاظ جو عربی زبان کے ہیں۔ تو وہ تو قرآن کے ہو نہیں سکتے۔ خواہ وہ عربی کے کیسے الفاظ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہاں کہا جارہا ہے کہ قرآن سات زبانوں میں نازل ہوا ہے اور انہوں نے اپنے ہی فیصلہ کے تحت چھ جلا دیئے ایک رکھا۔ وحی تو آنی نہیں تھی۔ پھر یہ کیسے بِلِسَانِكَ (19:97) ہو گیا۔

❁❁❁

راعیؑ سے رعایا، ایک خوبصورت اصطلاح عربی زبان میں

راعیؑ، رعایا، ایک عظیم تربیّت:

موسیٰؑ نے مدین میں بارہ برس تک بکریاں چرائیں۔ ہمارے ہاں رعیت اور رعایا کا لفظ وہ اسی اعتبار سے ہے۔ حاکم کو ''راعیؑ'' کہتے ہیں یعنی بکریاں چرانے والا ''گڈریا'' یہ تربیّت بڑی عظیم ہوتی ہے۔ راعی اور رعایا کا تعلق استبداد اور محکومیت کا تعلق نہیں ہوتا کوئی راعی اپنی بکری کو اپنے ہاتھ سے ہلاک نہیں کرتا بلکہ وہ اسے ہر قسم کی ہلاکت اور نقصان سے بچاتا ہے پرورش کرتا ہے۔ غلط راستے سے صحیح راستہ پر لاتا ہے اس کی پرورش، حفاظت، تربیّت اس راعی کے ذمہ ہوتی ہے۔ وہ راعی کہلا اس صورت میں سکتا ہے جب وہ ان مویشیوں کے گلہ کی حفاظت کرے اور ان کو تمام خطرات سے بچائے۔ یہ تھی گہرائی ان کی زبان میں۔ ایک ان پڑھ قوم، جن کے ہاں حکومت کا منظم تصوّر ہی نہیں تھا۔ یہ تھا حاکم اور رعایا کا تصوّر جو راعی اور رعیت کے تصوّر کے تحت دیا گیا تھا۔ پرورش، نگہداشت، وہ ایک میل چلیں تو یہ دس میل چلتا ہے یہ ہیں صاحب اقتدار کے فرائض۔

عقل کا طریقہ قیاسی ہوتا ہے:

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ⑩(20:10) رات سرد اور اندھیرا چارسو۔ آگ دیکھی تو ساتھیوں سے کہا کہ یہیں رک جاؤ تاکہ میں تاپنے کیلئے آگ کا انگارہ لاؤں تاکہ تم لکڑیوں سے آگ جلا کر اپنی سردی میں کمی کرسکو اور اس اندھیری رات میں شاید کوئی آدمی موجود ہو جس سے راستہ کا پتہ چل سکے۔ تنہا عقل انسانی وحی کے بغیر اس طرح قیاسات سے نشان راہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

آگ ایک نشانی (آیت) ہے۔ اس حقیقت تک پہنچنے کی کہ وہاں ضرور کوئی انسان ہوگا۔ حیوانات میں تو آگ جلانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھی گئی۔ یہ بندر تو سب کچھ نقل مار کر کر لیتا ہے مگر آگ نہیں جلا سکتا۔ اگر ان کو کہیں آگ جلانا آ جائے تو ساری کائنات کا سلسلہ بھسم ہو کر رہ جائے۔ چونکہ راستہ بھول گئے تھے۔ چونکہ عقل کا طریق قیاس ہوتا ہے۔ وہ ان علامات سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو موسیٰ نے آگ سے قیاس کیا کہ ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی انسان ہو جس سے راستہ کا پتہ معلوم ہو سکے۔ یہ

سارا منطق، قیاس، شاید ہوتا ہے یہ حقیقت تک پہنچنے کا فکری طریق ہے۔ قیاس غلط بھی ہوسکتا ہے ہوسکتا ہے کہ آگ جلانے والا چلا گیا ہو۔ تو قیاس غلط ثابت ہوا کہ جہاں آگ ہوتو وہاں آدمی ضرور ہوتا ہے اگر بالفرض وہاں ہوتو وہ اس قابل بھی ہے کہ ہمیں راستہ بتا سکے۔ قیاس ہے کہ شاید راستہ بتا سکے۔ لَّعَلِّيٓ (20:10)۔شاید کی بات ہے۔ قیاس ہے۔) عقل کے پاس دوسرا طریق ہے ہی نہیں۔ ان قیاسات کی رو سے عقل، اپنے تجربہ کی طریق ہے۔ جسے Trial and Error کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ناکامیوں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ ایک فارمولہ لیا۔ اس پر صدیوں تک عمل کیا۔ آگ اور خون کی ندیاں پھاندیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو غلط تھا۔ دوسرا طریق لیا۔ اس پر چل نکلی۔ ابھی موسیٰ علیہ السلام وحی سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ⑪ (20:11) اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ (20:12) نے قیاس ختم کردیا یعنی یقین کیلئے آتا ہے یہ بات قیاس نہیں رہی کہ پتہ نہیں کس کی آواز ہے۔ اَنَا سے تو حاکمیّت وجلال کا تصوّر پیدا ہو گیا۔ فوراً ہی رَبُّكَ (20:12) کہا کہ ڈرنے کی بات نہیں میں تو تمہارا نشوونما دینے والا ہوں۔

نئی منزل کا آغاز:

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ (20:12) لفظی معنی تو جوتا اتار دے اپنا۔ اب آرام سے بیٹھ جا۔ قرآن نے استعاروں میں بات کی ہے۔ وہ تو وحی اور فلسفہ کا بین فرق بتاناتھا۔ اس نے بدو اور آئن سٹائن کو بھی سمجھانا تھا۔ اب یہ وحی یہ لازوال عمل وحی کا اس مختصر سی عمر کو زندگی کا، دوام بخش دیتا ہے۔ یہ تو بلا مزدور معاوضہ ملتی ہے۔ اسے رحمت کہا گیا ہے جس طرح رحم مادر میں بچہ کی نشوونما ہوتی ہے بلا مزدور معاوضہ ؎

ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دوا میر کارواں
عقل بہ حیلہ می رود، عشق بردکشاں کشاں
عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

یہ ہے وحی اور عقل کا فرق۔ وہ تیری لمبی لمبی مسافتیں، وہ خضر کی تلاش، بارہ بارہ سال تک بکریاں چرانا، وہ تمام منزلیں، وہ مسافت کا دور اب ختم ہو گیا اور اب جوتے اتار کر آرام سے بات سن اے موسیٰ۔

اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ⑫ (20:12) قَدَّسَ فِي الْاَرْضِ۔ وہ بہت دور تک چلا گیا۔ طوی (ط وی) سے مراد ''لپیٹ دینا'' طَوَى اللهُ الْبُعْدَ لَنَا۔ اللہ نے ہماری مسافتوں کو لپیٹ کر دوری کو قریب کر دیا۔ یعنی اب عقل کے قیاس طریق کی بجائے وحی کا ساخت سمیٹنے والا راستہ کھول دیا گیا ہے جہاں حقائق خود بے نقاب ہونگے۔

آگ کا تاپنا اور رہنمائی کا مل جانا، دونوں کا مجموعہ نظام خاوندی ہے:

آگ کا شدید سردی میں میسر آنا اور زندگی کی راہوں کا وحی کی رہنمائی سے روشن ہونا یعنی مادی سہولتوں کا اقدار خداوندی کے تحت استعمال کرنا نظام خداوندی ہے یہ اسلام ہے۔

ہندوؤں کو اکال الامم کہتے ہیں

چار ہزار سال سے ہندوؤں کی جو تاریخ ہے۔ جو قوم بھی باہر سے آئے یہ اسے نگل گئے۔ وہاں ہندو کے علاوہ اور کوئی قوم نظر نہیں آتی۔ حالانکہ اس دوران سینکڑوں قومیں، فاتح کی حیثیت سے باہر سے آئیں۔ حکومت کی اس کے باوجود اس ملک میں ایک کا نام بھی الگ قوم کی حیثیت سے نہیں ہے۔ ان کی ذاتوں اور گوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی کوئی الگ قوم تھے لیکن ہندو سب ہضم کر گئے۔ حالی نے انہیں اس لئے ''اکال الامم'' کہا تھا یعنی قوموں کو نگل جانے والی۔ لیکن مسلمان ایک سخت ہڈی تھی یہ ہضم نہ ہو سکی اور ان کے گلے میں اٹکی ہوئی ہے۔

......☆......

اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللہِ عَلَی الْاَرْضِ، آمن رع، سورج کا دیوتا، سب سے بڑا دیوتا تھا فرعونی قوم کا:

یہ جو مشہور ہے کہ فرعون اپنی پرستش کراتا تھا غلط ہے۔ فرعون ان کا معبود نہیں تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ''آمن رع'' ان میں سب سے بڑا دیوتا تھا، سورج کا دیوتا، فرعون خود سورج دیوتا کی پرستش کرتا تھا۔ اس کے مندر تھے اور ہامان ان کا مذہبی پیشوا تھا اس کے لاؤلشکر تھے۔ اس دیوتا کی نسبت سے فراعنہ مصر کا لقب ''فاراع'' یعنی سورج دیوتا کا اوتار'' قرار پایا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جائے تھے۔ تقریباً تین ہزار قبل مسیح سے لیکر اسکندریہ کے زمانہ 332 ق م تک فراعنہ کے تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ یوسفؑ کے زمانے میں ہیکسوس خاندان (HYKSOS) جن کو عمالقہ کہتے تھے، حکمران تھا۔ مصر کے قدیم تاریخی زمانہ کو شاہی خاندانوں کی حکومت کے حساب سے تقسیم کیا ہے۔ 3407 ق م سے 2475 ق م تک پہلے چھ خاندانوں نے حکومت کی۔ یہ زمانہ قدیم بادشاہت کہلاتا ہے اس کے بعد زمانہ جاگیرداری کہلاتا ہے۔ اس میں ساتویں سے لیکر دسویں شاہی خاندان نے 2475 ق م سے 2160 تک حکومت کی۔

تیسرا زمانہ وسطی بادشاہت 2160 ق م 1580 ق م ہے۔ چوتھا 1580 ق م سے 945 ق م پر محیط ہے۔ ان دونوں زمانوں میں گیارھویں سے اکیسویں شاہی خاندان نے حکومت کی بعض مورخین نے 26 ویں شاہی خاندان کے بعد ان کو بھی مصری خاندانوں میں شمار کیا ہے۔ ان کے مطابق ایرانی، یونانی اور بطلیموس خاندانوں کا بھی مصری حکمرانوں میں شمار کیا گیا۔ 33 ویں خاندان بطلیموس کی آخری ملکہ قلوپطرہ تھی۔ 30ء میں مصر روما کا حصّہ بن گیا۔ پھر مملکت کی بجائے ایک صوبہ بن گیا۔

ہمارے قرآن حکیم کے کئے گئے تراجم کی بنیاد

قرآن کے موجودہ تراجم کی بنیاد:

قرآن کے انگریزی کے تمام تراجم ''G-sale ایک پادری سب سے پہلے 1734ء میں منظر عام پر لایا اور باقی تمام مترجمین نے اپنے تراجم Sale کے انگریزی ترجمہ کی ہی بنیاد پر کئے۔ G- Sale ایک متشدد اور متعصب عیسائی پادری تھا۔ تو باقیوں نے بھی بھیڑوں کی طرح ان کا ہی اسلوب اختیار کیا۔ صرف انگریزی میں ہی نہیں بلکہ اردو میں بھی یہی ہوا۔

قرآن کا لاطینی زبان میں پہلا ترجمہ ایک پادری Basle سے Theoder Billeander سے 1143ء میں منظر عام پر آیا۔ بعد میں یہ ترجمہ اٹلی، جرمنی اور ڈچ زبانوں میں چھپا۔ فرانسیسی میں A Durayer نے 1647ء میں پہلا ترجمہ کیا۔ بعد ازاں یہی ترجمہ 1649ء میں Alexander Rass نے انگریزی میں کیا۔ جارج سیل کا انگریزی ترجمہ 1734ء میں آیا اس طرح انگریزی میں JM Rod-well نے قرآن کی سورتوں کی شان نزول کی ترتیب سے 1861ء میں ترجمہ کیا اور EM.palmer کا ترجمہ 1880ء مشرق کی مقدس کتاب میں طبع ہوا۔ انہی میں ای ایچ بامز کی طرز پر Bell کا ترجمہ قرآن کریم بھی شامل ہے۔ R-Blachere کے فرانسیسی ترجمہ (1949-50) اور (R.Paret) کے جرمنی زبان میں 1962ء کے تراجم کو خاص شہرت ملی۔

❁❁❁

منطق کی یاوہ گوئی یعنی Absurdity علمِ نفسیات اسے Logical Fellacies کہتی ہے

ساحری یا منطق کی یاوہ گوئی یعنی Absurdity:

ساحری سے مراد غلط بات کو حق ثابت کرنا۔ صحیح ثابت کرنا ہے۔ یہ منطق یہی کرتی ہے باطل کی دلیلوں سے ہر جھوٹی بات کو سچا کرتی تھی۔ یہ درحقیقت علم کا ایک فن ہے ایسے دلائل کہ انسان چکرا جائے۔ جو دماغ میں آئے وہ اسے ثابت کر دیتا ہے۔

اس منطق کے مخالفین جب انتہا پر پہنچے تو تصوّف میں آ گئے۔ حالانکہ جو کچھ منطق اپنے دلائل سے کرتا ہے تصوّف وہی کچھ مثالوں اور تشبیہات سے کرتا ہے۔ غزالی (1111ھ) نے آدھی عمر تو منطق کی رو سے بسر کی۔ وہ ان غلط مفروضوں کو صحیح ثابت کرنے کے بڑے فلسفی تھے۔ آدھی عمر تو اس میں گزار دی۔ اس کے بعد کی آدھی عمر انہوں نے اپنے ہی خود وضع کردہ یا ثابت کردہ منطقی دلائل توڑنے میں گزار دی۔ یعنی چھوٹے بتوں کی جگہ بڑے بت رکھ دیئے۔ تصوّف کی زیادہ مسحور کن تشبیہات کی دنیا میں جا بسے۔

تصوّف کی ایک دو مشہورِ کن تشبیہات:

مرشد کی ایک تشبیہہ کہ انسان خدا کو براہ راست کیوں نہیں دیکھ سکتا، فکر و نظر کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس قرآن نے بچا لیا قرآن کہتا ہے کہ ''تم بلاؤ تو ہم جواب دینگے۔ کہا کہ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ (مرشد) ذرا سورج کی طرف آنکھ کر کے تو دکھاؤ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ کیا سورج نظر آتا ہے؟ کہا جی نہیں نظر آتا۔ کہا لو یہ پانی کا پیالہ۔ دیکھو اس کے اندر تو سارا سورج نظر آتا ہے۔ کہا کہ خدا کے ''جلال'' کو ''مرشد'' کے جمال کے وسیلہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ہے سحر۔ اس سحر سے ساحر پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ یہ تو جمال خداوندی ہے۔ جلال خداوندی کیسے ہے؟

مرشد نے کہا کہ جلال خداوندی بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہا کہ ذرا ایک مائی کی کپاس کو دیکھو کہ سورج کی شدید تمازت میں شام تک پڑی ہے مگر زیادہ سے زیاہ گرم ہوتی ہے۔ اگر اس کپاس کے اوپر آتشی شیشہ یوں سامنے رکھو کہ سورج کی کرنیں اس کپاس میں سے گزریں تو دیکھو گے کہ دو منٹ میں اسے آگ لگ جائے گی۔ براہ راست خدا کا جلال تو صرف تپش دے گا۔ جو آتشی شیشہ ہے، اس کے قلب سے جلال خداوندی کی کرنیں گزریں گی تو تم کو جلا کر بھسم کر دینگی۔ یہ لوگ چپک کر رہ جاتے ہیں ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا بڑا مشکل ہے۔ یہ سب سحر ہے اور مسحور کن ہے۔

انسانیّت کی بقاء انہی شخصیات کے صدقہ بچی ہوئی ہے جو دلائل کو دیکھ کر اپنا سر جھکا دیتے ہیں، فرعون کے مذہبی پیشوا کا سجدہ عظیم، حیران کن سجدہ!

ساری تاریخ میں عالم انسانیّت ان لوگوں کے طفیل بچی ہوئی ہے کہ جرأت ایمانی سے کام لے کر جب حقائق کو دیکھ لیا تو سجدہ ریز ہو گئے۔

وَاُلۡقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ (7:120-121-122)

نخواہم ایں جہاں و آں جہاں را — مرا ایں بسکہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوزو سرورش — بوجد آرم زمین و آسماں را

یہ ہے وہ سجدہ عظیم

مسلمانیم و آزاد از مکانیم — بروں از حلقہ نُہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کہ کزوئے — بہائے ہر خداوندے بدانیم

(جس سے ہر خدا کی قیمت جانی جاسکتی ہے)

فرعون نے کہا۔

قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَهٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَـكُمۡ‌ ۚ اِنَّهٗ لَـكَبِيۡرُكُمُ الَّذِىۡ عَلَّمَكُمُ السِّحۡرَ‌ ۚ (20:71) یہ تو ملی بھگت لگتی ہے۔ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰى ﴿۷۱﴾ (20:71) انہوں نے جواباً کہا۔

اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ‌ ﴿۱۲۵﴾ (7:125) پہلے رخ تمہاری طرف تھا۔ اب تمہاری طرف پشت اور منہ دوسری طرف ہو گیا ہے۔ قَالُوۡا لَنۡ نُّـؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالَّذِىۡ فَطَرَنَا (20:72) یعنی دلائل وشواہد کی بناء پر ایمان لائے ہیں کر لے جو کر سکتا ہے۔ فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ‌ ؕ اِنَّمَا تَقۡضِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ﴿۷۲﴾ (20:72) کہا انہوں نے۔ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَـغۡفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَاۤ اَكۡرَهۡتَنَا عَلَيۡهِ مِنَ السِّحۡرِ‌ ؕ (20:73) اقرار جرم اور فرعون کا شکریہ۔ وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَـمَّا جَآءَتۡنَا‌ ؕ (7:126) اگر کسی اور جرم میں مواخذہ کرتا تو یہ ذلت کی بات ہوتی۔ تیرا شکریہ۔ بڑے بلند

کردار کا ثبوت دیا ہے۔ تیرے ہاں جرم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جرم تو وہ شدید ہے جو خدا کے ہاں محرم بن کر جائے۔

اِنَّهٗ مَنۡ يَّاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ (20:74) تیرے پاس تو زندگی ختم سزا دیدی اور موت واقع ہوگئی مگر ادھر لَا يَمُوۡتُ فِيۡهَا وَلَا يَحۡيٰى ۝۷۴ (20:74) وَيَاۡتِيۡهِ الۡمَوۡتُ مِنۡ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ (14:17) اس کے برعکس وَمَنۡ يَّاۡتِهٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰى ۝۷۵ (20:75) جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَكّٰى ۝۷۶ (20:76)

قرآن کا معجزہ، موسیٰ علیہ السلام کو خاص راستہ کی نشاندہی، سَیَهۡدِیۡنِ (37:99)، رَهۡوًا (44:24)، یَبَسًا (20:77) کہا ہے، موجودہ تورات نے گواہی دیدی

تورات کا موجودہ ایڈیشن:

سمندر کو اگر معجزانہ طور پر پھٹ کر راستہ دینا تھا تو پھر سَیَهۡدِیۡنِ (26:62) کہ وہ یقینا ہمیں راستہ دکھا دے گا، کی ضرورت نہیں تھی۔ سَیَهۡدِیۡنِ (26:62) ایسا راستہ جس سے ہم سلامتی کے ساتھ منزل تک پہنچ جائیں گے۔ اگر راستہ کو سمجھنے کیلئے آج کا جغرافیہ بھی سامنے لے آیئے اگرچہ وہ اس دور سے ذرا مختلف ہے۔ مصر سے صحرائے سینا کی طرف راستے میں بحر قلزم یا بحر احمر یا (Red Sea) پڑتا ہے۔ یہ بحر احمر، بحر ہند سے الگ ہو کر عرب اور مصر کو دو قطعوں میں تقسیم کرتا ہوا بحرہ روم کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ آخر میں جا کر یہ بحر احمر دو چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ جاتا ہے بائیں طرف کی بڑی شاخ جو آج نہر سویز کے ذریعہ بحیرہ روم سے ملا دی گئی ہے۔ موسیٰؑ کے زمانے میں یہ نہر سویز موجود نہیں تھی۔ آج بحر احمر یا بحر قلزم کے اگلے سرے کو نہر سویز کے ذریعہ بحیرہ روم سے ملا دیا گیا ہے جہاں سے بحری جہاز سیدھے آتے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ بحیرہ روم سے ملا ہوا نہیں تھا۔ یہ نہر 165 کلومیٹر لمبی ہے۔ فرانسیسی انجینئر نے 1859ء سے 1869 تک اس کی پلاننگ اور نگرانی کی۔

اس وقت یہ بحرہ قلزم وہیں تک جاتا تھا اور پورے کا پورا سمندر میں نہیں جاتا تھا آگے دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اگر آپ کا رخ بحیرہ روم کی طرف ہو۔ تو بائیں طرف والی شاخ مصر کے ساحل کی طرف ہو گی اور دائیں سینا کی طرف ہو گی۔ جہاں آج فلسطین اور بنی اسرائیل ہیں۔ انہی دونوں شاخوں کے درمیان مثلث قطعہ میں سینا کی وادیاں ہیں جہاں بنی اسرائیل کو پہنچنا تھا۔

اب موسیٰؑ بحر قلزم کی اس شاخ سے مصر کی طرف آئے۔ تو آگے یہ دوسری شاخ تھی درمیان میں اور آخری حصّہ میں سمندر نہیں تھا بلکہ خشکی تھی۔ مدوجزر آتا رہتا ہے اور پانی بڑھتا ہے۔ جب اترتا ہے تو نیچے سے خشک زمین نظر آتی ہے دوسری جگہ قرآن نے اسے رَهۡوًا (44:24) کہا ہے۔ اس طرح پانی کا اوپر آکر نیچے جانا اور اس کے باعث خشک زمین کا ابھر آنا رَهۡوًا

674

(44:24) کہلاتا ہے رَهْوًا ؕ (44:24)۔جب پرسکون یعنی جب جوش باقی نہ رہے وہ پرسکون ہوجائے یہ تو ہوئے ایک معنی اور دوسرے معنی سمندر کا پیچھے ہونا اور خشک راستہ کا نمودار ہوجانا۔ دونوں صورتیں سمندر میں مد و جزر کی ہوتی ہیں۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ (44:24) فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ (20:77)، وہ جگہ جو خشک ہوچکی ہو۔ وہاں رَهْوًا ؕ (44:24) تھا۔ يَبَسًا ۙ (20:77) ہر وہ شے جو کبھی تر اور کبھی خشک ہوجائے۔ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ (26:62) تو ہمیں صحیح راستہ کی رہنمائی مل جائے گی۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ (44:23) موسیٰؑ تو بمعہ ساتھیوں کے نکل گئے۔ تو فرعونی لشکر نے بھی پیچھا کیا کہ نکل جائیں۔ تو مد و جزر تو کس کا انتظار نہیں کرتا۔ تو جونہی سمندر میں اترے تو پانی چڑھا اور غرق ہوگئے۔ سمندر کے پھٹنے کا قصہ تورات کا ہے قرآن کا نہیں ہے یہ تو ایک خشک راستہ تھا۔ جو پانی کے اترنے سے نکل آیا تھا اور موسیٰؑ قوم کو لے کر پار اتر گئے۔

تورات کا موجودہ ایڈیشن:

قرآن کا اعجاز کہ انتہائی مختصر الفاظ میں اصل حقائق سے پردہ اٹھا دیا۔ یہودیوں کی طرف سے تورات کا جدید ترین ایڈیشن 1962ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے ترجمہ بدل کر نوٹ دیا ہے کہ دور حاضر کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ موسیٰؑ قوم کو لیکر بحرہ قلزم کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ اس مقام سے لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا اور وہاں سرکنڈا اگا ہوا تھا۔ سرکنڈا تو سمندر میں نہیں اگتا وہ تو اس مقام پر اگتا ہے جہاں پانی آجائے اسے Red sea نہیں بلکہ Sea of Reeds سرکنڈے کی نسبت سے کہتے ہیں۔ یہ مقام نہر سویز کے قریب واقع ہے۔ یہ Red sea تھا۔ موسیٰؑ اس کے اندر نہیں گئے بلکہ اس کی شاخ کے کنارے سے گئے تھے جن کو سرکنڈے کا سمندر کہا جاتا ہے۔ قرآن نے چودہ صدیاں قبل اسے رَهْوًا ؕ (44:24)، يَبَسًا ۙ (20:77) کہا تھا۔

❁❁❁

دوسرا معجزہ کہ یہودی مصری دیوتا (Osiris) عزیر کی پوجا کرتے تھے

Osiris جس کی پرستش یہودیوں نے شروع کردی اور انکار کرتے رہے کہ ہم نے تو کبھی بھی عزیر دیوتا کی پرستش نہیں کی جبکہ قرآن نے اس دعویٰ کو غلط قرار دیا یہ مصر کا ''عزیر دیوتا'' تھا جس کی وہاں قبطی قوم پرستش کرتی تھی ان کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کردی۔ ہروڈوٹس نے آج سے 2½ ہزار سال قبل اس دیوتا کا نام Osiris (عزیرس) لکھا ہے۔ یونان میں Nouns کے بعد ''س'' ہمیشہ زائد ہوتی ہے۔ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام ''ایزاری'' آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سانڈ پوجا جاتا تھا۔ اس کا نام ''ایزارہاپی'' یعنی عجل عزیر تھا۔

اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ''فتاح'' یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا ابن عزیر مانا جاتا تھا۔ مصر کے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین تک پھل چکے تھے یہی وہ بچھڑا (عجل) تھا۔ جس کی پرستش یہودیوں نے موسیٰ کی غیر حاضری میں شروع کردی تھی۔ اس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ موسیٰ نے ان کو گوسالہ پرستی سے روک دیا تھا۔ مگر بعد میں دوبارہ اس کی پرستش شروع کردی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تعلیم کے بعد شمالی سلطنت کے بادشاہ یبروبعام اوّل (933ق م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کردی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

مصر سے نکلتے وقت کچھ غیر اسرائیلی بھی ایمان لا کر ساتھ آ گئے تھے۔ ان میں سمیری قوم کا ایک آدمی سامری تھا یہ قوم عراق سے نکل کر مصر تک ان کے تعلقات تھے۔ سامری نے ان کے زیورات سے سانڈ بیل یا گائے کی شکل کا بت بنایا یہ اہل فرعون اور مصریوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔

بچھڑے کا بت بنالیا:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ (9:30) وحی آنے کے باوجود انہوں نے مصری دیوتا عزیر کو Osiris کو خدا کا بیٹا تسلیم کیا اور پرستش شروع کردی یہودیوں نے اس کی وہیں تردید کردی تھی یہ کہتے ہیں کہ ہم تو عزیر

کو ابن اللہ نہیں مانتے۔ ہمارے ہاں انہوں نے روایات میں عزیر کو عزرا سمجھا۔ یہودیوں کے ہاں عزرا کا بلند مقام ہے۔ یہ مروّجہ تورات اسی نے مرتب کی ہے۔ جسے عہد نامہ عتیق کہا جاتا ہے کہ عزرا نبی (یاد رہے کہ یہودی لٹریچر میں نبی کا لفظ قرآنی اصطلاح کے مفہوم میں نہیں آیا۔ اس سے مراد ہیکل کا ایک اعلیٰ منصب دار تھا۔ تورات میں عزرا کو فقیہہ کہہ کر پکارا گیا) اس نے تورات یعنی سلسلہ اوّل کی پانچ کتابوں اسناد ''پیدائش خروج، احبار، گنتی، استثناء'' کو از سرِ نو مرتّب کر کے واقعات کو مورّخانہ حیثیت سے قلمبند کیا۔ عزرا نے ان اسناد کو کسی مواد کے تحت از نو مرتب کیا تھا۔ تاریخ اس پر خاموش ہے۔ عزرا فقیہہ کے بعد نحمیاہ نبی نے سلسلہ دوم کی چھوٹی بڑی 22 کتابوں کو جمع کیا۔ اس کے بعد فلسطینیوں کی طرف یونان کا سیلاب آیا۔ 18 ق م میں انٹونیس انطاکیہ کے یونانی بادشاہ نے مقدس صحیفوں کو جلا دیا۔ اس کے بعد یہودا مقابی کی ہمت سے مقدس صحیفوں کو از سرِ نو جمع کیا گیا اور اس دفعہ پہلے دو سلسلوں کے ساتھ سلسلہ سوم کی 12 کتابوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ بعد میں مفسرین نے عزیر کو عزرا سمجھا اس پر یہودیوں نے پھر اعتراض کر دیا کہ ہم تو عزرا جی کو بھی ابن اللہ نہیں مانتے۔ بحر حال بات الجھاؤ میں رہی قرآن نے صرف یہ کہا کہ

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ (9:30) مزید کچھ نہیں کہا اور نہ زمرۂ انبیاء میں ان کا نام لیا۔

جدید تحقیقات میں خود تسلیم کر لیا:

یونانی زبان میں Nouns کے آخر میں جو الف آتا ہے۔ وہ درحقیقت ''ی'' ہوتا ہے۔ یونانی میں ''اسرا'' عبرانی میں ''اسری'' تھا عزرا تھا عبرانی میں ''عزری'' تھا۔ اس لئے یونان کا ''اسرا'' عبرانی کا ''اسری'' اس طرح یونان کا ''عزرا'' عبرانی کا ''عزری'' تھا۔ یہی عزری مصر میں عزیر تھا۔ مصری اس کی پوجا کرتے تھے۔ اس دیوتا کو ابن اللہ مانتے تھے۔ بنی اسرائیل مصر میں اس کی پرستش کرتے تھے۔ مصریوں کی دیکھا دیکھی اسرائیلی بھی اسے یہی کچھ مانتے تھے۔ یہ اس عزیر کو ابن اللہ مانتے تھے۔ اس کا خود انہوں نے اعتراف کیا ہے اب نئے انسائیکلو پیڈیا میں یہ چیز اس اعتراف کے ساتھ موجود ہے کہ یہی وہ عزیر تھا جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے اب بائبل کے نسخوں کی جو تصحیح ہوئی ہے اب یہ بات واضح ہوگئی کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود تھا لیکن ان کے ہاں غلطی یہ ہوگئی کہ انہوں ''اسرا'' کو ''اسری'' لیا پھر اسری کو عبرانی میں اسیری لیا۔ اس طرح لفظ ''عزیر'' کو اسیر لکھ دیا اور اس کا ترجمہ قیدی کر دیا۔ پر ان کی تحقیق ہے اب لیگارڈ نے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کر دی ہے۔ یہ عزیر ہے جس کو یہ ابن اللہ مانتے تھے۔ ہمارے ہاں یہ عزیر حضرت عزیر بنے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی تحقیق۔ قرآن اب ان کی کتابوں کی تصحیح کر رہا ہے۔ ان کے محققین خود قرآن کی تصدیق کر رہے ہیں۔

انسان کی خام خیالی اور خدا کا تصوّر

اہل مصر کا سب سے بڑا دیوتا سانڈ یا بیل یا بچھڑا کہیئے۔ اس کا سر بیل کا ہوتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ جتنی زراعتی قومیں تھیں جن کی معیشت کا دارومدار زراعت پر تھا۔ وہ بیل کو دیوتا بنا دیتی تھیں تا کہ وہ محفوظ رہے۔ مثلاً جب آریہ ہندوستان میں آئے تو ان کے ہاں سورج کی حرارت، دریا کا پانی اور بیل بڑی اہمیّت کے حامل تھے۔ تو ان چیزوں کی حفاظت کیلئے ضروری تھا کہ ان کو دیوتا بنا دیا جائے۔ اس طرح کے موسم میں جہاں شدت کی گرمی پڑتی تھی۔ پیپل بھی دیوتا اور بڑ کا درخت بھی دیوتا بنا دیئے گئے۔ تا کہ ان کے سائے تلے بیٹھا جا سکے اور لوگ ان کو لوٹ کھسوٹ کر نہ لے جائیں۔ اس طرح سے انسان کی خام خیالی، یوں خدا کے تصوّر میں ڈھلی۔ اس طرح اگر قبریں اینٹوں سے بنا کر چوکیدار حفاظت کیلئے نہ بٹھایا جائے تو کچھ عرصہ بعد ایک اینٹ بھی نہ رہے۔ اگر انہی قبروں کو مقبرہ کا مقدس رنگ دیا جائے تو لوگ سجدے کرنے لگ جاتے ہیں اور ان کی طرف پیٹھ بھی نہیں کرتے۔ اب ان زرعی قوموں کے جو سیانے تھے انہوں نے سوچا کہ ان چیزوں کو مقدس بنا دو۔ دیوتا بنا دو۔ یہ کرنا، ان کو لوٹ کھسوٹ سے بچانے میں مدد دے گا۔ اس لئے گائے کا ہندوؤں کے نزدیک ذبح کرنا حرام ہے۔ یہ بات زراعت کی وجہ سے ہے اگر گائے کو ذبح کر کے کھاتے چلے جائیں تو ان کے ہاں بیل ہی پیدا نہ ہوں اور دودھ دینے والی گائے ختم ہو جائے۔ بیل پیدا نہ ہوں اور آخر کار زراعت کا خاتمہ ہو جائے۔ اس لئے زرعی معیشت کو بحال رکھنے کیلئے، جن اشیاء پر معیشت و زراعت کا دارومدار تھا۔ انہیں دیوتا بنا دیا۔ گائے کو ماتا دیوی، گنگا دیوی تا کہ پانی ضائع نہ کریں۔ مصریوں کے ہاں بھی چونکہ معیشت زرعی تھی۔ اس لئے نیل کی پرستش تو ہوتی تھی اور ہر سال ایک انسان کی نسل بھینٹ چڑھاتے تھے۔ تا کہ اس کی طغیانیوں میں فرق نہ آ جائے انہی میں یہ سانڈ دیوتا، بیل، گائے یا بچھڑا کہیئے اس کے سر کی شکل سانڈ کی سی ہوتی تھی۔ یہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ ان کو دیوتا اس لئے بنایا تا کہ ان کی زراعت قائم و دائم رہے اس لئے عزیر کو دیوتا بنایا۔

❁❁❁

قرآنی پروگرام کی تکمیل کا راز، جلدی نہ کرو،
وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ (20:114)

قرآن کے پروگرام کی تکمیل کا راز جلدی کرنے میں نہیں ہے:

قرآنی پروگرام کی تکمیل کے سلسلے میں مکمل ہدایات تک انتظار کرنا وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ (20:114) خیال رکھو کہ جب تک کسی (مرحلہ) کے متعلق وحی کی رو سے مکمل ہدایت نہ ملے تو اس میں جلد بازی اور عجلت سے کام مت لو۔ ٹھیک ہے تمہارے دل میں ہے کہ یہ پروگرام جلد از جلد محسوس شکل میں سامنے آئے۔ مگر

وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰۤى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ ز (20:114) ساری کڑیاں جب تک وحی کے ذریعہ سامنے نہ آ جائیں۔ جلدی نہ کرنا ورنہ فساد ہو جائے گا۔

بلند ترین مقصد کی کامیابی کا راز تحمل تمنا کے ساتھ ساتھ طالب علمانہ ذہنیت میں مضمر ہے:

کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے اور پروگرام قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس لئے اسے تنزیل یعنی بتدریج نازل کیا ہے۔

؎ عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

صبر اور تمنا تو ہے مگر یہ پروگرام تدریج چاہتا ہے۔ ایک ایک قدم لیکر پختگی تک پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ یہ تو بڑے صبر اور حوصلہ کا پروگرام ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کل بویا۔ گوڈی کی اور پانی دیا تو چوتھے دن فصل حاصل کر لی۔ کتنی اچھی سکیمیں لیکر اٹھنے والے پرخلوص لوگ محض اس لئے فیل ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اس میں جلدی سے کام لیا۔ وحی کا پروگرام تو

؎ آہ کو چاہیئے ایک عمر اثر ہونے تک

ہمارے ہاں کے یہ تمام نام نہاد علماء کے رویوں سے نخوت اور تکبر ٹپکتا ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ (2:88)اس لئے ہمیں کسی نئے علم کی ضرورت نہیں ہے ہم ان تمام علوم سے بے نیاز ہیں۔قرآن کے طالب علم کی تو یہ ذہنیت نہیں ہے وہ تو عمر کے آخری حصّہ تک طالب علم رہتا ہے۔ پروفیسر Sulliven اپنی کم مائیگی اور بے بساطی کا برملا اظہار کرتا ہے۔ یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ آج زندگی کی ابتداء کے بارے میں نیوٹن (1727) بھی وہیں کھڑا ہے یہ سیلوان ایک بڑا سائنسدان ہے کتاب ہے Limitations of Science اس کتاب کا آخری فقرہ یہ ہے کہ ''میں اور میرے ہم عصر جو کچھ کہہ چکے ہیں اس کے باوجود میں کہونگا کہ سائنس کی دنیا میں حرف آخر، آخری انسان پر چھوڑ دینا چاہئے۔''

یہ ہے طالب علمانہ ذہنیّت جو کشادہ نگاہ پیدا کرتی ہے۔ وسعت قلب کے ساتھ، راستے بھی روشن کرتی ہے وہ ہستی جو علم انسانی کے بلند ترین افق پر ہے، اس سے کہا جارہا ہے کہ وَلَا تَعْجَلْ (20:114) جلد نہ کر اپنی سوچ طالب علمانہ رکھ اور تمنا کر رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ (20:114) اس طرح۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ (75:16) کسی معاملہ میں عجلت مت کرو عملی قدم اٹھانے میں اور وحی کا انتظار کرو اور دعا کرو رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ (20:114)۔ علم ہونے کے بعد قدم اٹھاؤ۔

❁❁❁

کائنات میں دو عظیم انقلابات
قصّہٴ آدم کی حقیقت

عظیم انقلاب کا اعلان:

قصّہٴ آدم کی لم یہ ہے کہ کائنات میں دو عظیم انقلابات آئے ہیں کائنات کی تخلیق ہوئی تو اشیائے کائنات کو مجبور پیدا کیا گیا۔ ان کو ان مقرر کردہ قوانین پر چلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کیونکہ ان کو اس کا اختیار ارادہ ہی نہیں دیا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کریں۔ ان کی فطرت کے اندر وہ قوانین ودیعت کر دیئے۔ ان کو خارج سے کہیں بھی رہنمائی نہیں ملتی تھی۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَ ہُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ (16:48) یہ جو چیزوں کے سائے دائیں بائیں ڈھلتے رہتے ہیں۔ (اور اس سے انسان یقین کے ساتھ وقت کا انداز کر لیتا ہے کہ یہ کس طرح ہوتا ہے اس طرح چاند، سورج اور روشنی کے دیگر سرچشمے وہ اشیاء جو ان کی روشنی کے سامنے آتی ہیں) سب اس کے قوانین کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور سرکشی کا یارا نہیں ہے یعنی یہ مجبور محض ہیں مگر باہر سے بھی کوئی ان پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ یہ سب ان قوانین کے تابع چلنے پر مجبور ہیں یہ تھی مثال جو ان بدوؤں کو سمجھانی تھی اور آئن سٹائن کو بھی کہ کائنات میں یہ تمام چیزیں از خود کوئی اختیار و ارادہ نہیں رکھتیں لیکن انسان جو صاحب اختیار ہے وہ بھی اپنے سایہ کی سمت نہیں بدل سکتا۔ یہ ہے اس کے اپنے سایہ کی مجبوری کہ وہ سایہ اس کے کنٹرول میں نہیں ہے چاہے وہ کتنا ہی عقل و دانا کا مالک ہو۔ چھوٹی مثال دیکر بات سمجھا دی۔

وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ ہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۴۹﴾ (16:49) یہ تمام سرتابی نہیں کر سکتے۔ یَخَافُوۡنَ رَبَّہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۵۰﴾ (16:50) حکم خداوندی سے سرتابی نہیں کر سکتے۔

فعل اور عمل کا قرآنی مفہوم:

قرآن نے ہر جگہ انسانوں کو ایمان لانے اور عمل کرنے کا کہا ہے۔ اعمال کا کہا ہے۔ فعل کے معنی بھی کام کرنا ہے اور عمل کا بھی۔ اعمال و افعال ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ عربی میں تو مرادفات نہیں ہوتے اور جن کو ہم مرادفات کہتے ہیں ان کے اندر بھی ایک باریک Shade (امتیازی نشان) ہوتا ہے۔ جو زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ عمل اور فعل میں فرق ہے۔ عمل کیلئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بالارادہ ہو اور دوسری شرط یہ کہ مسلسل ہو۔ جو کام بھی ہنگامی طور پر کیا جائے۔ خواہ بالارادہ ہی کیوں نہ ہو۔

وہ اس کو بھی ''عمل'' نہیں کہتے تھے۔ قرآن نے ہر جگہ ''اِعْمَلُوْا اِعْمَلُوْا'' کہا ہے یہاں یَفْعَلُوْنَ کہا ہے یعنی وہ سارا کچھ بغیر ارادہ کے کرتے ہیں۔ یہ مجبور محض ہیں۔

کائنات میں دو عظیم انقلابات:

ایک انقلاب تو یہ آیا کہ انہی اشیائے کائنات کے اندر ایسی مخلوق پیدا کی جو ان سب سے الگ تھلگ ہے۔ صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ یہ ہے ایک بہت بڑا انقلاب۔ یہ ہے پہلا انقلاب کہ اختیار و ارادہ تو صرف خدا کو حاصل ہے اور یہ صفت خداوندی اس کو دیدی گئی ہے۔ ایسا انقلاب کہ ایک صاحب اختیار و ارادہ مخلوق کا پیدا کر دینا پہلی مخلوق سے بالکل Departure (الگ) ہے۔ Deviation (انحراف) ہے۔ اب یہ ان مجبور اشیاء سے کام لے گی۔ وہ تمام مجبور اشیاء اس کے سامنے جھکا دی گئی ہیں۔ لیکن ایک ایسا مجمع، جہاں اس صاحب اختیار و ارادہ مخلوق کو اس کرہ ارض پر ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے تو پھر اس کا جو حشر ہوگا۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب جو صاحب اختیار کسی خارج خدا کے قانون کے تابع نہ چلے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق اختیار و ارادہ استعمال کرے تو اس کا نتیجہ تو ہر سو فساد ہی فساد ہوگا۔

۞۞۞

حملِ امانت والی آیت کا غلط مروّجہ مفہوم (33:72)

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَحَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا ﴿ۙ۷۲﴾ (33:72) انسان کو دیکھو کہ یہ اس امانت میں خیانت کرتا ہے اگر اسے وحی کے بغیر چھوڑ دیا جائے تو یہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ کسی اور کا کیا بگاڑے گا۔ یہ حال ہے اس انسان کا جو کسی خارج کی قوّت کے ماتحت نہ ہو اور صاحب اختیار و ارادہ ہو اور ان کو کوئی ہدایت بھی نہ ملی ہوئی ہو اور ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ تو آدم یعنی بنی آدم کے دو بیٹوں کا ذکر ہے کہا آدم کو پیدا کیا۔ وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ (20:121) تو آدم نے اپنے رب کے قوانین سے سرکشی برتی۔

❋❋❋

انسانی فطرت کی کہانی قرآن کی زبانی

فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا ؕ (30:30) خدا کا قانون تخلیق جس پر اس نے کائنات کی تخلیق کی تو انسان کو بھی اس قوانین کی رو سے تخلیق کیا۔

جو چیز بھی فطرت رکھتی ہے تو اس کی طرف نبی نہیں آیا۔ کیونکہ یہ ہدایت اس کے اندر ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ عظیم انقلاب کہ اسے اختیار وارادہ دیکر آزاد چھوڑ دیا گیا تو پھر کام کیسے چلے گا۔ کہا یوں چلے گا۔ قَالَ اهۡبِطَا مِنۡهَا جَمِیۡعًۢا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّكُمۡ مِّنِّیۡ هُدًی ۬ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشۡقٰی ﴿۱۲۳﴾ (20:123) یہ انبیاء کی وساطت سے رہنمائی آتی رہے گی۔ لیکن اختیار وارادہ سلب نہیں کریں گے۔ لَاۤ اِكۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ ۟ۙ (2:256) اب رہنمائی خارجی کائنات کو بھی دی اور اس اختیار وارادہ والے کو بھی دیدی۔ وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۟ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَكۡفُرۡ ۙ (18:29) روشنی دیدی گئی ہے اختیار و ارادہ سلب نہیں کیا گیا یہ ہے عظیم انقلاب۔ کائنات کے تخلیقی نظام کے اندر ایک بہت بڑا انحراف (Departure)۔ اب جو اگلا انقلاب ہے اس کی باری تو بہت دیر کے بعد جا کے آنی ہے۔ انبیاء کا اس سلسلہ رشد و ہدایت کو پہنچانا، اس پروگرام پر لوگوں کے سامنے خود عمل کر کے دکھا دینا، پھر انسان کا اس کائنات کے اندر موجود رہنا، یہ ایک ایسی چیز تھی جس کی ضرورت بھی انسان کے بالغ ہوجانے کی حد تک تھی۔

نزول وحی کے سلسلے میں انسان کا عہدِ طفولیت:

جب تک بچہ نابالغ رہتا ہے۔ انگلی پکڑ کر چلانے والا آدمی، اس کے ساتھ رہتا ہے۔ انگلی چھوٹ جائے تو بچہ رونے لگتا ہے۔ جب ساتھی آگے چلا جائے تو بچہ حیران و ششدر ہوجاتا ہے، چیختا چلاتا ہے۔ نوع انسانی کو ہدایت تو خارج سے دی۔ لیکن وہ عہد طفولیت سے چلا آرہا تھا۔ بچہ تھا۔ قدم قدم پر نبی، ہر قوم میں نبی، ہر قریہ میں، رسول انگلی پکڑ کر چلا رہے ہیں۔ ذرا سا بہکا تو پکڑ کے چلانے والا ایک اور آ گیا۔ انسان جامد تو نہیں ہے۔ یہ تو بالغ ہوتا چلا جارہا تھا۔ بچہ آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کر کے بالغ ہورہا تھا۔

اب وہی بچہ جب جوان ہوجائے تو پھر ذرا انارکلی میں اس کی انگلی پکڑ کر دکھائیں۔ تو شرما کر انگلی جھٹک دے گا۔ پھر راستہ پر نشانات راہ کی ضرورت تو اب بھی پڑے گی۔ چاہے وہ کتنا بڑا کیوں نہ ہوجائے۔ اگر دوراہے پر سائن پوسٹ نہیں ہے۔ تو پھر وہ

674

مکان، ہی ڈھونڈتے بھول بھلیوں میں گم ہو جائیں۔ یعنی اب انسانیت بلوغت تک آ پہنچی۔ اب مستقل سائن پوسٹ خدا نے لگا دیئے ہیں اور ایسے کہ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ (10:64) اب ان نشانات راہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ کہا کہ بارش اور طوفان سے بھی یہ نشانات نہیں مٹیں گے کیونکہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ (15:9) ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب ان کو مٹا نہیں سکے گی۔

دوسرا انقلاب، ختم نبوّت انسانیت کے بالغ ہونے کا اعلان:

ہم نے ایسے محفوظ سائن پوسٹ لگا دیئے ہیں۔ یہ نہ بجھ سکتے ہیں نہ گر سکتے ہیں کہا کہ اب انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ تو شرف انسانیت کا تقاضا تھا کہ وہاں نبوّت ختم ہو جاتی۔ انسانیت بالغ ہوگئی۔ اب یہ خدا کی طرف سے سرٹیفکیٹ ہے کہ اب تم بالغ ہو گئے ہو۔ تم خود راستہ چل سکتے ہو۔ اب تمہیں انگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہیں ہے۔ ختم نبوّت تو شرف انسانیت کی دلیل ہے۔ مجدد، امام، مہدی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ عقیدہ تو اس قرآنی انقلاب کے خلاف ہے۔ یہ عقیدہ کہ اس کے بعد انگلی پکڑ کر چلانے والا پھر آئے گا۔ شرف انسانیت کی تذلیل ہے۔ پہلا انقلاب کہ ''صاحب اختیار و ارادہ بنایا اب دوسرا عظیم انقلاب کہ اتنے عرصہ سے ایک ہی روش پر انسان چلے آ رہے ہیں۔ انبیاء ایک کے بعد دوسرا آتے رہے۔ ہر قوم، ہر قریہ، ہر ملک میں، یہ تو بچہ کی بلوغت کیلئے تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو بڑی زیادتی ہوتی اگر اس کو قیامت تک ایسا رکھتا کہ یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہی نہ ہوتا۔ یہ تو قِیٰمًا لِّلنَّاسِ ہے تا کہ انسانیت اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے۔ کوئی فرد یا قوم کسی دوسرے فرد یا قوم کا محتاج نہ رہے۔ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو نوع انسانی کا بالغ ہونے وقت ہی نہ آتا بچہ اب بالغ ہو گیا۔ انسانیت اب کھڑی ہوگئی۔ بالغ ہونے کے بعد بھی اگر وہ سلسلہ جاری رکھتا۔ بچہ شرف انسانیت سے عاری ہو جاتا۔ یہاں آنے کے بعد کہہ دیا۔ اب فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (18:29) اب یہ فَمَنْ شَآءَ (18:29) کی بجائے آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اپنے اختیار و ارادے سے انکاری ہو گئے ہیں کوئی راستہ بنانے والا آئے گا تو پھر چلیں گے۔ انتظار کر رہے ہیں۔ ساری قومیں آنے والا انتظار کر رہی ہیں۔ ہندو کلنکی کی اوتار ''بدھ مت'' سیتا کا مجوسی مترا کا۔ عیسائی مسیح کا اور ہم مہدی کا۔ اب اس کے ماننے والے بھی انتظار میں ہیں جس نے کہا تھا کہ اب انسانیت بالغ ہوگئی کسی کی انگلی پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ (6:115) کہا اب انتظار مت کرو۔ کہنے والا چلا گیا۔ یہ قرآن دینے کے بعد اور جن کو یہ تعلیم دی گئی تھی وہ اس انتظار میں کھڑے ہیں اور زندگی بھر انتظار کرنے والی قومیں سوئی رہتی ہیں۔ عمل سے بے گانہ ہو کر ذات کی پستیوں میں کھو جاتی ہیں اب جنہوں نے یہ مذہب چھوڑا قصہ ہی ختم کر دیا۔ کسی کے انتظار میں رہنے کے بجائے، غلط راستہ ہی صحیح، صحیح راستہ تو کبھی مل جائے گا۔ قرآن نے کہا تھا یاد رکھو بیٹھا رہنے والا کبھی چلنے والے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ غلط ہی سہی چل تو پڑو۔ اب یہ سارے اسی انتظار میں ہیں کہ وہ آنے والا آ کر جگا دے گا۔

مذہب اور دین کا بنیادی فرق:

یہ ہے مذہب کی تفسیر جو ایک مقام پر کھڑا ہے سوائے اس کے کہ اس کے ہاں نام یا الفاظ بدلے ہوئے ہوتے ہیں جبکہ دین نے انسان کو بالغ قرار دیا ہے۔ صاحب اختیار و ارادہ ہے اور اس کی کوئی فطرت نہیں۔ اب اسے مستقل رہنمائی دیکر آزادی دیدی گئی کہ ان میں سے جو راستہ اختیار کرے۔ ٹھیک ہے غلطیاں بھی کرے گا۔ غلط راستے پر چل کر لیکن اس کا جو شرف انسانیّت ہے اس سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

اب اس آیت میں آدم سے کہا گیا تھا کہ وحی کی رہنمائی نہ چھوڑنا۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ (20:115) اصل بات یہ ہے کہ اس میں عزم کی پختگی نہیں ہے۔ یہ ہے کمزوری اس میں جو ایمان سے رفع ہو سکتی ہے یعنی قصہ آدم سے شروع کیا کہ وہ ابتداء تھی اور یہ اب جو وحی تمہارے پاس آئی ہے تو یہ اس کی انتہا ہے بات تو وہیں سے شروع کی یعنی انسانی اختیار و ارادہ ہے۔ وحی اور انبیاء کی ضرورت اس لئے پڑی کہ آدم کی سرگذشت ملاحظہ کریں۔ ہم نے اسے رہنمائی دی۔ اس نے عہد کر لیا ہم اس آدم کی اولاد ہیں۔ فَنَسِيَ (20:115)۔ اس نے عہد کو ترک کر دیا۔ یعنی معصیت سے مراد سرکشی ہے۔ عہد و اقرار کے بعد تو عزم کی ضرورت تھی۔ رسول ﷺ سے کہا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ (3:159) فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (46:35) اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿٣٠﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾ ؕ (41:30-31) کون ہونگے یہ خوش بخت۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (76:30) تم وہی چاہو جیسا کہ قانون خداوندی کا منشا ہے۔ تو موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور مستقبل بھی خوشگواریوں میں بسر ہوگا۔

نسلِ آدم میں نسلی امتیاز اور مفادات کی ابتداء کب اور کیوں ہوئی؟

ماہرین علم الانسان (Anthropologists) نے تحقیقات کی ہیں اور کرتے جا رہے ہیں کہ ''شروع سے انسان کی سرگذشت کیا تھی؟'' سب سے پہلے انسان کی موجودگی، پھر وہ کن کن ادوار سے گزرے اور یہ ساری تحقیقات بعینہ وہی ہیں جو قرآن میں تمثیلی انداز میں بیان ہوئی ہیں۔

نسلِ آدم میں نسلی امتیاز اور مفادات کی ابتداء:

ایک مخصوص آبادی تھی۔ رزق کی بڑی فراوانی تھی۔ یہ ہے ان ماہرین کی تحقیق کہ تیری میری کا امتیاز ناپید تھا۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن نے کہی۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) بھوک لگے تو پیٹ بھر کر کھانا کھالے سامان نشوونما کی بڑی فراغت تھی۔ معاش اور رزق کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ دیگ کا پلاؤ تو نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دیگ کے سارے اجزاء موجود تھے۔ میری اور تیری کا امتیاز نہیں تھا۔ قرآن نے اس شجر کے پاس جانے سے منع کردیا۔

تخلیق کائنات کے وقت فطرت کی قوتوں کا ظہور:

پہلے پوری آبادی انسانوں کی ''میری اور تیری'' کی تفریق سے آزاد تھی۔ پھر ان میں قبائل کی تفریق پیدا ہوگئی۔ اب اولاد ہوئی تو اس سے ایک خاندان بنا۔ گویا اب یہ ہوا ''یہ میرا بیٹا وہ اس کا بیٹا یہ میرا اور وہ اس کا یہ روٹی میرے بیٹے کیلئے اور وہ تیرے بیٹے کیلئے۔ اب چھوٹے سے پیمانے سے نسلی امتیاز شروع ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ سب انسان تھے۔ اب پہلا ٹکراؤ جسے قرآن نے خونریزی کہا کی ابتدا ہوئی۔ اب جن کی افرادی قوت زیادہ تھی۔ تو انہوں نے وسائل رزق پر زیادہ سے زیادہ قبضہ جمالیا۔ اب یہ اس کے کھیت ہوگئے اور یہ میرا باغ ہوگیا۔ اب یہ چیز نہ رہی کہ جس کو بھوک لگے وہاں سے کھالے۔ جو خاندان کمزور رہ گیا وہ ان کے مقابلے میں دشواری کی زندگی بسر کرنے لگ گیا۔ آہستہ آہستہ یہ مفلس ہوتے چلے گئے۔ جب یہ ان کیلئے کام کرنے والے بن

گئے اور وہ مالک۔ اس طرح دو طبقے وجود میں آ گئے۔ یہ ہے تحقیق علم الانسان کی آج جو سامنے لا رہے ہیں۔

قرآن نے قصہ آدم کو تمثیلی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ آج کی تحقیق اس کے ایک ایک جزو کی تائید کرتی جا رہی ہے۔ اسے سامنے رکھیے تو ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ قرآن نے کہا کہ کائنات کی تخلیق ہوئی۔ تو یہ فطرت کی قوتیں۔ Natural forces موجود تھیں۔

پانی، ہوا، روشنی زمین اور اس میں زراعت کی صلاحیت یعنی ملائکہ اور دوسری چیز انسان کے اپنے جذبات۔ ان جذبات سے ذاتی مفادات، میری، تیری پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو متضاد چیزیں سامنے آ گئیں۔ فطرت کی قوتوں پر قابو پا لینا تو اس کیلئے بڑا آسان ہے اور یہ ہو رہا ہے مریخ تک پہنچ رہے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کنٹرول نہیں رکھ سکا۔ یہ جو ''اپنے پر کنٹرول رکھنا'' کہا گیا ہے اسے قرآن نے ابلیس یا شیطان کہا ہے۔

میری اور تیری کے قصے کی ابتداء اور اس کا علاج:

اب اس تصادم، اختلاف کی ابتداء اس ''تیری میری'' یعنی اپنا اپنا مفاد اس سے ہوتی ہے۔ اس سے انسانیت برادری، گروہوں، نسلوں، قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئی۔ پھر ان کے اندر طبقات نے جنم لیا۔ ایک امیر اور طاقتور، دوسرا مفلس و ناتواں، حالانکہ ابتداء میں یہ تفریق نہیں تھی۔ اب کائنات کا پہلا انقلاب تو یہ تھا کہ یہ نوع اختیار و ادارہ کی حامل قرار پائی۔ انسان نے میری تیری سے ابتدا کی قبضے کر لئے۔ محتاج بھی ہو گیا، امیر بھی ہو گیا، لاتعداد طبقات نے جنم لے لیا۔ اب کیا اس کا کوئی علاج بھی ہے یا اس طرح رہے گا؟

قرآن نے بتایا کہ اس کا علاج انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ اس کا علاج صرف ان قوانین کی رو سے ہو سکتا ہے جو ایسی ہستی کی طرف سے ملیں جو اس ''میری اور تیری'' کے تصوّر میں انسان کا شریک نہیں۔ وہ تو خالق ہے۔ وہ تو رزق دیتا ہے مگر خود کھاتا پیتا نہیں ہے ''کوئی ایسا ہی وہ قانون دے سکتا تھا جو دوسروں کو دیتا چلا جائے۔ لیکن اسے کچھ لینے کی ضرورت ہی نہ ہو'' اب اگلا مسئلہ نسل پرستی اور طبقاتی تقسیم کا ہے جو خود ان تمام تعصّبات سے بالا ہو تو ایسا قانون تو وہی دے سکتا تھا۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ (112:3) کہا کہ ان قوانین کی رو سے معاشرے کی تشکیل کرو تو اس میری اور تیری کی فساد انگیزیوں سے نکل آؤ گے اس طرح یہ پوری انسانیت برادری بن جائے گی۔ جیسے پہلے تھی۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ (10:19) یعنی ابتداء ایک برادری تھی۔ پھر مفاد پرستی سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ خاندانی قبائلی، قومی، نسلی، طبقاتی اس کے بعد

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۝ (2:213) وہ انبیاء ان کو اس فساد انگیزی سے نجات کا طریقہ بتاتے کہ معاشرہ کو اقدار خداوندی کے تحت تشکیل کرو جو تمہارا معاشرہ ایک عالمگیر انسانیّت کا ہو جائے گا۔

قصہ آدم کا قرآن کا محاکاتی انداز:

بات تو معیشت کی تھی جہاں سے انسان نے اوّلین دور شروع کیا ہے۔ پھر آگے چلا۔ پھر اس معیشت کی بنیادوں پر اس کی سیاست، تمدّن، تہذیب، یہ سارے بکھیڑے بعد میں پیدا ہوئے۔ اگر انسانیت ایک عالمگیر برادری بن جائے تو یہ سارے امتیازات اور فساد انگیزیاں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ اسے ذہن میں رکھئے تو قصہ آدم آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ ہنری فورڈ کے الفاظ میں ''جو کچھ معاشی طور پر صحیح ہے۔ وہ اخلاقی طور پر بھی صحیح ہے اور آج ساری اقوام میں یہی ہو رہا ہے۔ میکانکی تصوّر حیات کی رو سے انسان کی ساری تاریخ اس معاشی مسئلہ کے حل کی تلاش کی تگ وتاز کی داستان ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ ط (2:34) محاکاتی انداز ہے کائنات کے ساری قوتیں تو انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوسکتی ہیں الا ابلیس۔ یہ جو اپنی ذات ہے یہ ان قوانین خداوندی کے سامنے نہ جھکی۔ جس طرح رسول ﷺ نے فرمایا کہ میرا بھی ابلیس ہے مگر میں نے اسے مسلمان کر دیا ہے۔ ابلیس کو اقدار خداوندی کے تحت لانا یہ ہے مسلم ہونا۔ اس پر کنٹرول صرف ان اقدار سے ہوسکتا ہے۔ اس میں سرکشی اور بغاوت ہوتی ہے۔ یہ رنگ ونسل، قومیّت، مفادات یہ تمام ابلیسی صفات ہیں۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ ((20:117 اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ یہ بھکنے کی خصوصیّت دونوں میں ہیں۔ یہ غلط ہے کہ عورت شیطان کے بہکاوے میں آگئی۔ آگے اسی آیت میں کہا۔ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾(20:117) پھر تم ان ضروریات جو اب آسانی سے میسر ہیں، محروم ہو جاؤ گے اور جگر پاش مشقتوں سے گزرنا پڑے گا۔ اگر ان امتیازات کو قائم رکھا تو یہ جنّتی زندگی چھن جائے گی کیونکہ جنّت کی کیفیّت یہ ہے۔

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾(20:118) وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾(20:119) اب تو نہ روٹی کی فکر ہے، نہ کپڑے کی، نہ پینے کی اور نہ گھر کی۔ یعنی یہ تمام چیزیں بافراط میسر ہیں۔ تو تیری میری والی روش سے ان چیزوں سے محروم ہو جاؤ گے۔ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾(20:120) ایسے درخت کا پتہ بتاؤں جس سے تم کو حیات جاوید مل جائے اور ایسی مملکت جس پر کبھی زوال نہ آئے۔

انسان ویسے ہی اس کا متلاشی تھا کہا کہ یہ اولاد کے ذریعہ سے حاصل ہوگی۔ وہی تمہاری بقاء کا ذریعہ بنے گی۔ اس سے تمہارا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لہٰذا تم اپنے مفادات کو سامنے رکھو۔ تمہیں دوسروں کی کیا پڑی ہے۔ اب تو صورت یہ ہے کہ کھانے پینے کو تو مل جاتا ہے۔ مر جانے کے بعد تمہارا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ تمہاری مملکت ''جاگیر اور زمینداری'' سرداری صرف اس صورت میں رہے گی کہ اپنے بیٹے کے حق میں وراثت کر دیا کرو۔ اب قصہ ''اپنی تیری میری'' کا نہ رہا۔ اب ''میری اور تیری'' نے منتقل ہونا شروع کر دیا۔ تاکہ اسے دوسرے نہ لے جائیں اس طرح سے یہ جھگڑا فساد دوامی ہو گیا۔ یہ ہے وسوسہ ''دبے پاؤں'' چپکے سے کچھ بات کہنا۔ یعنی خودغرضی کے جذبات پیدا کر دیئے کہ آؤ وہ شجر بتاؤں جس سے قرآن نے منع کیا تھا۔

شجر کا قرآنی مفہوم:

یہ عربی زبان میں اختلاف کیلئے بیسیوں الفاظ تھے۔لیکن ایک اختلاف ایسا ہے نیچے سے جڑ اور تنا ایک ہو۔ابتداء ایک ہو،آگے جا کر اس میں اختلافات ہوں۔اس قسم کے اختلاف کو مشاجرت کہتے ہیں۔درخت کی جڑ، بنیاد، واحد ہوتی ہے پھر اس کے بعد یہ لاتعداد شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔قرآن نے کہا کہ تم آپس میں کہیں یہ کیفیّت پیدا نہ کر لینا۔نوع انسانی کی ابتداء تو وحدت کی جڑ ہے۔ایک تھا۔اب الگ الگ شاخوں میں نہ بٹ جانا۔اس سے پرہیز کرنا مگر افسوس نوع انسانی کی عالمگیر برادری کی جگہ نسل پرستی کی کشمکش میں الجھ گیا۔یوں سمجھ کہ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (20:121) تو اس سے برہنگی کو باغ کے پتوں سے چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ (20:121) غلط راستوں پر چلی کر زندگی برباد ہوگئی۔روزی درہم برہم ہوگئی۔معیشت تباہ ہوگئی۔تو پکار اٹھا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (7:23)

تیری بات نہ مان کر اپنے آپ پر ظلم کیا۔ابدی طور پر راندۂ درگاہ سے مراد ہے کہ جو اپنی غلطی تسلیم نہ کرے۔جو ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دے تو اس کی اصلاح تو ابدی طور پر نہیں ہوسکتی۔وہ اسے دوسرے کے سر پر ڈالتا ہے۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ (20:122) پھر خدا نے اسے گلے سے لگالیا۔مگر شرط یہ ہے کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرے۔رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ (7:23) تو اس بات پر ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ (20:122) تو پھر اس کا قانون واپس ہو کر رجوع کرتا ہے۔اعتراف کے بعد وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ (20:122) راستہ دکھا دیا۔چلنا تو خود پڑتا ہے خدا صرف رہنمائی دیتا ہے۔چلنا تو خود ہوتا ہے اس رہنمائی میں۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ (20:129) اگر قانون مہلت کا وقت، ظہور نتائج کا وقت مقرر نہ ہوتا تو ہلاکت کا عذاب جو فیصل ہو چکا ہے ان کے ساتھ کب کا چپک گیا ہوتا۔یہ تو رحیمی کا تقاضا ہے کہ ایک وقتِ مہلت بیج سے فصل پکنے تک کا رکھا ہوا ہے۔

ہبوطِ آدم

مشاجرت کا نتیجہ مقام بلند سے پستی کی طرف آتا ہے۔صحیح راستہ دکھادیا ہے چلنا تو انسان نے خود ہی ہے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (20:123) اب تم اس مقام سے نیچے آجاؤ تمہاری مفاد پرستیوں نے تمہارے درمیان حائل ہو کر تمہیں ایک دوسرے کا دشمن بنادیا ہے۔اهْبِطَا سے مراد نکل جانا نہیں ''ہبوط'' کسی بلند مقام سے پست مقام پر آجانا۔ بلند مقام تو عالمگیر اخوت ہے اس کے برعکس مختلف ٹکڑوں میں بٹ جانا پست مقام ہے۔بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (20:123) عدو، دشمن کیلئے تو اور بھی الفاظ ہیں۔عداوت سے مراد لکڑی میں کلہاڑے سے چھید کر کے اس کے اندر پھانا Wedge لکڑی کا ایک ٹکڑا تاکہ وہ لکڑی آپس میں نہ مل جائے جوزور دروں سے ملنا چاہتی ہے۔اگر یہ پھانا نکال دیا جائے تو بڑے زور سے ملتی بھی ہے یہ شے جو ملنے نہ دے اسے عداوت کہتے ہیں۔بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (20:123) یعنی تم ایک تھے اب درمیان میں یہ چیز ہے ملنے نہیں دیتی۔اسے عداوت کہتے ہیں۔اب تو خود تو اسے نکال نہیں سکتے تو دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ (20:123) نہ تو محنت رائیگاں جائے گی اور نہ ان نعمتوں سے محرومی اور جگر پاش مشقتیں۔وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ (20:124) وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (17:72) پھر قرآن نے جواب دیا۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ (20:125) قَالَ كَذٰلِكَ (20:126) یہ اس فریب کی وجہ سے ہوا کہ تو اندھا ہوتے ہوئے اپنے آپ کو آنکھوں والا سمجھ رہا تھا۔اس لئے کہ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا (20:126) ان قوانین کو ناقابل اعتنا سمجھ کر پس پست ڈال دیا۔وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ (20:126) اس لئے آج تمہیں زندگی کی روشنی سے محروم کر کے اندھا کر دیا گیا ہے اور تجھے انسانوں کی صف سے دھکیل کر پیچھے کر دیا گیا ہے، بھلا دیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾ (20:127) تاریخی نوشتے دیکھو کہ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ (20:128) جو جانتا ہے کہ مجھے کہاں رک جانا چاہئے۔

ہمارے ہاں عرسوں اور مقبروں کی شہرت کی وجۂ جواز

عرس اور مقبرے:

عقل کی تنقیص و تحقیر ایک بڑی سازش تھی۔کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔اس سازش میں یہ چاروں طرف سے یورش کر کے آئے۔پہلی بات جو ذہن میں کھٹکتی ہے کہ عقل کی اگر کیفیّت یہ ہے کہ جو کچھ اس کے ذریعہ ثابت کیا جائے وہ قابل اعتماد نہیں ہوتا۔تو آپ یہ چیز عقلی دلائل سے ثابت کر رہے ہیں کہ عقل نا قابل اعتماد ہے تو آپ کا یہ نتیجہ کیسے قابل اعتماد ہو گیا۔کیونکہ عقلی دلائل کے بغیر تو مدمقابل کو نہیں منا سکتے کہ یہ باطل ہے۔غزالی نے فلسفہ میں آدھی عمر بسر کی۔بڑی بلندیوں پر پہنچے اور پھر جو آدھی عمر تھی اسے ادھیڑنے میں گزر گئی۔یعنی عمر کا آخری حصّہ عقل کی تحقیر و تنقیص میں گزارا۔جو پہلے ثابت کر چکے تھے۔یہ ہے ان صاحب کا کارنامہ۔(1059-1119)

اس سازش میں یہ سرمایہ داری اور ربوبیّت مخالف قوّتیں کارفرما تھیں۔اگر یہ نہ ہوتیں۔تو ان ترک دنیا کا سبق دینے والوں کو کوئی بھی نہ پوچھتا۔ان ننگے دھڑنگوں کے مقبرے پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے چاندی اور سونے کے دروازے کھڑے کر دیئے۔ کیا علم و بصیرت پر مبنی دلائل دینے والوں کی قبروں کے متعلق بھی کوئی شہرت نظر آئی۔کسی سے پوچھو کہ عمرؓ یا ابوبکرؓ کا مزار کہاں ہے؟ یوم شہادت یا یوم وفات؟ تو شاید 1 فیصد بھی جواب نہ دے سکیں۔اس کے برعکس ہر گھوڑے شاہ کی تفاصیل تک معلوم ہیں یہ تھی سازش۔اس بیّنات کے خلاف۔آیات (معجزوں) کے مطالبہ کی۔دلیل نہیں کہ کرامات دکھایئے اور ان عرسوں اور مقبروں میں یہ سب کچھ ملتا جاتا ہے یہی تو ان کی وجہ شہرت ہے۔سابقہ ادیان یا مذاہب کو چھوڑیں۔آج اپنی حالت ملاحظہ کریں۔یہ تمام بزرگ جو قلوب پر مسلط ہیں۔وہی ہیں تو ان کے تذکرے ہی شعبدہ بازیاں، کرامات ہیں۔ان کی کسی بات میں، کتاب میں دلیل نہیں ہے بلکہ کرامات سے بھری ہوئی ہیں۔جتنا کوئی بڑا ولی قطب تو اتنی بڑی کرامت۔دلیل کوئی نہیں۔دلیل والوں کے پیچھے تو لٹ لئے پھرتے ہیں۔سارا تصوّف وجدان ہے۔ساری جنگ ہی آیات و بیّنات کی ہے۔کوئی دلیل نہیں ہے۔

❁❁❁

قرآنِ حکیم کی زبان کا خاصہ

عربی زبان کے الفاظ ان کے مادہ سے بنتے ہیں۔(Roots)اوران کے صیغے اوزان پر بنتے ہیں۔جیسے سَمِیْعٌ ،عَلِیْمٌ کے الفاظ معین وزن پر بنے ہیں۔ یہ بڑی ہی سائیٹفک زبان ہے۔ جولفظ اس وزن پرآئے گا اس میں ان کے قاعدے کی رو سے استمرار پایا جائے گا۔یعنی مستقلاً وہ ایسا کرنے والا ہے اب ان اوزان اور ابواب کو ملاحظہ کریں مثلاً ''عَلِیْمٌ '' تو وہ ہوسکتا ہے جسے ایک وقت میں ایک بات کا علم ہو۔مگر دوسرے وقت میں دوسری بات کا علم نہ ہو۔لیکن جب یہ لفظ عالم'' دوسرے باب میں ایک وزن پر''عَلِیْمٌ '' بنتا ہے تو یہ علیم'' ایسا نہیں ہوسکتا ہے جیسے عالم ہے۔ کہ ایک وقت میں اسے ایک بات کا علم ہومگر دوسرے وقت میں اسے کسی دوسری بات کا علم نہ ہو۔اس باب میں عَلِیْمٌ وہاں آئے گا۔ جہاں استمراراًوہ چیز کہی جاتی ہے۔اس طرح سے سَامِعٌ ہے کہ ایک وقت میں سن لیا مگر دوسرے وقت میں نہ سنا۔اس کے برعکس جب دوسرے باب میں سَمِیْعٌ بنتا ہے تو اس کی یہ حالت نہیں ہوتی کہ کبھی کوئی بات سن لی اور کبھی کوئی بات نہ سنی۔

عربی زبان کی گرامر:

عربی زبان کا ہر لفظ الگ الگ مستقل حیثیت نہیں رکھتا بلکہ جس طرح درخت کی شاخیں، پتے، پھول، پھل اس کے بیج (Seed) یا جڑ (Root) سے نکلے ہوتے ہیں۔اسی طرح زبان کا ہر لفظ اپنی ایک جڑ یا اصل رکھتا ہے جس سے وہ وجود پذیر ہوتا ہے۔اس جڑ کو مادہ یا(Root) کہتے ہیں۔عربی زبان میں ایک مادہ سے سینکڑوں الفاظ (اسماء، افعال، صیغے وغیرہ) بنتے ہیں۔ان الفاظ کی شکلیں مختلف ہونگی۔لیکن ان میں سے ہر ایک میں اس جڑ (مادہ) کی خصوصیات ضرور ہونگی۔اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی لفظ کا مادہ معلوم ہواور ان قاعدوں سے واقفیت ہوجن کے مطابق اس مادہ سے مختلف الفاظ خاص شکلیں لئے ہوئے ابھرتے ہیں۔تو مادہ کے معنی معلوم ہوجانے سے ان تمام الفاظ کے معانی خود بخود سامنے آجائینگے۔اس سے ظاہر ہے کہ عربی زبان میں مادہ ان اصل حروف کو کہتے ہیں جن کے بغیر فعل (Verb) کی پہلی شکل وجود میں نہ آسکے۔اس کے فعل کا مادہ کبھی تین حرفی اور کبھی چار کا ہوتا ہے۔ اسماء(Nouns) کے مادہ میں پانچ اور چھ حروف بھی ہوتے ہیں۔لیکن حرف ثلاثی کہلاتا ہے عربی میں زیادہ تر ثلاثی افعال ہیں۔ چار حرفی کو رباعی کہتے ہیں وہ مشتق اور متصرف کلمہ جو کسی اصل لفظ سے نکالا گیا ہو صیغہ کہلاتا ہے۔

اوزان وابواب:

عربی زبان میں ہر مادہ سے معین اوزان پر افعال (Verb) اور اسماء (Nouns) بنا لئے جاتے ہیں۔ انہیں اس مادہ کے مشتقاق (Derivatives) کہتے ہیں مگر حروف (Particles) مادہ سے نہیں بنتے۔

اس طرح فعل، جمع، اسم صفت کے اوزان مقرر ہیں۔ ان کے ابواب بھی مقرر ہیں۔ مختلف ابواب، مختلف اوزان پر آتے ہیں۔ ثلاثی مجرّد کے علاوہ ایسے افعال جن میں اصل حروف تو تین ہی ہوں۔ لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں۔ ثلاثی مزید فیہ کہلاتے ہیں۔ ان کے مختلف ابواب، مختلف اوزان پر آتے ہیں۔ جن میں قرآن میں استعمال ہونے والے مادہ ہیں۔ کسی فعل کا ایک باب سے دوسرے باب میں تبدیل ہونے سے بالاخر مقصود کیا ہے؟

مقصد ابواب:

یاد رکھئے! ان تبدیلیوں سے مقصود معانی میں وسعت اور ان کے درمیان معنوی فرق واختلاف پیدا کرنا ہے یعنی ایک ہی فعل (Verb) مثلاً جب باب تفعیل میں ہو۔ تو اس کے معنی اور ہوتے ہیں اور باب افعال میں ہو تو اور۔

ان ابواب کی یہ خصوصیّت (یعنی خاص معنی) مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہے عربی زبان کی وہ خصوصیّت جو اور کہیں نہیں ملتی۔ ہر باب کے خواص مقرر ہیں جب وہ فعل دوسرے ابواب میں منتقل ہوتا ہے تو اس کے وہ بنیادی خواص اس کے اندر موجود رہتے ہیں۔

عربوں کے ہاں شاعری اور اس کا مقام

غیرت کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا:

بڑی غیّور قوم تھی۔ ہر ایک چیز کو برداشت کر لیتی تھی مگر عزت کی بدنامی کسی صورت نہیں۔ ان کے ہاں ''الکریم'' متواضع ہونا قابل قدر وصف تھا۔ وہ اس بات سے ہر وقت ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی راہ چلنے والا آئے اور ہم اس کی خاطر مدارت نہ کر سکیں کوئی ابن السّبیل آ گیا۔تو پوچھنا ہی نہیں کہ تم کس کے بیٹے ہو۔ وہ تو مانا ہی ''راستے کا بیٹا جاتا'' تھا۔ اگر کوئی شخص کہیں کہہ دے کہ اس نے ابن السّبیل کو کھانا نہیں دیا تھا۔تو پورا قبیلہ شرم وحیاء سے ڈوب مرتا تھا اور اس قبیلہ کو بدنام کرنے کا کام یہ شعراء سے لیتے تھے اور اگر کوئی اتنی سی بات شعر میں لکھ دے کہ ان کے ہاں فلاں مہمان بھوکا گیا تھا۔تو وہ اسے ختم کر دیتا تھا۔ پھر یہ چیز اسے ختم کر دینے کیلئے اسلاف در اسلاف چلتی تھی۔ شعر تو زبانی یاد رہ جاتا ہے۔نثر کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں نہ تو ان کے پاس لکھی ہوئی کوئی کتاب تھی اور نہ لکھنا پڑتا۔مگر ہر شخص کو ہزاروں اشعار یاد ہوئے تھے۔ان کے ہاں شاعروں کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ Muse بھی آتی ہے، ان کو اذن بھی ہوتا ہے۔یقین جانئے کہ ان کی زبان پر وجدآ جاتا ہے۔فیض کا ایک شعر ہے۔

ے ایک نظر تم میرا محبوبِ نظر تو دیکھو وہ تو وہ ہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے

ان عربوں پر نظر ڈالئے تو یہ قرآن کے عرب تو ایک طرف رہے یہ جاہلیت کے عرب بھی محبوب بن بیٹھتے ہیں۔ان کے ہاں شاعری کی اتنی اہمیّت ہے لیکن اس کے باوجود وہ حقیقت کو نہیں بھولتے۔ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ (52:30) گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ بھی شاعر ہے۔ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيۡبَ الۡمَنُوۡنِ (52:30) تھوڑا سا انتظار کرو۔ زمانہ کی گردشیں اسے خود ہی ختم کر دینگی۔یعنی شعر میں زمانہ کا مقابلہ کرنے کی قوّت نہیں ہوتی۔ ناپیدار شے ہے۔یعنی اندازہ لگائیں کہ شاعر کی اتنی اہمیّت ہے۔عظمت ہے کہتے ہیں کہ اسے الہام ہوتا ہے۔

شاعری ایک نظریہ زندگی تھا اور ہے:

قرآن نے شاعری کو ایمان کے متضاد ایک نظریہ زندگی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ایک آسمانی انقلاب کے داعی کے شان شایان نہیں ہے۔ اگر شاعری کا مفہوم بات کو موزوں یعنی وزن کے ساتھ بیان کرنا ہے تو وہ کفر کیسے ہوگئی؟ نہ تو مومنین اور نہ رسول کیلئے یہ زیب دینے والی بات ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ اگر کوئی اپنے موضوع کو، اپنی فکر کو، اپنے پیغام کو، منظوم الفاظ میں بیان کرے۔ تو اسے جہنّم میں بھیج دیا جائے۔ یہ بات اس پیرائے میں بیان ہی نہیں کی۔ یہ تو ایک نظریہ زندگی تھا اور آج بھی ہے۔ اس زمانے میں اس نظریہ کو شاعری سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ وہی ان کا نظریہ زندگی تھا۔ ایمان تو اس قوم میں تھا ہی نہیں۔ ان کے ہاں فالیں نکالنے والے، نجومی اور قرعہ انداز موجود تھے اور پرستش گاہ میں کاہن اور ساحر تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان سب کو الہام ہوتا ہے۔ یہ تصوّر قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا کہ Muse ایک دیوی ہے۔ اس کے ساتھ نجومیوں، قرعہ اندوزوں، کاہنوں اور ساحروں کا تعلق ہوتا ہے اور انہیں الہام ہوتا ہے اس زمرے میں شاعر بھی آتے تھے۔ تو ان کے متعلق بھی یہ تھا کہ انہیں الہام ہوتا ہے۔ رسول ﷺ کے دعویٰ وحی کو ہی انہوں نے اس قسم کا الہام سمجھا کہ یہ اس قبیل سے ہے۔

شیطٰن، وہ انسانی جذبات جو حقیقت پر مبنی نہ ہوں:

قرآن نے وحی اور ان کے تصوّر الہام و وجدان میں فرق کرنا تھا۔ ان امتیاز کو پیدا کرنے کیلئے قرآن نے شیطن یا شیاطین کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یعنی انسان کے وہ جذبات جو حقیقت پر مبنی نہ ہوں۔ یہ تمام الہامات، نجوم، کہانت وغیرہ اس زمرے میں آتے ہیں اور یہ نفس غیر شعوریہ کی کارروائیاں ہیں اور ان سب میں ان کے ہاں شاعروں کو زیادہ اہمیّت حاصل تھی۔ انہوں نے نبی کو ساحر اور کاہن کہا۔ قرآن ان سب چیزوں کی تردید کرتا گیا۔ حالانکہ قرآن کے اسلوب کو دیکھ کر انہوں نے اسے ایک بلند درجے کی شاعری قرار دیا۔ جس کی مثال ہم پیش نہیں کر سکتے۔ قرآن نے اس شاعری کی بھی تردید کی۔

وَمَا تَنَزَّلَتۡ بِهِ الشَّيٰطِيۡنُ ﴿۲۱۰﴾ (26:210) وحی ایک الگ چیز ہے یہ شیطانوں پر نازل نہیں ہوتی۔ یہ جو نجومی، کاہن، ساحر اور شاعر ہیں جن کو وجدان کہتے ہیں یہ تو بہکے ہوئے خیالات ہیں۔ جو شیطانی عمل ہے وحی ان پر نازل نہیں ہوتی۔ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ عَلٰى مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيۡنُ ﴿۲۲۱﴾ (26:221) آؤ تمہیں بتائیں کہ شیطان کن لوگوں پر الہام کرتا ہے۔ یہ قوت کس قسم کے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ﴿۲۲۲﴾ (26:222) یہ الہام تو ان کو حاصل ہوتا ہے یہ قوّت ان کو ہوتی ہے جو کذف باف ہوتے ہیں۔ جھوٹے ہوتے ہیں مکاریاں کرتے ہیں اور ان کی انسانی صلاحیتیں بری طرح مضمحل ہوتی ہیں۔ (45:78)

يُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَاَكۡثَرُهُمۡ كٰذِبُوۡنَ ﴿۲۲۳﴾ (26:223) کچھ قیاس سے یعنی سونگھتے پھرتے ہیں۔ پھر دل سے بات گھڑ لیتے ہیں۔ یہ ان کی مضامین آفرینی ہوتی ہے۔ یہ افک ہے۔ گھڑی ہوئی بات ہے۔ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی اور جھوٹ بھی بولتے ہیں۔

کچھ تو جہالت کی بناء پر کرتے ہیں اور کچھ وہ جو ان کا غیر شعوری نفس ان کو یہ چیزیں الہام۔ وجدان بنا کر پیش کرتا ہے۔ اب جو قسمت کے لکھے پر یقین کرلیں تو پھر یہ اضمحلال کوشش و حرکت سے محروم کر دیتا ہے۔ تو پھر یہ کوئی کام ہی نہیں کرتے۔

شاعری میں داد لینے اور دینے کی کیفیّت:

قرآن نے اثیم کا لفظ استعمال کیا ہے اب شاعری کو دیکھئے ٹوہ لگا کر باتیں سنتے رہتے ہیں۔ کن سوئیاں لیتے پھرتے ہیں۔ کوئی جہالت کی بنیاد پر مضامین آفرینی کرتا ہے کوئی سچ مچ دل سے گھڑتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے اور مجموعی نتیجہ ان سب کا قوت عمل مفقود اور اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ (26:222) ان کی صلاحیتیں پژمردہ ہو جاتی ہیں اور ان کو داد دینے والوں کے بارے میں کہا۔ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ (26:224) اور ان کے پیچھے چلنے والے وہ فریب خوردہ لوگ جو جذبات کی روش سے چلے جاتے ہیں۔ حقائق کا سامنا نہیں کر سکتے۔ تعداد کے لحاظ سے ٹڈی دل لیکن نتیجہ تخریب ہی تخریب۔ یہ داد دینے والے ان کو بہکاتے ہیں۔ انہی کے زور پر ان کی شاعری پروان چڑھتی ہے۔ اگر کوئی داد نہ ملے تو ان کا دیا اس معاشرہ میں گل ہو جاتا ہے۔ ان کو بھی قوت و عمل سے محروم کیا ہوا ہوتا ہے۔ تعداد میں لاکھوں ان کو بہکا وا دیتے ہیں۔ کیفیّت ٹڈی دل کی ہے جو زندگی کی نمی، خوشحالی اور سرسبزی چٹ کر کے اڑ جاتے ہیں۔ اس طرح سے وہ قومیں تباہ ہو جاتی ہیں جو اس شاعری میں گرفتار ہوتی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ (26:225) کہتے ہیں یہ شاعر کہ ہمارا تعلق عالم غیب سے ہے جبکہ حالت ان کی اس اونٹ کی ہے جو جھوٹی پیاس میں مبتلا ہو اور اس جھوٹی پیاس کو بجھانے کیلئے مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرے۔ مگر پیاس بجھنے نہ پائے۔ ساری عمر جذبات کا پرستار اور جذبات بھی جھوٹے اور بناوٹی۔ یہ تو جھوٹی پیاس کا مریض ہے۔ یہ جذبات سچے نہیں ہوتے یہ جھوٹی پیاس کی طرح ہوتے ہیں جو اسے مختلف وادیوں اور بیابانوں میں لئے پھرتے ہیں۔ کوئی متعین نصب العین نہیں۔ جہاں منہ اٹھایا چل پڑے اور اسے بلند درجہ کی الہامی چیز سمجھتا ہے۔

الہام:

؎ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اپنے آپ کو ہم دوش جبریل بتا رہا ہے۔ خود فریب میں مبتلا ہے۔ ساری عمر یہی کچھ کہتا جائے گا۔ ساری قوم کو جہاد کیلئے کہتا ہے آپ پیچھے بیٹھا رہے گا۔ ان کا الہام یا وجدان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ (26:226) سب سے بڑی بات کہ ان کی زندگی کے قول اور فعل سے تضاد ہوتا ہے ''مال اور حال میں مطابقت نہیں ہوتی۔ یہ اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ قرآن ایک نظریہ حیات بیان کر رہا ہے۔ ایک نہج زندگی، طرز فکر، ایک پروگرام بیان کیا جا رہا ہے۔ پہلی چیز جو یہ الہامی کہتے ہیں۔ یہ الہامی نہیں بلکہ شیطانی ہوتی ہے کہیں پیغمبر کی وحی کے ساتھ ان تینوں (الہام، وجدان، کہانت) کے ساتھ نتھی نہ کر دینا۔ وحی

ایک متعین چیز ہوتی ہے۔ پیغمبر اور اس کے ماننے والے ایک متعین نصب العین رکھتے ہیں۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (26:227) یہ تو اپنی ذات کی صلاحیتوں کو بھی نشوونما کرتے ہیں اور معاشرے کو بھی سنوارتے ہیں۔ اس آیت کے عجیب معنی کر کے شاعروں پر مصیبت آ گئی۔ ان کے سامنے جھٹ سے قرآن کی یہ آیت پیش کی جانے لگی۔ تو انہوں نے بھی جھینپ کر کہا کہ یہ تو غیر مسلم شعراء کی بات ہو رہی ہے۔ مسلم شعرا کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ اِلَّا سے یہ مراد نہیں کہ یہ صرف مسلم شعراء یا غیر مسلم شعراء کی بات ہے بلکہ یہ کہ مومن کا یہ نظریہ حیات نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خیالات کو نظم میں، شاعری میں بھی بیان کرے۔ بات نظریہ حیات کی ہے قرآن نے یہاں ''اٰمَنُوۡا'' کہا ہے۔ اس فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّہِیۡمُوۡنَ ﴿۲۲۵﴾ (26:225) کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ایمان سے مراد تو ایک نصب العین کو مرکزِ حیات بنانا۔ بلکہ سب کا نقطہ ماسکہ ایک ہو۔

لا الاسر مائیہ اسرارِ ما: رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما:

ہمارے رموز و اسرار یعنی نظریات کی متاع گراں بہا تو لا الہ ہے یہی ہے جس سے ہمارے افکار کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ اس عمل سے یہ مومن کہلاتا ہے۔ ایمان والا۔ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (26:227)۔ یعنی ایک نصب العین حیات پر یقین رکھتا ہے۔ اس سے فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّہِیۡمُوۡنَ ﴿۲۲۵﴾ (26:225) کا قصہ ختم ہوا۔ یہ سَمِعَ، کن سوئیاں نہیں۔ فکر و تدبّر، غور و فکر کے بعد دل کی رضامندی سے ایک صداقت پر یقین لانا ہے۔ یہ ایمان ہوا۔ شاعری نہیں ہے جس کے ہاں نصب العین ہو ان کی زندگی میں کبھی تضاد ہو نہیں سکتا۔ ان کے قول و فعل میں ہم آہنگی۔ یَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲۲۶﴾ (26:226) والی کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ جو کہتے ہیں وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (26:227) اسے کر کے دکھاتے ہیں۔ وہاں کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۲۲﴾ (26:222) افسردگیاں، اضمحلال جبکہ یہاں صالحات ہیں۔ کائنات کو، اپنے آپ کو سنوارتے ہیں جبکہ یہ تصوّرِ جاناں کئے ہوئے ہیں۔ مومنین تو وَ ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا (26:227) وہ زندگی کے معاملات قیاسات سے نہیں بلکہ قانون خداوندی کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ کَثِیۡرًا (26:227) زندگی کے ہر معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ خدا کا قانون کیا کہتا ہے ملاحظہ کریں مومنین کی طرز زندگی کے خلاف ایک اور طرز زندگی بیان ہو رہی ہے۔ اِلاّ کے بعد تو قرآن کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ نثر نگار کیا ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور کی جا رہی ہے۔ یہ تو نظریہ زندگی خلاف قرآن کی بات ہو رہی ہے۔ خواہ اسے وہ نثر میں لکھے یا نظم میں بات اسلوب اظہار کی نہیں ہے بلکہ مومن وَ ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا (26:227) وہ تو زندگی کے ہر گوشہ میں قانون خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں۔ اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔

زبان تو اظہارِ مدّعا کا ذریعہ ہے:

یہ تو اظہار اور مدّعا کا ذریعہ اور نوع انسانی کیلئے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہارِ مدّعا کیلئے انسانوں نے دو طریق اختیار کئے۔ ایک تو جس میں روزمرہ بات چیت یعنی نثر، دوسرے شعر، شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب سے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نثر اور شعر الفاظ کی ترتیب کے دو مختلف اسلوب ہیں۔ قرآن ان اسالیب کی مذمت نہیں کرتا۔ شاعری رسول کے شایان نہیں یعنی

اس سے مقصود الفاظ کی وہ ترتیب نہیں جس سے شعر موزوں ہو جاتا ہے۔ بلکہ نفسیاتی کیفیّت ہے جسے شاعری سے تعبیر کیا۔ اس کیفیّت میں تو نصب العین ہوتا ہے۔ اس کے حصول کی تڑپ، اس کے جذبات اس کے معبود اور ان کی تسکین زندگی کا منتھیٰ۔ یہ جذبات اس کی ناک میں نکیل ڈالے اسے زندگی کی مختلف شاہراؤں پر لئے پھرتے ہیں۔ کبھی تصوّرات کی حسین وادیوں میں، کبھی تخیلات کے ان نگاہ فریب مناظر کی طرف۔ چونکہ نصب العین متعین نہیں ہوتا۔ اس لئے آج جذبات کی رو میں جو کچھ کہا تو کل کچھ اور۔ جس قسم کا دل میں جذبہ موجزن ہو اس قسم کی آواز زبان پر آ گئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کیلئے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے اس لئے جذبات پرستی کی اس نہج زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مومن کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔

شعر کہنے سے ظلم ختم نہیں ہوتا:

كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾(26:222) انسانی صلاحیتیں بری طرح مضمحل ہو چکی ہیں جھوٹ اور مکاریوں سے کام لیتے ہیں۔ بیٹھے ہیں اٹھتے ہی نہیں ہیں۔ اگر کوئی دو مار جائے تو کہتے ہیں کوئی بات نہیں جبکہ اس کے برعکس مومن۔ وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ (26:227) جب ان پر کوئی زیادتی کرے تو شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر کلیجہ ٹھنڈا نہیں کرتے بلکہ وہ تو ظلم کا بدلہ لیتے ہیں وہ طمانچہ کا بدلہ منہ توڑ کر دیتے ہیں۔ وہ ظلم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾(26:227) ایسے ظالموں کو ان کا ٹھکانہ یاد دلاتے ہیں کہ اس ظلم کا ٹھکانہ کیا ہوگا۔ یہ نثر اور نظم کا تقابل نہیں ہے کہ نظم میں کہنے والا تو جہنّم رسید ہوگا اور نثر میں کہنے والا جنّت میں جائے گا۔ شاعری کا متضاد سائنس ہے نثر نہیں ہے۔ یہ بات انگریزی کے مشہور نقاد (Coleridge 1847) نے کہی۔ The antithesis of poetry is not prose but Science.

سائنس تو Effect and Cause ہے۔ شاعری میں تو علت و معلول نہیں ہوتا۔ کوئی چیز قانون کے تحت نہیں ہوتی۔ وہاں تو ہر قانون شکنی ہوتی ہے قرآن نے کہا کہ شاعری نثر کی ضد نہیں بلکہ ایمان کی ضد ہے۔

علامہ کے نزدیک شاعری کی حقیقت:

اقبال نے قرآن سمجھا اور اسے موثر انداز میں اشعار کے ذریعہ لوگوں تک پہنچایا۔ ساری عمر شعر کہے مگر اپنے آپ کو شاعر کہنے سے مجتنب رہا۔

؎ من اے میر امّم ﷺ داد از تو خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند

وہ اس طرز زندگی کو تہمت کہہ رہا ہے۔ اظہار شعر و سخن سے مراد وہ جذبات ہیں یہی نہج زندگی جس کی قرآن مذمت کر رہا ہے۔ اس کے سامنے تو قرآن نصب العین تھا۔ ساری عمر اس کا پیغام دیتے رہے یہ شعر بدعا کی انتہا ہے کہ اگر قرآن سے باہر کوئی بات کی ہو۔

؎ روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

ذکر کا قرآنی مفہوم

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (21:10) ہم نے تو تمہاری طرف یہ ضابطہ قوانین نازل کیا ہے۔ جس میں خود تمہارا ہی شرف وعظمت اور بلندیوں کا راز پوشیدہ ہے اگر تم ذرا بھی عقل وبصیرت سے کام لو گے تو یہ جان جاؤ گے کہ اس میں تو بلندیاں ہی بلندیاں ہیں۔ بڑے جاہل ہو کہ عقل وبصیرت سے کام نہیں لے رہے۔

مومن بالائے ہر بالا ترے غیرت اُو بر نتابد ہمسرے

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (23:71) ہم تو ان کے پاس شرف وعظمت، سرفرازی و سربلندی کا سامان لائے ہیں ہم ان کو یہ گراں بہا متاع دے رہے ہیں اور یہ اپنی ہی عزت وشرف سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی اور جاہل ہوگا۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ ۝ (43:44) اس میں تمہارے لئے اور قوم کیلئے شرف وعظمت ہے اور اگر اعتراض برتا تو شرف وعزت سے محرومی خود ہی سوال بن جائے گی۔

تاریخِ انسانی تو آج تک صدرِ اوّل کی مانند ذکرِ خداوندی کی کوئی مثال بھی پیش نہیں کرسکی:

GOORGE.A. DORSEY کی کتاب "Civilization" کا صفحہ (644:45)

تاریخ کے صفحات پر یہ جہانِ نو تو کچھ یوں لگتا ہے کہ گویا نوع انسانی ایک خشک نیستاں کی طرح ایک شرارے کے انتظار میں تھی۔ وہ شرارہ اسی بطل جلیل (محمد ﷺ) کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوع انسان کو شعلہ صفت بنا گیا۔ جس میں علم کے متلاشی سیاسی مدبرّین سے بھی زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک قافلہ تجارت، جہاں ریشمی کپڑے اور سوت لاد کر اس کے ساتھ ہی اس کے اونٹوں پر ہندوستان اور بازنطین کی کتابوں کے مسودے اور اقصائے عالم سے معدنیات اور نباتات کے نمونے بھی لاتے تھے۔ کتب خانہ اور لیبارٹریاں، درس گاہیں، زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ انہی کے ہاتھوں یورپ نے زندگی کی ابتدا پائی اور انہی سے انہوں نے فلکیات، نباتیات، کیمیاء، قانون، ریاضی، طب اور فلسفہ کا پہلا سبق لیا اور یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ قوموں کی تاریخ میں اتنے قلیل عرصہ کے اندر، یہ کچھ ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ یہاں وہ انقلاب آیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا۔ ایک

674
صدی سال کے اندر اسلام عملاً اور اعتقاداً تمام عرب پر حکمرانی کر رہا تھا۔ خدا کے نام پر ایران، خراسان، مغربی ہندوستان، شام، مصر، حبش، شمالی افریقہ کا وہ تمام علاقہ جو اس وقت تک معلوم ہو سکا تھا۔ بحیرہ روم کے متعدد جزائر اور سپین تک کو فتح کر لیا تھا۔ یہ قوم جو اونٹنیوں کا دودھ پیتی تھی بڑے بڑے کانٹوں والی گوہ کھاتی تھی۔ کھجوریں نہ ہوں تو کھجوروں کی گٹھلیوں کے ستو پر گزارہ کرتی تھی۔ اس قوم نے صدیوں کا عرصہ نہیں، صرف چند ہی سالوں کے اندر دنیا کی دو عظیم ترین تہذیبوں ایران اور روما کو الٹ کر رکھ دیا۔ یہ تھا وہ ذکر جس سے انہوں نے بلندیاں حاصل کیں۔ آخری الفاظ وہ اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے کہ میں خوش ہوں کہ میں زندہ ہوں مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے لیکن مجھے اس سے بھی زیادہ فخر ایک انسان ہونے پر ہے اس لئے کہ آج ہماری قومیّت پرستی، نوع انسانی کی بدترین، دشمن اور تہذیب کیلئے خطرہ ہے۔

اقتدارِ مطلق (Sovereignty) اور
قرآن کا لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ (21:23)

سیاست (Politics) سے مراد وہ شعبہ سائنس جو انسانی نظام باہمی سے متعلق ہے۔ اسے پولیٹیکل سائنس یا پولیٹیکل فلاسفی کہتے ہیں۔ مملکت یا ریاست وہ بلندترین معاشرتی ادارہ جو انسان کے تمدّنی معاملات کو قانون اور ضابطہ کی رو سے سرانجام دینے کیلئے وجود میں آتا ہے مملکت کے اجزائے ترکیبی (i) آبادی۔ (ii) علاقہ۔ (iii) وحدت نظام۔ (iv) اقتدار اعلیٰ۔

اقتدار اعلیٰ کا تصوّر سب سے پہلے فرانسیسی مفکر نے دیا۔ اقتدار اعلیٰ یعنی (Sovereignty) سے مراد وہ مرکز ہے جو مملکت کی تمام قوّتوں کا سرچشمہ اور سارے اختیارات کا منبع ہے۔ دیگر قوائے مملکت ذاتی قوّت نہیں رکھتے۔ ان کے پاس اقتدار اعلیٰ کی تفویض کردہ قوّت ہوتی ہے۔ اقتدار اعلیٰ اپنے اختیارات کسی سے نہیں لیتا اور نہ ہی اس کے فیصلوں کے خلاف اپیل ہوسکتی ہے۔ رابرٹ لینزنگ نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔

" The power to do all things without accountable"

اسے اقتدارِ مطلق، Sovereign state بھی کہتے ہیں۔ خودمختار ریاست ملوکیّت کے زمانے میں جسے اقتدار مطلق حاصل ہوتا تھا وہ ایک فرد جسے ڈکٹیٹر کہتے ہیں ہوتا تھا جبکہ ڈیما کریسی میں افراد کے نمائندوں کو یہ حاصل ہوتا ہے۔ ان کو آخری اتھارٹی کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ چند انسانوں کے اندر پھرتی ہے۔ جو جی میں آئے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ جس میں جواب دہی نہ ہو۔ یہ ہمارے آئین میں بھی ہے۔ وزیر، وزیر اعلیٰ کو، وزیر اعلیٰ، وزیر اعظم کو اور وزیر اعظم صدر کو جواب دہ ہیں یا انہوں نے اس کا حساب پارلیمنٹ کو دینا ہے۔ آخری اتھارٹی وہ ہے جو بغیر جواب دہی کے ہے۔ اس کے اوپر کوئی ایسا نہ ہو جو پوچھ سکے کہ تم نے کیوں کیا؟ یہ ہے اقتدار اعلیٰ۔

قرآن کا دیا ہوا تصوّر اقتدار اعلیٰ کا:

اقتدار اعلیٰ کے تصوّر نے انسانی نظام سیاست میں جتنے پیکر بھی بدلے۔ یہ اقتدار اعلیٰ کسی نہ کسی شکل میں انسانوں کے پاس ہی رہا۔ قرآن کا سیاسی نظام کیا ہے؟ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ (21:23) اس کے اقتدار کا عالم یہ ہے کہ اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ اس

نے کائنات کو کیوں ایسا بنایا ہے اور اس قسم کے قوانین اس میں کیوں نافذ کئے۔ یعنی اس سے مراد اقتدار اعلیٰ کائنات میں اس کو حاصل ہے اور وہ جواب دہی کے دائرے سے باہر ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کوئی ایسا نہیں ہے کہ اس کے کئے کی باز پرس نہ ہو۔ صرف خدا ہے جس سے نہیں پوچھا جا سکتا۔ اس کے برعکس وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾ (21:23) سب سے پوچھا جائے گا کہ تم نے جدا دگانہ نظام کیوں تجویز کر رکھا ہے خدا سے اوپر تو کوئی ہے نہیں۔ اس لئے اس سے نہیں پوچھا جا سکتا۔ اس کے علاوہ جو بھی ہی وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾ (21:23) جواب دہ ہے۔ یہ طے کر دیا گیا ہے۔

خدا تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو بھی تفویض نہیں کرتا:

قرآن کہتا ہے کہ اقتدار مطلق خدا تعالیٰ کو حاصل ہے اور وہ اپنے اختیارات کسی کو بھی (Delegate) تفویض نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ پاور سے محروم ہو جاتا ہے اور اس وقت تک محروم رہتا ہے۔ جب تک وہ واپس نہ لے لے۔ اب یہ جو اختیار مطلق اللہ کو حاصل ہے جو کسی کو بھی تفویض نہیں کرتا۔ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ (21:23) ہم سے کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ اس کے برعکس وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾ (21:23) تم سے پوچھا جا سکتا ہے۔ اگر اس نے اقتدار اعلیٰ تفویض کر دیا تو پھر پوچھا کیسے جا سکتا ہے؟

یہ ان کا نیابت کا تصوّر مشرکانہ اور غیر قرآنی ہے۔ قائداعظم نے کہا تھا ''اسلامی مملکت کی امتیازی خصوصیّت اور انفرادیت یہ ہے کہ اس میں اقتدار اعلیٰ خدا کو حاصل ہوتا ہے لیکن ان اختیارات پر عمل اس قرآن کی رو سے کیا جاتا ہے۔

خلافت اور ملوکیّت:

حضرت عمر سے پوچھا گیا کہ خلافت اور ملوکیّت میں کیا فرق ہے؟ تو جواب دیا کہ ''مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کہاں سے لیا اور کس کو دیا'' یعنی میں جواب دہ ہوں۔ مجھے اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہے۔ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿٨﴾ (102:8) یہ تمام مال و دولت و آسائش کیسے حاصل کیں اور ان کو کیسے خرچ کیا؟

ذاتِ خداوندی کی دو حصّوں میں تقسیم

اِلٰهُ السَّمَآءِ اِلٰهُ الْاَرْضِ

یوں تو قرآن کا کونسا مقام ایسا ہے جس پر اگر غیر جانبدارانہ طور پر غور کیا جائے۔ تو انسان اس نتیجہ پر نہ پہنچے کہ یہ واقعی کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ اس زمانے میں جہاں علم انسانی، عام فکر اور تمام مذاہب اس مقام پر کھڑے تھے جہاں تہذیب کا بلند و بالا محل، جس کی تعمیر میں چار ہزار برس لگے تھے، وہ گرنے کے قریب ہے۔ اس دور میں ایسی بات کہنا کہ آج بھی عام انسان اور عام مفکر تو رہا ایک طرف آج کے علوم وفنون پر مہارت رکھنے والے عظیم سکالرز بھی اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتے یہ ہے وہ دلیل کہ قرآن واقعہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

ہم میں سے ہر شخص کہتا ہے کہ خدا کو مانتا ہوں۔ ساری دنیا سوائے چند دھریوں کے خدا کو ماننے اور نہ ماننے میں کیا فرق ہے۔ یہ تمام سائنسدان مستثنیات کو چھوڑ کر مانتے ہیں کہ یہ واقعی خدا کی تخلیق ہے۔ فطرت کے قوانین اٹل ہیں اور ان میں ایک عظیم حسن و تدّبر ہے اور وہ بھی جو کہتے ہیں کہ کائنات اتفاقاً وجود میں آ گئی۔ جیسے گھڑی کی چابی دی جاتی ہے۔ تو یہ کائنات بھی قاعدے کے ساتھ گھڑی کی طرح چل رہی ہے۔ اصل بات تو ایمان باالله ہے اور اس سے کفر یہی تو امتیازی چیز ہے اور ہمیں اس میں فرق نظر نہیں آتا کیونکہ خدا کو تو سب مانتے ہیں سوائے چند دھریوں کے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ (21:21) یہ اسے ماننے کیلئے بالکل تیار نہیں بلکہ انہوں نے اپنی حیات ارضی، معاشی اور معاشرتی زندگی کیلئے دیگر معبود یعنی اور نظامِ ہائے زندگی تجویز کر رکھے ہیں اور انہی کے سہارے زندگی کو آگے بڑھنا، پھلنا اور پھولنا چاہئے۔ یہ ان کی سب سے بڑی بھول ہے۔ قرآن نے آگے تفریق کی ہے۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ط (6:3) یہ نہ سمجھ لو کہ اس اقتدار کا دائرہ صرف خارجی کائنات تک محدود ہے جبکہ تمہاری معاشرتی اور تمدّنی زندگی اس کے دائرہ اثر ونفوذ سے خارج ہے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہہ دیا کہ میں تو خدا کو مانتا ہوں تو قرآن ارض وسماء کے الٰہ میں یہ تفریق کیوں کر رہا ہے۔؟

وَهُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ ؕ (43:84) دنیا کی کسی کتاب میں بھی اِلٰهُ الۡاَرۡضِ اور اِلٰهُ السَّمَآءِ کی یہ تفریق نہیں ہے۔ یہاں وہ تفریق کررہا ہے کہ تم اِلٰهُ السَّمَآءِ تو مانتے ہو مگر اِلٰهُ الۡاَرۡضِ سے انکاری ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ وَهُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ ؕ (43:84) گویا انسانی ذہن نے یہ تفریق کی تھی دوقسم کے الٰہ تجویز کر کے ایک سماوی اور دوسرا ارض کا جبکہ قرآن اس کی تردید کررہا ہے۔ بات بڑی غور طلب ہے کہ خدا کے ماننے کے کیا معنی ہیں۔ جب ساری کائنات کا خدا ہے تو کائنات میں سماء اور ارض دونوں آ گئے۔ یعنی خدا کو اس طرح ماننا ہوگا۔ کہ اِلٰهُ السَّمَآءِ بھی وہی اور اِلٰهُ الۡاَرۡضِ بھی وہی۔

ارض کا خدا الگ اور سماء کا خدا الگ ماننے کا نتیجہ:

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ ارض یعنی اپنی تمدّنی زندگی کیلئے اور الٰہ تجویز کرر کھے ہیں۔ گو یا یہاں فرق پیدا کر دیا کہ الٰہُ سماء تو مانتے ہیں مگر الٰہ الارض اور تجویز کرر کھے ہیں۔ یورپ کے سارے سائنسدان خدا کو مانتے ہیں اور وہ مانتے ہیں کہ یہ سلسلہ اس کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع چلتا ہے۔ ان تمام کتابوں میں ساری تگ وتاز اِلٰهُ السَّمَآءِ کے متعلق ہوتی ہے۔ ان میں سارا یورپ، یورپی اقوام اور ہم مسلمان شامل ہیں جبکہ ان کی زمین زندگی، معاشی، معاشرتی، تمدّنی، سیاسی کیا اس میں بھی اسے الٰہ مانتے ہیں؟ یہ سارا معاشرتی نظام اپنا وضع کردہ ہے ان تمام شعبوں میں کہیں بھی الا ارض اس کے اندر ہے۔ ملحدین کو چھوڑ کر یہ جو مانتے ہیں اور جو نہیں مانتے تو کیا ان کی معاشی، معاشرتی، تمدّنی زندگی میں کوئی فرق ہے۔ تو اس طرح سے خدا کو ماننے یا نہ ماننے سے تو کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ جنہوں نے مان لیا تو کیا؟ اور جنہوں نے نہ مانا تو کیا؟ یہ ماننے والے بھی خدا کو کبھی کبھی ایکسٹرا کھلاڑی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ظِهۡرِیًّا ؕ (11:92) یعنی اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تم نے خدا کو بطور ایکسٹرا رکھا ہوا ہے کہ جب اصلی کھلاڑی کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس وقت کچھ دیر کیلئے استعمال کر لیا۔

مسلمانوں کیلئے سرمایہ دار اقوام کی ایک چال:

کمیونسٹوں کا زور پڑا تو سرمایہ دار اقوام مصیبت میں پڑ گئی تھیں۔ تو اشتراکیوں نے ان کے خلاف یہ نعرہ بلند کیا۔

"workers of the world! unite together, you won't loose anything but your chains"

اس کے جواب میں سرمایہ داروں نے کہا۔

"Believers in God unite together"

حالانکہ یہ تمام مغرب سیاسی طور پر مسلم اتحاد سے لرزاں تھا تو اشتراکیوں سے الگ رکھنے کیلئے ان کو خدا بطور ظِهۡرِیًّا ؕ (11:92)۔ یاد آ گیا تا کہ یہ کہیں رشیا کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اس طرح ایکسٹرا خدا یاد آیا۔ یہ ہے اِلٰهُ السَّمَآءِ کا ماننا۔ اس حد تک کہ کائنات اس نے تخلیق کی اور یہ سارا نظام اس کے قوانین کے تابع چل رہا ہے یہ سارا آسمان کا اوپر کا حصّہ ہے جہاں خدائی کا اوپر کا حصّہ ہے جہاں خدائی کارفرما ہے اب نیچے ان خدا پر ایمان والوں کی کیفیّت وہاں سیاست، معیشت، معاشرت بالکل اس

طرح کی ہے جس طرح خدا کو نہ ماننے والوں کے ہاں۔ خدا نہ وہاں ہے اور نہ یہاں۔

خارجی کائنات کے اصول واقدار خدا کے مگر انسانی زندگی کے تمام ضوابط خود ساختہ:

کائناتی زندگی میں تو مانتے ہو کہ خدا کے قوانین رائج ہیں تو پھر تمہاری اپنی زندگی میں وہ کیوں نہ رائج ہوں۔ آسمانی کروں پر تو اس کی خدائی ہے مگر تمہاری زمینی زندگی میں اس کی خدائی نہ ہو۔ آخر کیوں؟ یہ ہے خدا کا ہمارا ماننا کہ ہم سب آسمان خدا مانتے ہیں مگر اِلٰہُ الْاَرْضِ پر کسی کا ایمان نہیں ہے۔ اگر خدا کو اس طرح مانیں جس طرح سورج خدا کو مان کر اس کے قانون کے خلاف ذرا بھی آنکھ جھپک نہیں سکتا۔ اگر اس الٰہُ السَّمَآءِ کو اسی طرح اِلٰہُ الْاَرْضِ مانیں کہ جیسے سماء کے اندر اس کے قوانین رائج ہیں تو اس طرح ہماری زندگی میں بھی اس کے قوانین نافذ العمل ہوں۔ تو یہ ہے خدا کا صحیح ماننا۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ (21:19-20) یہ تمام اس کی اطاعت میں سرکش اور سستی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ یعنی یہ ساری قوتیں خدا کو مانتی ہیں۔ اب جو خدا کو نہ مانے تو اسے ابلیس کہتے ہیں۔ دراصل Non-believer بھی خدا کو مانتا ہے۔ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ (38:82) وہ الہ السماء تو مانتا ہے لیکن ارض میں یہ الہ نہیں مانتا۔ یہ انسان ارض میں الہ نہیں مانے گا ابلیس نے کہا کہ میں دونوں میں ایمان والوں اور بغیر ایمان والوں میں یہ کرونگا۔ حکم سے سرکشی کے باوجود میں تو خدا کو مانتا ہوں۔ تو کہا کہ ایسی مملکت کا پتہ دونگا جو لازوال ہو۔ وہ یہ ہے کہ الٰہُ السَّمَآءِ اور اِلٰہُ الْاَرْضِ مان لینا صرف نظری طور پر اپنی تمدّنی زندگی اپنے قوانین سے چلانا یہ یورپ کے سائنسدان اور ہم سب مانتے ہیں کہ یہ خدا کائنات چلا رہا ہے۔

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ (23:88-89) یہ تمام کائنات میں جو کچھ ہے کسی کے حکم کے تابع سرگرم عمل ہے اور اس کیلئے ہے تو اس کا رہنا چاہئے پھر اسے اپنی ملکیت کیسے بنا سکتے ہو۔ پھر کہا۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ (23:86-87) سب یہ مان رہے ہیں پہلے بھی اور آج بھی۔ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ (23:88) تو سب کہیں گے۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ (23:89) تو پھر قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ (23:89) تو پھر کونسی چیز دھوکہ میں، مغالطہ میں ڈال رہی ہے اس کے بعد تمہیں موت پڑ جاتی ہے اپنی تمدّنی دنیا میں آکر۔ اپنا خود ساختہ اِلٰہُ بنا کر۔

ہم نے خدا کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے:

الٰہُ السَّمَآءِ مان رہے ہیں مگر اِلٰہُ الْاَرْضِ ماننے میں کونسی چیز آڑے آ رہی ہے۔ یہی ثنویت ہے ایک حصّہ تو مانتے ہیں باری تعالٰی کے وجود پر کتابیں لکھی جاری ہیں اور خدا کا اقرار فخر سے پیش کر رہے ہیں۔ یہ کتابیں ان کی طرف سے آ رہی ہیں تا کہ کہیں روسی نظام نہ آ جائے۔ قرآن ان دونوں کو کہتا ہے کہ تم میں سے کوئی بھی ماننے والا نہیں ہے۔ کیونکہ اِلٰہُ الْاَرْضِ ماننے سے انکار کرتے ہو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے ہو ایک الٰہُ السَّمَآءِ اور دوسرا اِلٰہُ الْاَرْضِ تو پھر کیسے مومن ہو سکتے ہو یہ ہے تُسْحَرُوْنَ

(89)(21:89)اس طرح کا خدا کو ماننا قرآن تسلیم ہی نہیں کرتا۔ 99 فیصد بھی مانو اور 1 فیصد کفر کر دو تو اسے قرآن کفر قرار دیتا ہے۔اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ (2:85) جس طرح انسانی جسم کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے اس طرح اس کتاب کے بھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو سکتے مانو تو سارا مانو۔انکار کیا جائے گا تو پورے کے پورے سے انکار ہوگا۔جسم کے دو ٹکڑے کر دینے سے کوئی ٹکڑا ابھی زندہ نہیں رہ سکتا۔اگر یہ کہا تو یاد رکھو نتیجہ۔اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ (2:85)وہ عذاب پھر کافروں سے بھی زیادہ ہوگا کیونکہ تم دھوکہ دے رہے ہو کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ ماننا ہے تو الہ الارض کو بھی مانو۔

سیکولرازم:

اس میں زندگی کے معاملات کیلئے اپنی عقل وفکر اور مشوروں کو کافی سمجھا جاتا ہے اور کسی اور کا عمل دخل نہیں چاہتے۔خدا کو کوئی دخل نہیں۔اس کی بادشاہت آسمانوں پر ہے۔انسان کے معاملات بغیر خارجی رہنمائی کے خود حل کرسکتا ہے۔یہ ہے سیکولرازم۔اس میں ماننے والے اور نہ ماننے والے سارے آجائیں گے۔مسلمانوں سمیت آج ساری دنیا سیکولرازم پر عمل پیرا ہے۔خدا کی حکومت کہیں بھی نہیں الہ ارض کہیں بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔اس طرح یہ مذہبی پیشوائیت نے دنیاوی معاملات حکومت کے سپرد اور سجدہ کرنا۔ جنازہ نکاح وغیرہ خدا کے سپرد کر دیا۔اصل تحفظ تو اس ارض کی دنیا کا ہے اسے حوالے کر دیا انسانوں کے تو الہ ارض تو انسان بن گیا۔ان تمام رسومات کا ارض زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا یہ سب پارلیمنٹ میں جا کر خود الہ بن کر قانون سازی کر رہے ہیں اور سجدہ کرنے والے عملاً انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر زندگی بسر کرتے ہیں اور خدا کا ان کے تمدّنی معاشرت پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔

اصل سوال خدا کی ذات پر ایمان کا نہیں بلکہ اس کی وحی کا ہے:

آج دنیا کے عظیم مفکر اور سائنسدان یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اصل سوال خدا کی ذات پر ایمان کا نہیں بلکہ اس وحی کا ہے جو انسانوں کی رہنمائی کیلئے ملتی ہے جو یہ مانتا ہے وہ خدا کو مانتا ہے۔ جو یہ نہیں مانتا وہ خدا کو نہیں مانتا۔ ایڈنگٹن کی کتاب "Science and the unseen .world" شعور انسانی کے مرکز کو نفس انا یا ایغو کہتے ہیں۔اب تحقیقات کی رو سے نفس انسانی Mind مادہ کی پیداوار نہیں تو یہ لامحالہ ماننا پڑے گا کہ اس کا تعلق مادی دنیا سے ماوراء ہے تو جس طرح مادی اشیاء کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ ان کی بنیاد مادی نہیں، ماورائے مادیّت ہے۔اس طرح شعور کی بنیادیں کسی اور دنیا سے ہے۔ یہ دنیا کیسی ہے؟ اس کے متعلق سائنس کچھ نہیں کہہ سکتی حتیٰ کہ اس کا کوئی متعین نام بھی نہیں رکھ سکتے یہ ہے غیب کی دنیا "Unseen world"۔وہ کہتا ہے کہ وحی کی رہنمائی کے بغیر خدا کا ماننا کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور وہ وحی قرآن میں ہے جبکہ خود یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ تمام آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہیں۔اب چونکہ ان کے پاس وحی کی رہنمائی نہیں ہے تو یوں ارض کی دنیا کٹ گئی۔الہ السماء کو یوں مان کر فکر کی دنیا تو یوں کٹ گئی۔

آج کرہ ارض پر مختلف خداؤں کی حاکمیّت تسلیم کرنے کا نتیجہ:

ہمارے ہاں صرف اعتقادات عبادات اور رسوم ومناسک تک ہی الہ الارض کو مانتے ہیں۔ باقی معاملات میں ان کا بھی دنیاوی الہ ہے۔قرآن کوصرف اعتقادات وعبادات تک محدود کر رکھا ہے۔ باقی زندگی خود ساختہ قوانین کے تحت، بہت سے الہ بنا رکھے ہیں۔ معاشرت کا الگ۔ معیشت کا الگ، تمدّن کا الگ۔ یہ ہیں وہ الہ جو مانتے ہو۔ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ (21:21) بہت سارے خدا جن کے سہارے ان کی زندگی آگے بڑھتی ہے اور بھول جاتے ہیں کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ج (21:22) تو اگر پھر خدا کے قوانین اس کائنات میں ہوتے تو پھر کائنات ساری درہم برہم ہو جاتی۔وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ج (16:51) دوخدا نہ بنالینا۔ یادرکھو۔ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ط (43:84) ساری کائنات میں اس کا اقتدار ہے۔ اگر سماء میں الگ اور ارض میں الگ خدا مان لیا تو یہ ہے اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ط (16:51)۔ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ط (16:52) اس کی اطاعت لازمی ہے کیونکہ یہی سچا دین ہے۔ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾ (16:52)

اس اطاعت کا مفہوم:

اِلہ الارض ماننے کے معنی کیا ہوئے؟ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (16:53) یہ تمام آسائشیں، نعمائے زندگی یہ سب اس کی عطا کردہ ہیں یہ تمہاری ہنرمندی کا نتیجہ نہیں ہیں۔ تمہاری صرف محنت ہے تو پھر اس کو اس کے قوانین کے تابع استعمال کرو۔ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ط (16:55) جو میں نے دیا ہے اسے یہ کہو کہ میرا حاصل کردہ ہے یہ ہے کفر۔ جو تم اس کی ہدایت کے تحت تقسیم نہیں کرتے۔

دین کے بنیادی اجزاء میں جبریّت کا اضافہ

وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی کو جزوِ ایمان بنا دیا

تمام آسمانی کتابوں میں یہی جبریّت کارفرما ہے۔ قرآن نے آکر ان سب کو چیلنج کیا کہ غلط ہے انسان صاحبِ اختیار ہے۔ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40) جو جی میں آئے کرو۔ ہم تمہاری مشیّت میں قطعاً دخل اندازی نہیں کرینگے ہماری مشیت تو قانون سازی تھی۔ تم کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح کسی بھی معاملے میں مجبور نہیں ہو۔ تم کائنات کے اندر کسی قوّت کے تابع نہیں ہو بلکہ یہ تمام قوّتیں تمہارے تابع کر دی گئی ہیں۔

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (45:13) اس کے بعد شِئْتُمْ (41:40) ہے جو خدا نے اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ ہم عالم امر کے اندر صاحب مشیت ہیں۔ ہم وہاں تمہارے لئے قانون بناتے ہیں۔ تم چاہے ان پر چلو یا نہ چلو تمہاری مرضی۔ اس عالم خلق میں اب تمہاری مشیت چلے گی۔ قرآن نے آکر صرف اس بنیادی اصول سے ان تمام نظریات کو ملیامیٹ کر دیا۔ لیکن تمہارا ہر عمل نتیجہ ہماری مشیت کے مطابق پیدا کرے گا۔ تم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو۔ اس اکاؤنٹیبلٹی کا مطلب اپنے اعمال کے نتائج بھگتنا۔

مجبور کی نیکی اور بدی کوئی اہمیّت نہیں رکھتی:

قانون تو خدا نے بنا دیا اب ان پر عمل کرنا تمہارے اختیار و ارادے سے ہے۔ اس میں مداخلت نہیں ہوگی تو اگر مداخلت ہوئی تو اس سے جبریّت کا پہلو نکل آئے گا۔ تو جزا و سزا اور قانون مکافات عمل سب ختم ہو جاتا ہے۔ دنیاوی عدالتیں بھی مجبور کو سزا نہیں دیتیں۔ وہاں جرم ہی ثابت نہیں ہوتا جو بلا ارادہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ نہ مجبوری کا جرم، جرم اور نہ نیکی، نیکی ہوتی ہے۔ اپنے اختیار و ارادہ سے کرو گے تو ہوگی۔ اب ایک سازش کے ذریعہ۔ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ کو جزو ایمانی بنا دیا گیا۔ حالانکہ قرآن نے صرف پانچ اجزاء کا حکم دیا تھا۔ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ مَلٰئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اسی طرح کمیونزم نے تو ان پانچ اجزاء کا انکار مگر جبر اور جبریّت تقدیر پر ان کا پختہ عقیدہ ہے کہتے ہیں انسانی دنیا کے اندر ایک قوّت ہے جسے یہ تاریخی Historical Necessity کہتے ہیں۔ یعنی انسان جو چاہے کرے ''وہ ہو کر رہے گا'' یہ ہے جبریّت کہ انسان کچھ نہیں کر

سکتا وہ ضرورت آ کر اس نظام کو الٹ کر، اس کے برعکس دوسرا نظام لاتی ہے اس میں ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے۔ یعنی اس نظام میں تغیرّ وتبدّل انسان کا کام ہی نہیں ہے اس کے خلاف کوئی انسان اپنے آپ کو نہیں بدل سکتا۔ خدا، وحی، رسالت سے انکار پر تو فخر محسوس کرینگے مگر وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ۔ پر ایمان لے آئے۔ یہ جبریّت کا نظریہ ملوکیّت کا پیدا کردہ تھا ہر قسم کی دھاندلی، ظلم واستبداد و بے انصافی کو خدا کی مرضی قرار دیا گیا کہ اس کے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ اب یہ کمیونزم والے ان کی طرح ذمہ داری سے چھوٹ گئے۔ فری لائسنس مل گیا۔ اب کوئی جواب دہی نہ رہی اور ساری دنیا میں فسق و فجور اس جبریّت کے عقیدے کی وجہ سے پیدا ہو گیا۔

سائیکالوجی، نفسِ شعوریہ اور غیر شعوریہ اور نظریۂ جبریّت:

اب سائیکالوجی آئی تو اس نے نفس شعوریہ اور نفس غیر شعوریہ انسان میں موجود ہے۔ غیر شعوریہ نفس 9:10 ہے جبکہ شعوریہ صرف 1:10 حصّہ ہے اور یہ تمام فیصلے نفس غیر شعوریہ کرتا ہے اور اس پر نفس شعوریہ کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ بات ابتداً انہوں نے ایک نظریہ کے طور پر کی تھی۔ اب ہمارا نوجوان طبقہ اسے لے اڑا۔ موج ہو گئی اب یہ تمام حرام زدگیاں تو غیر شعوریہ کی ہیں جس پر انسان کو اختیار ہی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اس جبریّت پر جا پہنچا۔ کمیونزم سے نوجوان بھاگے تو ادھر آ پھنسے۔ دراصل ساری بات اپنے اعمال کی ذمہ داری سے فرار ہے۔ اب کمیونزم میں تو خدا اور رسول نہیں ہے۔ مگر اس میں اسے بھی مانتے جاؤ اور اپنی ذمہ داری سے فرار بھی حاصل کرلو۔ اب یہ دو چار ابتدائی اصطلاحات جن پر ابھی تحقیق جاری ہے، استعمال کر کے اپنے اعمال اور فیصلوں سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں کہ یہ تو غیر شعوریہ نفس ہی کرتا رہتا ہے وہی جبریّت، وہی وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللهِ تَعَالٰی کی تباہیاں معاشرہ میں چارسو گردش کرنے لگیں حالانکہ یہ 70 سال پہلے فرائیڈ نے کہی تھیں جو ساری غلط ثابت کر دی گئی ہیں۔

اقتدارِ خداوندی کے تابع انسان کی قوّت ارادی (Will power) ایٹمی قوّت کا درجہ رکھتی ہے:

فرائیڈ کے 60 سال بعد سائیکالوجی جہاں تک پہنچی ہے ان کو اس کی گرد کا بھی پتہ نہیں خود اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ انسان کی قوّت ارادی ایسی چیز ہے جو نفس غیر شعوریہ کو بھی کنٹرول کر سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس قوّت ارادے کو صحیح اقدار کے تابع رکھ لیا جائے۔ یہ بالکل کوئی سات آٹھ سال کی بات ہے یہ فرائیڈ کو چھوڑ چکے ہیں۔ ابلیس نے کہا تھا کہ میں تگنی کا ناچ نچواؤں گا۔ تو خدا نے کہا تھا کہ میرے وہ بندے جو اقدار خداوندی کے تحت زندگی گزاریں گے تو ان پر نفس غیر شعوریہ کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ان کی تحقیق ہے کہ غیر شعوریہ قوّت کے باوجود (ان کے اندر) ایسی قوّت بھی ہے جو نفسی غیر شعوریہ کی اندر کی چیزوں کو بھی اپنے پیمانوں کے اندر ڈھال سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان کو یہ اقدار کہیں سے مل جائیں اور وہ غیر متبدّل ہوں۔

جنّت میں داخل ہونے کیلئے سب سے پہلے غِلّ نکالا جاتا ہے۔ یہ ایک کانٹا ہے، پھانس ہے، گرہ ہے اس کو یہ نفس غیر شعوریہ کے اندر چھپا ہوا بھید کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اقدار کے اندر رہتے ہوئے یہ نکل جاتا ہے۔ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ

غِلٍّ (15:47) کینہ، عداوت، سازش، مکروفریب بات صاف ہوگئی۔

یعنی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر انسان کا کنٹرول نہ ہو۔ نکل سکتا ہے خواہ وہ کسی وجہ سے بھی پیدا ہوا ہوا۔ اب ان کے ہاں Inheritance (وراثت) کا نظریہ تھا یہ ساری تھیوریز Explode ہو چکی ہیں۔ پہلے کہا تھا کہ بچہ نے جو تین سال میں بننا ہوتا ہے تو وہ بن چکتا ہے اور آئندہ زندگی میں اس سے بچ نہیں سکتے۔ اب یہ Inheritance آ گئی کہ جو دس ہزار سال پہلے ان کے ہاں بدمعاش تھا تو یہ بدمعاشی وراثتاً چلی آ رہی ہے۔ تو بھئی اس نسل میں تو اچھے لوگ بھی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بدمعاشی جمپ کر جاتی ہے۔ اس طرح درمیان میں دو تین کڑیاں چھوڑ دیتی ہے تو وہ اچھے ہو جاتے ہیں تو جب جمپ کر کے آئی تو اتفاق سے ہم پیدا ہونے والے تھے۔ تو وہ جمپ کر کے ہمارے اندر آ گئی یہ اس طرح کا خام علم بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ دراصل بدمعاشی کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ نہ حیا نہ شرم، دھڑلے سے کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے بس کی بات ہی نہیں۔ دس ہزار سال پہلے ہم میں سے کوئی تھا۔ یہ سوسائٹی کا اثر ہے اور انتھروپالوجی علم البشریات آ گیا۔ Inheritance کا اثر آ گیا۔ سوسائٹی کا ابتدائی اثر بچہ تین سال تک جو بننا تھا بن چکا۔ یہ سائیکالوجی صرف مبادیات سے آگے کا کوئی علم ہی نہیں ہوتا۔ ان کے پروفیسروں کو بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ یہ وہی متروک فرائیڈ پڑھا رہے ہیں۔ کچھ یہ لوگ، کچھ یہ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ والے اور کچھ کمیونسٹ، کمیونزم میں الحاد آیا۔ ساری اخلاقی اقدار سے بھاگ رہے ہیں۔ یہ تاریخی وجوب بنا دیتا ہے۔ تو یہ برٹرنیڈ رسل 1970ء نے کہا تھا یہ لینن (1870-1924ء) جرمنی میں بغاوت کے مقدمہ میں قید ہوا۔ جج نے رحم کھا کر اسے سائبریا بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے سازش جاری رکھی اور یہ کچھ کر دیا۔ تو اگر یہ سارا کچھ تاریخی وجوب کا ہے۔ اگر صبح اس جج کا مزاج چڑچڑا ہوتا تو پھر پھانسی مل جاتی تو پھر یہ ساری تاریخی وجوب کہاں چلی جاتی؟

قرآن کے نزدیک ابلیس وآدم کا تعارفی انداز:

ابلیس تو ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ آدم نے غلطی کا اعتراف کیا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) جو تیری بات نہ مانی اور اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ یہ ہے جبریّت کے خلاف پہلی آواز۔ یعنی منع کرنے کے باوجود آدم نے حکم سے انکار کیا۔ یہ ہے تخلیق نو جس نے اپنے ارادہ کو استعمال کیا۔ غلط سہی اپنے اختیار سے کی۔

قرآن نے جبریّت کی جڑ کاٹنے کیلئے یہ تعارف کرایا۔ کہ اس تخلیق نو میں جبریّت نہیں تھی۔ اس نے اپنے اختیار سے کچھ کرنا ہے اس کے برعکس ابلیس بڑی قوتوں کا مالک، تو اس نے کہا کہ میں نے تو یہ نہیں کہا بلکہ یہ تو تیرے حکم سے ہوا۔ میں تو اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ تو پھر جو لوگ غلطی کا اعتراف نہ کریں اور ذمہ داری قبول کر دیں تو پھر ہمیشہ کیلئے راندۂ درگاہ ہو جاتے ہیں۔ ابلیس نے مذہب میں یہ عقیدہ پھیلایا۔ ہر مذہب میں جبریّت جزو ایمان بن کر رہ گئی حتّٰی کہ مسلمانوں کیلئے ایمان کا حصّہ بن گیا۔ پہلے یہ کمیونزم آ گئی۔ حالانکہ مارکس 1884ء خود اس نتیجہ پر آخر میں آ گیا تھا کہ انسان اپنے آپ کو خود بنا سکتا ہے۔ یہ اعتراف موجود ہے۔ اب

674 انہی فرائیڈ اور ینگ 1961ء کے سکول آف تھاٹ سے لوگوں نے ان کلیوں کو مسترد کر دیا ہے اور وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں جس نتیجہ پر خدا نے آدم کو پہنچایا تھا ابلیس کو نہیں۔ قرآن تو بہت آگے کی چیز ہے۔ یہ تو مسلمانوں کیلئے مقدم چیز تھی۔ اگر اس پر تدبّر کر لیتے تو یہ ساری جبریّت ختم ہو کر رہ جاتی۔ چار دلیلیں لیکر پھر انسان کا دماغ تو ابلیس واقع ہوا ہے۔ پھر ابلیس بھی یہی دلیل لا یا تھا۔ حالانکہ جنّت تو عمل کے اندر مضمر ہے۔ سارا مذہب، روایات ولٹریچر عہد ملوکیّت کا بنا ہوا ہے۔ تقدیر کا بہانہ بنا کر مسلمانوں کو عمل سے ہی فارغ کر دیا۔

ایک عظیم آیت (21:104)

جب زمین پر نظامِ ربوبیّت نافذ ہو جائے گا

یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ ؕ وَعۡدًا عَلَیۡنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ﴿۱۰۴﴾ (21:104) اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جلد ہی یہ آسمان کی بلندیوں پر اڑنے والے جو سمجھتے ہیں کہ ان کو کوئی ہلا نہیں سکتا۔ تو یہ ردی کے کاغذوں کی طرح لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا جس طرح کہ بہی کھاتہ حساب کتاب کے بعد کسی کام کا نہیں رہتا بلکہ لپیٹ لیا جاتا ہے۔ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ ؕ (21:104) جو تخلیق انسانی دور اوّل میں تھی۔ معاشرہ پھر اس حالت میں لوٹ آئے گا۔ جب نوع انسانی امت واحدہ تھی۔ رزق کی فراوانیاں اور تیری میری کا یہ منحوس ابلیسی نظام نہیں تھا اور آخر کار غلط تجارب کے بعد انسان آخر کار اس تمدّن کی طرف آ جائے گا نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا۔ حجّ الوداع کے موقعہ پر۔ انسانو! سن لو۔ زمانہ گردش کرتے کرتے آج پھر وہیں آ پہنچا ہے جہاں سے ابتداء ہوئی تھی۔ یَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ (9:36) حضور ﷺ کا دور فردوس گم گشتہ کی بازیابی کا دور ہے۔ اور یہ دور دوبارہ نافذ ہوگا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔

❁❁❁

قانونِ خداوندی انسانی اختیارات میں وسعت پیدا کرتا ہے(21:90)

یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ (21:90) خیر یا خیرات کا وہی مادہ ہے جس سے اختیار کا لفظ نکلا ہے۔ قانون خداوندی کے مطابق انسان جتنا کچھ حاصل کرتا ہے تو اس سے اس کا اختیارات کی وسعتیں بڑھتی ہیں۔ محکومیت اور محتاجی کم ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ محرومی اور محتاجی رہتی ہی نہیں ہے۔ اختیار کامل تو انسان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ اس کو نہ تو کسی قسم کی محتاجی ہو اور نہ محکومی۔ یہ ایسا نظام تھا جس میں افراد انسانیہ کے اختیارات کی وسعتیں بڑھ جاتی تھیں۔ یعنی ایسی وسعت کہ دوسرے کا دست نگر نہ ہو۔ محکوم نہ ہو ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

حاکم ومحکوم کے مقابل امیر المومنین کی اصطلاح:

اس نظام میں حاکم ومحکوم ہونے کا تصوّر ہی نہیں۔ تمام افراد قانون خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ جن کو حاکم کہتے ہیں۔ وہ بھی خدا کے قانون کے محکوم ہوتے ہیں اور محکوم کی اصطلاح ہی نہیں ہے۔ اسلامی نظام میں یہ اصطلاحات ہی نہیں ہیں۔ حاکم ومحکوم کی اصطلاح بھی ناپید ہے۔ صدرِ اوّل میں امیر المومنین کی اصطلاح تھی۔ ہمارے ہاں امیر کا لفظ غریب کے مقابل جو دولت کے بل بوتے پر غریب پر حکومت کا حق حاصل کرتا ہے۔ ہمارے ہاں دولت مند آ گیا۔ عربی زبان اور نظام اسلام میں یہ دونوں معنی نہیں ہیں۔ یہ امیر کارواں پائلٹ کی طرح کارواں سے آگے جا کر، راستہ کو دیکھ بھال کر کے، متعین کر کے، چھوٹے چھوٹے پتھر (گیٹیاں) رکھ کر کارواں کیلئے راستہ متعین کرتا جاتا تھا۔ یہ امیر اور امر سے مراد رہنمائی کرنا۔ راستہ کا تعین کرنا خدا کی ہدایات کے مطابق۔ یہ تھا امیر المومنین یہ حاکم نہیں تھا۔

حاکم کا لفظ شرک اور انسان کی تذلیل ہے:

کسی انسان کیلئے حاکم کا لفظ یا اصطلاح شرک ہے اور محکوم کا لفظ انسانیت کی تذلیل ہے۔ یہ اصطلاحات تو اسلامی نظام کے

بالکل برعکس اور علی الرغم ہیں۔ وہ تو غیر خدائی، طاغوتی قوّتوں کو ہٹاتے تھے جو انسانوں کے صحیح اختیارات کو سلب کرتی تھیں۔ وہ تو صحیح اختیارات دیتے تھے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ؕ (2:286) یہ پابندیاں اقدار اس لئے عائد کی جاتی ہیں تا کہ ان کی ذات میں وسعت پیدا ہو۔ نہر کی ٹھوکر (Fall) جس سے پانی ٹکراتا ہے۔ اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ اس کی روانی روک دے بلکہ اس کی روانی میں تیزی پیدا کر دے۔ یہ انبیاء محتاجی اور محکومی کی ذلتوں سے افراد کو بچا کر صحیح اختیارات کا مالک بناتے تھے۔ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا يُسٰرِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ (21:90) نیکی کا تصوّر جو مذہب کا پیدا کردہ ہے اس میں استحصال کا پہلو ہوتا ہے۔ یہ ہندو صبح اٹھ کر چڑیوں کو دانہ ڈالتے تھے اور اسے نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ غریبوں کا خون چوس کر دولت اکٹھی کرتے تھے۔ پھر اس میں سے تھوڑا سا نکال کر سمجھتے ہیں کہ مال پاک ہو گیا۔ ہمارے ہاں بھی لنگر، مسافر خانے، بڑا نام، شہرت کا کام ہے۔ کہاں سے آیا؟ یہ تصوّر ہی نہیں کہ کسی محنت کش کی محنت کا استحصال نہ کرنا نیکی ہے۔ اس استحصال دولت سے سبیل لگانا۔ دانہ ڈالنا غریبوں کا خون چوس کر، کیا فرق ہے۔ مذہب ان اعلیٰ تصوّرات کو بدل دیتا ہے۔ اصطلاحات کے معنی بالکل الٹ جاتے ہیں۔ خیرات جیسا عظیم لفظ جس سے مراد ''اختیارات کی وسعتیں'' تھیں، اب اس کے معنی بھیک ہو گیا ہے۔ خیرات بانٹتے ہیں اور خیرات لیتے ہیں۔ یہ تصوّر لینے والے اور دینے والے ان دونوں کی انسانیّت کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ دینے والا تکبر اور لینے والا تذلیل محسوس کرتا ہے۔ ایک شیطنت اور دوسری ابلیست۔ یہ انبیاء جو خیرات کا کام کرتے تھے تا کہ ان میں اختیارات پیدا ہو جائیں اور یہ مروّجہ خیرات ان کو ناکارہ بھی اور بھیک منگا بھی بنا دیتی ہے۔ دیکھا کیسے اصطلاحیں بدل کر رکھ دیں۔ یہ تھی بڑی سازش۔

قرآن کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے
موجودہ انکشافات ایک ایک آیت کی تصدیق کر رہی ہیں

(قرآن کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے یہ اس ذات کی طرف سے ہے جس کے سامنے غیب وشہادت یکساں ہیں)

کائنات:

قرآن اس ذات کی طرف سے ہے جس کے سامنے غیب اور شہادت یکساں ہے۔ ماضی حال اور مستقبل اس کے سامنے ہے یہ ہے وہ مقام جہاں اس کے دعویٰ صداقت بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں عرب کا خطّہ میں جس میں عام علم بھی ناپید تھا۔ صرف سترہ آدمی ابتدائی لکھنا پڑھنا جانتے تھے مکہ اس زمانے میں مرکزی شہر تھا۔ سارا عرب تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو خطے مقابلۃً ایڈوانس تھے۔ ذرا اس کائنات کے بارے میں ان کے تصوّرات کو سامنے لایئے۔ بطلیموس نظام کی رو سے یہ مانا جاتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ تصوّر کہ تھال کی طرح چپٹی ہے۔ نیچے پانی ہے، پانی کے اوپر مچھلی اور مچھلی کے اوپر گائے ہے گائے کے سینگوں پر یہ دھرتی ماتا ہے۔ ایک وقت میں ایک سینگ پر دھرتی ماتا کو رکھتی ہے ایک تھک جائے تو دوسری پر رکھتی ہے اور یوں زلزلہ آتا ہے۔ یہ ان کی الہامی کتابوں میں تھا۔ سورج، چاند، ستارے تمام دیوتا تھے۔ اب یہ چاند گرہن لگتا تو کہتے کہ سور یہ دیوتا نے قرض لے رکھا ہے قرض خواہوں نے گلے میں پٹہ ڈال کر رکھا ہے کیونکہ وقت پر ادا نہیں کر سکا۔ جلدی جلدی سے یہ پنڈت زیورات اور پیسہ اکٹھا کرتے تا کہ دیوتا کا چھٹکارا ہو سکے اور سارا کچھ گھر لے جاتے تھے۔ عیسائیّت کے مطابق جس جگہ عیسیٰؑ آئے ہیں تو اسے کائنات کا مرکز ہونا چاہئے۔ یہ تو ہوئی چھٹی صدی عیسوی۔ اب آیئے 17 ویں صدی میں۔ Galalio (1564-1642) نے پہلی دفعہ کہا کہ زمین متحرک ہے تو اسے پھانسی پر چڑھانے لگے۔ اب تو چاند اور مریخ تک چلے گئے ہیں تو پہلی بار اس کا اعلان روسی خلانوردوں نے کہا کہ اجرام فلکی کا سارا سلسلہ ابتداء ایک ہیولی تھا۔ (یعنی گیسوں کا مجموعہ) چاند اور زمین کا مرکب جن چیزوں سے بنا ہے وہ اس وقت بھی وہی تھیں وہ الگ الگ نہیں تھیں۔ چونکہ چاند کے اوپر کوئی فضائی تہہ نہیں ہے تو اس میں کچھ تبدیلیاں جو آئی ہیں وہ اس فضا کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ عطارد (مرکوی) کے اوپر یہ

فضانہیں ے اس لئے چانداور عطارد کے اجزاء کم وبیش ایک جیسے ہیں مریخ پر لطیف سی فضا ہے اس لئے اس کے اجزاز مین سے ملتے جلتے ہیں۔ زمین چاند عطارد جیسی ہی ہے یہ شروع میں ایک تھے۔ چاند زمین سے 21 کروڑ پچاس لاکھ میل دور ہے راکٹ کو گیارہ ماہ لگے۔ جو ہزاروں میل فی یعنی 26000 میل فی سیکنڈ اسے زمین فضا سے نکلنے کیلئے یہ رفتار اختیار کرنی پڑتی ہے۔

قرآن:

اب چودہ صدیاں قبل قرآن کی طرف آیئے۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ (41:11) دیگر اجرام فلکی کی طرف توجہ کی جو ایک ہیولی کی شکل میں تھے۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ⑪ (41:11) یہ سب مظاہر جو الگ الگ ہیں اس کے پیدا کردہ ہیں۔ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (21:30) کفر اور ایمان کا امتیاز ملاحظہ کریں۔ مظاہر فطرت پر غور نہ کرنا کفر ہے کہ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ (21:30) یہ سب ایک ہیولی تھا اس کے بعد اس کے چھینٹے اڑے اور یہ الگ الگ ہو گئے۔ دوسری جگہ۔ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؕ ⑳ (79:30) اور بعد میں زمین کو یوں پھینکا جیسے گوپئے سے پتھر پھینکتے ہیں۔ اب یہ چھوٹے بچہ کو بھی سمجھا رہا ہے۔ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۪ ㉛ (79:31) پانی کو کشید کر کے الگ کیا۔ خشکی کے قطعات الگ کر کے پھر اس میں نباتات کو کھیتی باڑی کیلئے الگ کر دیا۔ یہ تمام کرے نکلے اور كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ㉝ (21:33) بڑی تیزی سے اپنے اپنے مدار میں گردش کرنے لگے۔ یہ جو چھینٹے تھے شمس وقمر اور تمہاری زمین ہے۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ㉝ (21:33)۔ يَّسْبَحُوْنَ ㉝ کا لفظ کتنا وجد آفرین ہے۔

زندگی کی نمود کا دارومدار پانی پر ہے:

ہمارے ہاں سائنس کا انکشاف کہ پانی سے ہی زندگی کی نمود ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو زندگی نہیں ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ (21:30) ہر شے میں زندگی کی نمود پانی سے ہوئی۔ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ (24:45) ہر متنفس شے کو۔ آگے ہے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ؕ (24:45) یعنی اوّلین جرثومہ سے لے کر انسان سارے دآبہ میں آجاتے ہیں۔ اب تو نباتات بھی، کہتے ہیں کہ سانس لیتے ہیں۔

كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ (21:30)۔ وہاں دَآبَّةٍ (24:45) کہا۔ شیء میں دَآبَّةٍ (24:45) آجائیں گے۔ مگر دَآبَّةٍ (24:45) میں ہر شے نہیں آتی۔ مریخ سے مٹی میں نمی کی تلاش ہو رہی ہے وہ دلیل ہوگی کہ وہاں دآبہ کی شکل میں زندگی ہے۔ نباتات کی شکل میں زندگی نہیں جرثومہ خواہ مردہ ہو یا زندہ کہ لائف ان میں موجود تھی یا نہیں۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:29) یہ زمین اور اجرام فلکی نشانیوں میں سے ہیں۔ آگے ہے۔ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ (42:29) نیز وہ ذی حیات جو ارض اور کروں میں پھیلا رکھی ہیں۔ مگر ہر کرے میں نہیں مگر ان میں ذی حیات کا امکان ہے۔ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (21:29) جو مِنْ اٰيٰتِهٖ

(42:39) بات کہاں پہنچ رہی ہے۔ مومن کسے کہتے ہیں؟ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾ (42:29) اکٹھے ہو جائیں۔ رابطہ ہو جائے ایک امی کی زبان سے کہلوایا جا رہا ہے۔ قرآن تو صرف سائنس کے اصول بیان کر رہا ہے۔ مگر قرآن یہ باتیں کسی اور مقصد کیلئے کر رہا ہے۔ کہا وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (11:7) اس سرچشمہ حیات پر مرکزی کنٹرول اس کا ہے یہ تھا مقصد کہ اس کا مرکزی کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے۔

زمین کے متعلق ارشاد خداوندی:

جو گیلی لیو نے کہا تھا کہ زمین گھوم رہی ہے قرآن نے کہا۔ وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ص (21:31) زمین کو ایسا بنایا کہ وہ ان کو ساتھ لے کر گھومتی بھی رہے اور پہاڑ جو واٹر ورکس کا کام دیتے ہیں اور سامان زیست کے ذخائر کا بھی۔ دوسری جگہ ان تَمِيْدَ بِكُمْ (16:15) ہے تاکہ تیزی سے گردش کے باوجود تمہیں لے کر گھومتی رہے۔ ان میں سے سامان نشوونما بھی چل رہا ہے اور گھوم بھی رہی ہے دونوں معنی اس لفظ ''تمید'' میں آ گئے۔ تیزی سے متحرک ہے۔ فضا کی تنہائیوں میں تیر رہی ہے اور جو شے اتنی تیزی سے متحرک ہو تو اس پر تو کوئی ٹک نہیں سکتا۔ اسی کو گھما کر اس پر ذرا سی کوئی شے رکھیں تو وہ اڑ کر دور چلا جائے گا۔

پھر اس کے اوپر یہ بارہ میل کی فضا ہے۔ یہ چوڑائی ہے اس کے بعد یہ اوپر فضا نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کروں کی سطح پتھریلی سی ہو گئی ہے جبکہ اس فضا کی وجہ سے زمین کی سطح محفوظ رہی ہے اس کے اوپر ان چیزوں کی (Meteors) کی یورش نہیں ہوئی قرآن نے اسے سَقْفٌ مَّحْفُوْظٌ کہا ہے۔ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ (21:32) پہلی بلندی ہے اسے محفوظ یعنی حفاظت کیلئے بنایا ہے یہ خود بھی محفوظ ہے اور شہاب ثاقب سے محفوظ رکھتی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ کروڑ ہا سال سے یہ کرے گردش کر رہے ہیں۔ ان میں سے اب بھی بڑے بڑے ہمالیہ جیسے ٹکڑے آ کر گرتے ہیں چونکہ وہاں Atmosphere نہیں ہے۔ یہ دمدار ستارے، شہاب ثاقب (Meteors) جو ان اجرام فلکی کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں۔ اگر ایک ٹکڑا زمین پر آ گرے تو کوئی زندہ نہیں رہے گا۔ یہ زمین کی فضا ایسی محفوظ چھت ہے جس کی وجہ سے بچت ہو گئی ہے۔ جب ٹکڑے اس فضا کے اندر آتے ہیں۔ تو اس کی رگڑ سے وہ پس جاتے ہیں۔ کبھی جو سخت جان ٹکڑا بچ جائے تو کہتے ہیں کہ فلاں جگہ وہ ٹکڑا پڑا ہے اور اس راکھ کے اوپر جو روشنی نظر آتی ہے وہ اس لئے کہ اگر کسی کرے کی شعاع اس وقت پڑ رہی ہو تو وہ اتنے وقت کیلئے روشن نظر آتا ہے اور یہ ان ذروں کا، اس پسی ہوئی راکھ کے صدقے یہ سورج کی روشنی سے زمین چمکتی ہے یہ ہے وہ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ (21:32)۔

خداوند تعالیٰ کی بے پناہ نوازشات:

کرہ زمین کو ایسا کر دیا کہ اطمینان سے بیٹھے رہو سامان زیست بھی ملے اور گھومتی بھی رہے تاکہ تمہارے لئے اوقات، دن، رات اور سالوں کا تعین کر سکے۔ (16:15) اور بڑے بڑے پہاڑ جو واٹر ورکس اور دیگر ضروریات کا ذریعہ ہیں۔ پھر اَنْهٰرًا وَّ

سُبُلًا (16:15) خشکی کے راستے دریا اور درے بھی رکھ دیئے۔ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا (21:31) ان سے راستوں کا کام لیا جا سکے۔ لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ (21:31) تاکہ تم منزل تک پہنچنے میں رہنمائی لے سکو۔ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ (10:67) اور دن کو روشنی تاکہ کام کر سکو۔ ذرا غور تو کرو یہ کیسے پیدا ہو گیا۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾ (21:33) کہا لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ (15:77) لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾ (16:12) لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾ (16:11) اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ (13:19) الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (3:191) تحقیقات کے بعد پکار اٹھتے ہیں۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (3:191) یہ ہے مومن کی پہچان کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ان آیات پر غور وفکر کرتے ہیں۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ (3:190) یہ کائنات اور رات دن کی گردش یہ ہیں بڑی نشانیاں اس کے قوانین کی ہمہ گیری کی جو صرف غور وفکر سے سمجھ میں آ سکتی ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ (21:30) یہ ہے مومن اور کافر کا فرق۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ ان پر تحقیق کی جائے۔ آگے ہے۔ وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾ (21:32) یہ یہی کہ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔ آیات سے پہلو تہی کرنا تو مومنوں کا شیوہ ہو نہیں سکتا۔ ان کا تو فریضہ تھا کہ ان پر تحقیقات کرتے۔ غور وفکر نہ کرنا تو کفر ہے۔ ابراہیم کو جو اتنا یقین محکم پیدا ہوا تھا۔ وہ کائنات یعنی ملکوت ارض وسماء کا مشاہدہ کرایا گیا اور جلال و کبریائی دکھائی گئی۔ یہ انبیاء کائنات پر غور وغوض پر بھی زور دیتے تھے۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (41:53) کائنات کے پردے جوں جوں اٹھتے جائینگے تو یہ حقیقت نظر آجائے گی کہ قرآن واقعی صداقت وسچائی پر مبنی ہے۔

قرآن کی صداقت کی دلیل تو یہ آفاق یعنی خارجی کائنات کے ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ یہ ان کو سچا ثابت کر رہے ہیں اور ہم جھٹلا رہے ہیں جبکہ یہ تو ہمارا کام تھا لیکن یہ تو نوع انسانی کا قرآن ہے۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ اب عالم انفس یعنی سائیکالوجی پر بھی ان کی طرف سے یہ حقائق آ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو تزکیہ نفس سے نفس کو مارنا ہی معراج ہے۔

خارجی کائنات:

یہ کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے اس کے سامنے تو ایک متعین نصب العین ہے اور نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ساری کائنات میں ایک ہی قانون نافذ ہے۔ جو ایک ہی صاحب اقتدار کا دیا ہوا ہے ان اشیاء میں سے خود کسی کا وضع کردہ نہیں ہے کائنات اس قدر عظیم القدر اور محیّر العقول ہے کہ اس کی وسعت کا اندازہ کا تصوّر بھی ذہن انسانی میں نہیں آ سکتا۔ اس میں ہر جگہ قانون وحدت ہے جو توحید کی طرف لے جاتا ہے کہ ان تمام قوانین کا سرچشمہ ایک ہے وحدت تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قانون بنانے والا اور دینے والا

674
ایک ہو۔ اگر مختلف الٰہ ہوں تو قوانین میں اختلاف ہوگا۔ قرآن اس کی تائید میں شواہد پیش کرتا ہے کہ دیکھو ان چیزوں پر غور وغوض کے بعد کیا انسان اس نتیجہ تک نہیں پہنچتا کہ اس ساری کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے اور یہ کہ قرآن یہ تمام چیزیں اپنے نصب العین کی تائید وضاحت کیلئے پیش کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں ابتدائے کائنات کی اور دیگر مخلوقات کی، اس کا مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ بات آگے چلنی ہے کہ ہمارا اس کائنات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اب سائنسدان تو کائنات کو آیات کے طور پر یعنی حقیقت تک پہنچنا نہیں لیتے۔ یہ علم تو صرف مقصود بالذات بن گیا۔ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۳ (45:3) ہیں۔ یہ ہے مومن کا فریضہ تھا کہ وہ ان تمام بکھری ہوئی آیات پر تحقیق کرتا۔ جن کیلئے یہ چیزیں آیات نہیں بنتیں وہ مومن ہو ہی نہیں سکتا۔

مغرب کے سائنسدان اور قرآنی سائنسدان:

مومنین قرآن کے سائنسدان ہیں قرآن ان دونوں کا فرق ایک لفظ ''آیت'' میں دے رہا ہے۔ یورپی سائنسدانوں کی ریسرچ کے بعد ان کی اپنی زندگی میں ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ان چیزوں کو خارجی طور پر محض علمی تحقیق کی رو سے دیکھتے ہیں۔ مگر یہاں یہ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۳ (45:3) غلبہ وحکمت کی نشانیاں صرف انہی کو نظر آسکتی ہیں۔ جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ کیا؟

تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۲ (32:2) وَفِیْ خَلْقِکُمْ (45:4) خود تمہاری تخلیق کے اندر۔ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ (45:4) تمام متنفس ذی حیات میں۔ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝۴ (45:4) پہلے مومنین کہا اب یقین کہا یعنی ایمان میں یقین کیسے پیدا ہوگا۔ یہ تمام غور وخوض تحقیقات ایمان کی طرف لے جانے کی علامت بنے گا۔ یہ آیات باعث ایمان وایقان ہیں۔ یہ زبان سے کہنے کی بات نہیں ہے اس لئے ان کو آیات کہا ہے۔ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ (45:5) اب بیالوجی سے فلکیات کی طرف آگئے۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (45:5) آگے وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝۵ (45:5) ایمان وایقان والوں کو ہی صاحبان عقل وخرد کہا۔ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝۶ (45:6) اگر کوئی اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو اور کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے۔

ذاتِ خداوندی کو دیکھنے کا طریق:

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (10:7) ان آیات سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جو یقین رکھیں کہ جس طرح خارجی کائنات میں اس کے قوانین کارفرما ہیں۔ انسانی اعمال بھی اس کے قوانین کے تابع نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں اور حیات کا سلسلہ آگے بھی چلے گا۔ جو ہمارا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے۔ تو یہ خارجی کائنات کے حقائق صرف اس پیش یا افتادہ مفاد کیلئے استعمال کر کے اسے ہی اطمینان کے باعث بناتے ہیں۔ لِقَآءَنَا (10:7) جو کچھ ان کے سامنے پڑا ہے وہ اس پر راضی ہو جاتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ٹھیک ہے، یہی اصل مقصود ہے، کافی ہے۔ بنجر زمین ہے تو بنجر

ہی سے لو اور مزید محنت نہیں کرتے۔ کائنات میں اضافہ کی فکر نہیں ہے آگے ہے۔ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝٧ (10:7) یہ ہیں جو ان آیات سے بےخبر اور جاہل رہ جاتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝٨ (10:8) یہ مسلمان ہو کر بھی جہنّم کا ایندھن بنتے ہیں۔ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝٢ (13:2) تا کہ خدا کی کارفرمائی بےنقاب ہو کر سامنے آجائے اور تم ایمان میں یقین حاصل کر سکو۔

حواسِ خمسہ کے تحت علم کی تعریف:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــــُٔوْلًا ۝٣٦ (17:36) حواسِ خمسہ کے لیئے (Physical senses) قرآن نے سمع و بصر و فواد کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ان سے اگر کام نہ لیا اور ویسے کسی چیز کے پیچھے پڑ گئے علم تو کہتے ہیں جن کی شہادت یہ حواس دیں گے۔ یہ ہے علم محسوس، یہ تمام طبعی دنیا محسوسات کے اندر آتی ہے اب اپنے مسائل کو اقدار خداوندی کے تحت حل کرنا ہے۔ قرآن علماء ان کو کہتا ہے جو ان آیات پر تحقیقات کر کے اس کے جلال و جمال سے لرزاں رہتے ہیں۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰۗؤُا ۭ (35:28) یہ جو علم و بصیرت سے کائنات پر غور کر کے اس کے قوانین کے سامنے جھک جاتے ہیں یہ ہیں علماء۔

جو قوم کائناتی قوّتوں کو مسخّر نہیں کرتی اس کیلئے اقدار خداوندی چہ معنی دارد؟:

سائنس کا علم حاصل کرنے کے بعد جو قوانین آشکارا ہو جائیں تو ان کو اقدار خداوندی کے تحت استعمال کرنا یہ ہے کہ مومن کا فریضہ۔ جو قوم اس عطیہ خداوندی یعنی فطرت کے علوم سے ہی محروم ہے تو پھر کیسے استعمال کر سکتی ہے اقدار کے تحت؟ جب حقائق ہی نظروں سے اوجھل کر دیئے گئے اور ہم افسانوں میں چلے گئے۔ قرآن نے تو وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ (45:13) یہ تسخیر کائنات تو مومن کا فریضہ، ایمان کا حصّہ تھا۔ انہی سے تو مومن اور متقی بنتا تھا۔ یہ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ (45:13) خدا کی طرف سے ایسے ہی ہے جیسے یہ قرآن اس کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اس طرح سے تسخیر کائنات کا فریضہ عائد کر دیا گیا ہے۔ یہ چاند اور مریخ ہی نہیں وہ تو جَمِيْعًا (45:13) کہہ رہا ہے۔ اب مومن کے علم کی تو حد ہی مقرر نہیں کی جا سکتی۔ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ (45:13) یعنی پوری کائنات میں سب کا سب اس ایک۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝١٣ (45:13) یہ غور و فکر والی قوم ہی سمجھے گی کہ مسخّر کر دیا گیا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ (45:13) مومنین کیلئے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا (2:31) اشیائے کائنات کے علم کی، تمام علم کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے اس میں مومن اور کافر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اب قوّت حاصل کرنے کے بعد ایمان اور کفر کا فرق آجاتا ہے جو منفعت نوع انسانی کیلئے، اقدار خداوندی کے تحت، ان کو استعمال کرے گا۔ وہ ہے مومن۔ پہلے ان قوّتوں کی تسخیر ہے۔ پھر اقدار کے تحت استعمال اور جن کو یہ قوّت حاصل

ہی نہیں تو وہ کیسے ان کی اقدار کے تحت استعمال کر سکتا ہے؟ اور جنہوں نے ان علوم کو خواہشات اور ذاتی مفادات کیلئے استعمال کیا پھر ان کو علم کی یہ بلندیاں بھی بچا نہ سکیں اور وہ قصہ پارینہ بنا دیئے گئے۔ غلط استعمال سے قوّت کا نقصان تو ہوتا ہے۔
وہ تو پورا ہیروشیما بھک سے اڑا دے گا۔ ساری دنیا میں امن مفقود ہو جائے گا۔ یہ تو مومن ہے جو نوع انسانی کے امن کا ضامن ہے۔ قوّتوں کو اقدار خداوندی کے تحت استعمال کرنے والا مومن کہلاتا ہے۔ خدا کی ایک صفت المومن بھی ہے۔ وہ تو کسی پر ایمان نہیں لاتا۔ اس کا مطلب تمام نوع انسانی کے امن کا ضامن تاکہ کائنات میں فساد برپا نہ ہو جائے جبکہ یہ امت نچلے درجے پر اس فریضہ کو انجام دینے والے ہیں جو نوع انسانی کو امن دے۔ جو اپنی حفاظت اور امن کیلئے غیروں کا محتاج ہو تو وہ بھلا کیسے مومن ہو گیا؟

اقوام سابقہ کی بستیوں کے کھنڈرات نوحہ خواں ہیں:

اگر تسخیر فطرت کی ان قوّتوں کو (چاہے تھوڑے پیمانے پر ہوں آج کے مقابلہ میں) اقدار خداوندی کے تحت استعمال نہیں کرو گے تو نتیجہ تباہی و بربادی ہے۔ بیسیوں آیت میں صرف ایک آیت وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۟ (46:26) وہ کوئی وحشی قوم نہیں تھی۔ علم و بصیرت کے تمام ذرائع حاصل تھے۔ لیکن مفاد پرستی نے ان کو اقدار خداوندی سے سرکشی پر آمادہ کیا۔ تو ان کی فہم و فراست بھی ان کے کسی کام نہ آسکی۔
آج ساری دنیا علوم و سائنس میں اتنی ترقی کے باوجود جس جہنّم میں گرفتار ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ سچ کہا تھا کہ قرآن نے وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۟ (46:26) خوف و ڈر چاروں طرف سے منڈلا رہا ہے۔ تصادمات بڑھ رہے ہیں۔ ایک قدم غلط اٹھایا تو پوری نوع انسانی صفحہ ارض سے ختم ہو جائے گی۔ مہیب گھاٹی کے دہانہ پر انسان کھڑا لرزاں و ترساں ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

تین درجات اقوام کے:

ایک قوم وہ ہے جو فطرت کی قوّتوں کو علوم سائنسی کی رو سے مسخّر کرتی ہے پھر ان کو اپنے مفادات اور مصلحت کی خاطر استعمال کرتی ہے نتیجہ تباہی اور بربادی ان کے نیشنلزم کی صورت میں ملا۔ بحر حال فطرت کی قوّتوں کی وجہ سے یہ اپنی حد تک ساری دنیا میں بلندی پر ہیں۔ دوسری قوم وہ ہے جو ان قوّتوں کو حاصل کر کے اقدر خداوندی کے تحت انفع الناس کیلئے استعمال کرتی ہے۔ یہ جماعت مومنین ہیں جو کہیں نظر نہیں آتے۔ یہ ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتی ہے۔ ان کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ تیسرے ہم جن کے پاس

674

فطرت کی قوّتیں ہی نہیں تو ان کا استعمال کیسے ہوگا؟ مقام آدم پر آج اقوام مغرب کھڑی ہیں۔ مومن کا مقام تو بہت ہی آگے ہے اور وہ گروہ پست ترین سطح آدمیت پر ہو وہ مومن نہیں ہوسکتا۔ جس کے حصے میں مقام آدم نہیں آتا تو مقام مومن کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ صرف نام ہی رکھا ہے۔ صرف اصطلاحی۔ اَسۡمَآءٍ سَمَّيۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (7:71) جہنّم میں تو محتاجی اور محکومی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اصول یہ ہے کہ جن کی دنیا نہیں سنورتی اس کی عاقبت بھی نہیں سنورتی۔ دنیا اور عاقبت الگ الگ نہیں ہیں جو پودا اگتے ہی مرجھا جائے وہ کبھی پھل دار درخت نہیں بن سکتا۔

وَمَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى (17:72)

ے
وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

رسول ﷺ نے فرمایا جس کا کل اور آج یکساں گزر گئے وہ تباہ ہوگیا۔ یہ تمام رسومات بے روح ہوچکی ہیں۔ قرآن کی رو سے تو علم یہ تھا۔ عالم یہ تھا۔ یہ تھا مومن کا مقام!!

سارا کچھ چھین لیا گیا اور ہمیں مطمئن کر کے بٹھا دیا یہ ہے عبادت اور یہ ہے مدرسوں والا علم۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

ایک جدید معاشرے کی بنیاد اقدارِ خداوندی پر

معاشرے کی تشکیلِ نو:

انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد معاشرے کو اقدار خداوندی کے مطابق متشکّل کرنا ہوتا تھا اور اس کے حصول کی ہر کوشش جہاد کہلاتی ہے اور یہ مقصد افہام وتفہیم سے حاصل کیا جاتا تھا۔ یہ تبدیلی زبردستی پیدا نہیں کی جاتی تھی یعنی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) دین کا معاشرہ زبردستی متشکّل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو اندرونی تغیرّ اور تبدیلی سے ممکن ہے اور تبدیلی بھی آئینی طریقوں سے۔ جس میں قرآن صرف رائے ہی ہموار نہیں کرتا بلکہ دلوں کو بدلتا ہے رائے کا بدلنا تو مستقل تبدیلی نہیں ہوتی اور نہ فلو کراسنگ ہوتی ہے ادھر کا بندہ ادھر اور ادھر کا ادھر ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ تمام کرھاً ہوتا ہے۔ بظاہر تو کہتے ہیں۔ مگر زبردستی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں جبکہ طوعاً میں دل سے تبدیلی ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) یہ قوم خود ہی نفسیاتی تغیرّ سے یہ انقلاب بپا کرتی ہے۔

تبدیلی تو ذہنیت، دل دماغ، خیالات، خواہشات اور تقاضوں کی ہونی چاہئے اور صداقت صرف خدا کے دیئے ہوئے قوانین میں ہے انسانوں کے خودساختہ قوانین میں نہیں۔ اصل انقلاب تو دلوں کا بدلنا ہے۔ جب تک دل گواہی نہ دے تو تبدیلی خارج میں نہیں آسکتی۔ اس داخلی تبدیلی کا نتیجہ خارجی تبدیلی فطری طور پر ہوتا ہے اس میں اکراہ اور زبردستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تو عرب ہو یا عجم ہو، تر لا الہ الا
لغت غریب، جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

ابلیس کا طریقہ کار:

زبردستی کے معنی صرف ڈنڈے کے زور پر ہی تبدیلی لانا نہیں بلکہ اس کے بیسیوں طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک ابلیسی طریقہ کہ میں ان کو آوازیں دیکر بھی بہکا دیا کرونگا۔ یہ ہے موجودہ دور میں ابلیس کا کارگر حربہ۔ یہ تمام ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹی وی،

انٹرنیٹ، جلوس، بینرز، یہ ہیں وہ سارے ابلیسی ہتھکنڈے جن میں آوازوں سے کام لیکر بہکا دیا جاتا ہے۔

اطاعت کا مفہوم تو ''بطیب خاطر'' ہوتا ہے:

انبیائے کرام کے انقلابات میں تو جبر واکراہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ تو دل کی رضامندی اور بطیب خاطر ہوتا ہے۔ کچے پھل کو درخت سے اتارنے کیلئے اسے جھانپڑیں مارنا پڑتی ہیں۔ جب پھل پک جائے تو ازخود نیچے آجاتا ہے۔ یہ جو پکے ہوئے پھل کا ازخود ٹہنی سے نیچے ٹوٹ کے آنا عربی میں اسے ''اطاعت'' کہتے ہیں۔ اگر پھل کو ذرا بھی باہر سے ہلانا پڑے تو اسے اطاعت نہیں بلکہ استبداد، اکراہ، جبر ہوگا۔ انقلاب آنے کے بعد مخالف قوتیں اسے ختم کرنے کیلئے تمام حربے استعمال کرتی ہیں۔ آخری حربہ یہ آجاتا ہے کہ میدان جنگ میں آنا پڑتا ہے۔ تو پھر اس انقلاب کے داعی اگر صرف وعظ ہی کرتے رہ جائیں تو اس نظام کو تو شکست ہوجائے گی۔ اس کا قیام ہی ناممکن ہوجائے گا۔ یہ ہے وہ مقام کہ دلائل وقوانین کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی نازل کی۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢٥﴾ (57:25) یہ تھا وہ ذہنی انقلاب جوان کو میدان جنگ میں لے آیا اور فتح کے بعد تمام بلندیاں پستیوں اور پستیاں بلندیوں میں تبدیل ہوگئی یہ ہے اَلسَّاعَةُ۔ دوڑ کر آنے والی گھڑی۔ یہ ذہنی انقلاب تو لمبا عرصہ تیرہ سال نبوّت کا 60 فیصد حصّہ لے لیتا ہے۔ اس میں قلبی وذہنی تبدیلی ہوتی ہے۔

اب حق پر جماعت غالب آکر مملکتیں، جائیدادیں لے لیتی ہے۔ خون بھی بہتا ہے۔ ان کو وطن بدر بھی کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہے مخالفت کا سدباب جو خارجی انقلاب سے ہوتا ہے یہ ہے اَلسَّاعَةُ وَالْقِيٰمَةُ۔

اس میں مخالفین جہنّم رسید ہوتے ہیں۔ ذلت وشکست ان کا جہنّم ہے اس کے برعکس کامیاب حق والی قوتوں کا معاشرہ جنّت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یہ ہے اس دنیا کی حقیقت اور جہنّم اور پھر اس جنّت اور جہنّم کو لیکر اگلی زندگی میں وہ قوم داخل ہوتی ہے۔

قرآن اپنی موجودہ ترتیب میں ہی قرآن ہے:

قرآن جس ترتیب میں ہمارے سامنے آیا ہے وہ یہی ہے جو قرآن کریم میں ہے۔ کسی اور ترتیب کا قرآن، قرآن ہی نہیں ہے۔ ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیں۔ ایک گہرا ربط ہے۔ جس طرح سمندر میں مختلف چٹانیں بظاہر الگ الگ مگر ان سب کی جڑیں ایک ہیں۔ جہاں آخری سورۃ ختم ہوئی اگلی سورۃ کی ابتداء وہیں سے ہوئی۔ آگے سلسلہ یوں ملتا جاتا ہے اور آیات میں اس قدر ربط ہے جیسا کہ ایک لڑی کے موتیوں میں۔ اب اگلی سورہ ملاحظہ کریں اور آیت کا ربط بھی دیکھیں!

انقلاب کا مژدہ بدر کے میدان میں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ (22:1) اے نوع انسانی! اس ہلاکت سے بچو جو تمہارے غلط نظام کی وجہ سے آنے والی ہے۔ اس کی حفاظت کا طریقہ رَبَّكُمْ ہے۔ اس ربوبیّت کو صرف اس کے عطا کردہ نظام سے مخصوص کردو اسے ان داتا۔ آقا سمجھو اور کسی اور کی محتاجی، محکومی اختیار کرو۔ اگر یہ نہیں کروگے تو اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ﴿١﴾ (22:1) تو یہ پھر اس انقلاب کے

674
ذریعہ ہوگا۔جس میں ہر شے اپنے مقام سے تیزی سے ہلادی جائے گی۔زندگی کا ہر شعبہ تبدیل ہوجائے گا۔اس تزلزل سے ہر شے اپنے مقام سے ہٹ جائیگی۔آگے ہے کہ دہشت اور سراسیمگی کی شدت ہوگی۔يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا (22:2) دودھ پلانے والی مائیں بچوں کو دودھ پلانا بھول جائینگی ان کو اس کا قطعاً احساس نہیں ہوگا اور عورتوں کے حمل ساقط ہوجائینگے۔یہ محاورے استعمال ہوئے ہیں۔خوف اور سراسیمگی تو حمل ساقط ہوجاتے ہیں۔ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں۔وَتَرَى النَّاسَ سُكَٰرَىٰ وَمَا هُم بِسُكَٰرَىٰ (22:2) اور یوں محسوس ہوگا کہ جیسے شدید نشہ میں لڑکھڑا رہے ہوں مگر انہوں نے نشہ نہیں پیا ہوگا۔یہ کیا ہوگا کیا۔وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ۝٢ (22:2) یہ سب کچھ خدا کے عذاب کی شدت کا نتیجہ ہوگا۔تاریخ ایسے مناظر سے بھری پڑی ہے۔

شکست کا ذلت آمیز انجام لانے کی بھی اجازت نہیں تھی:

بدر میں قریش کو شکست ہوئی کہا گیا کہ جو رشتہ دار اور سردار قتل ہوگئے ہیں تو ان پر نوحہ نہیں ہوگا۔اس طرح یہ باقی قومیں سمجھیں گی کہ ہمارا نقصان ہوا ہے۔اگلی تیاری تک خاموشی اختیار کرنا ہوگی۔اب یہ تو سختی کی بات تھی کہ ایک سردار نے کہیں سے رونے کی آواز سنی چھ ماہ بعد تو کہا شاید رونے پر پابندی اٹھادی گئی ہے۔تاکہ میں بھی اپنے بیٹے کی موت پر جی بھر کر روسکوں۔تو اسے بتایا گیا کہ ایک عورت کا اونٹ گم ہوگیا ہے اور وہ رو رہی ہے۔تو اس نے کچھ اشعار کہے کہ اونٹ کی گمشدگی پر تو رونے کی اجازت ہے لیکن میرے بیٹے کی موت پر رونے کی اجازت نہیں ہے۔زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ (22:1) کہ ہر شے کو اپنی جگہ سے ہلادے۔

قرآن قوم تو رہی ایک طرف، کسی ایک فرد کو بھی اجازت نہیں دیتا کہ بزور حقیقت منوالے یہ تو قرآن کے سارے مقصد کو پامال کرتا ہے۔کھجور پک کر خود گر جائے اسے چھانپڑ سے اتارنے کی کوشش تو سراسر اکراہ ہے۔یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔لڑائیاں ہوئیں۔جہاد ہوئے۔یہ سب اسلام سے بے خبری کی دلیل ہے اور حقیقت سے بعید ہے۔

مشکل ترین آیت ''اگر پیمانہ صرف عزت وشرف کا دولت ہی ہو جبکہ اقدارِ خداوندی اور قانون سب لغو ہیں'' (22:15)

توسنو! مَنۡ کَانَ یَظُنُّ اَنۡ لَّنۡ یَّنۡصُرَہُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ فَلۡیَمۡدُدۡ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآءِ ثُمَّ لۡیَقۡطَعۡ فَلۡیَنۡظُرۡ هَلۡ یُذۡهِبَنَّ کَیۡدُہٗ مَا یَغِیۡظُ ﴿۱۵﴾ (22:15) اگر یہ چیز ذہن میں ہے کہ یہ اقدار، پیمانے، قاعدے اور قانون سب لغو ہیں۔

''اگر کوئی اس زعم باطل میں مبتلا ہے کہ اعمال کی نتیجہ خیزی میں کسی خارجی قانون کو کوئی دخل نہیں کہ حال اور مستقبل کی خوشگواریاں، اس کی نصرت یعنی اس کے قانون سے نہیں حاصل ہوتی ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ یعنی ایسا کہنا غلط ہے کہ انسان کا عرّ وج و زوال اس کے قوانین سے ہوتا ہے۔ پھر تمام ذرائع کو کام میں لاکر خارجی قوانین سے اپنا رشتہ منقطع کرے پھر دیکھ لے کر اس کی تدبیر سے یہ حقائق یُذۡهِبَنَّ (22:15) واقعی کالعدم ہوجاتے ہیں جس کے تصوّر سے اس کا خون کھولتا ہے۔ یعنی ان خارجی قوانین سے ماوراء اس کی تدابیر کامیاب ہوسکتی ہے۔''

قوانین خداوندی کو اگر مانو تو وہ اثر انگیز ہوں یا نہ مانو تو تمہارے معاملات سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ یہ صورت حال نہیں ہے۔ انسانی معاملات ان قوانین کے بحرحال تابع رہیں گے چاہے کوئی ان کو مانے یا نہ مانے۔ انسان ان سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرسکتا۔ ان سے بھاگ کر نہیں جاسکتا نہ ادھر اور نہ آخرت میں۔

اس آیت کو مشکل آیات میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہم عربی کے الفاظ کو اُردو میں لے آئے ہیں۔ تو پھر ان کی رو سے مفہوم فٹ نہیں بیٹھتا۔ تو مشکل ہوجاتی ہے۔ اگر عربی محاورہ میں بات ہو تو بات آسان ہوجاتی ہے یہ تو ترجمہ کرتے ہیں'' کہ جسے خیال ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا۔ تو اسے چاہئے کہ آسمان پر جاکر قطع کردے پھر دیکھے کہ اس کی یہ تدبیر اس چیز کو رد کردیتی ہے جو اسے ناگوار ہے۔ یہ ہے وہ غلط ترجمہ جس سے بات ہی سمجھ میں نہیں آتی یہ چیزیں قرآن سے برگشتہ کرتی ہیں۔

''کیا یہ ہے کہ جس طرح سے بھی کماؤ کھاؤ، شرف انسانیّت کو بھلا دو بس کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ یہ قاعدہ، قانون سب واہمہ ہیں، اس طرح سے معاشرہ غلط کاریوں میں بڑھتا جاتا ہے۔ اب طبعی قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ تو فوراً آگ میں انگلی ڈالنے سے جل جاتی ہے، پتہ چل جاتا ہے لیکن کہو کہ حرام مال کھانے سے بھی ہلاکت ہوتی ہے۔ مگر محسوس نہیں ہوتا کیونکہ اس کا اندازہ حیوانی

پیمانوں سے کرتے ہیں۔ انسانی اقدار سے اسے جانچتے ہی نہیں اس لئے مغالطے میں رہتے ہیں کہ حرام کھانے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ ہے مغالطہ آفریں۔

طبعی قوانین میں تو اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیل کا اپنے کھیت ہی چرے یا پرائے میں چرے، یہ چارہ تو صحت کے لحاظ سے ایک ہی اثر کرے گا۔ یہ اقدار تو ذات انسانی پر اثر کرتے ہیں۔ اب غلط معاشرہ میں بد یانت دن بدن ترقی کرتا ہے اور دیانتدار کی زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ اصل مشکل یہ ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے کہ غلط نظام، معاشرہ آخر لامرتباہ کن ہوتا ہے۔ یہ صرف تاریخ سے پتہ چلتا ہے جبکہ یہ تاریخی دور تو بڑا لمبا ہوتا ہے اس کے نتائج صدیوں میں جا کر برآمد ہوتے ہیں۔ وہ خدا کا ایک دن ہزار ہزار انسانی سالوں کے برابر ہوتا ہے قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ ترقی کرتے کرتے بلندیوں پر پہنچ جائے اور وہ ان اقدار سے الگ ہو کر دیکھ لے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے اس کا جواب تاریخ میں مل جائے گا۔

اس کا حل:

انسانوں کی ایک جماعت اگر کھڑی ہو جائے۔ اقدار کے ساتھ انسانی مدد کا ثمر۔

اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ ؕ (35:10) پھل دینے والے بیج کے ساتھ کوشش قانون کے مطابق ہو کوشش صحیح، اعمال صالح تو پھر وہ صعود تبدیل ہو جاتا ہے رَفَعَ میں۔ یعنی ہزار ہزار سال کا دورانیہ دنوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ (48:29) نے کس طرح اس صعود کو رَفَعَ (79:29) میں تبدیل کر دیا۔ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ ہے پلک جھپکنے میں انقلاب۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر اپنی ہی رفتار سے چلتا رہتا ہے ہزار ہزار سال میں جا کر کہیں ایک دن پورا ہوتا ہے۔

قانونِ ارتقاء اور جہنّم

سزا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زندگی تو ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور یہ خدا کا مقرر کردہ ارتقائی قانون کارفرما ہے۔ جو نوع صلاحیت پیدا کر کے زندہ رہے اور آگے بڑھے تو یہ جنّت ہے اور جو صلاحیت یافتہ نہ ہو تو وہیں ختم ہو جاتی ہے اور رک جاتی ہے اور اسی حالت میں رہتی ہے۔ یہ ہے ارتقاء جو قرآن بیان کر رہا ہے اور تمام تحقیقات اسی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتی ہیں۔

بنیادی فرق:

سائنسدان یہاں تک تو متفق ہیں مگر اس مقام سے آگے دونوں کے راستے مختلف ہو جاتے ہیں۔ سائنسدان صرف اس طبعی زندگی تک ارتقاء کے قائل ہیں۔ اس کے بعد تو وہ زندگی کو ہی ختم کر دیتے ہیں۔ تو ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ قرآن کا سارا پروگرام ارتقاء کو آگے لے جانے کا ہے۔ جو لوگ اپنی ذات کی اتنی نشوونما کر لیں اور بلند زندگی کی منزل طے کرنے کے قابل ہوں تو وہ ترقی پا کر اگلی منزل میں داخل ہو جاتے ہیں اور جو ان صلاحیتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ آگے بڑھ نہیں سکتے۔ وہ روک دیئے جاتے ہیں۔ ''جحیم'' جہنّم کیلئے آیا ہے۔

رک جانے والی یا اسے روک دینے والی چیز۔ زندگی تو جوئے رواں ہے جسے رواں دواں آگے بڑھتے چلے جانا چاہئے۔ جونہی روانی بند ہوئی تو جوہڑ بن گئی اور سڑاند پیدا ہو گئی۔ یہ جہنّم ہے۔ انسانی کی قربان گاہ۔ جنّتی معاشرہ میں انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے اور جس معاشرے میں انسانیّت ذبح ہو جائے۔ راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ جہنّمی معاشرہ ہے اس کیلئے جحیم ہے یعنی وہ مقام جہاں انسانیّت کی نشوونما رک جائے۔

ایک مقام پر رک جانے کی وجہ سے ختم نہ ہونے والا احساس:

یہ باقیوں کے مقابلہ میں جو رک جانے کا احساس ہے اسے قرآن ''غم'' کہتا ہے۔ یعنی ایسا حزن و کرب جو چھا جائے اور اس سے نکلا نہ جا سکے۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾ (22:22) وہ احساس ہے کہ آخری چانس تھا جس میں فیل ہو گئے۔ تو یہ نہ ختم ہونے والا احساس التباس میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ ہے اصل حزن و کرب جو چار سو چھایا ہوتا ہے اور روکنا ناممکن ہوتا ہے۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿۷﴾ (104:6-7) یہ تو خارج کی آگ نہیں بلکہ ان کے دل سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کے اعمال کا ثمر۔

حجّ کا مقصد

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَالۡبَادِ ؕ وَمَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۵﴾ (22:25) یہ حسن وخوشگوار نظام جس کا مرکز یہ کعبہ ہے واجب الاحترام ہے اور تمام انسانوں کیلئے اطاعت خداوندی کا سرچشمہ ہے یہ یہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کیلئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ یعنی اس کے دروازے ہر ستائے ہوئے انسان کیلئے کھلے ہیں۔ سب اس نظام کی منفعت بخشیوں میں برابر کے شریک ہیں۔ مگر یہ لوگ جو اس نظام کی صداقت سے انکار کر کے سرکشی برتتے ہیں اور لوگوں کو اس پر شامل ہونے سے روکتے ہیں تو جو بھی ظلم وزیادتی کے ساتھ حق کے راستے سے ہٹ کر یہ مجرمانہ حرکت کرے گا تو اسے الم ناک سزا دی جائے گی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ انسانیّت کو ان کے جبر وستم سے بچایا جائے اور ان کی روک تھام کی جائے۔

مملکت کا دار الخلافہ اس قوم کا نظریاتی سمبل ہوتا ہے:

اسلام نے آ کر تصوّر دیا کہ مملکت میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور اب ہر مملکت کا ایک مرکزی مقام ہوگا۔ جیسے ماسکو جو کمیونزم کا سرچشمہ تھا یا واشنگٹن سرمایہ داروں کا مرکز مقام۔ تو مکہ سے مراد وہ چند اینٹوں کا کوٹھا نہیں تھا۔ قرآن نے ان کو شعائر اللہ یعنی نظام خداوندی کے علامات۔ سمبلز۔ جس طرح جھنڈا، وہ ایک ڈنڈے پر کپڑا مگر اس کا احترام دراصل اس مملکت کا احترام ہوتا ہے۔ تو اب کعبہ اس مملکت کا مرکز محسوس تھا۔ پہلے دن سے یہ اس مقصد کیلئے بنایا گیا تھا تو دین کے تمام شعائر بت پرستی میں تبدیل کر دیئے گئے۔ فتح مکہ اس لئے نہیں تھا کہ اس کی رسول ﷺ کو اور مملکت کو بڑی ضرورت تھی تا کہ ایک شہر ہاتھ میں آ جائے۔ یہ تو حکومت خداوندی کا مرکز تھا۔ اسے خدا نے اپنا گھر اس لئے کہا تھا۔ اب اگر مجاوروں سے درگاہیں چھین لی جائیں تو پھر ان کا مقام چھن جاتا ہے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

یہ تھی وہ کشمکش کہ وہ اس نظام کی اس قدر مخالفت پر اتر آئے تھے۔

حجّ اور عمرہ میں مملکت کے نمائندوں نے مختلف امور پر گفت وشنید، مشاورت کیلئے سال میں ایک مرتبہ جمع ہونا تھا اور پھر یہ چھوٹی چھوٹی کانفرنسیں جو عمرہ کہلاتی ہیں۔ مقام تو وہی رہا مگر اس کی ساری حیثیت بدل ڈالی ہے۔ قریش یہ نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے وہ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ (22:25)۔ وہ اس نظام کے راستے میں روک بن کر لوگوں کو کعبہ کی طرف یعنی اس نظام کی

طرف آنے سے روک رہے تھے۔ یہ نہیں کہ اس کوٹھے کی طرف نہیں آنے دیتے تھے کیونکہ یہ تو اب ایک open شہر ہو گیا ہے۔ پوری نوع انسانی کیلئے لِلنَّاسِ سَوَآءٌ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ط (22:25)۔ سب کیلئے باہر کے ہوں یا اندر رہنے والے، سارے اس نظام کی نفع بخشیوں سے متمتّع ہونگے۔ جو اس میں ٹیڑھ پیدا کرے گا تو پھر اسے سزا ملے گی۔

کعبہ کی تعمیر کا مقصد:

بظاہر پتھروں کی اس چار دیواری کے اس کوٹھے کی حقیقت کو قرآن نے یوں واضح کیا۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَيْـًٔا (22:26) اس گھر کی تاسیس جب ابراہیم کے ہاتھوں سے ہوئی تاکہ انسانوں کیلئے محکومیت صرف خدا کی رہ جائے اور اس میں وہ کسی اور کو شریک نہ کریں۔ یعنی قوانین خداوندی میں کسی اور کے قوانین کی اطاعت نہ کی جائے۔ اس لئے تو اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہ مکان اس مقصد کیلئے بنایا جا رہا تھا۔ محض مکان تو یہ مقصد پورا نہیں کر سکتا۔ وہ مقام تو کسی نظام کا محسوس مرکز بنتا تھا اور وہ یہ کہ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَيْـًٔا (22:26) محکومیت صرف اس کی جس میں کوئی اور شریک نہ ہو۔ پھر کہا۔ وَّطَهِّرْ بَيْتِیَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ (22:26) اس مرکز کو تمام خود ساختہ نظریات و اختلافات سے پاک کر کے اس جماعت کی تربیّت کیلئے مخصوص کر دو جس کا ذریعہ یہ ہو گا کہ وہ اقوام عالم کی نگرانی و پاسبانی کرے اور عدل و انصاف کا نظام قائم کر کے ان قوانین کیلئے سامنے سر خم تسلیم کر کے ان کی پوری پوری اطاعت کرے۔ اس میرے گھر میں کسی قسم کا شرک کی آلودگی نہ آنے پائے یہ نہ ہو کہ اسے پرسنل اور پبلک لاز میں تبدیل کر دو۔ اسے پاکیزہ رکھو لِلطَّآئِفِيْنَ (22:26) اور الْقَآئِمِيْنَ (22:26) کیلئے بھی۔

ہماری غلط نگہی اور کعبہ کے مرکز محسوس نظام کی خصوصیّت:

کعبہ کو اتنے اہتمام سے بنوا کر اس اسماعیل کی یہ عظیم قربانی کو ذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾ (37:107) کہنا۔ اسے ''بَيْتِی'' کہہ کر اور پھر ان قریش کی اتنی کشمکش یہ سارا صرف اتنے سے طواف، رکوع اور سجود کیلئے تھا۔ تو یہ گھر تو مدینہ میں بھی بن سکتا تھا۔ وہاں بھی تو مسجد بنی ہوئی تھی۔ کیا ان مسجدوں میں قیام و رکوع و سجود نہیں ہوتے تھے۔ یہ تھے، شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (8:110) یعنی نگرانی ایسی کہ ساری دنیا امن و سکون میں رہے یہ تھا قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97) تاکہ نوع انسانی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر محتاجیوں سے چھٹکارا حاصل کرے۔ یہ تھا فریضہ ان لِلطَّآئِفِيْنَ (22:29) اور الْقَآئِمِيْنَ (22:29) کا۔

قائمین اور طائفین کی خصوصیات اور تدریجی مراحل:

یہ اس جماعت کی پہلی خصوصیّت راکعین اور ساجدین ہونے چاہئیں۔ قرآن نے دونوں کو الگ الگ بیان کیا ہے حالانکہ دونوں کا مطلب رکوع و سجود بنیادی معنی جھک جانا۔ رکوع میں تو آدھا جھکاؤ ہوتا ہے سجدہ کی شکل نہیں ہوتی اس کا مکمل جھکاؤ تو سجدے

میں جا کے ہوتا ہے۔

یہ محکومیت کا دورِ عبوری دور ہے۔ اس نظام کے قیام کا دور ابھی شروع نہیں ہوا۔ جس میں نظام کی شکل میں قوانین خداوندی کی کامل اطاعت کی جائے۔ اس عبوری دور میں جہاں تک حالات اجازت دیں گے تو قوانین خداوندی کی اطاعت ہوگی۔ پھر تا آنکہ کامل اطاعت کیلئے حالات سازگار ہو جائیں۔ یہ عبوری دور کی اطاعت کو رکوع کہا گیا ہے اور آخری دور جب نظام نافذ ہو جائے تو مکمل اطاعت ہوگی۔ (سجدہ) یہ مدنی زندگی میں آ کر جو ہوئی حالات رکوع تھی۔ جب کعبہ تحویل میں آیا تو یہ سجدے کی حالت ہوگئی۔

اس مرکز کا مقصد اور مدّعا:

ایسا گھر جو انسانی تصوّرات وقوانین سے پاکیزہ ہو۔ اسے خدا کی حکومت کا مرکز بناؤ۔ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97) تا کہ کوئی فرد کسی کا محتاج نہ رہے۔ وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) جو بھی اس نظام میں داخل ہو یا تو اسے کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا۔ یہ الناس کیلئے ہے عالمگیر انسانیت کیلئے۔ وَ اَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ (22:27) سب انسانیت میں اعلان کر دو کہ وہ اپنے معاملات یہاں آ کر شمشیر کی بجائے دلیل وحجّت کی رو سے کرائیں۔ آگے کہا۔ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ ۙ‏ ﴿۲۷﴾ (22:27) اگر ان کو یہ اطمینان دلایا تو دیکھو گے کہ لوگ جوق در جوق پیدل اور ایسی سواریاں جو تھک کر چور چور ہو جائیں، مریل سی سواری بھی ہو تو دنیا کے دور دراز گوشوں سے آئیں گے۔ یہ اعلان کر کے تو ذرا دیکھو۔ کاہے کیلئے؟ لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ (22:28) تا کہ آنکھوں سے دیکھ لیں کہ تم ان کیلئے کس قدر منفعت بخش پروگرام ترکیب دے رہے ہو۔ یہ ہے لوگوں کی بھلائی کیلئے مسلم ورلڈ کانفرنس۔

یہ تو صرف convener یعنی اجتماع کو منعقد کرانے والے، انتظام کرنے والے ہوں گے، اس احتجاج کا جو عظیم اجتماع ہے اور کیفیّت یہ ہے کہ ذرائع مواصلات تک نہیں تو اتنے انسانوں کے کھانے کا کیا کرنا چاہئے۔ دوسرے مقام پر کعبہ کی تعمیر کے بعد دونوں باپ بیٹا پہلی دعا ان اسباب وذرائع کی مانگ رہے ہیں۔ قرآن تو اس دنیا میں رہنا سکھاتا ہے۔

یہ جوگیوں اور سنیاسیوں کا مذہب نہیں۔ کھانے کی اہمیّت کعبہ کی تعمیر کے فوراً بعد پہلی دعا یہ ہے مگر صرف اسے ہی مقصد و بالذات بنالینا تو حیوانوں کا شیوہ ہے۔ تو اگر انسان بھی یہ کرے تو اُولٰۤئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ (7:179) ساتھ دعا میں یہ بھی ہے۔ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ (14:37) تا کہ ان کی کوششیں جو اس مقصد کیلئے ہیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ تو پھر کیا کیا جائے؟

روٹی کا مسئلہ مویشیوں کے ذریعہ حل کرو:

لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ وَيَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ فِىۡۤ اَيَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِيۡمَةِ الۡاَنۡعَامِۚ فَكُلُوۡا مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِيۡرَ ﴿۲۸﴾ (22:28) تو ان مویشیوں پر اللہ کا نام لے کر خود بھی کھائیں اور جو تکلیف میں بھوکے محتاج ہوں

ان کو بھی کھلائیں۔ روٹی کا مسئلہ ان سواری والے جانوروں کے ذریعہ حل کر دیا۔ یہ جو سامان لادتے ہو سواری کرتے ہو یہاں لانے کے بعد یہ ذبح کر دو۔ اس طرح ان عاکف و باد کو بھی ساتھ کر لو۔ ضیافتیں کرو پکاؤ اور کھاؤ پیو۔

جانور کو ذبح کرتے اللہ اکبر کہنا:

سَخَّرَهَا لَكُمْ (22:37) جانور تمہارے قبضہ میں آ گیا۔ مسخر کر لیا۔ اس کے اوپر چڑھ بیٹھے ہو چھری لیکر ذبح کر رہے ہو۔ وہ بے بس و محتاج اور تم غالب و مسلط۔ اس وقت ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ لو۔ تو اس وقت کہو کہ نہیں ہم بڑے نہیں بلکہ سب سے بڑی ہستی تو خدا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس طرح سے جانور حلال ہو جاتا ہے اور یہ نہ کہو تو حرام۔ ان دونوں لفظوں میں کیا رکھا تھا۔ تو اس نازک مقام پر تم اوپر اور وہ نیچے تو قطعاً خیال نہ آ جائے کیونکہ لِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ط(22:37) تا کہ تم خدا کے ان قوانین کو جس سے اس نے تمہاری رہنمائی کی ہے دنیا کے تمام قوانین پر غالب کر دو۔

جانوروں کیلئے کہیں بھی قربانی کا لفظ قرآن میں نہیں آیا:

اب ہر شخص دو دو جانور لیکر آ گیا۔ ذبح کیا اور اس کا نام قربانی رکھ لیا۔ یہ تو کھانے پینے کیلئے کہا تھا اور مقصد تو مشاورت کے ذریعہ مسائل کا حل نکالنا تھا۔ کہا ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَ لْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾(22:29) کھائیں پئیں اور کثافتوں کو دور کرنے کی تجاویز پر غور کریں اور ان ذمہ داریوں کو پورا کریں جو نوع انسانی کی فلاح و بہبود و نگرانی کیلئے اپنے ذمہ لے رکھی ہیں تا کہ پوری امت اس مرکز کی نگہبان ہو جائے۔ جو انسانوں کی حریت و آزادی، قوت و اقتدار خداوندی کا نشان ہے اور جسے اس باب میں سبقت اور شرف اوّلیت حاصل ہے۔ اسلامی نظام کے بعد باہمی مشاورت کیلئے عالمگیر کانفرنس کا نام حجّ ہے۔ وہاں دلیل و حجّت کی رو سے متنازع فیہ معاملات طے کئے جائیں اور ساری اقوام عالم کو دعوت دی جائے کہ آ کر آنکھوں سے دیکھ لیں کہ نوع انسانی کی منفعت کیلئے یہ نظام کیا گیا۔ پروگرام دے رہا ہے ؎

مکہ نے دیا خاک جینوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

دین تو قدم قدم پر نتائج دیتا ہے:

اہل مکہ تو اتنے بڑے اجتماع کی میزبانی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس بے آب و گیاہ زمین پر تو کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ تو یہ آنے والے کھانے پینے کا سامان جو ان کے چلتے پھرتے ریفریجیٹر تھے ان کی شکل میں ساتھ لائیں۔ یہ تھا جس کو قربانی کے جانور بنا دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے تو قربانی کا لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا۔ جانور ساتھ لائیں۔ ان سے سواری بار برداری کا کام بھی لیں اور ان کو ذبح کر کے خود بھی کھائیں اور باقی لوگوں کی بھی ضیافتیں کریں اب یہ جو چند مناسک یا رسومات بھی ہیں اور وہ پھسلتی گھاٹی ہے

جہاں سے اقوام لغزش کھا جاتی ہیں۔ دین تو ایک ساری اقوام کی طرف آیا صرف حالات کے تحت ان کی شرائع میں فرق آجاتا تھا۔ پھر ان پیغمبروں کے جانے کے بعد اصل غرض و غایت اور روح تو ختم ہو جاتی تھی اور یہ بے جان و بے روح رسومات باقی رہ جاتی تھیں۔ اندازہ ان کا نتائج سے لگانا پڑتا ہے۔ یہ تدّ بر و سوچ تو ذہنی حرکت ہے۔ جس کے بغیر زندگی جوہڑ بدبودار بن کر رہ جاتی ہے۔ دین تو ارتقاء کا نام ہے جبکہ مذہب سراسر جمود تو ایسی اقوام پیچھے رہ جاتی ہیں۔ دین کے عناصر مذہب میں آکر رسومات بن جاتے ہیں اور اطمینان اور فریب نفس کیلئے ثواب کا لفظ گھڑ لیا گیا ہے اور اسے یا تر ابنا دیا گیا۔ جہاں کا اجتماع ان رسومات کی ادائیگی کا نام ہے۔

جسمانی حرکات وسکنات کا انسانی نفسیات سے گہرا تعلق ہے:

کہیں کوئی اجتماع ہو یا غور و غوض ہو، اس میں بعض چیزیں محسوسات کے طور پر کرنی پڑتی ہیں۔ اس میں اطمینان ہی نہیں بلکہ اندر کا تقاضا بھی ہوتا ہے ایک مقرر زبان سے جو کہتا ہے تو اس کے جسم کی حرکات وسکنات کیسے اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ اگر اسے روک دیا جائے کہ کسی قسم کی کوئی جنبش، حرکت سرزد نہ کرے۔ تو وہ پانچ منٹ تک بھی تقریر جاری نہیں رکھ سکے گا۔ اگر کرے تو وہ غیر موثر ہو کے رہ جائے جسم کا یا دل کا تقاضا جو بھی ہو تو اس کی نمود کا اظہار جسم کی کسی حرکت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ایک گہری نفسیاتی حقیقت ہے۔ نفسیات یا فلسفہ میں اسے متوازیت (Paralallism) کہتے ہیں۔ دل کا تقاضا اور جسم کی حرکت متوازی چلتی ہے۔ کسی کی تعظیم کیلئے بے اختیار ہاتھ ماتھے کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ غصے میں چہرے کے اعصاب کچھ اور، اور خوشی میں کچھ اور ہوتے ہیں یہ عجیب کیفیّت ہے، انسان کے دل کی آرزو، تقاضا کی نمود جسم کی کسی نہ کسی حرکت سے ہوتی ہے۔ دین میں اس کی بھی رعایت رکھی جاتی ہے۔ اس مقصد کیلئے طواف راتوں کو پہرہ دینے والوں کا فریضہ جو شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ یہ ایک بڑے پیمانے پر نگرانی اور پاسبانی کرنے کی ایک ذمہ داری تھی۔ تو اس کیلئے ''گھومنا'' ہے۔ طائف یہ کعبہ میں محسوسات کے طور پر ہے۔ جو مناسک یا رسم کہلاتی ہے جس طرح صلاۃ میں قیام ورکوع وسجود ہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ بلکہ جو خدا کے سامنے جھکنے کی آرزو دل میں اٹھتی ہے تو جھکنے کے ساتھ سر اور جسم جھک جاتا ہے۔ یہ تمام محسوس حرکات، انسان کی خواہشات، غیر محسوس آرزوؤں کی نمود کا ذریعہ بنتی ہیں۔ آج وہ آرزوئیں تو نہ رہیں۔ وہ محسوس علامات باقی رہ گئیں تو پھر یہ مذہب بن جاتا ہے۔ پھر یہ صرف رسم ہی بن کے رہ جاتی ہے۔ ان کی ادائیگی کیلئے وقت، پیسہ، توانائی تو صرف ہوتی ہے۔ مگر أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ (18:105)

شعائر اور حُرمات ایک بلند مقصد کا ذریعہ ہیں:

ان کو کہیں حُرُمٰتِ اللّٰهِ کہا اور کہیں شَعَآئِرَ اللّٰهِ کہا۔ یعنی اللہ کے مقصد کی محسوس علامات، یہ علامات، نشانی، سمبل کا لفظ ہے۔ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اگر سلطنت نہ رہے تو جھنڈا محض ڈنڈا اور کپڑا رہ جاتا ہے۔ زندہ سلطنت کے جھنڈے کی کیفیّت کچھ اور ہوتی ہے۔ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ (22:30) جو بھی ان مقرر کردہ پابندیوں کا احترام کرے گا تو یہ

674
چیزاس کیلئے نفع بخش ہوگی۔ یہ دابۃ واجب التحریم نہیں ہیں یہ تو خدا کے مقصد کی مقرر کردہ نشانیاں ہیں۔ جو درحقیقت اس مقصد کی تعظیم کرتا ہے۔اس طرح اونٹ پہلے دیوتا کی خوشنودگی کیلئے آستانوں پر ذبح ہوتا تھا۔ بار بار دہرایا کہ اسے مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔

وَ اُحِلَّتۡ لَکُمُ الۡاَنۡعَامُ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ وَ اجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ ﴿۳۰﴾ (22:30) ہر اس شے سے بچو جو زندگی کو ساکن کر دے اس سے ذہنی جمو د وتعطل طاری ہوجائے گی۔ کثافتیں پیدا ہو جائینگی۔ ہر وہ شے جو ایک مقام پر جمی رہے۔ کھڑی رہے حرکت ساکن ہو۔ اسے وثن کہتے ہیں۔ دین کا ہر متحرک عنصر وثن میں آ کے ساکن ہوجاتا ہے۔ یعنی ان کو رسم نہ بنالینا کہ زندہ جاوید نظام کی بجائے مذہب کی رسم بن کر ساکن اور جامد ہوجائے۔ تو اس کثافت اور گدلاپن پیدا ہوجائے گا۔ اس سے بچو۔ اور ہر اس نظریہ سے بچو جو تم کو حق سے برگشتہ کر کے غلط راستے پر لے جائے۔ زور سے مراد کسی جگہ ٹکرا کر دوسری طرف نکل جانا زندگی میں حرکت ضروری ہے۔ حُنَفَآءَ لِلّٰہِ (22:31) تمام توجہات کا مرکز ناک کی سیدھ میں صرف قوانین الٰہی کی طرف موڑ دو للہ۔ اس متعینہ نصب العین کی طرف جو خدا نے مقرر کر دیا۔ غَیۡرَ مُشۡرِکِیۡنَ بِہٖ ؕ (22:31) کوئی اور قوانین کی ملاوٹ نہ کر دینا۔ کسی اور کی محکومی نہ کرنا۔ آ گے کہا۔ وَمَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُہُ الطَّیۡرُ اَوۡ تَہۡوِیۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَکَانٍ سَحِیۡقٍ ﴿۳۱﴾ (22:31) ذٰلِکَ ٭ (22:32) اس طرح سے ہوتا ہے جو۔ وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ ﴿۳۲﴾ (22:32) جو ان نشانات کی تعظیم کرے گا تو یہ اس امر کا اظہار ہے کہ اس کے دل میں قوانین خداوندی کی نگہداشت کا احترام موجود ہے یہ جو دل کے اندر ان کی نگہداشت کا احساس ہے۔ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ ﴿۳۲﴾ (22:32) یہ تو صرف ان کے اظہار کا ایک محسوس ذریعہ ہے کہیں ان کو مقصود بالذات نہ بنا دینا۔ یہ تو تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ ﴿۳۲﴾ (22:32) ہے۔ تمہارے دلوں کے اندر قوانین کے احترام نے ان شعائر کو بھی وادب الاحترام سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ بجائے خویش کسی احترام کے مستحق نہیں ہیں۔

حفاظت کے سلسلہ میں قرآن کا فرمان اس اجتماع کی ایک غرض وغایت:

اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ (22:38) خدا تمہاری حفاظت کرے گا ان مخالفین سے مگر، آگے ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوۡرٍ ﴿۳۸﴾ (22:38) جو لوگ فلاح انسانیت کے امین نہیں جن پر کسی صورت اعتماد نہیں کیا جا سکتا جو نظام کی صداقت سے اتنی شدت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ بھلا کیسے خدا کی نظروں میں پسندیدہ کہلائے جاسکتے ہیں۔

ہمارا مروّجہ حجّ اور اس کا نتیجہ:

کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوۡرٍ ﴿۳۸﴾ (22:38) جن پر کسی صورت اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور وہ اس نظام سے شدومد سے انکار کرتے ہیں۔ وہ تمہاری خوشگواریاں برداشت ہی نہیں کر سکتے اور چاہتے ہیں کہ تمہیں پھر سے ذلیل وخوار کر دیا جائے تو خدا ان سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ تو اس مروّجہ حجّ کے تمام مناسک صحیح صحیح ادا کرنے کے باوجود کیوں ہماری حفاظت نہیں ہو رہی ہے۔ ہم غیر محفوظ ہیں اور

دنیا ہماری تخریب کے درپے ہے یہ تو خدا کی طرف سے گارنٹی تھی۔ پھر منشائے خداوندی کے مطابق نتیجہ کیوں برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ بس اس سے ثواب ہوگا اور قیامت میں جا کر نجات۔ یہ ہے وہ جھوٹا اطمینان جو دلایا جاتا ہے۔ اگلی دنیا میں تو مداخلت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ مذہب سوچتا ہی نہیں۔ یہ مداخلت کیسے ہوگی؟

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ (22:39) چونکہ ان پر مخالفین نے ظلم ڈھائے ہیں اور وہ میدان جنگ تک آ گئے ہیں۔ اس لئے اب ان کو جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۟ۙ (22:39) دیکھنا حؔج میں کیا کرنا تھا۔ ان کو جنگ کی حکمت عملی سوچنی تھی۔ مدافعت کا طریقہ میدان جنگ بتا دیا ہے۔ کہتے ہیں قرآن میں ربط نہیں بڑی بے باکی سے۔ جنگ کی اجازت مگر شرط یہ ہے کہ ان پر ظلم وستم کیا گیا ہے۔ لگتا ہے یہ پہلی بار کی بات ہے۔ جنگ کی اجازت مظلوم ہونے کی شرط سے مشروط ہے۔ وجہ۔ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ (22:39) اب کہا کہ خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ مگر۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ (22:40) مدد ان کی جو خدا کی مدد کرے گا۔ کیسے مدد کرتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (47:7) وہ کیا کرے گا۔ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ (47:7) تمہارے قدموں میں لغزش نہیں ہوگی۔ میدان جنگ میں سپاہ کے پاؤں جمتے ہیں کامیابی اس سے ہوتی ہے سوال ہی نہیں ہے کہ اس کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ سامان وذرائع کی تو الگ تاکید ہے کہ سرحدوں پر اتنا ساز وسامان رکھو کہ دشمن اسے دیکھ کر ڈر جائیں۔ لیکن اصل کام تو Man Bchind the gun ہوتا ہے۔ بات تو ساری اس کی ہے۔ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ (22:40) مظلوم کی نصرت خدا پر لازم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کو ناحق گھروں سے نکالا گیا۔

قوّت کا سرچشمہ صرف قوانینِ خداوندی ہیں،
قرآن کا سوشل کنٹرکٹ

اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۷۴﴾(22:74)اللہ بڑی قوّتوں کا مالک اور ہرایک پر غالب ہے۔مغربی جمہوریت کا نعرہ کہ قوّت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ملوکیّت میں قوّت کا سرچشمہ ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔اسے حاکم، بادشاہ یا شہنشاہ کہئے۔ڈکٹیٹر یا حکمران۔اس کا حکم قانون ہوتا تھا۔ساری قوّت کا مرکز یہ تھا۔

انقلاب فرانس کا جذبہ محرّکہ:

اس قوّت کے سرچشمہ کے خلاف بغاوت عام طور پر انقلاب فرانس کے نام سے ہوئی۔دراصل امریکہ میں برطانیہ کے نو آبادیاتی نظام کے خلاف بغاوت ہوئی۔یہ نظریہ میثاق پہلے یونانیوں نے متعارف کرایا تھا۔امریکہ میں یہ انقلاب 1775ء میں رونما ہوا اور 1783ء میں کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

نظریۂ میثاق:

اس میں افراد باہمی رضامندی سے ایک اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں۔جس میں مملکت اور افراد کے فرائض وواجبات طے کئے گئے۔یہ قدیم نظریہ یونان سے اٹھارویں صدی میں یورپ کے (1679ء) ہابز، (1632ء)Locke روسو (1717-1778) نے فروغ دیا موجودہ ڈیماکریسی کی یہی بنیاد ہے۔مملکت اور افراد میں یہ میثاق ہوتا ہے جس میں افراد اپنے ذمہ کچھ فرائض لیتے ہیں اور مملکت بدلے میں افراد کے حقوق ادا کرتی ہے۔مملکت اور افراد الگ الگ نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک اجتماعی ادارہ ہوتا ہے اب اقدار کو عوام کے حوالے کرنا ہے قوّت واقتدار عوام کے پاس ہونا چاہئے۔یہیں سے یہ سلوگن اٹھا۔

اب جس کو اکثریت ہو تو اقتدار اس کے حوالے کردو یہ اختیارات 51 فیصد کے دیئے ہوئے ہیں یعنی قوّت کا سرچشمہ عوام ہیں۔اب اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ نہ تو قوّت عوام کے پاس ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس یعنی ارباب اقتدار کے پاس۔اسے یہ گورنمنٹ By law (قانون کے ذریعہ حکومت) کہتے ہیں۔اس میں ہر قدم پر آئین آتا ہے تو قوّت تو قانون کی ہوگئی اگر کسی

جرم کی سزا قانون میں نہ ہوتو مجرم صاف بچ جائے گا۔ برسر اقتدار طبقہ جو بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ سارے ذرائع ہونے کے باوجود وہ قانون کی عدم موجودگی اس مجرم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ یہاں یہ قانونی حکومت بے بس ہوکر رہ جاتی ہے۔ اب اس کیلئے قانون بنایا جائے پھر اس کا مواخذہ ہوگا۔ اب یہ قوّت کا سرچشمہ نہ یہ 51 فیصد بلکہ 100 فیصد عوام تھی اور نہ یہ اقتدار والا طبقہ بلکہ قوّت کا سرچشمہ تو قانون ہے اور عدالت قانون کے ذریعہ ہی مجرم کو سزا دے سکتی ہے۔ سارے عوام مل کر بھی اس مجرم کو نہیں چھڑا سکتے۔ کیونکہ قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اب وہی حکومت ہے جو قانون کی عدم موجودگی میں مجرم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ اب قانون آ گیا تو اس کی رو سے عدالت نے اسے سزا دیدی اب پوری عوام بھی چاہے تو اسے چھڑا نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ قانون کی قوّت ہے۔ اب قوّت اگر عوام کے ہاتھ میں آ جائے تو اس انارکی کو کوئی بھی پسند نہیں کرے گا۔ سارے رد کر دیں گے پھر اس کا نتیجہ فسادات، قتل وغارت، سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے تو اس جمہوریت میں حکومت قانون کی ہوتی ہے اب قانون تو یہ خود بناتے ہیں مگر بنانے والوں کے ہاتھ میں بھی قوّت نہیں ہوتی بلکہ قوّت قانون کی ہوتی ہے۔ یہ ہے Rule of the Law۔ آج کی زبان میں۔

خدا کیسے قوّت کا سرچشمہ ہے اور اسے کیا حق حاصل ہے قوانین بنانے کا:

کہتے ہیں قوّت کا سرچشمہ خدا ہے تو اس کی قوّت کا مظاہرہ کہاں ہو رہا ہے۔ اب یہ چرچ نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کیلئے کہا اقتدار بادشاہ کی بجائے خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن اس نے یہ اقتدار ہمیں تفویض کر دیا ہے ہم خدا کی قوّت کو نافذ کرتے ہیں یعنی یہ ہمارے Through ہوگا۔ بات اب اقتدار کی انسانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ ملوکیّت نے بھی جب مذہب کا نقاب اوڑھا تو اَلسُّلْطَانُ الْعَادِلُ ظِلُّ اللهِ عَلَى الْاَرْضِ۔ قوّت تو اصل میں خدا کے پاس ہے مگر اس نے یہ اختیارات ایک فرد کو تفویض کر دیئے ہیں کلیسا یعنی مذہبی پیشوائیت نے کہا کہ نہیں! یہ اختیارات ہمیں خدا نے تفویض کر دیئے ہیں اس لئے ہمارا فیصلہ خدا کا فیصلہ ہوگا۔ اس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوگی۔

قرآن کا اعلان کہ قوّت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے:

ان خود ساختہ نظریات کے تحت بات تو گھوم کر پھر انسانوں پر آ گئی کہ انسانوں کو انسانوں کی اطاعت کرنی پڑے گی یہ رہی۔ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ (22:73) والی بات آ گئی۔ یہ نعرہ کہ طاقت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے۔'' قرآن نے آ کر دیا۔ یہ بڑی انقلابی کتاب ہے یہ بات بڑے دوررس نتائج کی حامل ہے۔

اب یہ قانون وضع کون کریگا؟

اب فکر انسانی میں بات صرف یہاں آ گئی کہ قانون وضع کرنے کے اختیارات کس کو حاصل ہیں؟ یہاں آ کر قرآن نے ملوکیّت مغربی جمہوریت اور کلیسا کی تمام جڑیں کاٹ کر رکھ دیں۔ کہا کہ قانون وضع کرنے کا اختیار صرف خدا کو ہے اور قوّت قانون

میں ہے۔یعنی قوّت کا سرچشمہ خدا ہے۔قانون سازی کا اختیار خدا کے سوا کسی اور کونہیں ہے۔

قانونِ فطرت کی نمود کا ثمر:

اب غور کریں قرآن اس بات کو کیسے سمجھاتا ہے؟ وہ محسوسات کو سامنے لاتا ہے۔نظام فطرت اور قوانین فطرت۔پہلے تو صرف اتنا پتہ تھا کہ یہ سیلاب کیسے آتے ہیں۔جھکڑ اور طوفان کیسے آتے ہیں۔زلزلے وغیرہ۔ان میں لامتنھی قوّتیں ہیں۔لیکن موجودہ دور میں قانون فطرت کی مضمر قوّتیں مشہود ہو کر سامنے آرہی ہیں۔ایک ایٹم کے اندر جو قوّت مضمر ہے۔اس کی نمود قانون فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔جو خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ورنہ تمام ایٹم جب سے کائنات بنی ہے،قوانین خداوندی کے مطابق پھیلے ہوئے ہیں۔اب اس کا استعمال اگر تباہی کی طرف کردیں تو ساری دنیا کو پلک جھپکتے ہی اڑایا جاسکتا ہے۔ساری مملکتیں اس چھوٹے سے ذرے کی لاانتہا قوّت سے لرزاں ہیں۔اگر اس اٹامک انرجی کو رفاہ عامہ کیلئے استعمال کیا جائے تو حیرت انگیز فوائد مضمر ہیں۔ چاندگاڑیاں اپنی قوّتوں کی تسخیر کے بعد،قوانین فطرت کے حیرت انگیز مظاہرے ہورہے ہیں۔یہ ہے جو قرآن سمجھارہا ہے کہ جسے آپ قدرت یا طاقت کا سرچشمہ خدا کہتے ہیں۔تو اس نے اپنی اس طاقت کی نمود، کائنات میں،ان قوانین کے ذریعہ کی ہوئی ہے اور متعدد مثالیں قرآن میں جابجا بکھری پڑی ہیں۔اِنَّ فِيۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِىۡ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ (2:164) غور کرو یہ سارا کنٹرول ایک ذی اقتدار ہستی کے ہاتھ میں ہے۔انسانوں کو طاقت کا سرچشمہ بنانے والوں کیلئے لمحہ فکریہ! کیا کیا یہ تمام قوانین فطرت کسی انسان نے بنائے ہیں؟ یا ان کے احکامات کے تابع چل رہے ہیں؟ اتنی قوّتیں ان کے اندر کس نے رکھ دی ہے۔کیا یہ خود بخود اس قدر قوّت کے مالک ہوگئے ہیں یا انسانوں نے یہ قوّت رکھ دی ہے؟ تھوڑا سا عقل وفکر سے کام لوگے تو جان جاؤ کہ یہ اس خدا کے بنائے ہوئے قوانین ہیں اور اس کے تابع یہ عظیم الجثہ اور محیّر العقول سلسلہ اس قدر نظم وضبط سے چل کر تعمیری نتائج مرتب کررہا ہے۔

یاد رکھو۔اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ۙ (2:165) قوّت نہ فرد کے پاس، نہ انسانوں کے پاس۔بلکہ صرف خدا کے پاس ہے۔ آگے ہے۔لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ (2:164) یہ بات صرف ان کی سمجھ میں آئے گی جو عقل وفکر سے کام لیں گے۔اب چونکہ اس کے تمام بنائے ہوئے قوانین میں یہ قوّت موجود ہے۔تو اب اس کو حق حاصل ہے کہ وہ انسان کی تمدّنی زندگی کیلئے بھی اس قسم کے قوانین دے۔کائنات کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اشیائے فطرت کے یہ قوانین بھی وجود میں آگئے تھے اور یہ سارا سلسلہ اس حسن وخوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ سارا نظام ان قوانین کی پابندی کررہا ہے کہا کہ اس قسم کے قوانین ہم نے

انسانوں کی زندگی گزارنے کیلئے بھی دیئے ہیں۔

کلماتُ اللہ اور سنّتُ اللہ کا قرآنی مفہوم:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾(33:62) لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ (6:34) ان دو آیات میں کلمات اللہ اور سنّت اللہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اسے یوں سمجھو کہ جو نظام فطرت ہے جہاں اس کے قوانین ہیں ان کو ''سنّت اللہ'' کہا ہے اور انسانوں کے متعلق جو قوانین بطور وحی دیئے ہیں ان کو کلمات اللہ کہا ہے۔ ان میں لطیف فرق ہے۔ سنّت وہ ہے جو مشہود ہو کر سامنے آجائے اور کلمہ وہ قانون ہے جو نظریہ کے طور پر دیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانوں کو جو قوانین دیئے ہیں وہ نظری حیثیت سے دیئے ہیں۔ عملی حیثیت سے انسانوں نے خود اپنے معاشرے کے اندر نافذ کرنا ہے۔ نافذ کرنے کے بعد یہ قوانین سنّت اللہ ہو جائیں گے۔

قانونِ فطرت ہوں یا انسانی زندگی کے قوانین، ان سب کو خدا نے اپنے کنٹرول میں رکھا ہے:

جس طرح اس نے قوانینِ فطرت کسی کو تفویض نہیں کئے۔ انہیں اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اسی طرح یہ انسانی زندگی کے قوانین کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کسی کو بھی تفویض نہیں کئے گئے یہ ایک ضابطہ قوانین ہے یہ مملکت کیلئے قوّت نافذہ ہوتے ہیں۔ اس کا کام ان کو نافذ کرنا ہے۔ اس مملکت کا کام صرف یہ ہے کہ ان کو معاشرے میں عملاً نافذ کرے۔ ان کے پاس کوئی ذاتی قوت نہیں ہوتی۔ جس طرح انجن کو چلانے کی قوّت اسٹیم میں ہوتی ہے۔ ڈرائیور میں نہیں ہوتی۔ اس ڈرائیور میں یہ قوت نہیں ہوتی بلکہ انجن کے اسٹیم کے اندر ہوتی ہے۔ جس پر وہ کنٹرول رکھے ہوئے ہے۔ جسے وہ نافذ کر رہا ہوتا ہے۔ سیاست اور حکمرانی ان قوانین میں ہوتی ہے۔ یہ قانون قوّت رکھتے ہیں۔ اب چونکہ یہ قوانین نافذ نہیں ہیں تو جس کا جی چاہے قوّت ہاتھ میں لے لے۔ وہ غیر اللہ کہلائے گا۔ اگر اس پر ایمان ہے۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ (2:165) کائنات میں قوّت و اقتدار صرف اس کا ہے۔ تو قوانین خداوندی کو معاشرے میں نافذ کر دو۔ یوں ساری قوّت ان قوانین کو حاصل ہو جائے گی۔ تو قرآن کے الفاظ میں یہ قوّت خدا کو حاصل ہو جائے گی۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ (22:74) لوگوں نے خدا کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾(22:74) وہ بڑی قوّتوں کا مالک ہے ہر ایک پر غالب ہے۔ اللہ کو ایسا ہونا چاہئے نہ کہ ایسا جیسا کہ تم نے تراش رکھا ہے۔

خدا کے صحیح تصوّر کی اہمیّت:

ان کے ہاں خدا کا صحیح تصوّر نہیں ہے۔ خدا کا صحیح تصوّر لے آیئے یہ تمام مسائل حل ہو جائینگے۔ ایک سے زیادہ الٰہ مقرر کرنے سے فساد ہوتا ہے۔ (45:23) جو آج ساری دنیا میں فساد ہی فساد ہے اس کی وجہ ہر انسانی قلب صنم کدہ بنا ہوا ہے۔ ہر گروہ، ہر قوم اپنی اپنی خواہشات کو خدا بنائے بیٹھے ہیں۔ اس ''خدائے خواہشات و جذبات'' کے تغلب میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ بقول لینن اور میکیاولی۔ جائز وہ جس سے مقصد حاصل ہو جائے اور ناجائز وہ جو حصول مقصد میں مخل ہو۔ یہ ہیں وہ خدا جنہوں نے دنیا کو جہنّم بنا رکھا ہے۔ ان بتوں کی تعمیر کوئی سنگ تراش نہیں کرتا بلکہ یہ ذہن انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ ان کا مسکن

کوئی مندر نہیں بلکہ قلب انسانی ہے۔ مال واولاد کا بت، دولت وثروت کا بت۔عزت ووجاہت کا بت۔حکومت کا بت، ملک ونسب کا بت خدا جانے کون سے لات ومنات، کون سے ہبل عزیٰ، انسانی دماغ میں ہر آن تراشے جاتے ہیں ؎

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر

رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

اللہ پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ انسان کا نصب العین اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے۔ انسان کو اکثر مخلوق پر اشرف اور تمام اشیائے فطرت کا مخدوم پیدا کیا گیا ہے اس کا یہ فریضہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کو اپنے تابع فرمان کردے اور خود اللہ تعالیٰ کے قوانین کے تابع ہوجائے۔ اس طرح سے ذات میں استحکام پیدا کرکے ساری دنیا میں ان قوانین کا نفاذ کرے۔ وہ جماعت جو اس فریضہ انسانی کی تکمیل کرتی ہے۔

وہ ذاتِ خداوندی پر ایمان رکھتی ہے اس جماعت میں تاحدِ بشریت ان صفات کا پرتو جھلک رہا ہو۔ اس بے مثال و دبے ہمتا، برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم خدائے عرش کی صفات جلیلہ کا خاکہ اس قدسی نفس جماعت کے محسوس پیکروں میں فرش زمین پر منقوش نظر آتا ہو اور اس جماعت کے قلوب واذہان اس ضاع نادرہ کار کے حسین جمیل رنگ میں رکھے ہوئے ہوں۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ (2:138)

؎ رنگ او برکن مثال اوشوی در جہاں عکس جمال اوشوی

قائداعظم کے الفاظ میں۔ درحقیقت اسلامی نقطہ نگاہ سے طاقت کا سرچشمہ نہ بادشاہ، نہ حکمرانوں کی جماعت، نہ عوام، نہ مذہبی پیشوا، کوئی بھی نہیں۔ آزادی اور پابندی کے حدود وقانون خداوندی مقرر کرتے ہیں یہ ہے اسلامی مملکت یہ ہے اسلام اطاعت خدا صرف اس کا قوانین کے عمل نافذ سے ہوتی ہے۔ جو قرآن نے دیئے ہیں۔

❀❀❀

نظریۂ ارتقاء

قرآن کی آیات۔ (23:12-16) زندگی انسانی کے مختلف مراحل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ابتداء بے جان مادے میں کیمیائی ارتقا سے ہوتی ہے پھر طویل ارتقائی مراحل کے بعد اس بے جان مادے میں زندگی کی نمود ہوئی۔ (3:27) پھر آخری مرحلہ آ گیا جہاں افزائش نسل کی ابتداء نر و مادہ کے اختلاط سے ہوتی ہے۔اس کے بعد جنین، ایمبر یو اور Fetus کا بالترتیب ارتقاء۔پھر ایمبر یو کی تکمیل (مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ) (22:5) کے بعد ہڈیوں کا ڈھانچہ پھر مزید گوشت کی تہہ اور آخر میں خَلۡقًا اٰخَرَ ط (23:14) نفس یا ذات دیگر باقی حیوانات سے ممتاز کر دیا۔ پھر موت اور حیات کا ذکر۔زندگی کی ابتداء کے بارے میں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ اگر اس کا تعلق عالم محسوسات (خلق) سے ہوا تو اس کا سراغ مستقبل میں ضرور مل جائے گا۔ اگر یہ معاملہ عالم امر کا ہوا تو اس اکتسابی علم انسانی کیلئے اسے پتہ چلانا ناممکن ہے۔ یہ تو فجائی ارتقاء سے ایک نئی نوع حیات کی براہ راست تخلیق کا نام ہے۔حیوانی سطح سے انسانی سطح کا ظہور فجائی ارتقاء کا ثمر ہے۔فطرت میں کسی نئی چیز کی تخلیق ہمیشہ ہی کسی بڑے جست کے نتیجہ میں ہوئی اور یہ بھی کہ ظہور آدم کیساتھ ہی زمین پر دو ٹانگوں پر چلنے والے تمام جانور ختم ہو گئے۔بل برائسن 5-4 بلین سالہ طویل کرہ ارض کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس تاریخ میں ہماری آمد انتہائی جدید اور مختصر دورانیے پر منحصر تھی۔

کرہ ارض پر زندگی کی اہم خصوصیّت یہ بھی ہے کہ یہ اچانک نابود ہو جاتی ہے اور ایسا باقاعدگی سے ہوتا ہے۔کتنی محنت اور لگن سے جانداروں نے اپنی اقسام کو ترتیب دیا۔لیکن یہ اقسام فنا ہو گئیں جوں جوں وہ ارتقائی منزل طے کرتی ہیں توں توں ان کے اچانک معدوم ہونے کے امکانات بڑھتے جاتے ہیں۔جدید تحقیق میں یہ نیا نظریہ سامنے آیا ہے موجودہ انسانوں سے قبل زمین پر لاکھوں سال تک دو ٹانگوں پر چلنے والے کئی حیوانات کے ادوار آتے رہے ہیں۔لیکن ان میں کسی کو بھی انسان نہیں کہا جا سکتا۔ان کا آغاز 50 لاکھ سال پہلے افریقہ میں ہوا تھا۔کوئی چالیس پچاس ہزار سال پہلے قدرت کے تخلیقی امر میں پھر اچانک کوئی بڑی تبدیلی آئی اور انسان نما مخلوقات کے مقابل میں ایک بہت زیادہ ترقی یافتہ مخلوق پیدا ہوئی۔

میکڈوگل نے کہا تھا کہ انسان اور حیوان میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ پروفیسر برونوسکی اس تصوّر کی تردید کرتے ہیں کہ یہ تو بالکل الگ تھلگ اور انوکھی مخلوق ہے۔اس کے پاس قدرتی تحقیق کا ایسا مجموعہ ہے جو اسے بلند مقام عطا کرتا ہے وہ تصویر کا حصّہ نہیں بلکہ

674

تصویر بنانے والا بھی ہے۔قدرت کا کھوجی، چابک دست، مشاہدہ کرنے والا مفکر، پرجوش، ذہن میں الفاظ اور ریاضی کی علامتوں کو ترتیب دینے والا۔ارتقاء نے اسے جانوروں کی سطح سے قدرت کے راز و اسرار جاننے کی خواہش تک پہنچایا۔ظہور آدم کے سلسلے میں اب یہ طے ہے کہ انسان نے سب سے پہلی بار افریقہ میں خط استوا کے قریب ارتقاء کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ یہاں انسان کا چالیس لاکھ سال قبل کا ریکارڈ موجود ہے اس کی تہذیب کی ابتداء Jorden (موجودہ اردن) میں ہوئی۔ یہ چالیس لاکھ سالہ ریکارڈ دراصل دو ٹانگوں والے انسان نما حیوان کا ریکارڈ ہے۔ خلیفہ سے مراد یہ ہے کہ پہلے کسی مخلوق کا جانشین Successor (عبدہ مصر والا) کہتے ہیں کہ خلیفہ کے لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ زمین انسانوں کی کئی اقسام ایسی بھی گزر چکی ہے جن کا نام ونشان مٹ گیا۔

جعفر صادق کا قول ہے اللہ نے بابا آدم سے پہلے تیس آدم پیدا کئے امام باقر سے مروی ہے کہ آدم سے پہلے دس لاکھ آدم یا اس سے بھی زیادہ ہوگزرے ہیں ابن عربی کا کہنا ہے ہمارے آدم سے چالیس ہزار سال پہلے ایک اور آدم تھے۔یعنی دو ٹانگی مخلوق کی موجودگی کا نظریہ جدید نہیں بلکہ ماضی میں سب اس کی جڑیں دور تک جاتی ہیں۔ارتقاء ایک واضح حقیقت ہے۔علامہ رحمت طارق تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ایک نفیس علمی نقطہ ملحوظ ہو کہ قرآن میں خلیفہ کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے آدم کے ساتھ 12:30 میں داوٗدؑ کے ساتھ (38:20) پر دو جگہ پر جَعَلَ ہے اس کے برعکس جہاں عام نبی نوبشر کا ذکر ہے۔وہاں تخلیق سے بات کی گئی ہے اس طرح لاکھوں سالہ تخلیق کے بعد جب جَعَلَ کا مرحلہ آیا یعنی بشر کو نمائندگی کی بات ہوئی تو فرشتے حیرت میں ڈوب گئے۔اگر مشہور کردار آدم ہی انسان اوّل ہوتے تو اس کی خلافت کو جَعَلَ کے صیغے سے واضح نہ کیا جاتا۔اس کی تخلیق ہی کو خلافت کی غرض ٹھہرایا جاتا۔آدم کی جنّت زمین تھی۔موقف کے حق میں ابن کعبؓ، ابن عباس اور کئی اماموں کے حوالے دیئے ہیں۔الشجر ہ سے مراد جہاں بیوی کے جنسی تعلقات کا کنایہ مراد لینا ہے۔شیطان سے مراد نفس امارہ جو خود انسان کے اندر موجود ہے۔

ناسخ ومنسوخ کا مروّجہ غلط اور گمراہ کن عقیدہ

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۙ‏ ﴿۵۲﴾ (22:52)

اس سے پہلے ہوتا یہ تھا کہ ہمارا نبی آتا تو لوگوں تک پیغام پہنچا دیتا۔ اس کے جانے کے بعد مفاد پرست عناصر جو احبار و رھبان ہوتے تھے۔ اس وحی میں اپنی طرف سے آمیزش کر کے اسے کچھ کا کچھ بنا دیتے۔ اس کے بعد خدا دوسرا نبی بھیج دیتا اور سابقہ وحی کو اس آمیزش سے پاک کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ یہ سب اس لئے کیا جاتا ہے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہے اور اس کے سارے کام حکمت پر مبنی ہیں۔

آیت کا مروّجہ مفہوم:

تجھ سے پہلے بھی کوئی رسول اور نبی ہم نے ایسا نہیں بھیجا کہ جس کے ساتھ یہ واقعہ نہ گزرا ہو۔ اب ترجمہ یہ ہے ''کہ اس رسول کی دل کی خواہشات، آرزوؤں میں شیاطین نے اپنی آرزو وملا نہ دی ہو۔ پھر خدا ان آرزوؤں کو منسوخ کر دیتا تھا اور آیات کو محکم کر دیتا تھا۔ یہ ہے مروّجہ ترجمہ۔

یاد رکھیں رسول اور نبی مرادف المعنی اور ایک ہی شخصیت کے دو فنکشنز ہیں۔ یہ غلط ہے کہ رسول صاحب شریعت اور نبی بغیر شریعت کے آتا تھا یہ وضعی اور قرآن کے خلاف ہے یہ نبوّت باطنہ کیلئے ایجاد کی گئی ہے۔ نبوّت خدا کی طرف سے وحی کا ملنا جبکہ رسالت وحی کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ وَاَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ (2:213) دوسری جگہ رسول کہتا ہے۔ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ (57:25) تورات موسیٰ اور ہارون دونوں کو دی گئی تھی۔ (21:48)

ابلیس کا چیلنج:

اس آرزو کو داخل کرنے کی کتنی بڑی سازش کی۔ ابلیس خود معترف ہے کہ میرا غلبہ تیرے مخلص بندوں پر نہیں ہو سکے گا۔ خود خدا

نے ابلیس سے کہا کہ میرے مخلص بندوں پر تیرا جادو نہیں چل سکے گا۔ تیرا غلبہ وسلطان کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ کوئی نبی شیطٰن سے مغلوب نہیں ہوسکتا۔ قرآن کی شہادت ہے کہ خدا کے مخلص بندوں پر کوئی تسلط نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ اور خدا کے رسول جن سے زیادہ مخلص اس آسمان کے پیچھے کوئی انسان نہیں ہوسکتا۔ ان کے متعلق کہنا کہ شیطان یہ کر دیتا تھا۔ اس لئے کہ وہ خود اس سے بچ نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد خدا نکال کر آیات کو محکم کر دیتا تھا۔ یعنی رسول پر شیطان غلبہ پالیتا ہے جبکہ قرآن کی محکم آیات میں ہے کہ کبھی بھی شیطان مخلص بندوں پر غلبہ نہیں پا سکتا۔

یہ ہے وہ تصوّر جو وحی کے تصوّر پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ جس سے نبی یا رسول کا قرآنی تصوّر تک ہل جاتا ہے۔

حق کی باطل سے مفاہمت تو ہو نہیں سکتی:

مخالفین قریش کوشش کرتے تھے کہ کچھ مفاہمت ہو جائے اور سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ہمارے بتوں کو باطل کہنا چھوڑ دو ان کی تعظیم کرو۔ اتنا سا یہ کر لیں تو باقی معاملات میں ہم ان کے ساتھ مفاہمت کر لیں گے۔ قرآن میں ذکر موجود ہے۔ وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝١٠ هَمَّازٍ مَّشَّآءِۭ بِنَمِيمٍ ۝١١ (68:10-11) اس نمائندہ کی بات قطعاً نہ ماننا جو بات بات پر جھوٹی قسمیں کھاتا ہے۔ پست ذہنیّت چاہتا ہے کہ یہ اپنی فریب کاریوں سے جماعت میں تفرقہ پیدا کر دے۔ لگائی بجھائی کرنے والا۔ اسے ہر جگہ شر ہی شر نظر آتا ہے۔ وَإِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَاتُنَا بَيِّنَٰتٖ ۙ قَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَرۡجُونَ لِقَآءَنَا ٱئۡتِ بِقُرۡءَانٍ غَيۡرِ هَٰذَآ أَوۡ بَدِّلۡهُ ۚ (10:15) جواب دیا گیا۔ قُلۡ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنۡ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلۡقَآيِٕ نَفۡسِيٓ ۖ (10:15) یہ تو میرا کلام ہی نہیں ہے تو میں کیسے بدل دوں۔ إِنۡ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ ۖ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّي عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيمٖ ۝١٥ (10:15)۔ میں تو صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں اور اس کی خلاف ورزی کے تصوّر سے ہی ڈر جاتا ہوں۔

تفسیری سازشیں:

اب شیطان کی آرزو دل میں داخل کرنے کیلئے کتنے بڑے افسانے کی عمارت وضع کی گئی۔ سورہ نجم کی آیت 19 کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ رسول ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ ان آیات پر پہنچے۔ أَفَرَءَيۡتُمُ ٱللَّٰتَ وَٱلۡعُزَّىٰ ۝١٩ وَمَنَوٰةَ ٱلثَّالِثَةَ ٱلۡأُخۡرَىٰٓ ۝٢٠ (53:19-20) ان سے کہو کہ ایک طرف یہ دین ہے جو اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کے علم کی وسعتیں لامحدود ہیں اور یہ رسول پیش کرنے والا جو انسانیّت کے بلند مقام پر فائز ہے۔ دوسری طرف تمہارا خود تراشیدہ بتوں کے سامنے جھکنا ذلت اور خواری کی علامت ہے۔ ذرا بتاؤ کہ لات وعزیٰ ومنوۃ کی حقیقت ہی کیا ہے؟ روایات میں ہے کہ جب رسول ﷺ ان آیات پر پہنچے امام کی حیثیت سے، قریش پیچھے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس آیت کے بعد ان الفاظ کی تلاوت کی۔

تِلۡكَ ٱلۡغَرَانِيقُ ٱلۡعُلَىٰ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرۡتَجَىٰ۔ یہ بہت بلند مرتبہ دیویاں ہیں۔ ان کی شفاعت کی واقعی انسان کو امید

رکھنی چاہیئے۔

اندازہ لگائیں ان سازشیوں کا! حالانکہ اس سے اگلی آیت ہے۔اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾ (53:21-22) اپنے عقیدہ پر غور تو کرو کہ یہ دیویاں خدا کی بیٹیاں ہیں کس قدر بھونڈی اور جہالت پر مبنی ہے۔

مخالفین کی طرف سے جشن مسرت، بخاری کی ہرزہ سرائی:

یہ جب رسول ﷺ نے پڑھا تو سارے قریش اور مخالفین سجدے میں گر گئے۔جشن مسرت کے نعرے بلند کئے۔کہا ہماری تمہاری مفاہمت ہوگئی۔کام بن گیا۔اب مخالفت ختم ہوگئی۔یہ ایسے نہیں ہوا کہ وہیں کی وہیں بات ہوئی اور وہیں ختم ہوگئی۔واقعہ مکی دور کا بتا رہے ہیں۔یہ وہ دور ہے کہ کچھ صحابہ ان کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر گئے ہیں کہا جا رہا ہے کہ یہ بات ان تک پھر پہنچ گئی اور کچھ اصحاب واپس بھی آ گئے کہ رسول ﷺ نے ان دیویوں کو تسلیم کرلیا ہے۔حضور ﷺ کو بھی معاذ اللہ یہ محسوس ہوا کہ یہ الفاظ شیطان نے کہلوا دیئے اور اس کی تردید کی گئی کہ نہیں ہم ان دیویوں کو نہیں مانتے۔پھر وہ مصالحت ٹوٹ گئی یہ چیزیں قرآن فہمی کیلئے ضروری ہیں۔ان سازشوں کا ذکر ضروری ہے۔

آیت کا صحیح مفہوم:

''تَمَنّٰى ''جس کے معنی صرف آرزو یا خواہش کئے گئے ہیں۔تَمَنّٰى کے معنی تلاوت کے ہوتے ہیں۔یعنی جو رسول پیش کرتا ہے۔وحی خداوندی تَمَنّٰى الْكِتٰبَ کتاب کو پڑھا۔اُمْنِيَّةٌ کتاب کی تلاوت۔جو کچھ پڑھا جائے۔مَنَا يَمْنِيْ۔اندازہ کرنا۔پڑھنے سے کتاب کے مفہوم کا اندازہ کیا جاتا ہے۔اَلْمَنٰى۔واحد مُنْيَةٌ مقاصد، خواہشات وہ کام جن کا پہلے سے اندازہ کیا جائے۔قرآن نے بتایا ہے کہ دین شروع سے ایک چلا آ رہا تھا۔دین کے اصول ایک ہی چلے آ رہے تھے۔یہ قریہ، ہر زمانے میں نبی آیا اور دین کے اصول وہی تھے جو وہ پیش کرتا چلا آیا۔پھر نبی کے جانے کے بعد انہی لوگوں میں سے مفاد پرست اس میں ذہنی اختراع سے ملاوٹ کر دیا کرتے تھے۔تو رسول آ کر ان غلط باتوں کی تردید کرتے۔ان کو منسوخ کر کے ان کی جگہ صحیح باتیں دی جاتی تھیں۔یہ شیاطین سرغنہ، وہ اس کی تلاوت کردہ وحی کے اندر آمیزش کر دیتے تھے تو دین غیر آمیز اور منزہ شکل میں باقی نہیں رہتا تھا تو پھر فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ط (22:52) پھر دوسرا رسول آ کر اسے منسوخ کر دیتا اور اپنی آیات کو پہلے رسول کی وساطت سے بھیجی ہوئی تھیں ان کو محکم کر دیتا تھا وحی کا یہ طریقہ کار شروع سے یوں چل آ رہا تھا۔جو آیت ناسخ و منسوخ ہے۔مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط (2:106) یہ سلسلہ یوں تھا کہ سابقہ نبی کی آیات میں سے کچھ تو بھلا دی جاتی تھیں یا آمیزش کر دی جاتی تھی تو ان کی مثل دوسرے رسول کی وساطت آیات دی جاتی تھیں اور جو وقتی احکام ہوتے تھے۔جن کو باقی رکھنا مقصود نہیں ہوتا تو ان سے بہتر بِخَيْرٍ (2:106)۔اس نئے نبی کی وساطت سے دیئے جاتے تھے۔

شیاطین کی سازشیں:

i) ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ:

کہتے ہیں کہ قرآن میں کئی آیات منسوخ ہیں۔اس آیت مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ (2:106) سے لیتے ہیں۔500 آیات خدا نے نازل کی تھیں انہوں نے کہا کہ منسوخ ہیں۔ پانچ سو سے قصہ شروع کیا تھا۔شاہ ولی اللہ تک پہنچتے پہنچتے پانچ رہ گئیں اوران کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی نے کہا کہ شاہ ولی اللہ نے ان مذہبی پیشواؤں کے دباؤ کی وجہ سے ایسا کہہ دیا تھا ورنہ انہوں نے پانچ آیتوں کی منسوخی کا جو کہا تھا تو ان کی منسوخی کی بھی کوئی وجہ نہیں۔لیکن ابھی تک یہ عقیدہ باقی ہے جہاں کہیں اس حکم سے بچ نکلنے، سرتابی کا جی چاہے،توجھٹ سے کہہ دیا کہ یہ تومنسوخ ہے۔آیات توقرآن میں ہیں مگران کی تلاوت ثواب کی خاطر کی جائے گی ان کے حکم منسوخ ہوگئے۔قرآن میں کہیں بھی منسوخی کا حکم نہیں ہے۔

اگلا عقیدہ کہ حدیث آیت کومنسوخ کرسکتی ہے جبکہ رسول تو کہتے تھے کہ میں ان کا امین ہوں اوران میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔بعینہ لوگوں تک پہنچا تا ہوں۔

اور یہ بھی کہ اب آیت رجم قرآن میں موجود نہیں بکری کھا گئی تھی۔لیکن حکم چلتا ہے کہ زانی کو سنگسار کرو۔وصیت کے متعلق روایات نے قرآنی آیات کومنسوخ کردیا۔ كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۖۚ ۨالۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ ۚ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَؕ‏ ﴿۱۸۰﴾ (2:180) آخر میں کہا حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَؕ ﴿۱۸۰﴾ (2:180) اس کے بعد روایت گھڑی کہ وصیت 1:3 میں ہوسکتی ہے۔یعنی ایک تہائی میں اوروہ بھی وارثوں کے متعلق نہیں ہوسکتی۔

اس آیت کواس حدیث نے منسوخ کر دیا ہے کہا گیا کہ ایسا تونہیں ہوسکتا کہ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِىۡ ۚ (10:15) یہ تو میرے اختیار سے باہر ہے۔تو پھر یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دوقسمیں ہیں وحی خفی، غیرمتلو۔جوقرآن میں نہیں ہے اوروحی جلی۔وحی متلو۔ یہ توایک وحی نے دوسری وحی کومنسوخ کر دیا۔اب کرلو کیا کرتے ہو؟

ii) قرآن کے جمع کرنے کی تاریخ:

جب کہا کہ احادیث تو قابل اعتماد نہیں کیونکہ ان کو رسول ﷺ نے جمع کر کے نہیں دیا۔مگر رسول ﷺ نے قرآن بھی تو مرتب کر کے نہیں دیا۔قرآن پھیلا ہوا دیا۔کچھ کسی کے پاس، کچھ کسی کے پاس، ہڈی پہ، پتہ پہ لکھا،کسی نے پارچہ پر چارآیتیں لکھ دیں کسی کے پاس دو،کسی کے پاس دس۔ یہ قرآن تو بعد میں مرتب ومدوّن ہوا۔اب قرآن کی جمع وتدوین کی تاریخ مرتب کردی۔کسی نے کہا کہ ابوبکرؓ نے کہا تھا۔کوئی کہتا ہے کہ عمرؓ نے کہابات عثمانؓ تک آئی ان کے نام کے ساتھ ہم قافیہ لفظ عثمان جامع القرآن کر دیا یعنی ان سے پہلے دور میں اوررسول ﷺ کی پوری زندگی میں قرآن جمع ہی نہیں ہوا تھا۔صرف یہ ثابت کرنے کیلئے کہ احادیث اس طرح سے کیوں ہوئیں۔ان کا کیا اعتبار۔تو یہ جواب دیا گیا کہ قرآن کے بارے میں ثابت کروکہ یہ بھی اس طریقے سے جمع ہوا ہے۔

قرآن جمع نہیں ہوا تو پھر کونسا قرآن حفظ کیا گیا:

اب افسانے وضع ہوئے کہ ایک کمیٹی بٹھائی جس نے خلفائے راشدین میں سے کوئی نہیں ہے۔ زید اپنے ساتھ کچھ لوگ بٹھا لیتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ کسی کے پاس اگر لکھا ہوا ہے تو لے آؤ۔ یہ لوگ آپس میں دو ٹکڑے بھی نہیں ملاتے کہ جنگ یمامہ میں ابوبکرؓ کے زمانے میں ستر حفاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے یہ تجویز دی کہ اگر حفاظ اس طرح سے شہید ہوتے گئے تو قرآن تو کہیں رہے گا نہیں۔ تو اسے جمع کر لینا چاہیئے۔ تو گو یا یہ تو ان لوگوں نے لکھ دیا۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ستر قرآن کے حافظ کیسے بن گئے؟ کیونکہ حافظ تو وہ ہوتا ہے جسے الحمد سے الناس تک پورا قرآن حفظ ہو۔ اب جو زندہ بچ گئے تو ان کی تعداد تو ہزاروں میں ہوگی۔ تو یہ حفاظ کہاں سے آ گئے؟ اگر رسول ﷺ نے قرآن کی ترتیب نہیں دی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ہر سال قرآن رسول ﷺ دہراتے تھے اور آخری دو سال دو مرتبہ دہرایا اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر کہ میں دو یا ایک چیز چھوڑے جا رہا ہوں۔ کہ میں کتاب اللہ چھوڑے جا رہا ہوں۔ تو کیا اس طرح بکھری ہوئی، دو ادھر اور چار ادھر، پڑی ہوئی کو کتاب اللہ کہا جائے گا؟ جبکہ اس کے بارے میں کہا۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (2:2) کیا خدا نے بھی ان ہڈیوں، پتوں کو بھی کتاب کہا ہے۔ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (15:9) ہم اس کے محافظ ہیں۔

iii) قرآن کی ترتیب میں خدا کا ہاتھ:

اگلا سوال کہ قرآن کی الحمد سے الناس تک ترتیب کہ اس طرح آیات آئیں، اس طرح سے اس میں سورتیں آئیں۔ تو یہ کس نے دیا۔ کہا عثمانؓ نے۔ کسی کتاب کی ترتیب کو الٹ دیں تو وہ کتاب ہی نہیں رہتی۔ کہتے ہیں کہ قرآن جس ترتیب سے نازل ہوا تھا رسول ﷺ نے اسے الٹ دیا۔ یہ صحف عثمانی میں ترتیب الٹ دی گئی۔

iv) صحائف میں تضاد:

سنیوں کے ہاں روایات ہیں کہ عثمانؓ نے جو قرآن ترتیب دیا تھا وہ خود مدینہ کے بہت سے نسخوں، صحائف سے مختلف تھا۔ مدینہ کے نسخوں میں ہی غلطیاں رہ گئی تھیں اور اس حجّاج بن یوسف نے مصحف عثمانی کی غلطیوں کو درست کیا۔ صحابہ کے پاس جو نسخہ تھے ان میں اور مصحف عثمانی میں متعدد اختلاف تھے۔ یہ خیالات قرآن کے بارے میں عام کر دیئے جائیں تو اسلامی محکمیت کہاں باقی رہ سکتی ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا تھا۔ اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (22:52) تلاوت شدہ آیات کے ساتھ یہ شیاطین یہ کرتے تھے ہر رسول کے ساتھ یہ ہوتا رہا ہے۔ یہ تمام شیطان اس طرح کی سازشیں روایات اور افسانوں کی شکل میں گھڑتے رہے۔ خود قرآن میں تو کر نہ سکے کیونکہ اس کا ایک ایک حرف پہاڑ کی طرح محکم ہے۔ جس ترتیب سے خدا نے رسول کو دیا۔ وہ حرفاً حرفاً اس ترتیب سے کتابی صورت میں موجود ہے اور قیامت تک اس طرح موجود رہے گا۔

v) قرأت کا اختلاف (اگلی سازش):

یہ کہ شیاطین رسول اللہ کی تلاوت میں کچھ ملا دیا کرتے تھے۔ یہ ہے وہ روائیداد۔ کیا صحابہؓ نے اس میں ملا دیا تھا۔ کہنے لگے۔ معاذ اللہ وہ خود کیسے ملا دیتے۔ تو پھر اختلاف کیسے ہے۔ کہا خدا نے جو نازل کیا اس میں اختلاف ہے جبکہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ اس میں اختلاف ہے۔ یہ جو پڑھنے کا بھیرویں یا بھیروی انداز ہے تو یہ پڑھنے والی قرات کی بات نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ان آیات کے الفاظ میں فرق ہوتا ہے ان میں زیروں، زبروں کا فرق ہے جس سے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ اِعراب کے بدلنے سے ہمارے ہاں عقیدہ یوں ہے کہ یوں بھی نازل ہوا۔ مصحف عثمانی میں اور قرات عباس میں یوں بھی نازل ہوا ہے۔

المصاحف:

یہ صحاح سِتّہ میں ابوداؤد کی طرف سے ہے یہ ان کے بیٹے حافظ ابوبکر عبداللہ ابن ابی داؤد سجستانی کی تصنیف ہے۔ اس میں قرآن سے متعلق ان تمام روایات کو جمع کر دیا گیا ہے جس سے ثابت ہو کہ معاذ اللہ قرآن میں بھی صحابہ اور تابعین کے زمانے میں کافی اختلاف تھے اب تمام منتشر روایات کو صحاح ستہ اور دوسری کتب سے یکجا جمع کر دیا ہے۔ ان کی وفات 316ھ ہے۔ ان میں درج ذیل نکات ملتے ہیں۔

1- قرآن حضور ﷺ نے جمع نہیں کیا بلکہ صدیق اکبر نے جمع کیا۔ -2 قرآن صدیق اکبر نے خود جمع کیا اور زید نے نظر ثانی کی۔ -3 جمع قرآن کا کام صدیق اکبر نے نہیں بلکہ عمرؓ نے شروع کیا اور عثمان نے تکمیل کی۔ -4 قرآن کی کچھ آیات بکری کھا گئی۔ -5 مروان نے حفصہؓ کے صحیفے جلا دیئے۔ -6 قرآن کی ترتیب عثمانؓ نے کی تھی۔ -7 قرآن میں غلطیاں رہ گئیں۔ -8 عثمانؓ کے لکھے ہوئے مصاحف مدینہ کے تمام مصاحف سے مختلف تھے۔ -9 مختلف شہروں کیلئے جو مصحف لکھے گئے تھے ان میں باہمی اختلاف تھا۔ -10 حجّاج بن یوسف نے مصحف آسمانی میں گیارہ موقعوں پر تبدیلی کی۔ -11 قرآن کے اختلاف قرآن اور لب ولہجہ کے اختلاف نہیں تھے۔ -12 قرآن بھی روایت بالمعنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہے ان کی کتب حدیث جیفری نے اس کتاب کو مرتب و مدون انگریزی میں کیا۔

" Material for the History of Text of Quran"

اس کتاب میں جیفری نے جو تفصیل درج کر دی اس کی رو سے ان نسخوں میں مختلف فیہ آیات کی تعداد صحابہ کبارؓ کے نام سے دیدی گئی ہے تاکہ ثابت ہو سکے کہ صحابہؓ میں بھی اختلاف تھا۔

نام صحابہ بمع تعداد آیات

1	ابن مسعودؓ	1322 آیات
2	ابی بن کعبؓ	992 آیات
3	علیؓ	89 آیات
4	ابن عباسؓ	186 آیات
5	ابوموسیٰؓ	04 آیات
6	حفصہؓ	10 آیات
7	انس بن مالکؓ	24 آیات
8	عمرؓ	28 آیات
9	زید بن ثابتؓ	10 آیات
10	ابن زبیرؓ	34 آیات
11	عمرو بن العاصؓ	معلوم نہیں
12	عائشہؓ	13 آیات
13	سالمؓ	2 آیات
14	امہ سلمہؓ	14 آیات
15	بلید ابن عمیرؓ	18 آیات

نوعیّت اختلافات:

ان سے بات کرو تو کہتے ہیں کہ جیسے لاہوری چڑیا کو چریا کہتا ہے ایسا اختلاف تھا۔ یہ عثمانؓ کے مصحف میں چڑیا لکھی گئی تھی جبکہ عباسؓ کے مصحف میں چریا لکھی گئی تھی۔ عربوں کے مختلف قبائل تھے چونکہ ان قبائل کے اس قسم کے فرق ہوتے تھے۔ تو خدا

تعالیٰ نے ان مختلف قبائل کی زبان میں اتنے قرآن نازل کر دیئے۔ قرآن نے تو اس کو "بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴿۱۹۵﴾(26:195)" یعنی واضح عربی مبین کی زبان۔

قرآن نے السنہ نہیں کہا بلکہ لسان کہا ہے۔ واحد استعمال کیا ہے۔ یہ تمام صحابہؓ مکے والے تھے۔ عربی مبین جاننے والے ہیں۔

vi) متضاد شکل میں آیات کا نزول بخاری کی ہرزہ سرائی:

یہ روایت بخاری میں بھی ہے اور کتاب المصاحف میں بھی ہے مکہ کے دو صحابیؓ ان کی زبان تو ایک ہی تھی۔ عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے ہشام بن حکیم کو رسول ﷺ کی زندگی میں سورۃ فرقان پڑھتے سنا۔ وہ ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسول ﷺ نے نہیں پڑھائے تھے۔ نماز کے بعد اس سے پوچھا کہ یہ سورۃ کس نے پڑھائی ہے؟ جواب دیا رسول ﷺ نے۔ اس نے کہا کہ یہ تو جھوٹ ہے رسول ﷺ نے تو مجھے اس کے خلاف پڑھائی ہے جو تو پڑھ رہا تھا۔ جب اسے لیکر سارا ماجرا سنایا رسول ﷺ تو ہشام سے کہا گیا کہ پڑھو۔ تو اس پر رسول ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورۃ یوں بھی تو نازل ہوئی ہے پھر عمرؓ نے کہا پڑھو تو رسول ﷺ نے کہا کہ یوں بھی نازل ہوئی تھی۔

قرآن سات زبانوں میں نازل ہوا تھا (بخاری):

رسول ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہو۔ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ جس طرح آسان ہو۔ پڑھ لیا کرو یعنی قرآن سات قراتوں کے، سات مختلف طریقوں سے، سات اختلافات کے ساتھ نازل ہوا ہے ان کے ہاں ابھی تک مسلّمہ کے طور پر مانا جاتا ہے۔

vii) شیعہ اور سنی حضرات کے مابین متعہ:

سنی نکاح کو دائمی عقد جو موت یا طلاق سے ختم ہوتا ہے نہ اس میں مدت کا تعین ہے بلکہ شیعہ حضرات اسے وقتی معاہدہ بھی مانتے ہیں۔ اسے متعہ یعنی ایک مدت تک مانتے ہیں سورہ نساء کی آیت ہے۔ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ (4:24) اور اس کے علاوہ جو ہیں تمہارے لئے حلال ہیں اس طرح اپنے مالوں سے نکاح چاہو تو کر لو۔ نہ کہ شہوت رانی کیلئے۔ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ (4:24) تو ان کو مقررہ مہر کے بعد ان سے گھریلو زندگی کا فائدہ اٹھاؤ۔

شہوت رانی مقصد نہ ہو بلکہ گھریلو زندگی گزارنے کیلئے یعنی یہ تو زندگی بھر کا معاہدہ ہے جو موت یا طلاق سے ٹوٹے گا۔ اب شیعہ حضرات متعہ کے قائل ہیں جس میں مرد اور عورت ایک مدت معینہ کیلئے مباشرت کا معاملہ طے کر لیتے ہیں اور اس عورت کو جنسی تعلق کا معاوضہ دیدیا جاتا ہے۔ اب اوپر کی آیت لکھنے کے بعد کہتے ہیں عبد اللہ بن عباسؓ کی قرات میں یہ آیت یوں آئی ہے۔ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ ایک متعین مدت کیلئے فائدہ اٹھاؤ۔ اس اضافہ سے یہ متعہ کا سند تلاش کرتے ہیں۔ سنی پھر اس آیت میں اس اضافہ کے قائل ہیں کوئی اس روایت کو جھوٹا کہنے کی سنی بھی جرات نہیں کرے گا۔

دوسرا اختلاف پاؤں دھونا یا مسح کرنا:

وضو کے احکام

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ (5:6) پاؤں کو ٹخنوں تک دھولیا کرو۔ اَرْجُلَكُمْ کی دو قرأتیں متواتر ہیں۔ ابن عامر وغیرہ کی قرأت اَرْجُلَكُمْ (لام پر زبر) اور اَرْجُلِكُمْ (بکسر لام) یہ اعراب کا فرق ہے قرآن میں زبر کے ساتھ ہے اس کے معنی ''پاؤں دھونا'' جبکہ لازم زیر کے ساتھ ہو تو معنی ''مسح کرنا کے ہو جائیں گے۔

عثمانؓ نے چھ زبانوں والے قرآن جلا دیئے کیوں؟:

مودودی بھی فرماتے ہیں کہ قرآن سات قراتوں، سات زبانوں میں نازل ہوا۔ رسول ﷺ نے صحابہؓ کو سات زبانوں میں دیا۔ عثمانؓ کے زمانے تک یہ سات زبانوں میں قرآن محفوظ رہے۔ عثمانؓ نے چھ زبانوں کے قرآن اپنی مرضی سے جلا دیئے۔ ایک زبان والا باقی رکھا۔ نہ تو خدا کا حکم ہے اور رسول ﷺ کا یہ ہیں وہ شیطان جو قرآن میں تو رود بدل نہ کر سکے مگر قرآن کی حیثیت کو بذریعہ ان روایات مشکوک کرنے کی کوششوں میں لگا تار مصروف رہے۔

یاد رکھو ہمارا یہ ایمان ہے کہ یہ لفظاً لفظاً، حرفاً حرفاً، الحمد سے الناس تک بعینہ وہی ہے جسے خدا نے رسول ﷺ پر وحی کیا اور جسے رسول ﷺ نے امت کو دیا۔ لیکن ان کے ہاتھ قرآن تک بھی جا پہنچے۔

نبوّتِ باطلہ کا ثبوتِ اختلاف قرأت سے:

عباسؓ کی قرأت میں آیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى (22:52) یہ وَلَا مُحَدَّثٍ کا اضافہ کیا گیا ہے یعنی خدا سے خبریں پانے والا۔ جبکہ مُحَدِّثٍ سے مراد حدیث بیان کرنے والا۔ جس طرح نبی اور رسول خدا کی طرف سے ہے اس طرح مُحَدَّثٍ بھی خدا کی طرف سے ہے اور اس نبوّت باطلہ قادیان نے اپنے دعوٰی کی تائید میں یہ قرأت پیش کر دی کہا کہ نبی اور رسول نہیں مانتے تو محدث تو مانو۔ بات تو مامور من اللہ ہونے کی ہے۔

ملاوٹ کرنیوالے شیطٰین:

وحی میں اس طرح کی تحریف کرنیوالوں کو شیطٰن کہا گیا ہے یہ نبی کے اپنے ہی نام لیوا تھے۔ اگر دوسرا کرتا تو فوراً پکڑا جاتا۔ اس کے بعد دوسرا نبی آکر، وہ خدا کی وحی کی بنا پہ، اس آمیزش کو الگ کر دیتا تھا۔ پھر دین کو اصلی شکل میں پیش کر دیتا تھا۔ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ (22:52) آمیزش منسوخ کر کے آیات کو محکم کر دیتا تھا۔ اب رسول ﷺ تو خاتم النبیّٖن ہیں اس کے بعد تو نبی آنا نہیں تھا تو اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے لیا۔ اب اس میں تو کچھ ملانے کا امکان نہ رہا۔ اب

674

ملانے والے باز تونہیں آ سکتے تھے۔تو انہوں نے اس آمیزش کیلئے نئی نئی تدابیر سوچیں۔اب کیا کچھ وہی جائے گا جو پہلے کرتے تھے۔اب کتاب تومحفوظ ہےتوان سازشوں کا جائزہ لیں۔

1- پہلی سازش:

قرآن تومحفوظ رہامگر پانچ صد آیات منسوخ کر دیں۔

یہ ناسخ ومنسوخ کی آیات قرآن کے احکام وحقائق کے متعلق تھیں۔مابعد الطّبیعات کے ناسخ کی بات ہی نہیں تھی۔بات تو ساری احکام کی ہے یہ اتنے احکام منسوخ کر دیئے یہ تھی ان شیاطین کی سازش۔

2- دوسری سازش:

کچھ آیات قرآن میں تو شامل نہیں مگر حکم ان کا چلتا رہا۔آیات وحی ہیں مگر قرآن میں شامل نہیں ہیں مگر حکم ان کا چلتا ہے۔وہاں تو وحی میں ملا دیتے تھے۔انہوں نے یہ آیات شامل تونہیں کیں مگر فرق کیا پڑا۔باہر رکھیں اور حکم ان کا چلتا رہا۔قرآن کی حفاظت کے دعویٰ کے ساتھ اس امت کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا ذہن میں آ سکتا تھا کہ جو پچھلے رسولوں کے ساتھ ہوا۔خاتم النّبیٖن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔

3- تیسری سازش:مختلف قرأتوں کا عقیدہ:

قرأتوں سے مراد یہ نہیں ہے کہ پڑھنے کا لہجہ مختلف ہے بلکہ الفاظ کا اختلاف کہ یوں بھی نازل ہوئی تھی اور یوں بھی۔

4- چوتھی سازش:

ساری فقہ کا دارومداران قرأتوں پر ہے۔

5- پانچویں سازش:

سات زبانوں میں قرآن نازل کیا۔

6- چھٹی سازش:

حدیثوں کے مجموعہ کوقرآن کے مثل قرار دیا گیا۔یہ کون تھے۔قرآن نے بتایا۔وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط (6:112) یہ کوئی نئی بات نہیں جو نبی بھی آیا تو یہ انس وجن میں بڑے بڑے سرغنے متمدّن وغیر متمدّن مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور عوام کوساتھ رکھنے کیلئے طرح طرح کی ملمع سازیاں کر کے ان کو صحیح راستے سے ہٹا دیتے۔زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط (6:112) "جھوٹے نگوں کی مینا کاری" اس کا نام دیا اقبال نے،یعنی جھوٹی چمک والی فریب دہ باتیں کہا ہے۔

7-ساتویں سازش:

سوسال کے بعد مجدّد کا عقیدہ۔امام مہدی کا عقیدہ۔ ہر سوسال بعد ما مومن اللہ مجدّد ہوگا۔ جسے خدا سے وحی ملتی ہے۔اس کے بعد آخر میں امام مہدی آئے گا اس کے بعد قیامت آ جائے گی۔ یہ عقیدہ رائج کیا۔شیعہ اماموں کے بعد تو یہ عقیدہ نہ چلا مگر اسماعیلی خوجے یا بوہرے ان میں تو یہ امامت کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔اب یہ آمیزش کیسے دور کی جائے۔کیونکہ نبی نے تو آنا نہیں۔اب جنھوں نے یہ دعوے کئے تھے کہ ان آمیزشوں کو نکالنے کیلئے آئے ہیں یہ سارے محدث، مجتھد، مجدد، صوفیہ یہ لوگ سوسال تک دین میں آمیزش کرتے رہتے ہیں ان مجدوں سے پوچھو کہ کونسی ملاوٹ الگ کی ہر مجدد کے آنے کے بعد نیا عقیدہ پیدا ہوگیا اور نیا فرقہ۔

8- آٹھویں سازش، سنیوں کے تصوّر حیات میں وحی کی جگہ کشف والہام:

یہ سنی حضرات بھی اس قبیل کے عقیدے میں پیچھے نہیں رہے ان کے ہاں صوفیا اور اولیاء کو بھی براہ راست خدا سے علم ملتا ہے۔انہوں نے اسے وحی کی بجائے الہام وکشف کہا۔انہوں نے نبی کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ان میں سے کچھ ایسے تھے جنہوں نے یہ بات بھی کہہ دی تھی مگر اس کو دبا دیا گیا۔انہی کی وجہ سے قادیانی نبی غلطی کھا گیا کہ ان کو کچھ نہیں کہا تو مجھے بھی کچھ نہیں کہیں گے۔یہ نام نہاد مجدد خالص دین کی تجدید کیلئے آئے تھے۔ان سے پوچھئے کہ انہوں نے دین سے کوئی ملاوٹ صاف کر دی یا مزید کنفیوژن کا شکار کر دیا۔

❁❁❁

''قرآنی آیات کو کیسے محکم کیا جائے؟''

قرآنی آیات کو محکم کرنے کا طریق کار:

ان دعاوی کی تنسیخ کا طریقہ یہ ہوگا اب مامور من اللہ یا نبی نہیں آئے گا تو قرآن کی آیات کو کیسے محکم کیا جائے؟ اب چونکہ وہ آیات لفظاً لفظاً قرآن میں محفوظ ہیں پہلا ایمان تو یہ ہے کہ وحی صرف قرآن ہے وحی کی اور کوئی قسمیں نہیں ہیں ان آیات کو ضعیف کر دیا گیا ہے ان کو محکم کرنا ہے۔ ان کو اپنے مقام پر محکم کر دیا جائے۔ یہ سارا لٹریچر قرآن سے باہر یہ قرآن کے خلاف ہے اور ان تمام غیر قرآنی عقائد سے انکار کرنا ہوگا۔ جس طرح رسول ﷺ کی وفات کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا۔ حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ اس نے ختم نبوّت کی لم کو پا لیا تھا۔ اقبال نے کہا تھا کہ یہ ہے آیات کی تحکیم جو یہ حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ کہے گا وہ دین کو اصلی شکل میں پیش کر سکے گا۔ کیا ان سازشوں کا توڑ ممکن ہے؟ کیا اسلام کو اس ملبہ کے ڈھیر سے نکالا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے اور یقینا ممکن ہے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ آج اس کی ضرورت ہے۔

یہ جو مفاد پرست وحی میں آمیزش کس مقصد کے تحت کرتے تھے۔ یہ ہے جواب اس سوال کا۔ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ (22:53) وحی کی آمیزش جو یہ مفاد پرست کرتے تھے تو یہ ان لوگوں کیلئے جو خود بھی مفاد پرستی کے مرض میں مبتلا ہوتے تھے یا جن لوگوں کے دل حقائق قبول کرنے میں سخت ہو جاتے تھے۔ وہ خود بھی اس فتنہ کا شکار ہوتے اور ان لوگوں کو بھی اس سے دو چار کر دیتے تھے۔ غور کرو کہ یہ ظالم قانون خداوندی کی مخالفت میں کس قدر انتہا تک چلے جاتے تھے کہ واپسی کا راستہ نہ رہے۔ انتہا درجہ کی مخالفت کرنے والے اس لئے خدا ان آیات کو محکم کرتا تھا تا کہ لوگوں کیلئے فتنہ کا باعث نہ بنیں۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ (2:10) مفاد پرستیوں کی بیماری یا منافقت کے مرض میں مبتلا تھے۔ یہ مذہبی پیشوائیت تھی جو جانتے بوجھتے ایسا کرتے تھے۔ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ (2:79) ان کو چار پیسے مل جائیں۔ روٹی روزی کے لیے پیشہ ور احبار و رہبان۔

قرآن نے ان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ایک تو قلبی امراض والے، منافقت اور ذاتی منفعت کیلئے جانتے بوجھتے کہ یہ چیز

قرآن کے خلاف ہے۔

دوسرے وہ جو اندھی تقلید والے جن کی سوچنے کی صلاحیتیں مفقود ہوگئی ہوں۔ ان کے دل ہی پتھر کے ہوگئے۔ اَلْقَاسِيَةُ قُلُوْبُهُمْ ط (22:53)۔ یہ جو سادہ زندگی بسر کرتے ہیں ان کیلئے کہا ہے کہ وہ نیک نیّتی سے کرتے ہیں۔ حالانکہ صرف نیک نیّتی حق و صداقت کا ثبوت نہیں ہوتی۔ یہ اندھی تقلید والے اَلْقَاسِيَةُ قُلُوْبُ ہیں۔ کوئی بھی ان آیات کو محکم کرنے اٹھے تو یہ دونوں گروہ لٹھ لیکر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ختم نبوّت سے قبل تو دوسرا رسول آ کر ان آیات کو دوسری آیات سے محکم کر دیتا تھا۔ یہ تو یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ط (3:144) یہ تھا اعلان شخصیت پرستی کے خاتمہ کا اس لئے ختم نبوّت والی قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ آزاد ہونا چاہئے تھا جو سب سے زیادہ غلام ہوگئی ہے ختم نبوّت اور آیات کی تحکیم۔ دنیا میں سب سے بڑی آزاد قوم بنا دیتا ہے۔ ڈکٹیٹر بادشاہ تو رہا ایک طرف، جمہوریت کی سو فیصد آراء بھی اس قوم کے کسی شخص کو اپنی آرا کا محکم نہیں بنا سکتی۔ وہ ان سے خدا کی سند مانگے گا جو یہ محکم آیات ہیں۔ یہ ہے ختم نبوّت اور آیات کی تحکیم کا طریق۔ اس کیلئے ان ساری آمیزشوں کو دور کرنا ہوگا تب دین قائم کرنے کی طرف بڑھ سکے گا اس لئے کہ یہ آمیزشیں منافقین اور قاسینِ قلوب نے کی ہیں۔ ان کو مٹا کر آیات کو محکم کیا جا سکتا ہے۔ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾ (22:54) (اب یہ سارا کچھ قرآن میں آ گیا ہے جس کا حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہے)

اور جن لوگوں کو یہ وحی ملی ہے تو وہ علم وبصیرت سے کام لیکر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ یہ ان کے رب کی طرف سے صداقت پر مبنی ہے۔ پس ان کو اس پر ایمان لانا چاہئے اور اس طرح ان کے دل اس کے سامنے جھک جائیں اور اس کی اطاعت کریں۔ تو خدا ان کی رہنمائی متوازن اور سیدھی راہ کی طرف کر دیتا ہے۔

آیات اللہ کو محکم کرنے کا فریضہ امت کے سپرد ہے:

آیات کو محکم کرنے کا طریقہ کیا ہوگا۔ آیات تو اپنی جگہ موجود ہیں۔ محکم تو ہے مگر یہ صرف طباعت کے اعتبار سے پڑھنے کے اعتبار سے، لکھنے کے اعتبار سے، الفاظ کے اعتبار سے محکم ہے۔ اس سے آگے معاذ اللہ اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ یہ تحکیم کیسے ہو گی۔ براہ راست سلسلہ تو ختم نبوّت کے بعد ختم کر دیا گیا ہے۔ قرآن کو دوسروں تک پہنچانا، قرآن کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کرنا، یہ امت کا فریضہ تھا۔ یہ تھا فریضہ رسالت۔ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط (5:67) اب یہ فریضہ رسول ﷺ کے بعد امت کا ہوگیا۔ یہ وارث کتاب ہے اس کا فریضہ ہے کہ ان آیات کو محکم کرے۔

عملی شکل آیات کو محکم کرنے کی:

خدا آیات کو محکم کر دیتا تھا کے عملی معنی کیا ہیں؟ اور آج اس کی کیا شکل ہوگی؟ نبی نے تو یہ نہیں کرنا۔ امت نے کرنا ہے۔ قرآن نے اس آمیزش کو فتنہ قرار دیا۔ دو گروہوں کا ذکر ہے ایک تو مرض تھا دلوں میں وہ اپنے مفادات کیلئے کرتے تھے۔ دوسرا اَلْقَاسِيَةِ

قُلُوۡبُهُمۡ ؕ (22:53) جن کی تقلید سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہوجاتی ہیں۔ یہ پہلے گروہ کے فریب میں آجاتے ہیں۔ ایک دانستہ آمیزش کرتا ہے اور دوسرا نادانستہ، تقلید سے سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے۔ دونوں دین سے بالا، خارج از قرآن چیزیں دین کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ مذہبی پیشوائیت میں یہ دونوں گروہ مل جائیں گے۔ یہ جوجان بوجھ کر کرتے ہیں یہ بڑے چالاک ہوتے ہیں اور کثیر طبقہ ان کا ہے جو اسلاف کی اندھی تقلید سوچنے کی صلاحیتیں مفقود کر دیتے ہیں۔ یہ آمیزش، یہ الحاق امت کیلئے، دین کیلئے فتنہ کا باعث ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ وَّلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اَنَّهُ الۡحَـقُّ (22:54) یہ غور وفکر اور علم و بصیرت سے کام لیکر صرف قرآن کو حق سمجھتے ہیں اور باقی تمام چیزوں کو قرآن سے پرکھتے ہیں۔ یہ فکری طور پر سمجھ کر دل میں اس کا یقین کرتے ہیں۔

صرف فکری طور پر قرآن کو سمجھ لینا کافی نہیں:

پہلی چیز تو العلم کی رو سے ایمان لانا ہے۔ یہ ناگزیر شرط ہے اس کے بعد فَتُخۡبِتَ لَهٗ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ (22:54) ان کے دل نرم ہو کر جھک جائیں۔ اطاعت اختیار کرلیں۔ تو قرآن سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کر دیتا ہے۔ چلنا خود ہوتا ہے۔ خدا انسان کو کسی راستہ پر نہیں چلاتا۔ وہ تو اختیار وارادہ کو کام میں لاکر چلنے کی بات ہے۔

اس کے برعکس۔ وَلَا يَزَالُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ (22:55) جو علم وبصیرت سے کام نہیں لیتے تو وہ قرآن کے بارے میں ہمیشہ شک اور تردد میں مبتلا رہیں گے۔ تا آنکہ حَتّٰى تَاۡتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً اَوۡ يَاۡتِيَهُمۡ عَذَابُ يَوۡمٍ عَقِيۡمٍ ﴿۵۵﴾ (22:55) تا آنکہ موعودہ گھڑی آکر ان کے شجر امید کو یکسر خشک کر کے رکھ دینے اور وہ پھر بار آور ہی نہ ہو سکے کبھی دوبارہ بحر حال جو بھی شک میں رہے تو اس کا انجام تباہی ہے۔

آیات اللہ کیسے محکم ہونگی؟:

غور سے ملاحظہ کریں۔ یہ وہ دور ہوگا۔

اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ (22:56) پورا اقتدار صرف قانون خداوندی کو حاصل ہوگا۔ آگے ہے يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ ؕ (22:56) تمام امور کے فیصلے خداوندی قانون کے تحت ہونگے۔ وہی ''ح ک م'' ہے۔ استحکام۔ تحکیم۔ کس طرح اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ (22:56) حاکمیّت صرف اللہ کی ہوگی اور فیصلے قرآن کے مطابق ہونگے۔ یہ ہے آیات خداوندی کا استحکام یعنی خارج از قرآن ساری چیزوں کو منسوخ کر کے فیصلے صرف قرآن سے کرنا۔ یہ ہے استحکام آیات یہ ہوجائے تو پھر اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ (22:56) تو پھر اقتدار خدا ہوگا۔ تو اس سے مراد يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ ؕ (22:56) پھر اخلاقی معاملات کے فیصلے خدا کرے گا تو خدا کیسے کرے گا۔ یعنی فیصلے قرآن سے ہونگے۔ ثُمَّ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ﴿۱۸﴾ يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـئًا ؕ وَالۡاَمۡرُ

674

یَوۡمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ (82:18-19) ایک ہی بات ہے سارا حکم یا امر خدا کا یعنی صرف قرآن کا خدا خود تو نہیں ہوگا۔ تو فیصلے کیسے ہونگے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) اب ان اختلافات کو مٹانا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں تھا تو اس مقصد کیلئے فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ وَاَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ (2:213) کا ہے کے یہ ضابطے قوانین۔ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ (2:213) اب خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا آیات اللہ کا محکم کرنا ہے۔ خدا کے فیصلے سے مراد خدا کی کتاب کا فیصلہ ہے۔ جس طرح حکومت پاکستان کا فیصلہ سے مراد ان قوانین کا فیصلہ جو حکومت کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہر نبی آیات خداوندی کو محکم کرتا تھا:

مادہ ''ح ک م'' ذہن میں رکھئے۔ لِيَحۡكُمَ (2:213) اس ''ح ک م'' سے ہے۔ اس سے فیصلہ کرنے کی بات چلتی ہے۔ دیکھئے قرآن کس طرح سے ایک ایک نقطہ کی تشریح کرتا چلا جاتا ہے۔ دیگر مقامات پر۔ پچھلی آیت میں (22:52) میں الحق کے ذریعہ سے لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ (2:113) وہ حق کے ذریعہ لوگوں کے فیصلے کرتا ہے۔ یہ ہے آیات کا محکم کرنا۔ ہر نبی یہی کرتا تھا۔ کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا، آیات کو محکم کرنا تھا۔ رسول ﷺ سے ارشاد ہے۔ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ (5:48) آگے ہے فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (5:48)۔ فَاحۡكُمۡ (5:48) سے آیات محکم ہوتی چلی جارہی ہے۔ اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِىۡ حَكَمًا (6:114) کیا خدا کے سوا کسی اور کو حاکم تسلیم کرلوں۔ یعنی فیصلہ کرنے والا۔ یہ کتاب کیلئے قرآن کیلئے اللہ آیا ہے۔

شرک کا مفہوم:

وَّلَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا (18:26) اس کے قوانین میں دیگر قوانین شامل نہیں کئے جاسکتے۔ رسول ﷺ کا اعلان۔ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ (6:50) اِنِّىۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۵﴾ (10:15) صرف وحی کا اتباع قرآن کا اتباع۔ وَاُوۡحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ (6:19) الکتب، وحی، اطاعت سے مراد صرف قرآن ہے۔ اختلافات صرف قرآن سے دور ہوسکتے ہیں۔ وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِيۡهِ مِنۡ شَىۡءٍ فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ (42:10) تو اس کا فیصلہ قرآن سے کرو جس میں متضاد باتیں نہیں ہیں اور بات صاف کردی۔ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤىِٕكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) بات آیات کو محکم کرنے کی ہے جو ان آیات کو محکم نہیں کریں گے وہ کافر ہیں۔

آئین اور قوانین، تغیرّ و تبدّل کا حسین امتزاج:

آئین مملکت کے اصولی خدوخال، اصولی حدود متعین کرتا ہے پھر اس آئین کے تحت ہر قوم، حکومت، حالات کے مطابق، بین الاقوامی تقاضوں سے خود پنے قوانین وضع کرتی ہے آئین کی وہ حدود اپنے مقام پر محکم رہتی ہے۔ مگر یہ وضع شدہ قوانین تبدیل

ہوتے رہتے ہیں۔آئین کے خلاف پارلیمنٹ کوئی قانون پاس نہیں کرسکتی اور جتنے قوانین ان حدود کے اندر رہتے ہوئے پاس کئے جائیں آئین کی روسے وہ قوانین جائز اور صحیح قرار پاتے ہیں۔

قرآن نے حدود اللہ، دین کے ابدی اصول دیئے ہوئے ہیں۔یہ آج کی اصطلاح میں آئین ہے۔یہ غیر متبدّل ہے اس آئین میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔اس آئین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جتنے معاملات سامنے آئیں۔ان کیلئے قوانین وضع کرنے ہونگے۔یہ تفاصیل ان پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، جزئیات زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے جائینگے۔اسے وہ نظام بدلے گا۔ازخود نہیں بدلیں گے۔نہ کوئی فرد اور نہ کوئی گروہ اس میں تبدیلی نہیں کرسکتا اور نہ ان گروہوں کی اجازت ہے۔

قرآن نے جزئیات خود متعین نہیں کی۔جس آئین کو قیامت تک غیر متبدّل رہنا تھا اس کی یہی حیثیت رہنی چاہئے تھی۔اگر جزئیات بھی غیر متبدّل ہوتیں تو زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ اس پر چلنا ناممکن ہوجاتا۔وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص (42:38) معاملات باہمی مشاورت سے آئین کے تحت ہونگے۔مشاورت کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔مشاورت کی مشنری، طریق کار، امت کی صوابدید پر حالات کے تقاضوں کے مطابق چھوڑ دیا وہ امت جوامت واحدہ ہوگئی اور ملت اسلامیہ وہ ہوگی جو قرآن کو اپنا آئین بنائے گی۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) اس کے علاوہ سارا شرک ہے۔قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (72:20) صرف کے قوانین کی اطاعت اور اس میں کسی اور کے ساتھ کوئی دیگر قوانین تو سراسر شرک ہے اس کے تجویز کردہ نظام کے مقابل دوسرا نظام قائم کرنا شرک ہے۔قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ (72:22) تحفظ صرف اس کے قوانین میں ہے۔تو کیا، اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85) کچھ حصّہ ادھر سے اور کچھ ادھر سے ملاکر نظام قائم کروگے تو نتیجہ۔خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (2:85)۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ (39:45) اور آگے ہے۔وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ (39:45) قرآن سے نفرت انتہا تک ہے۔وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ (17:45) یہ جو تحت لاشعور میں ایسا پردہ جو دکھائی نہ دے۔وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ (17:46) یہ ہیں۔وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ (12:106) کہنے کے باوجود مشرک کے مشرک رہے۔

اقتدار کا دعویٰ کرنیوالوں کی بے اختیاری ملاحظہ ہو۔يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ط (22:73) ایک مثال دی کے کانوں سے سنو۔اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (22:73) خدا کے علاوہ اگر کسی دوسرے کو اقتدار اور اختیار والا سمجھو گے۔تو ان کی بے بسی دیکھو۔لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا (22:73) ایک مکھی تک تو پیدا نہیں کرسکتے۔تخلیق کائنات کے مقابل میں مکھی کی

تخلیق لایا ہے قرآن۔ وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ ؕ (22:73) اگر یہ سارے جمع ہو کر ایک ننھی سی مکھی کی تخلیق نہیں کر سکتے اور آگے کہا کہ بے چارگی اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ یَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡـئًا لَّا يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ؕ (22:73) کہ اس سے واپس لے سکیں۔ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ ۝۷۳ (22:73) ان معبودوں کی یہ بے بسی کہ وہ مکھی جیسی شے پر قدرت نہیں رکھتے ان کو صاحب اقتدار سمجھنے والے اور ان سے مرادیں طلب کرنے والے تو اس سے بھی گئے گزرے۔ یعنی انسانوں کو صاحب اقتدار ماننے والے، ان کے سامنے جھک جانے والے کبھی سرفراز اور سربلند نہیں ہو سکتے۔ یہ تو سارے ناتواں ضعیف اور بے بس۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ ؕ (22:74) اصل میں انہوں نے خدا کا اندزہ لگایا ہی نہیں جس طرح کہ لگانا چاہئے۔ اس کو انسانی سطح پر لا کر اَلسُّلۡطَانُ الۡعَادِلُ ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الۡاَرۡضِ۔ یعنی جو نہ کسی قانون کا پابند نہ قاعدے کا پابند۔ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيۡزٌ ۝۷۴ (22:74)۔ وہ تو بڑی قوّت اور اقتدار والا ہے مگر اس کا اقتدار دھاندلی پر نہیں ہے۔ قانون پر مبنی ہے۔ علم و برہان پر مبنی ہے۔

(1)

تصرّیفِ آیات اور درس

سطح بین حضرات درس میں بار بار آیات کو تکرار یعنی (Repitition) سمجھتے ہیں۔ جو سراسر قرآن کے اسلوب سے ناواقفیت کی بناء پر ایسا غلط نظریہ قائم کرتے ہیں۔ گیہوں کی کٹائی کے بعد اس کی گہائی کیلئے ان دانوں یا خوشوں کو زمین پر بچھا دیا جاتا ہے اور اسی دائرے کے ندر بیل سارا دن چکر لگاتے رہتے ہیں۔ بظاہر تو بیلوں کا اس طرح دائرے میں چلنا تکرار نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خوشوں کے اندر جو دانے ہیں وہ باہر نکل آئیں۔ تو اس کیلئے یہ پروسیس اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی بار بار اس چیز کو سامنے لانا تا کہ چھلکا الگ ہو جائے اور اندر سے اس کا مغز یا دانے باہر آجائیں۔ اسے درس کہتے ہیں۔ قرآن نے اسے اپنے ہاں تصریف آیات کہا ہے کہ بار بار ان آیات کو سامنے لا کر ان حقائق کا مفہوم واضح ہو جائے۔ دراصل یہ وہی چیز ہے جس کو درس کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ جو کسان کا ان خوشوں کا گاہنا ہوتا ہے اسے درس کہتے ہیں آپ دیکھیں گے کہ جب تک وہ سارا طریق اس طرح سے نہ چلایا جائے۔ وہ دانے چھلکے سے الگ نہیں ہوتا۔ درس کا لفظ وہاں سے ہے۔ اس لئے اس میں ایک ہی چیز بار بار آتی چلی جائے تو وہ تکرار نہیں کہلائے گی بلکہ چھلکوں کو الگ کرنے کا ایک طریق کہلائے گا۔

❁❁❁

نجات، مکتی یعنی Salvation کا تصوّر غیر قرآنی ہے

مذہب کی دنیا میں تمام عبادات و مناسک، ریاضتیں، مشقّتیں، قربانیاں صرف نجات حاصل کر لینے کیلئے ہیں۔ نجات ہندو دھرم میں مکتی، عیسائیّت میں جو اس کا ترجمہ ہو کر آیا تو وہ Salvation۔ یہودیت میں بھی نجات اور ہمارے ہاں بھی یہی تصوّر ہے۔ قرآن ان کی تردید کر کے بالکل ایک سائنٹیفک تصوّر دیتا ہے یعنی انسان کسی مصیبت میں پھنسا ہو تو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کو نجات کہتے ہیں۔

ہندو دھرم میں یہ مکتی (نجات) یہ ہے کہ انسان ایک جنم لیتا ہے اس میں بہت سے پاپ کرتا ہے تو گناہوں کی آلائش لگ جاتی ہے تو دوبارہ جنم لیتا ہے تاکہ اس کے گناہوں کی کچھ آلائشیں صاف ہو جائیں پھر جنم لیتا ہے اور پھر جنم در جنم کا سلسلہ جسے ''جون کا چکر'' کہتے ہیں ایک چکر، پھر بتیس کروڑ دفعہ جنم لیتا ہے۔ بس ایک چکر ہے جس میں وہ آتا ہے اور جاتا ہے اس طرح سے ان آلائشوں سے بتدریج کمی ہوتی رہتی ہے۔

نجات کا یہ تصوّر Pythagoras (فیثا غورث) (500-582-BC) نے دیا:

جو فلسفہ ریاضی دان ہونے کے ساتھ ساتھ Theologian بھی تھا۔ دائرے کا یہ تصوّر یونانیوں کے ہاں تھا۔ فیثا غورث جو ان کے ابتدائی مفکر تھے۔ انہوں نے آسمانی کروں پر غور کیا تو گول نظر آئے۔ تو اس سے یہ نظریہ قائم کیا کہ زندگی دائرے کے اندر چلتی ہے یعنی جہاں سے چلے تھے اسی نقطہ کے اوپر آجاتا ہے۔

اس طرح ہندوؤں کا چکر یا تناسخ کا تصوّر یونان سے آیا۔ جون کا چکر ''Transmigration of soul'' یہ فیثا غورث کا تصوّر تھا کہ زندگی ایک دائرے میں چلتی ہے اور مقصود یہ ہے کہ اس دائرے میں جتنی بھی آلائشیں لگتی ہیں۔ وہ پاک ہو کر پھر ویسا ہی ہو جائے۔ جیسا پہلے تھا۔

عیسائیوں اور اپنے ہاں مذہبی دنیا کا تصوّر:

عیسائیوں نے کہا کہ ہر بچہ اپنے اوّلین ماں باپ، آدم وحوا کی معصیت کی آلائشیں اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ گناہ تو آدم وحوا نے کیا اور جنّت سے نکالے گئے لیکن ہر بچہ اس گناہ کی کثافت لیکر پیدا ہوتا ہے۔ اب اس کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ عیسیٰؑ کے کفارے پر ایمان لایا جائے یعنی جس نے اپنی جان دیکر میرے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ جو یہ ایمان لے آئے تو اس کی Salvation ہو گئی۔ یعنی جیسا آلائش سے پہلے تھا ویسا ہو گیا۔ موجودہ خودساختہ اسلام میں بھی پاک صاف انسان کے ساتھ آلائشیں

لگیں۔جہنّم میں بھیجا تو یہ آلائشیں جس طرح میلے کپڑے کو بھٹی سے گزار کر صاف کیا جاتا ہے یا سینوٹوریم میں تپ دق کی بیماری سے نجات مل گئی۔یعنی بیماری سے پہلے جیسا تھا ویسا ہو گیا۔اب یہ وہی یونانی ہے۔یعنی ایک نقطہ سے چلا سارے مصائب بھگتنے کے بعد اس دائرے کو پورا کیا اور پھر اس نقطہ آغاز پر آ کر جیسا تھا ویسا ہو گیا۔

ان کے ہاں ویدانت یعنی تصوّف یعنی انسانی آتما (روح) پر ماتما (روح اعلیٰ) کا جزو ہے۔ایشور یا خدا کی روح کا ایک حصّہ ہے۔یہ آتما ہر انسان کے پیکر میں آیا ہوا ہے یہ ایک حصّہ ہے جو وہاں سے آیا ہے اب معلوم نہیں کہ وہاں بھی کچھ باقی بچا ہے کہ نہیں۔وہ تھوڑا تھوڑا ابھی انسان میں بھرنا شروع ہو جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔

اب یہ حصّہ مادی پیکر انسان میں آ کر دلدل میں پھنس گیا۔اب کثافت دور کرنے کیلئے ترک دنیا، ترک لذائز، ترک در ترک کر کے سارا کچھ چھوڑتے جایئے۔تو روح انسانی پھر خدا کی روح میں مل جائے گی۔یعنی آتما پھر پرماتما کے اندر جا کر مل جائے گی۔تو نجات ہو گئی ہمارے ہاں کا تصوّف یہی ہے۔انسانی روحِ خداوندی کا ایک حصّہ ہے۔یہ تمام ویدانت سے آئی ہوئی چیزیں ہیں۔

قرآن ان تمام تصوّرات کو باطل قرار دیتا ہے:

قرآن کا تو تصوّر ہی مختلف ہے یہ تمام مراقبے، ریاضتیں، مشقّتیں جو اس قدر تکلیف دہ ہیں جو تمام اس لئے اٹھائی جاتی ہیں کہ جو روح خداوندی اس پیکر میں آ کر پھنس گئی ہے اس سے نجات مل جائے۔پھر یہ ''واصل بالحق'' ہو جائے۔اس لئے یہ وفات کو وصال یعنی ان کی روح، روح خداوندی میں جا کر مل گئی۔جب تک یہ نہ ملے، اس وقت تک اسے چین نصیب نہیں ہوتا۔

قرآن کا تعارف ''صراط مستقیم'' کا ہے:

قرآن نے اس دائری حرکت کے تصوّر کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اسے صراط مستقیم کہہ کر ان تمام خود ساختہ نظریات پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔جس میں ہر قدم آگے جاتا ہے اور اس سفر کی انتہا و ہی نقطہ آغاز نہیں ہوتا۔یہ تو ایک متعیّنہ منزل کی طرف کا سفر ہے۔اس ایک لفظ صراط نے ان تمام تصوّرات کی نہ صرف تردید کر دی بلکہ زندگی کا ایک مثبت تصوّر بھی دیا کہ زندگی کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں چکر لگانے کا نام نہیں بلکہ ارتقائی منزل طے کرنے کا اور آگے بڑھنے کا نام ہے۔

صراط کے بعد طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾ (84:19)

صراط کے بعد یہ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾ (84:19) یعنی صراط سیدھا بھی اور بلندیوں کی طرف جانے والا بھی درجہ بدرجہ۔خدا ذِي الْمَعَارِجِ ﴿٣﴾ (70:3) یعنی سیڑھی جو بظاہر سیدھی ہوتی ہے پہلے قدم سے درجہ بہ درجہ بلندی کی طرف، آخر پر پہنچ کر آپ وہاں نہیں پہنچے جہاں سے شروع ہوئے تھے۔آپ پستی کی منزل کو دور چھوڑ آئے اب بلندی پر ہیں۔

زندگی کے کسی منزل پر رک جانے کا نام جحیم ہے:

اگر زندگی درجہ بدرجہ آگے نہیں بڑھتی، کسی مقام پر رک جاتی ہے تو یہ جہنّم یا جحیم ہے۔ جحیم کے معنی ہی کسی ایک مقام پر کھڑے ہوجانا، رک جانا ہیں۔ مگر زندگی کا وہ سارا دائرہ ختم کرکے آپ پھر اس نقطہ پر آ کر کھڑے ہوجائیں تو قرآن کی رو سے یہ جحیم ہے۔ یہ تو اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ (9:17) یہ ہیں وہ لوگ کام تو بڑے مشقت والے، تکلیف والے کئے۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکے۔ کیونکہ وہ دائرے میں سفر کرتے رہے اور آخر میں اس نقطہ پر پہنچ گئے جہاں سے بات شروع کی تھی۔

نامہٴ اعمال کی برومندی کیلئے زراعت، فَلَاحَۃٌ اور فائزون کی قرآنی حیرت انگیز اصطلاحات:

جہاں قرآن نے نجات کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے مراد کسی آنے والی مصیبت سے بچائے رکھنا، محفوظ رکھنا، مصیبت میں پھنس جانے کے بعد اس میں سے نکالنا نہیں بلکہ شروع ہی سے اس سے محفوظ رکھنا۔ قرآن نے فائزون کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ فوزٌ یعنی حصول و تکمیل (Achievement)۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ (23:1) فلاح جو انسانی اعمال کے بانتیجہ ہونے کی ایک ایسی نازک حسین اور مکمل تشبیہ ہے۔ جسے ایک بدو بھی سمجھتا ہے اور آئن سٹائن بھی۔ فلاحت، زراعت کو کہتے ہیں زمین جس میں اگانے کی صلاحیت ہے جس میں نمود ونشوونما پانے کی صلاحیت ہے وہ انسانی زندگی ہے جہاں سے اس کی ابتداء ہوتی ہے کہا لو ان قوانین کی رو سے اس زمین کو تیار کرو۔ اس میں صالح بیج ڈالو۔ اس کی یوں رکھوالی کرو پانی، روشنی، حرارت، کھاد اور تمام زرعی قوانین کے مطابق اسے پروان چڑھاؤ۔ پھر آخر میں کیا ہوتا ہے؟ کیا وہ زمین ویسے کی ویسے رہ جاتی ہے جیسے اسے دی گئی تھی۔ نہیں، بلکہ ایک ایک دانے کے بدلے سات سات سو دانے، اس کے گھر میں آتے ہیں۔ تمام کوششیں ثمر بار اور برومند ہوجاتی ہیں۔ کھیتی بونے سے پہلے کے کسان اور کھیتی کاٹنے کے بعد کے کسان کی زندگی میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ قرآن نے اس زندگی کو زمین سے تشبیہ دی ہے اور بیج کو ایمان سے تشبیہ دی ہے یعنی اس بات کا یقین کہ ان بیج کے دانوں کو اگر قوانین کے تحت بویا جائے رکھوالی کی جائے تو ایک ایک خوشے سے کئی گنا بڑھ کر ملیں گے۔ اگر کسان کو یہ یقین ہو تو تب تو وہ محنت کرتا ہے اور گھر میں روٹی پکانے والے گیہوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے۔ اگر اسے کہہ دیا جائے کہ اس میں اگنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو وہ اس پر محنت نہیں کرتا وہ اس بیج پر محنت کرتا ہے جس کے متعلق اسے یقین ہو کہ اس میں بارآور ہونے کی صلاحیت ہے۔ یہ جو اس چیز کا یقین ہے۔ یہی تو ایمان کہلاتا ہے۔ بیج کے دانوں پر خالی یقین تو کچھ پیدا نہیں کرسکتا۔ یقین کے بعد وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے تحت محنت کرے گا۔ ان کاموں کو ان قوانین کے تحت، محنت کے کام اعمال صالح کہلاتے ہیں۔ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (103:3) سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔

حفاظتِ عصمت قرآن کے نزدیک سب سے زیادہ اہم

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۝۵ۙ اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ۝۶ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاۗءَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۝۷ۚ (23:5-6-7)

میاں بیوی کے عائلی زندگی اور جنسیاتی پابندیوں کے متعلّق موجودہ ریسرچ:

جن ممالک میں یہ ریسرچ ہورہی ہے ان میں پہلے کچھ پابندیاں تھیں جوان کواڑاتے چلے جارہے ہیں اوراس انتہا تک چلے گئے ہیں کہ جہاں حیوانی زندگی بھی نہیں ہے۔قرآن نے اس سے قبل ان جرائم میں ملوث ان لوگوں کی نشاندہی کی ہے جو بڑی مہذّب اورعلوم میں دسترس کے باوجوداس قسم کی خرابیاں کیوں پیدا ہوگئیں؟ اور یہ محقق اپنی قوم کواس آنے والی تباہی سے آگاہ کر رہے ہیں۔اس کے باوجود یہ بے باکیاں عام ہورہی ہیں۔مثلاً مغرب میں ہم جنسیّت کوقانوناً جائز قرار دیدیا گیا ہے۔سابقہ اقوام میں قوم لوط بس ایک قوم تھی۔ان کے شہر (Sodom) سدوم کے نام کالفظ جنسی بدنہادی کیلئے ابھی تک چلاآرہاہے۔یہ محقق چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ تباہ ہوجاؤ گے۔برباد ہوجاؤ گےقرآن نے اس کو جواہمیّت دی ہے وہ آج سمجھ میں آرہی ہے اور

لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۝۵ۙ (23:5) کوسب سے بڑی مومنوں کی خصوصیّت قراردی ہے۔

حفاظتِ عصمت قرآن کی نگاہ:

قرآن نے جہاں جہاں حفاظتِ عصمت کا ذکر کیا ہے ویسے تو مرداورعورت دونوں کا ذکر ہے۔لیکن پہلے مرد کا، پھرعورت کا ذکر کیا ہے۔سوسائٹی کے اعتبار سے سہی،لڑکیوں اورعورتوں کی عظمت کی اہمیّت تو بحرحال کچھ برقرار ہےقرآن نے پہلے مردوں کو مخاطب کرکے کہا کہ باہرنکلوتو نگاہوں کو بے باک ہونے نہ دو۔(124:30-31) اس کے بعدعورتوں سے کہا کہ وہ بھی باہر جائیں تو نگاہوں کو بے باک ہونے نہ دیں۔اب ان کیلئے حٰفِظُوْنَ۝۵ۙ (23:5) اور پھرجس کے ساتھ اِحْصَانٌ کالفظ آیا ہے اس سے مُّحْصِنِيْنَ (4:24) اور مُحْصَنٰتٌ ہے یعنی کسی چیز کومحفوظ کرنے والا جیسے قلعہ میں فوج قلعہ بند ہوکرمحفوظ ہوجاتی ہے یعنی اسی قدر شدت کی حفاظت۔جنسی اختلاط کی اجازت بذریعہ نکاح ہے اور مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ط (4:24) احصان تو حفاظت کرنیوالا اور مُسٰفِحِيْنَ (4:24) و(س ف ح) یونہی کسی چیز کو بہادینا۔ضائع کردینا۔بلامقصد کام۔

یہاں سے ان کو یہ نقطہ ملا کہ انسان کے اندرایسی انرجی ہے جسے محفوظ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے اوراسے صرف افزائش نسل کی بقا کا خاص مقصد قراردیا ہے۔

عصمت کے سلسلہ میں قرآن کی باریک بینی:

قرآن میں ''حٰفِظُوْنَ ۝۵ (23:5)'' کا لفظ آیا ہے اور مردوں کیلئے مُّحْصِنِیْنَ (4:24) اور عورتوں کیلئے مُحْصِنٰتٌ (ص زیر کے ساتھ) اور دوسرا مُحْصَنٰتٌ (ص زبر کے ساتھ) واقعی یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ مُحْصَنَۃٌ حفاظت کرنے والی اور مُحْصَنَۃٌ ص زبر کے ساتھ جس کی حفاظت کی گئی ہو یعنی وہ شادی شدہ باعصمت عورت یہ اس کے لیے بولتے تھے اور ص زیر کے ساتھ مُحْصِنَۃٌ وہ جو کنواری ہوتی تھی۔ غیر شادی شدہ تو اپنی عصمت کی حفاظت خود کرتی ہیں اور شادی کے بعد شادی اس کی حفاظت خود کر دیتی ہے یہ ہے فرق اس زیر اور زبر کا۔

"Sex and culture"by Dr.J.D Unwin کی سوشیالوجی کے نقطۂ نظر سے ایک تحقیقاتی کتاب ہے۔ اس نے دنیا کے تقریباً 80 معاشروں کے تہذیب وتمدّن کا مطالعہ کیا۔ پھر سولہ مہذب قوموں پر تحقیق کی اس نے نتائج کے لحاظ سے ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا۔

1۔ جس گروہ نے شادی سے پہلے کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تہذیب وتمدّن کی پست ترین سطح پر تھا۔

2- جس نے تھوڑی بہت پابندیاں عائد کی تھیں وہ تمدّن کی درمیانی سطح پر تھا۔

3۔ اور تمدّن کی بلند ترین سطح پر وہ لوگ تھے جو شادی کے وقت حفاظت عصمت کو اتنی اہمیّت دیتے تھے۔ اور ان میں جو پابندیاں نہیں رکھتے تھے۔ وہ اقوام زوال پذیر ہوگئیں۔ اس نے ''جنسی توانائی'' کیلئے Preservation کا لفظ استعمال کیا ہے جسے قرآن ''محافظین'' کہتا ہے۔

فرائیڈ کی تحقیقات:

ڈاکٹر انون نے سوشیالوجی کے نقطہ نگاہ سے سیکس پر تحقیق کی۔ ہمارے ہاں فرائیڈ نے نفسیاتی نقطہ نگاہ سے تحقیقات کیں۔ یہ دنیائے جدید اور قدیم میں جنسیات کا امام سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ فرائیڈ کی ان تحقیقات میں کچھ غلطیاں اور خامیاں رہ گئی تھیں تو اس کے مطابق جنسیات پر پابندیوں کا نتیجہ اس قوم میں قوّت فکر وعمل کا بہت بڑھ جاتا ہے۔ نیز محاسبہ خویش کی قوّت بھی یہ ہے اس کا ثمر بار ہونا۔ ان جنسی توانائیوں پر پابندی سے یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ہیں۔ جسے عمل تصعید (Sublimation) کہتے ہیں۔ یعنی ان کو پست مقصد کی بجائے بلند مقصد کیلئے استعمال کرنا یہ توانائی سائیکالوجی کی اصطلاح میں تصعید) کہلاتی ہے۔ کہتا ہے کہ یہ حصول لذت پست مقصد ہے اس سے ہٹ کر اگر اسے محفوظ کر دیا جائے تو یہ توانائی بڑے بلند مقاصد حاصل کرنے کیلئے استعمال کی جاسکتی ہے۔ اس طرح افراد کی یہ توانائی جنسی گوشوں سے ہٹ کر، ان گوشوں کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ جو تمدّنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔

674

هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ (23:5) ڈاکٹر انون کے آخری الفاظ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں ابدالاباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کیلئے ضروری ہوگا کہ پہلے وہ اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے۔ پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرے۔ جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے، کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدّنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشاں مستقبل کی حامل ہونگی۔ وہ تہذیب وتمدّن کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا۔ جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا اور یہ توانائیاں، اس کی ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کرتی جائینگی جو اس وقت ہمارے حیطہ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔

اصل جوہرشرف انسانیّت کا تخلیقی قوّت کا اظہار ہے:

تخلیقی توانائی یہی تو شرف انسانیّت ہے۔ حیوان تو تخلیق نہیں کرسکتا اس میں تو عملِ تولید ہے یعنی جنس اختلاط سے اس قسم کا ایک اور بچہ پیدا کر دینا جبکہ تخلیق میں تو جو دیا ہوا میٹریل ہو اس سے ایک نئی چیز پیدا کر دینا تخلیق کہلاتا ہے۔ جو خدا کیلئے مخصوص ہے۔ وہ خود احسن الخالقین ہے۔ وہ دوسرے خالقوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ جس قوم میں تخلیقی صلاحیتیں نہ ہوں تو وہ حیوانی سطح پر ہوتی ہے اس میں تولید ہوتی ہے جو حیوانی سطح کی چیز ہے۔ لَمۡ یَلِدۡ ۙ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ ۙ﴿۳﴾ (112:3) اس نے تمام ذی حیات کو تخلیق سے پیدا کیا ہے نہ کہ تولید سے۔ اس عمل سے تو پیدا کرنے والا کا ایک حصّہ وجود میں آ جاتا ہے اس طرح والا ناقص رہ جاتا ہے جبکہ تخلیق میں ایسا نہیں ہوتا ؎

ہر کہ اورا قوّتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر ساری دنیا میں مسلم قوم ایک حیرت انگیز انقلاب بر پا کر کے اتنی بلندیوں پر پہنچ گئی تھی۔ قرآن نے تولید کی خاطر خود ہی اس کے مواقع کا تعیّن کر دیا۔ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۚ﴿۶﴾ (23:6) صرف اپنی بیویاں اور ان لونڈیوں پر جو قرآن سے پہلے ان کی ملک میں تھیں مگر ان کو نکاح کے بعد ہم پلہ بیویوں کے قرار دیا جا چکا تھا۔ (47:43)

قوم کی جذباتی کیفیّت کی وجہِ جواز:

یہ قوم جو اتنی جذباتی ہوگئی ہے تو اس کا سبب ان جنسی توانائیوں کا ضائع کرنا ہے۔ جسے فریب دیکر ان کی شریعت نے اجازت دے رکھی ہے تو ایسی قوم جذباتی ہوتی ہے۔ اشتعال میں آ کر قانون شکنی کرتی ہے اگر غیر فعال ہو تو گنڈے، تعویز اور اکابر

پرستی پر چل پڑتی ہے۔

وہ قوم جو اپنی جنسی توانائیوں کو محفوظ رکھتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ ان کی کوششیں ثمر بار ہوتی ہیں اور اس توانائی کو صرف تولید کیلئے استعمال کرتے ہیں اور معاشرے سے ان غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کرتے گئے اور وحدت زوج کے اصول کو قانوناً بنیادی طور پر رکھا۔ اس میں یہ ایک کلیہ مستثنیٰ رکھا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں پھر ہر فرد کو اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ مرضی سے شادیاں کرتا چلا جائے۔ معاشرہ فیصلہ کرے گا۔ حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ جہاں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے تا کہ عورت کو حفاظت دیدی جائے۔ قرآن نے کہا کہ اس کے علاوہ دوسری کوئی شکل اختیار کرے خواہ یہ شریعت اسے قانون کا درجہ بھی دیدے تو وہ اس توانائی کو ضائع کرتا چلا جاتا ہے تو فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ (23:7) تو قوم سرکش، بے باک ہو جائے گی۔ حدود فراموش ہو کر کناروں کو توڑ دے گی پھر یہ دریا نہیں رہے گا بلکہ سیلاب بن جائے گا۔ اس کا ایک ہی مصرف ہے اور وہ ہے تولید۔ حیوانات کے اندر فطرت نے خود رکھ دیا۔ جب فطرت کا اشارہ ہو تو اس وقت یہ جنسی خواہش بیدار ہوتی ہے اور وہ اسے صرف تولیدی مقصد کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ صرف انسان کو چونکہ صاحب اختیار بنایا تو ذمہ داریاں بھی عائد کر دیں۔ بہار کا موسم آتا ہے تو ان کا جنون ابھر آتا ہے چاک دامانی کے یہی معنی ہیں۔ فرج چاک دامانی کیلئے عرب استعمال کرتے تھے۔ وہ اشارے کے اعتبار سے چاک دامانی کہتے تھے۔ غالب نے اسے وہیں سے لیا ہے ؎

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہئے

❁❁❁

قرآنی معاشرتی نظریۂ میثاق

A Quranic Social contract

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿٨﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿١٠﴾
الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١١﴾ (23:8-9-10-11)

امانات، معاہدات اور عالمگیر ضابطۂ اخلاق کے مروّجہ تصوّرات:

عام ترجمہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں جو اپنے وعدوں کا ایفا کرتے ہیں اور امانات کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ باتیں تو انفرادی طور پر ہونی ضروری ہیں۔ مگر بات اس سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ اب اس قسم کی جو اخلاقی پابندیاں قرآن نے بتائی ہیں۔ ان کیلئے کہا جائے گا کہ یہ تو دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ انہیں عالمگیر ضابطہ اخلاق ''Universal Ethics'' کہتے ہیں۔ مثلاً یہ چیز کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، دغا نہ دو، زنا نہ کرو، دھاندلی نہ کرو۔ یہ چیزیں تو تمام مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ تمام مہذب سوسائٹیز حتیٰ کہ وحشی قبائل میں بھی بہت سی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یہ یونیورسل ایتھکس کہلاتی ہیں۔ ابتدائً یہ بھی وحی پر ہی مبنی تھے۔ وحی کا رشتہ، نسبت تو پھر گم ہوگئی مگر یہ چیزیں باقی رہ گئیں۔ یہ عالمگیر اس لئے ہیں کہ قرآن کی رو سے ہر قوم میں، ہر زمانے میں، نبی آتے رہے اور وہ ان وحی پر مبنی اقدار کو عام کرتے رہے بعد میں وحی میں آمیزش ہوئی۔ یہ بنیادی اخلاقی اقدار تو ان معاشروں میں باقی رہیں۔ جو متوارث چلی آرہی ہیں۔ اسی اعتبار سے تو یہ وہی ہیں جو عام طور پر پائی جاتی ہیں اور جو آج دنیا میں موجود ہیں۔ جسے عالمگیر ضابطہ اخلاق کا نام دیدیا گیا ہے قرآن بھی یہی کہتا ہے کیونکہ وہ بھی تو وحی کی چیز ہے اور یہ ہونی چاہئے۔ مگر قرآن اس سے آگے جاتا ہے۔ اصل میں جہاں مذہب نہیں ہے وہاں بھی یہ اقدار پائی جاتی ہیں قرآن صرف ان بنیادی چیزوں کو دہرانے کیلئے تو نہیں آیا جو ایک غیر متبدّل اور قیامت تک تمام نوع انسانی کیلئے ضابطہ حیات ہے۔

قرآن وحی کی بنیاد پر ایک عالمگیر ضابطۂ حیات ہے:

قرآن تو امانات اور عہد کے متعلق بڑی خصوصیّت کی بات کر رہا ہے۔ ذہن اس سے آگے جاتا ہی نہیں ہے کہ یہ اپنی امانات اور عہد کی پابندی کرتے ہیں اس پر انسان مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے۔ یہ بڑی اچھی خصوصیّت ہے جس کے اندر بھی پیدا ہو جائے مگر بات اس سے بھی بہت آگے جاتی ہے۔ انسانی تمدّن کی تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ جب سے تاریخ کا پہلا دور آیا ہے اس دور سے یہ سوال وجۂ پریشانی ہے کہ قبائل کے معاشرہ میں نظام حکومت کسی قسم کا ہو اور خدا کی وحی نے اس کے متعلق کیا کچھ کہا؟ وہ پہلے جتنی بھی وحی آئی تھی۔ وہ تو اپنی منزّہ شکل میں باقی نہیں رہی اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا چیز آئی تھی؟ لیکن انسانی

کوششوں کی تاریخ وہ بتا رہی ہے کہ اس میں انسان ناکام وسرگرداں چلا آرہا ہے۔ اب اصل بات صحیح نظام حکومت کی ہے جس سے معاشرے میں امن وسکون اور فوز وفلاح ہو اور انسان روزمرہ کی پریشانیوں سے محفوظ ومطمئن ہوکر، کسی بلند مقصد کی طرف گامزنی کے قابل ہوتا ہے۔ جو صحیح نظام زندگی ہے۔ جسے آج کی اصطلاح میں نظام حکومت کہئے۔ وہ تو قرآن کے الفاظ میں، انسانی زندگی کا صحیح خطوط پر متشکّل کرنا تھا۔ جو ایک بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی تلاش میں یہ نوع انسانی کا قافلہ صدیوں سے مارے مارے پھرتا ہے اور اس نے اس کیلئے جو طریق بھی تجویز کیا۔ ناکام ثابت ہوا۔ پھر اسے چھوڑا پھر دوسرا تجربۃً اختیار کیا چنانچہ Trial and Error کا یہ سلسلہ اب تک مسلسل اور متواتر چلا آرہا ہے۔ انسان کی کوشش ہائے ناتمام ناکامیوں اور نامرادیوں کی سرگزشت ہے اب یہ آخری کوشش جس پر یہ نازاں وپراطمینان ہیں اور اس میں مزید بہتری نہیں ہوئی ہے۔

نظریۂ میثاق:

اب تک یہ حل کوئی تسلی بخش حل نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی مزید بہتری ہوئی ہے۔

انقلاب فرانس کے ذریعہ پیدا ہونیوالا نظریہ میثاق کو انسانی دنیا کا ایک سنگ میل اور معرکۃ الآرا نظریہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق حکومت یا ارباب نظم ونسق اور ملک کے عام باشندے یعنی رعایا، اپنے حقوق ان ارباب نظم ونسق کے سپرد کر دیتے ہیں یعنی یہ تمہاری obligations ہونگی اور اس کے بدلے میں یہ حقوق Rights دیئے جائینگے۔ تو ارباب نظم ونسق اس معاہدہ کی رو سے لوگوں کو کہتے ہیں کہ تم یہ چیزیں ہمارے حوالے کردو۔ سپرد کردو اور ہم یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ اس کے بدلے میں یہ کچھ کریں گے۔ گویا جو کچھ ان کو دیا ہے تو وہ حقوق کی شکل میں ان کی طرف لوٹاتے ہیں۔ جس کا عہد ومعاہدہ کرتے ہیں۔ اس معاشرتی نظریہ میثاق پر جمہوریت کے سارے نظام عمارت کی بنیاد استوار ہو رہی ہے اور اسے انسانی کوششوں میں آخری اور سب سے بڑی کوشش قرار دیا جا رہا ہے یہ کامیاب ہے یا نہیں اسے چھوڑیئے۔ لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ ابھی تک اس سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا نظام انسانی کوششوں نے ایجاد نہیں کیا۔ نظام وضع کرنے کے سلسلے میں اسے انسان کی آخری کوشش قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ نظریہ یونان قدیم سے چلا آرہا تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی میں یورپ نے اسے پہلی بار فروغ دیا۔ (1588-1679) Hobbes۔ لاک (1632-1704)(روسو (1712-1778)) اور یہ پہلی بار اس لئے کہی جا رہی ہے کہ انسانی تاریخ تو ان کے سامنے تھی مگر قرآن سامنے نہیں تھا۔ ان کا کیا قصور؟ قرآن ہم نے ان کے سامنے اس انداز سے پیش ہی نہیں کیا۔

قرآن کا پیش کردہ نظریۂ میثاق: The social contract of the Quran

قرآن نے یہ نظریہ ان جامع الفاظ میں پیش کیا قرآن نے اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَـنَّةَ ؕ (9:111) ایک طرف سے مومنین کی جان ومال اور دوسری طرف سے بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَـنَّةَ ؕ (9:111) اب دو پارٹیاں آگئیں جن کے درمیان یہ میثاق ہو رہا ہے۔ اب قرآنی تصوّر کی رو سے یہ ذمہ داریاں ''اللہ اور رسول'' یعنی یہ نظام اپنے ذمہ

لے لیتا ہے۔ رسول ﷺ اللہ کے بعد جانشینان رسول ﷺ وہ اس کے ارباب حل وعقد ہوتے ہیں۔ یہ نظام قرآن کے قوانین و احکام کو عملاً نافذ کرنے کیلئے متشکل ہوتا ہے۔ اس میں تو اشۡتَرٰی (9:111) یعنی خریداری والی بات ہے یہ کوئی ذہنی سودا نہیں ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مکہ والوں کی نیّت خراب ہوگئی تھی اور انہوں نے آپ ﷺ حج سے روک دیا تھا عثمانؓ کے متعلق مشہور ہوگیا کہ ان کو شہید کر دیا گیا۔ اب یہ موقع تھا کہ لوبھئی اب عہد کا وہ وقت آ گیا۔ مال تو پہلے سے دے رکھا تھا جو ضرورت سے زیادہ رکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اب جانوں پر عہد کی تجدید ہو رہی ہے۔ اب ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے جاتے یہ تھا سودا پکا کرنے کا طریقہ وتجدید۔ یہ سنگ اسود پر ہاتھ رکھنا پکے سودے کی شرط ہوتی ہے۔ اب قرآن نے کہا کہ ان کو بتادو کہ ان کے ہاتھوں کے اوپر رسول ﷺ کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ خدا کا ہاتھ ہے تو یہ بیع وشریٰ محسوس شکل میں سامنے آ گیا۔ اب وہ خریدار جس کی جانب سے یہ معاملہ کرنے کی اتھارٹی دے رکھی تھی۔ سامنے آ گیا۔ اب سودا کرنے کے بعد خریدار آ گیا۔ اس نے ان چیزوں کا قبضہ لے لیا۔ یہ تھیں وہ امانات جو انہوں نے اس کے سپرد کر دیں۔ اب ادھر سے یہ عہد ہے کہ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَـنَّةَ ‌ؕ (9:111)۔ یہ زندگی کا عملی ضابطہ ہے۔ جنّت اسی دنیا سے شروع ہوجاتی ہے یہ بیع وخرید کا معاملہ یہیں ہوتا ہے خدا نے ان کو اتھارٹی دے رکھی ہے جو یہ نظام قائم کرتے ہیں۔ جب ان سے کہا گیا۔ وَيَسۡـئَلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ (2:219) اب بات پکی ہوگئی۔ یہ چیز ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ گئی۔ اب وہ نظام اس کے عوض کیا دے گا؟ وہ اس دنیا کی جنّت۔ آخرت کی جنّت پر تو ایمان ہے لیکن وہ جنّت یہیں سے شروع ہوجاتی ہے اس میں فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ (2:38) مال تو ان سے وصول کر لیا۔ جہاں تک جان کا معاملہ ہے تو يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ‌ قف (9:111) اب جان وامانت تھی تو وہ میدان جنگ میں غازی یا شہید کے طور پر پیش کر دی۔

حاکم اور رعایا کا قرآنی مفہوم:

اب اس میثاق کے تحت جو ضرورت سے زیادہ تھا سب کا سب نظام کے حوالے کر دیا۔ اب رعایا یعنی subject ہیں تو استبداد ہے یہ تو محکومیت ہے قرآن اس نظام کے تحت رعایا اور حاکم میں فرق ہی کچھ نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لی ہوئی ہیں۔ مثلاً خدا نے یہ ذمہ داری لی ہوئی ہے۔ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا (11:6) یہ ہے وہ ذمہ داریاں جو یہ نظام اپنے سر لے لیتا ہے تو عمرؓ کو بھی کہنا پڑتا ہے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ اس کا ذمہ دار ہوگا۔ کہا کہ میرا فریضہ یہ ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔ لوگوں نے اس کی وضاحت چاہی تو کہا کہ جب تمہارا کوئی کام رکے گا تو تم دعا مانگو گے اور جب کوئی کام رکے گا نہیں تو پھر کیسے تم خدا سے میری شکایت کر سکو گے۔ یہ تھا سوشل کنٹرکٹ۔ اب اس جان و مال کے عوض ایسا معاشرہ جس میں سامان زیست کی فراوانیاں ہونگی۔ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَـنَّةَ ‌ؕ (9:111)۔

امانات کو لوٹانے کا قرآنی مفہوم:

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ﴿۸﴾ (23:8) یہ ہیں وہ جنہوں نے امانتوں اور معاہدوں کا پاس رکھا۔ امانات دے دیں تو لوگوں کی ان امانات کی پاسداری کریں گے۔ کیسے؟ وہ ان کے بدلے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کریں گے۔ یہ جان و مال امانت کے طور پر رکھتے ہیں۔ اگر لوگوں کے حقوق پورے نہیں کریں گے تو پھر ان کو امانات رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جس طرح ایک یہودی غیر مسلم نو وارد کو عمرؓ نے گورنمنٹ کے واجبات ادا کرنے سے منع کر دیا تھا جب تک تمہارے لئے اتنا کچھ نہ کر دیں پھر جا کر واجب الاداد دینا۔ اب جان و مال دینے کے بعد اس عہد کا دوسرا حصّہ جو خدا کے ذمہ ہے وہ رہ گیا۔ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ (9:111) خدا سے بڑھ کر کوئی اور اپنے عہد پورا کرنے والا نہیں ہوتا۔ آگے کہا فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِىۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ‌ ؕ (9:111) اس معاہدے پر جشن مسرت مناؤ۔ کیونکہ جو معاہدہ کیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اور پورا ہوتا چلا جائے گا۔

دراہم چند دادم جاں خریدم تعالیٰ اللہ عجب ارزاں خریدم

(مولانا جامیؒ)

فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ (9:111) اس سستے سودے پر خوشیاں مناؤ!۔

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ﴿۸﴾ (23:8) یہ نظام، یہ حکومت ان امانات اور اپنے معاہدوں کی بڑی پاسداری کرتے ہیں۔ اب یہ بات انفرادی وعدہ یا امانت کی نہیں ہے بلکہ یہ تو اس عالمگیر نظام حکومت کی ہے جو نوع انسانی کو قرآن سکھانے آیا تھا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ نظام حکومت کیا ہوتا ہے۔ اب الۡجَـنَّةَ‌ ؕ (9:111) کا کیفیّت کیا ہوگی۔ لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآءُوۡنَ خٰلِدِيۡنَ‌ ؕ (25:16) جو مانگو گے ملے گا۔ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعۡدًا مَّسۡـُٔوۡلًا ﴿۱۶﴾ (25:16) بفرض محال اگر یہ پورا نہ ہو تو تم خدا سے بھی پوچھ سکتے ہو یعنی ان لوگوں سے جو اس نظام کے ارباب حل وعقد ہیں۔ تو ان کا ہر وعدہ مسئول ہوگا۔ کیونکہ یہ جماعت عَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ (23:8) شرط یہ ہے۔

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ (2:40) تم اپنا عہد پورا کرتے جاؤ تو ہم اپنا عہد تم سے پورا کرتے چلے جائینگے۔ اب دونوں میں سے کسی نے عہد پورا نہ کیا تو سودا کٹ گیا۔ اب سے نظام امانت لیکر اس کے عوض حقوق پورے کرے گا۔ یعنی جب ہم عہد کریں گے تو پھر ہم بطور امانت لیں گے۔ اس سے پہلے ہماری ملکیت میں نہیں آ سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهۡلِهَا ۙ (4:58) یعنی ان امانات کو لوٹاتے جاؤ ان لوگوں کی طرف یعنی عہد پورے کرتے جاؤ کیسے؟ وَاِذَا حَكَمۡتُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ‌ ؕ (4:58) یعنی فیصلے عدل کی رو سے، قرآن سے ہونگے۔ آگے کہا يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ‌ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ (4:59) اب مرکزی حکومت کا فیصلہ وہ آخری فیصلہ ہوگا۔

اس نظام کی تشکیل کے دوران مشکل گھاٹیاں:

اب سوال یہ ہے کہ خیانت کی طرف مائل کرنے والی چیزیں کیا ہیں۔قرآن کوئی چیز بھی ادھوری، مبہم نہیں چھوڑتا بلکہ اسے وہیں کا وہیں صاف کر دیتا ہے۔ کہا یاد رکھو کہ اس راستے میں کچھ تھوڑی سی رکاوٹیں بھی آئیگی یہ ہیں وہ پھسلتی گھاٹیاں جہاں انسان لغزش کھاتا ہے۔وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ۙ (8:28) یہ مال واولاد کی ہوس خیانت پر اکساتی ہے ان سے محتاط رہنا۔اس میں عوام اپنی چیزوں کو بطور امانت اس پارٹی کے سپرد کر دیتے ہیں اور دوسری طرف سے یہ پارٹی ان کے حقوق پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔ یہ ہے وہ نظام مملکت جو قرآن دیتا ہے۔تنہا عقل کے زور پر یہ لوگ قابل قدر ہیں جو اس نظریہ تک جا پہنچے حالانکہ یہ میثاق آگے چل کر فیل ہو گیا۔ان کو اس کیلئے بھی جذبہ محرّکہ نہ ملا اور یہ چیز میکانکی طور پر بھی نہیں ہو سکتی ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جذبہ محرّکہ تو صرف قرآن عطا کرتا ہے۔جن سے یہ چیزیں دل کا تقاضا بن جائیں۔الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ (23:2) یہ فرائض منصبی کو دل کے جھکاؤ کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿ۙ۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾ (23:10-11) یہ ہیں کشاد اور وسعتوں والی زندگی جو خیرات کے طور پر نہیں بلکہ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ (7:43) یہ تو تمہارے اپنے اعمال کا صلہ ہے ؎

جنّت تیری پنہاں ہے تیری خون جگر میں

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ (9:111) ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾ (23:11) اس میں سے کوئی نہیں نکالے گا کیونکہ یہ تو تمہاری محنتوں کے عوض ملی ہے۔اور اس عہد کے عوض۔

Evolution of Man ''حیوان اور انسان میں فرق''

(زندگی کی ابتداء)

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۚ﴿۱۲﴾ (23:12)

سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۚ﴿۱۲﴾ (23:12) مرحلہ اوّل:

زمین کا آگ جیسا گولہ سورج سے الگ ہونے کے بعد اتنا زیادہ گرم تھا کہ اس کے ایٹمز مرکبات نہیں بنا سکتے تھے۔ جب بتدریج اس کا درجہ حرارت گر گیا کہ ایٹمز سے مرکبات کا بننا ممکن ہو گیا۔ تو زمین کی باہر کی تہہ میں ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن کے ملاپ سے جو مرکبات وجود میں آ گئے۔ پانی، امونیا، میتھین (گیس جو ایندھن کے طور پر استعمال ہوتی ہے)۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ، ہائیڈروجن سی اے نائیڈ، (HCN) ہائیڈروجن مالیکیول۔

جب زمین مزید سرد ہوئی تو ہوا کا پانی جم کر بارش برسنے لگی۔ یہ بارش ان مرکّبات کو بہا کر سمندروں میں لے آئی۔ سمندر میں ان مرکّبات کے علاوہ مزید اضافہ معدنیات کا ہوا۔ یہ کہاں سے آئے؟

1- دریاؤں کا پانی پتھریلی زمین سے ٹکراؤ کی وجہ سے ان کو سمندر میں لے گیا۔

2- سمندر کا پانی ساحل سے ٹکرا کر ان کو اپنے اندر جذب کرتا گیا۔

3- سمندر کے اندر لاوا پھوٹتا رہا چنانچہ یہ چھ مرکّبات بمع معدنیات ساحل سمندر کی مٹی میں جذب ہوتی گئیں۔ یہی بعد میں سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۚ﴿۱۲﴾ (23:12) بنیں جن سے زندگی کی ابتداء ممکن ہوئی۔

زندگی کی ابتداء میں پانی اور دیگر ابتدائی ایٹمز اور مرکّبات کا کردار:

زندگی پانی کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی وجوہات یہ ہیں۔

1- بے جان مادہ اور زندگی (Inorganic and organic) خیز مادہ دونوں پانی میں آسانی سے حل ہو سکتے ہیں۔

2- پانی کے اندر الیکٹرولائٹس (برق) پوشیدہ ہیں۔ یہ پانی میں بجلی کی روگزرنے میں مدد دیتے ہیں۔

3- پانی کا Surface tension زیادہ ہوتا ہے۔

4- پانی میں گرمی جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ H اور O کا ذریعہ ابتداء میں پانی تھا۔ یہ دونوں ایٹمز زندہ اجسام کی تعمیر میں عمارتی اینٹوں کا کام کرتے ہیں۔ لیکن کرہ ارض بننے کے بعد O_2 کے ایٹمز باہمی ملاپ سے پانی بن کر ناپید ہو گئے۔ پانی نے زندگی کا دروازہ کھولا۔ زندگی کی نمود کے بعد بھی پانی کا حصّہ زندگی کے قیام کیلئے ضروری ہے۔ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ ؕ

(21:30) وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (11:7) (اس نے زندگی کی بنیاد پانی پر رکھی) اس کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔

زندگی کی بنیاد میں کاربن کا رول سب سے بڑھ کر ہے۔ اس کی Valency چار ہے اور دوسرے مفردات سے مل کر مرکبات بنانے میں اس کا ثانی نہیں۔ چنانچہ میتھین جیسے مرکبات نے دوسرے مرکبات سے مل کر بہت پیچیدہ مرکبات (Organic compounds) زندگی خیز مرکبات پیدا کر کے زندہ مادہ کی پیدائش کے ارتقائی مراحل میں ایک اہم رول ادا کیا۔

دوسرا مرحلۂ ارتقاء سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (23:12) کا:

اس مرحلہ میں (زندگی خیز مرکبات) کے جو بے شمار مرکبات معرض وجود میں آئے ان میں سے پانچ ارتقائی مراحل کے لحاظ سے اہم ہیں۔

Sugars-1

Glycerines-2

Fatty Acids-3۔ چربی والا تیزاب

Amino Acids-4۔ امائنوایسڈز

Nitrogen Bases-5

ان میں کاربن کی زنجیر کے ساتھ نائٹروجن کے بنیادی مرکبات اور N2 موجود ہیں۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے بلکہ لیبارٹریوں میں تجربات کر کے ان کو مسلّمہ کے طور پر مانا گیا ہے۔ کتاب ''Origin of Life'' مصنف (Oparin)۔

کیمیائی ارتقاء کا تیسرا مرحلہ:

کیمیائی عمل کیلئے انرجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب زمین کی ارتقائی ابتداء میں جو مرکبات بنے تو ان کیلئے انرجی کہاں سے آئی؟ ابتدائی زمین صدیوں تک بادلوں سے گھری رہی۔ بادلوں کے اندر بجلی اس کیمیائی ارتقاء کیلئے بجلی مہیا کرتی رہی۔ اب ان ابتدائی مرکبات کے تعامل سے زیادہ پیچیدہ مرکبات پیدا ہوئے جو later organic compounds کہلاتے ہیں۔ ان میں پانچ بڑے گروپ پیدا ہوئے جن کے ملاپ سے زندگی کی نمود ہوئی۔

Adenosine phosphates-1

Polysaccharides-2

Fats -3

Proteins -4۔ لحمیات۔

Nuclic Acids-5۔

کیمیائی ارتقاء کا وہ مرحلہ جو زندگی کا پیش خیمہ بنا:

اب کیمیائی ارتقاء کا دلچسپ مرحلہ جس میں زندگی کی نمود ہوئی اور انہی سات مرکبات سے زندگی کی اکائیاں یا Cell پیدا ہوئے۔ خلیہ زندگی کی بنیادی اکائی کا نام ہے یہ خوردبین سے نظر آنے والا قطرہ ہے۔ جس میں اوپر بیان کردہ سات مرکبات موجود ہیں۔ خلیات یا سیلز کی پیدائش کے بعد بھی کیمیائی ارتقاء جاری رہا۔ سالمات سے پھر نئے سالمات بنتے رہے۔ لیکن زندگی خیز سالمات کے اندر ایک نئی تخلیق وجود میں آئی۔ جس میں زندگی کی خصوصیات موجود تھیں۔ ابتدائی خلیات 20 کروڑ سال پہلے نمودار ہوئے۔

سیلز یا خلیوں کی ابتداء:

زندگی خیز مادہ (Organic Matter) لیس دار قطروں کے اندر جمع ہوگیا۔ سادہ مرکبات شوگرز، گلیسرینز اور امائنو ایسڈ وغیرہ مٹی کے مساموں میں جمع ہوگئے اور وہاں باہمی تعامل سے پیچیدہ مرکبات بنے۔ جب نیوکلک ایسڈ بن گئے تو اس کے بعد پروٹینز کی تعمیر شروع ہوگئی۔ تو ایسا آمیزہ جس میں روغنیات اور پروٹین ہوں ان میں فلم یا جھلی بنانے کی خاصیت ہوتی ہے۔ چنانچہ ساحل سمندر کی مٹی کے مساموں کے اندر جمع شدہ مادہ کے باہر جھلی بن گئی اور اندر کی طرف دھاگے نمودار ہوئے۔ اب اس جھلی کے اندر ساتوں اجزاء پانی، معدنیات، اے پی ٹی، پالی سکرائیڈز، روغنیات، پروٹینز اور نیوکلی اک ایسڈ بند ہوگئے۔ اس طرح سے یہ اکائیاں سیل یا خلیے بن گئے۔ اب چونکہ ان کے گرد حفاظتی جھلی بن چکی تھی۔ اس لئے یہ دوبارہ پانی کے اندر بہہ جانے کے بعد بھی محفوظ رہے کیونکہ اب ان کے اجزاء کے بکھر جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ نامعلوم ان سات مرکبات کو جمع ہونے میں کتنی دیر لگی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمام اجزاء متوازن مقدار میں جمع ہونے اور خلیہ بننے کے آخری مرحلہ پر پہنچنے سے پہلے کئی مرتبہ دوبارہ سمندر میں بہہ گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام مراحل کے بعد بالکل خشک ہوگئے ہوں۔ تاہم لاکھوں سالوں کی بار بار غلط ابتداء اور نامکمل اختتام کے بعد کچھ خلیے ساحلی مٹی سے سمندر کے پانی میں صحیح سالم داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ جس قسم کا کیمیائی مواد سمندر کے پانی میں جمع ہوا تھا اس کے بعد خلیوں کا معرض وجود میں آنا اتفاقی بات نہیں تھی ایسا ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ اس طرح کائنات کی تخلیق کے دو ادوار قرآن جن کو ''یومین'' کہتا ہے مکمل ہوگئے اور خلیوں کی ابتداء سے زندگی کی ابتداء ہوئی۔ اس کے بعد چار ادوار وہ ہیں جن میں زندہ اشیاء کی ارتقاء کے چار مراحل طے ہوئے۔ بالآخر ارتقاء انسان کی تخلیق تک جا پہنچی اسے قرآن اربعۃ ایام یعنی چار ادوار کہتا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ (18:54) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (40:67) بے جان مادے سے کی ۔وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا (25:54) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ (6:2) گیلی مٹی، گارے۔اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ⑪ (37:11) چپکتے گارے سے۔مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ⑫ (23:12) ابتداء مٹی

کے خلاصہ سے کی۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ كَالۡفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ (55:14) ایسا کیچڑ جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ (15:26) سیارہ گارے سے جو بہت سن رسیدہ ہو گیا تھا۔ مٹی کا خلاصہ وہی سات کیمیائی اجزاء جو ساحلی گارے میں جذب ہو گئے اور جن کے باہمی عمل سے پھر خلیوں کی تعمیر ہوئی مٹی کے اس خلاصہ نے کروڑوں سالوں میں کتنے مراحل طے کئے پھر یہ زندگی کی نمود کے قابل ہوا۔ اس کے بعد کرہ ارض پر کتنے مراحل اربوں سالوں میں طے ہوئے جس کے بعد انسان کی تخلیق ہوئی۔

حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۶﴾ (15:26) مسنون، سن رسیدہ، پرانا، حَمَاٍ (15:26) وہ گارا جو دھوپ اور دیگر طبیعاتی قوتوں کی وجہ سے سیاہ ہو چکا تھا اور اس کی حالت بدل چکی تھی لیکن سڑا ہوا گارا نہیں اس کا ترجمہ سڑا ہوا گارا غلط ہے۔ سڑاند زندگی کی نمود کے بعد پیدا ہوئی۔ سڑاند جراثیم کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ جو زندہ اشیاء ہیں اور اس وقت تو زندہ اشیاء موجود ہی نہیں تھیں۔

خلیہ:

اس میں بنیادی چیز کروموسومز ہیں۔ جو پروٹین اور نیوکلیک ایسڈ سے بنے ہوتے ہیں۔ نیوکلیو پروٹین کا زیادہ اہم نیوکلیک ایسڈ DNA اور دوسرا RNA ہے کروموسومز میں GENE کام کرتے ہیں۔ یہ خلیہ کے اندر سارے اعمال کو کنٹرول کرتے ہیں۔ انسان کے خلیہ میں 46 کروموسومز ہوتے ہیں۔ ہر زندہ شے ایک خلیہ یا کروڑوں خلیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ خلیہ کا سائز چند مائیکرو ملی میٹر ہوتا ہے۔ اس (ملی میٹر کے ہزارواں حصہ) میں خام مادے سے خوراک پیدا کرنے کی فیکٹریاں موجود ہیں۔ پروٹین جو زندہ جسم کا بلڈنگ میٹریل ہے اس کو جوڑنے کا عمل بھی جاری ہے۔ ان میں رطوبتیں پیدا کرنے کا عمل بھی موجود ہے یعنی مشین کو موبائل آئل مہیا کرنے کا عمل کہہ سکتے ہیں۔ نشاستہ بنا کر اسے سٹور کرنے کا عمل۔ اس خلیہ میں عمل تولید کا مادہ بھی موجود ہے اور ٹرانسپورٹ کا عمل بھی موجود ہے۔ جو خلیہ سے باہر سے مادہ کو الٹا کر اندر لاتا ہے اور فالتو گلے سڑے مادے کو اٹھا کر خلیہ کے باہر پھینکتا ہے۔ اس تمام فنکشنز کو توانائی کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ خلیہ کے اندر سانس کا عمل یعنی آکسیجن کی سپلائی کا خودکار نظام موجود ہے صانع ازل کی صناعی ملاحظہ کرتے جایئے اور جھومتے جایئے۔ وَاِنَّ لَكُمۡ فِى الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً‌ ؕ نُسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِىۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيۡنَ ﴿۶۶﴾ (16:66)۔ ''ان کے پیٹوں میں جو فضلات اور لہو کے درمیان ہے خالص دودھ پینے والوں کیلئے خوشگوار ہے''۔ بعض نے اس سے فَرۡثٍ (16:66) سے مراد فضلہ یا خوراک جو چبانے کے بعد اوجھڑی میں چلی جائے، مراد لیا ہے۔ قرآن نے دودھ کو فَرۡثٍ (16:66) اور لہو کے درمیان ایک الگ چیز کہا ہے چنانچہ نہ تو یہ فضلات جن کو Excretion کہتے ہیں۔ یعنی بول براز وغیرہ اور نہ ہی یہ خون ہے بلکہ یہ ایکسریشن تو بے کار شے ہوتی ہے۔ لیکن سیکریشن (Secretion) کارآمد شے ہوتی ہے۔ مثلاً منہ کے غدود تھوک اور معدے کے غدود رطوبت بناتے ہیں۔ خلیے مادہ منویہ بناتے ہیں۔ یہ چیزیں بے کار نہیں ہیں بلکہ ایک خاص مقصد کیلئے ہیں اس طرح دودھ بھی سیکریشن (Secretion) ہے۔

تولید:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ (35:11)اس میں تولیدی خاکہ کے تین مراحل بتائے ہیں۔ پہلا مرحلہ تخلیق کی ابتداء بے جان مادہ سے کی۔ دوسرے میں زندگی کی اکائیوں نے اپنے آپ کو حصّوں میں تقسیم کیا اور تیسرے میں تولیدی کا عمل ازواج جوڑوں کے باہمی ملاپ سے شروع ہو گیا۔

زندہ اجسام کی تولید:

واحد خلیہ کی تولید سالمات کی تقسیم اور خلیہ کی تقسیم پر مشتمل ہے لیکن کثیر الخلایہ اجسام کی تولید دو مرحلوں میں ہوتی ہے۔

1-ایک تولیدی اکائی کی اپنے ماں باپ سے علیحدگی۔ 2-علیحدگی کے بعد تولیدی اکائی سے نئے جسم کی تعمیر کثیر الخلایہ حیوانات اور نباتات کی تولید یا Asexual (بلا صنف) ہوتی ہے Sexual بذریعہ صنف ہوتی ہے۔

بلاصِنف تولید: (Asexual Reproduction)

یہ تولید والدین کے جسم سے کوئی تولیدی حصّہ علیحدہ ہوئے بغیر عمل میں آتی ہے۔ ایسا تولیدی عمل بے شمار نباتات اور چھوٹے درجہ کے حیوانات میں موجود ہے۔ مثلاً پیرامیشیم ایک واحد خلیہ پر مشتمل جاندار شے ہے اس میں عمل تولید یا مثنیٰ انشقاق (Binary Fission) کے ذریعہ ہوتا ہے اور پورے کا پورا خلیہ ایک تولیدی اکائی ہے۔ بعض جانوروں میں تولید بلا صنف چوٹ لگنے کے بعد بھی عمل میں آتی ہے۔ مثلاً ایک کیچوے کو درمیان سے کاٹ کر دو یا زیادہ حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ہر حصّہ نشوونما پا کر پورا جانور بن جاتا ہے یہاں جانور کے جسم کا حصّہ تولیدی اکائی بن جاتا ہے۔ گویا اس کے جسم کے حصّوں میں پورا جانور بننے کی مشینری موجود ہوتی ہے۔

تولیدِ باصنف: (Sexual Reproduction)

یہ ایک عالمگیر واقع ہے کہ ایک نئے کثیر الخلایہ جانور یا پودے کی تولید کیلئے وہ اکائی جس کے اندر تولید کا پورا ساز وسامان موجود ہو ایک واحد خلیہ ہوتا ہے قرآن اسے نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (7:189) کہتا ہے۔ تولیدی اکائیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔

1-ایک وہ جس میں خلیے کثیر العناصر انشقاق کی طرز پر تقسیم ہوتے ہیں۔ اور ہر ڈاٹر سیل یا بعد از تقسیم بڑھ کر جوان خلیہ بن جاتا ہے۔ اس قسم کے خلیہ کو Spore، بَذْرَہ یا تخمک کہتے ہیں۔ یہ نباتات میں عام ہیں اس تولید کو Sporulation کہتے ہیں۔

2- تولیدی خلیوں کی دوسری قسم وہ ہے جو براہ راست نئے کثیر الخلایہ اجسام میں نہیں بدل سکتے ان کو ایک صنفی عمل میں سے گزرنا پڑتا ہے جس میں دو خلیے مل کر ایک تولیدی اکائی بناتے ہیں۔ ان خلیوں کو Gametes نسبتی خلیے کہتے ہیں۔ ان خلیوں کے ملاپ کے عمل کو جفتہ سازی یا Fertilization کہتے ہیں اور ملاپ سے جو خلیہ بنتا ہے اسے Zygote (جفتہ) کہتے ہیں۔ اب یہاں تولیدی عمل کے دو مرحلے ہیں۔ 1-نر اور مادہ کے نسبتی خلیوں کا بننا۔ 2-دونوں نسبتی خلیوں کے درمیان جفتہ سازی کے عمل سے ایک تولیدی اکائی یا جفتہ کا معرضِ وجود میں آنا۔ قرآن نے نفس واحدۃ کہا ہے۔ چنانچہ یہ ارتقا کا وہ مرحلہ ہے جہاں تولیدی عمل دو نسبتی خلیوں (نر اور مادہ) کے ملاپ سے جن کی صنف مختلف تھی، شروع ہوا۔ یہ دو نسبتی خلیے ایک دوسرے کے زوج بن گئے۔ اب دوسرا

674

مرحلہ وہ ہے جہاں خلیہ یا قطرہ آب خود تولیدی اکائی بن گیا اور اس سے دوسرے خلیے پیدا ہونے لگے اور تیسرا مرحلہ وہ جہاں نسبتی خلیے نر اور مادہ معرض وجود میں آئے اور وہ ایک دوسرے کے زوج بن گئے اور ان کی باہمی جفتہ سازی سے جفتہ خلیے بننے شروع ہو گئے۔ اوپر تولیدی عمل کی تینوں شکلوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ جو اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔

Vegetative-1۔ یعنی وہ عمل جس میں خلیے ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ تقسیم ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل واحد خلیے والے حیوانات و نباتات میں عام ہے۔ اس میں تولید کا عمل نہایت تیز ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جراثیم ہر دس منٹ کے بعد دو جراثیم بنا دیتا ہے۔

Gametes (ga, meet) A mature sexual reproductive cell having a single set of unparied chromosomes.

Spore Formation-2:۔ (بذرہ سازی) ان جانداروں میں پائی جاتی ہے۔ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ چل کر نہیں جا سکتے۔ چنانچہ یہ تولیدی عمل دور دراز علاقوں میں پھیلنے کا ذریعہ ہے۔ Spore (بذرہ) پانی میں تیر کر دور تک جا سکتا ہے لیکن زمین کے اوپر اس کے باہر خول بن جاتا ہے تاکہ یہ خشک نہ ہو سکیں اور یہ ہوا اور پرندوں کے ذریعہ دور دراز علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔

Gemetic Reproduction-3، جفتہ سازی کا تولیدی عمل:

اس میں نقائص بھی ہیں۔ پہلا نقص یہ ہے کہ دو نسبتی خلیے نر اور مادہ اتفاقاً ایک دوسرے سے ملتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں نر خلیوں میں سے کونسا مادہ خلیے سے ملاپ کرتا ہے چنانچہ باقی تمام ضائع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عورت اور مرد کے ملاپ سے بھی لاکھوں کی تعداد میں نر خلیے ضائع ہو جاتے ہیں اور صرف ایک نر خلیہ مادہ خلیہ سے مل کر جفتہ بناتا ہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ نر خلیہ کو مادہ خلیہ تک پہنچنے کیلئے دور فاصلے پر جانا پڑتا ہے۔ تیسرا یہ کہ جفتہ سازی کیلئے واٹر میڈیم کی ضرورت ہوتی ہے یعنی نر خلیہ کو تیر کر مادہ خلیے تک پہنچنا ہوتا ہے۔ لیکن ایک چیز کا بڑا فائدہ ہے ان نقائص کے باوجود۔

(Sex) صنف کی حقیقت:

Zygote= (The union of sperm and ovum is fertilised ovum)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سیکس افزائش نسل کیلئے ہے۔ گو حیوانات اور نباتات میں عام طور پر صنف اور افزائش نسل ایک ساتھ پائے جاتے ہیں مگر دراصل صنف، ماحول کا مقابلہ کرنے کیلئے وجود میں آئی۔ بے شمار چھوٹے درجہ کی زندہ اشیاء میں افزائش نسل تو ہوتی ہے مگر صنف ان میں نہیں ہوتی۔ جوہڑ میں دیر تک پانی کھڑا رہنے سے سبز رنگ کی کائی جو ایک ابتدائی قسم کا پودا ہے، جم جاتی ہے۔ کائی کے ایک تنکے میں خلیوں کی قطار ہوتی ہے۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک تنکا بناتے ہیں گرمیوں میں یہ خلیے دو سے چار ہو کر بڑھتے جاتے ہیں لیکن سخت سردی میں نشوونما رک جاتی ہے اور پودے کے مرجھانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ پودے کی نسل کو مستقبل میں جاری رکھنے کیلئے دو تنکے آپس زوج بن کر ایک دوسرے کے پہلو میں آ جاتے ہیں دونوں کے ملاپ سے ایک

تھیلی بن جاتی ہے۔جس کے باہر ایک سخت خول پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی سردی سے حفاظت کرتا ہے چنانچہ سردی سے دونوں پودے مردہ ہو جاتے ہیں صرف Cyst باقی رہ جاتی ہے اور موسم بہار میں اس Cyst (تھیلی) سے نیا پودا باہر نکلتا ہے اور نئی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے جب انفرادی طور پر دو پودے ماحول کا مقابلہ نہ کر سکے تو دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔

تخفیفی انشقاق:Meiosis

نوع انسانی کی ہر نسل میں لونیوں کی تعداد 46 ہوگی۔ چنانچہ جب عورت یا مرد کے نسبتی خلیوں میں بھی (Gametes) ہر ایک میں 46 ہے تو اس صورت میں ایک نر نسبتی خلیہ جب مادہ نسبتی خلیہ سے ملاپ کرے گا۔تو اس کے بعد جفتہ (Zygote) میں لونیوں کی تعداد 92 ہو جائے گی۔46 نر خلیہ سے اور 46 مادہ خلیہ سے اس نے اگلی نسل میں پھر دو گنے ہو کر 184 ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہر نسل میں لونیوں کی تعداد ایک ہی رہے گی۔ ہر نسل میں لونیوں کی تعداد دگنا ہونے کے عمل میں ایک خاص قسم کی خلیوں کی تقسیم سدراہ ہوتی ہے۔اس عمل کو Meiosis کہتے ہیں۔

نر اور مادہ کے تولیدی اعضا خصیہ اور اوری میں جو خلیے ہوتے ہیں ان میں Gametes یا نسبتی خلیے سے پہلے پختگی کا عمل ہوتا ہے۔

جفتہ کے اندر نر اور مادہ دونوں کے مورثے موجود ہوتے ہیں۔اس جفتہ میں نشوونما پا کر نر بھی بن سکتا ہے اور مادہ بھی۔انسان میں بھی اس سے لڑکا یا لڑکی پیدا ہو سکتی ہے اس جفتہ کو قرآن نے نفس واحد کہا ہے۔خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (4:1) اس نے تمہیں ایک خلیہ سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا زوج بنایا۔

جنین (Embryo) کی نشوونما:

مادہ خلیہ کی بار آوری یعنی جفتہ بننے کے تین ہفتہ بعد جنین ریت کے ایک موٹے دانے کے برابر ہوتا ہے چار ہفتہ بعد آنکھوں کی حد تک بن چکی ہوتی ہے اور دل حرکت کر رہا ہوتا ہے پانچویں ہفتہ میں بازوؤں اور ٹانگوں کے ابھار نمایاں ہو جاتے ہیں اور کان بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔گویا اعصابی نظام بھی بن چکا ہے آٹھویں ہفتہ میں انسانی شکل پہچانی جا سکتی ہے۔اس وقت اس کی لمبائی ایک انچ کے قریب ہوتی ہے اس مرحلہ تک اسے Embryo کہتے ہیں۔اس کے بعد مراحل Fetus کہلاتے ہیں اردو میں ایمبریو اور فیٹس دونوں کو جنین کہتے ہیں۔ہم Fetus کو بچہ کہیں گے بارہویں ہفتہ تک کان اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔باو آوری سے 5 ماہ بعد بچہ آٹھ انچ لمبا ہوتا ہے۔اس کا وزن قریباً ایک پونڈ ہوتا ہے اور اس کا چہرہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝١٢ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝١٣ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝١٤ (23:12-13-14) ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتداء مٹی کے خلاصہ سے کی (پھر یہ پروگرام اس کڑی تک جا پہنچا) پھر

674
اس کو محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر نطفہ کو علقہ بنایا اور اس سے مضغہ پھر ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھار کر اس پر گوشت کی تہہ چڑھا کر اسے خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ (23:14) کر دیا۔ یہ ہیں وہ مراحل، ایک میں تو کیمیائی ارتقاء کے بعد بے جان مادہ کے اندر زندگی نمود ہوئی پھر صنف پیدا ہوئی۔ پھر نر اور مادہ کے ملاپ سے بارآور مادہ خلیے کی نشوونما رحم مادر میں شروع ہوئی۔ یہ مراحل بتدریج طے ہوتے گئے۔ آخر میں یہ مخلوق جو حیوانات سے یکسر مختلف ہے اس میں توانائی کا کرشمہ دیکر بالکل نئی شکل دیدی۔

علقہ:

ترجمہ علقہ کا جونک کی شکل، لوتھڑا یعنی وہ خون جو بالکل خشک ہو گیا ہو۔ دوسروں نے جما ہوا خون۔ ابن فارس نے بنیادی معنی ''کسی بلند چیز کے ساتھ کسی چیز کو باندھ دینا یا وابستہ کرنا'' یہ معنی درست ہے۔ علقہ وہ مرحلہ ہے جب بلاسٹوسسٹ (Blasto cyst) بیضہ نالی کے اندر سے گزر رہی ہوتی ہے اس وقت بلاسٹوسسٹ (Cyst) کا تعلق ماں کے خون کے ساتھ نہیں ہوتا اور نہ ہی خود اس کے اندر کوئی خون ہوتا ہے۔ یہ خلیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لئے کا اس ترجمہ خون یا لوتھڑا کرنا غلط ہے۔ علقہ سے مراد، معلق، لٹکی ہوئی چیز۔

بلاسٹوسسٹ: (Blasto cyst)

یہ وہ چیز ہے جس میں جفتہ (نفسِ واحد) حصّوں میں تقسیم ہونے اور قدرے نشوونما کے بعد بیضہ نالی کے اندر سے رحم کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے اور اس کے اندر لٹکی ہوئی چیز معلق چیز کو قرآن نے علّقہ کہا ہے بلاسٹوسسٹ ایک بہت چھوٹی شے ہے جو خوردبین کے بغیر نظر نہیں آسکتی اور اسے ایجاد ہوئے تین سو سال نہیں گزرے۔

علّقہ کے اندر مضغہ کی تخلیق:

علّقہ سے مضغہ بنایا۔ مضغہ کے اندر ہڈیوں کا ڈھانچہ تیار ہوا اور ہڈیوں کے ڈھانچہ کو لحماً سے ڈھک دیا۔ علقہ اور مضغہ دو مراحل ہیں۔ مضغہ وہی ایمبریو (جنین) ہے۔ ہڈیوں کا بننا اور گوشت سے ڈھکنے کا عمل اس مضغہ کے اندر پھیلنے پھولنے کا نام ہے ان جاہلوں نے مضغہ کے معنی بھی گوشت کر دیا۔ اور لحما کے بھی معنی گوشت کر دیا۔ مضغہ رحم میں آ کر خوراک اور آکسیجن کی صرف ایک ہفتہ کی ضرورت پوری کرتا ہے اور ایلنٹا ئیس (جس کے ذریعہ جنین کو آکسیجن ملتی ہے اسے پھیپھڑا کہہ دیں) اب یہ آنول بن کر خوراک اور آکسیجن ماں کے خون سے ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ بارآور بیضہ میں خلیے تقسیم ہو کر ایک گچھا بناتے ہیں۔ یہ ''مورولا'' کہلاتا ہے۔ مورولا کے بیرونی خلیے جھلیاں بناتے ہیں اور اندرونی خلیوں سے علقہ اور مضغہ بنتا ہے۔ مضغہ رحم مادر میں کافی دیر تک آبائی جانوروں کے مضغہ کے مشابہ رہتا ہے۔ یہ مشابہت اس لئے ہے کہ ان کے آباؤ واجداد ایک تھے۔ نسلیں شاخوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہوتی گئیں کوئی پہلے کوئی بعد اور ہر شاخ مختلف طریق اور ماحول میں ارتقائی مراحل طے کرتی گئی۔

خَلۡقًا مِّنۡۢ بَعۡدِ خَلۡقٍ فِیۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ (39:6) یہ سب کچھ تین اندھیروں یعنی ماں کے پیٹ کی دیوار، رحم مادر کی دیوار اور جھلیوں کے غلاف۔ ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ وَّ غَیۡرِ مُخَلَّقَۃٍ (22:5) خلیات کا غیر منظم مجموعہ پر بتدریج اعضا بنتے گئے اور ان میں تنظیم کے بعد مُّضۡغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ (22:5) بن گیا۔

صنفی وراثت: Inheritance Sex

انسان سمیت کئی انواع کے نر خلیہ میں ایک لونیوں کا جوڑا ایسا ہوتا ہے جس میں ایک لونیہ دوسرے کی نسبت چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ X اور Y صنفی لونیے کہلاتے ہیں۔ اس کے مقابل باقی تمام لونیوں کو Autosome یا غیر صنفی کہتے ہیں نر کا X لونیہ مادہ کے X لونیہ کی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ مادہ کے اندر دو X لونیے ہوتے ہیں جبکہ مرد کے اندر ایک لونیہ X اور اس کا ساتھی Y ہوتا ہے انسان کے نسبتی خلیے میں 23 لونیوں کے جوڑے یعنی کل 46 لونیے ہوتے ہیں جن میں 44 لونیے غیر صنفی ہوتے ہیں اور دو صنفی لونیے ہوتے ہیں۔ صنفی جوڑا XX یا YX ہوتا ہے۔ X خلیہ مادیّت کا مظہر ہے جس وقت رحم مادر میں جنین بنتا ہے۔ اس وقت یہ صنفی لونیے غیر نشوونما صورت میں موجود ہوتے ہیں اور جوانی کی عمر میں نشوونما پا جاتے ہیں۔ XX اور XY لونیے انسانی نسل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی ترتیب میں اگر نقص پیدا ہو جائے تو نوزائیدہ بچہ میں نقص پیدا ہو جائے گا۔ مثلاً اگر XX کے جوڑے میں ایک X غائب ہو جائے تو اس سے عورت کا حمل پہلے تین ماہ میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ایک اور نقص XXY ہے اس میں ایک X لونیہ فالتو ہے اس سے نقص والا لڑکا پیدا ہوگا بالغ ہونے کے بعد اس کے خلیے چھوٹے ہونگے اور وہ اولاد پیدا نہیں کر سکے گا اور ذہنی طور پر بھی نابالغ ہوگا۔

قرآن اور نظریہ ارتقاء درخت کی مثل سانچہ

سائنسدان تحقیقات کررہے ہیں جن سے صنف بدلی جاسکے اور یہ لونیوں کی خصوصیات بدلنے کی کوشش ہے۔ کہا جارہا ہے کہ مصنوعی روشنی کے انسان اور حیوانات کی صنف پر اثرات ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ روشنی سے ہارمون پیدا کرنے والے غدودوں کے ذریعہ جسم کا کیمیائی توازن بدلا جاسکتا ہے روشنی آنکھوں کے ذریعہ دماغ کے غدودوں پر اثر کرتی ہے نیلے رنگ کی روشنی اگر آنکھوں پر پڑتی رہے تو زیادہ بچے مادہ پیدا ہوتے ہیں۔ اگر گلابی رنگ کی روشنی پڑتی رہے تو زیادہ نر پیدا ہوتے ہیں۔ سورج کی روشنی جو سرخ سے لیکر بنفشی شعاعوں تک سب کی مرکب ہوتی ہے اس میں نر اور مادہ پیدا ہونے کے امکانات پچاس پچاس یعنی برابر ہوتے ہیں۔

نظریہ ارتقا اور قرآن:

ڈارون کے برعکس ''قدرتی انتخاب'' ایک پرامن تخلیقی قوت ہے نہ تو یہ زندگی کی تگ و دو کیلئے مقابلہ ہے اور نہ ہی جو طاقتور ہے زندہ رہتا ہے'' کے نظریہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے۔ قرآن نے ہر اس عمل کو جو کائنات میں زندہ اشیاء کے اختیار وارادہ کے بغیر ہوتا ہے قانون مشیت کہا ہے اور اس میں اس کا قانون انتخاب طبعی شامل ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ ارتقائی عمل میں انتخاب اللہ کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ افراد کے اختیار وارداہ کے مطابق قرآن نے یہ حیران کن چیز بتائی ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾ (28:68) تخلیق اور انتخاب تیرے رب کے قانون سے وابستہ ہے۔ ان کا (زندہ اشیاء کا) اس میں کوئی اختیار نہیں ہے یہ جو اس عمل میں اس کا شریک بتاتے ہیں خدا ان سے بلند و بالا ہے۔

درخت کی مثل سانچہ:

پرانا نظریہ کہ پہلے امیبا (amaeba) یا ایک خلیہ کا جانور پیدا ہوا۔ پھر درجہ بدرجہ دیگر حیوانات کی نسلیں سیڑھی کی طرح اوپر اٹھتی چلی گئیں۔ اب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ جب ایک نئی قسم کا جانور معرض وجود میں آتا ہے تو یہ کئی پیدا ہونے والی نسلوں کا اب وجد ہوتا ہے اور ان میں ہر شاخ کا ارتقاء ایک مختلف ماحول میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ارتقاء کا عمل ایک شاخ دار درخت کی طرح ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ (71:17) اللہ نے تمہیں ایک درخت کی طرح زمین سے اگایا۔

قرآن اور نظریۂ ارتقاء:

نظریۂ ارتقائے حیات قرآنی نظریہ کی سچائی کی دلیل ہے۔ کائنات جامد شے نہیں بلکہ پروگریسو ہے اور تخلیق کا ہر مرحلہ ایک سکیم کے تحت ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (32:5) عالم مشیت سے سکیم کو پست ترین نقطہ سے آغاز ہوتا ہے۔ پھر ارتقائی منازل طے کر کے اس منزل کی طرف بڑھتا جاتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھی ہے جو تمہارے حساب سے ہزار ہزار سال یا پچاس پچاس ہزار سال ہے۔ آگے ہے۔ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (32:6) الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ (32:7) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ (32:8) ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (32:9) دو مراحل بے جان مادہ سے زندگی کی نمود اور دوسرے صنفی تولید کیلئے غائب کی ضمیر ہے جب نفس مل گیا تو ضمیر حاضر سے ''لَكُمُ'' سے خطاب کیا۔ اس سے پہلے وہ ''وہ'' تھا اور اب ''تم ہو گیا'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ لَكُمُ تک قدم بہ قدم پہنچا۔ اب آگے انسانی زندگی ارتقائی مراحل پھر فرد کی زندگی کے مراحل۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (40:67) ثُمَّ بتدریج اور ترتیب کو ظاہر کرتا ہے نوعِ انسانی کو تخلیق کے ان مراحل سے گزارا گیا۔ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۝ (85:13) لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (84:19) وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝ (71:14) اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (29:19-20)

......☆......

گزشتہ ارتقاء، کائنات کا ارتقاء

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ (10-3) ارتقا چھ ادوار اور منازل میں ہوا۔ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ (41:9) پھر کہا فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ (41:12) یہ ادوار سائنسی اصطلاح میں ''AZOIC ERA'' جب کرے کہلاتے ہیں۔ اور زمین کی مادی تخلیق ہوئی اور زندگی کی نمود نہیں ہوئی تھی۔ اب آگے اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ (41:10) کا ذکر ہے۔ زندگی کی نمود کے بعد زمانے کو سائنس نے بھی چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ان کا تعین حجری گھڑیوں (Fossil cloaks) کے ذریعہ کیا گیا ہے جب کوئی جانور مر جاتا ہے تو باقی تو ختم ہو جاتا ہے مگر ہڈیاں باقی رہتی ہیں۔ بعض تو چورہ چورہ ہو جاتی ہیں مگر بعض زمین کی تہوں میں دب جاتی ہیں آخر میں مٹی ہڈی یکجان

ہو کر پتھر بن جاتی ہیں۔

ڈیٹنگ:

پتھر کی تہوں سے عمر معلوم کی جاتی ہے جو عمر اس پتھر کی ہوگی وہی اس کے اندر موجود اس فاسل کی ہوگی۔ اس سے جانور کا کہ کسی زمانے میں مرا۔ اسے سائنسی اصطلاح میں Dating کہتے ہیں۔ اس لئے اس بنیاد پر تخلیق کائنات کے مختلف پانچ ادوار قرآن کی رو سے چھ کی مدت متعین ہو چکی ہے۔ ان حجّری پتھروں کو Fossil Clocks بھی کہتے ہیں۔ جو عام گھڑیوں سے بھی زیادہ صحیح وقت دیتی ہیں۔ اب ان چار اربعۃ ایام جن میں زندہ اشیاء کا ارتقاء ہوا۔

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ط (41:10) سائنس کے چار ادوار یہ ہیں۔

1- Precambrian	يَوْمُ الثَّالِثَةُ	
2- Palaeozoic	يَوْمُ الرَّابِعَةُ	قدیم زندگی
3- Masozoic	يَوْمُ السَّادِسَةُ	موجودہ زندگی

زمین کی ابتداء 5 ارب سال پہلے ہوئی۔ اس میں صرف 60 کروڑ سال کے حالات واضح ہیں۔ زمین کے گیس سے ٹھوس شکل اختیار کرنے سے پیشتر کے حالات معلوم نہیں ہیں اور نہ ٹھوس ہونے کے بعد پہلے 30 کروڑ سال۔ جب کائنات ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔ پوری کائنات 92 مختلف مفردات (elements) سے بنی ہوئی ہے اور ہر ایک عنصر کو ایٹمی وزن اور والینسی نمبر دیا گیا ہے ان میں بعض ریڈیو ایکٹیو مفردات بھی ہیں جن سے توانائی کی لہریں ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہیں۔ جب سے ایک مدت کے بعد مفرد ضائع ہو کر نچلی سطح کے مفرد میں بدل جاتا ہے اور اس انتشار کی مدت صحیح طور پر معلوم ہے۔

اربعۃ ایام:

مثال کے طور پر ریڈیم ایک مدت کے بعد (سکہ)lead کے مفرد میں تبدیل ہو جاتا ہے جنانچہ اگر پتھر کی ایک تہہ میں ریڈیم اور سکہ دونوں دھاتیں یکجا پائی جائیں تو پہلے دونوں کی مقدار معلوم کر کے باہمی تناسب سے معلوم ہوگا کہ کتنا ریڈیم سکہ میں تبدیل ہو گیا ہے چونکہ ریڈیم کے انتشار کی صحیح صحیح مدت معلوم ہے۔ اس سے زمانے کا صحیح وقت متعین کیا جا سکے گا جب سے ریڈیم وہاں موجود ہے اس طرح سے ایک فیصد یورینیم چھ کروڑ 60 لاکھ سال میں سکہ میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس طرح سے دوسرے مفردات سے بھی ڈیٹنگ کی جاتی ہے۔ اس ڈیٹنگ کی بنیاد پر سائنسدانوں نے ایک ٹائم ٹیبل قائم کیا ہے جس سے زمینی پتھروں کی مختلف تہوں کی عمریں معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس سے تخلیق کائنات کے 5 مختلف ادوار (پانچ) قرآن کی روح سے چھ کی مدت متعین ہو چکی ہے۔ ان حجّری پتھروں کو فاسل کلاکس (Fossile clocks) کہتے ہیں جو عام گھڑیوں سے بھی زیادہ صحیح وقت دیتی ہیں۔

اربعۃ ایام:

یعنی چار ادوار جن میں بے جان مادہ میں زندگی کی نمود کے بعد زندہ اشیاء ارتقاء کرتی ہوئی موجودہ صورت تک پہنچیں۔

وَجَعَلَ فِيۡهَا رَوَاسِىَ مِنۡ فَوۡقِهَا وَبٰرَكَ فِيۡهَا وَقَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا فِىۡۤ اَرۡبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ (41:10) زمین کی سطح پر پہاڑ بنا دیئے (جس سے آب رسانی کا سلسلہ جاری ہے) اور اس میں برکت رکھ دی اور چار ادوار میں ہر ضرورت مند کی ضرورت کا سامان نشوونما رکھ دیا۔ سائنس نے بھی زندگی کے ارتقائی مراحل کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

1-Precambrian۔ پری کیمبریان۔ ہم اسے یَوۡمُ الثَّالِثَةُ کہیں گے۔

2-Palaeozoic۔ یَوۡمُ الرَّابِعَةُ قدیم زندگی

3-Mesozoic۔ یَوۡمُ السَّادِسَةُ مڈل لائف

4-Canozoic۔ یَوۡمُ السَّادِسَةُ۔ موجودہ زندگی ماڈرن لائف۔

زمین کے ٹھوس حالت کرنے سے پیشتر کے حالات معلوم نہیں ہیں اور نہ ہی ٹھوس ہونے کے 30 کرڑو سال بعد کے حالات کا علم ہے۔

......☆......

ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ (23:14)

یہ وہ زمانہ تھا جب پوری کائنات ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔ جسے قرآن یَوۡمَیۡن کہتا ہے۔ سب سے پہلے اور ابتدائی زندہ اشیاء مثلاً سمندری گھاس، بغیر ریڑھ کی ہڈی والے جانور نہ معلوم کتنے ملین سالوں سے بنتے رہے ہونگے۔ ان کے فوسلز گزشتہ 60 کروڑ سالوں میں پتھروں کے اندر محفوظ ہوئے۔

ریڑھ کی ہڈی والے جانور اور ابتدائی دور کی مچھلیاں مزید 10 کروڑ سال تک ظاہر نہیں ہوئے۔ خشکی کے پودے قریباً 40 کروڑ سال پہلے پیدا ہوئے۔

دودھ دینے والے جانور بمعہ انسان، ان کی ارتقائی تاریخ 25 کروڑ سال پہلے کی طرف جاتی ہے اور خود انسان کی شاخ آخری دس لاکھ سال میں ہوئی۔

بعض حیوانات اور پودے کئی ملین سال زندہ رہنے کے بعد نابود ہو گئے۔ بعض ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی تبدیلی کے زندہ رہے۔ زمین کا جغرافیہ اور موسم یکسر بدلتے رہے۔ ان کے اثرات نباتات کی ارتقا اور روئے زمین پر پودوں کی تقسیم پر بہت گہرے ثابت ہوئے زمین کی ارتقائی تاریخ کے چار ادوار میں تقسیم اپنی خلل اندازیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی اور جو شہادت ان پتھروں اور فوسلز

674

سے ملتی ہے وہ نباتات اور حیوانات کی ارتقائی کا صرف ایک عام خاکہ ہی پیش نہیں کرتی بلکہ ان امور کی بھی شہادت پیش کرتی ہے کہ یہ سمندر دریا، آبادیوں کے قطعات، کس طرح پیدا ہوئے اور موسم کس طرح سے بدلتے رہے۔

خَلْقًا اٰخَرَ ؕ (23:14) اٰخَرَ اور آخِرَۃُ۔ دو مختلف الفاظ ہیں۔ گویا مادہ (أخ ر) ایک ہی ہے آخَرَ۔ نئی اور نمایاں شے۔ جس کا پہلے سلسلے سے تعلق نہ ہو۔ Another جبکہ اٰخِرَ سے مراد واقعات کی آخری کڑی۔ اب آیئے یہ

الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ۚ﴿۷﴾ (32:7) ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ۚ﴿۸﴾ (32:8) ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَۃَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۹﴾ (32:9)

ان آیات میں درجہ بدرجہ انسانی ارتقاء کے مراحل کے بعد جب سلسلہ تناسل نقطہ کے ذریعہ شروع ہوا۔ پھر حیوانات سے الگ انسان کو ذات دیدی گئی۔ پھر آنکھ اور کان کے ذریعہ علمِ بالحواس دیا۔ یہ الوہیاتی توانائی عرف عام میں روح جو صرف انسان کو دی گئی ہے۔

انسان اور حیوان میں فرق صرف اقدار کی بنا پر ہے

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾ (17:85) روح کا تعلق تو عالم امر سے ہے محسوس کائنات سے نہیں چونکہ تمہارا علم تو صرف محسوس کائنات تک محدود ہے اس لئے تم عالم امر کی ماہیّت کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ہے الوہیاتی توانائی جو انسان نفس یا ذات کہلاتی ہے۔ یہ غیر مادی شے ہے اسے خدا نے رُوْحُنَا کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی الوہیاتی توانائی جو مادی قوانین سے ماوراء ہے۔

انسان اور حیوان میں فرق صرف اقدار کی بناء پر ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿١٢﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿١٣﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿١٤﴾ (23:12-13-14) انسان اور گدھے کی طبعی مشینری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب کلیسائی مذہبی پیشوائیت نے ان پر زندگی تنگ اور گراں کر رکھی تھی تو اس کا ردعمل شروع ہوا۔ تو وہاں سے رسا تڑا کر بھاگے۔ بدقسمتی سے سائنٹفک ریسرچ کا دور تھا۔ وہاں انسانی جسم کو چیرا پھاڑا اور گدھے کو بھی تو دیکھا کہ دونوں کے اندر وہی کچھ ہے اس ترتیب کے ساتھ، اس نظام کے ساتھ۔ فرق یہ ہے کہ بڑا جانور ہے تو اعضا بڑے اور چھوٹا جانور تو اعضا چھوٹے۔ بعینہ دونوں میں ایک ہی چیز نظر آئی اس اناٹومی سے یہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ آؤ دیکھ لو حیوان اور انسان میں تو کوئی فرق ہی نہیں ہے اگر ہے تو ہمیں دکھا دو ۔

کسے بتائیں کہ خونِ آرزو کیا ہے؟ انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے؟

وہاں رنگ و بو دیکھ کر فیصلہ کر دیا کہ انسان اور حیوان میں فرق ہی نہیں۔

معاشرتی زندگی کی خاطر سوسائٹی کے قانون کی ضرورت:

اب سوشیالوجی والے آ گئے تو انہوں نے کہا کہ کیا کہتے ہو مل جل کر رہنا ہے اگر یہ کہہ دیا کہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہے تو پھر تو معاشی دنگل ہو گیا۔ جینا محال ہو جائے گا۔ بس ان کیلئے سوسائٹی سے قوانین مقرر کر لو اور ان کی پابندی ان سے کراؤ یعنی Man is Social Anmal انسان سماجی حیوان ہے تا کہ ان قوانین سے امن وسکون معاشرہ میں قائم ہو جائے۔ کیونکہ یہ حیوان ہیں۔ قانون تو ہے مگر جب جی چاہے اسے توڑ دے۔ حالانکہ اس کا وقار تو قانون کے احترام میں ہی ہے۔ اُولٰٓئِكَ

674

كَالْاَنْعَامِ (7:179)۔ یہ حیوان ہے انسان نہیں بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط (7:179) اس سے بھی بدتر۔ کیونکہ وہ قانون نہیں توڑ سکتا مگر یہ توڑ سکتا ہے کیونکہ بکری کیلئے قانون گھاس کھانے کا ہے وہ اسے توڑ نہیں سکتی۔

فکر انسانی کی ناکامی اور مشکلات:

پولیس ہے، جانباز، رینجرز، آرمی، عدالتیں، جیل خانے یعنی قانون منوانے والوں کی تعداد ماننے والوں سے زیادہ ہوگئی ہے۔ چاروں طرف بدامنی اور چیخ و پکار ہے۔ کوئی ان قوانین کو نہیں مانتا۔ تو حل یہ ہے کہ نفری بڑھا دی اسلحہ زیادہ کردو۔ دن رات اس میں غرق ہیں بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان کو حیوان تصوّر کیا گیا ہے۔ اس کے اندر کوئی روکنے والی چیز ہی نہیں ہے۔ اب اصل مسئلہ کی طرف نہیں آتے۔

ان تمام مصائب کا حل صرف وحی کی روشنی میں ہے:

یہ ہیں وہ مقامات جہاں قرآن کی عظمت سامنے آتی ہے۔ یہ معجزہ ہے ساری دنیا عاجز آئی ہوئی ہے اور عقل کے عاجز آنے کے بعد حل جو بتائے تو وہی معجزہ ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (23:12) یہاں قرآن نے انسان اور حیوان میں فرق کر کے انسان کی پیدائش کا وہ حصّہ دیا ہے جو جنین یعنی رحم مادر کے اندر ہوتا ہے اب ایک ایک چیز کی علم الجنین اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ اب قرآن اختصار سے وہ تمام مراحل گنا رہا ہے جو رحم مادر میں ایک سٹیج سے دوسرے سٹیج میں نمودار ہو رہی ہے۔ وہاں رحم مادر میں قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ (23:13) میں جا کر ٹھہر جاتا ہے۔ پھر یہ نطفہ علقہ یعنی پلازمہ کی شکل میں پھر اگلی سٹیج مضغہ یعنی اس میں پھر گوشت، ہڈیاں پروان چڑھتی ہیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت کی تہہ چڑھا کر ہر حیوانی جنین اور انسانی جنین انہی مراحل سے گزرتا ہے۔ اب حیوان کے بچہ کا یہ آخری مرحلہ تھا وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اب ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط (23:14) کہہ کر خط امتیاز کھینچ دیا کہ ایک بالکل نئی شکل کی مخلوق میں نمودار کر دیا گیا۔ یعنی اب انسان کا جنین کچھ اور سے اور ہوگیا۔ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (32:9) اب اس میں خالص خدا کی جو قوّت تھی وہ پیدا کر دی گئی۔ نتیجتاً۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ط (32:9) اب یہ صاحب بصارت وبصیرت اور اختیار وارادہ والا ہوگیا۔ یہ قوّت وتوانائی کائنات میں کسی اور کو نہیں دی گئی ؎

زآب وِ گل خدا خوش پیکرے ساخت　　جہانے از ارم زیبا ترے ساخت
ولے ساقی بہ آں آتش کہ دارد　　زخاک من جہان دیگرے ساخت

میرے ساقی نے اس آتشی شعلے یعنی روح خداوندی سے میری باہر کی دنیا کو روشن کر دیا اور اس آب وگل کے ہیولے سے ایک نئی دنیا ساخت کر ڈالی۔ جہاں دیگرے یعنی خَلْقًا اٰخَرَ ط (23:14)۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ (71:13-14) یعنی اس تخلیق میں یوں کیفیات بدل گئیں اور اس میں ذات جیسی چیز عطا کر دی گئی جواب غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملی ہے اسے محکم کرتے جاؤ تا کہ موت کے بعد بھی تم مر نہ سکو۔

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی　　وہ صدف کیا جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ذات انسانی کا قطرہ موتی بن کر سمندر کا حصہ نہیں بنتا اور یاد رکھو۔

؎ بخود محکم گزر اندر حضورش　　مشو ناپید اندر بحرِ نورش

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿١٩﴾ (84:19) حقیقی عمل خدا پرستی نہیں بلکہ اطاعت خداوندی سے انسانی ذات بلندیاں اور استحکام حاصل کرتی ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ (59:19)

؎ منکر حق نزدِ ملا کافر است　　منکر خود نزد ما کافر تر است

شاخ نہال سدرۂ خار و خسِ چمن مشو　　منکرِ اوشوی اگر، منکر خویشتن مشو

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿٤﴾ (95:4)

حسین ترین آب وگل کے پیکر سے نہیں ہوتا اس کا حسن تو اس کی ذات کی رعنائیوں اور زیبائیوں کا نام ہے اور اس میں سیرت و کردار میں اقدار کے تحت حسن و توازن کے امکانات مضمر کر دیئے گئے ہیں۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی　　یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

جینین سے جسم انسانی، پھر نفس انسانی اور اس کی نشوونما کیلئے وحی اور پھر ایک نئی منزل کی طرف سفر کا آغاز۔

❁❁❁

برزخی زندگی کا تصوّر (23:100)

وَمِنۡ وَّرَآٮِٕهِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ۝۱۰۰ (23:100)

عالمِ برزخ:

یہ جوتصوّر ہے کہ موت اور قیامت کے دن زندگی کے درمیان ایک عرصہ ہے یعنی حیات برزخ۔ یہاں موت ہے اور قیامت کو زندگی ہوگی۔ اس درمیانی عرصہ کو قبر کا عذاب کہتے ہیں اور باقی سارے افسانے بنائے ہوئے ہیں۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے زندگی تو جوئے رواں ہے اس میں انقطاع ہوتا ہی نہیں ہے۔ جو مرتا ہے اس کی قیامت آ جاتی ہے۔ زندگی جوئے رواں ہے۔ اس میں انقطاع کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں بھی موت نہیں ہے شعور یا Consciousness کا جو لیول ہے اس میں ایک فرق آتا ہے یہ پردہ یعنی برزخ، کہا یہ گیا ہے کہ یہ پیچھے کی طرف نہیں آ سکتے۔ پیچھے والے نہ ان کی سنتے ہیں اور نہ یہ ان کو کچھ سنا سکتے ہیں یعنی اس دنیا سے سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ وَّرَآٮِٕهِمۡ (23:100) کے معنی آگے نہیں ہوتا بلکہ پیچھے بھی ہوتا ہے کیونکہ آگے اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ۝۱۰۰ (23:100) یعنی ایک وقت وہ بھی ہوگا جب یہ آمنے سامنے بھی ہونگے۔ یعنی یہ پہلے مر گیا تو واپس نہیں آ سکتا۔ وہ جو دنیا میں ابھی تک زندہ ہے وہ اس کے ساتھ ابھی نہیں مل سکتا۔ وہ ایک دور ہے کہ آمنا سامنا ہوگا۔ یعنی اس میں وقت کا جو تصوّر ہے یہ جو عبوری وقفہ، درمیانی دور ہوتا ہے۔ شعور کی جو موجودہ سطح ہے ہمارے اس طبعی جسم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ اس سے نکل کر شعور کی نئی سطح پر جو آنا ہے جس کو برزخ کی زندگی کہتے ہیں۔ اس میں یہ عبوری طور پر وہاں پہنچتا ہے۔ یہ بتدریج وہاں تک پہنچتا ہے۔ پچھلا تصوّر Concept بڑا مدھم سا ہوتا ہے اور اگلا تصوّر ابھی تک واضح طور پر نہیں آیا ہوتا۔ اسے برزخ کا دور کہتے ہیں۔ حیات بعد الموت بڑا سائنٹفک ہے۔ یہ محسوس طور پر قرآن سامنے لے آتا ہے اور یہ مابعد الطبیعات کی چیز رہتی نہیں۔ تو کہا کہ بتاؤ وہاں کتنا عرصہ رہے۔ قَالُوۡا لَبِثۡنَا يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ فَسۡـَٔلِ الۡعَآدِّيۡنَ ۝۱۱۳ (23:113) کہا سکھ کے دن تو یونہی بیت جاتے ہیں۔ کوئی دن یا آدھ دن کی بات ہے۔ اگر کوئی ان چیزوں کا حساب رکھنے والا ہے تو اس سے پوچھ لیں۔ عجیب نقشہ کھینچا ہے۔

قٰلَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِيۡلًا لَّوۡ اَنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۱۴ (23:114) کہا وہ عرصہ گنتی میں چاہے لمبا اور طویل ہو مگر یہ حیات جاویداں کے مقابلے میں تو قلیل ہے۔ یہ حیات جاویداں کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

زندگی کا مقصدِ عظیم

(23:115) جب کائنات کے متعلق یہ نظریہ ہو کہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے اور نہ کوئی غرض وغایت جس طرح چاہو دولت و قوت اکٹھی کرلو۔ یہ ہے کفر۔ کہا کہ کائنات ایک مقصد کیلئے پیدا کی گئی ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (23:115) یونہی اتفاقاً وجود میں آ گئے۔ قانون طبعی کے مطابق زندہ رہنا ہے اور پھر ایک دن مرجانا ہے۔ یہ زندگی تو عبث ہے۔ عبث۔ وہ مویشی جن کے اوپر گڈریا نہ ہو اور ان کا راستہ بھی متعین نہ ہو اور وہ ادھر ادھر پھریں۔ یعنی زندگی سفر کی بجائے آوارگی ہوگی۔ جس کا نصب العین اور مقصد نہ ہو۔

وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴿۱۱۵﴾ (23:115) اور تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ (38:27) یہ ظن ہے۔ علم نہیں ہے کائنات کو بے مقصد ماننا کفر ہے بلکہ یاد رکھو۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (45:22) متعین نصب العین اور غرض وغایت کیلئے اس کو تخلیق کیا گیا ہے۔

وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ (45:22) اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى﴿۳۶﴾ (75:36) خالی تانا تاننے کو سدًی کہا جاتا ہے۔ یہ تو تانے اور بانے کا امتزاج ہے جس سے کپڑا بنتا ہے۔ وَقَالُوْا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (45:24) وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ (45:24) علم کی بارگاہ میں آکر اس عقیدے کو چھوڑ دیں گے۔ اب یہ ارتقا والے ڈارون کی اس نظریہ سے انکار کر رہے ہیں۔ جو اس کو آخری کڑی کہتا تھا اب وہ خود اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کے بعد ایک نیا ارتقا کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے جو طبعی قوانین کے تابع نہیں ہے یہ تو ایک نئی زندگی ہے ؎

زمیں خاکِ درِ میخانہ ما　　فلک یک گردشِ پیمانہ ما

زمین تو ہمارے مہ خانے کے دروازے کی مٹی ہے کائنات کا یہ آسمان ہمارے پیمانے کی ایک گردش ہے ؎

حدیثِ سوز و ساز ما　　جہاں دیباچۂ افسانہ ما

یعنی جو اصلی زندگی ہے یہ دنیا کی زندگی تو اس کا دیباچہ ہے۔

❁❁❁

''جرائم کا ازالہ صرف اقدار پر قائم نظام سے ہی ہوسکتا ہے''

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰٮهَا ۙ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰٮهَا ؕ (91:9-10) فلاحت کھیتی باڑی کو کہتے ہیں جس نے صالح بیج کی نشوونما کر لی تو اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی اور جس نے اس کے اوپر مادی دنیا کا ڈھیلا رکھ دیا تو پھر وہ نہیں اگتا۔ ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ تَبٰرَكَ الَّذِىۡ بِيَدِهِ الۡمُلۡكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرُ ۙ (67:1) یہ کائنات کا پورا کنٹرول اس کے پاس اس لئے ہے کہ چیزیں نشوونما پا کر، استحکام حاصل کریں اور یہ سارا کچھ کوئی اندھا نہیں کرتا بلکہ اس کیلئے اس نے قوانین بنا دیئے ہیں۔
الَّذِىۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ (67:2)

اقدار پر مبنی نظام اور سیکولر نظام:

سیکولر نظام میں سزاؤں سے جرائم ختم نہیں ہو سکتے۔ جرائم صرف اندرونی نفسیاتی تبدیلی سے بند ہو سکتے ہیں۔ اب بھی قتل کی سزا موت ہے لوگ روز پھانسی پر چڑھتے ہیں قتل کے کتنے جرائم بند ہو گئے ہیں۔ ان میں تو روز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اصل نظریہ تو یہ ہے کہ ہر عمل کا اثر جو میری ذات پر پڑتا ہے خواہ کسی کی گرفت میں آئے نہ آئے۔ سزا ملے نہ ملے۔ میں تو مجرم ہو گیا۔ تو زندگی کا تحفظ اور مقصد تو اس ذات کی نشوونما اور تحفظ ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر ایمان لانے سے ان تمام جرائم کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ ذات پر اگر جرم کا اثر ہو گیا ہے تو اس کے مٹانے کا دوسرا طریقہ ہے۔ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (11:114) زیادہ سے زیادہ تعمیری کام ان تخریبی کاموں کا ازالہ کر دیتے ہیں اور اقدار خداوندی کے تحت زندگی گزارنے سے صرف ان جرائم کا خاتمہ ہوسکتا ہے ان کی خلاف ورزی سے جو ذات پر اثر پڑے گا تو اسے دنیا میں کوئی طاقت زائل نہیں کر سکتی۔ یہ ہے قانون مکافات Law of Requittal۔

یہ جرم دراصل انسان اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے:

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ (4:110) یہ جرائم بظاہر تو نظر آتا ہے کہ اس نے دوسروں کے خلاف کئے ہیں۔ کسی کو گالی دیدی۔ چوری کر لی۔ قتل کر لیا۔ یہ تو سوسائٹی کے خلاف جرائم ہیں۔ کہا نہیں بلکہ يَكۡسِبُهٗ عَلٰى نَفۡسِهٖ ؕ (4:111) اپنے خلاف جرم کیا ہے۔ اگر دوسرا انسان نہ ہو تو جرم تو سرزد نہیں ہوسکتا۔ یہ تو سوسائٹی کا جرم قرار دیا جاتا ہے۔ مگر اس کا ایمان تو یہ ہے کہ يَكۡسِبُهٗ

عَلٰی نَفۡسِہٖ ؕ (4:111) قصہ آدم میں یہی بات تھی جو کہا۔ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٜ (7:23) یہ تو میرے خلاف جرم تھا۔

وَلَا تَکۡسِبُ کُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَیۡہَا ۚ (6:164) وہی ذات والی بات ہے۔ عَلَیۡہَا وہ اپنی ذات کے خلاف یہ جرم کرتا ہے یاد رکھو قانون مکافات یہ ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۚ (6:164) خود ہی ان جرائم کا بوجھ اٹھانا ہوگا۔ اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ ۟ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَہَا ؕ (17:7) ہم تو ہمیشہ طبعی زندگی کے شعور کے تحت سوچتے ہیں۔ جرم وسزا کی ابتداء کہ سوسائٹی کے جرم میں آپ دوسرے کا نقصان کرتے ہیں۔ اَنۡفُسَہُمۡ وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾ (6:26) چونکہ طبعی زندگی کے شعور سے سوچتے ہیں تو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو نقصان دے رہے ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ کو نقصان دے رہے ہوتے ہیں۔ وَاَنۡفُسَہُمۡ کَانُوۡا یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾ (7:177) یہ جو دوسروں پر زیادتی کررہے ہوتے ہیں یہ تو دراصل اپنے خلاف کررہے ہوتے ہیں۔

یہ تھا وہ معاشرہ جس میں عمرؓ نے ابوبکرؓ کو عدالت بند کرنے کا کہا تھا کہ کیونکہ ان کے پاس ایک سال میں کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا۔

نفسیاتی تبدیلی:

ادھر قانون بنا رہے ہوتے ہیں ادھر قانون شکن انسان ان تدبیروں کو توڑنے کی تراکیب کررہا ہوتا ہے۔ توڑنے والے زیادہ نابغہ ہوتے ہیں اور ان قوانین سے بچنے کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ پولیس، عدالت، فوج، جیل، اسلحہ، سخت سزائیں، یہ سارا کچھ انہی اقدام پر کیا جاتا ہے لیکن جو اندر کی تبدیلی ہے۔ اس پر کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ ساری دنیا ناکام ہو کر رہ گئی ہے۔ نیویارک میں ایک رات بجلی فیل ہوئی۔ سارا نظام موجود تھا۔ صرف اتنا ہی ہوا تھا کہ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ ساری دکانیں لٹ چکی تھیں۔ یہ ساری باہر کی تبدیلی تھی۔ قوانین اور سزاؤں کو سخت کرتے جایئے جرائم مزید بڑھتے جائینگے۔ سوسائٹی کی طرف سے ملنے والی سزائیں جرائم کو ختم نہیں کرسکتیں۔ اقدار پر مبنی معاشرہ میں تو جرم سرزد ہی نہیں ہوتا۔ اگر کبھی غلطی سے ہو جائے تو جب وہ ''میں'' جاگتی ہے وہ فوراً قانون خداوندی کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ قانون سے نافذ نہیں ہوتا بلکہ تغیرِ نفس سے جرائم کا انسداد کیا جاسکتا ہے ؎

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر — با نگاہِ دیگرے اورا نِگر

وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ ؕ (2:129) ہی اس کا علاج ہے نفسیاتی تبدیلی قرآنی تعلیمات کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے۔

تانہ و بالا نہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب و دین سودائے خام

وحدت الوجود کا غلط مفہوم کہ خدا خارجی کائنات کا نور ہے
اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (24:35) کی غلط روایتی تشریح

اس پر تمام باطل عمارات قائم کر دی گئیں۔ ابن عربی کی فتوحات مکّیہ اور فصوص الحکم میں یہ درج ہے کہ کائنات کچھ شے نہیں ہے یہ سارا خدا کا نور ہے۔ اللہ ہی ہے، کوئی ہے ہی نہیں یہ ہے ان کے ہاں مغز دین اور وحدت الوجود کا فلسفہ۔ فرعون کا نعرہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾ (79:24) وہ بھی سچ ہے وہ ایمان پر مرا تھا اور اس کی بخشش ہو چکی ہے۔ اسے رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾ (79:24) کہنے کا حق تھا کیونکہ وہ ذات حق سے جدا نہ تھا۔ اگر چہ صورت فرعون کی تھی (فصوص الحکم کلمہ موسویہ) یہ تمام پوجنے والی چیزیں جن کو الٰہ سمجھتے ہو۔ وہ اللہ ہی ہے۔ سارا فلسفہ ہندوؤں سے لیا جو ان کے ہاں ختم ہو چکا۔ رام بھی وہی، رحیم بھی وہی، فرعون بھی وہی، منصور بھی وہی۔ ملا روم اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے لیکر مجدّ د الف ثانی تک کے نزدیک کفر اور اسلام میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ابن عربی نے کہا کہ جس مقام سے نبی اور رسول لیتے ہیں۔ اسی مقام سے ہم غوث اور ابدال لیتے ہیں۔ رومی نے اسے دعویٰ کو انتہا تک پہنچا دیا۔ وہ مقام نبوّت کو پہنچنے کو بھی ممکن قرار دیتے ہیں۔ تصوّف میں بریلوی فرقہ کا باطلانہ کردار اور نور بشر کا معاملہ، بانی احمد رضا خان بریلوی ؎

وہی جو مصطفوی عرش تھا خدا ہو کر   اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفی ہو کر

اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط (59:24) میں کچھ صفات صرف اللہ کیلئے مختص ہیں اور اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ ان میں دوسرا شامل نہیں ہوسکتا۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج (57:3) اس کی ذات زمان و مکان کی نسبتوں سے ماوراء ہے سب سے اوّل بھی وہی اور آخر بھی وہی۔ نہ اس کیلئے ابتداء ہے اور نہ انتہا۔ وہ ہر شے پر غالب ہے لیکن اس کا غلبہ غیر مرئی اور غیر محسوس کے طور پر کام کرتا ہے قانون تو ہوتا ہی غیر محسوس وغیر مرئی مگر اس کے نتائج محسوس اور مرئی ہوتے ہیں۔ جملہ کائنات اس کی صفتِ خالقیّت اور ربوبیّت کی مظہر ہے اور اس کی ہستی کی زندہ شہادت ہے۔ اس کی ذات انسانی نگاہوں سے پنہاں اور مستور ہے۔ اس لحاظ سے وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ الٰہیّات کی اصطلاح میں وہ Transcensent بھی ہے اور Immanent بھی۔ یہ ساری حدود کراس کر چکے ہیں کفر کی۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ (2:26) قرآن کے باطنی معنی نکال کر باطل اور کفر سے بھی آگے بڑھ گئے۔

کسی غیر محسوس شے مثال سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (24:35) کی طرف آجایئے۔ پہلی بنیادی غلطی کہ خدا کائنات کا نور ہے۔ بعض اوقات تو عام چیزوں کو مثلاً درد وغیرہ کو محسوس شکل میں بیان نہیں کیا جا سکتا تو وہ تو ؎

برتر از خیال و قیاس و وہم و گمان

تو کیا اسے مثال کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ خود ہی قرآن نے اس کی گواہی دیدی۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ (42:11) تو نور السموت کی مثال سے بھی خدا نے اپنے آپ کو نہیں سمجھا یا اس آیت سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ سب کچھ نور علیٰ نور ہے۔ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ (24:35) خدا کا دیا ہوا نور وہ ہے جس سے وہ ہر شے کو ہدایت دیتا ہے۔ جس طرح کائنات میں ہر شے کے اندر ہدایت رکھ دی ہے۔ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ (20:50) پیدا کر کے اس کا منزل تک راستہ متعین کر دیا۔ خارجی اشیاء کے اندر یہ ہدایت رکھ دی۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ (24:41) وہ اپنے فرائض منصبی کو جانتی ہے کہ اسے کس طرح سرگرم عمل ہو کر پورا کرنا ہے۔ اس طرح انسانوں کی طرف وحی کی۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (5:15) قرآن کو متعدد مقامات پر ''نور'' روشنی کہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو جو وحی ہوئی۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (42:52) اس علم کو جَعَلْنٰهُ نُوْرًا (42:52)

کا ہے کیلئے تاکہ نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ (42:52) تو قرآن اللہ کا نور ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (24:35) نور یعنی ایسی روشنی جس کو خود دکھانے کیلئے خارجی روشنی کا محتاج نہ ہو جو اپنی دلیل آپ ہو۔

''عربی زبان میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی مصدر کو زیادہ شدت سے استعمال کیا جائے تو وہ ''اسم فاعل'' کے معنی میں آتا ہے نور کے معنی ''مُنَوِر، نورانیت دینے والا، روشن کرنے والا'' وہ کائنات میں روشنی عطا کرنے والا ہے۔ یہ اس کا لفظی ترجمہ ہے۔ مصدر کو اسم فاعل کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے عربی قاعدہ کی رو سے۔ وہ منور ہے اور کائنات کا روشن کرنیوالا ہے۔ آگے ہے۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ (24:35) اس کے نور کی مثال یہ ہے یہ مثال خدا کی نہیں ہے بلکہ اس کے نور کی ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ (42:11) اس کی تو مثال ہی نہیں دی جا سکتی۔

اب آگے اس آیت اس نورانی چراغ کی خصوصیات۔ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ (24:35) گویا ایک چراغ ہے جو طاق میں رکھا ہے تو گویا طاق سے مراد باطل اس کے دائیں، بائیں اور پیچھے سے نہیں آسکے گا۔ خارجی اثرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ تو جھکڑ سے بجھ بھی تو سکتا ہے کہا نہیں کیونکہ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ (24:35) آگے سے بھی اس دیئے کو شیشے کے فانوس میں رکھ کر ان خارجی اثرات سے بالکل محفوظ کر دیا ہے اب یہ روشنی اس فانوس سے آرہی ہے۔ یعنی یہ قرآن کے الفاظ ہیں جن کے ذریعہ سے ہم اس کے مفہوم تک پہنچتے ہیں۔ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ (24:35) اس فانوس کی کرنیں گویا ستارہ صبح گاہی ہے۔ جو

674

ان تاریکیوں میں نور پاش ہے۔ اس میں سے دودھ کی طرح نور کی ندیاں رواں دواں ہیں۔ یعنی اس نور کی ندیاں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ (6:115) اب آگے کہا۔ يُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيۡتُوۡنَةٍ لَّا شَرۡقِيَّةٍ وَّلَا غَرۡبِيَّةٍ ۙ (24:35) اور اس چراغ کو ایسے بابرکت زیتون کے درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے و مشرق اور مغرب کی تقسیم سے ماوراء ہے یعنی تمام نوع انسانی کے راستوں کو روشن کرتا جاتا ہے۔ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡهُ نَارٌ ؕ (24:35) اگر چہ اسے جلانے کیلئے کسی خارجی آگ کی ضرورت نہیں۔ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡهُ نَارٌ ؕ (24:35) ازل سے جل رہا ہے اب تک جلے گا۔ وہ فکر انسانی کا محتاج نہیں روشنی جلانے کیلئے اسے کسی خارجی روشنی یا حرارت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اپنے مطالب خود واضح کرتا ہے۔ معانی و تفسیر کیلئے کسی خارجی امداد کا محتاج نہیں۔ نُوۡرٌ عَلٰى نُوۡرٍ ؕ (24:35) کیا پوچھتے ہو۔ اس روشنی کا۔ وہ عام چراغ کی طرح تو نہیں ہے۔ روشنی کی تہیں ہیں۔ جو ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی ہے نور مجسم ہے۔ گویا جگمگاتے تہہ در تہہ چراغ ہیں۔ يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ (24:35) یہ ہے خدا کا وہ نور یعنی وحی جو ہر اس شخص کی رہنمائی کرتا ہے جو اس سے رہنمائی لینا چاہے۔ جو اس سے ہدایت لینا چاہے تو اسے ہدایت مل جاتی ہے۔ وَيَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ (24:35) اللہ اس قسم کی مجرّد حقیقتوں کو محسوس مثالوں سے اس لئے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۙ (24:35) جو جانتا ہے کہ ان حقائق کو کس قسم کی مثالوں سے واضح کیا جانا چاہئے۔ ورنہ ہمارے علم میں تو ہر ایک شے ہے لیکن یہ علم تم تک محسوس ذرائعوں سے پہنچے گا۔ اس لئے ان کو محسوس مثالوں سے سمجھانا پڑا ہے۔

آیت کا مفہوم:

خدا نے ہر شے کو پیدا کیا اور اسے اس راستے پر چلنے کیلئے رہنمائی دی جو اس کیلئے مقرر کیا گیا تھا۔ (20:51)

یہی خدا کا وہ نور ہے جو ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اشیائے کائنات میں یہ ہدایت ان کی پیدائش کے ساتھ ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی۔ لیکن انسانوں کو یہ رہنمائی کتاب کی شکل میں دی گئی۔ اس وحی کی مثال یوں سمجھو۔ جیسے کسی طاق میں جو پیچھے سے بند ہو۔ اس لئے محفوظ اور سامنے سے کھلا تاکہ اس کی روشنی ساری فضا میں پھیل جائے۔ ایک جگمگاتا چراغ جسے ستارہ صبحگاہی تاریکیوں میں نور پاش ہو۔ اس ستارے کو ایک صاف اور شفاف شیشے کے فانوس میں رکھ دیا گیا ہو تاکہ تمام خارجی اثرات سے محفوظ ہو۔ (41:42)

اس درخشندہ فانونس، نور کی ندیاں رواں دواں ہیں اور چراغ ایک ایسے بابرکت شجر کے تیل سے روشن ہو جو مغرب و مشرق کی نسبتوں سے بلند تمام نوع انسانی کیلئے ہو۔ ایسا تیل جو اس کا محتاج نہ ہو کہ کوئی خارجی روشنی اسے جلائے۔ وہ خود روشن ہے اور تاریک راستوں کو بھی روشن کرتا ہے۔ اپنے معانی اور تفسیر کیلئے کسی خارجی امداد کا محتاج نہ ہو۔ وہ چراغ کی نہیں۔ روشنی کی تہیں ہیں۔ جو ایک دوسرے کے اوپر، تو بر تو چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ سارے کا سارا نور ہے۔ نور مجسم ہے گویا آب گوہر کے سوا کچھ اور نہیں یہ ہے وہ روشنی جو ہر اس شخص کی رہنمائی کرتا ہے جو اس سے رہنمائی لینا چاہے۔

اللہ مجرد حقائق کو محسوس مثالوں سے اس لئے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ یہ باتیں اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ مثالیں اس خدا کی طرف سے ہیں جو جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور اسے کن مثالوں سے واضح کرنا چاہئے۔

اسلام بطورِ دین اور سیکولرزم بطورِ مذہب

(24:35) کی آیت سے تسلسل میں یہ (24:36) ہے اس چراغ سے جو بھی روشنی حاصل کرنا چاہے تو اسے مل جاتی ہے۔ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ (24:36) اب یہ چراغ ان تمام گھروں میں موجود ہے اس چراغ کے ذریعہ اس گھر کو بلندی اور رفعت ملتی ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ ان گھروں کو بلندی اور رفعت دو اس روشنی کے ذریعہ۔ آگے اس آیت میں ہے کہ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ (24:36) اس میں اس کی صفات کا چرچا ہوتا رہتا ہے اور ایسی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں رات دن کہ کس طرح سے اس پیغام کو عام سے عام کیا جائے؟ وہ مومن اس فکر میں سرگرم اور سرگرداں رہتے ہیں کہ اسے نوع انسانی تک کیسے پہنچایا جائے۔ یہ کوئی خانقاہوں والے نہیں بلکہ آگے ہے۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (24:37) یہ عام لوگ ہیں جو مصروفِ تگ و تاز ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ تجارت اور خرید و فروخت ان کو اپنی اس ذمہ داری سے غافل نہیں ہونے دیتی۔ یہ ہے ان مومنوں کا فریضہ حیات۔ یعنی وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ (24:37) وہ ان قوانین کی روشنی میں صلوۃ و زکوۃ کا عالمگیر نظام قائم کرتے ہیں تاکہ عالمگیر انسانیت کی روح و جسم دونوں کی نشوونما ہو سکے۔ یہ ہے اسلام کا نظام جو اس روشنی میں قائم کیا جاتا ہے۔

وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو۔ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ (24:37) اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ دن آجائے گا جب کہ ہر چیز الٹ کر رکھ دی جائیگی۔ فساد پھیل جائے گا۔ تو پھر دلوں کو اور نگاہوں کو الٹ کر رکھ دے گا۔ اس لیے وہ اس دن سے ڈرتے ہیں اور صبح و شام کوشاں رہتے ہیں کہ یہ اسلامی نظام قائم ہو جائے۔ قلوب کے الٹنے سے مفہوم کہ بڑے بڑے دانشور اور عقل والے اس فساد سے نکلنے کا کوئی حل نہیں پائیں گے۔ روسو اور لاک سے بھی بڑے جو جمہوریت کی نیلم پری سے آگے ابھی تک ایک قدم بھی طے نہیں کر سکے اور ابصار کے الٹنے کی بات ہے۔ نظر کی بات نہیں ہے پھر اس طاغوتی نظام کے اندھیرے بصیرت اور بصارت کو ناکارہ کر دیتے ہیں۔ اس کو روشنی نظر ہی نہیں آتی۔ اس لیے رِجَالٌ۔ مردِ مومن، جری اور بہادر جماعت صبح و شام کوشاں رہتے ہیں کہ یہ نظام قائم ہو جائے۔ جو اس چراغ کی روشنی سے پورے خطہ وارض کو منور کر دے اور یہ خطہ اپنے نشوونما دینے والے کے نظام سے جگمگا اٹھے۔ یعنی اس قرآن کی روشنی سے کرہ ارض جگمگا اٹھے گا۔ ربوبیّت عالمگیری سے جگمگا اٹھے گا۔ اور اس نظام کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (24:38) ہر شخص کو

674
اس کے کاموں کا صحیح صحیح نتیجہ مل جاتا ہے اور ایسے نظام میں اس کا کوئی عمل بے کار اور بے نتیجہ نہیں رہتا۔ غلط اعمال کا تباہ کن نتیجہ اور اچھے اعمال کا احسن اور خوشگوار نتیجہ۔ ایک ایک دانہ کے بدلے سو سو دانے ملتے ہیں۔ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ (2:261) اس کو رزق ان کے اندازوں سے زیادہ ملتا ہے یہ ہے قانون مکافات عمل اعمال کا ثمر بے حساب یعنی اندازوں سے بھی زیادہ۔

پہلے دور کی ملوکیّت کا نظام ہی آج کا جمہوری نظام ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (24:39) جو اس نظام سے انکار کرتے ہیں یعنی سیکولر نظام والے۔ سیکولرازم سے مراد ہی وحی اور اقدار خداوندی سے انکار کر کے انسانوں کیلیے خود ہی قوانین وضع کر لیا۔ کوئی حد نہ ہو۔ جس میں فائنل اتھارٹی یہی لوگ ہوں۔ چاہے آج کا جمہوری نظام ہو یا پہلے دور کی ملوکیّت، قدر مشترک ان میں یہی ہوتی ہے کہ اس میں ایک انسان کا فیصلہ ہو یا گروہ ہو، منتخب افراد ہوں یا پارلیمنٹ ہو۔ ان کو اقتدار مطلق حاصل ہوتا ہے یہ ہے سیکولر نظام۔ یہ ہے کفر۔ جبکہ قندیل آسمانی کے نظام میں معاملات باہمی مشاورت سے طے پاتے ہیں ان کی مشاورت ان قرآنی حدود کے اندر ہوتی ہے۔ اسے آپ Controlled Democracy کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہے اسلام۔ اگر یہ حدود اٹھا دی جائیں تو آج سیکولرازم اور کفر مرادف ہیں۔ اس میں کیا کہا گیا ہے بڑی عجیب آیت رہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ (24:39) یہ سیکولرازم والوں کے سارے کام کا نتیجہ ایک ایسے چٹیل سراب کی طرح ہے۔ یعنی پانی جو سراب بن کر صحرا میں نظر آتا ہے اسے پانی سمجھ کر لپکتے ہیں۔ پیاس کی شدت ہے۔ وہ اس سراب کو پانی سمجھ کر لپکتا ہے۔ لفظ ہے۔ بِقِيْعَةٍ (24:39) چٹیل میدان، کوئی سرسبزہ نہیں۔ پھر بھی اسے پانی سمجھتا ہے۔ اگر یہ ذرا عقل وفکر سے کام لیتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ جہاں پانی ہو تو وہاں سرسبز پودا، گھاس، ہریالی تو ہونی چاہئے۔ کوئی سبزہ نہیں، چٹیل میدان ہے۔ یہ لوگ اتنی سی بات بھی نہیں سوچتے۔ اگر یہ شخص فکر سے کام لیتا تو سراب کو پانی نہ سمجھتا۔ اس کے باوجود اس کو یہ پانی کیوں سمجھ بیٹھا ہے؟ کیونکہ یہ ظَمْاٰنُ پیاس کی شدت اسے یہ بات سمجھنے نہیں دیتی۔ اس کی فکری صلاحیتیں ماؤف ہو چکی ہیں یہ تو پھر یہی بات تھی۔ سراب کے ساتھ بِقِيْعَةٍ (24:39) کا مفہوم آیا سمجھ میں۔ ایک عظیم اصول قرآن نے دیدیا کہ انسان وہاں فریب کھاتا ہے جہاں جذبات فکر پر غالب آجائیں۔ اگر پیاس کی شدت ہو تو پھر آدمی نہیں سوچتا۔ یہ ہے جذبات کی شدت۔ جو عقل وفکر کی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیتی ہے قرآن اسے سراب کہتا ہے۔ اصل میں یہ آرزو، جذبہ، تمنا اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہ اسے حاصل پر مجبور کرتی ہے اور وہ فریب کھاتا ہے اور اس خود فریبی میں لذت ہوتی ہے جس طرح مذہب ہزار دانے تسبیح پر گنے تو انسان کو اطمینان مل جاتا ہے کہ صاحب جنّت مل گئی۔ یہ ہے سراب کی کیفیّت۔ جذبات کی شدت ہے جو تسبیح کے دانوں کے بعد سمجھ لیتا ہے کہ جنّت مل گئی ہے یہ ہے عقیدت مندی۔

اس لیے قرآن نے سراب کے ساتھ بِقِيْعَةٍ (24:39) کہا ہے کہ اگر عقل وفکر سے کام لیتا کہ پانی ہے تو ہریالی ہونی چاہئے۔ مگر پیاس کی شدت ہے اس لیے اس سعی لاحاصل میں تصوّر جاناں کئے مفت کی جنّت ہاتھ میں سمجھتا ہے۔ یہ سارا مذہب سعی

لا حاصل کی لذت کا نام ہے۔ اصل میں تو زاویہ نگاہ کو بدلنا ہے۔

؎ نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی فقط ایک دل کی شگفتگی سبب نشاط بہار ہے

قرآن تو زاویہ نگاہ کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس لیے وہ ہر سراب کو عقل وفکر سے دیکھتا ہے کہ اس کے قریب کوئی درخت ہے۔ پرندہ اڑ رہا ہے یہ ہے زاویہ نگاہ کا بدلنا۔ اس نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ (24:35) سے اس کی روشنی میں عقل سے کام لیا جائے عقل خود بیں یعنی سیکولرازم والی عقل سے نکل کر عقل جہاں بیں بن جائے ان سرکش جذبات کو قرآن کے تابع رکھا جائے۔

جبکہ یہ سیکولرازم والے۔ قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ؕ﴿۱۰۳﴾(18:103) اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (18:104) ساری کوششیں اس سیکولرازم میں کھو بیٹھتے ہیں۔ وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾(18:104) اسے حقیقی سمجھ کر اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اُولٰۤئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ﴿۱۰۵﴾(18:105) ان کیلئے تو میزان کھڑا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ ہیں وہ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ كَسَرَابٍۢ بِقِيۡعَةٍ يَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـًٔا (24:39) اہل طریقت اور اہل شریعت کا بھی یہی راستہ ہے۔ وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰٮهُ حِسَابَهٗ ؕ (24:39) اور پھر قانون مکافات کی صورت میں اس سعی لا حاصل کا انجام تھکان کے سوا کچھ نہیں۔ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ۙ﴿۳۹﴾(24:39) ہم تو بڑی جلدی حساب کر دیتے ہیں۔

تیسرا گروہ جو جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ تمام اندھیرے، تقلید، تواتر، توارث کے یعنی ظُلُمَاتٌ۔

سراب کے بعد یہ تیسری کیٹگری قرآن لایا ہے۔ اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّـجِّىٍّ يَّغۡشٰٮهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ (24:40) (آسمانی روشنی کے بغیر) ان کے اعمال کی مثال یوں سمجھو گویا جیسے کسی تلاطم انگیز سمندر کی گہرائیوں میں انتہائی تاریکی ہو اس تاریکی کو اور موج در موج لہروں کی تاریکیاں مزید چھا رہی ہوں اور اوپر چاروں طرف سے کالی گھٹائیں چھا رہی ہوں۔ مختصر یہ کہ تاریکیوں پر تاریکیاں ایک دوسرے پر چڑھ رہی ہوں اور ان حالات میں اسے اپنا ہاتھ بھی نظر نہ آئے۔

قرآن نے ظُلُمٰتٌ (24:40) کیلئے جمع کا صیغہ جبکہ نور کیلئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ ایک حق جبکہ دوسرا باطل ہے۔ صحیح جواب ہمیشہ ایک ہوتا ہے غلط جواب لاتعداد۔ صحیح جواب دو ہو ہی نہیں سکتے۔ جمع تو ایک طرف تثنیہ کے صیغہ میں بھی نہیں آ سکتا۔ اس لیے نور ہر جگہ واحد کے صیغے میں آیا ہے۔

تاریکی میں انسان خود کو بھی نہیں دیکھ سکتا:

تاریکیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ بتایا ہے کہ انسان خود اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ سراب میں تو اپنے جذبات سے دھوکا کھا جاتا ہے اور جہالت کی تاریکیوں میں اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتا اور یہ تاریکیاں موج در موج، تہہ در تہہ، اس کے اوپر چلی آتی ہیں۔ مذہب کی دنیا میں یہ تقلید کی تاریکیاں ہیں اور تقلید میں انسان اپنا تشخص کھو بیٹھتا ہے۔ فلاں مفسر کی کتاب میں

یوں آیا ہے۔حضرت صاحب نے فرمایا۔''میں'' رہتا ہی نہیں ہے۔جتنا یہ زیادہ سندیں کوٹ کرے گا۔اتنا ہی بڑا عالم کہلائے گا۔ جتنا جاہل اتنا ہی جید عالم کہلائے گا۔قرآن نے جو تہہ در تہہ تاریکی کا ذکر کیا ہے ان کے ہاں یہ تاریکی وہ ہے جس کی سندان کے ہاں تواتر و تواثر ہوتی ہے۔ان کے ہاں کسی بھی بات کی صداقت یہ ہے کہ بات امت میں تواتر سے چلی آ رہی ہے۔یہ تواتر تہہ تر تہہ، موج در موج ہوتا ہے۔پھر جتنا لمبا ہوتا جائے گا اتنی ہی اس بات کی سچائی، پختہ ہوتی چلی ہوتی ہے۔پہلا جھوٹ اگر پانچ سات تہوں کے اندر آ جائے یا آگے بڑھ جائے۔تو پھر وہ جھوٹ سچ ہو جاتا ہے۔یہ ان کی دنیا یعنی تواتر بہت بڑی سند ہے۔

ان کے سلف صالحین کے یہ قول تہہ در تہہ، موج در موج جمع ہیں۔کوئی فتویٰ ان سے مانگیئے اس میں اسلاف کے قول ہونگے کہ یہ چیز تواتر سے آئی ہے۔اس تواتر سے یہ قرآن کی آیات بھی منسوخ کرتے ہیں۔یہ ہیں وہ ظلمت، تہہ در تہہ، تاریکی تھی اگر آسمانی روشنی پہنچ جاتی تو یہ تاریکی چھٹ سکتی تھی۔انہوں نے خود ہی اس روشنی کے آگے بادلوں کی تہہ در تہہ بچھا رکھی ہے۔تاکہ سورج کی روشنی آنے نہ پائے۔اپنے عقل، فہم و شعور، علم و تدبر کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی اور نیچے خود ظلمت کے اندر رہ رہے ہیں تو اس سے یہ ''میں'' بھول گئے۔حالانکہ قرآن نے سب سے بڑی بات یہ بتائی تھی۔وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ (59:19) یہ اپنی ذات کو ہی بھول گئے۔قرآن تو انسان کو اس کے نفس سے آشنا کرتا ہے ؎

؎ شاخِ نہال سِدرہٗ خار و خسِ چمن مشو منکراو اگر شوی منکر خویشتن مشو

قرآن کی ساری تعلیمات کا نچوڑ صرف ذات انسانی کا تعارف ہے۔ظلمت یعنی ظلم سے مراد ہی جس چیز کو جہاں ہونا چاہئے اسے وہاں نہ رکھا جائے۔یعنی ایک تو یہ ہے کہ ایک چیز کو مقام بلند پر ہونا چاہئے اسے اگر نیچے گرا دیا جائے یا جو پست درجہ پہ ہو اسے اسی کے مقام سے اونچا کر دینا بھی ظلم ہے۔

دنیائے مغرب شدت جذبات کی گرویدہ ہے تو مشرق تقلید کا غلام ہے قرآن چھڑانے کے بعد دنیا دو ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک تو جذبات سے مغلوب مغرب سراب کی طرف رواں دواں ہے اور دوسرے جو ظلمت کی تاریکیوں کے اندر، سمندر کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے اور آسمانی روشنی (قرآن) کے سامنے تقلید کے اندھیروں والے بادلوں کی چادر تانے کھڑے ہیں۔مذہب پرست چاہے کوئی نام ہو اس کا، ان ظلمات میں رہتی ہے دوسرے یہ سراب والے ہیں۔وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ ﴿٤٠﴾ (24:40) اگر یہ آسمانی روشنی میسر نہ آتی تو پھر روشنی کہیں بھی نہیں مل سکتی۔دنیا سامنے ہے خدا کے ماننے والے بھی اور منکر بھی مگر کہیں بھی یہ روشنی نہیں ہے۔کائنات میں تو اسی روشنی کو ان کی جبلت میں رکھ دیا اور ہر ایک اپنے یہ فرائض تندہی سے سرانجام دے رہا ہے جبکہ انسان کو رسولوں کے ذریعہ قوانین دیئے۔

❁❁❁

''بدلے ہوئے حالات میں حق و باطل''
Absolute and Relative

Ethics(اخلاقیات):

انگریزی میں Morality عام اخلاق کو کہتے ہیں جبکہ Ethics وہ سائنس یا فلسفہ جو Morality سے بحث کرتا ہے۔

ہمارے ہاں ان کیلئے الگ الگ اصطلاحات نہیں ہیں۔ان دونوں کو اخلاق سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے۔خیر اور شر میں تفریق، حق و باطل میں تفریق، اخلاقیات کا بنیادی مسئلہ ہے یہ مسئلہ یونانی فلاسفر جو ابوالحکمت کہلاتے ہیں کے زمانے سے شروع ہوا اور آج تک چلا آرہا ہے اور حیرانگی یہ ہے کہ آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہوسکا۔ یہ بعض چیزوں کو حالات کے تحت اچھا اور دوسرے حالات میں انہی چیزوں کو برا یعنی حق کو ایک وقت میں حق اور دوسرے وقت میں اسے باطل قرار دیتے ہیں۔خیر کو اچھا کہئے شر کو برا۔تو حالات بدلنے کے ساتھ یہ چیزیں بدلتی جاتی ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اضافی (Relative) ہیں۔جس طرح سچ ایک وقت میں اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے مگر مصلحت کے تحت یہ سچ اور جھوٹ اضافی رہے گا۔مطلق نہیں ہوتا کیونکہ وہاں مصلحت کا تقاضا ہے کہ جھوٹ بول دیا جائے۔

بدلتے ہوئے حالات میں حق اور باطل کی تعریف:

اگر یہاں پہلی چیز یہ پوچھی جائے کہ جھوٹ بولنا کیوں برا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ جواب ہوگا کہ سوسائٹی اسے مذموم سمجھتی ہے اس لیے یہ بری چیز ہے اگر کل کو سوسائٹی اس کو اچھا سمجھنے لگ جائے تو پھر یہ اچھی ہو جائے گی۔ تاریخ میں کئی سوسائٹیاں ایسی گزری ہیں جھوٹ،فریب چوری نیکی کے کام سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان میں ٹھگوں کی جماعت کا پورا مذہب تھا ان میں درگاہ یا کالی دیوی کے پجاری تھے۔ان میں نوجوان لڑکے کی شادی اس وقت تک نہیں ہوتی تھی جب تک وہ دھوکہ دے کر مار نہ آئے۔کئی قبائل ماں باپ کو کچا کھا جانا بڑی نیکی سمجھتے تھے۔رومنز کے ہاں رومنز کو دھوکا دینا برا مگر غیر رومن کو دھوکا دینا بڑی نیکی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے ہاں بھی غیر یہودیوں سے سود لینا شیر مادر کی طرح حلال ہے۔ان مثالوں سے کہ سچ بولنا،عصمت کی حفاظت کرنا، دغانہ دینا، یہ سب مذموم تھا اور بعض سوسائٹیوں میں اس کے برعکس تھا۔حالات کے تابع یہ چیزیں بدلتی چلی جاتی تھیں۔ایسی چیزیں جو اس طرح سے بدلنے والی ہوں ان کو یا Relative کہتے ہیں یا مشروط ہوں حالات کے تحت کہ حالات بدل جائیں تو پھر اچھی باتیں بری اور

674
بری باتیں اچھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن حق یا صداقت تو وہ ہے جو اضافی نہ ہو بلکہ مطلق ہو اور ہر حالات میں وہ حق ہو۔ باطل ان تمام ادوار میں حالات میں باطل ہو ہر قوم ہر تمدّن میں باطل ہو۔ خیر مطلق وہ ہے جو مشروط نہ ہو جو کسی حالت میں بھی نہ بدلے۔ اپنے مقام پر محکم ہو۔ اضافی نہ ہو۔ عربی زبان میں حق کے ساتھ مطلق کا لفظ لگانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ تو حق کہتے ہی اسے تھے جو ہر مقام پر، ہر حالت میں، ہر شرط پر، اٹل ہو۔ ان کے ہاں اضافی کا تصوّر ہی نہیں تھا۔ یہ حقِ مطلق زبان کے اعتبار سے بھی غلط ہے حق ہے ہی The Truth یعنی ایک چیز بعض شرائط کے تابع شر ہے ذرا حالات بدل جائیں تو وہی خیر ہو جاتا ہے۔ بالکل غلط ہے۔

جنسی جذبات کی تسکین (Hedonism):

Hedonism ایک ضرورت تو طبعی ضرورت ہے اس سے روپیہ پیسہ ملتا ہے۔ یہ چیزیں جذبات کی تسکین کرتی ہیں۔ زنا کار کو جذبات کی تسکین کی زیادہ ضرورت ہے جو قرآن نے حرام مطلق قرار دیا ہے۔ اب یہ جنسی جذبہ کی تسکین کی خاطر کیا جاتا ہے۔ یہ ضرورت جذباتی ضرورت ہے۔ زندگی کی ضروریات پوری ہونے کے باوجود اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ① (102:1)۔ ہوس زرا سے لیے باری باری پھر رہی ہے۔ یہ جذباتی ضرورت تو طبعی ضروریات سے بھی کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔

Hedonism اخلاقی مفکرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ انسان کا مقصد زندگی حصول لذت ہے۔ یعنی ہر کام کا جذبہ محرکہ حصولِ لذّت کا خیال ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے تمام اعمال جو حصولِ لذّت میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ خیر (Good) اور جو اس مقصد کے راستے میں مانع ہوں۔ شر (Evil) کہلاتے ہیں۔ یہ نظریہ Hedonism کہلاتا ہے۔ Hedonism یونانی لفظ ہے اس کے معنی لذت Hobbes (Pleasure) نظریہ لذئیت کی انتہائی شکل Egoism کے نظریہ کا قائل تھا۔ یعنی اپنی ذات کیلئے حصول لذت۔ اسپونزا 1677 (Spinoza) نے اس میں یہ تبدیلی کی کہ انسان کو لذت اپنی ذلت کے تحفظ اور اس کی تکمیل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اعمال خیر وہ ہیں جن سے انسان تحفظ نفس اور اس کی تکمیل کر سکے اور اس کی بنیاد یں اس جذبہ خود غرضی پر ہیں۔ اور اس پر Hobbes کا نظریہ Egoism مبنی تھا۔ اس تصوّر پر رہبانیت کی عمارت قائم ہے یہی تجرّد اور انفرادیت جو یونان میں رواقیت (Staicism) کی بنیاد قرار پائی۔ یہ تصوّر اس کے ایک حسین پیکر کا نام ہے۔

اخلاقیات میں دوسرا نظریہ افادیت Utiliterianism ہے اس میں عمل خیر وہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ افراد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ مرتب ہو۔ ان کے آئمہ فکر John Mill بتاتا ہے کہ لذت کا حصول اور درد سے نجات ہی مقصود زندگی ہے۔ راشڈل اسے Ideal utiliterianism کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔

نظریہ ارتقاء کا حامی ہربرٹ اسپینر 1903 بقائے اصلح کا موجد بنا۔ Survival of the fittest کا موجد بنا اور طبعیات کے دائرے سے نکال کر اسے اخلاقیات کے دائرے میں لے آیا۔ اسے ارتقائی اخلاقیات کہتے ہیں۔ جس میں نوع انسانی کا باقی رہنا ہی خیر ہے اور اس بقاء کیلئے ماحول سے مطابقت ضروری ہے۔ اس کا قول ہے کہ اخلاقیات کی بنیاد انتقام کا خوف ہے۔ اگر انتقام کا خوف نہ رہے تو پھر اخلاق کا تصوّر ہی باقی نہیں رہتا۔ اس کے طرز فکر کو فطریت (Naturalism) یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ (Humanism) نظریہ انسانیت بھی کہتے ہیں۔ انتھروپالوجی (علم الانسان) اور سوشیالوجی کی رو سے اخلاقی ضوابط ان

رسوم کے مجموعہ کا نام ہے جنہیں سوسائٹی نے وقتاً فوقتاً اختیار کیا۔ جونسلاً بعد نسل متوارث چلے آئے۔ اس سے اخلاق بدلتے رہتے ہیں۔Paul کے الفاظ میں اخلاقیات کامیابی کا دوسرا نام ہے۔ اس روش کا نام۔ مصلحت کوشی Expediency ہے اور جھوٹ اچھی چیز ہے۔ یہ ہے ان کی Institutionalistic theory of Ethics۔

ہر جرم کا ارتکاب ضرورت کا رہینِ منت:

اگر تصوّر اور نظریہ یہ ہو جائے کہ ضرورت کے مطابق ایک چیز جو غلط ہے وہ صحیح ہو جاتی ہے۔ اسے حق قرار دیکر معاشرے میں قانونی حیثیت حاصل ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی چیز باطل مطلق یا شر مطلق نہیں رہتی۔ بڑے سے بڑا قاتل بھی اس جرم قتل کے جواز میں کچھ نہ کچھ کہے گا کہ میں نے کس ضرورت کے تحت یہ جرم کیا۔ مثلاً انتقام لیا جو ایک جذباتی ضرورت تھی۔ اب یہ تمام ضرورت کے تحت اضافی چیزیں ہیں۔

وحی کی ضرورت:

یہاں آ کر وحی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو ایسی چیزیں دیتی ہے۔ جو مطلق حق ہوتی ہیں۔ ورنہ ان کا عقل تو ہم جنسی کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔

کل تک جو ان کے ہاں جرم تھا، شر تھا، باطل تھا، دوسرے وقت میں اسے بدل کر اس کے خلاف قانون بنا دیا۔ یہ ہے سیکولر ازم جس میں کوئی قدر حقِ مطلق نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ فساد ہے جو ساری دنیا میں اس وقت قائم ہے۔ یونان سے لیکر آج تک ساری دنیا اس کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی کہ مطلق حق یا خیر کیا ہے؟ لیکن آج بھی انسان وہیں کھڑا ہے مطلق کو تو بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ (10:64) مطلق تقاضوں کے مطابق، ضروریات کے مطابق تبدیل نہیں ہوتا۔

؎ آدمی اندر جہانِ خیر و شر	کم شناسد نفع خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوب کار چیست؟	جادۂ ہموار و ناہموار چیست؟

دانشِ نورانی و دانشِ برہانی:

قرآن عقل سے کام لینا سکھاتا ہے یہ سائیکالوجسٹ فلاسفروں سے آگے بڑھ گئے ہیں ان کے ہاں دو اصلاحات استدلال (Reason) ہے۔ دوسری چیز منطقیانہ عقل (Rationalising Intellect)۔ جو اضافی چیزیں روز بدلتی ہیں اس کو حق ثابت کرنے کیلئے یہ جو عقل ہے یہ اپنے فیصلوں کو (منطقی) (Rationalise) کرتی ہے۔ عقل اور عقل کے اس فرق کو اقبال دانش برہانی اور دانش نورانی کہتا ہے۔ یعنی اس Rationalising عقل کو دانش برہانی کہا ہے اور دانش نورانی کو ماہرین نے خرد کہا ہے۔ یہی چیز اقبال کہتا ہے کہ وحی حق مطلق کے حق میں جو دلائل دیتی ہے وہ دانش نورانی ہے قرآن بات منوانے کیلئے جسے حکمت کہتا ہے یعنی مطلق حق کے دلائل وہ Reason کہلا سکتی ہیں اور جو باطل کو حق ثابت کرنے کیلئے دلائل وہ Ratioalizing کہلا سکتے ہیں۔ دوسری جگہ انہی کو اقبال عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں کہتا ہے۔

ے عقل خودبیں غافل از بہبودِ غیر | د خود بیند نہ بیند سودِ غیرسو
وحی حق بینندہ سودِ ہمہ | درنگاہش سود و بہبود ہمہ

وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ (13:17) یعنی پوری عالمگیر انسانی کیلئے جو عمل ہوا سے ہمیشگی حاصل ہوتی ہے ورنہ اپنی ذات، خاندان، قبیلہ، قوم کی منعفت سوچنا یہ دانش بر ہانی، عقل خود بیں یا Rationalizing کہلاتی ہے جبکہ تمام نوع انسانی کی منعفت والی عقل دانش نورانی عقل جہاں بیں یا آج کی اصطلاح میں Reasion کہیں گے۔

ے عشق ناپید و خردمی گزدش صورتِ مار
(وحی سے محروم عقل کی رو سے چیزیں سانپ کی طرح اسے ڈسنے لگتی ہیں)۔

ے اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا | آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

قرآن الفرقان ہے جو حق و باطل کا فرق بتا دے۔ مانگ کی طرح سیدھی یا ٹیڑھی کچھ بال ادھر آ گئے ہیں۔ یہ محسوس مثال سے قرآن کا واضح کرنا۔ جو ضروریات اور تقاضوں سے بالا ہو۔ ہر زمانہ، حالت، ہر آن، حق حق رہتا ہے۔ خیر خیر ہوتا ہے اور پوری نوع انسانی کیلئے ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (25:1) اپنے مقام پر اٹل اور مستحکم اور زمانے کی ضرویات ساتھ ساتھ پوری کرتا جائے۔ نشوونما اور ارتقاء کے ساتھ ساتھ۔ کوئی مصالحت نہیں ہوسکتی۔ جنگ بدر کو یوم الفرقان کہا گیا ہے مگر ضرورت کے تحت کوئی مصالحت نہیں کی۔ اگر کامیابی نہ بھی ہو تو معلوم ہو جائے گا کہ حق پر کھڑے ہونے والے جان دیدیا کرتے ہیں مگر مصالحت نہیں کرتے۔ جنگ بدر عملی طور پر فرقان کی زندہ مثال ہے۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ (8:41) جب دو لشکر آمنے سامنے مدمقابل آ گئے تھے۔ یہ ہے دوقومی نظریہ۔ یہ تمام مومن حقّا تھے۔ اور دوسری جانب اس نظریہ کے مخالف۔

تقدیر کا مفہوم:

وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾ (25:2) تقدیر یعنی وہ منزل جہاں اس نے پہنچنا ہے اس کیلئے فَقَدَّرَهٗ (25:2) پیمانے، قوانین بنا دیئے۔ اگر ان قاعدوں کے مطابق چلے گی تو پھر منزل تک پہنچ جائے گی۔ یعنی Destination آخری منزل، وہاں Destiny جس کو مقدر اور قسمت بنا دیا ہے۔ Destination سے Destiny وہ تو لے آئے جبکہ ہم جن کے ہاں یہ لفظ ان معنوں میں آیا تھا ہم نے کبھی ان معنوں میں اس لفظ کو استعمال ہی نہیں کیا۔

حرفِ باریکش بہ رمزے مضمر است | تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شونذرِ ہوا سازد ترا | سنگ شو برشیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست | قلزمی! پائندگی تقدیرِ تست
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست | زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است

حق کا قیام انسانی زندگی میں (25:25)

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ (25:25) جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائے گا تو وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ (25:25) اور کائناتی قوتیں بتدریج اتاری جائینگی۔ یعنی باطل کی جگہ اس دور میں جب حق کا نظام، الجنۃ قائم ہوگا۔ تو انشقاق ہوگا۔ یعنی عرب اَلشَّقُ کو طلوع سحر بھی کہتے تھے۔ غمام سے مراد بادل ہیں۔ قرآن ہر جگہ مردہ زمین کو حیات نو عطا کرنے کیلئے ہمیشہ بادلوں کو مینہ سے تشبیہ دی ہے یعنی اقدار خداوندی سے حیات نو عطا کرنے والے ذرائع و اسباب ملیں گے۔ جب غلط نظام کی تاریکیاں چھٹ کر طلوع سحر ہوگا۔ تو یہ فطرت کی قوتیں ان تمام اسباب و ذرائع کو آہستہ آہستہ لائیں گی۔ یکلخت نہیں آئینگی۔ پھر اس دور کی کیفیت کیا ہوگی۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ (25:26) تو اس دور میں حق پر مبنی اقتدار اور کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو خدا کی صفت رحمانیّت سے سرشار ہونگے۔ تو ان لوگوں کا فریضہ عالمگیر نشوونما ہوگی۔ یعنی ایسا نظام جس میں دودھ کی نہروں کے ساتھ ماں کی ممتا جیسی شہد کی نہریں بھی رواں دواں ہونگی۔ اَلْمُلْكُ (25:26) باپ کا مشفقانہ کنٹرول بھی یعنی بچہ کی صحیح تعلیم و تربیّت رحمت اور الملک کے امتزاج کی عکاس ہوگی۔ جو قوم صرف Mother child بن کے رہ جائے۔ تو وہ اپنی حفاظت اور نشوونما کیلئے دوسروں کی محتاج ہوکر رہ جاتی ہے۔ خدا کو بھی ماں کے قالب میں ڈھالتی ہے پھر ماں دھرتی بھی ہے۔ گائے ماتا، اگنی ماتا، ہندوؤں نے دھرتی ماتا کا تصوّر دیا اور ہم نے بھی دیکھا دیکھی مادر وطن کہنے لگ گئے۔ نتیجہ کہ ہزار سال سے محکوم چلے آ رہے ہیں اور جو قوم یہودیوں کی طرح خالص باپ کی آغوش میں ہی پرورش پائے۔ ماں کی محبت اور شیرینی نہ ہو تو ایسی قوم میں ماں جیسا رحم کا جذبہ نہیں ہوتا اس لیے ان کے ہاں خدا کا تصوّر باپ کا تصوّر ہے۔ قرآن نے آکر ماں اور باپ دونوں کا امتزاج کر دیا۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ (25:26)

❁❁❁

قرآن کے نزول کے متعلق کفار کے اعتراضات

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (25:32) روزتم بتاتے ہو کہ آج یہ حکم آیا ہے اب یہ تقاضا ہے تو پورے کا پورے ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ کہا كَذٰلِكَ (25:32) اس طرح اتارا گیا ہے 23 سال میں بتدریج نازل کیا گیا ہے۔ كَذٰلِكَ (25:32) یہ اسی طرح ہماری مشیت کے مطابق ہے۔

موتیوں کی ایک مالا ہے۔ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ (25:32) یہ تو بتدریج ایک ایک قدم پر ایک ایک پروگرام کی کڑی ہوگی۔ اسے سمجھایا جائے گا۔ ان کو اس پر آمادہ کر کے اس کڑی پر عمل ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ آیت آ گئی ہے پھر دوسری آیت آ گئی۔ ایسا بکھرا ہوا انداز قطعاً نہیں ہے بلکہ اس پروگرام میں ایک کڑی میں سے دوسری کڑی خود بخود نکلتی جائے گی۔ یہ ترتیل یا رتل ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہیں۔ جو بظاہر الگ الگ ہیں مگر مربوط ہیں۔ تا کہ ایک کڑی میں سے دوسری کڑی نکلتی جائے۔

پورا پروگرام سامنے ہے مگر جب ایک حصّہ پر عمل ہو جائے گا تو پھر از خود اگلی کڑی آ جائے گی۔ پھر ان کو اس کی تربیّت دی جائے گی۔ پھر عمل ہوگا۔ اس کے بعد اگلا قدم دوسری کڑی، اس طرح کڑی در کڑی یہ پروگرام اپنے احسن و حسین انجام سے ہمکنار ہوگا۔ یہ ہے سائنٹفک انداز۔ یہ بتدریج ترتیل کہلاتی ہے۔ جس طرح پودے کی نشوونما میں خود بخود ایک اگلی سٹیج اس پودے میں آتی جاتی ہے کونپل سے پتیاں، کونپل بڑھ کر شاخیں، پھر ادھر ادھر نکل کر اس میں شگوفے، پھول اور آخر میں پھل۔ یہ یکبارگی نہیں ہوتا بلکہ بتدریج عمل ہے۔ اس بتدریج میں پچھلی کڑی جب تکمیل تک پہنچ جائے تو پھر اگلی کڑی نکلتی ہے یوں یہ ایک پروگرام کے تحت ترتیلاً شروع سے آخر تک پہنچتی ہے۔ اسے ترتیل کہا جاتا ہے۔ مسلسل کڑیوں کا یوں نکلنا ایک مربوط نظام کے تحت ترتیل کہلاتا ہے۔

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ (73:4) اور قرآن پر عمل ترتیل سے یعنی درجہ بدرجہ ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی پر ہوگا۔ اس لیے اس پر عمل بھی ترتیل سے کرو کیونکہ اس کا نزول بھی ترتیل سے ہو رہا ہے قرآن میں ایک آیت کا دوسری آیت کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ دین کا پروگرام سامنے ہو تو پھر پتہ چلتا ہے۔

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (25:32) اس طرح سے تیرے دل کو بھی ثبات اور تقویت حاصل ہوگی۔ یعنی کسان کی طرح بیج بونے کے بعد، پانی دینے کے بعد، دھوپ سے بچانے کے بعد اس کی حفاظت کرنے کے بعد تو پھر ہر روز اس کا آنا ترتیلاً ہے جس طرح

674

سے یہ پودا نشوونما پا رہا ہے تو اس کی نشوونما پر کسان کو تقویت ملتی ہے۔ کوششوں کا نتیجہ سامنے آ رہا ہے اگر نتیجہ بالکل پروگرام کے مطابق نکل رہا ہو۔ تو اس سے تقویت قلب حاصل ہوتی ہے۔ یہ پروگرام ہوگا تدریجاً لیکن ہر قدم، ہر درجہ بتا دے گا کہ تمہارا قدم واقعی منزل کی طرف اٹھ رہا ہے اس سے قلب کو تقویت حاصل ہوگی۔ اس لیے ہم بھی اسے بتدریج نازل کر رہے ہیں اور تم بھی اسے بتدریج منزل تک پہنچاؤ۔ اس میں تو تغیرِ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتاب وحکمت وتزکیہ نفس کی ضرورت ہے یہ بڑا ہی لمبا وقت لیتا ہے۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿٣٣﴾ (25:33) یہ جو بھی اعتراض کرتے ہیں ہم اس کا جواب عمدہ توازن اور حق وصداقت سے دیتے ہیں۔ اس لیے ان باتوں سے تمہاری تکذیب نہیں ہوتی۔ اس کا جواب ہم دیں گے یعنی اپنی تفسیر خود کرے گا اور تفسیر مصنف خود کر رہا ہے۔ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴿١٧﴾ (75:17) اس کا جمع کرنا اور حفاظت سے رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿١٩﴾ (75:19) اور اس کی توضع وضاحت، ابھار کر، نکھار کر، واضح طور پر بیان کرنا۔ یعنی تصریف آیات کے ذریعہ قرآن ایک مقام کی دوسرے مقام سے وضاحت کرتا ہے۔ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿٣٣﴾ (25:33) نہایت متوازن، مدلل اور واضح تفسیر، نہ کمی اور نہ زیادتی۔ کیونکہ اعتراض ہماری کتاب پر کیا جاتا ہے لہٰذا اس کا جواب بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

غیر محسوس حقائق کو محسوس مثال سے واضح کرنا قرآنِ حکیم کا شاندار انداز ہے

سایہ کی مثال:

اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَیۡہِ دَلِیۡلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضۡنٰہُ اِلَیۡنَا قَبۡضًا یَّسِیۡرًا ﴿۴۶﴾ (25:45-46)

ایک بدو کو بھی سمجھایا جا رہا ہے اور آج کے آئن سٹائن کو بھی، خارجی کائنات میں چونکہ جذبات نہیں ہوتے۔ اس لیے کوئی چیز اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ نہیں کرتی۔ ذرا اس سایہ کو تو دیکھو بڑی عجیب مثال ہے کیا کوئی شے اپنی مرضی سے اپنا سایہ مقرر کر سکتی ہے۔ قطعاً نہیں کیونکہ اس کیلئے قانون ہے۔ سورج بلند ہو کر، اس کے مطابق سایہ بنتا چلا جاتا ہے۔ انسان سے کہو کہ اس قدر اختیار و ارادہ ہے تو اگر یہ مغرب کی سمت جائے تو سایہ اپنے پیچھے چلا جائے۔ یہ ہے وہ طبعی قانونی جس کے سامنے یہ بے بس ہے اور جہاں اس کے اختیار و ارادہ کو ہمارے قوانین کے تابع ہونا چاہیئے۔ یہ ان قوانین سے انکاری ہے سایہ اس کی مرضی کے تابع نہیں ہے۔ یہ سورج اس کو متعین کرتا ہے۔

''کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کا قانون کس طرح (زوال آفتاب کے بعد) سائے کو لمبا کرتا ہے ہم چاہتے تو ایسا قانون بنا دیتے کہ (زمین گردش نہ کرتی) تو سایہ ہمیشہ ایک جیسا رہتا۔ لیکن ہم نے (سورج اور زمین کی گردش کا باہمی تعلق ایسا رکھا ہے) کہ ہر شے کا سایہ سورج کی نسبت سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اس طرح سورج اس کے گھٹنے اور بڑھنے کی دلیل بن جاتا ہے۔ یعنی سورج کے مقام سے سایہ کے انداز کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ (یوں زوال آفتاب کے وقت سائے گھٹنے شروع ہوتے ہیں) حتیٰ کہ ہم انہیں آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ یعنی غروب آفتاب کے ساتھ سائے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔''

یعنی فرق یہ ہے کہ اشیائے کائنات تو مجبور ہیں۔ وہ اطاعت پر مجبور ہیں جبکہ انسانوں کو قوانین دیکر پھر ان پر چھوڑ دیا۔ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ ۙ (18:29)

دنوں کے نام بتوں کے نام پر رکھے گئے

جب عیسائیت نہیں آئی تھی۔ ان یورپ والوں کے ہاں بت پرستی تھی۔ انہوں نے بتوں کے نام پر دنوں کے نام رکھے تھے۔ یعنی SUN (سورج) دیوتا کا دن Sunday سے Moon سے، Monday (چاند دیوتا کا دن) Tuesday، منگل، Tiu (جرمنی دیو مالا میں جنگ اور آسمان کے دیوتا کا نام) Wednesday (بدھ) یعنی Wednesday (اینگلوسکین دیو مالا میں سالار دیوتا کا دن) Thursday جمعرات Thor، Thorisday سکنڈ نیون ممالک گرج کے دیوتا کا دن Firday (جمعہ)، Day of frig یعنی اسکنڈ نیون میں گھر بار ازدواجی زندگی کی دیوی کا دن۔

مصر میں آمن رع (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا لقب فارع یعنی سورج کا دیوتا قرار پایا۔

عیسائی اور یہودیوں کے تعلقات نفرت پر مبنی تھے۔ عیسائیوں کے ہاں انجیل میں تو کوئی قانون نہیں ہے۔ یہ یہودیوں کے قانون پر ہی تھے۔ لیکن یہ عیسیٰؑ کو صلیب دینے کی وجہ سے سخت نفرت کرتے تھے۔ یہ عیسائی یہودیوں کے علی الرغم کرتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں خنزیر حرام تھا۔ انہوں نے کھانا شروع کر دیا۔ یہودیوں کا ختنہ بھی حرام اور ان کے ہاں یوم سبت چھٹی کا دن ہفتہ کا تھا۔ عیسائیوں نے اتوار کو Holyday قرار دیا۔ قرآن نے زندگی بھر کسی بھی دن کو چھٹی کا دن قرار نہیں دیا۔ قرآن نے آ کر کہا زندگی کام کرنے کیلئے ہے۔ اس نے کسی بھی دن کو مقدس دن نہیں کیا۔ (Holyday) ہر دن مقدس اور یکساں ہے۔ وہ تو دیوتاؤں کی تقدیس کی وجہ سے ان کو مقدس دن Holyday کہتے تھے۔ قرآن کی رو سے، کسی ایک دن کو بھی مقدس قرار نہیں دیا اور ہفتے میں تو ایک طرف رہا وہ تو زندگی بھر کسی بھی دن کو چھٹی کا دن قرار نہیں دیتا۔

جمعہ کے روز جمع ہونے کا مقصد نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ (62:9) یَّوْمِ الْجُمُعَةِ (62:9) سے مراد وہ مخصوص جمعہ کا دن نہیں ہے بلکہ اجتماع کا دن ہے جب اس اجتماع کیلئے بلایا جائے تو سب کام چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آؤ۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ ص (42:38) معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کرنے کیلئے وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ (62:9) تو کام کاج چھوڑ کر آؤ۔ یعنی آواز سے کام کاج کرنے کی بات ہے اگر یہ چھٹی کا دن ہوتا تو پھر اس میں کام کاج چھوڑ دو، کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (62:10) تلاش معاشی کیلئے نکل جاؤ۔ کوئی چھٹی کا تصوّر ہی نہیں ہے۔

جہادِ کبیر

جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾--- وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴿٥٢﴾ (25:52) یہ جہاد کبیر کیا ہے۔ وہ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿١١١﴾ (17:111) خدا کی کبریائی قائم کروتا کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) چونکہ اس سے ٹکراؤ ہوگا۔ اس لیے مسلسل جدوجہد ہو گی اور آخر میں جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ (25:52)۔ سرتوڑ کوشش جو آخرلامر غالب ہوکر رہے۔ اس کبیر کے معنی قرآن خود واضح کرتا ہے۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ (40:12) جب ان کو خدائے واحد کی اطاعت کیلئے بلایا جائے تو انکار کرتے ہیں۔ جب اس کے ساتھ دیگر قوانین کو ملایا جائے تو پھر کہیں کہ ہاں اب مانتے ہیں۔ آگے ہے۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿١٢﴾ (40:12) سارے فیصلے اس کے قوانین کے تحت ہوتے ہیں۔ وہ کبریائی کا مالک اور سب سے اعلیٰ وارفع ہے غلبہ اور حق حکومت صرف اس کو حاصل ہے۔

مرزا صاحب نے آکر تلوار والا جہاد منسوخ کر دیا اور کہا کہ اب جہاد کبیر کیا کرو ایک حدیث پیش کر دی۔ کہ نبی ﷺ نے ایک جنگ کے بعد لوٹتے ہوئے کہا کہ ہم اب جہادِ صغیر سے جہاد کبیر کی طرف جا رہے ہیں۔ یعنی اب تبلیغ جہاد کبیر ہے اور میدان جنگ والا جہاد، جہادِ صغیر ہے۔ جہادِ کبیر قلم سے ہوگا۔ تبلیغ کے ذریعہ، وعظ کے ذریعہ ہوگا۔ حالانکہ کیفیت یہ تھی زندگی کے آخری دور میں بھی آپ ﷺ جنگِ تبوک کی طرف گئے۔ اس دوران حضور ﷺ کی وفات ہوئی تو اسامہؓ بن زید اس کا سپہ سالار بنا۔ حضور ﷺ تو زندگی کے آخری سانس تک اس جہاد کے اندر رہے۔ آپ ﷺ تو یہی کرتے رہے تو کیا پھر زندگی کے آخری سانس جہاد تو جہادِ صغیر ہو گیا؟ ساری باعمل قوم کو ان حدیثوں سے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ ایک حدیث سے سارا قرآن منسوخ کر دیا جبکہ حکم یہ تھا۔ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ (25:52) ایسی سرتوڑ کوشش جو آخرلامر غالب ہو جائے۔ اس سے مراد قرآن کے سایہ میں جہاد ہوگا تلوار کے ذریعہ

؎ ایں دو قوّت حافظ یک دیگر اند	کائنات زندگی را محور اند
مومناں راتیغ باقرآں بس است	تربت مارا ہمیں ساماں بس است

یہ شرف النساء بیگم جو نواب عبدالصمد کی بیٹی تھیں اور اس نے وصیت کی تھی کہ قبر میں قرآن کے ساتھ تلوار بھی رکھو۔

❀❀❀

کارخانۂ قدرت میں اقسامِ تفریق کی مثال (Diversity)

پوری نوع انسانی میں مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں مختلف اقسام تو ایک طرف رہیں۔ یہاں تو ایک فرد دوسرے فرد سے نہیں ملتا۔ ان میں امتیاز، افتراق، تخصیص اور تمیز پہ غور کرنے سے حیرت ہوجاتی ہے۔

اقسام تفریق کی حیران کن مثال:

غور کریں ایک شخص کے انگوٹھے کی کتنی ہی لکیریں ہیں۔ یہ مقام ایک انچ کے برابر تو ہے۔ مگر یہ دنیا میں کسی دوسرے شخص سے نہیں ملتیں۔ یہ آج موجودہ دو ارب انسانوں کی بات نہیں۔ یہ تو جب سے انسان پیدا ہونا شروع ہوا ہے اس کی آج تک کی بات ہے۔ مثلاً جو پہلا انسان تھا اور آج کا ہے ان کے بھی دو انگوٹھے ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے اور نہ آج کے انسان کے ملتے ہیں۔ یعنی انفرادی تفریق کی کیفیّت تو یہ ہے کہ یہ ایک انچ جگہ ہے۔ تصوّر میں نہیں آ سکتا کہ چند لکیروں کے اندر اتنے مختلف ڈیزائنز بنانا کہ ایک ڈیزائن دوسرے سے ملے ہی نہ۔ معلوم نہیں کہ اس پر کیسا حساب دان فرشتہ لگا رکھا ہے اس کے بعد Accuracy کی یہ کیفیت کہ وہ کبھی غلطی نہیں کرتا! دنیا بھر کے حساب دان بٹھا دیں۔ وہ لکیروں کو ادھر ادھر ہی کچھ کرنا ہے۔ اتنے ایک انچ کے رقبہ میں کوئی دو انسان ایسے نہیں کہ جن کی یہ لکیریں ایک جیسی ہوں۔ بعد ان چند لکیروں سے شناخت ایسی کہ کسی اور طریق سے اس کی متعین طور پر شناخت نہیں ہوتی۔ مجرموں کو انہی سے شناخت کیا جاتا ہے۔ ایک فرد کی دوسرے فرد سے یہ کیفیّت ہے۔

قرآن نے انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ پچھلی آیت۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾ (25:52) یعنی ان انکار کرنے والوں کی مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ ان کی باتوں میں نہ آ جانا۔ یہ تمہاری مخالفت کرینگے۔ ان کے باطل نظریات کے ساتھ تو مصالحت ہو نہیں سکتی تو دو متضاد نظریات ہیں۔

انسان کی اقسام شمار کرتے جایئے۔ نسلیں، قبیلے، قومیں، رنگ، زبان، شکل اور شباہت کتنے ہی ہیں مگر قرآن نے تمام انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط (64:2) سارے انسان ایک ہی ہیں مگر دو گروہوں میں بٹ گئی ہیں۔ ایک صداقتوں کو تسلیم کر کے مومن جبکہ دوسرے ان صداقتوں سے انکار کر کے کافر بن جاتے ہیں۔ یہ کوئی گالی نہیں ہے۔ بلکہ اسے ممبر اور نان ممبر کہہ لیجئے۔ یہ ہے تقسیم قرآن کی رو سے شروع سے اور یہ ہے دو قومی نظریہ اور انسان کی ساری تاریخ ان دو نظریات میں ٹکراؤ کی ہے اور یہ ٹکراؤ آخر تک ہوگا۔ بدر میں اور احد میں ہوگا۔ مقصد قرآن کا یہ ہے کہ یہ ظاہرا اکٹھے ایک جگہ رہتے ہیں۔ لیکن ان دو انسانوں کے اندر دو بنیادی تفاوت کس قدر ہیں کہ یہ دونوں گروہ آپس میں مل نہیں سکتے۔ اب جیسا کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے

کہ وہ ساری بات کو محسوس مثال سے سمجھا تا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىۡ مَرَجَ الۡبَحۡرَيۡنِ هٰذَا عَذۡبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلۡحٌ اُجَاجٌ‌ ۚ وَجَعَلَ بَيۡنَهُمَا بَرۡزَخًا وَّحِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا ﴿۵۳﴾ (25:53) پانی کی زیر زمین لہریں جو ساتھ ساتھ جاری کر دی گئی ہیں۔ایک پانی بارش کا تو پہاڑوں سے آتا ہے دوسرا اصل پانی کا ذخیرہ وہ زمین کی سطح کے نیچے ہے۔ایک جگہ کنواں کھودیئے تو کڑوا جبکہ ذرا ہٹ کر کھودیئے تو میٹھا پانی ملتا ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ یہ دونوں سٹریمز (Streams) مل جائیں یہ ہے اس کی رحمت ورنہ کڑوا اور کھاری اپنی میٹھے پانی میں مل کر اسے بھی کڑوا اور کھاری کر دیتا۔اب یہ لہریں اس قدر فراوانی سے رواں دواں ہیں کہ اس قدر ٹیوب ویل چل رہے ہیں یہ دونوں لہریں آپس میں نہیں ملتیں۔ حِجۡرًا مَّحۡجُوۡرًا ﴿۵۳﴾ (25:53)۔یعنی پتھر کی چٹانیں جو بَرۡزَخًا (25:53) ایک آڑ۔روک بن کر ان کو ملنے سے روک دیتی ہیں۔ چودہ صدی قبل زیر زمین پانی کی باتیں ہو رہی ہیں۔بات یہ سمجھائی کہ سارے انسان ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔تو پھر ان کے درمیان اتنا بیّن تفاوت ہے۔ایک شرافت کا مجسمہ جبکہ دوسرا غنڈہ نظر آتا ہے۔ایک ان صداقتوں کو ماننے والا جبکہ دوسرا انکاری ہے۔اس لیے اس میں تعجب کی بات نہیں ہے جس طرح یہ قریش یہیں کے رہنے والے اور باقی انسان بھی ایک ہی جیسے انسان جبکہ کیفیّت یہ ہے کہ ساری عمر مخالفت کرتے رہے اور میدان جنگ تک میں اتر آئے۔

زندگی کے تسلسل کو ماننے والوں اور اس سے انکار کرنیوالوں کے مابین ایک پردہ حائل ہے۔اب اس محسوس مثال کے بعد وہ انسانوں کی طرف آجاتا ہے۔وَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ ﴿۴۵﴾ (17:45) جب تو قرآن پیش کرتا ہے اس کا اعلان کرتا ہے۔آگے ہے۔ جَعَلۡنَا بَيۡنَكَ وَبَيۡنَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا (17:45) ان دونوں کے درمیان وہ پردہ جو مستور ہے یعنی تمہاری نگاہوں سے خود پردہ چھپا ہوا ہے یہ ہے وہ انڈر گراؤنڈ کرنٹ جو نظر نہیں آتی لیکن جس طرح آپس میں دو پانی نہیں ملتے۔تو اس طرح یہ انسان بظاہر شکل وشباہت کے اعتبار سے انسان نظر آتے ہیں۔مگر ان دونوں کے درمیان ایک نگاہوں سے مستور پردہ ہوتا ہے۔

اصل سوال انسانوں کا طبعی طور پر یا قبائلی طور پر تقسیم ہونا نہیں:

وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا (25:54) یعنی ان سب کی نمود ایک ہی ذریعہ پانی سے ہوئی۔پھر یہ بشر بن گئے۔تو اس کے بعد اپنے آپ کو نسل وقبائل اور اقوام میں بانٹ دینا تو صرف تمدّنی بات ہے۔جو صحیح تقسیم نہیں ہے حالانکہ خاندان کا آغاز کیسے ہوتا ہے۔جس سے آگے تم پر قبائل اور اقوام میں اپنے آپ کو تقسیم کر دیتے ہو۔فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهۡرًا‌ ؕ (25:54) پھر تمہارے دو رشتے نسب اور صھر بنائے۔یعنی نسب آباؤ اجداد اور صِهۡرًا‌ ؕ یعنی سسرال کا رشتہ۔دونوں رشتوں کو ایک سطح پر رکھ کر واجب الاحترام بتا دیا ہے۔جاتے جاتے دو لفظوں میں یہ سارے تنازعات حل کر گیا کہ یہ دونوں اس کے قوانین کے تحت بنے ہیں۔وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيۡرًا ﴿۵۴﴾ (25:54) یہ اس کے پیمانوں کے مطابق دو خاندان ایک خاندان بنتے ہیں۔اس کے بعد تمہاری حالت یہ ہے۔

وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُهُمۡ وَلَا يَضُرُّهُمۡ‌ ؕ (25:55) پھر ان صداقتوں کو چھوڑ کر اپنے اکابر اور دیگر نظریات کو اپنا لیتے ہیں۔وَكَانَ الۡكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيۡرًا ﴿۵۵﴾ (25:55) زندگی کے ہر معاملہ میں تو قبائلی عصبیت پر زور دیتے ہیں جبکہ خدا کی مخالفت میں یہ سارے قبائل جو ایک دوسرے کے یوں تو مخالف ہوتے ہیں مگر مددگار بن جاتے ہیں۔

سورج کیلئے ضیا اور چاند کیلئے نور

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا (10:5)''سورج اور چاند دونوں کو روشنی دینے والا بتایا ہے۔ ضِيَآءً (10:5) وہ روشنی جو کسی کی اپنی ہو جبکہ نُوْرًا وہ روشنی جو کسی سے مانگ کر لی ہوئی ہو۔یعنی چاند کی روشنی سورج کی روشنی کے عکس سے روشنی لیتا ہے۔اس لیے قرآن نے چاند کی روشنی کو''نور'' کہا ہے اور اس سے زیادہ دلچسپ بات۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝۲ (2-91:1)سورج کی اور اس کی روشنی، تابانیاں اس کی اپنی ہوتی ہیں۔ جبکہ چاند تَلٰىهَا جو کسی کے پیچھے پیچھے بھیک مانگنے جا رہا ہو کہ مجھے روشنی دیدو۔یعنی چاند اپنی رفتار سے سورج کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔

قمار بازی:

مقامر جواری کو کہتے ہیں بنیادی معنی دھوکہ دینا،فریب دینا،جنون، پاگل پن، دیوانگی (Lunatic)اس Lunar (چاند) سے ہے حالانکہ چاند کی روشنی میں عجیب کشش اور رعنائی ہوتی ہے شاعروں نے اسی سے Lunatic (دیوانگی) کہا۔عرب بھی اسے دھوکہ یا جنون کے معنوں میں لیتے تھے۔ہم چاند سے دھوکہ کھا رہے تھے۔اب اس کے چہرہ زیبا سے جو پردہ ہٹا ہے تو وہ تو ایک جلا ہوا کھنڈر نظر آیا۔ یہ سارا دھوکہ ہی دھوکہ تھا جو وہ دے رہا تھا اب معلوم ہوا کہ قمر کا لفظ انہوں نے دھوکہ کیلئے کیوں رکھا تھا۔

بہارِ نو اور حیاتِ تازہ کی نمودِ زندگی اس خزاں میں

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾ (25:62) مایوسیوں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے ہو مایوسی کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو کس طرح تاریکی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خِلْفَةً (25:62) مایوسی کے بعد امید۔ خزاں میں جب روئیدگی کا نام ونشان نہ ہو۔ جب بہار آتی ہے تو انہی خزاں آلود شاخوں سے زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ شاخیں لہلہا اٹھتی ہیں۔ چاروں طرف سبزہ اور پھول کھلنے لگتے ہیں۔ اسے خِلْفَةً (25:62) کہتے ہیں پھر اس سے خلافت یعنی ملوکیّت کی تاریکیاں اور خزائیں، جن میں زندگی کی نمود نہ ہو۔ انسانیّت بے برگ و بار ہو جاتی ہے۔ تو دین خداوندی کی بہار سے پھر یہ خلافت انسانیّت کو اس آزادی اور صلاحیتوں کی نمود سے آشنا کرتی ہے اور جو خود اس کیلئے متمنّی ہو کہ میری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر کے اسے بلندیاں اور رفعتیں مل جاتی ہیں۔

حروفِ مقطّعات کی کیفیّت

مقطّعات،(مخفّفات Abbreviations):

قرآن کی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کے ابتداء میں اس قسم کے حروف آتے ہیں۔ یہ لفظ نہیں ہوتے بلکہ حروف ہوتے ہیں۔ یا حرف ہوتا ہے اوران کو پڑھا بھی حرف کی طرح جاتا ہے۔ مثلاً طسم۔طاسین۔میم۔ یہ اس طرح سے پڑھا جائے گا۔ یہ قرآن چونکہ عربی بین میں نازل ہوا ہے تو عربوں کا جو اسلوب و انداز بیان تھا اس کے مطابق نازل ہوا۔ اس سے پہلے عبرانی میں بھی یہ بات تھی۔تورات میں بھی یہ چیزیں ملتی ہیں۔جس طرح انگریزی میں مخففات یعنی الفاظ کے مخففات ہوتے ہیں۔ جسے خط کے بعد کچھ اور اضافہ کرنا ہو تو نیچے Ps یعنی Post Script یعنی بعد میں سوجھی۔ مثلاً وقت لکھ کر pm اور am لکھتے ہیں اس قسم کی چیزیں عبرانی اور عربی زبان میں بھی تھیں۔ان کے ہاں اسلام سے پہلے کا لٹریچر شعر میں ہی ملتا ہے۔عربی زبان میں نثر کی سب سے پہلی کتاب قرآن کریم ہے۔ان کی شاعری میں یہ مخففات ملتی ہیں۔ اصطلاح میں ان کو مقطّعات کہتے ہیں یعنی یہ حروف قطع کئے ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ word نہیں بلکہ Letters حروف ہیں اور الگ الگ پڑھے جائینگے۔اس لیے ان کو مقطّعات کہتے ہیں۔حروفِ مقطّعات۔

خدا تعالیٰ کی صفات پر مبنی حروفِ مقطّعات:

اللہ تعالیٰ کی صفات کیلئے جو الفاظ قرآن میں آئے ہیں۔ان الفاظ میں سے کوئی ایک حرف لیکر اکٹھے لکھے گئے ہیں۔

(1) مثلاً طٰ سے مراد خدا کی صفت ذی الطول۔طول سے مراد لمبا ہاتھ۔اختیارات کی وسعتوں والا۔

(2) الٓمٓ۔خدائے علیم وحکیم۔

(3) الٓمٓصٓ خدائے علیم وحکیم وبصیر۔

(4) الٓرٰا۔خدائے علیم ورحیم۔

(5) کٓھٰیٰعٓصٓ اللہ الکریم الہادی والحی والعلیم والبصیر۔

(6) طٰسٓ۔ذی الطول وسمیع۔

(7)یٰسٓ۔

(8)الصّٰفّٰت۔

(9)صٓ۔

(10)قٓ۔

(11)نٓ۔

(12)حٰمٓ۔خدائے حکیم وعلیم۔

کتاب مبین کیلئے کسی مامور من اللہ کی ضروت نہیں:

تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۝۲ (26:2) اس کتاب کا مصنف خود اسے مبین کہہ رہا ہے۔''نہایت واضح'' لسان عربی مبین۔یعنی نہایت واضح اور بیان کرنے میں فصیح۔اگر واضح نہ ہوتو اس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔اگر اسے قرآن کے بتائے ہوئے طریقے سے سمجھا جائے تو پھر واضح اور مبین ہے۔

❁❁❁

رسول ﷺ کی صحیح سیرت کے قرآنی گوشے، قلبِ حساس اور خدا کے جبّار و قہار کا تصوّر

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝٣ (26:3) رسول ﷺ کی سیرت کے متعلق عام طور پر یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ مکہ کی زندگی ایک مبلّغ کی زندگی تھی کوئی مملکت اور قوت کا تصوّر نہیں تھا۔ انہی سے یہ مستشرقین مواد لکھ کر سب کچھ لیتے ہیں اور جب مدینہ آئے تو دیکھا کہ ماحول بڑا سازگار ہے تو یہاں حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ تو اس سے مخالفت ہوئی اس کے بعد باقی ساری زندگی جنگوں میں گزر گئی۔ یہ ہے تصوّر کہ مکی زندگی درویشی کی جبکہ مدنی زندگی میدان جنگ اور قتل وغارت کی زندگی تھی کہ جس نے مخالفت کی تو آپ ﷺ اٹھے اور اس کے خلاف تلوار اٹھائی۔ یہ دونوں تصوّرات خودساختہ اور غلط ہیں۔

سیرت رسول ﷺ کی صحیح صورتحال:

اس میں شک نہیں کہ مدنی زندگی میں آپ ﷺ کو واقعی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ان لڑائیوں میں کہیں بھی فوج کشی نہیں کی حملہ نہیں کیا آپ ﷺ تو مدینہ آئے۔ تین سو میل کا سفر، نہ سڑک، نہ راستہ اور نہ سواری۔ یہاں بھی ان قریش نے چین لینے نہ دیا۔ پناہ گزینوں کی طرح آ کے بیٹھے ہی تھے، نہ گھر، نہ در، نہ کھانے کو روٹی۔ انصار جنہوں نے پناہ دی تھی۔ وہ بھی اس طرح غریب لوگ تھے۔ یہ قریش دوسرے ہی سال اس زمانے کے اعتبار سے ایک عظیم لشکر لیکر تمام ساز و سامان کے ساتھ حملہ آور ہوئے اور یہاں سے وہ لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ یہ تمام لڑائیاں مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے مکہ میں جا کر کوئی حملہ نہیں کیا ہے اور سلسلہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ انہوں نے مکہ میں بیت اللہ کے راستے بند کر دیئے اور حدیبیہ کے مقام سے ان کو حج کئے بغیر واپسی آنا پڑا اور مکہ کو بھی بغیر لڑائی کے فتح کیا گیا یہ تھی ان لڑائیوں کی نوعیّت۔

آپ ﷺ کا قلب حساس:

خودساختہ نقشہ بنا کر پھر فخر سے کہا جاتا ہے کہ اسلام تو بزور شمشیر پھیلا ہے۔ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن اور کہا جاتا تھا کہ مسلمان ہوتے ہو یا نہیں تو نہ ہوئے تو سر کاٹ کر رکھ دیا جاتا تھا۔ یہی کچھ تاریخ میں ہے اور یہیں سے یہ مستشرقین لیتے ہیں۔ ایک طرف یہ تصوّر ہے اور دوسری طرف خود خدا کی شہادت سامنے رکھئے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ کہا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

674
اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۳﴾ (26:3) یعنی تو ان کے غم میں جان گھلا لے گا کہ یہ کیوں صحیح راستہ پر نہیں آئے۔ جو کسی کی خاطر جان گھلا تا ہے کیا وہ شمشیر بدست اس کے سرہانے کھڑا ہوتا ہے؟

اس سے زیادہ مشفق طبیب تو کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ اور اس ڈاکٹر کا تعلق صرف دوا سے نہیں بلکہ اس کے دل میں مریض کیلئے شدید دردمندی اور غمگساری ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی۔ یہ رسول ﷺ ہیں جنہیں واقعی اتنی لڑائیاں لڑنی بھی پڑیں۔ کسی مجبوری کے عالم میں یہ کچھ کرنا پڑا۔ دوسروں کے غم میں جان گھلانے والا شمشیر بدست نہیں ہوتا یہ لڑائیاں تو ایسی ہیں جیسے کسی بچہ کو ماں چولہے کے قریب آنے سے روکنے کیلئے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کردے۔ اگر باز نہ آئے تو اسے طمانچہ سے مارنا بھی پڑتا ہے۔ یہ مقامات تو وہ تھے مگر قلب کی کیفیت بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (26:3) خدا کو بھی کہنا پڑا کہ اتنا غم کہ اپنی جان کو بھی ختم کردے۔ یہ ایک مقام نہیں ہے۔ متعدد مقامات پر قرآن نے کہا ہے کہ یہ ان کی تباہی پر جان گھلا رہے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ (18:6) یعنی اس غم کے مارے تاسف پر تو اپنی جان گھلا رہا ہے۔

پھر آخر برائی بھی اچھائی نظر آنے لگتی ہے، تاسف سے بھی زیادہ گہرا دردمندانہ لفظ:

یہ کون لوگ ہیں جن کی تباہی و بربادی کے صدمہ سے رسول ﷺ جان گھلا رہا تھا۔ ان کی یہ کیفیت ہوگئی تھی۔ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ (35:8) دھاندلی میں جب انسان بڑھتا جاتا ہے تو اسے پھر ہر برائی اچھائی نظر آتی ہے۔ عقل خود بیں اس کے غلط کاموں کو ایسے جواز کے دلائل دیتی ہے کہ وہ مطمئن ہوجاتا ہے۔ تو جن کو غلط کام مزین بن کر دکھائی دیں تو ان کی واپسی مشکل ہوجاتی ہے۔ اس لیے آگے اس آیت میں کہا۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۸﴾ (35:8) یعنی مقصد کے ساتھ تعلق نہ ہو سکے یونہی میکانکی طور پر آتے جائیں۔ یَصْنَعُوْنَ ﴿۸﴾ (35:8) ان کی بربادی پر خون کے آنسو کیوں روتا ہے؟ حَسَرٰتٍ ؕ (35:8) یہ طبیب اس کا قلب کس قدر ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔ یہ اتنی مخالفتوں پر اترے ہوئے۔ ایک دن بھی چین سے رہنے نہیں دیا۔ بجائے اس کے ان ﷺ کے دل میں انتقام کے جذبات ابھریں۔ کیفیت یہ ہے کہ خون کے آنسو رو رہا ہے اور انتہائی کوشش ہے کہ بچ جائیں کہ خدا کو کہنا پڑا کہ یہ تو تباہی پر تلے ہوئے ہیں۔ تو تو کیا کرے گا؟ وہاں اَسَفًا ﴿۶﴾ (18:6) کہا اور یہاں حَسَرٰتٍ ؕ (35:8)۔

حَسَرٰتٍ (35:8) بیماری سے پرندوں کے پر جھڑ جائیں اور ان میں اڑنے کی سکت نہ ہو۔ یعنی قوت و طاقت نہ ہو اور اسے کوئی جانور اڑا کر لے جائے۔

کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تیرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے لیکن تیری دردمندی سے کیا بنے گا۔ جو جانتے بوجھتے تباہی کو دعوت دے رہا ہو۔

خدا کی صفت جبّار اور قہار کے متعلق پایا جانے والا تصوّر:

خود خدا کے بارے میں جو تصوّر عام طور پر دیا جاتا ہے کہ یہ قہار، جبّار و متکبر ہے۔ غضب آلودہ، ہر وقت اسی فکر میں کہ اسے مار

دو۔اسے یہ کردو۔اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِيۡدٌ ﴿۱۲﴾ (85:12)اس کی گرفت گردن توڑ دیتی ہے۔جب قوموں کی کیفیّت یہ ہوجائے کہ ان کی ہر برائی اچھائی نظر آنے لگے کہا۔وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰى قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنۡزِلِيۡنَ ﴿۲۸﴾ (36:28)تو ان کی تباہی کیلئے ہم آسمان سے لشکر نہیں اتارا کرتے اور ہم کبھی ایسا نہیں کرتے۔اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ خٰمِدُوۡنَ ﴿۲۹﴾ (36:29) آسمان سے فوجوں کی ضرورت نہیں بلکہ اس قوم میں خاکسر کی طرح ڈھیر بن کر رہ جاتی ہیں۔ان کی سرگرمیاں اور حرارتیں ختم ہوکر رہ جاتی ہیں۔تو خدا کو تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ اب پتہ چلا سرکشی کا نتیجہ۔ بلکہ یہ آواز خدا کی طرف سے آتی ہے۔يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ ۚ (36:30)او میرے بندوں! یہ کیا تم نے اپنے ساتھ! خود اپنے ہاتھوں سے یہ تباہی مول لے لی۔ یہ ہے قرآن کا پیش کردہ پیغمبر اور خدا۔ تباہی تو مکافات عمل کا نتیجہ ہے۔اس میں کوئی رعایت نہیں ہے کاروبار حیات چل ہی قانون کی حکمرانی سے سکتا ہے تو نفرت تو اس جرم کے خلاف ہوتی ہے۔لیکن ان کو عبد کہہ کے پکارنا، ان کے خلاف نہیں بلکہ اس جرم کے خلاف ہے۔محاورتاً تو اس کی تباہی پر خدا بھی خون کے آنسو روتا ہے۔وہاں حَسۡرٰتٍ تھا اور یہاں حَسۡرَةً ہے۔

نبوّت کا فریضہ صرف آگاہ کرنا ہے، صحیح راستہ پر زبردستی چلانا نہیں:

یہ بات متعدد مقامات پر قرآن نے کی ہے۔اے رسول! لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ (2:272)صرف راستہ کی نشاندہی ہے نہ کہ پکڑ کر اس راستے پر چلاتا ہے۔اس سے تو ان کا اختیار ارادہ سلب ہوجاتا ہے اور یہ تو مشیت کے سارے پروگرام کی خلاف ورزی ہوگی۔هُدٰٮهُمۡ (2:272) سے مراد ''صحیح راستہ پر چلانا''۔وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ (2:272)ہدایت اسے ملتی ہے جو ہدایت لینا چاہے۔عام لوگ تو ایک طرف رہے۔جن کو تو عزیز رکھتا ہے۔خاص طور پر چاہتا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ (28:56)وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ (28:56) تمہارا کام صرف یہ بتانا ہے کہ اے لوگو! اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُهُمۡ لَهَا خٰضِعِيۡنَ ﴿۴﴾ (26:4)۔اگر آسمان سے کوئی معجزہ نازل کرتے تو ان کی گردنیں جھک جاتیں۔کہا وَاِنۡ تُطِيۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۵۴﴾ (24:54)

مایوسی کا اصل سبب:

قرآن نے یہی طریقہ بتایا ہے جب کہ قلب اور دماغ میں صحیح تبدیلی نہیں ہوگی۔انقلاب نہیں آئے گا۔قرآن پر یقین رکھنے والے بعض اوقات حالات ناموافق پاکر، نظام کی تشکیل کا سفر دور دیکھ کر مایوس ہوجاتے ہیں۔یہ مایوسی کیوں ہوتی ہے کہ قرآنی نظام کا متشکل کرنا فریضہ قرار دیا جاتا ہے اور حالات دیکھ کر مایوس ہوجاتے ہیں۔یہ ہے بنیادی غلطی۔جو فریضہ نہیں تھا۔ہم نے خود اسے اپنا فریضہ بنالیا۔یہ سراسر بنیادی طور پر غلط ہے۔خدا اپنے آخری رسول ﷺ سے یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تیرا کام نہیں ہے کہ تو ضرور یہ نظام قائم کرکے رہے ان لوگوں کو صحیح راستہ پر چلا کر رہے۔تیرا کام تو ان باتوں کو عام کئے جانا ہے جو دل سے تیرے ساتھ ہوتے جائیں تو ان رفقاء کو لے کر پھر عملی کام کر سکتے ہو۔

رسول ﷺ کی زندگی کی آخری خواہش پر اللہ تعالیٰ کا جواب:

یہ وجہ تھی کہ رسول ﷺ اور ان کے ساتھی آخری وقت تک مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے وہ ذمہ داریاں اپنے سر پر نہیں لی تھیں جو ان کی نہیں تھیں۔ وہ انسانیت کی ہلاکت پر درد اور افسوس تو تھا مگر یہ نہیں تھا کہ ہم ایسا کیوں نہیں کر پاتے۔ رسول ﷺ کے دل میں آخر میں ایک معصوم سی خواہش ظاہر ہوئی کہ ساری عمران تکالیف اور مشکلات میں گزر گئی ہے۔ کیا اس نظام کی ایک جھلک دیکھ سکونگا۔ سورۃ الرعد کی 40 ویں آیت ہے تو کہا کہ ضروری نہیں کہ تیری زندگی میں ہو جائے۔ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ (13:40) یہ ہمارے قانون کے حساب سے ہوگا۔ بس تو اسے عام کرتا جا قانون تو قانون ہوتا ہے۔ اس میں تو جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تم زبردستی نہیں کر سکتے۔ اگر زبردستی کرنی ہوتی تو ہمارے پاس بڑے علاج تھے۔ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾ (26:4) تو ایک معجزے سے ان کی گردنیں جھک جاتیں۔

معجزوں کے سلسلے میں قرآن حکیم کی تعلیم:

اعتقاد یہ ہے کہ رسول ﷺ کی طرف سینکڑوں معجزے منسوب کئے ہوئے ہیں۔ قرآن ان سب کی تردید کرتا ہے کہا کہ تو اس غم سے گھلا جا رہا ہے کہ یہ صحیح راستہ کیوں نہیں اختیار کرتے۔ کہا کہ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ معجزہ دکھا دیتے۔ تو سارے مسلمان ہو جاتے مگر یہ تو زبردستی والی بات ہوتی زبردستی تو زبردستی ہے چاہے تلوار سے کرو یا عقل کو ماؤف کر کے معجزہ دکھا دو۔ جبکہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ (2:256) رسول تو تمہاری عقل و فکر کو اپیل کرتا ہے۔ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ (2:111) اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (12:108) تقلید پرستی کے تحت قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی مفلوج کرنے کی چال کہ کیا پہلے بھی کسی نے کہا۔ یہ ہے بات ان شریعت والوں کی۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿۵﴾ (26:5) خدا کی طرف سے جو بات بھی پیش کی جائے تو اگر وہ ایسی ہے جو ان کے ہاں نئی ہو۔ پہلے سے نہ آ رہی ہو تو بغیر سوچے سمجھے ان سے انکار کر دیں گے۔

یہ روش طریقت اور شریعت کی ہزار برس سے ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ کہ کیا پہلے بھی کسی نے کہا؟ ان کا تو یہ ایمان ہے ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں۔ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔۔۔ وَ كُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔۔۔

فرعون کے ساحرین کا سجدہ غلامی سے انکار کے بعد

فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ ﴿۴۶﴾ (26:46) تو فرعون نے کہا۔ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (26:49) ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّکُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۹﴾ (26:49) یہ بڑی بغاوت ہے کہ سارے دربار میں فرعون کی شکست ہوگئی۔ انھوں نے اس فرعونی گرج کو پورے اطمینان سے سنا۔ کیونکہ انھوں نے موسیٰؑ سے مباحثے میں ہار مان لی اور ایمان کا بھرے دربار میں اعلان کردیا۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ (26:47) رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (26:48) قَالُوْا لَا ضَیْرَ (26:50) جو جی میں آئے کرلو۔ ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ (26:50) اب تیری جگہ خدا نے لے لی ہے۔ یہ انقلاب آیا ہے کہ ہمارا نصب العین حیات خدا ہوگیا۔ کیونکہ ہم تو ساری دنیا کے نشوونما دینے والے پر ایمان لے آئے ہیں۔

مردمومن فرعونیّت کا سب سے بڑا باغی ہوتا ہے اب کمزوریوں کا اعتراف کرنے کی بجائے سیاست فرعونی کی چال اس شرمندگی سے بچنے کیلئے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَہٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَکُمْ ط اِنَّہٗ لَکَبِیْرُکُمُ الَّذِیْ عَلَّمَکُمُ السِّحْرَ (20:71) تم سب اندر سے ملے ہوئے تھے اور یہ موسیٰ تو تمہارا پیرومرشد یعنی گروگنھٹال ہے۔ یہ تو ایک گہری سازش تھی۔ تو لوگ میری اجازت کے بغیر کیسے ایمان لے آئے؟

عزم واستقلال:

کہا سن لو! قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ط اِنَّمَا تَقْضِیْ ھٰذِہِ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ﴿۷۲﴾ (20:72) تیری گرفت تو زیادہ سے زیادہ اس طبعی زندگی تک ہے۔ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ط (7:126) شکر یہ کہ تو نے کوئی اور الزام نہیں لگایا بجز اس کے تجھ سے بغاوت کی ہے اس جرم کو تو دل سے تسلیم کرتے ہیں۔ فرعون کی عدالت کے مجرم اور خدا کی عدالت کے مجرم میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اِنَّہٗ مَنْ یَّاْتِ رَبَّہٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَھَنَّمَ ط (20:74) تیری عدالت میں تو جرم قابل فخر ہے۔ اصل جرم تو وہ باعثِ ذلت ہے جو خدا کی عدالت میں تباہی و بربادی سے ہمیشہ کیلئے ہمکنار کردے۔

جہاں لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی ﴿۷۴﴾ (20:74) تیری عدالت سے تو موت آ گئی تو چھوٹ گئے۔ مگر وہاں تو موت بھی نہیں ہے

اورزندگی موت سے بھی بدتر ہوگی ۔ یہ تھاوہ انقلابی سجدہ جسے اقبال نے خراج تحسین پیش کیا ؎

مسلمانیم و آزاد از مکانیم | بروں از حلقہ نو آسمانیم
بما آمو ختند آن سجدہ کزوے | بہائے ہر خداوندے بدانیم
نہ خواہم ایں جہاں و آں جہاں را | مُرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کزو سوزو سرورش | بوجد آرم زمین و آسماں را

كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ (96:19) یہ ہے سجدہ اس کے قوانین کی اطاعت کراور قریب ہوجا۔

ما غلاماں از جلالش بے خبر | از جمالِ لازوالش بے خبر
دربدن داری اگر سوزِ حیات | ہست معراج مسلماں در صلوٰت
گر نہ داری خون گرم اندر بدن | سجدہ تو نیست جز رسمِ کہن
عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں | عید محکوماں ہجومِ مومنین

(اقبالؔ)

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ (20:72) اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۵۱ (26:51) چونکہ اس دعوت پر پہلے ایمان لائے ہیں اس لیے ہمیں امید کامل ہے کہ ہمارا رب ہماری سابقہ لغزشوں سے ہمیں محفوظ کردے گا۔

عربی مبین کی اہمیّت

عربی مبین:

قرآن نے بار بار جو ذکر کیا ہے کہ اسے عربی مبین میں نازل کیا ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ورنہ ایک کتاب جو عربی زبان میں ہے بار بار یہ کہنا ہے کہ اسے ہم نے عربی زبان میں نازل کیا ہے یہ کوئی معقول بات نہیں ہے۔ کیا کسی انگریزی کی کتاب میں یہ لکھا ہوا ملے گا کہ یہ کتاب انگریزی زبان کی کتاب ہے اب اس قدر تاکید کیوں کی گئی ہے۔ عجیب چیز ہے خدائے علیم وبصیر کی اسے تو پتہ ہے کہ کیا کیا کچھ ہوگا اس کے ساتھ۔ اسی بناء پر یہ تاکیدات کئے گئے ہیں۔ دعوائے تضادات (Anti-thesis) دیئے گئے ہیں تاکیداً کہا گیا اسے سمجھنا ہے تو عربی مبین کو سمجھ تو پھر قرآن سمجھ میں آئیگا۔ کیونکہ اس کو علم تھا کہ اسے ساری دنیا میں پھیلنا ہے۔ عجم میں اور غیر عجم میں، اس کے تراجم، تفاسیر بھی ہونی ہیں، اسے اس لیے عربی مبین کی رو سے، محاورہ عربی کی رو سے دیکھ کر عرب اس زمانے میں ان چیزوں کو کس طرح استعمال کرتے تھے اور ان الفاظ کے کیا معنی لیتے تھے۔ یہ عربی زبان تو بحر عمیق ہے۔ اونٹ کیلئے پانچ ہزار سات سو چوالیس الفاظ شمشیر کیلئے ایک ہزار، سانپ کیلئے دو سو، شیر کیلئے پانچسو۔

ایک تو مادہ کے اندر ایک بنیادی تصوّر دیا جاتا تھا۔ پھر باقی الفاظ جسے مجازی کہتے ہیں۔ وہ لغوی معنی نہیں بلکہ مجازی ہوتے تھے کہ ان کو کن کن معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ خصوصیات جس سے یہ لسان مبین بنتی ہے۔ قرآن سمجھنے کیلئے ان کے جو مفردات یعنی الفاظ ہیں، ان کو دیکھا جائے کہ اس کے بنیادی معنی کیا ہیں۔ اس زبان کی خصوصیّت یہ ہے کہ اس مادہ سے خواہ ہزار الفاظ بنیں۔ ان الفاظ میں وہ بنیادی تصوّر ہر جگہ موجود ہوگا اور آگے اس کے استعمال کی مختلف اشکال ہونگی۔ یہ استعمال کی اشکال جب سامنے آئینگی پھر عربی ادب میں دیکھیں کہ وہ ان الفاظ کو اپنے ہاں کس کس مفہوم میں استعمال کرتے تھے۔ پھر وہ مفاہیم سامنے رکھ کر قرآن کی طرف آیئے تو بات نکھر جاتی ہے کہ عرب ان الفاظ کو ان معنی میں استعمال کرتے تھے۔

ہمارے ہاں قرآن کو سمجھنے کا طریق:

اب اس بنیادی چیز سے انحراف کیسے ہوا۔ ایک سازش کے تحت اس امت کے ذہن کو، قرآن کے مفہوم سے الگ کرنے کیلئے، قرآن کی آیات کے معنی، ان من گھڑت روایات کے تحت متعین کر دیئے گئے۔ قرآن کے الفاظ کے معنی ایک ہی دفعہ متعین کر دیئے گئے اور روایات میں یہ لکھ دیا کہ اس کے معنی ہیں۔ مثلاً ایک لفظ اونٹ کے 5744 معنی ہیں۔ ان میں سے ایک معنی لیا اور

کہہ دیا کہ اس کے معنی قرآن کی اس آیت میں یہ ہیں۔اب آپ اس معنی سے الگ ہٹ نہیں سکتے۔ یہ ہوئے روایات کی رو سے قرآن کے ان الفاظ کے معانی۔ آگے یہی بات تفسیر میں آئی جب کہا جائے کہ یہ معنی تو رسول ﷺ نے بتائے ہیں تو اس کے بعد کسی کی جرأت ہے جو اس سے انکار کر سکے یا کہہ دے کہ میں اس سے الگ کوئی معانی لیتا ہوں۔اب یہ معانی متعین ہو گئے۔

وہ معنی تفسیر میں متعین ہو گئے۔اب ترجمہ کرنیوالوں نے اسے تفسیر میں دیکھ کر وہ معانی ترجمہ میں لے لیے۔اب وہ ایک متعین معنی ہے۔سارے قرآن میں اس کی رو سے، آپ نے ہر جگہ آیات کے معانی اور مفاہیم کو متعین کرنا ہے۔ان الفاظ کے ان متعین معانی کی رو سے جو اس طرح سے سامنے آئے ہیں۔اب محاورہ عرب اور لسان عربی مبین قصہ پارینہ ہو گئی۔اب کہنے کو تو یہ بات ٹھیک ہے کہ اگر یہ معانی حضور ﷺ کے ہیں تو ان سے زیادہ عربی مبین جاننے والا کون تھا۔اگر عرب کی حیثیت سے دیکھیں تو پھر حضور ﷺ کی بصیرت ہے اتنے الفاظ میں سے آپ ﷺ نے وہ معانی متعین کر دیئے تو تراجم و تفاسیر کا معاملہ ٹھیک ہو جاتا لیکن اصل شے پھر وہیں آجاتی ہے کہ جسے آپ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ معانی متعین کئے۔تو اس کا ثبوت کیا ہے؟ کہ حضور ﷺ نے متعین کئے ہیں۔ یہ تو کوئی ڈھائی سو سال بعد یہ روایات اکٹھی کی گئیں۔

نزول قرآن کی عربی پر عجمی اثرات:

عباسیہ دور (1256-750ء) میں جو عربی تھی اسے زبان کے اعتبار سے بھی دیکھئے تو وہ عربی نہیں رہی تھی۔ جو عربوں کے ہاں نزول قرآن کے وقت تھی۔ یہ تو ساری عجمی عربی ہو گئی ہوئی تھی۔ فارس کی فتح کے بعد، عباسیوں کے دور میں، یہ سارے ایرانی ہر شعبہ زندگی کے اوپر چھائے ہوئے تھے ادب و ثقافت میں بھی یہی چھائے ہوئے تھے۔ خدا نے قیامت تک قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔اس کے مفاہیم کیلئے اس نے یہ وسائل دینے تھے۔ وہ جو زمانہ نزول قرآن کی عربی مبین ہے وہ اس عرب جاہلیت کی شاعری کے اندر محفوظ چلی آرہی ہے۔یعنی باقی چیزوں کے اندر تو انحراف ہو جاتی ہے آمیزش کا بھی امکان ہوتا ہے۔لیکن شعر کے اندر اس کا امکان مشکل ہوتا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے بعض اشعار وضع بھی کئے۔لیکن جو جاہلیت عرب کے اشعار آرہے تھے ان میں ان کی زبان کا سارا سرمایہ اشعار کی صورت میں موجود تھا۔

نثر میں ان عربوں کی پہلی کتاب قرآن کریم ہے۔اس سے پہلے عربی زبان میں کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔ وہ نثر کی طرف آتے ہی نہیں تھے۔شاعری ان کیلئے وجہ امتیاز تھی اور یہی ان کا ادب تھا۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمارے لئے آ یہ رحمت بن گئی۔نثر کی کتابوں میں انحراف و تحریف ہو سکتی تھی شاعری میں بہت کم ہوتی ہے اور وہ شاعری بڑی وسیع ہے اس کے اندر الفاظ کے جو مجازی معنی ہیں وہ استعمال ہوئے تھے۔

ابواب و اوزان:

فعل کی ہر نئی شکل جو فعل ماضی اور اس کے فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکات (زیر۔زبر۔پیش) سے مل کر بنے، ایک باب کہلاتی ہے۔ ماضی اور مضارع کے درمیانی حروف کی حرکات کے اعتبار سے ثلاثی مجرّد کے چھ ابواب مستعمل ہیں۔ ثلاثی مجرّد

کے علاوہ اسے افعال میں جن میں اصلی حروف تو تین ہی ہوں۔لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں۔ثلاثی مزید فیہ کہلاتے ہیں ان کے مختلف ابواب مختلف اوزان پر آتے ہیں۔جن میں قرآن مجید میں بیشتر استعمال ہونے والے بارہ ہیں۔

علم انسانی اور علم وحی میں ایک بنیادی فرق:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ (26:192) یہاں وحی کیلئے تنزیل کا لفظ آیا ہے۔اس ''نزول'' کے لفظ میں وحی اور علم انسانی کا بنیادی فرق نمایاں کر کے رکھ دیا ہے۔علم انسانی اپنے کسب و ہنر، کوشش، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور فکر کا نتیجہ ہوتا ہے باہر سے اطلاعات پا کر یہ اپنی فکر کی رو سے کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے یہ علم اس کے اندر سے باہر آتا ہے ایجوکیشن کے معنی ہی اندر سے باہر لانے والی چیز ہے۔جبکہ وحی میں اپنی فکر و کاوش، کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔یہ خالصتاً Objectively خارج سے ان تک پہنچتی تھی اور ختم نبوّت کے بعد علم کا یہ دوسرا طریقہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا۔

تنزیل کا قرآنی مفہوم:

تنزیل، نزول، کسی چیز کا خارج سے نازل ہونا (Objectively) اوپر سے نیچے آتا ہے۔نیچے سے اوپر جانا نہیں ہے۔اس کا مادہ ''ن ز ل'' ہے اب باب یا اوزان میں، اس مادے میں ایک آدھ لفظ کا تغیّر و تبدّل کیا جاتا ہے اور معنی بدلتے چلے جاتے ہیں۔لیکن بنیادی معنی وہی ہوتے ہیں۔صرف نوعیتیں بدلتی جاتی ہیں۔

تَنْزِيْلُ کا باب یا وزن تَفْعِيْلٌ کا باب ہے۔اب قاعدہ یہ ہے کہ جو لفظ بھی اس وزن پر آئیگا۔بنیادی معنی تو اس لفظ میں موجود ہونگے۔یعنی نَزَلَ سے مراد ''خارج سے آنا'' اب یہ نزل سے تنزیل کے وزن پر یعنی تفعیل کے وزن پر آئے گا۔تو آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ اس کام کا ہونا جو مادے میں بتایا گیا ہے۔تو لفظ تنزیل نے یہ بات بتا دی کہ قرآن ایک ہی بار نازل نہیں ہو گیا تھا بلکہ یہ رفتہ رفتہ، بتدریج 23 سال میں اتر کر اس کی تکمیل ہوئی۔لفظ تنزیل بتا رہا ہے کہ خارج سے ملنے والا علم جو بتدریج آغاز سے تکمیل تک پہنچا۔اب ربوبیّت میں انسانی جسم کی پرورش اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما دونوں آ جاتی ہیں۔کسی گروہ، قوم کی نہیں بلکہ عالمین یعنی عالمگیر انسانیّت کی ربوبیّت کیلئے۔

روح سے مراد:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ (26:193) دوسری جگہ روح القدس یعنی دور دور تک لے جانے والا۔جس کی وسعتیں لا انتہا ہوں۔ایک جگہ روح کو جبریل کہہ کر پکارا گیا ہے۔قرآن میں روح ان معنوں میں نہیں آیا جو مرتے وقت جسم سے نکل جائے۔یہ یونانی فلاسفرز نے مادہ کے مقابل غیر مادی کو ہمارے ہاں روح کر دیا گیا۔اس سے Spiritual روحانی بنا اور روحانیّت آ گئی۔قرآن ایک تو انسانی جسم کا ذکر کرتا ہے اور دوسرے اس کی ذات یا نفس کا، روح کا ذکر نہیں کرتا۔روح کے معنی توانائی ہے۔روح خداوندی کا ذکر ہے مگر انسانی روح کا قرآن میں ذکر نہیں ہے یہ روح خداوندی الوہیاتی توانائی ہے سائنس بھی اب مادہ سے خالص توانائی پر آ گئی ہے۔

جبرائیل، میکائیل الوہیاتی توانائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے:

جبریل کا لفظ قرآن میں تین مقامات پر آیا ہے۔ (2:97-98, 66:4) جبکہ میکائیل کا نام صرف ایک بار (2:98) عزرائیل کا نام کہیں بھی قرآن میں نہیں آیا۔

عبرانی زبان میں جِبْرٌ یا جُبْرٌ توانائی کو کہتے ہیں اور ''ایل'' (Eel) خدا کو۔ جبریل کے معنی بھی ''روح الامین'' کے ہو گئے۔ یہاں عربی کا روح کہا ہے وہاں عبرانی کا جبر ہے۔ یہ خدائی توانائی ہے یہ امین ہے جو خود اس میں کسی قسم کا دخل نہیں دیتا۔ وہ Medium ذریعہ جس سے یہ خدا کا علم نبی کو ملتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ وہ صرف امین ہے۔ امانت دار ہے۔ نَزَّلَ بِهِ (26:193) وہ اس کو لیکر نازل ہوتا ہے۔ عَلٰى قَلْبِكَ (26:194) تیرے قلب پر نازل کرتا ہے۔ تو یہ خالص توانائی جو خدا کی طرف سے آئے اور قلب پر نازل ہو تو کوئی دوسرا تو اسے جان ہی نہیں سکتا۔ نازل ہونا تو چھوڑ یئے۔ ہمارے ہاں انہوں نے لمبی چوڑی بحثیں کی ہوئی ہیں۔ قرآن نے بات صاف کر دی۔ کیا محض خیالات ہوتے تھے جو نازل ہوتے تھے؟ کیا ایک خیال پیدا کیا گیا تھا نبی ﷺ کے دل میں؟ یہ ہے گہری بات اور نبی ان خیالات کو اپنے الفاظ میں ظاہر کرتا تھا؟ اس میں تو بڑا فرق پڑ جاتا ہے کہ خیال تو ہوں خدا کی طرف سے اور ظاہر کرے نبی اپنی زبان کے اندر۔ کیا معلوم کہ ان کو صحیح بیان کر سکا ہے یا نہیں؟ یہ بڑا ہی غور طلب سوال ہے۔

خیالات والفاظ کا ایک دوسرے کو جنم دینا ایک پیچیدہ سوال ہے:

اس زمانے میں تو یہ علم نہیں تھا۔ ہمارے زمانے میں علم المعانی (Semantics) کا ایک علم آیا ہے۔ یہ زبانوں کا علم ہے۔ فلسفہ کی رو سے یہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا جس کیلئے لفظ موجود نہ ہو۔ اگر یہ پہلے سے موجود نہ ہو تو آپ کو لفظ (Coin) وضع کرنا پڑے گا۔ کوئی خیال بغیر لفظ کے ذہن میں نہیں آ سکتا اور کوئی ایسا لفظ آپ کے ذہن میں نہیں آتا جس کا تصوّر آپ کے ذہن میں موجود نہ ہو۔ جس لفظ کا کوئی تصوّر جسے معنی کہتے ہیں آپ کے ذہن میں نہیں آتا تو وہ مہمل ہوتا ہے بامعنی لفظ وہ ہوتا ہے جس کا مفہوم ایک تصوّر کی شکل میں، ایک خیال کی شکل میں، آپ کے ذہن میں آئے۔ آپ کو کوئی خیال ایسا آ نہیں سکتا۔ جس کیلئے آپ کے ہاں ایک لفظ موجود نہ ہو۔ اس پر بڑی تحقیق ہوئی ہے یہ جو نئے الفاظ جو ذہن میں آتے ہیں نئے خیالات ہوتے ہیں جن کو بیان کرنے کیلئے یہ الفاظ وضع کرنے ہوتے ہیں۔ اب خیال اور لفظ جو ہے اس میں کیا تعلق ہے۔ یہ بڑا ہی پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے۔ جب ہم پانی کہتے ہیں تو ذہن میں یہ چیز پانی ہوتی ہے۔ لفظ پانی کے اندر تو یہ چیز موجود ہی نہیں ہے کہاں سے یہ چیز آ گئی؟ یہ تو پھر محسوس شے ہے۔ جب آپ محبت کہتے ہیں۔ بات تو ساری سمجھ میں آ سکتی ہے مگر اس چیز کو بتا نہیں سکتے کہ یہ کیا ہے؟ تو لفظ ہے اس کے اندر چھپا ہوا معنی ہے۔

الفاظ و معانی کا باہمی تعلق:

جسم اور جان کا تعلق کیا ہے؟ کوئی جان کا بتا نہیں سکتا مگر یہ ایسی اہم ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو جسم بے کار رہتا ہے۔ کیا یہ جسم کی پیدا

کردہ ہے یا کہیں اور سے آئی ہوئی ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ اس طرح لفظ اور معنی کا تعلق کیا ہے؟ کہاں ہوتے ہیں وہ معنی؟ لفظ کا تجزیہ کیجئے تو چند حروف ہیں۔ الگ الگ کر دیں تو اس کے معنی تو اس میں کہیں نظر نہیں آتے۔ لیکن جو لفظ ہے وہ ایک متعین معنی دیتا ہے ایسا کہ جب میں پانی کہوں تو فوراً پانی لا یا جاتا ہے مفہوم اس قدر متعین ہوتا ہے کہ لفظ کے اندر پانی! یہ چیز کہاں سے آ گئی۔ موجود ہے مگر ہم بتا نہیں سکتے کہ کیسے موجود ہے؟ ؎

ارتباطِ حرف و معنی، اختلاطِ جان و تن جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر میں ہے

یوں سمجھ لو گو یا جسم اور جان کا تعلق ہے کوئلہ کی راکھ جو اس پر آ جاتی ہے تو وہ کوئلہ کی راکھ ہوتی ہے لیکن یہ راکھ حرارت سے الگ شے ہے جو کوئلہ کے اندر رہوتی ہے۔ راکھ ایک محسوس شے ہے حرارت کو ہم اس وقت تک محسوس نہیں کر سکتے۔ تاوقتیکہ وہ مادی یا محسوس شکل میں سامنے نہ آئے یہی جو حرارت کی طرح معنی ہوتے ہیں جان ہوتی ہے یہ جو لفظ یا جسم میں محسوس چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں گو یا دہکتے ہوئے کوئلہ کے اوپر اس کی راکھ آتی ہے۔ باہر سے نہیں آتی۔

قلب نبوی ﷺ پر عربی مبین کے الفاظ کی شکل میں وحی کا نزول:

وحی قلب نبوی پر تو کیا یہ محض خیالات ہوتے ہیں۔ اگر صرف خیالات ہوں۔ تو پھر بشر کے، انسان کے الفاظ تو آ گئے۔ معلوم نہیں کہ وہ مفہوم بھی پوری طرح ادا کر سکے یا نہیں۔ اس لئے قرآن نے واضح اور کھل کر بتا دیا کہ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ (26:195) محض خیالات ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی ڈالے گئے۔ جب الفاظ ہونگے تو کوئی زبان ہونی چاہئے تو اس کیلئے عربی زبان کہہ دیا کہ عربی زبان کے الفاظ میں یہ وحی قلب نبوی پر نازل کی گئی۔ اب الفاظ بھی خداوندی ہیں خود لفظ عربی کے معنی واضح ہیں۔ عربی میں بھی یہ عربی مبین کہلاتی تھی۔ عربی مبین میں اسے خدا نے نازل کیا اور یہ اس زبان کا اعجاز ہے کہ اس کے الفاظ ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرتے جا رہے ہیں اور اسے صرف عربی مبین میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن بلفظہٖ وحی ہے اور زبان عربی مبین کی ہے۔ اس لئے جس زبان میں کتاب ہوگی۔ اس زبان کی رو سے اس کتاب کو سمجھا جائے گا۔

مختلف ممالک کی عربی زبان:

زبانوں میں سو سال سے کم ہی عرصہ میں اتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ سو سال پہلے کی کتاب اٹھا کر پڑھیں تو وہ زبان عجیب و غریب نظر آئے گی۔ ایک زبان تو ادبی انداز کی ہوتی ہے دوسری روز مرہ کی گفتگو کی زبان ہوتی ہے۔ آج عربی زبان کی کیفیّت یہ ہے کہ سعودی عرب سے لیکر یمن، عراق، شام فلسطین، مصر، لیبیا، سارے عربی بولنے والے ایک دوسرے کی عربی نہیں سمجھتے۔ اگر قرآن بھی ان میں سے کسی زبان میں ہوتا تو ساتھ والا نہ سمجھ سکتا کہ یہ عربی کیا ہے؟ زبانیں تو ان سب کی مختلف ہیں مگر ان کے ہاں کی کتابی زبان وہی ہے۔ جو قرآن کی ہے۔ جسے ہر عرب پڑھ سکتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کتابی زبان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لہٰذا قرآن کی زبان اور اس کے معانی محفوظ ہیں۔

اس خدا کا عجیب اعجاز ہے جس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اگر قرآن کے الفاظ محفوظ ہوں اور معنی مرور زمانہ سے بدل جائیں تو یہ حفاظت کسی کام کی نہیں ہے۔ یہ تو سنسکرت کی طرح مردہ زبان ہوجاتی۔ یہ عربی زبان زندہ ہے۔ نثر یا گفتگو میں تو آگے جا کر معلوم نہیں وہ کیا سے کیا بن جائے۔ لیکن اشعار کی یہ صورت نہیں ہے۔ اس میں ایک لفظ تک کا فرق نہیں آ سکتا۔ اگر اس میں ایک لفظ بھی ادھر ادھر ہوجائے تو اوّل تو اس میں سکتہ پڑ جاتا ہے پھر معانی میں بھی فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ تھا اعجاز جو خدا نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم قرآن کو محفوظ رکھیں گے اور قرآن کی زبان عرب کی شاعری کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔ چودہ صدی قبل بھی نہیں بلکہ آج بھی کوئی زبان اپنی بے مثل سائنٹفک حیثیت کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ اشعار اس دور میں مرتب ہوئے تھے جب سارا عجمی اثر پھیل چکا تھا اور یہ بڑی حیران کن بات ہے۔

عباسیوں اور بعد کے ادوار میں عربی زبان زمانے کے لحاظ سے متاثر ہوچکی تھی۔ یہ سارا کچھ جو ایرانی مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے مرتب کیا تھا۔ یہ تمام لغات کی بنیاد شعرائے جاہلیت کے شعروں پر ہے۔

یہ تمام قرآن کے مفردات الفاظ اوران کے معانی، ان اشعار کی رو سے، لغت کے اندر آئے ان میں ایک تو وہ معنی جن کی سند ان شعراء کی ہے پھر آگے وہ معنی جو ان کے زمانے میں رائج تھے۔ عربی مبین وہ ہوگی۔ جس کے معنی شعرائے جاہلیہ کے کلام سے متعین کئے گئے ہوں۔ جو اس زمانے میں عربیوں کی زبان تھی۔ اب لسان عربی مبین محفوظ ہوگئی۔

آج اگر عربی بولنے والوں کی عربی زبان تو ایک دوسرے سے ملتی نہیں۔ علمی اور کتابی زبان ملتی ہے۔ تو وہ وہی زبان ہے جو قرآن میں استعمال ہوئی ہے۔ اس طرح زبان محفوظ ہوگئی صرف لفظ ہی نہیں محفوظ ہوئے، الفاظ کے معنی میں بڑا فرق پیدا ہوجاتا ہے بہت سے الفاظ متروک ہوجاتے ہیں لیکن جب سامنے وہ معنی محفوظ ہیں۔ جو زمانہ نزول میں عرب ان الفاظ کا لیتے تھے۔ تو اس کے بعد اور معنی جتنے چاہیں بڑھاتے چلے جائیں وہ معنی تو محفوظ ہیں۔

تراجم اور تفاسیر میں تضادات کی وجہ، الفاظ قرآن کے معنی عجمی:

یہ جو تراجم اور تفاسیر میں اختلافات ہیں تو سازش کو تو چھوڑیئے جنہوں نے دیانت داری سے ایسا کیا تو یہ جو الفاظ کے معانی لئے گئے ان کی وجہ سے ہوا۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ﴿۱۹۸﴾فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ﴿۱۹۹﴾ (26:198-199) اگر اسے کسی عجمی پر نازل کرتے وہ ان کو پڑھ کر سناتا (تو ان کا انکار قابل فہم ہوتا) مگر یہ کھلی شہادت ہے کہ یہ صداقت کی راہ ہی اختیار نہیں کرنا چاہتے۔

عربوں کی زبان میں نازل کیا۔ ان عربوں نے کوئی ایک سوال تک نہیں کیا کہ اس آیت کے معنی کیا ہیں۔ ان کے سوالات جو قرآن میں ہیں وہ محض بعض مسائل یا احکام کے متعلق ہیں۔ عرب بدو تک اسے یوں سمجھتے تھے اس لئے کسی تفسیر کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خدا نے اسے عربی مبین میں نازل کیا اگر عجمی یعنی غیر عرب کی زبان میں ہوتا تو پھر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یعنی غور سے سنیں۔ الفاظ تو قرآن کے رہیں ان کے معنی اور ہوجائیں تو پھر قرآن کیسے سمجھ میں آئے گا۔ ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے۔ الفاظ تو قرآنی

مگر تراجم اور تفاسیر ساری عجمی۔ قرآن نے تو پہلے کہہ دیا کہ اگر یہ عجمی زبان سے ہوتا تو ان کی سمجھ میں نہ آتا اور یہ پھر ایمان نہ لاتے۔ الفاظ ہوں وہی معنی ہوں عجمی تو قرآن کیسے سمجھ میں آئے گا؟ اصل اہمیّت تو معانی کی ہے۔ لفظ تو اہمیّت نہیں رکھتے۔ اگر معنی دوسرے ہو جائیں لفظ وہی رہیں تو قرآن الفاظ کے لحاظ سے اگر محفوظ بھی رہے اور معنی وہ نہ رہیں جو عربی میں تھے تو قرآن خود غیر محفوظ ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے تو تم سمجھ ہی نہ سکتے ایمان ہی نہ لاتے۔

قرآن نے اپنی اصطلاحات کا مفہوم بھی خود قرآن میں واضح کر رکھا ہے:

عربی مبین قرآن سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ کے معانی عربی مبین سے متعین کریں جو اصطلاحات قرآن نے استعمال کی ہیں ان کا مفہوم بھی خود قرآن نے واضح کر دیا ہے۔ اسے نور مبین کہا گیا ہے۔ روشنی کو کسی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی خارجی سہارے کی محتاج نہیں ہے۔ عربی بین اور فکر انسانی وَتَتَفَكَّرُوْا قرآن بولتا ہوا سامنے آجاتا ہے کہ عرب اس کو یوں سمجھتے تھے۔

آج عربی بولنے والے بھی قرآن فہمی میں عجمی ہو چکے ہیں۔ ہم تو ایک طرف رہے یہ تمام عربی بولنے والے سارے عجمی ہو چکے ہیں۔ ان کی عربی زبان کے الفاظ عجمی ہو گئے ہیں۔ تفسیریں بھی اس عجمی زبان میں ہیں اور عجمی معنی میں۔ حالانکہ زبان عربی ہے۔

قرآن کا نہ تو ترجمہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے مرادفات کہیں مل سکتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ ترجمہ کا مطلب عربی زبان کا لفظ، اس کا مرادف جو دوسری زبان میں ہو، وہ رکھا جائے۔ مَاءٌ کا ترجمہ پانی۔ آب یا واٹر تو ہو جائے گا مگر جب قرآن ''الٰہ'' کہے گا تو اس کا مرادف تو دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں مل سکتا۔ ترجمہ سے مراد ہے ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لگانا۔ الٰہ کا دوسرا لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ قرآن کے الفاظ تو خدا کے الفاظ ہیں۔ ان لفظوں کا مرادف کہاں سے ملے گا؟ خود ہمارے دانشوروں نے بھی یہ بات کی ہے۔ قرآن تو عربی مبین سے سمجھ میں آئے گا۔ ہم عربی ہی نہیں سمجھتے تو عربی مبین کہاں سے آئے گی؟ یہ جو تراجم ہیں دیوبندی اپنی نقطۂ نظر سے، جب یہ مرادف بھی اپنے نقطۂ نظر سے دیتے ہیں تو پھر اس قدر فرقے تو ہوں گے اور یہ سارا سر پھٹول کیوں ہے؟ اس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

H.R.GIBB عربی زبان کا علامہ اور بہت بڑا مستشرق اپنی کتاب "Modern Trends in Islam" میں رقمطراز ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے۔ قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کی بجائے مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیّت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات جن میں عام واقعات یا قوانین یا احکام مذکور ہوں۔ ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو لیکن با ایں ہمہ جو مدوجزر، جو نشیب و فراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں اور اس کے ساتھ جوش و خروش اس کتاب کے الفاظ میں جلوہ فروز ہے کیا وہ ترجمہ میں آسکتا ہے؟ وہ اپنے ہاں انگریزی کے مترجم کو چیلنج کرتا ہے کہ ذرا اس صاف اور سیدھی آیت (50:47) میں جو الفاظ ہیں انگریزی میں ہی نہیں دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ کر کے دکھایئے۔ ان الفاظ میں پانچ مرتبہ ''ہم'' کی تکرار ہے۔ اِنَّا۔ نَحْنُ۔ نُحْیِ۔ نُمِیْتُ اور ''اِلَیْنَا''۔ اسے دنیا کی کوئی زبان ادا نہیں کر سکتی۔

تفسیرِ جلالین:

خود عربی میں بھی اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ دو باپ بیٹا کی تفسیرِ جلالین ہے۔ انہوں نے قرآن کے لفظ کے آگے ''قوسین میں'' اپنے ذہن میں جو عربی زبان کا مرادف لفظ لکھ دیا ہے۔ عرب میں ایک ایک چیز کے لئے ہزاروں الفاظ ہوتے ہیں۔ عربی میں تو مرادف الفاظ ہی نہیں ہوتے۔ ان عربوں کا دعویٰ تھا کہ Exactly وہی معنی ادا کرنے کے لئے دو لفظ تو زبان کا بڑا نقص ہے مگر باپ بیٹا مرادفات لکھتے گئے۔ ذرا ان مرادفات کی آیات بنا کر ملاحظہ کریں تو مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔ عربی زبان میں بھی مرادفات نہیں ہیں تو دوسری زبان میں کیسے ترجمہ ہو سکے گا۔ قرآن کا مفہوم بیان کیا جاسکتا ہے؟

قرآن کے الفاظ کا محفوظ ہوجانا ہی قرآن کا اعجاز ہے۔ کروڑوں سینوں سے لفظ بہ لفظ موجود ہے۔ ان الفاظ کے معانی، لسان عربی مبین کے معنی شعرائے جاھلیہ کے کلام کی رو سے محفوظ ہیں۔ الفاظ محفوظ، معانی محفوظ، مگر مسلمان عجمی ہو جائے تو یہ چیز اسے قرآن سے دور لے جائے گی۔ فَقَرَاَهٗ عَلَيۡهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹۹﴾ (26:199) تو وہ پڑھ کر سناتا تو ان کا اعتراض قابل فہم نہیں ہوتا کہ کیوں یہ ایمان نہیں لا رہے۔ مگر اب تو یہ کھلی شہادت ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔

❁❁❁

حقائق کو شعر کی بجائے نثر میں بیان کرنا چاہیے

ے تو غنی از ہر دو عالم من فقیر | روز محشرِ عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر | از نگاہِ مصطفیؐ پنہاں بگیر
ے تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش | براہ دیگراں رفتن عذاب است
اگر دست تو کارِ نادر آید | گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است
(اقبالؒ)

اقبال کو حقیقتوں کو نثر میں بیان کرنا چاہیے تھا:

حقیقتوں کو نثر (Prose) میں بیان کرنا چاہئے۔ سچائی کو شعر میں بیان کر دینا قابل مذموم نہیں ہے۔ قرآن نے دو الگ الگ ذہنیتیں بتائی ہیں۔ قرآن نے اسلوب بیان نثر یا نظم کی بات نہیں کی بلکہ یہ جو دعویٰ وجدان کا کرتے ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ اونٹ کی طرح جھوٹی پیاس ہے جو ان کو ہر وادی میں لئے جا رہی ہے۔ نہ زندگی کا نصب العین اور نہ کوئی پختہ پروگرام۔ ساتھ دینے والے بھی ٹڈی دل کی طرح چرچگ کراڑ جانے والے جبکہ دوسری طرف وہ لوگ جو ایک پختہ پروگرام کے ساتھ ایک متعین نصب العین پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونے والے۔

ویسے سچائیوں کو نثر میں بیان کرنا چاہئے ورنہ یہ اشعار کی شکل میں بعد میں ڈھولک کی تھاپ تک محدود ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبال اپنے آپ کو شاعر کہلوانا توہین سمجھتے تھے۔

ے نہ پنداری کہ من بے بادہ بستم | مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست | کہ برمن تہمت شعر و سخن بست
بآں رازے کہ گفتم، پے نہ بر دند | زشاخِ نخل من خرما نخور دند
(راز کی بات نہ پہچانی)
من اے میرِ اممؐ! داد از تو خواہم | مرا یاراں غزل خوانے شمر دند

اقبال جیسے مفکّر کو قوم نے شاعری کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ ان کے ذہن میں نثر میں ایک کتاب لکھنے کا خیال تھا "Introduction to study of Quran" مگر وہ یہ نہ دے سکے۔ اگر یہ کتاب دے جاتے تو بڑا کام ہوتا۔ اصل میں شاعری مٹ جاتی ہے۔ ان کی شاعری بس وہی ہے جو گائی جاتی ہے۔

خارجی حوادث اور قوم کا داخلی کردار، دونوں کا تعلّق

قوموں پر عذاب نازل ہونے کی بنیادی وجہ:

قوموں پر یہ عذاب جس شکل میں آتا رہا تو اس کا تعلق دراصل ان کے داخلی کردار سے ہوتا تھا۔ مثلاً قوم نوح نے طبقاتی ناہمواریاں پیدا کیں اور ذاتی کردار کی بجائے دولت کو عزت ومناصب کا معیار قرار دیا۔ جس کی پاداش میں سیلاب آیا اور وہ غرق ہو گئی۔ اس طرح باقی اقوام میں سے کسی نے زمین کو ذاتی ملکیت میں لیا غریبوں اور ان کے مویشیوں پر دروازے بند کر دیئے۔ لاوا آیا اور وہ قوم بہہ گئی۔ کسی نے غلط جبر والا سیاسی نظام بنایا۔ زلزلہ آیا اور وہ قوم تباہ ہوگئی۔ جنسی بدنہادی پر آندھی چلی اور وہ قوم تباہی کا شکار ہوگئی۔ اب جو یہ اخلاقی بدکرداریوں کا ان حوادث سے کیا تعلق ہے؟ یہ سیلاب اور زلزلے، آندھیاں آج بھی آتی ہیں اور اس میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ یہاں بدکردار کا ذکر ہے۔ اور ہمارے نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو کفار کی قومیں انتہائی بدکردار ہیں مگر وہ ان قدرتی اور خارجی آفات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتی ہیں۔ جبکہ بجلی بیچارے مسلمانوں پر گرتی ہے۔ ہالینڈ کا پورا ملک تختے لگا کر سمندر سے حاصل کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں سیلاب آتا ہے مگر تباہی وبربادی لے آتا ہے۔ یہ سوال غور طلب ہے کہ قوموں کا ان بدکرداریوں سے کیا تعلق ہے؟ اگر تعلق ہے تو وہ ماضی میں تھا مگر آج وہ نظر نہیں آتا۔

تعلق کیا ہوتا ہے؟ سیلاب آیا، بند ٹوٹ گیا اور چاروں طرف بربادی چھا گئی۔ معلوم ہوا کہ انجینئر اور ٹھیکیدار کی ملی بھگت سے مقررہ معیار سے کم سیمنٹ، سریا اور تعمیراتی سامان استعمال کیا گیا تھا جو حفاظتی تدابیر والے تھے انہوں نے ذمہ داریوں میں کوتاہی برتی۔ یہ ہیں بددیانتی، کام چوری، اتنی رقم صرف کرنے کے باوجود خرد برد کر کے اخلاقی گراوٹ یہ سارا اخلاقیات کا مسئلہ ہے اگر کل کوئی مورخ یہ کہے کہ اس معاشرہ میں بداخلاقیاں وبا کی طرح پھیل گئی تھیں اور اس طرح سے حرام کاریوں اور فرائض سے کوتاہی کے سبب ہر سال سیلاب کا عذاب آتا تھا اور لوگوں کو تباہ کرتا تھا تو بات تو یہ ٹھیک ہوگی۔

ارض وسماوی حوادث سے محکم انتظامات اور تدابیر کے ذریعہ ہی حفاظت ممکن ہے۔ ان تمام حوادث کا تعلق براہ راست ان اخلاقی بدکرداریوں سے نہیں بلکہ تعلق فطرت کے قوانین سے ہے۔ حوادث سے بچاؤ کے لئے قوم کے اندر جن کا تعلق اخلاقی ذمہ داریوں سے ہوتا ہے وہ جتنا بہتر اور بلند ہوگا اتنے ہی حوادث کم ہوں گے۔ آج بھی آندھیاں، سیلاب، زلزلے اور آتش فشاں پھٹتے ہیں۔ اور جن قوموں کی حالت وہی ہے جو ہماری ہے جن کے ذمہ یہ کام ہیں وہ جتنی کوتاہیاں اور بددیانتیاں برتیں گے اس حد

تک پوری قوم کا نقصان ہوگا۔ تجزیہ کرتے جایئے لوگوں کی صحت گرگئی ہے نہ خوراک صحیح، نہ دوا صحیح، نہ صفائی کا انتظام، کروڑوں روپیہ ان مدوں کے لئے ہوتا ہے مگر خرد برد کرلیا جاتا ہے۔ اگر ان وباؤں کے بارے میں بعد کا مورخ لکھے کہ اس قوم کی اخلاقی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ ایک وبا کے اندر ہزاروں تباہ ہوگئے تو وہ ٹھیک کہے گا۔ حالانکہ وبا کا تعلق تو فطری قوانین سے ہے۔ اس سے بچاؤ اور قوانین فطرت سے ہوسکتا ہے اور یہ تدابیر بھی انسان کرتے ہیں اگر وہ غلط نظام یا غلط افراد کی وجہ سے ایسی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوجائیں تو حوادث عذاب الٰہی بن کر آ جاتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام:

قوم نوح طبقاتی تقسیم کر کے لوگوں کو رذیل سمجھتے تھے پھر اس سے معاشرے میں بیسیوں خرابیاں اور پیدا ہوجاتی ہیں۔ اب ان خرابیوں اور سیلاب کا تعلق دیکھئے حضرت نوح علیہ السلام اور متبعین میں یہ اخلاقی کمزوریاں نہیں تھیں۔ اب سیلاب کو تو صرف ان بدکردار لوگوں کو تباہ کرنا چاہئے تھا اور اچھے کردار والے اس سے محفوظ رہتے۔ اور وہ وہیں رہتے وہ کافران کے سامنے ڈوبتے اور سیلاب ان کو کچھ نہ کہتا۔ یہ ان کے حسن عمل کا نتیجہ ہونا چاہئے تھا کہ سیلاب ان کو نہ چھوتا۔ حکم ہوا کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (11:37) سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے کشتی بنانے کا کہا جارہا ہے۔ نبی کو ان آنے والے حادثات سے اس زمانے میں قبل از وقت آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ اب اس سیلاب سے بچنے کا طریقہ صرف طبعی قوانین کی رو سے کشتی بنا کر بچا جا سکتا ہے۔ اگر کفار مذاق نہ اڑاتے اور وہ بھی کشتی بناتے تو بچ جاتے۔ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ (11:38) اب جو طوفان آیا تو جو کشتی میں بیٹھا تو وہ بچ گیا جو نہ بیٹھا وہ سیلاب کی نظر ہوگیا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ سیلاب کے بعد مختلف قسم کے جانوروں کے دو دو جوڑے بھی رکھ لو سیلاب میں سارے تباہ ہوجائیں گے اور بعد میں ان کی ضرورت ہوگی۔ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (11:40) ان چیزوں کے معاملے میں کافر اور مومن کی کوئی تمیز نہیں۔ وبا آتی ہے تو وہ مومن اور کافر کے بچوں میں فرق نہیں کرتی۔ فطرت کے قوانین کا ان چیزوں پر مدار نہیں ہے۔

یہ تمام حادثات فطرت کے قوانین کی رو سے آتے ہیں جو فطرت کے قوانین کے مطابق ان حادثات سماوی وارضی سے محفوظ رہنے کا سامان کرتے ہیں وہ بچ جاتے ہیں۔ تباہی ان کی آتی ہے جو اس کا فطرت کے قوانین کے مطابق انتظام نہیں کرتے۔

قوم سبا:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴿۱۵﴾ (34:15) سب کچھ حاصل تھا۔ رزق کی فراوانیاں اور سامان حفاظت بھی مل رہا تھا۔

تباہی:

فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا (34:19) ایسا چسکا لگا کہ اپنے وطن سے دور دور دولت کے ہوس میں چلے گئے۔ تجارت میں ایسی وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ (34:19) یہ معاشی نظام چھوڑ کر ظلم پر مبنی غلط طریق اپنایا اس سے دولت آسانی سے ہاتھ آ جاتی

تھی۔ دور دور نکلنے کی بات ہے۔ فَاَعۡرَضُوۡا (34:16) تو جو نظام آبپاشی تھا اس سے توجہ ہٹا کر ڈاکہ زنی وغیرہ سے دولت حاصل کرنے لگے اور اس ڈیم سے چشم پوشی کر لی تو فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ سَیۡلَ الۡعَرِمِ (34:16) تو عدم کا بند ٹوٹا اور سیلاب آ گیا تو انجام کیا ہیں وَبَدَّلۡنٰہُمۡ بِجَنَّتَیۡہِمۡ جَنَّتَیۡنِ ذَوَاتَیۡ اُکُلٍ خَمۡطٍ وَّاَثۡلٍ وَّشَیۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِیۡلٍ ﴿۱۶﴾ (34:16) باغات تباہ ہو گئے۔ اب کہیں بیریاں ہیں کڑوے پھل، جھاڑیاں کانٹے دار، یہ ہے خدا کا عذاب پھر وہ قوم تباہ ہوگئی۔ اب میسرہ جو آسانی سے مال کمانے کا چسکا پڑا۔ زرعی نظام میں تو یہ بات نہیں تھی (Easy Money) والی چسکا پڑا تو بند اور نہروں کی نگہداشت چھوڑ دی۔ یہ ہے تعلق بداخلاقیوں کا حوادث سے اس طرح بعض قوموں کو آتش فشاں کا لاوا تباہ کر گیا کیونکہ قوم عیاشیوں میں پڑ گئی تھی۔ توجہات کے مرکز اور چیزیں ہوگئیں ساری کی ساری قوم۔ یہ تمام اسباب اور ذرائع رزق وتمدّن کے وہ نظر انداز ہو گئے۔ یہ ہے وہ عذاب جو خود اپنے ہاتھوں سے لایا جاتا ہے چونکہ ان حوادث سے بچنے کے انتظامات اس زمانے میں زیادہ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے چھوٹا حادثہ بھی پوری قوم کو تباہ کر دیتا تھا۔ پس نبی کو قبل از وقت اطلاع مل جاتی تھی۔

حضور ﷺ کا عہد قدیم اور جدید میں حد فاصل ہے:

ختم نبوّت سے مراد زمانۂ قدیم اور جدید کے اندر حد فاصل ہے۔ اب قدیم زمانے کے تمام مسلک اور روشیں جن کو سنّت اللہ کہتے ہیں اس دور میں آ کر انہوں نے اور شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ (اقبال)

پہلے عذاب سیلاب، آتش فشاں اور جھکڑ وغیرہ کی شکل میں آتا تھا۔ اس دور میں ان سے حفاظت کا سامان انسان نے دریافت کر لیا ہے اور مزید کرتا جا رہا ہے۔

دور حاضر کے انسان کی تباہی خود انسانوں کے ہاتھوں کی ہی رہین منت ہے۔ حوادث ارض وسماوی سے حفاظت تو اس دور میں آسانی سے ہوگی۔ مگر اب اس دور میں انسانوں کی تباہیاں انسانوں کے ہاتھوں سے آئیں گی۔ یہ ایک نئے دور کا آغاز تھا جو رسولؐ کی بعثت سے شروع ہوگیا۔ قریش نے شدید اذیتیں دیں مگر نہ ان پر زلزلہ آیا نہ آندھی، نہ آتش فشاں۔ جو پہلے ہو رہا تھا وہی ہونا چاہئے تھا مگر قرآن کہتا ہے اب انسانوں کا مقابلہ انسانوں سے ہوگا۔ ان کی مخالفت سے جو تباہی ہوگی وہ عذاب ہے۔ اس عذاب سے بچنے کا طریقہ کیا ہے کہا قَاتِلُوۡهُمۡ (9:14) یُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ (9:14) اب عذاب خارجی حوادث سے نہیں بلکہ تمہارے ہاتھوں سے آئے گا۔ یہ ہے وہ دور جس میں دنیا کا نقشہ بدل گیا اور یہ عذاب والے وَیُخۡزِهِمۡ (9:14) ذلت کی زندگی گزاریں گے۔

جنگ احد میں شکست سے دوچار ہونے کے اسباب:

جنگ احد میں مال غنیمت کے ساتھ Temptation میں آ کر کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی کی تو فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ اس لئے آئندہ احتیاط سے کام لیں جبکہ بدر کے میدان میں کفار کا ایک ہزار کا شاندار لشکر صرف تین سو کے مقابل شکست کھا گیا۔ قرآن ان کی شکست کی وجہ بتا رہا ہے بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۵۸﴾ (5:58) پلاننگ غور وفکر جنگ میں ضروری امر ہے۔ یہ نہیں کہا کہ یہ تو کفار تھے اور مقابل میں اولوالعزم جماعت تھی اس لئے شکست کھا گئے کہا کہ جو فکر تفکّر سے کام نہ لیا اس لئے شکست کھا

گئے۔ احد میں بھی مسلمانوں نے تفکّر سے کام نہ لیا۔ مال غنیمت کے جذبات غالب آ گئے اور شکست کھا گئے۔

جوہر انسانیت نہ رہے تو مال و دولت کی فراوانی کے باوجود قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ کہا کہ اگر جنگ نہ بھی ہو تو عذاب کیسے آتا ہے وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الدُّنْیَا (9:85)

لوگوں کی مال و دولت محبت کہیں تمہیں حیرت میں نہ ڈال دے کیونکہ یہی چیزیں دنیاوی زندگی میں ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔

ٹھیک ہے یہ بھی ضروری ہیں مگر ان کے ساتھ حسن کردار نہ ہو تو پھر تباہی مقدر ہو جاتی ہے۔

بدترین عذاب:

لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی ﴿۷۴﴾ (20:74) یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (14:17) ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا (3:112) جہاں جائیں ذلت و رسوائی پیچھا کرتی ہے۔

مسکنت کا ذلت آمیز عذاب:

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (3:112) دوسروں کے سہارے معاہدہ کر لیا یا کسی اور کا سہارا ڈھونڈ لیا اور حفاظت تلاش کر لی تو خدا کے قانون کا سہارا نہ لینے والوں کے لئے وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (3:112) وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ (3:112) تباہی اور بدحالی کی ذلت والی زندگی۔ چلتی ہوئی معیشت، فیکٹریاں رک جائیں۔ پٹرول اور گیس بجلی و پانی ناپید متحرک زندگیاں ساکن ہو گئیں۔ حرکت جموّد میں بدل گئی۔ یہ کیوں؟

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85) تو ان کی سزا فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (2:85) اس دنیا میں ذلت و خواری کی شکل میں عذاب آتا ہے۔ یہ ہمارے بارے میں ہے وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (16:112) پھر لوٹ کھسوٹ شروع کر کے ان نعما کو صرف اپنے لئے چھپا دیا فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (16:112) خدا کی طرف سے بھوک اور خوف کا عذاب نازل ہوا۔

قانون خداوندی سے اعتراض:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ﴿۱۲۴﴾ (20:124)

غلط نظام کی وجہ سے آلام کی مختلف اشکال:

اب آہستہ آہستہ ہو کر آخر یہ شکل ہو جاتی ہے۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ (6:65) جس طرح ساری مسلم دنیا میں ایک

دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ اور بے ایمان قیادت لوٹ کھسوٹ میں مبتلا ہے۔

عذاب کی انتہائی شکل:

یہ تھیں عذاب کی مختلف شکلیں۔ اسی دنیا میں اور آخر میں ایک فیصلہ کن مرحلہ آ جاتا ہے۔ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ (9:39) قوم کو مخالفتوں کے خلاف میدان جنگ میں آنا چاہئے اور اگر وہاں جی چرایا تو دردناک عذاب سے دوچار ہو جاؤ گے۔ وَّيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ (9:39) دوسری قوم کا آنا۔ غلامی میں چلا جانا۔

Law of succession and substitution

یہ ہے عذاب کی انتہائی شکل۔ یہ قانون استبدال واستخلاف قومی۔ قوموں کی جگہ دوسری قومیں کیسے لے لیتی ہیں۔

اقتدار وعزت وتکریم سے نا آشنا قوم ریت کے ذروں کی طرح بکھر جاتی ہے۔ پھر تاریخ میں فَجَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِيۡثَ وَمَزَّقۡنٰهُمۡ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ (34:19) پھر یہ ریت کے ذروں میں تبدیل ہو کر ہوا کا ہلکا سا جھونکا جیسا چاہے اڑائے پھرے یعنی ذلت کے مقام پر آ جاتی ہے۔ اور مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر وحدت گم کر دیتی ہے۔

حاکم قوم کا سلوک:

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰٮهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ (17:5) ان کی سخت گرفت ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ (17:5) گھروں میں گھس گھس کر تلاش کر کے شدید سزا دی جاتی ہے۔ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝۵ (17:5) یہ مکافات عمل کا فطری نتیجہ ہے۔ جو افغانستان، عراق، شام، لیبیا میں ہوا۔

خدا عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ یہ قوموں کے اعمال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ ؕ (4:147) او بابا! ہم نے کیا کرنا ہے تمہیں عذاب دے کر اگر تم ان قوانین کی صداقتوں پر عمل کرو اس طرح کہ جیسے کہا گیا ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيۡمًا ۝۱۴۷ (4:147) یہ تو تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے، ہم تو تمہارے اعمال کا نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔ اسے ان تمام باتوں کا علم ہے۔ حالانکہ وہ تو افسوس کرتا ہے يٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ ۚ (36:30)۔

وائے تفسیری:

تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيۡنٍ ۝۱ (27:1) یاد رکھیں! یہاں ''وَ'' کے معنی ''اور'' نہیں ہیں کہ قران اور ہے اور کتاب مبین اور ہے۔ عربی زبان میں یہ تفسیری ''واوَ'' کہلاتا ہے جس کے معنی ''یعنی'' ہوا کرتے ہیں۔ یعنی ایسی کتاب جو خود بھی واضح ہے اور ہر چیز کو واضح کرتی ہے۔

قرآنِ حکیم کو خدا تعالیٰ کی کتاب ماننے کا طریق اور مورس بکائے کی تحقیقات

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:53) اس آیت سے آگے ہے اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴿۵۳﴾ (41:53) یہ خود قرآن نے اپنی صداقت کی دلیل دی ہے کہ جوں جوں خارجی کائنات اور خود انسان کی نفسیاتی دنیا میں جوں جوں حقائق سے پردے اٹھیں گے خواہ ہزار سال کے بعد ہی کیوں نہ ہو اور وہ بات اس کے مطابق نکل آئے جو قرآن نے بیان کیا ہے تو مانو گے کہ خدا نے دیکھی ہوئی بات کی ہے تو یہ ثبوت بن جائے گا کہ وہ خدا کے سامنے ہر شے موجود ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہے کیا یہ اس کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرے وہ حقیقت ہو۔ وہ پہلے بیان کر دے جو اس نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ جب وہ صداقت بن کر آ جائے تو مان لو گے کہ اس نے حقیقی بات کی تھی جس نے کائنات کو خود تخلیق کیا ہو تو کیا اس کی شہادت کافی نہیں ہے۔ یہ ہے حیرت انگیز دلیل! یہ تو کسی انسان کا علم نہیں ہو سکتا۔

مذہب پرست قوم قرآن کی طرف نہ خود آئے گی اور نہ دوسروں کو آنے دے گی:

جہاں مذہب جاگزیں ہو وہاں قرآن نہیں آئے گا۔ یہ قرآن کے خلاف جو قوتیں کھڑی ہیں یہ خود مذہبی قوتیں ہیں۔ یہ ہیں دیواریں۔ کفر کے فتوے لگا کر پروپیگنڈے کے ذریعہ بات کو آگے چلنے ہی نہیں دیں گے۔ یہ ہماری ساری تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے جس نے قرآن کی بات کی اسے قتل کر دیا گیا، اس کی کتابیں مٹا دی گئیں۔ لیکن یہ تو نوع انسانی کی کتاب ہے کوئی دوسری قوم اسے اٹھا کر لے جائے گی۔ اور ان سے بہتر ہو گی ان کی مثل نہیں ہو گی۔

مورس بکائے کا قرآن کو سمجھنے کے لئے چند اصول:

ضروری سمجھے (Maurice Bucai 1911-89) پہلی چیز محاورۂ عرب یعنی عرب اس لفظ کے اس زمانے میں کیا معنی لیتے تھے۔

دوسرا قرآن میں ایک موضوع پر جو کہا گیا ہے وہ بکھرا ہوا ہے وہ سارے مقامات سامنے ہونے لازمی ہیں یعنی تصریف الایات۔

تیسری چیز عربی زبان کا مادہ بڑے وسیع معانی رکھتا ہے۔قرآن کے سمجھنے کے لئے خود قرآن نے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ چونکہ انسانی زندگی کا تعلق مختلف گوشوں سے ہے۔ معاشیات، سائنس، سیاست، معاشرت، تاریخ ان علوم پر عبور حاصل کرنا قرآن فہمی کے لئے ضروری ہے۔قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ ایک ہی مادہ (Root) کے بنے ہوئے الفاظ جو وہ ان مختلف علوم کے اندر لاتا ہے۔ اس خاص علم کی جو اصطلاحات ہیں اس مادہ سے اس اصطلاح میں بھی ''معنی'' مل جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہوگی کہ ہم ایک علم کے دائرے کے اندر ایک لفظ کا جو مفہوم لیں وہ جتنے علوم ہیں اس میں وہی مفہوم اور ترجمہ لیتے جائیں۔تو یہ سراسر غلط ہو جائے گا۔انگریزی زبان میں ذرا دیکھئے وہی لفظ اکنامکس میں کچھ اور معنی، تاریخ میں کچھ اور معاشرت میں کچھ اور۔ حالانکہ وہ ایک ہی اصطلاح ہوتی ہے۔مثلاً account accountability۔ بینک والا اکاؤنٹ اور account for کیا ہوتا ہے۔یعنی قرآن کے ان مفردات کے یہ معنی ایک علم کے ضمن میں آپ لیں تو ہر جگہ انہی الفاظ کے وہ معنی نہ دہرائے جائیں۔اس علم میں اس کے لئے اس علم کی ایک اصطلاح ہوگی۔مگر شرط یہ ہے کہ جو اس لفظ کے مادہ (Root) کے معنی ہیں۔آپ اس سے الگ نہ ہٹیں۔ یہ اگر کر دیا تو یہ تحریف ہوگی۔اس کے مطابق رہیں گے تو یہ قرآن کے مطابق ہوگا۔

نظریات کی دنیا میں ردّوبدّل انسانی عقل کا خاصہ ہے:

یہ تمام تراجم اور تفاسیر وہ آج کام نہیں دیتیں۔اس زمانے میں علم انسانی اتنا بلند ہی نہیں ہوا تھا نہ ان کی اتنی ذہنی سطح تھی۔ وہ اس کے مطابق ہی بیان کر سکتے تھے۔اب یہ سراسر غلط ہوگا کہ علم انسانی تو بلند ہو جائے اور ہم اسی کے پابند رہیں جو اس علمی سطح کے اوپر ان لوگوں نے کہا تھا۔

وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ جو کچھ میں آج کہوں گا وہ نظریات ہوں گے۔مسلمات نہیں "Apriori" نہیں۔اس سلسلے میں دو چیزیں ہیں۔ایک تو نظریات ہوتے (Theory) ہیں۔نظریہ یہ ابھی ثابت شدہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک وقت میں جا کر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔جو چیزیں ابھی نظریات کی دنیا میں ہیں میں ان کو مسلمات کبھی نہیں کہوں گا۔قرآن ان نظریات سے آگے جاتا ہے۔ان کو تو میں ابھی Touch نہیں کروں گا۔ میں صرف وہ چیزیں لوں گا جو ہمارے ہاں سائنٹفک علوم میں ثابت ہو چکی ہیں۔ کلیہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

قرآن کے تراجم اور تفاسیر غلط کیوں ہو جاتے ہیں؟:

آج کے دور کے جو ترجمہ کرنے والے یا مفسرین ہیں وہ انہی سے بندھے ہوئے چلے آ رہے ہیں جو پہلے دور کے کرنے والوں نے کیا تھا۔اس دور میں جب ابھی علم انسانی اتنا نہیں تھا۔ان کے پاس یہ معقول عذر تھا کہ وہ اتنا ہی سمجھ سکے۔اس سے زیادہ نہ سمجھ سکے۔اس زمانے میں وہ واضح نہیں ہو سکتا تھا۔آج وہ بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا ہے ان علوم سائنس کا شکر یہ کہ اس نے ہمیں قرآن سمجھنے کی توفیق عطا کر دی ہے۔آج ان سائنسی علوم نے کئی ایک قرآنی نظریات کو ثابت کر دیا ہے اور یہ کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔حالانکہ اکثر لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ رسولؐ نے وہاں ان کی کچھ اڑتی ہوئی باتیں سن لی ہوں گی اور پھر قرآن میں بیان کر

دیں۔ان کے ذہن میں کوئی اور توجیہہ آتی ہی نہیں تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان کے ہاں خیالات ملتے ہیں۔لیکن ملے جلے ہوتے ہیں۔کچھ غلط اور کچھ صحیح ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ان کی فکریں واقعی اپنے ہم عصروں سے آگے نکل گئی تھیں۔لیکن اس کا بھی اقرار کرنا ہوگا کہ اس میں بہت سی باتیں غلط بھی ہیں۔

لیکن قرآن ان سے بالکل منفرّد نظر آتا ہے۔

رسول خدا ﷺ کی نبوّت کی تائیداور خراجِ تحسین:

ان فلاسفرز اور دانشوروں کی باتوں میں غلط بھی ہیں۔صحیح بھی ہیں۔قرآن کی خصوصیّت یہ ہے کہ اس نے بے شمار مقامات پر یہ دعاوی کئے ہیں اور ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جو سائنٹفک انکشافات کے بعد غلط ثابت ہوا ہو۔اس لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ محمد ﷺ نے ان مفکرین کے افکار مستعار لے لئے اگر وہ یہ کرتا تو اس میں غلط اور صحیح دونوں ہوتیں۔اگر انہوں نے ان میں سے غلط چیزوں کو چھانٹ کر صرف صحیح چیز میں رکھی تھیں۔تو وہ کونسا ذریعہ علم تھا جس سے انہوں نے سمجھا کہ وہ غلط ہیں۔اس دور میں تو کسی بڑے سے بڑے محقق نے بھی ان کو غلط نہیں کہا تھا۔اس کو تو پھر انسانی فکر سے ماوراء سرچشمۂ علم ہی غلط کہہ سکتا تھا۔یہ ڈاکٹر وجد میں آ کر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔اے دنیا کے دانشورو! خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ کوئی ذہنِ انسانی یہ بات کہہ سکتا تھا!

مسلمانوں سے التجا:

ان کو مشورہ یہ ہے کہ اگر میری یہ بات مان لیں کہ قرآن ہی کو خدا کی کتاب کہہ کر پیش کریں تو دنیا میں کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔اگر انہوں نے موجودہ مذہب کو خدا کا دین کہہ کر پیش کیا اور یہ قرآن کا جزو بنا دیا جبکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن بھی وحی ہے اور یہ احادیث بھی مثلہ معہ وحی ہیں۔اگر یہ پیش کرتے رہے تو مسلمان قوم تو گئی ہے اس سے باقی دنیا بھی ادھر نہیں آ سکے گی۔علم کی بارگاہ میں قرآن پیش کرو تو اس انداز سے اس کو پرکھ کر سمجھو کہ پیش کرو تو دنیا کا کوئی اہل علم اس کو چیلنج نہیں کر سکے گا۔اس کے بعد تو وہ سائنسدان۔

؎ میری نگاہ نے جھک جھک کر کر دیئے سجدے جہاں جہاں پہ تقاضائے حسن یار ہوا

جب سائنس کی ڈسکوری کو قرآن کی روشنی میں دیکھا تو بے اختیار سجدے میں گر گیا کہ یہ کسی انسان کا خاصہ نہیں ہو سکتا! اور مسلمان ہو گیا۔

ساری عمر تلاش میں رہتے ہیں کہ خدا سامنے بے نقاب ہو کر آ جائے

حالانکہ لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ ۡ (6:103) تو محسوس شکل میں، تمہارے ادراک میں تم تو ایک طرف رہے موسیٰ علیہ السلام سے بھی یہ بات کہہ دی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا اس کی شہادت، علامات، مظاہر، اس کے قوانین اگر تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائیں تو اس کو تو خدا کا بے نقاب ہونا کہا جاتا ہے۔ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ ؕ (41:54) یہ شک میں ہیں کہ پتہ نہیں خدا ہے بھی یا نہیں چاہتے ہیں کہ سامنے آئے۔ ان سے کہو اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍ مُّحِيۡطٌ ۵۴ (41:54) وہ کہیں عرش پر نہیں بیٹھا کہ تم اسے نہ دیکھ سکو۔ کائنات کی جس شے کے متعلق تحقیق کرو گے خدا مل جائے گا۔ سامنے نظر آ جائے گا۔

لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ ؕ (41:54) کے لئے صوفی مارا مارا پھرتا ہے، حجّروں کے اندر، غاروں کے اندر، تاریکیاں بڑھا کر خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ (29:20) اس کائنات میں جگہ جگہ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ ؕ (41:54) بکھرا ہوا ہے ان سے پردہ اٹھاؤ تو وہ نظر آ جائے گا۔

دعا کا قرآنی مفہوم

اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَیَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿ؕ۶۲﴾ (27:62) یا کون ہے جو مجبور و پریشان، محکوم قوم اس کے قانون کو پکارتی ہے تو وہ اس کی پکار کا جواب دیتا ہے اور جب وہ اس کے مطابق عمل کرتی ہے تو اس کے مصائب اور مشکلات دور کر دیتا ہے۔ اس طرح تمہیں محلات عطا کر دیتا ہے۔ اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کا وارث۔

اعتراضات موجودہ عقیدۂ دعا پر:

عقیدہ یہ بنا لیا گیا ہے کہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے تو کیا دعا کرنے سے وہ جو خدا نے مقرر کر رکھا ہے، تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی بیمار کے متعلق طے کر رکھا ہے کہ تین دن بعد اس نے مر جانا ہے تو گھر والے دعائیں کرتے ہیں کہ اسے شفا عطا کر دے تو کیا وہ اس لکھے ہوئے کو تبدیل کر دے گا۔ تو اس سے اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ طے کرنے کے بعد ہمارے چاہنے سے بدل دیا پھر اگر ہم نہ کہتے تو وہ اس کے مطابق ہی کرتا۔ کیا وہ اپنے کیئے ہوئے فیصلوں کو ہمارے چاہنے سے بدل دیتا ہے؟ اس سے اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ نہیں اس نے کائنات میں کچھ قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور انسان کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ ان کے مطابق کرے یا خلاف کرے۔ جیسا کرے گا اس قسم کا نتیجہ اس کے سامنے آ جائے گا۔ تو اگر وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے دعا کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو تو کیا وہ نہیں ہوتا۔ مثلاً سنکھیا کھانے کے بعد دعا کرتا ہے کہ میری ہلاکت نہ ہو۔ تو کیا جو اس نے قانون مقرر کر رکھا ہے کہ سنکھیے سے ہلاکت ہو گی تو کیا اپنے اس قانون کو بدل دے گا؟

نہ تو قانون اور نہ پریکٹس (سنّت) تبدیل ہوتی ہے:

قرآن میں بار بار ہر جگہ کہا ہے کہ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ (10:64) کلمات تو Theoratical جبکہ سنّت پریکٹس میں آنے کو کہتے ہیں۔ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ﴿۶۲﴾ (33:62) سنّت یعنی نہ قانون اور نہ پریکٹس دونوں میں تبدیل ہو گی۔ نہ روش میں تبدیلی اور نہ قانون میں تبدیلی۔ تو دعا تو قانون کی خلاف ورزی کے نتیجہ سے بچنے کے لئے کی جاتی ہے کہ اس کے خلاف ہو جائے۔ یہ اعتراضات دعا کا غلط مفہوم لینے کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ کیا خدا مظلوم، بے بس کی دعائیں نہیں سنتا؟ پھر اگلا اعتراض کہ مظلوم کی دعاؤں کو سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ لیکن روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ایک بیوہ عورت کا ایک ہی سہارا نوجوان بچہ قریب المرگ

ہے۔اس سے زیادہ مخلص دعائیں کون کرے گا۔رات بھر سجدے میں پڑی دعائیں مانگتی ہے کہ یا اللہ! اسے بچا دے اور وہ مر جاتا ہے تو پھر یہ بات بھی غلط ہے کہ مظلوم کی دعا سن کر اس کے مطابق کرتا ہے۔

اگر خدا نے حق کا ساتھ دینا ہی ہے تو پھر دعا کرنے کا مقصد؟:

اگلا اعتراض دعا کے اس خود ساختہ مفہوم پر عدالت میں مدعی اور مدّعا علیہ دونوں رات کو صبح کی تاریخ میں دعائیں کرتے ہیں کہ میرے حق میں فیصلہ ہو جائے تو کس کے حق میں فیصلہ کرے گا؟ کہا جاتا ہے جو حق پر ہے اس کے حق میں خدا یہ فیصلہ کرائے گا۔تو جو حق پر ہے اگر وہ یہ دعا نہ کرے تو کیا یہ فیصلہ دوسرے کے حق میں ہو جائے گا۔تو دعا کرنے یا نہ کرنے کا اس پر کیا فرق پڑے گا؟ اگر قاعدہ خدا کے ہاں یہ ہے کہ جو حق پر ہے خدا اس کی مدد کرے گا تو پھر دعا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔کوئی دعا کرے تو فیصلہ حق میں ہو جائے اگر دعا نہ کرے تو اس کی مدد نہ کرے۔دوسرے کے حق میں فیصلہ ہو جائے۔یہ ہیں اعتراضات جو ذہن میں ابھرتے ہیں۔

قلب مضطرب میں خدا کے متعلق تصوّرات اور قرآن کا جواب:

تڑپتا ہوا مظلوم دل میں قیامت لئے آ کر کہتا ہے کہ یہ کس قسم کا خدا ہے کہ میں حق پر ہوں اگر وہ ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑتا اور مظلوم کی مدد نہیں کرتا تو (معاذ اللہ) کس قسم کا خدا ہے یہ ہیں وہ اعتراضات جو دعا کے اس غلط تصوّر کی وجہ سے دلوں میں ابھرتے ہیں۔ قرآن ہر بات کا جواب دلیل سے دیتا ہے۔اصل میں یہ سارے اعتراضات دعا کے غلط تصوّر کی وجہ سے اٹھتے ہیں اگر قرآنی تصوّر سامنے آ جائے تو پھر ان میں سے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا۔

دعا کا قرآنی مفہوم ''پکارنا یا آواز'' دینا ہے:

عربی زبان کی رو سے بھی اور قرآن کی رو سے بھی دعا کے معنی کسی سے کچھ مانگنا نہیں ہے۔دَا عِ۔ دَعَا سے مراد آواز دینا، پکارنا ہے ہم تو دعا مانگنا یعنی دعا بھی اور ساتھ مانگنا بھی کہتے ہیں۔یہ آیت اس کا اعادہ ہے۔یہ روزوں کے احکام کے درمیان ہے وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ (2:186) کہو ان سے فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ؕ (2:186) بعید نہیں قریب ہوں۔اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) پکارنے والا۔آواز دینے والا ہمیں آواز دیتا ہے تو ہم اس کی آواز کا جواب دیتے ہیں۔

جواب مشروط ہے:

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾(2:186) لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾(2:186) نے سارا مفہوم واضح کر دیا۔راستہ صحرا میں بھٹک گیا ہے تو راستہ پوچھنے کے لئے آواز دیتا ہے راستے کی مثال صرف سڑک یا صحرا تو نہیں ہے جب تک حل نہ ملے تو پریشانی ہوتی ہے جونہی حل ملا تو بات آگے بڑھتی ہے۔اب بتائیے ہوئے راستہ پر چلنا ہے۔

رَشَدَ (استاد) اس میں تین چیزیں ہیں پہلا صحیح راستہ۔دوسرا تمہیں منزل مقصود تک پہنچا دے۔اس راستہ کو مُرْشَد کہتے ہیں۔راستہ معلوم ہونے کے بعد تیسری چیز اس پر جم کر چلنا۔یہ تینوں چیزیں ہوں تو پھر رشد ہوتا ہے۔دَاعِ سے يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾(2:186) تو اس سے پرابلم کا صحیح حل سامنے آ جائے گا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے جواب دینے کا طریق:

ہم نے پکارا تو اس نے جواب دیا تو کوئی آواز تو سنی نہیں تو اس جواب کا فائدہ کیا؟ دراصل یہ جواب کہیں اور سے ملنا ہے۔ اس آیت سے پہلے والی آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ (2:185) قرآن نازل ہوا اس میں نمایاں طور پر ساری انسانیت کی نشاندہی کردی گئی ہے جہاں دوراہا آیا تو وہاں وَالْفُرْقَانِ ۚ (2:185) فرق کرنے کے لئے نشانات راہ، سائن پوسٹ لگا دیا ہے کہ یہ فلاں جگہ کو اور یہ دوسرے مقام کو جائے گا۔ پتہ پوچھ رہے ہو راستے کا تو وہ ہم نے اپنی کتاب میں نقشے بنا دیئے۔ سڑکیں بنا کر جگہ جگہ نشانات دے دیئے ہیں۔ یہ گائیڈ بک تمہارے ہاتھ میں ہے اسے follow کرو۔ پکارو مجھے کیونکہ یہ کلام اللہ میری باتیں اسی میں ریکارڈ ہیں اور تمہارے ہر پکار کا جواب میں نے دے دیا ہے۔ ارے بھئی لکھ کر بھی تو ہم ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔ نسخے بھی تو لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ قیامت تک جو رہنمائی درکار تھی وہ دے دی گئی ہے۔ ہم علیم اور خبیر ہیں ہمیں پتہ ہے کہ کہاں کہاں تمہیں راستے کی تلاش ہوگی۔ ہم نے پہلے سے یہ سارے جوابات، نقشے ان راہوں کے اس کتاب میں درج کر دیئے ہیں اور وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6: 115) یہ مکمل ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ تم کسی مقصد کے لئے آواز دو اور اس کا جواب قرآن سے نہ ملے۔ براہ راست باتیں ختم نبوّت کے بعد بند ہوگئیں۔ ہر قلب مضطرب کا علاج اس میں درج ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قلب پریشان کو ایک سیکنڈ میں جواب مل گیا اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (27:62) کون ہے جو قلب پریشان کا جواب دیتا ہے ہم راستہ بتا کر اس کی پریشانی کو رفع کر دیتے ہیں۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) تم نے پوچھا تو ہم نے جواب دے دیا مگر تم نے بھی کچھ کرنا ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ (2:186) پہلے ہماری بات کا جواب دو۔ آگے کیسے جاؤ گے؟ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ (2:186) ہماری بات پر یقین ہے یقین نہیں تو جاؤ دھکے کھاتے پھرو۔ اگر ہے تو اس یقین کے بعد لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ (2:186) صحیح راستہ آ گیا ہے اس پر چل پڑو۔ سچا اور کھرا راستہ یہی ہے جو تمہیں تمہارے مقصد سے ہم کنار کردے گا۔

یقین محکم اور عمل پیہم دعاؤں کی قبولیت کے لئے لازم و ملزوم ہیں:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ (40:60) راستہ کی تلاش ہے تو مجھے پکارو۔ میں پکار کا جواب دوں گا۔ (40:60) راستہ کی تلاش ہے تو مجھے پکارو۔ میں پکار کا جواب دوں گا اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ (40: 60) راستہ بتا دیا پوچھنے کے بعد تو اس کے بعد اس کی اطاعت نہ کرے، سرکشی اختیار کرے اس پر چلنے سے تو ذلت و خواری کا جہنّم اس کا مقدر ہو جائے گا۔ یہ ہے طریقہ دعاؤں کے قبول ہونے کا۔ صرف راستہ کا معلوم ہونا کافی نہیں۔ اس کے بعد اس پر یقین ہونا پھر اگلی بات پر سرکشی آئے۔ نسخہ لے کر الگ رکھ دیا تو جہنّم میں داخل ہو گئے۔ منزل اسے ملے گی جو اس کے قوانین کی اطاعت کرے گا۔ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) وہاں يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ (2:186) کہا تھا اور ادھر وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) ایمان ہے مگر عمل صالح سے فائدہ ہوگا۔

کائنات کی حیثیت، اس کی کامیابی اور اس کی افادیت پر غور وفکر کی دعوت:

اِنَّ فِيۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ (3:190-191) اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے کائنات پر غور وفکر کرتے ہیں۔ حقائق کو تحقیقات کے ذریعہ بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (3:191) پھر ان کی دعائیں ہیں کہ ہم ان قوتوں کو انسانیت کی بہتری کے لئے استعمال کریں۔ پھر کہا فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ (3:195) تو اس کے معنی یہ نہیں کہ دعاؤں کو قبول کر لیا بلکہ اَنِّىۡ لَاۤ اُضِيۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡكُمۡ (3:195) یعنی جب تم اس کے مطابق کام کرتے ہو تو وہ کام وہ نتیجہ برآمد کرتا ہے اب تمہاری کوششیں ضائع نہیں ہوں گی۔

اور جو راستے کے لئے قرآن کو Consult نہ کرے تو فَاُولٰٓٮِٕكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ (2:217) یہ تھے جنہوں نے منزل اور راستہ کا تعین نہیں کیا تو ان کا سارا سفر، محنت رائیگاں چلی گئی۔ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۱۱﴾ (22:11) یہ ہیں حد سے زیادہ نقصان میں رہنے والے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پکار:

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا جاؤ فرعون سرکش ہو گیا ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے کچھ مانگا کہ بھائی ساتھ کر دو۔ قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا (10:89) کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی بشرطیکہ فَاسۡتَقِيۡمَا (10:89) اس پروگرام پر مستقل طور پر جم کر ڈٹ کے کھڑے ہو جاؤ۔ وَلَا تَنِيَا فِىۡ ذِكۡرِىۡ (20: 42) کہیں بھی سستی نہ دکھانا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی پکار اور جواب:

حضرت نوح علیہ السلام نے ساری مشکلات بتائیں وَلَقَدۡ نَادٰٮنَا نُوۡحٌ (37:75) یہاں دعا کی بجائے نداء ہے فَلَنِعۡمَ الۡمُجِيۡبُوۡنَ ﴿۷۵﴾ (37:75) سب سے بہتر جواب دینے والے ہیں۔ تو اب ان کو آرام سے بیٹھ جانا چاہئے۔ طوفان کی خبر پہلے سے مل گئی تھی۔

فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ اَنِ اصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡيُنِنَا وَوَحۡيِنَا (23:27) پرابلم کا حل بتا دیا گیا اور راستے کی رہنمائی کر دی جاتی ہے۔ سارا مسئلہ تو صحیح قانون ہو اور اس پر چلا جائے جب معاشرہ ہی سارا غیر قرآنی ہو تو اس میں صحیح حل کو چلنے ہی نہیں دیتے۔ سارے مصائب ان غلط قوانین کی وجہ سے ہیں اور جو ان قوانین پر بھی چلنا چاہے تو چلنے نہ دیا جائے۔ نسخہ تو صحیح دیا ڈاکٹر نے لیکن دوا جو ملاوٹ والی ہو تو کیا کریں۔ قانون والا قدم قدم پر ٹپتا ہے۔ قرآن نے اس کا بھی حل بتا دیا ہے۔ (27:69) تو اس معاشرہ کو بدل دو وَيَجۡعَلُكُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ (27:62) اقتدار ان کے حوالے کر دو جو قانون کے مطابق چلتے ہیں۔ حکومت کیسی ہو گی۔ کہا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ (27:62) اس دور سے کوئی اور قانون نہیں صرف قرآن کا قانون۔ ہر مشکل کا حل بتا دیا۔ اسے تم اپنے ہاں کا قانون بناؤ۔

مکہ والوں کی مشکلات کے متعلق مدینہ والوں کو حکم جاری ہو رہا ہے:

ان مشکلات سے نجات وہ مملکت جس میں اقتدار قرآن کو حاصل ہو، قائم کرو۔ مکہ والے براہ راست خدا کو پکار رہے ہیں وَمَا لَكُمۡ لَا تُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ الَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ

674

اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ (4:75) اس سے تو کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ خدا براہ راست آ کے کچھ نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے ہاتھوں سے اپنی ذمہ داریاں پوری کراتا ہے۔ اس لئے صحیح نظام اقدار خداوندی پر قائم کرو۔ پھر کوئی مظلوم خدا کو پکارے تو اس کی مدد کو پہنچو۔ الناس کہا ہے صرف مسلمان نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرا فریضہ یہ ہے کہ تمہاری دعائیں خدا تک پہنچنے سے روک دوں خود ہی بتایا کہ کیوں؟ کہا کہ تم اس وقت خدا سے دعا کرو گے کہ تمہارا کوئی کام یہاں رک جائے گا۔ اگر مجھ تک شکایت پہنچی اور کام ہو گیا تو خدا کو پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو خدا کے ہاں میری شکایت ہوگی۔ ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کسی کی دعا کو خدا تک پہنچنے نہ دیں۔ یہ ہے تفسیر وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ط (27:62) یہ ہے نظام خداوندی۔ اپنی ہی تمنا آرزو کا نام دعا ہے جس کی قبولیت کا طریق قرآن بتاتا ہے۔ دل میں تمنا۔ آرزو پیدا ہو کر ہونٹوں پر آ جائے تو اسے دعا کہتے ہیں۔ آرزو کی جتنی اہمیّت ہو اتنی ہی وہ شدت سے پیدا ہوتی ہے اس کا خیال شدت سے ذہن میں بار بار آتا ہے۔ دعا دراصل شدت آرزو کا نام ہے۔ ان آرزوؤں سے دلوں میں مقاصد ابھرتے ہیں۔ یہ مدّعا ہوتے ہیں یہ ایک نفسیاتی تغیرّ ہوتا ہے اگر کسی چیز کی آرزو کو دل سے بار بار دہراتے چلے جائیں تو اس سے ایک نفسیاتی تغیرّ پیدا ہوتا ہے اور اس کی اہمیّت اپنے سامنے بطور نصب العین مدّعا سامنے رکھیں تو اس سے ایک جوت بیدار ہوتی ہے جو دیگر قوموں کو مجتمع کرتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط (13:11) تغیرّ نفس سے باہر کی دنیا بدل جاتی ہے۔ اقدار بدل جاتی ہیں قوموں کی حالت تبدیلی تغیرّ نفس پر ہے۔ اسے دعا کہہ دیں۔ آرزو کا شدت اختیار کرنا اس سے تغیرّ نفس ہوتا ہے تو اس سے بڑی قوّتیں آ جاتی ہیں جن کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا ؎

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی — مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

آرزو اگر غلط ہو تو فسادات پھیل جاتے ہیں۔ اگر صحیح ہو تو تعمیری کام ہو جاتے ہیں۔

؎ تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری — میری دعا ہے کہ تیری آرزو بدل جائے

آرزو کا تعین قرآن سے کریں وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (81:29) آرزو کا تعین قرآن سے کرو پھر اس آرزو میں شدت پیدا کرتے جاؤ تو مخفی قوّتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

شدت آرزو کا پیدا ہونا ہی زندگی کا نشان ہے:

''دعا''، مخفی پوشیدہ قوّتیں انسان کے اندر ہی رکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر آرزو پیدا نہ ہو تو یہ ساری قوّتیں سو جاتی ہیں۔ پیدا ہو اور کمزوری میں ہو تو ذرا یونہی کروٹ لیتی ہیں۔ شدت اختیار کر جائیں تو ساری قوّتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ عرب دودھ دوہتے وقت تھوڑا سا دودھ تھنوں میں چھوڑ دیتے تھے۔ وہ اس میں ذرا سا تحرک پیدا کرتا تھا۔ اندر یہ مادہ تحرک پیدا کرتا رہتا تھا جو وہ اندر چھپا ہوا دودھ ہوتا تھا اور ان کے برانگیخت کرنے سے نیچے اترتا تھا۔ اس ننھے سے خفیف جذبہ میں خزانہ پوشیدہ ہے۔ اس کو اس طرح سے انگیخت کرے کہ وہ دودھ اترنا شروع ہو جائے تو دعا سے وہ اسے اَلدَّاعِيه کہتے تھے یعنی تحرک پیدا کرنے والی چیز۔ صحیح دعا کا تعین قرآن سے، پھر شدت پیدا کرنے کے لئے اسے سامنے رکھیں تو خفتہ قوّتوں کو بیدار کر دے گی۔

قانون کی قوّت کا خارجی کائنات میں عمل پیرا ہونا:

اَمَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَاَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمۡ اَنۡ تُنۡۢبِتُوۡا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ يَّعۡدِلُوۡنَ ﴿۶۰﴾ (27:60) دوسری شکل اس دعا کی ہے یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ (13:14) محاکاتی انداز ہے۔

اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيۡهِ اِلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ (13:14) یہ لوگ ہیں جو ہم سے راستہ نہیں پوچھتے بارش کس قوانین کے تحت برستی ہے۔ مختلف کرے فضاؤں میں کس طرح تیرتے ہیں۔ پہاڑ۔ دریا۔ سمندر۔ زراعت یہ تمام چیزیں قوانین کی پابند ہیں۔ ملاحظہ کریں کہ ہر آیت دوسری آیت سے باہمی ربط ترتیل کے ذریعہ آراستہ ہے۔ مگر یہ مذہبی پیشوائیت دوسروں کو محتاج بنا کر اپنی اجارہ داری قائم کرتی ہے۔ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّهۡبَانِ لَيَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ (9:34) یہ تمام مولوی۔ پیر۔ علماء۔ مشائخ اکثریت میں دوسروں کا مال ناجائز طور پر ہڑپ کرتے ہیں۔ فی الحقیقت خدا کا نظام قائم کرنے میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کی تقدیریں بدلتے ہیں۔ پچھلی آیات میں قرآن نے خارجی کائنات سے قوانین کی کارفرمائی پر زور دیا ہے تو جب مصیبت پڑتی ہے تو بھول جاتا ہے کہ ہر چیز تو قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ کوئی قانون کی خلاف ورزی ہوئی اس لئے یہ افتاد آن پڑی۔ تو علاج یہ ہے کہ پھر اس کے قانون کی طرف رجوع کیا مگر وہ نہیں کرتا۔ چاہتا یہ ہے کہ خلاف قانون کچھ ہو جائے۔ تو پھر یہ ان سے جا کر دعائیں منگواتے ہیں کہ کچھ ایسا کر دیں کہ قانون کے خلاف کچھ ہو جائے۔ تو یہ خدا کے راستے کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے پیسے بٹور کر خدا سے ان فیصلوں کو بدلوانے کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں۔

قاعدے اور قانون کی خلاف ورزی کا نام بیچارگی ہے۔ جب قاعدے قانون کے مطابق کچھ ہوتا نہیں ہے تو اسی کو بیچارگی کہتے ہیں۔ جب بھی موٹر کا انجن قاعدہ قانون کے مطابق ہو یعنی پٹرول، آئل وغیرہ صحیح ہو تو چلتا جاتا ہے۔ جہاں نقص آ جائے تو وہاں موٹر رکتی ہے پھر لوگوں کو ڈھونڈتے ہیں کہ ذرا دھکا لگا دیں۔ یہ دعا منگوانے والے دھکا لگواتے ہیں ورنہ جب تک وہ قاعدے قانون کے مطابق ہو تو چلتی جاتی ہے۔ دھکے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قرآن نے پہلی یہ بات کی ہے یاد رکھو! دعا نہ منگوانے والی بات کرو۔ جب بھی صحیح راستہ نہ ملے تو ہمیں آواز دو صحیح راستہ بتانے کے لئے کہ جس پر چل کر ہم منزل مقصود تک پہنچ سکیں اور وہ راستہ ہمارے قانون کی کتاب قرآن میں تمہیں مل جائے گا۔ قانون کی خلاف ورزی سے ایک یا ایک انداز کی زندگی سے اگر کوئی مصیبت آئی ہے تو اس کا حل یہ ہے تو اس کے مطابق جو صحیح قانون اس نے مقرر کیا ہے اس طرف لوٹ آؤ جس طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی پہاڑی پر گئے لشکر دیکھنے کے لئے جہاں طاعون کی وجہ سے عراق تک سیلاب کی طرح پھیل گئی تھی تو حکم دیا کہ فوراً یہاں سے کوچ کرو۔ یہاں ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ تقدیر الٰہی سے بھاگ رہے ہیں۔ جواب دیا ہاں میں خدا کی ایک تقدیر سے دوسری کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ آپ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو واپس بلانے کے لئے خط لکھا۔ مگر جواب دیا کہ چونکہ میں سپہ سالار ہوں اس لئے مجھے معذرت کریں اور وہیں جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یعنی کہا یہ ایک تقدیر یہ ہے کہ وبا پھوٹنے

سے جراثیم لگ جاتے ہیں۔اس لئے وہاں سے نکل جاؤ اور اس کا قانون یہ ہے کہ جہاں جراثیم نہ ہوں تو محفوظ رہو گے۔تو خدا ہی کے ایک قانون سے دوسرے قانون کی طرف جارہا ہوں وہ وہاں بیٹھ کر دعائیں نہیں مانگنے لگ گئے تھے۔

اب یہ درمیان میں یہ دعائیں مانگ کر قسمتیں بدلنے والے آجاتے ہیں اور یہ تمام مذاہب میں موجود ہیں۔گرجا، مندر، مسجد، خانقاہ، میں یہ دعاؤں والے بیٹھے ہوتے ہیں۔جب قاعدے اور قانون کے مطابق لوگوں کے کام نہ ہوں تو لوگ مجبور و محتاج ہو جاتے ہیں۔اس طرح سے یہ آستانے والے ان کو لوٹتے ہیں کہ آؤ ہم کرا دیتے ہیں۔یہ نہیں کہتے کہ آؤ سب مل کر ان غلط قوانین کو بدلیں جن کی رو سے یہ ظلم اور دھاندلی کا بازار گرم ہے۔

ڈاکٹر ہسپتال اس قدر بڑھ گئے ہیں کیونکہ قانون کے مطابق نہ دوائیں ہیں اور نہ پولیس نہ عدالتیں اپنا کام کر رہی ہیں یہ سارے لوگ آجاتے ہیں۔اس لئے درمیان بارشوں، ہواؤں، دریاؤں کا ذکر کیا کہ یہ سب تو قوانین کے تحت چل رہے ہیں تو کیا انسانی زندگی میں لاقانونیّت ہونی چاہئے۔اب قانون اور کرتا دھرتا اس قدر ظلم پر آجائیں تو پھر یَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ (27:62) تو ان جانشینوں کو بدلو۔تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اب وہ قسمت والے آکر کوئی طوطا لئے بیٹھا ہے۔یہ اب قسمت کا حال بتا رہے ہیں۔قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰہُ ؕ (27:65) تم ان کے پاس جا کر قسمت کا حال پوچھتے ہو۔تو غیب کا علم خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔رسولؐ تک نے اعلان کیا کہ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ (11:31) میں قسمت کا حال نہیں جانتا۔مجھے اپنے متعلق نہیں پتہ میں کل کیا کروں گا۔اس طرح پیش گوئی بھی تو غیب کا علم ہے کہ واقعہ صادر ہونے سے پہلے بتا دیا جائے۔اب ایک بھیڑ لگی ہے ان پیش گوئیاں کرنے والوں کی۔یہ ولی، صوفی اور مرزا صاحب قادیان کی تو نبوّت کا دارومدار ہی پیش گوئیوں پر ہے حالانکہ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ ۚ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ ؕ وَ مَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ﴿۳۴﴾ (31:34) یہ ظہور نتائج کی گھڑی، یا دنیا کے اندر جو انقلابات آتے ہیں اس کا علم خدا کو ہی ہو سکتا ہے۔اگرچہ اعمال کے مرتب ہونے کا علم ہر وقت جاری رہتا ہے جس طرح بارش ایک وقت پر برستی ہے مگر ایک مدت پہلے سے بننی شروع ہو جاتی ہے اسی طرح بچہ پیدا ہوتا ہے۔ایک خاص وقت میں لیکن رحم مادر میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے خدا کو ان تمام مراحل کا علم ہے۔اپنے امور یعنی بارش اور جنین کے مختلف مراحل کا علم تم بھی حاصل کر سکتے ہو اور جو چیز کوئی نفس قطعاً نہیں جان سکتا کہ عمل وہ کیا کرے گا۔(مستقبل) اور نہ ہی بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کہاں واقع ہوگی۔خدا یہ بات جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے۔اس لئے خدا کو ظہور نتائج کی گھڑی کا علم ہے اور وہ آکر رہے گی۔تمہیں اس کا یقین ہونا چاہئے۔موت اور جگہ کا علم نہ ہونا ایک رحمت ہے۔"غداً" کل آنے والے سے مراد مستقبل ہے۔یہ آنے والے کل میں اگر کوئی فیصلہ کرے اور پابند رہے اور کر کے دکھائے لیکن اس میں آنے والا افراد ہے بہت سے خارجی اسباب پر کنٹرول نہیں ہوتا۔زلزلہ آجائے رات کو تو کیا کرے گا۔گاڑی، جہاز کا حادثہ ہو جائے بڑے بڑے عناصر ایسے شامل ہیں جن کے متعلق انسان قطعیت سے نہیں کہہ

674

سکتا بشرطیکہ تمام عناصر وہ بھی اس سے مطابق ہوں تو پھر ہوگا۔ اور ضروری نہیں کہ ہر ایک کو ان پر کنٹرول ہو۔ کسی کام کے کرنے کے لئے فیصلہ ہی قولِ آخر یا قول فیصل نہیں ہوتا۔ اس میں دیگر عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ نہیں بتا سکتا کہ قبل از وقت کہ میں کب مروں گا اور کہاں مروں گا۔ یہ تو اس کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کو اس کا علم نہیں دیا کہ تمہاری موت کب ہوگی؟ اگر کسی کو پتہ ہو کہ میں نے اگلے سال اس مہینہ میں مرجانا ہے تو آج ہی سے اس پر موت شروع ہو جائے اور سانس لینا حرام ہو جائے۔ گھروں سے دوست یار آنا جانا شروع ہو جائیں تو موت کا عدم علم ہے جس کی بنا پر ہم یوں زندہ رہتے ہیں اور آرزوئیں اور مقاصد تعمیر کرتے رہتے ہیں۔ یہ غیب ہے اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ یہ جو کہا ہے کہ تم دوسروں کے پاس جا کر قسمتوں کا حال معلوم کرتے ہو تو وہ تمہیں کیا بتائیں گے۔ اگرچہ غیب کا علم خدا کو ہے بات تو اتنی سی نظر آتی ہے کھڑے ہو کر گہرائی میں جایئے تو وہ کیا بات کہہ گیا ہے۔ جو علم الافلاک کے ماہر ہیں یہ ہزار سال پہلے بتا دیتے ہیں کہ سورج کو گہن (Eclipsc) کس تاریخ کو لگے گا۔ کس وقت لگے گا۔ کتنا اور کتنے وقت لک لگے گا۔ اگر ان کی؟ صحیح ہوں تو یہ کہیں غلط نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ وہ سب مجبور اور قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (45:13) اس قانون سے واقفیت حاصل کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ اگر کسی کو پتہ ہے کہ ریل کی جو پٹڑی ہے وہ ادھر جاتی ہے اور اس نے صحیح کانٹا موڑ لیا تو وہ بتا سکتا ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد یہ انجن ادھر مڑ جائے گا۔ انجن تو صاحب اختیار نہیں ہے وہ قانون کی زنجیروں میں مسخر ہے۔ دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مکھی اب اڑ کر کہاں بیٹھے گی (Prof. Sullivan (Limitations In Sceince۔ اس کا کہنا ہے کہ آنے والے ہزار سال میں جو حادثات ہونے والے ہیں ان کے متعلق تو سائنسدان حساب شمار کر کے بتا سکتے ہیں مگر اگر میز پر مکھی آ بیٹھے تو دس چھوڑ سو بھی بیٹھے ہوئے ہوں تو وہ نہیں بتا سکیں گے کہ یہاں سے اڑ کر کہاں بیٹھے گی۔ سورج کو اختیار نہیں ہے کہ وہ نکل کر پوری روشنی دے یا آدھی یا نہ دے مگر مکھی جہاں چاہے بیٹھ جائے۔ جس کی یہ صورت ہو اس کے متعلق پہلے سے کچھ کہنا پیش گوئی کرنا غلط ہے۔

خارجی کائنات میں خدا کی مشیت اور انسانی دنیا میں انسان کی مشیّت:

انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنا دیا گیا ہے پھر اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ لا (41:40) ہماری مشیت خارجی دنیا اور تمہاری مشیت تمہاری دنیا میں۔ جو جی میں آئے کرو۔ اس قسم کے صاحب اختیار کے متعلق کسی کا یہ کہنا کہ کل وہ کیا کرے گا؟ مکھی کے متعلق تو تم بتا نہیں سکتے کہ یہ اڑ کر کہاں بیٹھے گی۔ تو انسان کے متعلق تم کیا کہہ سکتے ہو؟ تو یہ منجم انسانوں کی قسمت کیا بتا سکتے ہیں؟ منجم۔ نجم سے ہے معنی ستارہ۔ یہ خیال یونان کے حکماء میں در آیا پھر گردش کے لفظ بھی اسی طرح آیا۔ حالانکہ قرآن نے جو ان تمام ستاروں، کائنات کو وَسَخَّرَ لَكُمْ (45:13) یہ تمہارے تابع ہیں اور مجبور اتنے کہ قانون سے ادھر ادھر ہٹ نہیں سکتے۔ یہی بات قرآن سے لی اقبال نے ؂

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے — کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

خاک زندہ بھلا اس مردہ ستارہ کے تابع کیسے ہو سکتا ہے۔ خاک زندہ کے معنی صاحب ارادہ کے ہیں۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند
تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ — خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

لاقانونیّت انسان کوتوہم پرستیوں میں دھکیل دیتی ہے:

اگر انسان قاعدوں کا پابند ہوتا ہے تو اس قاعدے کے مطابق ایک مقام پر رکتا ہے۔ جب بے قاعدگی کی طرف جائے تو اس کی توہم پرستی کی انتہا نہیں۔ پھر وہ زندہ، مردہ حضرت صاحب کے پتھروں کے پاس جاتا ہے تاکہ ان بے اختیار و بے ارادہ لوگوں سے قسمتیں بدلوا سکے۔ عقل انسانی کی ایک حد ہوتی ہے یہ اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔ لیکن بے عقلی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ قرآن کی روشنی کا صدقہ ہے کہ اس نے اس توہم پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس نے ان مردوں کے متعلق یہی کچھ کہا۔ کیسی زبردست دلیل ہے کہ جب یہ مردے تمہارے پاس ہوتے ہیں نہ سن سکتے ہیں اور نہ کچھ سنا سکتے ہیں اور حیرت ہے کہ تم ان کو مٹی میں دبا دیتے ہو پھر ان کے متعلق یہ نظریہ کہ تمہاری بھی سن رہے ہیں اور دعائیں کر رہے ہیں اور تمہاری قسمتیں بھی بدل رہے ہیں۔ او! کیا جہالت کا مظاہرہ کر رہے ہو یہ جو اس نے کہا قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ (27:65) اور جن کے پاس قسمتوں کے بدلنے کے لئے جاتے ہو وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾ (27:65) وہ مردہ کیا بتا سکتے ہیں تم زندہ کو یہ ظلم کی کھیتی کا نبیڑا اس لئے ہے کہ یہ قانون مکافات پر یقین نہیں رکھتے۔

بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۶۸﴾ (27:66-67-68)۔ اصل میں قانون مکافات پر ایمان نہیں ہے یہ ہے اصل وجہ دنیا میں اس سارے فساد کی۔ اصل میں خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آگے بھی چلتی ہے۔ انسانی ذات پر تو بڑھاپا بھی طاری نہیں ہوتا۔ یہ روایت ہے کہ جنّت میں سب جوان ہی ہوں گے۔ بوڑھا کوئی نہیں ہوگا ذات پر تو ان طبعی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔

۞۞۞

سارے مغرب کی تباہی اس ذات کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے ہے تہذیبِ مغرب

یہ میں، نفس، خودی یہ جسم کی موت کے ساتھ نہیں مرتی۔ یہ ابھی تک اس مادیّت کے تصوّر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب سے انسان نے یہ تصوّر چھوڑا ہے تو دنیا کی ہر قوم اس جہنّم میں گرفتار ہے۔ اب سائیکالوجسٹ اور سائنسدان یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ یہ ذات فیصلہ کرنے والی قوّت انسان کی طبعی موت سے نہیں مرتی۔ اس پر بڑا مواد موجود ہے۔ اصل ایمان ہے ہی یہی اگر ایمان نہ ہو کہ انسان جسم کی موت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے تو پھر کسی اور چیز کے ماننے کی نہ جزا و سزا کی ضرورت ہے۔

؎ شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو منکر او اگر شوی منکرِ خویشتن مشو

یورپ کا نیوروسرجن ایچ ڈی رابرٹ وائٹ کی پکار:

یورپ کے بڑے بڑے سائنسدان اس طرف آ رہے ہیں۔ ریڈرز ڈائجسٹ میں ایک مضمون کا مصنف وہاں کا عالمگیر شہرت کا مالک نیوروسرجن رابرٹ وائٹ ہے۔ اس کی ساری عمر اس میں گزر گئی۔ کہتا ہے کہ دماغ کا ایک ایک خلیہ، ہر ذرہ میرے علم میں ہے۔ ساری عمر یہ کچھ ان کے بعد نہ میری اور نہ کسی اور سائنسدان کی اور ایک چیز ہے۔ جو دسترس سے باہر ہے۔ جو شاید سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ دماغ اگر چہ انہی cells کا نام ہے۔ یہ physical ہے لیکن وہ چیز جسے Mind کہتے ہیں یہ کس کو پتہ نہیں کہ کیا ہے؟ اس کے اور نام بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ وہی ذات یا نفس ہے ہم وہ رابطہ جو دماغ کا اس چیز Mind سے ہے بالکل نہیں بتا سکتے۔ یہی دماغ کو احکامات جاری کرتا ہے۔ یہ حافظہ، قوّتیں اور عمر کے 20 سال پہلے کی واقعات۔ ان کے اثرات، ان تمام واقعات کو واپس لانا۔ یہ دماغ کے طبعی خلیہ ہیں ان کا کام نہیں ہے۔ وہ کچھ اور ہے۔ دماغ اس دوسری چیز کا Container ہے اس کے لئے وہ لفظ جسے mind کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا ہے؟ لیکن ساری عمر کے تجربہ کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ دماغ کے مادی خلیوں کا کام نہیں ہے۔ اس میں کچھ اور شے ہے جس کا یہ کام ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے ''اس دماغ کی موت کے ساتھ جو شے ہے حافظہ رکھتی ہے۔ تاثر رکھتی ہے۔ احساس رکھتی ہے۔ نتائج کے نقوش اپنے اوپر رکھتی ہے وہ بھی مرجائے گی۔ یہ بالکل بکواس ہے۔ غلط ہے۔ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ اس کی ہستی ختم نہیں ہوسکتی۔ اس کے فوراً بعد کہتا ہے:

far more reasonable is to beleive. that the "Essence" of us escapes from a container, the brain, which no longer is stable of supporting us and supported in a new dimensions.

Essence کا ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ یعنی کہتا ہے کہ جو میں ہے جو ہماری اصل ذات ہے یہ ہے ہماری Essence ہے۔ دماغ کی موت سے وہ Essence جو اس نے اپنے اندر سنبھال کے رکھی تھی۔ وہ Brain اسے آگے منتقل کر دیتا ہے۔ آگے اسے سنبھالنے والا کوئی اور ہے جو اس Brain سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔ وہ اس کو سنبھال لیتا ہے۔ Brain کے ان خلیات کے تباہ ہو جانے سے یہ جو میری Essence ہے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ برگسان نے بھی کہا تھا کہ یہ حافظہ مادی خلیات کا نتیجہ نہیں ہے۔ قرآن نے اس Essence کو نفس کہہ کر پکارا ہے۔ رابرٹ وائٹ نے بھی یہ چیز کہی ہے۔ انسان کی ذہانت۔ شعور انسان کی فکر یہ ہے جو اصل Essence ہے۔ فلاسفرز اور سائیکالوجسٹ اس آیت کو دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ (39:42) اختیار والا وہ بھی تو اس کا روبہ عمل آ سکتا ہے جو اپنے شعور سے کام لے شعور کے معطل یا سلب ہو جانے کی صورت میں انسان اپنے اختیار وارادہ سے کام نہیں لے سکتا۔ اس کا مشاہدہ تو عملی زندگی میں روز کرتے ہو۔ مثلاً نیند کی حالت میں یا موت کی حالت میں انسانی شعور باقی نہیں رہتا۔ شعور انسانی Essence وہ اصل ذات، اصل انسان ہے ہماری زبان میں الفاظ مکمل نہیں ہوتے ہیں قرآن اسے نفس کہتا ہے۔ شعور، فکر، Intelligence، ذہانت، حافظہ، اور memory وہ سارا اس کا ہے۔

نیند کی طرح موت کی حالت میں بھی شعور کو روک لیا جاتا ہے۔ جب انسان نیند سے بیدار ہوتا ہے جو اس کا دماغ کام کرنے لگتا ہے۔ ساتھ ہی وہ شعور بھی کارفرما ہو جاتا ہے۔

قرآن کے الفاظ کہ ہم اسے واپس دے دیتے ہیں موت کے وقت جسم یہاں رہتا ہے وہ جو Essence ہے اسے ہم روک لیتے ہیں۔ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (39:42) بیداری کی حالت میں ایک مدت معینہ کے لئے جب تک اس نے زندہ رہنا ہے۔ اسے ہم واپس بھیج دیتے ہیں اور موت کی حالت میں پاس رکھتے ہیں اور وہاں جو بیداری کی حالت ہے تو وہ اسے وہاں دے دی جائے گی۔ لیکن اس کا جو Container ہے وہ اس Container سے مختلف ہو گا۔ چودہ سو سال پہلے کیا یہ کوئی انسان کہہ سکتا تھا۔ آگے کہا کہ یہ بات اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ (39:42) جو قوم غور وفکر سے کام لے گی تو اسے پتہ چلے گا کہ ہم کیا کہہ گئے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ (27:67) جب ہم اور آباءواجداد مر کر سڑ گل جائیں گے تو پھر بھی زندگی آگے چلے گی۔

بیچارے کو کیا علم ہے ان کی نگاہ تو صرف محسوس جسم پر ہے کیا یہ ٹھیک ہے وہ یہ ایسے ہی ہو جائے گا۔ مگر جو Container ہے اس کے اندر جو Essence ہے اس پر ان کی نگاہ نہیں ہے۔ کہا ذرا تاریخ تو پڑھیں قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ (27:69) تو جو ظلم اور سلب ونسب کا نظام قائم کرتے تھے کتنے اتنے انتظامات اس کی حفاظت کے کئے تھے۔ اس کے باوجود وہ تباہیاں ان مقامات سے آئیں مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ (16:45)۔

؎ تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جس کی بناء سرمایہ داری ہو

وحشی قوموں کا ٹکراؤ، جنگِ عظیم اوّل اور دوم کا تذکرہ

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿٨٢﴾
(27:82) یہ وحشی اقوام کا ٹکراؤ ہے ان اقوام کے خلاف جو قانون خداوندی پر یقین نہیں رکھتیں تو خدا کا یہ نشتر ان کے خون کی گرمی کو کم کرتا ہے۔

اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز ؎ کرتی ہے ملوکیت انداز جنوں پیدا

جب بھی کوئی قوم اپنے غلط نظام غریبوں اور ضعیفوں کی جان لینے میں استحصال میں شدت تک پہنچ جاتی ہے جس طرح دھوپ کی گرمی تیز ہو جائے تو جھکڑ آتا ہے اسی طرح اس قسم کے انسانوں کا جھکڑ اٹھتا ہے وہ جھکڑ (طوفان) تاریخ میں ہلاکو کے ہاتھوں 1258ء تباہی کی صورت میں اٹھا اور سپین میں فرڈیننڈ کے ہاتھوں ان کی جڑ بنیاد تک مٹا دی گئی۔ پھر یہ (دابہ) وحشی قومیں آکر ان کا سرسام اس طرح کے نشتروں سے کرتے ہیں۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّن يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿٨٣﴾ (27:83) تاریخ میں ایسے ادوار بھی آئیں گے کہ کسی ایک پارٹی یا قوم کی بجائے مختلف قومیں اٹھ کھڑی ہوں گی اس طرح سے ایک عالمگیر جنگ کا آغاز ہو جائے۔ یہ تمام فوجیں ہمارے قوانین کی تکذیب کرنے والی ہوں گی۔ اس باہمی ٹکراؤ سے وہ کمزور ہو کر فساد انگیز سے رک جائیں۔ کیا آج دنیا بھر کی بدمست قوموں کی پھیلائی ہوئی تباہ کاریاں قرآنی حقائق کی زندہ مثالیں نہیں ہیں۔ پھر یہ فوجیں ان کو کٹہرے میں لاتی ہیں محبوس کرتی ہیں۔ یہ ہے جنگ عظیم اوّل و دوم۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُم بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨٤﴾ (27:84) جب وہ کٹہرے میں آکر روک دیئے جاتے ہیں تو ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہاری ان غلط کوششوں تباہی میں نہ تھا یا تم نے کوئی علم کی بارگاہ سے تحقیق کر لی تھی۔ تم نشہ میں بدمست تھے أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨٤﴾ (27:84) کس بناء پر یہ کچھ کرتے تھے ذرا بتاؤ تو سہی۔ ہٹلر، سولینی سے پوچھا گیا تھا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِم بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنطِقُونَ ﴿٨٥﴾ (27:85)۔ اس طرح سے خدا کی وہ بات جو ان سے کہی گئی تھی کہ جرائم کا نتیجہ ضرور بھگتو گے تو جواب میں ایک لفظ نہیں کہہ سکیں گے۔

غلط نظام کا نتیجہ اندر سے زوال لے آتا ہے:

قرآن غلط نظام پر چلنے والوں کا یہ انجام بتا رہا ہے۔ سارے قرآن میں یہ ہے ایک انداز کہ کوئی دوسری قوم اٹھ کر ان کو تباہ کر

674 دیتی ہے۔قرآن نے اور انداز بھی بتائے ہیں کہ غلط نظام کی تباہی کس طرح سے آتی ہے۔ یہاں دو تین شکلیں بتائی ہیں۔ قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ (6:65)۔ یہ سربراہ جو مسلط ہوتے ہیں ان کا ظلم و استبداد اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ باقی قوم کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔ یہ ابر رحمت کی بجائے عذاب کی شکل top سے یعنی اوپر سے آتا ہے اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ (6:65) جنہیں پاؤں تلے مسلا ہوتا ہے۔ لاچار اور مجبور عوام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور تیری شکل اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ (6:65) اوپر والے نیچے والوں کے ساتھ مل کر پارٹی بنا لیتے ہیں۔ اس قسم کے دوسرے اوپر والے نیچے والوں کے ساتھ مل کر گروہ بنا لیتے ہیں۔ پھر یہ پارٹیاں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ ۝۶۵ (6:65) غور کرو عذاب کی ان شکلوں پر عذاب کی بدترین اور سنگین ترین شکل۔ بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ (17:5) ڈھونڈ ڈھونڈ کر گھروں سے پکڑ پکڑ کر شدید ترین عذاب دیتے ہیں۔ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝۵ (17:5) یہ خدا کا قانون ہے جو ہو کر رہتا ہے۔

❁❁❁

قرآن کی عربی مبین اور اہلِ حجاز

حجاز کے عربوں کی عربی کو ٹکسالی عربی کہا جاتا تھا ان کے ہاں نثر کی کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔ یہ زبان ہزاروں سال سے چلی آ رہی تھی۔ نثر کی کوئی کتاب نہ تھی مگر شاعری بڑے عرّوج پر تھی۔ یہ قرآن نثر میں پہلی کتاب تھی جس نے ان کی شاعری کو ماند کر دیا۔ وہ جو ساری دنیا کو گونگا کہا کرتے تھے خود گونگے ہو گئے۔ عرب کے معنی ''فصیح البیان'' کے ہیں اور عجم کے معنی گونگے کے ہیں۔ تو اس قرآن نے آ کر چیلنج دیا کہ تمہیں تو اپنی زبان پر بڑا مان ہے۔ حقائق نہیں زبان کے اعتبار سے ہی پورا نہیں تو سارے مل کر دس شقوں کی مثل لے آ ؤ۔ اتنے بڑے بڑے شعراء جن کے قصیدے کعبہ کی دیواروں پر سونے کے حروف میں چسپاں ہوا کرتے تھے۔ تیئیس سال تک ان کے سامنے یہ چیلنج رہا مگر کسی کو ایک آیت کی مثل بنانے کی جرات نہ ہوئی۔

این کتابے نیست چیزے دیگر است

قرآن کا جو اسلوب ہے۔ داستان بیان کرنے کا انداز تو اب تمام ادیب وافسانہ نگار وہی اسلوب اپنا رہے ہیں۔ پہلے افسانہ پیدائش سے شروع کر کے آہستہ آہستہ آخر تک لے جاتے تھے۔ اب آخر میں جو انجام ہوتا ہے تو شروع میں اس کے دو چار الفاظ لے آتے ہیں۔ پھر درمیان میں ابتداء کی طرف آتے ہیں۔ یہ بڑا موثر طریق ہے جو آج اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن کا یہی انداز ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان فرعون کی سرکشی سے شروع کی۔ اس کے بعد وَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى (7:160) یہ مؤثّر انداز اب نظموں، ڈراموں اور ناول نویسوں نے اختیار کیا ہوا ہے۔

❁❁❁

سابقہ ادوار میں معاشرتی رسم و رواج

باپ کی حکومت اور عورت کی حکومت Patriarchal and Matriarchal

شعیبؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھر میں چونکہ رکھنا ہے قوی بھی ہیں اور امین بھی۔ نو جوان ہیں اور لڑکیاں بھی نو جوان ہیں تو کیا تدبیر دے رہے ہیں؟

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ (28:27) بہتر یہ کہ ان دو میں سے ایک کی تمہارے ساتھ شادی کردوں۔ امن کی حسین شکل پیدا کر دی اب یہ خاندان کا فرد بن گیا اس کے دل میں بھی ملازم والی بات نہ رہی۔ گھر میں امن کی صورت پیدا کر دی۔ اس دور کو تاریخ میں Matriarchal (عورت کی سربراہی۔ شاہ مادری) کہتے ہیں جس میں عورتوں کی بالادستی ہوتی تھی۔ اس سامی النّسل قوم (Semitic Race) میں بھی اس کا اثر تھا اور اب تو تاریخ باقی قبائل میں بھی عورتوں کی حکمرانی بتا رہی ہے۔ Patriarchal کے معنی باپ کی حکومت۔ اس پہلے دور میں قبیلے کی بہبود حکمران ہوتی تھی۔ اس کے اثرات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اب تو لڑکی بیاہ کر سسرال میں جاتی ہے۔ اس زمانے میں لڑکا بیاہ کر لڑکی کے گھر آتا تھا۔ بہر حال وہ دور جاہلیت اچھا انداز تھا۔ عورت ہمیشہ مظلوم ہوتی ہے۔ وہ لڑکے کے گھر ایک کمزور سی، اتنے غیر ماحول مانوس میں اگر وہ لڑکا ادھر آ جائے تو اس کی تو سسرال کے ہاں یہ کیفیّت نہ ہوگی۔ یہ عقلمندی کی بات تھی اس دور جہالت میں بھی۔ اس دور میں عائلی زندگی بڑی خوشگوار تھی۔ اب اس دور میں تو یہ سارا الٹ گیا ہے۔ سامی النسل اقوام میں لڑکی اور لڑکا الگ گھر بنا کے رہتے تھے۔ اس میں لڑکی محتاج دوست نگر نہیں ہوتی تھی۔ ہمارا بیڑہ تو ان ہندوؤں نے غرق کر دیا۔ گھریلو زندگی ساری ہندوانہ ہے ان کے ہاں یہ جائنٹ فیملی سسٹم میں لڑکوں کو اپنے آپ سے الگ ہونے ہی نہیں دیتا تھا۔ تمام جائیداد، دولت باپ کے نام پر ہوتی تھی لڑکے محتاجی کی وجہ سے ساتھ رہنے پر مجبور ہوتے تھے۔ لڑکا باپ یا بڑے کا دست نگر اور بیوی اس گھر کے اندر محتاج۔ حالت یہ کہ خربوزہ کھانے کے بعد بہو بیج دھوتی تھی۔ اس کے بعد ان کو سارا دن سکھاتی تھی۔ یہ لاہور کے گول باغ میں ساری نو بیاہتیاں بیٹھ کر گریاں نکالتی رہتی تھیں ان کو بیچ کے دو چار پیسوں سے صابن وغیرہ خریدتی تھیں۔

قرآن کے نزدیک میاں بیوی کا آزاد گھر ہونا چاہئے:

قرآن مجید نے تصریحاً تو یہ بات نہیں کی مگر ایک آیت میں میاں بیوی کے آزاد گھر کا ذکر کیا ہے کہ فلاں کے گھر سے کھانے

پینے میں حرج نہیں اور ماں باپ کے گھر سے کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں۔

قرآن ماں باپ کو اور سسرال کو ماں باپ قرار دیتا ہے۔ رشتہ جوڑ کر ان کو معاشی طور پر آزاد کر دیتا ہے اور زندگی بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔

جموّد موت کا دوسرا نام ہے جبکہ قرآن حرکت تعلیم دیتا ہے:

؎ چہ کنم فطرت من بہ مقام در نسازد	دل ناصبور دارم چوں صبابہ لالہ زارے
چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے	تپد آں زماں دل پئے خوبتر نگارے
زشرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے	سرے منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں را کہ نہایتے نہ دارد	بہ نگاہ نا شکیبے بہ دل امید دارے

یہ ترجمہ ہے وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ (53:42)

؎ تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں	میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

روزِ اوّل سے آخر تک دین کے اصولوں میں نہ کوئی تضاد ہے اور نہ کوئی فرق اور انسانی جذبات

یہودیوں کا اعتراض ہوتا تھا کہ اس میں اختلاف ہے۔ کہا گیا کہ تمہارے نبی کی طرف جو نازل کیا گیا تھا اگر وہ تمہارے ہاں غیر معروف اور اصلی شکل میں ہوتو اسے دیکھو گے تو دین کے اصولوں کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوگا اور میں بھی اس کا اتباع کروں گا۔ اور کتاب موسیٰؑ بھی خدا کی طرف سے تھی۔ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٥١﴾ (28:51) دین کے اصول شروع سے ہی سے ایک تھے ایک کڑی دوسری کڑی سے ملتی جاتی ہے یہ مسلسل کڑیاں ہیں جو شروع سے آخر تک چلی آ رہی ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تمہارے پاس جو کتاب ہے اس کی وجہ سے اعتراضات اٹھاتے ہو۔ حالانکہ تم خود معترف ہو کہ اس میں تحریف اور آمیزش ہوئی ہے۔ اسے میرٹ پر دیکھو۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسمٰعیل کی شاخ میں کیوں آ گیا۔ یہ تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

انسانی جذبات:

اب اوپر کی آیات ان مسائل کا حل پیش کر دیتی ہیں جن کے حل میں انسانیّت کی تاریخ میں بڑے بڑے دانشور اور اہل مذاہب بھی سرگرداں چلے آ رہے ہیں۔ آیت یہ ہے کہ یہ ذرا اصلی کتاب تو لائیں تو اس میں اور قرآن کے اصولوں میں کوئی فرق نہیں ملے گا۔ یا اس قرآن کو آن میرٹ دیکھو اس پر اعتراض ہو تو بتاؤ۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ (28:50) اگر اس دعوت کے باوجود Response نہیں کرتے فَاعْلَمْ (28:50) تو جان لو کہ یہ علم و بصیرت کی بجائے اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ط (28:50) محض اپنے جذبات کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس میں علم۔ بصیرت، استدلال اور شعور نہیں ہے بلکہ محض جذبات کی پیروی ہے تو یہ آیت کا آدھا حصّہ ہے۔ جذبات پر تو سارے عمل کا انحصار ہے۔ دیگر مقامات پر اَهْوَآءٌ کہتا ہے جو ھوی کی جمع ہے۔ جذبہ کے بغیر تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ پتھر اور انسان میں تو فرق ان جذبات کا ہے۔

(Secularism) کا بنیادی فلسفہ:

دنیائے انسانیّت میں Extremes (انتہا) آ کے افراط وتفریط۔ افراط توسیکولرازم ہے تمام مغربی تہذیب کی بنیاد اس پر ہے کہ انسان بھی حیوان کی ایک شکل ہے بس یہی طبعی زندگی ہے اس کے بعد زندگی کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔ زندگی کے لئے تمام عیاشیوں، خوشحالیوں کے سامان اکٹھے کرلو ۔ موت آئی تو معاملہ ختم۔ زندگی کچھ عناصر کا ظہور ترتیب ہے ان میں اتفاقاً ربط پیدا ہوا اور زندگی آ گئی۔ موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشان ہونا۔ پھر یہ مربوط اجزاء منتشر ہو گئے۔ تو بس یہی طبعی زندگی ہے۔ تو پھر کسی قسم کی حدود و قیود کا سوال ہی نہیں ہے بس ان جذبات کا اتباع کرتے جاؤ۔ یہ تصوّر اپیقورس (Epicurus) یونانی فلاسفر (270-241-BC) نے پیش کیا۔ اسے اپیقوریت (Epicureanism) کہتے ہیں۔

دوسری انتہا تفریط، تصوّف یعنی جذبات کی مکمل نفی:

یہ بھی یونانی فلاسفرز کا ایک گروہ تھا ان کو اشراقین کہا جاتا ہے۔ ان کے مطابق دنیا میں ساری تباہیاں جذبات کے ٹکراؤ سے آتی ہیں۔ اب ان جذبات کو ختم کر دو۔ اسے نفس کشی کہا گیا۔ یہ دونوں تحریکیں، نظام وفلسفۂ زندگی، اس زمانے سے متوازی چلی آ رہی ہیں۔ ان کا نام اور شکلیں تو بدلتی رہی ہیں لیکن ان کا اصل وہی یونانی فلسفہ ہے۔

Secularism کا نتیجہ تباہی و بربادی:

پہلے تو یہ افراد میں ہوتی تھیں مگر اب تو اقوام میں آ کر ساری دنیا کو جہنّم بنا دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا جذبات کو فنا کر دو تو آدھی دنیا تو مفلوج ہو کر رہ گئی۔ بدھ مت اور جینیوں کے ہاں یہ بات انتہا کو پہنچ گئی۔ ہندوؤں کے ہاں ویدانت، عیسائیوں کے Saints میں یہ چیز آ گئی۔ یہودیوں کے ہیکل اور ہمارے ہاں تصوّف انتہائی چیز ترکِ آرزو ہے۔

ایں کتاب نیست چیز دیگر است:

یہ ہیں وہ مقامات جہاں علی وجہ البصیرت ثابت ہوتا ہے کہ قرآن واقعی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ چودہ سو سال کی پیشتر کی تاریخ میں۔ دونوں انتہائیں متوازی چلی آ رہی تھی۔ اور اب تک چلی آ رہی ہیں۔ درمیان میں وحی کی رو سے ایک حیرت انگیز اعلان آ رہا ہے کہ قرآن کے نزدیک جذبات کا مقام کیا ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی اس سے منسلک اہم مسئلہ کہ جرائم کیوں وجود میں آتے ہیں اور ان کو روکنے کا طریقہ کیا ہے؟

اب تو ان جرائم نے عالمگیر حیثیت اختیار کر لی ہے۔ تمام مہذب ممالک ان کے ہاتھوں لرزاں ہیں کہ یہ کیوں اور ان کو کیسے روکا جائے؟ غور کیا کہ کتنا اہم مسئلہ ہے؟ قرآن کے صرف دو الفاظ نے سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا۔ یہ ہے اس کی صداقت کا ثبوت کہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔

انسانی ہیئت کا تجزیہ:

قرآن کی رو سے زندگی پستی سے مختلف منازل طے کرتی ہوئی ارتقائی طور پر پیکر انسانیّت میں پہنچتی ہے۔ (Evolution)

674

تحقیق یہ ہے کہ انسان میں 9/10 حصّہ حیوانی ہے اور 1/10 حصّہ انسانی۔یعنی نفس انسانی۔ذات۔خودی۔انسانی جسم چونکہ طبعی قوانین کی رو سے اس شکل میں آیا ہے اس لئے یہ جسم طبعی قوانین کے تحت آتا ہے۔آج یہ اعتراف ہورہا ہے کہ 1/10 حصّہ نہ طبعی جسم کی پیداوار ہے اور نہ طبعی قوانین کے تابع۔لہٰذا انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز چیز یہ 1/10 ہے۔یہ ہے سارے گھر کا مالک۔(Master of the house) زندگی جہاں بھی ہے اس کے بنیادی تقاضے دو ہی ہیں۔تیسرا بھی شامل کرتے ہیں مگر بنیادی دو ہی ہیں۔ایک تقاضا تحفظ خویش Self Preservation زندگی جس شکل میں بھی ہو اپنا تحفظ چاہتی ہے۔چیونٹی کے سامنے ایک تنکا کھڑا کرلو تو وہ اس سے لڑتی ہے وہ اپنے آپ کو حفاظت میں رکھنا چاہتی ہے۔حیوانات کا یہ حصّہ انسان کے اندر بھی ہے۔دوسرا تقاضا افزائش نسل Self Reproduction ہے اپنے جیسا پیدا کرتے جانا زندگی کا تسلسل اس طرح سے قائم ہے۔اسے عام طور پر جنسیات sex کہتے ہیں۔اس تحفظ خویش میں تغلب خویش (Self-aggression) دوسرے پر غالب آنے کا جذبہ جو دراصل تحفظ خویش کی ایک شکل ہے جب ویسے preservation نہ ہو دوسرے پر تغلب کیسا؟ ان حیوانات میں تغلب خویش کے ساتھ تحفظ خویش کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔افزائش نسل کا قدرت نے ان کے ہاں Matting season رکھا ہے۔اس سے بقائے نسل کا سلسلہ رواں دواں ہے۔یہی چیزیں انسان کے اندر ہیں۔حیوانات کا کنٹرول قدرت نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔پیٹ بھر جائے تو چپکے سے بیٹھ جاتا ہے۔شیر صرف گوشت جبکہ بکری گھاس کھانے پر مجبور ہے۔

افزائش نسل کے وقت بیل پاگل ہوجاتے ہیں۔جب افزائش نسل کا تقاضا پورا ہوجائے تو سارا سال وہی گائے اور وہی بیل ہیں پھر وہ ایک دوسرے پر حرام ہیں۔

انسان کی فضیلت اختیار و ارادہ کی نعمت کی ہی رہینِ منت ہے:

یہی تمام تقاضے انسان کے اندر بھی موجود ہیں۔مگر اسے آزاد پیدا کر کے صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔وہاں یہ چیز مجبوراً حیوانات کے اوپر فطرت کرا رہی ہے۔انسانی بچہ کو دیکھئے کہ مرچ میں ہاتھ ڈال رہا ہے آگ میں بھی ہاتھ ڈالتا ہے پانی میں ڈبکیاں کھا رہا ہے ماں کو عجیب مصیبت پڑی ہوئی ہے یہ ہے اس کا اختیار و ارادہ۔اگر اس کے اختیار پر باہر سے جبر کر دیا گیا تو پھر وہ انسان نہ رہا تو پھر حیوان ہوگیا تو اس لئے کسی پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔شیر کی قوّت تو ایک حد تک ہوتی ہے۔پرندہ کی بھی ایک حد ہے ان کے جذبات وخواہشات پر فطرت کا کنٹرول ہے۔بکری بھوکی کھڑی ہے درخت کے نیچے۔بھوک سے بلک کر مر جائے گی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔یہ انسان کا بچہ لٹھ لے کر اڑنے والی پتنگ کو پکڑ لیتا ہے اور درخت کے سب سے اوپر کا پھل کو یوں مارا اور وہ نیچے آگیا۔درندگی جتنی بھی دی گئی ہے۔شیر اس درندگی میں کوئی ایک بکری قابو کرلے گا یا کوئی انسان۔تو وہ تو یہیں تک ہے مگر یہ تو پورے ہیروشیما کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔قوتوں کی لاانتہائیت کی یہ کیفیّت اور حیوانیّت اس میں اس درجہ کی کہ کوئی کنٹرول نہیں ہے۔قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا (2:30) یہ تو درندہ ہے اس کی قوتیں اور انتہا ہیں تیری حسین کائنات کا ستیاناس کردے گا۔کہا اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ (2:30)۔کہا کہ تم اس تخلیق کا مقصد جاننے سے قاصر ہو۔

نفسیات کہتی ہے کہ انسانی جذبات کی تسکین کا طریق دبا دینے میں مضمر نہیں:

آج کی نفسیات یہ کہہ رہی ہے اگر ان جذبات کو نکلنے کا صحیح راستہ نہ دیا جائے تو پھر یہ غیر فطرتی طریقوں سے تسکین کرتے ہیں اسے بدنہادی Perversion کہتے ہیں اور اس سے بیسیوں نفسیاتی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور یہ نفس کشی، جو اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں اور جذبات کو غیر فطری طریقوں سے تسکین پانے والے، یہ بیسیوں قسم کی نفسیاتی عوارض کا شکار ہوجاتے ہیں اور یہ ناممکنات میں سے ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا ایسی چیزیں جو مذموم ہوں چلو ان کو تو روک بھی لیا گیا۔ جذبات تو ہر قسم کے ہیں۔ بھوک بھی ایک جذبہ ہے پیاس بھی۔ جو روکے ہی نہیں جاسکتے۔

ے پری رو تاب مستوری ندارند چوں در بندی زروزن سر بر آرند

خدا شر کا خالق ہی نہیں اور نہ ہی کوئی چیز خدا نے بغیر مقصد پیدا کی ہے:

اگر جذبات ایسے ہی چیز تھے تو ذرا ان سے پوچھئے کہ ان کو فنا کر لینا ہی مقصد حیات تھا تو اللہ کے اوپر کتنا بڑا اعتراض ہوتا ہے کہ اس نے ایسی چیز پیدا کر دی جس کا تباہ و فنا کرنا ہی مقصد حیات ٹھہرا (معاذ اللہ) می نہ سزد خدائے را۔ اور نہ ہی وہ شر کا خالق ہے اس نے تو پناہ مانگنے کے لئے دعا سکھائی ہے مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ (113:2) اس نے جو پیدا کیا ہے اس کا طریقہ استعمال اسے خیر یا شر بناتا ہے۔ تلوار اپنی ذات میں نہ شر ہے اور نہ خیر۔ مظلوم کے سینہ میں گھونپ دو تو شر۔ ظالم کے ہاتھ روک دو تو خیر ہوگئی وہ تو خیر ہی خیر ہے وہ شر کا خالق نہیں ہے تو جو بات جو اس کی تخلیق ہیں کیسے شر ہو سکتے ہیں؟ جرائم کیسے جنم لیتے ہیں۔ اتنی طاقتیں اور کنٹرول کوئی نہ ہو۔ ماہرین نفسیات نے حیوان کے لئے جبلت instinct اور انسان کے لئے جذبات کا لفظ وضع کیا ہے۔ اصل میں وہ جبلت ہی ہے جسے حیوانی جبلت کہتے ہیں (The animal in man) اس کے تقاضے وہی ہیں جن کو جبلت کہا جاتا ہے ان تقاضوں کو بے محابہ پورا کرنے سے جرائم جنم لیتے ہیں۔ قیود اور حدود تو فطرت نے خارج سے نافذ نہیں کیں۔ سوسائٹی قانون بنا کر ایک حد باندھ دیتی ہے کہ اس کے اندر رہنے سے جب بھی باہر جاؤ گے تو جرم ہوگا۔ کیا محض اس اعلان سے جس کی قوتیں اس قدر زیادہ ہوں آپ ان کو روک سکیں گے۔ قانون کی پابندی تو کمزور گردے والے، شریف لوگ کرتے ہیں۔ اندر سے ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ ان غلط طریقوں سے مال و دولت اکٹھی کر لیں۔ چونکہ ہمت نہیں پڑتی ورنہ ادھر سے یہ قانون بنا رہے ہیں اور ادھر سے قانون کی Aversion کے لئے نئی نئی شکلیں بن رہی ہیں۔ حیوان قانون کے تصوّر سے آگاہ ہی نہیں ہوتا۔ قانون کا اعلان حیوان تو نہیں کرسکتا حیوان کو بھی جب بھوک لگی ہو تو اسے کسی دوسرے کے کھیت سے کھانے سے روک کر دکھائیں تو پھر تماشہ ہوگا۔ وہ تو لٹھ سے نہیں رک سکتا تو قانون سے کیسے رک جائے گا؟ تو اب اس کا حل کیا ہے؟ جب تک زندگی ہے جذبات تو ختم نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی طرف سے کنٹرول نہیں ہے اگر ہوتا تو پھر یہ انسان ہی نہ ہوتا۔ آپ جذبات کا ترجمہ جبلت Instinct ہی رکھئے۔ ان حیوانی تقاضوں کا پورا ہونا ضروری ہے۔ تو یہ کیسے ہوگا؟

قرآن انسان کی اس بے مہابہ زندگی کو کنٹرول کرنے کا طریق عطا کرتا ہے:

یہ ہے وہ مقام جہاں فرمایا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ (28:50) اگر اس کے باوجود وہ اس انداز کی زندگی نہیں بسر کرنا چاہتے تو سمجھ لو کہ وہ محض اپنے حیوانی جذبات یا جبلتوں کے تحت کہہ رہے ہیں۔ اس میں بے مہابہ زندگی بسر کرنے کی بڑی گنجائش اور اجازت ہوتی ہے۔ وَمَنْ اَضَلُّ (28:50) اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہوسکتا ہے؟ حیوانات تو راہ گم کردہ ہوتے ہی نہیں ہیں تو یہ کون ہیں؟ یہ جو جذبات کو فنا کرنے کی تلقین کر رہے ہیں تو یہ بھی تو گمراہ ہیں مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ (28:50) جو صرف اپنے ان جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50) خدا کی دی ہوئی رہنمائی چھوڑ کر جو بھی ان جذبات کی پیروی کرتا ہے وہ راہ گم کردہ ہے۔

هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50) کیوں ہو کیونکہ یہ حد بندیاں تو انسانوں کی بنائی ہوں گی۔ جس کے پاس یہ عقل وفکر ہے اور جس کی کیفیت یہ ہے کہ اگر عقل کی حدود خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو یہ جتنے بڑے بڑے جرائم عقل کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ سارے عقل کے زور پر ہوتے ہیں۔ تو ''Battle of wits'' ہے جرائم پیشہ ہونے کے لئے تو بہت بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنا بڑا دماغ اتنا بڑا جرم۔ تو اجتماعی طور پر اپنے عقل فریب کار سے دوسری قوموں کو مات دیتے ہیں۔ عقل کا کام تو یہ ہے وہ جو بھی حیوانی جذبہ اٹھے تو اس کی تسکین کے لئے وسائل مہیا کردے۔ یہ عقل بے باک ہے۔

عقل بے باک کو قندیل آسمانی کی احتیاج ہر آن محسوس ہوگی:

یہ تو عقل انسانی کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ اس قسم کی حدود مقرر کرے۔ یہ کام تو صرف هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50) کا ہے۔ یہاں آ کر ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جو اس عقل کا تخلیق کردہ نہ ہو بلکہ جس نے فطرت پر کنٹرول رکھا ہے تو اس ہستی کی طرف سے اس قسم کی چیز انسان کو ملے۔ قرآن نے اسے ہی وحی کہا ہے۔

ھوٰی کا قرآنی مفہوم:

ھوٰی ہر وہ شے جو پستی کی طرف لے جائے۔ قرآن تو انسان کو حیوان سے بلند کر کے لایا ہے اگر یہ انسان حیوانی جذبات کے تابع بلا حدود زندگی بسر کرنے لگ جائے تو اپنے مقام انسانیّت سے نیچے گر جائے گا۔

احسنِ تقویم کے مدارج کو برقرار رکھنے کا طریق:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (95:4)۔ اس کو حیوانات سے لا کر انسانی پیکر میں حسین ترین، امتزاج میں اسے تقویت دی۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ (95:5) جب یہ ان تقاضوں کو حیوان کی طرح پورے کرتا ہے تو پست ترین درجہ یعنی وہی ھوٰی والی بات ہوگی۔ زندگی کے تقاضوں کو اگر هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50) کے تحت پورا کرے تو بری بات نہیں ہے تو پھر احسن تقویم والے مقام پر ہوگا۔ ایک اور مقام پر ہم مسلمان قوم کی مثال دی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا (7:175) ایسے شخص کو اس قسم کی ہدایات دی تھیں فَانْسَلَخَ مِنْهَا (7:175)

اس میں سے یوں نکل گیا گویا سانپ اپنی کینچلی چھوڑ کر بیچ میں سے نکل جاتا ہے۔ اور نشان تک باقی نہیں رہتا۔ فَاَتۡبَعَهُ الشَّيۡطٰنُ (7:175) وہ جذبات کے پیچھے لگ گیا فَكَانَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ ﴿۱۷۵﴾ (7:175) راستہ بھول کر تباہ ہو گیا۔ وَلَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰهُ بِهَا (7:176) ہم تو چاہتے تھے کہ وہ ان قوانین کے ذریعہ بلندیوں پر چلا جائے وَلٰكِنَّهٗۤ اَخۡلَدَ اِلَى الۡاَرۡضِ (7:176) مگر یہ بدبخت زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹ گیا وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ‌ ۚ (7:176) جذبات کے ذریعہ پستیوں میں گر گیا۔

یہ تمام مفکّر مل کر بھی دنیا کے جرائم ختم نہیں کر سکتے:

معراج انسانیت تک پہنچانے والی اقدار کو وضع کرنا انسانی عقل سے ماورا ہے۔ اور اہم بات تو یہ ہے کہ ان ہدایات کو علم و بصیرت کی رو سے پرکھ کر ان کی صداقت پر ایمان لائیں اور دوسری شرط کہ اپنے اختیار کو بطیب خاطر اس چیز اور پابندیوں کے تابع لائیں۔ یہ گروپ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ (28:50) کے تحت وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ‌ ۚ (7:176) کرے گا۔

اچھے نظام کی مثال سرسبز و شاداب کھیتی کی مانند ہے فَاَمَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنۡ يَّكُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِيۡنَ ﴿۶۷﴾ (28:67) یقین ہو۔ ایمان ہو اس نظام پر کہ ایک ایک دانہ کے بدلے سوسو دانے ملیں گے اور پھر اس ایمان کے ساتھ محنت کرتا ہے تو ان کی کھیتیاں پھل لائیں گی۔ کہا یہ کیوں ضروری ہے کہ بیج اچھا ہو زمین قانون زراعت کے مطابق تیار ہو اور پانی دیا جائے تو پھر پیداوار ہو گی۔ یہ ہے مکافات عمل۔

چھوٹے پیمانے پر اسے شروع کریں جب اس کے ہاں یہ تمام مسائل جس کے حل کرنے میں عقلِ انسانی ناکام رہی ہے حل ہونا شروع ہوں گے اور باقی لوگ آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے تو خود بخود اس کی طرف فوج در فوج آئیں گے۔ یہ جبر سے نہیں ہوا جبر سے تو اصلاح نہیں ہو سکتی۔ پہلے تو ایمان کی بات ہے۔ اعمال صالح تو بعد میں آتا ہے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں حضرت عمرؓ مجسٹریٹ تھے۔ سال بھر میں کوئی مقدمہ نہیں آیا تو عدالت کو بند کرنا پڑا۔ کیونکہ انہوں نے بطیب خاطر اپنے اوپر ان حدود کو خود وارد کر دیا تھا۔ حل ان مسائل کا چار الفاظ میں اتباع هَوٰٮهُ‌ ۚ (7:176) "هُدًى مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ (28:50)"۔

غلامی جس سے چھڑانے یہ دین آیا تھا:

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت — حدیث خوشتر ازوے، کافرے گفت
نہ نداند آں غلام احوال خود را — کہ دوزخ را مقام دیگرے گفت
در غلامی تن زجاں گرد تہی — تنِ از بے جاں چہ امید بہی
کیش او تقلید و کارش آذری ست — ندرت اندر مذہب او کافری است

كُلُّ بِدۡعَةٍ ضَلٰلَةٌ وَّكُلُّ ضَلٰلَةٍ فِي النَّارِ ۔ یہ ہے ان کی تباہی کا راز، ہر نئی چیز سے راہ فرار اختیار کرنا۔

تاز گیہا وہم و شک افزا آیدش — کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

چشم او بر رفتہ از آئیندہ کور   چوں مجاور رزقِ اُو از خاکِ گور
دین و دانش را غلام ارزاں دہد   تا بدن را زندہ دارد جاں دہد
گرچہ برلب ہائے او نام خداست   قبلۂ او طاقت فرماں روا است
این صنم تا سجدہ اش کردی خداست   چوں کہ اندر قیام آئی فناست
آن خدا نانے دہد جانے دہد   ایں خدا جانے برد نانے دہد

نظریۂ ارتقاء کا فطری انتخاب

کہا جاتا ہے کہ تخلیق بڑی بکثرت اور عام ہوتی ہے جب بوہڑ کے درخت میں لاکھوں کی تعداد میں گولے ہوتے ہیں اور ہر گولے میں لاکھوں دانے اس ایک دانے سے اس قسم کا ایک درخت پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تخلیق کے تسلسل کے لئے ہے کہ بڑ پیدا ہونے چاہئیں۔ فطرت اس کے لئے اتنا کچھ بناتی ہے تاکہ ایک دانے سے یہ بوہڑ پیدا ہو جائے کتنے دانے ضائع کیوں نہ ہو جائیں۔ لیکن قدرت کا یہ عمل کبھی ناکام نہیں رہتا۔ وہ اتنی افراط میں لاتعداد اس کو پھیلاتا چلا جاتا ہے تو کوئی تو اس کے اندر صلاحیت والا ہوگا۔ یہ ایک پوری سائنس ہے اس کے قوانین اور پھر کونسی چیز باقی رہتی ہے آگے بڑھتی ہے تو اس میں کیا کیا خوبیاں ہوتی ہیں اب قرآن نے اس صلاحیت کا ذکر کیا ہے کہ انسانوں میں سے کونسا گروہ بچ سکتا ہے۔ صرف نشوونما یافتہ صلاحیت ہی طبعی قانون انتخاب کے تحت آگے بڑھتی ہے۔ یہ ہے قانون مشیت وَرَبُّكَ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخۡتَارُ ؕ (28:68) ہمارے قانون کے تحت تخلیق تو بکثرت ہوتی ہے اور ایک خاص قانون کے تحت انتخاب ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ہی فیصلہ ہوتا ہے کہ کون آگے بڑھتا ہے اور کون ہے زندہ رہنے کا اہل مَا كَانَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ ؕ (28:68) یہ انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے کہ یہ جسے چاہیں تو باقی رہے اور جسے چاہیں تو تباہ ہو جائے۔ بلکہ یہ ہمارا قانون ہے کہ جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے وہ باقی رہے گا۔ اور جس میں آگے بڑھنے کی استعداد ہے وہ آگے بڑھے گا۔ یہ تمہارے قانون کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ ہمارے قانون کے مطابق ہوگا جب یہ سائنسدان لاکھوں کروڑوں سال پرانے ڈھانچے دیکھ کر اس کا مقابلہ موجودہ شکل کے اندر کرتے ہیں کہ فلاں چیز باقی نہیں رہی اور مٹ گئی اور یہ اس شکل کے اندر کیسے آ گئی تو یہ اس قانون پر انگشت بدنداں ہیں کہ یہ قانون اتفاقاً وجود میں نہیں آ سکتا تھا اگر تم اس قانون پر پورے نہیں اترو گے تو تمہیں چیلیں اور گدھ بنا دیں گے۔ وہ اپنے اس قانون میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۶۸﴾ (28:68) یہ جو کہتے ہیں کہ ان کے قانون کے مطابق ہو جائے یہ شرک ہے خدا ان سے بلند و ماوراء ہے کہ وہ اپنے ان قوانین میں کسی کو شریک کرے۔ اگر ایسا کر دے تو یہ نظم و نسق نہیں چل سکتا۔

وَرَبُّكَ يَعۡلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوۡرُهُمۡ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ ﴿۶۹﴾ (28:69) اس کے اس قانون کو کوئی بھی فریب نہیں دے سکتا کیونکہ اس کی نگاہ نہ صرف ظاہر پر دکھ دلوں کے اندر گزرنے والے خیالات تک ہوتی ہے۔

؎ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است قرآن کشید و دست از قلم کشید!
(اقبالؒ)

(قیامت تک کے لئے محفوظ آخری تصنیف! خدا اس کتاب کا مصنف)

خدا نے تصویر اتارنے کے بعد قلم کو رکھ دیا۔ جوں جوں علم انسانی بلند ہوتا جائے گا تو اس کے حقائق زیادہ نمایاں طور پر بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ قرآن کسی ایک دور کے لئے نہیں ہے یا یہ کہنا کہ کسی ایک دور میں کسی نے سمجھ لیا صحیح نہیں ہے۔ یہ تو ان مغربی مفکرین کی تحقیقات کا صدقہ ہے کہ ہمیں بھی قرآن کی کوئی آیت سمجھ میں آ جاتی ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ (28:68) مشیت کے مطابق پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور ان قوانین کے تحت جو نوع، جو فرد جو قوم زندہ رہنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے تو وہ زندہ رہتی ہے یعنی جو آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کرے تو وہ آگے بڑھتی ہے۔ اور اگلی منزل میں چلی جاتی ہے۔ پھر اس منزل میں ''وہی قانونِ یختار'' قانون طبعی انتخاب Law of Natural Seletion يَخْتَار کا ترجمہ ہی انتخاب ہے یعنی تخلیق اور اس کے بعد انتخاب۔ یہ ان ڈھانچوں سے ان کی مسلسل کڑیاں ملاتے ہوئے وہاں تک پہنچتے ہیں جہاں تک وہ نسل موجود ہے کہ پیدائش سے درمیان میں جو اتنا معلوم ہو گیا۔ یہ شکل کیسے آگے بڑھی تو یہ اس قانون انتخاب کے تحت یہ آگے بڑھ کر اس شکل میں آ گئیں۔

ان آیات سے قبل قرآن بتا رہا ہے کہ اقوام کس طرح آگے بڑھتی ہیں اور کس طرح ختم ہوتی ہیں اس کے بعد تخلیق اور یختار کی آیت ہے یعنی جس میں اگنے کی صلاحیت ہے وہ اگتا ہے باقی ضائع ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہماری تخلیق ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس میں برومندی صلاحیتوں سے ہوتی ہے۔ گیہوں بوؤ گے تو اس میں گیہوں اگے گا۔ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہم نے خود بند کر دی ہے۔

ے مغاں کہ دانۂ انگور ناب می سازند ستارہ می کنند آفتاب می سازند

(انگور کے دانہ کو ستارہ اور شراب کے پیالے کو آفتاب ارتقاء کا مسئلہ بیان کر دیا ہے)

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ (28:70) سارا اقتدار اس کا ہے اس کے سوا۔ کسی کے پاس نہیں ہے۔ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ز (28:70) پروگرام کی پہلی کڑی بھی حمد و ستائش اور باقی ہر کڑی جس میں سے اس کا پروگرام درجہ بدرجہ آگے بڑھتا ہے قابل حمد و ستائش۔ انجام بھی حمد و ستائش۔ الحمد ہی الحمد۔ خزاں کے موسم میں اس ٹنڈ منڈ درخت کو نہ دیکھو جو بہار کے لئے منتظر ہے برگ و بار لانے کے لئے۔ خزاں جو ابتداء وہ بھی حمد و ستائش اور بہار بھی حمد و ستائش۔ جو اس کے قوانین پر عمل پیرا ہوگا تو یہ دنیا بھی خوشگوار اور مستقبل بھی خوشگوار اور وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (28:70) حکم صرف اس کا ہے اور تمہارا ہر قدم اس کے قانون مکافات کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ ذرا اس کے قانون کی ہمہ گیری کا اندازہ خارجی کائنات اور خود اپنی دنیا میں دیکھو۔

نیند کے اندر سامانِ نشوونما پوشیدہ ہے، جدید تحقیقات

وَ مِنۡ رَّحۡمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾ (28:73) یہ اس کے نظام ربوبیّت کا صدقہ ہے کہ اس نے دن رات کی گردشیں قائم کر رکھی ہیں تا کہ تم رات کو آرام اور دن کو کام کر سکو۔ اس طرح محنت اور آرام مل کر تمہاری کوششوں کو بھرپور نتائج کا حامل بنا دیں۔

انسانی جسم خلیات (cells) کا بنا ہوا ہے۔ ہر سانس میں Matabolism ہوتا ہے یعنی جن خلیات میں انرجی ختم ہو جائے تو وہ مرتے چلے جاتے ہیں اور وہ کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں جبکہ ہر سانس میں کروڑوں کی تعداد میں نئی توانائیوں والے خلیات پیدا ہوتے ہیں یعنی Catabolism کا یہ سلسلہ قائم رہتا ہے۔ رحمت کی بات جو قرآن کہہ رہا ہے کیا ہمیں کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ ساری زندگی کا دارومدار اس Matabolism کے اوپر ہے۔ اگر ناکارہ، مردہ خلیات نکل نہ جائیں تو اندر ایسی سڑانڈ پیدا ہو جائے گی کہ اس سے زندگی ختم ہو جائے۔ اگر ان مردہ خلیات کی جگہ نئے خلیات پیدا نہ ہوں تو اس کے بعد موت اس کا نام ہوتا ہے کہ جب جسم کے اندر نئے خلیات پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے یہ سلسلہ انسانوں اور حیوانوں میں بھی ہوتا ہے جہاں اس انداز کی لائف ہو گی تو وہاں نیند ہوتی ہے۔ یہ میٹابولزم کیسے ہوتا ہے؟ یہ دن اور رات، روشنی اور تاریکی ردھم کی طرح، تال کی طرح، یہ گردش آتی ہے جس سے یہ میٹابولزم جاری ہے۔ یہ ہے وہ رحمت کا سامان۔ کام کاج میں توانائی صرف ہوتی ہے۔ ورزش کے بعد آدمی تھک جاتا ہے اور توانائی میں کمی ہو جاتی ہے۔ یہ گوشت (Protein/ Muscles) وغیرہ یہ سارے خلیات ہی ہوتے ہیں۔ بھاگ دوڑ کرنے میں یہ زیادہ تعداد کے اندر ختم ہو جاتے ہیں اس کے بعد تھکاوٹ طاری ہو جاتی ہے اور نیند آنے لگتی ہے تا کہ یہ جو پروٹین ضائع ہو گیا ہے تو اس کی تخلیق وتجدید (Regeneration and replacement) نیند کی حالت میں اس ردھم کے طریقہ پر ہوتی چلی جاتی ہے۔ قرآن نے اسے وَمِنۡ رَّحۡمَتِہٖ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَالنَّہَارَ (28:73) یہ اس کے نظام رحمت و ربوبیّت کا صدقہ ہے کہ اس نے دن اور رات کی گردش کا یہ سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ جونہی نیند غالب ہوئی تو ہارمونز بننے شروع ہو گئے۔ خلیات کی توڑ پھوڑ میں جلدی سے تیزی آ گئی اور وہ بننے شروع ہو گئے۔ پھر نیند کے بعد آدمی ترو تازہ اٹھتا ہے کیونکہ نیند میں خلیات کی تبدیلئ نو اور تخلیقِ نو ہوتی رہتی ہے۔ یہ دماغ بچہ کی پیدائش سے دو ماہ پہلے بننا شروع ہو جاتا ہے اور پیدائش کے بعد قریباً ایک ماہ تک بڑی سرعت سے اس کا بننا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ پیدائش کے بعد چوبیس سے بائیس گھنٹے

سوتا رہتا ہے کیونکہ یہ نیند کی حالت میں بنتا ہے۔ نیند کی حالت میں جسم کے باقی اعضا کام کرنا بند کر دیتے ہیں اور سارا خون دماغ کی طرف جانا شروع ہوجاتا ہے اور تمام تھکے ماندے خلیات کی Cure شروع ہوجاتی ہے۔

تصوّف، یوگا:

ہمارے ہاں تصوّف اور ہندوؤں کے ہاں یوگا میں جگانے کی ایک مشق ہوتی ہے۔ یہ ریاضت، مراقبے میں جگاتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ اس طرح سے مسلسل جو جاگنے کا عمل ہے اس سے ارتکاز (Concentration) نہیں رہتی۔ پھر عجیب قسم کی طلسماتی چیزیں ذہن میں آنا شروع ہوتی ہیں تو پھر جس طرح خواب میں ہوتا ہے تو اس طرح جاگنے میں ہونے لگتا ہے۔ بس پھر پاگل ہونے سے ایک ہی قدم پیچھے رہ جاتا ہے۔ اسے مجذوب کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ لیل ونہار کی اس گردشِ دولابی کے اندر سوچنے والوں کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (28:73) یہ غیر محسوس طور پر تمہاری نشوونمارات اور دن کی اس گردش اختلاف کے اندر موجود ہے۔ پھر دن کے اجالے میں لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ (28:73) رات کو نیند میں اعضاء کی مرمت ہوگئی نئے سیلز بنے۔ توانائی آگئی۔ تا کہ تم تلاش معاشِ میں نکلو اور تمہاری نیند بھرپور نتائج پیدا کرے۔ یہ ہے ہمارا قانونِ تخلیق و یختار، جو یہ کرتا ہے۔ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ (28:73) تا کہ یہ حرکات کچھ عرصہ کے لیے ساکت ہوجائیں اور رات کو آرام کر سکو۔

باطل نظام میں جسمانی خلیات کا بننا محال اور رزق کی بہار نہیں ہوتی:

باطل نظام میں جاگنے والوں کو بھی سکون نہیں ملتا۔ ان کو رات کو بھی یہ سکون نیند نہیں ملتی تو ان کے خلیات نہ مرمت ہوتے ہیں اور نہ بنتے ہیں یہ Paradoxical Sleep کہلاتی ہے۔ اگر صحیح نظام میں ارتکاز کی قوتیں یکجا ہو کر ارتقاء کی طرف رواں دواں ہوتی ہیں۔ یہ گردش لیل ونہار تو ہمارے قانون سے آتی ہے۔ اگر یہ بھی تمہارے ہاتھ میں ہوتا تو تم اسے بھی نہ ہونے دیتے۔ ذہنی اور قلبی سکون مہیا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کیونکہ شکر سے مراد ہے محنت کا بھرپور نتیجہ نکلنا، جس کو طبعی زندگی میں رات کی نیند میں سکون نہیں ملتا۔ وہ محنت کر ہی نہیں سکتا روزانہ اس کی محنت بھرپور نتیجہ پیدا کر سکتی ہے۔ اگر قلبی اور ذہنی سکون نہ ہو تو تلف شدہ توانائیاں کی بازآفرینی نہیں ہوتی۔ یوں قومیں مرتی تھیں۔ یہ ہے ربط قرآن میں!

ے حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

سر جیمس جینس علم الافلاک کا ماہر اپنی کتاب ''پراسرار کائنات (The Mysterious universe)'' میں کہتا ہے اس کائنات میں اتنا ربط ہے کہ یہاں جو کھڑا انگلی ہلا رہا ہے اس کی یہ حرکت مریخ کے اوپر جاری ہے۔

❀❀❀

سرمایہ دار اور قرآن

کمیونزم کے نام:

؎ اے کہ می خواہی نظامِ عالمے جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اقبال نے جو کہا تھا کہ مارکسزم میں خدا کو شامل کر دو تو وہ اسلام کے قریب ہو جاتی ہے یعنی اس ساری بات کو خدا کے ساتھ شامل کر لو۔ یہ تو عمارت ہے۔ بنیاد ہے وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (16:53) یہ ہے خدا کو شامل کرنا کہ تمام صلاحیتیں میری نہیں بلکہ خدا کی ہیں اور اس کے حکم کے مطابق صرف ہونی چاہئیں۔ یہ ہے اساس محکم۔ یہ دو ذہنیتیں ہیں۔ دو ایمان ہیں ایک تو إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ط (28:78) ان دو ذہنیتوں پر یہ سرمایہ داری اور کمیونزم استوار ہوتے ہیں ان کو اس کے لئے جذبۂ محرّکہ نہ ملا اور مارکس نے شکست تسلیم کر لی۔

؎ وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب نیست پیغمبر لیکن در بغل دارد کتاب

قرآن نے جواب میں کہا بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (39:49) ایمان تو یہ ہوگا وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (16:53) قرآن نے کسی کے لئے محنت کش یا مزدور کا لفظ استعمال نہیں کیا وہ تو سارے انسانوں کو محنت کش کہتا ہے۔ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿٣٩﴾ (53:39) جو محنت کش نہیں ہے وہ انسان نہیں ہے۔ قرآن میں طبقات ہی نہیں ہیں جہاں محنت کش کہا تو وہاں کوئی دوسرا طبقہ ہوگا۔ جو محنت کرنے والا نہیں ہوگا۔ جہاں دوسرا طبقہ پیدا کیا تو نظام ختم۔ اس کا نام سرمایہ داری ہے۔ خواہ روس میں ہو یا امریکہ میں۔ جو محنت نہیں کرتا اسے کچھ نہیں مل سکتا۔ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾ (32:17) ناہمواریاں پیدا کرنے والا نظام تباہ ہو کر رہتا ہے۔

قرآن کے نزدیک مساوات:

قرآن نے سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا ہے۔ وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ط (16:71) مختلف لوگوں میں مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ معاشرہ کو

چلانے کے لئے یہ مختلف صلاحیتیں ضروری ہیں۔ اب فتنہ اس وقت بنتا ہے کہ جن میں یہ صلاحیتیں زیادہ ہوں تو وہ سارے کا سارا اپنے لئے رکھ لیتے ہیں تو وہ ساتھ کام کرنے والوں کی ضروریات کو پورا نہیں کرتے۔ ان کو چاہئے کہ اپنی بھی ضرورت پوری کریں اوران کی بھی کیونکہ اس ماحصل میں تو سب شریک ہیں۔ تو سب کی ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں۔ فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ ط (16:71) تاکہ ان معاشی سہولتوں میں برابر کے شریک ہوسکیں۔

مساوات یہ نہیں کہ کسی کی ضرورت زیادہ ہے اور کسی کی کم اور سب کو دو روٹیاں ملیں دولت کی مساوی تقسیم سے تو نظام ہی نہیں چلتا۔ مسئلہ تو ضرورت کا ہے۔ جتنی جس کی ضرورت ہے تو اسے اس کی ضرورت کے مطابق اس میں سے دیا جائے۔ حالانکہ یہ سب کچھ ان کی محنت سے حاصل ہوا ہے۔ مختلف صلاحیتوں والے اکٹھے ہو کر اپنی اپنی صلاحیت بطور حصّہ ادا کرتے ہیں تو بانٹنے والے سارے کا سارا خود لے جاتے ہیں جو ان کے ساتھ طے ہوتا ہے وہ دے دیتے ہیں۔ حالانکہ فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ ط (16:71) برابر برابر ضروریات پوری نہیں کرتے۔

❁❁❁

ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ (81: 27)

ؔ ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ   تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

قندیل آسمانی کو ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ (81: 27) کیا گیا ہے آخر کس خصوصیات کبریٰ کی بنا پر؟

ہمارا یہ ایمان ہے کہ قرآن کے حقائق اور صداقتوں کو علی الوجہ بصیرت تسلیم کئے بغیر کوئی شخص بھی مومن نہیں ہو سکتا۔ اس لئے خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کا تعلق اس کے مقررہ کردہ قوانین اور اقدار سے ہی ہوتا ہے۔ اس کتاب کی موجودگی شخصیت پرستی کے خاتمہ کا اعلان ہے۔ اس کا مرکزی موضوع اور محور یہ ہے کہ اس نے انسان کو اس کے مقام سے آشنا کرایا ہے۔ کتاب تو اس کی ہے مگر

ؔ محمدؐ بھی تیرا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا   مگر یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا

اس کی تعلیمات مذاہب کی دنیا تو ایک طرف رہی یہ تو دنیائے فکر و دانش میں بھی کہیں نہیں ملے گی۔ تنہا عقل انسانی کے بل بوتے پر تشکیل کردہ نظام کو ایک محسوس مثال سے واضح کیا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ (29:41) اقدار خداوندی کی چھوڑ کر خود ساختہ روش پر چل کر مطمئن ہو گئے۔ حالانکہ کیفیت یہ تھی کہ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ (29:41) گویا یہ تو مکڑی کا جالا تھا جو اپنے سے کمزور مکھیاں اور مچھر پھانس لیتا ہے اگر اس سے کوئی طاقتور پھونک بھی مار دے تو ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ تمکن، سارا علم و بصیرت اپنے سے کمزور کو پھانسنے کے لئے تو بہت ٹھیک تھا۔ لیکن اس سے ایک قوّت والا بھی آیا تو اس کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ کہا گھر ایسا بناؤ جو طاقتور کو پھانس لے اور کمزور کی حفاظت کرے تو وہ گھر کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (2:256) محکم سہارا تو اقدار خداوندی کا ہے جس کا ٹوٹنا تو ایک طرف اس میں تڑک بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہے مضبوط سہارا جبکہ ان غیر خداوندی سہاروں کی کیفیّت تو یہ ہے اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ (29:41) سب سے کمزور سہارا کاش عقل و بصیرت سے کام لیتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی۔

چنانچہ ان گنت قسم کی معاشرتی، سیاسی تمدّنی، ہزار کوششوں کے باوجود بھی یہ عقل انسانی مصائب و آلام کے بھنور سے نکل کر آزادی کے بحر بیکراں سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ نامور ماہر سیاسیات H.J. Mancken اپنی کتاب Treatise on right and wrong میں کہتا ہے۔ تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی انسان کی ہے۔ اس کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع ہو اور

سب سے زیادہ عقل مند ہے اور وہ ناکامی یہ ہے کہ آج تک اپنے لئے کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس باب میں اس نے بڑی بڑی کوششیں کیں۔ بعض ایسی کہ فی الواقع محیرّ العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرات آزما تھیں۔ مگر جب ان کی عملی تنقید کا وقت آیا تو نتیجہ حیرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فطری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات ہے۔ فطری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افراد مملکت کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور ارباب حکومت پبلک کے خادم۔ مگر عملی طور پر جب حکومت ہاتھ آ جاتی ہے تو یہ پبلک کی حکومت نہیں بلکہ سلب و نہب ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

؎ عقل بے مایہ امامت کی سزا وار نہیں ۔۔۔۔ راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات

صرف قرآن زبوں کار حیات ہونے سے محفوظ رکھ سکتا ہے ورنہ ان کی محدود عقل تو

؎ در نگاہش آدمی آب و گل است ۔۔۔۔ کاروانِ زندگی بے منزل است

جبکہ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (45:22) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (15:77) مقصد یہ ہے وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22) اصل بات یہ ہے کہ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (45:24)

ذرا علم کی بارگاہ پر دستک تو دیں یہ سراسر بے سر و پا اور ظن و قیاس پر مبنی باتیں کر رہے ہیں کیونکہ یہ خواہشات و جذبات ان کے راستے میں حائل ہیں۔ کائنات کی تخلیق کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو اس کے اعمال کی پوری پوری جزا و سزا مل سکے۔

❁❁❁

حَسَنٰت اور سَیِّاٰت کا قرآنی مفہوم

جب بھی انسان اور انسان کے اندر تفریق کی تو یہ چیز سیئات کے اندر داخل ہو گئی۔ خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے ناہمواری پیدا ہو گئی تو سیئات اور جب انسان اور انسان کے اندر ہمواری پیدا کی تو وہ حسنہ ہو گیا۔ رسولؐ نے جو تبلیغ اسلام کا پہلا خط رومنز، ایران، حبشہ کو لکھا تھا کہ ان حقائق کو تسلیم کر لو اور اپنا نظام اس کے مطابق کر لو تو ٹھیک ہے اگر اس سے سرکشی برتی تو یاد رکھو کہ جتنے مظالم ان کا شتکاروں پر ہو رہے ہیں ان سب کا بدلہ لیا جائے گا۔ تم ان ناہمواریوں کے ذمہ دار ہو۔ باز آ جاؤ۔ یہ تھی اسلام کی طرف دعوت۔ اور جن کے اپنے ہاں اس قدر ناہمواریاں ہیں وہ بھلا دوسروں کو اسلام کی کیا تبلیغ کریں گے؟

سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کردہ سیئات (ناہمواریاں) تفریق پر مبنی معاشرہ:

پہلی چیز قابل غور ہے کہ محنت کشوں، مزدوروں کے لئے بہبود کا کام کر رہے ہیں۔ ان سے ذرا پوچھو کہ یہ ہم اور یہ وہ الگ الگ تم نے کہاں سے پیدا کئے؟ تم کون ہو کرنے والے۔ کن کے لئے کر رہے ہو؟ یعنی یہ تفریق انسانوں میں پہلے سے کر دی تم تو تم ہو گئے اور یہ ہم ہو گئے۔ جیسے وہ مریخ سے اترے ہوں۔ یہ ان کو محنت کش کہتے ہیں جیسے یہ کوئی اور جنس ہے۔ یہ الگ اور یہ بہبود والے الگ۔ یہ ہے ناہمواری۔ قرآن میں کہیں ان دو طبقات کا ذکر نہیں ہے۔

وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىۙ‏ (53:39) وہ جو محنت نہ کرے انسان نہیں کہلا سکتا تو یہ جو محنت کشوں کے لئے کچھ کرتے ہیں تو یہ تو قرآن کی رو سے انسان ہیں اور جو محنت نہ کریں تو وہ انسان ہی نہیں کہلائے جا سکتے۔ وہ تو ان کو انسان ہی تسلیم نہیں کرتا جبکہ یہ چوہدری بنے ہوئے ہیں۔ تم کون ہو جو ان محنت کشوں کے لئے کرتے ہو۔ تم تو وہ ہو جو محنت نہیں کرتے ان کا دیا ہوا کھاتے ہو۔ یہ ہیں سیّاٰت۔ نظام سرمایہ داری نے غلام کا نام محنت کش رکھ دیا غلام اور آقا کی تفریق مٹا کر بڑا اجہاد کیا اور اب کہا کہ یہ مزدور اور ہم آقا۔ یعنی غلام کا نام مزدور رکھ دیا اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ غلامی کو ختم کرنے کا کریڈٹ لیتے ہیں ارے تفریق تو ویسی ہی ویسی ہے۔ وہ الگ ایک طبقہ بنا کر اس کا نام غلام کی جگہ مزدور۔ محنت کش رکھ دیا۔ نہ وہ غلام اپنی شرائط آپ متعین کرتا تھا اور نہ یہ مزدور اپنی شرطیں آپ منوا سکتا ہے۔

قرآنی معاشرے میں مساوات کی مثال:

تقسیم کار اور چیز ہے یہ تو تھی ناہمواری۔ مشین کے پرزوں کے فرائض کو تقسیم کار کہا جاتا ہے۔ مشین میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک

674 دوسرا بڑا پرزہ پیچ سے یہ کہے کہ تم بہت ذلیل ہو اور ہم تو بڑے حاکم ہیں۔ سب پرزوں کے تعاون سے یہ مشین کا نظام احسن طریقے سے چل رہا ہے۔ پیچ ذرا سا ڈھیلا ہو جائے تو ساری مشینری سیئات کا شکار ہو جاتی ہے یہ ہے مساوات۔ سو سو کے نوٹوں کی گڈی میں اوپر کا نوٹ نیچے والے نوٹ سے نہیں کہے گا کہ تم ذلیل ہو تیری تو کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ تو نیچے ہے۔ اگر پھیلا کر نہیں رکھنا تو پھر کچھ تو اوپر آئیں گے اور کچھ نیچے اس طرح سے قیمت تو کم نہیں ہو جائے گی۔ سو تقسیم کار کی رو سے کس کو نیچے رکھئے یا اوپر بٹھایئے سب کی قیمت ایک ہو گی۔ یہ قرآن کی اصطلاح میں حسنات، نیکی کہلاتے ہیں۔ یہ قرآنی نظام ان تمام ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لئے آیا ہے۔ مساوات ایک جیسی شکل اور لباس کا نام نہیں ہے اس سے مراد ایک جیسی تکریم اور ایک جیسی عزت۔ کوئی انسان جب کسی دوسرے انسان سے اطاعت کرائے تو یہ مساوی تکریم نہ رہی ان کا مقام مساوی نہ رہا۔ یہ شرف انسانیّت کے خلاف چلا گیا۔ وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡٓ اٰدَمَ (17:70) تو جھکا جب غیر کے آگے، نہ تن تیرا نہ من۔ یہ تقسیم کار والے، کچھ نافذ کرنے والے، خواہ نبی ہی کیوں نہ ہو اسے حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان سے اطاعت کرائے وَ لٰكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ۙ﴿۷۹﴾ (3:79) عملاً اطاعت اس کتاب کے قوانین کی ہو گی۔ اس کے مقابل وہ گروہ جو انسانوں سے اپنی اطاعت کرائیں تو قرآن انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ مومن اور کافر۔ نظریات کی بنیاد پر۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر (29:14)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ط (29:14)

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کا اندازہ:

فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ط (29:14) اس آیت کا مروّجہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان میں ایک ہزار سال سے پچاس برس کم رہا۔

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال تھی۔ اس پر معترضین ومخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ تاریخ تو اس امر کی شہادت نہیں دیتی ان کا زمانہ کوئی چھ ہزار سال قدیم سمجھ لیجئے اور علم الانسان کے ماہرین Anthropologist کے مطابق کہ شروع سے ہی انسان کی ساڑھے نوسو سال کی عمر نہیں ہوا کرتی تھی۔

اب دو باتیں یاد رکھیں کہ جب کسی بڑے شخص کی عمر کہا جاتا ہے تو وہ اس کی طبعی زندگی یا ذاتی عمر نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کی تعلیم کا، اس کی بنائی ہوئی تہذیب، اس کے تمدّن کا ایک دور ہوتا ہے مثلاً دور ابراہیمؑ، نبیؐ کا دور رسالت قیامت کے لئے۔ ہمارے ہاں روز مناظرے بحثیں ہوتی ہیں یہ اولوالعزم اپنے پیغام یا تعلیمات کی رو سے زندہ ہوتے ہیں جب تک ان کی امت، متبعین کا تسلسل ہوتا ہے وہ زندہ ہوتے ہیں۔ روح محمدیؐ امت محمدؐ کے اندر زندہ ہے رسالت قیامت تک کے لئے زندہ ہے۔ فَلَبِثَ فِيْهِمْ (29:14) وہ ان کے اندر رہا۔ یہ اس کا دور ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت نوحؑ کا پیغام وہی رہا جبکہ دیگر پیغمبر آتے رہے۔ وہ اس وقت تک رہا جب تک حضرت ابراہیمؑ کا دور نہیں آ گیا۔ قرآن نے اس آیت کے بعد درمیان میں تمام انبیاء کا ذکر حذف کر کے حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع کر دیا وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ (29:16) یہ دور نوحؑ دور ابراہیمؑ کے آغاز تک رہا اور وہاں سے دور ابراہیمؑ شروع ہوا۔ ان دو ادوار میں کیا فرق ہے اور اس دور کی بنیادی خصوصیّت کیا تھی اور دور ابراہیمیؑ میں آ کر کیا فرق پڑا بہر حال یہ تو ان کی تعلیم کا دور یا زمانہ ہے۔ اب ان کی طبعی عمر کی طرف آ یئے اس طبعی عمر میں ایک عجیب نقطہ قابل غور وتدّبر ہے۔ کہا گیا اَلْفَ سَنَةٍ (29:14) ہم تو سن سال بھر کے لئے کہتے ہیں مگر عربوں کے ہاں سے جو چار فصلیں ہوتی ہیں ان میں سے ہر فصل کو وہ سن کہتے تھے یعنی سال کا چوتھا حصّہ۔ تو ہزار فصلیں اڑھائی سو سال ہوئے۔ اب آگے ہے اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ط (29:14) یہاں سنہ نہیں بلکہ عاما کہا ہے جس سے مراد سال ہے تو اڑھائی سو میں سے پچاس نکال دیں تو دو سو سال رہ جاتے ہیں اور یہ ممکن ہے ڈیڑھ ڈیڑھ سو

سال کی عمر کےتو کئی لوگ آج بھی موجود ہیں۔اس لئے اس کا امکان ہے۔

اب آیئے سَنَةٍ (29:14) اور عاماً تو اگر سال کے لئے استعمال کریں تو وہ عاماً خوشحالی کا سال اور سَنَةٍ (29:14) سختیوں کا سال۔ رسولؐ چالیس سال تک مکہ میں انہی قریش کے ساتھ امن میں رہے خوشحالی اور امن کی زندگی۔کوئی مزاحمت نہیں۔اسے عرب عاماً کہتے تھے۔اس کے بعد جو مزاحمات شروع ہوئے تو اسے وہ سنۃ کہتے تھے۔اب حضرت نوحؑ کے بارے میں یوں کہیں گے کہ ان کی پچاس سال کی زندگی قبل از نبوّت آرام سے گزری اور سنۃ جو تعلیم کی زندگی ہے اس میں سختیاں شروع ہوتی ہیں تو اس اعتبار سے ان کی نبوّت کا زمانہ یہ ان کی تعلیمات کا زمانہ آئے گا۔ یہ ہے وہ دور جو دور ابراہیمؑ کے دور کے آغاز تک چلا آ رہا ہے۔اب تحقیق کا رخ اس طرف گیا ہے کہ اگر اڑھائی سو سال کی عمر ہے تو پچاس سال زمانہ قبل از نبوّت ہے جس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔اس کے بعد دوسرا دور نبوّت کا دور تو وہاں سے ٹکراؤ شروع ہوتا ہے۔اس کے حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ہے۔درمیان سے قوم عاد اور قوم ثمود کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

اسوۂ ابراہیمیؑ قرآن کی زبانی

ابتدائیہ، بابل کی زندگی:

قرآن نے دوہستیوں کو اسوۂ حسنہ یعنی بہترین ماڈل کہا ہے ایک حضرت ابراہیمؑ اور دوسری حضور نبیؐ۔

اس میں شک نہیں کہ منصب نبوّت کے اعتبار سے تمام انبیائے گرامی ایک ہی مقام کے حامل ہوتے ہیں یکساں عزت وکریم کے پیکر لیکن ان کے دائرہ کار، تعلیم اور پروگرام کی نوعیّت اور وسعت کے اعتبار سے ان کے مدارج میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے ان دوہستیوں کو ان کے بلند کردار اور حسن سیرت کی وجہ سے ماڈل قرار دیا ہے اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ کو امام الناس کہا یعنی وہ ہستی جو کسی خاص قبیلہ یا قوم کی نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں ے لئے ایک ماڈل قرار دیا ہے اور نبی اکرمؐ کو رحمۃ العٰلمین کہا۔ یہ کوئی وقتی، مقامی یا زمانی اعتبار سے نہیں بلکہ یہ سیرت وکردار تمام انسانوں کے لئے ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے اور ان دونوں ہستیوں کے ماڈل ان افسانہ نگاروں کے ہاتھ لگے تو انہوں نے اس میں کسی قسم کی رنگ آمیزیاں اور عجوبہ پرستیاں کیں اور اسے کیا سے کیا بنا دیا۔
بابل ایک شاندار مملکت جو اس زمانے میں تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا اس دور میں مذہبی پیشوائیت کا سربراہ بادشاہ سے کہیں زیادہ صاحب اقتدار ہوتا تھا۔ ہامان اور ہندوستان میں برہمن جب تک راجہ کو تلک نہیں لگاتا تو وہ گدی پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ یہ ہامان، برہمن اور پیشوا تمام بادشاہ گر ہوتے تھے۔ ان کا والد مملکت کا ہیڈ پریسٹ تھا جو لوگوں کے قلب و دماغ اور اعصاب پر مسلّط ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بڑا بیٹا ہونے کی جہت سے اس کے ولیٔ عہد تھے۔ اور باپ کے بعد یہ منصب ان کا منتظر تھا اب باپ کی اطاعت ایک مسلّمہ تھا۔ اب یہ بیٹا اس کا مستقبل ہے اور یہ اس قوم کا ہیڈ پریسٹ تھا۔ کہا ابراہیمؑ نے والد سے وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾ (6:74) کمال ہے کہ ایک بت کو تراش کر اسے تم اللہ بنا کر اس کی پرستش کرتے ہو اور اس طرح ساری قوم کو ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا کر دیا ہے اور دیکھا کہ باپ کی اطاعت غلط بات پر نہیں کی بلکہ اسے ان باتوں پر ٹوکا۔ اب یہ ہے اسوۂ حسنہ کے اندر پہلی بات۔

باپ سے کہا جا رہا ہے کہ ساری قوم کو بدراہ کر دیا ہے۔ باپ کہتا ہے قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ (19:46) کیا تم ہمیں ان خداؤں سے بیزار کر کے ان کی پرستش چھڑوانا چاہتے ہو یہ تو تم ان کی توہین کر رہے ہو لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾ (19:46) جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ میں تمہیں عاق کر دوں گا۔ یہ وہی جواب ہے جو آج کا

باپ دیتا ہے لیکن قرآن نے کہا کہ بڑھاپے میں عقلیں اوندھی ہوجاتی ہیں۔ اعصاب کمزور اور مزاج چڑچڑے ہوجاتے ہیں اس لئے ان سے تلخ نوائی سے کام نہ لیا کرو۔ جھڑکا نہ کرو۔ آرام سے بات کیا کرو۔ اطاعت صرف صحیح بات کی کرنا لیکن بدتمیز اور گستاخ نہ ہونا۔ اب بیٹا جو اتنی بڑی وراثت سے محروم ہورہا ہے اسوۂ ابراہیمؑ کا دوسرا گوشہ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿47﴾ (19:47) میں یہ کوشش کرتا رہوں گا کہ تو اس تباہی سے محفوظ ہوجائے۔ دیکھا جسے ماڈل بنایا تو اس کی جزئیات تک دی ہوئی ہیں۔ غلطی کے خلاف احتجاج خواہ باپ کے سامنے کیوں نہ ہو مگر ادب کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ ستاروں کے بت تراش کران کی پرستش کرتے تھے۔ اس دور میں ستارہ پرستی عام تھی۔

فہم وفراست کے بعد ان میں مقام نبوّت:

نبی تو خود ایک بڑا معلم ہوتا ہے۔ اور اسے علم کے بلند مقام پر ہونا چاہئے۔ خود نبی کو بھی یہ علم حاصل کرنا پڑتا تھا۔ صرف وحی کے چار فقرے دہرادیں اور اس کے خلاف دلیل آئے تو کیا وہ چپکے بیٹھ جائے گا۔ نبوّت عجیب چیز ہے وحی تو اس کی محنت وکاوش کا نتیجہ نہیں ہوتی مگر وحی کو پیش کرنے کے لئے جس حکمت کی ضرورت ہوتی ہے تو اس مقام بلند پر نبی ہوتا تھا۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿75﴾ (6:75) ان تمام مظاہر فطرت کے اوپر اس نے غور وغوض کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ یہ کس طرح سے نظام چل رہا ہے تو اس پر اسے یقین ہوگیا پھر اس نے آگے چل کر بات چلائی تو اگلا اسوۂ حسنہ یہ ہوا کہ جب اس کے متبع اپنی زندگی کو اس ماڈل میں ڈھالیں گے تو جس subject پر بات ہونی ہے تو اس پر ان کو ماہر ہونا چاہئے۔ جب ہی وہ معترض معلم ہوسکتا ہے۔ بات کرنے سے پہلے اسے وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿75﴾ (6:75) خود یقین تک تحقیقات، مشاہدہ کے بعد پہنچنا چاہئے۔

اب قوم کے سامنے آئے فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ (6:76) اچھا تم اسے میرا خدا سمجھتے ہو۔ اس وقت نہیں کہا بلکہ فَلَمَّآ اَفَلَ (6:76) جب وہ غروب ہوگیا تو یہ تو خود اس کی خدائی کے خلاف دلیل ہوگئی۔ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿76﴾ (6:76) صرف یہ ستارہ ہی نہیں ہر وہ شے وہ تغیر پذیر ہو اسے خدا نہیں مانا جاسکتا۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿77﴾ (6:77)

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ (6:78) یہ تو بہت بڑا اور چمکدار بھی ہے۔ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿78﴾ (6:78) اب تمہارے خداؤں کی انتہا ہوگئی اب یہ تولا کا حصّہ ہوگیا کیا اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿79﴾ (6:79) اس لا کے بعد تمام توجہات کا مرکز اسے مانتا ہوں ساری قوم ان دلائل قوم کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ جو چرچا ہوا تو بات اس وقت کے نمرود تک جا پہنچی۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ (2:258) جواب دیا قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ (2:258) اس اَنَا میں تکبر کا اظہار ہے۔ اب اسوۂ ابراہیمؑ کو ملاحظہ کریں اس مدہوش کو اس لائن پر جواب دیا جاسکتا تھا۔ مگر دوسری لائن پر آ

گئے۔ مقصد مناظرہ جیتنا تو نہیں تھا۔ اسے لاجواب کرنا تھا۔ قَالَ اِبْرٰهِمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (2:258) جس کی عقل ٹھکانے پر نہ ہو تو وہ صحیح بات کیسے مان سکتا ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقۂ استدلال محسوس شکل میں:

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محسوس شکل میں ان کو باور کرانا تھا کہ یہ بت بے بس ہیں کیونکہ وہ تو ان کو صاحب قوت و اقتدار جانتے تھے۔ جس کے خلاف ہو جائیں تو اسے بھسم کر کے رکھ دیتے ہیں یہ تمہیں راکھ بنا دیں گے۔ میں دیکھوں گا کہ ان میں کتنی قوت ہے اس نے یہ بات چھپا کے نہیں رکھی بلکہ سب کے سامنے کہا کہ مومنانہ شیوہ ہی یہی تھا۔ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (21:57) کہا جب یہ اکیلے ہوں اور میں بھی اکیلا تو پھر طاقت آزمائیں گے۔ اعلان کیا ہے دھوکہ نہیں دیا ہے ان کی غیر حاضری میں اس لئے تاکہ یہ ہنگامہ کھڑا کر کے ان کو زبردستی اس کام سے روک نہ دیں۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (21:58) بڑے کو چھوڑ کر باقی سب کا ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تاکہ اس کی طرف رجوع کریں تاکہ یہ پوچھا جا سکے کہ بھئی اتنے طاقتور معبود کی موجودگی میں یہ کیسے ہو گیا۔ اگر اسے بھی توڑ دیا جاتا تو اس دلیل و حجت کی گنجائش کہاں رہتی۔ آئے تو قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ (21:59-60-61) تاکہ عوام اسے دیکھ سکیں۔ عوام کو مشتعل کر دیا سامنے تفتیش ہوگی قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ (21:62) قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ (21:63) یعنی جس نے بھی کیا اسے چھوڑ دو یعنی بَلْ فَعَلَهٗ مَنْ فَعَلَهٗ میں "مَنْ فَعَلَهٗ" حذف ہے كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (21:63) جواب نہیں تھا تو فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ (21:64) یہ تو ہم نے لوگوں کے سامنے لاکر غلط کام کر دیا۔ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ (21:65) شرمندہ ہو گئے۔

تفتیش کے دوران پوچھ رہے ہیں ابراہیم علیہ السلام سے لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (21:65) عوام کے سامنے لے کر سارا کچھ ظاہر ہو گیا تو کہا قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (21:66) یہ تو نفع و نقصان ایک طرف رہا اپنے آپ کو بھی نہ بچا سکے اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (21:67) تو جواب نہ تھا بلکہ کہا انہوں نے قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (21:68) اسے بھسم کر دو اور اپنے دیوتاؤں کا بول بالا کر دو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف آتش انتقام کا ماجرا:

انہوں نے ان جذبات کو بھڑکایا آتش انتقام کی جو شعلہ باریاں تھیں ان کو بھڑکایا۔ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ (21:69) تو ہم نے ایسا طریقہ کیا کہ وہ آتش انتقام ٹھنڈی ہو گئی۔ اور ابراہیم علیہ السلام کو گزند سے بچا لیا۔ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (21:70) انہوں نے جو خفیہ تدبیر کی تھی کوئی الاؤ نہیں جلایا گیا تھا وہ ابھی

674

اَرَادُوْا (ارادہ ہی کر رہے تھے) اس کو نافذ نہیں کیا تھا اس کا ارادہ کیا تھا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾ (21:70) ہم نے ان کو ناکامی سے دوچار کر دیا اسے وہیں ختم کر دیا۔

ہجرت کے تعمیری مقاصد کا پروگرام:

وَ نَجَّيْنٰهُ (21:71) اسے حفاظت سے نکال لیا۔ کفار کی گہری سازش جو قرآن نے دو لفظوں میں بیان کر دی جو ہم صفحوں میں بھی بیان نہ کر سکتے قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾ (37:97) اس کو بھسم کر دو۔ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾ (37:98) ان کی خفیہ سازشوں کے تمام ارادوں کو پست کر دیا وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ (37:99) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (60:4) اپنے بیگانے کا معیار اس دو قومی نظریہ سے ہوا ہے۔ یہ قومیت کی تشکیل کا معیار اور یہ اسوۂ حسنہ ہے۔ فلسطین آ گئے تو وہاں نئی زندگی شروع ہو گئی۔

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ (4:54) وہاں نبوّت۔ مملکت اور عقل و دانش سے سرفراز ہوئے۔

اس کے بعد وہ کن کن مشکلات میں سے گزر کر ہر آزمائش میں پورا اترتے ہیں۔

فلسطین و شام کی روداد:

ان دونوں ہستیوں کے مکمل خدوخال قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں تا کہ وہ ماڈل یا تصویر نا تمام نہ رہ جائے۔ اب یہ سرزمین دیکھا کہ بالکل زندگی کی نمود کے لحاظ سے بنجر ہے۔ اس میں فصل اگنے کا امکان نہیں ہے۔ بیج کا ڈال کر بیج ضائع کرنے والی بات ہے تو پھر دوسری زمین جس میں کوششیں بار آور ہوں تو وہاں چلا جاتا ہے۔ یہ ہجرت کہلاتی ہے۔ اب یہ نئی قوم نا مانوس، وحشی، یہاں سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں خام مال ہے ان میں سے انسان پیدا کرنے ہیں۔ مردہ بستی میں صور اسرافیل سے زندگی کی نمود کے لئے ایک سخت جدوجہد کا دور شروع ہو گیا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ (2:260) اب اس مردہ جسم میں زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ مخالفت اور مزاحمت تو نہیں مگر قوم مردہ ہو چکی ہے۔ جس طرح رسولؐ کو کہا گیا کہ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (27:80) لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) پیغام تو ان کے لئے ہے جو زندہ ہیں دوسری جگہ ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (8:24) یہ آواز تو یہ دعوت تو زندگی دینے کے لئے ہے تو کہا کہ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ (2:260) كَيْفَ سے مراد اس کا طریقہ کیا ہے یہ نہیں کہتے کہ مجھے ایمان نہیں ہے کہ تو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے یا نہیں اس مناظرے میں تو نمرود سے کہا اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۙ

(2:258) وہ تو خدا سے طریقہ کار پوچھ رہا ہے کہ یہ تو بالکل مردہ قوم ہے۔ ان میں زندگی کی رمق ہی نہیں ہے۔ اصل میں ابراہیمؑ کی سوچ سعی اور خطا (trial and error) کے تجرباتی طریق سے گریز کی خواہاں تھی۔ یہ بات تو اس نے اطمینان قلب کے لئے پوچھی تھی۔ عقل کا طریقہ تجرباتی ہوتا ہے اس میں دل کا یقین نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ طریقہ وحی کے ذریعے معلوم کرنا چاہا تو کہا کہ معجزوں سے تو نہیں لایا جا سکتا۔ اس الجھن کا حل قوم کو اپنے ساتھ مانوس کرنے میں تھا۔ جس طرح وحشی پرندہ مانوس ہو کر آزاد بھی چھوڑ دو تو پنجرے کے پیچھے پیچھے خود بخود چلتا ہے لیکن سدھانے کے لئے استقامت اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کوئی ایک دن کا کام نہیں ہے۔ انسان تنگ پڑ جاتا ہے اس کے لئے داعی انقلاب کا مشفق ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ فساد برپا کرنا تو آسان ہے وہ اگر بھاگ نہ جائیں تو اس کی جان لے لیتے ہیں لیکن انقلاب تو قلب سے ہے۔ قلبی تبدیلی کے لئے تو صبر اور حوصلہ کی ضرورت ہے۔ یہی چیز رسولؐ کے متعلق قرآن نے کہی ہے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ (3:159) اگر تو شقی القلب اور خود غرض ہوتا تو یہ سب کب کے چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جاتے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ (3:159) چھوٹی موٹی غلطیوں کو نظر انداز کر کے ان کو ساتھ ساتھ نقصان سے حفاظت کا انتظار کر۔ اس لئے ابراہیمؑ نے کہا کہ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۭ (2:260) تو اطمینان سے مراد تو علم و بصیرت سے ہوتا ہے نہ کہ معجزے سے۔ دلائل اور برہان سے اطمینان ہوتا ہے۔ ذات خداوندی بھی بغیر اطمینان کرائے ایمان لانے کا تقاضا نہیں کرتی۔ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (2:260)۔ اس لئے تجھے قوت کے ساتھ حکمت کا بھی مظاہرہ کرنا ہوگا۔

قربانی کا واقعہ:

خدا نے ابراہیمؑ کو اس بیٹے کی قربانی کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ یہ تو بڑھاپے کی اولاد تھی اور پیغمبرؑ کا ورثہ تو ان کی یہ تعلیمات ہوتی تھیں۔ وہ جائیدادیں نہیں چھوڑتے بلکہ صحیح تربیّت یافتہ اولاد، ذریت، مومنین اور جماعتوں کو چھوڑتے ہیں۔ اس زمانے میں سے خدمت کا جذبہ کہ ہر چیز خدا کے راستے میں قربان کرنی ہے عام تھا۔ یہ اپنے پہلے پیدا ہونے والے بچوں کو بھی خدا کے نام پر قربان کرتے تھے۔ مویشی کا پہلا بچہ، فصل وغیرہ، پہلا دودھ تو سب ہی گاؤں میں دیتے تھے اب جو عزیز ترین متاع کو قربان کرنے کا جذبہ ان کے دل میں شدت پا گیا تھا فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ (37:102) بیٹے نے کہا قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (37:102)

؎ یہ فیضان نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی — سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

اس پر آمادہ ہو گیا خدا دیکھ رہا ہے کہ کہاں تک جاتا ہے؟ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ (37:103) اونچی جگہ کن پٹی کے بل لٹا دیا وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ (37:104) قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ (37:105) ارے تو تو سچ مچ کر رہا ہے چونکہ زندگی اقدار کے تحت گزر رہی تھی اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (37:105) جن کی زندگی حسن کارانہ اعتدال پر ہوتی ہے تو وہ جذبات کی شدت میں بھی کہا جائے تو رک جاتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ چھری چلا دوں گا۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗـؤُا الْمُبِيْنُ ۝ (37:106)

یہ تو بڑی آزمائش کی بات تھی گردش تھی۔ جوتم نے کر دکھایا یہ بالکل نہیں کہ انسان کو قربان کر دیا جائے۔ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (37:107) وہ قربانی تو ایک منٹ میں ختم ہو جاتی ہم نے تو اسے ایک بڑی اور لمبی قربانی کے لئے محفوظ کر دیا ہے وہ یہ کہ شام کے سبزہ زاروں سے نکل کر یہ بادشاہت حشمت و اقتدار چھوڑ کر مکہ وادی غیر ذی زرع جہاں کونپل تک نہیں ہے اس میں جا کر ایک گھر بناؤ۔ اسماعیلؑ بھی اور اس کی اولاد بھی رہے صرف اسماعیلؑ ہی کو نہیں بلکہ ذریت اسماعیلؑ کو بھی قربان کر دیا۔ یہ ہے ذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾ (37:107)۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ (37:108) اور اس مثال کو آنے والوں کے لئے باقی رکھا۔ یہ ہے قربانی۔ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۱۰۹﴾ (37:109) قربانی بھی دی اور خیریت سے بھی رہا۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ (37:110-111)۔

وادیٔ حجاز اور تعمیر کعبہ:

معاشرتی زندگی کے محدود تصوّر کو قرآن نے نظام عالمگیریت کی طرف موڑنے کا اعلان کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے تک انسانیّت کا ابتدائی دور تھا۔ ان کے ذہن میں عالمگیریت، یونیورسلزم، انسانیّت کا تصوّر نا آشنا تھا۔ خاندانوں سے قبیلوں اور پھر قوموں میں بٹے ہوئے تھے۔ دین بھی اس وقت قومیّت کے دائروں میں بٹا ہوا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام وغیرہ اپنی قوموں کی طرف آئے۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ امتیازی خصوصیّت جس کی ابتداء ان کے دور میں دین کی قومیّت کے دائروں سے نکل کر عالمگیریت کی طرف بڑھنے سے ہوئی ہے۔ عالمگیریت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ یہ نہیں کہ اس زمانے میں عالمگیریت آ گئی تھی۔ یہ ان کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ فطرت کا فیصلہ تھا۔ خدا جس کے سامنے آج اور کل امتیار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کے ہاں تو مستقبل بھی آج ہوتا ہے۔ بہت دور تک دیکھ کر فیصلے کرتا ہے۔ اب عالمگیر دین کے لئے ایک محسوس مرکز بھی ہونا چاہئے۔ تو یہ مرکز تو شام اور فلسطین میں قائم ہو سکتا تھا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت حضرت اسحاق علیہ السلام سے بنی اسرائیل تھے۔ اور ان کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چلا آیا ہے تو وہ دین تو قومی تھا جو بنی اسرائیل تک تھا۔ جبکہ اس دین کو عالمگیر ہونا تھا۔ تو مشیت کا پروگرام یہ ہوا کہ یہ عالمگیریت دوسری شاخ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاخ اسماعیلؑ میں سب سے پہلے اور آخری رسول نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے۔ اور وہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں کعبہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ تو اس کی عملی شکل عالمگیریت کی وہ رسول اللہؐ کے ہاتھوں تشکیل پائی تو رحمت للعالمین اور ذکر للعلمین کی کتاب کسی ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ پوری انسانیّت کے لئے ہے تو اس کا آغاز نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں ہوا۔ اب اس کا مرکز محسوس اس وادی غیر ذی زرع ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے ہاتھوں سے رکھا جا رہا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دور میں اہل عرب کی معاشی حالت:

اس وادی غیر ذی زرع میں کوئی بھی دنیاوی کشش نہیں تھی۔ یہ غریب قوم تھی۔ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ذریت اسماعیل کو جا بسایا۔ فلسطین جیسا سرسبز و شاداب خطہ چھوڑ کر۔ یہ تھی بڑی قربانی۔ یہ ہے ذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾ (37:107) کہا

ابراہیمؑ نے رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ (14:37) اولاد کا ایک حصہ، بڑے واجب الاحترام گھر کے پاس یعنی رب کی نسبت صرف ساری انسانیت کی طرف کی گئی۔ لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (14:37) تا کہ تیرا نظام قائم کر سکیں۔ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ (14:37) لبوں پر دوران تعمیر حسین دعائیں تعمیر کے ساتھ گنگنا رہے ہیں ان حسین آرزوؤں کے ساتھ۔ وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾ (2:127)۔ یہ نظرانہ تیری بارگاہ میں حاضر ہے اسے قبول فرما وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾ (2:128) جو آگے اولاد آئے تو وہ بھی تیرے سامنے جھکے۔ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ (2:128)

تعمیرِ کعبہ کی غایت اور منتہا:

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُزَکِّیۡہِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾ (2:129) ان دعاؤں میں ملاحظہ کریں دنیا کی آسائش۔ رَبِّ اجۡعَلۡ ہٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَہۡلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (2:126) رزق حلال کی دعائیں لبوں پر ہیں لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ (14:37) تا کہ ان کی محنت بھرپور نتائج پیدا کریں یعنی یہ خدا کے نام پر گھر بنا ہے تو ایسا نہ ہو کہ ہیکل گرجا یا مندروں میں بیٹھ کر لوگوں سے روٹی خدا کے نام پر مانگ کر کھا رہے ہیں۔ کہیں میری اولاد مجاور بن کر روٹیاں مانگنے لگ جائے اپنی طرف سے روٹی کا انتظام کرنا۔ ورنہ مجاور بن کر لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ (9:34) یعنی خدا کے نام پر مرکز بنا کر خود کما کر نہیں کھاتے بلکہ تعویذ، گنڈے اور قسمتوں کے حال بتا کر روٹی خریدتے ہیں۔ یہ تو خدا کا مرکز ہے تو اس کے چڑھاوے کا تو اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

قرآن نے اسوۂ ابراہیمیؑ کا دو لفظوں میں نچوڑ نکل کے رکھ دیا۔ وَلَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَاِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾ (2:130) اِذۡ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾ (2:131) شروع سے آخر تک تمام مراحل دیکھتے جایئے یہ تھے وہ بڑے بڑے مراحل وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ (2:124) ہر مرحلہ میں پورا اترا۔ اس کسوٹی پر پورا اترا تو قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (2:124) لیڈرشپ عطا کر دی قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ (2:124) میری اولاد کے بارے میں وعدہ کرلو۔ کہا۔ جَاعِلُکَ ؕ (2:124) صرف تجھے بنایا ہے۔ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾ (2:124)

؎ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیز نیست

انسانیت اور کردار وہ وراثت میں نہیں ملتے ابراہیمؑ نے قومیت کا معیار پلٹ دیا کہا فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡ (14:36) ایک امام کی شخصیت پوری قوم کی عکاسی کرتی ہے۔ ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیۡنَ عَمِلُوا السُّوۡٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَاَصۡلَحُوۡۤا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۱۹﴾ اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیۡفًا ؕ وَلَمۡ یَکُ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاکِرًا لِّاَنۡعُمِہٖ ؕ اِجۡتَبٰہُ وَہَدٰىہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَاٰتَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً ؕ وَاِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ

اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾ (16:119-123) مقام ابراہیمی کو مصلّی یعنی نصب العین بناؤ۔ اس کا اتباع کرو کیسا حسین ماڈل خالق نے خود قرآن میں محفوظ کر دیا۔

اب روایات کی شکل میں اس حسین وجمیل ماڈل کے بالکل برعکس:

اب یہ ماڈل ان روایات کے ہتھے چڑھ گیا۔ تو اب ان کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ماڈل ملاحظہ کریں۔ یہ ان کا ظلم ملاحظہ کریں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا تھا کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ (2:260) یعنی جو قوم مردہ ہو تو اس کو زندہ کرنے کا طریقہ کیا ہو گا؟ پوچھا کیا تیرا اس بات پر ایمان ہے کہ نہیں کہ وحی سے مردہ قوموں کو زندہ کیا جا سکتا ہے اس نے کہا کہ یقین کیوں نہیں ہے اس سے پہلے بادشاہ سے مناظرہ میں اس نے یہ دلیل دی تھی کہ میرا خدا وہ ہے کہ جو زندگی اور موت دیتا ہے تو اس سے بڑا یقین تو ہو نہیں سکتا۔ بخاری میں ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ ہم شک کرنے میں ابراہیمؑ سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں یعنی پہلے ابراہیمؑ نے شک کیا اور دوسرا اس سے بھی زیادہ عظیم المرتبت نبی کہہ رہا ہے کہ ہمیں ان سے زیادہ شک ہے اگر ان انبیاء کرامؑ کو بھی شک پیدا ہوتا ہے تو ہم اس آسمان کے نیچے یقین کہاں ڈھونڈنے جائیں گے۔ ان دونوں کو ہمارے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا جا رہا ہے تو ہمارا تو ایمان ہی نہیں رہ سکتا جبکہ دونوں شک ظاہر کر رہے ہیں ان کے متعلق یہ بات کیسے مانی جا سکتی ہے کہ یہ بات رسولؐ نے فرمائی تھی۔ وہ تو پوری انسانیت کے لئے ماڈل ہیں اور زندگی تو یقین سے چلتی ہے۔ انہی روایات میں آگے ہے کہ ابراہیمؑ نے کہا کہ شیطان کے وسوسہ میں آ گئے تھے۔ حالانکہ خدا کہہ رہا ہے ابلیس سے کہ جو چاہے کرے میرے مخلص بندوں پر تیرا کسی قسم کا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ خدا چیلنج دے رہا ہے ابلیس کو۔ اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ ابراہیمؑ جیسے مخلص بندوں کے اوپر اس کا غلبہ ہوا۔ وسوسہ ڈالا اور وہ خدا کے متعلق شک کرنے لگے۔

دوسری روایت کہ حضرت ابراہیمؑ نے ستارہ پرستی کے جشن میں یہ کہہ کر کہ میں بیمار ہوں جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد روایت ہے کہ ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا بیمار و بیمار نہیں تھے حالانکہ اس میں عربی کا محاورہ سقیم یعنی میں بیزار ہوں یہ عربی کا محاورہ ہے ہو سکتا ہے وہ بیمار ہوں مگر یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ بیمار وغیرہ نہیں تھے۔ یہ وہاں کھڑے تھے۔ بڑے بت کو چھوڑ کر باقی کو توڑ دیا۔ پوچھنے پر کہا کہ میں نے تو نہیں کیا یہ دوسرا جھوٹ ہے۔ حالانکہ انہوں نے قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا بلکہ بَلۡ فَعَلَهٗ ۖۗ (21:63) آگے مَنۡ فَعَلَهٗ حذف ہے جو محاورتاً استعمال ہوتا ہے کہ جس نے بھی کیا اسے ابھی رہنے دو آگے کی بات کرو کہ یہ بڑا بت ہے اس سے پوچھ لو۔ تیسرا جھوٹ کہ ہجرت کے وقت سارہ ساتھ تھیں مصر میں سے گزرے تو وہاں کا بادشاہ جو بھی راستے سے گزرتا تو اس کی بیوی کو پکڑ لیتا۔ تو بیوی سے کہا کہ اگر تم سے پوچھے تو کہہ دینا کہ میں تو اس کی بہن ہوں۔ بادشاہ نے ہاتھ بڑھایا تو وہ پتھر کا ہو گیا جو بھی ہے مگر جھوٹ بلوانا تو ضروری تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا۔ ان کے لئے تو قرآن نے خصوصاً صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا ﴿۴۱﴾ (19:41) کہا ہے جو ہمیشہ سچ بولے۔ جب تک رسول کی صداقت پر ایمان نہ لایا جائے تو اس وحی پر کیسے ایمان لایا جا سکتا ہے ورنہ وحی کا تو اور کوئی ثبوت نہیں ہوتا اور دلیل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور ہم کہتے ہیں کہ تو سچ بولتا ہے اور اگر نبی کے متعلق بھی یہ ہو جائے کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے تو پتہ نہیں کہ وہ کن کن باتوں میں پھر جھوٹ بولتا ہے اس طرح رسولؐ پر بھی انہوں نے

تین جھوٹ بولے۔ باندھا ہے کہ پہلے دو جھوٹ دین کی خاطر اور ایک جھوٹ اپنی بیوی کی عزت بچانے کے لئے بولا تھا۔ اس میں نظریہ ضرورت آ گیا۔ بخاری میں ہے اب جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے کہ اگر دین کی خاطر تھا تو اس پر تو فخر ہونا چاہئے کہ قیامت میں گناہ گار سفارش ڈھونڈیں گے تو آدمؑ سے لے کر ہر نبی کے پاس جائیں گے مگر ایک ایک اپنے گناہ کا اعتراف کرے گا اور شرمائے گا جانے سے۔ ابراہیمؑ کہیں گے کہ میں نے وہ جو جھوٹ بولے تھے اس کی وجہ سے شرم آتی ہے بجائے اس کے کہ وہ دین کی خاطر تھے فخر کرتا۔ یہ ہے اسوۂ حسنہ جو یہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ اس سے اپنے جھوٹ کے لئے بوقتِ ضرورت تائید اور سند لیتے ہیں۔

آگ میں جلانے کا افسانہ:

حالانکہ ''وہ پکڑو جلا دو'' آتش انتقام تھی جس کو وہ اس طرح سے بھڑکا رہے تھے اور ہم نے ان کی اس سازش کو ناکام کر دیا اور ابراہیمؑ کو وہاں سے نکال لائے۔ اب یہ آئے کہا کہ ایک میل لمبا ایک میل چوڑا اور آدھا میل اونچا الاؤ تھا۔ کتنے عرصہ تک ساری قوم اور عورتیں باہر سے لکڑیاں لا کر اس الاؤ میں ڈالتے رہے۔ اب آگ نہ جلے تو ایک گرگٹ آیا اس نے پھونک ماری تو اس سے آگ لگی۔ تو اس لئے حدیث ہے کہ جونہی گرگٹ نظر آئے تو فوراً مار دینا یہ ہے وہ مِثۡلَهٗ مَعَهٗ (39:47) کی اسوہ حسنہ۔ پھر وہ اس آگ میں چالیس دن تک رہے اور وہ پھول بن گئی۔ ذبح عظیم۔ تعمیر کعبہ کے لئے قرآن نے ذِبۡحٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۰۷﴾ (37:107) کہا ہے کہ اسماعیلؑ کو اس مقصد کے لئے رکھا گیا تھا۔ ہاجرہؓ کنیز اور سارہؓ بیوی تھیں تو دونوں میں رقابت تھی۔ سب سے پہلے جس عورت نے گھا گھرا پہنا وہ منکوحہ بیوی سارہ تھیں اور یہ ہاجرہ کنیز تھی جو سارہ نے تحفہ میں دیا تھا۔ سارہ بے اولاد نہیں تھی۔ ہاجرہ کے ہاں اسماعیلؑ پیدا ہو گئے۔ سارہ کی رقابت کی وجہ سے ابراہیمؑ مجبور ہو کر حاجرہ اور 6 ماہ کے بچہ اسماعیلؑ کو لے کر چل پڑے ایک صحرا میں جھاڑی کے پاس ان کو بٹھا دیا۔ پانی کا مشکیزہ اور تھوڑی سی کھجوریں۔ اب ابراہیمؑ ان کو اس وادی میں چھوڑ کر جا رہے ہیں کہ جہاں نہ کوئی غمخوار ہے نہ انسان۔ کوئی آدمی اور کوئی آبادی نہیں ہے۔ خوراک اتنی جو دو دن میں ختم ہو جائے تو کہا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں کہا کہ اللہ کا حکم ہے۔ پھر جو پانی ختم ہوا تو بچہ کو جھاڑی کے سائے میں لٹاتی تھی اور بھاگی بھاگی اس ٹیلہ پر جاتی کہ دور دور دیکھوں کہ کہیں پانی ملے پھر بچہ روتا تھا تو بھاگی ہوئی آتی تھی۔ اس طرح سے وہ بار بار جاتی تھیں۔ یہ صفا و مروہ سنّت حاجرہ ہے۔ جو بھاگ بھاگ کر پوری کرتے ہیں۔ فرشتہ آیا تو اس نے ایڑیاں رگڑنے سے آب زم زم کا چشمہ پیدا ہو گیا۔ حالانکہ کعبہ کی تعمیر کے لئے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡىَ (37:102) اور یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ چھ ماہ کے بچہ کو یہاں لے آیا۔

روایات میں امام النّاس بننے کی ابتلاء:

وہ تمام آزمائشوں میں سے گزر کر پورے اترے تو اسے شاباش دی کہ تم اب امام الناس ہو۔ ابن کثیر میں ہے کہ حکم یہ تھا مونچھیں سامنے سے ترشوانا، کلی کرنا، ناک صاف کرنا، مسواک کرنا، سر کے بال منڈوانا یا لمبے چھوڑنا، ناخن ترشوانا، استنجا کرنا، جمعہ کے دن غسل کرنا۔ یہ احکامات تھے ان پر خدا نے امام الناس بنا دیا۔ اگر حضورؐ کا اسوہ بھی ان روایات کی رو سے پیش کیا جائے تو انہوں نے اس عظیم المرتبت ہستی کا پاکیزہ دامن بھی جگہ جگہ سے داغدار کر دیا ہے۔

؎ سینۂ تمام داغ داغ، پنبہ کجا کجا نہم

کائنات میں ہر آن تغیرّ اور حرکت ہے

اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡكًا ؕ (29:17)

وَثَنٌ جمع اَوۡثَانٌ۔ ہر وہ شے جو جامد ہو کر رہ جائے اس میں حرکت نہ رہے وہ آگے نہ بڑھے، جموّد ہو تو وثن ہے یہ تو بہت بعد میں جب دوسری قوموں کے ہاں دیکھا کہ پتھر کی مورتی ہے وہ ایک جگہ جمی رہتی ہے ہٹتی نہیں ہے تو مجازی طور پر ہر اس شے کو جو ایک مقام پر جمی رہے اور حرکت نہ کرے تو اس کو وثن کہنا شروع کیا۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہی نہیں ہیں۔ (یعنی بت) بنیادی معنی جموّد کے ہیں زندگی تو حرکت نمود اور تحرک چاہتی ہے جہاں جموّد پیدا ہوا تو سمجھ لو کہ زندگی ختم ہوگی۔ یہ کائنات میں تمام اشیاء میں نظم وضبط اس ارتقاء کی وجہ سے ہے اس آیت میں یہ عظیم حقیقت کہی گئی ہے۔ یَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ ۚ﴿۲۹﴾ (55:29) خدا اس ارتقاء سے ماوراء ہے ایسا نہیں کہ بچہ سے بڑا ہو کر جوان ہوا اس کے بعد بوڑھا ہو جائے گا اس نے ہر شے کو فَانٍ ۖ﴿۲۶﴾ (55:26) هَالِكٌ (28:88) کہا ہے كُلُّ شَىۡءٍ هَالِكٌ (28:88) ہر شے تغیرّ پذیر ہے سوائے وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ ۚ﴿۲۷﴾ (55:27) یہ قوانین اس کے ہیں جو تغیرّ ات سے ماوراء ہے اور ہر قسم کی عظمت وتکریم کا مالک۔ ان غیر متبدّ ی قوانین کے اندر ارتقاء اور حرکت ہے جو رک گیا تو موت ہے۔

؎ نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا　　کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

مذہب بھی تو وثن ہے جس کی ایک ہزار سال سے پرستش کر رہے ہیں سلف صالحین کا اتباع یہ جموّد ہے اس کا نام وثن ہے۔ فقہ میں تو تفقہ حرام ہے یعنی غور وفکر۔ وہ جس نے سب سے پہلے تفقہ مانگا اسے ابلیس کہتے ہیں کیا غاروں میں رہنے والے ہمارے اسلاف نہیں تھے۔ ان کا اتباع کیوں نہیں کرتے۔ ورنہ اسلاف کا مسلک تو غاروں میں رہیے۔ یہ ہے وثن۔ حرکت نمود اور ارتقا تو مردے میں نہیں ہوتا زندگی تو حرکت اور تغیرّ آگے بڑھنے کا نام ہے۔

؎ دما دم نقش ہائے تازہ ریزد　　بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروز تو تصویرِ دوش است　　بخاک تو شرارِ زندگی نیست

اگر آج آپ کے گزرے ہوئے کل کا فوٹو ہے تو راکھ کا ڈھیر ہے کیونکہ زندگی تو نقش ہائے تازہ ریزد کا دمادم ارتقاء وعمل تو جنّت میں بھی نہیں رکتا۔ حیات تو حرکت کا نام ہے حَيَّةٌ (20:20) سانپ کنڈلی مار کر بیٹھا تو ہے مگر ذرا اسے چھیڑ کر دیکھئے کس طرح سے وار کرتا ہے۔

ے زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود ایں مے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

جنّت کی کہانی اقبالؒ کی زبانی،تغیرّ سے متعلّقہ،
جنّت میں حور مخاطب ہے وہاں حسن ورعنائی کمال پر ہے:

ے نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی عجب ایں کہ تو ندانِ رہ و رسمِ آشنائی
چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد دلِ ناصبورِ دارم چوں صبا بہ لالہ زارے
چوں نظر قرارِ گیرد بہ نگارِ خوبروئے تپدآں زماں دلِ من پئے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے سرِّ منزلے ندارم کہ بمیرم ازِ قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد بہ نگاہِ نا شکیبے بہ دلِ امید وارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے نہ نوائے دردمندے، نہ غمے، نہ غمگسارے

وائٹ ہیڈ (1881-1974) کتاب کا نام ہے’’Adventures of Ideas‘‘بت پرستی کی بنیاد یہ ہے کہ تم اپنے پیش یا افتادہ دیوتاؤں سے مطمئن ہوجاتے ہو یہ ہے وثن جس کا ترجمہ بت پرستی کرلیا گیا ہے۔کہتا ہے کہ جونہی پیچھے کی طرف چلوتو زوال آ جاتا ہے۔کائنات کی کوئی شۓ بھی مکمل ہوکر اپنے مقام کے اوپر کھڑی نہیں ہے یاتو عرّوج ہوگا یا زوال ایک مقام پر کھڑے ہو نہیں سکتے۔ایسا سمجھنا فریب نفس ہے صرف انسان کے سامنے ارتقا یعنی عرّوج یا زوال ہے۔قدامت پرستی میں ایک مقام پر،تمہارے مطابق کوئی چیز کسی تکمیل تک پہنچ گئی تھی جو اسے گلے سے لگا کر کھڑا ہوجاتا ہے تو یہ فطرت کے خلاف اعلان جنگ ہے۔یادرکھو اگر وہ شۓ جس نے ایک شکل اختیار کرلی تھی خواہ کسی مکمل ترین زمانے کی ہو آپ اس کو آگے بڑھاتے رہے تو یہ آہستہ آہستہ تکرار Cycle میں آجاتے ہیں۔آگے بڑھ نہیں رہی ہوتی۔ایک قدم بھی دائرے میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔دین کے یہ حقائق اگر ایک دور میں جن شکلوں میں نمود ہوئی تھی ان کے لئے اس طرح سے دہراتے چلے جاتے ہیں تو یہ اعادہ Repitition ہے اس میں تو آگے بڑھ نہیں سکتے۔قرآن نے صراط مستقیم کہا تھا۔دائرہ نہیں۔یہ تو یونانی آواگون کا فلسفہ تھا۔تو یہ رسومات،مناسک کسی دور کے ہوں ان کا اعادہ صرف نمائش ہوتی ہے ان میں حقیقت نہیں ہوتی۔کسی بھی دور کے کارناموں کو شاندار قرار دینے کا معیار یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ماضی سے آگے بڑھ کر کچھ کیا تھا۔ورنہ ان کا وہ دور شاندار نہ کہلاتا۔سارے دارالعلموں میں یہ رٹا یا جاتا ہے۔Passive knowledge ماضی کا جو کوئی رمق پیدا نہیں کرتا۔ایک زندہ تہذیب کے لئے علم کی بھی ضرورت ہے لیکن یادرکھو! وہ ان معلومات سے آگے کی بات ہوتی ہے جسے تہذیب کہتے ہیں۔

قرآن نے جو وثن کی معبودیت سے روکا تھا تو وہ جموّد اور تعطّل خواہ کسی دور کا ہو اسے چھوڑ دو۔جو آگے نہیں بڑھتا تو سمجھ لو کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔زندگی کے فرسودہ پیکروں کو گلے لگائے رکھنا تنزّل اور تسفّل ہے جو تہذیب ہمت کرکے آگے نہ بڑھے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے۔

صدیوں سے مسلمانوں کی حالتِ زار:

اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا (29:17)۔ تم لوگ وثن کے اوپر جم کر بیٹھ جاتے ہو یہ تو موت ہے۔ گدھے کی سواری چھوڑ کر ہوائی جہاز تک آ گئے ہیں لیکن فکری طور پر مذہبی دنیا میں انہی رسوم ومناسک کے اندر اسی گدھے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں وَکُلُّ بِدۡعَةٍ ضَلٰلَةٌ وَ کُلَّ ضَلٰلَةٍ فِی النَّارِ۔ ہر نئی چیز گمراہی ہے جو جہنّم میں لے جاتی ہے۔ وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا ؕ (29:17) اور یہ ماضی کے پرستار بنانے والے اس کے متعلق افسانے وضع کرتے رہتے ہیں کہ اب ان اسلاف کی طرح کا مومن بننا ناممکن ہے حالانکہ خدا تو تمہیں حرکت اور ارتقا طرف لے جانے والا ہے تم جموّ د اور تعطّل کو خدا بنا لیتے ہو یہ کیوں کرتے ہیں؟

مَّوَدَّةَ بَیۡنِکُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۚ (29:25) یہ دنیاوی زندگی کے مفاد اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ گروہ بنا کر اسے مضبوط کرتے ہیں اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا (29:17) روٹی کی خاطر تم یہ سارا کچھ کرتے ہو۔ فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ الرِّزۡقَ (29:17) حلال روزی کی طرف آ ؤ۔ اس کے قوانین کی رو سے رزق حاصل کرو۔ پھر جتھہ بنانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پھر یہ افسانے گھڑنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

حیرت انگیز:

یہ ہیں وہ مقامات جو غور طلب ہوتے ہیں۔ زندگی نام ہے مسلسل حرکت کا آگے بڑھنا۔ جہاں کوئی شے رک جائے تو وہاں زندگی نہیں رہتی بلکہ موت رہتی ہے اس کے بعد یا تو وہ کیفیت اعادہ (Repitition) کی رہ جاتی ہے۔ اس طرح سے زندگی اپنے آپ کو دہراتی چلی جاتی ہے یعنی دائرے کے اندر چلتی چلی جاتی ہے یا پھر وہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات حضرت ابراہیمؑ نے قوم سے اتنے قدیم کے زمانے میں کہی اب اس کے لئے وہ دلیل مانگتے ہیں۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے یہ بات اگر واقعی خدا کی طرف سے نہ ہو تو آج کا بڑے سے بڑا اسکالر بھی یہ بات نہ کہے کہ واقعی یہ بات اس زمانے میں کہی تھی۔ جس طرح مورس بوکائے نے قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لئے جس ثبوت کی بناء پر کہا کہ واقعی یہ انسان کی کتاب نہیں ہو سکتی کہ یہ بات تو پچھلی صدی میں بھی نہیں کہہ سکتے تھے جو قرآن نے چودہ صدیاں قبل کہی اور ہمارے ایمان کی رو سے یہ چھ ہزار سال قبل وحی نے کہی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے جہاں حرکت رکے تو زوال یا موت ہوتی ہے اس کا کیا ثبوت ہے؟ اور تم کہتے ہو کہ زندگی اسلاف کی اطاعت کا نام ہے یہ تو جموّد ہے یہ تو موت ہے۔ زوال ہے۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰهُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ ﴿۱۹﴾ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنۡشِئُ النَّشۡاَةَ الۡاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿ۚ۲۰﴾ (29:19-20) کیا اس چیز پر غور نہیں کیا کہ تخلیق کی ابتداء کیسے ہوئی۔ پھر وہ موجودہ شکل تک کیسے آ گئی۔ یہ مسلسل حرکت کا نتیجہ ہے جا کے ذرا ریسرچ کرو کہ جو چیز پیدا کی گئی اس کی ابتدائی شکل کیا تھی پھر ہر مرحلہ میں وہ بہتر سے بہتر ہو کر اور زیادہ بلند ہوتی گئی۔ تا آنکہ وہ اس موجودہ انسانی شکل میں آ گئی۔ گردشیں دیتا ہوا بڑھا یا تو یُنۡشِئُ النَّشۡاَةَ الۡاٰخِرَةَ ؕ (29:20) ایک اور مخلوق پیدا ہو گئی۔ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ ﴿۱۹﴾ (29:19)۔ یہ اس کے قوانین کے لئے بڑی آسان سی بات ہے۔ یہ ذرۂ ناچیز ان مراحل

سے گزر کر، حرکت کرتے ہوئے ارتقا کی رو ایک اور پیکر اندر آ گیا اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۰﴾ (29:20)۔

اب اگر مزید نشاۃ ثانیہ چاہتے ہوتو وہ ان قوانین کے ذریعہ ہوگا۔ اب چھ ہزار سال قبل قرآن بتا رہا ہے حضرت ابراہیمؑ نے کہا قوموں کی زندگی حرکت میں ہے۔ اسلاف کی تقلید تو جموّد ہے۔ مٹ جاؤ گے، پیچھے رہ جاؤ گے۔ اب یہ ثبوت یورپ کے سائنسدان دے رہے ہیں۔

ے ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
حیاتِ شعلہ مزاج و غیور و شعلہ انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکش زم و گرما، تپ و تراش و خراش
ز خاک تیر دروں تابہ شیشۂ حلبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیساں و آتش عنبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی
تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن حرام است
اگر از دست تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

تصوّر و مبادیات صلوٰۃ و ذکر

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ (29:45)

الصّلوٰۃ:

قرآن الصّلوٰۃ کہتا ہے اور ہم نماز۔ ایرانیوں نے کانٹا ذرا بدلا تو دوسری پٹڑی پر چڑھ گئے۔ پھر جتنا تیز رفتاری سے انجن چلے گا منزل سے دور ہوتا جائے گا۔ صلیٰ سے مراد کسی کے پیچھے اس طرح چلنا کہ اس سے آگے نہ بڑھے اور دونوں کے درمیان فاصلہ بھی نہ رہے۔ ساتھ کے ساتھ جار ہا ہو۔ ریس میں دوسری نمبر کا گھوڑا اس کی کنوتیاں اگلے گھوڑے کی پشت کے ساتھ تو لگی رہتی تھیں مگر یہ اس سے آگے نہیں بڑھتا تھا اور ان میں انقطاع بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ دوسرے نمبر کے گھوڑے کو مصلّی کہتے تھے۔ اس گھوڑے کے سامنے منزل مقصود بھی ہوتی ہے۔ پہلے نمبر کو Follow کرتا ہے تو اس میں اتباع آ گیا۔ ایک منزل، ایک نصب العین ایک خاص راستہ جس کی طرف وہ چلتا ہے۔

تسبیح کا مفہوم:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (24:41) خارجی کائنات میں تمام چیزیں خدا کے پروگرام تک پہنچنے کے لئے تسبیح کرتی ہیں۔ یہ گھوڑا جو اگلے گھوڑے کے اتباع میں منزل مقصود کی طرف جار ہا ہوتا ہے ریس میں تو گھوڑا اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیتا ہے یعنی انتہائی درجہ کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح سے تیراک، پورے ہاتھ پھیلا کر تیرتا ہے۔ یہ تسبیح کہلاتی ہے۔ یعنی صلوٰۃ اور تسبیح کرنے والا گھوڑا۔ اپنی منزل مقصود کی طرف کسی کے اتباع میں چلنے والا، پوری کوشش اور توانائی کے ساتھ چلے تو یہ صلوٰۃ و تسبیح ہے۔ یعنی کائنات کی ہر شے خدا کے پروگرام کے لئے معروف تسبیح یعنی پوری پوری توانائیاں صرف کر کے اس منزل تک پہنچنے کی کوششوں میں مصروف کار رہے یہ ہوگئی تسبیح وَالطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسۡبِیۡحَہٗ ؕ (24:41) ہر ایک اپنی صلوٰۃ اور تسبیح جانتا ہے۔ پرندے روزانہ سینکڑوں میل کا سفر کر کے شام کے وقت گھونسلوں میں کوئی راستے میں سڑک نہیں، نشان نہیں، کوئی بتانے والا نہیں، کتنی تیزی سے اپنی منزل تک پہنچتے ہیں۔ مہاجر پرندے آسٹریلیا کے کسی مقام سے اڑتے ہیں۔ تین ہزار میل کا فاصلہ سمندر کے اوپر طے کرتے ہیں۔ ان کے بچے جب اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو انہی راستوں پر ان کے

پاس پہنچ جاتے ہیں۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ط (24:41) اس طرح سے شہد کی مکھیاں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر شہد لے کر اپنے اپنے چھتوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

دلجمعی کے ساتھ صراط مستقیم پر گامزن رہنے کا عزم:

اب وہ راستہ کونسا ہے جس سے چلتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔ مصلّی ٹریک کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ اگلے گھوڑے کو دیکھ کر اس کے پیچھے چلتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ (1:5) کیا ہے؟ یہ بڑی آرزو ہے یہ وہ حرکت کولہو کے بیل کی نہیں ہے۔ یہ صراط مستقیم تو کسی منزل تک پہنچاتا ہے۔

محض حرکت تو آوارگی ہوتی ہے وہ سفر نہیں ہوتا وہ تو وہیں کا وہیں رہتا ہے جہاں سے چلتا ہے۔ صلوٰۃ میں تو منزل مقصود سامنے ہے اس تک پہنچنا ہے۔ اب یہ راستہ سامنے آ گیا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ (11:56) میرا رب صراط مستقیم پر جا رہا ہے اس کے پیچھے چلو۔ اب پہلے نمبر کا گھوڑا سامنے آ گیا۔ یعنی اس سے آگے نہیں جانا۔ صفات خداوندی پیدا کر کے چلتے جانا اتباع خداوندی ہے۔ یعنی اس کے مقرر کردہ راستہ پر اس کے پیچھے چلنا۔ صلوٰۃ تو ایک متعین راستے پر ایک منزل تک پہنچنے کا نام ہے۔ اس میں خدا کا اتباع یعنی اس کے قوانین کا اتباع ہے۔ اب اس کے مقابلہ میں اپنے جذبات مفاد والے انبیاء کے بعد فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (7:169) ان کے اور ناخلف آئے تو اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ ﴿۵۹﴾ (19:59) انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا کون تھے وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (19:59) اپنے جذبات کا اتباع کرنا تباہی و بربادی ہے۔ خودساختہ نظام کا اتباع ہے یہ۔

اقامت صلوٰۃ کے لئے پہلی چیز تمسّک بالکتاب ہے

نماز میں تو ایک خاص وقت کے اوپر رکعت، ارکان اور کچھ پڑھنا ہے۔ مگر کہتا ہے کہ یہ خاص وقت کے اوپر کچھ کرنے کی بات نہیں ہے۔ وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ط (7:170) پوری زندگی کے دور میں قرآن کے ساتھ متمسک رہنا ہے۔ یہ ہے اقامت صلوٰۃ۔ یہ تو خلا نہیں ہوگا بلکہ چپکے رہنا ہے۔ قرآن میں کہیں بھی نماز پڑھو کا لفظ ہی نہیں بلکہ صلوٰۃ کو قائم کرنے کا حکم ہے۔ تو تمسک بالکتب نہ ہو تو کیا انفرادی طور پر یا غیر مسلموں کی حکومت میں الصلوٰۃ قائم کی جاسکتی ہے؟ اس کے لئے تو تمکن فی الارض کی شرط ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ (22:41) اس جماعت کو ملک میں تمکن حاصل ہو گیا۔ اپنی گورنمنٹ مل گئی تو پھر صلوٰۃ کا نظام قائم ہوسکتا ہے۔ یہ تو غیر قرآنی مملکت میں بھی ممکن نہیں۔ خواہ وہ مسلمانوں کی اپنی مملکت ہو یا غیر مسلموں کی۔ اس کے لئے تمکن فی الارض شرط ہے۔ یہ نماز پڑھنا تو نہ ہوا۔ ایک اور جگہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص (24:55) یہ حکومت کا ہے کے لئے ملے گی؟ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (24:55) تو مملکت کا

ملنا دین کے تمکن کے لئے ہے۔ مملکت تو مقصود بالذات نہیں ہے تو کیسے پتہ چلے گا کہ دین کا تمکن ہو گیا؟ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (24:55) پہلی چیز یہ ہو گی کہ کسی قسم کا خوف باقی نہیں رہے گا۔ ہر ایک کو اطمینان ہو گا۔ اگلی بات يَعْبُدُوْنَنِيْ (24:55) اطاعت صرف قرآن کی ہو گی۔

لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ (24:55) یہ بھی نہیں کہ کچھ تو میرے قوانین اور کچھ انسانوں کے بنائے ہوئے۔ یہ تو شرک ہو گا۔ اس میں اس کی اجازت نہیں ہو گی۔

صدیوں سے زبوں حالی کی وجہ:

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (24:55) مملکت تو ہو گی مگر شمار فاسقوں میں ہو گا۔ مومنوں میں نہیں۔ اگر كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ (24:55) نہ ہو تو وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (24:56) یہ صلوٰۃ قائم کرو تو یہ کفر بعد اسلام نہیں ہو گا۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (24:56) یہ ہے اس کا مقصد۔

وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (24:56) مملکت کا سربراہ ہے اس کی اطاعت کرو۔ اس کے بعد جو ان کے جانشین ہوں ان کی اطاعت کرو۔ یہ صلوٰۃ تو دین کا مرکز ہے۔ اس کی تفصیل قرآن نہیں دے گا تو کس چیز کی دے گا۔

فرقوں کی موجودگی میں نماز تو پڑھی جاسکتی ہے لیکن نظام صلوٰۃ قائم نہیں ہو سکتا۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (30:31) نظام صلوٰۃ قائم کرو وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (30:31) اس اسلام کے بعد مشرک نہ ہو جانا بتوں کو پوجنا شرک نہیں ہے۔ سنو شرک کیا ہے؟ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (30:32) صلوٰۃ قائم کرو تا کہ امت فرقوں میں نہ بٹ جائے۔

نظام شورائیت:

یہ صلوٰۃ کے لئے حاضر ہو جاتے ہیں وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ (42:38) باہمی مشاورت کرتے ہیں۔

دورِ اولیٰ میں نظام صلوٰۃ پر عمل پیرائی کے خدوخال:

یہ اجتماع کے اندر رکعتوں والی صلوٰۃ ایک چھوٹی سی شق تھی کہ مجلس کا آغاز، مشاورت کا آغاز اس کے نام سے کرنا تھا۔ نظام صلوٰۃ تو دین کا قیام ہے۔ یہ نماز تو ایک ہلکی سی شق تھی۔ یہ اس کی محسوس شکل تھی۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (29:45) یہ تو خود بخود فَحْشَآءِ اور منکر کو روک دے گی فَحْشَآءِ یعنی بخل یعنی وہ جذبہ جو کہے کہ اپنی ذات کے لئے رکھو۔ جب یہ نظام ضمانت دے رہا ہے ساری عمر کے لئے تو پھر کسی کو بخل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور وَالْمُنْكَرِ ؕ عقل کی فریب کاریاں کہ دوسروں کو فریب دے کر سب کچھ سمیٹ لو۔ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (29:45) ذکر کا قرآنی مفہوم اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (29:45) اَكْبَرُ سے مراد یہ

نہیں ہے کہ وہ اس سے بہتر ہے یا اس سے کوئی اور چیز ہے۔ اَکْبَرُ کے معنی کبریائی۔ اقتدار مطلق، یعنی اعلیٰ درجہ جس کے اوپر کوئی اور نہ ہو۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (45:37)۔ یعنی جس کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہو جس کے اوپر کوئی دوسرا حاکم نہ ہو۔ ذکر کسی شے کو محفوظ کر لینا اور سب سے بڑی حفاظت یہ ہے کہ وہ چیز ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہاں محفوظ ہے۔ اپنی جگہ موجود ہے۔ تو کسی شے کا ہر وقت نگاہ کے سامنے رہنا ذکر کے ثانوی معنی ہو گئے۔ جس شے کے اندر وہ چیز موجود ہو تو اسے بھی ذکر کہتے ہیں۔ اس لئے قرآن کو بھی ذکر اللہ کہا گیا ہے۔ تو کس کی حفاظت ہو رہی ہے۔ اصول اور قانون کو بھی ذکر کہا جاتا ہے۔ قوانین خداوندی کی حفاظت کرنا ہر مومن کا فریضہ ہے۔ یہ ہے ذکر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مشن اور ذکر کا فریضہ:

اب قرآن صلوٰۃ اور ذکر کو محسوس شکل میں لا رہا ہے۔ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿١٣﴾ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ (20:13-14) کیسے اطاعت کی جائے قوانین کی۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ (20:14) صلوٰۃ قائم کرو۔ کس مقصد کے لئے لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ (20:14) تو ذکر کیا ہے؟ قرآن سے پوچھتے ہیں۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ (20:14) تو لِذِكْرِيْ کے لئے کیا کرنا ہوگا۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا (20:15) یعنی ہمارے ذکر کے لئے صلوٰۃ قائم کرو تا کہ وہ زیر زمین انقلاب ابھر کر سامنے آ جائے۔ اور انقلاب کا ہے کے لئے لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿١٥﴾ (20:15) یاد رکھنا فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿١٦﴾ (20:16)۔ یہ ذکر اللہ اکبر کرنا ہے تو نہ صرف ان کے ہاتھوں سے ہو سکتا ہے جن کے ذاتی مفادات اور خواہشات نہ ہوں۔ یہ ہے پہلی شرط تو وہ صلوٰۃ قائم کر سکتے ہیں اور صلوٰۃ بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہے۔ مقصد تو ذکر اللہ کو کرنا ہے تا کہ قانون خداوندی کی کبریائی قائم ہو جائے۔

روزوں کا مقصد وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185) مومن کی زندگی کا مقصد ہی اس کے قوانین کی کبریائی قائم کرنا ہے۔ ایک جگہ کہا کہ یہ خدا کے منکر نہیں ہیں بلکہ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ (40:12)۔ یہ خدا کے منکر نہیں ہیں بلکہ حکمرانی صرف خدا کے قوانین کی سے انکاری ہیں۔ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (40:12) ساتھ اور انسانوں کے قوانین لے آؤ تو پھر تم ایمان لاؤ گے۔ یہ شرک ہے پھر اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ صرف خدا کا نام رہ جاتا ہے۔ غلبہ سارا اس شرک کا ہوتا ہے۔ کیا ان سے کہو یہ غلط ہے۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ (40:12)۔ حکمرانی صرف اللہ کی اور الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿١٢﴾ (40:12) کبریائی بھی اسی کی وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (29:45) اَکْبَرُ کے معنی ہوئے حکمرانی کے۔ کبریائی صرف اسی کے قوانین کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدد مانگی ساتھ بھائی کا ساتھ بھی تا کہ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ (20:33) تا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ توانائیاں صرف کریں۔ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ (20:34) تیری کبریائی کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کریں۔ دوسری جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جاؤ فرعون کی طرف وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾ (20:42) میرے پروگرام کے عمل میں سستی نہ کرنا۔

جنگ بدر میں ملاحظہ کریں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً (8:45) ان سے جب مقابلہ ہو تو فَاثْبُتُوْا

(8:45) ثابت قدم رہو اور وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (8:45) اور قوانین خداوندی کو شدت سے سامنے رکھو۔

کائنات پر غور و فکر کو ذکر کہا گیا:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ (3:190) کون ہیں یہ اولو الباب، الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (3:191) کا ذکر کرتے ہیں وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ (3:191-192) یہ وہ تباہی ہے جو قوم بھی اس سے دو چار ہو جائے تو دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتی ہے ہمیں اس تباہی سے محفوظ رکھنا۔ اب یہ عقل و بصیرت کے میدان میں غور و فکر، تحقیق، ریسرچ تا کہ کائنات کی مخفی قوتوں کو مسخر کر کے بہتری کے لئے استعمال کیا جا سکے۔

قرآنی قوانین کو ذکر کہا گیا ہے:

تمام قوانین خواہ کائنات یا میدان جنگ یا قرآن میں مجموعہ قوانین، ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ (21:50) یہ مجموعۂ قوانین خداوندی برکت ہے۔

ذکر سے مراد شرف وعزت و بلندی لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ (21:10) اس میں تمہارا ہی شرف اور عزت ہے۔ کوئی شے جتنی قیمتی ہوگی اس کی حفاظت اتنی ہی شدت سے ہوگی۔ عرب اس چیز کی شدت سے حفاظت کرنے کو ذکر کبیر کہتے تھے۔ یعنی شدت کی حفاظت ان کے ہاں بھی شرف انسانیت اور عزت سب سے قیمتی متاع ہیں۔ اس لئے وہ اس کے لئے بھی ذکر کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ مذکر اس سے ہے۔ یہ صاحب شرف انسان کے لئے بولا جاتا تھا۔ یہ انسان کے لئے نہیں بولا جاتا تھا۔ جس طرح ہم مذکر و مونث بولتے ہیں تو ذِكْرُكُمْ ۭ (21:10) سے مراد تمہارا ہی شرف و عزت و مجد ہے۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ (23:71) ضابطۂ قوانین دیا جس میں ان کی عزت اور شرف کا راز مضمر تھا مگر فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾ؕ (23:71) یہ اپنے ہی شرف وعزت سے گریز کر رہے ہیں۔

کیا ان کے لئے قرآن کافی نہیں ہے؟ کہتے ہیں قطعاً نہیں۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124) پھر وہ دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ (2:152) میرا ذکر کرو۔ اَذْكُرْكُمْ (2:152) تو میں تمہیں بلندیاں عطا کروں گا۔ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ؑ (2:152) جو دیا ہے اسے مت چھپاؤ۔

کیا قرآن کافی نہیں ہے

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ (29:51) یہ قرآن کیا کافی نہیں ہے۔ چھاتی پر ہاتھ مار کر

کہتے ہیں کہ یہ بالکل کافی نہیں ہے۔ کافی کیا!! یہ تو کہتے ہیں یہ کچھ ہے ہی نہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے وفات نبویؐ پر فرمایا کہ حَسْبُنَا کِتٰبُ اللّٰہِ پتہ نہیں کہ یہ ٹکڑا ان کی تاریخ میں کیسے آ گیا۔ ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا مَنۡ لَّمۡ یَتَغَنَّ بِالۡقُرۡاٰنِ فَلَیۡسَ مِنَّا۔ جس کو قرآن دوسری چیزوں سے مستغنی نہ کردے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہے۔ غَنٰی غ کی زبر کے ساتھ ہو تو اس کے معنی مستغنی کر دینا اور غ کی زیر کے ساتھ غِنٰی گانے کو کہتے ہیں یعنی مُغۡنِیٌّ گانے والا۔ تو ترجمہ ہو گیا کہ جو قرآن کو گا گا کر نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

یہ ہے تماشہ جو انہوں نے بنایا ہوا ہے تو تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو تو ان کی تجدید اس قوم میں پھر نہیں ہو سکتی۔

"The verdict of history is that worn out ideas have never risen to power among a people who have worn them out"

وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۷﴾ (29:47) جو بھی اس سے انکار کرے۔ چاہتے یہی ہیں کہ اس پر پردے پڑے رہیں۔ وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۹﴾ (29:49)۔

کٹ حجتیاں تو وہ کرتے ہیں جو اس چیز کو اس کے اصل مقام پر نہیں رکھتے۔ بلکہ اس کے ساتھ مِثۡلَہٗ مَعَہٗ (39:47) بھی لگا دیا۔ معہ تو پیچھے چلا گیا اب سارا کچھ مِثۡلَہٗ (39:47) ہو گیا۔ یہ ہیں ظٰلِمُوۡنَ جھوٹ کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ سچ کے لباس میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی باتوں کو سچا کہے (جھوٹی باتوں کو) اور اٹھتے وقت یہ کہے کہ میں نے جھوٹ کہا تھا تو اس کی سازش ناکام ہو جاتی ہے وہ کبھی کسی جگہ بھی نہیں کہے گا کہ میں نے جھوٹ کہا تھا وہ سچا بن کر آئے گا تو لوگوں کو فریب دے سکے گا۔ یہ تھی ان کی چال کہ اپنے جھوٹ کو دین کے سچے لباس میں پیش کریں۔ زبان وہی جس میں قرآن نازل ہوا مگر مفہوم بدل دیا۔ وہ تمام ارکان صوم وصلوٰۃ وذکر وحجّ شکلیں اس طرح سے قائم رکھ کر ان کا مقصود ومفہوم بدل کر رکھ دیا تا کہ لوگ مطمئن ہو جائیں۔

قرآن کے معاشی نظام کی دلکش مثال

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٠﴾ (29:60)۔

کتنے ذی حیات ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے ہوتے ہیں یا ذخیرہ کرتے ہیں ان سب کو خدا کے کائناتی قانون ربوبیّت سے رزق ملتا ہے۔ اگر تم بھی یہ انفرادی لوٹ کھسوٹ اور ذخیرہ اندوزی چھوڑ دو تو تم کو بھی اسی طرح رزق ملتا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ سب کی سنتا اور ہر کسی کی ضروریات سے واقف ہے۔ اس آیت میں باطل کا نظام اور صحیح معاشی نظام کی مثال اس آیت سے واضح کر دی ہے۔ اس باطل کے نظام میں بھوک کا سماں پھیلا ہوتا ہے کیونکہ جو کسی کے ہاتھ آیا تو اس نے سمیٹ کو اپنے لئے رکھ لیا۔ یہاں معاملہ ضروریات کا نہیں ہے بلکہ جس کے ہاتھ میں قوت واقتدار ہو وہ دوسروں کا حصّہ سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ بارٹر سسٹم میں تو پھر بھی اس کا امکان بہت تھوڑا سا تھا یعنی اس جنس کو سنبھال کر رکھنا ہوتا تھا۔ بارٹر سسٹم میں اس قسم کے طبقاتی امتیاز پیدا نہیں ہوتے تھے۔ اگر کسی کے پاس غلہ زیادہ ہو گیا تو زیادہ غلہ والا تیلی کو دے کر وہاں سے تیل لے لیتا تھا۔

سکّہ اور ابلیسی اثرات:

یہ مسئلہ جب سے ایجاد ہوا ہے دنیا کا پہلا سکہ ''The laydian lion'' جو 600 ق م میں بادشاہ Alyaltes نے ایشیا کو چک (موجودہ ترکی) نے بنوایا تھا اس زمانے میں چین نے بھی پہلا سکہ بنایا۔ 550 ق م قدیم یونان نے۔ تو یہ ایجاد ایک ضرورت کے لئے ہوا تھا کہ کون من بھر غلہ اٹھائے پھرے۔ اس کی بجائے ایک روپیہ جیب میں ڈال دیا تو برابر ہو گیا۔ یہ ضرورت پھر ایک ابلیسی نظام کی شکل اختیار کر گیا۔ اب تو ضرورت کی کوئی حد نہ رہی۔ اب کروڑوں اربوں روپیہ سمیٹتے جایئے۔ جتنا سمیٹے چلے جائیں گے تو یہ دوسروں کا حصّہ ہے۔ یہ تمام طبقات اس ابلیسی لعنت نے پیدا کر دیئے ہیں۔ باطل نظام میں ہر فرد ضرورت کے مطابق نہیں لیتا۔ وہ ضرورت کے بعد فاضلہ سمیٹ کر رکھتا ہے۔ جبکہ صحیح نظام میں یہ ضرورت کے مطابق لے کر باقی دوسرے ضرورت مندوں کے لئے چھوڑ دیں۔ یہ بھوک اور افلاس اس وجہ سے ہے کہ ضرورت پوری کرنے والا ضروریات تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ فالتو کو اپنی پیٹھ پر رکھ کر چلتا ہے اور دوسرے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر یہ فطرت والا نظام ہو تو اس میں ہر ضرورت مند ضرورت کے مطابق پیٹ بھرتا ہے اور باقی سمیٹ کر نہیں رکھتا اس کو مٹانا ہے تو یہ نظام نافذ کر وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (2:219) پوچھتے ہیں کہ محنت کی کمائی سے کتنا لیں اور کتنا دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ کہا کہ ایک بیل کو

دیکھو غلہ کا ڈھیر لئے ہوتا ہے پیٹ بھرتا ہے تو اس کے بعد جگالی کرنے لگتا ہے اس کو پرواہ ہی نہیں ہوتی باقی کون لے جاتا ہے؟ دوسرا بھوکا بیل آ کر اس کو کھا لیتا ہے۔ چراگاہوں میں، جنگلوں میں جا کر دیکھو ہر ایک ضرورت کے مطابق لیتا ہے۔ باقی باندھ کر ذخیرہ نہیں کرتا۔ اب ان کو تو فطرت کی طرف سے ملتا ہے۔ مگر وَاِيَّاكُمْ ۚ (29:60) تمہیں کو اس نظام کو نافذ کرنے کے بعد ملے گا جہاں کسی کی ضرورت نہیں رکے گی۔

اس لئے کہا اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ (29:62) اس نظام کے تحت چلو تو ہر ایک کو ملے گا۔ اپنا چلاؤ گے تو پھر ہر طاقتور زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتا ہے اور دوسروں کو نہیں دیتا ضرورت کے مطابق۔ دوسروں کو محروم کرنے کے لئے سمیٹ لیتا ہے۔

ایران وروم کا ذکراور جنگِ بدر کی خوشخبری

قیصرِ قسطنطین یعنی Constantine نے عیسائیّت کو قبول کیا تو قسطنطنیہ کو دارالسلطنت بنایا۔ چوتھی صدی میں رومن ایمپائر یعنی مملکت روما دوحصّوں میں تقسیم ہوگئی۔ایک حصّہ کا دارالحکومت روم ہوا اور دوسرا حصّہ کا دارالخلافہ قسطنطنیہ تھا جس کو بازنطین کہتے تھے تو یہ ان کا مشرقی حصّہ جو عرب کی سمت تھا اسے بانطینی حکومت کہا جاتا تھا۔عربوں کا تصادم اس مشرقی رومن ایمپائر یعنی بازنطین سے ہوا تھا۔شام، بیت المقدس، فلسطین، مصراور عراق اس کے ماتحت تھے۔اورعرب کے بارڈر پر غسانی ان کے نمائندے تھے۔ جبکہ مغربی رومن ایمپائر جس سے عربوں کا تعلق نہیں تھا ایرانیوں کی کشمکش اسی بازنطینی حکومت سے رہتی تھی۔اس زمانے سے لڑائیوں کا سلسلہ بہت عرصہ تک جاری رہتا تھا مثلاً ایک سلسلہ جو 602 عیسوی سے 612 یا 614 عیسوی تک جاری رہا اس میں ایرانیوں کو بازنطینی عیسائیوں کے خلاف فتح پر فتح ہوتی چلی گئی۔شام، فلسطین اور مصر تک فتح کرکے یروشلم میں اس کی صلیب مقدس بھی اٹھا کر لے گئے۔گویا یہ ایک بہت بڑی شکست تھی جو رومنز کو ملی۔ایرانی مجوسی ہونے کی وجہ سے مشرکین کی صف میں شمار کئے جاتے تھے۔ حالانکہ یہ بھی ایک پیغمبر کے ماننے والے تھے۔ان کے ہاں کوئی کتاب نہیں تھی۔آتش پرست تھے اور عیسائی اور یہودی اہل کتاب تھے۔ یہ پارسی تھے۔قرآن نے اہل کتاب کو بھی کفار کی صف میں رکھا ہے کیونکہ یہ قرآنی حکومت سے انکاری تھے۔اس کے باوجود معاشرتی اور تمدّنی سطح پر قرآن نے مشرکین اور اہل کتاب میں کچھ فرق رکھا ہے۔مثلاً ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے ان کے ہاں کے وہ کھانے جو حلال ہوں جائز ہیں اور مشرکین کے ساتھ یہ تعلقات بھی قرآن نے روا نہیں رکھے۔اس فرق کے اعتبار سے مکہ کے مشرکین ایرانیوں کے ساتھ اپنی نسبت رکھتے تھے اور ان کے خیال میں اس نئی جماعت اور ان عیسائیوں (بازنطینی) کا آپس میں رابطہ ہوسکتا ہے۔یہ حضورؐ اس وقت مکہ میں تھے اور یہ واقعہ 602ء سے 619 عیسوی تک کا ہے۔یہ چھٹا یا ساتواں نبوی سال یا مکی زندگی ہے۔ چونکہ یہ عیسیٰؑ کو بھی نبیؑ مانتی تھی تو یہ اپنے ذہن میں یہ سمجھ بیٹھے تھے۔ان کا آپس میں رابطہ ہوسکتا ہے اور یہ ہمارے بھی خلاف ہیں اور ایرانیوں کے بھی۔تو ایرانیوں کی اس فتح پر ان مشرکین نے ایک بڑا جشن منایا حالانکہ ان کو اس فتح سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔لیکن جو مشہور ہے کہ دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے اس اعتبار سے انہوں نے خوشیاں منائیں اور یہ کمزور سی جماعت کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ ''ذرۂ ناچیز وتعمیر بیابانے نگر۔'' اس پر وہ ہنسا کرتے تھے۔

تو عیسائیوں کی شکست پر کہتے تھے کہ وہ خدا پرست اور یہ ایرانی آتش پرست، انہوں نے ان کو رگید کر رکھ دیا اور جب ان

عیسائیوں کی خدامدد نہ کر سکا تو تم کس باغ کی مولی ہو؟

اس پروپیگنڈ و کا اثر بھی ان کے دلوں پر ہو سکتا تھا کہ رومن، ایمپائر ان کے سامنے نہ ٹھہر سکی اگر کل کو ان قریش نے ایرانیوں کے ساتھ اتحاد کرلیا جو مشرک ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک جیسا سمجھتے ہیں تو معاملات سخت ہو جائیں گے۔ یہ تھا اثر جو دلوں پر پڑ سکتا تھا۔

اس میں ان آیات کو اس تناظر میں نہیں سمجھا جاتا۔ معاملہ تو عیسائیوں اور آتش پرستوں کا تھا ایک مغلوب دوسرا مفتوح۔ اور اس کی اتنی اہمیّت کہ وحی نازل ہو رہی ہے اور اس کا نام ہی سورۃ الرّوم ہے یہ کیوں اتنی اہمیّت ہے اس پس منظر کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ حالانکہ قرآن نے اس کی وضاحت دوسری ہی آیت کے اندر کردی۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ (30:2-3-4)۔ ان مشرکوں سے کہہ دو کہ اس میں جشن منانے کی ضرورت نہیں کہ یہ جو تمہاری سرحد کے قریب رومنز ہیں یہ مغلوب ہو گئے ہیں کہ صرف 3 سے 9 سال میں تم دیکھو گے کہ یہ رومنز ایرانیوں کو مغلوب کر دیں گے۔ یہ صرف ایک پیش گوئی قرآن میں ملتی ہے اور کہا کہ تم دیکھو گے کہ یہ تین سے نو سال کے عرصہ میں ہو جائے گا۔ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ (30:4) ماضی ہو یا مستقبل۔ تمام امور کا فیصلہ ان کے قوانین کی رو سے طے ہوتا ہے۔

مومنوں کو جنگِ بدر کی خوشخبری:

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ (30:4-5) اور تم جو ان کا تمسخر اڑا رہے ہو رومنز ایمپائر کے متعلق جو تم جشن منا رہے تھے دیکھ لینا کہ زیادہ سے زیادہ چھ سے نو سال کے اندر یہی رومنز پھر ایرانیوں کے اوپر غالب آئیں گے اور نو سال کے اندر 622 عیسوی میں رومن نے پلٹ کر ایسا حملہ کیا کہ ان کے دارالخلافہ تک پہنچ گئے اور یہ وہ دن تھا کہ جس دن بدر کے میدان میں مسلمانوں کو قریش پر فتح حاصل ہوئی۔ بات یہ کہی تھی وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ (30:4-5)۔

دیکھو تم اس کمزور اور حقیر جماعت کا مذاق اڑا رہے ہو اور اس کے لئے اس بڑی مملکت بازنطینی کی نظیر پیش کر رہے ہو تم دیکھو گے کہ ادھر سے یہ عیسائی ان ایرانیوں پر غلبہ حاصل کر لیں گے اور ادھر تمہیں شکست فاش سے دو چار کریں گے اور اس شکست نے تو صف ماتم بچھا دیا کہ رونا بھی حکم کے ذریعہ بند کر دیا گیا۔ دنیا کے مورخ اس جنگ کو جس دنیا کی تاریخ کا دھارا موڑ دیا یہ تھا سترہ روزے رکھنے کا نتیجہ۔ اس کے بعد 8 ہجری میں صرف نو دس روزے رکھے تھے کہ مکہ فتح ہو گیا۔ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ (2:185)۔

افادی پہلو اور جمالی پہلو کے مجموعہ کا نام ہے جنّتی معاشرہ

جنّت میں موسیقی اور فنونِ لطیفہ

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴿۱۵﴾ (30:15)۔

عرب تو جہاں آب رواں اور تین چار درخت دیکھتے تو اس کو جنّت کہتے تھے۔ درختوں کے سائے جھکے ہوئے، پھلوں سے لدے ہوئے اشجار، دودھ کی رواں ندیاں، شہد کی رواں ندیاں، سبزہ زار، پرندوں کے چہچہے۔ ایرانی قالین، حریر و اطلس کے پردے اور لباس، صوفے اور پلنگ، پرندوں کا گوشت، یہ ہیں نعمائے جنّت جو اس دنیا میں دی جا رہی ہیں۔ ہر قسم کی آسائشیں ہر وہ شے جس میں زیبائی، رعنائی، دلکشی اور خوبصورتی اور جنّت نگاہ ہو۔ اسے حَبْرٌ کہتے تھے۔ یہ روشنائی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یعنی دلکشی رعنائی جو جنّت نگاہ ہو اور فردوس گوش کو حَبْرٌ کہتے تھے۔ وہاں يُّحْبَرُوْنَ﴿۱۵﴾ (30:15) بہترین قسم کی، اعلیٰ قسم کی موسیقی ہوگی۔ جو فنون لطیفہ میں بلند مقام رکھتی ہے۔ یہ فنون لطیفہ کو تحسین کی نظر کے لئے حسِ لطیف کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے تو دنیا کی ہر وہ شے جو حلال سے حلال تر ہے۔ اگر وہ بھی اقدار خداوندی سے تجاوز کر جائے تو حرام ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ان اقدار کے تابع ہے بجز ان کے جن کو خود حرام قرار دیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں۔ بشرطیکہ ان اقدار کا خیال رکھا جائے ؎

؎ وہ نغمۂ سردئ خونِ غزل سرا کی دلیل — کہ جس کو سن کے تیرا چہرہ تاب ناک نہیں

نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود — وہ نے نواز جس کا ضمیر پاک نہیں

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام — حرام میری نگاہوں میں نالے و چنگ و رباب

جنّت کی موسیقی میں تو حیات ابدی کا پیغام ہوتا ہے ہر وہ شے جس میں ضعف اور ناتوانی ہو خواہ فقہ کی رو سے اسے آپ کتنا ہی حلال کہہ لیں لیکن قرآن کی رو سے حرام ہوگی۔ حدود خداوندی کے اندر رہتے ہوئے تمام تخلیق کردہ اشیاء ان سے متمتع ہونا، زندگی اور حرارت حاصل کرنا عین حلال اور منشائے قرآن کے مطابق ہے۔

فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴿۱۵﴾ (30:15) وہ زندگی کی خوشگواریوں اور شادابیوں سے بہرہ یاب اور ایسی موسیقی اور نغمات سے جوان کو حیات و حرکت عطا کرے گی۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ﴿۷۰﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴿۷۱﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ۝ (43:70-73)۔ ذوق جمالیات کا تمام سامان جنّت میں فراہم کیا جاتا ہے۔ افادی پہلو کے ساتھ ساتھ ذوق جمالیات Aesthetic Sense بھی ہے۔

گلاب کے پھول کی تاثیر تو الگ ہے مگران شاخوں، جڑوں اور کانٹوں کے اوپر حسن وزیبائی کا ایک مجسمہ مسکراتا ہوا سامنے آتا ہے جو انسان انسانیّت کی سطح پر ہو تو یہ اس کے ذوق جمالیات کی تسکین کا سامان ہوگا۔ بکری اور بیل تو گزر جائیں گے کیونکہ وہ تو اس حسِ جمالیات سے عاری ہیں۔

یہ ایک دلیل ہی کافی ہے کہ خالق نے ربوبیّت کے لئے ان چیزوں میں افادی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان میں رعنائیاں، خوشبو اور نزاکت بھی رکھ دی۔ صرف ایک پتی کے اوپر حسن کی پوری دنیا اس کے اندر ناچتی ہوئی نظر آئے گی۔ قرآن نے ذوق جمالیات پر کس قدر زور دیا ہے۔ مویشیوں کا ذکر ان کے افادی پہلو لائے جارہے ہیں کہ ان کا گوشت کھاتے ہو، دودھ پیتے ہو، ان سے کمبل اور کپڑے بناتے ہو، خیمہ اور مختلف اقسام کی چیزیں ان کی کھالوں سے بناتے ہو۔ سواری کرتے ہو۔ منوں وزنی سامان لاد کر لے جاتے ہو۔ ایک مویشی میں ملاحظہ کریں افادیت کے پہلو یہ سارا گنانے کے بعد کہا کہ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۝ (16:5)۔ یہ ہیں ان کے افادی پہلو، یہ (Utiliterian aspcct) پہلو کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہئے تھا مگر نہیں کہا۔ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ (16:6)۔ افادی پہلو سے تو صرف حیوانی اور طبعی زندگی کی تسکین مقصود ہوئی۔ یہ مقامات ہیں جہاں انسانی بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ جمالیات کا پہلو دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں بتاؤں۔ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ۝ (16:6)۔ نور کے تڑکے، صبح کا وقت، چاروں طرف خاموشی کا عالم فضا گردمرمریں سے لدی ہوئی۔ عین اس سکوت کے عالم میں گاؤں سے مویشیوں کے گلہ جس طرح خراماں خراماں باہر چراگاہوں کی طرف جاتا ہے کتنے حسن وجمال کی رعنائیاں اس لاجواب اور دلکش منظر میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ کس قدر یہ صبح کا منظر دلکش ہوتا ہے۔ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ۝ (16:6) اور شام کو جب سورج غروب ہورہا ہے نہ اندھیرا اور نہ روشنی، بین بین کا سماں، خاموشی مگر صبح سے الگ اور مختلف خاموشی۔ تو یہ خاموشی ان کی گھنٹیاں توڑ دیتی ہے کیا کبھی دور سے اس منظر کو دیکھا ہے؟ یہ صبح اور شام، دوپہر ہو یا رات، ہر مقام پر ذوق جمالیات کا سامان بکھیر دیا ہے۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۝وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۝ (30:17-18)۔ زندگی کی نشوونما کے لئے صرف روٹی کافی نہیں ہے یہ تو حیوانی زندگی ہے انسانی زندگی تو آگے چلتی ہے۔ مغرب کے ہاں ان پینٹنگز میں یونہی ایک ندی، ٹوٹا ہوا پل، ادھر ادھر چراگاہیں، دودھ، درخت، دور سے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی۔ ان کے ہاں یہ ماسٹر پیس قرآن نے صرف دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے پھر جو قوم زوال پذیر ہو تو یہ تمام حیات آور چیزیں جو قلب ونگاہ اور دیدۂ بینا کے ارتقاء کا موجب بنی تھیں ان پر حرام قرار دی جاتی ہیں۔

؎ جناب شیخ سے مے کا جواز کیا پوچھیں — کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

عہدِ مغلیہ:

ہمارے زوال کا آخری دورِ مغلیہ سلطنت کا زوال تھا۔ اس نے فنونِ لطیفہ کے خوبصورت چہرہ کو مسخ کر کے رکھ دیا تمام شاعری، مصوری، موسیقی میں، اعصاب پر عورت سوار تھی۔ حزن اور افسردگی کا یہ عالم کہ ہر شعر پر واہ کی بجائے ''آہ'' نکلے تو وہ بہترین موسیقی اور شعر کہلائے۔ موسیقی میں دل ڈوبا جا رہا ہے۔ یہ عرّوج کی چیزیں جو حرکت اور حرارت کا موجب ہوں تو یہ زوال کے زمانے میں چھا جاتی ہیں۔ جواب خضر۔ زندگی، علامہ اقبال۔

ے زندگی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پرواہ خرام
وہ خضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیلؑ
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
اور وہ پانی کے چشمہ پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنّت میں گردِ سلسبیل

اس نے قرآن کی آیات سے صبح اور شام کا سماں لیا ہے۔ اس کے بعد فطری صلاحیتوں سے کام لے کر یہ ذوقِ لطیف کا نقشہ کھینچا ہے۔

عیسائیّت:

ان کے ہاں تمدّنی اور سیاسی زندگی کے لئے کوئی مستقل اقدار نہیں ہیں۔ نہ قوانین اور نہ احکامات۔ صرف جذبات کی تسکین کا سامان ہے۔ ان کی پینٹنگز میں کوئی افادی پہلو نہیں ہے صرف جذبات کا پہلو ہے۔

ہندوؤں کے پاس فنونِ لطیفہ:

یہ قوم تو انسانوں کی سطح پر ہی نہیں ہے۔ ان کے خداؤں کے مجسمے، کالی سیاہ اور بڑی سرخ زبان نکلی ہوئی، گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا ہار، چار ہاتھ، ایک میں نیزہ، ایک میں تلوار، بڑی بھیانک صورت، خوف اور ڈر، لطافت کا کوئی پہلو نہیں۔ آگے درویشی مہاراج، آدھا دھڑ ہاتھی کے سونڈ کا، ان کے ہاں یہ ذوق ہی نہیں ہے۔ بابر بادشاہ کی نگاہ کا اندازہ کریں۔ اپنے وطن سے غربت کی حالت میں نکل کر ہندوستان میں صرف چار برس رہا۔ تزک بابری میں ان کا معاشرہ، جغرافیہ اور سیاحت کے متعلق جو کچھ کہا ان کا جواب نہیں۔ دوست نے لکھا کہ اتنی بڑی قوم کا مقابلہ کیسے کرو گے؟ جواب میں لکھا کہ ان پر فتح پانا کونسا مشکل کام ہے؟ جن کے ذوق جمالیات کی کیفیّت یہ ہے کہ دریا کے کنارے مکان بناتے ہیں اور اس کی پشت دریا کی طرف رکھتے ہیں۔ ان کا فتح کر لینا کونسا مشکل ہے۔ یہ ہے تعلق ذوق جمالیات کا انسانی زندگی سے۔ جو بھی آیا ان کو دھڑا دھڑ مارتا گیا۔ یہ یہودی اور ہندو جمالیات سے خالی ہوتے ہیں۔ صرف روپیہ لکشمی دیوی ان کا افادی پہلو ہے۔ عیسائیّت میں تو صرف Emotionalism ہے۔ قرآن نے دونوں پہلو افادی اور جمالیاتی دیئے ہیں۔

سیکولرازم میں مادی طور پر صرف افادی پہلو ہے:

یہ تو حیوانی زندگی ہے صرف جذبات غالب ہوں تو یہ تو موت ہے۔ یہ جذبات تو عقل وشعور پر غالب آ جاتے ہیں۔

قرآن تو دونوں کا امتزاج ''زندگی جوئے شیر وتیشہ وسنگ گراں'' بھی ہے۔ اسلام کی تکمیل، دین کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ اس میں دونوں پہلو ہوں۔ مغرب والوں کا ذوق پھولوں کے ساتھ تو ہے مگر ان میں صرف رنگ ہوتا ہے خوشبو نہیں ہوتی۔ ان کی ساری تاریخ کا نچوڑ ہی یہ ہے کہ اس میں رنگ ہی رنگ ہے۔ خوشبو نہیں ہوتی۔ ہمارے حکماء نے تو پھولوں کے افادی پہلوؤں پر کتابیں اور کتابیں تک لکھ دیں جبکہ شعراء نے ذوق جمالیات کے تمام پہلو خوشبو اور رنگینیوں سے کیا کیا کام لیا!

❁❁❁

کائنات میں تغیّرات اور قوموں کا عرّوج وزوال

فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ﴿۱۷﴾وَلَہُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَعَشِیًّا وَّحِیۡنَ تُظۡہِرُوۡنَ﴿۱۸﴾(30:17-18)۔صبح کا تڑکا ہو یا شام کا سکوت، سورج نصف النّہار پر ہو یا رات کا سماں ہو اس کا ہر گوشہ خارجی کائنات میں قابل حمد و ستائش ہے۔ اس میں زمان و مکان دونوں آ گئے۔ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (30:18) تو مکان۔ (Space) آ گیا اور صبح، شام، زوال آفتاب اور عشاء کا (رات) تو اس میں زمان (Time) آ گیا۔ وہ خود تو اس زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہے لیکن اس کی تخلیق انہی حدود کے اندر ہے۔ یہ تغیّرات اس بات پر شاہد ہیں کہ چاہے قوموں کے عرّوج کا زمانہ ہو، یا ختم ہونے کا، یا ان کا آفتاب نصف النّہار پر ہو، یا زوال پذیر، یہ سارا کچھ اس کے قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے آپ کو ان اقدار کے تابع کرے تو وہ بھی قابل تحسین ثمرات کی حامل ہو جائے گی۔ جس طرح کائنات کا گوشہ گوشہ ان تغیّرات سے گزر کر قابل حمد و ستائش ہے فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ (30:17)۔ جوں جوں نگاہ بلند ہوتی جائے گی تو یہ زمان و مکان آخر میں تو مٹ ہی جاتے ہیں اور انسان Durationless ٹائم میں پہنچ جائے گا۔ جہاں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔ یہ تغیّرات قوموں کے عرّوج و زوال میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک قانون کے تحت ہو رہا ہے یہ اتفاقیہ نہیں ہو رہا ہے۔ اگلی آیت نے یہ قانون مزید واضح کر دیا ہے۔ یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ یُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ (30:19)

انہی قوانین کے تحت مردہ اقوام کو زندگی ملتی ہے اور انہی کی خلاف ورزی سے زندہ اقوام مردہ ہو جاتی ہیں۔ اس لئے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی ہنسی پر برامت مناؤ کہ

؎ ذرۂ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر

وَیُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ وَ کَذٰلِکَ تُخۡرَجُوۡنَ﴿۱۹﴾ (30:19)۔ بنجر زمین پر ایک بارش کا چھینٹا اسے زندگی سے ہمکنار کر دیتا ہے اس طرح سے یہ بظاہر کمزور اور مردہ جماعت حیات تازہ سے سرشار ہو جائے گی۔ اس میں مایوسی کی ضرورت نہیں ہے۔

❁❁❁

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ ؕ (30:22)

السنہ والوان، "Languages and colours"

ڈاکٹر Bucke کی کتاب "Cosmic Consciousness" Language and colors ان کی تحقیق ہے کہ نوع انسانی ارتقائی منازل میں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ کسی ایک درجہ میں، دور میں مختلف قوموں نسلوں کی ارتقائی سطح کتنی بڑھی تھی گراف بنانا ہو اس ارتقاء کا، صلاحیتوں کی نشوونما کا تو اس کے لئے السنہ والوان (Language and colors) ذریعہ ہیں کہ اس قوم میں کتنی زبان کی وسعت تھی اور اس قوم میں کتنے رنگوں کی پہچان کا مادہ تھا۔ اصل غور کرنے والی چیز ایک چیز کا تصوّر Concept ہوتا ہے۔ Percept یعنی محسوس کی جانے والی شے نہیں ہوتی ہے جیسے پانی۔ روٹی۔ درخت۔ درخت سے مراد یہ محسوس شکل کا درخت نہیں بلکہ یہ دیکھو کہ اس درخت کے اس قوم میں کتنے تصوّر Concepts ہیں۔ تو تمام قوموں میں عربوں کے ہاں اتنے concepts تھے کہ ساری قوموں کو ملا کر بھی اتنے نہیں تھے۔ گراف کے اعتبار سے یہ قوم منفرد نظر آتی ہے۔ صرف اونٹ کے لئے 5744 الفاظ تھے۔ اگلا جانچنے کا پیمانہ رنگوں کا اختلاف ہے۔ ہم نے تو یہی سمجھ لیا کہ تین رنگوں میں قومیں تقسیم کی گئی ہیں۔ یعنی علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوام عالم کو مختلف مماثلت کی بناء پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔ سفید فام White Race سیاہ فام Black اور سرخ یا زرد فام Red/Yellow۔ قرآن ان اختلافات کی بات نہیں کرتا اور رنگوں کی پہچان کا مادہ یہ اس قوم کے ارتقائی درجہ کا سٹینڈرڈ ہے۔ جس طرح حیوان کے اندر رنگ کی پہچان ہی نہیں ہوتی۔ یہ صرف انسانوں میں ہوتی ہے جو قوم پست درجہ پر ہو تو ان کے پاس اس دور کے لٹریچر میں صرف ایک رنگ کا نام ملتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ دوسرا رنگ پہچانتی ہی نہیں تھی۔ ہندوؤں کا اتنا بڑا لٹریچر اور ان سے صرف تین رنگوں کے نام ملتے ہیں۔ جبکہ عربوں کے ہاں اس دور میں بھی چھ رنگوں کے نام ملتے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡعٰلِمِيۡنَ ۝۲۲ (30:22)۔ اس کا مطلب تو صرف اہل علم ہی جان سکیں گے اور ان تمام تغیّرات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ سارا سلسلہ قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ وہ نہ تو ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سویا ہوا ہے اور نہ ہی کائنات کو چابی دے کر غافل ہو گیا ہے۔ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ (2:255)۔ وہ اَلۡحَیُّ الۡقَيُّوۡمُ ۚ (2:255) ہے۔ خبیر و سمیع وعلیم ہے اور نہ ہی یہ کوئی کھیل تماشہ ہے۔ وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا لٰعِبِيۡنَ ۝۳۸ (44:38) اور نہ ہی اس نے لیلا رچائی ہوئی ہے۔ یہ ناٹک نہیں ہے۔

فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا ؕ (30:30)

فطرت کا غلط تصوّر

علمی سطح پر دنیا بھر میں فطرت کے متعلق پائے جانے والے تصوّر کی تردید

فِطۡرَتَ اللّٰہِ(30:30):

اس سے مقصود انسانی فطرت Human Nature لیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں ہر قوم، ملک اور عام طبقہ میں نہیں بلکہ بلند پایہ فلاسفرز، دانشوران ان سب کے ہاں انسانی فطرت کا تصوّر موجود ہے اور یہ غلط تصوّر مسلسل ڈھائی ہزار سال سے چلا آ رہا ہے۔ یونانی فلاسفرز نے اس کی ابتداء کی۔ ہر ایک نے غور نہیں کیا بلکہ اسی مفروضہ پر بات کا آغاز کیا۔ ان کو تو چھوڑ یئے انہوں نے یہ جھوٹی روایات رسول اللہؐ کی طرف بھی منسوب کر دیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی اسلام پر۔ یہ اس کے ماں باپ اسے یہودی نصرانی بنا دیتے ہیں۔ اگر اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جو کچھ بنے گا وہ اسلام ہوگا۔ پھر روایات اس کے ثبوت میں پیش کر دی جاتی ہیں۔ آیئے اس کا تجزیہ کریں۔ خارجی کائنات میں فطرت کا مفہوم ٹھوس اور غیر مبتدل ہے۔ خارجی کائنات میں یہ فطرت موجود ہے۔ پانی کی فطرت ہے کہ اگر اسے علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو نشیب کی طرف بہتا ہے۔ خاص درجۂ حرارت پر آ کر بھاپ بن جاتا ہے اور ایک خاص درجۂ حرارت پر ٹھوس بن جاتا ہے۔ پانی جہاں بھی ہے یہ اس کی فطرت ہے۔ بکری کی فطرت گھاس کھانا ہے۔ گوشت نہیں کھاتی۔ دس ہزار سال پہلے بھی اور آج بھی اس کی یہ کیفیّت ہے اور ہمیشہ یہ رہے گی۔ شیر کی فطرت ہے کہ وہ گوشت کھاتا ہے سبزی نہیں کھاتا۔ آگ کی فطرت حرارت پہنچانا ہے یعنی فطرت کسی شے کی وہ خصوصیّت جو غیر متبدّل ہے۔ تبدیل نہیں ہوسکتی۔ بکری اور شیر جو ذی حیات ہیں وہ بھی اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ غیر ذی حیات وغیرہ کو تو چھوڑ دیں تو فطرت کی خصوصیّت یہ ٹھہری کہ وہ کسی شکل میں بدلتی نہیں تو کیا انسان کی بھی کوئی فطرت ہے؟ کہا جائے گا کہ انسان پر خارجی اثرات سے اس کی فطرت بدل جاتی ہے تو جو بدل جائے وہ فطرت کیسے ہوئی؟ فطرت تو بنیادی طور پر وہ شے ہے جو بدل نہ سکے۔ تو پہلے ہی قدم پر ان کا مسلّمہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر فطرت وہ ہے جو اس نوع کے ہر فرد کے اندر یکساں ہے۔ یہاں تو دو انسان یکساں نہیں ہوتے تو یہ انسانی فطرت پھر کیا ہوئی؟ وہ تو ہر انسان میں یکساں ہونی چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ انگوٹھے کے نشان دو افراد میں ایک جیسے نہیں ملتے۔ اس ایک نقطہ پر عقل محوِ حیرت ہے۔ خواہ اسے لاکھوں ہزاروں سال ہوئے اس وقت سے

آج تک کوئی دو انسان ایسے نہیں ہیں جن کے انگوٹھوں کی لکیریں ایک جیسی ہوں۔ حیرت ہی حیرت۔ اتنے لامحدود ڈیزائن! اب تو کہا جا رہا ہے کہ کوئی دو انسانی ایسے نہیں جن کی ناک ایک جیسی ہو۔ کبھی کبھار تو جڑواں بچے ماں کے لئے مصیبت ہو جاتے ہیں تو گلوں میں مختلف منکہ ڈالتی ہے تا کہ پہچانے جا سکیں۔ اگر سارے انسانوں کے چہرے یکساں ہوتے تو انسانوں پر کیا بیتتی ؟ کیا دو فرد ایسے ہیں جن کی خصوصیات بالکل یکساں ہوں۔ کیا ہر بکری کے اندر دوسری بکری کی طرح فطرت ہوتی ہے؟ دو انسان بھی اس قسم کے یکساں نہیں ہوتے۔ تو پھر یہ انسانی فطرت کیا ہے؟ یہ تو غیر متبدّل خصوصیّت کو کہتے ہیں اور پہلا ہی قدم یہ کہ خارجی اثرات سے بدل جاتی ہے تو یہ مسلّمہ تو ادھر ہی باطل ہو گیا۔ دوسری خصوصیّت فطرت کی یہ کہ وہ اس نوع کا ہر فرد میں یکساں ہوتی ہے۔ ہر بکری کے اندر دوسری بکری جیسی فطرت ہوتی ہے۔ ہمیں تو کوئی دو انسان بھی ایسے نظر نہیں آتے جن کے اندر کی ذہنیتیں ،نفسیات ایک جیسی ہوں تو انسانی فطرت کیا ہوئی ؟ کہ جی اگر ان کو پیدا ہوتے ہی چھوڑ دیا جائے اور خارجی اثرات اس پر نہ ہوں تو وہ فطرت پر چلتا ہے۔

تجربہ:

پہلے پتہ نہیں اس کا تجربہ ہوا تھا یا نہیں مگر کہتے ہیں کہ اکبر نے اس کا تجربہ کیا تھا۔(1605) مگر یہ ابھی اسی صدی میں انڈیا کی تقسیم سے پہلے یو پی میں ان کو ایک لڑکا جنگل میں ملا تھا۔ شاید پہلے ہی دن اسے بھیڑیئے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس بچہ کو ان بھیڑیوں نے اپنے طور پر پالا۔ وہ چھ سات سال کا ایک بڑے ڈاکٹر کو ملا۔ گویا یہ انسان تھا۔ اس پر انسانوں کے خارجی اثرات نہیں ہوئے تھے۔ اسے تو انسانی فطرت پر ہونا چاہئے تھا لیکن وہ بالکل بھیڑیا تھا۔ ہاتھوں پر چلتا تھا جسے چاروں ٹانگوں پر چلنا کہتے ہیں۔ بول نہیں سکتا تھا۔ ہاتھوں سے نہیں کھاتا تھا۔ اس طرح منہ سے وہی کچھ کھاتا تھا جو بھیڑیئے کھاتے ہیں۔ انسان کا بچہ جس پر خارجی انسانوں کے اثرات نہیں ہوتے وہ یہ بن گیا تو وہ انسان ہی نہیں رہتا۔

انسانی فطرت کا تصوّر پیدا کرنے میں فلاسفرز کا کردار:

ارسطو(384 BC) غلامی کے جواز میں یہ کہتا تھا کہ بعض انسان فطرتاً غلام پیدا ہوتے ہیں اگر ان کو آزاد کر دیا جائے تو ان کی فطرت کے خلاف ہوگا اور وہ تکلیف میں رہیں گے جیسے ٹیڑھے پاؤں والے کو سیدھی جوتی پہنا دو۔ جیسے مچھلی پانی سے باہر خوش نہیں رہ سکتی۔ اس کے پاس بیس غلام تھے اور وہ بیس دلائل دیتا تھا۔ اس طرح سے اس نے ایک گروہ بنا لیا۔ یہ استحصال کرنے والے، غلبہ حاصل کرنے والے اکٹھے ہو گئے اس طرح سے یہ جواز کہ ہم نے ان کو غلام نہیں بنایا بلکہ یہ فطرتاً ایسے ہیں۔

وہیں سے ہندوستان میں یہ تصوّر آیا۔ انسانوں کو ذاتوں (ورنوں) میں تقسیم کیا۔ شودر، ویش۔ کھشتری۔ برہمن،۔ شودر کا کام یہ ہے کہ معاشرے میں تمام ذلیل اور پست کام کرے۔ وہ اس سڑک پر چل نہیں سکتا جس پر یہ بڑے ورنوں والے چلتے ہیں۔ یہ وہ چاول نہیں کھا سکتے جو برہمن کھاتے ہیں اس اونچی ذات والے کے کنویں سے پانی بھی نہیں پی سکتے۔ شادی کو تو آئینی طور پر جرم قرار دیا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ یہ ہم نے نہیں کیا بلکہ برہما نے پیدا اس طرح سے کیا ہے شودر برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ ویش (بنیئے) پیٹ سے، کھشتری بازوؤں سے اور برہمن اس کے سر سے پیدا ہوئے تھے۔

انسانی فطرت کا تصوّر ہی قرآن کے خلاف ہے:

یہ تصوّراس بنیاد پر کہ دوسرے انسانوں کو مغلوب اور محتاج رکھا جائے۔اس لئے یہ دھرم کی بنا پر ورنوں کا تصوّر آیا۔قرآن کیسے اس قسم کے ظالمانہ اور مجرمانہ تصوّر کو درست قرار دے سکتا ہے؟ وہ تو یہ اعلان کر رہا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70)۔ تمام انسانی بچے یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔اگلی چیز کہ فطرت بدل نہیں سکتی کیا غلط ہے۔اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾ (76:3)۔دونوں راستے بتا دیئے اب ان کا اختیار و ارادہ ہے کہ مرضی سے جس پر چلنا چاہیں اس کی کوئی فطرت نہیں ہے۔جہاں فطرت ہو تو وہاں اختیار و ارادہ نہیں ہوتا۔امکانات کا ہونا ضروری ہے جہاں دو امکانات نہ ہوں تو وہ استبداد ہے۔کائنات میں یہ اختیار و ارادہ کسی کو نہیں دیا گیا بجز انسان کے۔سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط (31:20)۔فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (18:29) کوئی پیغمبر فطرت رکھنے والی کسی شے کی طرف نہیں مبعوث ہوا۔جو فطرت کی شے کسی کے اندر ہو تو اس کے لئے کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ ان جانوروں کی طرف کوئی رسول نہیں آیا۔اس لئے خالق فطرت نے ایک متعیّنہ راستہ پر چلنے کے لئے ان تمام کو مجبور کر دیا ہے۔تو ان کی رسالت کی کیا ضرورت ہے۔یہ تو انسانوں کو ایک رہنمائی کی ضرورت ہے۔تاکہ ایک یکساں تعلیم کے ذریعہ اپنی مرضی سے اختیار کریں۔تو یہ گروہ ایک امت یا جماعت بنے گی۔ایک مقصد اور نصب العین رکھنے والی اپنے ارادہ سے نہ کہ مجبوری سے۔ان کا یہ تصوّر غلامی، ورنوں کا اور اب سرمایہ دارانہ نظام میں لوٹ کھسوٹ اور استحصال جن کو مذموم اور جرم ہونا چاہیئے تھا۔اصل تباہی اور بربادی کی جڑ ہے۔اب ملکیت کو انسانی فطرت قرار دے دیا تو اس کی تسکین کے لئے زیادہ سے زیادہ رکھنے کا مجرمانہ جواز تلاش کر لیا۔جیسے اب اسے روکنا ایسا ہوگا گویا پانی کو روکو تو وہ سیلاب بن جاتا ہے۔یہ ہیں ان کے دلائل۔اب یہ فطرت کا تصوّر جو کہ اس سرمایہ دارانہ نظام کو پروان چڑھانے میں معاون تھا تو اسے اتنا پھیلایا کہ عین فطرت انسانی قرار دے دیا کہ یہ ذاتی ملکیت میں چیزیں اکٹھا کرنا، یعنی ''Self Possession'' کو انسانی فطرت قرار دے دیا۔قرآن بھلا ایسے نظریہ کی کیسے تائید کر سکتا ہے؟ جو کسی شے پر ملکیت کو جرم قرار دیتا ہے اور جو محنت کی استعداد کے باوجود محنت سے روٹی نہ کمائے جو انسانوں کی صف میں ہی شامل نہیں کرتا۔وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ (53:39) اس اعلان نے تو سرمایہ داری اور لوٹ کھسوٹ کے مجرمانہ تصوّر کو ختم کر دیا۔

قرآن تو ایک طرف رہا زمانۂ نزول کی عربی میں بھی فطرت کا لفظ ان معنوں میں کہیں بھی نہیں ہے۔عرب جو اس قدر حریت پسند اور آزاد منش قوم تھی وہ کبھی بھی کسی کی محکوم نہیں رہی۔تو فطرت کا مجبور تصوّر ان کے ہاں کیسے آ سکتا ہے؟ اس زبان میں یہ لفظ ان معنی میں استعمال ہی نہیں ہوتا تھا۔قرآن نے پیدائش کے لئے دو الفاظ ایک فَطَرَ ہے اور دوسرا خَلَقَ ہے۔یعنی عدم سے وجود میں لانا فَطَرَ ہے۔فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (35:1) یعنی یہ سلسلۂ کائنات شروع سے ایسا نہیں تھا بلکہ اسے وہ عدم سے وجود میں لایا۔پھر اس میٹریل کو مختلف توازن اور پیمانوں سے نئی نئی چیزیں پیدا کرتے چلے جانا خَالِقٌ کہلاتا ہے۔یہ فَطَرَ انسان نہیں کر سکتا۔

اس نے اپنے آپ کو اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ﴿۱۴﴾ (23:14) کہا ہے اَحۡسَنُ الۡفَاطِرِیۡنَ نہیں کہا۔ اور خالق انسان ہو سکتے ہیں حیوان تو نہیں۔ اب فَطَرَ سے مراد وہ قانون خداوندی جو کسی شے کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ اب یہ ہمارے ہاں کیسے ہوا۔ عباسیوں کے عہد میں جب یونانی فلسفہ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا تو ان کے ہاں یہ نیچر کا لفظ عام چلا آ رہا تھا۔ ادھر عربوں کے ہاں یہ اس معنی میں تھا ہی نہیں۔ معلوم نہیں کس طرح سے اس کا ترجمہ فطرت کر دیا گیا اور یہ لفظ پہلی دفعہ ان تراجم شدہ کتابوں میں ملتا ہے جو یونانی فلسفہ کے عربی میں ترجمہ پر آئی ہیں۔

اس تصوّر سے تو قرآن کی ساری تعلیم بے معنی ہو جاتی ہے پھر اس ترجمہ کو عربی سند دے دی گئی۔ یہ سوچا تک نہیں کہ قرآن کا تصوّر تو اس یونانی تصوّر کے بالکل خلاف ہے۔ اس فطرت کے یونانی مفہوم سے تو قرآن کی بنیادی تعلیم تک ختم ہو جائے گی۔ کہا گیا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ ہر انسان فطرت پر پیدا ہو کر اگر انسانی اثرات نہ ہو تو جس حالت میں ہو تو اسلام کی حالت ہوتی ہے۔ ابھی تو اس بھیڑ یا والے بچہ کی مثال سامنے ہے کہ اگر اسے نہ تعلیم ملے نہ تربیّت تو وہ کیا بنتا ہے۔ اب یہ تو فکر انسانی کی غلطی ہے اگر یونانی فلاسفرز نے نہیں سوچا مگر انہوں نے اسے عین دین بنا دیا۔ ہزار برس سے یہ اسے دہرا رہے ہیں۔

؎ تاثریا می رود دیوار کج

اب انسان کی فطرت کے مطابق خدا کی فطرت کا تصوّر:

خِشتِ اوّل غلط رکھی یعنی اسلام کو دین فطرت کہا، انسان فطرت پر پیدا ہوتا ہے کہا اور انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو خدا کی بھی فطرت ہوتی ہے۔ کہ جو بن گیا سو بن گیا۔ یعنی بچہ کو ویسا ہی چھوڑ دیا جائے تو وہ اسلام پر ہے اور بڑا ہو کر جو خصوصیات آئیں گی تو وہ اللہ کی فطرت ہوگی۔ یعنی اللہ ویسا ہی ہوگا۔ یہ سارے فلاسفر، محدّث، علماء پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ انسان کو اللہ کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔

وحی کی تعلیم کے بغیر انسان کی حالتِ زار:

یہودیوں نے کہا تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا یہ ان سے بھی آگے بڑھ گئے اور کہا کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ خدا نے قرآن میں انسان کو اگر علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو کیا بنے گا؟ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ كَفَّارٌ﴿۳۴﴾ (14:34) وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ كَفُوۡرًا﴿۶۷﴾ (17:67)۔ هُوَ خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ (16:4)۔ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ اَكۡثَرَ شَيۡءٍ جَدَلًا (18:54)۔ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا﴿۱۱﴾ (17:11)۔ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا﴿۱۰۰﴾ (17:100)۔ بخیل۔ تنگ نظر۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا﴿۱۹﴾ (70:19)۔ لالچی ایسا کہ پیٹ ہی نہ بھرے۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ﴿۶﴾ (100:6) اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا﴿۷۲﴾ (33:72) یہ خدا الۡاِنۡسَانَ (14:34) (وحی سے محروم) کے بارے میں بتا رہا ہے اگر انسان خدا کی فطرت پر پیدا ہوا ہے تو پھر اندازہ لگائیں یہ انسان جو وحی سے محروم ہو تو کیا خدا ایسا ہو سکتا ہے؟ اَلۡاِنۡسَانُ (17:67) جو وحی سے محروم ہو۔

انسان وحی کے بغیر کیوں ایسا ہے؟ اَلْاِنْسَانُ:

یہ خدا نے جو کچھ کہا انسان کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ اس میں 9/10 حصّہ حیوان کا ہے۔ پہلے جرثومہ سے لے کر آخری منزل سے ایک قدم پیچھے تک اس میں اور حیوانی بچہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ رحم مادر ہی نہیں بلکہ اوّلین لائف سیل تھا وہ فَطَرَ سے اللہ نے پیدا کیا تھا۔ وہاں سے زندگی جن مراحل سے گزری ہے اس میں سارے ذی حیات انہی مراحل میں سے گزرتے چلے آئے ہیں اور ارتقا سے آہستہ آہستہ منازل طے کرکے انسان یہاں تک پہنچا۔ اور ہر منزل کو پچھلی منزل سے زیادہ متناسب اور حسین بناتا گیا اور زیادہ حشو و زوائد الگ کرتا گیا۔ اَلْبَارِئُ ۔ اس کے بعد اَلْمُصَوِّرُ (59:24)۔ خاص شکل میں لے آئے اور ترتیب یہ ہے هُوَاللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ (59:24)۔ اب اس میں اور حیوان کی طبعی زندگی میں کچھ فرق نہیں۔ اس کے بعد ارادہ و اختیار کا عظیم تحفہ۔ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (32:9) یہ الوہیاتی توانائی یعنی اختیار و ارادہ جو خدا کو حاصل تھا اب یہ انسان کو دے دیا گیا۔ اس کے بعد یہ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ (23:14) یا خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ (34:7)۔ اب یہ باقی مخلوق سے الگ ہو گیا اب اس اختیار و ارادہ کو صحیح استعمال کرنے کے لئے وحی کی ضرورت ہے۔ اگر باہر سے اسے ہدایت نہ ملے تو حیوان کا حیوان ہے۔ حیوان کی قوّتیں تو محدود ہوتی ہیں یعنی شیر جیسا قوی تیزی سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی حد سے اونچا بکرا کھڑا ہو ابھو کا مر رہا ہو تو یہ اس حد تک نہیں پہنچ سکتا۔ کائنات میں ہر شے کی صلاحیت کی ایک حد مقرر ہے۔ اس سے آگے وہ نہیں جا سکتی۔ اس لئے وہ اوزار نہیں بنا سکتی۔ ان یونانی فلاسفرز نے انسان کی حد بندیاں دی ہیں کہ وہ حیوانِ ناطق ہے۔ یہ بات تو غلط ہوئی۔ طوطا بھی بولتا ہے اسے Cooking Animal کہا اور یہ اوزار بھی بنا سکتا ہے۔ یہ ہے بڑی خصوصیّت انسان کا چھوٹا سا بچہ ایک ڈانگ سے درخت کا اوپر والا پھل توڑ دیتا ہے مگر بکری بھوک سے مر جائے گی اس کی رسائی ان پتوں تک نہیں ہو سکتی۔ اس قوّت تخلیق نے اس کے دائرے کو بڑا لا منتہیٰ بنا دیا ہے۔ اسلحہ دیکھیں۔ ایک بم سے ساری دنیا اڑا کر رکھ دے۔ اس میں بھی وہ حیوانی جبلتیں تحفظِ خویش، تحفظِ تغلّب اور نسل بڑھانا، ہر حیوان میں یہ ہوتی ہے۔ اسی لئے اس حیوانیّت کو روکنے کے لئے اس کے روّیے کی ایک حد باندھ دی جائے۔ یہ اقدار دے دی گئیں چونکہ قوّتیں محدود تھیں اس لئے اگر اپنے آپ کو ان اقدار کا پابند نہ بنایا تو پھر جگہ جگہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (30:41)۔ اب کہا یہ ہے کہ یہ تصوّر کہ انسانی فطرت ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور یہ کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ یہ سراسر باطل اور قرآن کی تعلیمات کو منہدم کر دیتا ہے۔

انسان کے متعلق مشیّتِ خداوندی:

فطرت کا تقاضا تو یہ بھی ہے کہ ہر نوع ایک جیسی ہوتی ہے۔ مثلاً بکری ایک نوع ہے اور انسان بھی ایک نوع ہے۔ انسان کے متعلق کہہ دیا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۙ۱۱۸ (11:118)۔ اگر ان میں بھی فطرت رکھ دیتے تو یہ بھی بھیڑ بکریوں کی طرح ایک نوع ہوتی مگر ہماری یہ مشیّت نہیں تھی۔ اس لئے تو اسے بیچ میں سے الگ نہ کر دیتے۔ رسولؐ سے کہا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ (10:99)۔ تو کیا تو ڈنڈا استعمال کرے گا؟ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ

النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴿۹۹﴾ (10:99) کیونکہ یہ تو حیوان کا درجہ ہوتا ہے۔ ہر حیوان مومن ہوتا ہے لیکن خدا نے ان کو مومن نہیں کہا کیونکہ وہ مرضی سے ایمان نہیں لائے وہ تو ایمان لانے پر مجبور ہیں۔ خدا نے انسان کے اندر فطرت نہیں رکھی۔ اسے خود مومن اور کافر بننا ہوتا ہے۔ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴿۱۰﴾ (90:10)۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔ راستہ اس لئے بتایا گیا کہ یہ ارادے کو استعمال کر کے ایمان لائے اگر اسے مجبور کر کے ایمان لانا ہوتا تو پھر یہ حیوان کے درجہ پر ہوتا۔ یہ مومن نہ ہوتا۔ انسان کے لئے شرف انسانیّت کا معیار یہ ہے کہ جب انسانیّت کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے تو جان اور زندگی کو محفوظ رکھنا شرف انسانیّت نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے لئے جان دے کر حیات جاوید مل جاتی ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ (2:154) صحیح اور غلط کا معیار وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ (13:17)۔

انسانی دنیا میں جنگ وجدل کی وجۂ جواز:

دنیا میں یہ قیامت کیوں برپا ہے۔ ساری دنیا جہنّم بن گئی ہے کیونکہ انسان نما حیوانوں کو ان کی جبلت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ جانور تو کھا کر باقی چارے کی طرف دیکھتا تک نہیں مگر یہ ننانوے کے پھیر میں جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴿۲﴾ (104:2) اگر یہ خدا کی فطرت ہے تو خیر وشر کی تمیز تو ہونی چاہئے۔ خیر کو یہ تو مانتے ہی نہیں ہیں مگر جو کہتے ہیں خیر اور شر انسان کے اندر ہے تو ہر انسان کا وہی تصوّر ہونا چاہئے۔ مگر ایک انسان تو وہ ہے جو کیڑے کو مارنا ہی شر سمجھتا ہے۔ مسلمان کا بچہ مزے سے لے کر ہڈی چباتا ہے۔ اگر خیر اور شر کی تمیز اس کے اندر ہے تو دونوں جگہ ایک ہی چیز خیر ہونی چاہئے۔ اگر شر ہے تو ہر ایک کو شر ماننا چاہئے۔ یہ تو ان کے ہاں خیر اور شر اضافی ہوتے ہیں جب حب الوطنی کا تقاضا ہو تو وہی شر دوسرے ملک کے خلاف خیر ہو جائے گا۔ یہ انسانی جذبات دراصل حیوانی زندگی کی جبلتیں ہیں۔ تصوّف آیا تو اس نے ان جذبات کو فنا کرنے کا نعرہ دیا۔ یہ سیکوازم آیا تو جذبات کی تسکین مقصدِ انسانیّت ٹھہرا۔ قرآن کہتا ہے سب باطل ہیں۔ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (30:29) وحی کے بغیر ان کی تسکین سے سارا فساد پیدا ہوتا ہے۔

یہ سارے تصوّرات جو ذہن انسانی کی اختراع ہیں یہ دوسرے سے مستعار لئے گئے ہیں اور قرآنی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔ اب آیا دین قیم یہ ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ (30:30) اللہ کا قانون تخلیق جو ساری کائنات میں کارفرما ہے۔ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (30:30) انسانوں کو بھی اسی کے مطابق پیدا کیا ہے یہ کوئی الگ مخلوق نہیں ہے کہ اس کے لئے کچھ اور قوانین ہیں۔ ان قوانین کے تحت اسے بھی عدم سے وجود میں دیگر کائنات کی طرح لائے ہیں۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (30:30)۔ ہم نے اس کے لئے کوئی الگ قانون نہیں بنایا۔ بلکہ وہی قانون ہے جس کے تحت باقی کائنات کو بنایا ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (30:30)۔ یہ ہے دین قیم۔ ایسا راستہ ایسا قانون جس پر چل کر انسان کو استحکام مل سکتا ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴿۳۰﴾ (30:30) یہ تقلید اور جہالت کی بات نہیں ہے مگر اکثریت آنکھیں بند کر کے چلی جارہی ہے یہ تو علم کی بات ہے اور اس کے بغیر تو ایمان نہیں آسکتا۔ اس لئے مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ (30:31) تمام توجہات کو اس کے

مقرر کردہ نصب العین کی طرف مرکوز کردو۔

ے پرد در وسعتِ گردون یگانہ نگاہِ او بہ شاخ آشیانہ

اس کائنات کا ذرہ ذرہ انسانی زندگی کی ارتقائی منزل کی شہادت ہے۔ ہر شے پہلے دن سے ہی بنائی ہوئی تکمیل تک پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ ایک لائف سیل ارب ہا ارب سالوں سے ارتقائی منازل طے کر کے بالآخر اس انسان کی شکل میں آ جاتا ہے یہ ہے دین قیم۔ خدا نے اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کئے۔ یہ ہے دین قیم۔ انسان کو بھی دیگر اشیاء کی طرح اس قانون کے پیدا کیا گیا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس کو اختیار و ارادہ کے ساتھ دو ممکنات دکھا دی گئیں۔ باقی اشیاء تو مجبور ہیں۔ ایک ہی امکان پر چلنے کے لئے اگر اس کے سامنے بھی ایک ہی بات منوائی جائے گی تو یہ حیوانی سطح پر آ جائے گا۔ یہ سارے فسادات ان اختیارات کی وجہ سے ہیں۔ اگر اپنے جذبات، اغراض کے مطابق اپنا چانس اختیار کرے گا تو تباہی ہے۔ اس کا علاج وہی ہے کہ خدا کی اقدار کے تحت زندگی گزارنا۔ خود انتخاب کرنا کہ میں بھی ان اقدار کے تحت زندگی بسر کروں گا یہ ہے دین قیم۔

اپنے آپ کو خود آزمالو کہ کتنی قوّت مدافعت ہے۔ اگر ٹکراؤ میں مخالف قوّت کے اوپر غالب آ گئے تو آگے بڑھو گے تو یہ دین قیم۔

ابلیس کو تو قیامت تک کے لئے ضمانت دینے کا وعدہ:

جب انسان کو ملائکہ کا مسجود بنایا جا رہا تھا تو ابلیس نے کہا کہ میں کس طرح اسے تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ (17:62) تو یہ چیلنج دیا تو کہا گیا جاؤ تم اپنی سی کر لو۔ مگر ابلیس نے ضمانت مانگی کہ کہیں میرا ہاتھ اس کی گردن پر ہو تو تم میرا ٹینٹوا نہ دبا دو۔ مجھے اس کی مہلت ملنی چاہئے۔ کہا ٹھیک ہے تمہیں اس کی اجازت ہے قرآن اس چیلنج کو تمثیلاً بیان کر رہا ہے ساری تاریخ انسانیّت اسی کشمکش کی گواہ ہے اس لئے معاذ اللہ یہ سارے جرائم اللہ میاں برداشت کرتا رہا۔ کیونکہ وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے عظمت اور وعدے کا پاس کہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر جو وعدہ کیا تھا کہ دخل نہیں دیں گے۔ بڑی Fairplay ہو گی اور یہی شرف انسانیّت ہے۔ اگر انسان اس سے تنہا شکست بھی کھا جائے اور اقدار و قوانین کو نہ چھوڑے تو یہ شکست بھی فاتحانہ ہے۔

کائنات میں وحدت کا محیّر العقول سلسلہ

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (31:28)

قرآن کا بنیادی فلسفہ:

قرآن کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ کائنات ہو یا انسانی دنیا یہ ایک وحدت ہے۔ ہمیں تو افراد الگ الگ نظر آتے ہیں۔ مگر قرآن کا تصوّر یہ ہے کہ پوری انسانیت ایک نا قابلِ تقسیم وحدت ہے۔(One Indiviisible whole)۔

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

یہ نظریہ کہ شروع میں مٹی، ہوا، پانی اور آگ، یہ چار بنیادی عناصر ان سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ وہ تحقیقات کہہ رہی ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ اصل میں یہ ایک ہی وحدت ہے۔ یہ اسے چار سے کم کر کے دو تک لائے ہیں اور مزید تحقیق جاری ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام اور وینگ برگ کے نظریہ کے مطابق:

"The electromagnetism and the weak force which causes radioactive decay in some atomic nuclei, are facets of the same phenomenon."

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (31:28) تمہاری پوری انسانیّت کی تخلیق اور بعثت (نشاۃ ثانیہ) میں نظر تو یہ آئے گا کہ ایک ایک فرد الگ الگ ہے۔ لیکن انسانیت ایک وحدت ہے۔ تمہاری تخلیق اور بعثت كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (31:28) ہے یعنی ایک نا قابل تقسیم وحدت ہے۔ یہ وحدت انسانیت تصوّر چودہ سو سال پہلے قرآن دے رہا ہے جو دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ آپ کا درد میرے دل میں محسوس ہو۔ یہ ہے نا قابل تقسیم وحدت۔ سائنسی انکشافات انسانی ذہن کو اس طرف لا رہے ہیں۔ اب تو امریکہ میں بیٹھا ہوا انسان یہاں ان ذرائع رسل کے ذریعہ تصویر، رنگ، آواز تک سامنے آ رہی ہے۔ فاصلے کس طرح ختم ہو گئے ہیں وحدت ہوگئی ہے۔ چاند پر جانے والوں کے تمام حالات زمین پر بیٹھا ہوا آدمی اسے لمحہ لمحہ دیکھ رہا ہے۔ یہ ہیں وحدت کے روز بروز کے انکشافات۔ تو انسانیّت کی تخلیق بھی جس طرح ایک وحدت سے ہوئی ہے اس طرح سے یہ آخرالامر ایک نا قابل تقسیم وحدت ہو جائے گی۔ (بعث) اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾ (31:28)۔ یہ افسانہ نہیں ہے یہ تو سن کر اور دیکھ کر کہا جا رہا ہے

اس ذات کی طرف سے جس کے سامنے Enternal Now ہے۔ یہ بات بدو کو بھی اور آئن سٹائن کو بھی کہی جارہی ہے۔

Time کے سلسلے میں برگسان اور آئن سٹائن کے انکشافات:

آئن سٹائن (1950-1879ء) کی تھیوری ٹائم کی، اس کا امام برگسان ہے (1941-1859ء) ہم نے تو کل کا دن، آج کا دن، رات، صبح۔ سورج نکلنے کے بعد دن، غروب ہونے پر رات، کل الگ اور آج الگ الگ نظر آتا ہے۔ یہ تو آسانی کے لئے ہم نے گز پر نشان ماپنے کے لئے لگا رکھے ہیں۔ یہ تقسیم اس طرح سے نہیں ہے۔ یہ برگسان نے کہا تھا۔

آئن سٹائن نے اسے prove کیا۔ كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (31:28)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ (31:29)۔ کیا دیکھا کہ یہ رات اور دن یہ سایہ اور دھوپ، یہ نہ کہیں آ رہا ہوتا ہے اور نہ کہیں جا رہا ہوتا ہے۔ اور ایسی چیز جو اس طرح سے کسی کے اندر داخل ہو جائے کہ وہ درحقیقت داخل نہ ہو اور ہمیں داخل ہوتی نظر آئے۔ اس کے لئے يُوْلِجُ کا لفظ ہے۔ کہا یہ ہے کہ دن اور رات میں نہ وہ جاتا ہے اور نہ وہ ہوتی ہے بلکہ وہ یوں ایک دوسرے کے اندر جاتے ہیں کہ تمہیں نظر آتا ہے کہ جیسے جا رہے ہوں۔ کہتے ہیں کہ برگسان ان آیت پر جھوم اٹھا تھا۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ سورج غروب ہو گیا جبکہ وہ تو کہیں غروب ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہماری بینائی کی حد اس طرح سے دیکھ رہی ہے یہ تو نہ کہیں آتا ہے اور نہ جاتا ہے بس يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ (31:29) سمجھانے کے لئے کہ یہ اختلافات تو تمہاری نظروں نے پیدا کئے ہیں۔ ورنہ یہ تو ایک نفسہ واحدہ کی طرح ہے۔ درخت کی پتیاں الگ الگ نظر آتی ہیں۔ خزاں میں تو یہ پتیاں نظر نہیں آتیں مگر بہار میں ایک ایک الگ نکل رہی ہوتی ہے جبکہ وہ پورا درخت ایک وحدت ہے۔ زمین کو ساکن مانا جاتا تھا۔ قرآن کہہ رہا ہے وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ز كُلٌّ يَّجْرِىْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (31:29)۔ یہ ساکن نہیں ہیں۔ تیزی سے چل رہے ہیں ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ ایک متعینہ مدت کے لئے۔ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۝٢٩ (31:29) یہ قانون تمہاری زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ اپنی طرف سے بھی دیکھو ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (31:30)۔ ابدیت صرف اس کے قوانین کو ہے۔ یہ نظریہ ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا۔ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ لا (31:30) اس کے علاوہ سارے نظریات تخریبی اور مٹ جانے والے ہیں۔ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۝٣٠ (31:30)۔ الحق کا ثبوت صرف اس کی علو اور کبریائی اپنی داخلی دنیا میں قائم کرنے سے ملے گا۔ اقتدار اور حاکمیّت صرف اس کے قوانین کی ہو تو تمہیں بھی اس طرح بلندیاں اور حاکمیّت مل جائے گی۔ وہ حق ہے باقی سارے نظامہائے حیات تخریبی ہیں جو باقی نہیں رہ سکتے۔

سپیشل تھیوری آف ایولوشن کی قرآنی تردید

غلط العام:

چودہ صدیاں پہلے نہیں بلکہ اس سے ہی بہت پہلے تک، کائنات کی تخلیق کے متعلق تمام مذہبی کتابیں، تورات اور دیگر مذاہب کی کتابوں میں یہی بات سامنے آتی ہے کہ خدا نے کُن کہا اور پھر کائنات وجود میں آ گئی۔ یہ چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، سمندر، مویشی، حیوانات اور انسان بھی، یہ تمام اس شکل میں پیدا ہوگئیں اور اس شکل میں، اس طرح سے پہلے دن سے آج تک چلی آ رہی ہیں۔ یہ پہلا تصوّر نہیں تھا بلکہ دو اڑھائی سو سال پہلے تک آج سے یہی تصوّر تھا۔ یورپ کے تمام مفکرین کے ہاں یہی تصوّر تھا۔

دو یا تین صدیاں قبل خارجی کائنات اور انسان کی تخلیق کے متعلق سائنسی تحقیق کا آغاز:

یہ نظریہ کل تک، مذہبی دنیا اور علم وفکر کی دنیا کا ایک مسلّمہ تھا اب یہ تین صدیاں قبل یہ نظریۂ ارتقاء نے انکشافات کئے ہیں کہ خارجی کائنات انسانوں سمیت پہلے دن سے اس شکل میں سامنے نہیں آ گئی تھی۔ بلکہ ہر شے کا آغاز خام سی شکل (Crude) بڑے پست درجہ میں ہوا۔ تو پھر یہ ابتداء ہزاروں، لاکھوں سال کی منزلیں طے کرتی ہوئی Evolve کرتی ہوئی یعنی بنتی اور ابھرتی ہوئی موجودہ شکل میں پہنچی۔ یہ تخلیق Revolution (انقلاب) سے نہیں ہوئی بلکہ Evolution سے ہوئی۔ "Evolve" یعنی بننا اور ابھرنا سے مراد ایک شے جو پست درجہ کی ہے اس میں سے کوئی دوسری شے اس سے بہتر نکلے اور وہ آگے بڑھے اس طرح سے رفتہ رفتہ بتدریج مختلف منازل طے کرتے ہوئے وہ آگے پہنچے۔ اسے ویسے تو ڈارون (83-1809) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مگر اس سے پہلے بھی تھی۔ اس پر ان دو صدیوں میں بڑا کام ہوا ہے۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق:

قرآن نے ایک عالم امر اور دوسرا عالم خلق کہا ہے۔ یورپ کا بڑا مفکّر Patison (1931) کہتا ہے کہ یہ قوم ہمارے مقابلہ میں بڑی advantageous پوزیشن میں ہے۔ ہماری زبان میں تخلیق کے لئے صرف ایک ہی لفظ ''Creation'' ہے۔ جبکہ ان کے ہاں دو الفاظ عالم امر اور عالم خلق ہیں۔ یہ الفاظ ان کے ذہن کی بلندی بتا رہے ہیں۔ اب یہ امر سمجھنے کے لئے مثال تو انسانوں کی دی جاسکتی ہے کہ خدا کے ذہن میں تخلیق سے پہلے ایک تصوّر imagination تھا۔ جیسے کوئی آرکیٹیکٹ بلڈنگ بنانے سے پہلے اس

کے ذہن میں ایک نقشہ ہوتا ہے۔ جبکہ اس چیز کی محسوس شکل ابھی نہیں ہوتی۔ مگر اس سکیم کے سارے خدوخال اس خالق کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ تو اسے پھر وہ ڈرائنگ کے ذریعہ نقشہ پر لاتا ہے تو تعمیر شروع کرنے پر تخلیق کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی کسی اسکیم کا محسوس شکل میں آنے کا جو مرحلہ ہے جسے تخلیق کہا جاتا ہے۔ تو اس کا پہلا حصّہ وہ عالمِ امر ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی جو قاعدے اور قانون کے تحت عمل میں آئے گی تو یہ اسکیم کا مرحلہ، نقشہ بنانے کا مرحلہ، عالمِ امر کتنا اہم مرحلہ ہے اور یہیں سے یہ بات سامنے آ جائے گی کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات اتفاقاً کسی طرح سے وجود میں آ گئی تھی تو جو چیز اس طرح سے کسی سکیم کے ماتحت، سوچے سمجھے تصوّر کے مطابق محسوس شکل یا تخلیق میں سامنے آئے اسے تو بائی چانس نہیں کہا جا سکتا قرآن نے اس تصوّر کو کہ ہر چیز مکمل شکل میں پیدا کر دی کاٹ کر رکھ دیا۔

اب چونکہ اس کا آغاز یعنی عدم سے وجود میں کیسے آ گئی؟ اس کے متعلق ذہن انسانی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس لئے سائنسدانوں نے کہا کہ بس یہ کسی نہ کسی طرح سے وجود میں آ گئی۔ قرآن کسی نہ کسی طرح سے نہیں کہتا اس کے ہاں ایک عالم امر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ یونہی بائی چانس وجود میں نہیں آ گئی بلکہ اس کے خالق نے پہلے ایک سکیم مرتب کی۔ ایک نقشہ، ڈیزائن، اس کے سامنے تھا۔ پھر اس کے مطابق اس تخلیق کی ابتدا کی۔ گویا یہ بائی چانس نہیں ہوئی بلکہ ایک سکیم کے تحت ہوئی۔

نظریۂ ارتقاء قرآن کی زبانی:

اب آیئے چودہ سو سال قبل اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا (32:4)۔ ارض وسموت اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے وہ اللہ نے تخلیق کیا۔ کیا کُن کہہ دیا اور ہر شے اپنی اس شکل میں جس میں آج موجود ہے وہ وجود میں آ گئی؟ کہا نہیں یہ تخلیق تو وہ مرحلہ ہے جب کوئی شے محسوس شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔ بات اس سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ اگلی ہی آیت میں واضح کر دیا۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۝ (32:5)۔ عالم امر میں سکیم مرتب ہوتی ہے۔ یُدَبِّرُ (32:5) غور وفکر کے لئے دیگر سینکڑوں الفاظ تھے۔ یہ لفظ کیوں چنا؟ (د ب ر) مادہ ہے۔ معنی کسی شے کا آخری حصّہ۔ کسی شے کا انجام، آخر میں جو آئے۔ کسی شے کے نقطۂ تکمیل تک۔ اس کو سامنے رکھ کر۔ آغاز سے تکمیل تک کے تمام مراحل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ارض سے سماء کے سفر کی روئداد ہے۔ یُدَبِّرُ کہ انجام کار اس شے نے کیا بننا ہے اور سکیم وہی کامیاب ہوتی ہے جس میں سکیم بنانے والا یہ دیکھے کہ آخر میں اس نے کیا بننا ہے۔ یعنی وہ ابتداء پر نہ پہنچے بلکہ یہ دیکھے کہ اس نے آخر الامر کیا بننا ہے۔ اسے سامنے رکھ کر پھر سکیم کو چلائے۔ اس کا جو الامر ہے اس کی جو کائنات کی تخلیق کی سکیم ہے۔ اس کے آخری نقطۂ تکمیل کو سامنے رکھ کر اس کی ابتدا کرتا ہے۔ سماء کے معنی ہم آسمان اور ارض کے معنی زمین لیتے ہیں۔ تو یہ بھی معنی ہیں مگر بنیادی طور پر سماء بلندی اور ارض پستی کو کہتے ہیں۔ پہلے یہ سکیم بلندی پر طے ہوتی ہے تو تخلیق کا آغاز کہ امر محسوس شکل میں سامنے آ جائے تو امر جو سماء کی بلندیوں میں طے ہوئی تھی اس کو ارض سے یعنی پست ترین نقطہ سے شروع کرتا ہے۔ اس سکیم کا آغاز پست ترین درجہ سے کرتا ہے۔

ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ (32:5) پھر سے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔آگے بھی بڑھ رہی ہے اور بلند بھی ہو رہی ہے۔یَعۡرُجُ کا مادہ ''ع رج'' ہے۔عُرُوۡجٌ۔سیڑھیوں کی طرح اوپر چڑھنا درجہ بدرجہ۔بتدریج بلند ہونا، درجہ سیڑھی کے ڈنڈے کو جو بلندی کی طرف لے جائے۔عرّوج میں بلندی مگر مدارج کی رو سے۔معراج اس لئے سیڑھی کو کہتے ہیں اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۵۶﴾ (11:56)۔ساتھ ہی وہ ذی المعارج بھی ہے۔

ان مدارج، ارتقائی منازل کے لئے قدرت کا ایک ایک دن پچاس پچاس ہزار سال ایک شے سیدھی بھی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ اونچا بھی چڑھتی جاتی ہے۔غبارے یا جہاز کی طرح فوراً اونچا نہیں بلکہ بتدریج مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر جاتی ہے۔خدا ذی المعارج اور رفیع الدرجات ہے۔سیڑھیوں کے درجات کے ذریعہ، بتدریج یکلخت نہیں۔یہی تو ارتقا ہے۔نقطۂ آغاز سے آہستہ آہستہ اس نے تکمیل تک پہنچنا ہے۔عرّوج ہے بلندیاں مگر درجہ بدرجہ یکلخت نہیں۔مراحل میں سے یوم سے مراد مرحلہ، منزل، پیریڈ، کہا کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۵﴾ (32:5)۔ایک ایک روز تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار برس کا ہے۔دوسری جگہ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ ﴿۴﴾ (70:4)۔کہا ہے۔بتدریج ہر مرحلہ میں لاکھوں ہزاروں سال میں ہر شے اس نقطہ تک جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے پہنچتی ہے۔

منزل کے لئے سمت (Direction) کی اہمیّت:

اب اس ارتقاء میں بتدریج جانا بھی ہے اس کے لئے اِلَیۡہِ کہا۔جس میں سمت ہے۔منزل تک پہنچنے کے لئے سمت Direction کا ہونا ضروری ہے۔ڈائریکشن (سمت) بڑی اہم چیز ہے۔ایک کتاب ہے Gilbert Keith (1936) کی An Essay on Heretics میں ایک جگہ لفظ ترقی یا پروگریس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بے معنی ہو جاتا ہے تاوقتیکہ سمت کا تعین نہ ہو اور سمت بے معنی ہوتی ہے۔اگر آپ Destination نصب العین کا تعین نہ ہو۔اس آیت میں الیٰ سمت ہے۔الیہ میں ہ نے بات واضح کر دی کہ وہ نقطۂ تکمیل جو اس کے لئے طے کیا گیا ہے یہ اس لئے کہ آگے بڑھنے اور بلند ہونے کی جو ڈائریکشن ہے اس نقطۂ تکمیل کی طرف ہے۔ہمارے ہاں ترقی کے لئے ارتقا کہا ہے۔رقی کے معنی بھی بلند ہونا لیکن قرآن نے اس کے لئے عرّوج کا لفظ استعمال کیا ہے اس میں ہر شے کے آگے بڑھنے اور زندہ رہنے کے لئے حرکت وجدوجہد ضروری ہے۔اگر اس راہ میں جو رکاوٹیں، موانعات آتے ہیں اور ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے جو شے اس تصادم میں غالب رہے وہ زندہ رہتی ہے جب راستہ میں اس مانع کو چھوڑ دے تو وہ ایک قدم آگے بڑھتی ہے اسے ارتقاء کہتے ہیں یہ اس کی بنیاد ہے۔وہ جو پرانے زمانے کے Fossils (آثار متحجّرہ) جو زمین سے برفوں میں دبے ہوئے پنجر نکلے ہیں۔یہ بڑے بڑے عظیم الجثہ جانوروں کے ہیں۔یہ وہ تھے جن میں صلاحیت ان موانع کے مقابلہ کی ناپید تھی۔تو یا وہ وہیں جو ٹھٹھر کر، جامد ہو کر رہ گئی یہ ہے قرآن جسے جہنّم یا جحیم کہتا ہے۔اور جن میں یہ صلاحیت تھی وہ آگے بڑھ گئیں۔اقبال کی نظم ''ارتقاء''۔

؎ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

حیاتِ شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشا کشی زم و گرما، تپ و تراش و خراش — زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید — میان قطرۂ نیساں و آتش عنبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی
مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند — ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

شراب کو کشید کرنے والے انگور کے دانہ کو توڑتے ہیں تو اس میں رس ہوتا ہے۔ نشہ نہیں ہوتا یہ ارتقا کی پچھلی منزل ہے جب تک وہ ٹوٹتا نہیں تو اگلی منزل میں نہیں پہنچتا۔ جب ٹوٹ کر اگلی منزل میں آتا ہے تو وہی شیرہ شراب بن جاتا ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (32:6)۔ اب اس شے میں جو ممکنات موجود ہیں جس کے لئے آغاز ہوا ہے وہ ابھی تک مشہود ہو کر سامنے نہیں آئی۔ یعنی مضمر صلاحیتیں بآرور نہیں ہوئیں ابھی تک تو وہ غیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نے کیا بننا ہے اور اسے شہادت کا بھی علم ہے کہ وہ کیا بن گئی ہے یعنی اس شے نے آخرالامر کیا بننا ہے اور کتنا بن چکی ہے۔ اس لئے وہ شے آگے چلے گی تا کہ غیب مشہود ہو جائے۔ یہ ہے رَّحِيْمُ اب اس ذرۂ ناچیز کو پہاڑ بنانے کے لئے قوّت کی ضرورت ہے۔ غلبہ کی ضرورت ہے۔ پھر ان کو اس طرح سے اس ارتقاء کے راستہ پر چلانے کے لئے بڑی قوّت اور غلبہ کے لئے وہ العزیز ہے۔ لیکن یہ غلبہ تو نشوونما کے لئے ہے اور وہ بھی بلا معاوضہ پھر اس ڈائریکشن پر چلانے کے لئے اس کے پاس قوّت بھی ہے۔

محدود انسانی فکر کی غلط نگہی نے پوری انسانیّت کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے:

جانوروں کو دیکھا اب ارتقا میں یہ اس کی آخری منزل ہے۔ وہ قوانین فطرت کے تحت زندگی گزار کر انہی طبعی قوانین کے تحت مر جاتا ہے۔ اسے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی سمجھ کر انسان کے لئے بھی یہی فارمولا استعمال کر کے اسے حیوانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ یہ بھی انہی کی طرح زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔ دماغ بڑا ہوا اور گردن ہوٹیڑھی تو ان کی غلط نگہی کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ اب زندگی کا نصب العین موت ہوگئی۔ اور حیوانات کے مقابلہ اور لاانتہا قوتیں کہ ایک ہتھیار سے ساری دنیا کو بھسم کر دے۔ ساری قوّتیں دوسرے انسانوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں کیونکہ اس بلند نصب العین کو انہوں نے ختم کر دیا۔ ساری چیزوں سے انکار کر دیا۔ یہ جوان کی زندگی کا یہ تصوّر کہ زندگی بس یہی ہے۔ یہ ہے تہذیب مغرب۔

؎ یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد — زیر گردوں رسم لا دینی نہاد
در نگاہش آدمی آب و گِل است — کاروانِ زندگی بے منزل است

قرآن نے کہا کہ ٹھیک ہے یہ تخلیق کا آغاز پستی سے ہوتا ہے اور بلند سطح تک جاتا ہے۔ ایک منزل تک ہر شے جاتی ہے آم کی گٹھلی کی انتہا آم ہے یہ اس کی انتہا ہے۔ شیر کا نصب العین شیر، بکری کا بکری۔ دس لاکھ سال پہلے اس دور میں آج بھی اس کے لئے یہی نقطۂ تکمیل ہے۔ مگر انسان ان سے الگ تھلگ ایک نئی منزل انسانیّت رکھتا ہے۔ الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ (32:7)۔

یہ شے تخلیق کر کے اس میں اعتدال رکھ دیا۔ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ‌ۚ (32:7)۔انسان کی ابتدا بھی دیگر حیوانات کی طرح بے جان مادے سے کی گئی ہے ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ‌ۚ (32:8)۔پھر اسے منازل میں سے گزار کر جہاں اس کی افزائش نسل عورت اور مرد کے اختلاط سے ہوتی ہے۔ یہ تو حیوانی سطح ہے حیوانی بچہ کو اس سطح پر چھوڑ دیا مگر اسے ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ‌ؕ (23:14)۔ یہاں ہونے کے بعد اسے ایک اور مخلوق بنا دیا۔ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ (32:9)۔اب یہ صاحب ارادہ ہو گیا تو وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ‌ۚ (90:10)۔اور کہا گیا اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ‌ۙ (41:40)۔اب کائنات میں یہ واحد مخلوق ہے جو تخاطب کے قابل ہو گئی۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ‌ؕ (32:9)۔اب ضمیر غائب کی جگہ ضمیر مخاطب (سیکنڈ پرسن پروناؤن) آ گیا۔ اب منزل اِلٰى رَبِّكَ الۡمُنۡتَهٰى (53:42) تمہاری منزل اب پروردگار تک ہے۔ سیکولرازم نے تو انتہا پر جا کر موت سے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اور تصوّف والوں نے تو ذات کو خدا کی ذات میں مدغم کر کے اس سے چھٹکارا پا لیا۔ ''میں'' نہ یہاں رہی اور نہ وہاں رہی۔ قرآن نے فِيۡ رَبِّكَ الۡمُنۡتَهٰى نہیں کہا کہ تمہاری انتہا خدا کے اندر ہے بلکہ سمت وہی ہے اِلٰى رَبِّكَ الۡمُنۡتَهٰى (53:42) کہ اس کی صفات اپنے اندر منعکس کرتے جاؤ۔ خدا کے اندر جذب ہو جانا تو غیر قرآنی تصوّر ہے۔ یہ وحدت وجود کا تصوّر تو یہودیت، عیسائیت، ویدانت کا تصوّر تھا۔ قرآن کا منتہیٰ تو یہ ہے ؎

بخود محکم گذر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحرِ نورش

قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوّت اس کی تعلیم اور حقائق ہیں

قرآن کا منزل من اللہ یا انسانی فکر سے ماوراء سرچشمہ سے آنا ہے۔ وہ اس کی معنویت اور اس کی تعلیم اور حقائق ہیں۔ جہاں تک اس کے اسلوب بیان اور الفاظ کے چناؤ کا تعلق ہے وہ بھی کچھ کم معجزہ نہیں ہے۔ عربی زبان کی وسعت اور پھر خدا کا الفاظ کا چناؤ حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ (29:64)۔ یہ قریبی زندگی ہے اس کی دلچسپیاں آخرت کے مقابلہ میں تو عارضی ہیں یہ تو صرف ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس آیت میں کہا وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ (29:64) اصل زندگی تو وہ ہے جو اس کے بعد شروع ہونے والی ہے۔ لفظ حَيَاةٌ اور الْحَيَوَانُ ۘ (29:64)۔ مادہ دونوں کا ایک ہے۔ عربی زبان میں ابواب اور اوزان ہوتے ہیں مثلاً فَعِيْلٌ کے وزن پر رَحِيْمٌ ہے ہر باب کے وزن کے بدلنے سے بنیادی معنی وہی رہتے ہیں لیکن ان معنوں میں تخصیص ہو جاتی ہے۔ وسعت آ جاتی ہے اور وہ کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ معنی حرکت و نمو داس سے سانپ کو حَيَّةٌ کہا وہاں سے یہ حَيٰوةٌ کا لفظ لیا اور حیا کا لفظ بھی یہیں سے آیا۔ اب باب بدلا تو یہ فَعْلَانُ کے وزن پر آ کر الْحَيَوَانُ ہو گیا۔ فَعِيْلٌ میں تو اس طرح کے درجہ بدرجہ، تسلسل سے قاعدہ کے مطابق جو پیچھے سے چلا آ رہا ہے اگر کہیں ارتقاء کے اندر فجائیت ہو گئی کہ ان کڑیوں کے بالکل خلاف کوئی یکا یک نمودار ہو جائے تو یہ فَعْلَانُ کے وزن پر ہو گا یہ آج سے محققین کہہ رہے ہیں کہ درمیان میں اگر کہیں کوئی ایسی شے نمودار ہو جائے جو پچھلی کڑیوں کی پیدا کردہ نہ ہو۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیسے ہو جاتی ہے اب یہ دونوں سائنسز پروگریسو اور فجائی ارتقاء الگ الگ ہو گئی ہیں۔ یعنی حیوۃ الدنیا تو طبعی قوانین کے تابع چلی آتی ہے اس کے بعد جو زندگی ہے وہ فجائی ارتقاء کے تابع ہے اور وہ نئی زندگی ہے جس پر وہ طبعی قوانین کا اطلاق نہیں ہو گا۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ (29:64) کاش علم کی بارگاہ سے پوچھو تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔

؎ زمین خاکِ درِ میخانۂ ما فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
؎ حدیثِ سوز و ساز ما دراز است جہاں دیباچۂ افسانۂ ما
؎ بگوشم آمد از گردوں دم مرگ شگوفہ چوں فروریزد برے ہست

درخت کا شگوفہ گرتا ہے تو پھل پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کو شجرِ حیات کا شگوفہ اور اصل حیات کو شگوفہ گرنے کے بعد پھل کہا۔

ذات کی نشوونما وآلحیوٰان کی نشوونما کا انحصار قرآنی اقدار پر ہے:

طبعی قوانین کو تو سائنسی انکشاف سے معلوم کیا جا سکتا ہے مگر اقدار یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں یہ تو نہ عام قوانین سے پیدا ہو سکتی ہیں اور نہ ہی ان کا Injection کسی کے اندر کیا جا سکتا ہے۔ آپ چوری کو قانوناً روک سکتے ہیں مگر قانوناً کسی کو اس پر آمادہ نہیں کر سکتے کہ محتاج کی مدد کر و اس کا تعلق تو اقدار سے ہے۔ یہ دنیا بھی ضروری ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201)۔ جبکہ وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201)۔ یہ اقدار سے ہوگا۔

مانندِ سحر صحنِ گلستان میں قدم رکھ — آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن — ہاتھوں سے تیرے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

وحی سے تعلق توڑنا تو سحر کی نورانیاں ختم ہو جائیں گی۔ کوہ و بیاں سے ہم آغوش یہاں مومن اور مادہ پرست ایک سطح پر ہیں۔ لیکن اختصاص مومن کا ''دامن افلاک نہ چھوٹے'' اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ (53:42)۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ (96:19)۔ وہ تو وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4) آنچہ حق می خواہد آں ساز د ترا۔

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا جو قطرے کو گوہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ (32:10)۔ یہ محض فلسفیانہ نظریہ نہیں بلکہ ان کے من کا چور ہے۔ بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾ (32:10) یہ قانون مکافات عمل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔ اسے فلسفیانہ معذرتوں میں چھپا رہے ہیں کہ کہیں یہ چیز نہ ہو اس لئے اس سے انکار کر کے ساری حرامزدگیاں اور جرائم کر رہے ہیں۔

❁❁❁

سازشی عناصر

طبری سے پہلے سیرۃ النبی پر ابن اسحٰق (ایک یہودی تھا) نے کتاب لکھی اور ابن حشام اس کا پارسی شاگرد تھا۔ یہ سارا کچھ طبری نے زبانی روایات اور سنی سنائی باتوں سے 300 سال بعد لکھا۔ ایک روایت کے تحت صحابی ابی بن کعبؓ نے دوسرے صحابی سجادؓ سے پوچھا کہ سورہ احزاب میں کتنی آیات ہیں کہا اب تو 73 آیات ہیں مگر میں نے اس میں سورۃ البقرہ جتنی آیات یعنی 286 آیات دیکھی تھیں یعنی اس زمانے میں ہی ایک سورۃ میں 213 آیات گم ہو گئیں تو یہ تھے وہ شکوک و شبہات جو پیدا کر دیئے جاتے تھے۔ اس لیے احتیاط برتنے کا کہا گیا تھا۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۥ الْخَنَّاسِ ۝۴ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶ (114:1-6) ان کو وارننگ دے دی تھی۔ متنبہ کر دیا گیا تھا ان سازشوں سے۔

❁❁❁

عورت صرف امورِ مملکت میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے ساتھ ساتھ برابر کی شریک ہوگی

قرآن نے تَبَرُّج سے منع کیا ہے یعنی نمود و نمائش و زینت کی چیزوں کی اجازت دی ہے۔قرآن نے عورت کو بلند مقام دیا ہے یہ تو مردوں کی سازش ہے کہ تیرا وجود مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ تو مرد کے جذبات کی تسکین کے لئے بنائی گئی ہے۔اس باطل نظریہ کی قرآن نے تردید کی ہے۔جذبۂ نمود و نمائش غیر شعوری طور پر وہ جذبہ بٹھا دیا گیا ہے کہ مردوں کی نگاہوں میں جاذب نظر بن جائے۔یہ جذبہ تو وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاهِلِيَّةِ الۡاُوۡلٰى (33:33)۔نمود حسن کے جذبہ کا نمایاں کرنا یہ تو عرب جاھلیہ کا ایک غلط دستور تھا۔اسلام نے آکر اس سے منع کر دیا۔قرآن نے تو عورت کو مرد کے ساتھ زندگی کے ہر گوشہ میں ہمدوش کر دیا ہے۔اگرچہ قانون میں سارے صیغے، ضمیریں بھی مذکّر کی ہوتی ہیں مگر قانون میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ جہاں بھی اس قسم کے صیغے یا ضمیریں آئیں تو ان سے مراد مرد اور عورت دونوں ہوں گے۔قرآن جہاں مذکّر کے صیغے استعمال کرتا ہے تو اس سے مراد دونوں مذکر اور مونث ہوتے ہیں۔اس لئے ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ مرد اور عورت کو زندگی کے ہر گوشے میں شانہ بہ شانہ، دوش بدوش چلنے کے لئے بنایا ہے۔دونوں کے وظائف زندگی میں حیاتیاتی لحاظ سے اتنا فرق تو ہے مگر یہ دونوں ایک ہیں۔قرآن نے یہ بتانا تھا۔اعجاز ملاحظہ کریں کہ عام قاعدہ صرف مذکّر کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور مونث اس میں شامل ہوتی ہے لیکن چونکہ یہاں نمایاں کرنا تھا اس لئے دونوں کا ذکر ہے۔

اِنَّ الۡمُسۡلِمِيۡنَ وَالۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡقٰنِتِيۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيۡنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالۡخٰشِعِيۡنَ وَالۡخٰشِعٰتِ وَالۡمُتَصَدِّقِيۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيۡنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالۡحٰفِظِيۡنَ فُرُوۡجَهُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيۡنَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِيۡمًا۝۳۵ (33:35)۔کونسی خصوصیّت ہے جو باقی رہ گئی۔

امورِ مملکت میں برابر برابر کی شریک:

ہر جگہ جو امورِ مملکت کے فرائض ہیں قرآن نے اس کے لئے ایک اصطلاح استعمال کی ہے۔دو نہیں۔يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ (9:71)۔کیا اس فریضہ میں عورتیں بھی شامل ہیں۔کہا:

674

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ م (9:71)۔ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔خدائے بصیر ہے اس کو پتہ تھا کہ یہ بحثیں چلیں گی کہ عورت بھی حصّہ لے سکتی ہے یا نہیں۔آ گے ہے يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (9:71)۔دونوں کو اس فریضہ میں شامل کر دیا ہے۔اب تو اس بحث کی گنجائش ہی ختم ہوگئی۔ یہاں عورتوں اور مرد دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔اس لئے تجھے یہ فریب دیا گیا ہے کہ تو صرف مرد کے جذبہ کی تسکین کے لئے نمود و نمائش سے کام لے جو کہ جاھلیۃ اولیٰ کا تبرّج ہے۔

❁❁❁

اسلامی نظام میں کوئی شخص اپنی اطاعت نہیں کرا سکتا چاہے رسول ہی کیوں نہ ہو۔ اوپر سے سے نیچے تک ہر فرد کی حیثیت برابر ہوگی۔ رسول کے بشری اور وحی کے تقاضوں کا فرق

نظام یہ ہو گا وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ (33:36)۔ خدا اور رسولؐ نظام خداوندی کے فیصلے یعنی میں مردوں اور عورتوں کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ ان کو بطیب خاطر فیصلہ کا پابند ہونا ہوگا۔ اس میں ہر فرد کی حیثیت مساوی ہوگی۔ آگے ہے وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ﴿۳۶﴾ (33:36) سرکشی ان فیصلوں کی غلط راستوں پر ڈال دے گی۔ مومن وہ ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ (4:65)۔ دل کی گہرائیوں سے ایسے فیصلہ کی پابندی کرنے والا مومن ہوگا۔

اسلامی مملکت میں کوئی شخص چاہے رسول ہی کیوں نہ ہو اپنے فیصلوں کی اطاعت نہیں کرا سکتا:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ (3:79)۔ اطاعت صرف قوانین کی کتاب کے ذریعہ۔ نبی بھی ان قوانین کی اطاعت کرتا ہے اور دوسروں سے بھی کراتا ہے۔ اگرچہ نظام کے فیصلے نبی کی طرف سے صادر ہوتے ہیں۔ اس سے رسول کی ذاتی اطاعت مقصود نہیں۔ سارا قرآن شاہد ہے کہا کہ اگر میں کسی حکم کی ارادتاً معصیت کروں تو میں بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

اطاعت کے سلسلے میں زید بن حارثؓ کی مثال:

اب قرآن کا اعجاز دیکھیں کہ کہنا یہ تھا کہ ایک نبی بھی اپنا ذاتی فیصلہ اپنے قریب ترین آدمی سے نہیں منوا سکتا تو اس کے لئے ایک بیّن مثال سامنے لے آیا۔ قرآن میں صرف اس صحابیؓ کا ذکر آیا ہے۔ زید بن حارثؓ جو حضرت خدیجہؓ کے پاس غلام تھے اور رسولؐ نے ان کو بعد میں آزاد کر دیا۔ اس کے بعد انہیں بیٹے کا درجہ دے دیا اور پھر پھوپھی زاد زینبؓ سے ان کی شادی کر دی اور داماد بن گئے۔ اس زمانے میں عرب متبنّیٰ بنا لیا کرتے تھے۔ حضورؐ کی انتہائی کوشش تھی کہ طلاق نہ ہونے پائے۔ حضرت زیدؓ کے پاس خود گئے وہ رسول جس پر ایمان لانے سے یہ مسلمان ہوئے تھے محسن جس نے انہیں غلامی سے آزاد کر کے متبنّیٰ بنا دیا۔ ایک ممتاز

گھرانے کی خاتون سے ان کی شادی کر کے ذرۂ ناچیز کو آسمان پر چڑھا دیا گیا۔ یہ دیکھئے کہ کہنے کون جا رہا ہے اور کسے کہہ رہا ہے؟ اسے جو غلام ابن غلام، آزاد کردہ غلام، بیٹا بنایا ہوا۔ ان سے یہ کہہ رہا ہے کہ میری بہن کو طلاق نہ دو۔ مملکت کا سربراہ۔ کیا کوئی انکار کی جرات کر سکتا ہے۔ محسن اس سے کہہ رہا ہے جس پر اتنے احسانات ہیں۔ عقیدت، معاشرت، سیاست، ان سب کا تقاضا تھا کہ یہ شخص انکار نہ کرے۔ خدا کا ایک حکم ہے کہ تیرے فیصلہ کے خلاف دل میں گرانی بھی محسوس نہ کریں۔ لیکن وہاں تو دوسرا حکم بھی ہے کہ کسی نبی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی سے اپنا فیصلہ منوائے۔ زیدؓ پوچھتے ہیں یہ آپ کا حکم ہے یا خدا کا۔ کہا یہ خدا کا فیصلہ نہیں بلکہ یہ میرا مشورہ ہے۔ کہا کہ معاف فرمایئے میں اپنا فیصلہ اپنے معاملات میں بہتر کر سکتا ہوں اور طلاق دے دی۔ دل میں کوئی رنجش نہیں۔ ساری عمر زیدؓ کے ساتھ رہے بعد میں ان کا بیٹا اسامہؓ ایک لشکر کا کمانڈر مقرر رہا۔ یہ واقعہ کیوں لایا گیا ہے؟ صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے؟ اس سے زیادہ نکھری ہوئی محسوس اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ ایک طرف تیرے فیصلوں کے خلاف دل میں بھی گرانی محسوس نہ کریں۔ دوسرا سربراہ مملکت سے بھی تم اپنا حکم نہیں منوا سکتے۔ صرف مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ رسولؐ کی ذاتی رائے اور مشورہ سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اس اختلاف کا نام ''معصیت رسول'' نہیں ہوگا۔ اس لئے اس فرق کو واضح کرنے کے لئے حضرت زیدؓ کی مثال رکھی گئی ہے۔

زیدؓ کے دل میں پیدا ہونے والا خوف:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (33:37)۔ بیوی کو نکاح میں رہنے دے۔ اسے طلاق نہ دے۔ کچھ اور راستہ نکل آئے گا۔ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ (33:37) چونکہ لوگوں کا ڈر ہے اس لئے بات زبان پر نہیں لاتا۔ قریش کی خاتون اور رسولؐ سے ذاتی تعلق تو لوگ کیا کہیں گے۔ یہ باتیں دل میں آ رہی تھیں۔ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ (33:37)۔

بیٹے کی بیوی یعنی منہ بولا بیٹا سچ مچ کا بیٹا نہیں ہو جاتا:

فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ (33:37) تاکہ باقی مومن بھی یہ جانیں کہ منہ بولے بیٹے کی طلاق یافتہ بیوی سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اسلامی نظام کا صحیح نقشہ:

ایک طرف نبی کا حکم جو قرآن کا ہے صادر کرے تو اس میں ذرا برابر گرانی محسوس نہ کریں اور دوسری طرف نبی کا ذاتی معاملہ لگتا ہے۔ اہم کیوں نہ ہو۔ تو اگر دل نہ چاہے تو اس سے انکار کر دو۔ قرآن نے اس فرق کو کس قدر حسین انداز سے فرق کر کے بتا دیا کہ کسی نظام میں جو برسر اقتدار ہو تو وہ اپنی دونوں پوزیشنوں کو الگ الگ رکھ سکتا ہے۔ قرآن نے حسین ترین طریقہ سے دونوں طرف انتہا پر بٹھا کر اس فرق کو بتا دیا کہ جب خدا کا حکم ہے تو دل میں گرانی بھی محسوس نہ کرنا اور تربیّت دوسری طرف یہ ہے کہ اللہ کا حکم ہے یا آپؐ کا ذاتی فیصلہ۔ تو ذاتی فیصلہ کے ماننے کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔

ذِكْرًا تو پروگرام ہے نہ کہ پڑھنا اور درود

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ (33:41-42)۔ خدا کے قوانین کو زندگی کے ہر گوشہ میں سامنے رکھو، ہر شعبہ میں ہر میدان میں ذِكْرًا كَثِيْرًا (33:41)۔ کثرت سے، جو قدم اٹھاؤ اس کی بابت دیکھو قرآن کیا کہتا ہے۔

وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (33:42) دن رات امکان بھر کوشش کرتے رہو۔ شدت سے سرگرم عمل ہو جاؤ۔ اس لئے پوری پوری جدوجہد کرو۔ یہ ایک پروگرام بتایا گیا ہے اس کے بعد اگلی آیت۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43)۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو رسولؐ کے متعلق کہے گئے ہیں۔ آیت اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ (33:56)۔ گویا جو صلوٰت اللہ اور اس کی کائناتی قوتیں نبی پر بھیجتی ہیں وہی يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ (33:43) مومنین کے متعلق ہے۔ یہ کچھ ایسی چیز ہے جو صرف نبی کے ساتھ نہیں کر رہے بلکہ وہ جماعت مومنین کے ساتھ بھی کر رہے ہیں اب اس میں نبیؐ اور مومنین دونوں شریک ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات میں حجّ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، شکلیں وہی رکھ کر ان کا مفہوم بدل دیا گیا۔ یہ نماز، درود ان مجوسیوں کے ہاں پرستش اور دعا کو کہتے تھے۔ سَبِّحُوْهُ (33:56) کو تسبیح بنا کر اور ذکر اللہ کو درود بنا دیا یا اب ان سب کو کرنے کی بجائے پڑھنا کر دیا جو عمل اور عمل تھا۔ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ (33:56) یہ ایک انقلابی پروگرام دیا گیا تھا۔ اسے پڑھنا کر دیا گیا۔ اب یہ ملائکہ اور خدا بھی یہ پڑھ رہے ہیں۔ ''کرو'' کی بجائے ''پڑھو'' نے ملت کی سوچ کا رخ ہی بدل دیا۔ کہا یہ تھا کہ خدا اور اس کے ملائکہ بھی یہ کرتے ہیں اے مومنو! تم بھی اس طرح کرو۔ تو اس طرح سے ہم خدا اور ملائکہ کی صف میں کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ تھا مومن کا مقام بلند کہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر تم بھی یوں کرو۔

صَلّٰی علٰی کے صحیح مفہوم:

امام راغب اصفہانی (502ھ) ''المفردات فی غریب القرآن'' جو ان سب کے ہاں مستند مانا جاتا ہے اس میں صلیٰ علیٰ کے معنی ''کسی کی تعظیم کرنا۔ شاباش دینا، دعا دینا، حوصلہ افزائی کرنا، مدد کرنا پروان چڑھانا، نشوونما کرنا، کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا ہونے نہ دینا''۔ تو کہا گیا کہ خدا اور ملائکہ اس پروگرام کی کامیابی کی تائید کرتے ہیں اس کی مدد کرتے ہیں صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (33:56) تم بھی اس طرح سے ان کی مدد کرو۔ یہ ہے مورل سپورٹ، جب بھی حوصلہ افزائی کہ جب بھی ضرورت ہوئی تو اس کی کامیابی کے لئے مدد بھی کریں گے۔ یہ پروگرام تھا اور خدا کے ایسا کہنے سے یہ تائید اور حوصلہ افزائی تو ایک Catalyst کا

کام کرتی ہے۔ یہ تو ہوئے صَلِّ علی کے پہلے معنی۔

عطیات وصدقات:

نظام کے ابتدائی دور میں مالی مدد کی ضرورت تھی۔ صحابہ کبارؓ اپنی بساط سے بڑھ کے لاتے تھے۔ حضورؐ سے کہا گیا خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً (9:103)۔ ان عطیات کو قبول کرو۔ تُطَهِّرُهُمۡ وَ تُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا (9:103) ان عطیات کو اس طرح سے خرچ کرو کہ ان کی سیرت و کردار میں پاکیزگی پیدا ہوتی جائے اور ان کی نفسیاتی نشوونما میں ساتھ ساتھ ہو۔ وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ (9:103) ان کو شاباش میں دو تا کہ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ ؕ (9:103)۔

تمہاری شاباش ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی۔ اب غزوہ احزاب میں جان ہتھیلی پر رکھ کر اتنی بڑی فوج کے خلاف صف آرا ہیں تو هُوَ الَّذِىۡ يُصَلِّىۡ عَلَيۡكُمۡ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43) اس مخالف لشکر کے خلاف جو کہ لڑ رہے ہو تو کیا بات ہے اور شاباش! تمہاری کیا بات ہے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

صلوٰۃ کے ساتھ استقامت کا مظاہرہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ (2:153)۔ ان تمام معرکوں اور تصادمات میں استقامت دکھانا صلوٰۃ کے ساتھ۔ وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ وَالۡجُـوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ (2:155)۔ آگے ہے۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ۝١٥٥ الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ۝١٥٦ (2:155-156)۔ ہمارا تو ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ کرنا ہے جو کرلو۔

صلوٰۃ بھیجنے کا قرآنی مفہوم:

اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۚ (2:157) یہ صلوت ہر امتحان میں پورا اترنے والوں کے لئے ہے۔ پھر اس آیت پر آیئے۔ هُوَ الَّذِىۡ يُصَلِّىۡ عَلَيۡكُمۡ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43) یہ کاہے کے لئے تا کہ يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ (2:257) تاریکیوں سے نور کی طرف لے جائیں۔

ایک دوسری جگہ ہے: الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ (14:1) یہ ہے وہ پروگرام جس میں قرآن کی روشنی میں سارے اندھیرے اصلی شکل میں نظر آنے لگ جاتے ہیں خدا کی مدد سے مراد اس کے نظریہ کو عملی شکل دینا هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ (9:33) خدا کی مدد یہ ہے کہ اس نے دین اس مقصد کے لیے دیا تھا۔ اس مقصد کو کامیاب کرنا مومن کا خدا کی مدد کرنا ہے۔ اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ يَنۡصُرۡكُمۡ (47:7) یہ مدد مشروط ہے اس کی مدد کرنے سے تو کیا فوجیں بھیجے گا؟ کہا نہیں آگے ہے۔ وَيُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ ۝٧ (47:7)۔ تمام لغزشوں سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

صحابہ کرامؓ کا مرتبہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ حَسۡبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝٦٤ (8:64) خدا اور یہ مومن کی جماعت تمہارے لیے کافی ہیں وَتُعَزِّرُوۡهُ وَتُوَقِّرُوۡهُ ؕ (48:9) تم خدا کی عظمت اور وقار کو قائم کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡهِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (33:56) اور جو اس کے مخالف ہوں گے۔
اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا مُّهِیۡنًا (33:57) جو اس پروگرام کو ضعف دیں گے۔ کمزور کریں گے تو ان کے لیے ذلت آمیز تباہی ہے۔ اب اس کتاب کو عملی شکل دینا ہے۔ اس لیے یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ آیا ہے۔ یہ فریضہ اب اس امت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ رسول ﷺ نے یہ نظام نافذ کر کے دکھا دیا اب یہ اس امت کا فریضہ تھا کہ اس سلسلے کو آگے چلائے۔ یہ ہے وہ پروگرام جس کو ''کرنے'' کی بجا پڑھنا بنا دیا گیا۔ اگلی ہی آیت ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیۡرًا ﴿۴۶﴾ (33:45-46) ایسا نظام وحی کے ذریعہ قائم کرے جو تمام انسانوں کی نگرانی کر کے بتا دے کہ اس کے مطابق چلنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہیں اور خلاف چلنے کے کس قدر تباہ کن۔ یہ خود تو ظُلُمٰت سے نور کی طرف آ گئے۔ اَوَمَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ (6:122) قرآن سے پہلے اس مردہ قوم کو زندہ کر کے اسے نورانی قندیل دیدی تاکہ ساری دنیا میں اس کی روشنی کو لے کر چلیں۔ اب رسول کے بعد یہ ان کا فریضہ ہو گیا اس امت کا کہ جہاں جہاں تاریکیاں ہوں وہاں روشنی لے کر جائیں۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَةٍ اَکٰبِرَ مُجۡرِمِیۡهَا لِیَمۡکُرُوۡا فِیۡهَا ؕ (6:123) یہ بڑے انسانیّت کے مجرم دن رات ان سازشوں میں ہوتے ہیں کہ یہ لوگ روشنی میں نہ آ جائیں جا کر ان کی سازشوں کو ناکام بنا دو۔ یہ دنیا کی تاریکیوں کو مٹانے کے لیے مامور ہوئے تھے۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (2:143) وَّسَطًا (2:143)۔ دائرے کا مرکز جو اس کے محیط سے ہر مقام ایک ہی فاصلہ پر ہوتا ہے۔ یہ ہے مساوات کی حقیقت۔ تم ہر قوم سے یکساں فاصلہ پر ہو۔ عدل و انصاف کی بہترین مثال ہے اور مساوات کی۔ اس مثال کا بدل تو لا کر دکھایئے۔ دائرے کو بڑھا کر محط کل بنا دیں پوری کائنات پر دائرے کو محیط کر دیں اندر کا نقطہ مساوی فاصلہ پر رہے گا۔ نہ کسی سے دور اور نہ یونہی قریب۔ نہ خواہ مخواہ مخالفت کرے اور نہ کسی سے اور عایت کرے۔ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَهِیۡدًا ؕ (2:143) اور یہ رسول ﷺ مرکز ملت بعد میں جو بھی ہو وہ تمہاری کارکردگی پر نگران ہوگا۔ یہ وَّسَطًا (2:143) کی تشبیہہ ہے اب ان کا روشنی میں آنا آخری مرحلہ نہیں تھا بلکہ اس روشنی کے ذریعہ باطل کی تمام تاریکیاں توہم پرستیوں کی تاریکیاں۔ استبداد ملوکیّت کی تاریکیاں، ہامان و قارون کی تاریکیاں ان سے انسانیّت کو نکال کر روشنی کی طرف لانا تھا۔ ان کے نظام کا کنٹرول رسول ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بطور شاہد کیا۔ اب ان کے بعد سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ گاڑی اس سلسلے کی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور روشنی کا مینار نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جو قوم بھی قرآن کو پسِ پشت رکھے گی اس کا مستقبل ہمیشہ تاریک رہے گا۔ قرآن سِرَاجًا مُّنِیۡرًا ﴿۴۶﴾ (33-46) ہے۔ اپنا مفہوم خود بیان کرتا ہے یہ تو سورج ہے تم اسے انسانوں کے ذہنوں کی موم بتیوں کے ذریعہ دکھاتے ہو، قرآن تہ داماں اس لیے آ گیا کہ دیوں اور موم بتیوں سے کہہ رہے ہیں کہ ہم تمہیں دکھا رہے ہیں کہ سورج کیا ہے؟ کہاں ہے اور کیسا ہے؟

؎ ایں کتاب نیست چیزے دیگر است

انسانیّت کا بلند مقامِ احترامِ آدمیّت ہے اوراس سے محرومی جہنّمی ہے

ے وہ قصور و حور بجا بجا یہ شباب و حسن غلط غلط
مگر اس کا کوئی جواب ہے کہ یہ نقد ہے اور وہ ادھار ہے

اگر یہ معلوم ہوجائے کہ یہ ادھار نہیں بلکہ یہ بھی نقد ہے۔تو پھراس کا اثر بھی ہو۔اصل جہنّم کا عذاب تواس دنیا سے شروع ہوجا تا ہے۔جسے ان کی سازشوں نے دوسری دنیا پرڈال دیا ہے۔

شدید ترین عذاب:

قرآن نے بلند ترین مقام انسانیّتِ تکریم آدم،عزتِ نفس کودیا ہے اگرعزتِ نفس میں کہیں فرق آ گیا تو یہ ذلّت ہے۔یہ ہے جہنّم کی وہ بنیادی خصوصیّت جس میں انسان اپنے شرف وتکریم سے محروم ہوجائے۔جہاں وہ ذلیل سمجھا جائے۔تو یہی جہنّم ہے۔

جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ (2:85) ذلت یہ ہے کہ اس قوم کی حال کی زندگی ذات و رسوائی کی زندگی ہو۔جن کی روش یہ ہو۔ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ (2:85) نتیجہ: اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ (2:85) انسان بھوک،تنگی،مصائب سب کچھ برداشت کرسکتا ہے اگراسے اپنی انسانیّت کا احساس ہے۔اگرعزتِ نفس پرحرف آئے تو یہ نا قابلِ برداشت ہوتا ہے۔یہ اس دنیا کے جہنّم کا شدید ترین عذاب اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ (2:85)۔مومن کی دعا تو یہ ہوتی ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ (3:191) ہماری اس عذابِ نار سے حفاظت کر۔اگر تیری تخلیق کو بے مقصد گردانا۔اس لیے کہ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ؕ (3:192) وہ ذلیل ہوگیا۔شرف انسانیّت سے محروم ہوگیا۔جہنّم کی سب سے بڑی نشانی اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ (2:85) یہ ہے۔ النَّارَ کسی انسان کا دوسرے انسان کامحکوم ہوجانا ملوکیّت ہے اوریہی جہنّم ہے۔یادرکھیں جس معاشرہ میں کسی بھی ابن آدم کو ذلیل کیا جائے تو خدا اس معاشرے سے ناراض ہوکراسے چنگیز اور ہلاکو کے حوالے کردیتا ہے۔کہ جاکراس پوری قوم کی عزت نفس کومٹا کر ذلیل کردو۔خدا کا بسیرا جب معاشرے میں ہوتا ہے گورنر کی زبان پرسہواً ایک دفعہ کسی کے لیے(غیر مسلم) خدا تجھے ذلیل کرے'' نکل گیا جب احساس

ہوا تو کانپتے ہوئے عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس نے کہا کہ حب کی زبان سے کسی کے لئے ذلت کا لفظ نکل جائے تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں، بھلا گورنر کیسے رہ سکتا ہے! ملوکیّت، بادشاہت یا جو بھی کہیں۔ کسی انسان کا دوسرے انسان کے محکوم ہو جانا۔ یہی تو سب سے بڑا جہنّم ہے۔ یہ تو تکریم انسانیّت کے خلاف ہے۔

ملکہ بلقیس کی زبان سے لطیف انداز میں جو بات آئی ہے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ (27:34) یہ ہے ملوکیت جو ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ کوئی نظام ہوا گر وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) نہیں ہے تو وہ ملوکیّت ہے۔

جہنّم کی نوعیّت :

جہنّم یہ لفظ ہی سامی النّسل قوم کے ہیں۔ اس کے اندر سارے معانی پوشیدہ ہیں۔ یہ عبرانی زبان میں تھا۔ قرآن میں یہ وہیں سے آیا ہے۔ بیت المقدس کے شمال میں وادی جہنّم "جیِ ھنُّوم"۔

وہ وادی جہاں انسان ذبح کر کے اسے جلا دیا جائے۔ قرآن میں جہنّم کے داروغہ کا نام بھی "مالک" ہے یعنی انسان کا دوسرے انسان پر مالک ہونا وہاں سے ملوکیّت ہے کہ انسانوں کا انسانوں پر حکومت کرنا یہ جہنّم کا معاشرہ ہوتا ہے۔ تو وہ معاشرہ جہاں کوئی ایک بھی ذلیل ہو جائے تو وہ جہنّمی معاشرہ کہلاتا ہے۔

قوموں کے مقابل قوم کی تذلیل :

کون سی قوم جہنّم میں ہوتی ہے۔ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ۝ (16:62) یہ پیچھے وہ جانے والی قوم۔ جس سے دوسری قومیں آگے چلی جائیں ایسی قوم دوسری قوموں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاتی ہیں۔

نداند آں غلام احوالِ خودرا
کہ دوزخ را مقام دیگرِ گفت

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝ (79:36) یہ وہ صرف دیکھنے والے کو نظر آ سکتا ہے۔

قرآن کا اقتصادی نظام سرمایہ داری کے بالکل برعکس ہے

سرمایہ داری کا نظام تو یہ ہے کہ جس طریقہ سے چاہو دولت اکٹھی کرلو اور جس طرح چاہو اسے صرف کرو کوئی اس میں مداخلت نہیں کرسکتا۔ یہ ہے کیپٹل ازم کی ایک شق کہ اس میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ جس طرح سے جی چاہے کماؤں۔ جس طرح سے ''مرادسوسائٹی کے قوانین کے خلاف نہ جاؤں۔ یہ قوانین، یہ دولت مند ہی اسمبلی میں بیٹھ کر بناتے ہیں۔ وہ سارا ان کے حق میں بنتا ہے۔ یہ کارخانہ دار کبھی بھی مزدوروں کے حق میں قانون نہیں بناسکتے۔ اس لیے قرآن نے جسٹس صرف اس کو کہا ہے جو قرآن کے مطابق ہو کیونکہ تمہارا قانون ہی مبنی بر عدل نہیں ہے۔

دولت کمانا بری بات نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ کماؤ مگر اسے کیسے استعمال میں لاتے ہو۔ اصلی بات یہ ہے۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ وَیَقۡدِرُ لَہٗ (34:39) جو چاہے تو ان قوانین کے تحت زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرلے اور جو چاہے اپنے آپ کو محروم کردے۔ اس کے لیے قوانین مقرر ہیں۔ محنت اور تگ ودو کرکے زیادہ سے زیادہ کماؤ۔ بنیادی بات یہ ہی ہے۔ اصل سوال تو اس کے صرف کرنے کا ہے۔ اگر اسے مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ (13:17) کے لیے کرو تو پوری محنت سے کمائی ہوئی دولت پر اعتراض نہیں ہے مگر جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ (104:2) اور وَجَمَعَ فَاَوۡعٰی (70:18) جمع کرکے پھر اسے بند کر دیتا ہے۔ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ اس طرح سے دوسروں کو محتاج بنا دیتا ہے پھر اس میں عدم مداخلت کا قانون بنادیا ہے۔

قرآن نے تو منفعت عامہ کے لیے ''انفاق'' کی اصطلاح دی ہے۔ اس کا ترجمہ انہوں نے کردیا۔ ''خرچ کرنا'' گویا جرم یہ ہوگیا کہ روپیہ اکٹھا کرکے خرچ نہ کرے۔ اگر خرچ کرے تو مقصد پورا ہوگیا۔ کارخانے زیادہ سے زیادہ لگا تا جائے۔ مزید انوسمنٹ کرتا جائے۔ حالانکہ یہ تو خرچ کرنے کی ضد ہے۔ ربوٰ ہے۔ یہ تو سرمایہ داری کی ضد ہے جس میں صرف ذاتی اغراض ومقاصد کے لیے روپیہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ جبکہ ''اِنۡفَاق'' ''منفعت عامہ کے لیے کھلا رکھنا'' ہے جو دونوں طرف سے کھلا ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک نظام وہ ہے کہ سمیٹتے جاؤ مگر اسے منفعت عامہ کے لیے کھلا نہ رکھو۔ جب کہ دوسرا یہ قرآن کا کہ زیادہ سے زیادہ محنت کرو اور ضرورت کے مطابق رکھ کر تھیلی کا دوسرا منہ بھی کھلا رکھو۔ سرمایہ کا جمع کرنا اور نوع انسانی کو اس سے محروم رکھنا یہ ہے سرمایہ داری جو قرآن کے خلاف ہے اوپر آیت میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ کماؤ اس کے قوانین کے تحت۔ اس کے بعد وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَہُوَ یُخۡلِفُہٗ

وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (34:39)اورقانون یہ ہے کہ جس قدر تم نوع انسانی کے لئے کھلا چھوڑ دو گے اس قدر تمہارے رزق میں کشادگی اور وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔ یُخْلِفُهٗ (34:39) خزاں کے موسم میں جب درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتا ہے۔تو تمام پتے جھڑ جاتے ہیں تو تمہارا خیال یہ ہے کہ دینے سے تو یہ پتے جھڑ جائیں گے۔خشک ہو جائیں گے۔ بہار کا انتظار کرو تو دیکھو گے کہ وہ درخت دوبارہ سرسبز و شاداب ہو کر پھل دینے لگے گا۔

خِلْفَةٌ:''خزاں دیدہ درخت پر بہار نو آ جانا'' یہ ہے اعجاز قرآن کا ایک لفظ میں ساری بات کہہ دی۔

اَنْفَقَ سے تم سمجھتے ہو کہ سارے پتے جھڑ جائیں گے مگر خِلْفَةٌ کا انتظار تو کرو۔ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (34:39)

یہ ہے بہترین نظام جس میں ہر ایک کو جھولیاں بھر کر رزق ملتا ہے۔اس میں اجتماعی طور پر ایک ایک دانہ سے سات سات سو دانے ملتے ہیں۔

رِبٰوٰی:

زمانہ نزول قرآن میں یہ سرمایہ دارانہ نظام کی اصطلاحات تو رائج نہیں تھیں۔ کیونکہ سود تو فارسی کا لفظ ہے۔قرآن نے اس نظام کے لئے، ربٰو کی اصطلاح استعمال کی ہے جس میں روپیہ دوسرے کی محنت کے ماحصل کو لے جاتا ہے۔اور اس طرح روپیہ بڑھتا رہتا ہے۔اس کا ترجمہ سود کر دیا ہے۔یعنی قرضہ لے کر اس پر لینا سود ہے مگر زمین کی بٹائی کو مزارعت قرار دے کر حلال کر دیا۔ ربٰو تو وہ نظام ہے جس میں روپیہ بغیر محنت کے بڑھتا ہے۔ یہ کیپٹل ازم۔سرمایہ داری کا نظام یہ ہے رِبٰو۔ جو خدا کے ساتھ کھلا اعلان جنگ ہے موسیٰ نے اس کے خلاف جہاد کیا تھا۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا (20:15)وہ انقلاب کیا تھا؟ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى (20:15)ایسا نظام جب میں ہر کام کرنے والے کو اس کا صلہ مل جائے۔ جو یہ قائم کریں گے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (20:112)

اب اس میں ظلم و ناانصافی۔سلب و کا خوف نہیں ہو گا۔اس میں کام کرنے والے کو اس کا ماحصل ملے گا۔

تُجْزٰى (20:15) کا ترجمہ معاوضہ نہیں بلکہ ماحصل ہے۔اس نظام کے چلانے والے مترفین ہیں جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔اس میں سرمایہ دار، مذہبی پیشوائیت کے سات گٹھ جوڑ کرتی ہے۔ یہ جو اجرت (wage)اس کا ترجمہ کرتے ہیں یہ غلط ہے۔قرآن نے تُجْزٰى ک(20:15) ہا ہے''برابر ہونا۔قائم مقام ہونا۔کافی ہونا۔''یعنی محنت کا ماحصل''اس میں ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (20:112) یعنی نہ سیاسی استبداد اور نہ معاشی سلب و نہب۔ یہ دولت مند''مُتْرِفِيْنَ''ہیں یہ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ یہ خود کسی پیداوار میں حصّہ نہیں لیتے۔بغیر کام کیے ان کی محنت سے لے جاتا ہے۔ان کی دولت اور اقتدار مضبوط ہوتا ہے پارٹی کی بنیاد پر۔اور یہ نظام کبھی پنپ نہیں سکتا۔تباہی اس کا مقدّر ہے۔

❁❁❁

رسول کی بشری اور وحی کی حیثیت

رسول اکرم ﷺ کا اعلانِ عام کہ میں تمہیں کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتا ہوں اس بات کو ذہن سے نکال دو قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ (7:188) اور وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ (7:188) اگر مجھے نفع ونقصان کا اختیار ہوتا تو مجھے کوئی تکلیف ہی نہ ملتی۔ جب میں تمہاری طرح جنگ میں زخمی ہوا ہوں۔ بیمار بھی ہوتا ہوں۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ (6:15) شفاعت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ سے اجتہادی غلطیاں بھی ہوسکتی ہیں۔

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ؕ (34:50) اگر کہیں میری ذاتی تدبیر سے غلطی ہو جائے اور جنگ میں شکست ہو جائے تو وہ میری اجتہادی غلطی ہے اس میں وحی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ؕ (34:50) جب دیکھو کہ میں صحیح راستے پر ہوں تو وہ وحی کی وجہ سے ہے اس میں میرا کوئی کریڈٹ نہیں ہے میں تو اس متعین راستہ کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اسے یہ نہ سمجھنا کہ یہ وحی کی غلطی تھی۔ بلکہ وہ میری اپنی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ یہ میری ذاتی غلطی ہے۔ اس کا میں ذمہ دار ہوں۔

یہ ہے دو حیثیتوں کا فرق۔ کہ میں اس غلطی کا ذمہ دار ہوں خدا نہیں ہے یہ ہے بلندی کردار غزوہ تبوک پر نبی ﷺ کی اجتہادی غلطی پر سرزنش۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ (9:43) دوسری مثال يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ (66:1) پہلے بھی ایک پیغمبر کے ساتھ ہو چکا ہے اونٹ کا گوشت یعقوب علیہ السلام کے لیے باعث مضرت تھا اور یہودیوں کے ہاں اونٹ حلال تھا تو انہیں نے شریعت میں اس حرام قرار دیدیا ہمیشہ کے لیے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

مذہب نے تو دین پہنچانے والے رسولوں کو عین خدا بنا لیا تھا۔ کیا کوئی مذہب تصوّر کرسکتا ہے کہ ان کے مذہب کا بانی انسان تھا چہ جائیکہ ان کے متعلق کہا جائے کہ ان سے لغزشیں بھی ہوسکتی ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی ماننے کو تیار نہیں۔ یہ ہے امتیازی خصوصیّت۔ رسول ﷺ سے لغزش تو ہوسکتی ہے۔ معصیت نہیں۔ ان کے تراجم اور تفاسیر تو دوسری پٹڑی پر ڈال کر قرآن کے مقاصد سے دور لے جاتے ہیں۔ منزل دور ہوتی جائے گی اور پھر "ضلالاً بعیداً" ایسی گمراہی جس سے واپسی کا راستہ نہ مل سکے۔

ملائکہ جومختلف خصوصیات والے ہیں

”الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ“(35:1)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ (35:1) الحمدللہ؛ یہ کائنات اوراس کی تخلیق جو جمالیات اور افادیت کا حسین شاہکار ہے جو بھی ان پہلوؤں کو دیکھتا ہے تو اس کی زبان پر کلماتِ تحسین آجائیں گے۔ تمام اشیاء جمالیاتی اور افادی پہلو، ان کو صرف حامدون ہی بنظرِ تحسین دیکھ سکتے ہیں اور وہ سائنسدان یعنی مومن ہی ہو سکتے ہیں جو حامدون ہیں وہ اس محسوس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے کوئی ذہن انسانی اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ کہ اس سے آگے جا سکے۔ (اس لئے اسے اتفاق کہہ دیتے ہیں) یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ؕ (35:1) عدم سے وجود میں لایا پھر بیکار نہیں بیٹھ گیا بلکہ مزید تخلیقات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے نہ وہ تھکا ہے اور نہ سویا ہوا۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ (2:255) نیند تو ایک طرف اسے اونگھ بھی نہیں آتی۔ وہ تو اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ (2:255) وہ تو خود زندہ وقائم ہے اور دوسروں کو زندگی اور ثبات عطا کرنے والی ہستی ہے۔

ملائکہ،قرآن محسوسات سے غیر محسوسات کی طرف لے جاتا ہے:

ملائکہ کا ترجمہ فرشتہ،فرستادہ کو موڑ کر فارسی زبان کا فرشتہ بنالیا اب جو چیزیں ادراک میں نہ آئیں صرف ایک خیال سا آسکتا ہے۔ غیر محسوس (Abstract) مثلاً توانائی۔ اپنی جان، خیال جو غیر محسوس ہوں۔ محسوسات کا خوگر انسان لباس مجاز میں دیکھ کر ہی سجدہ کرتا ہے قرآن اس سے تو بہت اونچا لے جاتا ہے کہتا ہے کہ قانون اور نظریہ کو سمجھیں۔ ان تمام محسوسات اور غیر محسوسات کے بنانے والے کو سمجھ۔ پھر اس کو سجدہ کر جس نے محسوسات اور غیر محسوسات کو بنایا۔

یہ تمام غیر محسوسات کو بنایا۔ اور خود ان سے بھی بلند ہو گیا محسوسات کو دیکھ کر سجدہ کرنا تو پستی کی علامت ہے۔ موسیقی کا سر، پھول کی رنگینیاں جو ذہن میں بشاشت پیدا کرتی ہیں یہ محسوسات ہیں آپ اسے Explain نہیں کر سکتے۔ محسوسات کے خوگر انسان نے ان فرشتوں کو بھی دیوی دیوتا کی شکل میں ڈھالا۔ قرآن نے کہا کہ لَمْ تَرَوْهَا ؕ (33:9) کہ وہ محسوسات کے اندر نہیں آتے صرف ان کا وجود بتایا جو قوّت پانی کو بھاپ اور برف بنادے۔ قران نے اسے ملائکہ کہا ہے۔ ملائکہ کا لفظ ان میں سے ہے جن کے ایک سے زیادہ مادے ہوتے ہیں۔ ملائکہ کے بھی دو مادے ہیں ایک ”ا ل ک“ اور دوسرا ”م ل ک“ یعنی پیغام رسانی (Communication) اور

قوّت والی مخلوق۔ یہ دونوں معنی اس ایک لفظ میں موجود ہیں۔

آم کا بیج بویا پہلے شگوفہ نکلا۔ پودا بنا، تو اس کو درجہ بدرجہ کون بتا رہا ہے کہ ایسے پتے ایسی شاخیں اور یہ پھل پیدا کرنا۔ جامن میں اس قسم کا اُگانا۔ یہ خوشبو اور ذائقہ پیدا کرنا۔ قرآن کہتا ہے کہ ہماری قوّتیں ان کو پیغام پہنچاتی ہیں۔ یہ ان ملائکہ کی صفات ہیں جو لَمۡ تَرَوۡهَا ۚ (33:9) تمہارے عالم محسوسات میں یہ بات نہیں آسکتی۔ اگر یہ ہنگامی طور پر ہوتا تو کبھی جامن کی گٹھلی میں سے کیکر اور آم میں سے انگور لگنے شروع ہو جاتے۔

Messegs پیغامات:

پیغام کے مسئلے سمجھے بغیر قرآن کی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ جسم انسانی کا حکمران یہ Mind جو جسم سے الگ ہے۔ یہ جسم کا کوئی حصّہ فیصلہ نہیں کرتا۔ یہ کچھ اور ہے جو فیصلہ کرتا ہے فیصلہ کرنے کے بعد بڑی تیزی سے کام کرتا ہے۔ اس تیزی کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ کیا ہے جو پیغام رسانی کا کام کرتی ہے کہ ہاتھ کو کہو کہ یہ کرے۔ سائنس ادھر آ کر ختم ہو گئی تھی کیونکہ یہ تو طبعی تھا ہی نہیں۔ فزیکل سائنس تو یہ نہیں بتا سکتی کہ میں نے پانی کا گلاس اٹھانا ہے، اسے تھپڑ مارنا ہے۔ تو طبعی جسم کا کام ہی نہیں ہے۔ وہ حکم دینے والا کون ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ یہ ابلاغ (پیغام رساں) ایک قوّت ہے جسے ہم نہیں سمجھ سکے۔ قرآن کہتا ہے۔ کہ یہی تو ملائکہ ہیں۔ انہی کو لَمۡ تَرَوۡهَا ۚ (33:9) کہا۔ اس محسوس کائنات میں ساری کارفرمائی انہیں قوتوں کے زریعہ سے جو خدا نے پیدا کی ہیں یہ ہمارے محسوسات کے دائرے سے ماوراء ہیں۔ ملائکہ کے بنیادی معنوں میں یہ ''پیغام رسانی'' محفوظ ہے ''الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا '' (35:1) کہا ہے۔ اُولِیۡۤ اَجۡنِحَةٍ۔ جَنَاحٌ کی جمع ہے اَجۡنِحَةٌ ہے۔ جَنَاحٌ کسی شے کے دونوں سائیڈز۔ بازو پر۔ سہارا۔ جس سے یہ کچھ کر سکے۔ بشرطیکہ دونوں جانب ہوں۔ سایہ اور حفاظت'' کو بھی کہا ہے۔

تو مجازی معنی ''قوت جو حفاظت کے لیے استعمال ہو نہ کہ تخریب کے لیے ان میں دو، تین تین اور چار چار مختلف خصوصیات ہوتی ہیں۔ یعنی خواص جو پیمانوں کے متعلق ہوتے ہیں جیسے ذرہ کے برابر سنکھیا توانائی اور زندگی دیتا ہے۔ اگر پیمانہ زیادہ ہو گیا تو موت کا باعث۔ پانی ممدِ حیات ہے۔ مگر انسان اس میں ڈوب جائے تو مر جاتا ہے۔ اب فرق مقدار کا پیمانہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝۱ (35:1) اب چونکہ پیمانے بنا دئے ہیں تو خود ریسرچ کر کے مقدار کا تعین کر لو کہ اتنی مقدار سنکھیا کی ہلاکت ہے اور اتنی طاقت و توانائی دیتی ہے۔

عالم امر سے عالم خلق کی طرف مختلف منازل کے لیے ان گنت قوّتوں کا نزول:

ملائکہ کے متعلق کہا۔ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۝۵ (79:5) خدا کے امر کو پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔ تخلیق کر دی۔ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ (65:12) ارض سموت میں ہمارا امر بھیجتے چلے جاتے ہیں تو ان امور کو پہچانے والے یہ قوّتیں فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۝۵ (79:5) ہیں۔

امور کو بھیجتے چلے جاتے ہیں ان کو ملائکہ follow up کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیّت یہ ہے وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ۝۵۰

674

(16:50) اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتے بلکہ اس امر کے مطابق کرتے ہیں۔ مومن سے پہلے مقام آدم کا حصول ان قوتوں کی تسخیر اور پھر ان کو مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ (13:17) کے لیے استعمال مومن بناتا ہے۔

بآدمے نرسیدی ، خدا چہ می جوئی

شیطان کی ماہیّت اور عمل کی نوعیّت :

اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَـكُمۡ عَدُوٌّ (35:6) وَلَا يَغُرَّنَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ ۝ (35:5) خیال کرنا کہ دھوکہ دینے والا کہیں خدا کے نام کی آڑ میں تمہیں فریب نہ دے دے۔ انہیں کو شیطان کہا گیا ہے کہ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَـكُمۡ عَدُوٌّ (35:6) یہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہو۔ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا ؕ (35:6) اسے دشمن سمجھ، دوست نہ سمجھ اور اس سے دور رہو۔ انسان قرآن سے پہلے بچپن کے زمانے میں تھا ابتدائی دور میں، غاروں کے دور میں وہ جو غیر مرئی، غیر محسوس، نظر نہ آنے والی، وہ ان کا تصوّر ذہن میں نہیں لا سکتا تھا۔ آج کا انسان اگرچہ اس دور سے آگے چلا گیا ہے مگر اب بھی وہ ان حقیقتوں کو محسوس پیکروں میں اپنے ذہن میں لاتا ہے اس لیے خدا کا محسوس قسم کا تصوّر جو بچپن میں ذہن میں آ جائے تو مستقبل کی زندگی میں اس تصوّر کو نکالنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے بچہ کی تعلیم کو اخلاقیات سے شروع کریں۔ ملائکہ کے بارے میں بھی کہا کہ وہ ان کو دیوی دیوتاؤں کی شکل میں نہیں لائے۔ محسوس شکل میں نہیں لائے۔ ہم تصوّر ہی نہیں کر سکتے کہ یہ عالمِ امر کی پیغام رسانیاں، یہ قوّتیں اور توانائیاں، تدبیر امور کرنے والی یہ قوّتیں کیا ہوتی ہیں؟ ہم سمجھ نہیں سکتے ۔ہمیں لامحالہ ان کا کوئی محسوس پیکر لانا پڑتا ہے۔ اس سے یہ بت پرستی کی ابتدا ہوتی ہے۔ قرآن انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ بت پرستی کو چھڑایا کہ اسے بتوں سے حسد تھی کہ اونچا نہ ہو جائے کہ میرے مقابل ایک پتھر کی مورتی کو پوجا جا رہا ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ پوجتے رہیں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ (3:97) جب یہ انسان نہیں تھا تو اس وقت بھی خدا تھا۔ اصل میں وہ انسانی ذہن کو اس پست سطح سے بہت اونچا لے جانا چاہتا ہے۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لئے انسانی ذہن کو تیار کرتا ہے مگر عقائد کے محسوس پیکروں کے اندر نہیں، یہ کچھ تو ایک نچلی سطح کا انسان بھی کرے گا۔ ملائکہ کے متعلق قرآن انسان کو بہت اونچا لے گیا۔ اب نفسیات تحقیق کر رہی ہے، کہ یہ پیغام رساں کرنے والی قوّت کیا ہے؟ جو دل کے ارادے کو ہاتھ تک پہنچاتی ہے کہ یہ کرو۔ یہ ایک کتاب ہے۔ (Mind and Body) ملائکہ تو جمع کا صیغہ ہے بہت سے تھے۔ شَيۡطٰن تو واحد کا صیغہ ہے جو ایک ہی ہے۔ اس کا تصوّر یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی انسان ہے اس کے پاس شیطان آ کر اسے ورغلاتا ہے۔ یہی ایک شیطان دنیا کے ہر گوشہ کے اندر جہاں انسان ہے اس کے ساتھ وہی ایک شیطان ہے یہ ہے بڑی گمراہی! دنیا میں بیک وقت ہر جگہ موجود ہونا صرف خدا کی صفت ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمۡ اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ ؕ (57:4) خدا کی اس صفت کو ہم شیطان کی صفت بتا دیتے ہیں۔ یہ عقیدہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ایک ہی شیطان ہے۔ خدا کی صفت تھی جو شیطان کو دے رہے ہیں۔ اس ابلیس یا شیطان کا قصور کیا تھا جو راندۂ درگاہ ہوا۔

آدم سے معصیت ہوئی۔ ابلیس سے بھی ہوئی، آدم سے پوچھا تو اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ۫ (7:23) غلطی ہو گئی ہے۔ غلطی تسلیم کر لی تو اصلاح کا امکان ہے۔ تو کہا گیا جاؤ آئندہ اس روش پر نہ چلنا۔ اصلاح ہو جائے گی۔ ابلیس سے پوچھا کہ

تو نے کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ میری کیا جرأت! تیرے حکم کے بغیر تو پتہ تک نہیں ہلتا۔ یہ تو نے کرایا ہے میں ان کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا تو اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی اس لئے راندہ درگاہ ہوا۔ ہم بھی ذمہ داری نہیں لیتے بلکہ اسے شیطان پر ڈال دیتے ہیں بات تو ہم وہی کررہے ہیں جس سے وہ مردود ہوا۔ یہ شیطان کیا ہے؟

خیر وشر کی گتھی کا حل قرآن کی روشنی میں:

خیر وشر کے مسئلہ کو گزشتہ اڑھائی ہزار سال سے انسان اس گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا ہے۔ اور یہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جارہی ہے۔

اگر خدا خیر محض ہے تو اس نے شر کیوں پیدا کیا؟ اگر شر خود پیدا ہوگیا ہے تو پھر خدا کا اس پر اقتدار نہیں ہے۔ وہ بے بس ہے۔ اگر اس کی مرضی سے پیدا ہوا تو وہ خالق شر بھی ہے۔ تو جو شر کو پیدا کرنے والا ہو وہ خیر کا خالق کیسے ہوا؟

اگر اس کی مرضی کے خلاف ہورہا ہے تو وہ قادر مطلق نہیں ہے یہ فلسفیوں کے ہاں ایک اہم مسئلہ اور بڑ معمہ ہے۔ ان کی لائبریریاں ان بحثوں سے بھری ہیں۔ وہ آکررک گئے کہ یا وہ خیر مطلق نہیں یا قادرِ مطلق نہیں۔ جب آپ بھی شیطان کو ایک باہر کی ہستی قرار دیں گے تو وہ شر ہوجائے گی۔ یہ ہستی سارا شر پھیلا رہی ہے اور خدا دیکھ رہا ہے۔ چونکہ اس نے ہر ایک کو پیدا کیا ہے تو آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ اس کو بھی پیدا کیا ہے اور انسان کے ساتھ اس کو چھوڑا ہے۔ اب شر پیدا کرکے خود ہی اتنی تاکید کی ہے کہ اس سے احتیاط برتو۔ سوال یہ ہے کہ اسے پیدا ہی کیوں کیا تھا؟ یہ ہیں فلسفیوں کے وہ سوالات۔ دراصل یہ انسان خود ہے کیونکہ خدا نے کائناتی قوّتوں کے مقابل صرف انسان کو اختیار وارادہ کی قوّت سے نوازا ہے۔ کائناتی قوّتیں بھی وَهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ۝۴۹ (16:49) وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ۝۵۰ (16:50) کائنات کی کوئی قوّت انکار نہیں کرسکتی۔ صرف انسان کے سامنے دو راستے وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ۝۱۰ (90:10) اسے کے بعد کہا اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41:40) ہم دخل نہیں دیں گے۔ غلط راستہ اختیار کروگے تو وہ شر کا راستہ ہوگا۔ صحیح راستہ اختیار کروگے تو وہ خیر کا راستہ ہوگا۔

شر تو انسان کی غلط روش کا نام ہے:

یہ خیر اور شر کے مسائل راستے ہیں۔ یہ ہمارا پیدا کیا ہوا شر نہیں ہے۔ اگر تم اسے اختیار نہیں کروگے شر ختم ہوجائے گا۔ اگر تم اسے اختیار کروگے تو تم نے شر کو خود قبول کیا ہے۔ انسان کا یہ اختیار وارادہ جب وہ قانون، احکام اور اقتدار خداوندی کے مطابق چلتا ہے تو یہ ملائکہ کی بھی صفت ہے۔ خدا کا قرب بھی ہے حدِ بشریت کے اندر خدائی صفات کو پیش نظر رکھنے کی ایک تمنا ہے۔ اگر اختیار و ارادے سے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یہ شر ہی شر ہے۔ جس کا انجام تباہی ہے۔ یہ تو انسان کے اپنے اختیار وارادہ کا نام ہے جو راستہ اختیار کرے۔ شیطان یہ ''ش ط ن'' سے ہے ''بھڑک اٹھنے والا شعلہ، جذبات دیئے گئے ہیں۔ غصہ کی حالت میں غضب میں آجاتا ہے۔ غضب کے عربی معنیٰ ''شعلہ، حرارت، اور سرکشی'' ہیں۔ غصہ کی حالت میں انسان کا ٹمپریچر 2F بڑھ جاتا ہے۔

یہ شعلہ دل ودماغ کو جلا کر ماؤف کردیتا ہے۔ وہ اس اصول کو چھوڑ کر سرکش ہوجاتا ہے۔ اس جذبہ کو تعمیری کاموں کی بجائے

تخریب کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ سرکشی تیزی، تندی، مشتعل مزاجی ہے۔ یہ شیطان ہے ''شعلوں کا مشتعل ہوجانا'' یہ ہر فرد کے اپنے جذبہ کی بات ہے کہ وہ سرکش ہوجاتا ہے یعنی اقدار کے خلاف چل پڑتا ہے۔ یہ ہر فرد کا اپنا ہوتا ہے۔ جی چاہے تو اسے اقدار کے تحت لے آئے۔ ذرا سا بے باک کیا تو پھر یہ شعلہ ہے۔ بھڑک اٹھتا ہے یہی سرکشں جذبات شیطان ہیں۔ قرآن میں اس کے لیے دو الفاظ آئے ہیں۔ ابلیس اور شیطان۔ باقی مذاہب اور زبانوں میں ہر جگہ ایک ہی لفظ شیطان ہے۔ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ الگ الگ نہیں ہیں۔

موجودہ سائکالوجی میں اسے (Theory of Aggression and Frustration) جارحیت اور مایوسیت کا نظریہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ قرآن کی صداقت کو ان تحقیقات سے ثابت کررہے ہیں ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ان کی ریسرچ یہ کہہ رہی ہے'' کہ جب بھی انسان کا غصہ (Aggression) جو قوت، بالادستی کا حدود فراموش ہوجانا کہلاتا ہے۔ جیسے دریا ساحل کو توڑ کر سیلاب بن جاتا ہے جب یہ جارحیت ختم ہوتی ہے۔ تو اس کا نتیجہ مایوسیت یعنی (Frustration) ہوتا ہے عربی میں شیطان ''بھڑک اٹھنے والا'' ابلیس'' کے معنی مایوس ہوجانے والا۔ جب یہ اشتعال فرو ہوجائے تو پھر کئے پر نادم ہوتا ہے۔ اب اس کا درجہ حرارت 98F سے کم ہوکر 96F پر آجاتا ہے۔ یہ درجہ حرارت میں کمی یہ اس کی ندامت ہے۔ مایوسی (Frustration) ہے یعنی ابلیس جو مایوس ہوجائے۔ تو ایک رخ تو سرکشی یعنی شیطان اور دوسرا رخ مایوسی یعنی ابلیس ہوتا ہے۔

یہ کسی ایک کے لیے دو الفاظ، قرآن ہی میں ہیں اور دنیا میں کہیں اور نہیں ملتے۔

شیطان کوئی خارج میں نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے اپنے غلط فیصلہ کا نام ہے۔ جب یہ اقدار سے سرکشی اختیار کرے تو اس وقت اس کا شیطان کام کررہا ہوتا ہے اور جب اقدار کے تحت کام کرے تو یہ مومن ہے۔

قرآن میں ان جذبات کو شیطان کہا گیا ہے کوئی باہر کی چیز نہیں ہے۔ واقعہ آدم کے تمثیلی انداز میں فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (7:20) شیطان نے دونوں کو ورغلایا۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (50:16) اس کا اپنا نفس اسے ورغلاتا ہے۔ شیطان بطور فاعل اس نفس کو کہا گیا ہے یہ اس کا اپنا نفس سے اشارہ کرتا ہے۔ ابھی انسانی علم بہت پیچھے ہے کہ متعین کرے کہ یہ نفس کیا ہے؟

یہ انسان کا اختیار و ارادہ ''میں''، یعنی نفس یہ کراتا ہے اگر اقدار کی خلاف ورزی کرے گا تو یہی نفس شیطان بن جاتا ہے۔ جب اس کے عواقب سامنے آتے ہیں تو مایوس ہوجاتا ہے۔ ابلیس ہوتا ہے اگر یہ اپنے اس ابلیس یا شیطان کو مسلمان کردے تو مومن ہے۔ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٠﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ (36:60-61) حکم دیا گیا تھا کہ اپنے پرکشش جذبات کی پیروی نہ کرنا۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (45:23) یہ انسان کے اپنے جذبات ہیں جن کو خدا بنا کر ان کی اطاعت کرتا ہے۔ تو نتیجہ اس آیت میں

674 وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ (45:23) جذبات کی وجہ سے علم وعقل کے باوجود اندھا ہو جاتا ہے۔ جب قومیں اپنے سرکش جذبات کو خدا بنا لیں تو پھر دوزخ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ایک فرد شیطان ہے اس طرح کے اگر جنود یا لشکر اکھٹے ہو جائیں تو یہ حزب الشیطان ہیں تو اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ (58:19) یہ ہیں۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ (58:19)۔ یہ ہیں وہ شیطانوں کے لاؤلشکر۔ جو اس کو قابو کر لیتے ہیں اور اقدار سے فراموشی اختیار کرتا ہے۔

ان حِزْبُ الشَّيْطٰنِ کے منشور:

پروپیگنڈہ کے ذریعہ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ (17:64) ریڈیو، ٹی وی اخبارات کے ذریعہ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ (58:19) تیرے قوانین سے غافل کر کے وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ (17:64) اس کے بعد ان کی اقتصادیات پر کنٹرول وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ (17:64) اور یہ اس کے لاؤلشکر۔ کہا یاد رکھو اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ (17:65) صرف میرے اطاعت گزار بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکے گا۔

موجودہ دور کی سوشیالوجی پر عیسائیت کے اثرات:

آج کل سوشیالوجی (عمرانیات) اور اخلاقیات کے بڑے بڑے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر ایک شے ہے۔ یہ اس شے سے دور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ کہ شیطان اس پر غالب آتا ہے۔ اسے جبلت (Instinct) کہتے ہیں۔ کوئی اسے (Inheritance) وراثت میں ملنے والی شے کہتا ہے۔ ماحول اور بچپن کو اسی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تو یہ ماہرین عمرانیات و اخلاقیات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے کہ وہ اس کے اوپر غالب آ جائے۔ انسان کا جھکاؤ تخریب کی طرف ہی ہوتا ہے۔ یہ ہے آج کی تحقیق کا ماحاصل۔

اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تمام سکالر خالی الذہن ہو کر تحقیق کرتے ہیں مگر پوری طور پر یہ عیسائی کے عیسائی ہی رہتے ہیں۔ عیسائیت کا یہ نظریہ کہ ہر بچہ اپنے ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ ساری عمر اس کو الگ نہیں کر سکتا۔

بظاہر یہ بات اپنی ریسرچ سے کہتے ہیں۔ اور اس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں جہاں عیسائیت کے عقیدے نے ان کو پہنچایا تھا۔ اب یہ بات کتنی گہرائیوں میں پہنچاتی ہے۔ یہ تمام سوشیالوجی، انتھروپالوجی ڈارون نے یہ کہلایا تھا۔ آج کی نفسیات یہ ہے عقیدہ عیسائیت کا جو اس قدر گہرائی میں گیا ہوا ہے کہ یہ ان کے دلوں کے اندر پیوستہ ہے۔ جس سے یہ ماہرین یہ کچھ کہتے ہیں۔

قرآن ان سے نظریات کو ایک جملہ سے رد کر دیتا ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ (17:65) یہ غلط ہے کہ انسان کے اندر شر ہے اور وہ اسے دور نہیں کر سکتا۔ تخریب اور شر تو اس کے اختیار و ارادہ سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے ان سب تھیوریز پر ایک خط تنسیخ کھینچ کر رکھ دیا کہ یہ انسان کا

اپنا اختیار ہے کہ وہ اقدار کی پیروی کر کے ان تخریبات اور شر سے بچ سکتا ہے اور شیطان کا کوئی بھی نہیں چل سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کا اپنا اپنا ابلیس ہوتا ہے۔ شیطان ہوتا ہے اور میرا شیطان اور ابلیس جو ہے اُسے میں نے مسلمان کر دیا ہے۔ مسئلہ حل ہو گیا۔ ابلیس کو مارا نہیں جا سکتا۔ اگر جذبات کو مسلمان کر دیا جائے تو دنیا میں اس سے بڑی قوت کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔

کشتنِ ابلیس کا رے مشکل است — زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

مومن تو وہ ہیں اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (7:201) اس سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ ہر وقت قانون خداوندی کو سامنے رکھو تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس لیے کہ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا (35:6) اس کو دور رکھو۔ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (35:6) دور والوں پر تو اس کا بھی بس نہیں چلے گا جو اس کی پارٹی میں شامل ہوتی ہے یہ جہنم تک پہنچا کر رہتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ (35:7) اس کے برعکس مومن اور عمل صالح والے صرف اس کے حملہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

❀❀❀

کلماتُ اللہ کی وسعت اور جامعیّت

اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ (35:10)

progressive Evolution and Emergent Evolution

عربی زبان میں ''مرادف'' نہیں ہوتے۔ مرادف (Synonyms) سے مراد جس کے معنی میں فرق نہ ہو۔ یہ تو زبان کا نقص ہوتا ہے کہ ایک معنی کے لیے دو الفاظ ہوں۔ ان کے ہاں تو ایک چیز کے لیے ہزار ہزار الفاظ ہوتے ہیں۔ مثلاً اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو، تلوار کے ایک ہزار لیکن ہر لفظ میں دوسرے سے معنی کے عکس میں ذرا سا فرق ہوتا ہے۔

طَیِّبٌ، شجر طیب جس میں خوشگوار پھل آنے کا امکان ہو۔ جب کہ شجر خبیث جس میں پھل نہ آئے۔ دوسرا لفظ کلمہ ہے۔ جامع لفظ ہے۔ نظریۂ زندگی، اقدارِ خداوندی، اصول، فقرہ، آئیڈیالوجی یعنی اس نظریہ میں یہ صلاحیّت موجود ہے۔ (Potentiality)

انسانی ذات کی نشونما کا انحصار صالح بیج کی مانند اعمال صالح کا رہین منت ہے۔

یَصۡعَدُ، پہاڑ کی گھاٹی پر آہستہ آہستہ، بامشقت چلنا۔ چڑھنا۔ وہ زور دروں سے چڑھنا۔ بغیر کسی خارجی مدد کے۔ اس میں مشقت اور رفتار کی کمی کا پہلو ہے۔ صَعَدٌ۔ صُعُوۡدٌ۔ آہستہ آہستہ محنت کے ساتھ بلندی کی طرف چڑھتے جانا۔

یَرۡفَعُ۔ جلدی سے بلند کرنا۔ اِلَیۡہِ۔ وہ منزل مقصود جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ سمت کے ساتھ منزل خدا اور انسان کی رفاقت: اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ (35:10) یہ خوشگوار پھل لانے والا نظریہ (کائناتی قوّتوں کے ذریعہ) اپنے نصب العین کی طرف بڑی آہستگی سے بلند ہوتا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کو وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ (35:10) عمل صالح کی رفاقت مل جائے تو ہزاروں سال کا سفر چند سالوں یا دنوں میں طے کر لیتا ہے۔ اس منزل کی طرف جو مقرر کردہ ہے۔ اگر بیج صالح ہو پھر زراعت کے قاعدہ کے مطابق محنت کی جائے تو بیج نتائج پیدا کرے گا۔ پھر اسے ایک ایک دانہ کے بدلے سات سات سو دانے ملیں گے۔

صالح عمل وہ ہے جو مضمر صلاحیتوں کو بارز کر دے۔ یہ خدا اور بندے کی رفاقت پتھر کی چٹان کو تراش کر تاج محل بنا دیتی ہے۔ خدا نے تو صرف میٹریل دیا ہے انسان نے کائنات کے حسن میں نکھار پیدا کیا ہے اگر تخریبی پہلو پر آئے تو ایک بم سے اس تاج محل کو اڑا بھی سکتا ہے۔ اس نظم میں انسان کی رفاقت کا ذکر ہے۔

خدا کا مکالمہ:

جہاں را از یک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را — قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان کا جواب:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی، سیال آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم
مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں — انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ

خدا کے ساتھ انسان کی رفاقت کی نوعیّت:

اب دو چیزیں ہیں کہ اگر یہ اپنے اختیار وارادہ کو تخریب کی طرف استعمال کرتا ہے کہ خدا نے لوہا بنایا تو اس نے اس سے شمشیر وتفنگ بنا کر کشت وخون شروع کر دیا۔ اگر انہیں ہتھیاروں کو ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے استعمال کرے گا تو خدا کا رفیق بن جائے گا۔ چونکہ یہاں ظلم کرنے والوں کو بھی اختیار دیا گیا ہے کہ جس طرح ظلم کریں قوّت واقتدار کو استعمال کرتے ہوئے دوسری طرف صاحب شمشیر کو بھی یہ اختیار دیا تھا کہ وہ اس ظالم کا ہاتھ روک دے۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴿۲۱﴾ (6:21) وہ ظالموں کی کھیتی کو خود اجاڑنے نہیں آتا بلکہ ان مظلوموں کی مدد ان انسانوں سے کراتا ہے جو اس کے رفیق بنتے ہیں۔ مومن ہجرت کے بعد مدینہ جا کر ایک چھوٹی سی جماعت قائم کرتے ہیں۔ کچھ مسلمان ساتھی مکہ میں پیچھے بھی رہ گئے۔ ان پر بڑے مظالم کرتے تھے۔ وہ خدا کو مدد کے لیے پکارتے تھے۔ اس آہ وپکار کا جواب سن لیں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا﴿۷۵﴾ (4:75)
''ہمارے لیے مددگار بھیج جو اس ظلم سے نکالیں۔''

حضرت عمر کے نزدیک خلافت کا فریضہ کی شکل:

خلافت کا فریضہ یہ ہے کہ میں تمہاری دعائیں خدا تک پہنچنے نہ دوں۔ راستہ میں روک لوں۔ جب میں تمہاری ضرورت یہاں پوری کر دونگا تو پھر دعا کی کیا ضرورت ہے۔ یہ دعا تو اس نظام کے خلاف ایک شکایت ہوگی۔

جنگ بدر میں:

فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ (8:17)

؎ من تو شدم تومن شدی | من تن شدم تو جان شدی
تا کہ نہ گوید بعد ازاں | من دیگرم تو دیگری

یہ تو ایک معاہدہ ہے رفاقت کا: اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَـنَّةَ (9:111)

؎ خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے

نوجوان نسل کی مایوسی کی وجہ:

اس نظریہ حیات میں، اس بیج میں خوشگوار پھل دینے کی صلاحیت ہے اور ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔ زمانہ کی بھی قید نہیں ہے۔ صدر اوّل میں پھل دیئے تھے تو کیا اب نہیں دے سکتا۔ شرط یہ ہے کہ اس بیج کے ساتھ عمل صالح ہو۔ بیج تو قرآن میں محفوظ ہیں۔ لیکن اگر وہ بیج کسان کی بوری میں بند پڑے رہیں تو پھر کیسے پھل دے سکتے ہیں۔؟

اس لیے وہ اس خود ساختہ اسلام کو اصل سمجھ کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم محنت نہیں کر رہے۔ تو کیا ہم نے خدا کو بے بس کر دیا۔ ہم نے ساتھ نہ دیں تو کیا اس پروگرام دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ کہا نہیں اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡـكَلِمُ الطَّيِّبُ (35:10) یہ تو خود بلندیوں پر، چاہے آہستہ آہستہ ہو خود اپنے زور دروں سے چلا جا رہا ہے۔ یہ کائنات ہر آن ہر شعبہ میں ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی حسین سے حسین تر ہوتی جا رہی ہے۔ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الۡاَرۡضِ ثُمَّ يَعۡرُجُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (32:5) اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ (35:10) پہاڑ کی گھاٹی پر، رفتہ رفتہ بلند ہوتا ہوا مختلف منازل طے کرتا ہوا۔ اگر تم اس پھل سے مستفیض ہونا چاہو تو اٹھو وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ (35:10) جس طرح یورپ والے چوبیس گھنٹوں میں تمام پھول پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر رفاقت کرنی ہے تو یہ خوشگوار پھل مل سکتے ہیں۔ جس طرح رسول ﷺ یہ "الۡـكَلِمُ الطَّيِّبُ" (35:10) لے کر اٹھے تو اسے یرفعہ اپنے مسلسل کوششوں سے وہ ہزاروں سال کا پریڈ سات سال میں انقلاب سے ہم کنار کر دیا۔

؎ صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور | نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

آج پوری دنیا اس نظریہ کے نتائج پر انگشت بدنداں ہے:

ساری دنیا انگشت بدنداں ہے کہ یہ عظیم ترین انقلاب اتنے تھوڑے سے عرصہ کے اندر کیسے آ گیا۔ یہ کلمۂ طیب، عمل صالح نے اسے بلند کیا۔ اس کے بعد عمل صالح الگ ہو گیا۔ تو وہ بے کار نہیں بیٹھ گیا۔ اس کا سورج اس طرح سے بلند ہو رہا ہے خواہ کوئی انسان یہاں نہ رہے۔ رسول ﷺ کے زمانے میں عالمگیر انسانیت کے تمام نظریات پر نگاہ دوڑایئے۔ ملوکیّت ساری دنیا کا مسلّمہ تھا۔ کسی کے ذہن میں دوسرا طرز حکومت نہیں آ سکتا تھا۔ اس حکم طیب کا پہلا اعلان مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَ

الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (3:79) یہ اعلان عظیم ہے۔ مٹھی بھر عربوں نے قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اور اپنے ہاں ایسا نظام قائم کیا کہ جس میں کوئی انسان دوسرے پر حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد عمل صالح لگ ہو گیا۔ آپ کے ہاں میں ملوکیّت آ گئی۔ اب یہ کلمہ طیب اپنے زور دروں سے پڑھتا چلا آ رہا ہے آج ساری دنیا اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ملوکیّت۔ ڈکٹیٹر شپ بدترین انداز حکومت ہیں۔ وحی کے مقامی انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔

عقل تجربہ کر کے Trial and Error سے ہڈیاں تڑوا کر خون کے دریا بہا کر غلط نظام کی جگہ پھر دوسرا طریق اختیار کرتی ہے دنیا میں آج ملوکیّت کہیں بھی نہیں ہے۔ صرف اسی قوم کے اندر ہے جس پر ملوکیّت حرام تھی۔

آج ساری دنیا نے نسل انسانی کی تقسیم زبان، رنگ، خون و وطن کو حرام قرار دیا ہے جبکہ وحی نے ہر انسان کو واجب التکریم بتایا ہے۔ اور یہ مسلمان رنگ نسل زبان اور وطن کی بنیاد پر تقسیم ہو گئے۔ آج ساری دنیا نیشنلزم کو بدترین چیز کہہ کر اپنی کرنسی اور بارڈرز کی پابندیاں تک ہٹا دی ہیں۔ یہ تمام چیزیں کیسے آ گئیں۔ ساری دنیا میں یہ نظام سرمایہ داری کے دور دورہ تھا۔ قرآن نے قل العفو بتایا تھا۔ ہم نے تو اس صالح بیج کو چھوڑ کر بدترین قسم کی سرمایہ داری کو اپنے ہاں نوشتہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ کارل مارکس کوکس نے اس نتیجہ پر پہنچایا یہ زمانے کے تقاضے تھے۔ اب یہ تمام Welfare State تک نہیں آ رہے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کو قرآن نے ختم کر دیا تھا۔ یورپ نے ان کو چرچ تک محدود کر دیا حالانکہ ان کا مدار ہی چرچ پر تھا۔ آج غیر شعوری طور پر انسانی زندگی سے اٹھنے والا ہر قدم اسی منزل کی طرف ہی گامزن ہے۔ جہاں جہاں یہ ہو رہا ہے۔

ے ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفی اورا بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفی است

اس میں سب سے زیادہ محروم اور بدقسمت قوم تو وہ ہے جو مصطفی کے نام کے ساتھ اپنے آپ کو منسوب کر رہی ہے۔ هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ (9:33) کلمہ طیب کی آیت کے بعد اگلی آیت وَالَّذِیۡنَ یَمۡکُرُوۡنَ السَّیِّاٰتِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَمَکۡرُ اُولٰٓئِکَ ہُوَ یَبُوۡرُ ﴿۱۰﴾ (35:10) یہ جو فریب دیتے ہیں۔ انکار کرنے والوں کی بات نہیں ہے۔ وہ تو کھلا انکار کرتے ہیں یہ جو فریب دیتے ہیں۔ نام اسلام کا رکھتے ہیں۔ یہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ یہ وہی کلمہ طیّب ہے جو ہم بو رہے ہیں۔ کہا یہ فریب دے رہے ہیں۔ ہمارا کیا اکھاڑیں گے۔ خود ہی تباہی و بربادی کی طرف رواں دواں ہیں۔

یٰسین اور حروفِ مقطّعات

سورۃ یٰسین جیسے حیات آفریں کے پیغام کے متعلق ہمارا مرگ آفریں تصوّر ؎

؎ بہ بند صوفی و ملا اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز این نیست — کہ از یٰسین او آساں بمیری

یہ تو مردہ بستی میں صور اسرافیل پھونکنے کے لیے آئی تھی اس میں یہ حیات آور پیغام مرتکز کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ تو مردہ اقوام کو زندگی دینے کا پیغام ہے۔جس کو مردہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

حروفِ مقطّعات،مخفّفات(Abbreviations):

قرآن کی سورتوں کے شروع میں کچھ اس قسم کے حروف(letters)ایک جگہ رکھ دیئے گئے ہیں تو ان کی شکل ایک لفظ کی سی بن جاتی ہے۔مگر یہ حروف کا مجموعہ مقطّعات کہلاتے ہیں۔یعنی الفاظ سے قطع کئے ہوئے،الگ کئے ہوئے۔یہ سامی النسل اقوام کا زبان کا ایک انداز نگارش تھا۔عبرانی زبانوں میں بھی یہ عام بات تھی۔اور عربی شاعری کا تو یہ ایک خاص اسلوب تھا۔یہی وجہ ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے حضور ﷺ سے صرف کسی آیت یا اس میں اصطلاح کا مفہوم پوچھا ہے لیکن کہیں بھی یہ دیکھنے میں نہیں ملتا کہ ان مقطّعات کے بارے میں پوچھا گیا ہو۔کیونکہ وہ اس اسلوب کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔اس لیے اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔مگر بعد میں چونکہ وہ اسلوب نگارش نہ رہا تو ہم نے ان کو خود بخود معنی پہنانا شروع کر دیا۔یہ(یہ حروفِ صفات خداوندی یا صفات رسول کے لیے آئے ہیں)ان الفاظ سے لیے گئے ہیں۔تو یکجا بیان کرنے کے لیے جیسے علیم وحکیم کی بجائے الٓمٓ کہہ دیا جائے۔

یٰسٓ:

تو رسول ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے۔مگر سٓ وہ شہتیر جو کسی چھت کے کمزور شہتیروں کو سہارا دیکر کھڑا کیا جائے۔یہ سامی زبان کا لفظ ہے۔"معنی" اے کہ جو کمزوروں کو دنیا میں سہارا دینے کے لیے آئے ہیں"سٓ" سے منصبِ نبوّت کو نمایاں کر کے بتادیا ہے۔ان کے ہاں قوم کے سردار کو بھی"سٓ" کہتے تھے۔وہ سردار غریبوں کا خون چوسنے کے لیے نہیں ہوتا تھا۔اور انسان کے لئے

بھی یہی لفظ استعمال کیا۔انسان وہ ہے جو کمزوروں اور ضعیفوں کو سہارا دے۔دوسرے کو وہ انسان سمجھتے ہیں نہیں تھے۔حضور ﷺ کے لئے''سؔ'' کا انتخاب تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔کتنے معنیٰ اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔''اے کہ جو کمزوروں اور ضعیفوں کا سہارا بننے کے لئے آیا ہے''۔اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣﴾ (36:3) تو خدا کی طرف سے قاصد ہے تو اس کی ثبوت کیا ہے وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ (36:2)''سے مراد شہادت''یعنی قرآن اس کی شہادت ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔اور کرۂ ارض پر اس سے بڑا معجزہ کوئی دوسرا نہیں۔چیلنج دیا گیا اگر تم نہیں مانتے تو وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (2:23) یہ ہے دعویٰ کا ثبوت جسے قیامت تک کے لیے چیلنج کیا گیا ہے کہ اس جیسی تعلیمات کی کوئی ایک شق لے آؤ۔

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤﴾ (36:4) صرف قاصد نہیں ہے بلکہ خود اس راستے پر گامزن ہے۔تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٥﴾ (36:5)۔یہ ہے شہادت کہ یہ بتدریج 23 سال کے عرصہ میں نازل ہوا ہے۔یہ کسی انسان کا وضع کردہ نہیں ہے بلکہ اس اقتدار والے اور نشوونما دینے والے کی طرف سے ہے۔لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70)۔یہ ان کے لئے جن میں زندگی کی حرارت باقی ہے۔جو زندہ رہنے کا متمنی ہے۔

❋❋❋

اسلامی مملکت کا پروگرام کہاں سے شروع کریں؟

کہا ٹھیک ہے کہ اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا (6:122)۔اس قوم سے ابتدا کرو جو مردہ ہومگر اس میں زندگی کی صلاحیت ہو۔فَاَحۡیَیۡنٰہُ (6:122) اور مردہ اسے زندہ کرو۔اور زندہ کرنے کے لئے پروگرام وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَیُزَکِّیۡہِمۡ ؕ (2:129) ان کی مناسب تعلیم وتربیّت سے ان کی صلاحیتوں کو پیدا کرو۔پہلے زندہ کرو ورنہ مردہ قوم اس بڑے فریضہ کو انجام نہیں دے سکے گی۔فَاَحۡیَیۡنٰہُ (6:122) زندہ ہوجائے۔وَ جَعَلۡنَا لَہٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ (6:122)۔ قرآن کی شمع ہاتھ میں لے کر ساری انسانیّت کے گوشے گوشے کو اس روشنی سے منور کردے۔

؎ پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

تمام تصوّرات اور نظریات کو چھوڑ کر اس قرآن سے جہان نو پیدا کرنا ہوگا۔بنجر زمین کو قابل کاشت بناؤ۔وَاٰیَۃٌ لَّہُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَیۡتَۃُ ۚۖ اَحۡیَیۡنٰہَا (36:33) تو اس قابل کاشت زمین میں وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡہَا حَبًّا فَمِنۡہُ یَاۡکُلُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلۡنَا فِیۡہَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ (36:33-34)۔تو جو بوؤ گے تو نمود ہوتی جائے گی۔اگر میّۃ کو میّۃ چھوڑ دیا تو ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔زندگی کیسے پیدا ہوگی۔صِبۡغَۃَ اللّٰہِ ۚ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبۡغَۃً ۫ (2:138) اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ جیسے یہ رسول ﷺ رنگا ہوا ہے۔

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ (33:21)۔اس نظام کی تشکیل کے لئے انسانیّت سازی قدمِ اوّلی ہے۔یہ میکانکی چیز نہیں ہے اور نہ ہی قوانین سازی سے ہوگی ؎

؎ نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

اس میں تو رفقاء تیار کرنا ہوگا۔وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ (48:29)۔یہ معہٗ مکہ کی تیرہ سالہ تربیّت میں بنے تھے۔تو راستہ آسان ہو گیا۔انسانوں کے اندر روح پھونکنے کا کام خدا نے انسانوں کے سپرد کردیا ہے اور زمین صرف انسانیّت کے زیور سے آراستہ ہوکر امن وسکون کی جگہ بن سکتی ہے۔آؤ اس زندگی کا راز ہم بتائیں۔نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (36:12)۔ہمارے قوانین سے ہی زندگی ملتی ہے۔جو شرف انسانیّت کی حامل ہوگی۔بدترین عذاب جس میں احترام انسانیّت نہ رہے۔خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ (2:85)۔ وہ معاشرہ جس میں تکریم انسانیّت نہ رہے۔اگر یہ نہ رہے تو یہ ذلت شدید ترین عذاب ہے۔

حیوانی زندگی کفر ہے، مغربی تہذیب حیوانی زندگی ہے

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ (47:12) ''کھایا پیا اور مر گئے۔ یہ ہے حیوانی زندگی جو کفر کی زندگی حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ اس کا نتیجہ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ (47:12) یہ ہے۔ جہنّم ہی کو ہم فخر کی زندگی کہتے ہیں۔ ساری عمر جسم کی پرورش جو حیوان اور انسان میں مشترک ہے۔ ساری دنیا اس جہنّم میں آگ کی طرح بھڑک رہی ہے۔ ان ویلفیر سٹیٹ کو بھی دیکھو وہاں کوئی بھوکا نہیں ہے مگر سب سے زیادہ خودکشی کا ریٹ ان ممالک میں ہے کیونکہ حیوانی سطح کی زندگی جی رہے ہیں۔ جہاں شرف انسانیّت ہو اس کا نام اسلام ہے۔ اگر کھانے پینے کو نہ ملے لیکن قرآن اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ ہیں وہ مقامات جن کی صداقت یہ سائیکالوجی لیکر ان آیات کو نکھار کر رکھ دیتی ہے۔ ایک امریکن سائیکالوجسٹ کہتا ہے۔ ''پہلا بنیادی تقاضا روٹی کا شدید ترین تقاضا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس تقاضے میں الجھا رہے تو اس سے بلند سطح کی چیز اس کی طرف اس کی توجہ جا ہی نہیں سکتی۔ وہ اس قدر بنیادی ہے۔ (بقول سعدی)

چناں قحط سالے اندر دمشق ~ کہ یاراں فراموش کردند عشق

یہ بھوک عشق تک کو بھلا دیتی ہے۔ یہ سائیکالوجسٹ کہتا ہے کہ آدمی اس وقت کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ روٹی سے اطمینان کے بعد اگلا تقاضا سیکورٹی، تحفظ کا ہوتا ہے۔ اسے خوف دامن گیر ہوگا۔ اگر یہ دو تقاضے پورے جائیں تو پھر انسان اقدار کے متعلق سوچ سکتا ہے۔

کہتا ہے کہ جرائم ان نصیحتوں سے ختم نہیں ہونگے۔ اخلاق حسنہ اور کردار جو چاہے کرلو پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ روٹی اور حفاظت کا یقین کامل نہ ہوجائے۔ وہ اقدار کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔

قرآن نے چودہ صدی قبل اس روٹی کی اہمیّت کو پیش کردیا تھا:

قرآن کی دونوں آیات نکھر کر سامنے آگئیں۔ مثال ملاحظہ کریں۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (16:112) روٹی کی طرف سے اطمینان اور خوف کے مقابل امن حاصل تھا۔ سیکورٹی، تحفظ میسر تھا۔ مگر اس رزق کو ڈھانپ کر رکھ دیا تو فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (16:112) بھوک اور خوف نے ان کی اونچی سوچ ہی ختم کردی۔ یہ ہیں دو بنیادی تقاضے۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴿۲﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ (4-1-106:1)۔ جب ان کو بھوک اور خوف سے دور کر کے امن دیدیا تو ان کو اقدار کی طرف آنے میں کونسی چیز مانع ہے؟ کھانا پینا تو حیوان کی زندگی ہے۔لیکن بحر حال یہ تو ضروری تقاضے ہیں۔ آ ؤ جو ضروری تقاضا ہے انسانیت کا اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى (36:12) رزق اور تحفظ کے کامل اطمینان کے بعداب مقصود حیات کفر کا،حیوانی سطح کا،کھانے پینے کانہیں بلکہ شرف انسانیت کا ہے۔ جوصرف اقدار سے ملتی ہے۔ہم مردہ قوموں کو حیات نوعطا کرتے ہیں۔

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۭ (36:12) لکھنے سے مراد زمانے کے ریگِ رواں پر ثبت ہوتا ہے۔ مَا قَدَّمُوْا (36:12.)، زندہ قوموں کی پہچان یہ ہے کہ وہ مستقبل کے لیے کیا کرتے ہیں۔دوسری چیز وَاٰثَارَهُمْ (36:12) آنیوالوں کے لیے کیا نقش قدم چھوڑتے ہیں۔ یہ ہے اسلامی مملکت کا آئین کہ جو مستقبل کے لئے کرتے ہیں اور جو نقوش آنیوالوں کے لیے چھوڑتے ہیں۔ یہ سارالکھا جاتا ہے۔محفوظ ہوتا ہے۔

وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (36:12) عام ترجمہ تو ہر ایک چیز کو اعمالنامہ میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ایک تو امام،اعمالنامہ کے لیے،دوسرا آگے آگے چلنے والا،آگاہ کرنیوالا،چونکہ آگے چلتا ہے اس لیے اعمالنامہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ دیوار کو سیدھا کرنے کے لیے Mason کے پاس جولٹو ہوتا ہے اسے کہتے ہیں یعنی خارجی معیار۔''جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سیدھے چل رہے ہو یا غلط اور وہ مبین ہے یعنی اس کا فیصلہ تم خودنہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کا ایک واضح معیار ہے جو ساتھ کے ساتھ غلط اور صحیح کو الگ الگ کرتا جاتا ہے۔کھجوروں اور انگور کے باغات اور یہ رواں چشمے اور پھل،سبزیاں زمین سے پیدا ہوئی ہیں۔لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ (36:35) زمین توتم نے تیار کی تھی مگر یہ پھل توتم نے نہیں بنائے تھے ہاتھوں سے۔اس میں ہماری زمین اور قوانین اور تمہاری محنت کی رفاقت ہے۔دونوں مل کر خوشگوار نتائج پیدا کرتے ہیں۔ یہ تو شریک کاروبار ہے۔اس لیے اپنا حصّہ بقدر ضرورت لیکر باقی ہمارا حصّہ وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾ (56:73) مگر یہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ (36:47) دوسری جگہ ہے سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (6:148) حالانکہ یہ نظام تو وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) یہ تو سارے اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾ (36:47) وَلَوْ نَشَاۗءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓي اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾ (36:66) وَلَوْ نَشَاۗءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰي مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾ (36:67) اگر ہماری مشیت یہ نہ ہوتی کہ انسان کو اختیار وارادہ دیکر اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے تو ہمارے لئے کیا مشکل تھا کہ ہم ان مخالفین کی بینائی سلب کر لیتے۔راستہ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ یا ان تمام قوتوں کے علی الرغم ان کو کمزور اور ناتواں کر دیتے۔ کہ نہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔اس طرح سے ہم ان کی مخالفت کو روک سکتے تھے۔مگر یہ ہماری مشیت کے پروگرام میں شامل ہی نہیں

تھا۔ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴿۱۰﴾ (90:10) اور اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ (41:40) ان کی مشیت میں بالکل دخل اندازی نہیں کرتے۔ اور سب کچھ ان قوانین کی رو سے ہوتا ہے جس طرح وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ﴿۶۸﴾ (36:68) یہ عقل وفکر سے ہی سمجھ میں آئیگا کہ فرد ہو یا قوم ہو جب بڑھاپا ہوتا ہے تو اس قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں جیسے اوندھا ہو گیا مگر اس کی طبعی زندگی میں یہ ہوتا ہے (فی الخلق) نہ کہ ذات کے کس حصہ میں جس طرح بچپن سے شباب، جوانی اور آہستہ آہستہ انحطاط، یہ سارا قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ہم بچپن کے بعد خود ہی اس کو جوان کر دیں یا بڑھاپے طاری کر کے پھر خود ہی اس کو اوندھا کر دیں۔ یہ تو ایک قانون کے تحت ہوتا ہے۔ یہ تو عقل وفکر سے سمجھنے کی بات ہے اس کے لئے وحی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر قومیں ان اقدار کے تحت چلتی رہیں تو یہ تبدیلی تو صرف طبعی طور پر ہوتی ہے لیکن جو ثبات اور استحکام ان کی ذات میں اقدار کی وجہ سے پیدا ہوا ہے ان میں ضعف نہیں آتا۔

❁❁❁

حصّہ سوم

مسلم فلاسفہ اور قرآن

یونانی سائنس بھی ابتداءً ان بابلیوں سے اخذ کی گئی تھی، جو عرب سے میسو پوٹیمیا ہجرت کر گئے تھے:

قرآن غور و فکر کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ جو مسلمان فلاسفر کو کسی نہ کسی طرح اسلام سے منحرف قرار دے کر ان کے علمی کارناموں کو مسلمانوں کی نظر میں حقیر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ان کی یہ سازش دراصل اسلام کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ اوّل تو یہ سازش مسلمان فلاسفر کو یونانی فلاسفر کا فقط شارح ثابت کرتے ہیں۔ پھر حدیثی اقوال کے ذریعہ عام مسلمانوں کو ان مسلم فلاسفر سے بے زار کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور سب میں یہ کاوش ہو رہی ہے مگر مسلمان فلاسفر کا یہ فکری قافلہ سرگرم سفر رہے گا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یونانی فلاسفر کو نو فلاطینوس کے بعد زنگ لگنا شروع ہوا۔تو پورے چھ سو سال تک نہ تو اہل یونان میں سے کوئی عبقری پیدا ہوا۔ جو اس زنگ آلودہ فلاسفر کا رنگ اتارتا۔ اسے تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر، نئی راہیں تلاش کر کے نئے فکر کو عام کرتا۔ اور روزانہ ہی روما اور سکندریہ ہی سے کسی نئے فکر کی روشنی نمودار ہوئی۔ گویا پورے یورپ اور شرقِ اوسط کا ذہن نئے فکری اطوار و انداز سے کورا تھا۔ یہ قرآن کی برکات تھیں اور اس کی روشنی دیکھتے ہی دیکھتے مشرق سے مغرب تک پھیل گئی۔ مسلمان جہاں بھی گئے ان کے پاس بلند تعلیمات والا قرآن تھا۔اس کی روشنی میں انہوں نے کائنات کا مشاہدہ کیا اور اپنی فکرِ رسا کے مطابق وہ سب کچھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

یہ بات نا قابل تردید ہے کہ قومیں ایک دوسرے سے تہذیبی، فکری اور ثقافتی طور پر متاثر ہوتی ہیں۔ کیونکہ بنی نوع انسان اس کائنات میں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے آیا ہے۔ تا کہ تمدنی زندگی میں توازن پیدا ہو اور معاشرتی زندگی خوش اسلوبی سے گزرے، اور ایک دوسرے کے خیالات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور نئے خیالات کی صورت گری ہو۔ جو قومیں تقلید کی رو سے مستعار خیالات پر پوری زندگی گزارنے پر ٹھان لیتی ہیں۔ تو وہ قومیں صفحہ ہستی سے نابود ہو جاتی ہیں۔

مگر اہل علم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی فکری تاریخ روشن ہے مگر ایسا نہ ہوتا تو خود اہل مغرب مسلمانوں کے افکار کی تاریخ لکھنے پر مجبور نہ ہوتے۔

جن دنوں مسلمانوں کا فکری پرچم مشرق و غرب میں لہرا رہا تھا۔اہل یورپ اس دور کے یورپ کو ''دورِ ظلمت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے سپین میں فلسفہ و سائنس کی تخم ریزی کی اور جب کچھ عرصہ کے بعد شجر علوم پھلا پھولا۔ تو صدیوں تک

سارے یورپ کو اپنے سائے میں رکھا۔ بریفالٹ نے یونہی نہیں لکھ دیا۔

بریفالٹ۔''Making of Humanity''(تشکیل انسانیت)

''عربوں نے ان تمام ماخذوں اور سرچشموں سے جو دستیاب ہو سکتے تھے۔ اپنا علم حاصل کیا۔ زیادہ تر علم ہیئت اور کسی قدر علم ریاضی کو انہوں نے یونانی اور ہیلانی ماخذ سے حاصل کیا۔ یونانیوں کی قدیم سائنس بھی ابتداءً ان بابلیوں سے اخذ کی گئی تھی جو عربوں کی طرح عرب سے میسوپوٹیمیا میں ہجرت کر گئے تھے۔ گویا عربوں نے قدیم سائنس یورپ کو دی وہ ان کے اپنے قدیم بھائیوں ہی کا سرمایہ تھی جو ایک زمانہ میں یونانیوں نے ان سے مستعار لی تھی۔ وہ اس امر کا اعتراف کرتا ہے۔

بے شمار یہودی ولیم آف نارمنڈی کے جلو میں انگلستان آئے۔ اور اس کی حمایت اور حفاظت سے مستفید ہو کر انہوں نے پہلے سنگین شہری مکانات بنائے۔ جو آج بھی لنکن اور سینٹ ایڈ منڈز بری میں موجود ہیں۔ اور آکسفورڈ میں سائنس کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ اس آکسفورڈ سکول میں ان کے جانشینوں ہی سے راجر بیکن اور اس کے ہم نام فرانسس بیکن کے سر جو تجرباتی اسلوب کا سہرا باندھا جاتا ہے۔ راجر بیکن کا کام صرف اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ مسیحی یورپ کو اسلامی سائنس اور ان کا اسلوب سکھانے کا ذمہ دار تھا۔ اور وہ اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے تھکتا نہ تھا کہ اس کے معاصرین کے لیے علم صحیح کا واحد ذریعہ صرف عربی زبان اور عربی سائنس ہے۔ اس کے بعد جو بحثیں ہوئیں کہ تجرباتی اسلوب کا بانی کون تھا۔ عربوں کے ہر اکتشاف اور ان کی ہر ایجاد کا سہرا اس یورپین کے سر باندھ دیا گیا۔ جس نے پہلے پہل اس کا تذکرہ کیا۔''

اس بیان سے یہ واضح ہو گیا۔ کہ مسلمانوں کی ایجاد و اختراع اور نظریات کو یورپ میں جس بھی یورپین فلاسفر یا محقق نے پیش کیا وہ اسی کے نام سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

یہ بات تو قطعاً غلط ہے کہ دنیائے قدیم کے کھنڈروں پر یک لخت ایک نئی دنیا پھلنے پھولنے لگے۔ بلکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی پانچ سو سال کی مدت تک یورپ جہالت کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

نویں صدی عیسویں میں بمقابلہ چھٹی صدی اور ساتویں صدی کے حالات بے انتہا تاریک اور قطعی طور پر یاس انگیز تھے۔

اگر نویں صدی کا وہ دور ظلمت باقی دنیا سے منقطع رہتا۔ اور اسے صرف اپنے ہی وسائل پر انحصار کرنا پڑتا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے کسی زندگی عنصر پر کبھی مہذب ہو سکتا۔ افراتفری کے اس تنزل آفریں دور میں کوئی بھی ممکنات مضمر ہوتے یا کوئی بھی قوت عاملہ ہوتی جو سازگار حالات میں مفید ہو سکتی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یورپ کے لوگوں میں زندگی اور ترقی کے وہ تخم ہی موجود نہ تھے۔ جو اندرونی قوت سے پھوٹ کر پروان چڑھنے کے قابل ہو جاتے۔ صورت ایسی تھی کہ یورپ ایک قسم کی ''بربری حبشہ'' منتج ہو جاتا۔

جس روشنی سے تہذیب کا چراغ ایک دفعہ پھر روشن ہوا وہ یونانی و رومی کے ان شراروں سے نہیں اٹھ رہی تھی۔ جو یورپ کے کھنڈروں میں سلگ رہی تھی اور نہ باسفورس کی زندہ موت سے وجود میں آئی تھی۔ یہ روشنی شمال سے بھی نہیں آئی تھی۔ بلکہ اسے جنوبی

حملہ آور اور عرب اپنے ساتھ لائے تھے۔

یہ تھی مسلمانوں کے دور عروج کی علمی اور تہذیبی روشنی جس سے دسویں صدی عیسوی میں یورپ علمی طور پر منور ہونے لگا۔ اور مسلسل پندرہویں صدی کے شروع تک ہوتا رہا۔ اس طرح اخلاقی زندگی کا اثر بھی پورے یورپ پر ہوا۔ اور اسی قدر گہرے اثرات چھوڑے۔ کہ یورپی مورخین اور محققین کو اعتراف کرنا پڑا اور ان تمام افسانوں کی جو یورپ کے ان نام نہاد مفتیوں اور پادریوں نے گھڑے تھے اس کی تردید کرتے ہوئے یہ بریفالٹ لکھتا ہے ''غالباً حقیقت ثابتہ یہی ہے کہ یورپ کی حقیقی، عملی اور ٹھوس اخلاقیات میں مسلمانوں کی ثقافت کا بھی اتنا ہی بڑا حصہ ہے۔ جتنا کسی بہت بلند، اخلاقی وروحانی عقیدے کا ہوسکتا ہے''۔

یہ تھی ایک مغربی محقق کی تحقیق کہ مسلمانوں کے فکری اور عملی اثرات نے یورپ کو اندھیرے سے نکال کر روشنی بخشی۔

اب یہ ثابت ہوگیا کہ یورپ کے تمام موجودہ سائنسی علوم اور فکری ارتقاء مسلمانوں کے علمی اور اخلاقی اثرات کا نتیجہ ہے تو آیئے ملاحظہ کریں کہ مسلمانوں کا فکری ارتقاء کیا تھا؟ جس کی وجہ سے یورپ نے اس منہاج پر قدم رکھ کر ترقی کی۔ اور موجودہ دور کا فکری اور سائنسی پیکر وجود میں آیا۔ یہ منہاج تھی ''فکری آزادی اور اس کا اظہار'' اس اظہار میں مذہب کو صرف اتنا دخل تھا کہ جو مختصر عقائد اسلام وایمان کی بنیاد ہیں ان کا انکار نہ کیا جائے۔ ''اللہ پر، اس کے رسول پر، فرشتوں پر، قرآن اور دیگر سابقہ کتب جو قرآن میں آ گئی ہیں، آخرت پر، روز جزا وسزا پر، دوزخ وجنت پر ایمان۔ ان میں سے کسی کا انکار بھی اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ ہے پابندی اتنی سی۔ اور یہ آزادی کا زمانہ پہلی صدی ہی میں اسلام کے طلوع ہوتے ہی شروع ہوگیا تھا۔ مامون الرشید کے زمانے میں جب بیت الحکمت بنا۔ تو یونانی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ اور ترجمہ کرنے والے عیسائی اور نسطوری تھے۔ اس طرح عرب یونانی فلسفہ سے آشنا ہوئے۔ اور تراجم کے ذریعہ مسلمانوں کے پاس جو فلسفہ پہنچا تھا۔ وہ ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ نہیں تھا۔ بلکہ نو فلاطینوس کا فلسفہ تھا۔ مسلمانوں نے غلطی سے ارسطو کا فلسفہ سمجھ لیا اور اس کی شرح کرنے لگے۔ یاد رہے کہ مسلمان فلاسفہ صوفیا تک نو فلاطینوس کے اسیر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہودیت اور عیسائیت کی جنگ مذہب سے سیاست اور فکر تک صدیوں سے جاری ہے۔ اور رہے گی۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یونانی فلسفہ کا مطالعہ کرکے بڑی فراخدلی سے ان کا احترام کیا۔ اور معقولات میں اسے معلم اوّل کے نام سے منسوب کیا۔ جن لوگوں نے ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ پر تنقیدی نظر ڈالی۔ انہوں نے ان کی غلطیاں ظاہر کیں لیکن معتدل مزاج مسلم فلاسفہ نے معقول باتوں کو سراہا اور ان کو اپنی کتابوں میں جگہ دی۔ اور غلطیوں کی رد میں کتابیں لکھیں۔ نظام معتزلی نے ارسطو کی رد میں کتاب لکھی۔ ایک بار جعفر برمکی نے نظام کے سامنے ارسطو کا ذکر کیا کہ میں نے اس کا رد لکھا ہے جعفر نے کہا تم تو اس کی کتاب اچھی طرح پڑھ بھی نہیں سکتے تو رد کیا کروگے۔؟

نظام نے ارسطو کی کتاب زبانی پڑھنی شروع کردی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے مسائل کو رد کرتا گیا۔ جعفر متعجب ہوکر رہ گیا!

اس زمانے میں جبائی معتزلی نے ارسطو کی کتاب ''کون وفساد'' کا رد لکھا۔ اس طرح قاضی ابوبکر باقلانی نے کتاب الدقائق لکھی جس میں اہلِ فلسفہ ونجوم کا رد لکھا۔ اور متکلمین عرب کی منطق کو یونانیوں کی منطق پر ترجیح دی۔

اسی طرح مشہور متکلم شہرستانی محمد بن کریم نے ہرقلس اور ارسطو کی رد میں ایک کتاب لکھی۔

مذکورہ حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یونانی علوم کے تراجم ہوتے ہی مسلمانوں نے ان کی طرف توجہ دی اور فلسفہ ونجوم پر تنقید شروع کر دی۔ خود امام ابوحنیفہ بہت بڑے متکلم تھے۔ بعد میں علم الکلام کو چھوڑا۔

دراصل یونانی فلسفہ سے زیادہ دلچسپی رائج الوقت علوم کی وجہ سے بھی ہوئی۔ ایران دمشق اور مصر میں یونانی علوم اور فلاسفہ اہل علم کے دماغوں پر مسلط تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے علاوہ اور کوئی فلسفہ نظر میں نہ تھا۔ راہبوں میں تو فلاطینوس کا اثر تھا۔ اس لیے اس دور کے اہل علم زیادہ تر یونانی فلاسفہ کے مسائل اور منطق کے دائرے میں بات کرتے تھے۔ تو مسلمانوں نے بھی یہی سمجھا کہ ان سے انہی کے اسلوب انداز میں بات ہوسکتی ہے۔ اس لیے بعض نے اسے قبول کیا اور بعض نے ان پر تنقید کی۔ ابن مسکویہ نے الفوز الاصغر میں ڈارون سے 9 صدی قبل نظریہ ارتقاء تدریجی اور فجائی پیش کیا تھا۔ بوعلی سینا اپنی کتاب شفا میں جہاں ارسطو کی نمائندگی کرتا ہے تو وہاں افلاطون کے نظریہ اعیان پر تنقید بھی کرتا ہے۔ بعض فلاسفہ خود ابن رشد کا خیال ہے کہ بوعلی سینا کی کتابوں میں ارسطو کم اور خود بوعلی سینا زیادہ ہے۔ خود ابن سینا اپنی کتاب ''حکمت شرقیہ'' کی پڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔ شفا اور اشارات میں نفسیات کا باب، نبوت ومعجزات اور واحد سے واحد کا صادر ہونا، یہ تمام مسائل یونانی فلاسفہ کے خیال تک میں بھی نہ تھے۔ فلسفہ، تصوف اور نفسیات میں ابن سینا سے پہلے کسی نے بھی پختہ دلائل سے کام نہیں لیا۔ اور ارسطو کے مقلد ہونے کا انکار کیا ہے۔ بوعلی سینا کہتا ہے کہ روشنی کی رفتار کتنی ہی لامحدود رفتار ہو۔ پھر بھی وہ محدود ہوگی۔ اس طرح بادلوں کی پیدائش کے متعلق جو کچھ کہا وہ آج کی سائنس بھی کہہ رہی ہے۔

ابن تیمیہ اور امام فخر الدین رازی نے ارسطو کی منطق اور دیگر نظریات پر مدلل تنقید کی۔ ارسطو، افلاطون اور بطلیموس آسمان کو ٹھوس سمجھتے تھے۔ اس میں تغیر تبدل نہیں ہوسکتا اور یہ باقاعدہ عقل وروح رکھتا ہے۔ اور یہ عقل وروح انسانی عقل وروح سے فوقیت رکھتے ہیں۔ تمام کائناتی امور ان کے ذریعہ تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ آسمان حرکت کرتے ہیں اور اختیار وارادہ رکھتے ہیں۔ اس طرح کے بے شمار غیر معقول خیالات فلکیات کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان نظریات کی مسلم متکلمین نے تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ مشاہدہ سے ستاروں کی حرکت ثابت ہوتی ہے نہ کہ آسمان کی۔ ان ستاروں کی حرکات کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے۔ اس طرح نظریۂ تجاذب اور اضافیت پر مسلمان حکماء کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ طوسی نے ثابت کیا کہ حرکت ایک طرح اضافی ہے اس نے اپنا فلکی اصطرلاب بھی نظریۂ حرکت اور اضافیت کے اصول پر ایجاد کیا تھا۔ یورپی اہل تحقیق اعتراف کرتے ہیں کہ ابن خلدون کے مقدمہ نے یورپ کے علمی حلقہ پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ یہی صورت حال فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کی ہے جسے فلسفہ کا جدید بانی کہا جاتا ہے۔ اس کے فلسفہ کی ابتدا تشکیک

1077
سے ہوئی لیکن صدیاں قبل یہ نظریہ غزالی نے پیش کیا اور تشکیک کے ذریعہ تحقیق کو حقائق کی منہاج قرار دیا۔

اس طرح ابن عربی (سپین) جیسا نابغہ روزگار نے ایسے فلسفیانہ مسائل حل کئے۔ اوران کی نشاندہی اتنی وضاحت سے کی۔ جن کو آج کے ایٹمی دور کی سائنس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ دانتے کی ''ڈیوائن کومیڈی'' کا مواد خاکہ مہیا کیا تو دوسری طرف پورے یورپ کو نظریۂ علم کی صحیح تعریف سمجھائی۔ یونانی فلاسفہ نے جوہر کو قائم بذات کہا۔ عربی نے مجموعہ اعراض کہا۔ (جوہر سے مراد۔ اشیاء کی حقیقت جو ہوتی نہیں)

(عرض سے مراد وہ صفت جس کا موضوع کی خاصیت سے تعلق نہ ہو۔ عرض بدلتا رہتا ہے مثلاً آدمی کا رنگ وغیرہ)

سپین کے فلاسفہ ابن طفیل، ابن رشد کا اثر کئی صدیاں یورپ پر رہا۔

اس طرح محدث شاہ ولی اللہ اور دیگر فلاسفہ کے ہاں برگسان کا فلسفہ جوش حیات اور مارکس کا نظریۂ معاشیات کے بنیادی عناصر ہی نہیں بلکہ مکمل فلسفۂ معاشیات موجود ہے۔

دیکھیے قرآن کا اعجاز کہ ایک گمنام قوم کو کس طرح بلندیاں مل گئیں!

اسلام کے چیدہ چیدہ مشاہیر

''معتزلہ''

بنوامیہ کے دور میں اسلامی عقائد کے بارے میں بہت سے سوالات پیدا ہو گئے تھے۔ اوران کے جواب میں بہت سے فرقے بن گئے تھے۔ اس طرح علم کلام کی ابتدا ہوئی۔ امیہ کی سیاسی صورت حال نے ''قضا وقدر'' کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ یہ حاکم لوگوں پر ظلم کرتے تھے اور کہتے تھے یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس طرح جبریہ اورقدریہ نے جنم لیا۔ یہ خیالات معتزلہ کی اساس تھے۔ انہوں نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ معبد جہنی نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور مارا گیا۔ اس کے بعد ان خیالات کو پروان چڑھاتے غیلان دمشقی بھی شہید کر دیا گیا۔ جہم بن صفوان اور دیگر بھی اسی جرم میں قتل کر دیئے گئے خلیفہ ولید کے زمانے میں معتزلہ کے افکار کو ترویج ملی۔ یزید بن ولید معتزلی تھا۔ منصور اور مامون کے عہد میں معتزلہ کے خیالات پروان چڑھے۔ ابوالھذیل علاف اور نظام ماموں کے استاد تھے۔ مامون کٹر معتزلی تھا۔ اس کے بعد واثق اور معتصم کے دور میں بھی معتزلہ کو مقبولیت حاصل رہی۔ واصل بن عطا نے تمام علاقوں میں اس نظریہ کی تبلیغ کی۔

واصل بن عطا حسن بصری کا شاگرد تھا۔ حسن بصری نے ایک سوال کے جواب پر کہ گناہ کبیرہ والا شخص کافر نہیں ہوتا، حسن بصری نے اسے کہا ''اِعۡتَزَلَ عَنَّا'' (وہ ہم سے جدا ہو گیا) تو واصل ان سے الگ ہو گیا وہاں سے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔ ان کے خیالات یہ تھے (1) توحید (2) عدل (3) جزا وسزا (4) کفر وایمان کی درمیانی حالت (5) امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔

(ا) توحید سے مراد صفات خداوندی اس کی ذات کا حصہ ہیں یعنی وہ اپنی قدرت مطلق کی وجہ سے قادر مطلق ہے۔

(ب) قرآن مخلوق ہے۔ معتزلہ کے ہاں۔ لیکن عام لوگوں کے نزدیک قرآن کلامِ الٰہی ہے جو مخلوق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا نے ہر شے کو ''کُن'' سے پیدا کیا۔ کن کا لفظ خدا کا کلام ہے۔ اگر کن مخلوق ہے تو پھر مخلوق کیسے خالق بن سکتی ہے۔ کیونکہ کن پر خالق ہونا لازم ہے۔ کلام تخلیق سے مختلف ہے۔ خدا قدیم ہے۔ اور اس کا کلام حادث ہے مگر معتزلہ کے ہاں قرآن مخلوق ہے۔ اگر غیر مخلوق ہوا تو بھی خدا کے ساتھ قدیم ہوگا۔ اس طرح سے اس کی وحدت پر زد آتی ہے۔ اس لیے قرآن مخلوق ہے۔

(ج) رویت باری (دیدارِ الٰہی): ان کے نزدیک خدا کا دیدار ممکن نہیں موسیٰ کے لیے ''لَنۡ تَرٰانِيۡ'' کبھی ہرگز نہیں

1077
دیکھ سکو گے کے الفاظ اس بات کا ثبوت ہیں کہ خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جو یہ کہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا ہے۔ وہ کاذب ہے۔

1) قرآنی آیات کی تعبیر: عرش، خدا کے ہاتھ پاؤں یا منہ استعارات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

2) عدل: خدا نے قانون جزا و سزا بنا دیا ہے اس لیے نہ تو نیکی کے بدلے عذاب اور نہ جرم کے بدلے انعام۔ یہ قوانین عدل انسان کی بھلائی کے لیے ہیں۔ خدا ظالم نہیں ہے۔

3) الوعد والوعید (جزا و سزا) انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ اختیار و ارادہ کا مالک اور فاعل ہے۔ وہ ہر عمل کی جزا دیتا ہے۔ یہی عدل ہے۔

4) بین المنزلتین: (کفر اور ایمان کی درمیانی حالت) گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہے اور نہ مسلمان بلکہ اس کا مقام ان دونوں کے درمیان ہے۔

5) امر بالمعروف و نہی عن المنکر: ہر لمحہ اس فریضہ کا جاری رکھنا ضروری ہے۔ اس میں کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں۔

چند مشاہیر معتزلہ کے افکار:

معتزلہ میں سے واصل بن عطا۔ غیلان ابو الھذیل، جہم بن صفوان، الخیاط، معمر وغیرہ وغیرہ نے شہرت پائی اور ابتدائی علم کلام میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے چیدہ چیدہ خیالات یہ ہیں:

خدا کی طرف صفات کی نسبت شرک ہے۔ وہ عادل ہے۔ کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔

گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن نہ کافر بلکہ دونوں کے بین بین ہے۔

خدا صرف خیر کا خالق ہے۔ ظلم پر قادر نہیں۔ کائنات ہیولیٰ سے تخلیق کی گئی ہے۔ کائنات تغیر پذیر ہے۔ اور اس میں حرکت ہی حرکت ہے۔

خدا کی ذات ہر اعتبار سے ایک ہے اس کی صفات بھی عین ذات ہیں اور الگ صفات کا گمان بھی توحید کے منافی ہے۔ وہ مجسم نہیں ہے۔ اس کا دیدار ممکن نہیں۔

- بدکار جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔
- مادہ قدیم ہے اور غیر فانی۔
- انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔
- خدا کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ وہ اس سے ماوراء ہے۔
- قرآن مخلوق ہے۔
- ہر چیز فانی ہے۔ دوزخ اور جنت بھی فانی ہیں۔

''اشاعرہ''

معتزلہ کے برعکس اشاعرہ عقل پر نقل کو ترجیح دیتے تھے۔قرآن وحدیث کے الفاظ پر من وعن یقین کرتے تھے۔ وہ عقلی توجیہہ اور تاویل کے زیادہ قائل نہیں۔ اس فرقہ کے امام ابوالحسن اشعری یعنی پورا نام ''ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری ہے یہ مشہور معتزلی محمد بن عبدالوہاب کے شاگرد تھے۔ چالیس برس تک معتزلی رہے۔تو اس نے مسجد میں اعلان کر دیا کہ میرا عقیدہ کہ قرآن مخلوق ہے۔ انسان خدا کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور انسان اپنے افعال کا خالق ہے۔ میں ان باتوں پر نادم ہوں اور معتزلیوں کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ اس فرقہ میں امام غزالی۔فخر الدین رازی۔ باقلانی۔مشہور فلسفی تھے۔ان کے عقائد درج ہیں۔

۞ خدا قدیم ہے۔ واحد ہے۔ موجود ہے۔ جو ہر نہیں ہے۔ جسم نہیں ہے عرض نہیں ہے کسی چیز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کسی مکان میں نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور وہ نظر آسکتا ہے۔

۞ انسانی افعال کا خالق خدا ہے۔ خدا نے ان افعال کا ہونا چاہا۔

۞ قرآن مخلوق نہیں ہے۔ خدا کا کلام ہے۔ کلام اور تخلیق دو مختلف چیزیں ہیں۔ خدا قدیم ہے اور کلام خدا کے ساتھ قدیم ہے۔ امر اور خلق میں فرق ہے۔ کلام مخلوق نہیں اس لیے قرآن بھی مخلوق نہیں۔

۞ خدا کا دیدار ممکن ہے اور قیامت کے روز مومن دیدار کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ خدا عرش پر متمکن ہے۔

آزادئ ارادہ:

جبریہ جبر کے قائل تھے۔ اور انسان کو مجبور محض سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس قدریہ قدرت پر یقین رکھتے تھے۔ معتزلہ نے قدریہ کے نظریہ کو اپنایا۔ ان کے نزدیک انسان مطلقاً آزاد ہے اور اپنے افعال کا خالق۔ اشاعرہ نے درمیانی راہ اپنائی۔ انہوں نے خلق کے ساتھ کسب کا نظریۂ پیش کیا۔ انسانی افعال کا خالق خدا ہے اور انسان ان کا کاسب ہے۔ انسانی افعال کا خالق تو خدا ہے۔ لیکن انسان اپنے اختیار کو ان افعال کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ قدرت کی دو قسمیں ہیں:

(1) قدرتِ قدیمہ:

یہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ انسان کو قدرت حادثہ حاصل ہے۔ اور قدرت حادثہ کی خالق نہیں ہوسکتی۔ انسانی افعال کا خالق خدا ہے۔ اور انسان ان کا کاسب ہے۔ اس قدرت حادثہ کی بدولت خیر وشر میں انتخاب کرتا ہے۔ اس طرح جزا وسزا کا اکتساب کرتا ہے۔

تصوّف

تصوّف کو بعض ''صوف'' سے مشتق سمجھتے ہیں۔ بعض صفا سے۔ بعض ''سوف'' یونانی لفظ سے۔ معنی عقل وحکمت'' چونکہ صوفیا پشمینہ کا لباس پہنتے تھے۔ اس لیے بعض کی رائے میں یہ ''صوف'' سے مشتق ہے۔ صوفیا باطن کی صفائی پر زور دیتے تھے اس لیے بعض نے اسے صفاً سے مشتق سمجھا۔ ہر صوفی نے اس کی مختلف تعریف کی ہے۔ ذوالنون مصری کے مطابق صوفی وہ ہے۔'' جس نے سب کو چھوڑ کر صرف خدا کو لیا ہو'' ابوبکر جریری کے خیال میں صوفی وہ ہے جو اخلاق حسنہ کا پیکر ہو۔ اور ہر برائی سے پاک ہو۔ منصور حلاج کے نزدیک صوفی وہ ہے جس کو کوئی پسند نہ کرے اور نہ وہ کسی کو پسند کرے۔ ابوالحسن لوزی کے مطابق تصوف نہ تو رسم ہے اور نہ علم بلکہ اخلاق کا نام ہے۔ معروف کرخی کے قول'' حقائق کو حاصل کرنا اور مخلوق سے یکسر روگردانی کرنا'' جنید بغدادی کے مطابق تصوف سے مراد حق تجھے بڑے وجود سے الگ کر کے ہلاک کر دے اور پھر وہ جو زندگی دے۔ وہ اس کے لیے ہو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہر صوفی نے تصوف کی جداگانہ تعریف کی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اسلامی تصوف کی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور:

اس دور میں تصوف شرعی احکام تک محدود رہا۔ عبادات اور اذکار پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک رہا۔

دوسرا دور:

یہ دور جنید بغدادی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ریاضت اور مراقبہ پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ خاص لباس صوفیا نے پہنا اور ترک دنیا کی تعلیم دی۔ اور صوفیانہ افکار بیان کئے۔

تیسرا دور:

یہ دور ابوالسعید اور شیخ ابوالحسن خرقانی کا دور ہے۔ اس میں جذب ومستی پر زور دیا گیا۔ اور فنا وبقا کے مسائل سامنے آئے۔

چوتھا دور:

یہ دور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا دور ہے۔ اس دور میں فلسفہ کی آمیزش ہوئی۔ اور تصوف ایک علمی موضوع بن گیا۔ اور اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی جانے لگیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ فرقے بنتے گئے۔ مثلاً سہروردیہ۔ قادریہ۔ چشتیہ۔ مولویہ۔ نقشبندیہ

1077
وغیرہ۔ ہر ایک کا اپنا اپنا طریق سلوک ہے۔ ہر صوفی کے نظریات دوسرے سے الگ ہیں۔ مگر کچھ نظریات ایسے ہیں جن پر سب صوفیا متفق ہیں۔

1۔ توحید:

خدا کی توحید مطلق کا قائل ہونا۔ اور اس میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ خدا کے سوا کسی اور کے تصور کو بھی کفر سمجھتے تھے۔ وحدت الوجود اس نظریہ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بیشتر صوفیا وحدت الوجودی تھے۔

2۔ عشقِ الٰہی:

تصوف میں ذاتِ الٰہی سے عشق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ صوفی خدا سے عشق کرتا ہے اور ہر وقت اس میں ڈوبا رہتا ہے۔

3۔ وصالِ الٰہی:

وصال کی یہ خواہش بڑی شدید ہوتی ہے۔ وہ دنیا کو فراق سے تعبیر کرتے ہیں اور ہر لمحہ اس آرزو میں بے تاب رہتے ہیں کہ کب خالق حقیقی سے وصال نصیب ہوگا۔

4۔ صوفیانہ اخلاق:

امام غزالی اور کشف المحجوب میں ان اخلاق کا ذکر ہے فہرست تو طویل ہے لیکن چند فضائل یہ ہیں۔ (1) صبر (2) شکر (3) خوف (4) اُمید (5) فقر (6) زہد (7) صدق (8) توکل (9) محبت اور توبہ وغیرہ۔

صوفی کے لیے یہ تمام فضائل لازم ہیں۔ تاکہ یہ اس کی زندگی کا حصہ بن جائے۔ صوفی خدا کی صفات کو اپناتا ہے ان کے ہاں کسی نہ کسی انداز میں مردِ کامل یا مردِ مومن کا تصور پایا جاتا ہے اور تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ پر عمل کرتا ہے۔

تصوّف کے منابع:

تصوّف کے مآخذ کے بارے میں مستشرقین کی آراء مختلف ہیں۔ بعض اسے عیسائیت سے اور بعض بدھ مت سے اور بعض اسے آریائی نسل کا ردِعمل کہتے ہیں۔

عیسائیت:

بعض مستشرقین کے مطابق اسلامی تصوف یہودیت اور عیسائیت کا ماخذ ہے۔ تصوف نے عیسائیت کا اثر قبول کیا ہے۔ عیسائی راہب اور مسلم صوفیا کے لباس میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ تسلیم و رضا اور توکل کے نظریات بھی عیسائیت کا ماخذ ہیں۔

نوافلاطونیّت:

مسلم فلسفہ پر یونانی فلسفہ کا گہرا اثر ہے۔ یعنی یونانی فکر نے اسلامی تصوف پر اپنے نقوش چھوڑ دے۔ صوفیاء کے ہاں

1077
افلاطون اور فلاطینوس کے فلسفہ کی جھلکیاں موجود ہیں۔ تاریخ میں فلاطینوس اور یونانی فلسفی مثلاً پورفاٹری کے سفر کی شہادت ملتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نو افلاطونیت پر یونانی فلسفہ کا اثر ہے۔

نو افلاطونیت کی اساس افلاطون کی مثالیت پر رکھی گئی ہے۔ حقیقت خیال ہے۔ وجدانی ہے اور حقیقت تک پہنچنے کا واحد طریقہ صوفیانہ تجربہ ہے۔ خدا سے عشق ضروری ہے۔ فلاطینوس اس کا مبلغ تھا۔ مسلمان فلسفی اور صوفیا اس نظریہ سے متاثر ہوئے۔

بدھ مت اور ویدانت:

نکلسن کی رائے میں مسلمان صوفیوں کے ہاں مراقبہ اور تسبیح کا استعمال بدھ رشیوں سے سیکھا۔ فنا اور صوفیانہ مقامات کا تصور ہندو فلسفہ سے لیا۔ فنا کا تصور نروان ہے۔

آریائی ردِعمل:

بعض مستشرقین کی تحقیق یہ ہے کہ تصوف سامی مذہب کے خلاف ایک ردعمل ہے اور یہ صحیح ہے کہ اسلامی تصوف میں ایرانی صوفیا کی کی سب سے بڑی کنٹریبوشن ہے۔ ایرانیوں کو تصوف سے ایک خاص دلچسپی رہی ہے اور انہوں نے اس پر بڑا کام کیا ہے۔ دعویٰ ان صوفیا کا یہ ہے کہ تصوف کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہے اس کے بعد ان کے روحانی تجربات اور مشاہدات پر ہے۔ جب یہ ایک علمی موضوع بن گیا تو اسے ایک باضابطہ علم کی شکل دیدی گئی۔ اور مختلف اصطلاحات وضع کردی گئیں۔ رفتہ رفتہ اس میں فلسفہ کی آمیزش بھی ہوتی گئی۔ اس آمیزش سے بعض خیالات نو افلاطونیت، عیسائیت، ہندو اور بدھ مت فلسفے کے مماثل ہو گئے۔ جبکہ جنید بغدادی کا دعویٰ یہ ہے کہ علم تصوف قرآن وسنت کے ساتھ مقید ہے۔

تصوّف ہندوپاک میں:

مسلمان صوفیا ہندوؤں میں بھی مقبول تھے۔ سلطان سخی سرور کے بہت سے ہندو معتقد تھے۔ بابا نانک کافی عرصہ دیوان چاؤلی کے روضہ پر بیٹھے رہے ہندو پاک میں سب سے پہلے صوفی دیوان چاؤلی تھے۔ جو ہندو سے مسلمان ہوئے۔ ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ ابراہیم ادھم کے ہم عصر تھے۔ تصوف کے دوسرے دور میں علی بن عثمان ہجویری یہاں آئے۔ کشف المحجوب تصوف کی اولین کتابوں میں سے ہے۔ بعض فرقوں میں غیر شرعی رسوم بھی آ گئیں۔ اس لیے نقشبندیہ نے شرعی احکام پر زور دیا نقشبندیہ خواجہ باقی اللہ، مجدد الف ثانی اور ان کے پوتے عبدالاحد سرہندی جبکہ چشتیہ معین الدین چشتی، سلیم چشتی، قادریہ کو مخدوم گیلانی وغیرہ نے جاری کیا۔ چشتیہ نے وجد وسماع کو خاص طور پر اختیار کیا۔ سلسلہ سہروردیہ نے بھی اسے جائز سمجھا۔ اکثر صوفیا نے شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان میں اکثر وحدت الوجودی تھے۔ مسئلہ تقدیر کے سلسلے میں یہ جبریہ تھے۔ ان کے کلام میں تین موضوعات مشترک ہیں۔

1۔ فنا:

دنیا اور اس کی ہر شے فانی ہے۔ اس لیے دنیا سے لو نہیں لگانا چاہیے۔

2۔عشقِ الٰہی:

خدا کی ذات باقی ہے۔وہی لائق عشق ہے۔صوفی اس دنیا کو فراق سمجھتا ہے ہر لمحہ اس کی روح خدا سے وصال کے لیے تڑپتی ہے۔عشق الٰہی سے معرفت الٰہی ملتی ہے۔جو اس کا مقصود ہے۔

3۔انسان دوستی:

انہوں نے انسان دوستی کا پر چار کیا ہے۔سندھی اور پنجابی صوفی شعراء کے کلام میں انسان دوستی کا جذبہ نمایاں ہے۔خواجہ فرید۔بلھے شاہ۔سلطان باہو۔شاہ لطیف۔بابا فرید۔مادھولال حسین وغیرہ۔

شیخ الاکبر ''ابنِ عربی''

شیخ ابوبکر محی الدین محمد بن علی، ابن عربی اور شیخ الاکبر کے نام سے مشہور ہیں۔ 1165ء (560ھ) اور اندلس کے شہر فرسیہ میں پیدا ہوئے۔ عربی قبیلہ طے سے تعلق تھا۔ سیر و سیاحت کے بعد دمشق میں مستقل سکونت اختیار کی۔ فتوحات مکیہ فصوص الحکم۔ مفاتیح الغائب ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ان کی شخصیت متنازعہ فیہہ ہے۔ بعض علما ان کی کفر والحاد کا مرتکب سمجھتے ہیں۔ وہ اعتقاد میں باطنی نظریہ کا قائل تھا۔ وحدت الوجود کو فارسی میں ''ہمہ اوست'' کہتے ہیں۔ اس میں وجود صرف ایک ہے۔ خدا کی ذات کا۔ باقی تمام موجودات اس کا پرتو، مظہر، اس کے مطابق کائنات میں ہر لحہ تخلیق جاری ہے۔ اور یہ تخلیقی عمل کبھی نہیں رکتا۔ خدا خیر ہے۔ اور تمام خیر ہے۔ شر صرف ایک انداز نظر ہے اور اضافی ہے۔

❁❁❁

''اخوان الصّفا''

اخوان الصّفا فلسفیوں کی مجلس کا نام ہے جو بصرہ میں 373ھ میں قائم ہوئی۔ اس کے اجلاس خفیہ ہوا کرتے تھے۔ اس میں فلسفہ اور مذہب پر آزادانہ بحث ہوتی تھی۔ انہوں نے 51 رسالے تحریر کیے۔ ان میں چند فلسفیوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں جو کشف الظنون میں مذکور ہیں۔ ابوالحسن بن ہارون، زید بن رفاعۃ وغیرہ۔ انہوں نے اپنی اس مجلس کا مقصد یوں بیان کیا ہے کہ حکمائے قدیم نے طب، ریاضی نجوم وغیرہ پر جو کتابیں لکھیں۔ ایک گروہ نے تو مخالفت کی۔ جس کی وجہ جہالت تھی یہ مسائل ان کی فہم سے بالا تھے۔ دوسرے گروہ نے ان علوم کو پڑھ کر شریعت سے انکار کر دیا۔ ہمارا مقصد ان دونوں کی حقیقت تک پہنچنا ہے۔ اس لیے ہم نے 51 رسالے لکھے ہیں جس میں شریعت اسلامی اور علوم فلسفہ کے حقائق بیان کیے ہیں اخوان الصفا نے تمام مذاہب اور مروجہ علوم وفنون سے استفادہ کیا ہے یہ فلسفہ مختلف رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔ بہر حال ان کے فلسفہ کی تلخیص یہ ہے۔

کونیات:

ان کے کونیائی فکر پر نوافلاطونیت کا گہرا اثر ہے۔ عقیدہ ان کا یہ ہے کہ خدا تمام علوم اور انسانی فکر سے بلند ہے۔ خدا کی ذات سے اس کائنات کا ظہور ہوا ہے۔ یہ مادی دنیا مختلف مراتب سے ظہور پذیر ہوئی۔ جو یہ ہیں:

(1) عقلِ اوّل (2) عالمِ روح (3) ابتدائی مادہ (4) فطرت

(5) مکانی مادہ (6) کروں کی دنیا (7) دنیا کے عناصر (8) دھاتیں

یہ آٹھ جواہر خدا جو مطلق واحد ہے، سے مل کر نو بن جاتے ہیں: روح خدا کی طرف جاتی ہے۔ انفرادی روحیں عالم روح کا حصہ ہیں۔ جسم کی مدت ختم ہونے کے بعد یہ روحیں خدا کی طرف چلی جاتی ہیں۔ اور عالم روح بھی خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ انسانی روح عالم روح سے ظاہر ہوئی۔ اور ہر روح مادہ سے ملوث ہے۔ مذہب اور فلسفہ کی غایت روح کی پاکیزگی ہے۔

اخلاقیات:

اخوان الصفا روح کی پاکیزگی پر زور دیتے ہیں۔ خدا سے محبت اعلیٰ قدر ہے۔ جسم مادی ہے اور تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ روح کا تعلق خدا سے ہے اور روح کو بالآخر خدا کی طرف لوٹنا ہے۔ جسم فنا ہو جائے گا لیکن روح باقی رہے گی تمام نیکیاں روح سے

1077
تعلق رکھتی ہیں اور برائیاں جسم سے۔جسم کی فنا روح کی زندگی ہے ان کے ہاں انسان کامل کا تصور بھی ملتا ہے۔ ڈی۔ بوئر اس تصور کی وضاحت اس طرح کرتا ہے۔''انسان کامل مشرقی اور ایرانی نژاد کا ہونا چاہیے۔ جسے عقیدے میں عرب، تعلیم میں بابلی، فہم میں عبرانی، کردار میں عیسیٰ کا حواری، شامی راہب کی طرح نیک، علوم طبعی میں یونانی، اسرار کی تعبیر میں ہندوستانی، اور ان میں سے بالاتر ایک صوفی اور اپنے روحانی تصور میں مکمل صوفی ہونا چاہیے۔

نظریۂ علم:

علم کا مقصد روح کی پاکیزگی ہے۔ مادی اشیا کا علم حواس کے ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن منطق اور مبادیات کا علم وجدانی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ روح بدن کے تابع نہیں۔ روح عقل محض یا عقل خالص کے قوانین کے تابع ہے۔ اس لیے تمام علم حقیقی فرد کی روح میں موجود ہے۔ روح کی پاکیزگی کے لیے علم کا حصول ضروری ہے۔ پہلے وہ کم تجریدی علم حاصل کرے۔ پھر اس سے زیادہ تجریدی علم حاصل کرے۔ جیومیٹری، ہندسہ، حساب اور منطق ضروری علم ہیں۔ منطق، طبعیات اور مابعد الطبیعات کو درمیانہ درجہ حاصل ہے لیکن علم منطق نہایت ضروری ہے۔

❁❁❁

’’الکندی‘‘

ابو یوسف یعقوب بن اسحق الکندی

یہ فیلسوف عرب کہلاتے ہیں۔ پہلے عربی النسل فلسفی جنہوں نے ڈھائی سو زائد کتابیں لکھیں۔ ان کا سائنس کے ساتھ ساتھ مذہب کا بھی گہرا مطالعہ تھا۔ ان کے نزدیک فلسفہ اور سائنس ایک ہی شے ہے۔ اس نے ڈیکارٹ سے پہلے فلسفہ کے لیے ریاضیاتی منہاج استعمال کی۔ اور دوسرے علوم کے علاوہ موسیقی میں بھی اس نے ریاضی کو استعمال کیا۔ فلسفہ اور مذہب کے اتحاد پر یقین رکھتے تھے۔ دونوں حقیقت واحد یعنی علتِ اولیٰ (خدا) کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

کونیات:

الکندی کے نزدیک کائنات عدل کا مجموعہ اور علت ومعلول کے رشتے میں مربوط ہے علت کے کئی درجہ ہیں:

(1) اعلیٰ علت (2) ادنیٰ علت۔

اعلیٰ علت ادنیٰ علت کو متاثر کرتی ہے۔

جواہر خمسہ:

ان کے نزدیک پانچ کونیاتی جوہر ہیں۔ جوہر مادی دنیا کا بنیادی اصول ہے۔ اور اس مادی دنیا میں پانچ جواہر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

(1) مادہ: جو جوہر کو قبول کرتا ہے۔

(2) صورت: اس کی دو اقسام ہیں، ایک وہ صورت جو مادے کا جز ولاینفک اور دوسری صورت ایک صلاحیت ہے۔ جو بغیر صورت کے مادہ سے ایک شے پیدا کرتی ہے۔ بغیر صورت کے مادہ ایک خیال ہے اور وہ اس وقت شے بنتا ہے۔ جب وہ کوئی صورت قبول کرتا ہے۔

(3) حرکت: حرکت کی کئی اقسام ہیں مادہ میں تبدیلی، مقدار میں کمی وبیشی کیفیت میں تبدیلی، مقام اور حیثیت میں تبدیلی۔

(4) زماں (Time): زماں حرکت کو مستلزم ہے۔ وقت ہمیشہ ایک سمت میں سفر کرتا ہے۔

(5) مکان (Space): مکان کو جسم سمجھا جاتا ہے۔ مکان میں کوئی نہ کوئی جسم موجود رہتا ہے۔

ظہورِ عالم:

اس کائنات نے خدا سے ظہور پایا۔ یہ تخلیق نہیں کی گئی بلکہ خدا کی بیکراں ذات کا ناگزیر بہاؤ ہے اور اس کی تخلیق کا لازمی نتیجہ۔ جس طرح سورج کی شعاعیں سورج سے نکلتی ہیں اس طرح اس کائنات نے خدا کی ذات سے ظہور پایا ہے۔ ظہور میں مختلف درجے اعلیٰ اور ادنیٰ ہیں۔ (Evolution)

انسانی روح:

انسانی روح، روح عالم سے نکلتی ہے۔ ہر روح جسم میں مقید ہے۔ اس لیے روح اس عارضی جسم کے ساتھ اس عارضی دنیا میں خوش نہیں رہ سکتی۔ روح انہی کاموں میں خوشی اور تسکین محسوس کرتی ہے۔ جن کا تعلق عقل اور روح سے ہوتا ہے جسم سے متعلق سر گرمیوں سے اسے تسکین محسوس نہیں ہوتی۔

نظریۂ عقل:

اس کا نظریہ عقل بہت مشہور ہے۔ علم یا تو حواس کے ذریعہ یا عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ حواس کا تعلق مادی اشیاء سے ہے۔ اور عقل کا روحانی اور آفاقی، عقل کی چار انواع ہیں:

(1) عقلِ فعال (2) عقلِ ہیولانی

(3) عقلِ مستفاد (4) عقلِ بالفعل

عقلِ فعال اسی کائنات پر حکومت کرتی ہے۔ یہ عقل پیغمبروں میں ظاہر ہوتی ہے۔

عقلِ ہیولانی، عقلِ فعال کی تفہیم کی استعداد کو کہتے ہیں، اور عقلِ مستفاد اس صلاحیت کے اکتساب کا نام ہے اور عقلِ بالفعل اس کو عملی جامہ پہنانے کو کہتے ہیں۔

’’ابوبکرالرّازی‘‘

ابوبکرمحمد ابن زکریاالرّازی

ابوبکرمحمد ابن زکریاالرّازی مشہور طبیب، کیمیادان، ماہر طبیعات ونفسیات اور فلسفی تھے۔ طبیب کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے۔ رے میں پیدا ہوئے اس لیے رازی کہلائے۔ رازی مذہب۔ فلسفہ اور سائنس کی دوئی کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں یہ تینوں الگ الگ مضامین ہیں۔ ان میں اتصال واتحاد کی گنجائش نہیں۔ ان کی دو کتابیں مقالہ فی مابعدالطبیعہ اور کلام الٰہی میں ان کی مابعدالطبعی فکر کا پتہ چلتا ہے۔ رازی کی مابعدالطبیعات کے پانچ بنیادی اصول ہیں۔

(1)خالق (2)آفاقی روح (3)ابتدائی مادہ (4)مکان مطلق (5)زمان مطلق

خالق نے کائنات تخلیق کی ہے۔ کہتے ہیں کہ روح آفاقی کو مادے کے ساتھ ملاپ کے لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ جنسی مسرتیں حاصل ہوسکیں۔ لیکن مادہ باغی نکلا۔ جس پر خالق کو رحم آگیا۔ اور اس نے کائنات اور انسان کی تخلیق کی۔

رازی کے ہاں زمانِ مطلق اور اضافی زمان اور مکان مطلق اور اضافی مکان میں واضح فرق ہے۔ زمان مطلق ایک آزاد قوت کا نام ہے۔ جو ہر لمحہ ایک تیز بہاؤ ہے۔ یہ تخلیق کائنات سے پہلے موجود تھا۔ اور کائنات کے ختم ہونے کے بعد بھی موجود رہے گا۔ زمانِ مطلق ابدی ہے اور ازلی بھی۔ اضافی زماں کا حرکت اور تغیر کے ساتھ تعلق ہے۔ ان کے بقول ابتدائی مادہ تخلیق ارضی سے پہلے بکھرے ہوئے جواہر پر مشتمل تھا۔ ان جواہر سے عناصر پیدا ہوئے۔ جو پانچ ہیں: (1)مٹی (2)ہوا (3)آگ (4)پانی (5)آسمانی عنصر۔

اخلاقیات:

رازی ترکِ دنیا کے قائل نہیں تھے۔ ان کے نزدیک سقراط اخلاقی زندگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے نظریہ اخلاق کو ہم عقلی لذئیت کا نام دے سکتے ہیں۔ انسان جتنا عقلمند ہوگا اتنا وہ خدا کے قریب ہوگا۔ ان کے نزدیک فلسفہ محض علم کا نام نہیں بلکہ علم وعمل کو فلسفہ کہتے ہیں۔

''الفارابی''

ابونصر محمد بن محمد بن طرفان

فاراب کے نزدیک ایک گاؤں وسیج میں پیدا ہوئے۔ترکی النسل تھے۔فلسفہ میں اس قدر شہرت پائی کہ ان کو معلّم ثانی کہا جانے لگا۔بغداد میں تعلیم پائی۔ان کا فلسفہ:

(1)وجودیات (2)کونیات (3)الٰہیات (4)عقلی نفسیات (5)سیاسی فلسفہ

1۔وجودیات:

ان کے نزدیک وجود ایک ایسا تصور ہے۔یعنی ناقابل تجزیہ، ناقابل تغیر (Indivisible) وجود کی درج ذیل اقسام ہیں:

i۔وجودِ واجب اور وجودِ اتفاقی:

وجود واجب ہر حال میں موجود ہوتا ہے۔اور وجود اتفاقی کسی دوسرے وجود کے سہارے موجود ہوتا ہے۔

ii۔وجودِ بالقوۃ اور وجودِ بالفعل:

وجود بالقوہ وجود کے موجود ہونے کی صلاحیت کو کہتے ہیں۔اور اس کی موجودگی کو وجود بالفعل کہتے ہیں۔

iii۔جوہر و عرض:

جوہر فی نفسہ موجود ہوتا ہے۔جبکہ عرض کو موجود ہونے کے لیے جوہر کی ضرورت پیش آتی ہے۔اشیاء کی حقیقت جو نہ بدلے جوہر کہلاتا ہے۔

جبکہ عرض سے مراد وہ صفت جس کا موضوع کی خاصیت سے تعلق نہ ہو۔عرض بدلتا رہتا ہے۔مثلاً آدمی کا رنگ وغیرہ۔

iv۔جوہر اور وجود:

جوہر وجہ موجودگی کو کہتے ہیں۔جو اس کی ماہیت کو متعین کرتا ہے اور وجود اس کی فی الحقیقت موجودگی کو کہا جاتا ہے۔

ابونصر فارابی کی رائے میں خدا بذات خود موجود ہے اور واجب الوجود ہے۔

مادہ غیر متعین ہے اور صورت مادے کو متعین کرتی ہے۔اور مادہ بغیر صورت کے وجود نہیں رکھتا۔

2۔کونیات:

فارابی نے صدور کا نظریہ پیش کیا ہے۔اس دنیا نے خدا کی ذات سے ظہور پایا ہے۔یہ کائنات براہ راست ذات الٰہی سے ظاہر نہیں ہوئی بلکہ مختلف ارواح اور عقول کے ذریعہ سے ظہور میں آئی ہے۔

3۔الٰہیات:

فارابی کے نزدیک ذات الٰہی کا علم فلسفہ کا مقصد ہے۔اس کے خیال میں ہر وجود یا ضروری ہے یا ممکن۔خدا وجودِ واجب ہے۔جو بغیر کسی سبب کے خود اپنی ذات میں موجود ہے۔اس نے خدا کے وجود کے لیے مندرجہ ذیل ثبوت پیش کیے۔

i۔حرکت:

اس دنیا میں حرکت ہے۔حرکت سے محرک ضروری ہے۔اس طرح خدا سب سے پہلا محرک ہے جس نے تمام اشیاء کو حرکت دی ہے۔

ii۔علت ومعلول:

ساری کائنات علت ومعلول کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے ہر معلول (Effect) کی کوئی نہ کوئی علت (Cause) ضرورتی ہے (Cause)۔اس طرح خدا علتِ اُولیٰ ہے۔جس نے تمام علتوں کو پیدا کیا ہے۔

iii۔خدا واجب الوجود ہے:

خدا واجب الوجود ہے۔اس کی ناموجودگی کے بارے میں سوچنا ناممکن ہے وہ بذاتہٖ موجود ہے باقی سارے وجود اتفاقی ہیں۔وجود اتفاقی کی ناموجودگی کا تصور ممکن ہے۔وجود اتفاقی وجود واجب کی وجہ سے موجود ہے۔خدا بسیط ہے نا قابل تغیر، لامحدود اور واحد ذات ہے۔

4۔عقلی نفسیات:

انسان روح اور جسم سے عبارت ہے۔جسم کا تعلق مادہ سے ہے اور روح کا تعلق ایسی دنیا سے جو حواس سے ماوراء ہے۔روح تفکر اور ارادے میں اظہار پاتی ہے۔(عقل+ارادہ=روح)۔

5۔سیاسی فلسفہ:

سیاسی فلسفہ میں اس کی کتاب ''المدینۃ الفاضلۃ'' مشہور ہے اس میں مثالی ریاست کا تصور موجود ہے۔معاشرے میں قانون فطرت جاری وساری ہے انسانی معاشرہ انسان کے جسم کی مانند ہے جس طرح جسم پر قانون فطرت کا اطلاق ہوتا ہے اس طرح ریاست پر بھی قانون فطرت لاگو ہونا چاہیے۔ریاست کا مقصد شہریوں کی بھلائی و بہبود ہے اور شہری ارادتاً پابندیوں کو اختیار کرتے ہیں ریاست کے حکمران میں پیغمبرانہ خصائل ہونے ضروری ہیں۔ایک فلسفی اور مضبوط کردار کا حامل ہو۔

''ابن مسکویہ''

ابوعلی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ الرازی ابن مسکویہ

ابن مسکویہ نے بڑی لمبی عمر پائی 1030ء (421ھ) میں وفات پائی۔ اس کی یہ کتابیں بڑی مشہور ہیں۔

(1) تجارت الامم وتعاقب الامم (2) کتاب آداب العرب والفرس

(3) تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق (4) فوز الاصغر (5) فوز الاکبر

نظریۂ ارتقاء:

اس نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔ یہ نظریہ ڈارون اور ہربرٹ سپنسر کے نظریہ سے مختلف ہے کیونکہ یہ روحانی اور غایتی ہے۔ عالم وجودات، زندگی جمادات سے شروع ہو کر انسان تک پہنچتی ہے۔ جمادات کے بعد دوسرا مرحلہ نباتات کا ہے۔ تیسرا حیوانات اور آخری یہ انسانی زندگی کا مرحلہ۔ انسان نے بھی وحشی سے اپنی زندگی کی ابتداء کی ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے روحانی زندگی بسر کی، اور پیغمبر کے درجہ تک پہنچا۔ انسان کو جو چیز دیگر موجودات سے ممتاز کرتی ہے وہ قوت فکر ہے۔ یہ نظریہ فوز الاصغر میں موجود ہے۔ یعنی دونوں پروگریسو اور فجائی ارتقاء پیش کیے ہیں۔

اخلاقیات:

ابن مسکویہ کی دو کتابیں تہذیب الاخلاق اور فوز الاکبر اخلاقیات میں بڑی مشہور ہیں۔ ابن مسکویہ نے اخلاقیات کی بنیاد نفسیات پر رکھی ہے نفس غیر مادی ہے۔ غیر فانی ہے۔ وحدت ہے۔ (indivisible) ہے۔ نفس انسانی تین قوتوں پر مشتمل ہے۔

(1) قوتِ ناطقہ (عقل) (2) قوتِ غضبہ Self Aggression (3) قوتِ شہویہ Self Preservation

اخلاقیات ان تین قوتوں کی تربیت اور اصلاح کا نام ہے۔ ان میں اعتدال اخلاق کہلاتا ہے۔ اس سے حکمت، شجاعت اور عفت پیدا ہوتی ہے۔ ان تینوں میں ہم آہنگی عدالت کہلاتی ہے۔ فضیلت اعتدال سے پیدا ہوتی ہے اور عدالت اہم ترین فضیلت ہے اور تمام فضائل کی بنیاد ہے۔ اس نے رذائل کو ترک کرنے کے اور روحانی طریقہ علاج بھی بتائے ہیں۔ اخلاقی بیماریوں کا علاج تجویز کیا ہے۔

’’ابن سینا‘‘

ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا980ء(370ھ)

دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ منطق، فلسفہ، ہندسہ اور ہیئت کی تعلیم حاصل کی۔ طب میں شہرت دوام پائی۔ سولہ سال کی عمر میں تاجدار بخارا کا علاج کیا۔ تو اس سلسلے میں کتب شاہی کے مہتمم ہو گئے۔ 1037ء میں وفات پائی۔ ’’الشفاء، الاشارات، والتنبیہات، القانون فی طب‘‘ کی مشہور کتابیں ہیں۔

ابن سینا بڑے فلسفی اور نابغہ روزگار تھے۔ فلسفہ میں بہت سا اور یجنل کام بھی کیا ہے۔ ابن سینا نے علوم کی مندرجہ ذیل تقسیم کی ہے۔

نظری:

جو محسوس سے مجرد کی طرف یعنی Perception سے Conception کی طرف بڑھتے ہیں۔ مثلاً: طبیعات، ریاضیات اور مابعد الطبیعات مثلاً اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات وغیرہ۔

ابن سینا نے ایک دوسری نقطہ نظر سے صورت و مادہ کے اعتبار سے بھی علوم کی تقسیم کی ہے۔ (1) العلوم العالیہ (2) العلوم السافلۃ (3) العلوم الوسطی۔

علوم نظری کی مزید تقسیم یوں کی ہے:

1۔ حکمت طبعی:

ان اشیا کا علم جو حرکت اور تغیر کے تابع ہوں۔

2۔ حکمت ریاضی:

جس میں تغیر اور حرکت کو تجریداً اشیاء سے الگ کیا جاسکتا ہے

نفسیات:

ابن سینا نے نفس (ذہن) کی مختلف اقسام بیان کی ہیں اور ان کی مختلف صلاحیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن سینا کی نفسیات نفس نباتی سے نفس حیوانی تک اور نفس حیوانی سے نفس انسانی تک کا سفر ہے۔

1۔ نفسِ نباتی:

نفس نباتی میں مندرجہ ذیل قوتیں کارفرما ہیں۔(ا) تغذیہ (ب) تولید (ج) نشوونما

2۔ نفسِ حیوانی:

نفس حیوانی میں نفس نباتی کی قوتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل قوتیں کارفرما ہیں۔(ا) قوت مدرکہ (ب) قوت محرکہ

3۔ نفسِ انسانی:

نفس انسانی میں نفس نباتی اور نفس حیوانی کی تمام قوتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ ان قوتوں کے علاوہ نفس انسانی کو بہت سے ملکات حاصل ہیں۔ جیسے ملکہ فنتاسیہ، حواس خمسہ، قوت مصورّہ، قوت واہمہ، قوت ذاکرہ، ملکہ حافظہ۔ یہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں دماغ اور اس کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ نفس ناطقہ کی دو صورتیں ہیں۔

قوتِ عاملہ:

اس کا تعلق عمل سے ہے۔

قوتِ نظریہ:

اس کا تعلق فکر سے ہے۔ عقل کے چار مراتب ہیں۔

عقل ہیولانی:

یہ مادی قوت ہے۔ اس کے امکانات واضح نہیں ہیں۔

عقلِ بالفعل:

اس کے امکانات واضح ہیں۔

عقل بالملکہ:

جو اپنے امکانات میں کمال حاصل کرے۔

عقل مستفاد:

یہ معقولات (عقل علوم) میں دلچسپی لیتی ہے اور عقل فعال سے جا ملتی ہے۔

روح:

نفس (ذہن) مادے کی نہیں بلکہ صورت کی ایک قسم ہے۔ روح ایک معنوی جوہر ہے۔ روح ہی سے بدن کی تکوین اور تکمیل ہوتی ہے۔ اس سے بدن کا وجود ہے اس سے فعلیت قائم ہے۔ اس طرح نفس ناطقہ مادے سے الگ ایک جوہر ہے۔ مادی

صورت نہیں ہے۔ روح ایک وحدت ہے۔ جس کی بدولت جملہ شعوری واردات کی تکمیل ہوتی ہے۔ (موجودہ علم ابھی اس تک پہنچا ہے کہ Brain اور Mind الگ الگ چیزیں ہیں)۔

مابعد الطبیعات:

(میٹافزکس) مابعد الطبیعات کا انحصار منطق پر ہے۔ اصولِ منطق طبیعات اور مابعد الطبیعات دونوں میں کارفرما ہوتے ہیں۔ وجود اور شے وہ بسیط اور ابتدائی مفہوم ہیں کہ جس کی کوئی تعریف ممکن نہیں وجود جوہر اور اعراض میں منقسم ہوجاتا ہے۔ قوت، فعل، قدیم، واحد، محدث، علت، معلول، تام، ناقص، سب اعراض ہیں۔ ابن سینا مابعد الطبیعات میں علل اربعہ کا قائل ہے۔ مادی اور صوری علتوں کا تعلق خارج سے ہے۔ ایک کا فعل سے اور دوسری کا ہیئت سے ہے علت فاعلی کو اولیت حاصل ہے۔ علت غائی ایک علت بھی ہے اور علت العلا بھی۔ یوں تمام علتیں ایک ہی علت میں ضم ہوجاتی ہیں۔ اور اسے علت غائی کہتے ہیں۔ خدا بیک وقت علت غائیہ بھی ہے اور علت فاعلہ بھی۔

مادہ اور صورت ایک دوسرے کی علت نہیں۔ بلکہ صرف اپنے محدثات کی علت ہیں وجود عرض ہے جو ذات سے متصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مطلق واحد عرض نہیں بلکہ عین ذات ہے وہ عقل مطلق ہے۔ اس کی ذات میں عقل و عاقل اور معقول مل کر ایک ہو جاتے ہیں اسے اپنی ذات کا شعور حاصل ہے۔ اس حوالے سے اسے عالم کا شعور بھی حاصل ہے۔ وجود واجب ہوگا یا ممکن۔ ممکن کی ذات اس کے وجود سے الگ ہوتی ہے لیکن واجب کی ذات اس سے الگ نہیں ہوتی۔ امکان اور وجود کو محض ذہن سے متعلق سمجھنا غلط ہے۔ وہ حقیقی مفہوم رکھتے ہیں۔ ممکن ایک ایسا وجود ہے جس کی کوئی علت ہو لیکن واجب وہ جس کی کوئی علت نہ ہو۔ ہر ممکن کسی دوسرے ممکن کی علت ہوگا۔ لہٰذا ایک وجود واحد کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ وجود علت العلل بھی ہے اور غایت الغایات بھی۔ اگر صفات کو خدا کے ساتھ نسبت دی جائے۔ تو اس کی وحدانیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جیسا کہ معتزلہ کے خیال میں خدا کی صفات کو اگر خدا سے نسبت دی جائے۔ تو خدا کی وحدانیت پر زو پڑتی ہے۔ علت اُولیٰ سے صدور ہوتا ہے۔ تاکہ اس کی خوبیاں تمام موجودات میں منعکس ہوں۔ ابن سینا نظریہ صدور کا قائل ہے۔ یعنی خدا سے عقل اوّل کا ظہور ہوتا ہے اور یہ واحد ہوتی ہے۔ عقل اوّل اپنے جواہر اور وجود اوّل کے جوہر کا علم رکھتی ہے۔ عقل اوّل سے تین وجود ظہور پاتے ہیں:

(1) عقل دوم (2) روح اوّل (3) ستاروں کے کرے

اس طرح وجود اوّل سے دس عقول ظاہر ہوتے ہیں دسویں عقل کو عقل فعال کہتے ہیں جو ہماری دنیا میں کارفرما ہے اس سے مادہ پیدا ہوتا ہے اور عقل فعال مادے کو مختلف صورتیں بھی عطا کرتی ہے۔

منطق:

ابن سینا منطق میں ارسطو سے کہیں آگے تھا۔ بلکہ وہ جدید منطق کا بانی ہے۔ منطق سے متعلق اس کے خیالات اس کی کتاب

النجات الاِ شارات میں ملتے ہیں۔ منطق کا مقصد استدلال کی غلطیوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ ابن سینا نے منطق میں تحریر اور مشاہدہ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک تجربہ، مشاہدہ اور عقل دونوں مل کر کسی علم کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ارسطو کی طرح سینا بھی چار یا علل اربعہ کا قائل ہے۔ مادی، صوری، فاعلی اور غائی۔ 1077

لیکن اہمیت غائی علت کو ہے۔ باقی تمام علتیں اس کے تحت آتی ہیں۔ اور اس ایک علت میں ضم ہو جاتی ہیں۔ ابن سینا نے فن خطابت اور فن شعر کو بھی منطق میں شامل کیا ہے۔ اس نے منطق کی ابتدا فلسفہ لسان سے کی اور اختتام فن خطابت اور فن شعر پر کیا۔

اخلاقیات وتصوّف:

اس کی کتاب ''رسالہ فی العشق'' میں اس نے عشق کو اس کائنات کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ اس میں صوفیانہ اذکار ہیں۔ اخلاق کا مقصد فضائل کو عادتاً اختیار کرنا پڑتا ہے۔

''الغزالی''

ابوحامد ابن محمد الغزالی (455ھ۔1058ء)

طوس 455ھ میں پیدا ہوئے۔ مسلم فلسفہ میں غزالی کا مقام بہت بلند ہے مدرسہ نظامیہ کے صدر مقرر ہوئے۔ آدھی عمر تو فلسفہ میں باقی آدھی فلسفہ کے رد میں گزاردی مشہور کتابیں المقاصد الفلاسفہ، احیاء العلوم، تہافتہ الفلاسفہ، المنطق من الضَّلال۔ ان کی ذہنی اور روحانی سرگزشت ہے۔ جس میں انہوں نے حقیقت پانے کے لیے صوفیانہ طریقہ کو تجویز کیا۔ کہ صوفی روحانی واردات میں براہ راست خدا سے فیض یاب ہوتا ہے۔

فلسفیانہ نقطہ نظر سے تہافتہ الفلاسفہ ان کی دوسری بڑی اہم کتاب ہے جس میں اس نے الٰہیات کے ان مسائل کا ذکر کیا ہے جن کو فلسفی حل کرنے سے قاصر ہے چونکہ مسلمان فلسفیہ نے یونانی فلسفہ کے زیر اثر فلسفہ اور مذہب میں جو ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس میں پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکے۔

ابدیتِ عالم:

مسلمان فلسفی عالم کو خدا کے ساتھ قدیم مانتے ہیں۔ فارابی اور سینا بھی اس نظریہ کے قائل ہیں جس طرح خدا کی ذات قدیم ہے۔ اس طرح یہ عالم بھی قدیم ہے۔ لیکن مسلمانوں کے عام عقیدے کے مطابق خدا نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ عالم کے قدوم وحدوث کے اس مسئلہ کو مسلم فلاسفہ نے یونانی فلاسفہ کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن غزالی کے خیال میں مسلمان اس میں ناکام رہے ہیں۔ غزالی نے فرداً فرداً ہر مسلم فلسفی کے دلائل کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان سب کو رد کردیا ہے غزالی کی رائے میں خدا کا ارادہ آزاد ہے اور تمام علتوں کا خالق ہے اور فلسفی بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایسی علت موجود ہے جو بغیر کسی علت کے ہے اور علت العلل ہے۔ جب نتیجہ یہ نکلتا ہے تو پھر کیوں نہ خدا کے ارادے کو آزاد اور خالق مان لیا جائے۔ مشیت ایزدی ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہے اور تمام علتوں کی خالق ہے۔

اس لیے مشیت ایزدی نے ایک خاص لمحہ میں اس عالم کو تخلیق کیا۔ یہ ممکن ہے کہ مشیت ایزدی ابدی طور پر اس کا ارادہ

1077
کرے کہ ابن سینا اور فارابی فلاں فلاں وقت پر پیدا ہوں گے۔قدم عالم کے ساتھ فلاسفہ نے ہیولی کے امکان کو بھی ثابت کیا ہے غزالی ان کے نظریہ سے بھی متفق نہیں۔غزالی کے خیال میں امکان اور غیر امکان دونوں تعقلات ہیں۔اس لیے ان تعقلات کے ذریعہ سے مادے کی ابدیت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔اس طرح اس نے نظریہ صدور کو بھی رد کیا ہے۔اس کا لب لباب یہ ہے کہ کائنات کو عدم سے تخلیق کیا گیا ہے اور یہ خدا کی آزاد مشیت کی تخلیق ہے۔

علمِ الٰہی:

مسلم فلاسفہ نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ خدا کو جزئیات کا علم حاصل ہے بعض فلاسفہ مثلاً ابن سینا نے اس سے انکار نہیں کیا۔لیکن فلاسفہ کے خیال میں خدا کو جزئیات کا علم حاصل ہے۔لیکن آفاقی طور پر خدا کلیات کا علم رکھتا ہے اشیاء کی جزئیات اور تفصیلات کا اسے علم حاصل نہیں۔خدا کا علم ادراکی نہیں بلکہ تصوراتی ہے۔(Conceptual) کیونکہ ادراک تبدیلی اور تغیر کو مستلزم ہے اور خدا ناقابل تغیر ہے۔اس لیے خدا کو جزئیات کا علم نہیں ہوسکتا۔خدا ناقابل تغیر ہے۔مگر قرآن کی روشنی میں اسے ہر شے کا علم ہے۔غزالی کے خیال میں خدا کو ہر شے کا علم ہے۔اسے یہ معلوم ہے کہ واقعات کب رونما ہوں گے۔اصل میں فلاسفہ نے جس بنیاد پر خدا کے جزئیات کے بارے میں علم سے انکار کیا ہے۔وہ ارسطو کا ''نظریہ تعلیل'' ہے۔کیونکہ مسلم فلاسفہ علت ومعلول'' کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ہر چیز کو تعلیل میں مربوط گردانتے تھے۔اس نظریہ تعلیل کے تحت عالم کے بارے میں نظریہ میں جبر کی حکومت نظر آتی ہے۔اور ایسی دنیا میں معجزات اور تخلیقی اور آزاد فعلیت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

حشر اجساد:

مسلمان فلاسفہ حشر اجساد کے بھی منکر تھے۔ان کے خیال میں جو شے ایک دفعہ فنا ہو چکی ہے۔وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتی۔اس لیے وہ جنت اور دوزخ کو مقام یا علاقہ نہیں سمجھتے بلکہ روحانی حالتوں (یعنی کیفیت) کا نام دیتے ہیں۔اس طرح دکھ اور خوشی بھی روحانی ہوگی۔اور یہ جسم دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔بلکہ ایک روحانی احیاء ہوگا۔غزالی نے اس نظریہ کو رد کیا ہے۔اور ان پر کفر و الحاد کا الزام لگایا ہے۔غزالی کے نزدیک مسلمان فلاسفہ حشر اجساد کو اس لیے سمجھنے سے قاصر رہے کہ دنیا کے بارے میں ان کا تصور جبریت پر مبنی تھا۔

تعلیل:

ارسطو کے تتبع میں فلاسفہ علت ومعلول کے رشتہ کو ناگزیر سمجھتے تھے ان کے خیال میں علت خاص معلول کو پیدا کرتی ہے اور معلول ایک خاص علت کا نتیجہ ہوتا ہے۔غزالی کے نزدیک علت ومعلول کا رشتہ ناگزیر نہیں ہے بلکہ تقدم تاخر کا رشتہ ہے۔ضروری نہیں کہ ایک خاص علت ایک خاص معلول کو پیدا کرے۔بہت ساری علتوں کا ایک معلول ہوسکتا ہے۔اس طرح ایک علت کے کئی

1077
معلول ہو سکتے ہیں۔ مثلاً: آگ جلاتی ہے لیکن آگ کا یہ جلانا ایک امکانی امر ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ آگ نہ جلائے جس طرح ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا، اس لیے اگر علت ومعلول کو ناگزیر قرار دیا جائے تو نتیجہ جبریت ہوگا اور اس طرح معجزے کا امکان نہیں رہتا۔ اس نظریہ کو بعد میں جے ایس مل (JS Mill) اور ہیوم نے پیش کیا۔

ارادہ:

جبر وقدر میں غزالی الشاعرہ کے موقف کا حامی ہے۔ اشعری سلسلے کے سب سے بڑے آخری امام تھے۔ ان کا نظریہ ''کسب وعمال'' کا ہے کہ انسانی اعمال وافعال کا خالق خدا ہے۔ لیکن انسان کو جو اپنے اعمال پر قدرت حاصل ہے۔ وہ اکتسابی ہے۔

خدا کا ارادہ ومشیت آزاد، خود مختار ہے اور یہ کائنات اس کی تخلیق کا کرشمہ ہے۔

غزالی کا مقام:

بڑا فلسفی تھا اس نے ارسطو کے نظریہ تعلیل پر تنقید کی۔ اور ثابت کیا کہ علت ومعلول کا کوئی ناگزیر رشتہ نہیں۔ غزالی کے بعد جے ایس مل اور ہیوم نے بھی یہ بات کی ہے۔ کانٹ نے تنقید عقل محض میں انسانی عقل کو محدود قرار دیا ہے۔ غزالی کی تصنیفات سے بھی یہی مترشح ہے۔ ''المنقذ من الضّلال'' میں انہوں نے جس فلسفیانہ منہاج کا ذکر کیا ہے یہ ڈیکارٹ نے اختیار کیا۔ ڈیکارٹ اس لحاظ سے غزالی کا ہم خیال ہے کہ اس نے شک کو علم کی بنیاد قرار دیا۔ لیکن غزالی اس سے بھی بہت آگے نکل گیا۔ انہوں نے صوفیانہ تجربہ کو علم کی بنیاد قرار دیا۔ اس کے ذریعہ ہم حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے فلسفہ کا مغربی فلاسفہ پر بھی گہرا اثر ہے اور عیسائی متکلمین بھی اس سے متاثر ہوئے۔

❁❁❁

''ابنِ باجہ''

ابومحمد بن یحییٰ المعروف باجہ

باجہ چاندی کو کہتے ہیں یعنی زرگر، پانچویں صدی ہجری کے آخر میں سرقیسط میں پیدا ہوئے یوسف تاشفین کے وزیر بھی رہے۔موسیقی کا بھی ماہر تھا۔سیوطی نے اسے فلسفہ میں مغرب کا ابن سینا کہا ہے۔1138ء میں اسے کھانے میں زہر دیا گیا تھا۔

اس کی کتابیں ''تدبیر الموحد'' الاتصال، الوداع اور کتاب النفس مشہور ہیں فلسفہ میں رجحان الفارابی اور ارسطو پر ہے۔

اس نے مابعد الطبیعات کی اور نفسیاتی فلسفہ کی بنیاد طبیعات پر رکھی ہے۔عقل اور قوت متخیلہ کے درمیان تعلق، انسانی حافظہ کو جس مشترک کی طرف منسوب کیا ہے اس نے الفارابی پر تنقید کیا ہے۔اس نے الکندی، الفارابی اور ابن سینا کی طرح وحی اور عقل کے درمیان نہایت قریبی رشتہ ہونے کے عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔

مادہ اس کے خیال میں آزاد نہیں ہے بلکہ اس کی تشریح عقل اور روح کے حوالے سے کی جاسکتی ہے اس کے برعکس روح آزاد ہے۔روح اور عقل دونوں مادے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔انسانی عقل کا عقل فعال سے اتصال بیان کرتے ہیں۔عقل فعال انسانی عقل پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسے روحانی زندگی کی ترغیب دیتی ہے۔اخلاقی نظریہ میں فرد اور معاشرے کا تعلق بتایا ہے۔ اس کے نزدیک اخلاقی فعل وہ ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہو۔عقلمندوں کے معاشرے میں لوگ باہمی محبت کے ساتھ رہیں گے۔ہیگل کی طرح اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ حقیقت مطلق کی تفہیم فکر سے ہوتی ہے۔فکر انسان کا اعلیٰ ترین فعل ہے۔حِس ادراک دھوکہ دے سکتی ہے اس لیے عقلی تجربات زیادہ حقیقی ہوتے ہیں۔خود آگہی سب سے بڑا علم ہے۔ یہاں خیال حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔

''ابن رشد''

ابوالولید محمد بن احمد محمد بن رشد (1198-1126ء)

اندلس کا ایک بڑا فلسفی قرطبہ میں 1126ء میں پیدا ہوا۔ دادا قرطبہ کا قاضی اور باپ بھی اس عہدے پر فائز رہا۔ کچھ عرصہ ابن یوسف کا طبیب بھی رہا۔ قرطبہ کا قاضی القضا بھی رہا۔ یوسف کے جانشین یعقوب کے عہد میں ملحدانہ عقائد کے الزام میں جلا وطن کر دیا گیا۔ بعد میں خلیفہ نے ابن رشد کو دربار میں بلا لیا لیکن تھوڑے عرصہ بعد 1191ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ابن رشد ارسطو کا مقلد تھا۔ اسے معلم ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مشرق و مغرب کے فلسفہ پر ان کا گہرا اثر ہے۔ آزادی نسواں کا زبردست حامی تھا۔ اس نے غزالی کی کتاب ''تہافتہ الفلاسفہ'' کا رد لکھا۔ اس کی باون کتابیں موجود ہیں ان میں مشہور ''تہافتہ الفلاسفہ''، فصل المقال، کشف المناہج۔ اس کی شہرت سے زیادہ تر ارسطو کے شرح نویس کے طور پر ہے۔ اس نے الفارابی کی منطق پر تنقید بھی لکھی ہے اس نے ہیئت اور طب پر بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ اس کا فلسفہ یہ ہے۔

ابدّیتِ عالم:

کوئی چیز عدم سے ایک ہی بار پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی لحہ بہ لحہ تجدید ہوتی رہتی ہے جس کی بدولت دنیا برقرار رہتی ہے اور ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اشکال فلکی حرکت سے ہی قائم ہیں۔ عالم ابدی ہے۔ لیکن اس کی ابدیت ایک تخلیقی اور محرک علت کا نتیجہ ہے اس کے برعکس خدا بغیر کسی علت کے ابدی ہے۔ (Evolution)

علمِ الٰہی:

موجود اوّل کو محض اپنی ہستی کا ادراک ہوتا ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک یہ ابتدائی مفروضہ ضروری ہے۔ تا کہ موجود اوّل اپنی وحدت کو برقرار رکھ سکے۔ کیونکہ اگر اسے کثرت وجود کا علم ہو تو وہ خود ہی ذی کثیر ہو جائے گا۔ موجود اول کے لیے اپنی ہی ذات کے اندر رہنا اور اسے صرف اپنے ہی وجود کا علم ہونا چاہیے۔ اس طرح علم غایت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ لیکن ابن رشد کہتا ہے کہ اللہ خود اپنی ذات میں تمام اشیائے عالم کا علم رکھتا ہے اس کے علم کو نہ کلی کہا جا سکتا ہے نہ جزوی۔ وہ علم انسانی علم کی مانند نہیں بلکہ برتر نوعیت کا علم ہے۔ جو ہمارے تصور سے ماوراء ہے۔ یہ علم انسانی علم کی مانند تو نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو اس کے علم میں اور بھی لوگ

1077
شریک ہوجائیں گے۔ پھر خدا خدا نہیں رہے گا۔ مزید برآں خدا کا علم انسان کے علم کی طرح اشیاء سے ماخوذ یا ان کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ جملہ اشیاء کی علت ہے۔

روحِ انسانی:

ابن رشد روح اور عقل میں امتیاز کرتا ہے۔ عقل بالکل مجرد اور غیر مادی ہے۔ اس کا وجود درحقیقت اس وقت ہوتا ہے۔ جب اس کا ربط عقل کل اور عقل فعال سے قائم ہوجائے۔ وہ چیز جو کسی کی عقل کہلاتی ہے۔ دراصل ان معانی کے ادراک کی قوت کا نام ہے۔ اس کا سرچشمہ عقل فعال ہے۔ اس قوت کو عقل انفعالی کہتے ہیں۔ اور یہ دائم بالذّات نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اکتسابی ہوجائے۔ تب وہ جا کر عقل فعال سے وابستہ ہوتی ہے۔ جو ابدی معنی کا گہوارہ ہے اور یہ اس میں ضم ہوکر خود بھی ابدی ہوجاتی ہے۔

روح فلاسفہ کے نزدیک وہ قوت محرکہ ہے جو اشیاء نامیہ کی زندگی اور بالیدگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ ایک ایسی قوت ہے جس سے مادہ زندگی حاصل کرتا ہے اور جو عقل کی طرح صفات مادہ سے بالکل مبرا نہیں۔ لیکن اس کے برعکس اس کا مادہ سے بہت قریبی تعلق ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نیم مادی یا مادے کی انتہائی لطیف شکل ہو اور اواح اجسام کی شکل رکھتی ہیں۔ اس لیے جسم کی قید سے آزاد ہیں۔ وہ جسم کی موت پر بھی موجود رہتی ہیں۔ اور اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتی ہیں۔ اس کے خیال میں یہ آخری چیز محض امکانی ہے۔ وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ جس روح کا تخیل یہ ہو تو اس کی بقائے دوام کوئی اطمینان بخش ثبوت خالص فلسفیانہ ذرائع سے مل سکتا ہے۔ لہٰذا اس سوال کو حل کرنے کا کام وحی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

معاد اور حشرِ اجساد:

ہمارا جو جسم قیامت کے روز ہوگا۔ وہ جسم وہ نہیں ہوگا جو اس دنیا میں ہے۔ کیونکہ جو شے فنا ہوگئی وہ جوں کی توں پیدا نہیں ہوسکتی۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی اور مماثل صورت میں دوبارہ ظہور کرسکتی ہے۔ ہماری آئندہ کی زندگی حیات ارضی کی نسبت کہیں زیادہ برتر ہوگی۔ لہٰذا اس دنیا کے مقابل میں وہاں اجسام بھی زیادہ کامل، مکمل اور ناقابل تغیر ہونگے۔

مذہب اور فلسفہ:

اس کی کتابیں فصل المقال اور کشف المناہج کا یہی موضوع ہے۔ فلسفہ کو لازمی طور پر مذہب سے اتفاق کرنا چاہیے۔ اور یہی علم الکلام کا بھی اصول رہا ہے۔ سچائیاں دو قسم کی ہیں۔ (1) فلسفیانہ اور (2) مذہبی ان دونوں کا باہم اتفاق ضروری ہے۔ مذہب میں لفظی مفہوم اور تشریح کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ مثلاً قرآن کی کوئی ایسی عبارت جو بظاہر فلسفیانہ نتائج کی تردید کرتی ہو۔ تو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ظاہری معنی کی بجائے اس کا کوئی اور مفہوم ہے۔ اس حقیقی مفہوم کو تلاش کرنا چاہیے۔

1077

عام لوگوں کا فرض ہے کہ لفظی مفہوم کے پابند رہیں۔ اور اس کی صحیح تعبیر کرنا صرف اہل بصیرت کا کام ہے۔ عوام کو چاہیے کہ قصوں اور تمثیلوں کا وہی مفہوم لیں جس طرح وحی نے پیش کیا ہے لیکن فلسفی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کے اندر جو گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔ انہی تلاش کرے۔ مذہبی تعلیم کے لیے لوگوں کے ذہن معیار کا خیال رکھنا چاہیے۔ لوگوں کو درج ذیل طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1) ایسے جو تبلیغ کے نتیجہ میں ایمان لاتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف جوش خطابت سے متاثر ہوتے ہیں۔

2) وہ لوگ جن کے عقائد کا دارومدار استدلال پر ہے۔ مگر ایسے استدلال پر جو مذہبی مقدمات پر مبنی ہو۔

3) ایسے لوگ جن کے عقائد کی اساس بجائے خود ثابت شدہ مقدموں پر ہو۔ مذہب کی تبلیغ کے لیے ان تین قسم کے لوگوں کی ذہنی سطح سامنے رکھ کر نفسیاتی طور پر ان کو مذہبی تعلیم دینی چاہیے۔

❁❁❁

''ابن طفیل ابوبکر ابوجعفر محمد بن عبدالمالک محمد بن طفیل اندلسی''

494ھ/1100ء

یہ ابوجعفر الاندلسی الاشبیلی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔قبیلہ قیس سے تعلق اور 1100ء میں پیدائش۔ دربار میں کافی اثر و رسوخ تھا۔خلیفہ کے بیٹے کی ان سے کافی مراسم تھے۔اس کی ایک تصنیف ''حی بن یقظان'' دستیاب ہے جس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔حی بن یقظان کے معنی ''بیدار کا زندہ بیٹا''

یعنی زندہ بیٹا انسان کی علامت ہے۔ بیدار خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔اس حی بن یقظان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔علامتی طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ عقل انسانی بھی الوہی عقل کا ایک حصہ ہے اور انسان بغیر وحی کے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔اس میں تین اہم کردار ہیں۔حی۔سلامان اور اسال۔ یہ تینوں کردار ابن طفیل نے ابن سینا کی ایک کہانی سے لیے گئے ہیں۔داستان کچھ یوں ہے۔

ایک لڑکا ایک جزیرے میں بغیر ماں باپ کے پیدا ہوتا ہے اور اسے ایک ہرنی پالتی ہے وہ جانوروں کے درمیان رہتا ہے اور ان کی زبان سیکھتا ہے۔ بالآخر وہ ہاتھ پاؤں سے کام اپنا بھی سیکھ جاتا ہے۔اس دوران وہ ہرنی جس نے اسے پالا تھا وہ مر جاتی ہے۔ وہ اس کا عضو کاٹ دیتا ہے۔حتیٰ کہ اس کے دل تک پہنچ جاتا ہے جس پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ دل میں زندگی کا مرکز ہے۔ وہ ہرنی کو دفن کرنا بھی کوؤں سے سیکھتا ہے۔ وہ درختوں کی ٹہنیوں کو رگڑ کر آگ پیدا کرنا بھی جان لیتا ہے۔

آخر کار اپنے آپ کو ڈھانپنا، اون اور سوئیوں کا استعمال بھی سیکھ لیتا ہے۔ ابابیل کے پرندوں سے گھونسلا بنانا سیکھ لیتا ہے۔ یعنی پرندوں اور جانوروں کے مشاہدے سے وہ ساری معلومات اکھٹی کرتا ہے۔اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے پھر وہ فلسفہ سے تصوف کی طرف آتا ہے۔ پھر غور و غوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق ہے جو عاقل۔ رحیم اور علیم ہے اور آزادمشیت کا حامل ہے۔اب حی اپنے اور روح کے بارے میں غور و غوض کرتا ہے۔تو اسے معلوم ہوتا ہے وہ حیوانوں سے افضل ہے۔اور اپنے جسم کی وجہ سے وہ اس زمین پر رہتا ہے۔ اور اس کی روح کا تعلق آسمان سے ہے۔ جہاں اس پر خدا کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اور خدا کا قائل ہو جاتا ہے۔ اب وہ محتاط زندگی گزارتا ہے اور تمام برائیوں سے اجتناب کرتا ہے۔ کم خوری کو عادتاً اختیار کرتا ہے اور اس کا خدا سے وصال ہو جاتا ہے وہ اس وجد اور سرور میں محو ہوتا ہے کہ ملاقاتی اسے ملتا ہے۔ جو قریبی

جزیرے کے بادشاہ سلامان کا دوست اسال ہے۔ وہ حی سے ملتا ہے۔ جب حیّ انسانی زبان سیکھتا ہے تو دونوں اس پر متفق ہوجاتے ہیں کہ فلسفہ اور مذہب ایک ہیں پھر دونوں تبلیغ کے لیے قریبی جزیرے چلے جاتے ہیں پھر ان کا مشن ناکام ہوجاتا ہے اور وہ قائل ہو جاتے ہیں کہ پیغمبروں نے اس کام کو بہتر طور پر انجام دیا ہے۔ واپس آکر اپنی زندگیاں خدا کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

فلسفیانہ نتائج:

1) حیّ بن یقظان کی کہانی میں ابن طفیل نے علاقی طور پر فلسفہ دیا ہے کہ فلسفہ اور مذہب کا اشتراک لازمی ہے۔ دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ حیّ کو اپنے ماحول میں رہنمائی نہیں ملتی وہ فکر سے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے جس پر پیغمبر پہنچتے ہیں۔

2) فطری ماحول میں رہ کر کائنات پر غور کرنے سے انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ اس میں منطقی علم۔ وجدانی علم میں فرق بتایا گیا ہے۔ اور تینوں کردار حیّ فلسفیانہ رویہ، اسال مذہبی رویہ اور سلامان عام آدمی ہے۔

ان کا یہ ثابت کرنا ہے کہ انسان فلسفیانہ اور صوفیانہ وجدان سے خدا تک پہنچ سکتا ہے۔

''حیران کن مثال''
موت کے بعد زندگی کی حرارت کیسے وجود میں آئے گی؟

اَوَلَمۡ یَرَ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۷۷﴾ (36:77)

ایک ننھے سے قطرۂ آب میں پورا انسان بند ہوتا ہے۔مگر اس کو دیکھو کہ ہمارے ساتھ اس بات پر جھگڑ رہا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلۡقَهٗ ؕ (36:78) اپنی تخلیق کو بھول جاتا ہے کہ جب اسے عدم سے وجود میں لے آئے مگر ہمیں مختلف مثالیں دیکر سنا رہا ہے کہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ قَالَ مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَهِیَ رَمِیۡمٌ ﴿۷۸﴾ قُلۡ یُحۡیِیۡهَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمُۨ ﴿۷۹﴾ (36:78-79) جو تخلیق میں آچکا ہے وہ ان کی خوابیدہ، باطن صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ذرا غور تو کرو موت کے بعد حرارت کا وجود میں آنا۔

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الشَّجَرِ الۡاَخۡضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنۡتُمۡ مِّنۡهُ تُوۡقِدُوۡنَ ﴿۸۰﴾ (36:80) وجد میں لانے والی آیت ہے۔زندگی حرارت کا نام ہے۔ یہ دوران خون کا درجۂ حرارت ''Degree of hotness'' ہے۔اس کا نام حرارت ہے۔انسان مرجاتا ہے تو اس میں یہ حرارت نہیں رہتی۔ سارا نظام جامد ہوجاتا ہے۔ساری بات حرارت کی ہے۔کس قدر عام مثال ہے ایک دہقان کے لیے بھی اور فلاسفر کے لیے بھی۔

کیا اس سبز شاخ میں حرارت ہوتی ہے باقی چیزوں کے علاوہ نمی یا پانی ہوتا ہے۔گیلی لکڑیاں تو جلتی بھی نہیں ہیں۔کیا ان سرسبز ٹہنیوں میں حرارت ہوتی ہے۔وہی ٹہنی جب سوکھ جائے تو کیا ہم باہر سے لاکر اس میں حرارت داخل کردیتے ہیں؟ وہ پوری کی پوری شعلہ ہوتی ہے۔یہ آگ اس کے اندر کہاں سے آگئی؟ یہ تغیر اس سبز ٹہنی کے اندر ہوا ہے کہ اس کا پورا پانی حرارت، شعلہ بن جاتا ہے۔

؎ گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط — شعلہ خس میں جیسے خون رگ میں نہاں ہوجائے گا

تو وہ صلاحیّت اس صورت کے اندر نہاں ہوجائے گی۔تو سبز پانی کو جو شعلہ میں تبدیل کرسکتا ہے تمھیں تو اس مردہ جسم میں حرارت نظر نہیں آتی وہ تو چھپی ہوئی ہے کہاوہی یہ حرارت پیدا کرے گا۔

کائنات کا یہ محیّر العقول سلسلہ کیسے وجود میں آ گیا، ان سے کہو؟:

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۣ بَلٰى ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ (36:81)۔بغیر مسالہ کے یہ عظیم الجثہ کائنات کو جو وجود میں لاسکتا ہے تمہارا فلسفہ اور سائنس تو یہاں آ کر ختم ہوگئی۔خود بے زبان ہوجاتے ہو تو جھگڑتے کس بات پر ہو؟ بَلٰى ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ (36:81) کیوں نہیں وہ تو ایسی چیزیں تخلیق کر سکتا ہے جو تمہارے ذہن میں نہ آسکیں۔خَلّٰقُ'' کا یہی مطلب ہے۔فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ (36:83) کیا تم یہ تصور رکھتے ہو کہ مرنے کے بعد وہ پیدا نہیں کرسکتا۔وہ تمہارے ان ناقص تصورات سے بہت بلند ہے۔بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ (36:83) ہر شے کا اقتدار اس کے ہاتھ میں ہے اس کا اقتدار انتہا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔اور ہر چیز اس کے قانون کی طرف رجوع کرتی چلی جارہی ہے۔اس زندگی میں بھی اور بعد میں بھی۔

مغرب کے فلاسفر عقل کی بنیاد پر خراماں خراماں قرآنی تصورات کی طرف آ رہے ہیں:

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے

اب اگلی زندگی کے ثبوت میں ان کی تحقیقات آ رہی ہیں کہ زندگی آگے بھی ہے۔ڈاکٹر جونز (1956) کو (survival) تک پہنچا تھا۔کہتا تھا کہ میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتا۔اب یہ موجودہ سکالرز immortality (حیات جاوید) تک آ گئے ہیں۔''ایک کتاب The science of immortality'' وہ دیگر فلاسفر مل کر اس حیات جاوید پر بحث بھی کرتے ہیں۔''survival of the immortality'' پر ''سر اولیور لاج'' کی دو کتابیں:

1: The survival of man (1908)

2: The immortality of soul(1908)

اس نرالی اور انوکھی جماعت کا فریضہ،
سارے جہاں سے الگ تھلگ نظریہ والی جماعت

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ (37:1) مومنوں کے لشکر میدان جنگ میں اس لیے صف کشیدہ ہوتے ہیں۔ انسانیت کو ذبح کرنے کے لیے نہیں بلکہ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ (37:2) غلط کاروں اور ظالموں کو روکنے کے لئے میدان جنگ تک آجاتے ہیں۔ پوری امت یہی ہے۔ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ۙ﴿۳﴾ (37:3) یہ ہیں قانون خداوندی کی پیروی کرنے والے (قرآن)۔ یہ ہے ''نہی عن المنکر'' جب دشمن اس دیئے کو بجھانے آگے بڑھیں گے تو یہ ان کو میدان جنگ میں جا کر روکیں گے۔ یہ سارا کس مقصد کے لئے ہے۔ اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ (37:4) یہ سارا کچھ ایک خدا کی محکومیت قائم کرنے کے لئے ہے۔ ان کا مدعا

؎ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾ (37:5) خارجی کائنات میں تمام چیزوں کی نشوونما کرنے والا ہے۔ اسلامی مملکت کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ ہر ایک سامان نشوونما کے ساتھ اس کی کامل نشوونما کرتے جائیں۔

❁❁❁

حیوانی سطح پر زندگی گزارنے کے نتیجہ میں انسان خود حیوان بن کر رہ جاتا ہے

اس آیت میں ایک عظیم حقیقت پنہاں ہے۔ سطحی طور پر تو یہ بات بظاہر عامیانہ (معاذ اللہ) سی نظر آتی ہے۔ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَيۡدِيۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَهُمۡ لَهَا مٰلِكُوۡنَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلۡنٰهَا لَهُمۡ فَمِنۡهَا رَكُوۡبُهُمۡ وَمِنۡهَا يَاۡكُلُوۡنَ ﴿٧٢﴾ وَلَهُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشۡكُرُوۡنَ ﴿٧٣﴾ (36:71-73) حیوانات مویشی کہہ دیں فَهُمۡ لَهَا مٰلِكُوۡنَ ﴿٧١﴾ (36:71)۔ حق ملکیت سے مراد ''possession'' نہیں بلکہ کسی چیز کا مالک ہونا۔ ویسے تو شخصی ملکیت ہوتا ہے ورنہ ملکیت سے مراد ''اختیار و ارادہ، قدرت، قبضہ۔ کیا انسان ان کے مالک ہوتے ہیں۔ مویشیوں کے۔ مٰلِكُوۡنَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلۡنٰهَا (36:72-71)۔ ان سے وہ کام لیتا ہے۔ اس کے محکوم فرمانبردار ہوتے ہیں۔ وَذَلَّلۡنٰهَا (36:72) میں تذلیل کا پہلو بھی ہے۔ محکومیت اور فرمانبرداری کے لئے بیسوں الفاظ اور تھے۔ عرب عَيۡرُ الۡمَذَلَّةِ۔ وہ گدھا جس پر بوجھ بھی لادا ہوا ہو اور پیچھے سے ڈنڈے بھی پڑ رہے ہوں۔ یعنی ایسی محکومیت، کسی دوسرے کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بننا اور ساتھ ڈنڈے بھی پڑنا۔ یہ حیوانات کی کیفیت بتائی ہے۔

تم اس پر سواری کرتے ہو۔ نچوڑ نچوڑ کر ان کا دودھ پی جاتے ہو۔ کھالیں کھینچ لیتے ہو۔ مختلف قسم کے کام لیتے ہو۔ ان کو کھا بھی جاتے ہو۔ کہا یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان حیوان کے ساتھ یہ کچھ کرتا ہے۔ جہاں انسان دوسرے انسان کے متعلق یہ کچھ شروع کر دے۔ تو ان کے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لے گا۔ یہ ہیں جو شکل وصورت تو انسانوں کی رکھتے ہیں مگر زندگی حیوانوں کی گزارتے ہیں۔ اب ایسے تمام انسان جو حیوان کی زندگی بسر کرتے ہیں ان پر ان ساری چیزوں کا اطلاق ہو جائے گا۔ حیوانی سطح پر دوسرا انسان، اس محکوم انسان کے ساتھ یہی کچھ کرے گا جو کچھ انعام کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کو محکوم کر کے فرمانبردار بنائے گا۔ بوجھ بھی لادے گا۔ ذلیل بھی کرے گا۔ ڈنڈے بھی مارے گا۔ چوس کر اس کے خون کا ایک ایک قطرہ لے جائے گا۔ ان کو کھا بھی جائے گا کیونکہ یہ انسان نہیں رہا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انعام ہو گئے۔ یہ کون لوگ ہیں جو حیوانی سطح پر ہیں۔

1043
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ (47:12) اس میں ان کی شرف انسانیت جھلس کر رہ جاتی ہے۔ حیوانوں کی طرح جیا اور ان کی طرح مر گئے۔ کھانے پینے میں تو اقدار کا کوئی تصور نہیں آتا جو جی میں آئے اس سے وہ کام لیتا جائے اس کو تو صرف چارے سے غرض ہے۔ اقدار نہیں ہوتا۔ بیل تو حرام اور حلال میں تمیز نہیں کرتا یہ ہے حیوانی سطح زندگی۔ انسان کی سطح پر تو کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ۔مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) نبی کیوں نہ ہو۔ دوسرے انسانوں کو اپنے ذاتی اغراض کے لیے محکوم نہیں بنا سکتا۔

قوموں کی طرف سے قوانین کی سرکشی کا نتیجہ ذلت اور اختیار وارادہ سے محرومی:

حیوانی سطح پر آ کر جو حیوان سے کیا جاتا ہے تو زیادہ قوت والے انسان ان سے وہی کچھ کریں گے۔ قوم حیوانی سطح پر آ گئی۔ اقدار نہ رہیں۔ شرف انسانیت نہ رہا تو فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ (17:5) وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ (11:59) بڑی شان وشوکت کے مالک جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ (11:59) جبار اور سرکش لوگوں کے مطیع ہو گئے۔ اب مملوک جس کا کوئی دوسرا مالک ہو جائے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (16:75) مملوک جو اختیار نہ رکھے۔ حیوانوں کی طرح۔ جو دوسروں کے مقاصد کا ذریعہ بنتے ہیں ذَلَّلْنٰهَا میں دونوں چیزیں آ گئیں۔ بوجھ بھی اور ساتھ چابک بھی دوسروں کے مقاصد کو بروئے کار لانے والا صاحب اختیار نہیں رہتا۔

ے یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ وہزار گونہ فراغ

معاشرہ میں جو باہمی تعاون ہوتا ہے وہ ایک الگ چیز ہے یہ نہیں کہ دوسرے کے مقاصد کو بغیر ارادے کے پورا کرے۔ فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ (36:71)۔ کہ یہ صاحب اختیار ہیں تو جانور کے اوپر صاحب اختیار ہیں۔ اگر ان کا اختیار نہ رہا اور ذَلَّلْنٰهَا (36:72) ساتھ ہو گیا۔ رَكُوْبُهُمْ (36:72)۔ ان پر سواری کرے۔ مَشَارِبُ ؕ (36:73) ان کا خون بھی دودھ کی شکل میں نچوڑ کر پی لے۔ فِيْهَا مَنَافِعُ (36:73) سارے اپنے نفع کے کام ان سے لیتا جائے پھر يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ (36:72) ان کو کھا بھی جائے۔ قرآن میں مالک کا لفظ جہنم کے داروغہ کے لئے آیا ہے۔ جہاں انسان بے اختیار ہو جائے اسے قرآن نے جہنم کہا ہے۔ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ (43:77) کہے گا نہیں قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾ (43:77)۔ اب رہو اسی حالت میں ہمیشہ کے لیے۔

بندہ اور اطاعت صرف خدا کی:

سارا قرآن تعلیم دینے کے بعد آخری آیات میں کہتا ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١ مَلِكِ النَّاسِ ۝٢ (114:1-2) کتنی عظیم چیز قرآن کہہ گیا ہے۔ انسانوں پر حق اختیار صرف خدا کا ہو سکتا ہے۔

اسلامی مملکت کے خدوخال:

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (1:3) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٧ (82:17) ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٨ (82:18) خصوصیت کیا ہوگی اس نظام کی۔ کہا يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝١٩ (82:19)

ے کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

❁❁❁

کسی چیز کا ذہنی طور پر تسلیم کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز اس پر عمل کرنا ہوتا ہے

اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۸۱﴾ (37:81)

وَاِنَّ مِنۡ شِيۡعَتِهٖ لَاِبۡرٰهِيۡمَ ﴿۸۳﴾ اِذۡ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ ﴿۸۴﴾ (37:83-84)

پہلی چیز: صداقت پر ایمان لانا اور عبد بننا بھی اس کے بعد اس کے سامنے جھک جانا یہ ہے۔

دوسری چیز: یہ مقام کیسے حاصل ہوتا ہے۔ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ ﴿۸۴﴾ (37:84)۔ قلب کو اطمینان ہو جانا۔ یہ صرف دماغی طور پر سمجھنے کی بات نہیں ہے۔ سمجھ کر پھر اس چیز پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جانا۔ یہ دماغی چیز نہیں ہے۔ ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جو ہم نقصان دہ سمجھتے ہیں مگر پھر بھی کرتے ہیں۔

؎ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

صرف جاننا (دماغ اور فکر) کافی نہیں ہوتا۔ قرآن کا سمجھنا کافی نہیں ہے کیونکہ نتائج صرف سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتے۔ بغیر سمجھنے کے تو قرآن ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ سمجھنے کے بعد پھر ایمان ہو کہ ہاں واقعی اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ تو پھر طبیعت کو مائل ہونا چاہیے۔

اس فکری دنیا میں سقراط نے کہا تھا کہ ''knowledge is virtue'' صرف جاننا نیکی نہیں ہے لیکن نیکی کے لئے جاننا ضروری ہے۔ اس پر عمل کرنا نیکی ہے۔ اگلا تقاضہ طبیعت کا ادھر مائل ہونا یعنی (قلب سلیم) اور وہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب جاننے کے بعد طبیعت ادھر آئے۔ اس لئے قرآن تمام شکوک کو دور کر کے قلب سلیم سے ہمکنار کرتا ہے۔ یعنی جھکنے والا قلب۔

؎ پسر را گفت پیر خرقہ بازے ترا ایں نکتہ باید حرزِ جاں کرد
بہ نمرودانِ ایں دور آشنا باش ز فیضِ شاں براہیمی تواں کرد

جس طرح مسلمانوں نے عمل کرنا چھوڑ دیا تو ذلیل وخواری مقدر بن گئی۔ جس نے یہ عہد سحر کا عقیدہ کے الفاظ خود ایک تاثیر

1043
رکھتے ہیں۔ان کو اتنی دفعہ دہراتے جاؤ جنتر منتر کی طرح (jumbo mumbo) مفہوم اثر نہیں کرتا اس طرح سے یہ عہد سحر میں چلے گئے۔ یہ تمام درود و وظائف یہ ذہن انسانی کا عہد طفولیت کا دور تھا۔ یہ اس زمانے میں لے گئے ہیں۔قرآن نے ایمان کے بعد اعمال پر زور دیا تھا۔اب اس کا نام اعمال قرآنی رکھ دیا۔جس میں یہ سارے درود و وظائف ہیں۔اور عامل کے معنی یہ عمل کرنے والا۔ یہ تمام عملیات کہلاتی ہیں۔تعویذ گنڈے والے یہ تمام بھنگڑ عامل کہلاتے ہیں۔جس طرح پہلی قوم میں ملائکہ اور جن یعنی مخفی قوتوں کے متعلق یہ عقائد رکھتی تھیں کہ ان کا خدا سے رشتہ ہے اور یہ قوت وہیں سے لیتے ہیں۔قرآن نے ان تمام توہمات کی تردید کردی۔کہ یہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔جنات بدی کی قوتیں ہیں۔تباہیاں، بیماریاں اور زلزلے لاتی ہیں۔ان کو نذرانے دو اور پوجا پاٹ کرو۔پھر مردوں کی بستیاں قطب، اولیاء سے بھی یہ کام لیا جانے لگا۔پروپگنڈے سے ایک قبر پر گنبد بنایا اور اسے تمام طاقتوں کا مظہر بنا دیا۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝١٥٨ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝١٥٩ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝١٦٠ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۝١٦١ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۝١٦٢ (37:158-162)

تم اور یہ سب مل کر بھی کسی مخلص بندے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔یہ ہے اعلان اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ۝١٦٣ (37:163) جو ورغلایا جاتا ہے تو خود جہنم کی طرف جانا چاہتا ہے۔یہ تمام مسلمان نام بھی رکھ لیں تو صال الْجَحِيْمِ کے اندر آتے ہیں۔جبکہ مخلص بندوں کا تو یہ اعلان ہوتا ہے وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝١٦٤ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝١٦٥ (37:164-165) وہ جانتے ہیں اپنا مقام اس لئے وہ اس پروگرام کو بروئے کار لانے میں صف بستہ ہوتے ہیں۔اور جہنم اس دنیا میں هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۝٥٧ (38:57) کھولتا ہوا پانی اور یخ بستہ پانی ہوگا۔محکومیت کی بدترین شکل کا نام جہنم ہے۔جس کے داروغہ کا نام مالک ہے۔یہ محکومیت والے "شَرُّ الدَّوَابِّ" ہوتے ہیں۔دونوں حاکم و محکوم جہنم میں ہوتے ہیں۔

حَمِيْمٌ: حرارت کی بہت زیادہ حدت، سرکشی، شر، بے باق قوت اقتدار، یہ شر حرارت ہے۔جس سے جہنم بھڑکتا ہے۔یہ ایک طرف انتہا ہے۔دوسری جانب "غَسَّاقٌ" ہے۔شدید بدترین ٹھنڈا یعنی عوام کا خون جسم میں منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔ان میں آزادی کی تڑپ اور حمیت باقی نہیں رہتی۔عروق مردہ ہوتے ہیں۔زندگی تو نام ہی خون کی حرارت کا ہے نہ کہ یخ بستہ خون۔

یہ ہے غلط معاشرہ جس میں یہ دونوں چیزیں انتہا پر ہوتی ہیں۔جہنمی معاشرہ۔ایک طرف استبداد کی حرارت انتہا پر اور دوسری جانب محکومیت جس سے حرارت باقی نہیں رہتی۔یہ ہے معاشرہ جہنم کا۔سامان زیست ایسا کہ نشوونما ہونے کی بجائے اضطراب بڑھ جائے۔پانی کھولتا ہوا اور یخ بستہ دونوں کھیتی جلا دیتے ہیں۔اور قوم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔

انسان کا اختیار وارادہ اور طبعی جسم

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (38:76) تم تکبّر میں آ گئے کہ تم کو ان ملائکہ سے اونچا ہونا چاہیے یہ ''نار'' سے مراد کہ شیطان کو آگ، انسان کو مٹی سے پیدا کیا، یہ بہت بڑی دلیل دی ہے۔ حرکت اور حرارت تو جذبات کی خصوصیت ہے۔ انسان کا طبعی جسم جس کو اختیار وارادہ حاصل نہیں ہے۔ وہ مٹی کا پتلا ہے۔ کہا کہ میں تو اختیار وارادہ ہوں جو حرارت ہے۔ یہ تو میرے احکامات کی تعمیل کرتا ہے۔ یہ تو طین سے طبعی جسم میرے احکامات کی تعمیل کے لئے بنایا گیا ہے۔ تو بتاؤ میں افضل ہوں یا یہ طبعی جسم۔ حرارت وحرکت، اختیار کی چیز، یہ جذبات ہیں۔ یہ جذبات نے سرکشی اختیار کی تھی۔ انہوں نے احکام خداوندی کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہاری نگاہ صرف طبعی جسم پر ہے۔ اس میں ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ جو تمہیں بھی جھکا سکتی ہے۔ اس پر نگاہ رکھو گے تو اس مغالطہ سے نکل جاؤ گے۔ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ (38:77) تو محروم ہو گیا خوشگواریوں سے، دور ہو جا کیونکہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے ہمیشہ کے لئے جب تک تو یہ نہ کرے، سعادتوں سے محروم ہو گیا۔

ابلیس یہ انسان کے جذبات ہیں۔ یہ ''طین'' سے بنایا گیا ہے تو یہ انسان کے اعضاء، مٹی کا مادھو ہیں۔ یہ تمام اعضاء جذبات کے تابع کام کرتے ہیں۔ مثلاً ''میں'' نے فیصلہ کیا کہ بولنا ہے تو زبان بولنے لگ گئی۔ میں نے پانی لینے کا فیصلہ کیا تو ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ یہ ہاتھ پاؤں، زبان بجائے خویش کچھ شئے بھی نہیں ہے۔ یہ سارے جذبات کے تابع چلتے ہیں۔ غلطی یہ کی کہ اس نے کہا کہ چونکہ میں صاحب اختیار ہوں اس لئے ان کو میں اپنے احکام کے تابع چلاؤں گا، اس لئے تو کہا کہ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ (38:75) تمہاری انانیت تھی۔ تم نے بڑھا بننا چاہا۔ یہ جذبات یا انانیت بری شئے نہیں ہے۔ صرف ایک پابندی لگائی گئی ہے اگر وہ اقدار کے تحت فیصلہ کریں تو نتیجہ تعمیری اور خوشگوار ہوگا۔ تو ذات کے ساتھ ساتھ کائنات کے حسن میں بھی اضافہ ہوگا۔ اگر سرکشی برتے۔ تو ٹھیک ہے اس جسم سے جو کام لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ اس کے تابع چلنے والی چیز ہے۔ انکار نہیں کرے گی۔ کسی مظلوم کا گلا کاٹنے کے لئے ہاتھوں کو حکم دے گا تو وہ یہ کر دیں گے۔ یہ انانیت کسی کے تابع نہیں ہے۔ جو جی میں آئے فیصلہ کرے۔ یہ سیکولرازم کے تمام فیصلے بے محاسبہ اسی کے تحت ہوتے ہیں جو ساری دنیا جہنم کا نمونہ بن گئی ہے۔

1043 اصل شئے تو خودی کی تربیت ہے۔ یہ ہے اصل آدم۔ تاکہ احکام خداوندی کے مطابق فیصلے کرے۔ آج تو ساری دنیا سیاست، معیشت، معاشرت، سفارتی تعلقات میں یہ Ego کا ٹکراؤ ہے۔ یہ جذبات بھی ضروری ہیں اور انسانی جسم کے اعضاء ان فیصلوں کو بروئے کار لانے کے ذرائع ہیں۔ یہ بھی نہایت ضروری ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ سارا کچھ قوانین خداوندی کے مطابق سب کچھ کر رہے ہیں۔ تو سارا کچھ تعمیری کام ہوگا۔ اگر بے باق ہو کر خود ہی سب کچھ کرنے لگ گئے ہیں تو پھر فساد ہی فساد ہوگا۔ جو ملائکہ نے کہا تھا۔ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ (2:30) تو انہوں نے اس کی Ego کی بات کی تھی۔ جواب ملا اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٣٠ (2:30) کہ جب اسکی انا کو فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝٣٨ (2:38) امن اور بے خوفی اسی صورت میں ہوگی اگر اسکی ego پابندِ اقدار خداوندی ہو جائے ورنہ۔

حرفِ اسکتبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا — ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود
کب کھلا تجھ پر یہ راز انکار سے پہلے کہ بعد؟ — بعد اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود!
پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے — کہتا ہے کہ تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام — ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود

جو ذمہ داری قبول نہیں کرتا تو ملعون یعنی رہنمائی سے محروم رہ جاتا ہے۔ خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ (41:40) ایک غیر متبدّل قانون ہے۔ یہ خود ہی پستیٔ فطرت سے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے کر اس کی مرضی یعنی خدا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ کہہ کر اپنی ذمہ داریوں سے انکار کر رہا ہے۔

تنزیل کا ترجمہ نہ تو Inspiration نہ ہی Revealation اور نہ ہی Sent down ہوسکتا ہے

تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ① (39:1) ''تنزیل'' کا ترجمہ نہ تو Inspiration نہ ہی Revealation اور نہ ہی Sent down ہوسکتا ہے۔

تَنۡزِيۡلُ: جہاں قرآن کی تعلیمات منفرد، وہاں الفاظ کا چناؤ بھی ایک انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ الفاظ کا یہ چناؤ منفرد حقائق رکھتا ہے۔ ''تَنۡزِيۡلُ'' یہ الفاظ دراصل وحی کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ انسانی علم کا طریقِ حصول کوئی بھی ہو۔ اس میں انسان اپنی محنت و کاوش، صلاحیت و قابلیت، غور و تدبر، ساری چیزیں شامل ہونگی تو پھر وہ علم حاصل کرسکے گا۔ چاہے تعلیم کے ذریعہ ہو، تدریس، مشاہدہ، مطالعہ یا تحریر اس حصول میں کام آتا ہے۔ یہ اس کے اندر کی چیز ہوتی ہے۔ اس اصطلاح میں اسے (داخلی) (subjective) کہیں گے۔ چاہے کتنا بڑا فلاسفر کیوں نہ ہو یہ اندر سے ایک چیز کو باہر لایا جاتا ہے۔ خود Education سے مراد ''اندر سے کسی چیز کا باہر لانا'' یہ ہمارے ہاں Education کو تعلیم کہتے ہیں۔ یہ Education نہیں ہے۔ یہ تو معلومات (information) ہے۔ جب کہ ایجوکیشن سے مراد ''جو کچھ اندر ہے اس کی نشوونما کرکے باہر لانا''۔ چاہے کوئی کتنا ہی جینیس ہو انسانی علم سے مراد اس کے اندر سے کوئی چیز باہر آتی ہے۔

جبکہ وحی اس سے بالکل الگ اور ایک منفرد، مستثنیٰ ذریعۂ علم تھا۔ جو حصول علم کا ذریعہ نہیں تھا۔ یہ باہر سے بالکل منفرد ایک چیز اندر آتی تھی۔ خارج سے (Objectively) اس میں انسانی کاوش، فکر و تدبر، شعور کا دخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو خارج سے، جیسے کہیں کہ اوپر سے اتر رہی ہو۔ یہ ہے وحی کا وہ تصور جس کے لئے یہ لفظ ہے کہ یہ لفظ ہے کہ اسے خارج سے ملتا ہے۔ اس کے اندر سے باہر نہیں آتا۔ اب نازل ہونے کے لئے انگریزی کا لفظ revealed to (revelation) یعنی پردہ کشائی کرنا۔ یعنی ایک چیز پہلے سے موجود ہو اور اس کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا۔ ان کے لئے تو چیزوں کا پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے۔ جبکہ تنزیل تو خارج سے یا اوپر سے کسی چیز کا اندر آنا ہے۔ اب اس باب تَنۡزِيۡلٌ کا ایک خاصہ یہ ہے کہ

1043
بتدریج، آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ کسی چیز کا آنا۔ پردہ اٹھا دینے سے تو تَنۡزِيۡلٌ نہیں رہتی۔ اب یہ قلب نبوی ﷺ پر یہ علم خارج سے بتدریج اترتا رہا۔ اب اس ''تَنۡزِيۡلٌ'' کا ترجمہ کونسی زبان کر سکے گی؟

زبانیں تو انسانی تصورات کے لئے بنتی ہیں جبکہ یہ تصور ہی انسانوں سے ماورا ہے۔ اس لئے کسی زبان میں بھی اس کے لئے لفظ نہیں مل سکتا۔ نہ اس کے لئے (inspiration) اور نہ (revelation) صحیح مفہوم دے سکتا ہے۔ یہ revelation تو عیسائیوں کے ہاں تصوف تھا۔ جو ہمارے ہاں کشف اور الہام (inspiration) ہے۔ کشف (revelation) ہے۔ یہ وحی کا تصور تو بالکل ایک منفرد تصور ہے۔ پھر نازل ہونے کے لئے ''تَنۡزِيۡلٌ'' یعنی اوپر سے نازل ہونا۔ جیسے بارش کا آسمان سے برسنا۔ نازل ہونا جس میں زمین کا ذرہ بھر دخل نہیں ہوتا۔ اگلی بات کہ اگر زمین بنجر ہے تو اس بارش کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اگر زمین باصلاحیت اور بیج طیب ہے تو اس میں روئیدگی ہوگی۔

وحی کی کنہ اور حقیقت:

تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ (39:1) خارج سے ملا ہوا علم، اسے کتاب کہا ہے۔ بعض انگریزی ترجموں میں ''He has sentdown the book'' کیا ہوا ہے۔ کتاب تو نیچے نہیں آئی تھی۔ یہی تو مطالبہ تھا ان مشرکین کا کہ کتاب اوپر سے نازل ہو لکھی ہوئی تو تب ہم ایمان لائیں گے۔ تو اس ''sentdown'' کتاب کا تصور بھی قرآن نے رد کر دیا ہے۔ وحی کی ماہیت اور حقیقت ہی مختلف تھی۔ اسے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ؕ﴿۳﴾ (53:3) اس میں وہ خواہش، آرزو یا فکر سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ خود رسول ﷺ کا لفظ ساری بات واضح کر دیتا ہے۔ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۚۙ﴿۴۰﴾ (69:40) ان باتوں کا کہنے والا ہمارا ایک معزز قاصد ہے۔ ادھر ''قول محمد ﷺ'' نہیں کہا۔ رسول کیا ہوتا ہے وہ دوسروں کا پیغام پہنچاتا ہے۔ وَّمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ (69:41) یہ ارشادات کسی شاعر کے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ارشادات تم تک پہنچا رہا ہے۔ یہ تو رسول امین ہے اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کرے گا۔ لیکن پیغام تو اس کی زبان سے ہی ملے گا۔ میں تو اس کے الفاظ دہرا رہا ہوں۔ یہ الفاظ کا دہرانا قول رسول ہے۔ یہ قاصد کی حیثیت سے آگے پہنچا رہا ہے۔

امین کہا یعنی یہ الفاظ تو اس کی زبان سے ادا ہونگے مگر یہ کسی اور کا پیغام تم تک پہنچا رہا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔ اب یہ کلام جس کے ذریعہ سے ملا، نہ ملنے میں اس کا کوئی اور نہ پہچانے میں اس کا کوئی دخل۔ اب یہ تھی وحی۔ یہی نبوت تھی جو ختم ہوئی ہے۔ اب یہ ذریعہ علم باقی نہیں رہا۔ جو قرآن میں محفوظ ہو گیا۔ اب باقی جتنا بھی علم ہوگا۔ تو یہ انسان کی اپنی کاوش یا فکر کا دخل ہوگا۔ یہ وحی نہیں ہو سکتی۔ خدا کی طرف سے وہ علم نہیں ہو سکتا۔ یہ کشف والہام نبوت توڑنے کے حیلے ہیں۔ اب یہ علم رسول ﷺ کے بعد ختم ہو کر قرآن میں محفوظ ہو گیا۔ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۱﴾ (39:1)۔ اس کی طرف سے جو صاحب اقتدار ہے اور اس کا اقتدار حکمت پر مبنی ہے۔ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ (39:2) یہ اپنے دعوی کو محسوس شکل میں دکھا دے گا۔ یہ اپنے مقام پر غیر متبدل اور زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا جائے گا۔ ثبات اور تغیر کا امتزاج یعنی

1043 ''Permanance and change'' یہ ہے دین۔ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّیۡنَ ﴿۲﴾ (39:2) خدا کے ان قوانین
کی اطاعت خالص اس کے قوانین سے کرو۔ اگر انسانوں کے قوانین شامل کر دیئے تو یہ شرک ہوگا۔ ابدیت، غیر متبدل ہونے
کا درجہ صرف خدا کے قوانین کو ہے۔ اس لحاظ سے یہ تمام فرقے اور فقہوں کی پیروی کرنا شرک ہے۔ یہ تو بالمقابل دوسرا
قانون بنا دینا ہے۔ یہ تو ''اندادًا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ'' شرک ہوگیا۔

وسیلہ مشرکوں کا عقیدہ ہے

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (39:3) اعلان کردو۔ کہہ دو لوگوں سے کہ جس طرح کائنات میں الدِّيْنُ الْخَالِصُ (39:3) کسی طرح تعمیری نتائج کے لئے ساری کائنات میں جاری ساری ہے۔کائنات میں ہر شئے اس کے احکامات کے تابع چل رہی ہے۔تو انسانی دنیا میں بھی تعمیری نتائج صرف اسی کے قوانین پر چلنے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (39:3) اس میں احبار و رھبان، دوسرے حاکم یا اوروں کو اپنا کارساز بنانا، یہ ساری چیزیں جو ایران سے آئی تھیں۔اور آج تک یہ کہتے ہیں۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (39:3) ہم ان کی پوجا یا اطاعت تو صرف اس لئے کرتے ہیں کہ خدا تک رسائی حاصل ہو۔ کہتے ہیں کہ وسیلہ اور مرشد کے بغیر تو خدا تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ جب اس تصور کی جگہ اطاعت اور محکومیت کا تصور آجائے۔ اگر ضابطۂ خداوندی ہو تو پھر وسیلہ کی کیا ضرورت ہے یہ تو مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (39:2)۔شرک سے پاک اطاعت تو کتاب کی ہی ہوسکتی ہے۔کسی انسان کی اطاعت تو نہیں ہوسکتی۔خدا کی اطاعت کوئی ذہنی اطاعت تو نہیں یہ تو کتاب خداوندی کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے جس طرح حکومت کی طرف سے احکامات اس کی قانون کی کتاب سے جاری ہوتے ہیں۔حکومت کہیں بیٹھی ہوئی تو نظر نہیں آتی۔قوانین کی اطاعت کو حکومت کی اطاعت کہا جاتا ہے۔اگر یہ کتاب نہ ہو تو وہ ملوکیت کا استبداد ہوتا ہے۔ یہ ساری وسیلہ وغیرہ کی اصطلاحات انتہائی فریب کن ہیں۔ خدا تو وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) یہ تمام باطل نظریات ہیں۔وسیلہ کے معنی قرآن میں ''درجہ، عزت، مرتبہ'' وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (5:35) تم وقار اور عزت اس کے مقررہ کردہ نصب العین میں حاصل کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ جن کو یہ وسیلہ کہتے ہیں اگر وہ نیک نیت ہیں (17:57)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ (17:57) بڑے سے بڑا مقرب بھی خدا تک رسائی کے لئے کوشش کرتا ہے۔ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (17:57)۔خدا کو شہنشاہ سمجھ کر اس کے لیے وزیر، مشیر، مصاحب بھی اس کاروبار کے لیے پیدا کردئے۔ پھر یہاں سے وہاں تک عرضیاں لے جانے والے دکانیں لگا کر بیٹھ گئے۔اس غلط تصور سے سارے لوازمات ساتھ آگئے۔قرآن کا خدا کا۔قانون کا تصور، محکومیت کا تصور ذہن سے مٹا دیا گیا۔خدا

1043
ایسا جو اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۚ (2:255) ہے۔ نا قابل تغیر ضابطہ دیدیا۔ ختم نبوت کے ذریعہ دیگر احکامات کا تصور ہی ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ مزاج شاہاں تو نہیں ہے کہ پہلے حکم کو بدل دے یا دوسرا آ کر اس کا حکم تبدیل کر دے۔ سکون اور اطمینان تو اس وقت ہوگا جب قانون ایک ہی رہے۔ اِنَّ اللّٰهَ یَحۡکُمُ بَیۡنَهُمۡ فِیۡ مَا هُمۡ فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ۬ؕ (39:3) قرآن کی طرف آ ؤ گے تو تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ مَنۡ هُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ﴿۳﴾ (39:3) ان کو ہدایت کیسے مل سکتی ہے جنہوں نے اس کتاب پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ تبدیلی تو نہیں کر سکتے۔ کتاب تو موجود ہے مگر اسے کیسے چھپایا ۔ ناظرہ پڑھتے رہو مگر معانی کر طرف مت آ ؤ۔ معنی میں ان کی اپنی تفاسیر ہیں۔ مقصد ثواب حاصل کرنا ہے یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب کو نہیں مانتے۔ کیا یہ اس پر جھوٹ نہیں بولتے۔

❁❁❁

قانونِ فطرت کی ناقابلِ تردید نتیجہ خیزی

اور وقفۂ مہلت کا معجزانہ ذکر (39:21)

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیۡعَ فِی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَجۡعَلُہٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۲۱﴾ (39:21) قانون فطرت میں تو کسی شے کو اختیار نہیں کہ خلاف ورزی کرے۔ جب کہ انسان صاحب اختیا ہے اگر قانون کے مطاق کرے گا تو یہ نتیجہ نکلے گا اور خلاف کرے گا تو یہ نتیجہ نکلے گا اب چونکہ نتیجہ نکلنے میں ایک مہلت درکار ہوتی ہے۔تو یہ چیز ظالم کے دل میں فریب پیدا کرتی ہے۔ کہ مجھ سے کون پوچھ سکتا ہے؟ اس لیے کہ اس وقت تو اس کی کلائی نہیں مروڑی جاسکتی۔ اور مظلوم مایوس ہو جاتا ہے کہ

؎ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
آہ کو چاہئے ایک عمر اثر ہونے تک

لیکن مہلت کا وقفہ تو قانون فطرت میں بھی جاری وساری ہے۔ اور وہ محسوس طور پر دیکھی نہیں جاسکتی۔ دانہ بونے کے بعد اس میں نشوونما ہو رہی ہوتی ہے۔ مگر محسوس نہیں ہوتا۔ اب قرآن یہ بات ایک محسوس مثال کے ذریعے سامنے لاتا ہے۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیۡعَ فِی الۡاَرۡضِ (39:21) ندی نالے رواں ہو جاتے ہیں۔ ثُمَّ یُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَجۡعَلُہٗ حُطَامًا ؕ (39:21) کھیتی ابھرتی ہے، خوشے لگتے ہیں، دانے پکتے ہیں، زرد ہو جاتے ہیں۔ پھر بھوسہ الگ اور دانے الگ ہو جاتے ہیں۔ قانون کی ہمہ گیری کے ایک ایک دانہ سے سات سات سو دانے حاصل کرتے ہو۔ یہ روزمرہ کا تجربہ ہے۔ آگے ہے اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۲۱﴾ (39:21) صاحب عقل وبصیرت اس میں حقائق تک پہنچ سکتے ہیں۔ فطرت کے قانون اور ساتھ غور وفکر کرنا۔ اس کے بعد کہا اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ (39:22) تو اسلام کے لئے دل کی کشاد قوانین فطرت پر غور وخوض کرنے سے ہوتی ہے کہ یہی قوانین جب انسانی زندگی پر منطبق ہو جائیں تو ان کا بھی یقینی نتیجہ نکلے گا۔ اور ظالم کی کھیتی کبھی بنپ نہیں سکتی۔ یہ ہے قانون۔ مثال کھیتی اگنے کی دی جا رہی ہے۔ قانون فطرت پر غور کرنے سے اس حقیقت تک پہنچ جاؤ گے جو میں سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اَفَمَنۡ

1043 شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (39:22) اسلام کے لئے سینے کی کشادکا طریقہ یہ ہے کہ قوانین فطرت پرغور کریں۔ یہ عقل وبصیرت سے اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ یہی قوانین جو قرآن میں انسانی زندگی کے لئے دیے گئے ہیں وہ بھی اس طرح سے نتیجہ خیز ہوں گے۔ اگلی شرط کیا ہے فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (39:22) پھر وہ قرآن کی شمع ہاتھ میں لے یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (6:122)۔ شرط اول عقل وفکر سے کام لے کر مشاہدات فطرت پرغور کرے۔ کہ یہ کس طرح سے کارفرما ہیں۔ اور کس طرح سے نتیجہ خیز ہیں۔ اب اگلی شرط یہ ہے کہ وہ عقل کو ان فطرت کے فوائد کو وحی کی روشنی میں کام لے۔ مغرب صرف عقل کی روشنی میں ان مراحل کو طے کر رہا ہے اس کے پاس وحی نہیں ہے اور ہر جگہ فساد ہی فساد ہے۔ ان کی زندگی کے راستے تاریک ہیں۔ جب کہ ہمارے ہاں خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ (22:11)۔ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72) جہاں جہاں مذہب کا غلبہ ہے۔ تو قوم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکے گی۔ عقل انسانی اور وحی کی روشنی کا نام دین ہے۔ کہا یہ ہے کہ اسلام کے لئے دل کی کشاد قوانین فطرت کی نتیجہ خیزی پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ کہ جو قوانین قوموں کی فلاح وتباہی کے لئے دئے گئے ہیں وہ بھی اس طرح سے اٹل ہیں جس طرح سے قوانین فطرت کی نتیجہ خیزی فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۲﴾ (39:22) جن کے دلوں میں یہ احساس تک نہیں کہ یہ قوانین کس طرح سے کارفرما ہیں۔ تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ ان کو سیدھا راستہ مل ہی نہیں سکتا۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ (39:23) ایسی کتاب جو حسن میں تکمیل تک پہنچی ہوئی ہو نازل کی ہے۔ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (39:23)۔ ایک بات کو دوسری بات سے مشابہت حاصل ہے۔ ملتی جلتی ہیں۔ تضاد نہیں ہے۔ شرح صدر سے، غور وفکر سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی مثانی بھی ہے یعنی متضاد چیزوں کو سامنے لاکر Juxtaposition سے بات واضح کرنا۔ جس کے لئے عقل ودانش کے ساتھ ساتھ عملی جذبہ بھی قلب میں ہونا چاہئے۔ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ (39:23) بات تو فکر وتدبر سے سمجھ میں آئے گی مگر یہ سارا کچھ دلوں کے اندر جذبات میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے ذہنی طور پر سمجھنا کافی نہیں ہے۔ قلب محسوس کرے کہ واقعی اس بات کی خلاف ورزی سے نقصان ملے گا۔ دماغ تو صرف دلائل دے گا۔ علم نیکی نہیں ہے۔ اس کو کام میں لانا قلب سلیم کا کام ہے۔ دل کا جھکنا ضروری ہے ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ جو مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

بیسیوں حاکم کی بجائے صرف ایک حاکم کی محکومی اسلام ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ (39:29) کوئی آدمی اگر کئی لوگوں کا ملازم ہو جو جھگڑنے والے ہوں۔ تو اس بیچارے کی کیا حالت ہوگی۔ اس کے مقابلے میں وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ (39:29)۔ دوسری طرف وہ جو ایک کا ملازم ہو۔ یہ ہے فرق خدا کے نظام میں اور ان خودساختہ نظاموں میں هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ (39:29) کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (39:63)۔ ارض وسماء کے ذرائع تو اس کے قوانین پر عمل کرنے کے بعد ہی کھل سکتے ہیں۔

خارجی دنیا اور انسانی دنیا میں قوانینِ خداوندی کی ثنویّت

صحیح تصور یہ ہے کہ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (39:67)۔ انہوں نے خدا کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ خارجی کائنات میں تو اس کی کارفرمائی مانتے ہیں۔ مگر اپنی دنیا میں اپنے قوانین چلاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿٨٤﴾ (43:84)

وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ (43:85) دونوں میں اس کے قوانین ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ (21:21) اپنی زندگی میں کوئی اور ارباب اقتدار مانتے ہیں۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (21:22) ساری کائنات درھم برھم ہو جاتی۔ اگر خدا کے ساتھ اور بھی شریک ہوتے۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

دنیا سے فساد صرف اس وقت مٹ سکتا ہے۔ اگر ایک ضابطہ قانون ہو۔ اور صاحب اقتدار ایسا ہو۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ﴿٢٣﴾ (21:23) وہ جو کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو اور باقی ساری دنیا هُمْ میں آجاتی ہے۔ یہ خدا کی الوہیت کا اندازہ ہی نہیں لگا سکے۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (39:67) یہ اندازہ اس وقت لگے گا جب مکافات عمل کی ابتدا اس دنیا سے ہو جائے گی۔ ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جیسے مرنے کے بعد کی زندگی کا۔ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾ (39:67) ساری قوتیں تو اس کے قبضہ میں ہیں۔ یہ تمدنی زندگی، ارضی زندگی پر اس کا قبضہ نہیں ہے۔ یہاں انسان نے اقتدار قائم کر رکھا ہے۔ یہ ہے شرک۔ سمجھانے کے لئے کہا ہے کہ دائیں ہاتھ میں سمٰوٰت اور بائیں ہاتھ میں ارض ہوگی۔ اس طرح سے یہ توحید کا نظام قائم ہوگا۔ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾ (39:67) شرک یہ ہے یعنی انسانی دنیا میں الٰہ اور مانتے ہو۔ یہاں يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (39:67) کہا ہے۔ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦﴾ (83:6) یہ ہے وہ دور جس میں انسانیت کھڑی ہو جائے گی۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ (39:68) یہ عالم گیر بغاوت کا بتایا جا رہا ہے۔ صُوْرٌ ۔ صُوْرَةٌ کی جمع ہے۔ تو یہ پیکر آب و گل میں روح پھونک دی جائے گی۔ تو یہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اسی پہلے صور میں حواس باختہ ہوجائیں گے۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝ (39:68) قیام سے مراد دوسری دفعہ یہ ساری انسانیت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ نظام قائم ہو جائے گا۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ (89:22) خدا کا نظام ربوبیت زمین پر متمکن ہو جائے گا۔ اور ملائکہ صف بستہ ہونگے وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ (89:23) تو اس آگ کا فریب نمایاں ہوجائے گا جو انہوں نے سلگائی ہوئی ہے۔ اس نظام کے درخشندہ نتائج دیکھ کر انسان یہ کہیں گے الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ (39:74) حکومت مل گئی۔ اس آزادی "freedom from wants" تمام احتیاجات سے گلوخلاصی ہوگئی اس نظام کی رو سے اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ (20:118-119)۔ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ (39:69)۔ ہر نبی کو یہ ضابطہ دیا گیا اور اس کے مطابق انہوں نے بلند مقامات پائے۔ تاریخ اس پر شہادت دیتی ہے کہ حق کے ساتھ ہر ایک کا فیصلہ ہوا۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (39:69) اس طرح اس نظام میں بھی کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (39:70) پورا پورا بدلہ ان غلط نظام کے قائم کرنے والوں کا بدلہ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ (39:71) یہ ہے اس نظام کا نتیجہ۔ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (39:72) جبکہ اس کے برعکس وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (39:73) وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (39:74) اور اس دنیا کی جنت میں وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (39:75) تمام کائناتی قوتیں خدا کے تخت جلال کے گرد گھیرا کیے ہوئے ہونگی اور اس کی نظام ربوبیت کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرمی سے مستعد ہونگی۔ اس وقت تمام فیصلے قانون خداوندی کے تحت ہونگے۔ اور یہ اس حسن و خوبی سے آشکارا ہوگا کہ ہر ایک کی زبان اس کی حمد و ستائش میں نغمہ سنج ہوگی۔ یہ جنت اس زمین پر قائم ہوگی۔

کامیاب زندگی گزارنے کے دو پروگرام قیام وسجدہ زندگی بھر کے لیے

اَمَّنۡ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَیَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ ؕ (39:9) ان کی کیفیت یہ ہے کہ دن بھر تو مصروف رہتے ہیں۔

اِنَّ لَکَ فِی النَّہَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ؕ (73:7) یہ تمام صلاحتوں کو اس پروگرام کے کامیاب بنانے پر صرف کر دیتے ہیں۔ اس لیے اس کو کامیاب بنانے کے لیے یہ رات بھر یہ پروگرام کہ کہاں قیام کرنا ہے اور کہاں جھک جانا ہے؟ کیونکہ ان کی نظر مستقبل پر ہوتی ہے اور بہت محتاط رہتے ہیں کہ یہ نظام ربوبیت عام ہو جائے اور اس میں کوئی کمزوری یا سقم نہ رہ جائے۔

یہ وہ لوگ ہیں جوان اقدار پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ اور ہر حالت میں یہ دیکھتے ہیں کہ ہمیں ان احکام کو کس طرح سے عمل میں لینا چاہیے۔ یہ احکام قرآن میں کہیں ظالم کی کلائی مروڑنے کا کہہ کر، کبھی جھک جانے کا، کبھی سامنے کھڑے ہو جانے کا مثلا ضیعفوں کی مدد کے لیے جھکنا، سرکشی کو دبانے کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے قیام ہے۔ یہ اقدار اس طرح سے ساجداً اور قائماً سے طے ہونگی۔ انہوں نے اسے نفل پڑھنے پر معمول کر لیا۔ اور سارے افسانے گھڑے ہوئے ہیں یہ مصروفیات سَاجِدًا وَّقَآئِمًا (39:9)۔ تو وہ پروگرام کی سعی وکاوش تھی جس سے رومن وایران کی تہذیبیں حرف غلط کی طرح مٹادی گئی تھیں۔ راتوں کو غور وفکر اور پروگرام ہوتا تھا اس لیے تو کہا گیا تھا۔ کہ رات کا کچھ حصہ سوبھی لینا چاہیے کیونکہ اس میں تمہارے ساتھ دیگر لوگ بھی ہوتے تھے۔ جس کے سامنے ساری دنیا سے مخالفت لے کر یہ نظام لانا ہو تو وہ نفل پڑھتے رہیں گے۔ ساری رات۔ تو وہ اس پروگرام کو بروئے کار لانے کی تدبیر کیسے کریں گے؟ دن بھر کی مصروفیات کے بعد رات کو باہمی مشاورت سے پروگرام کی شقوں پر نظر ثانی ہوتی تھی۔ اب اس پروگرام کی دوشقوں کو قیام اور سجدہ کہا جارہا ہے۔ زندگی میں دو ہی تو مقام آتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا کہ کہاں جھکنا ہے اور کہاں کھڑا ہونا ہے؟ مظلوم کے سامنے کھڑے ہونا۔ یہ ہے بدترین جرم۔ ایک قیام اور دوسرا سجدہ ہے۔ اور یہ مقام تو ہر موڑ پر آتے رہیں گے سوچنا یہ ہے کہ قیام کا کونسا موقع ہے اور سجدہ کا کون سا۔ غلط مقام پر غلط چیز کا اختیار کر لینا ناکامی سے دوچار کر دیتا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾ (74:1-2-3)

یہ ہے قیام رب کا نظام اور اس کا اقتدار زمین پر قائم کرنا۔ قیام وسجدہ کے مقام کی کیفیت یہ ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (48:29) چٹان کی طرح کھڑے ہونا مجرموں کے خلاف قیام ہے۔ باہمی طور پر ریشم کی طرح نرمی سے جھک جاتے ہیں۔ یہ سجدہ ہے۔

دو گیتی را صلا ازِ قراتِ اوست
مسلمان لا یموت از رکعتِ اوست
نداند کشتنہ ایں عصر بے سوز
قیامت ہا در قد قامت اوست

اس قیام اور سجدہ کا غلط انتخاب اور غلط وقت تو ہمارے سامنے ہے۔ اپنوں کے سامنے تلواریں لے کر اٹھے ہیں۔ جہاں جھکنا تھا۔ جو اسلام کے خلاف ہیں ان کو سجدے کر رہے ہیں۔ جہاں سجدہ ہونا چاہیے وہاں قیام ہو رہا ہے ؎

یہ نادان گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

اس اوپر والی آیت میں "هُوَ قَانِتٌ" (39:9) آیا ہے جہاں ضرورت ہو تو مشکیزہ کا منہ کھول دے اور باقی کا سنبھال کر رکھے۔ جہاں ضرورت نہیں ہے یعنی یہ اپنی صلاحیتوں، مال و دولت کو اس مشکیزہ کی طرح حفاظت سے رکھتی ہیں۔ بے جا ایک قطرہ بھی صرف نہیں کرتی۔ یہ تھا ان کا سجدہ اور قیام۔ لہٰذا قَانِتٌ (39:9) نے خود واضح کر دیا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ جب الٹ ہو جائے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ مگر مشکیزہ بند ہے۔ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (107:7) رزق کو پانی کی طرح بہتا ہوا ہونا چاہیے تھا اپنے لیے اسے روک لیتے ہیں یہ ساجداً و قائماً کا ہے کے لیے یہ يَحْذَرُ الْآخِرَةَ (39:9) ان کے لیے سامنے مستقبل ہوتا ہے وہ اس کے بارے میں سوچتے ہیں کہ اس وقت تو خیر ہے تو کہیں خطرہ لاحق نہ ہو جائے۔ وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهِ (39:9) وہ نشوونما دینے والے کے سامان نشوونما کے بارے میں سوچتے ہیں کہ کیسے حاصل ہوگا اور تقسیم کیسے ہوگی۔ یہ تو دوسری دنیا کا ثواب نہیں ہے بلکہ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (39:10) اگر صحیح تناسب یعنی قیام کے وقت قیام اور سجدہ کے وقت سجدہ کیا۔ تو ان کی زندگی متوازن اور خوشگوار ہو جائیگی۔ حسنات تو توازن کا برقرار رکھنا ہے۔ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (39:10) حسنات کی زندگی بسر کرنے والوں کی یہ دنیا خوبصورت ہو جائے گی۔ یہ ذہنی اور ظنی ثواب کی بات نہیں ہے جو قیامت میں جا کر ملے گا۔ اس دنیا میں بھی یہ مل جائے گا۔ اس لئے اپنے علاقوں سے نکل کر باہر جاؤ۔ یہ تعلیم سب سے پہلے قرآن نے دی۔ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ (39:10)۔ وہ پھر مصر، ایران، ملتان، چین، امریکہ تک میں ان کے سکوں کے نشانات ملے ہیں۔ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ (39:10) استقامت اور استقلال سے کام لوگے تو أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ (39:10) اندازوں سے زیادہ اس کا صلہ اس دنیا میں پاؤ گے۔

عقل انسانی کے لئے قرآن پر ایمان لانے کا طریق

وحی کی کہنہ و حقیقت کا ادراک تو انسانی فکر سے ماورا ہے مگر اسے عقل و بصیرت اور علم کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کرو کوئی اسے نہیں مانتا۔ تو اس کتاب کا یہ چیلنج ہے کہ اسے آن میرٹ لے کر دیکھا جائے اس طریق سے جس طرح اس نے کہا ہے۔ تو یہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا دیتی ہے کہ یہ انسانی فکر سے ماوراء ایک تخلیق ہے۔ اور قرآن سے یہ چیز ثابت ہو جاتی ہے۔ بس تدبر، غور و فکر، عربی مبین، تصریف آیات، مُتَشَابِهًا (39:23) اور مَّثَانِيَ (39:23) اضداد اور مرادفات قرآنی سے یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔

ملائکہ۔کائناتی قوتیں۔پیغام رساں قوتیں اور وقت کا تقاضا

''اَلۡمَلٰٓئِکَةَ''اس کا مادہ ملک اور ألک ہے۔ملک سے مراد وہ قوتیں جو کائنات میں کارفرما ہیں۔مثلاً سورج کا اپنے وقت روشنی دینا، چاند، بارش، ہوائیں، شجر، غرضیکہ انسانی جسم کے اندر تمام نظام کا مواصلاتی نظام ۔یہ تمام غیر محسوس قوتیں چلا رہی ہیں۔یہ فطرت کی تمام قوتیں ایٹم کے ذرے سے لے کر تمام کروں سمیت ملائکہ کے زمرے میں آتی ہیں۔ملائکہ کا دوسرا حصہ غیر محسوس عالم امر کا ہے۔یہ حصہ ہمارے ادراک سے ماوراء ہے۔جب محسوسات کی دنیا میں آجائے تو پھر بات سمجھ میں آتی ہے۔یہ ملائکہ وحی انبیاء تک لاتے ہیں۔یہ حصہ عالم امر کا ہم نہیں سمجھ سکتے۔یہ میٹافزکس یعنی محسوسات سے ماوراء ہے۔اب سورۃ الزمر میں وَتَرَى الۡمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيۡنَ مِنۡ حَوۡلِ الۡعَرۡشِ يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ ۚ (39:75)اب یہ ملائکہ دیکھے جا سکتے ہیں جبکہ جنگ بدر اور حنین میں جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا (9:26) اب یہ کونسی قوتیں ہیں۔ظلم واستبداد کا نظام ایک تو انسان کی جماعت کے ذریعہ الٹا جا سکتا ہے۔دوسرا اگر یہ جماعت نہ ہو تو یہ کائناتی قوتیں، جن کو زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے وہ بھی غیر محسوس طور پر انسان کو اس طرف لاتی ہیں۔جو صحیح وحی کا راستہ ہوتا ہے۔سعی وخطا انسان کا تجرباتی طریق ہے۔انسانیت ایک فارمولہ، پروگرام یا نظام وضع کر کے اس پر چند قدم چلتی ہے۔ٹھوکریں کھا کر، ہڈیاں تڑوا کر اس کو چھوڑ کر دوسرا پروگرام لیتی ہے۔اس پر چلتی ہے۔اس طرح سعی وخطا کرتے کرتے ایک دن وہ صحیح راستہ پر آجاتی ہے۔مگر یہ طویل راستہ ہے۔جبکہ وحی انسان کی ان کاوشوں کو بچا کر اسے روز اول ان تمام تباہیوں اور بربادیوں سے بچا دیتی ہے۔جبکہ زمانے کے تقاضے اس جماعت کی عدم موجودگی میں انسانیت کو ان راستوں سے ہم آہنگ کر دینگے اور ساری قومیں اس طرف آرہی ہیں۔یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے کہ کس زمانے میں اس نے نتائج دئے اب وہ نتائج نہیں دے رہا۔اور مثال ان مسلمانوں کی دے رہے ہیں جنہوں نے تو صدر اول کے بعد ہی ان اصولوں کو چھوڑ دیا تھا۔فارمولہ کو تو غلط نہ کہو وہ تو صحیح ہے۔مسلمانوں کے حالات سے تو اندازہ نہ لگائیں۔آپ حیران ہونگے کہ دنیا نظام محمدی ﷺ کے لئے بے تاب ہے۔یہ قصور تو ہمارا ہے کہ ہم خود ہی اس سے بے خبر ہیں تو دنیا کو کیا بتائیں گے؟

یہ وہاں کے دانشور ٹھوکریں کھا کر عقل کے تجرباتی طریق سے جس نظام کے لئے چلا رہے ہیں یہ حیرانگی کی بات ہے کہ وہ نظام محمدی ﷺ ہے۔نہ ہم ان کے سامنے یوں پیش کر سکے اور نہ ان کے سامنے یوں آیا۔ہماری حالت دیکھ کر تو وہ اس نظام سے توبہ توبہ کرتے ہیں۔یہ جماعت جو تخت خداوندی کو زمین پر متمکن کرتی ہے اَلَّذِيۡنَ يَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَمَنۡ حَوۡلَهٗ يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ

رَبِّهِمۡ (40:7) یہ جماعت جو خدا کے اقتدار اعلیٰ کو نافذ کرتی ہے۔ یہ حاملین عرش ہے یعنی اس عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ خود عرش پر نہیں بیٹھتے بلکہ اس میں ان کا کوئی اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ عرش کے اوپر یہ خود نہیں بیٹھتی۔ یہ تو اقتدار خداوندی کی علامت ہے یہ اسے اٹھائے ہوئے ہے۔ کس قدر خوبصورت اصطلاح ہے۔ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ (40:7) وہ نظام ربوبیت قائم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہوتی ہے تا کہ لوگ یہ نظام دیکھ کر حمد وستائش کے نغمے پڑھنے لگیں۔ وَيُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ (40:7) وہ اس کی صداقتوں پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ (40:7) یہ دبے ہوئے کمزور لوگوں کی حفاظت کا انتظام کرتے ہیں۔ جو ان کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ جہاں سے مظلوم کی آواز آئے تو یہ اس کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ رسول ﷺ نے قیصر و کسریٰ کو جو خط لکھا تھا کہ اپنے ہاں کسانوں اور محنت کشوں پر ظلم روک دو ورنہ ہمیں آنا پڑے گا۔ یہ ہے فریضہ اس قوم کا جو حامل عرش خداوندی ہے۔ ان کی خصوصیات سورۃ النزعت میں وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۘ﴿۵﴾ (79:1-5) یہ جماعتیں ان مستند قوتوں سے ان کمزور اور دبی ہوئی قوموں کو اوپر کھینچ لاتی ہیں۔ اور ان تمام گرہوں کو کھول کر ان کی رکاوٹیں دور کر دیتی ہیں۔ تا کہ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾ (79:3) تا کہ یہ اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ کام لیں اور فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ﴿۴﴾ (79:4) تا کہ یہ باقی قوموں سے آگے بڑھ جائیں۔ اور پھر فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۘ﴿۵﴾ (79:5) اپنے معاملات کی تدبیر خود کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ ہے اس جماعت کا فریضہ کہ ساری دنیا سے استبداد اور ظلم کا خاتمہ کر دے۔ جب یہ قوم وہاں پہنچے گی تو يَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾ تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾ (79:6-7) یہ آسانی سے نہیں ہوگا۔ جھٹکے دینے ہونگے۔ ہر جھٹکے سے نیچے والا اوپر اور اوپر والا نیچے۔ یہ چھڑانے کے بعد ان کی قوتوں کو بحال کرتے ہیں۔ یہ جھٹکے کا نتیجہ قُلُوۡبٌ يَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾ (79:8) اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ﴿۹﴾ (79:9) ہر جھٹکے سے نیچے آنے والوں کے دل یوں دھڑکیں گے کہ اب گئے اور ندامت سے آنکھیں زمین میں گڑی ہونگی۔ يَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِى الۡحَافِرَةِ ؕ﴿۱۰﴾ (79:10) کیا ہماری حالت پہلی والی ہو جائے گی۔ لوٹ مار کا سامان تعیش اکٹھے کرنے سے قبل والی۔ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ﴿۱۱﴾ (79:11) ہم تو صرف قصہ پارینہ ہو جائیں گے، یہ حاملین عرش کے لبوں پر دعائیں ہونگی۔

رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَىۡءٍ رَّحۡمَةً وَّعِلۡمًا (40:7) بارالہا تیرا رحمت کا دامن تو پھیلا ہوا ہے اسے اور بھی وسیع کر۔ فَاغۡفِرۡ لِلَّذِيۡنَ تَابُوۡا (40:7) ان کی حفاظت کرتا کہ یہ وہاں لوٹ آ جائیں۔ تا کہ وَاتَّبَعُوۡا سَبِيۡلَكَ (40:7) تا کہ یہ تیرے راستے پر گامزن ہو جائیں۔ وَقِهِمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ ﴿۷﴾ (40:7) ان کو جامد بنا دیا گیا ہے۔ ان کو بربادیوں سے محفوظ رکھ۔ رَبَّنَا وَاَدۡخِلۡهُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ اۨلَّتِىۡ وَعَدْتَّهُمۡ وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ ؕ (40:8) ان کی آباؤ اجداد اولاد، ساتھیوں کو اگر صالحیت پیدا کرلیں تو ہمیشہ کی خوشگوار زندگی کی نعمتوں سے سرفراز کر۔ وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۹﴾ (40:9)۔

سلطان کو بطورِ دلیل استعمال کرنا:
قرآن کی نظر میں سُلْطَانٌ ''یعنی دلیل'' ایک بڑی قوّت ہے

دنیا کے کسی لٹریچر میں Reason کو قوت نہیں کہا گیا ہے۔ نہ فلسفہ میں اور نہ فکری تاریخ میں۔ اصل قوت ان عربوں کے ہاں یہ دلیل تھی۔ Reason تھا۔ یہ ایک ہی لفظ سلطان جو دلیل کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا اور قوت کے لیے بھی قوت درحقیقت Reason کا نام ہے۔ اگر Reason نہ ہوتو اسے قوت نہیں بلکہ دھاندلی کہتے ہیں۔ اصلی چیز جسے قوت کہتے ہیں۔ کیونکہ کامیابی اور غلبہ تو دلیل سے ہوتا ہے۔ ''سلطان'' دلائل کا نام ہے یُجَادِلُوْنَ (40:35) یہ جدل سے، دھاندلی سے، اندھی قوت سے بات کومنواتے ہیں''۔ جن کے پاس دلیل نہ ہوتو وہ دھاندلی پر اتر آتے ہیں اور دلیل بھی وہ اٰتٰىهُمْ ط (40:35) دلیل بھی وہ جو قوانین خداوندی کو سچا کر دکھائے۔

۞۞۞

مہلّت اور سنّت اللہ، ظہورِ نتائج کا وقت، جب مہلّت کا وقفہ نہ ہو تو پھر ''توبہ'' یعنی باز آفرینی کا موقعہ ختم ہو جاتا ہے

فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ وَ كَفَرۡنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشۡرِكِيۡنَ۝۸۴ فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ (40:84-85) تو غلط اعمال کا ازالہ یعنی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ (10:64) فَهَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا سُنَّتَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۚ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا۝۴۳ (35:43) نہ تو کلماتُ اللہ یعنی خدا کا قانون بہ شکل حروف نظری طور پر ہو اور جب وہ عملاً ہو جائے (practice) تو اسے سنت اللہ کہتے ہیں۔ ان دونوں میں تبدیلی نہیں ہوتی نہ نظریہ میں اور نہ نتائج میں۔

باطل نظام کی ابدی ناکامی اور سنت اللہ:

خدا کے احکام کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے اور ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ قانون غیر متبدل ہے۔ یہ تو عقیدے کی رو سے ہم مانتے ہیں مگر غیر مسلم دانشور بھی کہتے ہیں کہ یہ سنت اللہ ہے اور اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا اور آج کہہ رہے ہیں کہ انسانی مسائل کا حل صرف فکر انسانی سے ماوراء کوئی علم ہی دے سکتا ہے۔

(Briffault Robert) "The Making of Humanity" اس کتاب میں دیگر تہذیبوں کے علاوہ رومن پر لمبی چوڑی گفتگو کی ہے۔ اس کا نتیجہ سن لیجئے۔

''انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو، کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے چلایا جائے۔ ان کی بنیادی کمزوری خارجی نظم وضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لیے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متموّل بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس سوداگری کو نہایت قابلیت اور تدبر، خلوص اور نہایت دیانتداری سے چلایا۔ لیکن حسن انتظام کی یہ تمام خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطرتی نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔ اس

کے بعد وہ اقدار کے بارے میں کہتا ہے۔

اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہوگئی ہے۔نہ ہی سیکڑوں میل فی گھنٹہ رفتار کے معنی ترقی ہیں۔انسان اگر ستاروں کو تولنے کے قابل بھی ہوجائے اور علوم وفنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہر ذاتی میں قلب ماہیت پیدا نہیں ہوسکتی۔انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہیں۔قوت،تہذیب،کلچر بے معنی چیزیں ہیں۔اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں تو وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدرو قیمت ناپی جاسکتی ہے اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔

باطل نظام کا نتیجہ:

وہ تہذیب جس میں حق وصداقت کو عادی طور پر نظرانداز کردیا جاتا ہو۔آخرلا امر تباہ ہوکر رہتی ہے۔ناانصافی سے کوئی فرد کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے۔وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے۔اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے۔انجام کار یہ ناانصافی اسے برباد کردیتی ہے۔انتخاب طبعی کے اٹل قانون کی بناء پر گناہ کی اجرت موت ہے۔

امریکہ کا مؤرخ ''Goeorge A Dorsey'' کی کتاب ''Civilization'' سے اقتباس ''ہماری تباہی کا باعث نہ تو بڑے بڑے مجرم ہیں جن سے ہم لرزاں رہتے ہیں اور نہ افلاس جس سے ہم نادم ہیں۔اس کا اصل سبب وہ معاشرتی نظام جو منافقت اور فریب کی بنیادوں پر استوار ہے۔اور یہ قانون کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' ساتھ ہو تو اس قانون پر مبنی نظام میں تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔یہ ہے۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ (40:85) یہ قانون غیر متبدل تو شروع سے آرہا ہے۔یہ شہادات ان دانشوروں کی طرف سے آرہی ہیں۔وہ تمام ایسے نظام کی تلاش میں ہیں۔

''اس وقت چرچا ہے کہ اس ایٹم بم سے دنیا تباہ ہوجائے گی۔یہ تو صرف انسانوں کو موت کے گھاٹ اتاردے گا۔یہ تو کوئی تباہی نہیں۔تباہی وہ ہے کہ انسان زندہ ہوں اور تباہ ہوں۔اور یہ تباہی ہمارے غلط نظام کی وجہ سے آئیگی۔'' انسان اس میں طبعی موت نہیں مرتا۔انسانیت مرجاتی ہے اور جب انسانیت مرجائے اور انسان زندہ رہے تو یہ ہے سب سے بڑا عذاب۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ (40:85) یہ ہے وہ ابدی قانون جو دنیائے انسانیت میں شروع سے چلا آرہا ہے۔کہ جو اقدار خداوندی پر نہیں چلتے تو یہ دنیا ان کے لئے جہنم بن جاتی ہے''۔

قرآن نے تاریخی واقعات بیان نہیں کئے بلکہ نظام کے نتائج کا نام فلاسفی آف تاریخ کا کر رکھا ہے:

قرآن قانون کی شہادت میں خارجی کائنات یا سابقہ اقوام کی تاریخ بیان کرتا ہے۔یہ آج سے چودہ صدیاں قبل تاریخ کو ایک سائنس کے طور پر،جہاں قانون علت ومعلول کارفرما ہو پیش کرتا ہے یہ چیز اس دور میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔یہ تو تاریخ کو صرف واقعات اور حوادث کا ہی ایک مجموعہ قرار دیتے تھے۔صرف واقعات (Chronicles) ہوتے تھے۔تاریخ کو بطور سائنس یہ صرف قرآن نے پیش کیا ہے۔ہمارے دور میں ہیگل (1831) کو اس باب میں (Poineer) السابقون الاولون'' سمجھا جاتا ہے۔اس

1043 نے تاریخ کو بطور ایک سائنس کے دیا۔اس سے پیشتر ابن خلدون (1406) میں تاریخ کا مقدمہ لکھا اس نے یہ قرآن سے اخذ کی تھی۔قرآن نے ان واقعات کو سائنس یا قانون یا روش کے طور پر بتایا کہ اس روش کا یہ نتیجہ نکلا اور ہمیشہ ہی نکلے گا۔اب تاریخ کو سائنس کے حساب سے لکھا جارہا ہے۔ایڈورڈ گبن (1721) کی تاریخ ''Decline and Fall of Roman Empire'' یہ اس قوم کی ایک ایک روش گنا تا ہے۔اوران کا یہ نتیجہ نکلا۔اس نے 16 تہذیبوں کا احاطہ 12 جلدوں میں کیا ہے۔قرآن نے بھی علت ومعلّول کی وضاحت کے لئے تاریخی شہادات دی ہیں۔اورہم نے اسے سامریت بنادیا ہے۔

که با یاتش ترا کارے جز ایں نیست
که از یٰسین او آساں بمیری

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ (41:13)

وحی خداوندی کو چھوڑو گے تو عاد وثمود جیسا تباہ کن حشر ہو جائے گا۔

❁❁❁

عربی مبین کی خصوصیت اور قرآن کا دماغ کے راستے دل میں پہنچنا ہی صحیح ایمان کہلاتا ہے

قرآن ''لسان عربی مبین'' میں بھیجا گیا ہے۔خود عربی کے معنی ''فصیح'' واضح ،مفصل ،صاف۔اس کے ساتھ مبین کا اضافہ ''نہایت واضح زبان'' اس فصاحت اور بلاغت پر ان کو فخر تھا۔ یہ ماہرین بتاتے ہیں کہ عربی زبان اور اس زمانے کی عربی زبان تمام زبانوں میں افضل ترین زبان سمجھی جاتی تھی۔ یہ اپنے سوا تمام دنیا کو عجمی یعنی گونگا سمجھتے تھے یا غیر فصیح۔اہل فارس کو بھی عجم کہتے تھے۔ ہر غیر عرب کو عجمی یعنی بولنے والا تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ یہ لفظ عربی یہ تو اہل عرب کی زبان کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔اور بنیادی طور پر فصیح کے معنوں میں بھی آتا ہے۔تو یہ نہایت واضح زبان اور اس کے مقابل عجمی غیر فصیح یہ تو اس زبان کو برداشت ہی نہ کرتے تھے۔ چہ جائیکہ ایک ایسی کتاب جس کا دعویٰ ہی یہ ہو کہ وہ ماوراء سر چشمہء علم سے آئی ہے۔ وہ غیر فصیح زبان ہو تو وہ اسے تسلیم کر لیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔اس لئے یہ کتاب عربی مبین یعنی فصیح ترین زبان کے اندر ہے تا کہ زبان کے اعتبار سے اس پر اعتراض نہ کر سکیں۔اور یہ مسلمہ ہے کہ فلسفہ اور لسانیات کے اعتبار سے کہ کوئی خیال بغیر الفاظ کے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔صاحب تصور یا صاحب ہوش کے لئے لفظ اور معنی دونوں لازم وملزوم ہیں۔اگر وہ پاگل نہ ہو۔ڈاکٹر بک کی کتاب ''Consciousness'' (شعور) ''تصور اور لفظ کا باہمی تعلق'' ہر لفظ کے لئے ایک تصور ہوتا ہے۔اور ہر تصور کے لئے لفظ۔ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔کوئی نیا لفظ معرض وجود میں نہیں آ سکتا۔جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آ جائے۔ یہ ہے تصدیق اس دعویٰ کی کہ قرآن بالفاظہٖ قرآن ہے۔وحی کے الفاظ اور خیالات دونوں ہی خالصتاً خدا کی طرف سے اتارے گئے تھے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ خیالات خدا کی طرف سے آتے تھے۔اور الفاظ خود نبی کے تھے۔سراسر غلط اور جہالت پر مبنی ہے۔قرآن اپنے الفاظ میں قرآن ہے۔ان الفاظ کی جگہ اگر عربی زبان کے بھی دوسرے مرادفات رکھدیے جائیں۔معنوی اعتبار سے وہی ہوں جو قرآن کہتا ہے تو بھی قرآن کا بدل نہیں ہو سکتے جس طرح جلالین نے یہ پریکٹس کر کے مذاق بنا دیا ہے۔ یہ ہے اعجاز اس کی زبان کا۔حالانکہ یہ تو ہدایت ہے اور تعلیمات کا اعجاز تو اتنا بلند جبکہ زبان بھی ایک معجزہ ہے۔زبان کے بارے میں عرب اتنے متشدد تھے کہ ذرا سی زبر زیر کی غلطی بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔قرآن خود ان کی زبان میں آیا تو خود انہوں نے تسلیم کر لیا کہ ہم

اس اسلوب کے اندر کچھ بھی نہیں لکھ سکتے۔یعنی اس کا اسلوب بیان بجائے خویش خود عربوں نے مانا کہ یہ بھی ایک اعجاز ہے۔ بڑے بڑے عربی دان بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ان چودہ صدیوں میں اس زبان کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے ہیں۔صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ غیر عرب اور غیر مسلم دنیا میں بھی۔ وہ انگریزوں کے اتنے بڑے عربی کے ماہرین کا لغت لین کا (Lane) مقابلہ کوئی لغت نہیں کرسکتا۔ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ الفاظ کا معنی تو بتایا جاسکتا ہے۔لیکن ان الفاظ کے معنی کے بعد جو فقرہ بنتا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کونسا اسلوب کہیں!

؎ اما تو چیزے دیگری

نیٹشے کا اعتراف: (1900)

اسے نیٹشے نے پسند کیا تھا۔اقبال نے اسے دیوانہ کہا تھا اور دیوانگی کا یہ عالم ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

وہ کہتا تھا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس طرح یہ خیالات میرے ذہن میں آتے ہیں۔اپنی آخری کتاب میں وہ اپنے آپ کو زرتشت کہتا تھا۔اس نے کہا کہ اہل جرمن بھی حیران ہونگے کہ یہ سٹائل یعنی اسلوب بیان کیا ہے؟ اس نے کہا کہ الہامی زبان کا اسٹائل اپنا ہوتا ہے۔

دنیا کی لسانیات میں یہ ایک عجیب چیز ہے۔اور اسی معیار کے اوپر وہ مبینہ آسمانی کتابوں کو پرکھتے بھی ہیں۔ جہاں تحریف ہو تو وہاں اسٹائل انسانی ہوجاتا ہے۔ جہاں وہ کتاب غیر محرف ہو خود اس کا اسٹائل ایسا ہے کہ اس کی کاپی نہیں کی جاسکتی۔قرآن کہتا ہے۔ءَ اَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ (41:44) بات زبان کی نہیں ہے۔ بات عربی اور عجمی کی نہیں ہے اصل چیز یہ ہے کہ کس قسم کا دل، اپروچ سوچ لے کر آتے ہو۔اگر اپروچ انکار کرنا ہے تو چاہے عربی میں ہو یا عجمی میں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا اگر اپروچ حقیقت معلوم کرنا ہے اور اگر واقعی بات سچ نکلی تو ہم نے اس کو تسلیم کرنا ہے۔اس اپروچ کے تحت آؤ گے تو پھر بات سمجھ میں آئے گی ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا
لغت غریب ، جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

یعنی بات سمجھنے کی بھی ہے (لغت غریب)، مگر اس کے بعد دل میں اتارنا ہے۔اب اس کو بیان نہیں کرسکتے۔ دلیل نہیں دے سکتے اس سے محظوظ ہونے کے لیے۔جس طرح موسیقی دل پر اثر انداز ہوتی ہے، عقلی طور پر اسے بیان نہیں کرسکتے۔اب یہ جذباتی چیز ہوگئی۔جذبات پر آ کر ختم ہوگئی۔دوسرا طریق غور و تدبر، عقلی لحاظ سے بڑے بڑے فلاسفرز کی کتابیں پڑھیں تو محسوس ہوگا گویا آسمان سے بولا جارہا ہے جب ان کی زندگی اور سیرت دیکھیں گے تو تعجب ہوگا۔ایسے ایسے بھی کہ يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ

مِنۡ نَّفۡعِہٖ ؕ (22:13) شوگر کا مریض ہے مگر میٹھی چیز کھا رہا ہے۔ ہر چیز جانتا ہے۔ مگر ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

پہلی چیز جذبات پر بغیر جانے ہوئے اثر ہو جانا اور دوسری چیز طبیعت کا ادھر نہ آنا بھی دل کا متاثر نہ ہونا۔ پہلی چیز قرآن کو فکری طور پر سمجھا جائے۔ دماغی طور پر سمجھا جائے قرآن اس طرح سمجھنے کو آخری منزل قرار نہیں دیتا۔ قرآن دماغ کے راستہ دل تک پہنچا تا ہے۔ تو پھر اس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ براہ راست دل تک پہنچے تو پھر یہ جذباتی چیز ہو جاتی ہے۔ اگر صرف ذہن تک وہ جائے تو پھر یہ فلسفہ بن جاتا ہے۔ کردار پر نہ وہ چیز اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اور نہ یہ چیز۔ قرآن کا مقصود تو تغیر نفس ہے۔ کردار و سیرت میں تغیر ہے۔

؎ آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
گر زمینی آسماں سازد ترا

یہ تمام شکوک و شبہات فکری طور پر دور کرنا ضروری ہیں۔ اگر باقی ہوں تو دل میں نہیں اتر سکتا تو جذبات کی طرح تو پھر تصوف ہو جائے گا۔ شکوک دور ہو گئے اور دل پر نہ اترے تو تمام فلسفہ رہ جائے گا۔ مقصد اس وقت حاصل ہو گا ؎

لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

اب عقلی لحاظ سے سمجھنا ضروری ہے دل کی گواہی کے بعد یہ آپ کی سیرت کو بدلے گا۔ ہر کیوں کا جواب ہونا چاہیے مگر یہ آخری منزل نہیں ہے۔ یہ پہلا درجہ ہے پھر قلب کے اندر تبدیلی پیدا کرے تو قلب و جذبات اور ذہن و فکر کا امتزاج ہو گا تو یہ ایمان کہلائے گا۔ قرآن تو اس ایمان کو ایمان ہی نہیں کہتا جو فکری طور پر نہ لایا جائے۔ اور صرف فکری طور پر ایمان لانے کو بھی ایمان نہیں کہتا۔

لادینی ہو، لاطینی، کسی پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا لا غالب الا ھو

اس میں تو زبان کا کیا سوال ہے۔ اس کے وحی ہونے کی دلیل تو اس کے الفاظ ہیں جو محفوظ ہیں قرآن کی آخری منزل تو قلب ہے تو یہ اپروچ ہو پھر هُدًى اور شِفَآءٌ ؕ ہے مگر یہ اپروچ نہ ہو تو وَالَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرٌ وَّ ہُوَ عَلَیۡہِمۡ عَمًی ؕ (41:44) جو اس اپروچ کے ساتھ کہہ کہ اس میں ہدایت کونسی ہے نہیں جاتا۔ اس کی صداقتوں پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے قانون میں تعصب کے ڈاٹ اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے پہلے خیالات کو الگ کر کے ضد میں نہ آئے۔ ورنہ اُولٰٓئِکَ یُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّکَانٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۴۴﴾ (41:44) پھر قرآن ان کو اس طرح مبہم اور غیر واضح ہو گا جیسے کوئی دور سے آواز سن رہا ہو اور واضح نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے اگر دل کہیں اور ہو تو پھر پھر سنائی نہیں دیتا۔ قرآن کو تو براہ راست سنو۔ رازی، غزالی طبری تو مقام بعید ہے۔ بھلا ان آوازوں سے کیسے سنو گے؟

پرائیویٹ سے مراد دوسروں کو محروم کرنا

''پرائیویٹ پراپرٹی'':

قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد قُلِ الْعَفْوَ ط (2:219) پر ہے ضروریات سے زیادہ سارے کا سارے اس نظام کے حوالے کر دینا تا کہ ہر فرد معاشرہ کی نشوونما ہو سکے۔ اور ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ قران کا اصل مقصد تو تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اب یہ جو سمیٹ کر اپنے لیے جمع کرنا حیوانیت سے بدتر جذبہ ہے یہ ہوس ہے اسے پرائیویٹ پراپرٹی کہتے ہیں یہ لفظ پرائیویٹ لاطینی زبان سے انگریزی میں آیا ہے۔ اس کے معنی ''دوسروں کو محروم کرنا'' اس زمانے میں جب عیسائیت نافذ تھی تو اس زمانے میں اس کے یہ معنی تھے۔ واقعی آپ کا پیٹ تو دو روٹیوں سے بھر جاتا ہے۔ جو دو چار اور جمع کر لیتے ہین وہ اس بھوکے کو محروم کر دیتے ہیں۔ جس کے حصے میں یہ روٹیاں جانی تھیں۔ اسلام کا معاشی نظام ہولڈنگ کا (possession) کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ساری عمر جمع کرنا اور 2.5% دے دینا تو قرآن کے خلاف ہے یہ تو سرمایہ داری کا وضع کردہ نظام ہے۔ اسلام possession کا، ہولڈنگ کا جذبہ رہنے ہی نہیں دیتا ۔ وہ تو صرف دینے کے جذبہ کو ابھارتا ہے۔ اب جو اپنی ضرورت کے مطابق ہو اسے Consumer یعنی خرچ کرنیوالے کی جائیداد یعنی جتنا کوئی استعمال کر سکتا ہے۔ Consumer property جبکہ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:2) یہ ضرورت سے زیادہ ہے تو گن گن کر جمع کرتا ہے۔ یہ تمام نظریات قرآنی اصطلاح زکوٰۃ کے خلاف ہیں۔

❁❁❁

قانونِ مکافات کا سامنا اور کائناتی حقائق کی ڈسکوری کا سامنے آنا "لِقَآءِ رَبِّ" کہلاتا ہے یعنی ذاتِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنا

اَوَلَمۡ یَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ﴿۵۳﴾ (41:53) کیا اس ہمہ گیر علم اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ جو کچھ اس نے اس کتاب میں کہا ہے کہ وہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اس لئے حقیقت ثابتہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اَلَاۤ اِنَّهُمۡ فِیۡ مِرۡیَةٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّهِمۡ ؕ (41:54) ذرا ان کی حالت پہ غور کرو کہ یہ مکافات عمل کا سامنا کرنے پہ شک واضطراب میں مبتلا ہیں۔ اللہ محسوس شکل میں تو سامنے آنہیں سکتا۔ کوئی نگاہ اس کو پانہیں سکتی۔ موسیٰ ؑ سے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ اس طرح تم خدا کا دیدار نہیں کر سکتے۔ خدا کا یوں نگاہوں کے سامنے آنا یعنی ملاقات کرنا اس اعتبار سے تو نہیں ہو سکتا۔ اب خدا سے ملاقات کیسے ہوتی ہے؟ اب تحقیقات کے بعد جو ایک ایک حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے۔ تو اس کا قانون بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ یہی تو خدا سے ملاقات ہے۔ خدا کا سامنے آجانا ہے۔ اس طریقے سے خدا کو بے نقاب دیکھ لیتے ہیں۔ جو ان چیزوں پر نہیں آتے۔ یہ ہیں جو خدا سے ملاقات کرنے آمنا سامنا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

اس آیت میں لِقَاءِ رَب کا ذکر ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّكُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّكُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲﴾ (13:2) کہ ان چیزوں پر غور کرنے سے خدا کو سامنے دیکھ کر تجھے یقین آجائے۔ یہ ساری تحقیقات اس لقاء رب کی تفسیر بنتی جا رہی ہیں۔ مومن کی پہلی شرط یہ ہے کہ تحقیقات کرے۔ انہی کو متقی اور موقنین کہا ہے۔ دوسری شرط ہے کہ ان کی تسخیر کے بعد ان کو اقدار خداوندی کے تحت انفع الناس کے لئے کام میں لائے۔ جو ان کو اس طرح استعمال نہ کرے تو وہ چنگیز اور ہلاکو ہے۔ اور جو ان قوتوں کو نہ اس طرح استعمال نہ کرے۔ تسخیر نہ کرے تو وہ تباہی اور ذلت کی زندگی گزارے گا۔ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ ﴿۵۴﴾ (41:54) وہ کسی خاص مقام پر نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تمام چیزوں کو محیط ہے صرف پردہ اٹھانے کی بات ہے۔ تمہیں تمہارا رب نظر آجائے گا۔ جو کائنات کے کونے کونے میں موجود ہے۔

خدااور کائنات کا تعلق:

''لِقَآءِ رَبِّ'' بڑی اہمیت رکھتا ہے۔خدااور کائنات کا تعلق کیا ہے؟ایک پیچیدہ اور نازک مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔جسے قرآنی اعجاز نے مختصر ترین لفظوں میں سمٹا کر بتادیا ہےاوپر والی آیات میں اور چند دیگر آیات میں۔ایک گروہ کا خیال ہے کہ خدااور کائنات کا تعلق یوں ہے جیسا کہ ایک مشین بنانے والے کا مشین سے ہوتا ہے۔مشین بننے کے بعد بنانے والے کے وضع کردہ اصول کے مطابق خودبخود چلتی رہتی ہے۔اس کا مشین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔مشین کہیں اور۔اوراس کا بنانے والا کہیں اور۔اس تصور کی روسے خدا کو کائنات سے ماوراء (الگ تھلگ) سمجھا جاتا ہے۔فلسفیانہ اصطلاح میں اسے ماورائیت ''Transcendence of God'' کا تصور گردانا جاتا ہے۔جس کا نتیجہ Deism ہے۔یعنی ایسا خدا جو کائنات سے باہر، اپنے تخت حکومت پر متمکن ہے۔

اس سے تجسیم (صاحب جسم) ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔اس کے برعکس دوسرا گروہ ہے۔ان کے تصور میں خدااور کائنات ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔نہ کائنات خدا سے الگ ہے اور نہ خدا کائنات سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔اسے فلسفیانہ انداز ''immanence of God'' کا تصور کہا جاتا ہے۔جس کا نتیجہ وحدت الوجود (Pantheism) ہے۔یعنی ہر شئے خدا ہے۔

قرآن کی روسے یہ دونوں تصورات باطل ہیں۔اس کی روسے خدا Immanent بھی ہے اور Transcendent بھی۔وہ کائنات کے اندر ہے مگر محبوس نہیں۔وہ کائنات سے باہر ہے مگر خارج نہیں۔وہ کائنات کا خالق ہے۔لیکن اس کی مخلوق (کائنات) اسی کی الوہیاتی توانائی ''Divine energy'' کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔اسے خدا کا امر کہا جاتا ہے۔یعنی Directive force اسے زماں (Time) میں ابدیت حاصل ہے (Eternity) اس لئے ھواللہ الاول والاخر اسکی شان ہے۔وہ مکان میں لامحدودیت (Infinity in Space) کا مالک ہے۔اس لئے ''وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ'' (57:3) اس کی صفت ہے۔وہ کائنات سے باہر کہیں الگ تھلگ بھی نہیں ہے اور نہ ہی کائنات کی ہر شے خدا ہے۔اس لئے تجسیم اور وحدت الوجود کے دونوں تصورات غیر قرآنی ہیں۔

۞۞۞

کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ بڑی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا ہے جب کہ انسان کے خودساختہ نظام نے اسے ہلا کر رکھ دیا ہے

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ (42:4) یہ کائنات ایک مقصد کے تحت سرگرم عمل ہے۔ جو خدا کا متعین کردہ ہے۔ یہ سارا سلسلہ خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہے۔ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ (42:4) یہاں دولفظ آ گئے ادبی اعتبار سے اسے تجنیس یعنی (Alliteration) کہتے ہیں۔

"The writing or occurrance of two or more words having same initial sound in a phrase or line"

اسے تجنیسِ لفظی کہتے ہیں۔

سمٰوٰت بلندی ہے اس کے لئے تو علّیٌ آیا ہے یعنی بلند ہونا۔ اور ارض پستی کے لئے۔ اس کے لئے عظیمٌ آیا ہے۔ بنیادی ہڈیاں جس پر جسم کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی بلندیاں اسقدر اونچی اور بنیادیں محکم۔ وہی عمارت اونچی جا سکتی ہے۔ جس کی بنیاد محکم ہو۔ اس لئے اس کے لئے علیٌّ ہونا بھی ضروری ہے اور عظیم' ہونا بھی ضروری ہے۔ اب یہ ہوگئی اسلامی نظام کی خصوصیات ہر طرح کی عظمت اور بلندی۔ اس کے برعکس انسانوں کا اپنے معاشرہ جوان کے خودساختہ نظام سے ظلم واستبداد اور سلب ونہب پر مبنی ہوتا ہے اور اسے فساد انگیزیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (42:5) یہ اجرام فلکی، یہ بڑے بڑے کرے اگر یہ اس طرح سے معلّق نہ رہیں اگر ان کی باہمی کشش میں ذرا سا فرق پیدا ہو جائے تو یہ ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ زمین تو کوئی شے نہیں ایک سورج اس سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ اگر وہی اس پر گر جائے تو اس کا تو کچومر نکل جائے۔ یہ کیوں نہیں پھٹ پڑتے۔ گر پڑتے۔ یہ فطرت کی قوتیں ہیں جو خدا کے پروگرام کو اس حسن وخوبی سے چلا رہی ہیں کہ تا کہ بھی کرہ ارض کی مخلوق ہے اس کی حفاظت ہوتی جائے۔ یہی تو حفاظت اور نشوونما کا انتظام کر رہی ہیں۔ یہ ہے اسلامی معاشرہ کی خصوصیات کہ اسے غفور بھی اور رحیم بھی ہونا چاہیے یعنی سامان نشوونما کے ساتھ سارے بیرونی اور اندرونی خطرات سے حفاظت کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

حق و باطل کی کشمکش ایک نظریے کے تحت

وَیَمۡحُ اللّٰہُ الۡبَاطِلَ وَیُحِقُّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ ؕ (42:24) یہاں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ باطل مٹ جاتا ہے حق غالب آجاتا ہے لیکن بِکَلِمٰتِہٖ ؕ کی شرط ہے۔ یعنی قونین خداوندی کی رو سے۔ اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَی الۡبَاطِلِ فَیَدۡمَغُہٗ فَاِذَا ہُوَ زَاہِقٌ ؕ (21:18) حق سے مراد حقیقت کا محسوس شکل میں سامنے آنا۔ یہ کوئی تحریری یا نظری بات نہیں ہے۔ پوری کائنات میں حق و باطل کا یہ ٹکراؤ جاری ہے یہ فارمولا جو قرآن نے بیان کیا ہے ہمارے دور کی ساری سائنٹیفک تحقیقات اس کی رہین کرم ہیں۔ ارتقائی بنیاد ہی اسی کلیہ پر ہے جس کی ابتداء ڈارون نے کی کہ ساری کائنات میں تعمیری انتخاب جاری ہے۔

''Natural Selection'' اس کائنات میں تخریبی اور تعمیری قوتیں آپس میں پیہم کشمکش میں رہتی ہیں۔ جس نوع میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو وہ آگے بڑھ جاتی ہے زندگی کی نمود اوّلین جرثومۂ حیات سے ہوئی۔ زندگی مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی، زندگی چاہے جس شکل میں تھی وہ اسے نوع یا species کہتا ہے۔ اگر اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ تخریبی قوتوں کا مقابلہ کر سکی تو آگے بڑھ گئی۔ اور جس میں یہ قوت نہیں تھی تو وہ وہیں فنا ہوگئی۔ Fossilised (مُتحجّر) کھدائیوں سے، برفوں کے نیچے چٹانوں کے نیچے دبے ہوئے کروڑوں سال پہلے کے جانوروں کے جو پیکر نظر آتے ہیں۔ یہ زندگی ایک مقام پر منجمد ہوگئی یہ تخریبی قوتوں کا مقابلہ نہ کرسکی۔ جو نوع مقابلہ کرسکی وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ حق تھا جو آگے بڑھا تھا۔ جب کہ باطل کی قوتیں دب گئیں۔ آگے نہ بڑھ سکیں یہ سلسلہ کروڑ ہا سالوں تک جاری رہا۔ زندگی جس شکل میں بھی ہے۔ اس کی پوری داستان اسی ٹکراؤ کی داستان ہے۔ یعنی تخریبی اور تعمیری قوتوں کا ٹکراؤ۔ حق و باطل کا ٹکراؤ۔ ڈارون کے بعد اس نظریہ میں بے حد ترمیمات ہوئیں۔ قرآن ایک عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔ یہ کائنات کی زندگی کی پوری داستان ہے۔

ہیگل کا تعمیری اور تخریبی ٹکراؤ کا نظریہ:

ہیگل (1831-1770) اس نے کہا کہ یہ کشمکش تصورات (ideas) یعنی کلمات کی ہے۔ تخریبی اور تعمیری تصور میں ٹکراؤ

1043

ہوتا ہے۔اسے جدلیاتی (Dialectic) کہا ہے اس میں تخریبی نظریہ شکست کھا تا ہے جب کہ تعمیری نظریہ غالب آ کر پہلے سے زیادہ نکھر کر اور شفاف ہو کر آتا ہے۔اس نے کہا کہ سائنس آف ہسٹری نے یہی ثابت کیا ہے۔یہ چیزیں ایک خاص طریق سے آگے بڑھتی ہیں۔یہ ہے وہ حقیقت جو قرآن نے یہاں کی ہے۔جبکہ ہیگل کے شاگرد مارکس (83-1818) نے کہا کہ یہ فارمولا تو درست ہے کہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے مگر یہ ٹکراؤ تصورات میں نہیں ہوتا بلکہ نظام زندگی میں ہوتا ہے اور جو نظام نافع ہوتا ہے انسان کے لیے وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔قرآن نے اسی کو مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ (13:17) کہا ہے۔نظر آتا ہے گویا قرآن کی آیتوں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔حالانکہ اس بات کی شہادت نہیں ملتی کہ قرآن اس طرح اس کے سامنے آیا ہو اگر الفاظ نہ بھی ہوں تو حقائق تو کائنات کی فضا میں پھیلے ہوئے ہیں۔کہا کہ ہر وہ چیز جو انسان کے لیے تخریب کا باعث ہو گی وہ مغلوب اور جو نفع بخش ہو گی اس کو بقا ہو گا۔یہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ (13:17) کا ترجمہ ہے۔وہ نظریہ کو بھی نہیں چھوڑتا اور نظام کو بھی نہیں چھوڑتا۔کہتا ہے کہ ہر نظام کسی نہ کسی تصور کے اوپر متشکل ہوتا ہے۔قرآن اسے ایمان سے تعبیر کرتا ہے چند بنیادی نظریات کی صداقت پر یقین۔قرآن کہتا ہے یہ تصورات نظری طور پر رہیں تو کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرتے ان نظریات کی بنیاد پر نظام وہ نتائج پیدا کرتا ہے اور نتائج حق کی شہادت دیتے ہیں گویا قرآن نے تصورات اور نظام دونوں کا امتزاج پہلے دن سے پیش کیا ہے۔یہ دونوں الگ الگ تھے۔ہیگل صرف تصور کو لے کر چلا اور کارل مارکس نے نظام کو لیا۔ہیگل کا فلسفہ کچھ دیر چلنے کے بعد وہیں جامد ہو کر رہ گیا اور کارل مارکس بھی آگے نہ چل سکا کیونکہ اس کا نظام وہ تصورات کے بغیر تھا۔قرآن کے تصورات ابدی اور غیر متبدل اور اسی پر ایک نظام۔اس آیت میں بِکَلِمٰتِہٖ کا اضافہ ہے۔حق کا نظام جو خدائی نظریات کے اوپر متفرع ہوتا ہے (کسی چیز سے مثل شاخ نکلنے والا) یہ نظام دین کہلاتا ہے۔ابن مسکویہ نے اسے سَفَرًا کہا ہے۔(426ھ) یعنی مسافت طے کرنا جو ہزاروں سالوں میں طے ہوتی ہے اور اس میں چند دنوں میں طے ہو جاتی ہے۔فجائی ارتقا کے بارے میں۔ایک تو فطری ارتقاء ہے۔منزل بہ منزل جس میں کروڑ ھا سال لگ جاتے ہیں دوسرا فجائی ارتقاء Emergent Evolution ہے اس میں کوئی نوع درمیان کی کئی کڑیاں پھاند کر جو مسافت اس نے ہزار ہزار سال میں طے کرنا تھا وہ چند دنوں میں طے کر کے پہنچتی ہے۔ابن مسکویہ (330ھ) فارابی (950ء) ابن سینا (1037) ابن ماجہ نے بھی اس نظریہ پر روشنی ڈالی ہے۔ابن مسکویہ کی اصطلاح سَفَرًا یعنی ''مسافت طے کرنا''، یعنی ایسی مسافت جو سینکڑوں، ہزاروں سال میں طے ہو، وہ چند دنوں میں طے ہو جاتی ہے اس نے اپنے مشہور رسالہ فوز الاصغر میں اس پر خصوصیت سے بحث کی ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ حق و باطل کا معرکہ اگر سے علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو ہماری ملائکہ کی قوتیں زمانے کے تقاضے تو یہ ان کے زور پر آگے چلے گا۔تو اس میں ایک دن پچاس پچاس ہزار سال کا ہو گا۔تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔کتاب ''Adventures of ideas'' کہ صحیح تصورات کس طرح سفر کرتے ہیں۔یہ Alfred Whithead کی کتاب ہے۔یہ تصورات از خود سفر کرتے

1043
ہیں۔کہا ہے کہ عقل انسانی کا طریق سعی وخطا کا ہے۔وہ ایک پروگرام تجویز کر کے اس پر چلتی ہے۔ناکام ہوکر اسے چھوڑ دیتی ہے پھر دوسرا لائحہ عمل اختیار کرتی ہے۔اس طرح سے قدم بہ قدم نقصانات اٹھا کر،ہڈیاں تڑوا کر،خندقیں پھاند کر آگے چلتے ہیں۔پھر يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ‌ ۚ (2:30) کرتے کرتے آخر کار اس منزل تک پہنچ جائے گی۔

دین کی تاریخ تو نوحؑ سے شروع ہوئی نظریات کی کش مکش جاری تھی کہ رسول ﷺ نے ایک جماعت تیار کی۔وہ جماعت حق کو غالب کرنے کے لئے اٹھی۔اس جماعت کے بغیر یہ کائناتی قوتیں غیر محسوس طور پر یہی کام کر رہی تھیں مگر انہوں نے یہ منازل چند سالوں میں طے کر لئے۔جو ہزاروں سالوں میں اس جماعت کے بغیر طے ہونے تھے۔اس فجائی ارتقاء کے بعد پھر فطری ارتقاء نے لے لی۔وہ جماعت نہ رہی۔سطح بیں نگاہوں نے دیکھا کہ اسلام تو ختم ہو گیا حالانکہ اس دور کے بعد یہ ختم نہیں ہوا بلکہ فجائی ارتقاء،فطری ارتقاء میں بدل گیا۔

مغربی تحقیقات:

مغرب کے ایسے محققین کی تاریخی تحقیقات بھی یہ ہیں کہ انسان غیر محسوس طور پر انہی راستوں کی طرف گامزن ہے جو اسلام نے چودہ صدی قبل دنیا کو دیئے تھے۔یہ adventures of ideas ہیں جو اس طرح سے سفر طے کر کے آگے بڑھ رہے ہیں۔ وَيَمۡحُ اللّٰهُ الۡبَاطِلَ وَيُحِقُّ الۡحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ‌ؕ (42:24) زود ہو یا بدیر۔یہ ہے ابدی حقیقت۔ابدی نظریات کے اوپر ایک محسوس نظام قائم کر کے اس کے خوشگوار نتائج سے اس کے حق ہونے کی شہادت پیش کرنا۔یہ ہے دین جس میں بڑی کشمکش اور کشاکش ہوتی ہے۔

باطل کی ٹیکنیک کہ وہ اپنے آپ کو بے نقاب ہونے ہی نہ دے:

اغراض میں،مصلحتوں میں،انسانی جذبات میں،حق کا تقاضا منفعت عامہ ہوتا ہے۔نوع انسانی کی منفعت ہوتا ہے۔اس کے برعکس باطل کا تقاضا اپنے ذاتی اغراض اور ذاتی منافع ہوتے ہیں۔ان میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔سائیکالوجسٹ ایرک فرام (1980-1900) کہتا ہے کہ باطل کبھی بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آتا۔اس کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کا نقاب اوڑھ لیتا ہے۔وہ ایثار،قربانی اور خلوص کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ آپ کو یقین آجاتا ہے۔اگر وہ اٹھ کر یہ کہتا ہوا چلا جائے کہ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے،سب جھوٹ ہے تو وہ کامیاب رہ ہی نہیں سکتا۔اگر وہ بے نقاب ہو جائے تو کبھی بھی ظفرمند نہیں ہو سکتا۔اس طرح مذہب نے خود کو ہمیشہ دین کے نقاب ہی میں پیش کیا ہے۔جب وہ جماعت نہیں رہتی تو اب دین کی رفتار کائناتی ہو جاتی ہے۔اس کی جگہ باطل یعنی مذہب لے لیتا ہے۔یہ دین کا نقاب اوڑھ کر آتا ہے۔اس کی تمام اصطلاحات،رسومات،تصورات دین کا نقاب اوڑھ کر آتا ہے اور اس کی حقیقت باطل کی ہوتی ہے۔یہ باطل آہستہ آہستہ عام ہو کر معاشرے کا رہن سہن اور چلن بن جاتا ہے۔پورا معاشرہ اس کو حق سمجھنے لگ جاتا ہے۔پھر باطل وہ تمام حربے معاشرے میں استعمال کرتا ہے۔قرآن میں (64-17:62) میں

ابلیس کے یہی حربے دیئے گئے ہیں۔ جو پھر انسان کو تنگی کا ناچ نچاتا ہے۔ کبھی فوج کشی سے، مال و دولت میں شریک ہو کر، اولاد کی تعلیم و تربیت میں اور پروپیگنڈے کے ذریعہ سے، مذہبی دنیا کے ذرائع ابلاغ ذہنوں کو ماؤف کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتے ہیں۔ کہ انسان ان کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔ اور حق کے پرستاروں کو پورے معاشرے سے الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح عباسیوں کے عہد میں معتزلہ کو الگ کر دیا گیا تھا۔ اعتزال کے معنی (Isolated) ہیں۔ آج بھی قرآن کی آواز اٹھانے والوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہیں سارے ابلیسی ہتھکنڈے۔ لیکن غلبہ حق کا ایک فطری طریق ہے جو سست روی کے باوجود اپنے اندر کی قوت سے اوپر کو جاتا ہے۔ باطل اس ہنگامی ارتقاء کے راستے میں بڑی بڑی مشکلات کھڑی کرتا ہے لیکن جو فطری ارتقاء ہے وہ جاری ہے۔ اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اس کے لحاظ سے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) یہ تمام نظمہائے زندگی پر چھا جائے گا۔ یہ اس کی سرشت کے اندر ہے۔ جس طرح فوارہ اپنے اندر کی قوت سے ابھرتا ہے۔ خارجی قوت سے نہیں۔ یہ ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (35:10) اس نظریہ میں از خود یہ قوت موجود ہے کہ اوپر کو اٹھے لیکن اگر انسانی رفاقت ساتھ ہو تو وہ صعود تیزی سے ترفع میں بدل کر مدینہ میں ریاست قائم کر دیتا ہے۔

جو اس سست رفتاری سے حق کا باطل پر غلبہ وہ محسوس نہیں ہوتا۔ جس طرح گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی چلتی ہوئی، دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو اول تو وہ منٹوں کی سوئی بھی نظر نہیں آتی۔ اگر وہ بھی نہ ہو تو نگاہ تیز بھی کیوں نہ ہو۔ وہ گھڑی کی گھنٹے کی سوئی کے متعلق تو محسوس بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ چل رہی ہے حالانکہ وہ چل رہی ہوتی ہے۔ یہ ہے حق کی باطل پر غالب آنے کی کائناتی رفتار۔ دنیا رفتہ رفتہ اس طرف آ رہی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ لمبے عرصہ پر پھیلے ہوئے واقعات کو مرتکز کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ واقعی کہ باطل آہستہ آہستہ کسی طرح حق کے تابع ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ سارا کائناتی تقاضوں کے تحت رونما ہو رہا ہے۔ غار والے انسان اور موجودہ انسان میں فرق دیکھ لیں۔ وہ آج بھی اس حالت میں ہیں اور دوسرے کو دیکھئے کہ چاند تک رسائی حاصل کر لی۔

کیا ذہنی اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ یہ ارتقاء اب اس طرح سے ہو رہا ہے۔ لیکن اتنا غیر محسوس کہ اگر شکلیں بدلتیں تو ان کا پتہ چلتا کہ کل اس شخص کا اس قسم کا حلیہ تھا۔ اور آج یوں ہو گیا ہے۔ تو یہ محسوس ہو گا مگر یہ اندرونی ارتقاء کا تو محسوس ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ بڑے سے بڑا دیدہ ور مورخ بھی نہیں بتا سکتا کہ تاریخ کے فلاں دور میں ایک ایسی لائن آتی ہے۔ جس میں پچھلا انسان اور اس سے اگلا انسان متمیز ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ بالکل نہیں۔ یہ سلسلہ گھنٹے کی سوئی کی طرح چل رہا ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ گیارہ بج گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی رفتار کیا ہے؟ دس سے گیارہ تک پہنچنے میں یہ گھڑی کی سوئی تو چلتی ہوئی ہی نظر نہیں آئی۔ رابرٹ برفالٹ کی کتاب (Making of Humanity) میں وہ تہذیب کی رفتار کا بھی تجزیہ کرتا جاتا ہے لیکن وہ کہیں بھی نہیں بتاتا کہ اس لائن پر آ کر دیکھے اس سے پہلے کا انسان اور بعد کا انسان یہ رفتار بڑی غیر محسوس ہوتی ہے۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہوا:

اب یہ دین جو مذہب میں تبدیل ہوا ہے یہ فرق بڑا غیر محسوس طور پر ہوا ہے۔اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ مسلمانوں کے عقائد جو آج موجود ہیں یہ کس طرح سے ان اصلی عقائد کے خلاف ہیں۔ یہ کیسے عام ہوئے، کیسے پیدا ہوئے؟ بڑی مشکل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ لوگ اس مقام پر بھی انگشت بدانداں رہ گئے کہ وہ کونسا معیار ہے جس سے حق اور باطل کا فرق کیا جا سکتا ہے۔ کہا اس کا فیصلہ صرف وحی کر سکتی ہے انسان کو اس مخمصے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ عقلی طور پر یا تاریخی چھان بین کر لے۔اور بتائے حق کیا تھا۔اس میں تو مغالطہ ہو جائے گا۔کہا کہ ان ابدی اقدار کے تحت تاریخ کا مطالعہ کریں آپ کو نظر آجائے گا کہ جہاں کوئی تہذیب، کوئی تمدن، کوئی نظریہ، کوئی قوم آہستہ آہستہ روبہ زوال ہو کر فنا ہوگئی یہ وہ تھی جو ان ابدی حقائق کے خلاف گئی تھی۔اور جہاں کسی قوم کا فروغ وارتقاء ہوا۔اس قوم کا نام کچھ بھی ہو نظر آئے گا کہ انہوں نے پچھلے تصورات کو چھوڑ کر نئے تصورات اختیار کئے تھے۔اگر چہ انہوں نے بھی یہی کہا کہ ہم نے زمانے کے تقاضوں سے ایسا کیا ہے۔لیکن اگر وہ ان کے ارتقاء کا باعث ہوئے تو دیکھو گے کہ قرآنی نظریات سے ملتے جلتے تھے۔تاریخ کا مطالعہ اس انداز سے کرنا چاہئے پھر حقیقت سامنے آتی ہے۔

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (42:24) پھر اس کی شہادت ملتی ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ کتنا عظیم ہے اپنے آپ کو حق پر اور ہندوؤں وغیرہ کو باطل پر سمجھتے رہیئے یہ خوش فہمی ہے۔فسفیانہ طور پر بھی ان نظریات کو بلند سمجھیں مگر عملی طور پر کچھ نہ کریں تو ہیگل والی تفسیر ہے۔ان نظریات کے اوپر نظام ہی اس نظریہ کا ثبوت ہوگا۔اگر جماعت ہو تو یہ رفتار دنوں میں بدل جاتی ہے اگر یہ نہ ہو تو حق اپنی کائناتی رفتار سے آگے چلتا ہے۔وقت ضرور لگتا ہے۔

تاریخ کے سلسلہ میں مغربی محققین:

یہ خود اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو قوم بھی آگے بڑھی ہے تو اس نے ان اقدار کو اپنایا تھا۔اور جو زوال پذیر ہوئی تو اس نے ان اقدار کو چھوڑ دیا تھا۔اب وہ اس کا حوالہ اور سند نہیں دیتے کیونکہ ان کے سامنے مسلمانوں کی غلط تاریخ ہے اور ہے بھی مسلمانوں کی تاریخ اسلام کی نہیں۔صدر اول کی تاریخ بھی تو بعد میں عباسیوں کے زمانے میں مرتب کی گئی۔اس تاریخ کو تو ہم نے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔اس لئے یہ محقق اس کا حوالہ اور سند نہیں دے سکتے۔قصور تو ہمارا ہے کہ ہم نے نہ ان کے سامنے قرآن پیش کیا اور نہ صدر اول کی تاریخ۔مگر وہ اپنے طور پر غیر محسوس طور پر یہ تمام باتیں کر رہے ہیں۔جو قرآن نے کہی ہیں۔مثلاً آہستہ آہستہ انسان زمانے کے تقاضوں کی رو سے ملوکیت، بادشاہت، شخصیت پرستی، پروہت پرستی کو چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہوا چلا گیا۔کیا کرتا بے چارہ؟

ترا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

آخر الامر وہ جمہوریت تک آگئے۔مگر یہاں بھی انسان، انسان پر حکومت کر رہا ہے۔قرآن نے تو ایسی جمہوریت کی تردید

1043
کی ہے۔اپنے اَهۡوَآءَهُمۡ ﴿۱۴﴾(47:13) کومعبود نہ بنالینا۔اب اس سے آگے اس انسانیت ساز نظام حکومت پر لانے کے لئے کتنا لمبا عرصہ لگے گا۔اگر کوئی ان کو بتانے والا ہوتا۔ان کو سمجھانے والا ہوتا کہ یہ نظام یوں آئے گا۔تو وہ اس کو دیکھ لیتے۔اب یہ تو نہ ہوسکا لیکن قرآن کا دعویٰ اپنی جگہ موجود ہے۔وَيَمۡحُ اللّٰهُ الۡبَاطِلَ وَيُحِقُّ الۡحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ (42:24) اس کے فوراً بعد کہا اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۲۴﴾(42:24) یہ چیز دلوں کا تغیر مانگتی ہے۔میکانکی طور پر نہیں ہوگا۔مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا خواہ وہ مقننہ ہو یا انتظامیہ،خواہ نبی ہی کیوں نہ ہو کہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ میرے محکوم بن جاؤ۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

❁❁❁

ابواب یا اوزان
دَرَس اور تَنْزِيْلٌ جیسے الفاظ کا حیرت انگیز چناؤ

درس:

دَرَسَ الْحِنْطَةَ۔ گیہوں کا گاہنا۔ گیہوں کاٹ کر زمین پر تھریشر سے پہلے بچھا دیتے تھے۔اور سارا دن دھوپ میں اس پر بیل چلاتے تھے۔تو وہ بیل پاؤں سے اس کو مسلتے تھے۔تو دانے خوشوں سے الگ ہوجاتے تھے۔تو الفاظ میں چھپے ہوئے معنی کو باہر نکالنے کا جو طریق ہوتا تھا۔عرب اسے درس کہتے تھے۔درس سے مراد وہ چھلکا دانے سے الگ ہوجائے۔بار بار گھوم کر پھر اس کے اوپر وہ بیل آئے۔قرآن نے اسے تَصریفُ الایات کہا ہے۔یہ بار بار تکرار سے بیان اس لئے ہے کہ معنی جو الفاظ کے چھلکوں میں چھپے ہوئے ہیں وہ س طرح سے باہر آجائیں۔مغز اور دانے الگ الگ ہوجائیں۔یہ طریق تدریس کہلاتا ہے۔

تنزیل، خارج سے علم کا ملنا (Objectively):

وحی کے لئے تنزیل ۔نزول یا انزال استعمال کیا گیا ہے۔جو اس کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ خارج سے (Objectively) اس نبی کے اوپر القاء ہوتا ہے۔کوئی چیز جو باہر سے،اوپر سے نیچے آئے۔وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ (53:3) یہ اپنی فکر سے کچھ نہیں کہہ رہا ہے بلکہ خارج سے یہ علم اسے دیا جارہا ہے۔یہ لفظ نزول اس کے لئے ہے۔وحی کے علاوہ وہ دوسرا ایسا کوئی علم نہیں ہے جو اس طرح خارج سے انسان کو ملے کہ اس میں اس کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہ ہو۔یہ کشف والہام تو مہر نبوت توڑنے کی سازش ہے۔یہ تو وحی کا دعویٰ کرنا ہے۔اس قسم کے کشف والہام کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے۔اب یہ علم رسول ﷺ کو آخری بار دے دیا گیا ہے۔یہ تنزیل ہے۔یہ رفتہ رفتہ،آہستہ آہستہ،بتدریج کا باب ہے۔آہستہ آہستہ تکمیل تک پہنچا ہے۔کس کی طرف سے مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (41:2) اس دور کے سب سے بڑے نام نہاد مفکر مودودی کی تفسیر کے پہلے صفحہ پر کہ یہ رحمن ورحیم ہے۔یہ بات پر زور دینے کے لئے ایسا کہا ہے۔جیسے ہمارے ہاں لمبا تڑنگا'' کہتے ہیں۔یونہی ایک مہمل لفظ ہے۔

رحمن عربی زبان میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔جیسے درازیٔ قد کے ذکر میں جب ''لمبا'' کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے بعد ''تڑنگا'' کہتے ہیں۔

تیری نگاہ فرو مایہ ، ہاتھ ہے کوتاہ
تیرا گناہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ

یہ مقبولیت عامہ آدمی کو صحیح معنوں تک پہنچنے نہیں دیتی ۔اور پھر تقلید تو اس سے نکلنے ہی نہیں دیتی۔

رحم مادر کی مثال اور ابواب:

عربی زبان میں کسی لفظ کا مادہ ایک ہی ہوتا ہے۔ جب باب یا وزن بدلتا ہے تو اس کے معنی بدلتے ہیں۔ یہ رحمن ورحیم'' کا یک ہی مادہ ''رح م'' ہے۔یہیں سے رحم مادر بنا۔ایسی نشوونما جسے رحم مادر میں بچے کی نشوونما ہوتی ہے۔کتنے مراحل ہوتے ہیں۔بظاہر ماں کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اندر سے خود ہو رہا ہوتا ہے۔صورت یہ ہے کہ ہڈیاں بھی بن رہی ہیں۔اعصاب بھی بن رہے ہیں۔دل دھڑک رہا ہے۔خون گردش کرنے لگتا ہے۔بچہ کی ہر چیز پوری ہو رہی ہے۔آنکھ بن رہی ہے۔بینائی آرہی ہے۔دماغ اور خلیے بن رہے ہیں۔ماں کو بھی کچھ پتہ نہیں کہ کیسے ہو رہا ہے۔؟

وحی بھی اس طرح ہوتی ہے نبی کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ کیسے ہو رہا ہے۔اور یہ وحی جس کو رحمت کہا گیا ہے۔تا کہ اس سے انسانیت کی نشوونما ہو سکے۔حالانکہ ان کے ہاں رزق اور ربوبیت کے الفاظ بھی تھے۔جن میں بظاہر محسوس طور پر کوئی نہ کوئی ذریعہ ہوتا ہے۔اور ایسی چیز جس میں محسوس ہی نہ ہو کہ روٹی کھا رہے ہیں، پانی پی رہے ہیں اور نشوونما ہو رہی ہے۔یہ ہے ''رحیم'' کا لفظ۔پھر اس رحیم سے (Mercy) ہو گیا۔تو اس نے اور ستیاناس کر دیا۔ہم نے عیسائیت سے یہ لفظ لیا کہ (God is Mercy) اور اس کا ترجمہ رحیم اور مہربان کر دیا جو سراسر غلط ہے۔جسم کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اقدار کے ذریعہ انسانیت کی نشوونما جو وحی کے ذریعہ دی گئیں۔اس کے لئے لفظ رحیم'' آیا ہے۔اسکی دو شکلیں ہیں۔رحمٰن ورحیم۔صرف باب بدلا ہے اب وزن بدلنے سے معنی میں دونوں کے فرق آ گیا۔

نظریہ ارتقاء:

یہ نظریہ ارتقا کہ زندگی آہستہ آہستہ، بتدریج مختلف منازل سے گزرتی ہوئی اس موجودہ مقام تک آ پہنچی۔یعنی کڑی در کڑی آگے چلتے جانا بتدریج۔بعض مقامات ایسے تھے جن میں ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔کہ یہ چیز کیسے بن گئی؟ درمیان کی کڑی گم تھی۔(Missing) یہ درمیان سے کڑیاں پھاند کر کوئی چیز آگے جا پہنچتی ہے۔یہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔اسے انہوں نے فجائی ارتقا (Emergent) کہا۔کہ ہنگامی طور پر یک لخت کچھ ہو گیا ہے۔اس نظریہ کا امام C.C.Morgan ہے۔اس کی کتاب ''Emergent Evolution'' ہے۔

یہ ایک الگ شعبہ ہے۔ہنگامی طور پر کچھ اور بن جانا۔ایک تو کڑی در کڑی ،آہستہ آہستہ کے لئے ''Normal

1043

Evolution‘‘ کے لئے باب فَعِیْلٌ کے وزن پر رَحِیْمٌ ہے۔لیکن یہ جو دوسری کڑی ہے۔یہ جو درمیان میں تدریج کی کڑیوں کو پھلانگ کر کسی چیز کا یک لخت ہنگامی طور پر ابھر آنا۔اس طریق کے لئے فَعْلَانُ کا وزن ہے۔رَحْمٰنُ کا لفظ فعلان‘‘ پر آیا ہے۔اس باب کی خصوصیت یہ ہے کہ شدت سے یک لخت ہو جانا۔یہ ہے خصوصیتِ رحمٰن‘‘

اور رحیم‘‘ کسی چیز کا بتدریج، کڑی در کڑی، منزل بہ منزل، جس طرح فکر انسانی وہ پہلی جماعت سے ایم اے تک بتدریج علم حاصل کرتا ہے۔اسے (Detecting Knowledge) کہتے ہیں۔یعنی تحقیق کی پھر آگے پہنچے۔جس طرح بلڈنگ کی بنیاد، ڈھانچہ بتدریج اٹھتا جائے گا۔

اب نبی جس کو کل تک نہ ایمان کا پتہ تھا اور نہ کتاب کہ۔اب اسے وہ علم مل گیا۔جو ساری کائنات کو مشہود کر دینے والا ہو۔یہ اس طرح سے یکلخت مل جانا، یہ تدریجی ارتقاء نہیں ہے۔یہ فجائی ارتقاء ہے۔وحی ملنے کا خاصہ ہی رحمانیت ہے۔رحمیت نہیں ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ (55:1-2) رحمن نے قرآن کا علم دیا۔اس رحمن میں فجائی ارتقا کی بات ہے۔یہ قرآن تدریج سے، اپنے اکتساب، سوچ وبچار کا نتیجہ نہیں ہے اس کو رحمن نے سکھایا ہے۔اسے پہلی جماعت سے ایم اے تک نہیں لے گیا۔یہ تو رحمیت کا خاصہ ہے۔یہ تو رحمانیت والی بات ہے۔اس کو بتدریج نہیں سکھایا۔جس طرح بچہ ابجد سے ایم اے تک پہنچتا ہے۔آگے اس کی نتائج رحمیت کے خاصہ سے پیدا کرے گی۔اب یہ بتدریج آخری منزل تک پہنچائے گا۔اب یہ علم یہ نبی وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ (2:129) اب اس رحمیت کے ذریعہ ان کو تعلیم دے گا۔

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۚ﴿۲﴾ كِتٰبٌ (41:2-3) اب وحی ضابطہ کی شکل میں، کتاب کی شکل میں۔اب یہ بکھری ہوئی نہیں رہی۔یہ مدوّن ہو کر کتابی صورت میں آ گئی۔فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ (41:3) اب یہ الگ الگ، متمیز، صاف نکھری ہوئی (Distinct) ہے۔یہ ہے تفصیل یا مفَصّل سے مراد نہ کہ (Detailed) تشریحات سے بھرا ہوا بلکہ اس کے الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے۔ایک ایک نگ الگ الگ سمجھ میں آتا ہے۔نگینوں کی طرح جڑے ہوئے الفاظ۔یہ ہے معنی تفصیلاً۔ مُفَصِّلٌ۔کے۔نہ کہ تشریحات سے بھرا ہوا (Detailed)۔

❁❁❁

عقیدۂ تثلیث اور وحدت الوجود یعنی Trinity اور وصال

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ (43:15) یہ جوزبانی خدا کو ماننے والے ہیں۔آؤ تمہیں ان کی مثالیں دیں۔خارجی کائنات کے علاوہ یہ ہیں خدا کو ماننے والے۔یہ اس کے تخلیق کردہ بندوں کو اس کا جز،حصہ (Part) مانتے ہیں۔پارٹ میں بھی وہ بات نہیں ہوتی مگر یہ اس کا جز مانتے ہیں۔جس طرح یہ قلب، یہ جگر، پھیپھڑے، سانس کا عمل، خون، ان اجزاء کے مرکب ہونے سے ایک پیکر بنتا ہے۔یہ خدا کے جزو مانتے ہیں۔

اب اس میں پہلے تو عیسائیت آ گئی۔کہ خدا باپ اور مسیح بیٹا ہے۔بیٹا تو باپ کا جز ہوتا ہے۔گہرائی میں اس کا تجزیہ کریں۔باپ کا ایک حصہ نطفہ کی شکل میں آ کر رحم مادر میں پرورش پا کر بیٹا بنتا ہے۔یہ باپ کا جز ہوتا ہے۔عیسائیت میں باپ بیٹا اور روح القدس یا تثلیث میں مسیح خدا کا بیٹا ''جز'' ہے۔

اب تصوف میں روح انسانی کو خدا کی روح کا جزو قرار دیتے ہیں۔اس اصل روح کو ذات بھی کہتے ہیں۔یعنی ذات خداوندی، وہ اس ذات کا ایک ذرہ ہے۔جو انسانوں کے اندر ہے۔یعنی ذات خداوندی اتنے اجزاء میں تقسیم ہو گئی ہے۔یہ ہے وحدت الوجود۔یعنی وجود تو اس کی ذات کا ہے۔اور انسانوں کے اندر اس کے جزو ہیں۔حصے ہیں۔ان کے خیال میں ہماری روح ہماری ذات مستقل بذات نہیں ہے۔اس کا وجود ہی نہیں ہے۔وجود اس خدا کی ذات کا ہے۔چونکہ یہ انسانی ذات اپنے اصل سے ہٹی ہوئی ہے۔یہاں مادے کی دلدل میں آ کر پھنس گئی ہے۔اب اس نے بھیج دیا تو یہ وہاں تڑپ رہی ہے۔یہ اصل کے ساتھ مل جانے کے لئے بے قرار ہے۔تو اب اس دلدل سے انسان کی ذات جو خدا کی ذات کا جزو ہے۔یہ اس مادی دلدل سے نکل کر پھر یہ جزو اصل کے ساتھ مل جائے۔یہ ہے مقصود ان تمام ریاضتوں اور مشقتوں کا کہ یہ جز (خدا کا) اپنے اصل سے مل جائے۔یہ ان کے ہاں اور دوسری جگہوں پر موت کو وصال کہتے ہیں۔وَصَلَ بِالْحَقِّ یعنی اس کی ذات جو خدا کی ذات کے ساتھ مل گئی یہ خود تو فنا ہو گیا۔باقی اس کی ذات خدا کی ذات میں جا کر مل گئی۔اس کی بقا ہو گئی۔

؎ عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

یہ ہیں مقرب بارگاہ خداوندی۔وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ (43:15) عیسائی تو صرف ایک بیٹے کا کہتے تھے۔مگر

1043
یہاں تو ہر ذات، ہر روح، ہر انسان کے اندر خدا کی ذات کے اجزاء موجود ہیں۔ یہ تو لاتعداد جزو ہیں۔اس لئے کہا گیا اسی آیت میں ''کہ ان کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف تو اس کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ساری کائنات خدا ہی کی پیدا کردہ ہے۔اور دوسری طرف یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ خدا کی اولاد بھی ہے۔حالانکہ جب بھی پیدائش بذریعہ ہوگی تو والد کا ایک حصہ اولاد میں منتقل ہوکر آجائے گا۔جس سے والد ناقص رہ جائے گا۔تو خدا تو اس بلند و برتر ہے کہ ناقص رہ جائے۔اس لئے وہ ''لم یلد ولم یولد''۔اس کا طریقہ تو تخلیق ہے نہ کہ تولید۔

یہی اعتراض اس عقیدہ پر بھی وارد ہوتا ہے کہ انسانی روح، روحِ خداوندی کا حصہ ہے۔جو اپنے اصل سے الگ ہوکر مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔اور اس کا منتہیٰ یہ ہے کہ وہ اپنی اصل سے الگ ہوجائے۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۝۱۰۰ (6:100) انسانی ذات، ذات خداوندی کا جزو نہیں بلکہ اس کی عطا کردہ ہے۔ذات ناقابل تقسیم وحدت ہوتی ہے۔حصوں میں بٹ نہیں سکتی۔

فراق سے پہلے وصال یہ ہے خدا سے مل جانا۔جذب ہوجانا۔اصل کے مل جانے سے پہلے یہ ان کے ہاں مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ان میں وصل کی رات کی طرح ان کے ہاں عرس ہوتا ہے یہ شادی ہے۔عیسائی تصوف میں ''Trinity of God''یونین آف تھری۔باپ، بیٹا اور روح القدس۔راہبات (Nuns) اس دنیا میں شادی نہیں کرتیں۔ان میں سے یا تو یہ مسیح کی بیوی ہوتی ہیں یا خدا کی۔یہ تمام مقربین یا اولیاء جن کے عرس ہوتے ہیں۔شادی خدا کے ساتھ اور وصال پر مرنے کے بعد ہوکر مکمل ہوجاتا ہے۔یہ ہے

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ۝۱۵ (43:15) اس انسان کو دیکھو کہ کس طرح کھلی ہوئی حقیقتوں پر پردے ڈالتا ہے اور اس طرح سے انکار کا ارتکاب کرتا ہے۔

آئینہ مشرق و مغرب اور ملتِ اسلامیہ میں اسلام کا غلط پرچار

اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ۝ (45:7) میں معنی کا سمندر پنہاں ہے

وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ۝ (45:7) اِنَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ وَفِىۡ خَلۡقِكُمۡ وَمَا يَبُثُّ مِنۡ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ۝ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ۝ تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ ۚ فَبِاَىِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤۡمِنُوۡنَ (45:3-6) خارجی کائنات کی گوشہ گوشہ میں بکھری ہوئی یہ آیات اور یہ خدا کی طرف سے قرآن میں دی گئی اقدار، تو ان دونوں کی موجودگی میں پھر کونسی بات رہ جاتی ہے؟ جس کا یہ خدا پر ایمان لانے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ایمان لانے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت پڑ گئی۔ ۱) فطرت کی قوتوں کی تسخیر۔ ۲) قوانین جو وحی کی رو سے قرآن میں دے دئے گئے ہیں۔ ان پر غور و فکر سے ہی موقنین یعنی تحقیق کے بعد یقین حاصل کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ یہ ہیں دو ضروری چیزیں۔ اس کے بعد تو اب کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ انسان تلاش کرتا پھرے۔

مشرق و مغرب کا آئینہ اثیم اور افاک میں مضمر ہے:

وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ۝ (45:7) یہ دو قوموں کا ذکر ہے۔ وحی کی رو سے ان قوتوں کو مسخر کرنے اور ان کا استعمال وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ (13:17) نوع انسانی کی منفعت کے تحت اس کا استعمال یہ ہے دین کا تقاضہ۔ مغرب کی اقوام مومن کے درجہ پر تو نہیں آتیں۔ یہ تو دوسری کی تباہی اور لوٹ کھسوٹ کے لئے ان قوتوں کے حصول علم کو استعمال کرتی ہیں۔ ان کے لئے قرآن نے اَفَّاكٍ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور دوسرا اَثِيۡمٍ ۔ تھکی ماندی، سست رفتا جو دوسری اقوام سے پیچھے رہ جائیں۔ درماندہ، سہل انگار کیونکہ فطرت کے علم کے لئے تو بڑی جد و جہد اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تو جہاد مسلسل ہے۔ یہ اثیم قومیں تو سہل انگار، تھکی اور درماندہ، دوسروں سے بھیک مانگنے والی، دست نگر ایک تو ان کے لئے تباہی اور بربادی ہے جبکہ افاک'' وہ قوم جعل سازی، مکاری اور غلط بیانی سے دوسری کمزور اقوام کا لوٹ کھسوٹ، ان پر تسلط جما لینا۔

ان کے ہاں کی کانفرنسیں، سیمینار، تمام ٹی وی ٹاک شوز اور UNO میں بڑی بڑی خوبصورت تقاریر صرف اپنے ملک کا

مفاد، دوسروں کو مالی اور فوجی لحاظ سے مفتوح محکوم بنا لیتے ہیں۔ اب ایسی دونوں قوموں کے لئے تباہی اور بربادی ہے۔ ایک تو جو آدم کی سطح پر ہی نہیں ہیں۔ جنہوں نے ان قوتوں کا علم حاصل نہیں کیا۔ تو وہ اقوام علم سے پیچھے رہ گئیں اور دوسری یہ مغربی اقوام جو اس علم کو اپنے ابلیسی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہیں۔ ان دونوں کے لئے تباہی ہے۔

خود ساختہ نظریات پر مبنی اسلام کا پرچار اور ملتِ اسلامیہ میں:

قرآن کا پرچار ان مسلمانوں میں خود ساختہ تصورات پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ قرآن پر تدبر و غور تو اس نے ترک کر دیا ہے۔ يَّسۡمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتۡلٰى عَلَيۡهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝٨ (45:8) یہ کیفیت ہے ان مسلمانوں کی کہ قرآن کی تلاوت ہوتی ہے سنا ہے کہ بڑا چرچا ہوتا ہے۔ قرآن کا سنتے ہیں مگر بضدر ہتے ہیں۔ اپنی روش پر نہایت بڑھائی کے عالم میں، مگر روش اس کے مطابق نہیں کرتے۔ یہ سنا تو نہ سنا ہو گیا۔ جبکہ مومن کا شعار تو سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا (2:285) ہوتا ہے یعنی سن کر اس کے مطابق عمل کرنا۔ مگر سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا ۚ (45:8) ان کے لئے دنیا میں فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝٨ (45:8) ان کے لئے دردانگیز تباہی ہے۔ وَاِذَا عَلِمَ مِنۡ اٰيٰتِنَا شَيۡـئَا ۨاتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ؕ۝٩ (45:9) اور اگر ان میں سے کسی بات کا علم ہو جائے تو اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے تو تباہی اور ذلت آمیز تباہی ہے ان کے لیے مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغۡنِىۡ عَنۡهُمۡ مَّا كَسَبُوۡا شَيۡـئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡلِيَآءَ ۚ (45:10) پھر نہ تو سرپرست بحری بیڑہ آ کر ان کو بچا سکتے ہیں اور نہ ان کے حاصل کردہ کمائیاں ان کے کسی کام آتی ہیں تباہی کے وقت۔

زندگی بھر مومن کا فریضۂ حیات:

قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (45:14) اعلان کر دے کہ ان کا یہ دینی فریضہ ہے يَغۡفِرُوۡا لِلَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ اَيَّامَ اللّٰهِ (45:14) جو اس آنے والے انقلاب پر یقین نہیں رکھتے۔ تمہارا یہ فریضہ ہے کہ ان کو بھی بچاؤ۔ اللہ اکبر! کیا یہ کسی کے دست نگر ہو سکتے ہیں۔ لِيَجۡزِىَ قَوۡمًۢا بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝١٤ (45:14) جن کو ان کے جرائم کا بدلہ مل کر رہے گا۔ اور صرف اس نرالی قوم کے ہاتھوں۔

❁❁❁

شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ (45:18) شریعت یا واضح راستہ۔یعنی وہ راستہ جو پانی کے گھاٹ کی طرف جائے۔یعنی پانی سے مراد حیات آور۔زندگی بخش،یعنی زندگی عطا کرنے والا۔اگلی خصوصیت کہ وہ پانی بہتی ہوئی ندی کی طرح ہو،کھڑا نہ ہو،کھڑا ہو تو اسے کریعۃ کہتے تھے۔جس پانی میں حرکت ہو،روانی ہو،ایک مقام پر کھڑا نہ ہو۔دین کے اصول تو ندی کے ساحل کی طرح غیر متبدل جبکہ جزئیات اور قوانین وہ ہر زمانے کی اسلامی مملکت خود مدوّن کرے گی۔زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اقدار کی حدود کے اندر،یعنی ان میں حرکت،روانی رہے گی۔اب یہ تمام ہزار سالہ فقہی قوانین تو شَرِيْعَةٍ،نہیں ہو سکتے یہ تو کَرِيْعَةٌ ہیں۔یہ تو زمانے کے ساتھ چل نہیں سکتے۔یہ تو لفظی اعتبار سے بھی شریعت نہیں کہلائے جا سکتے۔لفظ کے انتخاب کے اعجاز پر غور کریں۔

اصول تو نوحؑ سے لیکر رسول ﷺ تک غیر متبدل ہیں۔مگر جزئیات زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہر دور میں بدلتے جاتے تھے۔اس لئے مشاورت کا حکم دیا گیا۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ (3:159)

یہ مشاورت اس پانی کو رواں دواں رکھنا تھا۔ہزار سالہ انسانوں کے بنائے ہوئے تو ان سے تو بو آ رہی ہے۔یہ تو ناممکن العمل ہیں۔ان کی بناء پر تو اسلام کو چلا ہوا کارتوس کہتے ہیں۔

پوری انسانیت کے لیے واضح دلائل، بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ:

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ (45:20) پوری انسانیت کے واضح دلائل۔ان کو دلائل سے قائل کرو تاکہ یہ اس ہدایت پر آ کر تمہارا حصہ بن جائیں۔اور جسمانی اور اگلی زندگی کی نشوونما پا سکیں۔آج مغرب کے مفکرین،دانشور اور سائنسدان کے سامنے اگر اسلام پیش کرنا چاہیں تو ان سے اگر اونچا نہیں تو کم از کم اس سطح کا ذہن تو ہونا چاہئے۔دلائل ایسے ہوں جو ان کے باطل دلائل کی تردید کریں۔ان کی جگہ بالاتر دلائل سے منوایئے۔یہ تو دلائل کا دور ہے علم

وحکمت عام ہوگئی ہے۔وہ تو ہر شے کا ''Why of it'' پوچھتے ہیں۔اسلام تو جواب ہی کیوں کا دیتا ہے۔اس سے مطمئن کراتا ہے۔''کیوں'' پوچھنے والی قومیں تو اسلام سے بہت قریب ہوتی ہیں۔یہاں پوچھو تو کہتے ہیں کہ کیا یہ چیز پہلے بھی کسی نے کہی تھی۔یعنی اگر کسی نے نہیں کہی تھی تو ہم بھی نہ کہیں کیونکہ پہلے جو کسی نے نہیں کہی۔تم نے تو پہلے بھی جبر واستبداد سے ان ہزاروں سکالروں کو کچھ کہنے نہیں دیا۔اگر یہ نہ کرتے تو ہم کہہ سکتے تھے۔کہ ہاں انہوں نے یہ بات کہی تھی۔لیکن جہاں یہ دلیل دی جائے کہ کیا پہلے کسی نے کہا تھا کہ زمین گول ہے۔نہیں کہا تھا تو پھر کیسے گول ہوسکتی ہے؟جیسی نظر آرہی ہے۔سارے سائنسدان تحقیق حقہ کے بعد یہ کہہ رہے ہیں۔یہ تو پہلے نہ کہنا شریعت تو نہ ہوئی کریعت ہوگئی۔

زمانہ تو تیزی سے آگے بڑھتا جارہا ہے۔اس کے تقاضے بھی تبدیل ہورہے ہیں۔یہ دین تو قیامت تک کے لئے دیا گیا ہے۔اس میں تو ہوسکتا ہے کہ تمام بڑھتے ہوئے تقاضوں کا دلائل سے حل بتائے۔

ان دوگروہوں کا تفاوت حیات وموت:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ (45:21) کیا ان دونوں گروہوں کی زندگی اور موت ایک ہوجائے گی۔موت بھی کہا، یہ دونوں ایک جیسی نہیں ہوسکتیں۔عام طبعی طور پر صحیح راستے پر چلنے والا صحت کے اصولوں پر قائم رہنے والا، احتیاط برتنے والا اور ایک بے احتیاط انسان کی صحت ایک جیسی ہوسکتی ہے؟ نہ ان کی زندگی اور نہ موت ایک جیسی ہوسکتی ہے۔تو کیا غلط روش والے، ناہمواریاں پیدا کرنے والے، صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والے اور جو ہمارے قوانین کی صداقت پر چلنے والے۔تو کیا ان کو یہ گمان ہے کہ ان کی موت اور زندگی یکساں ہوگی۔صورت حال تو یہی بتا رہی ہے کیا یہ مغربی اقوام سیکولرزم والے اور ہم مسلمانوں کی زندگی ایک جیسی ہے۔ذرا موت بھی ان کا جنازہ اور قبرستان ذرا دیکھیں اور ہماری حالت دیکھیں۔ہم محکوم، پست اور ذلیل جبکہ وہ غالب اور حاکم۔وہ ہمارے ان داتا ہر شعبہ خود دیکھتے جایئے اور پھر تقابل کریں۔یہ تو بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ ہے جو قوم بھی اس پر عمل پیرا ہو گی۔ان قوانین کے مطابق چلے گی۔ان کی زندگی اور موت ان جیسی نہیں ہوگی۔غالب آنے کی زندگی یہ ہے

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ (45:22) ٹھیک ہے طبعی زندگی کے تمام فوائد، اجناس، پھل، پٹرول، گیس یہ سارا کچھ اس سے محنت کے مطابق ملتا ہے۔لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ تمہارا کوئی عمل بے نتیجہ نہ رہ جائے۔کائنات کی ساری گردش بارش، حرارت، ہوائیں تمام محو گردش ہیں کہ ایک ایک دانہ ہزار ہزار دانوں میں تبدیل ہوجائے۔سامان زیست کے حصول تک تو بات سمجھ میں آرہی ہے۔لیکن یہ خارجی کائنات انسانی اعمال کے نتائج میں کس قدر ممد ومعاون ہورہی ہے۔کہ ظلم وزیادتی کرنے سے تباہی آئے گی۔ابھی علم انسانی اس تک نہیں پہنچا۔ایرک فرام

کہتا ہے کہ یہ تعلیم علم نہیں ہے۔ یہ تو صرف معلومات ہیں۔ علم تو تحقیق کا نام ہے۔ ابھی اس پر بھی تحقیقات ہو رہی ہیں۔ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ (45:22) کہ تخریبی اعمال کا نتیجہ اگر نہ نکلا تو یہ ظلم ہوگا۔ خارجی کائنات کی گردش اس لئے کہ ظلم نہ ہونے پائے۔

علم کے باوجود پھر تباہی اور قرآنی حل:

جتنا علم بڑھ رہا ہے۔ اتنے ہی تباہی کے امکانات بڑھ رہے ہیں۔ ساری دنیا چیخ رہی ہے۔ اگر کسی فرد یا قوم کے علم کی بنیاد یہ ہو وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ (13:17)۔ جو پوری انسانیت کے مفاد میں ہو جبکہ یہ قومیت کے بت ان کو امۃ واحدۃ بننے نہیں دیتے۔ یہ کیوں؟ اَفَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ (45:23) ہر فرد اپنے اپنے مفاد کے تابع چلے تو ٹکراؤ ہوگا۔ اتنے علم کے باوجود وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ (45:23) تنہا علم کافی نہیں ہے۔ یہ تو مسافر کا زادِ راہ ہے۔ اس کا توصحیح راستہ پر چلنا ضروری ہے۔ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) جب اغراض ومفادات غالب آجائیں تو نہ سنائی دیتا ہے، نہ دکھائی اور نہ دماغ صحیح سوچنے دیتا ہے۔

یہ ہے کفر، سیکولرزم اور جس کو نہ تو مکافاتِ عمل کا ڈر ہو تو پھر جس کی لاٹھی اسی کی بھینس۔ خون نچوڑ کر ساری آسائشیں مہیا ہیں۔ ایک ہی چیز اسے روک سکتی ہے۔ کہ زندگی آگے بھی چلتی ہے۔ اور ایک ایک چیز کا نتیجہ سامنے آئے گا۔

وَقَالُوۡا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا نَمُوۡتُ وَنَحۡيَا وَمَا يُهۡلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهۡرُ (45:24) کہاں کی دوبارہ زندگی اور کہاں کا مواخذہ؟ وَمَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ (45:24) اب علم کی بارگاہ سے ان کو یہ علم مل رہا ہے۔ کہ زندگی صرف جسم کی زندگی نہیں ہے۔ اس آگے بھی زندگی ہے۔ قُلِ اللّٰهُ يُحۡيِيۡكُمۡ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يَجۡمَعُكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (45:26) وہ اولیں زندگی تو Inanimate مادہ سے ملی تھی۔ یہ کائنات کیسے وجود میں آگئی۔ تمہیں تو علم نہیں ہو سکا۔ اس مادہ غیر ذی حیات میں زندگی کیسے آگئی۔ تو جو اس طرح زندگی پیدا کر سکتا ہے۔ تو مرنے کے بعد چاہے چورا چورا ہو جاؤ۔ تو کیا اس کے لئے مشکل ہے کہ اس میں سے دوبارہ زندگی پیدا کر سکے۔ آج تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ''Matter is Immortal'' کبھی فنا نہیں ہوتا۔ صرف حالتیں بدلتا ہے۔ تو کیا اس کے لئے ناممکن ہے جس کا اقتدار ساری کائنات میں ہے۔ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (45:27) اس کو ہر قسم کا اقتدار اور قوت حاصل ہے۔

ہم موجودہ مسلمان مُبۡطِلُوۡنَ ہیں

وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَيَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يَوۡمَئِذٍ يَّخۡسَرُ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۲۷﴾ (45:27)

الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۲۷﴾ (45:27) باطل سے ہے۔ایک تو کفر ہے کہ مانتے ہی نہیں ہیں۔ایک وہ جو کھوٹی اور فریب پر مبنی چیز کو حق بنا کر پیش کریں۔تو ایسی روش زندگی والے "الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۲۷﴾" (45:27) کہلاتے ہیں۔یہ اعلان جو ہم کرتے ہیں کہ زمین پر اس کا اقتدار ہے تو کیا کرہ ارض کے کسی گوشہ پر جہاں مسلمان ہیں جو ان آیات کا اعلان کرتے ہیں کیا خدا کی حکمرانی ہے؟ یہ اعلان تو جھوٹی بات کو سچ کہہ کر پیش کر رہے ہیں۔

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لاالہ را

یہ ہیں وہ لوگ جو دعویٰ تو کرتے ہیں مگر زندگی اس کے خلاف گزار رہے ہیں۔

بچے کو دودھ پلانے کی مدت کا معاملہ، بخشش اور نظریہ ارتقاء

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ (46:15)

تمہاری ماں نے جب تم رحم مادر میں ابھی جنین کی حالت میں تھے کس قدر تکلیف برداشت کی۔ مشقت اور اذیت سے گزری۔ اور وضع حمل میں بھی اور پھر کتنے عرصہ تمہیں خون جگر سے دودھ پلاتی رہی۔ تمہارا وجود تو اس کا رہین کرم ہے۔ کم از کم اس کے احسان کا بدلہ چکاؤ۔ یہاں ضمناً حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ یعنی اڑھائی سال دی گئی ہے۔ دوسری جگہ دودھ پلانے کے لئے دو سال مقرر کئے ہیں۔ چوبیس ماہ تو یہ ہوئے۔ اگر حمل کے مہینے 9 ملائے جائیں تو تیس نہیں بنتے۔ قرآن نے چوبیس ماہ اور 2 سال بتائے ہیں۔ وہ لازمی بات نہیں ہے کہ ماں یقینی طور پر 2 سال تک دودھ پلائے یا اس سے زیادہ عرصہ نہ پلائے۔ قانونی تقاضہ یہ بتایا ہے کہ طلاق کی صورت میں دودھ پلائی باپ پر لازم آتی ہے۔ تو یہ قانونی حد وہاں مقرر کی گئی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ دو سال کا عرصہ ہے۔ اگر دو ہی سال لئے جائیں تو یہاں بھی كُرۡهًا کی بات ہے۔ قرآن نے دوسرے مقام پر حَمۡلًا خَفِيۡفًا (7:189) کہا ہے۔ پھر حَمۡلًا ثَقِيۡلًا۔ خفیف جو بوجھل نہیں ہوتا۔ اس میں مشقت نہیں ہوتی۔ عورت کام کاج کرتی رہتی ہے۔ یہ قریباً تین ماہ تک ہوتا ہے۔ پھر وہ ثقیل ہوتا ہے تو وہاں كُرۡهًا کی بات آجاتی ہے۔ اور یہاں كُرۡهًا سے مدت مقرر کی ہے۔ تو یہ تو چھ ماہ کی مدت ہوتی ہے۔ تو چھ ماہ اور دو سال ادھر کے ملا کے تیس ماہ پورے ہو جاتے ہیں۔ کہ کوئی قرآن کا فریضہ نہیں ہے کہ دو ہی سال کے لئے دودھ پلایا جائے۔ نہ اسے سے کم اور نہ زیادہ کیا جائے۔ وہ تو ان مراحل کی مشکلات کا ذکر کیا ہے جو ماں بچہ کے لئے قدم بہ قدم برداشت کرتی جاتی ہے۔ جب یہ چالیس برس کا ہوتا ہے، خدا پرست بچہ ہے۔ دعا مانگتا ہے۔

شفاعت اور بخشش اور نظریہ ارتقاء:

قَالَ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىهُ وَاَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ اِنِّیۡ تُبۡتُ اِلَیۡكَ وَاِنِّیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۵﴾ (46:15) وہ توفیق طلب کرتا ہے کہ تیرے احکام کی طرف رجوع کروں تو

قرآن یوں جواب دیتا ہے اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ (46:16) تجاوز سے مراد ''مواخذہ نہ کرنا۔ آگے بڑھ جانا'' جسے ہم عام طور پر معاف کرنا کہتے ہیں۔ یعنی ان کی لغزشوں کو درگزر کر کے اسے معاف کر دیتے ہیں۔ ان کے حسن عمل کو شرف قبولیت بخشتے ہیں۔ یہ معافی کا تصور بڑا تباہ کن ہے۔ اگر سفارش رسول ﷺ کی طرف سے اور سَیّٰات کو مجموعی طور پر خدا معاف کر دیتا ہے۔ تو مکافات عمل کا قرآنی تصور تو دھڑام سے نیچے گر گیا۔ معافی، بخشش اور سفارش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں تو ہر عمل نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نگاہ کی خیانت اور دل میں گزرنے والا خیال بھی اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یہ ہے زندگی کا بنیادی اصول کہ ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (99:7-8) عمل کا ایک ایک ذرہ تل کر سامنے آجائے گا تو پھر اسی سے تجاوز کرنا۔ نظر انداز کرنا تو تضاد ہو گیا۔ یہ غور طلب اور اہم مسئلہ ہے۔ کائنات میں قانون ارتقاء جاری و ساری ہے۔ ہر شے اپنے نقطۂ آغاز سے آگے بڑھتی ہے۔ مختلف منازل سے گزرتی ہوئی ہر منزل میں اس کا ٹکراؤ تخریبی قوتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر اسی شے کی تعمیری صلاحیتیں قوت مدافعت زیادہ ہے تو تخریبی قوتوں کو شکست دیکر زندہ بھی رہتی ہے اور اگر صلاحیت ہے تو آگے بھی بڑھتی ہے۔ اور آگے بڑھ کر ارتقائی اگلی منزل میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس طرح منزل بہ منزل تخریبی عناصر کو شکست دیتی ہوئی، وہ آگے بڑھتی بڑھتی اپنی مقرر کردہ منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ جو کچھ اسے بننا ہوتا ہے بن جاتی ہے۔ یہ ہے قانون ارتقاء۔

تعمیری قوتوں اور تخریبی قوتوں کے پلڑے اور نجات کا گمراہ تصور:

انسان کی طبعی جسم میں ہر سانس میں کروڑوں جراثیم پہنچتے ہیں۔ اگر قوت مدافعت نہ ہو تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن تعمیری قوتوں کا پلڑہ بھاری ہوتا ہے جبکہ تخریبی قوتوں کا ہلکا تو تعمیری قوتیں غالب آجاتی ہیں۔ تو انسان تندرست رہتا ہے۔ اگر تعمیری قوتیں کم ہو جائیں تو مدافعت کم ہو کر تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں۔ تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ عارضی طور پر ہوا ہے تو اس کا علاج یعنی تو اندر کی قوت کو بڑھایا جاتا ہے۔ اگر بیماری میں یہ قوتیں کمزور پڑ گئیں۔ تو بالآخر موت انجام ہے۔ اس وقت یہ نہیں ہوتا کہ اندر کوئی تعمیری قوت نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے مگر نہایت کمزور جو تخریبی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کا ٹکراؤ ہر آن، ہر سانس میں ہوتا ہے۔ خارجی کائنات میں بھی اور انسانی جسم میں بھی۔ قرآن کا ایک بہت بڑا اعلان وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ (55:7) ترازو کھڑا ہے۔ دو پلڑے ہیں۔ ایک تعمیری قوتوں کا اور دوسرا تخریبی قوتوں کا۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (101:6-9)

یہ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ (101:6) اور خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ (101:8) یہ ہے قانون ارتقاء۔ یہ نہیں کہ جس کا تعمیری قوتوں کا پلڑہ جھکا ہوا ہو تو تخریبی قوتوں یا لغزشوں کی کوئی ایک رمق بھی اس میں نہیں ہوتی۔ وہ تو موجود ہیں مگر وزن تعمیری قوتوں کا

1043 زیادہ ہوتو ہے۔تو وہ ان تخریبی قوتوں کوشکست دے دیتی ہیں۔ یہ ہے موازین کی بات قرآن نے جو کہی ہے۔انسانی ذات بھی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی جہان نو کی طرف گامزن ہے۔جس طرح جسم کی کیفیت ہے اس کے علاوہ انسانی ذات یا نفس بھی ہے۔انسان کا اصل مقصود اس قانون ارتقاء میں اس کی ذات کی نشوونما اور پرورش میں ہے۔انسان کا ہرعمل طبعی زندگی سے متعلق نہیں بلکہ اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس کے بھی پلڑے ہیں۔اعمال صالحہ تو انسانی ذات کی نشوونما کرتے ہیں۔جبکہ عمل شر سے ذات میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔مرنے کے بعد اگر تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری ہے تو ارتقا کی اگلی منزل جنت ہے۔اور جس کا پلڑا ہلکا ہوتو اس کی خودی میں ضعف ہوتا ہے۔اس کا ارتقاء رک کر جمود میں آجاتا ہے۔اسے جہنم یا جحیم کہتے ہیں۔یعنی سلسلۂ ارتقاء روک دیا گیا۔یہ فزیکل یا کائناتی زندگی میں سائنس کے انکشافات بڑے محیّر العقول ہیں۔مختلف جانداروں کی انواع جو رک گئی ہیں۔ان کے کروڑوں سالوں کے ڈھانچے تو ملے ہیں مگر ان کا وجود نہیں ملتا۔یہ قوت مدافعت کم ہونے کی وجہ سے مقابلہ نہ کر سکیں۔وہ فنا ہوگئیں کچھ ایسی جو زندہ ہیں مگر اسی شکل کے اندر آگے نہیں بڑھ سکیں۔یہ تمام پرندے، چرندے اور مویشی یہ لاکھوں سال پہلے بھی اس طرح تھے۔آگے نہ بڑھ سکے۔زندہ ہیں یہ جحیم میں ہیں۔انسان کی بھی یہی کیفیت ہے۔

مختلف مذاہب میں سیّأت کے نتائج سے نجات کا تصور (Salvation) اور لازمی مضمون کی ضرورت:

جو قوتیں انسانی ذات کی نشوونما کرتی ہیں ان کو قرآن حسنات کہتا ہے۔اور تخریبی قوتوں کو سیّأت۔اب پلڑوں کی بات۔ترازو کے پلڑوں کی بات۔جس کا تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری ہوتو وہ آگے چلی جاتی ہے تو وہ جنت والوں کا دوسرا لغزشوں کا پلڑا خالی نہیں ہوتا۔یہ ایک جدید سائنٹفک تصور قرآن نے دیا ہے۔جبکہ دیگر مذاہب میں نجات کا تصور ہے۔یہ نجات اسے حاصل ہوتی ہے جو بالکل معصوم ہو۔ہندودھرم میں تو جون کا چکر ہے۔کروڑوں چکر دینے کے بعد اگر کوئی آلائش نہ ہوتو اس کو نروان (نجات) ملتی ہے۔شرط یہ ہے کہ آلائش نہ ہو۔عیسائیت میں تو ہر بچہ اپنے اولیں ماں باپ کی آلائشوں کا بوجھ لے کر آتا ہے۔اب اس آلائش کے بغیر تو جنت میں جایا نہیں جاسکتا کیونکہ معصوم ہونا چاہئے۔اب اس کے لئے عیسیٰؑ کے کفارے پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔انہوں نے آلائش دھونے کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا۔قرآن تو اسے فطرت کے خلاف سمجھتا ہے۔یہ جذبات میں نہیں آتا۔باقی سارے مذاہب جذبات پر مبنی ہیں۔اب اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (11:114) حسنات سیّأت کا ازالہ کردیں گے۔سائنس کا قانون ارتقا اس نکتہ کو بیان کرتا ہے کہ تعمیری قوتیں اگر زیادہ ہوں تو تخریبی قوتوں کا ازالہ ہوجاتا ہے۔تو چھوٹی موٹی تمام لغزشوں کو تخریب نہیں پیدا کرنے دیتیں۔چونکہ تعمیری قوتیں زیادہ وزنی ہوتی ہیں تو وہ ہلکی سی تخریب کا ازالہ ہوجاتا ہے۔یہ معافی یا بخشش نہیں ہے۔یہ قانون کا تقاضا ہے۔بشرطیکہ تعمیری قوتیں جن کو نیکی کہتے ہیں۔ان کا پلڑہ بھاری ہو۔یہ جو

1043
نَتَقَبَّلُ عَنۡهُمۡ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا وَنَتَجَاوَزُ عَنۡ سَيِّاٰتِهِمۡ (46:16) بہترین حسن عمل کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔تو یہ سیّاٰت چھوٹی موٹی لغزشیں جو ہلکی ہوتی ہیں مقابلۃ یہ حسنات ان کا ازالہ کر دیتی ہیں۔اس میں نہ سفارش ہے اور نہ بخشش کا تصور ہے۔

خسارے میں رہنے والے:

اب یہ چیز جو دل میں شبہ ڈالدی قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا (18:103) آؤ ان کی بابت بھی بتائیں جو بے حد خسارے میں رہتے ہیں۔یہ نہیں کہ وہ اچھا کام کرتے ہی نہیں ہیں۔کام تو کرتے ہیں مگر اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا (18:104) یہ دنیاوی مفادات کا کام کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهٖ (18:105) اگلی زندگی پر اور مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے۔ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا (18:105) ان کے لئے تو میزان بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔اب شک ہو گیا یہ تو تضاد ہے۔فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ (99:7) والی آیت سے۔یہ کون ہیں؟ جبکہ ان کے لئے میزان تک کھڑی نہیں ہو گی۔ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔یہ بڑا غور طلب ہے تو پھر ذرہ ذرہ کیسے سامنے آئے گا۔یہ اس مثال سے سمجھ میں آئے گا کہ جو لازمی مضامین (Compulsory) میں فیل ہو گیا اور اختیاری (Optional) میں چاہے بہت مارکس لے لے تو اس کے باقی پرچے دیکھے ہی نہیں جاتے۔

لازمی مضمون:

اس قانون ارتقاء کے تحت ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ (101:6) اور خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ (101:8) پر جس نے 60 فیصد مارکس لے لئے اور 40 فیصد غلطیاں بھی کیں تو وہ اگلی کلاس میں پروموٹ ہو جائے گا۔کیونکہ 60 فیصد تعمیری اعمال نے 40 فیصد لغزشوں کا ازالہ کر دیا ہے۔اس لئے وہ زندگی کے اگلے دور میں داخل ہو جائے گا۔اور جو لازمی مضامین میں فیل ہو گیا تو فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ (18:105) اس کی ساری محنت اکارت گئی۔فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا (18:105) اس کے لئے میزان کھڑی ہی نہیں کی جائے گی۔دوسری مثال اگر کسی کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت ہو جائے تو اس نے کتنے ہی شاندار کارنامے سرانجام دیئے ہوں، رفاع عامہ کے کام کئے ہوں تو اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا ایک بغاوت کا جرم اس کے باقی سارے کام کو بہا کر لے جاتا ہے۔فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ (18:105)۔یہ ہے جن کے لئے میزان تک نہیں کھڑی کی جائے گی۔

قرآن کے نزدیک وہ لازمی مضامین توحید ہے کہ حق حکومت صرف خدا کا ہے۔یعنی اس کی کتاب کی حکمرانی، اگر اس کے ساتھ کسی انسان کی حکومت یا قوانین شامل ہو جائیں تو یہ شرک ہے، بغاوت ہے جو ظلم عظیم ہے۔کائنات کے اٹل قوانین اس کی تائید کرتے ہیں۔قرآن مومنوں کے متعلق بھی کہتا ہے کہ وہ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ (53:32) سے اجتناب کرتے ہیں۔اِلَّا اللَّمَمَ (53:32) چھوٹی

1043
موٹی غلطی، ملامت والی بات اگر سرزد بھی ہو جائے تو ان کا حسنات کا پلڑا اتنا وزنی ہوتا ہے کہ ان کے ۶۰٪ مارکس ان کے تخریبی پلڑے کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (11:114) مدافعت کی قوت ہلاکت خیز جراثیم کو تلف کر دیتی ہے۔ ان تمام نوع میں جو آگے بڑھی ہیں تخریبی قوتیں بھی تھیں۔ کوئی نوع بھی ایسی نہیں ملی کہ جس میں کوئی بھی تخریبی قوت نہ ہو اور وہ آگے بڑھ گئی ہو۔ یہ شرط ہی ایسی ہے کہ پوری نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے ان حقائق کو سامنے رکھ کر نجات وسعادت کا قانون دیا ہے۔

ثواب کا قرآنی مفہوم:

خدا سے بغاوت ہو اور حق حکومت انسانوں کو دے دیا ہو شرک کا ارتکاب کر کے سمجھا جا رہا ہے کہ نماز وروزہ و حج وزکوٰۃ وغیرہ بڑے بھاری نیک کام کر رہے ہیں۔ اور تلاوت کر کے اپنے ذہن میں تو ثواب کا ایک انبار لیے ہوئے ہیں۔ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ (18:104) خدا کی بغاوت کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں پہلی شرط کہ لازمی مضامین میں پاسنگ مارکس تو اختیاری مضامین کے نمبر ایڈ کر کے پھر ڈویژن مرتب ہوتی ہے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ (46:19) اگر لازمی مضمون میں فیل ہے تو نہ آپشنل میں اور نہ لازمی کے نمبر ملتے ہیں تو ان کے لئے میزان ہی کھڑی نہیں ہوگی۔

جو اس نظریہ پر یقین نہ رکھیں تو ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور جو لازمی مضمون پر ایمان نہیں لائے۔

قرآن ہے اس میں افسانہ نہیں ہے۔ بخشش اور معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہے۔ اب اس نتیجہ کے لئے قانون ہے قرآن سے پہلے ہزار سال سے یہ مسلّم تھا کہ جب تک بخشش نہ ہو سفارش نہ ہو، کفارہ نہ ہو، معافی نہ ہو، جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے اسے خلاف فطرت قرار دیا۔ کہا کہ حسنات کا پلڑا بھاری ہونا چاہیے۔ اگر شرک کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ اگر کسی عمل کا نتیجہ اس زندگی میں نہیں ملتا تو زندگی تو جوئے رواں ہے۔ میں ان اعمال کے نتائج آگے لے کر چلونگا۔ اور فیصلہ پلڑوں کا ہوگا۔ نہ سفارش اور نہ بخشش۔ یہ تو باطل نظام میں سفارش اور ان چیزوں کا چال چلن ہوتا ہے۔ ہم نے ان باطل نظام کے اصولوں کو اپنے دین پر منطبق کر لیا کہ معافی بھی ہو سکتی ہے۔ جانے دو۔ بخشش بھی ہے۔ سفارش بھی ہے۔ اس لئے تو رشوت، ظلم و بربریت عام ہے۔ یہ نذرانے دے کر بخشش کرواتے ہیں۔ اس کے قانون میں اس قسم کی گنجائش نہیں ہے۔ خدا بننا تو جچتا ہی اس کو ہے۔ جس میں جذبات نہ ہوں اور فیصلے صرف قانون کی رو سے ہوں۔ وَنَتَجَاوَزُ عَنْ (46:16) کہ اس کا تعمیری پلڑا اتنا بھاری ہے کہ اس نے تخریبی پلڑا کا ازالہ کر دیا۔ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ (46:16) یہ وعدہ جو ان سے کیا گیا تھا اسے سچا پائیں گے۔ 60 فیصد پاسنگ مارکس لازمی مضامین پاس ہوں تو اور آل (Overall) 60 فیصد مارکس۔ کوئی سفارش نہیں۔ کسی کا کوئی پرچہ گم نہیں ہوگا۔ ایک ایک لفظ میں حقائق کی دنیا مضمر ہے۔

کیا اچھے کام کرنے والے غیر مسلم جنت میں جائیں گے؟

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٩﴾ (46:19) ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور کسی پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ اور مدارج کا تعیّن بھی اعمال کے ذریعہ کیا جائے گا۔ ایسا معاشرہ قرآن یہاں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ یعنی پروموشن وغیرہ کا تعیّن اعمال سے ہوگا۔ اور جو آخرت سے انکار کرتے ہیں تو وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ (46:20) چونکہ انہوں نے طبعی زندگی کی آسائیشوں کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔ وہ تمہاری طبعی موت کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ اب جن لوگوں کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ وہ کون لوگ ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مسلم بڑے بڑے نیک کام کرتے ہیں۔ یتیم خانے، ہسپتال، کنویں، ہندو گھوڑوں کو پانی پلانے کے لئے پیاؤ تک بناتے تھے۔ اگر وہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ ان نیک کاموں سے اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔ تو اس کا جواز صحیح ہے مگر جو ایمان نہیں رکھتا تو وہ کیوں کرتا ہے؟ یہ معاشرہ میں شہرت اور عزت یا اپنا اطمینان حاصل کرنے کے لئے یہ سب کرتا ہے۔ اس کا جذبۂ محرکہ معاشرے میں عزت و تکریم اور شہرت کا حصول ہے۔ ان خیراتی ہسپتالوں اور دیگر رفاعی اداروں میں ان کی تختیاں لگی ہیں۔ جذبۂ محرکہ وہی شہرت کا حصول ہے اس لئے اسے یہ جواب دیا گیا کہ تم نے جو اچھے کام کئے تو جو صلہ تم چاہتے تھے وہیں مل گیا۔ مرنے کے بعد تو تم بھی تمہارے عقیدے کے مطابق ختم ہو گئے۔ تمہارے اعمال وہیں ختم ہو گئے۔ قرآن اس طبعی عمر اور زندگی میں فرق کرتا ہے۔ اس لئے تو زندہ انسانوں سے کہتا ہے اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (8:24) زندگی اصل حیات ہے۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ (29:64) جن پر ان طبعی قوانین کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جب چلتے پھرتے زندہ انسانوں کو زندگی کی طرف بلاتا ہے تو یہ عمر اور زندگی میں فرق کرتا ہے۔ زندگی تو حسن عمل سے ترتیب پاتی ہے۔ اور وہ حسن عمل ساتھ جاتے ہیں۔ تو جو اسے نہ مانے تو اس کے سارے اعمال عمر کے ساتھ ہوتے ہیں۔ عمر ختم ہونے کے ساتھ اس کے سارے اعمال بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اچھے کاموں کا خوب ڈنکا بجا۔ عزت و شہرت ملی مگر یہ زندگی تو نہیں ہے اس کا صلہ وہیں عمر کے ساتھ اَذْهَبْتُمْ (46:20)۔ خود ہی ضائع کر دیا۔ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿٢٠﴾ (46:20) دنیا میں بڑائی حاصل کی۔ الحق کو چھوڑ کر۔ تعمیری نتائج پیدا کئے بغیر۔

دوزخ کا حقیقی تصوّر اور جنّت کا معاشی نظام اس دنیا میں

جو سیدھی شاہراہ پر چلنے والا ہے تو ان کا معاشرہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ط (47:15) وہاں کی جنت اور دوزخ کو مثال کے ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ تمثیلی انداز میں۔ یہاں وہ محسوس شکل میں ہوگی۔ جبکہ وہاں وہ مثالی چیز (Abstract) غیر محسوس ہوگی۔ آگے کہا فِیْهَآ اَنْهٰرٌ (47:15)۔ اب یہ قرآن معاشی نظام کی ایک جھلک بتا رہا ہے۔ فِیْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ج (47:15) ندیوں کا پانی رواں دواں ہے جس میں بو، سڑاند نہ ہو۔ جس پانی کی روانی بند ہو جائے تو کچھ دنوں بعد اس میں تغیر آ کر بدبودار، سڑاند اور ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ اگر وہی پانی بہتا چلا جائے تو صاف مصفّٰی اور شفاف ہوتا ہے۔ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ج (47:15) دودھ کی نہریں بھی رواں دواں تا کہ اس کا ذائقہ بدل نہ جائے۔ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ج (47:15) انگور کا رس بھی ایسا کہ رس کا بہاؤ رواں دواں ہو نہر کی طرح۔ ایسی شراب جس میں نشہ اور مستی نہ ہو۔ بلکہ سرور ہو۔ کیونکہ انگور کے رس کو روک کر، بند کر کے اس میں نشہ پیدا ہوتا ہے اگر وہ انہار کی شکل میں بہتا رہے تو اس میں نشہ یا سرمستی نہیں پیدا ہوتی۔

وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی ط (47:15) بہنے والا شہد صاف وشفاف۔ تمام ملاوٹوں سے پاک۔ وَلَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (47:15) تمام قسم کے آسائش۔ پھل۔ قرآن نے چار چیزیں بتائی ہیں۔ اپنے اپنے ادراک کے مطابق اس کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ پانی پر زندگی کا دارومدار ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ط (21:30) جہاں پانی ہوگا تو وہاں زندگی ہوگی۔ پانی بہنے والا ہونا چاہئے۔ اگلی شے نشوونما کی ہو اور وہ دودھ ہے۔ جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔ اس سے نشوونما ہوتی ہے۔ تیسری چیز پھلوں کا نچوڑ جس میں توانائی ہوتی ہے۔ جس میں نشہ نہ ہو بلکہ سرور ہو۔ اگلی شے شہد فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط (16:69) یعنی خطرات سے محفوظ رکھنے والی چیزیں۔ اور مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (16:69) ہر قسم کی غذا اور آسائش اور وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ط (47:15) جس کے لئے ساری دنیا تڑپ رہی ہے۔ تمام خطرات وخوف سے حفاظت۔ یہ تو یہاں کی جنت ہے۔ آخرت کی تو ہمارے ادراک سے ماوراء ہے۔

یہ رزق تو بہنے والی چیز ہے۔ یہ ایک گھر کے سامنے سے رواں دواں "سلسبیل" پکارتا ہوا گزرتا ہے۔ کہ کس کو کتنی ضرورت ہے آ کے لے جائے۔ یہ ہے اس جنتی معاشرہ کی پہلی نشانی۔ بہنے والے پانی میں ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ روک دو گے تو

1043 پھر یہ بات نہیں ہوگی۔معاشی نظام کی بنیاد قرآن نے رکھ دی۔کہ رزق اگر پینے والی ندی کی طرح ہے تو جنت کا رزق کریم ہے۔اگر بند لگا کر روک دیا گیا تو اس میں سڑاند پیدا ہو جائے گی۔تو یہ نظام سرمایہ داری کی سڑاند آج کل ساری دنیا میں محسوس کی جارہی ہے۔

قرآن کا معاشی نظام،اِنْفَاقٌ:

قرآن نے اس معاشی نظام کے لئے نَفَقٌ کا لفظ استعمال کیا ہے۔جو دونوں طرف سے کھلا ہو۔ایک طرف سے ڈالو تو دوسری طرف سے نکلتا جائے۔جو نہی بند ہوا تو نفاق نہ رہا۔يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (9:34) يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (9:35) سڑاند والا پانی ان کو دیا جائے گا جس سے ان کی انتڑیاں کٹ جائینگی۔وہی پانی بہ رہا تھا تو حیات بخش تھا۔روکا تو انتڑیاں کاٹ کر رکھ دیں۔دریا اور ندی کا پانی رواں دواں ہوتا ہے۔سمندر کا پانی ایک گھونٹ نہیں پیا جاتا۔قرآن میں تو انفاق کا لفظ تھا۔کوئی چیز جو ادھر سے آ کر دوسری طرف سے نکل جائے۔اب یہ انہار کی شکل میں پوری ہو سکتی ہے تمام چیزوں کو انھر کی شکل میں ہونا چاہئے نہ کہ دولت اکٹھی کر کے۔

یہ پوری انسانیت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انھار کی شکل میں ہونگی۔تو حیات بخش ورنہ روک دو گے تو تغیر پیدا ہوگا۔تو حیات آور کی بجائے موت آور ہو جائے گا۔وہ تو وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ (107:7) بہتا ہوا پانی ہونا چاہئے۔کسی قسم کی روک نہ ہو۔

جہنمی معاشی پروگرام،(سرمایہ دارانہ نظام):

كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ (47:15) کس قسم کا پانی ہوگا؟ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ۝ (47:15)۔پانی تو وہی تھا مگر اس سے تو انتڑیاں کٹ جاتی ہیں۔اب بند لگا دیا تو انسانیت کی موت واقع ہوگئی۔حیوانی سطح کی زندگی ہوگی۔یہی تو جنت اور جہنم ہے۔وہاں کا تو اندازہ نہیں لگایا جا سکتا مگر یہاں تو ساری دنیا اس الاؤ میں انتڑیاں کٹوا رہی ہے۔كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) بس کھایا پیا اور مر گئے۔یہ ہے حیوانی زندگی۔

قرآن اور اقبال:

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است
ساز قرآں رانوا ہا باقی است
نغمۂ ما بے اثر افتد اگر
آسماں دارد ہزاراں زخمہ دار

ذکرِ حق از امتّاں آمد غنی
از زمان و آسماں آمد غنی
ذکرِ حق ہر ذکرِ ذاکر جدا است
احتیاجِ روم و شام ادرا کجا است
حق اگر از پیشِ ما بہ باردش
پیش قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن
ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم آں روزے کہ محرومش کنند
آتش خود بر دل دیگر زنند

(یہ قرآن چھین کر کسی اور قوم کو مل جائے گا۔ میں اسی دن سے ڈرتا ہوں جب یہ چھین لیا جائے گا)

صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان کو فَتۡحًا مُّبِيۡنًا کہا گیا ہے

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَنۡصُرَكَ اللّٰهُ نَصۡرًا عَزِيۡزًا ﴿۳﴾ (48:1-3)

صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان:

ہم نے تمہارے لئے کامیابی اور کامرانی کی واضح کشاد پیدا کردی۔ یعنی اس راستے میں جتنی رکاوٹیں تھیں ان کو راستے سے دور کردیا گیا۔

یہ ایک معجزہ تھا کہ قریش کی طرف سے اس قدر کش مکش اور یہودیوں کی اندرونی سازشیں اور اعراب (مدینہ کے اردگرد بدوؤں کی آبادی) کی منافقت کے باوجود ایسی بے مثل اور بے نظیر حکومت کا قیام صرف قوانین خداوندی کی حکمرانی، کسی فرد، کسی قوم یا کسی گروہ کی حکمرانی نہیں اور ایسا پاکیزہ معاشرہ جو صرف کردار اور سیرت کے لحاظ سے انتہائی بلندیوں پر اس کے نظم و نسق کا ذمہ دار۔

حضور ﷺ کے دل میں شدید خواہش تھی کہ کعبہ جو اس نظام کا سمبل اور علامت ہے۔ جسے خدا نے بیتی کہا یعنی قرآن تو معنوی لحاظ سے اور یہ قرآن پر مبنی محسوس شکل میں مرکز تھا۔ تاکہ ساری انسانیت اس مرکز کے تحت ان قوانین کے سایہ میں ایک عالمگیر برادری بن جائے۔ اس طرح کا مرکز جیسا کہ کمیونزم کا اور واشنگٹن سرمایہ داری نظام کا مرکز گردانا جاتا ہے۔ تو یہ کعبہ بھی اس نظریہ کا مرکز ہوگا۔ اس لئے قرآن میں بار بار امت کو یہ تلقین کی گئی کہ چاہے دنیا میں تم جہاں بھی ہو، تمہاری نگاہوں کا نصب العین کعبہ ہونا چاہئے۔ کیا ایسے تصورات اس وقت کہیں موجود تھے اور نہ ہی آج۔

رسول ﷺ کو کہا گیا کہ (2:144) ہم جانتے ہیں کہ تم کس آرزو کے لئے بار بار آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہو کہ مملکت تو قائم کردی گئی ہے مگر اس کا مرکز دوسروں کے قبضہ میں ہے۔ یہ ہے اضطراب جو بار بار تمہارے دل میں شدت سے پیدا ہوتا ہے تو فکر نہ کرو خدا ضرور اس کعبہ کو اس نظام کا مرکز محسوس بنانے والا ہے۔ مشرکین عرب ایک میلہ کی شکل میں ملت ابراہیمی کی اتباع میں حج اور عمرہ کیا کرتے تھے۔ یہ ایک عظیم الشان اجتماع ہوتا تھا۔ رسول ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ حج یا عمرہ کر رہے ہیں۔ شدت آرزو نفس غیر شعوریہ میں خواب کی شکل میں نظر آئی۔ چنانچہ 6 ہجری میں چودہ سو صحابہؓ کے ساتھ آپ ﷺ نے عمرہ ادا کرنے کا ارادہ

1043 کیا۔ مکہ سے پہلے حدیبیہ ایک بستی تھی وہاں قیام کیا اور مکہ کے لوگوں کو پیغام بھیجا کہ ہم صرف عمرہ ادا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ اور یہ اس زمانے میں عام روش تھی کہ کسی کو بھی حج یا عمرہ سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ انہوں نے انکار کر دیا اور ایک فوجی دستہ بھیجا تو ان کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔ چونکہ سال کے چار ماہ میں جنگ حرام تھی۔ لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کر کے فوجی دستہ بھیجا۔ آپ ﷺ نے اس کے باوجود ان فوجیوں کو رہا کر دیا اور عثمانؓ کو ان سے بات چیت کے لئے بھیج دیا۔ تو معلوم ہوا کہ انہوں نے عثمانؓ کو گرفتار کر لیا۔ تو یہ تو ان کی طرف سے کھلا اعلان جنگ تھا۔ تو چونکہ (9:111) میں مسلمانوں نے اپنا جان و مال اس نظام کے ہاں بیچ دیا تھا اور خدا سے عہد کیا تھا۔ اب اس عہد نامہ پر عمل کرنے کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے ایک درخت کے نیچے جسے شجر رضوان کہتے ہیں۔ ان سب سے اس بیعت کی تجدید کروائی۔ خدا خریدنے والا مشتری اور یہ بیچنے والے بائع بیعت رضوان یعنی خدا کے قوانین سے ہم آہنگ ہونے کے لئے جان و مال دینے کے عہد کی تجدید۔ چونکہ جنگ کے لئے تو آئے نہیں تھے۔ اس لئے ہتھیار بھی نہیں تھے۔ اس نازک وقت میں ایمان کی صداقت پیش کرنا ضروری تھا۔ بڑے وجد آفریں انداز میں قرآن نے اس کا ذکر کیا ہے۔ آخر کار انہوں نے صلح کا پیغام بھیجا اور ساتھ نمائندہ بھی بھیجا۔ اور بظاہر کڑی شرائط پر صلح کرائی گئی۔ روایات میں تضادات اور افسانے وضع کئے گئے ہیں۔ بخاری کی کتاب الشرائط میں ہے کہ عمرہ کیا اور یہ بھی کہ انہوں نے اس سال اجازت نہیں دی اور واپس لوٹ گئے۔ یہ اگلی سطر میں دیا ہوا ہے۔ نظر آتا ہے کہ معاہدہ ہوا ہے۔ اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ غیر مسلم مؤرخین تو ان شرائط کو بھی رسول ﷺ کی فہم و فراست و بہترین سیاست قرار دے دیتے ہیں۔ اور ایک زبردست کامیابی بھی۔ مکہ کے قریش نے جو وہاں مدینہ کا نقشہ دیکھا تو جانے سے انکار کر دیا اور اس نظام کے تحت رک گئے۔ اور مکہ کے قریب ہی مخالفت کا مرکز بنا لیا۔ تو دو سال بعد قریش نے خود ہی اس معاہدہ کی منسوخی کی درخواست کر دی تو یہ ہے فہم و فراست رسول ﷺ کی۔ اور دو سال کے اندر ہی دس ہزار کی فوج کے ساتھ بغیر لڑے مکہ فتح کر لیا۔

یہ تھا وہ معاہدہ جس کا ذکر قرآن نے ''فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾'' (48:1) کہہ کر کیا ہے۔ اس سے مستقبل کی تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں۔ اور تمہارے خلاف یہ جو الزام تراشیاں کرتے ہیں یہ بعد میں بھی جو کریں گے ان سے حفاظت ہو جائے گی۔ یہ کامیابیاں تمہارے ان دعووں کی زندہ شہادت ہو گی۔ جو مذاق اڑاتے تھے کہ ذرا ان کو دیکھو کہ فتح مکہ کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ قیصر و کسریٰ بھی ہمارے زیر نگیں ہو جائیں گے۔ یہ تھے وہ ذنب یا اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام تدبیریاں غلطیاں جو تم کر چکے ہو یا بعد میں امکان ہے، ان تمام سے تمہاری حفاظت ہو جائے یعنی اپنے اس مشن میں ان کو دوبارہ نہ دہراؤ۔ (24:55) پاگل مجنون، شاعر کہتے تھے کہ ایک یتیم لڑکا اور یہ مجبور و بے کس جماعت ذرا ان کے دعوے تو ملاحظہ کرو۔

ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

یہ ہیں وہ ذنب جو چکائے جاتے تھے۔ لِّيُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا وَيُكَفِّرَ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنۡدَ اللّٰهِ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ۙ﴿۵﴾ (48:5) اور اسی دنیا میں ان مومنوں اور مومنات کے

1043 لئے جنتی معاشرہ قائم کر دیا گیا جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ جب تک یہ چلتے رہیں گے۔ یہ ہے زبردست کامیابی جو صرف خدا کے قوانین پر اتباع کرنے سے میسر آتی ہے۔

قرآن کی ابدی حقائق جو آج بھی ہم پر منطبق ہوتے ہیں:

ایک تو وہ لوگ تھے جو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو کر عظیم ترین کامیابی پر فائز المرام ہو گئے۔ اب یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو منافقین اور مشرکین کا ہے۔ یہ اساطیر الاولین نہیں ہیں بلکہ ہم پر فٹ بیٹھتی ہیں۔ اور ابدی حقائق ہیں خواہ وہ کسی انداز یا پیرائے میں بیان کئے گئے ہوں۔ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ (48:6) ہمارے ہاں یہ منافقین کون ہیں جو مذہب کا آلۂ کار بنا کر، سپر بنا کر جو تحریک آزادی میں تمام ہندوں کے ہمنوا تھے۔ ان کے خیال میں چونکہ ہندو نماز وروزہ وحج اور دیگر رسومات کی اجازت دیتا ہے اس لئے الگ مملکت اسلام کے لئے ضروری نہیں ہے۔ اور منافقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد تمام یہاں آ کر اس دو نمبر اسلام کا نام لینے لگ گئے۔ کہا ہمارے حوالے کر دو کیونکہ ہمیں پتہ ہے اسلام کیا ہے؟ بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر تمام اپنے کئے وعدوں سے پھر گئے اور غائب ہو گئے۔ جمہوریت کے علمبردار جس میں مشاورت ہوتی ہے جبکہ ان کے فقہ میں اور حدیثوں میں تو مشاورت کا دروازہ بند ہے۔ تو پھر یہ کیسی دوغلی سیاست کہ جمہوریت کا بینڈ بجا رہے ہیں۔ یہ ہے ساری ہماری داستان۔ اب مشرک اور مشرِکت تو نہیں رہے وہ والے۔ (12:106) ان کی اکثریت کی حالت یہ ہے کہ ایمان کے دعویٰ کے باوجود مشرک کے مشرک ہیں۔ اب خدا کے احکام کے ساتھ دیگر قوانین کا ملانا، اور فرقوں اور پارٹیوں میں پوری قوم کو تقسیم کر دینا تو یہ ہے اصل مشرك۔ (29:51) کیا یہ مکمل ضابطۂ حیات ان کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ فقہ، حدیثی لٹریچر سارا خود ساختہ قرآن کے مِثْلَهٗ مَعَهٗ قرار دیکر شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ یہ ہیں الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ (48:6)۔ خدا کے قوانین کے ساتھ گمان کرنے والے کہ یہ تو کافی نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ فقہ بھی ہونی چاہئے۔ یہ تو اس کتاب کو ناقص، نا تمام اور نامکمل کہتے ہیں۔ ان کو کس نے قوانین بنانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ (39:45) یہ ہیں جو خود ہی دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ (48:6)۔ اس Viclous Circle میں پھنس گئے ہیں۔ چاروں طرف سے مار پڑ رہی ہے۔ دنیا بھر میں ذلت مل رہی ہے۔ مصر کے لوگوں نے خود ہی ان کو اقتدار سے الگ کر دیا ہے۔ بنگلہ دیش میں پھانسیاں پا رہے ہیں۔ سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک دست بگریباں ہیں۔ چاروں طرف سے تباہی منڈلا رہی ہے۔ داعش اور طالبان کی شکل میں ساری دنیا میں رسوائی ہی رسوائی ہے۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ (49:1)

سیکولرزم اور اسلام کے اربابِ اقتدار میں بنیادی فرق

سیکولرزم میں صرف قانون کا جاننا ضروری ہے۔اور اس نظام کو چلانے کے لئے سیرت و کردار کی ضرورت نہیں ہوتی۔جس طرح کسی مشین کو چلانے کے لئے اس کے کل پرزوں کا علم ضروری ہوتا ہے۔یہ سارا مکینیکل ہوتا ہے۔اس میں کردار اور سیرت نہیں دیکھی جاتی۔جبکہ اسلامی مملکت میں بنیاد ہی کردار و سیرت ہے۔جس اخلاق اور تمدن کی پستی پر عرب اس زمانے میں تھے۔قرآن نے ان باتوں کو اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے۔اور اس تعلیم و تربیت سے وہ سیرت اور کردار کی انتہائی بلندیوں تک چلے گئے کہ ساری دنیا کے لئے ایک نمونہ بن گئے اور یہ تمام اس وقت کی متمدن اقوام ان کے کردار کا اپنانے میں فخر محسوس کرنے لگیں۔اوپر کی آیت میں ''يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ'' (49:1) سے مراد مرکز، سنٹرل اتھارٹی رسول ﷺ۔اس کے بعد امیر المومنین کا سلسلہ جو آگے چلنا تھا۔یہ نظام اب اقدارِ خداوندی محسوس شکل میں رسول ﷺ نے قائم کر دیا تھا۔اب یہ نہیں کہ جس کا جو جی چاہے فیصلہ کرے۔اب یہ نظام فیصلے جاری کرے گا۔قرآن میں تو قانون اور نظام کا لفظ ہی نہیں ہے۔اس سے بھی زیادہ جامع اور وسیع اصطلاح ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ'' (8:20) استعمال کی گئی۔اور کہا گیا کہ اب شورائیت کے بعد جو فیصلہ بھی مرکز سے جاری ہوگا ان کے فیصلے سے پہلے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔پہل نہ کرو۔

(2) اگلی آیت میں کہا گیا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (49:2) صوت سے مراد فیصلہ، جو فیصلہ مرکز کی طرف جاری ہوگا۔وہ آخری فیصلہ ہوگا۔اس کی تعمیل سب پر لازم ہے۔اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاسکتی۔اپنا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (49:2) آدابِ مشاورت کی تربیت ہو رہی ہے۔کہ شور و غل مچا کر اپنی بات مت منواؤ۔ملاحظہ فرمایا کہ ایک رسول ﷺ کی ذمہ داریاں کس قدر کٹھن اور مشکل ہوتی ہیں۔کردار اور سیرت کی نمود کے بغیر تو یہ نظام نہیں آسکتا۔وہ تو خدا بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ اس قوم میں نفسیاتی تغیر نہ ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ (49:3) اپنی آواز کو رسول ﷺ کی آواز سے پست رکھتے ہیں یعنی اس کے فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں۔یہ ہیں جن کے دلوں کو اقدارِ خداوندی

کے لئے خالص اور پاکیزہ کردیا گیا ہے۔

فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ (49:7) سے مراد زندہ اتھارٹی:

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (3:101) تم کیسے کافر ہو سکتے ہو کہ رسول ﷺ اور کتاب کی موجودگی میں۔یعنی مرکزی اتھارٹی اور قرآن کی موجودگی شرط ہے۔اب قرآن تو معنوی لحاظ سے ہے مگر محسوس شکل میں وہ نظام نہیں ہے۔(3:145) میں کہا اگر رسول ﷺ کل وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا یہ نظام اس کی ذات سے مختص تھا۔یہ تو شخصیات سے ماوراء ہے۔اس نے تو آگے چلنا ہے۔"وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ" (48:29) کہا ہے۔اگر پلٹ گئے تو خدا کا کیا بگاڑو گے۔خود ذلیل وخوار ہو جاؤ گے۔"فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ" (49:7) سے مراد یہ نظام، مرکزی اتھارٹی موجود ہے۔

"لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ" عمرؓ نے فرمایا تھا۔

وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ (49:9) تو یہ اس مرکزی اتھارٹی کا کام ہے کہ وہ زیادتی کرنے والی جماعت کو اگر نہ مانے تو بزور شمشیر روک دے۔تاکہ وہ امر اللہ۔جو قوانین خداوندی کی طرف سے کہا گیا تھا۔یہ "تم" کا صیغہ جہاں بھی آیا ہے اس سے مراد مرکزی اتھارٹی ہے۔یہ ایک امت ہے۔جس کا ایک دوسرے کا بھائی کہا گیا ہے۔کسی بھی جان کا قتل گویا پوری انسانیت کا قتل ہے۔یہ ہے حرمت انسانی زندگی کی قرآن کی نگاہ میں۔جبکہ مومنوں کے تعلقات تو اخوت اور یگانگت کے تعلقات ہیں۔قتل عمد اور قتل خطا کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے۔یہ جو "فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ" (49:9) ہے یہ تیسری پارٹی یہ ہے مملکت جو ان دو گروہوں میں صلح کرائے گی۔یہ قرآن کی اپنی اصطلاحات ہیں۔جن کو مروجہ اصطلاحات میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔یہ "تُمْ" سے مراد مرکزی اتھارٹی ہے۔اگر یہ قوت والی، سزا دینے والی، عدل وانصاف کرنے والی اتھارٹی نہ ہو تو اسلام نہیں ہے۔اس لئے تو عراق اور ایران دس سال تک لڑتے رہے مگر چونکہ یہ اتھارٹی نہیں تھی اس لئے سب وعظ کر کے آجاتے تھے۔اور دونوں گروہ ان کے وعظ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

جنگِ جمل اور جنگِ صفّین:

اب یہ آیت (4:97) کے مومن کے قتل کی سزا جہنم ہے۔اب ساری وضعی احادیث بنا کر عثمانؓ کے زمانے میں آدھے ایک طرف اور آدھے دوسری طرف جنگ جمل میں کہتے ہیں شام تک دس ہزار صحابہ قتل ہو چکے تھے۔جبکہ قرآن ان کو مومن حقہ قرار دے رہا ہے۔ان کو جنت کا سرٹیفکیٹ دیا جا رہا ہے۔قرآن کی اس شہادت کو کہاں لے جائیں ہم۔جنگ صفین میں ستر ہزار صحابہؓ میدان جنگ میں قتل کر دیئے گئے۔اب قرآن کی رو سے تو ایک صحابیؓ بھی جہنم سے نہیں بچ سکتا۔ان روایات کی رو سے سب قتل عمد میں مبتلا کر دیئے گئے۔کیا یہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) تھے جن کی شہادت قرآن دے رہا ہے۔رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا

1043
عَنۡهُ(58:22)۔ یہ تمام من گھڑت افسانے ایک دوسرے کی گردن کا جواز پیدا کرنے کے لئے گھڑے گئے۔عباسیوں کے زمانے میں آپس کی جنگوں میں ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے۔اب انہوں نے آکر وہ تیسری قوت ختم کردی جومرکزی اتھارٹی تھی۔کیا صحابہؓ کے زمانے میں وہ تیسر جماعت نہیں تھی۔جس کی شہادت قرآن دے رہا ہے۔یہ مسلسل قتال عباسیوں کے زمانے کا اور سند یہ من گھڑت اسوہ صحابہؓ تاکہ ان پر انگلیاں نہ اٹھائی جاسکیں۔رسول ﷺ تو ایسی جماعت تیار کر کے نہیں گئے تھے۔ساری طبری اور ان قماش کے دوسرے لوگوں کی وضعی داستانیں۔جو ان عباسیوں کی سرپرستی میں وضع کی گئیں۔

قرآن نے نسل پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾ (49:13)

یہ قبائل اور خاندان تو صرف تعارف کے لئے ہیں۔ نہ تو کوئی قبیلہ کی دوسرے سے افضل ہے اور نہ برادری افضل اور تکریم کا معیار تو قانون خداوندی کی نظروں میں صرف قانون خداوندی کی نگہداشت ہے۔

نسل پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ قومیت کا تصور وطن یا نسل یہ تو قرآن کی نظر میں ایک بڑا جرم ہے۔ جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں اور پھر ہر ذات کی گوتیں بنا دیں جو قیامت تک نہیں بدل سکتا یہ ہے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سب سے بڑا جرم قرآن کی نظر میں۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ''بچہ کی تخلیق میں عورت اور مرد دونوں شریک ہوتے ہیں۔ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ اس میں کچھ حصہ عورت کا اور کچھ حصہ مرد کا۔ اس لئے کوئی مرد کسی عورت سے افضل نہیں ہے۔ اس طرح سے تم کو خاندانوں، نسلوں اور قبائل میں تقسیم کر دیا گیا۔ عربوں کے ہاں تعارف صرف قبیلہ سے ہو سکتا تھا کیونکہ وہ دور دور بود و باش رکھتے تھے۔ کوئی قتل یا واردات ہو جاتی تو قاتل کو قبیلہ کے ذریعہ ہی تلاش کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ ''خَلَقْنٰكُمْ'' (49:13) سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ یہ خدا نے بنا دیئے ہیں۔ وہ نسبت اس لئے کرتا ہے اپنی طرف کہ یہ قوانین اور تخلیق ساری اس کی ہے۔ (16:22) میں کہا کہ خدا نے تمہارے لئے گھر اور خیمے بنا دیئے۔ اس قسم کی بیسوں چیزیں خدا نے اپنی طرف نسبت کی ہوئی ہے۔ تمہارے لئے کشتیاں بنائیں۔ (25:54) نسبی اور سسرالی رشتے، نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے۔ اس سے مراد تو قانون ہے۔

اب یہ وطن کے اوپر قومیت کا تصور کا جواز ''شعوب وقبائل والی آیت کو مفہوم کے لحاظ سے مسخ کر کے ایک انسانیت سوز نظریہ کا جواز لایا جا رہا ہے۔ یہ تو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ تو ہندوؤں کے ورنوں پر چلے گئے۔ خدا نے تو ہر ایک کو واجب التکریم بنایا ہے۔ صرف تعارف کے لئے خاندان اور قبائل ہیں۔ اگر اسے اونچ نیچ کی وجہ بناتے ہیں تو یہ قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

❁❁❁

قرآن نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ دی

اور دوبارہ زندگی کی حیرت انگیز دلیل

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ۚ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ۚ (50:1-2)
شخصیت پرستی کا خاتمہ اور دوبارہ زندگی کی حیرت انگیز مثال۔

(1) شخصیت پرستی کا خاتمہ:

ذرا ٹھہر جاؤ جو کچھ آگے کہا جا رہا ہے اسے غور سے سنو! یہ قرآن جو اتنے شرف و مجد کا مالک ہے اس پر شاہد ہے۔ ان کو چاہئے تھا کہ اس کی تعلیمات پر غور کرتے مگر اس پر تعجب اور حیرانگی ہو رہی ہے۔ کہ انہی میں سے ایک انسان پر وحی کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے تو کوئی فوق البشر ہونا چاہئے۔ قرآن نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ دوسری عجیب بات ان کے نزدیک یہ ہے

(2) ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝ (50:3-5)

موت کے بعد زندگی:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝ (50:9-11) دوسری عجیب بات کہ جب ہم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائینگے۔ تو پھر کیسے زندہ ہونگے۔ یہ تو بڑی بعید از عقل بات ہے۔ یہ ان کو عجیب و غریب بات نظر آتی ہے۔ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ (50:4)۔ ان سے کہو کہ زمین میں جس چیز کو کم کر دیتی ہے یعنی ان کا جسم تو منتشر ہو جاتا ہے مگر ذات اس کے تصرف سے ماوراء ہے۔ اس پر یہ طبعی قوانین لاگو نہیں ہیں۔ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝ (50:4) چونکہ اعمال کا تعلق ذات سے ہے نہ کہ جسم سے۔ تو چونکہ ان کے اعمال ہمارے ہاں محفوظ رہتے ہیں اس لئے ان کی ذات محفوظ رہے گی۔ اس سلسلہ کا یوں آگے چلنا حیات اخروی ہے۔ اس لئے یہ الجھاؤ اور کشمکش کا شکار ہیں۔ ضروری نہیں کہ صرف محسوسات کو دیکھ کر ایمان لاؤ اور جو غیر محسوسات تمہارے سامنے نہ ہوں تو ان پر غور کرنے کی بجائے ان سے انکار کر دو۔ کائنات کی قوتوں کی کارفرمائی پر ذرا غور کرو کہ کس طرح

1043

سے محو گردش ہیں۔ ذرا اس بیج کو دیکھو۔ دانہ کو تو زمین کھا گئی مگر جو چیز اس میں پوشیدہ تھی تو ان قوانین کے تحت کونپل نکلی۔ اور درجہ بدرجہ ہوتی ہوئی پھل، اناج کی آخری شکل میں محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ گئی۔ مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ (50:4) اس طرح سے جسم مٹی میں گل سڑ جاتا ہے۔ مگر ذات نشو ونما پا کر ہمارے پاس كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿۴﴾ (50:4) اعمالنامہ کی صورت میں محفوظ رہتی ہے۔ جس پر ان طبعی قوانین کی رسائی نہیں ہے۔ یہ جسم طبعی قوانین کی رو سے منتشر ہو جاتا ہے۔ جس طرح بیج کو زمین کھا جاتی ہے۔ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ (50:11) اس طرح سے زمین مردہ کو کیسے حیاتِ نو ملتی ہے۔ روزانہ اس کا مشاہدہ کرتے ہو یہ ایسی مشکل بات تو نہیں ہے۔ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾ (50:11) اسی طرح سے تمہارا خروج یعنی حیات نو ملے گی۔ یہ تو ایک بڑی واضح اور بہتر دلیل ہے۔ مگر یہ اس کی انفرادی مفاد پرستی اسے اس خود فریبی سے نکلنے نہیں دیتی۔ جنت اور جہنم تمہارے اعمال ہیں۔ جو آدمی ساتھ لاتا ہے۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾ (50:15) کیا وہ پہلی تخلیق کر کے تھک گیا ہے۔ جو خلق جدید نہیں کر سکے گا۔ یعنی نئی تخلیق جس کا ادراک نہ ہو سکے جو پہلے سے موجود نہ ہو۔ اس لئے تو یہ خلق جدید کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴿١٩﴾ (51:19) اس عبوری دور کے لئے آیت کو مستقل کردیا گیا

محتاجوں اور غریبوں کا مستقل وجود سازش کے تحت بنا دیا گیا یہ حکم عبوری دور کے لیے تھا

ملوکیت کے ساتھ ہی نظام سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت ساتھ آ گئے۔ تو اب وہ نظام جو صدر اول میں قائم کیا گیا تھا اسے نظروں سے اوجھل کر دیا گیا۔ اب ایک طرف امیروں کا گروہ اور دوسری طرف غریبوں کا ایک مستقل طبقہ پیدا کیا گیا۔ اور اس قسم کی آیات کو جو عبوری دور کے لئے تھیں۔ مستقل حل بنا کر پیش کر دیا گیا۔ کیا انسانیت کے لئے قرآن یہ نظام پیش کرے گا؟ جس طرح ہندوؤں کے ہاں دان اور پُن غریبوں کی مدد کرنے کے لئے کہ غریب تو خدا پیدا کرتا ہے اور امیروں کا طبقہ بھی خدا مستقل طور پر رکھنا چاہتا ہے۔ صدقات، زکوۃ، انفاق کو خیرات کے طور پر ایک مستقل حل خدا کی منشا قرار دے کر پیش کیا گیا۔ اسے خدا کا نظام بتایا جا رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ دولت کی غلط تقسیم سے طبقات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا نے ذرائع رزق سے زمین بھر دی مگر تقسیم انسان کرتا ہے۔ اسلامی نظام تو محتاجی اور محکومی کو جڑ سے اکھاڑتا ہے۔ اس لئے تمام ذرائع رزق مرکزی اتھارٹی کے پاس ہوتے ہیں۔ اور تقسیم حسب ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح ضرورت سے زیادہ (Surplus) کسی کے پاس نہیں رہتا۔ تو پھر طبقات کہاں رہ سکتے ہیں؟ طبقات تو اس غلط تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں تمام افراد کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ اس لئے فاضلہ دولت تو کسی کے پاس نہیں رہتی۔ یہ سارا فساد اس فاضلہ دولت کا ہے۔ عربوں کے ہاں سارا معاشرہ 75 فیصد غلاموں اور لونڈیوں سے بھرا تھا۔ جو باہر کے تمام کام کرتے تھے۔ ان کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی تھی۔ کھال ادھیڑ کر رکھ دیتے تھے۔ جس طرح آج کل محنت کشوں سے کام لیکر ان کو اتنی اجرت ملتی ہے جس سے ان کے بچوں کا پیٹ مشکل بھرتا ہے۔ جس طرح ہندوؤں کے ہاں شودر۔ یہ تو قرآن کے مراحل تھے۔ جو درجہ بدرجہ گزر کر آخری منزل قل العفو تھی۔ اس جماعت کی ذہنیت بدلنے اور تربیت میں تیرہ سال لگے۔ پھر یہ عبوری دور کے تمام احکامات، وہ مراحل تھے۔ جن سے یہ نظام آہستہ آہستہ گزر کر اپنے معینہ نصب العین ''العفو'' پر آنا تھا۔ اس لئے ان پسماندہ لوگوں کی مدد کی طرف ان کو راغب کیا گیا۔ تیرہ سال بعد آٹھ سال تو مدینہ میں لڑائیوں میں گزر گئے۔ رسول ﷺ نے بنیاد رکھ دی تھی مگر عمرؓ کے زمانے میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ کہا گیا کہ ایک کتا بھی اگر فرات کے کنارے مرجائے تو اس کی ذمہ داری بھی عمرؓ یعنی نظام پر ہے۔ تو اس وقت یہ تمام عبوری احکامات پیچھے چلے گئے۔ جس طرح پانی کی موجودگی

میں تَيَمَّمُ کا حکم پیچھے چلا جاتا ہے۔ پانی نہ ہو تو پھر یہ عبوری حکم نافذ ہو جاتا ہے۔

یہ تمام عبوری احکام ناداروں کی مدد، صدقات، قرض حسنہ، وراثت کے قوانین وغیرہ تمام پیچھے چلے گئے۔ قرآن میں یہ اس لئے محفوظ ہیں کہ اگر وہ معاشی اجتماعی نظام نہ رہے تو پھر ان عبوری دور کے احکامات پر عمل ہو سکے۔ ملوکیت آئی تو ساتھ یہ سرمایہ داری کا نظام بھی آ گیا۔ تو ان عبوری احکامات کے ذریعہ مستقل طبقہ محتاجوں اور غریبوں کا پیدا کر دیا گیا۔ حالانکہ قرآن میں جگہ جگہ مال و دولت کا جمع کرنا ایک سنگین جرم قرار دیا گیا۔ یہ تو اعلان جنگ ہے خدا کے خلاف۔ شرک ہے خدا کے ساتھ زمین وجائداد، باغات کی ملکیت۔ جب دولت جمع نہیں کی جاسکتی تو طبقات کہاں سے آسکتے ہیں؟ اب اسکے جواز کے لئے روایات واضح کر کے ان کو رسول ﷺ کی طرف منسوب کر دیا۔ عمرؓ کو اس مقصد کے لئے چنا گیا۔ گویا کہ یہ سارے صحابہؓ بڑے بڑے سرمایہ دار تھے۔ اڑھائی فیصد خیرات کے طور پر دے دو تو یہ سارا بے حد وحساب مال و دولت وجائیداد پاک کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد خیرات وصدقہ کے حق میں وضعی احادیث کا ایک انبار لگا دیا گیا۔ اس طرح سے ان عبوری دور کے احکامات کو ان کے عبوری مفہوم سے محو کر دیا گیا اور ان احکامات کو ایک مستقل حیثیت دے دی گئی۔ اور وہی سرمایہ داری نظام کو اسلامی نظام کا نام دیا گیا۔ اصل نظام کو یکسر الٹا دیا۔ حالانکہ ابھی بھی یہ سرمایہ دار چیرٹی کے طور پر مغرب میں ان سے بڑھ کر دیتے ہیں۔ اصل میں قرآن درجہ بدرجہ آہستہ آہستہ تمام مراحل سے گزار کر آخری منزل تک لے جاتا ہے۔ یکلخت نہیں۔ یہ ہے حکمت۔ وہ زمینی حقائق کو نظر انداز نہیں کرتا۔

غلام اور لونڈیوں کا ملاحظہ کریں کس طرح سے ان کا سارا معاشرہ بھرا ہوا تھا۔ قرآن نے آہستہ آہستہ ان کو جز و معاشرہ بنایا اور یہ تمام جنگ جو اس کا منبع تھا وہیں سے قید کر کے غلام بنائے جاتے تھے۔ قرآن نے یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ انہوں نے آ کر پھر جاری کر دیا۔ اور ان عبوری احکامات سے غلاموں اور لونڈیوں کے وجود کو ثابت کیا اور ان عبوری احکامات کو جو عبوری دور کے لئے تھے۔ انہوں نے ان کو مستقل طبقاتی نظام رائج کر دیا۔ یہ تمام لٹریچر اس ملوکیت کی سرپرستی میں تیار کر کے اسلام کے بالکل خلاف ایک نظام وضع کیا گیا۔

عبوری احکامات میں بھی انسان کی عزت و تکریم کا لحاظ رکھا گیا ہے:

اب ان عبوری دور کے احکامات ملاحظہ کریں کہ کس طرح سے اس انفرادی دور میں بھی اصلاح، عزت و تکریم کا پہلو ہے۔ تو جو مدد کرے گا تو کہتا ہے ''کہ ہم معاوضہ تو ایک طرف رہا اس کے لئے شکریہ تک کے متمنی نہیں ہیں'' اور ان سائلوں سے کہا کہ ان کی کمائی میں ''حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۲۴﴾'' (70:24) ہے ایسا جو ہر ایک کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہا وَفِي الۡاَرۡضِ اٰيٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِيۡنَ ﴿۲۰﴾ (51:20) زمین کے تمام ذرائع جو محنت کرے گا۔ حاصل کر سکتا ہے۔ صرف محنت والوں کا حق ہوگا کوئی مزارعت، بٹائی، جاگیرداری (جو شرک ہے خدا کے ساتھ) نہیں ہے۔ آگے کہا کہ ذرا ان بادلوں کو دیکھو ہر جگہ برستے ہیں ان میں تو طبقاتی تقسیم نہیں ہے۔ کہ غریب پر مت برسو اور امیر پر برسو۔ اور ذرا اپنے اندرونی نظام پر غور تو کرو۔ معدہ کیا سارا کچھ رکھ لیتا ہے۔ وہ تو محنت کر کے نشوونما کے لئے آگے بھیج دیتا ہے۔ اس طرح یہ سارے اجزاء خون میں مل کر نشوونما کا ذریعہ بنتے ہیں۔ زائد از ضرورت اگر کوئی حصہ رکھے تو سارا نظام بگڑ کر رہ جائے۔ اب اس نظام کے تحت معاشرہ تشکیل دو گے تو ہمارا وعدہ پورا ہوگا۔ ان بادلوں اور زمین کا خدا یہ شہادت دے رہا ہے تو یہ بات صداقت بن کر سامنے آ جائے گی۔ یوں کہ جس طرح تم ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرتے ہو۔

آنے والا جنّتی دور، قرآن کا منفرد اور محاکاتی انداز

وَالطُّوۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَ کِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ﴿۲﴾ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّ الۡبَیۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ۙ﴿۴﴾ وَ السَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ ۙ﴿۵﴾ وَ الۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَہٗ مِنۡ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾ یَّوۡمَ تَمُوۡرُ السَّمَآءُ مَوۡرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ تَسِیۡرُ الۡجِبَالُ سَیۡرًا ﴿ؕ۱۰﴾ فَوَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿ۙ۱۱﴾ (52:1-11)

آنے والے انقلاب کا محاکاتی انداز میں بیان:

یہ سلسلۂ رشد و ہدایت جو کبھی طور کی وادیوں میں اور کبھی زیتون یعنی عیسیٰؑ کا پیغام رشد و ہدایت اور ابھی اس کعبہ سے بھی وہی آواز بلند ہو رہی ہے۔ یہ شاہد ہیں۔ گواہ ہیں۔ ان کے ساتھ یہ قرآن جو ایک نرم جھلی پر لکھا ہوا ہے جس کی اشاعت دور دور تک کی جاتی ہے۔ اور یہ آباد گھر جس نے اس نظام کا مرکز اور تمام انسانیت کی دادرسی کا مرکز بنتا ہے۔ اور یہ فضائے بسیط جو تاحدنگاہ بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ اور یہ کشتیوں سے بھرپور اور تلاطم خیز سمندر سے تمام اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ اسلوب بیان بھی بے مثال ہے۔ معنویت کے اعتبار سے بھی بے نظیر، صرف ایک استعارہ اور تشبیہ ہے وہ چیز واضح اور غیر مبہم انداز سے کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ جس طرح کہ کہا جاتا ہے۔ میدان کارزار کا ذرہ ذرہ اس کی گواہی دے گا۔ جیسے کہ اقبال کا انداز ۔

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا تھا جب کنارے کارواں ہمارا
گم شدہ راستوں کے ویرانو
داستانِ غبار کچھ تو کہو

غیر محسوس، مجرد حقائق کو تشبیہات سے بتاتا ہے۔ یہ ہے ایک مؤثر ترین اسلوب قرآن کا۔ عیسیٰ، موسیٰ، نوح اور رسول ﷺ کا نام لینے کی بجائے طور، زیتون، انجیل و فاران کی پہاڑیوں سے پوچھو کہ کس طرح سے شروع ہی سے اس دعوت کی مخالفت ہوئی اب تاریخی شھادات کے بعد تو ان قوموں کا انجام بھی تباہی اور بربادی کی شکل میں نکلا۔ قرآن خارجی کائنات کی طرف توجہ مبذول کر رہا ہے۔ کہ جو بوؤ گے وہ کاٹو گے۔ یہ ہے اس کا غیر متبدل قانون جو ساری کائنات میں از خود جاری و ساری ہے۔ فضا کی بلندیوں میں یہ اجرام فلکی، یہ سمندر، تلاطم خیزیوں اور ساتھ ملے ہوئے مگر قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کہ ایک سوئی تو ڈوب جائے مگر

1043 اتنے بڑے بڑے پہاڑ نما جہاز اس کے قوانین کے تابع بط کی طرح تیر رہے ہیں۔تمہاری سرکشیوں کا بھی یہی انجام ہونا ہے۔اس دن جب یہ انقلاب آئے گا تو اس سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔یہ تمام بڑے بڑے سردار جو آسمانوں کی طرح بلند اور پہاڑوں کی طرح محکم ہیں۔مضطرب اور پریشان ہو کر اپنے مقام سے ہٹا دئے جائینگے۔تو اس انقلاب کو جھٹلانے والوں کے لئے یہ دن تباہی اور ذلت لائے گا۔يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾ (52:13) اس انقلاب کی نتیجہ خیزی اس آگ کی طرح جو ان کو خاکستر اور راکھ بنا کر رکھ دے گی۔

❁❁❁

اللہ سے علم پانے کا ثبوت یہ کہ مدّعی کے پاس سلطان مبین ہو

اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ‌ ۚ فَلۡيَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍؕ‏ ﴿۳۸﴾ (52:38)

خدا سے علم پانے کا ثبوت ''بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۸﴾'' ''سُلَّمٌ (52:38)۔ کیا کوئی ایسا ذریعہ یا سیڑھی ہے ان کے پاس جو یہ جا کر يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ‌ ۚ (52:38) کہ یہ جا کر سن لیتے ہیں۔ ''فَلۡيَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۸﴾''(52:38) تو جس نے بھی یہ وحی کا، الہام و کشف کا، کاہن یعنی پیشگوئیوں یا قسمت کا حال بتانے کا دعویٰ کیا ہے۔ تو اس کے لئے وہ ایک روشن اور واضح دلیل پیش کریں۔ عربوں کے ہاں تو ان کاھنوں کا بڑا مقام ہوتا تھا۔ یہودی بھی اپنے ہیکل میں ان لوگوں کو Prophets کہتے تھے۔ پیش گوئیاں اور قسمتیں بتانے والا۔ ہم نے بھی رسول کا ترجمہ (Prophet) کر دیا۔ یہ ترجمہ عیسائیت اور یہودیت کی اصطلاح میں کر دیا۔ اور نبی کو پیش گوئیوں والا بنا دیا۔ عربوں کی کہانت بھی یہی چیز تھی۔ انہوں نے وحی کو اس طرح کی چیز سمجھ لیا تھا۔ ان کے ہاں تو نثر میں کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔ پہلی کتاب ہی یہ قرآن تھا۔ ان کا سارا سلسلہ شاعری کا تھا۔ کہ یہ آسمان سے غیب کی باتیں سن لیتے ہیں۔ یہ تھا ان کا عقیدہ۔ قرآن نے ان تمام باطل تصورات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ انسانی علم تو کسب و ہنر، عقل و شعور، شواہد، تجربات سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسے دلائل کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جبکہ وحی میں انسانی کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ نبی کو براہ راست ملتی تھی۔ اب یہ کہانت، آگے چل کر Intution۔ وجدان (غیب سے مضامین خیال میں)۔ ایرانی اس فرشتہ کو سروش کہتے تھے۔ سامی مذاھب میں یہ جبریل تھا۔ ایرانیوں نے اس کو سروش کہا۔ جب پوچھا گیا کہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ ہو جائے گا۔ اس کے لئے دلیل لاؤ۔ تو کہا کہ اس کے لئے ہم دلیل نہیں دے سکتے کہ یہ کیسے ہوگا؟ یہ ہے بنیادی فرق وحی اور ان کشف و الہام وجدان و سروش میں۔

ے ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

یہ ہوتا ہے ان کا جواب۔ دلیل کوئی نہیں ہوتی۔ یہ قرآن نے آ کر بنیادی فرق بتا دیا۔ وحی میں اور ان تمام خود ساختہ تصورات میں۔ جس طرح سائنسی علوم دلیل دیتے ہیں۔ وحی بھی دلیل دیتی ہے۔ حکمت ''Why of it'' بتاتی ہے۔ قرآن نے

ان تمام کی نفی کردی۔ ان تمام صوفیوں اور اولیاء کی۔ رسول ﷺ تک کو غیب کا علم نہیں ہوتا تو یہ غیب کا علم رکھنے کا دعویٰ تو خدا کے اس دعویٰ کے خلاف ہے جو یہ ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ تو مکافات عمل کے سارے تصور کو الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ جب تقدیر میں آ گیا تو ذمہ داری سے بری الذمہ ہو کر ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ قرآن نے کہا کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ پرکھ یہ ہے کہ ''سلطان مبین لاؤ'' اس کی علت ''Cause'' یا ''Why of it'' بتاؤ۔ قرآن غیب کی خبر یعنی ہر عمل کا انجام ''Effect'' بتاتا ہے۔ تو ساتھ اس کی غرض وغایت ''Cause'' ''Why of it'' بھی بتاتا ہے۔ ثبوت تو یہ دلیل ہے اور قیامت تک کے لئے اس گروہ کشف والہام، سروش۔ وجدان، پیش گوئیاں اور قسمتوں کا حال بتانے والوں کی نشاندہی کردی۔ ہم ہیں جو قرآن کے علی الرّغم ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ کیفیت تو ان کے محدود عقل کی یہ ہے

وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿٤٤﴾ (52:44)

کہ آسمان سے شہاب ثاقب کا ٹکڑا گر رہا ہو تو شاداں فرحاں ہو جاتے ہیں۔ کہ یہ تو موسلا دھار بارش برسانے والے بادل ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی تباہیاں اور بربادیاں لئے ہوئے آتا ہے۔ اس لئے وحی کے بغیر ان کو کیسے حفاظت مل سکتی ہے۔ ورنہ ان کی یہ محدود عقل ان کو برباد کر دے گی۔ اگر اس کو وحی کے تابع نہیں رکھیں گے۔

❀❀❀

وحیٔ نبوّت، خدااور نبی کی رفاقت، سورۃُ النَّجم

یہ ''وحی ایک منفرد علم، نبوت کا مقام اور نبی اور خدا کی رفاقت اور'' سورۃ النجم (53) وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰىۙ (53:1) اس کے لئے یہ سازشی معراج کا دوسرا حصہ، سورہ نجم کی ان آیات کو پیش کرتے ہیں۔ یعنی مکہ سے، طور، طور سے بیت المقدس پہلا حصہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور پھر بیت المقدس سے معراج کے لئے یہ سورہ پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو ھجرت کا اور یہ مقام نبوت اور رسالت کا فرق بتایا گیا ہے۔ اس میں رسالت کی خصوصیات ہیں جن کی رو سے یہ نظام متشکل کیا جا رہا ہے۔ حضور ﷺ جو معراج کبریٰ پر تھے شرف انسانیت کے۔ یہ رسالت اور نبوت کا امتزاج پیش کرتی ہے۔ قرآن کا انداز ایک طرف تو اتنا سلیس اور سادہ کہ عام انسان بھی سمجھ لے اور دوسری طرف اس قدر عمیق بلند اور گہرا کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اطمینان حاصل کرے۔ بقول ھکسلے، اپنی کتاب (Religion without Revealation) قرآن کا یہی اسلوب ہے۔ جوان مفکرین کے سامنے اس انداز میں پیش ہی نہیں کیا گیا۔

قرآن ان عربوں سے مخاطب ہے کہ جس طرح ان ستاروں سے ہدایات لیکر صحیح منزل تک پہنچ جاتے ہو۔ هَوٰىۙ (53:1)۔ ایک لفظ میں طلوع ہوکر ایک خاص مقام، گزر گاہ سے گزر کر غروب ہوجانا۔ تو یہ سارا چونکہ وحی کے تابع کر دیا گیا ہے اس لئے نہ یہ بھٹکتا ہے اور نہ راستہ بھولتا ہے تو کہو کہ یہ رہنمائی با اعتماد اور قابل بھروسہ ہے یا نہیں۔ جو رات کے سفر میں تمہیں جب کوئی نشان راہ نہیں ہے۔ تم اس کے بھروسہ پر زندگی بھر سفر کر کے اپنی منزلوں پر صحیح پہنچ جاتے ہو تو اس آسمانی رہنمائی نے تمہیں کہیں دھوکہ دیا ہے۔ ستاروں کے متعلق متعدد آیات ہیں جو رہنمائی دیتے ہیں۔ 81:15، 56:75، 6:98۔ آگے کہا مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰىۚ (53:2) تو یہ تمہارا رفیق، ساتھی، لیڈر نہیں کہا جو رہنمائی تمہیں دے رہا ہے۔ یہ وحی ستاروں کی طرف رہنمائی دینے والے کی طرف سے ہے۔ یہ تو نہ راستہ کی تلاش میں سرگرداں ہے اور نہ راستہ پانے کے بعد بھٹک گیا ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىؕ (53:3)۔ کیونکہ جو کچھ وہ تمہیں کہہ رہا ہے۔ اس کے اپنے خیالات نہیں ہیں۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىۙ (53:4)۔ یہ تو وحی ہے جو اس کی طرف کی گئی ہے۔ یہ وہی ہے جو ستاروں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ اور اس رہنمائی کے ذریعہ تم

منزل تک پہنچ جاتے ہو۔ یہ تو تمہارا زندگی بھر کا تجربہ ہے۔ ذرا اس کا بھی تجربہ کر کے دیکھو۔ تو زندگی کی خوشگواریوں اور وسعتوں سے ہمکنار ہو جاؤ گے۔ اس کی صداقت کا ثبوت اس نظریہ کا عملی طور پر متشکل کرنا ہے۔ یہ ہے وہ اسلوب جسے عام انسان نے بھی سمجھا اور اس وقت کے آئن سٹائن نے گہرائی میں اتر کر اطمینان پا لیا۔ وہ معیار جو Huxley نے بتایا ہے۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ (53:5) علم والا بڑی قوتوں والے سے ملا ہے۔ دین کے تمکّن اور حفاظت کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔

؎ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝۶ (54:6) زندگی کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں۔ بچے سے لیکر بڑھاپے تک بچہ کی خوراک رحم مادر میں الگ، باہر کی دنیا میں الگ اس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف ضروریات اور تقاضے پوری کائنات اور اس میں ساری مخلوق کے تقاضے ذُوْ مِرَّةٍ ۭ '' کہلاتے ہیں۔ اب وحی دینے والا ان تمام گزرگاہوں، تقاضوں سے آگہی بھی رکھتا ہے۔ اور ان تقاضوں کے تحت ہر آن بدلنے والی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے۔ اس لئے انسانی ذات کی نشوونما کا تقاضا جو سب سے اہم ہے۔ اس کے لئے اس نے یہ اقدار عطا کر دیں۔ یہ تو ہوا وحی عطا کرنے والا۔ اور رسول ﷺ فَاسْتَوٰى ۝۶۔ سیرت و کردار، علم و بصیرت کے لحاظ سے انتہائی بلندی پر۔ ''Balanced Personality'' ایک لفظ میں ساری خصوصیات کمال انتہا لئے ہوئے توازن و عدل لئے ہوئے ہیں۔

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ (53:7) مقام نبوت کی انتہائی بلندی اور افق سے مراد تمہاری ارض زندگی کی طرف وحی کے ساتھ آیا۔

؎ اتر کر حرا سے وہ سوئے قوم آیا
وہ ایک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

ایسی تامہ تشبیہ ''بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ (53:7)'' انسانی ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ یہ صرف خدا ہی بتا سکتا تھا۔ اقبال نبوت اور تصوف کے فرق کو گنگوھی کے ایک قول ''محمد ﷺ افلاک الافلاک کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔ اور واپس آ گئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

یہ ہے فرق صوفی کی مراجعت نوع انسانی کے کسی کام نہیں آتی۔ جبکہ نبی وہ وحی لا کر ایک زلزلہ انگیز انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ جو کچھ اسے نظر آتا ہے اس کو متشکل کرنے کی شدید آرزو اس کے دل میں مچلتی ہے۔ یہ ہے بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ (53:7) '' زمین کو آسمان بنانے کے لئے۔

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ (53:8) اس کے بعد وہ ان قوانین سے اور قریب ہو جاتا ہے۔ یعنی ان قوانین میں ہم رنگ ہو کر چلتا پھرتا قرآن بن جاتا ہے۔

فَتَدَلّٰى ۝۸ (53:8) پھر وہ انسانی گہرائیوں میں اتر کر، ان میں نفسیاتی تغیر پیدا کر کے کتاب و حکمت سے ان کی نشوونما کر

کے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ (53:9) اب یہ صلاحیتیں جو معراج کبریٰ پر ہیں۔ کاہے کے لئے؟ تاکہ انسانیت کو ان تمام سلاسل اور بوجھوں سے آزاد کرادے۔ تو خدا خود انسانی دنیا میں آ کر نہیں کرتا بلکہ جماعت مومنین کو اس مقصد کے لئے تیار کرتا ہے۔ اس طرح خدا کی رفاقت سے یہ جماعت اس نظام کو متشکل کرتی ہے۔ قاب، کمان کا دستہ۔ قوسین، دو کمانیں۔ ایک خدا کی اور دوسری رسول ﷺ کی (والذین معہ کی) مل کر اس نظام کے قیام کی جدوجہد کرتے ہیں۔

عربوں کے ہاں یہ قاعدہ تھا جب وہ ایک دوسرے سے محکم اور پختہ عہد کا اعلان کرتے تو دو کمانوں کو لے کر ان کو ایک دوسرے سے ملا دیتے تھے۔ ایک قاب بنا لیتے۔ پھر ان دونوں کمانوں کو الٹا کھینچ کر ایک تیر چلاتے۔ یہ اعلان ہوتا کہ ہم یک جان دو قالب ہیں۔ یعنی ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے۔ یعنی دونوں کسی مشن کے لئے ہم خیال، ہم رنگ ہو جاتے ہیں۔

اَوْ اَدْنٰى ۝ (53:9) اس سے بھی زیادہ قریب تر۔ یہ ہے حِزْبُ اللهِ۔ یہ خدا کی طرف سے جواب دیتی ہے ؎

تیر قضا در ہر آئینہ ترکشِ حق است
لیکن کشاد آں از کمان محمد ﷺ است

یہ دنیا میں سلب ونہب اس لئے ہو رہا ہے کہ محمد ﷺ کی کمان نہیں ہے۔ اَوْ اَدْنٰى ۝ (53:9)۔ ایسی مضبوط رفاقت جو ٹوٹ نہ سکے۔ چلتا پھرتا قرآن ہو جائے۔

؎ قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ (53:10) اس پروگرام کے لئے جو ضروری تھا وہ اسے وحی کے ذریعہ بتا دیا گیا۔ تاکہ وہ اسے عملی طور پر متشکل کر سکے۔ اب اس کو عبد کہا گیا ہے۔ سب سے بڑا شرف اور فضیلت تو اس عبد ہونے میں ہے۔ اب یہ سیرت کی بلندی اور قرآن کی بلندی کو مغربی مفکرین بھی سمجھ رہے ہیں۔ اور انگشت بدنداں ہیں۔ اس جماعت کی اس قدر بلندئ سیرت پر۔ یہ ہے بلندئ رسول ﷺ! ایک عبد کی حیثیت سے اس کے آگے تو نہیں جا سکتا۔ اس سے آگے تو مقام خداوندی ہے۔

illussion اور Reality:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ (53:11) نبی جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کا دل اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ کہ یہ فریب نگاہ نہیں ہے۔ یہ ابدی، غیر متبدل حقیقت ہے۔ تخیّل کی خلاّ ضی (illussion) نہیں ہے۔ وہ تو قدم قدم پر بدلتا ہے۔ وہ تو چونکہ ذہن کا خود پیدا کردہ ہوتا ہے۔

؎ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

وحی خواب نہیں ہوتی۔ کیونکہ دل اس کی تصدیق کرتا ہے۔ تو خواب یا illussion کی دل تو تصدیق نہیں کرتا۔ دل تو حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔ ثبوت کیا ہے؟ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ (2:285)۔ کیونکہ رسول ﷺ بھی مومنوں کی طرف عقل وبصیرت سے ایمان لاتا ہے۔ آپ ﷺ نے بھی وہی طریقہ استعمال کیا۔ اس لئے مخالفوں سے کہا

اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾ (53:12) کیا تجھ سے دیکھا ہوا کہہ رہا ہے۔ اس کی دلیل دے رہا ہے۔ اس بات پر تو اس سے جھگڑتے ہو۔ جبکہ تم تو وحی کی نوعیت سے ناواقف ہو۔ یہ کوئی خواب یا تخیل کی خلاقی نہیں ہے۔ یہ تو ہر قسم کے فکری دلائل اور تجربہ کی کسوٹی پر پورا اترنے والی بات بتا رہا ہے۔ تصوف کی دنیا میں تو تخیل کی خلاقی الگ الگ نظر آتی ہے۔ جب ایک ہی وظیفہ پڑھ کر رسول ﷺ کی تصویر خواب میں ہر ایک کو الگ الگ نظر آتی ہے۔ یہ تو فریب اور تخیل کی خلاقی ہوتی ہے۔ یہ تو ہر قدم پر بدل جاتی ہے۔ دل تو اسی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے جو تخیل کی خلاقی نہ ہو۔ یہ تو اس کی دلیل دے رہا ہے۔ جبکہ کشف والہام والے تو دلیل نہیں دے سکتے۔ وحی تو ہر دلیل پر پورا اترتی ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی ﴿۱۳﴾ (53:13) خواب اگر ایک دفعہ دیکھ لیں تو دوبارہ ان تمام جزئیات کے ساتھ نہیں آتے۔ اس طرح یہ تخیلات بھی بار بار اس طرح جزئیات کے ساتھ نہیں آتے۔ مگر وحی تو مسلسل بار بار، لگا تار تیئس سال تک وہی کچھ تمام جزئیات کے ساتھ دیکھا جو پہلی بار دیکھا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان حقائق کو انسانی زبان میں بار بار ملاحظہ کیا۔ وحی خواب نہیں بلکہ صداقت کا حقیقی مشاہدہ ہوتا ہے۔ مسلسل وہی چیز، جزئیات کے ساتھ، اسی انداز میں پیغام مل رہا ہے۔ اب جس مقام سے یہ حقیقت آشکارا ہو رہی ہے۔

عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی ﴿۱۴﴾ (53:14) اس مقام سے یہ وحی مل رہی ہے۔ جو انتہائی حیرت اور تحیر کا مقام ہے۔ مگر نبی اس مقام پر کھڑا وحی پا رہا ہے۔ یہ دانش نورانی ہے جو حیرت کی فراوانی ہے۔ جس کو نبی کے بغیر ہر انسان کے لئے انتہائی حیرت، عقل کا خیرہ ہو جانا۔ اس کی سمجھ وبوجھ سے بالاتر۔ اب قرآن گواہی دے رہا ہے کہ نبی کو بالکل حیرت نہ ہوئی۔

عِنْدَہَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی ﴿۱۵﴾ (53:15) یہی تو وہ مقام ہے جہاں سے وحی پا کر ایک جنتی معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔ اب قرآن مقام نبوت اگلی آیت میں بتا رہا ہے۔

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ (53:16-17) اس انتہائی حیرت کے مقام پر بھی اس نبی کی آنکھ ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہوئی۔ یہ ہے عقل کے مقابل وحی۔ اب آگے آ گیا وحی اور علم خداوندی کا فرق۔ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ (53:17)۔ جب ہر سو حیرت ہی حیرت چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھ حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خدا کے علم کے مقابلہ میں وحی کا علم بھی محدود ہوتا ہے۔ کہیں یہ سمجھ لینا کہ وحی کا یہ قلیل علم، علم خداوندی کے برابر ہے۔ اس لئے اس نے اپنی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ ایک انسانی حد بتا دی اور دوسری علم خداوندی کی حدود بتا دیں۔ نبوت اور رسالت کا فرق بھی بتا دیا کہ نبی کے بعد جو جماعت

چاہے تو اس وحی پر عمل کر کے یہ نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ شخصیات اور زمانہ سے ماوراء ہے۔

لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّهِ الۡكُبۡرٰى ۝۱۸ (53:18) موسیٰؑ کو بھی یہی ایت الکبریٰ دکھائی گئیں تا کہ جا کر اقدار خداوندی کے تحت نظام قائم کرو۔ (30:23) اب رسول ﷺ کو بھی یہی آیات دکھائی گئیں کہ جا کر مدینہ میں اس نظریہ کو محسوس شکل میں متشکل کرو۔

وَكَمۡ مِّنۡ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِىۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ يَّاۡذَنَ اللّٰهُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَرۡضٰى ۝۲۶ (53:26) یہ بارش دیوتا، گنگا دیوتا ان تمام کو ملائکہ یعنی خدا کی بیٹیاں کہہ کر ان کا ساتھ ہو تو سارے کام سنور جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہماری فریاد لیکر جاتے ہیں۔ خدا کے ہاں۔ ہندو مسلمان سب کہتے ہیں۔ اس طرح ان کے سامنے جھکنے سے تو تمہاری مدد نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ تمام تو تمہارے تابع تسخیر ہیں۔ ان کی مدد تو اسے مل سکتی ہے جو اس کی مشیت سے ہم آہنگ ہو جائے۔ یعنی ان کو مسخر کر کے استعمال کر لے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِكَةَ تَسۡمِيَةَ الۡاُنۡثٰى ۝۲۷ (53:27) یہ کام تو وہ کرتے ہیں جن کو یوم آخر پر ایمان نہیں ہوتا۔ اور ان کے نام عورتوں کے نام پر رکھتے ہیں۔ یہ ہیں جو قانون علت و معلول پر ایمان نہیں رکھتے۔

❁❁❁

قرآن کا معاشی اور سیاسی نظام جس سے یہ امت پھر گئی

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ (53:33-34)

یہ امّت پر اس سرمایہ دارانہ نظام کی طرف پلٹ کر آ گئی۔ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ (53:33) میں ساری تاریخ آ گئی۔ پہلے نظام سے پھر جانے کے بعد اَنْفِقُوْا (2:254) کی بجائے وَاَعْطٰى قَلِيْلًا (53:34) کر دیا۔ اڑھائی فیصد دے کر باقی اَكْدٰى۔ چٹان کی طرح سخت ہو گئے۔ اور تمام مال و دولت اکٹھی کرتے گئے۔ اسلام کو اپنی منشا کے مطابق بنا دیا۔ يُنْفِقُوْنَهَا (9:34) تھا۔ سے مراد سارے کا سارا۔ مال و دولت کو جمع کرنا جرم قرار دیا گیا۔ ساری آیت میں ھا آیا ہے۔

معاشی اور سیاسی نظام

ملوکیت میں عہد جاہلیہ کی ساری خرافات اسلامی نام دے کر دوبارہ نافذ کر دیں۔ مال و دولت کا ارتکاز، غلامی، انسانوں کی انسانوں پر حکومت۔ ناداروں کا مستقل طبقہ، عبوری دور کے احکامات کو ڈھال بنا کر، وَاَعْطٰى قَلِيْلًا (اڑھائی فیصد) کا جواز سے تزکیہ نفس کرنے لگے۔

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾ (53:35) کہا اس مزکّی ہونے کے لئے اڑھائی فیصد کی کوئی غیب کا علم ہو گیا ہے جو اس کی سند لاتے ہیں۔ قرآن میں تو نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس قسم کے احکامات گذشتہ صحف موسیٰ یا ابراہیم میں تھے۔ ان میں بھی ایسی بات نہیں تھی۔ یہ نظام ان کتابوں اور قرآن میں بھی یہی ہے کہ

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ (53:38-39) اور انہوں نے اس کے خلاف انسانوں کا وضع کردہ معاشی نظام نافذ کر دیا۔ یہ شراکت، مضارعت، بٹائی، کرایوں پر مکانات، سارا غیر قرآنی اور ربوی ہے۔ حلال وطیب کی کمائی صرف محنت کی کمائی ہے۔ جو کمائی محنت کے علاوہ حاصل کی جائے وہ ربویٰ ہے۔ یہ تو قرآن کے بنیادی معاشی نظام کے خلاف ایک دوسرا نظام ہے جو بغاوت ہے۔ اس لئے اسے خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ آج دنیا کے تمام اکانومسٹ اس اصول پر آ رہے ہیں۔ کہ معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ سرمایہ داری سے بھاگ کر اب یہ اس سنہری اصول کی طرف آ رہے ہیں۔ اب یہ دوسرا ٹکڑا کہ سیاسی اور معاشی نظام کا کہ ''کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

1043
زندگی کے ہر شعبہ میں اگر ہر فرد اپنی ذمہ داری خود پوری کرے۔کبھی دوسرے پر نہ ڈالے۔بجز سائل ومحروم جو عبوری دور بھی ہنگامی طور پر ان کی مدد کرنا اور وہ بھی بغیر صلہ اور شکریہ کے،ان کا استحقاق سمجھ کر۔معاشرہ میں تسمہ پا ہونے (Parasite) کی سختی سے ممانعت ہے۔جو ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہوں تو ان کی ذمہ داری لے کر ان کو گداگرمت بناؤ۔ورنہ سارا معاشرہ گداگروں کا ہوجائے گا۔لیکن تَوَلّٰی سے گریز کی راہیں نکالیں۔ان آیات کو قیامت کی بات کہہ دیا کہ یہ یہاں کی بات نہیں ہے مگر قرآن کو پتہ ہے کہ کیا کریں گے۔ساتھ ہی کہہ دیا۔وَاَنَّ سَعۡيَهٗ سَوۡفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ (53:40)۔وہ پس محنت کا صلہ آنکھوں سے دیکھے گا۔یہاں اس دنیا میں جو قائم کرو گے تو دوسری دنیا میں بھی ہوگا۔ملوکیت میں تو سارا نظام قرآن کے علی الرغم کر دیا گیا۔ٹیکنیک یہ اختیار کی کہ یہ تو سارا قیامت میں ہوگا۔تو اس سلب ونہب کو برداشت کرو کیونکہ یہ خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے۔تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔کانٹا پٹڑی کا ذرا سا بدلہ تو منزل دور ہوتی گئی۔قرآن نے تاریخ اقوام اس لئے بتائی ہے کہ ان کے نتائج اسی دنیا میں ان کو ملے۔جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہوجاتی ہے۔مومن تو دنیا اور آخرت دونوں کا حسن چاہتے ہیں (2:201) اور راس کا حساب جلدی سے ہوجاتا ہے۔تم اپنے پروگرام پر عمل کرو اور میں اپنے۔نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔یہ تو ساری اسی دنیا کی بات ہے۔یہ تو فریب دیا گیا۔اگر صرف یہ دو اصول ''معاوضہ صرف محنت کا'' اور اپنی اپنی ذمہ داری خود اٹھائے'' دنیا میں نافذ ہوجائیں تو یہ دنیا جنت بن جائے۔تو ہر شخص محنت کا صلہ خود دیکھ لے گا۔اور ہر ایک کو اس کا بدلہ پورا پورا مل جائے گا۔اور جلدی وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الۡمُنۡتَهٰى ﴿۴۲﴾ (53:42) تو یہ نظام عالمگیر ہوجائے گا۔

❁❁❁

اسی دنیا میں جنّت اور جہنّم کی دلکش تصویر اگر نظام ربوبیّت سے انکار کیا یا اسے نافذ نہ کیا تو جنت کی بجائے زندگی جہنم بن جائے گی

آہنگ میں یکتا صفت سورۃ الرحمٰن

سورۃ الرحمٰن:

اس سورہ میں حقائق ومعارف اور اسلوب کا اعجاز واعجاز کا بحر بے کراں پنہاں ہے۔رحمٰن۔وحی کو یکلخت دیا۔خارج سے،تنزیل سے Objectively تین ہزار سال تک اسماعیلؑ سے قرآن تک ایسی زبان بنائی کہ خدا کو اپنا مقصد جو آخری طور پر نوع انسانی کو بیان کرنا تھا گویا کوئی دقت نہیں ہوئی۔اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اب بھی کوئی نیا نظریہ آئے تو اس زبان میں اس کی جھلک مل جائے گی۔جبکہ دوسری تمام زبانوں میں اسے Coin کرنا پڑتا ہے۔اس کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی بڑا دلچسپ اور سائنٹفک ہے۔ملاحظہ کریں رَحِیۡمٌ ،رَحۡمٰنٌ۔

نشوونما کے دو الگ الگ طریقے۔رحمن میں ساری حقیقتیں آ گئیں۔اس لئے یہ وحی دی گئی تا کہ ان کی ذات کی بھی نشوونما ہو سکے جو انسان کی بنیاد ہے اور پروگرام کا مرکزی نقطہ۔اب ہنگامی Evolution ایولوشن کے ذریعہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے عَلَّمَهُ الۡبَیَانَ۝۴(55:4)۔اسے اظہار کا وصف بھی دے دیا۔ہر انسان کو جو جانوروں کو نہیں دیا۔زبان اور تحریر سے عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ۝۴(96:4)۔تحریر کا علم۔تا کہ یہ سلسلہ ختم نبوت کے بعد زبان اور قلم کے ذریعہ آگے منتقل ہوتا رہے۔پھیلتا جائے۔اس کے بعد تو نبوّت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔قرآن کے تمّتؔ سے مراد نبوت نے خود اپنے خاتمہ اعلان کر دیا۔خارجی کائنات میں ہر شے کے اندر وحی رکھ دی۔جبکہ انسانوں کی طرف رسولوں کے ذریعہ وحی کر دی۔تا کہ معاشرہ اس کے مطابق امن وسکون سے کائنات کی طرح چلتا رہے۔پہلے وحی کا طریق آیا پھر یَسۡجُدٰنِ۝۶(55:6)۔ان قوانین کے تحت زندگی گزارنا۔وَوَضَعَ الۡمِیۡزَانَ۝۷(55:7)۔ایسا توازن،تناسب تمام اجرام فلکی میں کہ ذرا سا توازن بگڑا تو ساری کائنات پاش پاش ہو جائے۔ایسا حیرت انگیز توازن کہ عقل انسانی محو حیرت ہے۔

أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ﴿٨﴾ (55:8) تا کہ معاشرہ کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ﴿١٠﴾ فِيهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ﴿١١﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿١٢﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿١٣﴾ (55:10-13) یہ زمین کے تمام ذرائع ساری مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ہر قسم کا غلہ جو بالوں میں، ان کے غلافوں میں رکھ دیا گیا ہے۔ اور ہر قسم کے رنگارنگ پھول بکھیر دیئے تا کہ ان کی خوشبو سے تمہارے ذوق کی تسکین ہو سکے۔

یہ ساری نعماء، آسائش اس لئے دی گئی ہیں کہ ان سے ہر ذی حیات کی نشوونما ہو سکے۔ اور وہ صرف خدا کی ہدایت کے تحت، اسکے دیئے پروگرام کے تحت۔ اگر اس پروگرام سے انکار کر کے إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ (28:78) کا اصول اپناؤ گے تو پھر ان نعماء کی تکذیب کرو گے۔ یہ تمام نعماء اور تمہاری تمام صلاحیتیں فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٤﴾ (55:34) اگر یہ اصول مدنظر نہ رکھا۔ اور اس کی ہدایت کے مطابق معاشرہ کو متشکل نہ کیا تو پھر أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٧١﴾ (16:71) کہہ کے تکذیب کرو گے۔ یہ ہوگا جرم۔ پھر تمہارا معاشرہ جہنم کدہ بن جائے گا اس دنیا میں۔

جہنمی معاشرہ:

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ ﴿٣٥﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٣٦﴾ (55:35-36) روگردانی کا نتیجہ آگ کے شعلے اور دھویں کا غبار، تمہیں ذلیل وخوار کر کے رکھ دے گا۔ تباہ و برباد ہو کر رہ جاؤ گے۔ مسلسل مصائب اور تکالیف کا شکار ہو جاؤ گے۔ معاشرہ سارے کا سارا جہنم کدہ بن جائے گا۔ اور کوئی خارجی قوت تمہاری مدد نہیں کر سکے گی۔

فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ (55:37) ساری فضا بلندیوں میں اس قدر سرخ ہو جائے گی گویا پگھلا ہوا تانبا جو پگھلا کر راکھ کر دے گی۔ ساری خوشگواریوں سے محروم ہو جاؤ گے۔ یہ ہے وہ قدرت اور قوت۔ اس کے قوانین سے سرکشی برتنے پر یہ نتیجہ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ ﴿٤١﴾ (55:41)۔ ایسی شدید گرفت اس جہنمی معاشرہ کی ایڑی سے چوٹی تک، بند بند گرفت میں ہوگا اگر ان قوانین سے سرکشی کی۔ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ ﴿٤٤﴾ (55:44) ایک طرف آگ اور دوسری طرف کھولتا ہوا پانی۔ ان دونوں کے درمیان ہی دائرے کی شکل میں چکر لگاتے رہ جاؤ گے۔ یعنی سارے اعمال کی کھیتیاں جھلس جائیں گی۔ یہ ہوگا انجام ان کا جو تکذیب کریں گے ان قوانین کی۔ ساری دنیا واقعی جہنم بن گئی ہے۔ اگر معاشرہ کو قانون ربوبیت پر استوار کرنے کی تکذیب کرو گے۔

دنیا کا جنتی معاشرہ:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ ﴿٤٦﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٧﴾ (55:46-47) جو اقدار کی سرکشی کے نتائج سے خائف ہو کر ان اقدار پر معاشرہ کی تشکیل کریں گے۔ تو ان کی یہ دنیا بھی اور دوسری زندگی بھی جنتی معاشرہ پر مبنی ہوگی۔ جنت اور جہنم

تو اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔

ذَوَاتَآ اَفۡنَانٍ ﴿۴۸﴾ (55:48) ان دونوں معاشروں میں ہر قسم کے نئے نئے فنون لطیفہ ہونگے۔ میوزک، لٹریچر، شاعری، مصوری، پینٹنگز وغیرہ

فِيۡهِمَا عَيۡنٰنِ تَجۡرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ (55:50) دونوں جنتی معاشروں میں فیض کے چشمے رواں دواں ہونگے۔ کسی پر روک یا بندنہیں ہوگا۔ یہ تمام نعماء ضروریات کے تحت تقسیم ہوں گی۔

مُتَّكِـِٕيۡنَ عَلٰى فُرُشٍۢ بَطَآٮِٕنُهَا مِنۡ اِسۡتَبۡرَقٍ‌ؕ (55:54) ایسے بچھونے جن کے تکئے کے غلاف بھی دبیز ریشم کے ہونگے۔

وَجَنَا الۡجَـنَّتَيۡنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ (55:54) اور دونوں جنتوں کے ثمرات ہر ایک کی رسائی میں ہونگے۔ کوئی روک نہیں سکے گا۔ ضروریات زندگی پر روک نہیں ہوگی۔

فِيۡهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ لَمۡ يَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ وَلَا جَآنٌّ‌ۚ ﴿۵۶﴾ (55:56) اس جنتی معاشرہ کی عورتیں ایسی پاکیزہ اور حیادار کہ اپنے پرایوں میں سے کسی نے چھوا تک نہ ہو۔ کیسا اطمینان بخش معاشرہ ہوگا۔

كَاَنَّهُنَّ الۡيَاقُوۡتُ وَالۡمَرۡجَانُ‌ۚ ﴿۵۸﴾ (55:58) لعل و گوہر کی طرح پاکیزہ کردار اور سیرت کی مالک عورتیں۔

هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ‌ۚ ﴿۶۰﴾ (55:60) یہ معاشرہ ایک دوسرے کی کمیاں پوری کریں گے۔ اس طرح مجموعی طور پر اس معاشرہ کا حسن و توزن انتہا پر ہوگا۔ اور یہی اس کی جزا ہوگی۔

وَمِنۡ دُوۡنِهِمَا جَنَّتٰنِ‌ۚ ﴿۶۲﴾ فَبِاَىِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِۙ ﴿۶۳﴾ مُدۡهَآمَّتٰنِ‌ۚ ﴿۶۴﴾ (55:62-64) ان دونوں کے علاوہ سابقون الاوّلین کے لئے مدارج کے لحاظ سے جنتی معاشرہ یہ بھی سبزہ میں انتہا تک جا کر سیاہ ہو جائے گا۔ یعنی سرسبز و شادابی اور آسائشوں میں کمال تک جانے والا معاشرہ۔ فِيۡهِمَا عَيۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ‌ۚ ﴿۶۶﴾ (55:66) اس میں ایسے چشمے ہونگے جو زوروروں سے فوارہ کی طرح اٹھیں گے۔ یعنی اس میں مزید ارتقائی منازل طے کریں گے۔

ادھر نہ دیکھو اے جوانِ عزیز
بلندِ زور دروں سے ہوا ہے فوّارہ

یہ سامان نشوونما بلندیوں کے مدارج طے کرائے گا۔ اس میں فِيۡهِنَّ خَيۡرٰتٌ حِسَانٌ‌ۚ ﴿۷۰﴾ فَبِاَىِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ‌ۚ ﴿۷۱﴾ حُوۡرٌ مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِى الۡخِيَامِ‌ۚ ﴿۷۲﴾ (55:70-72)، پاکیزہ و شفاف عقل و خرد کی مالک عورتیں۔ اپنی عزت و عصمت کی محافظ عورتیں۔ مُتَّكِـِٕيۡنَ عَلٰى رَفۡرَفٍ خُضۡرٍ وَّعَبۡقَرِىٍّ حِسَانٍ‌ۚ ﴿۷۶﴾ (55:76)۔ نادر اور انمول قالین اور بچھونے۔ تمام آسائشیں جن کا ذہن تصور کر سکتا ہے۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (55:78) یہ ہوگا وہ معاشرہ جو عکس ہوگا اللہ کی صفات کا۔قوت وعظمت اور تمام آسائیشوں کا۔جس میں استحکام ہوگا۔اور جسمانی اور ذاتی نشوونما کے سارے ذرائع حاصل ہونگی۔فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (55:66) اب اس چشمہ کا زوروروں سے اٹھنا ارتقاء ہے اس میں رفتار یَصْعَدُ ہے جو زوردروں سے اٹھتا جائے۔

جبکہ بلندی کے لئے جماعت کا دست بازو اس کو یَرْفَعُهٗ تیزی سے منزل سے ہمکنار کردے گا۔

یہ آبجو کی روانی یہ ہمکناریٔ خاک

مگر تیری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ

یہ بلندیوں تک لے جانے والے دونوں جنتوں میں یہ فوارے ہونگے۔ادھر بھی اوراُدھر بھی۔ایک پروگرام کے تحت۔

جنتی معاشرے کی مزید جھلکیاں، سورۃ الواقعہ:

عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ (56:15) یہ مرصع اور زرنگار نشستوں پر ہونگے۔اس سے پہلے زرنگار تخت ہوتے تھے نشستوں کے لئے۔ایک دوسرے کے ساتھ راز میں شریک۔کوئی چیز ان کے درمیان راز والی نہیں ہوگی۔

مُّتَّكِـِٕیْنَ عَلَیْهَا مُتَقٰبِلِیْنَ (56:16) کوئی اونچ نیچ یا طبقات نہیں ہونگے۔بلکہ ایک دوسرے کے بالمقابل نشستوں پر تکیہ لگائے ہوئے۔یہ مساوات کی کیفیت ہوگی۔

یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (56:17)ان کے بچے ان کے اردگرد گھومتے پھرتے ہونگے۔مُّخَلَّدُوْنَ (56:17) ہمیشہ جوان رہنے والے۔

بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِیْقَ (56:18)۔آبخورے اور طشت اردگرد لئے ہوئے۔وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ (56:18)۔اور پیالے ایسے جن میں عمدہ مشروب جاری ہونگے۔ہر شے رواں دواں ہوگی۔رکاوٹ نہیں ہوگی۔

لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ (56:19)۔نہ تو اس مشروب سے سرگرانی ہوگی۔اور نہ کمی ہوگی۔

وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ وَلَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ (56:20-21) حسب خواہش پھل اور پرندوں کا گوشت۔

وَحُوْرٌ عِیْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (56:22-24) پاکیزہ عقل وخرد کے مرد اورعورتوں پر مشتمل معاشرہ۔ایسی پاکیزہ سیرت گویا سیپ کے اندر محفوظ موتی جس کو باہر کے شر سے محفوظ کردیا گیا ہو۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا (56:25)۔نہ تو اس مشروب سے کوئی لغو بات ہوگی۔اور نہ جسم میں کمزوری۔اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (56:26)۔پورا معاشرہ ایک دوسرے کی ذات کی تکمیل میں مصروف ہوگا۔ہر ایک دوسرے کی سلامتی چاہے گا۔فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (56:28)۔ایسے پھل جن میں کانٹا نہیں ہوگا یعنی آسائیش بغیر کسی تکلیف کے۔وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ (56:29)۔پھل بہتات میں۔تہہ بہ تہہ کیلے فراوانیاں۔

وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿٣١﴾ (56:31) پانی زمین پر بہتا ہوا۔ جس کو کھود کر نکالا نہ جائے۔ سامان زیست جس کو حاصل کرنے کے لئے جگر پاش مشقتوں سے نہ گزرنا پڑے۔

وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿٣٠﴾ (56:30) اور ایسے سائے جو ہر ایک تک پھیلے ہونگے۔ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿٣٢﴾ (56:32) لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿٣٣﴾ (56:33)۔ آسائش کثیر۔ ہر موسم میں پھل دینے والے کوئی روک نہیں ہوگی۔ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿٣٤﴾ (56:34) گھر کی عورتیں بلندی اور عظمت کی حامل ہونگی۔ کوئی لونڈی یا پست سطح پر نہیں ہوگی۔ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿٣٥﴾ (56:35) ایسی اٹھان اقدار کے تحت ہوگی ان کی کہ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿٣٦﴾ (56:36)۔ بے مثال اور ایک نئی مخلوق ہو جائے گی۔ فصیح البیان اور ایک ہی خمیر سے اٹھی ہوئی عورتیں جن میں حسد کا مادہ نہیں ہوگا۔

جہنمی معاشرہ:

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ (56:41)۔ یہ سوختہ بخت ہونگے۔ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿٤١﴾ (56:41)۔ گرم اور سخت بو کے تھپیڑے اور ابلتا ہوا پانی۔ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿٤٣﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿٤٤﴾ (56:43-44)۔ سایہ دھواں اور حرارت والا جس میں ٹھنڈک ہوگی اور نہ عزت و تکریم۔

لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿٥٤﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿٥٥﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٥٦﴾ (56:52-56) قرآن جو جنتی معاشرہ کا عکس دیا ہے تو اس سے یہاں کی سب سے زیادہ پر آسائش زندگی بھی ماند پڑ جاتی ہے۔

❁❁❁

مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کی ایک حیرت انگیز مثال

وَكَانُوا يَقُولُونَ ۙ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿٤٧﴾ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ﴿٤٨﴾ (56:47-48) یہ نظریہ آج بھی موجود ہے کہ مرنے کے بعد جب یہ جسم گل سڑ جائے گا تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دوبارہ زندہ ہو سکے۔ تو قرآن نے جواب دیا:

قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوعُونَ ۙ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٥٠﴾ (56:49-50) اب جس پیکر میں تم موجود ہو یہ شکل تو تمہارے سامنے موجود ہے۔ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ ﴿٥٧﴾ (56:57)۔ تو بار دگر زندگی پر کیوں یقین نہیں کرتے۔

اس سے پیچھے چلے جاؤ تو بڑے سے بڑا سائنسدان بھی آج تک نہیں بتا سکتا کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ اور نہ زندگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ نقطہ ان کے ادراک کے دائرے سے ماوراء ہے۔ شاید آخری انسان بھی اس عقدہ کا جواب نہ بتا سکے۔ آگے کہا أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ﴿٥٨﴾ (56:58) ذرا اس بچہ کی نشوونما پر رحم مادر میں غور کرو۔ کس طرح درجہ بدرجہ اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور یہ مناظر تم زندگی میں روز دیکھتے ہو۔ کہ اس کے قانون تخلیق کی قوت سے کس طرح سے پیکر عطا کر دیا جاتا ہے زندگی کو۔ کیا اس محسوس حقیقت سے انکار کر سکتے ہو۔ اور زندگی کے متعلق تو تمہارا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی نہیں بتا سکتا۔ کہ اس کی ابتداء کیسے ہوگئی؟

ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ﴿٥٩﴾ (56:59) یہ ہے ہمارے قانون تخلیق کی قوت جس سے ہر زندگی کو پیکر مل جاتا ہے۔ بڑھتی ہے۔ نشوونما پا کر پھر نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٦٠﴾ (56:60) اس طرح ہم نے ہی موت کے لئے قوانین بنائے ہیں۔ اسی سے موت آتی ہے اور یہ تمہارا پیکر انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیا کوئی خدا کے اس قانون کی گرفت سے بھاگ سکتا ہے۔

عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾ (56:61) تم نے اس پیکر کو زندگی سمجھ لیا ہے۔ جو لاتعداد شکل میں روزانہ تم رحم مادر سے بچہ کی صورت میں دیکھتے ہو۔ تو کیا اس کے اسی قانون تخلیق سے یہ ممکن نہیں ہے جو تمہیں ایک نیا پیکر دے کر اس پیکر کی جگہ دوبارہ کھڑا کر دیں۔ اس پیکر میں جو تمہارے علم کے احاطہ میں نہیں آ سکتا۔

قرآن نے یہاں زندگی اور پیکر میں تفریق کی ہے۔ تو تم اس لئے انکار کر رہے ہو کہ یہ زندگی تمہارے علم میں نہیں آ سکتی۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ﴿۶۲﴾ (56:62) یہ موجودہ پیکر تمہارے سامنے ہے۔اس سے تو انکار نہیں کرتے۔حالانکہ یہ بھی تمہارے علم میں نہیں آسکا۔کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوئی۔مگر پیکر چونکہ سامنے ہے اس لئے اس سے انکار نہیں کرتے۔مگر حیرت ہے کہ اس کے بعد کی زندگی کے پیکر سے انکار کرتے ہو۔اصل میں تم نے اسی پیکر کو زندگی سمجھ لیا ہے۔تو کیا اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس پیکر کے گل سڑ جانے کے بعد اپنے قانون تخلیق سے تمہیں دوبارہ کوئی پیکر دیدے۔اسی قانون سے جس سے اس نے تمہیں یہ دیا۔

النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى (56:62)۔ موجودہ پیکر دیا ہے۔تم اس تخلیق اُوْلٰی کو سامنے کیوں نہیں رکھتے۔نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ (56:61) اس پیکر کی جگہ دوسرا پیکر دیدیں۔کیا ہمارا قانون یہ نہیں کرسکتا جس نے تمہیں یہ پہلا پیکر نشاط اولیٰ دیا ہے۔ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴿۶۱﴾ (56:61) وہ پیکر عطا کردیں جو تمہارے علم میں نہیں آسکتا۔اور نہ آسکتی ہے کہ زندگی کیا ہے اور اس کی ابتداء کیسے ہوئی۔پہلی زندگی پیکر کی شکل میں تمہارے سامنے ہے۔اس پیکر سے تم انکار نہیں کرتے۔مگر اس کے بعد اس پیکر کی دوبارہ اٹھان پر تم اقرار نہیں کرتے۔تم اسے نہیں مانتے۔وہ اسے بھی ممکن بنادے گا۔جس نے تمہارے پیکر اوّل کو ممکن بنایا۔پیکر اور زندگی کو الگ الگ واضح کردیا۔جو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے۔کہ کیسے اس کا قانون تخلیق ایک قطرہ آب سے جیتا جاگتا پیکر آجاتا ہے۔اس سے تم انکار نہیں کرتے۔مگر زندگی کیسے وجود میں آگئی۔یہ تو نہ تمہارے اور کسی بڑے سے بڑے سائنسدان کے احاطہ علم میں آسکتا ہے۔یہ بھی تو تمہارے علم میں نہیں آسکتا۔اس طرح مرنے کے بعد پیکر دیا جائے گا تو وہ بھی تمہارے علم میں نہیں آسکتا۔اس لئے اس سے انکار کررہے ہو۔مگر موجودہ پیکر تم مان رہے ہو تو اس کا بھی تو تمہارا علم ادراک نہیں کرسکتا۔مگر اسے تو مان رہے ہو۔تو مرنے کے بعد والی زندگی چونکہ تمہارے علم میں نہیں آسکتی تو اتنی بڑی حقیقت سے تم انکار کررہے ہو۔یہ انکار تو کوئی دلیل نہیں۔جس نے پہلا پیکر دیا ہے وہ دوسرا بھی ممکن بنادے گا۔یہ سارا کچھ مکافات عمل کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ ہے۔

فلسفۂ الٰہیات ''Transcendant and Imminent''

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3)

فلسفۂ الٰہیات میں خدا کا ہر جگہ موجود ہونا اور اس سے ماوراء ہونا۔ یہ دو چیزیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں۔ اقبال نے باہمگی اور بے ہمگی کی دو اصطلاحات استعمال کیں۔ خدا کی صفات تو لامحدود ہیں۔ مگر قرآن میں چند الاسماء الحسنیٰ'' سے مقصود یہ ہے کہ مومن یہ صفات تا حد بشریت اپنے اندر پیدا کرتا جائے۔ جیسے رزاق، علیم، خالق، رحیم، کریم، وغیرہ۔ تا کہ ہر مومن ان صفات کا عکس بن کر معاشرہ کو ان صفات پر مرتب کرے۔ ان رنگوں میں رنگ جائے۔ ہر شخص ایک الگ انفرادیت کا حامل ہے کوئی دوسرا وہ انفرادیت نہیں رکھ سکتا۔ اس کے بعد معاشرہ کا ایک فرد بھی بنتا ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ (57:4) ''هُوَ مَعَكُمْ'' (57:4) یعنی فرد کو معاشرے کے ساتھ رہنا ہے۔ اور هُوَ کی طرح ذات میں منفرد بھی رہے۔

زندگی انجمن آراء و نگہدار خود است
اے کہ در قافلۂ باہمہ رو بے ہمہ شو

انجمن آرائی سے مراد قافلہ کے ساتھ چلنا۔ معاشرہ میں رہنا۔ یہ ہے وَهُوَ مَعَكُمْ (57:4)۔ وہ قافلہ میں کھو نہیں جاتا۔ اور یہ بھی نہیں کہ رہبانیت اختیار کر کے قافلہ سے الگ ہو جائے۔ باہمہ'' یعنی قافلہ کے ساتھ بھی رہنا لازمی ہے۔ اور بے ہمہ'' اپنی انفرادیت کو بھی قائم رکھنا ہے۔ یعنی نگہدار خود'' بھی رہنا ہے۔ اور معاشرے میں رہ کر ہی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ یہ ہے اسلام فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (89:29-30) امت سے الگ ہو کر تو ذات کی نشوونما ناممکن ہے۔ یہ خدا کی دو صفات اس لئے لائی گئی ہیں۔ کہ اگر ان مقامات کو غور سے سمجھ لیا جائے تو پھر قرآنی معاشرہ کی تشکیل سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں ہر فرد ہر دوسرے فرد کی ذات کی تکمیل کرے گا۔ یہ قافلہ ایک مقصد کی طرف قوانین خداوندی کے تحت جا رہا ہے۔ تو گویا ہر فرد منزل کی طرف گامزن ہے۔ اگر یہ میکانیکلی ہو رہا ہو جس میں ذات کی نشوونما نہ ہو تو پھر یہ سیکولرزم ہوگا۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (57:3) اس کی ذات زمان و مکان کی نسبتوں سے ماواء ہے۔ نہ اس کی ابتداء ہے اور نہ انتہاء۔ سب سے اول بھی وہی ہے اور آخر بھی وہی۔

وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3) وہ ہر شے پر غالب ہے مگر اس کا قانون غیر مرئی طور پر کام کر رہا ہے۔ قانون تو ہوتا ہی

1043 غیر مرئی اور غیر محسوس۔ مگر اس کے نتائج محسوس ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھ کہ یہ محسوس کائنات اس کی صفت خالقیت اور ربوبیت کی مظہر ہے۔ اور زندہ ہستی شہادت۔ یہ ہے کہ اَلظَّاهِرُ (57:3)۔ باہمہ ''Immanent'' لیکن اس کی ذات نگاہوں سے مستور، تو بے ہمہ اور ''Transcendent'' ہے۔ اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ یہ ہے اتنا بلند تصور خدا کا جو دنیا کے کسی لٹریچر میں نہیں ملتا۔ مَعَكُمْ (57:4) اور ''مَا وَرَاءُ'' بھی۔

چونکہ جھوٹ بونے سے زبان تو کالی نہیں ہوتی مگر ذات پر اس کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ جو باطن ہے۔ غیر محسوس، غیر مرئی۔ جبکہ طبعی قوانین تو محسوس طور پر نتائج بتا دیتے ہیں۔

تصوف نے آکر تو رام اور رحیم کو ایک کر دیا۔ خدا اور فرعون کو، اللہ اور محمد ﷺ کو ایک کر دیا۔ اِلٰهٌ سے مراد یہ تمام بت ہیں۔ یہ ہے محی الدین ابن عربی کی تفاسیر سو سو جلدوں میں۔ یہ ترجمہ ہو رہا ہے ''وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ'' (57:3)۔ خدا اور رسول کو ایک قرار دے رہا ہے۔ اس لیے تو کہا وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣﴾ (57:3) (اس آیت کے فوراً بعد) وہ جانتا ہے کہ آگے جا کر تم کیا کیا عقائد اختیار کرو گے۔ اس لئے کہا کہ ''وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ'' (57:4) وَهُوَ (57:4) ہے جبکہ تم مَعَكُمْ (57:4) ہو۔ کیا خالق اور مخلوق کبھی ایک ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان باطل عقیدوں کی تردید کرتا جا رہا ہے۔ وہ تو باہمہ ہے یعنی ہر شے میں موجود۔ اور بے ہمہ۔ ان سے ماوراء ''Transcendent'' بھی ہے۔ مَعَكُمْ (57:4) اور مَا وَرَاءُ'' بھی۔

❖❖❖

نظامِ ربوبیت میں ایسی قانونی شق کا رکھ دینا کہ فِی الْاَرْضِ یعنی زلزلہ، سیلاب، متعدی امراض، جنگ کی صورت وغیرہ اور فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ سے مراد بیماری اپاہج، زخمی ہو جانا تو اس صورت میں مرکزی حکومت ان کا خیال رکھے گی۔

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۲۲﴾ لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَ لَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِۣ ﴿۲۳﴾ الَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَ یَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ﴿۲۴﴾ (57:22-24)

غلط عقائد کو پھیلانے کے لئے اس آیت کو بنیاد بنا رکھا ہے۔ کہ سارا کچھ ایک لوح محفوظ میں تمام زمینی یا جانوں کے مصائب نمودار ہونے سے پہلے لکھ دیئے گئے ہیں۔ اللہ کے لئے یہ بات بڑی آسان ہے تا کہ اس نقصان پر رنج نہ پہنچے خواہ مخواہ۔ کہ یہ تو ہم نے سارا کچھ کیا ہے۔ بالکل نہیں ہر قسم کے ظلم وتعدی سے یہ کہہ کر کہ یہ تو پہلے سے مقدر ہے۔ مطمئن کر دیا۔ یہ تو اس کی مرضی سے ملتا ہے۔ جو مل جائے تو متکبر نہ ہو۔ وہ بھی اسی طرف سے، یہ عقیدہ رکھ لو، ان ظالموں کے خلاف محسوس تک نہ کرو۔ یہ ہے ان سازشی عناصر یعنی مذھبی پیشوائیت اور ملوکیت کا گٹھ جوڑ۔ حالانکہ ساتھ ہی۔ یہ آیت پڑی ہوئی ہے کہ جو لوگ سرمایہ دارانہ نظام قائم کرتے ہیں اور گریز کی راہیں نکالتے ہیں اور اس سے اگلی آیت میں اس فریب سے نکالنے کا انتظام بھی کیا ہے۔ اب آیئے اصل مفہوم کی طرف۔

اصل مفہوم:

فِی الۡاَرۡضِ (57:22) سے مراد حادثات۔ زلزلہ۔ سیلاب۔ آندھیاں وغیرہ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ (57:22) سے مراد بیماریاں۔ اپاہج پن۔ زخمی ہو جانا وغیرہ۔

کہا یہ ہے کہ حادثات، زلزلہ، سیلاب، آندھیاں، خارجی دنیا میں اور انسانی دنیا میں بیماریاں، اپاہج پن، زخمی وغیرہ ہو جانا۔ فِیۡ کِتٰبٍ (57:22) تو اس کے لئے قانون بنا دیا ہے۔ وہ نظام ربوبیت ہے کہ حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ ان اجتماعی یا انفرادی

1043 حادثات کا ازالہ کرے۔ ان حادثات کے رونما ہونے سے پہلے یہ شق قانون میں رکھ دی ہے کہ وہ ہر ایک کی نشوونما کرے گی۔ اگلی آیت میں بِالۡبُخۡلِ'' سے مراد نظام سرمایہ داری ہے۔ چونکہ یہ سرمایہ دار صاحب اختیار ہوتے ہیں تو یہ سرمایہ داری کا قانون بنا کر اسے جائز قرار دیتے ہیں۔تو جو قوم بھی اس خدا کی ربوبیت والے نظام سے گریز کرے گی تو پھر دوسری قوم آجائے گی۔(47:36)

تو روک تھام: ایک جزبُ اللہ آ کر ان جرائم کی روک تھام کرے گی:

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25) اگلی آیت۔ اس نظام میں چونکہ افراد کی محنت کا ماحصل تمام انسانوں کی ضروریات کے لئے کھلا رہتا ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کی کمانے کی استعداد کم ہو جائے یا حادثہ کی وجہ سے سلب ہو جائے تو یہ کمی یا سلب ان کے لئے وجہ تاسف نہیں بنتی۔ اور دوسری طرف جن کی استعداد زیادہ ہو جائے وہ اس پر اتراتے نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسے خود پسند لوگ جو ان باتوں کی وجہ سے بڑا بننے کی کوشش کریں جو ان کی پیدا کردہ نہیں ہیں تو ان کو قانون خداوندی پسند نہیں کرتا۔(57:24) اس نظام کو حزب اللہ نافذ کرے گا۔ اگر مخالفت ہو تو اس کے لیے تلوار اٹھانا پڑے گی۔

❁❁❁

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿17﴾ (55:17)

الْمَشْرِقَيْنِ اورالْمَغْرِبَيْنِ ﴿17﴾ (55:17) کا نشوونما دینے والا۔سورج کے نکلنے کے دو دو مقامات،سردیوں اور گرمیوں میں''اس کا تعلق سورج اوراس کے گرد زمین کی گردش سے موسموں کے تغیرات یعنی موسموں کی تبدیلی کے لئے دومشرق اور دو مغرب ،ربوبیت کے لئے ساتھ ہی مقصود ونصب العین بھی بتادیا۔سال میں چھ ماہ سردیوں کے لئے ایک مقام پر طلوع ہونا اور پھر اگلے چھ ماہ گرمیوں میں اسی مقام سے غروب ہونا'' پھر گرمیوں میں وہ مغرب،مشرق میں تبدیل ہوجاتا ہے۔حالانکہ مشرق میں طلوع ہوتا ہے۔تواس وقت امریکہ میں غروب ہورہا ہوتا ہے۔اس لحاظ سے بھی دومشرق اور دومغرب ہوجاتے ہیں۔چونکہ اس آیت میں ذکر رب کا ہے تو اس لئے اس سے مراد زمین اور سورج کی گردش کو اسی طرح متعین کیا گیا ہے۔کہ سورج کے مقامات طلوع وغروب(مشرقین ومغربین)کے ساتھ موسموں کا تغیر ہوتا ہے۔اس لئے سورج طلوع وغروب کے دوانتہائی نقاط یعنی مشرقین اور مغربین'' کے درمیان دکھائی دیتا ہے۔یعنی سردیوں میں اگر طلوع والا مقام مشرق ہے تو گرمیوں میں یہ مغرب،مشرق ہوجاتا ہے۔اسی طرح سے دومشرقین اور دومغربین بن جاتے ہیں۔سورج زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔۔

قرآنی تعلیمات کو بطور بَرْزَخٌ استعمال کر کے ظلم وتعدی سے بچا جاسکتا ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿19﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿20﴾ (55:19-20)اب ذرا ان بلندیوں سے زمین کی طرف آجاؤ۔یہ پانی کے دومختلف منبع (لہریں/Stratum) کوتو دیکھو کس طرح سے ساتھ ساتھ ملے ہوئے بہہ رہے ہیں۔ان دونوں کے درمیان ایک غیر محسوس آڑ ہے لیکن لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿20﴾ (55:20)۔ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں،ایسانہیں ہوسکتا۔ایک آڑ ان دونوں کو الگ الگ رکھ رہی ہے۔(35:12،25:53)لیکن یہ انس وجن کا گروہ متعینہ راستہ پر چلنے کی بجائے ایک دوسرے پر دست درازی کرتے رہتے ہیں۔ان کو اس ظلم سے روکنے کے لئے یہ تعلیمات بطور بَرْزَخٌ' دی گئی ہیں۔انگلینڈ میں بھی ایک گرم اور دوسری ٹھنڈے پانی کی روئیں(Streams) ساتھ ساتھ بہہ رہی ہیں۔مگر ایک دوسرے سے ملتی نہیں ہیں۔

''مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ (4:24) اور مُحۡصَنٰتٍ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ (4:25)''

قرآنی اہم اصطلاح

مُّحۡصِنِیۡنَ (4:21) مادہ اس کا (ح ص ن) ہے۔ اَلۡاِحۡصَانُ کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اسے محفوظ رکھنا۔ ایسا کہ اس تک پہنچنے کے راستے نہ ہوں۔ ایسی محفوظ جگہ حَصِیۡنٌ کہلاتی ہے۔ جمع حُصُوۡنٌ، حَصَّنَہٗ، اَحۡصَنَہٗ، یَحۡصُنُہٗ۔ اس نے اسے محفوظ کر دیا۔ مُحۡصَنَۃٌ، محفوظ کی ہوئی۔ اَلۡمِحۡصَنُ۔ قفل۔ حفاظت کرنے والا آلہ۔ لِتُحۡصِنَکُمۡ تاکہ تمہیں وہ محفوظ کر دے تم کو مِمَّا تُحۡصِنُوۡنَ ذخیرہ کی ہوئی گندم۔ محفوظ کی ہوئی گندم۔ حفاظت کے اعتبار سے وہ عورت جو اپنی عصمت کی حفاظت کرے اسے حِصَانٌ'' کہتے ہیں۔ موتی کو بھی جو سیپ میں محفوظ ہوتا ہے۔ عورت کے لئے پاک دامنی دو طرح کی ہوتی ہے۔ غیر شادی شدہ ہو تو اپنی عصمت کی حفاظت خود کرے اس اعتبار سے مُحۡصِنَۃٌ۔ جبکہ شادی کے بعد دوسرا اس کی حفاظت کرے تو وہ مُحۡصَنَۃٌ'' کہلاتی ہے۔ اس اعتبار سے ہر پاکدامن عورت کو مُحۡصَنٌ'' کہتے ہیں اور مُحۡصِنٌ بھی۔ (بطور فاعل اور مفعول) اَلۡمُحۡصَنٰتُ'' شادی شدہ عورتیں۔ اَحۡصَنَ، شادی کرنا۔ پاکدامن عورت کے لئے مُحۡصِنَۃٌ، مُحۡصَنَۃٌ۔ دونوں آتے ہیں۔ قرآن میں پاکدامن عورتوں کے لئے چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اَلۡمُحۡصَنٰتُ'' آیا ہے۔ اس لئے جہاں مُحۡصَنَۃٌ آئے تو سیاق وسباق کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ اس سے مراد پاکدامن عورت ہے یا شادی شدہ یا غیر شادی شدہ۔ یہ لفظ پاکدامن کے معنوں میں (57:24-44) میں آیا ہے۔ نساء میں لفظ فَتَیٰتٌ کے مقابل آیا ہے۔ یعنی آزاد عورتیں، بمقابلہ لونڈیاں۔

اسی سورۃ کی آیت میں اس سے مراد'' پاکدامن بھی'' اور شوہر دار بھی'' پہلے معنوں کے لحاظ سے'' تم پر پاکباز عورتیں حرام ہیں۔ بجز ان کے جو پہلے سے تمہارے نکاح میں ہیں۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے' تم پر شوہر دار عورتیں حرام ہیں۔ بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہارے نکاح میں آ چکی ہیں۔ یہاں'' شوہر دار'' کا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔ قرآن میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے لئے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ (4:24)۔

1043
سَفۡحٌ سے مراد اپنے مادہ کو گرا دینا۔ بہا دینا۔ جنسی اشتعال کی تسکین۔(Sexual Pleasure) زنا کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے۔ اس طرح کے تعلقات ناجائز ہیں۔ اگر جنسی اختلاط کا مقصد استقرار حمل ہے تا کہ اس سے مادہ منویہ محفوظ ہو جائے۔ یونہی بہہ کر ضائع نہ ہو جائے۔ یہ جائز ہے۔ اور یہ ہوگا نکاح۔ نِكَاحٌ کے مقابل لفظ سَفۡحٌ آیا ہے۔ ان کے ہاں تیروں سے جوا کھیلا جاتا تھا۔ ہر تیر کسی خاص حصہ کے لئے ہوتا تھا۔ ان میں سے جو ایک تیر خالی رکھا جاتا تھا محض خانہ پری کے لئے اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا تھا۔ اسے اَلسَّفِیۡحُ'' کہتے تھے۔ اس سے بھی مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ط (4:24) کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ اَلۡمَسۡفُوۡحُ مِنَ الزَّرۡعِ۔ وہ کھیتی جس کے پتے شدید سردی سے زرد پڑ جائیں۔ دانے مرجھا کر پتلے ہو جائیں۔ بالیں سیاہ ہو کر کھیتی ضائع ہو جائے۔

اس سے بھی جنسی اختلاط کا قرآنی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اس لئے عورتوں کو حَرۡثٌ (2:223) کہا گیا ہے۔ یعنی یہ جنسی اختلاط مرد اور عورتوں کا بطریق مُحۡصِنِیۡنَ (4:24) ہونا چاہیئے۔ یعنی تحفظ اور بقائے نسلی انسانی کے لئے نہ کہ محض جنسی تسکین کی خاطر۔ ایسا تیر چلانے کے لئے نہیں جس کا مقصد محض ضیاع ہو یا کھیتی بار آور نہ ہونا۔ وقتی نکاح بھی سَفۡحٌ ہوتا ہے نہ کہ احۡصَانٌ۔

❁❁❁

آزادیٔ نسواں کے دور کا اعلان

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ① (58:1)

یہ ہے وہ دور جب عورت کی تربیت اس انداز سے ہورہی ہے کہ ایک عورت سربراہ مملکت سے جھگڑ کر ان سے اپنی خاوند کی شکایت کررہی ہیں۔اس رسول ﷺ سے جن کا فیصلہ ایمان کا حصہ ہے۔اس کے خلاف گرانی تک محسوس نہیں کی جاسکتی دل کے اندر۔ تَحَاوُرَكُمَا ۭ (58:1)۔آپس میں تبادلہ ہورہا ہے۔اور تجادل، جھگڑ رہی ہے۔ وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ (58:1)۔خدا تک شکایت یعنی سربراہ مملکت سے شکایت ہورہی ہے۔قرآن نے اس واقعہ کو تا ابد تک کیلئے محفوظ کردیا ہے۔جس طرح عمرؓ نے کہا کہ خلافت کا فریضہ یہ ہے کہ میں تمہاری شکایت جو دعا کی شکل میں ہوگی۔خدا تک پہنچنے سے روک دوں گا۔چونکہ جب تمہاری ہر دعا کا ازالہ یہ مملکت کرے گی تو پھر دعا کاہے کے لئے کروگے۔یہ تھا اسلام۔اب شکایت کیا تھی؟

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗئِ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ② (58:2) فیصلہ اس عورت کے حق میں صادر کیا جارہا ہے۔اسلام سے قبل عرب جاھلیہ میں غصہ میں آکر بیوی کو ماں کہہ دیا تو نکاح ٹوٹ جاتا تھا۔لگتا ہے اس وقت وحی اس پر نہیں آئی تھی۔کہا یہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں یہ تو ناپسندیدہ اور حق سے ہٹی ہوئی بات ہے۔مائیں تو وہ ہوتی ہیں جو جنم دیتی ہیں۔ایسی بات نہیں ہے اس عورت کا نکاح اس طرح کی بے حقیقت باتوں سے نہیں ٹوٹا۔تو اس کے بعد معاشرے پر پابندیاں عائد کردیں۔ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ② (58:2) تو قانون میں اس سے درگذر کا کفارہ رکھ دیا گیا۔اب اگر کوئی کفارہ ادا کرنا چاہے تو سب سے پہلے فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۭ (58:3) اب زناشوئی کے تعلقات سے پہلے ایک غلام یا لونڈی آزاد کرو۔ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ (58:3)۔تا کہ اس وعید سے تم بعد میں سوچ سمجھ کر اس طرح کی باتیں زندگی کا معمول نہ بنالو۔اگر یہ نہیں تو پھر فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ (58:4) یا دو ماہ کے مسلسل روزے

1043
یا 60 مسکینوں کا کھانا۔اب اس پابندی سے ندامت بھی ہوئی ۔کفارہ بھی ادا کرنا پڑ گیا۔اب آئندہ سوچ سمجھ کر زبان استعمال کرے گا۔یہ تھی ان کی تربیت جو اتنی بلندیوں تک پہنچ گیا کہ ان کی سیرت وکردار ساری دنیا کے لئے نمونہ بن گیا۔اور ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ④ (58:4) اب ان حدود خداوندی سے انکار کفر ہوگا۔اور یہ مرکزی حکومت اس کی شدید سزا دے گی۔اس میں کسی کا نام نہیں لیا گیا اور یہ ابدی قانون بن گیا۔یہ تھی وہ اہمیت جو قرآن نے خاندانی معاملات کو دی۔اس طرح سے ان کی تربیت کی تاکہ ان جہالتوں کا مظاہرہ معاشرہ سے ختم کر دیا گیا۔

2) منافقین پاس پاس بیٹھ کر مجلس میں کانا پھوسیاں کرتے تھے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِى الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ (58:11) اس لئے مسلمانوں سے کہا گیا کہ کھل کر بیٹھا کرو تو تمہارے لئے خدا کشادگی اور وسعت پیدا کر دے گا۔حکم عام ہو گیا تاکہ اس کانا پھوسی کا ازالہ ہو جائے۔انہی معاشرتی جزئیات سے یہ معاشرہ بلندیوں کو چھونے لگا۔

اب پرائیویٹ گفتگو رسول ﷺ سے محفل میں کرنا،اس کے لئے عطیہ دینا شرط قرار دیدیا۔

اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑫ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ (58:12-13) پرائیویٹ باتیں رسول ﷺ سے کرنے کے لئے عطیہ کی پابندی لگا دی۔اب یہ پابندی ان منافق اَعراب پر بھی لگی۔اور ان کی سازشیں اس طرح دم توڑ گئیں۔یہ تو تمہارے قلوب کی پاکیزگی کے لئے ہیں۔اگر نہیں ہے تو ٹھیک ہے ان کے لیے استثنیٰ ہے۔طبقات پیدا نہیں کئے۔پھر اس نظام کے لئے کوشش کرو تاکہ ان صدقات کی ضرورت ہی نہ پڑے۔اس کے ساتھ ہی اس نوزائندہ نظام کی اطاعت جاری رکھو۔

دوقومی نظریہ

حِزْبُ اللّٰہِ ؕ (58:22)، حِزْبُ الشَّیْطٰنِ ؕ (58:19)

دنیا میں ایک نئی قوم نظریات کی بنیاد پر:

اب ایک انوکھا اور نیا معاشرہ وجود میں لایا جارہا ہے۔ صرف اس قرآنی نظریہ کی بنیاد پر۔ کچھ ساتھ ہیں۔ کچھ مخالف۔ اب ایک الگ حکم آیا۔ بھائی بھائی سے الگ۔ بیٹا باپ سے الگ۔ خاوند بیوی سے الگ۔ جو ایمان نہیں لائے اب یہ منافق ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات استوار کررہے ہیں جو مخالف ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ ؕ مَا ہُمْ مِّنْکُمْ وَلَا مِنْہُمْ ۙ وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَہُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ (58:14) اِنَّہُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ (58:15) اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَہُمْ جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَلَہُمْ عَذَابٌ مُّہِیْنٌ ﴿۱۶﴾ (58:16) اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ (58:17) اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ ؕ (58:19) یہ ہیں حِزْبُ الشَّیْطٰنِ ؕ (58:19) یہ منافق جن اس طرح سے اس معاشرہ سے الگ کردیا گیا۔ اب دوسرا گروہ حِزْبُ اللّٰہِ ؕ (58:22) ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَہُمْ اَوْ اَبْنَآءَہُمْ اَوْ اِخْوَانَہُمْ اَوْ عَشِیْرَتَہُمْ ؕ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَہُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ ؕ وَیُدْخِلُہُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ؕ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾ (58:22) جو بھی دوستداری کے تعلقات ان سے رکھے گا جو اس نظریہ کے کاربند نہیں ہیں۔ خواہ ماں باپ، رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ نشانی بتادی صرف حزب اللہ وہ ان تمام سے تعلقات منقطع کر کے صرف نظریہ کی بنیاد پر اس قوم کی تشکیل کرے گا۔ یہ ہے وہ جماعت جس کو اس قرآن نے تقویت دی۔ اور ایسا سدابہار معاشرہ ہوگا اگر اس کی اطاعت کرتے رہینگے تو یاد رکھو! (الا) صرف یہی گروہ دنیا پر چھا جائے گا۔ یہ تھے جنہوں نے تمام رشتوں کی بنیاد نظریات پر رکھی۔

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ (64:2) کافر گالی نہیں ہے بلکہ نان ممبر (non-member) جو وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) تو اس لحاظ سے وہ تمام نان ممبر اس سوسائیٹی سے باہر ہوگئے۔ یہ ہے دوقومی نظریہ اس کتاب کی رو سے۔

معاشی دنیا کا ایک زرّیں اصول دولت کا ارتکاز سب سے بڑا جرم

کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ وَمَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ ٭ وَمَا نَہٰىکُمۡ عَنۡہُ فَانۡتَہُوۡا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ۘ (59:7) مال غنیمت کو جو جنگ کا جذبہ محرکہ ہوتا تھا اب اسے سارا مرکز کے پاس رہنے کا حکم ہوگیا۔اور بلند ترین جذبہ محرکہ دیدیا۔اب میدان جنگ میں دل کی گہرائیوں سے جانیں ہتھیلی پر رکھ کر گئے۔تا کہ یہ نظریہ غالب آجائے۔یہ تھاوہ بلند جذبہ محرکہ جس کے سامنے سارے جذبہ محرکہ ماند پڑ گئے۔اب یہ تمام مال ودولت ان لوگوں کے تصرف میں ہوگا جو شہیدوں کے لواحقین، یتٰمیٰ، مسٰکین اور ابن السّبیل۔تا کہ مال ودولت صرف اوپر کے طبقہ ہی میں نہ گردش کرتا رہے۔یہ تو خون کی طرح پورے جسم میں گردش کرے گا۔اگر ایک جگہ بھی خون کے بہاؤ میں Clot آ گیا تو نتیجہ موت ہوتا ہے۔قومیں اس طرح دولت کو چند ہاتھوں میں دے کر موت کا شکار ہوتی ہیں۔یہ ہے دنیا کی معاش کے لئے انقلاب انگیز اصول۔جسے ابو بکرؓ نے ضروریات کے تحت تقسیم کیا۔خدمات کی بنیاد پر نہیں۔کہا کہ درجات تو وہاں اعمال کے ذریعہ جنت میں ہونگے۔یہ تو معاش کا مسئلہ ہے۔اس میں تو ضروریات کو مقدم رکھا جائے گا۔طبقات تو پیدا نہیں کئے جاسکتے۔

❁❁❁

مومنوں کے تین گروہ، سب کے سب مومن حقّا
اور جنت کا سرٹیفیکیٹ خدا کی طرف سے

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ(59:8) یہ مہاجرین جو اس معاشی مدد کے زیادہ حقدار ہیں اور انہوں نے دعوی ایمانی کو سچا ثابت کر دیا۔ دوسرے یہ انصار ہیں۔ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ڵ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ(59:9) اب ان کے لئے جنت لکھ دی گئی ہے۔ خدا ان سے راضی یہ اللہ سے راضی۔

تیسرا گروہ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۧ(59:10) یہ ان کے بعد آنیوالے ہیں۔ جنہوں نے بعد میں ہجرت کی اور ان کے نقش قدم پر چلے۔ یہ تمام کے تمام مہاجرین وانصار جو بعد میں شامل ہوئے۔ یہ سب مومن حقّا تھے۔ جنت ان کے لئے لکھ دی گئی۔ یہ اللہ سے راضی اللہ ان سے راضی۔ یہ بعد میں آنے والے ان کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ بارالہا! ہمارے دل میں ان کے بارے میں کدورت نہ ہو۔ یہ انتہائی جامع آیت ہے۔

قوم کا مستقبل اور انفرادی مستقبل اور الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ(59:24)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ (59:18)، آنیوالے کل مستقبل، ہر فرد کا، قوموں کا۔ ہر کام کا نتیجہ لگا ہوتا ہے۔ جب محسوس طور پر سامنے آ جاتا ہے یہ ہے ''غداً'' انسان کے ''پیش پا افتادہ مفاد'' کے لئے نہ حرام کی اور نہ حلال کی تمیز کرتا ہے۔ اگر وہ حرام ہے تو اس سے صرف جسم کی نشوونما ہوگی۔ مگر ذات کی نشوونما نہیں ہوگی۔ کہا یہ ہے کہ ہر کام کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھ کہ اس سے ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ یا نہیں۔ اس کے نتیجہ پر نظر رکھو۔ تم اس بات سے باخبر ہو نہ ہو مگر تم اس سے چھپا نہیں سکتے۔ وہ تمہارے سارے کارتوتوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ (59:19) خدا فراموشی دراصل خود فراموشی ہے۔ انسان طبعی ضروریات کبھی نہیں بھولتا۔ یہ تو حیوانی خصوصیت ہوئی۔ اصل چیز تو ذات کی نشوونما ہے۔ خدا کا بھلانا سے مراد اقدار خداوندی کو فراموش کرنا ہے۔ ان سے غفلت برتی تو گویا اپنے آپ سے، ذات سے غفلت برتی۔

شاخِ نہال سدرۂ، خاروخسِ چمن مشو
منکّرِ او اگر شوی منکّرِ خویشتن مشو

منکّرِ خویش ہونا اسلام چھوڑنا ہے۔ فٰسِقُوْنَ یعنی پیڑن سے بہر نکل جاتا ہے۔

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ (59:20-21) کامیابی کا نسخہ تو صرف اس قرآن میں ہے۔ اگر اسے قلب کوہ میں نازل کرتے اور اس کو احساس مل جاتا تو یہ خدا کے قوانین کے انجام سے اس قدر خائف ہو جاتا کہ لرز کر پھٹ جاتا۔ بات ساری عقل و فکر کی ہے۔

(22) یاد رکھو اس معاشرہ کی کامیابی کی بنیاد خدا کے صحیح تصوّر پر ہے۔ جو قرآن نے بتایا ہے۔ یہ موجودہ تصور خدا کا تو ملوکیت کا دیا ہوا تصور ہے۔ اب ملاحظہ کریں۔ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ(59:24) میں خدا کا صحیح تصور۔

❁❁❁

اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ؕ (59:24)

اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ؕ (59:24) هُوَ اللّٰهُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡمَلِكُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُهَیۡمِنُ الۡعَزِیۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَكَبِّرُ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ﴿۲۳﴾ (59:22-23) ساری کائنات میں اس کے سوا اور کسی کا اقتدار نہیں ہے وہ غیب اور شہادت کا جاننے والا ہے اور سب کی درجہ بدرجہ اور فوری / ہنگامی ضروریات کی نشونما کرنے والا ہے۔ وہی ہے ساری کائنات کا اقتدار والا وہ جس کی سرحدیں حدود نا آشنا۔ کا ہے کے لیے السَّلٰمُ (59:23)۔ اپنی ذات کی تکمیل میں انتہا تک اور تمام مخلوق کی نشوونما دیکر ان کی ذات کی تکمیل کرنے والا۔ امن کی حفاظت دینے والا سب کی حفاظت اور نگرانی کرنے والا۔ قوت و اقتدار والا مگر الۡمُتَكَبِّرُ ؕ (59:23)۔ اقدار اعلیٰ کا مالک، (Soverign) س کی صفات میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے وہ اس سے بہت دور ہے۔ معاشرہ کو انہی صفات کا توازن کے ساتھ عکس بنا دو۔ خود بھی ان صفات میں رنگ جاؤ۔

نظریہ ارتقاء کا اس قدر ایجاز صرف ایک آیت میں سمو دیا

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (59:24) ان تین لفظوں میں اربوں سالوں کا ارتقا بند کر دیا ہے یہ ہے۔ اعجاز انفس و آفاق کی تمام تحقیقات ان آیات قرآنی کو ثابت کر رہی ہیں کہ یہ عقل انسانی سے ماوراء سرچشمہ سے ہے۔ شروع سے نظریہ چلا آ رہا تھا کہ کائنات اور تمام مخلوق بشمول انسان جس طرح آج ہے۔ تو اسی شکل میں پہلے دن خدا نے اسی طرح بنا دیا تھا۔ قرآن نے اس نظریہ کی تردید کر دی ہے۔ کہا کہ یہ سلسلہ crude فارم میں اس کی تخلیق کی ابتداء کی۔ اس کے بعد گردشیں ایک طویل پریڈ میں دیکر اس سے تمام حشو وزوائد الگ کئے (الْبَارِئُ) (59:24) پھر اسے موزوں فارم (شکل) دے دی۔

جس طرح کمہار چاک پر مٹی کا تھوبا گھما گھما کر ہاتھوں سے زائد مٹی ہٹا کر الگ کرتا جاتا ہے پھر آخر میں اسے صراحی، پیالہ یا کسی اور کی شکل میں مکمل کرتا ہے یہ تمام بڑے بڑے fossils جو آج موجود ہیں۔ شروع میں بڑے بوجھل، بھدے مگر موجودہ شکل جیسے مگرمچھ۔ انسان ان تمام منازل سے گزر کر آیا۔ پہلے اس کی ابتداء ہوئی پھر یہ بوجھل پن الگ کیا۔ پھر فائنل الْمُصَوِّرُ (59:24) موجودہ شکل میں آیا سلسلہ ارتقاء میں یہ تین منازل گنائی گئی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تو چند صفات خداوندی بیان کی گی ہیں لیکن وہ تو الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (59:24)۔

لاتعداد صفات خداوندی تمام توازن کے ساتھ۔ رحمن و رحیم کے ساتھ جبّار و مُتکبِّر بھی۔ جو بظاہر متضاد مگر توازن سے یہ صفات الحسنی ہوگئی ہیں۔ جس طرح عیسائی صرف رحم والی صفت لے کر ایک طرف الحاد کی طرف نکل گئے کہ اعمال کی رو سے بخشش نہیں ہوسکتی۔ صرف رحم سے ممکن ہے۔ اور وہ بھی کفارہ پر ایمان لا کر۔، یہودیت میں تو توبہ کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ بازآفرینی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نشوونما ذات کی تو بازآفرنی کے بعد ہی ممکن ہے۔ مومن توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ظاہر ہے ظالموں سے تو رحیمی نہیں کرسکتا۔ ورنہ چاروں طرف فساد ہی فساد ہو جائے گا۔ اس کے لیے تو جبار و عزیز ہونا ضروری ہے تاکہ ظالموں کا ہاتھ روکا جائے یہ تمام صفات ایک مومن، اس کی جماعت اور معاشرہ میں توازن کے ساتھ موجود ہونی چاہیں۔

تو آگے کہا يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾ (59:24) ان صفات کو محسوس شکل میں لانے کے لیے جس طرح کائنات کی ہر شے محو کار ہے تیزی سے اور پوری پوری صلاحیتوں کے ساتھ۔ تم بھی وہ معاشرہ ان الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (59:24) پر قائم کرو۔ جس میں قوت کا استعمال چنگیزیّت نہ ہو بلکہ حکمت و دانش ہو۔ جو قرآن عطا کرتا ہے۔

نئی امت الۡبَارِئُ کے پروگرام پر استوار کی جارہی ہے

یہ ایک مخلوط معاشرہ تھا جن سے الۡبَارِئُ کے عمل کے ذریعہ ایک نئی امت وجود میں لائی جارہی ہے۔نظریہ تھا:
"اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ رَبِّکُمۡ ؕ "(60:1) یعنی تقسیم رزق صرف اس کے قوانین سے اور اس نظریہ کے مخالفین خواہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں دلوں کے اندر سے بھی ان تعلقات کو ختم کرنے کا اعلان ہو رہا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ وَ قَدۡ کَفَرُوۡا بِمَا جَآءَکُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَ اِیَّاکُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ رَبِّکُمۡ ؕ اِنۡ کُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِہَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ٭ۖ تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ ٭ۖ وَ اَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَ مَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡہُ مِنۡکُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۱﴾ (60:1)

لَنۡ تَنۡفَعَکُمۡ اَرۡحَامُکُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُکُمۡ ۚ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ یَفۡصِلُ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۳﴾ (60:3) اس کے لیے تاریخ سے ابرہیم کا اسوۂ حسنہ پیش کیا گیا جس نے ماں باپ رشتہ دار گھر بار حتیٰ کہ پوری قوم کی اس زمانے میں ترک کر دیا کہ جب قوم کے بغیر ہونا اور الگ رہنا اس زمانے میں واقعی ایک دل گردے کا کام تھا۔

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡہِمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ ؕ (60:6) اس لیے رسول سے بھی کہا گیا کہ ان سے قطع تعلق کرلو مگر بات ان تک پہنچاتے رہو۔مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ لوگ دل سے اسلام لائے اور انہوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دئے۔

دوسرا گروہ:

یہ جو مخالفت میں شدید نہیں ہیں۔ لَا یَنۡہٰىکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ لَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡہُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ ؕ (60:8) اب ان دونوں گروہوں میں قرآن نے فرق کر دیا۔ان کے ساتھ کشادہ اور حسن وانصاف کی سلوک کرو۔ہاں دوست داری اور یگانگت کا تعلق ان سے استوار مت کرو جنہوں نے تمہارے ساتھ جنگیں کیں گھروں سے نکالا۔انصاف اور حسن سلوک کا حکم تو جانی دشمن سے بھی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

عظیم اعلان:

اب اعلان ہوگیا کہ کوئی مسلم مشرک عورت سے شادی نہیں کرسکتا اب ان کی بیویاں جو اسلام لاکر ابھی مکہ میں تھیں اور جو ہجرت کر کے آئی تھیں تو ان کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی اب یہ مہاجر عورتیں اپنے اپنے مشرک خاوندوں کو بھی چھوڑ کر مدینہ آ گئیں۔ کہا کہ ان کو واپس نہ بھیجو۔ اب نہ وہ ان کی بیویاں ہیں اور نہ وہ مشرک ان کے خاوند۔ ان عورتوں نے بچوں اور کافر خاوندوں کو چھوڑ دیا ہے۔ کہا گیا کہ ان عورتوں کے ذمہ جو خرچہ ان مشرکوں کا ہے ان کو واپس کر و اس اعلان کے ساتھ کہ اب وہ ان کی بیویاں نہیں رہیں۔ مخالفت انتہا پر ہے مگر ایسی مثال کوئی بھی نہیں پیش کر سکتا۔ اب ان مومنوں کی جو عورتیں اسلام نہیں لائیں۔ بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (60:10)۔ وہ عورتیں جو کافر ہیں مگر تمہارے نکاح میں ہیں ان سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ (60:10)

اب اگلی آیت میں یہ تھا وہ حکم اور ایمر جنسی جس کی بناء پر دو، تین اور چار چار شادیوں کا حکم ان کی حفاظت کے لیے دیا گیا۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ (60:10) اور جو عورتیں مومنوں کے نکاح میں تھیں مگر اسلام نہیں لائیں تو کہا وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ (60:10) عِصْمَةٌ کی جمع عِصَمَ ہے یعنی نکاح میں ہونا۔ كَوَافِرَ جمع ہے كَافِرَةٌ کی اب ان تمام عورتوں سے بھی مال و جان اللہ کی رہ میں دینے کا عہد لیا گیا اور تنبیہ کر دی گئی کہ جو لوگ اس نظریہ کے مخالف ہیں ان سے یگانگت اور مُوَدَّةً کے تعلقات قائم نہ کرو۔ باقی معاہدات حسن سلوک اور انصاف کے تقاضے پورے کرتے رہو جو انسانی تقاضا ہے۔ قومیت کی بنیاد نظریہ پر ہے۔ قائداعظم قرآن کی ان تعلیمات کی روشنی میں پرانے نظریہ سے دستبردار ہوئے تھے اور دو قومی نظریہ کے علم بردار ہو گئے۔ اس شخص میں منافقت تو نہیں تھی۔ صرف دو قومی نظریہ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ (58:22)، حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ (58:19)۔ مگر ان کو سیاسی معاہدات کے حسن سلوک، انصاف کے تمام تقاضوں کا حکم دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کتاب میں ربط نہیں ہے۔:۔

(72) یہ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں ربط نہیں ہے۔ اور ایسی آیات اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ جو پچھلی سورۃ الممتحنۃ کے فوراً بعد الصّف آ رہی ہے۔

سورۃ الصّف (61:1-4)

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ① یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④ (61:1-4) ان آیات میں بڑی معنویت اور ایک گہرا ربط ہے۔ خارجی کائنات اپنی ساری صلاحیتوں کے ساتھ محوِ گردش ہے اور ٹھوس تعمیری نتائج پیدا کر رہی ہے۔ یہ باتوں کی بجائے خاموشی سے، تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ جو قوم ایک مقصد میں مصروفِ عمل ہو تو وہ محض باتیں نہیں کرتی۔ کام اور کام، مگر تمہاری کیفیت یہ ہے کہ جو کہتے ہو وہ کرتے نہیں ہو۔ قوت گویائی بھی ایک مقصد کے لیے دی گئی ہے۔ مگر ان کی ساری تاریخ ان لا حاصل بحثوں، مناظروں اور افسانہ طرازیوں سے لدی ہوئی ہے۔، ذرا ان مجاہدین کو دیکھو کہ کس طرح سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مصروفِ جہاد ہیں۔ یہ ہیں خدا کے پسندیدہ لوگ۔ اسی طرح موسیٰ کی قوم نے بھی باتیں کر کر کے ان کو ستایا تھا۔ اور ایک گائے کے ذبح کرنے میں اتنی حجتیں پیش کیں۔ یہ دنیا بھر میں جو اسلام کی مخالفت ہو رہی ہے۔ یہ وہ اسلام تو نہیں ہے یہ تو ملوکیت کا خود ساختہ اسلام ہے۔ اسلام تو دنیا کے سامنے اصل شکل میں نہیں پیش کیا گیا۔ مگر وہ نظری طور پر جس نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہ اسلام ہی ہے قرآن والا اسلام۔ یہ قرآن کے سامنے ان کے بڑے بڑے سکالر سر جھکا دیتے ہیں مگر سوال یہی کرتے ہیں۔ اگر یہ اتنا اچھا نظام ہے تو پھر کیوں 50 اسلامی ممالک میں کسی نے بھی نافذ نہیں کیا۔ اس لئے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② (61:2) سارے عالمِ اسلام کی یہی کیفیت ہے۔ اسلام اسلام کرتے کرتے ان کی زبانیں نہیں تھکتیں۔ مگر نظامہائے زندگی سیکولر نظریات پر رکھے ہوئے ہیں۔

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

❁❁❁

رسول کا مشکل ترین مشن

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ (١) هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (٢) وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (٣) (62:1-2-3) جس طرح خارجی کائنات میں یہ وحی ازخود رکھ دی اور وہ ان قوانین کے تابع بلاچوں چراں پوری صلاحیتوں کے ساتھ محوگردش رہ کر تعمیری نتائج پیدا کر رہی ہے۔اس طرح سے اس قوم کی طرف بھی جو پہلے اس قسم کی کتاب اور رسول نہیں رکھتے تھے۔یہ قرآن نازل کیا گیا ہے۔

رسول کا مشکل ترین مشن:

ابتدائی تیرہ سالہ نبوّت اور باقی مرتے دم تک پہلی چیز ان کو پڑھ کر سنانا۔اور قوانین کی تعلیم سے آگہی اور غرض وغایت بتانا۔اور یُزَكِّیْهِمْ (62:2) اور تربیت اس انداز سے کرنا کہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ان قوانین کے ذریعہ محسوس شکل میں اس نظام کو قائم کرنا تا کہ ان کی منفعت مشہود طور پر سامنے آجائے۔قلب ونگا میں تبدیلی تعلیم وتربیت سے ہوتی ہے جو بڑا صبر آزما اور جان گسل مرحلہ ہے۔حکمت سے مراد عقل وشعور،بصیرت ودلائل کی رو سے دل کی گہرائیوں میں یوں راسخ کرنا کہ ان کا اتباع دل کا تقاضہ بن جائے۔اگر صرف ذہن تک رہے تو بڑے بڑے فلاسفر ذہنی بلندیوں کے باوجود کردار وسیرت کے لحاظ سے گھناؤنا روپ دھار لیتے ہیں کیونکہ وہ علم ان کے دل کا تقاضہ نہیں بنتا۔ان تمام برائیوں کو دور کر کے ان کو سیرت کی اتنی بلندیوں پر پہنچا دینا کہ تاریخ میں اس جماعت کی مثال نہیں ملتی

اگر میں چاہوں تو نقشہ کھینچ کر رکھ دوں
مگر تمہارے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارا

اس تربیّت نبوی سے عمر فاروق اعظم بن گیا۔اب تو اس کتاب کی جگہ مِثْلَهٗ مَعَهٗ (5:36) اور فقہ انسانوں کا آگیا۔اور حکمت کی جگہ حکمت عملی اور مصالحت آگئی۔عقل وبصیرت تو خارج از قرآن قرار دے دی گئی۔معتزلہ کو اس وجہ سے مرتد قرار دے دیا گیا۔یہ ضربیں،مراقبے،تسبیح،ذکر اور پرستش تزکیہ نفس ہو گیا۔نفس کشی خانقاہیت سے مُزکیّ ہو گیا۔بات تو ساری تربیت کی ہے۔

1043
ایسے افراد تیار کرنا جنہوں نے چلتا پھرتا قرآن بن جانا تھا۔ کیا اس معاشرہ کو ان غیر تربیت یافتہ غیر مزکی لوگوں کی مدد سے جنت بنایا جا سکتا ہے۔ یہ تو قیامت تک ناممکن ہے۔ یہ تو لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ط (62:3) یہ تو ان وارثین کتاب کا کام تھا۔ ان کے لئے یہی طریقہ کتاب وحکمت، تعلیم وتربیت کا، جو قرآن نے بتادیا ہے۔ انہوں نے تو شان نزول کے ذریعہ اس آیہ کو ایرانی قوم سے مختص کر دیا۔ کہا گیا کہ یہ سلمان فارسی کی قوم کے بارے میں ہے۔ اگلی کی ہی آیت میں ہماری تصویر یہودیوں کی مثال میں بتادی گئی ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ط بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (62:5) اب اس قوم کی مثال جس کی کیفیت یہ ہے کہ ان کو تورات تو دی گئی تھی تا کہ اس کی ذمہ داریاں اٹھائیں جو اس میں فرائض وذمہ داریاں تفویض کی گئی تھیں۔ تو یہ اسے یوں اٹھائے پھر رہے ہیں جیسا کہ ایک گدھے پر کتابیں لاد دی گئی ہوں تو بھلا گدھا کیسے ان سے مستفیض ہوسکتا ہے۔ لَمْ يَحْمِلُوْهَا (62:5)۔ انہوں نے اس کتاب کی ذمہ داریاں نہ اٹھائیں یعنی اس نظام کو ان اقدار پر متشکل نہ کیا۔ یہ تھی تکذیب اس کتاب کی۔ تو بھلا ایسے ظالموں کو جو کسی چیز کو اپنے صحیح مقام پر نہ رکھیں۔ کیسے منزل مل سکتی ہے؟ یونہی ساری زندگی بھٹکتے رہیں گے۔ جس طرح ہم مسلمانوں نے قرآن سے سلوک کیا۔ وہی یہودیوں نے جو تورات کے ساتھ کیا تھا۔ عملی طور پر اس کتاب کو زندگی کا حصہ نہ بنانا یہ ہے تکذیب۔

يَوۡمِ الۡجُمُعَةِ (62:9)

اجتماع کا دن نہ کہ کسی خاص دن کا نام

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ‏ ﴿۹﴾ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ‏ ﴿۱۰﴾ (62:9-10) اسلام ایک اجتماعی نظام ہے جس میں باہمی مشاورت سے معاملات طے ہونگے۔حدیث ،تاریخ ظنی اور ناقابل بھروسہ ہیں جو عام تاریخی معیار پر بھی پورے نہیں اترتے بغیر کسی مواد کے،صرف زبانی روایات پر یعنی یہ سارالٹریچر جوملوکیت کے دور میں تین صدیاں بعد مرتب ہوا۔ ہرحدیث میں قَالَ رَسُولُ اللهِ سے شروع ہوکرآخرمیں کما قَالُ رسول اللہ۔ سے ظن ثابت ہوگیا۔اسی طرح سے تاریخ اوران کا سارامرتب کردہ لٹریچر بھی ہے۔قرآن کی موجودگی میں ان ظنّیات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔قرآن سے ان تمام اصطلاحات کو Reconstruct''(ریکنسٹرکٹ) کریں۔اور موجودہ تقاضوں کے مطابق ان تمام جزئیات کو طے کریں۔ یہ تمام دین کی اصطلاحات اس مذہب میں ''فٹ ان'' Fit in)) نہیں ہوسکتیں۔جھوٹا اطمینان کہ باجماعت نماز میں زیادہ ثواب بمقابلہ انفرادی طور پر ادا کرنے میں اور جمعہ کی نماز کی تو ثواب کی فضیلتوں سے ان کا ظنّی لٹریچر بھرا ہوا ہے۔ جو اگلی دنیا میں جا کر ملے گا۔جبکہ قرآنی صلوۃ کا دعوی تو اس دنیا میں تمام برائیوں اور جرائم کے خاتمہ کا اعلان ہے۔ یہ صلوۃ معاشرہ کو ان جرائم سے پاک کردے گی۔اس کا ثبوت،کسوٹی یہ ہے کہ قرآن اسی دنیا میں اس صلوۃ کا نتیجہ ان برائیوں کی روک تھام کے علاوہ بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ تمام ارکان اس اجتماعی نظام کا جزو ہیں۔ یہ باجماعت ہے مگر اس کا اعلان حکومت کرے گی۔اوقات کاتعیّن حکومت کرے گی۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا‏ ﴿۱۰۳﴾ (4:103) یہ وقت مقررہ پر فریضہ کے ادائیگی ہوگی۔کا ہے کے لئے۔وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (42:38) مشاورت ہوگی۔ یہ تو ساری امت کا اجتماعی فریضہ وقت مقررہ پر ہوگا۔(كَانَتۡ (4:103)۔ہوگا)

1043 اس میں حاضری لازمی قرار دی گئی۔ تاکہ باہمی مشاورت سے امور کا حل نکالا جائے۔ انہی کی اس تاریخ میں یہ چمکتی ہوئی روایت "اَلصَّلٰوۃُ الجَامِعُ" کی اصطلاح مل جاتی ہے۔ اس میں ابتداء قرآن کی آیات سے ہوتی تھی۔ کوئی آدھ ایک رکعت اگر محسوس شکل میں ہوتی تو وہ ادا کرنے کے بعد مشاورت ہوتی تھی۔ اس اجتماع کے لئے یہ یَوْمُ الجُمُعَةِ یہ اجتماع کا دن اہم ہے سارے کام کاج چھوڑ کر چلے آؤ۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴿۴۳﴾ (2:43)۔ اور سب کے ساتھ ان فیصلوں کی اطاعت کرو۔

عربوں کے ہاں اسلام کے پہلے ایسے اجتماعات ہوتے تھے۔ دارلندوۃ میں اسے وہ "یَوْمَ الْعُرُوْبَةِ یَوْمَ الْجُمُعَةِ" کہتے تھے۔ اس اجتماع کا مقصد اور غرض وغایت تھا۔ یہ پوجا پاٹ پرستش تو قرآن میں کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ نماز تو تباہی اور بربادی کی طرف امت کو لے جا رہی ہے۔ صلوۃ'' کو قَامَ'' کا حکم ہے۔ یعنی قائم کرنے کا۔ کہیں بھی پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے لئے ہفتہ میں خواہ ایک دن، دو دن مقرر کرے مگر اس کا اختیار صرف حکومت کو ہوگا۔ انہوں نے تو اس کو پانچ وقت کے لئے قیامت تک کے لئے غیر متبدل کر دیا۔ جب حکومت ضرورت محسوس کرے گی۔ تو پہلے سے اس کا اعلان کرے گی۔ تو جب یہ اجتماع میٹنگ اختتام پذیر ہو تو ذِكْرًا كَثِيْرًا ۔ تو یہ نہیں کہ صرف یہ اجتماع تک محدود تھا بلکہ زندگی کے ہر گوشہ میں ان قوانین کو پیش نظر رکھو تا کہ مفلحون۔ تمہاری کھیتیاں بار آور ہو سکیں۔ یہ قوم تو عقل وبصیرت سے عاری بھیڑ بکریوں کی طرح چرواہے کی لامعنی آوازوں پر ہزار برس سے لگی ہوئی ہے۔

چھٹی کا معاملہ:

یہودیوں نے سبت، چھٹی کا دن ہفتہ کو ڈیکلر کیا کیونکہ خدا نے چھ دنوں کام کر کے کائنات بنائی اور ساتویں دن آرام کیا۔ عیسائی چونکہ صلیب عیسیؑ کی وجہ سے ان کے جانی دشمن تھے۔ تو انہوں نے ہفتہ کی بجائے اتوار کو ہولی ڈے قرار دیا۔ ختنہ سے انکار اور خنزیر کھانا شروع کر دیا۔ اب یہ پھر کیسے پیچھے رہتے۔ انہوں نے جمعہ کا دن چھٹی منانے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ قرآن نے کہا کہ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ (62:9)۔ اور جب اجتماع ختم ہو جائے تو کہا فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (62:10)۔ ان کا یہ فعل یہ جمعہ کی چھٹی تو سراسر قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔

اگلی آیات میں ان بدوؤں کا ذکر ہے جو کچا ایمان رکھتے تھے۔ یہ باہر کوئی تماشہ یا تجارتی قافلہ دیکھتے تو اس اجتماع کو چھوڑ کر ادھر بھاگ جاتے۔ تو کہا کہ بھائی اگر ادھر آؤ گے تو اس نظام کی رو سے تمہیں سب سے زیادہ بہترین سامان نشوونما ملے گا۔ اس نظام کی رو سے جو قائم ہو رہا ہے۔

جو تعریف منافق کی موجودہ دور میں کی گئی ہے

جو نفسیات کی روشنی میں حق ثابت ہوئی

ایک عظیم نفسیاتی ڈسکوری:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۞ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ (63:1-2) یہ ایک عظیم حقیقت ہے جس کو قرآن نے بیان کیا ہے کہ منافقین کہتے ہیں کہ تو یقینا خدا کا رسول ہے اور اللہ بھی مانتا ہے کہ تو یقینا خدا کا رسول ہے اور خدا شھادت دے رہا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں یعنی یہ زبان سے تو کہہ رہے ہیں مگر دل سے ان کا اس بات پر ایمان نہیں ہے۔ یعنی بات تو سچی ہے مگر یہ جھوٹے ہیں۔ وائٹ ہیڈ نے منافقت کی تعریف یہ کی کہ Appearance and Reality کا ہم آہنگ نہ ہونا۔ اس پر اس کی تعریفوں کے پل باندھے گئے۔ حالانکہ یہ بات چودہ صدیاں قبل قرآن نے کہی ہے۔ جھوٹ اور سچ کی یہ تعریف کہ بات تو سچی ہے لیکن کہنے والوں کی چونکہ دل اور زبان میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہنے والے جھوٹے ہیں۔ یہ ڈیفینیشن (Defination) تو خدا ہی دے سکتا تھا۔

معاشرہ میں ہر قسم کا جرم اسی منافقت کی وجہ سے ہے۔ ایک دوسرے سے اعتماد کا فقدان ہو گیا ہے۔ جس معاشرہ میں عجمی اسلام یہ فتویٰ دے دے کہ ضرورت کے تحت جھوٹ بولنا واجب ہے۔ اور اسے اس ذات اقدس کا اسوہ حسنہ بتایا جائے۔ اور اسی اسلام کو عام کیا جائے ساری دنیا میں۔ ان سے آگے بڑھیے تو دودھ کے باطن اور ظاہر میں ہم آہنگی کا فقدان۔ دوائیوں میں منافقت زندگی کے تمام شعبوں سیاست، صحافت، تعلیم، پروڈکشن، تعلقات، ظاہراً اور باطناً حقیقت اور Appearance میں ہم آہنگی نہ رہے۔ منافقت ہو۔ تو بھلا ایسے معاشرہ میں سکون اور امن کیسے ہو سکتا ہے؟ جن کا مذہب بھی منافقت پر مبنی ہو۔ زندگی کا ہر شعبہ اس سیلِ سبک رو سے متاثر نظر آتا ہے۔ اب قسمیں کھا کھا کر ان کو ڈھال بنا کر منافقت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان صحیح اقدار پر چلنا بھی چاہے تو اس کو چلنے ہی نہیں دیتے۔ نہ خود چلتے ہیں نہ دوسروں کو چلنے دیتے ہیں۔ یہ ہے گھناؤنا کردار۔ قابل مذمت

کردار۔ یہ بڑے بڑے دانشور اپنے مفادات کے لئے یہی روش اپنائے ہوئے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَفۡقَهُوۡنَ ﴿۳﴾ (63:3) کیونکہ یہ ایمان لانے کے بعد ان چیزوں کو پوشیدہ رکھتے ہیں ان سے انکار کرتے ہیں۔ تو ان کے ذہن نفسیاتی طور پر ماؤف ہو جاتے ہیں۔ پھر کوئی بات عقل وفکر سے جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔

وَاِذَا رَاَيۡتَهُمۡ تُعۡجِبُكَ اَجۡسَامُهُمۡ ؕ وَاِنۡ يَّقُوۡلُوۡا تَسۡمَعۡ لِقَوۡلِهِمۡ ؕ (63:4) پرسانلٹی اور شخصیت اتنی متاثر کن اور باتیں تو ایسی کہ سننے کے لائق كَاَنَّهُمۡ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ (63:4) مگر اندر سے ایسے گویا گھن کھائی لکڑی جو دوسروں کے سہارے پر ہی کھڑی ہو سکتی ہے۔ بزدلی ایسی کہ يَحۡسَبُوۡنَ كُلَّ صَيۡحَةٍ عَلَيۡهِمۡ ؕ (63:4) پتہ کڑکا۔ ذراسی آواز آئی تو سمجھتے ہیں کہ یہ تو ان کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ (63:4)۔ ستیاناس ہو ان کا۔ غارت کرے ان کو خدا۔ اصل دشمن تو انسانیت کے یہی لوگ ہیں۔

❁❁❁

مہلّت کا وقفہ انسان کو مغالطہ میں ڈال دیتا ہے

چونکہ فوراً گرفت نہیں ہوتی کسی جرم کی۔ اس لئے انسان مغالطہ میں رہتا ہے کہ کہاں کا مکافات عمل اور کہاں کا قانون؟ تو وہ مزید سرکشیاں کرنے لگتا ہے۔ جس طرح بیج بونے کے بعد پھل کے پکنے تک ایک اجل یعنی مہلّت ہے۔ وہ اس مقررہ وقت سے پہلے نہیں ہوسکتا۔ وہ غیر محسوس ہوتا ہے۔ مگر بیج آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ نشوونما پا کر انجام تک پہنچتا ہے۔ اصل میں طبعی قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ تو فوراً سامنے آجاتا ہے۔ آگ میں انگلی ڈالو تو جلا دیتی ہے۔ تو انسان محتاط ہوجاتا ہے۔ مگر اقدار کی خلاف ورزی کا نتیجہ برآمد ہونے کا ایک الگ قانون ہے۔ اس کے لئے مہلت کا وقت درکار ہوتا ہے۔ فوراً اگر کسی مجرم کی گردن دبوچ دی جائے تو پھر یہ اختیار و ارادہ سے محروم کرنے والی بات ہوگی۔ جو خدا کی مشیت میں نہیں ہے۔ اس نے تو خود ان سرکشی قوتوں سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ ہاں تم جو جی چاہے کرلو مگر جو کرو گے تو اس کا نتیجہ ضرور ملے گا۔ یہ مہلت کا وقفہ اور ساتھ ہی ساتھ سریع الحساب بھی تو اس سے مغالطہ ہو جاتا ہے۔ اصل میں حساب کتاب تو ساتھ ساتھ بینک اکاؤنٹ کی طرح کریڈٹ میں سے ڈیبٹ ہوتا رہتا ہے۔ جب سارا کریڈٹ ختم ہوجائے تو پھر بیلنس شیٹ سامنے آجاتی ہے۔ یا یوں سمجھ لیں کہ تخریبی پلڑے کا وزن جب تعمیری پلڑے کے مقابل میں زیادہ ہو جائے تو نتیجہ فوراً سامنے آجاتا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱ (63:10-11) اگر نتیجہ سامنے نہ آئے اس زندگی میں تو زندگی تو جوئے رواں ہے۔ آگے جا کر سامنے آجاتا ہے۔ یہی تو ہر ایک کی قیامت ہوتی ہے۔ کہا مہلت کا وقفہ گزرنے کے بعد توبہ مقبول نہیں ہوتی۔ اور نہ مہلت میں تاخیر ہوتی ہے۔ کیونکہ موت کا تو پتہ نہیں کہ کب آئے؟ اس لئے ان اقدار کو فوراً اپنا لو۔

❁❁❁

جنّتی معاشرہ جلال و جمال کا امتزاج

لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① (64:1)

اقتدار وستائش دونوں اس کے لئے ہیں۔ ان قوانین میں اس قدر طاقت ہے کہ ان کے نتائج سے ہر زبان پر حمد وستائش جاری ہو جاتی ہے۔ ایسا اقتدار جو حمد وستائش ہو جلال و جمال کا امتزاج ہے۔ مظلموں اور بے کسوں کی مدد وحفاظت اور ظالموں کی کلائی مروڑنے کا اقتدار۔ یہ ہے وہ اسلامی معاشرہ جس میں ان دوصفات کا عکس ہو جوان ''صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ ''(2:138) میں رنگا ہوا ہو۔ اگر اقتدار چنگیز کا ہو تو انسان بلبلا اٹھتا ہے۔ اس اقتدار کی تو حمد وستائش نہیں ہوگی۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ (2:138) وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① (64:1) اور یہ اقتدار ان قوانین کی رو سے ہوگا جو قرآن میں دے دیئے گئے ہیں۔ نافذ کرنے والے قدیر کی صفت کے حامل ہونگے۔ تین لفظوں میں سارا نظام آ گیا۔ یہ قصیدہ خوانی نہیں ہے بلکہ اس میں نوع انسانی کا ذکر ہے۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③ (64:3) قرآن اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس کو انسانی فکر کا بھی علم ہو انہی دلائل کی رو سے ثبوت ملتا ہے کہ یہ قرآنی فکر ماورائے انسانی فکر ہے۔ صُوَرَكُمْ ۚ (64:3)، پیکر۔ صورت، فارم۔ یہ ہے لائف کی وہ سٹیج جس میں پہلو بدلتی ہوئی مختلف اطوار سے ہوتے ہوتے یہ ایسا پیکر جو احسن ہے اختیار کیا۔ اس کو صرف خوبصورتی تک محدود نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ انسانوں میں تو بدصورت بھی ہوتے ہیں۔ اور خوبصورت بھی۔ بات اس جسم کی ہی نہیں ہو رہی ہے۔ گوریلا کو دیکھئے پاؤں فلیٹ ہونے کی وجہ سے اس کا چلنا دشوار ہوتا ہے۔ مگر انسان کو پاؤں میں (Curve) دے دیا۔ یہ اس پاؤں پر متوازن کر دیا گیا اور دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے۔ یہ تو ہوا ایک پہلو۔ اگر اس لحاظ سے انسان کا مطالعہ کیا جائے تو کئی دیگر خصوصیات سامنے آئینگی۔ یہ تو ہوا حیاتیاتی یا طبعی توازن۔ اب اللہ کی صفات تضادات کے باوجود توازن ہے۔ عزیز کے ساتھ حکیم بھی۔ الملک کے ساتھ الحمد بھی ہے۔ اگر ہر صفت کو الگ الگ رکھا جائے تو تضاد ہوگا۔ تو یہ ہوگا۔ ''يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ'' عیسائی اور یہودی ایک ایک صفت لیکر انتہا تک لے گئے اب عدل اور رحم میں توازن نہ رہا۔ جبکہ قرآن نے ''غفور رحیم'' کہا۔ متضاد صفات میں توازن رکھنا یہ ہے فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ (64:3) ''بن جانا انسانی سطح پر

1043
تا حد بشریت۔لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝ (95:4-5) یہ تو ان صفات کی تقویم کی بات ہے ورنہ یہ تو پستی کی سب سے نچلی سطح پر پہنچ جائے گا۔اس کے اندر مضمر صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ توازن قائم رکھے۔ان تمام صلاحیتوں میں۔اور جب وہ رجوع کرے گا۔''وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ۝'' (42:15) اس کی صفات کی طرف رجوع کرنے سے ہی وہ بلند انسانی سطح پر تقویم حاصل کرے گا۔

کائنات میں علت ومعلول: Law of cause and Effect

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (64:11) جو بھی کائنات میں کوئی واقعہ یا حادثہ ہوتا ہے وہ خدا کے قوانین کی علت ومعلول کی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے۔یعنی بغیر علت کے کوئی واقعہ کائنات میں نہیں ہوتا۔چونکہ مومن کائنات کے ان غیر متبدل قوانین طبعی پہ یقین رکھتا ہے کہ یہ تو خدا کے قوانین ہیں تو غور وفکر سے وہ اس بات کو بھانپ لیتا ہے۔کہ اس واقعہ کی وجہ کیا ہے؟ اور اللہ ان تمام چیزوں کا علم رکھتا ہے۔کہ اس نے ان قوانین کو علت ومعلول کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔اس لئے یہ وحی بھی اس کی طرف سے انسان کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے دی گئی ہے۔اس لئے ان کی اطاعت جماعت کی حیثیت سے ایک مرکز کی اطاعت ہے مگر کسی جبر واکراہ کے بغیر۔

نبی کو تنبیہ کہ اس کا ہر عمل شریعت بن جاتا ہے اور گھر میں ہم آہنگی پیدا کرنا

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ② (66:1-2) اے نبی! تو اس چیز کو کیوں ممانعت۔ پابندی قرار دے رہا ہے اپنی بیویوں کی پسندیدگی کی خاطر جس کو خدا نے حلال قرار دیا ہے۔ یہ تنبیہ اس لیے کی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے تمہارے لیے سامان حفاظت اور نشوونما میں کمی نہ ہو۔

بات یہ ہے کہ تیرا یہ عمل تیری ذات تک محدود نہیں رہے گا اور بعد میں متبعین اسے ایک ابدی شریعت بنالیں گے۔ خدا نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے تو ان کو نبی بھی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ تو رسول اس قسم کی معصیت تو نہیں کرسکتا۔ تو اس تحریم سے مراد حرام قرار دینا نہیں عرف عام میں بلکہ اس سے مراد، ممانعت کرنا۔ پابندی لگانا ہے۔ یعنی اگر نا پسندیدہ ہے تو اگر وہ حلال ہے تو اسے حرام تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اگر طیب نہ ہو۔ پسند نہ وہ تو نہ کھائیں۔ جو موافق نہ ہو تو ان معنوں میں یہ پابندی ہے۔ ہ تنبیہ اس لیے دی گئی کیونکہ نبی کا ہر عمل لوگوں کے لیے شریعت بن جاتا ہے۔ جس طرح یعقوبؑ کو اونٹ کا گوشت موافق نہیں تھا حالانکہ یہ حلال تھا مگر بعد میں بنی اسرائیل نے نبی کے اتباع میں اسے ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیدیا۔ اس لیے یہ تنبیہ آئی ہے کہ بعد میں کہیں یہ ابدی قانون نہ بن جائے

؎ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

یعقوبؑ کا واقعہ اس لئے قرآن نے محفوظ کر دیا ہے۔ عام انسان تو یہ کر سکتا ہے مگر نبی کا مقام تو بلند ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل بعد میں ابدی شریعت بن جاتا ہے۔

اگر تم نے اس قسم کی کوئی قسم کھا رکھی ہے تو اس کو توڑنے کا کفارہ بھی قانون میں رکھ دیا گیا ہے۔ (5:57،2:22)

دوسری اہم بات گھر میں ہم آہنگی کا پہلو اجاگر کرنا:

دوسری بات یہ کہ نبی ﷺ نے کوئی رازداری کی بات کسی بیوی سے کی یہ چھوٹی موٹی باتیں تو گھروں میں ہوتی رہتی

1043
ہیں۔قرآن میں اسی لئے اسے محفوظ رکھا گیا ہے تاکہ گریلو زندگی میں مکمل ہم آہنگی کے لئے ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔اس سورہ میں دوسری وضاحت طلب بات "نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۳﴾" (66:3) یعنی وحی کے ذریعہ بتایا گیا اور یہ تو قرآن میں ہے نہیں تو اس سے وحی خفی کی سند لاتے ہیں۔حالانکہ بے شمار مقامات ایسے قرآن میں موجود ہیں۔کہ خدا ان چیزوں کو بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے جو انسان خود کرتا ہے۔

(5:4) تم شکاری کتوں کو اس علم پر سدھاتے ہو جو خدا نے تمہیں دیا ہے۔اب خدا کسی کو نہیں سکھاتا مگر فطری طریقوں کو بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔اسی طرح عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ (96:4)۔یعنی وہ صلاحیت جو خدا نے رکھ دی ہے۔اصل میں ان تمام علت و اسباب کا آخر میں تو وہی ہے۔مُسَبِّبُ الْاَسْبَابِ۔۔۔

تو علیم وخبیر نے بتایا ہے، سے مراد یہ نہیں کہ خدا نے بتایا ہے بلکہ اگر کہیں اور سے بھی پتہ چلا ہے تو اس کو بھی خدا نے اپنی طرف منسوب کر دیا ہے۔اصل مدعا تو گھریلو زندگی کو جنت بنانا ہے۔اس میں کسی قسم کی بھی خلش نہیں ہونی چاہئے۔یہ ساری بات قرآن نے اس لئے محفوظ کی ہے کہ یہ ہمارے لئے تلقین ہے کہ اگر یہ خلش دور نہ ہو سکے تو بہتر ہے الگ ہو جاؤ۔ورنہ گھریلو زندگی جہنم کدہ ہو کر رہ جائے گی۔پھر زندگی کے امور صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکو گے۔

اگر ہم آہنگی باقی نہ رہے تو ہم مزاج عورتوں سے شادی کرلو:

خاص کر عورتوں کو معاشی ڈر ہوتا ہے۔اور وہ اس جہنم سے نکلنے سے بھی ڈرتی ہیں۔تو یہ ان کا اقتصادی مسئلہ وہ خاوند یا حکومت اس کا خیال کرے۔(33:51،33:28)

عورت یا مرد کا ہمیشہ کے لئے معیار:

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ﴿۵﴾ (66:5) اب سربراہ خاندان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی اور خاندان کو بھی اس آگ سے بچائے جس میں ایک گھر میں ایسے لوگ جمع ہو جائیں جو اقدار خداوندی کا خیال نہ کریں۔تو پھر تمام نفسیاتی، کائناتی قوتیں ان سربراہوں کو، گھر والوں کو اس آگ میں عمر بھر جلاتی رہتی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾ (66:6) اگر اس طرح کے متضاد خیالات والے ایک گھر میں جمع ہو گئے تو پھر کائناتی قوتیں اس گھر کو جہنم کدہ بنا دیں گی۔اور اس آگ کا ایندھن تمام گھر والے اور ان کا سربراہ ہوگا۔اور یہ قوتیں پھر وہی کرتی ہیں جس طرح کا کام اس طرح کا فعل اور اس سے سرکشی نہیں کرتیں۔

اس لئے یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ گھر کے اندر ہو یا باہر، ان سب کو گھریلو زندگی کے اس دہکتے ہوئے عذاب سے بچاؤ۔

❁❁❁

کسی کا مومن ہونا دوسرے کو فائدہ نہیں دے سکتا اور نامساعد حالات میں بھی اپنے آپ کو نافرمانی سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے

بات عائلی زندگی سے شروع ہوئی اور اعمال کے نتائج تک آ گئی کہ کسی کا مومن ہونا دوسرے خونی یا ازدواجی رشتوں کو بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝١٠ (66:10) ان سے کہو کہ نوح اور لوط تو نبی کے بلند مقام پر تھے مگر ان کی بیویاں ہم آہنگ نہیں تھیں۔ نظریات میں فرق بتایا تو نبیوں کی بیویاں ہونا بھی ان کو عذاب سے نہ بچا سکا۔ کیونکہ انہوں نے قانون خداوندی میں خیانت سے کام لیا۔

نامساعد حالات میں بھی اگر ایمان دل میں جاگزیں ہو تو فلاح و فوز مل سکتا ہے:

مثال دنیا کے سب سے بڑے ڈکٹیٹر فرعون کی بیوی کی قرآن لاتا ہے۔ اور دوسری طرف بی بی مریم کی جرات و شجاعت کہ ہیکل کے قوانین سے بغاوت کر دی اور ان کی شریعت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خدا کے احکامات کے تحت شادی کی اور عیسیٰؑ جیسا بیٹا خدا نے عطا کیا۔ اور اس کو دنیا کی ساری عورتوں پہ فضیلت عطا کر دی۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝١١ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝١٢ (66:11-12) جس طرح فرعون کی بیوی نے ایک کافر کے گھر میں اسلام کا نظریہ دل سے محو نہیں کیا اور مریمؑ نے اس قدر نامساعد حالات میں شریعتِ خداوندی کے تحت گھر بسایا اور انسانوں کی خود ساختہ شریعت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔

❁❁❁

قرآن میں تین انقلابات کا مفہوم

قرآن ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔آخری پاروں میں جو انقلابات ہیں وہ تین اقسام کے ہیں۔اس میں سے خارجی کائنات میں انقلاب ہے جس میں کرے آپس میں ٹکرائیں گے۔سورج اور چاند کی روشنیاں مدھم پڑ جائیں گی۔ستارے جھڑ جائیں گے۔یہ خارجی کائنات میں تغیر کس قسم کا ہوگا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ انقلاب کیسا ہوگا مگر یہ مغربی سائنسدان اس تحقیق پر مصروف ہیں۔وہ یہ ابھی سے کہہ رہے ہیں جو نا قابل فہم ہوتی ہے عام آدمی کے لئے۔ان کا کہنا ہے کہ کشش ثقل کی وجہ سے یہ تمام کرے اپنے اپنے مقام پر محوگردش ہیں۔اگر حرارت میں ذرا بھر فرق آیا تو تمام کرے پاش پاش ہوجائیں گے۔اس انقلاب کے متعلق ہم کیوں سر کھپائیں کیونکہ اس وقت تو ہم نہیں ہونگے۔اگر ہونگے بھی تو بس ایک ٹکڑا آیا اور ختم۔

دنیائے انسانیت مس عالمگیر انقلاب:

یہ عالمگیر انقلاب قرآن اقوام کے اندر بتا رہا ہے۔اس میں تمام انسانیت قرآنی نظام پر آجائے گی۔

تیسرا انقلاب:

یہ انقلاب مرنے کے بعد کی زندگی کا ہے جسے آپ قیامت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔اب ان آخری دو پاروں میں اشارات کے ذریعہ ان ہی میں سے کسی نہ کسی انقلاب کی طرف اشارہ ملے گا۔

مجازی معنی:

مجازی معنی کسی خاص دور تک محدود نہیں ہوتے۔جوں جوں دنیا میں انکشافات ہوتے رہیں گے۔انقلابات آتے رہیں گے۔مجازی معنی کی فہرست اور زیادہ لمبی ہوتی جائے گی۔جو مجازی معنی لئے جاتے ہیں ان کو تو اپنے دور کی علمی سطح پر سمجھانے سے مراد ہوتی ہے تو وہاں ان میں مجازی معنی لئے جائیں گے۔کیونکہ یہ حقائق مرتکز شکل (Concentrated Form) شکل میں ہیں تو ان سے بیشتر مجازی معنی لئے جائیں گے۔

اسلامی نظام کے خدوخال

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝ (67:1-2) آخری دو پاروں میں یہ حقائق مرتکز ہو کر آ گئے ہیں۔ ''بَرَكَ'' کوئی شے جو اپنی جگہ محکم کھڑی ہو اور نشوونما پا رہی ہو۔ اگر کوئی کونپل یا درخت اپنے مقام سے اکھڑ جائے تو پھر اس میں نشوونما نہیں ہوگی۔ اور عربی زبان کے کسی لفظ میں بھی اگر باء اور راء اکٹھے آ جائیں تو اس میں بارز ہونا یعنی نمود و ظہور ہونے کے معنی ضرور ہونگے۔ یہ خصوصیت تمام ایسے الفاظ میں ہوگی۔ اس طرح جو ذات اپنے مقام پر محکم بھی ہو۔ غیر متبدل اور سامان نشوونما دینے والی ہو۔ اور الْمُلْكُ ۡ (67:1) سے مراد کلی اقتدار اس کا ہو۔ قرآن نے احکامات کے بالمقابل اصول دیئے ہیں۔ اور ان اصولوں سے معاشرہ کا نظام دستور مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اب جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ان کو کافر کہا گیا ہے۔ اور جو حکومت ان اصول کے تحت ہوگی وہی اسلامی مملکت ہوگی۔ اب اصول یہ ہوا کہ اقتدار ہے تاکہ سب کو سامان نشوونما مل سکے۔ تو لہٰذا وہی نظام اسلامی ہوگا جس کا اقتدار سامان نشوونما پہنچانا ہو۔ اب جو صفات خداوندی بیان کی گئی ہیں تو اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی اپنی تعریف کرا رہا ہے۔ کہ ہم ایسے ہیں اور ہم ویسے ہیں (معاذ اللہ) یہ جو صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ (2:138) کہا ہے تو اس سے مراد کہ پہلے کپڑے پر جو بھی رنگ ہے وہ باقی نہ رہے صرف اسی رنگ میں رنگ جانا ہی توحید کہلاتا ہے۔

اب اسلامی قانون کا نظام کا جو رنگ ہے تو وہ مل گیا کہ نظام کو محکم ہونا چاہئے۔ مقصد تمام نوع انسانی کو سامان نشوونما مہیا کرنا ہوگا۔ قرآن کا پہلا ہی اصول اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (1:1) وہی نظام قابل حمد و ستائش جو تمام نوع انسانی کی نشوونما کا ذمہ دار ہو۔ حمدیت ہے صرف اس قانون، نظام کے لئے ہے جو رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (1:1) کی شرط پوری کرتا ہو۔ اس لئے وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝ (67:1)۔ ہر شے کے لئے پیمانے، قوانین مقرر کر دیئے ہیں تاکہ ان پیمانوں کے مطابق ہر شے کی نشوونما ہوتی جائے۔ اب یہ نشوونما تو محسوس شکل میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس نظام کا مقصد تو صرف جسم کی نشوونما نہیں ہے بلکہ نشوونما تو ذات کی ہونی چاہئے (نفس، خودی) اب یہ نفس کی نشوونما تو صرف اقدار سے ہی ہو سکتی ہے۔ اب دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دینا تو جسم کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ تو اس چیز کے بس کی بات ہے جسے نفس کہہ کر پکارا ہے۔ کوئی حیوان تو اپنی زندگی کے اور پر دوسرے کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ انسان بھی جب جسمانی سطح پر ہوگا تو یہ حیوانی سطح ہوگی۔ لوٹ کھسوٹ اور جرائم کرتا جائے گا۔ اس طرح یہ '' اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ (95:5) کے مقام پر آ کر حیوان سے پست درجہ پر چلا جاتا ہے۔ اس لئے تو خدا نے موت و حیات کا قانون بنا دیا تاکہ اس کو معلوم ہو کہ وہ کیسے نشوونما پا کے آگے بڑھتی ہے۔

1043 الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ (67:2) تاکہ موت کے ذریعہ تمہارا ٹیسٹ ہو سکے کہ تمہاری ذات کس حد تک نشوونما پا چکی ہے۔اس کے بعد کی زندگی میں جسمانی نشوونما کی بات تو نہیں ہوگی بلکہ جس کی ذات نشوونما کے اس معیار تک پہنچ چکی ہوگی کہ اس میں یہ صلاحیت پیدا ہوجائے کہ وہ اگلی منزل یعنی جنت کی زندگی میں قدم رکھ سکے۔اور جس کی ذات نشوونما کے اس معیار تک نہ پہنچی ہو۔تو وہ کھڑی ہوجائے گی۔آگے نہیں جا سکے گی۔اسے جحیم کی زندگی کہا گیا ہے۔''یعنی روک دینے والی چیز''موت کا ذائقہ انسانی ذات کی کامرانی اور نشوونما کا پیمانہ ہے۔موت وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان اپنا یہ ٹیسٹ کر سکتا ہے کہ میری ذات کی اتنی نشوونما ہوچکی ہے یا نہیں کہ میں اگلے درجہ میں ترقی پا سکوں۔اس کی مثال یوں ہے کہ اگر سکول یا کالج میں امتحان نہ ہو تو دوسروں کو پتہ ہی نہ چل سکے کہ وہ کتنا قابل ہو گیا ہے۔امتحان کو ٹیسٹ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس طالب علم کی قابلیت کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔اسی طرح انسان کی ذات کا ٹیسٹ موت ہے جس سے یہ چیز ہویدا ہوگی۔اس لئے کہا کہ خدا نے موت اور زندگی کو الگ الگ پیدا کیا۔لِیَبۡلُوَکُمۡ (67:2)۔تاکہ انسان خود اپنا ٹیسٹ کر سکے۔جس طرح امتحان میں لڑکا خود اپنا ٹیسٹ کر رہا ہوتا ہے اور یہ ٹیسٹ کے لئے ٹکراؤ والی بات ہوتی ہے۔جو بڑی ضروری ہے جسمانی طور پر بھی جب تک آپ کا کسی چیز سے ٹکراؤ نہ ہو تو اس وقت تک طاقت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔سو یہ طبعی موت بھی اس کی ذات کی صلاحیتوں کے پرکھنے کی کسوٹی ہے۔''لِیَبۡلُوَکُمۡ ''(67:2) یہ گردش تم کو اس لئے دی جاتی ہے۔پہلو بدل کر مواقع اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ دیکھیں کہ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ (67:2)۔کہ تم نے کس قدر احسن اعمال کئے۔لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ (95:4-5) سب سے زیادہ تناسب اور توازن انسانی ذات کا، نہ کہ جسم کا۔

؎ آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

حق، یعنی قرآن تو اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ (96:4) چاہتا ہے۔اس لئے موت وحیات کا تضاد پیدا کیا گیا تاکہ ایسے موقع دیئے جائیں تاکہ تم وہ بن جاؤ جو خدا کا مقصود تھا۔طبعی طور پر تو طبعی قوانین سے ایک قطرہ سے بڑا جسم بن جاتا ہے مگر اس میں انسان بننے کی استعداد رکھ دی جاتی ہے تاکہ اس کی نشوونما ہو کر ذات کی نشوونما کر سکے۔ذات تو غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملتی ہے۔اب اس وحی کے تابع اس کی نشوونما ہو سکتی ہے اور معیار کہ اَحۡسَنُ (67:2) رکھا ہے۔وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾ (67:2)''اب اس حسن پیدا کرنے کے لئے قوت اور حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔اب غلبہ اور حفاظت مل کر اسلامی نظام بن جاتا ہے۔اب برکت کے ساتھ غلبہ اور مظلوموں کی حفاظت اس معاشرہ میں صفات خداوندی کا عکس ہوگا۔یہ کوئی خدا تعارف نہیں کرا رہا کہ ہم ایسے ہیں اور ہم ویسے ہیں۔اس سے تو مومن مظلوم کی حفاظت کرے گا اور ظلم یوں رک جائے گا۔اب خارجی کائنات کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾ (67:3-4) تمام کرے ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ایک ہی اصول کارفرما ہے ان میں ربوبیت کا نظام کس قدر حسن وخوبی سے چل رہا ہے۔کہیں کوئی عدم تناسب ہے۔اگر اپنی دنیا میں یہ نظام قائم کر لو تو اس فساد کی جگہ موافقت قائم ہوجائے گی۔

پشین گوئیاں، زائچہ، قسمت کا حال تمام توہّم پرستیاں اور منجم شناس یہ تمام رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ (67:5) میں آتی ہیں

وَلَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَجَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ وَاَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابَ السَّعِیۡرِ ۝ وَلِلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ۝ (67:5-6) اور قریب ترین فضائے بسیط میں جگمگاتے ہوئے چراغ رکھدیئے یہ جو اس قدر حسین نظر آتے ہیں۔ یہ ویسے نہیں ہیں مگر ان کا اگر نقاب الٹو تو چاند کی شکل کس قدر بھیانک اور ڈراؤنی ہے۔ یہ اس کی ربوبیت کا تقاضا تھا۔ کہ اس کو یوں مزّین کر دیا ورنہ وہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اسے یوں آنکھ سے مستور رکھنا بھی اور جاذب نظر بنا دینا اس نیلگوں بلندی کو۔ یہ تھا ربوبیت کا تقاضا۔

رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ۔ (67:5) ان اٹکلیں دوڑانے والے منجم، فال اور غیب کی باتیں بتانے والے، پیشن گوئیاں کرنے والے، صاحب اختیار وارادہ انسانوں کو مقدر اور قسمت کے فریب میں مبتلا کرنے والے، ان کی قسمتوں کو ان مجبور ستاروں کے ساتھ منسلک کرنے والے یہ ہے سرکشی خدا کے احکامات کی، اس لئے ان کو لِّلشَّیٰطِیۡنِ (67:5) کہا ہے۔ جبکہ ''رُجُوۡمًا'' (67:5) کوئی چیز پھینکنا'' تاریکیوں میں تیر پھینکنا، اٹکل پچو باتیں کرنے والے، اس میں تمام منجم ستارہ شناس اور اس انسان کو مقدر کے بندھن میں باندھنے والے جو اختیار وارادہ لیکر پیدا ہوا ہے۔ جس کو اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ (41:40) اپنی دنیا میں صاحب اختیار وارادہ۔ مجبور نہیں بلکہ راستہ بتادیا ہو۔ جب کہ یہ تمام توہم پرستیاں تو یہ اختیار وارسادہ چھیننے کے مرادف ہے۔

فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ ۙ (18:29)، شَآءَ (18:29) کی خصوصیت جو صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور اس کائنات میں انسان کو تو ایسا کوئی عقیدہ، نظام یا مسلک جو انسان کے ارادے کو سلب کردے۔ تو وہ خلاف قرآن ہوگا۔ کوئی انسان دوسرے پر حکومت نہیں کرسکتا۔ سب سے پہلی خلاف ورزی ان قوانین کی اس ملوکیت نے آ کر کی۔ ملوکیت کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کا نظام آ گیا۔ انہوں نے آ کر تقدیر کا حصّہ ایمان کا جزو بنا دیا۔ کہ ہر چیز پہلے سے لکھی ہوئی ہے۔ وَالۡقَدۡرِ خَیۡرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعٰلٰی کو چھٹا جزو بنا دیا۔ حالانکہ کہا گیا تھا۔

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

ان تمام منجم شناس اوران کے متابعین "وَاَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابَ السَّعِيۡرِ ۝۵" (67:5) ان کی متاع حیات جھلس کر رہ جاتی ہے۔ جو نبتی ہی سرگرمی سے ہے حرکت۔ ارادہ چانس سے ہے جب یہ نہ بچا سلب ہو گیا تو باقی کیا بچا یہ تمام وَلِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ۝۶ (67:6) یہ جس گوشہ میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ تو ان کا انجام تباہی اور بربادی ہے۔ یہ نہایت برا انجام ہے۔ ساری طریقت اور شریعت" تقدیر کا دوسرا نام کہ میں نہیں بلکہ یہ سب خدا کر رہا ہے۔ انسان کچھ نہیں کر سکتا تو پھر یہ سارا حساب کتاب، قانون مکافات، یہ رشد و ہدایت خداوندی کا سلسلہ کاہے کے لئے ہے؟

نبی ﷺ تک کو غیب کا علم نہیں دیا گیا۔ جبکہ یہ تصوف تو انہی پیشین گوئیوں پر چلا آ رہا ہے۔ یہ خاک زندہ کو مردہ خاک کے تابع کرنا تو سراسر شیاطین کا کام ہے۔

❁❁❁

ضابطۂ انصاف کے دو اصول،
قرآن سے آگہی اور اسے سمجھنے کی صلاحیّت

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿١٠﴾ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿١١﴾ (67:10-11) یہ جواب ہوگا کہ کاش ہم سن کر عقل وفکر سے کام لیتے تو اس جہنم کا ٹھکانہ نہ بنتے۔ اب جہنم سے بری ہونے کا ایک ہی معیار قرآن نے بتا دیا کہ غور سے سنا جائے پھر اس پر عقل وفکر کر کے عمل کیا جائے۔ اب قرآن تو اتنے زور وشور سے سنا جاتا ہے جس کے بعد عقل وفکر کا اس میں دخل ہی نہیں ہوتا۔ بلا معنی الفاظ کا سننا، ناظرہ کا پڑھنا۔ حافظ سے محض ثواب کا خاطر سننا۔ نہ حافظ کو اس کا علم اور نہ سننے والے کو اس کا مفہوم کا پتہ۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ (7:179) یہ تو حیوان ہیں گو یا بھینس کو بھی سنا دیا اور اس جیسے انسان کو بھی۔ یہ تھے جنہوں نے اعتراف جرم کرلیا۔ اب ان اصولوں سے مملکتوں کے دستور مرتب ہو سکتے ہیں۔ اور قوانین کے ضابطہ بھی۔

اب مجرم سے پہلے پوچھا جا رہا ہے پچھلی آیات میں کہ کیا تم تک یہ قانون پہنچا تھا۔

سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ﴿٨﴾ (67:8) اب کسی کو مجرم قرار دینے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے پاس وہ قانون پہنچ گیا۔ ہو۔ کتنی اہم شق ہے قانون کی۔

اور دوسری بات کہ اَوْ نَعْقِلُ (67:10)۔ اس کو یہ قانون سمجھنے کی صلاحیت بھی حاصل ہو۔ اگر نہ سمجھا ہو تو سمجھانے والے موجود ہوں۔ یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ہر شخص تک قانون پہنچائے۔ اگر وہ جہنم کا داوغہ پوچھتا ہے تو جواب میں وہ کہہ دیں کہ نہیں صاحب اہم تک تو نہیں آئے تھے تو پھر ان پر کوئی جرم عائد نہیں ہوگا۔ اس لیے ہر مجرم کو دفاع کا پورا پورا موقع دیا جانا چاہیے۔ اگر ثابت ہو جائے تو پھر وہ مستوجب سزا ہوگا۔ یہ ہے طریقہ قرآن سے قانون سازی کا اِبلیس جیسے ملزم کو بھی بغیر مدافعت پیش کیے مستحق سزا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو گناہ کا اعتراف کرے تو پھر اسے فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿١١﴾ (67:11)۔ تو اسے شدید سزا دی جائے۔ اس لیے کہا گیا یاد رکھو۔ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿١٣﴾ (67:13) چاہے دل کے ارادے ظاہر کرو یا مخفی رکھو۔ خدا تو دل کے اندر گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے اب دل کے ارادے سے ہی تو جرم کی

1043 ابتداء ہوتی ہے یہ تو تخم ہوتا ہے۔ پہلے ارادہ، پھر عمل، پھر نتیجہ۔ قرآن تو ارادے پر گرفت رکھتا ہے تاکہ وہیں جرم رک جائے۔ یہ تعلیم وتربیت سے ہوگا۔ تاکہ ان جرائم کے خلاف تعلیم ان کے دل کا تقاضا بن جائے۔ باہر سے بیڑیاں پہنانے سے تو کچھ نہیں ہوتا ان سے اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اسلامی معاشرہ، اصلاح کا کام ارادوں سے، خواہشات سے شروع کرتا ہے۔

اس سے تو سارا معاشرہ جنت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٤﴾ (67:14) اسی طرح عدل کرنے والوں کو بھی لطیف بھی ہونا چاہیے اور خبیر بھی۔ کہ ان کو نگاہوں سے پہچان لیں۔ یہ اللہ کی صفات تو تاحد بشریت افراد میں، اس سوسائٹی میں منعکس ہونی چاہیں۔

❁❁❁

مومن اور کافر میں فرق تقسیمِ رزق سے ہوتا ہے

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِیۡ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِهٖ ؕ وَ اِلَیۡهِ النُّشُوۡرُ ﴿۱۵﴾ (67:15) یہ ارض تمہارے پاؤں تلے یعنی یہ رزق کے سرچشمے تابع تسخیر کر دیئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ تم اس کے مختلف راستوں پر چلو پھرو۔ دوسرے یہ کہ جس طرح چاہو اسے استعمال کرو یہ انکار ہی نہیں کرسکتی۔ اس سے رزق کماؤ اور کھاؤ پیو مگر یہ رِّزۡقِهٖ ہی ہے جس کا جی چاہے محنت کرے اور حاصل کرے۔ اب اس کے حصول کے بعد اس کی تقسیم اصل مقام کفر اور مقام ایمان ہے اب جو اس رزق کو اقدار کے تحت تقسیم کرلے گا تو وہ ہوگا مومن۔ وَ اِلَیۡهِ النُّشُوۡرُ ﴿۱۵﴾ (67:15) اب یہ اس متعینہ پرگرام کے تحت پھیلایا جائے گا۔ یہ تو امانتاً تمہاری تحویل میں دیا گیا ہے اب یہ اس کے قوانین کے تحت پھیلایا جائے گا۔ رِّزۡقِهٖ ؕ (67:15) کے بعد اِلیہِ سے مراد خدا کے قوانین سے رجوع کرکے اس رزق کو پھیلاؤ تو یہ ہوگا اسلامی نظام۔ اگر تم نے اپنے خودساختہ نظام بنایا تو ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوۡرُ ﴿۱۶﴾ (67:16) تو کیا تم اس کے قوانین مکانات سے بے خوف ہوجاتے ہو جو اگر چاہے تو زمین کو گرد و غبار کرکے ان تمام معاشی سہولتوں کو سلب کرلے۔ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ (67:16) سے مراد قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔ جو تباہیاں آئیں گی تو کیا اس سے نڈر ہو گئے ہو۔ تھوڑا سا خطرہ اگر سیم و تھور کا شکار ہوجائے تو مصیبت آجاتی ہے اگر ساری زمین اس طرح ہوجائے تو کیا کرلو گے؟ پریشانی اور شدید اضطراب کا شکار ہوجاؤ۔ کہ آگے کہا۔

اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ (67:17) اگر یہ کرے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر شہاب ثاقب کی شکل میں گرادے تو تم کو ان تنبیہات کا علم ہوجائے کہ قوموں کی تباہی صرف طبعی حوادث سے ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ غلط نظام تمدن سے بھی ہوتی ہیں۔ غلط اور خودساختہ تقسیم کا نتیجہ خوفناک تباہی ہوگا۔ آج ساری دنیا جہنم بنی ہوئی ہے یہ تمام مغربی اقوام اس نظام کے ہاتھوں واویلا کررہی ہیں معاشی فراوانیوں کے باوجود۔ فطرت کی قوتوں پر کنٹرول تو حاصل کرلیا مگر وہ وَ اِلَیۡهِ النُّشُوۡرُ۔ چھوڑ کر اپنے مفادات کے تابع سارا رزق کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔ لرزاں اور خوف کوریا جیسی ایک کمزور قوم سے بھی۔ اب قرآن تاریخ سے مثال لے آیا کہ ہمارے قوانین کی قوت دیکھو کہ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّ یَقۡبِضۡنَ ؔ ۘ مَا یُمۡسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ (67:19) تو ان قوانین سے انکار کرنے والے بڑے فریب میں مبتلا ہوجاتے ہیں یاد رکھو وَ اِلَیۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ (67:24) اس کے قانون میں سب یکساں ہیں یہ تمام اس کے قانون کی طرف

ہی جارہے ہیں ان رزق کے سرچشموں کومت روکو۔ آخری بات سن لو قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ 1043
بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾ (67:30) پانی جو چشموں سے ابل کر اوپر آتا ہے اگر اس کا قانون یہ ہو جائے کہ اوپر کے بجائے نیچے ہی نیچے
چلا جائے تو یہ آبِ رواں جس پر تمہاری زندگی کا دارومدار ہے تمہیں کون دے سکے گا؟

❁❁❁

حروفِ ابجد کے سلسلہ میں حرف ''نٓ'' کی توجیہات

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۙ بِاَيِّيكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ (68:1-6)

حرف نٓ کی توجیہات:

یہ ن حروفِ ابجد میں سے ہے۔قدیم زمانے میں یہ حروف ابجد یہ اس شکل (اب ت) میں نہیں ہوتے تھے۔ یہ حروف تصویروں کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔اسی زمانے میں ن ایک پتلی مچھلی کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔تو عربی زبان میں اسے مچھلی کے معنوں میں لیا جانے لگا جیسے یونس کو ذُوالنُّون مچھلی والا کہا گیا۔ پھر آگے جاکرانہیں نے،اس سے معلوم نہیں کہ کسی بناء پر اس کے معنی اجمالی علوم کے لیے بھی جن میں تفسیر نہ ہو علامات یا اشارات کی رو سے خود علم کے معنوں میں بھی اسے لینے لگے۔تو پھر اسے قلم کے ساتھ ملا کر تو بعد میں روشنائی اس کے معنی ہو گئے۔اس کے معنی دوات کے بھی لیے جانے لگے۔اس کے بعد غالباوہ پہلی ذرا باریک سی لمبی سی شکل سے اس کے معنی بطور تلوار کے بھی استعمال ہونے لگے۔عربی زبان میں ہر لفظ کے متعدد معانی ہوتے ہیں مگر وہ اس لفظ کے مرادفات نہیں ہوتے۔ معنی میں اس قدر فرق کہ کوئی لفظ بعینہٖ انہی معنوں میں دوسری جگہ استعمال نہیں ہوتا۔اب تدبّر سے ان تمام معنوں سے موزوں معنی تلاش کرنا ہوگا دوسرا قرآن کا بتایا ہوا طریقہ تصرف الایات کا تو گویا ایک تو معنی کی سند جو لغت عربی میں سے ملے۔اور تصریف آیات سے اس کے جو معنی متعین ہوں۔تو دونوں چیزیں سامنے ہوں تو یہ قرآن کا تدبر یا اجتہاد ہوگا اب تدبر سے ان معانی کے ایک کو لے لیں۔تو چونکہ انسانی فکر بڑھتی رہتی ہے۔تدبر کی نئی نئی راہیں کھلتی رہتی ہیں۔اگر کسی اور مقام پر یہ دوسرے معنی زیادہ موزوں نظر آئے تو اسے اختیار کرسکتا ہے۔اسے اختلاف نہیں کہا جاسکتا۔ایک تو معنی کی سند ہو جو عربوں کے ہاں اس وقت عربی میں مستعمل تھے۔اور قرآن کے دوسرے مقامات سے اس کی تائید ہو اور تیسری اہم چیز کہ وہ قرآن کی کلی تعلیم کے خلاف نہ ہو۔مثلاً قرآن علم کی تعریف کرتا ہے مگر جہالت کی نہیں۔یہ اس کی کلی تعلیم ہے۔یہ تینوں چیزیں سامنے ہوں تو اسے تدبّر فی القرآن کہا جائے گا۔اب قرآن نے الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ (96:4) قلم کے ذریعہ علم کی صلاحیت دی۔دوسری جگہ بیان کے ذریعہ یعنی قوت گویائی اور تحریر کے ذریعہ انسان میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے اب وحی ملی تو اس کو قوت گویائی سے دوسروں تک پہنچایا اب صحابہ نے ان کو دھرایا اور پھر قلم کے ذریعہ اس کو تحریر میں لایا گیا۔اب وحی جو قلب نبوی پر القا ہوتی تھی تو اسے دہرایا بھی جاتا

1043 تھا۔اور پھر لکھا بھی جاتا تھا۔، اب وَمَا يَسْطُرُوْنَ (68:1) میں یہ تینوں زبانی دہرانا ان الفاظ کو جو اَلقاء ہوتے تھے۔اور پھر احاطہ تحریر میں لانا گویا قرآن لکھا جاتا تھا اور کچھ نہیں۔

ن بطور تلوار:

تلوار کی عظمت اور اہمیت تو قرآن کے ایک ایک صفحہ سے واضح ہے یعنی قتال، جہاد، جہاد تو ساری زندگی کی جدو جہد اور آخری منزل میدان جنگ یعنی قتال۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25) پہلی شرط تو دلائل و براہین۔تدریجی منازل میں پہلا درجہ، اگر مان لیں تو پھر کتاب یعنی قوانین پر ایمان لائیں۔اب اتباع بھی جو دل و دماغ سے ان کو تسلیم کر لے۔تاکہ ان قوانین سے لوگوں کے معاملات عدل وانصاف سے طے کئے جائیں۔

اب جو اس راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں تو اس مزاحمت کا مقابلہ تو تلوار سے ضروری ہے۔دلائل و برہان سے تو نہیں مانا اب مزاحمت کا مقابلہ تو صرف تلوار سے ہی ممکن ہے۔

مومن را تیغ با قرآں بس است
ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

قرآن شمشیر کا محافظ کہ یہ بے راہرو نہ ہو اور شمشیر قرآن کی محافظ کہ صرف وعظ بن کر نہ رہ جائے۔اب ''ن'' سے معنی شمشیر لے لیں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ لغت عربی اور قرآن اس کی تائید کر رہے ہیں۔اب اگر اس کے پاس یہ تینوں سندات موجود ہیں تو پھر کوئی اگر اس سے مراد شمشیر لے لے تو یہ جھگڑنے کی بات نہیں ہے۔کیونکہ قرآن کی سند۔لغت کی سند اور تیسری سند قرآن کی کلی تعلیم موجود ہے نہ کہ فلاں محدّث، مفسر یا عالم نے یہ کہا ہے۔سند یہ نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو قرآن نے بتائی ہے۔اس اعتبار سے کسی ایک تدبر کرنے والے کا بھی ضروری نہیں کہ عمر بھر کے لیے وہی بات ہو۔ہوسکتا ہے کہ مزید شواہد اس کے سامنے آئیں قرآن کے اور مقامات سے اور انکشافات ہوں۔تو وہ پہلے معنی میں ان شرائط کے ساتھ تبدیلی کر دے۔علم انسانی تو بڑھتا جاتا ہے اس لیے کسی ایک دور کے ایک فرد کا تدبر بھی حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ ہر ایک کو حق حاصل ہے کہ وہ اس سند کے ساتھ خود تدبر کرے۔محکمات تو اپنی جگہ چٹان کی طرح موجود ہیں قرآن نے اسے محور کہا ہے۔یعنی ایک شے جو اپنے مقام پر کھڑی ہے۔اور سارا تدبر و تفکر اسی کے ارد گرد گھومتا رہے۔تو اس کی رو سے تدبر یوں ہوگا جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا تو تدبر کی راہیں بھی کشادہ ہوتی جائے گی۔انفس و آفاق کا ہر پردہ نقاب اٹھنے کے بعد اس بات کی دلیل ہوگا کہ قرآن حق ہے اب آیئے انہی آیات پر نۗ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (68:1) یہ تمام اس بات کی شہادت دیتی ہیں۔علم کی بارگاہ سے، قوت کی بارگاہ سے تمہیں شہادت ملے گی کہ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (68:2) کہ تو دیوانہ یا مجنون نہیں ہے جو ایسی بلند پایہ تعلیمات پیش کر رہا ہو وہ بھلا کیسے دیوانہ ہوسکتا ہے۔دلیل یہ ہے کہ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ

1043 مَمْنُوْنٍ (68:3) تیری سعی وکاوش کا اجر ایسا ملے گا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔اب یہ اجر غیر مسلموں کے پاس ہے جو اس کے قریب ہیں کم از کم کائناتی قوتوں کی تسخیر کے کے فوائد تو بٹور رہے ہیں۔اور اب وہ اس زندگی کی تلاش میں ہیں جو قرآن نے دی ہے۔اب اس کے لیے سیرت کی بلندی اس جماعت کے لیے ضروری ہے۔غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (68:3) سے مراد یہ بھی کہ بلا محنت نہیں ملے گا۔ احسان کے طور پر نہیں بلکہ محنت کر کے۔چل کر وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (68:4) سب سے کامیاب ہتھیار سیرت وکردار ہے۔فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ (68:5) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (68:6) تم بھی اور یہ بھی قریب ہی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ کہ پاگل کون تھا۔اور کون بھٹی میں سے گزر کر کندن ہو گیا اور کون راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

❁❁❁

علم الیقین، عین الیقین، حقّ الیقین

قرآن نے تمام توہم پرستیاں پیش گو یاں۔قسمتوں کا حال۔علم لدنی وغیرہ آ کر ختم کر دیا۔

قرآن نے یقین کے تین درجے بتائے ہیں۔

پہلا علم الیقین: یعنی آنکھوں سے دیکھ لینا مگر یہ آخری درجہ نہیں۔جیسے آگ کا دھواں اٹھتا ہے تو ہم علم کے ذریعہ اندازہ لگاتے ہیں۔کہ آگ ہے۔جب سامنے بھڑکتی نظر آئے تو عین الیقین۔جب اس میں انگلی ڈال دو تو وہ جلا دے یہ ہے حق الیقین۔

❁❁❁

گمشدہ کڑی (Missing Link) وَالۡجَآنَّ: تخلیقی مدارج اور ارتقاء

یہ کرہ ارض شروع میں ایک آتشی گولہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اوپر کا حصہ ٹھنڈا ہوا۔ جب کہ ابھی تک اس کے اندر سے وہ پگھلے ہوئے مادے، دھاتوں کی صورت میں آتش فشاں کی شکل میں نکلتی رہتی ہیں۔ تو اس وقت اس کرہ ارض پر ایسی مخلوق آباد تھی جو اتنے زیادہ درجہ حرارت کے اندر زندہ رہ سکتی تھی گویا کہ یہ اس سے پہلے کی زندگی کی ایک کڑی تھی۔ جواب انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہی وہ مخلوق تھی جس کو آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ جواب نگاہوں سے اوجھل ہے۔ (وَالۡجَآنَّ) غالباً یہی وہ گمشدہ کڑی ہے جس کی سائنسدانوں کو تلاش ہے۔

ارتقائی سلسلے میں درخت کی مثال:

وَاللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ۙ﴿۱۷﴾ (71:17) تمہاری ابتداء درخت کی طرح نباتات کی طرح بے جان مادہ سے ہوئی۔ پھر گردشیں دیکر تم کو اس حالت میں۔ انسانی حالت میں پہنچا دیا۔ اسی طرح تم اس ارتقاء کے ذریعہ ثُمَّ يُعِيۡدُكُمۡ فِيۡهَا وَيُخۡرِجُكُمۡ اِخۡرَاجًا ﴿۱۸﴾ (71:18) ہر درخت کی زندگی اور انسانی زندگی میں فرق ہو گیا۔ درخت تو کھوکھلا ہو کر گر جاتا ہے۔ مگر تم موت کے بعد میں ارتقا کے ذریعہ اگلی زندگی میں داخل کئے جاؤ گے۔ وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲۶﴾ وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ﴿۲۷﴾ (15:26-27) اس مخلوق کو اس سے پہلے آگ بغیر دھوئیں والی سے پیدا کیا تھا یہ مخلوق اب مفقود ہے۔

❁❁❁

قرآن نے آ کر تمام باطل عقائد اور توہّمات کی نفی کر دی

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا۟ (72:8) اب یہ مذہبی پیشوا اور کاھن جو کہانت۔ نجوم پرستی کے ذریعہ لوگوں سے مال بٹورا کرتے تھے کہ ہم یہ تمام خبر بھی آسمان سے لاتے ہیں۔تو قرآن نے ان کی تردید کر دی۔'' کہ قرآن کے بعد اب آسمان کو چھونا بھی ممکن نہیں کیونکہ اس کی شدید نگرانی اس شعلہ کے ذریعہ ہو رہی ہے۔

وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا۟ (72:9) اس سے پہلے ہم یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ گھات میں بیٹھ کر آسمانی باتیں سن لیتے ہیں۔مگر اب کوئی سننے کی کوشش کرتا ہے تو اپنے سامنے شعلے پاتا ہے۔(یعنی برہان وعلم کے شعلے قرآن کی شکل میں)ہاں ہم پہلے کہا کرتے تھے کہ چوری چھپے آسمانوں کو خبریں سن کر پھر آ کر کہتے تھے کہ یہ ہوا وہ ہوا۔یہ تمام مذہبی پیشوا دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف کہتے ہیں۔اس علم میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔یہ عقیدہ بتایا گیا کہ تمام تقدیریں اور قسمتوں کا فیصلہ اوپر ہوتا ہے۔یہ سن کر ان کو بتاتے تھے۔اب اس سورۃ الجن میں تمام توہّم پرستیوں کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔یہ دور جہالت کی باتیں مثلاً،پیشن گوئیاں قسمت کا حال بتانا۔علم لُدنی وغیرہ ان تمام چیزوں کو اسی اعلان نے مٹا دیا۔اب کہا کہ یہ دور گیا اب اگر کوئی کوشش بھی کرے تو مار پڑتی ہے۔خوبصورت انداز میں ان تمام باطل عقائد کی تردید کر دی۔

❁❁❁

اسلامی حکومت میں سر براہِ مملکت کو بھی قانون کے خلاف نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں ہوتا

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ وَلَاۤ اُشۡرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا (72:20) چونکہ اس میں اقتدار صرف اس کے قوانین کا ہے۔ یہ ذاتی حکومت نہ سمجھ لینا۔ قُلۡ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ لَـكُمۡ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (72:21) تمہارے لئے کسی قسم کا نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ ہے پوزیشن ایک سر براہ مملکت کی اعلان کرایا جا رہا ہے۔ اس حکومت میں صرف اس کے قوانین کی تنفیذ ہوگی۔ اگر میں نے ایسی کوئی غلطی کی تو پھر کہیں بھی پناہ نہیں مل سکے گی۔

قُلۡ اِنِّیۡ لَنۡ یُّجِیۡرَنِیۡ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنۡ اَجِدَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مُلۡتَحَدًا (72:22) اس لئے حکومت کے مراکز وَّاَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (72:18) یہ مراکز صرف اطاعت خداوندی کے مخصوص ہیں ان کے ساتھ کسی اور کا حکم شرک ہوگا۔

رسول ﷺ کو اتنا غیب کا علم تھا جتنا وحی کے ذریعہ دیا گیا:

عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡهِرُ عَلٰی غَیۡبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ فَاِنَّهٗ یَسۡلُكُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ رَصَدًا (72:26-27) مستقبل کا علم صرف اس کو ہے وہ یہ علم کسی کو بھی نہیں دیتا۔ صرف اسی کو جس کو نبوت کے لئے منتخب کر کے وحی کا اتنا علم جو ضروری ہو۔ اور اس کی حفاظت کے لئے آگے پیچھے وحی کے محافظ لگا دیتا ہے۔ اس سے زیادہ رسول کو بھی علم نہیں ہوتا۔ اب یہ حضرات تو پیشین گوئیاں یعنی واقعہ ہونے سے پہلے بتا دینا۔ یہی تو غیب کا علم ہے۔ مقدرات اور قسمتیں بتاتے ہیں۔ عرش پر جا کر لوح محفوظ تک پڑھ آتے ہیں۔ حالانکہ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مگر یہ منجم آ کر ستاروں کے ذریعہ افراد کا، قوموں کا حال بتاتے ہیں۔ اس لئے تو قرآن کے بارے میں کہا وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیۡهِمۡ وَاَحۡصٰی كُلَّ شَیۡءٍ عَدَدًا (72:28) یہ پہرہ دار ان کا احاطہ کرتے ہیں تاکہ کوئی خائن نہ آنے پائے اور ہر چیز گن کر اس کا احاطہ کر دیا ہے۔ یعنی یقینی ہونے کے لیے کہ گن لو۔ اس کے بعد گنو تو وہی۔ اس میں تحریف نہیں ہوئی۔ اس قدر حفاظت سے رسول ﷺ نے دیا۔

سورۂ مزمّل، ایک بہترین ہمرنگ وہم خیال جماعت کی تیاری (73:5)

ان آخری دو پاروں میں اس انقلاب کا ذکر ہے جو نرم خرامی سے چلا آرہا تھا۔مکّی زندگی میں اس کی تیاریاں سست رفتاری سے تھیں۔ پروگرام تو ایک ہی تھا۔ نبی ﷺ کو پہلے دن سے آخری دن تک ،اس کی آخری منزل نبی ﷺ کو بتا دی گئی تھی۔ نبی ﷺ نے پہلے ہی خطاب میں قوم سے کہا تھا کہ میں عرب وعجم کی ان استبدادی ملوکیتوں کو الٹنے کا عزم لیکر اٹھا ہوں۔ کچھ رفقاء کی ضرورت ہوگی۔ بتاؤ کون اس بوجھ کو میرے ساتھ بٹائے گا!۔مگر کوئی بھی اس آواز کو سیکنڈ کرنے والا نہیں تھا اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) قریش نے اس پیغام کی شدید ترین مزاحمت کی۔ساری مکی زندگی میں یہی کچھ کرتے رہے اور مدنی زندگی میں تو باقاعدہ لڑائیاں شروع ہوگئیں۔سات سال کے عرصہ میں قریباً 82 جنگیں ہوئیں۔تآنکہ قریش کو فتح مکہ کے بعد آخری شکست ہوگئی۔وہ آخروقت تک، آخری انسان تک یہ مخالفت کرتے رہے۔

مخالفت کی وجۂ جواز:

یہ مخالفت نماز کی تو نہیں تھی۔نمازی تو ان کے ہاں حنیف کے نام سے موجود تھے۔ان کا دعویٰ تھا کہ ہم ملت ابراہیمی کی پیروی کرتے ہیں۔ملت ابراھیمی کا دعوی تو یہ عرب بھی کرتے تھے۔وہ اپنے زعم میں بت پرست نہیں تھے۔خدا کی پرستش کرتے تھے۔جس طرح ہم کرتے ہیں۔ان میں آپ ﷺ کے مخالفین تھے۔لیکن ان کو تو کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔تو کیا یہ نماز کی مخالفت تھی؟ مکی زندگی کے بعد مسلسل سات سال تک برسرپیکار رہے۔آخر کیوں؟ دراصل اس پروگرام سے تو ان کا کیا ساری دنیا کا خود ساختہ نظام الٹ رہا تھا۔اس لئے ہجرت کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔تو کیا یہ تمام لڑائیاں اس نماز کو روکنے کے لئے تھیں؟ دراصل ان کو پتہ تھا کہ اگر کسی جگہ بھی یہ نظام قائم ہوگیا تو پھر قریش کیا ساری دنیا میں ایک تزلزل آجائے گا۔ان کی بڑی قوت اور مقابلہ میں یہ قلیل تعداد، نہ سامان، نہ ہتھیار، پناہ گزیں مدینہ میں۔دوسرے ہی سال ہجوم کر کے حملہ کر دیا۔حالات ایسے اور تمام بادشاہوں کو خطوط لکھے جارہے ہیں کہ مزدوروں اور کسانوں پر ظلم بند کرو ورنہ ان کے ظلم کا بدلہ تم سے لیا جائے گا۔یہ ہے وہ انقلاب! یہ ہے وہ یقین محکم! جب ظاہراً نظر آرہا تھا کہ قریش کے مقابلہ میں بھی زندہ نہ رہیں گے، سپر پاورز کو خطوط لکھنا۔اور جو کہا پھر کر کے دکھا

دیا۔ دونوں کا نظام الٹ کے رکھ دیا۔ یہ تھی صلوٰۃ ؎

قیامت ہا در قد قامتِ اوست

اس میں تو نہ نسبی تفاخر باقی رہ سکتا تھا، نہ رِبوٰی۔ یہودیوں کا سارا کاروبار بلکہ دنیا بھر کا اسی ربوٰی پر تھا۔ ان کو علم تھا کہ کچھ بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ نہ انسان کی انسان پر حکومت، یہ تو زندگی کا ہر شعبہ الٹنے والا پروگرام تھا۔ ان کو علم تھا کہ اگر یہ انسانیت ساز انقلاب آ گیا اور غلاموں کو اٹھا کر کسی بڑے قریشی کے ہم مرتبہ رکھ دیا تو یہ انقلاب ساری دنیا میں تیزی سے سرایت کرے گا۔ اس لئے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ اسے ہر قیمت پر روکا جائے۔ اب اس انقلاب کی للکار سورۂ مزمل میں ملاحظہ کریں۔

❀❀❀

مُزَّمِّل کا قرآنی اور لغوی مفہوم

عربوں کے ہاں قافلے چلتے تھے۔تو اونٹوں کے کجاوہ میں دائیں بائیں دو سواریاں بیٹھتی ہیں۔ان میں جو میر کارواں ہوتے تو ان کی بڑی شہرت ہوتی تھی۔وہ ہر اونٹ پر ایسی سواریاں بٹھاتے پہلی چیز وہ ہم وزن ہوں۔تاکہ کجاوے کا توازن برقرار رہے۔اگر ایک طرف پہلوان بٹھا دیں اور دوسری طرف کم وزن، کمزور، تو اونٹ کے لئے چلنا دشوار ہو جائے گا۔یہ ہوئی طبعی چیز۔یہ لمبے لمبے سفر مہینوں پر مشتمل ہوتے تھے۔تو ان دو سواریوں کے باہم وزن کے علاوہ ان کے مزاج اور ذوق میں بھی ہم آہنگی ضروری ہے۔لہٰذا اس طرح کے دو رفقاء کا انتخاب کرنا جن میں مکمل آہنگی ہو اس میر کارواں کا اہم کام تھا۔یہ جو دو آپس میں ایک ہی کجاوے میں بیٹھے ہوتے تھے یہ ایک دوسرے کے زمیل ہوتے تھے۔جو اس طرح کی سواریوں کا انتظام کرتا تھا اسے مُزَّمِل کہتے تھے۔ان ہم رنگ سواریوں کو آج بھی مزمل کہتے ہیں۔تزمیل اس پراسیس کا نام ہے۔پہلی چیز نبی ﷺ کو اس قسم کی جماعت تیار کرنا تھی۔ایسے رفقاء جو ایک دوسرے کے ساتھ ہم رنگ ہوں۔اس خصوصیت کی بناء پر یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ (73:1) یعنی اے ہم رنگ جماعت تیار کرنے والے! یہ کمر توڑ پروگرام تھا۔اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ (73:5) یہ اس قدر عظیم انقلاب تھا جس نے ملوکیت سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو ختم کر کے رکھ دیا۔اور انسانیت کو صحیح آزادی سے سرفراز فرمایا۔یہ تمام چیزیں جو مٹ گئی تھیں، باردگر پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے اسی امت کے اندر آ ثبت ہوئیں۔یہ ہوا کیسے؟ یہ واقعی ایک تعجب انگیز بات ہے۔

بنیادی وجہ، انقلاب معکوس کی:

اُمیہ کے دور میں (750-661ء، 132-41ھ) تو یہ چیز اس طرح سے نہیں ہوئی یہ ٹھیک ہے کہ موروثی بادشاہت آ گئی تھی مگر اس دور میں قرآن کے علاوہ عربوں کے پاس کوئی اور کتاب ہی نہیں تھی۔اس کے بعد جو عباسیوں کا دور (1258-750، 656-132ھ) اس میں نہ قرآن باقی رہا اور نہ عربیت باقی رہی۔ان کی بادشاہت ایرانیوں کی رہین منت تھی۔یہ آ کر سارے معاشرے پر چھا گئے۔عجمی اسلام کی ابتداء یہاں سے شروع ہو گئی۔اس کے ساتھ ہی ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا دور شروع ہو گیا۔قرآن کی موجودگی میں، ان میں سے کسی ایک کے لئے بھی وجہِ جواز تو مل نہیں سکتا تھا تو سکیم یہ سوچی کہ قرآن کے الفاظ تو اس طرح رہیں مگر اس کا مفہوم بدل دیا جائے۔اور قرآن کے ساتھ نبی ﷺ کی سیرت اس انقلاب کی زندہ شہادت تھی۔اگر یہ سیرت سامنے رہتی تو بھی یہ انقلاب معکوس کبھی نہ آتا۔حالانکہ قرآن میں رسول ﷺ کی سیرت کے تمام خدوخال خدا نے دے دیئے

1043
تھے۔ یہ باتیں آج کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔ یہ آنے والے مؤرخ کے لئے ہے۔قرآن تک کے لئے موجودہ ماحول سازگار نہیں ہے۔آج کا دور تو مذہبی پیشوائیت کی انتہائی شدت کا دور ہے۔سرسید، اقبال اور قائداعظم اور علامہ پرویزؒ نے اس قرآن کی آواز بلند کی۔

قرآنی نظام ایرانی سازش اور عجمی سازش کا شکار ہو گیا:

عباسیوں کے دور میں یہ سازش پوری شدت سے اٹھی۔ایرانیوں نے اپنی شکست کا بدلہ قرآن سے لیا۔اب اس کے لئے انہوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ نہ تو قرآن اپنے الفاظ میں رہے اور نہ قرآن کا مفہوم قرآنی رہے اور نہ سیرت رسول ﷺ اور صحابہؓ قرآنی رہے۔اس سے پیشتر موطأ امام مالک کا صرف ایک حدیث کا مجموعہ تھا اور وہ بھی صرف مدینہ کے اصحاب کا مسلک کوئی تین سو روایات پر تھا۔بعد میں تقریباً ۱۰ لاکھ احادیث کا مجموعہ میں سے انتخاب کر کے ایک ایک مجموعہ ہزاروں کی تعداد میں احادیث آئیں۔ان میں سے چھ کو صحاح ستہ یعنی صحیح ترین مانا گیا اور ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا گیا۔یہ چھ کے چھ تمام ایرانی، کوئی ایک بھی عرب نہیں۔جب یہ سارا کچھ سرمایہ داری برھمنیت اور ملوکیت کی تائید میں رسول ﷺ سے منسوب کر کے یہ احادیث گھڑی گئیں۔

روایات کی رو سے پہلی تفسیر اور پہلی تاریخ:

اب قرآن کی باری آئی یہ سارا کچھ مرتب کرنے کے بعد طبرستان سے محمد بن جریر طبری (224ھ۔311ھ) دادا کا نام رستم اور اسلام قبول کرنے کے بعد یزید رکھا گیا۔یہ شیعوں کے لئے جو کتاب مرتب کرتے تو اس میں نام محمد بن جریر بن رستم جبکہ سارے مسلمانوں کے لئے بن یزید نام رکھتے۔انہوں نے قرآن کی تفسیر مرتب کی جو پہلی تفسیر ہے۔احادیث اور اور روایات کی رو سے اس طرح پورے قرآن کی تفسیر ثبت کر دی۔اب انہی نے تاریخ بھی مرتب کر دی۔اس طرح قرآن کی یہ پہلی تفسیر، پہلی تاریخ، احادیث کے پہلے مجموعے یہ تمام عجمیوں نے مرتب کیے۔تو کیا اس انقلاب کا وہ نقشہ جو رسول ﷺ نے برپا کیا تھا۔آ سکتا تھا؟ اس میں تو تمام تین لعنتوں کا خاتمہ ہو جاتا۔اس لیے انہوں نے پورے لٹریچر کے اندر مقدس سندیں مہیا کر دیں اب یہ اسلام ہو گیا۔ ذاتی ملکیت۔غلام لونڈیاں، چاندی سونے کے ذخائر جمع کرنا، انسان پر انسان کی حکومت جائز ہو گئی۔بادشاہوں کو ظِلُّ اللهِ علَی الْاَرضِ بنا دیا۔یہ ان مذہبی پیشواؤں نے کیا۔تو قرآن کی وہ تفسیر، نبی ﷺ کی وہ سیرت جس کو سنت کا نام دیا گیا ہے۔اسلام کا یہ نقشہ بنا دیا گیا جو آج تک چلا آ رہا ہے پھر ان فقہی قوانین کو قیامت تک کے لیے ابدی قرار دے کے امت مسئلہ کو اندھیرے غار میں دھکیل دیا گیا۔فقہ حنفی سارے جہاں میں مشہور ہے۔کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ (150-80) نے کوئی فقہ ہی نہیں دی۔

تو پھر یہ ساری حنفی فقہ کہاں سے آ گئی۔اصل معیار قرآن ہے ان میں کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔یوں انہوں نے آیات کی تفسیریں مرتب کیں اور رسول ﷺ کی سیرت مرتب کی۔اور ان کو Untouch بنا دیا۔تاکہ ان پر تنقید نہ کی جا سکے چھان پھٹک تو بہت بڑی بات ہوتی ہے۔مغرب میں تو جمہوریت آ گئی مگر مسلمانوں کے ہاں آج بھی ملوکیت ہے۔تاریخ میں یہ آوازیں اٹھیں مگر ان کی کتابیں جلا دی گئیں۔ان کو بچوں سمیت جلا دیا گیا۔جنہوں نے قرآن کی بات کی۔ان کا نام ونشان تک مٹا دیا۔صرف قرآن کافی ہے اس کے لئے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں ہے۔سیرت رسول ﷺ اسی سے مرتب ہوتی ہے۔

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ (73:4)

''وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ''(73:4) یہاں حکم ہے کہ قرآن کو یہ کرنا ہے۔ پہلے ترتیل'' کے معنی لیتے ہیں۔ رَتِّلِ'' کے بعد میں لیں گے۔ خودقرآن کے پارے میں ہے وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾ (25:32) ہم نے اس کو ترتیل سے نازل کیا ہے۔ یہ ترتیل سے کیا مراد ہے؟ کوئی بھی پروگرام، فارمولا اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس میں ایک خاص نظم، ترتیب اور تناسب ہو۔ مثلاً گھڑی کے سارے پرزے الگ کر کے ایک میز پر رکھ دیں تو اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اگر یہ پرزے ایک خاص ترتیب اور نظم کے ساتھ جوڑے جائیں تو آپ دیکھئے کہ کس طرح ڈائیل کے اوپر نتیجہ آتا ہے۔ اس طرح یہ جتنے بھی اس قسم کے پروگرام ہیں تو ان میں ایک خاص نظم ہوتا ہے۔ ترتیب ہوتی ہے۔ اگر اس ترتیب کے مطابق عمل ہو تو نتیجہ نکل آتا ہے۔ ترتیل حسن ترتیب اور حسن نظم کو کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ موتی کی لڑی کے لئے یا خوبصورت سفید دانتوں کے لئے آتا ہے۔ یہ ہیں وہ محسوس مثالیں جن سے یہ الفاظ سمجھ میں آجاتے ہیں۔ بکھرے ہوئے موتیوں کو لڑی میں پرودینے سے ان میں ترتیب اور نظم آجاتا ہے۔ اسی طرح خوبصورت دانتوں میں بھی فطرت نے ایک خاص ترتیب ونظم رکھا ہے۔ سامنے والے دانت چیزوں کو چھوٹا چھوٹا کاٹ کر ان کو پیچھے داڑھوں کے پاس پہنچاتے ہیں۔ تو یہ اس خوراک کو پیستے ہیں۔ اب اس کے حسن وخوبصورتی کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ اگر یہ داڑھیں سامنے ہوتیں تو سارا حسن کرکرا ہوجاتا۔ اب یہ ترتیل موتی کی لڑی، خوبصورت سفید دانتوں کی لڑی سے تشبیہ دیکر سمجھایا ہے۔ قرآن کا مفہوم تو موتیوں کی طرح پرویا ہوا ہے۔ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ (73:4) ہم نے قرآن میں ایک خاص نظم رکھا ہے۔ اور یہ نظم تصریف آیات کے ذریعہ رکھا ہے۔ مختلف مقامات پر ان تمام آیات کو ایک ربط کے تحت ایک جگہ سے آیئے تو قرآن کا مفہوم موتیوں کی لڑی کی طرح پرویا ہوا ہے۔ تو یہ واضح ہوکر سامنے آجائے گا۔ یہ تبویب (Classification) کہلاتی ہے۔ قرآن کی آیات ایک ایک موضوع کے اعتبار سے تبویب کرکے (Classify) کریں۔ اس نظم کے اعتبار سے ان کو ترتیب دیں تو دیکھئے کہ کس طرح قرآن کا مفہوم ابھرتا ہوا سامنے آجاتا ہے۔

قرآنی نظام کی ترتیب کے لئے مرحلہ وار پروگرام موجود ہے:

ہم ابھی تو صرف الفاظ تک رہتے ہیں۔ تحریروں میں تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ (73:4) یعنی یہ بات آتی ہے اگر نظام حکومت کی بات آجائے۔ تو وہ جو قرآن نے اس میں نظم اور ترتیب بتائی ہے۔ یہ اس کے مطابق ہوگا۔ ابتداء کیسے ہوگی؟ کس طرح آگے بڑھتے چلے جائینگے۔ یہ سارا پروگرام قرآن میں موجود ہے۔ اس میں کب، کیسے، کس طرح اور کیوں کا جواب موجود ہے۔ یہ مکی اور مدنی زندگی یونہی تاریخی حادثات نہیں ہیں۔ یہ تو وہی نظم قرآنی کا پروگرام ہے۔ اسی کے مطابق رسول ﷺ نے سب کچھ کیا تھا۔ جب

1043 بھی کبھی پھر اس انداز کا نظام قائم ہوگا تو وہ اسی انداز، اسی ترتیب سے ہوگا۔ جب بھی گھڑی بنے گی اس میں وہی نظم ہوگا جو گھڑی کے پرزوں میں رکھا جاتا ہے۔

قرآن کشمکش حیات کے لیے عملی پروگرام دیا جاتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ (73:1) اب جماعت کی تیاری میں۔ ہم رنگ ساتھی تیار کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ دن بھر مسائل کا کام ہوتا ہے۔ رات کو جاگتے ہو۔ یہ بھی ضروری ہے۔ مگر زیادہ مت جاگو صحت پر برا اثر بڑے گا۔ پھر ساتھی بھی ہیں۔ تھکے ہوئے بھی ہوتے ہیں بیمار بھی ان کو جانے دیا کرو۔ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ (73:1-4) اس مقصد کے لیے رات کو بھی جاگنا ہوگا۔ لیکن ساری رات نہیں۔ آدھی رات تک حسب ضرورت، کبھی کم، کبھی کچھ زیادہ، یہ کرو۔ کاہے کے لیے وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴿۴﴾ (73:4) پھر اسی نظم و ترتیب کے ساتھ قرآن کو عمل میں لاتے چلے جاؤ۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ:

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿۵﴾ (73:5) یہ ایک وزنی۔ بھاری پروگرام ذمہ لگایا جائے گا۔ یہ پروگرام کی تکمیل ایک بھاری بوجھ تھا۔ سورہ الم نشرح میں ہے۔ اس پروگرام کے ابتدائی مراحل، سختی منزل اور تنہائی سفر کے احساس اور وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿۳﴾ (94:2-3) ذمہ داریوں کے بوجھ سے کمر ٹوٹ رہی تھی تو آہستہ آہستہ جماعت پیدا ہوگئی۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْـًٔا وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۭ﴿۶﴾ (73:6) یوں اٹھنا جسے بیج میں سے پودا اٹھتا ہے یعنی یہ اٹھنا نشو و نما کے لیے ہے۔ (ن ش و) ایسا اٹھنا جس میں نشو و نما بھی ہو۔ اس میں ارتقاء اور بدلنے کا مفہوم ہے۔ وَطْـًٔا (و ط أ) عمل اور قول کے اندر موافقت پیدا ہو جانا۔ اَشَدُّ وَطْـًٔا (73:6) سرکش جذبات مغلوب ہو کر اَقْوَمُ قِيْلًا ۭ﴿۶﴾ (73:6) اس پروگرام کو استحکام دے دے گا۔ یہ ہیں وہ ارتقاء کی منازل اس پروگرام کے۔ غور و فکر کرنے سے قرآن مشہود ہو جائے گا۔ بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ تو یہ پروگرام محکم پائیدار اور نتیجہ خیز ہو جائے گا۔ اَقْوَمُ، صیغہ بھی (Superlative) ہے۔ یعنی سب سے زیادہ مستحکم۔ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ﴿۷﴾ (73:7) دن بھر کسی مصروفیات کی وجہ سے تجھے سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ یعنی اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دن کو بھی مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۭ﴿۸﴾ (73:8) سب سے کٹ کر، یکسو ہو کر، خالص اپنے اس پروگرام پر تمام توجہات مرکوز کر دے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (73:9)۔ یہ مقامی پروگرام نہیں ہے یہ تو مشرق و مغرب یعنی تمام عالمگیر انسانی نشو و نما کا پروگرام ہے۔ اور جس کی رو سے پھیلے گا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (73:9) یعنی وہ نظام عالمگیر کرنا جس میں اتھارٹی خدا کے قوانین کو ہو۔ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿۹﴾ (73:9)۔ تمہارا قابل اعتماد سہارا وہی ہے اسی پر بھروسہ رکھ کر اس پروگرام پر چلو۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ (73:20) رات دن کے پیمانے اس لئے مقرر ہیں تاکہ رات کو آرام کر کے صبح تازہ دم ہو سکو۔

1043 عَلِمَ اَنۡ لَّنۡ تُحۡصُوۡهُ (73:20)۔جمع کا صیغہ پوری جماعت کیلئے ہے۔مستقل طور پر نباہ نہیں کرسکو گے۔بیمار پڑ جاؤ گے۔اس لئے فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ (73:20)۔گنجائش رکھ دی ہے۔اس لئے کہا فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ (73:20) اس لئے قرآن کی تعلیمات کو جتنے حصہ تک آسانی سے قلب کی زمین میں آسانی سے تخم ریزی کر سکتے ہو۔اتنے پر اکتفا کرو۔ اِقۡرَاٴَ۔(ق رأ) کسی چیز کو جمع کرنا۔اکٹھا کرنا۔اس انداز سے جیسے عورت کے رحم میں نطفہ محفوظ اور جمع ہوتا ہے۔وہاں نشوونما پا کر بچہ بھی بن جاتا ہے۔اور محفوظ بھی ہوتا ہے۔اب جمع کے لئے جماع (Pregnancy) حمل۔پھر اس کی حفاظت رحم مادر کے اندر ایسی حفاظت کہ محفوظ بھی رہے اور نشوونما بھی ہوتی رہے۔''اب یہ ضابطہ جو جمع کیا ہوا ہے اور اسے محفوظ کیا ہوا ہے۔اور کیفیت یہ کہ وہ قیامت تک ساتھ ساتھ چلتا ہوا ارتقائی منازل طے کرتا جائے۔ایک لفظ قرآن کے اندر یہ ساری باتیں آجاتی ہیں۔اس میں جمع، حفاظت، ارتقا اور نشوونما کی صلاحیتیں موجود ہوں۔یہ تھا قرأت قرآن'' اس طرح پڑھ کر، سمجھ کر پھر عمل میں لایا جائے۔تو اس سے زیادہ بہتر حفاظت کسی چیز کی نہیں ہوسکتی پڑھ کے دکھا دیا جائے۔اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس کا ساتھ دیتا جائے اس سے یہ نشوونما خود ہوتی چلی جائے۔اس عمل کو قرأت کہتے تھے۔وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ (17:79) اگر حالات کا تقاضا ہو تو پھر زیادہ رات کے کسی حصہ میں جاگو تاکہ معاملات پر مزید غور و فکر کرسکو۔فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ (73:20) لہٰذا جتنا حصہ قرآن کا آسانی سے قلب کی زمین میں تخم ریز کر کے اسے قابل نشوونما بنا سکتے ہو اسی پر اکتفا کرو۔یعنی پروگرام اتنا بناؤ کہ اس پر عمل کیا جاسکے۔ناممکن العمل نہ ہو۔جتنا ممکن ہو وہ کرو۔آہستہ آہستہ، بتدریج، اس لئے کہ عَلِمَ اَنۡ سَيَكُوۡنُ مِنۡكُمۡ مَّرۡضٰى ۙ وَاٰخَرُوۡنَ يَضۡرِبُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ يَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۖ (73:20) اس لئے تاکیداً پھر کہا فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنۡهُ ۙ (73:20)۔جتنا آسانی سے ممکن ہو اتنا کرو۔

''سورۃ المدّثّر''، ساری نوعِ انسانی کو اس انقلاب سے آگاہ کرنا اور عملی قدم اٹھانا

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝٤ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝٥ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝٦

(74:1-6) سورۃ المزّمّل تو جماعت بندی کے تمام تقاضے تھے۔اب سورۃ المدّثّر یہ اعلان عظیم ہے۔پوری کائنات انسانی میں انقلاب برپا کرنے کا۔مُدَّثِّرٌ، دَثَرَ، مُدَّثِّرٌ، دَثَّرَ تَدْثِيْرٌ دَثَرَ الشَّجَرَ۔خزاں کے موسم میں پتے جھڑ جاتے ہیں۔پھر بہار کے موسم میں انہی ٹنڈ منڈ شاخوں سے نئی نئی کونپلیں پیدا ہوتی ہیں۔اس صحن خزاں دیدہ کے اوپر ایک بہار نو جلوہ فرما ہوتی ہے۔ایسا کرنے والے کو مدثر کہتے ہیں۔دوسرے معنوں میں بھی عرب اسے استعمال کرتے ہیں۔تَدْثِيْرُ الطَّآئِرُ۔پرندے پرانے گھونسلوں کے بوسیدہ تنکے جھاڑ کر اس کی جگہ نئے تازہ اور مضبوط تنکے لا کر اپنے گھونسلہ کو سنوارتے ہیں۔اس طرح سے نشیمن کو از سر نو سنوارنے والے کو مدثر کہتے ہیں۔تو يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ (74:1) کے معنی ہوئے اے کائنات کے چمن خزاں دیدہ پہ بہار نو لانے والے! اے نشیمن عالم کو از سر نو سنوارنے والے! قُمْ (74:2)۔اٹھ! یہ ہے قیامت اس ایک لفظ میں۔اور فریضۂ اس نبی ﷺ کا۔ڈینیسن نے اپنی کتاب "Emotion as the basis of civilisation" by Danison ظہور نبی ﷺ کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔(مدثر کے معنی ذہن میں رکھئے پھر سن لیں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے) اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جس کی تعمیر میں چار ہزار برس صرف ہوئے۔منہدم ہونا چاہتا ہے۔نوع انسانی پھر اس بربریت کی طرف لوٹ جانے والی ہے۔جہاں ہر قبیلہ دوسرے کا خون پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔قدیم قبائلی مسالک وآئین اپنی قوت واحترام کھو چکے تھے۔اس لئے اب ملوکیت کا انداز کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔عیسائیت یک جہتی کی بجائے تشت وافتراق اور ہلاکت وبربادی کا موجب بن رہے تھے۔ہر طرف فساد ہی فساد تھا۔تہذیب وتمدن کا وہ بلند وبالا درخت اب لڑکھڑا رہا تھا۔وہ اندر سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔سلسلہ حرب وضرب کے طوفان نے اسی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے۔لیکن یہ بھی خطرے میں تھے کہ کسی وقت گر پڑیں۔کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا؟ جو نوع انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے۔اور اس تہذیب کو مٹنے سے بچالے؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہئے تھا۔اس لئے کہ پرانی رسومات وآئین سب مردہ ہو چکے تھے۔اور انہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔یہ تھا تہذیب کا وہ نقشۂ اور وہ تھا بلند وبالا درخت اور یہ تھی اس کی حالت! اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ امر موجب حیرت

1043 واستعجاب ہے کہ یہ کلچر سرزمین عرب سے پیدا ہوا اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ(74:1)۔
اے وہ کہ جس کے ذمہ انسانیت کو سنوار کر اور ایک جہان نو کو وجود میں لانے اور ہر باطل نظام کی جگہ حق کا نظام غالب کرنے کا فریضہ ہے!۔ کارلائل (Carlyle Thomos-1818) کی کتاب (Hero and Hero Worship) یہ بھی دنیا کے قدیم ہیروز کا ذکر کرنے کے بعد رسول ﷺ کی ذات گرامی تک پہنچتا ہے۔تو وجد میں آ جاتا ہے۔''عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی۔ جو ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئی تھی۔عرب اس کے ذریعہ پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی۔ان کی طرف ایک رسول ﷺ آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہوگئی۔ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک آ گئے تھے۔اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چلے ہیں۔کہ یہ اس شان وشوکت اور درشندگی وتابندگی سے کرۂ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں۔ یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا۔ایمان میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔اس سے زندگی ملتی ہے جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا تو اس قوم کی تاریخ ،اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا ہوگئی۔ وہ عرب...... یہ محمد ﷺ......اور ایک سو سال کا عرصہ! کیا یہ انقلاب ایسا نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلہ پر آسمان سے بجلی کی لہر آ کر گرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتش گیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح سے بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے؟''نوع انسانی!'' کیا الفاظ ہیں! نوع انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطل جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوع انسانی کو شعلۂ صفت بنا گیا۔ یہ سمجھے ہیں المدثر کے معنی۔کیا عجیب اتفاق نہیں کہ جو ان کے بنیادی معنی تھے۔ وہ شجر خزاں دیدہ پہ بہار نو آنا'' وہ تشبیہ وتمثیل بھی وہی ہے۔جو ان مقالات میں آپ کے سامنے آئی۔ یہ تمام بڑے بڑے فاضل تھے۔ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ان کے بنیادی معنی لئے ہوں یا خود اپنے ہی تخلیقی ذہن سے اس نتیجہ پر پہنچے ہوں۔مگر یہ لوگ اس انتخاب تک پہنچ گئے۔اگر انسان خالی اندھن ہو کر سوچے تو پھر وہ قرآن کے قریب آ جائے گا۔ یہ تو تقلیدی بت اس تک آنے نہیں دیتے۔ یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ(74:1)۔ قُمْ (74:2) ؎

دو گیتی را صلا از قرأتِ اوست
مسلماں لایموت از رکعت اوست
نداند ایں کشتۂ عصرِ بے سوز
قیامت ہا در قد قامتِ اوست

یہ تھا وہ عظیم انقلاب جس کے لئے کہا گیا کہ اٹھو، کمر بستہ ہو جاؤ، فَاَنْذِرْ ۪ۙ (74:2)۔ان فراموشوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرو۔ پہلا مرحلہ انذار کا ہے آگے کنواں ہے۔اس لئے تنذیر زور سے کہنا پڑتا ہے۔اس میں جرأت چاہئے۔ یہ سارے اہل مذاہب کو للکارنا تھا۔ کہ تم سب غلط راستوں پر جا رہے ہو۔
اب اس منفی پہلو کے بعد مثبت پہلو آتا ہے۔اب پروگرام وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۪ۙ(74:3)۔خدا کے اس نظام ربوبیت کو اس

1043 طرح قائم کردے کہ کبریائی صرف اسی نظام ربوبیت کی ہو۔ کوئی نظام اس کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ یعنی تمام ذرائع نشوونما ان تمام ظالموں سے چھین کر اس نظام کی تحویل میں دیدیا جائے گا۔ تاکہ اس سے تمام نوع انسانی کی نشوونما ہو سکے۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:3) کو ادھر سے پڑھیئے۔ جب بھی وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:3) آتا ہے پیچھے کی طرف لوٹایئے تو تب بھی وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:3) آتا ہے۔ ہر ایک دائرہ بنتا ہے۔ یعنی تم خدا کی کبریائی قائم کرو تو وہ تمہاری کبریائی قائم کردے گا۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (2:152) وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (2:185) یہ تھے صوم اور ان کا مقصد۔

اب اگلی بنیادی بات وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4) ثِيَابٌ۔ ثَوْبٌ اور ثَوَابٌ کا مادہ (ث و ب) ہے۔ ابتدائی معنی تو کپڑا ہے۔ مگر ثَوْبٌ یا ثِيَابٌ سے مراد شخصیت، ذات، پرسنالٹی' لیا جاتا تھا۔ فَطَهِّرْ (74:4) سے مراد دور کرنا ہر غلط چیز سے پاک رکھنا۔ دور رکھنا۔ اس پروگرام کی کامیابی اس صورت میں ممکن ہے کہ اس جماعت کی سیرت وکردار پاکیزہ ہو اور اس تحریک کو تمام ناپسندیدہ عناصر سے پاک وصاف رکھا جائے۔ خود ثاب کے معنی جمع ہونا ہے۔ اس زمانے میں لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لئے ٹیلہ پر ایک کپڑا لیکر اور اسے زور زور سے ہلاتے تھے۔ لوگ اسے اہم ومعاملہ سمجھ کر جمع ہوجاتے تھے۔ یہ اسے تَثْوِيبٌ آج بھی کہتے ہیں۔ صبح کی اذان میں اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کو تَثْوِيبٌ کہتے ہیں۔ ثیاب یعنی دعوت، اجتماعیت۔ جمع کرنا۔ اس میں دونوں باتیں آگئیں۔ انفرادی طور پر شخصیت اور اجتماعی طور پر اجتماع کے لئے دعوت تو ایک تو خود اس جماعت کا کردار قابل رشک ہو اور دوسرا اسے ناپسندیدہ عناصر سے دور رکھا جائے۔ آگے ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (74:5)۔ ان رفقاء کی ایسی تربیت کر کہ وہ اس ذمہ داری کو اٹھائیں تو پاؤں میں لغزش نہ آئے۔

رہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخ حرم
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر
می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

لَآ اِلٰهَ سے پہلے اِلَّا اللهُ ضروری۔ اس کا پروگرام کا ضروری حصّہ یہ ہے اس کو مدنظر رکھا جائیگا۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (74:6) یہ تو ایسی جماعت تھی جو وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9) بغیر شکریہ اور صلہ کے یہ کام کرنے ہیں۔ اس نیت سے نہیں دنیا پر احسان دھردو یا اس امید پر کہ اس سے زیادہ مل جائیگا۔ اور یہ مسلسل عمل ہے۔ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ (2:132) اس میں تو صلہ ایک طرف شکریہ کے بھی متمنّی نہیں ہیں۔ اب ٹکراؤ قریب آرہا ہے۔ یہ انقلاب اب چاند کی طرح طلوع ہو کر رات کے اندھیرے کی جگہ صبح طلوع ہونے والی ہے۔ اب آگے سورۃ القیامہ کریں اور قرآنی ربط بھی ملاحظہ ہو۔

وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿٣٧﴾ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ (74:33-39) قرآن کے آخر تک یہ سلسلہ مربوط ہے۔

جہنّمی زندگی میں عذاب کے مجازی معنی کا استعمال:

قرآن جو اقوام عالم کی تاریخ پیش کرتا ہے تو اس سے یہ مقصود ہے کہ اگر اس قسم کی روش جو بھی اختیار کرے گا۔ تو نتیجہ اس قسم کی تباہی ہوگی۔ اور وہ جہنم کی زندگی ہے۔ عذاب کی زندگی۔ جلا دینے والی زندگی۔ راکھ کر دینے والی زندگی۔ یہ الفاظ کے مجازی معنی ہیں جو اس قسم کی زندگی کے لئے کہے جاتے ہیں۔ اگر نگاہ بصیرت ہو تو معلوم ہو جائے گا۔

ہزار حیف نہ بینی قیامت موجود

ہمیں تو ان جہنم کے شعلوں نے لپیٹ کر رکھا ہے۔ تمام سپر پاورز اس جہنم کا شکار ہیں۔ اور ہم جیسی محکوم قومیں خواہ قانونی طور پر آزاد کیوں نہ ہوں۔ وہ تو دہرے عذاب کا شکار ہیں۔ اپنے ہاں کے غلط نظام کے اور ان سپر پاورز کی طرف سے مسلط کردہ عذاب میں۔ یہ مکافات عمل ہے جس قسم کا عمل ویسا اس کا نتیجہ۔ ان قریش کو بھی بار بار وارن کیا گیا تھا عذاب یا تباہی سے مراد یہ ساری مراعات، مال و دولت تفاخر چھن جائے گا۔ یہ تولیت کعبہ، تجارتیں۔ حسب ونسب کا تفاخر، یہ سارا کچھ اس انقلاب سے چھن جائے گا۔ ان کے مقابلہ میں یہ کمزور اور لاچار آ کر یہ تمام چیزیں چھین کر لے جائیں گے۔ وہ یہ ماننے کے لئے بالکل آمادہ نہیں تھے۔ اب قرآن محسوس مثال سے یہ بات بتا رہا ہے۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ (74:32-35) پہلی رات کا چاند جو ایک چھوٹی سی لکیر نظر آتا ہے یہ آہستہ آہستہ منازل طے کر کے چودھویں کا چاند بن کر یعنی یہ چھوٹی جماعت بھی منزل بہ منزل اپنی روشنی پھیلاتی ہوئی جا رہی ہے۔ ذرا دیکھو کہ یہ رات کی تاریکی کیسے پیٹھ دکھا کر کافور ہو جاتی ہے۔ لیل کے لئے اِذْ جو ماضی کے لئے ہے جبکہ اِذَا جب کوئی آنے والا واقعہ اچانک ہو۔ جیسا کسی نے چہرے سے اچانک نقاب اٹھا لیا ہو۔ چاند کی چھوٹی سی لکیر تاریکی کافور کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور جوں جوں یہ بڑھنا شروع ہوگا تو صبح نے چہرے سے نقاب اٹھایا اور ساری دنیا جگمگا اٹھی۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ (74:35) إِحْدَى، بے مثل، بے نظیر، کبر، تکبیر، عظیم واقعہ۔ ایسا عظیم واقعہ ہوگا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملے گی۔ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾ (74:36)۔ پوری انسانیت کے لئے اس میں آگہی ہے۔ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿٣٧﴾ (74:37)۔ ان انسانیت کے ارتقاء کی بات ہے۔ جو قرآنی اقدار کے تحت صحیح نظام کے اندر نشوونما پا کر آگے بڑھتی ہے۔ غلط نظام میں رک جاتی ہے۔ اب جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جس کا جی نہ چاہے وہ پیچھے رہ جائے۔ یہ ہے سزا۔ یہ ہے آگ۔ یہ ہے جہنم۔ یہ تمام چیزیں تو مجازاً کہی گئی ہیں۔ یہ کوئی خارج کی سزا نہیں ہے یہ تو اعمال کے اندر ہی مضمر ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾ (74:38)۔ قوم افراد سے عبارت ہے۔ ہر فرد اپنے اعمال کے ہاتھوں گروی ہے جب تک اس کی قیمت ادا نہ کی جائے وہ آزاد نہیں ہو سکتی۔ جکڑا ہواہل ہی نہیں سکتا تو آگے کیا جائے گا۔ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ (74:39)۔ صرف ان خوش نصیبوں، بابرکت کے سوا۔

جیسے جنگلی گدھا بدک کر شیر سے بھاگتا ہے
اسی طرح یہ قرآن سے بھاگتے ہیں

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ (74:49) كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ (74:50) فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ (74:51) جیسے جنگلی گدھا بدک کر شیر سے بھاگتا ہے اسی طرح یہ قرآن سے بھاگتے ہیں۔ یہ کیوں بھاگتے ہیں اس قرآنی تذکرہ نے خود ہی جواب دیدیا۔ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ (74:52) اصل میں ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کا الگ الگ منشور ہو جس میں صرف اسی کی مفاد کی بات ہو۔ اجتماعیّت سے بھاگتے ہیں۔ صرف انفرادی مفاد ہونا چاہئے۔ كَلَّا مگر ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ نظام سرمایہ داری کی طرف اشارہ ہے جس میں ہر ایک کو جتنی چاہے دولت سمیٹ لے۔ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (74:52)(Individual Enterprise) كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾ (74:53)۔ یہ اصل میں مستقبل کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور نہ مکافاتِ عمل سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے یہ دولت سمیٹتے رہتے ہیں۔

کشمکشِ حق و باطل کے آخری مراحل

فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذۡكُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (74:55-56) اس سے تو وہی نصیحت حاصل کرے گا جو اپنے ارادوں کو مشیت خداوندی سے ہم رنگ کر دے۔ هُوَ اَهۡلُ التَّقۡوٰى وَاَهۡلُ الۡمَغۡفِرَةِ ﴿۵۶﴾ (74:56)۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اہل تقوی یعنی قوانین کی نگہداشت کرنے والے اور انہی کو تمام خطرات سے حفاظت ملے گی۔

کشمکشِ حق و باطل کے آخری مراحل:

اس عدیم النظیر واقعہ کا آخری دور آرہا ہے۔ پچھلی سورتوں میں جماعت سازی کے بعد قم کہا گیا۔ قیام کے بعد عربی زبان میں گول ''ۃ'' لگانے سے وہ کام جو شدت سے یکبارگی سے سامنے آجائے اس ''قِیٰمَة'' کہا گیا ہے۔ پھر شروع میں ال'' لگانے سے ''الۡقِيٰمَةِ ﴿۱﴾'' (75:1) قرآنی اصطلاح ہوگئی۔ جو اس دنیا کی اور مرنے کے بعد کی دنیا کے لئے بھی آتا ہے اب یہ حق و باطل کا معرکہ انقلابی طور پر یا ارتقائی طور پر منازل طے کرنے کے بعد سامنے آجاتا ہے۔ یہ قُم سے قِیَامَۃٌ ہے۔ یہ تدبر فی القرآن ہے۔ یہ انقلاب اب بھی جاری ہے۔ یہاں تو ہر آن یا ہر سانس میں ایک قیامت پوشیدہ ہے۔ امت زندہ ہونی چاہئے۔ مردہ کے لئے قیامت نہیں ہوتی۔ اٹھنا تو زندگی کے ساتھ ہے۔

کسی دور یا فرد کا تدبّر آنے والے دور کے لئے یا فرد کے لئے سند نہیں ہوسکتا۔ سورتوں کا معجزانہ ربط، نفس کے مختلف پہلو

کسی دور کا تدبر، کسی ایک فرد کا تدبر، آنے والوں کے لئے سند نہیں ہوسکتا۔ کہ وہ اس کی پابندی کریں اور اسے غیر متبدل سمجھیں۔ غیر متبدل تو صرف کلمٰتُ اللہ ہیں۔ اگر ایسا ہو تو قرآن پر تدبر تو ایک خاص دور پر آ کر ختم ہو جائے گا۔ اگر یہ تدبر فی القرآن کا راستہ اسی طرح سے کھلا رہتا۔ تو معلوم نہیں کہ ایک ہزار سال میں قرآن کے کس قدر حقائق بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آج آئے ہوئے ہوتے۔ لیکن ہم تو اسی ہزار سالہ دور میں آ کر رکے ہوئے ہیں۔ جبکہ علم انسانی کہاں سے کہاں چلا گیا ہے۔ فطرت کے اشارے تو ہم بے نقاب نہ کر سکے جو ایمان کا حصہ تھا۔ حالانکہ فطرت کے حقائق اس کی صداقت کو ثابت کرتے یہ خود قرآن کا دعوی ہے۔ ہم نے تو ہزار برس سے ان حقائق سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ تدبر کے دروازے تو ہر انسان کے لئے ہر دور میں کھلے رہنے چاہئیں۔ اس میں ناراضگی کی بات نہیں ہے کہ تمہارے تدبر کا نتیجہ میرے تدبر سے مختلف کیوں ہے؟ یہ تو افہام و تفہیم کی بات ہے۔ اگر اس میں فرق ہو تو آپس میں سمجھ لینا چاہئے۔ جو حقائق، قرآن کی تعلیمات کے قریب ہو بہتر تدبر ہے۔ مگر حرف آخر وہ بھی نہیں ہے۔ آخری حرف تو حقیقت میں صرف قرآن ہے۔

نفس انسانی کی مختلف خصوصیات:

لَآ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِۙ‏ ﴿۱﴾ (75:1) ان سے کہو کہ بات یوں نہیں ہے۔ جیسے تم خیال کئے بیٹھے ہو کہ جو جی میں آئے کریں۔ بھلا ہمیں کون پوچھ سکتا ہے۔ میں اس انقلاب کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں۔

وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِؕ‏ ﴿۲﴾ (75:2) اور اس شخص کو شہادت میں پیش کرتا ہوں جو اپنی غلطی کے احساس سے نادم ہے۔ (12:57) انسان کا ہر عمل نتیجہ خیز ہوتا ہے خواہ ادھر سامنے آجائے یا دوسری دنیا میں عربی زبان میں نفس کے مختلف اور متعدد معانی ہیں۔ لیکن جب یہ چیز انسان کے ضمن میں آئیگی تو اس کے متعلق بتایا ہی نہیں جا سکتا۔ کہ یہ ہے کیا؟ یونانی فکر نے اسے روح (Soul) کہا۔ عیسائیت میں آ کر یہ Spirit جو مادہ کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد علم کی دنیا میں اسے

(Mind) کہا۔اس سے کام نہ چلا تو پھر اسے (Psyche) کہا۔ یہ طبعی جسم تو وہی حیوانی تقاضے رکھتا ہے۔مگر اس کو اختیار وارادہ حاصل ہے۔خدا نے اسے اپنی روح میں سے ایک شمہ دیدیا۔یعنی ایسی توانائی جس سے یہ اختیار وارادہ کا مالک ہوگیا۔یہ خدائی صفت ہے اور چونکہ اس پر طبعی قوانین کا اطلاق نہیں ہوا اس لئے اسے کہا گیا کہ میں نے اپنی طرف سے یعنی اس کا تعلق مادی کائنات سے نہیں ہے۔قرآن نے اسے نفس کہہ کر پکارا ہے۔یہ انسان کے طبعی جسم کو استعمال کرنے کی قوت رکھتا ہے۔یہ ہے ذمہ دار سارے اعمال کا۔اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔انگریزی میں بھی اس کے لئے کئی نام اور اصطلاحات اختیار کی گئیں پھر رد کر دی گئیں۔مگر ابھی تک بات نہیں بنی۔

جسم انسانی تو مرجاتا ہے اس کا ''میں'' یہ نہیں مرتا۔یہ اپنی ذمہ داریوں کو لئے ہوئے آگے چلا جاتا ہے۔''پروفیسر Schrodinger(1966) کی چھوٹی سی کتاب ''What is life?'' وہ آخر میں رقمطراز ہیں کہ اگر آپ ''میں'' کا تجزیہ کریں۔تو دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔یہ وہ پردہ ہے جس پر حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا بغور مطالعہ کریں گے۔تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ جیسے آپ ''میں پھر پر سانلٹی (I am ness/self) کہتے ہیں۔اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربہ اور حافظہ کی عمارت اٹھتی ہے۔اگر کوئی Hypnotist تمہاری سابقہ یاداشت ذہن سے محو بھی کردے تو دیکھو گے کہ اس سے تمہاری ''میں'' کی موت واقع نہیں ہوگی۔لہٰذا انسانی ذات کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

ہمارے ہاں عموماً تین نفس گنائے جاتے ہیں۔اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (12:53) میں آیا ہے صرف۔بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿۲﴾ (75:2) النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ (89:27) میں۔ہمارے ہاں ان کو الگ الگ گردانا جاتا ہے۔یہ تمام ایک ہی نفس کی مختلف خصوصیات ہیں۔الگ الگ گوشے ہیں۔Aspets ہیں۔

1) نفسِ امّارہ:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴿۱﴾ (75:1)

نفس امارہ کا قول عزیز مصر کی بیوی سے منسوب ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (12:53) اس نے جرم کا اعتراف کیا تھا۔وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ (12:53) میں اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں سمجھتی۔یہ نفس برائی کے لئے آمادہ کرتا رہتا ہے۔قرآن نے ایک بات بڑھائی ہے۔یا عزیز مصر کی بیوی کا قول نقل کیا ہے۔اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (12:53) بنیادی طور پر وہ یہ نفس نہیں ہے جو انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے۔یہاں عیسائیت کے عقیدے کی جڑ کاٹ دی کہ ہر بچہ گناہ گار پیدا ہوتا ہے۔انسان کا نفس وہ برائی کی طرف بھی لے جاتا ہے۔لیکن جس پر خدا کی رحمت ہو وہ یہ نہیں کرتا۔تو بنیادی طور پر یہ نفس کی چیز نہ ہوئی کہ وہ برائی کی طرف لے جاتا ہے۔برائی کی

1043 طرف وہ نفس لے کر جاتا ہے جو خدا کی رحمت میں نہ ہو۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (12:53)۔ بڑی شدت سے اکسانے والا۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ گناہ کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ بلکہ کہا اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ (12:53)۔ اس سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جو خدا کی رحمت میں ہو۔

نفسِ مطمئنہ:

نفس کی تیسری سٹیج مطمئنہ ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاحات ہیں۔ ان کے بنیادی معنی کی طرف جائیے تو انسان جھوم جاتا ہے۔ یہ ہے وہ نفس جو انسان کو جنت کے لئے کوالیفائڈ کرتا ہے۔ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (89:27:30) یہ ہے وہ نفس جو جنت کے لئے کوالیفائیڈ ہوگیا۔ مگر جماعت کے ساتھ جنت اور جہنم میں بھی جانا پڑتا ہے۔ جس طرح آج پوری کی پوری قوم جہنم میں ہے اگر کوئی ایک فرد چاہے کہ جہنم میں کوئی ایک فرد جنتی ہوجائے تو وہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو پوری جماعت کو ہونا ہوگا یا جنتی ہونا ہوگا یا جہنمی ہونا ہوگا۔

نفسِ لوّامہ اور انسانی ضمیر کی تشریح:

نفس لوامہ یعنی ملامت کرنے والا۔ جہاں تک ضمیر کا تعلق ہے تو انسان کے اندر ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو حق و باطل کی تمیز کرسکے۔ اگر یہ چیز انسان کے اندر ہوتی تو پھر وحی کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ رسول کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ یہ صرف حیوانات کے اندر ہے۔ جس طرح مرغی کا بچہ انڈے سے نکل کر خشکی کی طرف اور بطخ کا بچہ پانی کی طرف بھاگتا ہے۔ یہ حق و باطل کا امتیاز ان کو کس نے بتایا؟ کوئی رسول ان کے پاس نہیں آیا یہ چیز ان کے اندر رکھی ہوئی ہے۔ جسے ان کی جبلت (Instinct) کہتے ہیں۔ جبکہ انسانی بچہ ذرا بڑا ہو تو گھر والوں کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ اس لئے اسے خارج سے ہدایت کی ضرورت پڑی ہے۔ اب رہنمائی یا تو مطلق ہوتی ہے یا اضافی۔ مثلاً اضافی یا (Relative) کا فیصلہ انسان خود کرسکتا ہے۔ اب فیصلہ کیا کہ میں شہر کی طرف جانا ہے تو یہ سیدھی سڑک اس کے لئے صراط مستقیم بن جائے گی۔ مگر دوسری چیز جو فی الواقعہ گمراہی ہے یا فی الواقعہ صراط مستقیم ہے۔ اضافی (Relative) نہیں ہے بلکہ مطلق ہے کہ رزق حلال سے روزی کمانا اور دوسرے کی محنت کو سلب کرنا حرام ہے۔ باطل ہے۔ اور ہمیشہ ہے۔ ہر حال میں، ہر شخص کے لئے ہے۔ بدل نہیں سکتا۔ یہ اقدار اضافی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً آپ دوست کی عزت کرتے ہیں۔ کل ہی وہ دشمن ہوجاتا ہے تو آپ عزت نہیں کرتے۔ آپ نے جو عزت کی تو وہ اضافی ہے۔ قرآن کا حکم کہ ہر شخص واجب التکریم ہے۔ یہ مطلق ہے۔ اب اگر وہ دشمن ہے یا دوست ہے۔ بے گانہ ہے یا اپنا ہے۔ یہ ایک حق مطلق ہے۔ اس کی تکریم مطلق ہے۔ اس لئے مطلق خیر اور مطلق شر کا علم انسان کے اندر نہیں ہے۔ یہ وحی کے ذریعہ رسولوں کی معرفت ملتا ہے۔ اب اگر ہندوؤں کے ہاں اگر وحی آئی تھی تو گم کردی گئی۔ انہوں نے یہ دھرم بنالیا کہ پیدائشی اعتبار سے یہ ذاتیں ہیں۔ برہمن کی تو عزت لازمی مگر شودر کو جوتی تلے رکھا جائے گا۔ یہ باطل ہے۔ جبکہ حق یہ ہے کہ ہر بچہ واجب التکریم ہے۔

ضمیر کی آواز:

مسلمان کا بچہ گوشت گائے کا لذت لے لے کر کھاتا ہے جبکہ ہندو کو قے آجاتی ہے کیا یہ ان کے ضمیروں کی آواز ہے؟ کسی نے اندر سے ان دونوں کو نہیں کہا بلکہ یہ جس ماحول میں ہندو کے بچے نے پرورش پائی تو بچپن سے یہ آواز اس کے تحت الشعور میں آ گئی کہ گائے کا گوشت نہیں کھانا۔ جبکہ یہ آواز مسلمان بچے کے کان میں ہی نہیں پڑی۔ بلکہ گھر میں گائے کا گوشت پکنا شروع ہوا تو اسنے یہ اپنے ماحول کا اثر لیا ہے۔ تو ضمیر تو اس کا نام ہے۔ یہ تو جس ماحول میں وہ ضمیر پرورش پائے گی اس ماحول کا اثر اس قسم کا ضمیر بن جائے گا۔ تو ضمیر کی آواز حق و باطل کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ جس قسم کے معاشرے میں کوئی پرورش پائے گا اس قسم کی اس کی ضمیر ہو جائے گی۔ جب اس کے خلاف کوئی کام ہوگا تو اس کی ضمیر اس کے خلاف یہ بات کرے گی۔ یہ لوامہ کیسے ہوا۔ کہ انسانی نفس وہ ملامت کرتا ہے۔ جب آہستہ آہستہ آپ اس ابا کی پرواہ نہیں کرتے۔ دباتے چلے جاتے ہیں تو وہ پھر ملامت بھی نہیں کرتا۔ وہ جرائم عام ہو جاتے ہیں۔ تو مجرم وہ جن چیزوں کو قابل ملامت سمجھتا ہے وہ وہی ہیں جو بچپن سے اس کے ذہن میں ڈالی گئیں۔ کہ یہ قابل ملامت ہیں۔ اب یاد رکھیں کہ انسان کا ضمیر یا نفس لوامہ ان چیزوں پر ملامت کرتا ہے جن کے متعلق اسے بتایا گیا ہے کہ یہ بری ہیں۔ ٹھگوں کے بیٹے کو بچپن سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم ایک شخص کو مارو گے نہیں تو تمہاری شادی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ کالی دیوی کا حکم ہے۔ تو جان لیتے وقت ان کا ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتا تھا۔ اب اس کا ضمیر اسے کیوں نہیں ملامت کرتا تھا۔ کیونکہ ضمیر تو وہی تھا جو بچپن سے اسے سکھایا گیا تھا۔ اب سرمایہ دار دوسروں کے حقوق سلب کرنے سے کرک نہیں کرتا۔ ان کا ضمیر ان کو ملامت نہیں کرتا۔ ضمیر تو حق و باطل کا فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے اس کی تائید اور جس کو باطل سمجھتا ہے اس پر ملامت کرتا ہے۔ وہ بھی اس وقت تک کہ وہ زندہ رہتا ہے اگر وہ جرم عام ہو جائے تو پھر وہ اَمّارہ یعنی برائی پر آمادہ کرنے والا بن جاتا ہے۔ لوامّہ اس تک رہتا ہے جب تک وہ اس چیز کو برا سمجھے اس پہ ٹوکتا رہے۔

نفس کے بارے میں قرآنی تعلیمات:

بچپن سے ہی معاشرہ کو بچے کے لئے ایسا بنادو کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے برا کہا ہے اسے برا سمجھے اور جسے اچھا کہا ہے اسے اچھا سمجھے۔ اب اس کے ضمیر کی آواز صحیح ہوگی۔ یہ لوگ ہیں جب ان کے سامنے شیطانی خیال یونہی گھومتا گھامتا آئے تو فوراً قانون خداوندی کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں تعلیم و تربیت پرورش ایسی ہوئی ہے کہ مطلق حق کو حق اور مطلق شر کو باطل سمجھا جاتا ہے۔ جونہی خیال آیا تو فوراً اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔

اقبال نے اسے ”Internalised Society“ ضمیر یا لوّامہ کو کہا ہے وہ معاشرہ جو سینے کے اندر سمویا ہوا ہو۔ یہ ہے ضمیر۔ جب ایسا ہو تو مومن فوراً خدا کے قوانین کے پروں تلے پناہ لے لیتا ہے۔

تَعُوْذ:

مادہ اسی کا (ع و ذ) ہے۔ مرغی کے بچے دانہ دنکا چن رہے ہوتے ہیں مرغی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر چیل کا سایہ اوپر آئے تو بھاگ کر مرغی کے پروں کے نیچے آجاتے ہیں۔ تو اسی طرح کے خطرات سے خدا کے قوانین کی چھتری سے ہی حفاظت مل سکتی ہے۔

اس لیے تربیت اور تعلیم بچپن سے بچہ کو ایسی دو کہ نفس غیر شعوریہ میں یہ حق و باطل کی تمیز اس کے کردار کا حصہ ہو جائے۔ تو غلط خیال آنے پر اس کا ضمیر اس کو ملامت کرے گا تو پھر وہ رک کر خدا کے قوانین کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور فوراً غلط راستے سے لوٹتا ہے۔ تو یہ نفس لوامہ تھا جس نے اسے توبہ پر مائل کیا۔ کیونکہ اس کے اندر صحیح تعلیم و تربیت سے یہ اقدار خداوندی رچ بس گئی تھیں۔ مطلق خیر اور مطلق شر وہی ہے۔ جو قرآن نے دیا ہے۔ ان خیالات کو معاشرے میں عام کرو اگر یہ نہ ہو تو پھر فریب دھوکہ، رشوت، ان چیزوں سے ضمیر مرتب ہوگا تو بڑھا ہو کر اس بچہ سے کیسے ایمانداری کی توقع کر سکو گے؟ تو وہ ان چیزوں کو جائز سمجھے گا اور ضمیر ملامت نہیں کرے گا۔ ضمیر کے اندر فی الواقعہ کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی بلکہ یہ تو بنایا جاتا ہے۔ اسے تعلیم و تربیت، معاشرہ ماں باپ بناتے ہیں۔ یہ وعظ و نصیحت سے کم جبکہ احوال اور کام سے بنتی ہے۔ جہاں ضمیر کا یہ غلط تصور ہو تو ضمیر غلط قدم اٹھنے پر نہیں روک سکتا۔ اقبال نے اسے ضمیر یا لوامہ کو جو سینے کے اندر سموئی ہوئی سوسائٹی ہے۔ یعنی "Internalised Society" کہا ہے۔

مکافاتِ عمل سے انکار

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾ (75:3) کیا اس کا یہ گمان ہے کہ جس بنیاد پر زندگی کی عمارت اٹھتی ہے تو وہ منتشر ہو جاتی ہے۔ اسے دوبارہ مجتمع نہیں کیا جا سکتا کچھ تو باقی ہے چلو راکھ سہی۔ تو جو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے تو کیا وہ اس سے نہیں بنا سکتا۔

عِظَامٌ (ع ظ م) مضبوط اور سخت شے جس پر کوئی عمارت اٹھتی ہے۔ بنیاد کا پتھر۔ زمیندار کے ہل نیچے سخت لکڑی جو ہمارے پاس موجود ہے تو اسی بنا پر کیا نئی عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی؟ یہ ہے دلیل۔ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ﴿۴﴾ (75:4) بنان۔ انگلیاں مگر مجازی طور پر ہر وہ چیز جس سے گرفت ہو سکے یعنی وہ قوتیں جن سے وہ عمل کو قابو میں لاتا ہے۔ ''ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے تمام قوی کو درست اور مکمل کر دیں جن سے اسے دوسری چیزوں پر تصرف ملتا ہے۔''

انسانی ذات پر نتائج کے نقش:

بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِہٖ بَصِیۡرَۃٌ ﴿ۙ۱۴﴾ وَّ لَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَہٗ ؕ﴿۱۵﴾ (75:14-15) آج تو یہ معذرتیں پیش کر کے، دلائل دے کر ان جرائم کو چھپا تا ہے۔ مگر مکافات کے وقت باہر سے کوئی نہیں آئے گا خود اپنے اوپر گواہ ہوگا۔ دلیل ہوگا۔ یعنی اس کی ذات جس پر ہر عمل نقش ہوتا جا رہا ہے اس کا اعمالنامہ ہونگے۔ لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ﴿ؕ۱۶﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚۖ۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاۡنٰہُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚ۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ﴿ؕ۱۹﴾ کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ ﴿ۙ۲۰﴾ (75:16-20)

اب تفسیروں کے مطابق تو یہ جبریل وحی لاتے تو آپ تیزی سے پڑھتے کہ کوئی رہ نہ جائے تو کہا گیا کہ جلدی مت کرو تم یہ نہیں بھول سکو گے اور ہم ان کو محفوظ کر دیں گے۔ یہ تو وحی کے قرآنی تصور کے سراسر خلاف ہے جبریل کا اسی طرح سے پڑھنا۔ رسول ﷺ کا سن کر بار بار دھرانا۔ یہ تو سراسر قرآنی تصور وحی کے خلاف ہے۔ جبریل تو وحی کو نبی ﷺ کے قلب پر نازل کرتے تھے۔ اور ان کا یہ سارا معنی قرآن کے تصور کے خلاف ہے۔ دوسری چیز یہ ہے ان میں اور پچھلی آیات میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ آخر جب جو وَّ لَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَہٗ ؕ﴿۱۵﴾ (75:15) غلط اعمال کی چاہے جو جواز پیش کرو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان چار آیتوں کے بعد آیا ہے۔ کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ ﴿ۙ۲۰﴾ (75:20) کیونکہ ان کو صرف اس دنیا کا مفاد اس غلط روش پر چلا رہا ہے گویا وہی ایک مضمون

1043 کا تسلسل ہے۔ تو رابطہ کا تقاضا یہ ہے کہ ان آیتوں کا مفہوم بھی اسی مضمون سے متعلق ہو جو پیچھے چلا آ رہا ہے اور جو اس کے بعد آگے چلا یا جا رہا ہے۔ جہاں اس جلدی کا تعلق ہے یہ قرآن کے دوسرے مقام پر ہے مگر اس کا مفہوم کچھ اور ہے وہاں یہ الفاظ کا دہرانا جبریل کے ساتھ بات نہیں ہے۔ وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡكَ وَحۡیُهٗ (20:114) قرآن پروگرام پر عمل کرنے سے پہلے اس بات کا خیال ضروری ہے۔ جب تک وحی کی رو سے کسی معاملہ کے متعلق پوری ہدایات نہ مل جائیں تو اس میں عجلت نہیں ہونی چاہیے۔ اس میں الفاظ دہرانے کے بات ہی نہیں ہے عمل میں لانے کا طریق بتایا گیا ہے۔

اوپر کی آیات میں سارا ذکر ہی اعمالنامہ سے ہے:

یہ آیات تدبر کا تقاضا کرتی ہیں پچھلی آیات کے ساتھ ربط قائم رکھنے کے لیے

کہا گیا جو اعمال نامہ کھولا گیا ہے اس میں کسی قسم کی تعذیر کام نہیں دے سکے گی۔ کوئی بہانہ کام نہیں آئے گا۔ یہ متعین چیز سامنے آئی ہے۔ اب آگے ہے کہ لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ (75:16) محاورتاً کہ قینچی کی طرح زبان مت چلاؤ اس سے کچھ اثر نہیں ہوگا۔ تو چاہتا ہے کہ تیزی سے زبان چلا کر معاملہ رفع دفع کر لے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ (75:17) یہ کام ہمارے ذمہ ہے کہ انسانی اعمال کو جمع کرے اور ان کو حفاظت سے رکھا جائے۔ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ (75:18) سو جب ہم نے اس طرح (تیرے اعمال کو) جمع کر رکھا ہے۔ تو اس جمع شدہ (اعمال نامہ) کے پیچھے پیچھے چلنا ہوگا۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَهٗ ﴿۱۹﴾ (75:19) اس طرح ان کو ظاہر کر کے تمہارے سامنے لانا ہماری ذمہ داری ہے۔ اب آگے ہے۔ كَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ (75:20) تم حیات آخرۃ سے بدکتے ہو کیونکہ مفاد عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہو۔ تم حیوانی زندگی کو نصب العین بنائے ہوئے ہو۔ وَتَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ (75:21) اور آخرت کو چھوڑ رکھا ہے۔

خدا کے دیدار کا غلط مفہوم

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ﴿۲۳﴾ (75:22-23) مفاد عاجبہ کے مقابل مستقبل کی خوشگواریاں زیادہ شاداب ہوں گی۔ تو جن کو حاصل ہوں گی تو ان کے چہرے ہشاش بشاش ہوں گے۔ تو وہ اب سامان نشوونما دینے والے کی ان کرم فرمائیوں کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ﴿۲۳﴾ (75:23) کا ترجمہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔ نَاظِرَۃٌ میں ''ظ'' ہے تو وہ ان فراوانیوں کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ قرآن نے جو تصور خدا کا دیا ہے تو اس میں تو اسے محسوس آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ تو پیغمبر کی آنکھ بھی نہ دیکھ سکی۔ تو وہاں اگر محسوس طور پر سامنے ہو گی تو یہ تصور تو قرآنی تصور کے خلاف ہے۔

سورۃ المُرْسَلٰتِ

"Evolution and Revolution"

حق و باطل کا تصادم، حق کے غلبہ کے لیے دو صورتیں

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (77:1) وَ یعنی یہ تمام قوتیں، جماعتیں اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ مُرْسِلٰتٌ جو خدا کی طرف سے پیغام لانے والی ہستیاں ہوں ان کے متبعین، وہ جماعتیں جو حقائق کا علم لے کر اٹھی ہوں۔ ملائکہ یعنی فطرت کی قوتیں جن میں زمانے کے تقاضے، تاریخی وجوب (Historical Necessity) اور حق و باطل کی کشمکش، یہ تمام عناصر ''مرسلات'' ہیں۔

حق کے غالب ہونے کی دو صورتیں:

ساری کشمکش تزاحم حق اور باطل کا تزاحم کہلاتا ہے۔ اس میں آخرالامر حق غالب ہو جاتا ہے ایک صورت تو یہ ہے کہ انسانوں کی جماعت اٹھ کر خدا کی رفاقت میں آ کر باطل کی قوتوں کو للکارے۔ تو حق چند دنوں میں فطری ارتقاء کی جگہ فجائی ارتقاء کی شکل میں یعنی Evolution سے ریولوشن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو انسانوں کے حساب سے تاریخ کے اوراق کو مدوّن کرتا ہے۔ جس طرح رسول ﷺ نے کیا مختصر ترین سات سالہ دور مدینہ میں۔

دوسرا طریقہ جس کو زمانے کے تقاضے سے یہ بتدریج، آہستہ آہستہ۔ غیر محسوس طور پر رواں دواں ہوتا ہے اپنی متعینہ منزل کی طرف۔ جس کا عرصہ کائناتی رفتار سے ایک دن کا ہزار ہزار سال یا پچاس پچاس ہزار سال کا (انسانی حساب) ہوتا ہے۔ اس کشمکش کو تاریخی شہادات سامنے لے آتی ہیں اگر تاریخ کا فلسفہ سامنے رکھیں۔ مثلاً قرآن نے حق جن امور کو قرار دیا ہے وہ کائناتی قوتوں کی تسخیر ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45:13) اب حق یہ ہے کہ ان قوتوں کو مسخر کرو اور باطل یہ ہے کہ ان کے سامنے جھک جاؤ۔ اب انسان کی ابتدائی ساری تاریخ ان قوتوں کے سامنے جھکنے کی ہے۔ بارش، بادل، بجلی، سیلاب، چاند، سورج، بیماریاں، غرضیکہ سانپ شیر تک کو ڈر کر پوجنا شروع کر دیں اب رفتہ رفتہ ان قوتوں کو مغلوب کر کے چاند تک پہنچ گیا۔ تمام مذہبی قوتوں نے اسے الحاد و کفر سے تعبیر کیا۔ اب اس حق کی مخالفت باطل یعنی مذہب کی طرف سے ہوئی اور ہو رہی ہے۔ حق تو کائنات کی قوتوں کی تسخیر کرنے کے بعد اسے نوع انسانی کی فلاح کے لئے استعمال کرنا ہے۔ اب اس حق

کومشہود ہونے کے لئے پتہ نہیں کتنی صدیاں صرف ہوئیں۔ جب بھی کسی سائنسدان نے کہا کہ زمین گردش کر رہی ہے گول ہے تو مذہب کی دنیا نے کہا کہ اسے پھانسی پر لٹکا دو۔ مگر اس قدر مخالفت کے باوجود حق و باطل کی اسی کشمکش میں حق غالب آ گیا۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) یہ صرف حق کا گوشہ ہے ایک جو ضروری ہے مگر اس کی تکمیل وہ دوسرے گوشہ پر عمل کرنے سے ہوگی۔ مفاد عامہ کے لیے استعمال۔

دوسرا گوشہ مفاد عامہ کے لئے اس کا استعمال:

کائناتی قوتوں کو مسخر کرنا بھی حق ہے۔ دین ہے مگر اس دین کا اگلا گوشہ دین کی تکمیل کرتا ہے۔ یعنی ان تمام تسخیر کردہ قوتوں کا مفاد عامہ کے لئے استعمال یہی حق و باطل کی کشمکش اب انسانوں میں آ گئی۔ انسانوں کی، گروہی مفاد پرستیاں ان انعامات کو عام ہونے نہیں دیتی۔ رسول ﷺ کا غلبہ تمام مذہب گزیدہ قوموں پر ہوا تھا۔ یہ تمام ایران و بازنطینی مذہب پرست تھے ان پر دین کا غلبہ ہوا تھا۔

اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ تمام مُرْسَلٰتِ اس حقیقت پر شاہد ہیں چاہے پیغمبر ہوں یا اتباع کرنے والی جماعتیں یا ملائکہ یعنی فطرت کی قوتیں یعنی زمانے کے تقاضے اس کشمکش میں یہ تمام خدا کے پروگرام کے مطابق آئی ہیں۔ ایک خاص مقصد کے لئے یہ مرسلت بھیجے گئے۔ عُرْفًا۔ اسی سے عرفانٌ، معرفت، پہچانا جانا۔ اس معاشرے میں جو دور دور رہا کرتے تھے۔ زندگی میں ایک آدھ مرتبہ ایک قبیلہ کا آدمی دوسری جگہ آیا یا ادھر کا ادھر چلا گیا تو وہ اچھی طرح سے پہچانا جاتا نہیں تھا۔ پہچانا وہ جاتا تھا جو بار بار آئے۔ جو متواتر آئے۔ عُرْفًا یعنی یہ قوتیں پروگرام کے تحت علی التواتر بھیجی گئیں۔ یہ کیا کرنے آئی ہیں؟ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (77:2) یہ تند و تیز ہوائیں تمام خس و خاشاک کو اڑا کر دور پھینک دیں۔ حق و باطل یوں ملے ہوتے ہیں۔ کہ پہچاننا مشکل ہے لوگ باطل کو حق سمجھنے لگتے ہیں۔ جو چھلکے اندر دانہ کی صورت میں چھپا ہوتا ہے اور صرف چھلکا نظر آتا ہے۔ اگر اس کو زور لگا کر کوٹ دیں تو وہ سارا پس گیا تو حق و باطل کی آمیزش ہوگئی۔ اس لئے فصل کو گاہنے کے لئے زمین پر بچھا کر دن بھر بیل چلائے جاتے ہیں۔ اس طرح دانہ چھلکے سے الگ کیا جاتا ہے۔ کہ دانہ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ چھلکا تو بھوسہ بن جاتا ہے۔ یہ مسلسل آنے والی قوتیں دانہ کو بھوسہ سے الگ کرتی ہیں۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ اس لے بار بار رسول ﷺ کو تاکید کی گئی۔ فَاصْبِرْ۔ آہستہ آہستہ چلو۔ جلدی میں دانے ٹوٹ جائیں گے۔ اس لئے تو قرآن نے نفسیاتی انقلاب پر زور دیا ہے۔ پہلا کام یہ ہے اس کے بعد۔

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (77:3)۔ پھر وہ اس حق کو بھوسہ سے الگ کر کے جگہ جگہ اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ اس کو پھیلاتے ہیں۔ اگر معاشی نقطہ نگاہ سے یہ تو سرمایہ داری جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:2) اور وَجَمَعَ فَاَوْعٰى (70:18) کے علی الرغم اسے ساری دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ پیغام کو بھی اور ان ذرائع رزق کو بھی۔ یہ جماعتیں بھی فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا (77:5) تاریخی نوشتوں کو بطور شہادت پیش کرتی ہیں کہ حق و باطل میں باطل کو شکست ہونا لازمی ہے۔ نوحؑ سے لیکر سارے رسولوں کی سرگذشت اور موجودہ ماضی قریب میں تاریخی نوشتے۔ کہ جس قوم نے باطل کا نظام اپنایا وہ تباہ و برباد ہوگئی۔

عُذۡرًا اَوۡ نُذۡرًا ۙ﴿۶﴾ (77:6)۔تا کہ اتمام حجت ہو جائے ان دلائل سے اور ان تنبیہات سے۔ان تمام شہادات کے بعد ان سے کہہ دو کہ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾ (77:7)۔یہ جو کہا جا رہا ہے کہ اس باطل نظام والے تباہ ہو کر رہیں گے۔وہ ضرور ہو گا۔

اس دور میں کیا ہو گا؟:

اس دور میں کیا ہو گا۔فَاِذَا النُّجُوۡمُ طُمِسَتۡ ۙ﴿۸﴾ (77:8) ان چھوٹے چھوٹے گروہوں کی قوتیں ماند پڑ جائینگی۔یہ تمام عرب کی سرحدوں پر واقع روم وایران چھوٹی چھوٹی ریاستیں جوان کی باجگذار تھیں ان کو ختم کیا گیا۔تاریخ شاہد ہے کہ وہ ختم ہو کے رہ گئیں۔توتم کیسے رہ سکتے ہو۔؟

وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ ۙ﴿۹﴾ (77:9)۔تمام بڑی پاورز میں دراڑیں پڑ جائینگی۔وَاِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ۙ﴿۱۰﴾ (77:10) اور پہاڑ جیسی یہ تمام سرداران کے پرخچے اڑ جائینگے۔تاریخ فارس،تاریخ روما یہ ہیں وہ تاریخی نوشتے۔یہ ہیں وہ قوتیں جو تباہ و برباد ہو کے رہ گئیں۔

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتۡ ؕ﴿۱۱﴾ (77:11) جب ان پیغام رسانوں کی ڈیوٹی،فریضہ کسی پروگرام کے لئے لگایا جاتا ہے وقت،فریضہ مقرر کیا جاتا ہے کہ کس نے کب اور کیا کرنا ہے تو یہ پھر پوچھتے ہیں۔

لِاَیِّ یَوۡمٍ اُجِّلَتۡ ؕ﴿۱۲﴾ (77:12) تو یہ کسی دور تک کے لئے مہلت دی گئی ہے۔یہ کب تک ملتوی کر دیا گیا ہے اس مہلت کے وقفہ سے انسان فریب کھاتا ہے۔کہ کہاں کا مکافات عمل اور پہلے ہی جرم پر گلا کیوں نہیں کاٹ دیا گیا۔

کہالِیَوۡمِ الۡفَصۡلِ ۚ﴿۱۳﴾ (77:13) فیصلے کے دن۔یہ ہو جائیگا۔ابھی تو مہلت دی جا رہی ہے وارن کیا جا رہا ہے۔وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۵﴾ اَلَمۡ نُہۡلِکِ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿ؕ۱۶﴾ ثُمَّ نُتۡبِعُہُمُ الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۱۷﴾ کَذٰلِکَ نَفۡعَلُ بِالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۸﴾ (77:15-18) اصل میں یہ مہلت کا وقفہ تو رحمت ہے۔اگر اس پر گہری نظر نہ ہو تو یہ دونوں اطراف غلط فہمی پیدا کر دیتا ہے۔مظلوم مایوس ہو جاتا ہے۔کہ اس پر ظلم بڑھتا جا رہا ہے۔شک پیدا ہوتے ہیں پھر مایوسی۔اور ظالم وہ مزید سرکشی میں بڑھتا جاتا ہے۔مگر خدا اس مہلت کے وقفہ کو نہیں بدلتا۔اب ایک محسوس مثال استقرار حمل سے یہ بات سامنے لاتا ہے جس میں کم از کم آٹھ نو ماہ لگ جاتے ہیں۔مہلت کا وقفہ پورا ہو تو پھر کہیں جا کر تو انا بچہ پیدا ہوتا ہے۔اگر عجلت ہو تو پھر Abortion ہو جاتا ہے۔

اَلَمۡ نَخۡلُقۡکُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ ﴿ۙ۲۰﴾ فَجَعَلۡنٰہُ فِیۡ قَرَارٍ مَّکِیۡنٍ ﴿ۙ۲۱﴾ اِلٰی قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۙ﴿۲۲﴾ (77:20-22) قرار کوئی شے حرکت کر کے کسی مقام پر رک جائے۔اب مرد اور عورت یعنی مرد کا مادہ عورت کے سیل میں جا کر آمیزش کو مکین کہا ہے۔یعنی رحم کے اندر قرار گیر ہونا۔قدر معلوم۔معلوم مدت،یعنی پیمانہ جو معلوم ہے۔

❁❁❁

صدیوں کی کاوشوں اور ہلاکتوں سے بچنا صرف وحی ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے

سنکھیا کھانے سے ہلاکت نظر آتی ہے۔اگر مہلت کے وقفہ میں علاج ہوجائے تو یہ مداوا مل جاتا ہے۔اب جھوٹ بولنے سے کیا اثر پڑتا ہے اسے سائنسدان تو معلوم نہیں کرسکتے۔یہ تو صرف وحی سے معلوم ہوئے ہیں۔یہ ہے اس کی دوسری رحمت کہ اس نے یہ قوانین دیدیئے۔ورنہ ایک بوٹی (Herbal) کی تاثیر معلوم کرنے کے لئے صدیاں گزرجاتی ہیں۔اوران تجربات میں پتہ نہیں کتنی ہلاکتیں، کتنی بربادیاں ہوجائیں۔جنہوں نے یہ تجربات کئے۔اس کا انسانیت پر بڑا احسان ہے۔یہ سانپ کا زہر زندگی بچاسکتا ہے پتہ نہیں کہ ان میں سے کتنوں کو سانپ ڈسوانا پڑا تاکہ معلوم کریں کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔یہ تو خدا کی رحمت تھی جو یہ قوانین انسان کو سنوارنے کے لئے عطا کیئے۔وحی کے ذریعہ اپنے رسولوں کے ذریعے۔اب جو لوگ دین کے پہلے گوشہ کا تو اتباع کرتے رہے اوراس دوسرے حصہ کو فراموش کردیا۔چلو ان کو کم ازکم دنیاوی حسنات تو حاصل ہوگئیں۔لیکن جن لوگوں نے یہ ضروری حصہ یعنی مادہ کو الحاد اور بے دینی قرار دیا۔تو جس جس قوم نے یہ نظریہ رکھا تو ان کی زبوں حالی ہمارے سامنے ہے۔دین اور دنیا کے امتزاج کا نام ہی اسلام ہے۔یہ ہیں دو گوشے یعنی طبعی قوانین اور انسانیت یعنی فطرت کی قوتوں کی تسخیر کر کے ان کو وحی کے مطابق کام میں لانا اسلام ہے۔تو اس کا نتیجہ اسی دنیا کی جنت کی زندگی۔اگر دوسرا حصہ فراموش ہوجائے تو اسلام نہیں بنتا۔اور ہم نے اس پہلے حصے کو تو متروک کردیا۔ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ‌ۚ (2:85)اس نے تو تمام زندگی کو کتاب کے تحت گزارنا کا حکم دیا ہے۔فطرت بھی تو کتاب اللہ ہے۔وہ کسی انسان کی تو لکھی ہوئی نہیں ہے۔اس کتاب فطرت کو صرف پڑھا جاسکتا ہے۔لکھا نہیں جاسکتا۔(سلیوان) کتاب فطرت تو کتاب اللہ ہے۔اس کا دوسرا حصہ قرآن ہے۔دونوں حصے یکجا ہونگے تو دین مکمل ہوگا۔اگر ایک حصے پر ایمان اور دوسرے سے انکار کروگے تو فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ (2:85)تو اس کی سزا ما سوائے اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ‌ؕ (2:85)ایک حصہ کو لیکر دوسرے حصے کو فراموش کرنے کا نتیجہ دونوں جہانوں کی رسوائی ہے۔مادی زندگی کو مسخر کئے بغیر دین خداوندی کو ایک قدم بھی نہیں

چلایا جاسکتا۔ یہ مادہ تو وہ گھوڑا ہے۔ جس پر سوار ہو کر منزل کی طرف جانا ہے۔ جب سواری نہ ہو تو منزل کی طرف کیسے جائیں گے؟

از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد

آگے کہا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (77:23) یہ ہمارے بہترین پیمانے جو عمدگی سے نتائج پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اب ذرا خارجی کائنات کی طرف آؤ۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا (77:25-26) یہ تمام عناصر، معدنیات، دریا، پہاڑ اور انسانوں کو اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اور ان سب کو بے جان اور جاندار اشیاء کے لیے ہوئے تیزی سے محوِ گردش ہے۔ اور گردش محسوس بھی نہ ہو۔ جیسے پرندہ پر سمیٹ کر تیزی سے اڑتا ہے اور اڑان محسوس (كِفَاتًا) نہیں ہوتی۔ پھر ان کائناتی قوانین کو جھٹلانے والوں کے لئے تباہی اور یہ دنیا جہنم کدہ بن جائیگی۔

وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٢٨﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿٣٠﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿٣١﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾ (77:28-34)

لپک کر اس تکذیب کے فطری نتیجہ کی طرف بھاگو۔ کائناتی قوتوں کی تسخیر نہ کرنا تکذیب ہے تو جاؤ۔ ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (77:30)۔ تین شاخہ سایہ یعنی چاروں طرف سے گھیر لینے والا۔ اوپر سے، نیچے سے، اور دائیں بائیں سے۔ اب یہ عذاب تو ہم روز عراق، افغانستان اور ڈرون کی شکلوں میں ملاحظہ کررہے ہیں۔ ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (77:31) ایسا فضا پر محیط ہوجانے والا جو بھی ان شعلوں کی زد میں آیا۔ کارپٹ بمبنگ سے افغانستان، عراق اور لیبیا کا حشر نشر کردیا۔ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (77:32) یہ عذاب تو شعلوں کے بڑے بڑے گھٹے پھینکے گا۔ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (77:33) گویا زرداونٹ۔ یہ میزائلوں کی بارش چاروں اطراف سے ہمارے سامنے حال ہی میں عراق افغانستان شام، لیبیا اور لبنان میں سب کچھ جلا کر راکھ کردیا۔ یہ ہوگا ان لوگوں کا انجام۔ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:34) اس فقرے کو دوبارہ کہہ کر کہا هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ (77:35)۔ ان کی زبانوں پر تالے لگ جائیں گے۔ کہ کاش ہم دین کے اس اہم حصہ کو فراموش نہ کرتے تو محفوظ ہوجاتے۔ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ (77:36) پھر ان کی یہ تمام معذرتیں کسی کام کی نہیں ہونگی۔ یہ تو مہلت کے دوران اقدام میں ہوسکتا تھا۔ توبہ کی گنجائش تھی۔ تباہی سر پر آجائے تو پھر اسکی گنجائش کہاں؟ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:37) تباہی اور بربادی ہے ایسے تکذیب کرنے والوں کے لئے۔

اتباع، طاعت، مادہ (ط و ع) ہے۔ طَاعَ، بِرٌّ

وہ پکی ہوئی کھجور جو از خود اوپر سے نیچے گرے۔ جھانپل سے کھجور کا گرانا۔ اَطَاعَ النَّخْل'' نہیں کہلاتا۔ دوسرا ''اتباع'' گائے بکری اونٹ وغیرہ کا بچہ، ماں آگے آگے اور یہ اس کے پیچھے پیچھے یہ نوزائیدہ بچہ جا رہا ہوتا ہے۔ اس کو ماں کوئی حکم نہیں دے رہی نہ ہی وہ کسی زنجیر سے بندھا ہے۔ ایک کشش ہے جو اس کو لئے جا رہی ہے۔ اتباع یعنی جو انسان کا دلی تقاضا بن جائے مرضی سے بغیر کسی خارجی دباؤ کے۔ اب تیسرا لفظ ''بِرٌّ'' ہے۔ طَاعَ میں تو کسی خارجی حکم یا اپنی پسندیدگی سے اطاعت ہے۔ اتباع کسی خارجی کشش کے پیچھے چلنا۔ مگر تیسری چیز زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے پوری آزادی ہے۔ اس کے لئے ایک عمل خود بخود جاری ہے۔ یہ آزادی کا عمل ہے۔ اطاعت تو وہ ہے جس میں محکومیت آتی ہے۔ مگر اس ''بر'' میں تو خدا کی بھی محکومیت نہیں آتی۔ یہ ہے وہ آزادی جو مَا شِئْتُمْ (41:40) میں ہے۔

❁❁❁

خوابیدہ قوتوں کے نمود کے لیے ٹکراؤ ضروری ہے۔شیطان

''Satan the Hindrer''

شیطٰن satan۔یعنی The hindrer: لفظ شیطٰن (Satan) عبرانی زبان (Hebrew) کا لفظ ہے۔

عربی زبان میں اس سے مراد'' بھڑکیلا۔مشتعل ۔۔اشتعال دلانے والا۔ یہ اسے لفظ شیطٰن سے اپنے ہاں لائے۔اس کا ترجمہ انگریزی میں The Hindrer صحیح ترجمہ ہے۔(9:35) اور دیگر مقامات یہ مذہبی پیشوا، علماء اور مشائخ اور سرمایہ دار خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں یہ ہیں شیطان یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (7:45) سرمایہ داری اور ملوکیت ان کے سہارے چلتی ہے۔ یہ محتاجی اور محکومی کو خدا کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ یہ اس قسم کی تعلیم سے لوگوں کو اطمینان دلاتے رہتے ہیں تاکہ اس نظام کے خلاف سرکشی نہ کرسکیں اور یہ منافقت کا لبادہ اوڑھ کر رکاوٹ بنتے ہیں۔ اصل میں یہی شیطان ہیں۔

شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (6:112) یہ خواہ اپنے ہوں یا غیر ان کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

خوابیدہ قوت کی نمود کے لیے ٹکراؤ ضروری ہے:

انسان کے اندر بہت سی صلاحیتیں مضمر potential فارم کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ جن کا خود بھی اسے علم نہیں ہوتا۔ ان کی نمود ٹکراؤ سے ہوتی ہے۔ چقماق کے اندر سویا ہوا شعلہ، پتھر کے ساتھ رگڑنے سے اس کی نمود ہوتی ہے۔ ان خوابیدہ قوتوں کی نمود سے خودی یا ذات یا انسانیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ ٹکراؤ نہایت ضروری ہے۔ یعنی جب کسی دوست کو آزماتے ہیں تو اس سے مراد کہ وہ آڑے وقت میں کیا Behave کرے گا اس لیے اسے آزمایا جاتا ہے۔ اس طرح خدا جو غیب السمٰوات والارض ہے، وہ کسی کو نہیں آزماتا بلکہ وہ پہلو بدل بدل کر، گردشیں دیکر، مختلف مواقع بہم پہنچا کرتا کہ انسان اپنے آپ کو آزمائے کہ میرے اندر کتنی قوت ہے۔ ورنہ ہوسکتا ہے کہ آپ فریب میں مبتلا ہوجائیں اور وقت پر معلوم ہو کہ میرے اندر تو وہ صلاحیت ہی نہیں تھی۔ اس طرح سے احساس کمتری پیدا ہوجاتا ہے۔ حالانکہ وہ قوت موجود ہے۔ مگر اس کی نمود نہیں ہوئی۔

اور نمود تو تزاحم اور ٹکراؤ سے ہوتا ہے۔ اور یہ تزاحم والی قوت موجود نہ ہو تو پتہ ہی نہیں چل سکتا۔ اپنی صلاحیتوں کا۔ بقول اقبال

مزی اندر جہان کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطان نہ دارد

جہان کور ذوق جہاں تصادم وتزاحم نہ ہو۔ جہاں ان قوتوں کی نمود کا احساس دلانے کی کوئی چیز نہ ہو۔ تو زندگی تو بے ذوق و بے رنگ ہے۔ اگر یہ ٹکراؤ نہ ہو تو شیطانی قوتیں اوپر چڑھتی چلی جائیں اور یہ جھکتا چلا جائے۔ اس مذہب میں تو ہو جا ''ککھ مست دا'' اس لیے تو آدم کے ساتھ ابلیس آیا۔ اور آخر تک اس کی ضرورت ہے کوئی زمانہ بھی اس سے خالی نہیں۔ مگر اسے غالب بنانے کے لیے تو نہیں بنایا تھا۔ انسان کے اندر اتنی مضمر صلاحتیں رکھی تھیں کہ یہ ان سب شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ (6:112) پر قابو پا سکے۔ کیونکہ یہ تو يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (7:45) کوئی کام ڈھنگ سے، قانون سے ہونے نہیں دیں گے۔ یہ کشمکش حق و باطل کی ہے، اس لیے تو یہ قرآن ساری نوع انسانی کے لیے آغاز ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) ہوا اور اختتام بھی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (114:1) نہ اپنا، نہ خاندان کا بلکہ ساری انسانیت کا۔ ہر قوم، ہر فرد صرف اپنا سوچتا ہے یہ ہے باطل۔ بلکہ عالمگیر انسانیت کی ربوبیت یہ حق ہے۔ جب من وتو درمیان سے اٹھ گیا تو پھر اپنے اور غیر کا سوال ہی نہیں ہے۔ جس طرح ایک گھر میں فائدہ مشترک ہوتا ہے۔ قرآن اس گھر کو پوری انسانیت پر محیط کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) اور بِرَبِّ النَّاسِ (114:1) ہو جاتا ہے۔ اور پھر عقل وحی کے تابع ہو کر عقل خود بیں سے عقل جہاں بیں ہو جاتی ہے ؎

عقلِ خود بیں دیگر و عقلِ جہاں بیں دیگر است
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سود خود بیند نہ بیند سود غیر
وحی حق بینندۂ سود ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

یہ ٹکراؤ نوح علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ محنت کرنے والوں کو کمی کمین کہا گیا۔ اور رسول ﷺ کے دور میں یہ ٹکراؤ تو شدت تک پہنچ چکا تھا۔ قبائلی، نسبی، سرمایہ دارانہ مذہبی پیشوائیت، مفاد پرستی کی ساری چیزیں قریش میں آ کر جمع ہو گئی تھیں۔ تمام انبیاء کرام کی ساری تاریخ اسی تصادم و ٹکراؤ کی تاریخ ہے۔ آج تو یہ شخص دوسرے کے راستہ میں اس قسم کی رکاوٹیں کھڑی کر کے اس کی جیب کاٹتا ہے۔ اگر کام قاعدے اور قانون سے ہو تو کوئی کام رک نہیں سکتا۔ کسی مقام پر رک جانا جہنم ہے قانون ارتقاء کے لحاظ سے یہ نوع کا اس کے خلاف دوسری نوع سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اگر اس نوع میں اتنی قوت ہے کہ وہ دفاع کر سکے تو زندہ رہتی ہے تو آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ جو حق کے راستے سے رکاوٹیں ہٹا کر آگے بڑھنا ہے اسے اسلام کہتے ہیں۔ یہی ربوبیّت عالمینی ہے۔ اور جنت کی زندگی۔ جو آگے نہ بڑھ سکے تو وہ جہنم کے اندر ہے۔

آج تو سارا معاشرہ جہنم ہے۔ قرآن نے اس کے لیے ابلیس اور شیطان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جب ان رکاوٹوں کو ہٹانے کا کوئی طریقہ نہیں سوجھتا تو مایوسی چھا جاتی ہے۔ یہی تباہی ہوتی ہے۔

”ایک انوکھی جماعت جس کو ساری نوعِ انسانی کا مفاد عزیز ہے“

سورۃ النّٰزِعٰتِ اس جماعت کے کردار کا مظہر ہے:

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝١ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝٢ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝٣ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝٤ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝٥

(79:1-5) اسلام کا پورا ملخص، ملت، اسلامیہ کا فریضۂ حیات، کائنات میں ایک نظام نو کی تجویز، صرف دس لفظوں میں اتنی جامعیت اور اعجاز سے سمودی گئی ہیں کہ اس کے اسلوب بیان اور عظمت و جبروت سے انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ (59:21) اگر قلب کوہ کو احساس دے کر رکھ دیتے تو اس کی عظمت و جبروت سے وہ بھی لرز کر لپٹ جاتا۔ اس کے لیے تو نفس جبریل کی ضرورت ہے۔

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبریل دے تو کہوں

اس امت کا فریضہ حیات نوع انسانی کو ہر نوع غلامی سے چھڑانا ہے:

اس دنیا میں افراد کو دیکھیے۔ ہر فرد کا مقصد اگر وہ مذہب پرست ہے تو اس کی اپنی نجات ہے۔ وہ اپنی نجات کے لیے ریاضتیں اور مشقتیں کرتا ہے۔ اسے کسی اور کی نجات فکر نہیں ہے۔ دنیادار ہے۔ تو اس کے لیے اپنی زندگی خوشحال اور فارغ البالی کی زندگی کی فکر ہے۔ اسی طرح افراد سے اقوام کی طرف آ جایئے ہر قوم اپنے استحکام، کامیابی اور خوشحالی کے لیے کوشاں ہے۔ خواہ اس کے لیے دوسری اقوام کا خون ہی کیوں نہ چوسنا پڑے۔ قوم کا ہیرو، محب وطن وہ ہے۔ جو اپنی قوم کے مفاد کے لیے دوسری قوم کا گلا گھونٹ دے۔ یہ اقوام کے اندر بڑے بڑے مجسمے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ تاریخ میں جن کے نام سنہری حروف سے لکھے جاتے ہیں۔ وہ کون ہیں؟ جو اپنی قوم کے لیے ہر قسم کی مفاد پرستیوں کے حصول کے لیے مصروف تگ و تاز ہوتے ہیں جن کے نزدیک باطل بھی حق کہلاتا ہے۔ ایک مفکر Cavour کے الفاظ ”If We did for ourselves what we do for our country What rascals we should be جو ہم وطن کے لیے کرتے ہیں اگر اسے اپنے لیے کریں تو سب سے بڑے شیطان

1043 کہلوائیں۔شیطان تو وہ پھر بھی کہلاتے ہیں۔مگر یہ الگ بات ہے کہ ان کی قوم ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کرتی ہے۔ان کے مجسمے کھڑے کرتی ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کے غلبہ کے لیے کتنے انسانوں کا خون کیا۔اس کی ان کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ہر قوم اپنے لیے جی رہی ہے۔ساری تاریخ اس کی چلی آ رہی ہے۔اپنی فکر، خاندان کی پھر قوم کی فکر۔

تاریخ میں ایک نرالی قوم:

تاریخ کے انہی ادوار میں ایک بالکل الگ قوم سارے جہاں سے نرالا جس کو معمار عرب نے بنایا۔ یہ وہ نادر قوم ہے جو ساری تاریخ میں ایک استثنیٰ رکھتی ہے۔ یہ قوم کُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ (3:110)۔ساری انسانیت کی بھلائی کے لئے۔فریضہ کیا ہے؟

وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ (7:157)

رسول ﷺ کی بعثت کا مقصد تمام نوع انسانی کو ان غلامی کی سلوں اور زنجیروں سے رہائی دلانا ہے۔اور یہ وہ سانس پھلا دینے والا پہاڑی پر چڑھنے کا راستہ ہے جسے عام انسان اختیار نہیں کرسکتا۔فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ۖ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ؕ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ (90:11-13) غلامی اور محکومی میں گرفتار ہر انسان کو اس سے آزادی دلانی ہے۔ پہلا کام رزق کی محتاجی سے چھٹکارا دلانا ہے۔اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِىۡ يَوۡمٍ ذِىۡ مَسۡغَبَةٍ (90:14) ابتداء رزق کی محتاجی سے نجات يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۙ اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ؕ (90:15-16) اب جس قوم کو حکم تھا فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ (90:13) کا کہ جہاں غلام نظر آئے تو اسے پاس سے دیکر آزاد کراؤ۔تو کیا اس قوم میں غلام اور لونڈیوں کا تصور ہوسکتا ہے۔ پھر عہد ملوکیت میں تو ہر حاکم کے ہاں تین تین ہزار لونڈیاں تھیں۔

اپنی آزادی حاصل کرنے کے بعد اس امت کا قرآنی فریضہ:

اب مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ (48:29)۔یہ امت اول تھی جنہوں نے غلامی اور محکومی سے آزادی حاصل کر لی تھی۔اب یہ سارا تصادم شیطانی رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔اب کہا گیا کہ بھائی جاؤ اب جہاں جہاں یہ محکوم قومیں ہیں۔ان کو بھی آزادی کی ان نشاط انگیز فضاؤں سے ہم کنار کردو۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ (79:1) اب یہ محکومی تو گویا پانی کی تہہ میں غرق کر دینا یعنی نہ کچھ دیکھ سکے اور نہ سن سکے۔ایک لفظ غَرۡقًا میں غلامی کی انتہائی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ یہ مستبد حاکم احساس محکومیت کے ہر دروازے پر مہر لگا دیتا ہے۔اب ایک تو ان حکمرانوں کے استبداد سے ٹکراؤ ہوگا جو اس راستے میں سخت مزاحمت کریں گے۔اور سب سے مشکل یہ خوئے غلامی میں پختہ لوگ جو خود نہ نکلنا چاہیں گے۔اب اس کے لئے ''النّٰزِعٰتِ '' آیا ہے۔یعنی بالوں سے پکڑ گھسیٹ کر اوپر لے آنا یہ ہے وہ جماعت۔ یہ تمام کشمکش تزاحمات سے اس قوم نے اپنی آزادی حاصل کرلی ابھی تیر کر پانی سے جونہی باہر آئے تھے۔حکم ہوا جو پانی میں غرقاب ہیں ان کو بھی نکالو۔اب ان کی فکر ہو رہی ہے۔اب صدر اول میں یہ تمام جنگیں یہی جنگیں ان اقوام کی آزادی کی جنگیں تھیں۔جو

قیصر وکسریٰ کوخطوط لکھے جارہے تھے۔

ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابان نگر

ان کواب آزادی سے آشنا کرانا ہے۔اب یہ مادر پدر آزادی نہیں کہ جس کا چاہے گلہ کاٹ دوآزادی تو نام ہے۔اقدار کے تحت زندگی گزارنے کا۔اب دیکھئے! سمجھایا جارہا ہے اب یہ سیّارے جوقوانین کے تحت حرکت کرتے ہیں یہ ہے آزادی۔ان پابندیوں کے تحت حرکت یہ ہے آزادی اب اس میں خوشی ہے۔نشاط ہے۔

وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا﴿۲﴾(79:2) ان کوآزادی ایسی کہ اقدار خداوندی کے تحت وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا﴿۳﴾(79:3) پوری پوری توانائیوں سے سرگرم عمل ہیں تاکہ راستے میں کوئی شیطانی قوت روک نہ بن جائے اور باقی اقوام سے آگے ہوسکیں۔یعنی فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا﴿۴﴾ (79:4) تاکہ آگے بڑھ سکیں۔باقی اقوام سے ان بھلائی اور خیر کے کاموں میں۔یہ ہے وہ نشاط آور آزادی۔فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴿۵﴾(79:5) تاکہ اپنے معاملات کی تدبیر خودکرسکیں۔خدا کے قوانین کی روشنی میں۔

حق و باطل کی بنیاد پراس جنگ کا نقشہ:

یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴿۶﴾تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ﴿۷﴾(79:6-7)اس انقلاب سے اب میدان جنگ میں جاناہوگا۔توپھر یہ ظالم قوم اس سے کانپ اٹھے گی۔اعمال اوراپنے نتائج ردیف پچھلی سواری کی طرح،اس کے پیچھے پیچھے خودآئیگی۔یہ تمام جرائم نتائج کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔یہ ان کے تخریبی نتائج ہیں اسی باطل نظام کے۔قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ﴿۸﴾اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴿۹﴾ (79:8-9) پریشانی اوراضطراب سے دل دھڑک رہے ہونگے۔تیزی سے ان آنکھیں شکست کی ندامت سے زمین گڑی میں ہونگی۔آج تو دولت،قوت وحشمت کے مالک ہیں۔

یَقُوْلُوْنَ(79:10) آپس میں بڑی طنزآمیز باتیں کرتے ہیں کہ یہ رسول ﷺ کہتا ہے ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ﴿۱۰﴾ (79:10)۔یہ تمام دولت وقوت جوظلم ونہب سے اکٹھی کی ہے۔چھین لی جائے گی۔اورتم اپنی پہلی حالت پرواپس ہوجاؤ گے۔

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴿۱۱﴾(79:11) ہم کھوکھلی ہڈیاں یعنی قصۂ پارینہ ہوجائیں گے۔اَلْحَافِرَةِ﴿۱۰﴾(79:10)۔پچھلی حالت پرلوٹنا۔آثارقدیمہ ہوجانا حَافِرَةٌ آثارقدیمہ'' کوکہتے ہیں۔یعنی یہ مال ودولت وقوت چھین لی جائے گی۔

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴿۱۲﴾(79:12) طنزیہ کہتے ہیں کہ یہ گردش توبڑی نقصان دہ ہوگی۔

فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴿۱۳﴾فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴿۱۴﴾ (79:13-14) ایک سخت آواز کے بعدتم میدان جنگ میں آجاؤ گے۔یہ سارا کچھ ان محکوم قوموں کوچھڑانے کے لئے ہورہا ہے۔ان کا اپنا کوئی مفادنہیں ہے۔ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔کوئی اشتراک نہیں۔اگرکسی جگہ مندر یا گرجہ کوخطرہ ہوتوان کافریضہ ہے کہ جاکراس کی حفاظت کریں۔

شانِ نزول کی ایک عجمی سازش

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ﴿١﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ﴿٢﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ﴿٣﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؕ﴿٤﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ﴿٥﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ؕ﴿٦﴾ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴿٧﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ﴿٨﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ﴿٩﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ﴿١٠﴾ (80:1-2-3-4-5-6-7-8-9-10) اب تمام تراجم میں فاعل رسول ﷺ کو بنایا گیا ہے۔ حالانکہ نوحؑ سے لیکر رسول ﷺ تک دعوت پر ان غریب لوگوں نے لبیک کہا اور ان دولت مندوں کا مطالبہ ہی یہی ہوتا تھا۔ کہ ان کو نکالو۔ کیا نبی ﷺ کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ ان بڑے بڑے لوگوں کے پیچھے لگ جائے اور جو سلیم قلب سے آرہا ہوا سے دھتکار دے۔ یہ تو قرآن کے اور خود سیرت رسول ﷺ کے خلاف ہے جو وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿٤﴾ (68:4) کے سرٹیفیکیٹ سے نوازے گئے تھے۔ اب تدبر سے یہ معاملہ سامنے کھل سکتا ہے۔ اب یہ فاعل حضور ﷺ نہیں ہو سکتے۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ﴿١﴾ (80:1) کے۔ اب سورہ مدثر میں یہ سرداروں کے نمائندے آتے تھے کہ مصالحت کر لیں۔ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۙ﴿١١﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ﴿١٢﴾ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۙ﴿١٣﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۙ﴿١٤﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۚ﴿١٥﴾ (74:11-12-13-14-15) اب یہ نمائندہ متکبرانہ انداز میں آکر شرائط پیش کر رہا ہے۔ رسول ﷺ نے جو کچھ اس سے کہا تو اس نے اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۙ﴿١٨﴾ (74:18)۔ اس نے غور کر کے اندازہ لگایا کہ اس سے ہماری کیا حالت ہوگی؟

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ﴿١٩﴾ (74:19)۔ ایسا اندازہ لگایا کہ اس میں تباہیاں اور بربادیاں تھیں۔

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ﴿٢٠﴾ (74:20) ستیاناس ہو اس کا کتنا غلط اندازہ لگایا۔ یعنی جن کو ہم پست سمجھتے ہیں ان کو نکالو۔ قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی یہ شرط ان کی طرف سے بتائی ہوئی ہے۔ ثُمَّ نَظَرَ ۙ﴿٢١﴾ (74:21)۔ اس سے پہلے فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۙ﴿١٨﴾ (74:18) دونوں نظاموں کا مقابلہ کیا کہ کونسی اس کے لئے سودمند ہے۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ﴿٢٢﴾ (74:22)۔ تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔ وہ تو ان لوگوں کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے کہ اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ (6:53)۔ اور اس سورہ میں ہے کہ اس شرط پر مصالحت نہیں ہو سکتی۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ (6:52) یہ دین تو نام ہی مساوات انسانیہ کا ہے۔ اس میں تو خلوص قلب ہوتا ہے نہ کہ پیشہ کہ کیا کام کرتا ہے۔ نوح سے یہ مطالبہ چلا آرہا ہے اور رسول ﷺ تک مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (6:52)۔

حِسَابِهِمۡ (6:52) سے مراد ان کے کاموں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ خدا نے کہا ان کی باتوں میں نہ آجانا۔ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۲﴾ (6:52) یہ رسول ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ خبردار ان کو نہ چھوڑنا۔ یہ تو بڑی متاع گران بہا ہے۔ وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ ۚ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ (18:28) اب عَبَسَ کا فاعل یہ سردار ہے جو نمائندگی کر کے آیا ہے۔ یہ ان لوگوں کو بڑی پست نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اب وہ غریب آیا تو یہ سردار بیٹھا ہوا ہے۔

اَنۡ جَآءَهُ الۡاَعۡمٰىؕ ﴿۲﴾ (80:2) کہ ایک معذور اور غریب اندھا آ گیا ہدایت کے لئے۔ اگلی ہی آیت میں کہا وَمَا يُدۡرِيۡكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓىۙ ﴿۳﴾ (80:3)۔ یہ وحی آرہی ہے خدا کی طرف سے۔ یہ نہیں کہ رسول سے کہہ رہا ہے کہ تمہیں کیا پتہ بلکہ جس نے منہ بسورا اور تیوری چڑھائی کہ اندھا اس محفل میں کیوں آ گیا؟ اس سے کہو کہ تمہیں کیا پتہ ہے کہ یہ اندھا تم سے زیادہ احکام کی پیروی کرنے والا ہو۔ اصلاح کرنے والا ہو۔ اور یہی شخص اَوۡ يَذَّكَّرُ فَتَنۡفَعَهُ الذِّكۡرٰىؕ ﴿۴﴾ (80:4)۔ یا وہ اس تعلیم کو سمجھ لے اور اس سے مزید فائدہ حاصل کر لے۔ اب وحی نبی ﷺ کی زبان اس نمائندہ کو کہہ رہی ہے۔ اور آگے کہا اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰىۙ ﴿۵﴾ فَاَنۡتَ لَهٗ تَصَدّٰىؕ ﴿۶﴾ (80:5-6)۔ اور اس کے مقابل جو یہ سردار ہیں جو اپنے آپ کو ان قوانین سے مستغنی سمجھ رہے ہیں تو محمد ﷺ سے یہ چاہتا ہے کہ میں ان کے پیچھے پیچھے پھروں۔ وَمَا عَلَيۡكَ اَلَّا يَزَّكّٰىؕ ﴿۷﴾ (80:7)۔ اور میں اس کے تزکیہ کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ بلکہ وہ خود ہے۔

وَاَمَّا مَنۡ جَآءَكَ يَسۡعٰىۙ ﴿۸﴾ وَهُوَ يَخۡشٰىۙ ﴿۹﴾ فَاَنۡتَ عَنۡهُ تَلَهّٰىۚ ﴿۱۰﴾ (80:8-9-10) تو چاہتا ہے کہ جو دل سے اس کی طرف دوڑا آئے اور ان قوانین کی خلاف ورزی سے ڈرے تو چاہتا ہے کہ اس میں بے اعتنائی برتوں۔ كَلَّآ، ہرگز نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔

قرآن کے خلاف گہری سازش:

قرآن کے بارے میں دیگر سازشوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ یہ رسول ﷺ کے زمانے میں جمع نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ قرآن میں ہے کہ کاتب اس کو لکھتے تھے۔ اور اس زمانے کا مضبوط ترین کاغذ ہرن کے کاغذ پر لکھا جاتا تھا۔ اسے قرطاس کہتے تھے۔

اسے ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ (2:2) کہا گیا کتاب تو کہتے ہی اسے تھے جب اوراق کو جمع کر کے اسے لوہے کے چھلے میں ڈال دیا جائے۔ پھر سازشیں شروع ہو گئیں کہ برس ہا برس جمع ہی نہیں ہوا۔ ہڈیوں پر، کھجور کے پتوں پر لکھا جاتا تھا۔ ان میں کچھ آیات بکری کھا گئی۔ اور اس کے بعد ملی ہی نہیں۔ پھر آگے اس کی تدوین یعنی جمع کرنے کی تاریخ کہ ابوبکرؓ کے زمانہ میں نہیں عمرؓ کے زمانہ میں۔ اور عثمانؓ کو تو جامع القرآن بنا دیا قافیہ ملانے کے لئے۔ یہ اس کتاب کے ساتھ کیا انہوں نے جبکہ قرآن کہہ رہا ہے۔

فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ﴿۱۲﴾ فِىۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍۙ ﴿۱۳﴾ مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۙ ﴿۱۴﴾ (80:12-13-14) خود صحف ہے یعنی لکھا ہوا ہے۔ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾، مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۙ ﴿۱۴﴾ (80:13-14) ہے، یعنی عظمت و بلندی والا ہے۔ بِاَيۡدِىۡ سَفَرَةٍۙ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍؕ ﴿۱۶﴾ (80:15-16) سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾، لکھنے والے پاکیزہ اور بے داغ، بلندی و کردار و سیرت میں کشادہ باہر کے اثرات سے غیر متاثر۔ ساری تنگناہوں سے آزاد۔

نسلی تفاخر کی جڑ کاٹ کر رکھدی

اب رسول ﷺ اعلان کر کے اس نمائندہ قریش کو بتا رہے ہیں کہ تم اس غریب اندھے کو اتنا حقیر سمجھ رہے ہو حالانکہ ذرا اپنی پیدائش پر اور اس پر غور کرو کیا فرق ہے۔ اس نسلی تفاخر کا ۔ مِنۡ اَیِّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ ؕ﴿۱۸﴾ (80:18)۔ تم پیدائش کے اعتبار اپنے آپ کو افضل سمجھ رہے ہو تو تیری تخلیق کسی شے سے ہوئی ہے۔ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ (80:19) ایک نقطہ آب سے۔ جس طرح ہر انسانی بچہ کی ہوتی ہے۔ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ (80:19)۔ تخلیق کر کے پھر خاص پیمانے سے بچہ بنا پھر انسان۔ ابتدا تو اس قطرہ سے ہوئی جو نہ قریش تھا اور نہ بنو ہاشم۔ تو یہ بات تو وجہ تفاخر نہیں ہو سکتی۔

ثُمَّ السَّبِیۡلَ یَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ (80:20) پھر سامان زیست عطا کر دیا۔ یہ تو طبعی زندگی کی راہیں ہیں جو سب کے لئے آسان کر دی ہیں۔ اس میں تو پیدائش کے اعتبار سے نہ جاٹ ہے نہ سید، نہ موچی۔ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ (80:21)۔ پھر ہر انسان طبعی زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔ تو اس میں ذات پات اور رنگ و نسل کی کیا تفریق۔

کَلَّا لَمَّا یَقۡضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ (80:23) جو کچھ کہا جاتا ہے یہ اس پر چلتا نہیں ہے۔ سب سے بڑا ابلیسی نظام قومیت کا تصور وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ (13:25)۔ انسانیت کو جوڑنے کا حکم ہے۔ مگر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ یہ تو برادریوں میں، ایک شہر میں، ایک گھر میں، انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اور سب سے بڑی فساد انگیز لکیریں تو یہ وطن اور قومیت کی لکیریں ہیں۔ اس کے بعد رزق کی تقسیم کا طریقہ کار وحی کر دیا۔

رزق کی بنیاد پر طبقات:

فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖۤ ﴿۲۴﴾ (80:24) طعام میں دھن، دولت، رزق ساری چیزیں آ گئیں۔ کہا کہ اس میں تمہاری کاریگری کیا ہے؟ یہ تو سارے کچھ ہمارے قوانین سے ملتا ہے۔

اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضۡبًا ﴿۲۸﴾ وَّ زَیۡتُوۡنًا وَّ نَخۡلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلۡبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاکِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ (80:25-26-27-28-29-30-31)

1043
یہ سارا کچھ تو ہمارے قوانین سے پیدا ہوتا ہے۔مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٢﴾ (80:32) یہ سارا کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے متاع ہے۔یعنی جتنا سفر کے لئے ضروری ہو اس سے زیادہ نہیں رکھا جا سکتا۔قرآن کا معاشی نظام اس ایک لفظ متاع میں مضمر ہے۔ کُمْ میں ساری انسانیت آجاتی ہے۔اور آج تم ان غریبوں کی محنت کو ہڑپ کر کے اس قدر مال و دولت اکٹھی کر کے تفاخر کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ یہ انقلاب آنے والا ہے جس میں یہ کالا دھن ان کے لئے دوزخ بن جائے گا۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ (80:40-41) گرد و غبار و روسیاہی ہوگی۔ذلت اور محکومی مقدر ہو گی ان لوگوں کی۔اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾ (80:42) یہ ہیں جو ان نعمتوں کو چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔اور یوں ان نعماء کی تقسیم کا انکاری کرتے تھے۔ یہ ہیں انسانیت کو ٹکڑے کرنے والے۔طبقات میں تقسیم کرنے والے۔

❁❁❁

قرآن کا انقلابی دور دورِ ہمایوں کے بعد

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ ۝۱ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۝۲ وَاِذَا الۡجِبَالُ سُيِّرَتۡ ۝۳ وَاِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۝۴ وَاِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۝۵ وَاِذَا الۡبِحَارُ سُجِّرَتۡ ۝۶ وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ ۝۷ (81:1-2-3-4-5-6-7)

اس سورۃ التکویر میں ایک انقلاب تو رسول ﷺ کے ہاتھوں آیا تھا۔اس کے بعد تاریکی کا زمانہ ہے اس تاریک زمانے کے بعد تدریجاً زمانے کے تقاضے آہستہ آہستہ انسانیت کو اس انقلاب کی طرف خراماں خراماں لے آئینگے۔ یہ کسی جماعت کے ہاتھوں تکریم انسانیت کا دور پھر آجائے گا۔

جب ملوکیت کا نظام لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا۔شمس سے مراد ملوکیت'' ہے۔جس طرح قبل از اسلام ایرانیوں کے جھنڈے کا نشان شمس تھا۔ یہ کسی آنے والے دور کے انقلاب کا ذکر ہے۔دوسری نشانیوں سے یوں مترشح ہوتا ہے جیسا کہ یہ ہمارے ہی زمانے کا ذکر ہے۔اور یہ عنقریب ہونے والا ہے۔ كُوِّرَتۡ ۝۱ (81:1) میں جیسے پگڑی کو سر کے گرد لپیٹا جاتا ہے۔لیل ونہار کی گردش کو تکویر جیسے سورج اپنی پگڑی باندھ رہا ہے۔ایسا اسلوب اور موسیقیت کہ صرف سن کر وجد آجائے۔

ے بسیار خوباں دیدہ ام
اماں تو چیزے دیگری

نہ شاعری، نہ نظم، نہ نثر۔

(Nietzsche,1800-1900) جو ایک جرمن فلاسفر تھا۔اس نے اس کو بنظر تحسین دیکھا اور کہا کہ الہام کی زبان نہ شاعری ہوتی ہے اور نہ نثر۔اس نے اپنی آخری کتاب میں ایک زبان خود Coin کی۔مگر اس زبان میں نہ شعر رہا اور نہ نثر۔دونوں کو چھوڑا تو کچھ بھی نہ رہا۔تو وہ پکارا اٹھا ماتو چیزے دیگری۔یعنی انسان تخلیقی طور پر بھی وہ اسلوب وضع نہ کر سکا۔جو قرآن کا ہے۔

كُوِّرَتۡ ۝۱ (81:1)۔فعل مجہول یعنی (Passive verb) جس میں فاعل کا ذکر نہ ہو۔یعنی نزول قرآن کے وقت کوئی اور اور بعد میں کوئی اور۔ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۝۲ (81:2)۔ ان کے اہالی موالی یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ان کی قوت ماند

پڑ جائے گی۔

وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ﴿٣﴾ (81:3) تمام پہاڑوں جیسے محکم امراء اور روٴسا اپنی اپنی جگہ سے ہلا دیئے جائینگے۔ یہ بتدریج آگے بڑھنے والا دور ہے۔ ''Trial and Error'' کا۔ اس کی رفتار سست ہوتی ہے۔

ہر دو امیر کارواں، ہر دو بمنزلے رواں

عقل بحیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

لگتا ہے یہ دور بہت قریب ہے۔ ان عربوں کے ہاں اونٹ سب سے زیادہ کارآمد ذریعہ تھا۔

وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿٤﴾ (81:4) جب اونٹ بے کار ہو جائینگے۔ جو رسل ورسائل کے لئے اتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ﴿٥﴾ (81:5) نامانوس آبادیاں جیسے افریقہ اور آسٹریلیا کے پرانے لوگ یہ تمام صحراؤں اور جنگلوں میں الگ الگ بسنے والے۔ یہ تمام قومی انداز کی زندگی اختیار کرنے لگیں گے۔ اب اقوام متحدہ میں آ آ کر نام درج کرائے جا رہے ہیں۔

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿٦﴾ (81:6) سمندروں میں آمد ورفت سے ہر وقت بھرے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یا البحار۔ ساحلی بستیاں آباد ہو جائیں گی۔

وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ﴿٧﴾ (81:7) جب اطراف سے سارے انسان گویا ایک بستی بن جائینگے۔ (Global village) اب تو ذرائع مواصلات سے دنیا اس قدر قریب آ گئی ہے کہ تمام فاصلے ہی مٹ گئے ہیں۔

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾ (81:8-9) الْمَوْءُدَةُ یہ عرب اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے۔ وہ کیوں ایسا کرتے تھے۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾ (16:58) لڑکی کی پیدائش پر چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

غلطاں وپیچاں ہو جاتا ہے۔ اگلی آیت ہے يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾ (16:59) قرآن نے آ کر عورت کو مرد کے ہمدوش کر دیا۔ اب وہ دور آ گیا ہے جس میں عورت سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم پر یہ ظلم کیوں ہوئے۔ اب تو عورتوں کا کمشن عورتوں کی سربراہی میں بٹھا کر ان سفارشات پر ساری دنیا میں اقوام متحدہ کے ذریعہ عمل کرایا جا رہا ہے۔ مغرب کی عورت نے بھی بغاوت کر کے یہ حقوق حاصل کئے تھے۔

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿١٠﴾ (81:10) ذرائع ابلاغ جگہ جگہ پھیل جائیں گے۔ پرنٹس اور الیکٹرونک میڈیا، رسائل کتابیں اخبارات کی بھرمار ہو جائے گی۔

وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ﴿١١﴾ (81:11) آسمانی کروں پر سے پڑے ہوئے پردوں کو اٹھا دیا جائے گا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا أَحْضَرَتْ ﴿١٤﴾ (81:14) ہر شخص کے کام کا نتیجہ سامنے آ جائے گا۔ جرائم نہیں چھپائے جا سکیں

گے۔کوئی کام بلانتیجہ رہ جائے۔ براکام چھپا ہوا رہے یہ نہیں ہوگا۔قرآن انسانوں کے تابع نظام کو جہنم سے تعبیر کرتا ہے اور اقدار خداوندی کے تحت زندگی کو جنت سے پکارتا ہے۔

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ۝١٢ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝١٣ (81:12-13) یہ جہنم جوان ریاکاروں نے لوگوں کی نگاہوں سے پنہاں کرکے رکھا تھا وہ سامنے آجائے گا۔ اور جنت کو تمہارے قریب لایا جائے گا۔یعنی وہ جنت یہاں قریب ہی ہے۔جنت کی وسعت تو ارض وسماء میں ہے۔ یہ کوئی مقام نہیں ہے بلکہ کیفیت کا نام ہے۔

وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝٢٢ (89:22)۔ اس دور میں فطرت کی قوتیں اور اقدار سماوی ایک صف میں ہونگے۔ معنی ان کا امتزاج ہوگا۔جس طرح مغرب نے ان کو مسخر کرکے اقدار کے تابع نہ رکھا تو ساری دنیا کو جہنم بنادیا ہے۔اقدار خداوندی اور فطرت کی قوتوں کو یکجا کرنے کا نام ہی مملکت اسلامیہ ہے۔قرآن میں شاعری جیسی لطافت اور فلسفہ جیسے حقائق یکجا نظر آتے ہیں۔

فَلَآ أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝١٥ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝١٦ وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝١٧ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ۝١٨ (81:15-16-17-18) یہ باتیں یونہی نہیں کہہ رہے ہیں اس حقیقت پر یہ کائنات شاہد ہے۔وہ ستارے بھی جو آہستہ آہستہ طلوع ہونے کے بعد، دبے پاؤں پیچھے ہٹتے جارہے ہیں۔اور وہ تیز خرام ستارے بھی جو اپنی اپنی منزل طے کرکے چھپ جاتے ہیں۔اور رات جو خاموشی سے آکر خاموشی سے چلی جاتی ہے۔اور صبح آکر ان اندھیروں میں سے نئی زندگی کا پیغام لاتی ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

قرآنی فکر، انسان کو مایوس ہی نہیں ہونے دیتی۔رات کی تاریکیاں اس کے بعد صبح کی تابانیاں انتہائی مایوسیوں میں امید کی ایک کرن کا روشن کرنا۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝١٩ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝٢٠ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝٢١ (81:19-20-21) یہ باتیں ہمارا بھیجا ہوا ایک معزز قاصد ہے جو کررہا ہے۔ یہ الفاظ اس کے اپنے نہیں ہیں بلکہ یہ اس پیغام کو من وعن دہرادیتا ہے۔اب وحی تو نبی کی زبان سے ہی الفاظ باہر آتے تھے۔وہ رسول یعنی قاصد ہے جو من وعن ساری بات کو دہرارہا ہے۔ایک لفظ نے دونوں چیزوں کو واضح کردیا اور یہ کسی کی طرف سے ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝٢٠ (81:20)۔ بڑی قوت کا مالک ہے۔قوت سے مراد وحی بھی ہوتا ہے۔ یہ اس کی طرف سے ہے جو کائنات کا مرکزی کنٹرول رکھتا ہے۔ یہ وحی کا ہے کے لئے ہے۔مُطَاعٍ (81:21)۔کہ اس کی اطاعت کی جائے جو نظام یہ محسوس شکل میں قائم کرے۔ یہ مرکز ہے۔قرآن کے مطابق نظام قائم کیا تو اس

کی اطاعت لازمی ہے۔اس کے بعد خلفائے راشدین کی اطاعت جواس نظام کی اطاعت ہوگی۔ثَمَّ اَمِيۡنٍ ﴿٢١﴾ (81:21)۔اس نظام میں امن اور امانت دونوں موجود ہونگے۔اس لئے جولوگ اس کی صداقت پر یقین رکھیں تو اس کی اطاعت کریں۔

وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِيۡنِ ﴿٢٣﴾ (81:23) اس نے اپنے آپ کو وحی پانے کے بعد بلندترین اور واضح مقام پر پایا ہے جس میں کوئی ابہام نہیں ہے۔وَمَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ ﴿٢٤﴾ (81:24) اب وحی واضح شکل میں آنے کے بعد غیب سے مراد وحی پانے کے بعد اس کا فریضہ ہے کہ وہ بخل سے کام نہ لے۔ بلکہ اسے دوسروں تک پہنچا دے۔قرآن نے کشف والہام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔جو یہ پانے کے بعد دوسروں کے ساتھ شریک نہیں کر سکتے۔تصوف تو یہ ہے ؎

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا بخشی

❁❁❁

انقلابِ نو کی نشانیاں سورۃُ الۡاِنۡفِطَار (82) میں

اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ ۙ﴿۱﴾ وَاِذَا الۡكَوَاكِبُ انۡتَثَرَتۡ ۙ﴿۲﴾ وَاِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾ وَاِذَا الۡقُبُوۡرُ بُعۡثِرَتۡ ۙ﴿۴﴾ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ ؕ﴿۵﴾ (82:1-2-3-4-5) جس انقلاب کا، جہان نو کا پیچھے سے ذکر ہو رہا ہے اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ فضا میں بلند توانیاں پھٹ جائینگی۔اور ستارے یعنی چھوٹی چھوٹی مملکتیں جھڑ جائیں گی۔اور زمین کے خزانوں کو کھود کھود کر باہر نکالا جائے گا۔اور تمدّنی زندگی میں عدل پر مبنی ایسا نظام ہوگا کہ ہر شخص اپنے اگلے پچھلے نتائج کے اعمال دیکھ لے گا۔

اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِىۡ نَعِيۡمٍ ۚ﴿۱۳﴾ وَاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِىۡ جَحِيۡمٍ ۚ ۖ﴿۱۴﴾ (82:13-14) ابرار کے مقابل فجار آیا ہے۔فجار۔جو انسانیت کو ٹکڑے کر دے۔تفرقے اور اختلافات پیدا کر دے۔اور ابرار کشاد اور وسعت والے۔جو ان تنگنا ہوں سے نکل کر پوری انسانیت کو متحد کر دیں۔ساری انسانیت کو سمونے والے اگر نوع انسانی ایک برادری بن جائے۔تو یہ دنیا جنت بن جائے گی۔تو فُجّار رک جاتے ہیں آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ثُمَّ مَاۤ اَدۡرٰٮكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ؕ﴿۱۸﴾ يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـــًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَٮِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ (82:18-19) اور اس نظام میں کوئی انسان دوسرے پر حکمرانی نہیں کر سکے گا۔

؎ کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

❁❁❁

''مُطَفِّفِيْنَ(83)'' نظامِ سرمایہ داری

پچھلی سورۃ انفطار کی آخری آیات میں کہا گیا تھا لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾(82:19)
اس دور میں کوئی انسان دوسرے پر حکومت نہیں کر سکے گا۔اور اقتدار صرف قوانینِ خداوندی کے تحت تمام معاملات کا فیصلہ ہوگا۔قوانین کی حکمرانی ہوگی۔اصل محتاجی تو معاش میں ہوتی ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہ شرع مبین ایں است وبس

اب پچھلی سورہ حکومت کی بات تھی تو اس میں وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾(83:1)۔قرآن کی اصطلاحات بڑی جامع ہیں۔اس دور میں نظام سرمایہ داری ایک منظم شکل میں نہیں تھا۔جس طرح ہمارے دور میں آیا ہے۔اس زمانے میں ایسی جامع اصطلاح تو نہیں تھی۔لیکن اس کے تمام اجزاء جس سے یہ مرکب ہوتا ہے موجود تھیں۔قرآن میں ان تمام کو اگر جمع کیا جائے تو یہ کیپٹل ازم بن جاتا ہے۔اب ایک اصطلاح تو مترفین کی ہے یعنی دوسروں کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کرنے والے۔اور دوسری اصطلاح مُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾(83:1) کی ہے۔چین میں تمام سرمایہ پرست اقوام چیانگ کیائی شک کے ساتھ تھیں۔جو امریکہ کے پٹھو کی حیثیت سے جنگ لڑ رہا تھا۔اسے سخت شکست ہوئی اور چین سے بھاگنا پڑا۔تو اس کے شکست کے اسباب تلاش کرنے کے لئے بڑی تحقیقات کی گئیں۔مگر ایک صحافی جیک بیلجن نے وسیع تحقیق کر کے ایک کتاب ''China shakes the World'' لکھی۔پہلے ہی صفحہ یعنی تمہید میں اس نے لکھا ہے کہ ارباب سیاست بھی گئے۔اکانوجسٹ،صحافی بھی گئے۔اپنے اپنے دائرے میں رہ کر مختلف نتائج اخذ کئے۔میں صرف ایک نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چیانک کیائی شک کو کوئی وہ کچھ کہنے والا نہیں تھا۔جو محمد ﷺ نے قریش سے کہا تھا کہ شکست کی بڑی وجہ تکریم آدمیت کا فقدان ہے۔

محمد ﷺ نے قریش سے کہا تھا: كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾(89:17-18)
اس لئے جب انسان وحی سے منہ موڑ لیتا ہے تو عقل وفکر سے کام نہیں لیتا تو قانون کا تصور ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔قانون کے تصور سے مراد جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کے سی نہ کسی انفرادی یا اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور جس کے سامنے یہ حقیقت نہ ہو وہ سمجھتا ہے کہ یونہی اتفاقی طور پر واقع ہو جاتا ہے اور اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً: فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ

1043
رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾(89:15) یعنی قاعدہ قانون کے بغیر هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ﴿۴۰﴾(27:40)۔ اور جب وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾(89:16) خدا یونہی ذلیل نہیں کرتا۔ تم نے ضرور کچھ کیا تھا۔ کلا، یہ بات ہرگز نہیں جو تم کہہ رہے ہو بلکہ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾(89:17-18-19-20) یہ تھا وہ نظام سرمایہ داری جس نے تمہیں تباہی سے دو چار کر دیا۔ اب یہ ہے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿۱﴾(83:1)۔

تَطْفِيْفٌ۔ (ط ف ف) بنیادی معنی'' کسی کو کچھ دینا تو نا تمام شکل میں دینا کہ وہ کسی کے کام ہی نہ آ سکے۔ اونٹنی کا ششما یہ نا تمام بچہ، اس کی شکل تو بن گئی مگر وہ کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اونٹنی کے پاؤں باندھ دینا تا کہ وہ اپنی رفتار سے چل ہی نہ سکے۔ اس کی صلاحیتیں پوری طرح نشوونما ہی نہ پا سکیں۔ تو یہ سارے معنی ایک لفظ مطففین میں آ گئے۔

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿۲﴾(83:2) دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پورا نچوڑ کر اور دوسری طرف وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴿۳﴾(83:3) دوسروں کو خواہ ماپ ہو یا تول ہو تو ڈنڈی مارتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں تطفیف، نظام سرمایہ داری'' کو کہتے ہیں۔ انسانوں کو ماپتے اور تولتے ہیں جبکہ دین میں ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ پورا پورا دیا جائے۔ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ﴿۴﴾(83:4) کیا یہ اس زعم باطل میں ہیں کہ یہ لوگ ان تمام رکاوٹوں کو ایک دن ہٹا کر آزادی حاصل کر لیں گے۔

قرآنی نظام کی اصل جنگ مطففین اور مترفین کے خلاف ہے اور اعلان یہ ہے کہ یہ نظام تباہ ہو کر رہے گا۔ ابتدا میں غلامی کا عہد ہو، جاگیرداری کا نظام ہو یا سرمایہ داری کا یہ تمام ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان کو ایک دن راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵﴾(83:5)۔ ایک عظیم انقلابی دور آئے گا۔ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾(83:6) جس میں یہ خدا کا تفویض کردہ نظامِ ربوبیّت، اس کو قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہونگے۔ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴿۷﴾(83:7) اس وقت ان لوگوں کے جرائم کا نتیجہ جنہوں نے انسانیت کو طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے۔ خود جکڑ کر باندھ دے گا۔ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾(83:12) یہ حقیقت کو جھٹلانے والے ان کی یہ سرکشی متعدّی امراض کی طرح پھیل جاتی ہے۔ تو محنت نہ کرنے کی وجہ سے ان کے قوائے عملیہ سست پڑ جاتے ہیں۔ دولت فراواں تو حدود فراموش تو محنت چھوڑ دی تو قوتیں مضمحل ہو گئیں۔

❁❁❁

قرآن کی پاکیزہ اور قوّت وحرارت دینے والی تعلیمات

شرابِ طہور، گرتوں کو تھام لینے والی شراب:

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ (83:25) ان کو پینے کو بادۂ خالص ملے گا، مختوم سربمہر اور مہریں مشک کی۔ حرارت بخش توانائیوں والی۔ اگر اسے ہوا لگ جائے تو تندی اور تیزی میں فرق آ جائے گا۔ یعنی باہر کی آلائیشوں سے محفوظ۔ یہ سب استعارہ، تشبیہ کے طور پر ہے۔ یعنی اس میں عظمت وشوکت اور قوت واقتدار کا اظہار ہے۔ کہ اس جماعت کے لوگوں کو ایسا ہونا چاہیے۔ ان کی رگوں میں حدت اور حرارت ہو جیسا کہ یہ چیز شراب سے پیدا ہوتی ہے۔ شَرَابٌ طَهُوْرٌ سے مراد توحید کا دین۔ یہ قرآن کی تعلیمات ہیں۔ ایسی شراب جو طہور یعنی اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو۔ یہ خالص دین ہے۔ اور جن بوتلوں میں بند ہے وہ سربمہر ہیں۔ یعنی سیل لگی ہوئی یعنی خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہوا ہے۔ یہ کلام اور اس کی تعلیمات یہ ہے وہ شراب اور پیکر یعنی الفاظ ہیں۔ وہ یہ بوتل ہے جسے قرآن کا نسخہ کہہ لیں۔ اور اس کی حفاظت خود خدا نے ذمہ لے لیا۔ تو استعارةً کہا کہ وہ رحیق یعنی خالص شراب جس پہ مہر خود خدا نے لگائی ہے۔ اور چونکہ مہر بھی قوت وحشمت کا استعارہ ہے وہ مہر (Seal) بھی مشک کی لگی ہوئی ہے۔ رحیق ہے پھر مختوم ہے۔ (سربمہر) اور سیل اس پر مسک یعنی مشک کی ہے۔ تو یہ اس نظام کے حشمت واقتدار کا پورا استعارہ ہے۔ مختوم، خاتم سے مراد دو قسم کی اردو میں، ایک تو انگریزی میں Stamp کہلاتی ہے۔ اور دوسری ایک (Seal) ہوتی ہے اردو میں تو اس کے لئے دوسرا کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ ایک چیز کو Seal کرنا ہوتا ہے تو خاتم کا لفظ (Seal) کے معنوں میں آیا ہے۔ قرآن میں۔ اسٹیمپ کے معنوں میں نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ جس درخواست پر رسول اللہ ﷺ کی مہر لگ گئی تو وہ نبی ہو گیا۔ اصل نبوت کی فہرست کے اوپر اللہ کی (Seal) لگ گئی تو اب اس میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے خود مختوم کہہ دیا۔ نبوت خود مختوم ہوگئی۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ سیل (seal) ہیں۔ اسٹیمپ نہیں۔ ان کے بعد نبوت قیامت تک کے لیے ختم ہوگئی۔

بات صاف کردی کہ کہیں حقیقی شراب نہ سمجھ لیں، کافور کی آمیزش:

ان تعلیمات میں تندی اور تیزی بھی ہے۔ نرمی بھی ہے تو توازن برقرار رکھنے کے لئے اس میں کچھ ملایا جاتا ہے۔ جہاں اس

معیار سے قوت اونچی ہوئی تو فوراً اس میں کافور ملا دی۔(76:5)

اب طب یونانی میں کافور حدت کو کم کرتا ہے۔ ویسے کافور سے مراد یعنی کفر سے مراد دبا دینا ہے۔ اس حدت کو فنا نہیں کرتا بلکہ اس تندی کو ذرا سا دبا لیتا ہے۔

شراب میں زنجبیل کی آمیزش:

اگر اس معیار سے وہ حدت، قوت کم ہوئی تو اس میں زنجبیل (ادرک) ملا دیتے ہیں۔ توازن برقرار رکھنے کے لئے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (48:29) تیزی ہے لیکن رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29)۔ ان کو نیچے لے آتا ہے۔ کس طرح سے قوانین خداوندی کے سامنے پیکر تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ یہی تو قیام ہے۔ اس کے ساتھ ہی فوراً رکوع سجود ہے۔ زندگی ہر وقت قیام چاہتی ہے۔ یہ تو اپنے موقع پر قیام چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ رکوع بھی ہے اور سجود بھی۔ رکوع اور سجود سے یہ مراد نہیں کہ بس رکوع ہی میں جھکے رہیں اور سجدے میں پڑے ہی رہیں۔

خودی کی تندی و تیزی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذّتِ نیاز نہیں

قرآن کی شراب تو انسان کو محتاجی اور محکومی سے گرنے سے بچاتی ہے کہ وہ مقام سے نہ گرے اس کو وہ مقام عطا کرتی ہے۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ﴿۲۵﴾ (83:25) یہ تو بادۂ خالص ہے ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک اور اس بوتل پر سیل بھی قوت بخش عنصر یعنی مشک سے مرکب ہوتا ہے۔ اس سے تو آگے بڑھنا ہے۔ ارتقاء حاصل کرنا ہے۔ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ؕ﴿۲۶﴾ (83:26) جو زندگی کی اس راہ آگے بڑھنا چاہے تو اسی کے ذریعہ آگے بڑھ جائے۔ یہی قوم اعلون ہوگی۔ السّابقون السّابقون۔ مصاف زندگی میں سب سے آگے آگے۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ؕ﴿۳۷﴾ (74:37) یہ ارتقاء تو بلندیوں سے ہو رہی ہے آبشار سے ہو رہی ہے۔ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ﴿۲۸﴾ (83:28) اس چشمہ سے پی کر تو قرب خداوندی یعنی خدا کی صفات میں رنگ جاتے ہیں۔

❁❁❁

سورۃ الطَّارِقِ (86)، قانونِ مکافاتِ عمل کی مظہر ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿١﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿٢﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴿٣﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿٤﴾ (86:1-4) قانون مکافات کی بات ایک نئے انداز سے سمجھائی ہے۔ کہ فطرت کی قوتیں ہوں یا انسان کی صلاحیتیں۔ کبھی یہ مضمر اور کبھی مشہود ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح سے اعمال کے نتائج جو بظاہر چھپے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ مشہود بھی ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

طارق وہ ستارہ جو رات کو آیا کرتا ہے۔ کہا یہ ستارہ کہیں چلا نہیں جاتا صرف اتنا ہے کہ دن کو یہ مضمر ہوتا ہے۔ اور وہ مشہود ہو کر سامنے بھی آ جاتا ہے اگر تم بصیرت سے کام لو۔ اب ذرا اپنی مثال دیکھو کہ چلتا پھرتا مشہود پیکر سامنے ہے۔ تو کیا یہ شروع ہی سے اسی طرح سامنے تھا۔ تو جیسے یہ مضمر تھا اور پھر مشہود ہو گیا ہے طارق اور پھر خود انسانی پیدائش کی مثال سامنے لایا۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿٥﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ﴿٦﴾ (86:5-6) ابتداء تو قطرہ آب سے ہوئی۔ جو تیزی سے اچھلتا ہوا رحم مادر میں آیا تو کیا اس میں تمہیں کوئی انسان نظر آیا؟ اگر مائیکروسکوپ سے دیکھ لو تو اس پوشیدہ انسان کو پا لو۔ تو کیا تمہارے جرائم محفوظ نہیں ہو سکتے۔ تو وہ نگاہ پیدا کرو جو غیر محسوس میں محسوس پا لے۔ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ﴿٧﴾ (86:7) اب اس قطرہ آب یعنی نطفہ کو دیکھو کہ کس مقام سے نکلتا ہے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی کا آخری حصہ (Sacrum) اور پیڑو (کولھے کی دونوں ہڈیاں) (Pelvic bones) سے ہوتا ہوا رحم مادر میں گرتا ہے۔ اب کیا یہ چیزیں تم مشہود طور پر دیکھ سکتے ہو۔ پھر اس میں سے مختلف گردشوں سے ہو کر جیتا جاگتا بچہ پھر یہ انسان ظاہر ہو جاتا ہے۔ اب تمہیں یہ شبہ ہو رہا ہے کہ مرنے کے بعد کیسے دوبارہ زندہ ہو گا۔ تو کیا جس نے اسے مضمر سے مشہود بنایا تھا۔ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿٨﴾ (86:8) تو کیا وہ اسے دوبارہ مشہود نہیں کر سکتا۔ اور پھر تم مکافات عمل کا سامنا کرو گے۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴿٩﴾ (86:9) تو انسانی اعمال کے پوشیدہ نتائج سامنے کھل کر آ جائیں گے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿١١﴾ (86:11) اجرام فلکی کے لئے نئے نئے پہلو ہیں جو گردش سے سامنے آتے ہیں۔ کبھی دن اور کبھی رات۔ یہ ان سماء کی گردشوں سے نئے نئے پہلو جو مضمر چیزوں کو دن کے وقت مشہود کر دیتا ہے۔ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿١٢﴾ (86:12) کہتے ہو کہ جسم انتشار کا شکار ہو گیا۔ تو زندگی ختم۔ ذرا بیج کے اندر تو جھانکو۔ وہ موت کی دلیل نہیں وہ تو زندگی کی دلیل ہے۔ دانہ خاک میں مل کر لپٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس سے دو دن بعد حیات نو کی نمود ہو جاتی ہے۔ اور قدم قدم پر تم یہ چیز دیکھ کر بھی شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہو کہ کائنات کے گوشہ گوشہ میں موت و حیات کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

اقتدار اعلیٰ کی چار اہم ترین کڑیاں، سورۃ الْاَعْلٰی (87)

الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ (87:2-3) صرف یہ چار الفاظ ہی سر جھکانے کے لیے کافی ہیں۔

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ﴿۱﴾ (87:1) اس نظام ربوبیت کو قائم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جاؤ جو کائنات میں اقتدار اعلی کا مالک ہے۔ اس سے بالاتر کوئی اور نہ ہو۔ اقتدار اعلی قوانین کا قرآن کا ہوگا۔

وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) اقتدار مطلق کتاب کو ہوگا۔ انسانی حکومت اس اقتدار اعلی کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ اب آگے خدا کے پروگرام کی چار کڑیاں صرف چھ الفاظ ہیں۔ خدا پر ایمان لانے کے لئے کافی ہیں۔ اور کچھ نہ بھی ہوتا تو یقینا یہ الفاظ ہی سر جھکا دینے کے لئے کافی ہیں۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے کسی لٹریچر میں یہ الفاظ نہیں ملتے۔

الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ﴿۲﴾ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَہَدٰی ۪ۙ﴿۳﴾ (87:2-3) عدم سے وجود میں لانے کے بعد تخلیق کا مرحلہ ہے۔ فاطر اور بدیع تو خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس نے خود کو اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ﴿ؕ۱۴﴾ (23:14) کہہ کر دوسروں کو بھی خالق تسلیم کیا ہے۔ خَلَقَ سے مراد مختلف چیزوں میں خاص تناسب و ترکیب سے مختلف چیزوں کا پیدا کرتے چلے جانا۔ فاطر تو وہ تمام اشیاء کا ہے۔ یعنی ابتدائی مادہ ہے جس سے آگے چیزوں نے بننا ہے۔ فاطریت سے چیزیں وجود میں آگئیں۔ اب نئی نئی تراکیب سے مختلف چیزوں کا بناتے چلے جانا تخلیق ہے۔ یہ دو صدی قبل تک یہ نظریہ تھا کہ جو شے آج جس شکل میں موجود ہے اس شکل میں اس طرح خدا نے بنا دی۔

ارتقائی منازل:

سائنسدان بھی یہی مانتے آرہے تھے اٹھارویں صدی تک، پہلی دفعہ اس تصور کے خلاف ڈارون کی تھیوری سامنے آئی۔ اس کے مطابق ذی حیات کی تاریخ اور ان کا ماضی یہ بتا رہا ہے کہ ہر شکل اس شکل میں پہلے ہی دن وجود میں نہیں آگئی تھی۔ جس میں وہ آج موجود ہے۔ بلکہ پہلے کچھ اور شکلیں تھیں۔ Crude Form (کندۂ ناتراش) یہ ابھرتی ہوئی چیزیں تھیں۔ جسامت میں بڑی بڑی آج جو چھپکلی ہے وہ اس زمانے میں مگرمچھ تھی۔ یہ تمام ارتقائی منازل سے گزر کر آگے آتی گئیں منزل بہ منزل۔ اور ہر اگلی منزل میں ان کا حشو زوائد چھٹتا گیا۔ ان میں اعتدال اور ہمواری پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس طرح یہ ہزار ہزار سال، پچاس پچاس

ہزار سال رہے۔تو ان کے مادی اجسام کی تراش خراش ہوتی گئی۔ذہنی طور پر بھی ارتقا ہوتا گیا۔اور جسمانی طور پر بھی یہ حشو وزوائد الگ ہوتے گئے۔یوں اعتدال آتا گیا اور یہ آگے بڑھتے چلے گئے۔خَلَقَ (87:2) کے بعد اگلا مرحلہ فَسَوّٰى ۝۲ (87:2) ہے۔حشو وزوائد سے الگ کر کے کسی چیز میں اعتدال پیدا کرنا۔پہلے مرحلہ فاطر جس کا تعلق عالم امر سے ہے۔نیوکلیائی اشیاء وجود میں آگئیں پھر مختلف تراکیب سے چیزیں متشکل ہوئیں۔ابتداًء یہ بڑی Crude تھیں۔پھر ان میں Refinement ہوتی گئی۔ان کو مختلف فلٹرز سے گزارا گیا۔حشو وزوائد گھٹتا گیا اور اعتدال آتا گیا۔یوں یہ موجودہ چیزیں متشکل ہوئیں۔یہ ہے خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ (87:2)۔

پیمانے:

وَالَّذِیْ قَدَّرَ (87:3) ہر شے کے لئے پیمانہ یعنی تقدیر مقرر کردی۔یعنی مراحل سے گزرنے کے بعد آخرالامر جو کچھ بننا ہے۔امکانات کی رسد کی آخری حد کو تقدیر کہتے ہیں۔وہ اس پیمانہ کے مطابق بنتی چلی جائے۔ہر شے میں یہ قوانین داخل کر دیئے گئے۔خارجی کائنات ہو، نباتات ہوں، یا حیوانات ہوں۔یہ ہے وہاں ہدایت کا سلسلہ۔یہ ہے ھدٰی۔وحی۔

فَهَدٰى۔فَهَدٰى ۝۳ (87:3)۔ان پیمانوں کے مطابق چلنے کی ہدایت رکھ دی۔ان چار الفاظ میں اقتدار اعلیٰ کی کارفرمائی بتادی۔اب قرآن نے پیش افتادہ مثال جہاں وہ خیمہ گاڑتے تھے گھاس کی مثال سامنے لایا۔

گھاس کی مثال:

وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝۴ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝۵ (87:4-5) کہا بڑی بڑی چیزوں کو چھوڑ دو۔یہ گھاس دیکھ جہاں تم خیمے گاڑتے ہو۔گھاس دیکھو کہ کیسے نشوونما پا رہی ہے۔اب اس کی قدر یعنی منزل مقرر کردی۔وہ ایک سمت کو آ کر سوکھ کر بالکل سیاہ کوڑا کرکٹ ہوجاتی ہے۔اور کائنات میں ہر شے کے لئے یہی طریق مقرر کردیا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳ (87:2-3)

انسان کے لئے ہدایت:

کائنات کی کوئی شے سرکشی نہیں کرسکتی۔جبکہ انسان کو اختیار وارادہ دے کر فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) یہ ہے ہدایت کا طریقہ انسان کے لئے جس طرح خارجی کائنات کے اندر قوانین محفوظ کردیئے گئے ہیں۔کہ کوئی ان پر اثرانداز نہیں ہوسکتا۔اس لئے سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۝۶ (87:6) (قرءیعنی جمع کر کے محفوظ کرنا) یہ وحی جمع کر کے پھر اس کی حفاظت اس طرح ہوگی کہ تو اسے نہ ترک کرسکے گا ترک اور نہ جھلا سکے گا۔وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹ (15:9) اس کی حفاظت یقیناً ہم کریں گے۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (87:7) اور اس کی مشیت یہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔یہ ہے ختم نبوت۔یہ کاہے کے لئے دیا۔اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝۷ (87:7) تاکہ مخفی، مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوسکے۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۸ (87:8) جو بھی ان ہدایات پر چلے گا۔تو راستے آسان ہوتے جائینگے۔

کعبہ کو بلند مقام سے پست ترین مقام پر اس قریش نے لا دیا

''سورۃ الۡفَجۡرِ 89''

وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ ۚ﴿۴﴾ ہَلۡ فِیۡ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ﴿۵﴾ (89:1-2-3-4-5)

اس سورہ کا پیغام اگر سورۃ القریش کو پہلے سامنے رکھا جائے تو وضاحت سامنے نکھر کر آ جاتی ہے۔ لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ٪﴿۴﴾ (106:1-2-3-4) ان چار آیات میں مذہبی پیشوائیت کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ خدا کے نام پر جہاں جہاں بھی یہ اڈے بنے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کی طرف نسبت سے قوت و تعظیم و دولت کے مقامات حاصل کرتے ہیں۔ اسی بل بوتے پر یہ خوشحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور تمام خطرات سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس میں کسی خاص مذہب کی تخصیص نہیں۔ ہندوؤں کے مندر ہوں یا عیسائیوں کے گرجے۔ یہودیوں کے ہیکل ہوں یا سکھوں کے گردوارے۔ ان کی نسبت خدا کے ساتھ رکھنے سے معاشرے میں عزت، خوشحالیاں، گھر کی حفاظت مگر ان کے کرتوت قابل غور ہیں۔ اب ان کعبہ کے متولیوں کی حالت ملاحظہ کریں۔ کہ ان کو ساری دنیا میں اس گھر کی وجہ سے عزت و تعظیم ملتی ہے۔ یہ سارے قافلے دن کے وقت لوٹ لئے جاتے ہیں۔ مگر ان کے تجارتی کارواں کو کوئی ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ ان کو خوف کے مقابل امن اور سہولت سے سامان نشوونما مگر حالت یہ ہے کہ جس کی طرف نسبت سے یہ تمام مراعات حاصل ہیں۔ اسی کے قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ کم از کم ان کو تو احساس ہونا چاہئے۔ کہ یہ تو ان حرکتوں سے باز آ جائیں۔ ذرا اس مقام کعبہ کو تو دیکھو جو ساری انسانیت کا مرکز تھا تاکہ لِّیَشۡہَدُوۡا مَنَافِعَ لَہُمۡ (22:28)۔ لوگ خود آ کر اس نظام کے فوائد نوع انسانی کے متعلق دیکھیں۔ تو یہ اس گھر کے رکھوالے تھے تاکہ لوگوں کو اس اجتماع میں بلائیں مگر ان کی کیفیت دیکھو کہ اس مقام کو یہ کن پستی کے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾ (89:1-2-3) ان کو دیکھو کہ اس اجتماع کو کیا سے کیا بنا دیا اور ابتدائی دس راتیں تو عیاشیوں کے لئے مخصوص کر رکھی ہیں۔ اس میں ساری بدمستیاں اور چاروں طرف جوئے کا بازار گرم ہوتا ہے۔ طاق

اور جفت پانسوں سے کھیلا جاتا ہے۔اور آخری رات تو انتہا کر دیتے ہیں۔ یہ دولت اس طرح لٹاتے ہیں اور غریبوں کو ایک وقت کی روٹی نہیں ملتی۔ هَلۡ فِیۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ﴿۵﴾ (89:5) جو لوگ عقل سے کام لیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کا بھی وہی انجام ہونے والا ہے جو اقوام سابقہ کا ہوا۔

ذلت کا مدار چار چیزیں پر ہے:

پہلی لَّا تُكۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ ﴿ۙ۱۷﴾ (89:17)، دوسری وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ﴿ۙ۱۸﴾ (89:18) اور تیسری وَتَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا ﴿ۙ۱۹﴾ (89:19) اور چوتھی چیز وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿ؕ۲۰﴾ (89:20)۔ ایسی محبت کہ گڑھا کھودا جائے تاکہ سب اس میں جمع ہو۔ یہ ہیں وہ وجوہات جن کی وجہ سے تم ذلیل ہو گئے۔ بغیر وجہ کے کوئی کام کائنات میں نہیں ہوتا۔

''سورۃ البَلَدِ(90)''، لَا کا قرآنی خوبصورت اسلوب

لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِۙ۝۱ وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِۙ۝۲ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَۙ۝۳ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡ كَبَدٍؕ۝۴
(90:1-2-3-4) لَا کا انداز بڑا قابل تحسین ہے۔ بات جو پیچھے سے چلی آرہی ہے اسے دہراتے نہیں تھے۔ اس کی تردید کرنا مقصود ہوتا تو دہرائے بغیر ایک ''لا'' کہہ دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں نہیں۔ بات یوں بنتی ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ بات یوں ہے اس لا'' میں سارا انداز آجاتا ہے۔ ان کے ہاں مخاطب کی اس ساری چیز کی تردید کرنے کے لئے وہ کلام کی ابتدا ہی لا سے کیا کرتے تھے۔ ہمارے بعض شعرا نے بھی اس خوبصورت انداز کو اپنایا ہے۔ (غالبؔ)

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

یہ نہیں جو زیادہ نظر آتی ہے۔ مگر بڑی دقیق سی چیز ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ کوئی بات ہو رہی تھی۔ اس پر مخاطب نے کہا کہ تم یہ بھی نہیں مانتے کہ یہ عربی انداز ہے کہ اس کا ذکر کئے بغیر بات ''نہیں'' سے شروع کی ہے۔ یہ بڑا بلیغ انداز ہے۔ قرآن بھی ''لا'' کے حرف سے یہ انداز اختیار کرتا ہے۔ نہیں یہ بات نہیں جو تم سمجھ بیٹھے ہو۔ یہ بے سروسامان جماعت اتنا بڑا دعوی لے کر نکلی ہے۔

ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانِ نگر

اس کعبے کو اس بلد عظیم کو اس نظام کا مرکز بنتا ہے۔ اب نظام ہی ہے۔ نہیں جس کا یہ مرکز بنا رہے ہیں تو ہماری سرداری ختم ارے ان کی باتیں تو سنو! تو جواباً کہا گیا نہیں۔ بات یوں نہیں جیسے تم سمجھ بیٹھے ہو۔ میں اسی بلد عظیم کو اس کی شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَۙ۝۳ (90:3) اور باپ سے بیٹے کی تولید یعنی قانون تولید کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔ جس کی روح سے پرانی زندگی (والد) سے ایک نئی زندگی (ولد) بیٹے کی نمود ہوتی ہے۔ کہ آخر الامر اس نظام کی جگہ صحیح نظام قائم ہو کے رہے گا۔ باپ بوڑھا ہو جاتا ہے تو نئی زندگی بچہ کی شکل میں حیات نو میں، سامنے آجاتی ہے۔ یہ تو پرانا لباس اتار کر نیا لباس پہنا جاتا ہے۔ اس طرح سے زندگی کا تسلسل قائم ہے۔ کہ جب ایک زندگی فرسودہ ہو جائے تو اس کے بعد اس میں سے حیات تازہ کی کونپل پھوٹتی ہے۔ یہ کعبے کا جو نظام بگاڑ دیا تھا اسی نوع سے ایک نیا نظام پھوٹے گا۔ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡ كَبَدٍؕ۝۴ (90:4) دوسری جگہ فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ۝۴ (95:4) کہا۔ کبد سے مراد توازن و تناسب قائم کرنے میں جو مشقت درکار ہو اور یہ صرف خدا کے قوانین

کے تحت ہوسکتا تھا۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ﴿۵﴾ (90:5) یہ وحی کے بغیر والا انسان کو یہ گمان کر رہا ہے کہ میرے اوپر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا جو مرضی ہے کروں۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۷﴾ (90:7) یہ اس زعم باطل میں ہے کہ جو جی میں آئے کرواسے تو کوئی دیکھنے والا پوچھنے والا ہی نہیں۔ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ﴿۹﴾ (90:8-9) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اسے دو آنکھیں دیں۔ تا کہ دیکھ بھال کر چلے۔ ایک زبان اور دو ہونٹ تا کہ مافی الضمیر کا اظہار کر سکے۔ یہ بڑی عجیب بات قرآن نے کہی جب حیوانی زندگی آگے بڑھ کر انسانی پیکر میں آئی تو اسے دو بنیادی خصوصیات ملیں۔ ایک بولنے کی قوت، قوت اظہار بولنے کے لئے تو زبان کہہ دینا کافی ہوتا ہے لیکن اس وقت جو ہونٹ ساتھ دیتے ہیں۔ ہونٹوں کو کھلا رکھ کر خالی زبان سے اظہار یہ دو ہونٹ عظیم آلہ ہیں۔ زبان خالی اظہار نہیں کر سکتی۔ بولنے کے لئے زبان اور دو ہونٹوں کا ہونا لازمی ہے۔ اور ساتھ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾ (90:10)۔ دونوں راستے دکھا دیئے۔ هُدٰی۔ ابھری ہوئی چیز بلکہ راستے کو ابھار کر سامنے لانا۔ ایک راستہ ذاتی مفاد پرستی، لوٹ مار، جبکہ دوسرا فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ (90:11)۔ یہ راستہ گھاٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے۔ اس میں حوصلہ اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فِيْ كَبَدٍ ﴿۴﴾ (90:4) سے مراد ان صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ صلاحیتیں بنی بنائی، نشوونما یافتہ شکل میں نہیں ملتیں۔ جس طرح یہ حیوان کو یہ چیزیں نشوونما یافتہ صورت میں ملتی ہیں۔ ان کو محنت نہیں کرنا پڑتی۔ مثلاً چیل کے بچوں کو اڑنا سیکھنا نہیں پڑتا اس طرح بطخ کے بچوں کو تیرنا سیکھنا نہیں پڑتا۔ جبکہ انسان کو تھوڑی سی مشقت کر کے یہ صلاحیتیں حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ یہ تھوڑا سا دشوار گزار راستہ، اور یہی دشوار راستہ گھاٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے۔

کائنات کا تنوع قدم قدم پر (Variety) مگر اصل و بنیاد وحدت ہے

’’سُورَۃُ الّیل(92)‘‘

کائنات کا تنوع قدم قدم پر:

وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى ۙ‏ ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ‏ ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰٓى ۙ‏ ﴿۳﴾ اِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتّٰى ؕ‏ ﴿۴﴾ (92:1-2-3-4)

کائنات پر غور کریں اس کے مظاہر، کائنات کی تخلیق، خدا کی اس مخلوقات میں بڑا تنوع ہے۔ باہر کا تنوع تو ایک طرف نوع انسانی ایک نوع ہے۔ ایک جنس ہے۔ کمال یہ ہے کہ اربوں انسان بیک وقت دنیا میں موجود ہیں۔ چہرے کے خدوخال کی حیثیت ہی کیا ہے؟ دو آنکھیں، ایک ناک، دو ہونٹ، پیشانی، اتنا سا کچھ مگر تنوع کا یہ عالم کہ ایک چہرہ دوسرے سے نہیں ملتا۔ اگر یہ تنوع نہ ہوتو ہم ایک دن بھی دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ (چہروں میں تنوّع) ایک گھر میں کبھی جڑواں بچے پیدا ہوجائیں تو ان کے چہروں میں تنوع نہیں ہوتا تو ماں کو پہچاننے کے لئے رنگ دار رومال ڈالنا پڑتا ہے۔ اگران اربوں چہروں میں تنوع نہ ہوتو آپ دیکھیں گے کہ کیا نقشہ بنے گا۔لیکن اس تنوع کے پیچھے دیکھئے کہ انسان کی اصل ایک ہی ہے۔اور سائنسدانوں سے پوچھیئے تو دو ہی بنیادی قوانین ہیں۔ایک تو ’’Law of Effect and cause‘‘ (قانون علت ومعلول) دوسرا ’’Law of Uniformity of Nature‘‘ (قانونِ وحدتِ وفطرت) اس قدر تنوع کے ساتھ ساتھ وحدت بھی ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب ہوتا ہے۔

وحدتِ فطرت اس قدر تنوع کے ساتھ ساتھ:

ہر علت کا معلول یا ہر Effect کا Cause ہوتا ہے۔ دوسرا قانون وحدت فطرت میں وحدت ہے۔ اس قدر تنوع (Variety) کے باوجود جو اصل کائنات ہے اس میں وحدت ہے۔ یہ سارا تنوع کاروباری سہولتوں کے لئے ہے۔ یہ تو چہرے کا تنوع ایک معاشرہ میں ضروری ہوتا ہے نہ کہ غار میں رہ کر۔ جونہی سوسائیٹی، معاشرہ کے اندر آیا تو اسے اس تنوع کی ضرورت ہے۔ یہ تنوع کاروبار کے لئے، معاملات کے لئے ہے۔لیکن اس کی اصل ایک ہے۔

اسی طرح اس تنوع کے باوجود انسانیت کی اصل ایک ہے۔قرآن انسان کو دو شقوں میں تقسیم کرتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ کائنات پر غور کرو بادی النظر میں یہ تمہیں متضاد عناصر کا مجموعہ نظر آئے گا۔

1043

وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰٓى ۙ﴿۳﴾ (92:1-2-3) ایک طرف رات ہے جس کی تاریکی ہر شے پر پردہ ڈالدیتی ہے۔دوسری طرف دن کا اجالا ہے جو ہر شے کونکھار کر سامنے لے آتا ہے۔جانداروں میں ایک طرف نر اور دوسری طرف مادہ ہیں۔جن کے وظائف زندگی الگ الگ ہیں۔رات اور دن کا اختلاف دو متضاد چیزیں نظر آتی ہیں۔تنوع ہے۔تفاوت ہے۔لیکن سائنسی نقطہ نگاہ سے دیکھیے جو دن اور رات سوائے زمین کی گردش کے کچھ بھی نہیں۔زمین کو جو پہلو سورج کے سامنے ہوتو دن کہلاتا ہے۔جب وہی پہلو سورج سے اوجھل ہوجائے رات کہلاتی ہے۔زمین دن ہوتی ہے وہی زمین رات ہوتی ہے۔اس تضاد کے پیچھے پھر وہی وحدت ہے۔تاریکی تمام امتیازی خطوط جو الگ الگ نظر آئیں تو ان کو مٹادیتی ہے۔نشیب وفراز حیات تاریکی سے باقی نہیں رہتا۔رنگوں کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔قرآن نے يَغۡشٰى ﴿۱﴾ (92:1) کہا ہے جیسے کوئی پردہ ڈالا ہے۔تومعلوم نہ ہو کہ پیچھے کیا ہے۔اس کے مقابل تَجَلّٰى ﴿۲﴾ (92:2)، اَلْجَلَآءُ، الگ الگ کردینے والی چیز۔رات کی تاریکی یہ امتیاز مٹادیتی ہے۔جبکہ روشنی ہر چیز کو دوسرے سے الگ الگ کردیتی ہے۔مگر روشنی معدوم ہوجائے یہ تمیز، تقسیم، اختلاف وتضاد باقی نہیں رہتا۔روشنی آتی ہے تو یہ امتیازات شروع ہوجاتے ہیں۔اسی طرح نر اور مادہ کی تمیز ایک خاص مقصد کے لئے ہے۔ورنہ اصل کے اعتبار سے تو ایک ماں ہوتی ہے۔انسان انسان ہے۔خواہ عورت کے روپ میں ہو یا مرد کے۔

اِنَّ سَعۡيَكُمۡ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ (92:4) اس طرح تمہاری کوششیں مختلف سمتوں میں ہوتی ہیں۔کام الگ الگ، پیشے الگ الگ، مقاصد الگ الگ۔تمہاری سوچ سے یہ کوششیں مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔تو اگر انسانوں کی تقسیم دیکھیں تو صرف دو بنیادی شقوں میں بٹ جاتے ہیں۔وہ کفر اور ایمان کا امتیاز ہے۔اب وہ دو شقیں کیا ہیں۔فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰى وَاتَّقٰى ۙ﴿۵﴾ (92:5) پس جو شخص نوع انسانی کو ایک سمجھ کر اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے۔اور ناہمواریوں سے محتاط رہے۔وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰى ۙ﴿۶﴾ (92:6) اور حسن عمل کے دعووں کو سچا کر کے دکھادے۔فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡيُسۡرٰى ؕ﴿۷﴾ (92:7) تو ان کے لئے زندگی کی راہیں آسان بنادی جاتی ہیں۔

دوسری شق: بخل: وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰى ۙ﴿۸﴾ (92:8)۔جو ذات کے لئے رکھ دے اور سمجھ لے کہ مجھے اب کس کی ضرورت نہیں۔وَكَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰى ۙ﴿۹﴾ (92:9) یہ ہے جو حسن عمل کے دعوی کی تکذیب کررہا ہے۔فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡعُسۡرٰى ؕ﴿۱۰﴾ (92:10) تو زندگی کی آسان راہیں بھی اس کے لئے دشوار گزار ہوجاتی ہیں۔

الَّذِىۡ يُؤۡتِىۡ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنۡدَهٗ مِنۡ نِّعۡمَةٍ تُجۡزٰٓى ۙ﴿۱۹﴾ (92:18-19) اس کے سر پر کوئی احسان نہیں تھا۔جس کا بدلہ اس نے اتارا۔اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰى ۚ﴿۲۰﴾ (92:20) یہ تو صرف نشوونما دینے والے کی صفت ربوبیت کو دنیا میں عام کرنے کے لئے کررہا ہے۔

داعیٔ انقلاب کی زندگی اور داعیٔ انقلاب کو تسلی دی جا رہی ہے،

''سُورۃُ الضُّحٰی (93)''

وَالضُّحٰی ﴿١﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ﴿٢﴾ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ﴿٣﴾ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ﴿٤﴾ (93:1-2-3-4)

رسول ﷺ جس انقلاب عظیم کی دعوت کو لیکر اٹھے۔ نبوت کی 23 سالہ زندگی میں 13 سال مکی زندگی میں مصائب پہ مصائب، مشکلات، اذیتیں گزارتے ہوئے برداشت کیئے اور مدینہ کی ابتدائی زندگی کے چھ سات سال تقریباً 82 جنگیں تھونپ دی گئیں۔ مگر ھنوز کامیابی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہوگا کہ شاید رات کی تاریکی ہمیشہ چھائی رہے اور سحر نہ ہو تو اے رسول! اس تاخیر سے شاید اس قسم کے خیالات جنم لے رہے ہوں۔ کہ شاید مجھ سے کوئی بات سرزد ہوگئی ہے۔ جس کی وجہ سے رب نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ یا ناراض ہوگیا ہے۔ تو تسلی دی گئی۔

وَالضُّحٰی ﴿١﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ﴿٢﴾ (93:1-2) صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے رات کی تاریکی کس طرح ہر شے پر چھا کر ساکت و صامت کر دیتی ہے۔ تو گھبراؤ نہیں اس تاریکی کے بعد صبح کا طلوع ہونا ایک غیر متبدل قانون ہے۔ یہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ﴿٣﴾ (93:3) تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا ہے اور نہ کوئی ناراضگی ہے۔ بلکہ وَلَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی ﴿٤﴾ (93:4) تیرے ابتدائی مراحل اس پروگرام کے دشوار گزار ہیں۔ مگر اس پروگرام کا مستقبل باعث خیر و برکت ہوگا۔ وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ﴿٥﴾ (93:5) عنقریب اتنا کچھ مل جائے گا کہ تیری آرزو خوشگوار نتائج سے ہمکنار ہو جائے گی۔

وَاَمَّا بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ ﴿١١﴾ (93:11) اور معاشرہ میں ایسی تبدیلی آجائے کہ تم اس بات کا چرچا کرتے چلے جاؤ کہ یہ آسائش اور نعمتیں اس لئے نہیں کہ کوئی ایک گروہ ان پر قابض ہو جائے بلکہ ان کے دروازے سب ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ فَحَدِّثۡ ﴿١١﴾ (93:11) عام کرتا جا، چرچا کرتا جا۔

ایک داعیٔ انقلاب کی ذمہ داریاں

''سورۃ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ (94)''

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ۙ﴿۱﴾ (94:1)

شرح صدر کا مقابل وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ يَضِيۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ ۙ﴿۹۷﴾ (15:97) کبیدہ خاطر ہوجانا اس کا الٹ شرح صدر کا کھل جانا''موسیٰ نے کہا قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِىۡ صَدۡرِىۡ ۙ﴿۲۵﴾ (20:25) سینہ کی کشادیعنی اس مہم کی جتنی مشکلات آئیں تو میں پامردی سے ان کا مقابلہ کر سکوں۔ابتدائی مراحل اس پروگرام کے انتہائی سخت اور کٹھن تھے۔فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ۙ﴿۷﴾ (94:7) جب تم اس سے فارغ ہوجائے گے۔یعنی یہ نہ سمجھ لو کہ یہ نظام یہاں قائم ہوگیا تو فارغ ہو گئے بلکہ یہ تو بین الاقوامی پروگرام ہے۔فانصب۔تو اس کے لئے جم کر کھڑا ہونا ہوگا۔وَاِلٰى رَبِّكَ فَارۡغَبۡ ﴿۸﴾ (94:8) تمہارا ہر قدم اس پروگرام کی طرف رجوع کرنا ہے چاہے کتنی مشکلات کیوں نہ ہوں۔

❁❁❁

داعئ انقلاب کو تسلیاں دی جارہی ہیں کہ یہ نظام ضرور نافذ ہوگا،

''سُورةُ التِّیۡنِ (95)''

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾ وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ﴿۶﴾ (95:1-2-3-4-5-6) ان سرگزشتوں کو سامنے لاؤ۔ نوحؑ نے تین کی پہاڑیوں سے جب یہ آواز بلند کی تھی۔ آج بھی انجیر امن کی علامت ہوتا ہے اور زیتون کی پہاڑیاں شہادت دیں گی کہ وہاں عیسیٰؑ نے جو پیغام دیا تھا۔ یہ مشکلات کوئی نئی بات نہیں ہے۔ موسیٰؑ نے جب اس دعوت کا آغاز طور کی چوٹیوں سے کیا تھا اور اب یہی داستان مکہ کے اس شہر سے بلند ہورہی ہے۔ یہ ساری سرگزشتیں اس بات پر شاہد ہیں کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس لئے ان مشکلات سے مت گھبراؤ۔ یہ ساری دعوت کا ہے کے لئے تھی کہ انسان کے اندر جو صلاحیت کہ یہ کائنات میں فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ (95:4)۔ تفضیل کا صیغہ ہے۔ (اَحۡسَنِ) سب سے زیادہ حسین ترین اور توازن والا پیکر بن جائے مگر اس کا کیا علاج کہ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ (95:5)۔ اَسۡفَلَ اسمِ تفضیل کا صیغہ ہے۔ اس کی مفاد پرستیاں اس کو سب سے پست ترین مقام پر گرادیتی ہیں۔ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۷﴾ (95:7) تو اس مکافاتِ عمل کے قانون کی وضاحت کے بعد کون تجھے جھٹلا سکتا ہے۔ فَمَا یُکَذِّبُکَ (95:7) کے ایک معنی تو وہ کون سی دلیل ہے۔ جس کی بناء پر تم تکذیب کروگے۔ دوسرے معنی ان سے پوچھو کون ہے جو اس مکافاتِ عمل کو جھٹلاتا ہے؟ کیونکہ یہ قانون اس پر شاہد ہے کہا اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ٪﴿۸﴾ (95:8) کیا اقتدارِ اعلیٰ خدا کا نہیں ہے۔ آخری فیصلہ تو اس کے قانون سے ہوتا ہے۔

انسانیت کو آخرالامر اسی نظام کی طرف آنا ہے،

''سُورۃُ الۡعَلَقِ''

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ (96:1-2) یہ پہلی وحی نہیں ہوسکتی۔ کہا جاتا ہے روایات کی رو سے کہ یہ پہلی وحی تھی۔ لیکن خود اس سورہ میں آگے چل کر چار آیات کے بعد ایک ایسی داخلی شہادت مل جاتی ہے۔ کہ یہ پہلی وحی نہیں ہوسکتی۔ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡہٰی ﴿۹﴾ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی ﴿ؕ۱۰﴾ (96:9-10) ذرا اس کو دیکھو کہ جب میرا بندہ فرائض منصبی کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو یہ اسے روکتا ہے۔ یا مروجہ نماز۔ سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ کو اس صلوۃ سے روکنا تو اس سے پہلے کی بات ہو نہیں سکتی۔ ان قریش کی مخالفت تو وحی کے ملنے کے بعد کی چیزیں ہیں۔ تو پہلی وحی میں تو یہ تصادم، روک تھام نہیں ہوسکتا۔ یہ تو بعد کی چیز ہے۔ تو یہ ہے داخلی شہادت کہ یہ پہلی وحی نہیں ہوسکتی۔ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ (96:1) اعلان کردے کہ جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے تو ساتھ ہی سامان نشوونما بھی دیدیا ہے۔ لہذا جسے پیدا کیا گیا ہے اسے سامان زیست سے محروم رکھنا اس کی ربوبیت سے بغاوت ہوگی۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ (96:2)۔ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ جنین کا وہ مرحلہ جب اس نے ہنوز کوئی شکل اختیار نہیں کی ہوتی۔ یعنی رحم مادر کی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا۔ اٹکا ہوا ہوتا ہے۔

عَلَقٍ۔ چپک جانے والا'' یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے۔ جس طرح خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ (21:37) یعنی تیز ہے۔ جلد باز ہے۔ دوسری جگہ ہے خَلَقَكُمۡ مِّنۡ ضُعۡفٍ (30:54) یعنی کمزور پیدا کیا کمزوری سے پیدا کیا'' یہ معنی نہیں ہیں۔

حیوانی سطح پر انسانی زندگی کی جبلتی:

حیوانی سطح پر بھی انسان کی بھی وہی تین جبلتیں ہیں جو حیوان کی ہوتی ہیں۔ زندگی کا تحفظ (Self Preservation)۔ اس طرح انسان ہر اس شے سے چپک جاتا ہے جس سے اس کی زندگی کا تحفظ وابستہ ہو۔ یعنی انفرادی طور پر چپکنے والا بنایا۔ اگلی جبلت (Herd Instinct) انفرادی زندگی کی حفاظت کے لئے سوسائیٹی میں رہتا ہے۔ علق، تعلقات والا۔ یہ ہیں وہ چیزیں جو قرآن بتارہا ہے۔ جس سطح کا، جس علم کی شاخ کا کوئی انسان ہے۔ اس کو یہ معنی دیا جائے گا۔ بائیالوجی کے نقطہ نگاہ سے اس کے معنی

1043 الگ (Anthropology) (علم البشریات) Behaviourism (کرداریت) کے لحاظ سے علق'' اس حیوانی جبلت یعنی سامان زیست کے لئے چپک جانا'' اگر سوشیالوجی کے نقطہ سے لیں تو اس سے مراد وہ تعلق جس میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعلق بنا کر سوسائیٹی بنا لیتے ہیں۔ کہا یہ گیا ہے'' کہ خدا نے اس کی تخلیق کی اسے سامان زیست دیا لیکن انسان کے اندر گہری جاذبیتیں اور کشش ہے۔ حیوانی سطح پر کیفیت یہ ہے کہ یہ سامان زیست کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ مگر سوسائیٹی سے تعلقات کا تقاضا ہے کہ صرف اپنی فکر نہ کرے بلکہ دوسروں کی بھی فکر کرے۔ یہ دونوں قسم کی جاذبیتیں اس کے اندر رکھ دی گئی ہیں۔ ان سے کہو اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿۳﴾ (96:3) بڑی فراوانیوں کے ساتھ سامان زیست دینے والا'' اَكْرَمُ ﴿۳﴾ (96:3) تفضیل کا صیغہ ہے۔ سب سے زیادہ فروانیوں سے سامان زیست دینے والا۔ گھبراؤ نہیں سامان زیست کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اگر اس قسم کا معاشرہ قائم کرو گے تو ضرورت کے مطابق ہر ایک کو ملے تو یہ فراوانیاں کبھی ختم نہیں ہونگی۔ اس لئے اعلان کر کے سب کو اس نقطہ پر اکٹھا کرو کہ اس نظام سے تمہاری تمدنی اور معاشی ضروریات پوری ہونگی۔

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ (55:4) بولنے کی قوت جو بڑی قوت ہے طبعی زندگی میں۔ یہ ہے وہ امتیازی خصوصیت جو حیوان سے نمایاں طور پر انسان میں آتی ہے۔ نطق ہے بیان کی قوت ہے۔ اب بیان کے ذریعہ تو اسے سنا سکتے ہیں جس کے کان تک آواز پہنچتی ہے۔ عالمگیر سوسائیٹی کے لئے دوسرے ذریعہ کی ضرورت ہے۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ (96:4) تحریر کے ذریعہ بھی آپس میں تعلقات بناؤ۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿۵﴾ (96:5)۔ وحی کے ذریعہ ان اقدار کا بھی علم دیا۔ جن کو انسان کا عقل نہیں جان سکتا تھا۔ اس طرح قوت گویائی اور تحریر دیکر وحی کا علم عطا کر دیا۔ تو اگر علق والی کیفیت رہے گی تو پھر تخلیق کا مقصد تو ناکام رہا۔ كَلَّآ (96:6) اس لئے ایسا ہو نہیں سکتا۔

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿۸﴾ (96:8) تمام حدود شکنیوں کے بعد تم نے اسی ربوبیت والے نظام کی طرف آنا ہے۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿۱۷﴾ (96:17)۔ اپنے حمایتیوں کو بلاؤ۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿۱۸﴾ (96:18)۔ تو ہم اپنی اس جماعت کو مقابلے میں بلائیں گے۔ جو حق کی مدافعت میں میدان جنگ میں آجائیں گے۔ یعنی اس نظام کے لیے اللہ کو بھی ایک جماعت کی ساتھیوں کی ضرورت ہے۔

❁❁❁

اقدارِ خداوندی سے اندھیرے چھٹ گئے،

''سُورۃُ الْقَدْرِ (97)''

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ ۝۱ (97:1) سے مراد وحی سے پہلے کا زمانہ جو تاریکیوں کا زمانہ تھا۔ تاکہ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ (14:1) لَیۡلِ تو تاریکی کی نمائندہ جبکہ دن روشنی کا۔ اور اسی تاریک دور میں اقدار کے پیمانے دیئے۔ جن کے بغیر ذات کی نشو نما ہو نہیں سکتی۔ اور نہ دنیا سے سلب ونہب مٹ سکتا ہے۔ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ؕ ۝۳ (97:3)۔ اس پر تو ایک رات کیا ہزاروں مہینے قربان کیئے جا سکتے ہیں۔ اور یہ رات ایک آنے والے دور کا آغاز ہے۔ تاکہ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوۡحُ فِیۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ۙ ۝۴ (97:4) تاکہ بتدریج، منزل بہ منزل یہ کائناتی قوتیں اور یہ وحی زندگی کے ہر گوشہ میں قوانین خداوندی کا بتدریج امتزاج ہوتا جائیگا۔ کُلِّ اَمۡرٍ، زندگی کے ہر گوشہ میں تو نتیجہ کیا ہوگا'' سَلٰمٌ ۛ ''۔ زندگی کے ہر گوشہ میں امن وسلامتی اور تمام خطرات سے چھٹکارا مل جائے گا۔ سلب ونہب ختم ہوجائے گا۔ تنزیل ہے ۔ بتدریج، درجہ بدرجہ، آہستہ آہستہ، هِیَ حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ۝۵ (97:5) تا آنکہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور سورج نمودار ہو اور وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا (39:69) پوری کائنات فطرت کی قوتوں اور وحی کے امتزاج سے مطلع انوار بن جائے گی۔

❁❁❁

دنیا میں آنے والا جنتی دور

''سُورۃُ الزِّلْزَالِ (99)''

یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۝۴ (99:4) اقوام ماضی کی سرگذشتیں دہرائی جائینگی۔ جنت کا وہ دور سامنے آجائے گا۔ وَکُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا ۪ (2:35) زمین اس دور کو دہرائے گی۔ بیان کرے گی۔

❁❁❁

ڈاکوؤں کی کیفیت جو موجودہ سرمایہ داروں کی طرح لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں'
'سُورۃُ الْعٰدِیٰتِ (100)''

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ① (100:1) ذرا ان لوٹ مار والوں کو دیکھو کہ لوگ آرام کی نیند سو رہے ہیں یہ تیزی سے گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ سرپٹ دوڑاتے ہوئے فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ② (100:2)۔ اتنی تیزی سے کہ گھوڑوں کے سموں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔

فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ③ (100:3) یہ دور سے آکر صبح کے وقت حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ④ (100:4) ایسا گرد و غبار اڑاتے ہیں کہ لوگوں پر وحشت طاری ہو جائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ⑤ (100:5) اس طرح سونے والوں کی جمعیت کے اندر گھس کر طوفان مچا دیتے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ⑥ (100:6) اس زمانے میں عربوں کے ہاں یہ لوٹ مار عام تھی۔ یہ کس بات کی شہادت ہے کہ وحی سے محروم انسان تمام قوانین کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے بجائے اس کے کہ اپنی قوت تخلیق سے سامان رزق میں اضافہ کرے۔ دوسروں کی کمائی لوٹ کر اپنے لیے سمیٹنا چاہتا ہے۔ اس طرح یہ خدا کے نظام ربوبیت کا انکار کرتا ہے۔ یہ صرف ڈاکوؤں کی بات نہیں ہے۔ یہ تو صرف پیکر ہیں۔ روح اور ذہنیت تو ہر حال میں وہی کام کرتی ہے خواہ میں دفتر میں بیٹھا ہوا بڑا ہی ناتواں نظر آئے۔ اور جس کے ہاتھ میں قلم ہو اور سامنے کاغذ کا ٹکڑا تو وہ ہزار ڈاکوؤں سے بڑا ڈاکا ڈال سکتا ہے۔ یہ کیوں كَنُوْدٌ ہے۔ كَنُوْدٌ۔ تنہا خور جو سب کچھ اکیلا ہی کھا جائے۔ جو غلاموں سے دن بھر کام لے اور شام کو دینے کی بجائے پیٹنا شروع کر دے۔ وہ جو دوسرے محتاج کی مدد نہ کرے۔ ایسی سنگلاخ زمین جس سے کچھ پیدا ہی نہ ہو۔ اب جب یہ وحی کے بغیر ہو تو سب کچھ سمیٹ کر، مزدور کو معاوضہ کی بجائے الٹا مارے اور یہ ذہنیت جب آگے بڑھے تو قزاقی اور لوٹ مار پر آجاتی ہے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ⑦ (100:7) اور اس کی ذات خود اس پر شاہد ہوتی ہے یعنی اس کے کام اتنے برہنہ ہوتے ہیں کہ صاف نظر آجاتا ہے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ⑨ (100:9) کیا سے اس بات کا علم نہیں کہ قانون مکافات ہر پوشیدہ بات کو کرید کرید کر باہر نکال لاتا ہے۔

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ⑩ (100:10) اور اس کے اندرونی حالات کو بھی حاصل کر کے نمایاں کر دیا جائے گا۔

حق و باطل کا تصادم،تلواروں کی جھنکار میں

’’سُورۃُ الۡقَارِعَۃِ(101)‘‘

اَلۡقَارِعَۃُ ①(101:1) دو چیزوں کا آپس میں ٹکرانا۔کسی چیز کو دوسری چیز پر مارنا۔جیسے چقماق پر پتھر مارنے سے آگ نکلتی ہے۔تواس سے جو تباہی آئے۔اس کے لئے بولا جاتا ہے۔حق و باطل کا یہ تصادم جو جنگ کی صورت میں تلواروں کی جھنکار‘‘ کے لئے آیا ہے۔

قرع ڈالنا،لاٹریاں ڈالنا،استخارے:

قرعہ اندازی کی اصطلاح اسی سے ہے۔یہ پانسے یعنی قرع ڈالتے تھے۔تو ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ان معنوں میں قرآن میں یہ لفظ نہیں آیا اس کے لئے ازلام آیا ہے۔عرب عام طور پر پانسوں کی بجائے تیروں سے فال نکالتے تھے۔عقل وفکر کی بجائے استخارے سے فیصلہ کرنا حرام ہے۔عقل کے دیئے گل کر کے تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنا قرآن نے حرام قرار دیا ہے۔

اَلۡاَزۡلَامُ: ان سے مراد وہ تیر تھے جن سے عرب جاھلیہؔ میں فال نکالتے تھے۔

ان میں سے ایک تیر پر اِفۡعَلۡ(کر) اور دوسرے پر لَاتَفۡعَلۡ(نہ کر) لکھ کر تیسرا تیر خالی چھوڑ دیتے تھے۔

جب کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا کہ میرے لئے اس کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فال نکالو۔چنانچہ وہ قاعدے کے مطابق تیر نکالتے اور تیر کی تحریر سے فال دیکھ کر اسے بتا دیتے۔اگر خالی آتا تو دوبارہ نکالتے۔انہی تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی۔اور جوئے کے جانوروں کا گوشت بھی تقسیم کیا جاتا۔

(5:3) قرآن نے ان سب باتوں سے منع کیا ہے۔یہ تو اختیار وارادہ کو چھوڑ کر جبر کا راستہ ہے بجائے فہم وفراست کے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہے۔

اس لئے ان تمام باتوں سے منع کیا ہے۔جس سے عقل دب جائے۔اس سے تو وہ مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔قرآن تو عقل وبصیرت کی تربیت کرتا ہے۔اور حریت وآزادی کی تعلیم دیتا ہے۔اور وہ تمام باتیں جن سے عقل وخرد دب جائے اور آزادی سلب ہو جائے قرآن کی نظر میں حرام ہیں۔یہ تو پوری پوری آزادی دیتا ہے۔کہ حدوداللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے عقل وفکر سے کئے جائیں۔

اَقۡلَامٌ۔قَلَمٌ کی جمع۔جس سے لکھا جاتا ہے۔بے پھل اور بے پر کا تیر۔ان تیروں سے جو کھیلا جاتا تھا۔آلِ عمران میں ہیکل کے پجاری مریم کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی کرتے تھے۔

یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَھُمۡ (3:44)۔اقلام سے مراد قرعہ اندازی۔

زمانہ اور تاریخ کی شہادت

''سُورَةُ الْعَصْرِ (103)''

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ (103:1-2) یہ کسی انسان کی نہیں۔ بستی کی نہیں بلکہ عصر، نچوڑ، نچڑی ہوئی بات ہے۔ ہر دور اپنے ماضی کا نچوڑ ہوتا ہے۔ یعنی تاریخ میں پریڈ Age وہ عصر کہلاتا ہے۔ پچھلے ادوار کا نچوڑ۔ یہ تاریخ ہوتی ہے۔ ہمارا دور پچھلے ادوار کا نچوڑ ہے۔ تو یہ عصر ماضی کے تمام تجربات کا نچوڑ ہے۔ پوری انسانیت کے تجربات کا نچوڑ۔ اس پر شہادت دیتا ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ (103:2)۔ بغیر وحی کے انسان نقصان میں رہتا ہے۔ بجز آں کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣ (103:3) تَوَاصَوْا کے عام معنی تو تاکید کرنا۔ تلقین کرنا پہلا معنی تو یہ ہوا۔ یہ اجتماعی نظام میں ایک دوسرے کو تاکید کرنا۔ کہ تمہارا حق کیا ہے۔ فریضہ کیا ہے۔ معاشرہ میں حقوق و فرائض۔ ذمہ داریاں اور حقوق دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ پہلے فرائض کی ادائیگی پھر اس کے حقوق کا متعین ہونا۔ اب اس روش پر صبر یعنی مستقلاً چلنا ہے۔ وَتَوَاصَوْا (103:3) ایک دوسرے سے مل جانا۔ (رشتہ اتحاد کی قوت) یہ وَتَوَاصَوْا (103:3)۔ ان کے درمیان ایک ''Cementing Factor'' ہوگا۔ مشترک عنصر، حق اور صبر ہوگا۔ جماعتی زندگی ہوگی۔ انفرادی نہیں۔ اس راستہ میں تمام مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا۔

سرمایہ دارانہ ذہنیت

''سُورۃُ الْھُمَزَۃِ''

وَيۡلٌ لِّـكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ‏ ﴿۱﴾ الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ‏ ﴿۲﴾ (104:1-2) اب قرآن محسوس انداز میں ان تباہ ہونے والوں کی ذہنیت بتارہا ہے۔سورۃ التکاثر میں بتایا گیا تھا کہ جو مال و دولت اور جاہ و منصب کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ رکھتے ہیں یہ ہے وہ نظریہ جو زندگی کے نصب العین سے غافل کر دیتا ہے۔ان کے لئے تباہی ہے جو جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ‏ ﴿۲﴾ (104:2)۔مال جمع کر کے پھر ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے۔ساری تباہیوں کا موجب یہ فاضلہ دولت ہے۔ضرورت سے زیادہ۔متاع تو صرف استعمال میں لانے کے بعد بچتا ہی نہیں ہے۔تو بینک بیلنس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ایسی ذہنیت کو دولفظوں میں بیان کر دیا ہے۔لِّـكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ‏ ﴿۱﴾۔پھر ان میں ہر ایک کی یہ ذہنیت ہو جاتی ہے۔هُمَزَةٍ (104:1)۔ان کو کہیں دوسرے میں خیر نظر ہی نہ آئے۔وہ کسی کو انسان ہی نہ سمجھے۔هُمَزَةٍ (104:1)۔وہ جسے اپنے سوا کسی اور میں کوئی خوبی ہی نظر نہ آئے۔دوسروں کے بارے میں نفرت، حقارت، ذات اور تحقیر کی گفتگو کرنے والا۔خودسر سے پاؤں تک سارے عیبوں کا مجسمہ۔اگلی بات لُّمَزَةِ ﴿۱﴾ (104:1)۔عیب جوئی کرنا۔کچوکے دے دیئے جونہی کہیں دیکھے کوئی یونین بن رہی ہے۔اتحاد ہو رہا ہے تو ہر وہ ترکیب استعمال کرنا جس سے تفرقہ پیدا ہو جائے۔يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۚ‏ ﴿۳﴾ (104:3) اس کا مال اسے مصیبتوں سے بچائے گا۔یہ سمجھ کر کہ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہر وقت دوسروں سے نفرت اور حقارت کرتا رہتا ہے۔

❁❁❁

کفار کی طاقت اور گھمنڈ کا جواب

''سُورۃُ الْفِیْلِ (105)''

کہا یہ گیا ہے۔قریش سے کہ تمہاری تمام خفیہ تدابیر اور سازشیں اسی طرح ناکام بنادی جائے گی جس طرح اصحاب الفیل کی تمام سازش اور کعبہ پر حملہ ناکام بنادیا گیا تھا۔

حقائق:

مکہ پر چڑھائی ابرہہ نے کی تھی۔تاریخ کا قیاس ہے کہ ملکہ بلقیس سلطنت سباء کی ایک طاقتور حکمران تھی۔950ق م میں یہ سلطنت بغیر جنگ کے سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں قوانینِ خداوندی کے زیرِ نگیں آئی۔یہ سلطنت 1100ق م سے 115ق م تک اپنے انتہائی عروج پر رہی۔یہ سلطنت آج کے یمن، صومالیہ اور ایتھوپیا پر مشتمل تھی۔115ق م میں Himaris (ہمائریز) کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔یہ جنگجو 300 سال تک حکمران رہے۔ان کے بعد دوسرے قبائل نے ان کا کنٹرول سنبھال لیا۔بعد ازاں 525ء میں ایتوپیا۔ابی سینیا کی عیسائی سلطنت نے ان کو شکست دی ابرہہ کو یمن کا گورنر بنادیا گیا۔اس نے 550 اور 555ء کے دوران یمن میں صناء کے مقام پر ایک عالیشان گرجا بنوایا۔اور کعبہ کی تقدیس اور شہرت کو کم کرنے کے لئے ہمسایہ ممالک اور اقوام کو کعبہ میں حج کرنے کی بجائے اس گرجا میں آکر حج کرنے کی دعوت دی۔ناکامی پر اس نے کعبہ کو گرانے کا فیصلہ کرلیا۔وہ ساٹھ ہزار کی فوج، گھوڑے، اونٹ اور ہاتھیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔یہ 550ء کا واقعہ ہے۔یہی سال حضور ﷺ کی ولادت کا سال ہے۔تاریخ میں اسے عام الفیل'' کہتے ہیں۔ابرھہ کو تین مقامی عربوں نے خفیہ راستے سے حملہ کا کہا تھا۔چونکہ دھوکہ اور غداری کرنے والوں کو عرب حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔انہوں نے مکہ کے باہر ''منا'' میں ان تین آدمیوں کے تین مجسمے بنادیئے۔اور اظہار نفرت وحقارت ان پر ہر سال پتھر برسانے لگے۔آج تین غداروں کے وہی ستون نصب ہیں۔جن کو چھوٹا بڑا اور درمیانہ شیطان کہا جاتا ہے۔اور حجاج کرام ان کو پتھر مارتے ہیں۔تاکہ معلوم رہے کہ غدار کا یہ انجام

ہوتا ہے۔ یہ واقعات عرب شعراء کی زبانوں پر زبان زدخلائق تھے۔

مکّہ والوں کی حفاظت کا سامان اور سورۃُ الفیل (105):

پرندوں کی پرواز نشاندہی کا باعث ہے۔ چیلوں اور گدھ کی جبلت میں ہے کہ بہت بڑا قافلہ یا لشکر اگر جار ہا ہو تو وہ اس کے ساتھ ساتھ اوپر اڑتے چلے جاتے تھے۔ ان کو معلوم ہے کہ یہ قافلہ جہاں قیام کرے گا تو وہاں کھانے پینے کو ملے گا۔ اور فوج ہو تو لڑائی کے بعد گدھوں اور چیلوں کی موج ہے۔ اتنا زیادہ سامان اور خوراک ذخیرہ تو اور کہیں بھی ان کو نہیں مل سکتا تھا۔ یہ چیز ان کے شعراء کے کلام میں موجود ہے۔ ان عربوں کو اگر اس طرح گدھ اور چیل اڑتے ہوئے نظر آئیں تو ان کو معلوم ہو جاتا تھا کہ کوئی جم غفیر آ رہا ہے۔ پرانے زمانے میں شہروں کے گرد پہاڑیوں پر بڑے بڑے پتھر اکٹھے کر کے ان کے آگے لکڑیاں لگا رکھتے تھے۔ تو کہیں دشمن آ جائے تو اوپر جا کر اس رسہ کو کاٹا تو اوپر ہزاروں من کا پتھر آ کر نیچے کچومر کر کے رکھ دیتا تھا۔

اس طرح اس فوج کا بھرکس نکل گیا اور ان کی سازش ناکامی سے دوچار ہوگئی۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ (105:2-3) ابابیل کے معنی جھنڈ کے جھنڈ۔ یہ پرندوں کا عمل نہیں تھا تو ان کے جھنڈ کے جھنڈ سے تمہیں معلوم ہوگیا۔ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ (105:4) چڑیوں نے کنکریاں نہیں ماریں۔ یہاں تَرْمِيْهِمْ (105:4)۔ اس کا فاعل وہی ہے جو اَلَمْ تَرَ کا ہے۔ تم نے ان پر بڑے بڑے پتھر کی بارش برسادی۔ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ (105:5) اس طرح لشکر کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو گیا۔ ان کا کچومر نکل گیا۔ قریش کو کہا گیا کہ جب اتنے بڑے لشکر کو شکست مل گئی تو تم کس گنتی میں شمار ہو۔ تمہاری ساری تدابیر ناکام ہو جائیں گی۔

❁❁❁

اللہ کی اطاعت سے پہلے سامانِ زیست اور امن لازمی اجزا ہوتے ہیں

''سُورۃُ قُرَیۡشٍ (106)''

لِاِيۡلٰفِ قُرَيۡشٍۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِۚ﴿۲﴾ فَلۡيَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِۙ﴿۳﴾ الَّذِىۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ﴿۴﴾ (106:1-2-3-4) اس تصادم کی وجہ بتائی جارہی ہے۔ کہ تمہارے اندر سے یہ جماعت کھڑی ہوئی ہے۔ جس کو نہ نسلی تعصب ہے نہ ذاتی مفادات۔

ہر نظام کا ایک محسوس مرکز ہوتا ہے:

دین اپنے نظام کے لئے ایک مرکز مقرر کرتا ہے۔ وہاں اجتماعات ہوتے ہیں۔ وہاں مشاورت ہوتی ہے۔ اور حج کا مقصد یہ ہے کہ تمام نوع انسانی کو دعوت دی جائے تاکہ وہ اپنے اختلافات تلوار کی بجائے حجت یعنی دلیل کے ذریعہ طے کریں۔ اور آ کر خود آنکھو سے دیکھ لیں کہ لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ (22:28) اس میں ساری دنیا کو دعوت عام تھی۔ مسلمان صرف اس اجتماع کا انتظام کرنے والے تھے۔ اور یہ مرکز محسوس تھا۔ جس طرح ماسکو کمیونزم کا۔ نیو یارک سرمایہ دارانہ نظام کا مرکز ہے۔ یہ ان نظاموں کے محسوس مراکز ہیں۔ اب دین مذہب میں تبدیل ہوا تو یہ سارے مراکز یاترا کے لئے مندر بن گئے۔ سب انبیاء نے آ کر یہ مراکز قائم کیے تھے۔ یہ یروشلم کے راستہ بیت المقدس کے مرکز، اس نظام کے غماز ہیں۔ یہودیوں کی تاریخ پڑھیں۔ یہ ان کے ہاں قومی مراکز تھے۔ وہاں ان کی سلطنتیں قائم تھیں۔ یہ ان کے دارالخلافے تھے۔ ان کی قوم کے اجتماعی مراکز تھے۔ جب وہ قوم کی اجتماعیت ختم ہوگئی تو یہ نظام کے مراکز وہ یاترا (Pilgrimage) کے لئے مندر بن گئے۔ ہیکل بن کے رہ گئے۔ ان کا نام ہی ٹیمپل ہو گیا۔ ہندوؤں کے ہاں بھی یہ انبیاء آئے ہونگے۔ انہوں نے تو دین کے مراکز بنائے تھے۔ انہوں نے بعد میں ان کو یاترا کے مندر بنا دیا۔ کچھ رسومات ادا کر دیں کہ مقصد پورا ہو گیا۔ اور اس طرح دین کے شعائر اور ارکان سارے کے سارے مذہب کی رسومات بن گئے۔ قریش نے بھی کبھی کعبے کو یہی کچھ بنا رکھا تھا۔ اور مندر بن گیا۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی یہ مندر اور ان کے مہنت ہیں۔ ان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ بڑا مال و دولت اور عیاشی کی زندگی۔ یورپ کے چرچ سے بادشاہ قرضہ لیا کرتے تھے۔ مہنت کسی قوم کا ہو۔ اس کے پاس دولت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ خدا کے گھر کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں۔ جتنی بڑی مسجد ، مندر، گرجے، گردوارے، اتنی بڑی آمدنی۔ یہ سارے مفاد قریش کو بھی حاصل تھے۔

سب سے بڑی نعمت اَلۡکَوۡثَرَ کی صورت میں یعنی قرآن

''سُوۡرَۃُ الۡکَوۡثَرِ (108)''

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴿۳﴾ (108:1-2-3) قرآن نے ''کثرت اور کثیر'' کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے۔زیادہ سے زیادہ جو ان کی زبان کہہ سکتی تھی اس سے بھی زیادہ کہنے کے لئے یہ لفظ ''اَلۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾'' استعمال کیا ہے۔وَ مَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ؕ (2:269) جس کو حکمت دیدی گئی تو سمجھ لو کہ اسے خَیۡرًا کَثِیۡرًا ؕ (2:269) دیدیا گیا۔خیر مال کو بھی، بھلائیوں کو بھی کہتے ہیں۔اور کثرت سے دیا جاتا ہے۔اس کو بھی کہتے ہیں۔قرآن کو خدا نے الحکمت کہا ہے۔یعنی ایک تو الکوثر'' دیا قرآن حکمت ہے۔اور عمل کرنے کا نتیجہ خود خیر کثیر ہے۔بڑی فراوانی سے اور کثرت سے دیا ہے۔

اب یہ بیچارگی کے عالم میں مدینہ میں پناہ لی جارہی ہے۔جہاں یہودی چھائے ہوئے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ یہ ہمارے پاس غلام کی حیثیت سے آئینگے۔صلوۃ سے مراد فرائض منصبی ادا کرتے جاؤ۔فرائض منصبی کی تکمیل صلوۃ کہلاتی ہے۔اِبۡ وَ انۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ (108:2) سے انہوں نے ترجمہ کردیا۔قربانی کر۔پھر کہتے ہیں قربانی واجب ہے۔سنت ہے مگر فرض نہیں۔

نَحۡرٌ۔سینہ کا اوپر کا حصہ مقام۔اس کے کئی معنی ہیں۔سینے پر ہاتھ باندھنا۔چھاتی نکال کے چلنا۔سینے تک ہاتھ لے جانا۔اونٹ کا ذبح کرنا یوں کہ اسے لٹا کر چھری نہیں پھیرتے۔بلکہ وہ کھڑے کھڑے اس کے اس مقام میں نیزہ گھونپتے ہیں۔اس طرح اونٹ کو ذبح کرنے کو بھی کہتے ہیں۔لیکن یہ صرف اونٹ کو ذبح کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔بھیڑ بکری کے ذبح کرنے کے لئے نہیں۔اگر اس کے معنی ذبح کرنے کے ہیں تو وہ صرف اونٹ کے ذبح کرنے کے ہیں۔اور چونکہ یہ سینے کے اوپر کا سارا مقام ہے جہاں انسان کا علم ہے۔اس لئے اس کے معنی ''کسی معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور و غوض کے بعد اس پر حاوی ہوجانا'' بھی ہے۔اب اس حالت میں جارہے ہو تو گھبرانا نہیں۔خیر کثیر ملے گا۔کرنا یہ ہے فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ (108:2) اپنے فرائض کی سرانجام دہی کرتے چلو جاؤ اور تمام امور پر غور و غوض کے بعد ان پر حاوی ہوتے چلو جاؤ۔

اونٹ کو ذبح کرنے میں مصلحت بھی تھی:

جس طرح انڈیا میں ہندوؤں کے ہاں گائے کا ذبح کرنا حرام تھا۔جبکہ مسلمانوں کے ہاں حلال۔مگر ان کو اجازت نہیں۔فرض کریں اگر لٹے پٹے مسلمان ہندوستان میں پناہ لینے جارہے ہوں۔اوران سے کہاجائے کہ وہاں جاکر سب سے پہلے گائے ذبح کرو۔اس سے مقصد یہ ہے کہ ہم تم سے قطعانہیں ڈرتے۔ہم تمہارے غلام نہیں رہینگے۔بلکہ اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھااور یہ بے کس و بے بس مہاجراور یہودی خوش ہورہے ہیں کہ اب پناہ گزینوں کی حیثیت سے ہمارے قابو میں ہیں۔اوران کو کہایہ جارہا ہے کہ یہودیوں سے کوئی مصالحت نہیں ہوسکتی۔دب کرصلح کرنا بے معنی بات ہوگی۔وہاں جاکر دھڑلے سے اونٹ ذبح کروتا کہ ان کو پتہ چل جائے کہ یہ دب کرنہیں آئے۔ایک لفظ کے اندر ساری سیاست قرآن نے کھول کرر کھ دی۔وہاں جاکر جومشترکہ شہری ہونے کی حیثیت سے معاہدہ کیا ہے۔وہ برابری کا ہے۔اس میں مسلمانوں کا ہاتھ غالب ہے۔مدینہ کوتو اس نظام کا اولیں گہوارہ بننا ہے۔اس لئے وہاں جاکر دبنا نہیں۔دھڑلے سے جاؤ۔وہاں جو گروہ غالب ہے۔وہاں دھڑلے سے اونٹ ذبح کروتا کہ اس سے ان کو اندازہ ہوجائے کہ یہ دبنے والے نہیں۔ان کے ہاں مہمانوں کی تواضع جوبہترین کھانے سے کی جاتی تھی وہ اونٹ کا گوشت ہوتا تھا۔

مشرکوں سے لاتعلقی کا اعلان

''سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ (109)''

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ① لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ② (109:1-2) اعلان کرایا جا رہا ہے۔ جب مکہ سے یہ بے چارے جان بچا کر بھاگ رہے ہیں کہ اے وہ کہ اے اقدار خداوندی سے انکار کر رہے ہو سرکشی برت رہے ہو تم اپنے ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ تم نے بڑی کوشش کر لی کہ میں مصلحت کر لوں مگر یاد رکھو لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ② (109:2)۔ تمہاری اور ہماری منزل الگ الگ اور راستے الگ الگ ہیں۔ میرا معبود الگ اور تمہارا الگ۔ منزل بھی الگ الگ، راستے بھی الگ الگ۔ تم عبادت سے کچھ اور مفہوم لیتے ہو میں کچھ اور۔ تمہارے معبود خود تراشیدہ جبکہ میرا خالق کائنات۔ بھلا میں ان تراشیدہ معبودوں کے احکام کی تعمیل کیسے کر سکتا ہوں؟ اگلی آیات میں کہا وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ③ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ④ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ⑤ (109:3-4-5) عجیب الفاظ ہیں مگر صیغے بدلے ہوئے ہیں۔ اور اسی میں سمجھنے کی بات ہے۔ کہا کہ لَآ اَعْبُدُ (109:2) مستقبل میں بھی سن لو کہ جو جی میں آئے کر لو میں نے ان کی محکومیت اختیار نہیں کرنی۔ یہ مومن کا نعرہ ہے۔ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ② (109:2) یہ مستقبل کا صیغہ ہے۔ جو جی میں آئے کر لو ان نظریات کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ جن کی تم کرتے ہو۔ اور تجربہ نے بتا دیا ہے کہ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ③ (109:3) نہ تم ہمارے اس نظریہ کی اطاعت کرنا چاہتے ہو جو ہم کرتے ہیں۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ④ (109:4) اور نہ میں زندگی میں کبھی کرونگا۔ مَّا عَبَدْتُّمْ ④۔ دلیل یہ ہے کہ جو تم زندگی میں کرتے تھے میں نے کبھی نہیں کیا۔ میں نے تو نبوت سے پہلے بھی نہیں کیا تھا چہ جائیکہ دعوت کے بعد یہ کچھ کر لوں۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ⑤ (109:5) حالات بتا رہے ہیں کہ تم کبھی اس نظام کی طرف آنے والے نہیں اس لئے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ⑥ (109:6) تمہارے اعمال کا نتیجہ تمہارے لئے اور میرے اعمال کا نتیجہ میرے لئے۔ دین سے مراد اعمال کا نتیجہ۔ دوسری جگہ بھی ہے۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ㊶ (10:41)
یہاں دین سے مراد مکافات عمل نہ کہ تمہارا دین تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے۔ اور وہ نتائج ۷ سال کے قلیل عرصہ میں مل گئے تھے۔ ساری دنیا نے مشاہدہ کر لیا تھا۔

سماوی اقدار اور انسانی محنت کا امتزاج

''سُورَۃُ النَّصۡرِ (110)''

حق و باطل کا یہ معرکہ قرآن کے ہر ورق پر مسلسل چلا آ رہا تھا۔ آخری الٹی میٹم سورۃ الکفرون میں دیدیا گیا تھا۔ کہ اس کے بعد ہمارا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اس لئے لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ﴿۶﴾ (109:6)۔ اب تمہاری اس روش کا نتیجہ تمہارے سامنے آئے گا اور میرے پروگرام کا نتیجہ میرے سامنے۔ گویا اب وہ کھیتی جس کی تخم ریزی 23 سال پہلے کی تھی، کے بار آور ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ اس لئے الٹی میٹم کے بعد اب یہ کہا جا رہا ہے اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ﴿۱﴾ (110:1) ذرا سوچئے وہ کسان جس نے چھ ماہ یا نو ماہ پیشتر اتنی محنت سے زمین کو سنوارا تھا اور تخم ریزی کی تھی پھر اس کی محنت اور مشقت کا یہ عالم کہ ہر صبح درانتی اور رسی لیکر کھیت میں چلا جاتا تھا۔ سارا دن دھوپ، گرمی سردی اور بارش میں کام کرتا اور شام کو خالی ہاتھ واپس آ جاتا تھا۔ ایک دن نہیں دو دن نہیں، سال نہیں بلکہ مسلسل زندگی کا ایک طویل ترین حصہ گزار دیا ہو اس کے دل کی کیفیت کیا ہوگی۔ حضور ﷺ کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ بارالہا! میری زندگی اس تگ و تاز ہی میں گزر جائے گی۔ اور میں اپنی محنت کے ثمرات کو سامنے بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہاں کہا گیا کہ فطرت کے قوانین اٹل ہوتے ہیں۔ وہ کسی کے جذبات کی رعایت نہیں کرتے۔ اس مہلت کے عرصہ میں کسی کے لئے تخصیص نہیں ہوسکتی۔ تمہارا محنت کرنا ہے۔ یہ فصل کب کٹنے کے لئے تیار ہوگی۔ اس کا فیصلہ ہمارے قوانین کی رو سے ہوگا۔ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ ﴿۴۰﴾ (13:40) یہ کتنی خوش بختی تھی کہ اس داعیٔ انقلاب کی زندگی میں وہ فصل پک گئی۔ اس پروگرام کی ریت بھی نرالی ہے۔ دنیا کے ہر پروگرام میں کامیابی کی گھڑی آنے کے بعد پروگرام ختم ہو جاتا ہے۔ فصل پک گئی اناج گھر لانے کے بعد یہ فصل کی مدت ختم۔ اس کے بعد کچھ اور کرنا باقی نہیں رہتا۔ مگر یہاں تو

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

جنت بھی آخری مقام نہیں ہے ارتقاء کا۔ وہ تو ستانے کا مقام ہے صرف

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا\
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اَور نہیں

اب یہاں سے ایک نیا پروگرام دیا جارہا ہے۔اس کے لئے دو الفاظ ہیں۔اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ (110:1)۔نصر کے معنی ہم نے مدد کے کئے اور مدد کے متعلق یہ تصور کیا کہ وہ کچھ غائبانہ طور پر ہوتی ہے۔یہاں وہ معنی اس انداز میں نہیں ہیں۔نصرت سے مراد''بھرپور بارش کا برسنا''جو اس کے قانون کے تابع ہوتی ہے مگر فائدہ صرف اسی ملتا ہے جس نے مہلت میں زمین کو سنوارا ہو۔بارش اور زمین کے درمیان ایک رابطہ قائم کیا جائے تاکہ وہ آئے اور یہ اسے اپنے سینوں میں سما دے۔اس کے مطابق کسان محنت کرے تو تب فصل پکتی ہے۔بارش کا یہ کام ہے۔

سمادی اقدار اور انسانی محنت کا امتزاج:

زمین تیار کی اور بیج ڈالا۔بڑی محنت ہوئی عین وقت پر بارش ہوئی۔اب سمادی اقدار اور انسانی محنت کے امتزاج سے صحیح نتیجہ برآمد ہوا۔یہ ہے خدا کی تائید۔نصرت یا مدد۔صرف اقدار سمادی جس کے ساتھ انسانی محنت نہ ہو تو خود کوئی نتیجہ برآمد نہیں کرتے۔اور اگر محنت اقدار خداوندی کے تحت نہ ہو تو وہ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ (18:105)۔باطل اور رائیگاں چلا جاتا ہے۔اس کے بعد کہا وَالۡفَتۡحُ ۝۱ۙ (110:1)۔اب فتح کا جو تصور ہمارے ہاں ہے وہ نہ تو قرآن کا تصور ہے اور نہ عربی مبین کا۔اگر معنی ان الفاظ کے مطابق متعین کر دیئے جائیں تو سارے مطلب واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی غلط ہے۔یہ تو ایک مسلسل پروگرام ہے جس کا سلسلہ تو آگے بھی چلنا ہے۔وَالۡفَتۡحُ ۝۱ۙ (110:1) کے معنی جو دروازے پہلے بند تھے اب کھول دیئے گئے ہیں۔اب یہ قافلہ منازل طے کرتا ہوا آگے جانا چاہتا تھا۔مگر راستے میں موانعات تھے۔مخالف قوتوں نے اس سفر کے تمام دروازے بند کر رکھے تھے۔مزاحمات کی شکل میں۔اب تمہاری مسلسل کاوشوں سے قوانین خداوندی کے تحت یہ تمام رکاوٹیں دم توڑ گئی ہیں۔یعنی دروازے جو بند تھے اب وہ کھل گئے ہیں۔

ہر مقام سے آگے مقام ہے تیرا:

اب دروازے کھلنے سے تو آخری منزل نہیں آجاتی۔اس کے بعد تو ایک نیا سفر درپے ہوتا ہے۔یہ ہے ارتقاء۔نئے نئے راستوں سے منزل بہ منزل آگے بڑھتے جانا۔اب نصرت خداوندی یہ ہے کہ تمہاری محنتیں اسی کے قوانین سے ہم آہنگ ہوگئیں۔تو اس سے ہوا یہ ہے کہ تمام رکاوٹیں دور ہوگئی ہیں اب دروازے کھل گئے ہیں۔آگے بڑھو۔وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۝۲ۙ (110:2) اب دروازے کھلنے سے کیا ہوا کہ لوگ فوج در فوج اس نظام میں داخل ہورہے ہیں۔فوج''سے مراد ہجوم کر کے تیزی سے اندر آجانا''دروازے کھلنے سے یہ ہوا ہے۔اب یہ کونسی چیز تھی جس سے لوگ فوج در فوج داخل ہورہے تھے۔یہ ہے سوچنے کا مقام!

تبلیغ کچھ کام نہیں دیتی:

زبانی تبلیغ کچھ کام نہیں کرتی۔کہا جاتا ہے کہ تبلیغ سے ہزاروں مسلمان ہوگئے۔یہ تبلیغ تو کسی کام کی نہیں ہے۔مغرب کے بڑے بڑے مفکر کے سامنے جب خالص قرآنی نظام حیات پیش کرو تو کچھ ہی دیر میں وہ مطمئن ہوجاتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ اس

پروگرام کو سامنے لانا چاہیے۔اور ہمیشہ ایک اعتراض کیا کہ پھر مسلمانوں کی یہ ذلت اور پستی کیوں ہے؟ قرآن تو اَعْلَوْنَ بتا تا ہے۔اچھے اچھے مفکر بھی اگر مطمئن ہو جائیں تو وہ اس قوم میں داخل ہونا کبھی پسند نہیں کریں گے۔ان کو معلوم ہے کہ جوان کا حشر ہوا ہے وہ ہمارا بھی ہوگا۔پھر وہ کیسے اس دین میں آسکیں گے۔یہ جوفوج درفوج آئے تھے۔یہ اسی لیے کہ انہوں نے اس نظام کے درخشندہ نتائج دیکھ لئے تھے۔کہ کس طرح یہ کھجوروں پر گزارا کرنے والی قوم اس قرآن پر چل کر دنیا کی بے مثال قوم بن گئی تھی۔تو پھر پھاٹک کھل جاتے ہیں۔اور يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ‏ (110:2) اس کے بعد کسی تبلیغ کی ضرورت نہیں رہتی۔''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' یہ ہے وجہ کشش جو ساری دنیا کو کھینچ کر آتی ہے۔زبانی کوئی شخص آپ کی باتوں پر یقین نہیں کرے گا۔آج تو اس قوم میں کوئی کشش ہی باقی نہیں ہے۔تو کیوں کوئی آئیگا۔حج کی تو پکار ہی یہی تھی۔اس نظام کے مرکزی اجتماع یعنی ساری انسانیت کو یہ دعوت دی گئی کہ آؤ۔کاہے کے لئے لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ (22:28) تا کہ وہ آنکھوں سے دیکھ لے۔کہ یہ نظام انکی منفعت کے لئے کیا کچھ کررہا ہے؟ جب وہ ان درخشندہ نتائج کو دیکھے گا تو پھر کوئی پاگل ہوگا جو اس نظام میں داخل نہ ہو۔یہ زبان سے کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔اس کے حسن اور خوشگوار ثمرات خود انسان کو کھینچ کر اس طرف لے آتے ہیں۔تو پھر لوگ فوج درفوج اس میں داخل ہونگے۔اب فتح تو ایک نئی منزل کے لئے دروازے کھل گئے ہیں۔جب نصرت خداوندی بھی ہو فتح بھی حاصل ہوجائے اور دنیا فوج درفوج داخل ہوجائے تو فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ (110:3) اس پروگرام کو مزید حمد ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل ہوجاؤ

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اسے چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

اگلی منزل اس فوج درفوج کی تعلیم وتربیت واستحکام ہے:

اس فتح ونصرت کے بعد دو دن بھی تفریح کے لئے نہ ملے۔(Recreation) اس سے ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی۔فَسَبِّحۡ (110:3)۔تو اس میں اور شدت سے مصروف کار ہوجاؤ۔کامیابیوں کے بعد گھاٹیاں بڑی لغزش آمیز ہوا کرتی ہیں۔وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ (110:3)۔ تو ان خطرناک گھاٹیوں سے بچنے کے لئے سامان حفاظت طلب کرتے رہو۔اب اس نظام کو برقرار بھی رکھنا ہے۔استحکام بھی دینا ہے اور اسی فوج کی تعلیم وتربیت کا خیال بھی رکھنا ہے۔اس وسیع اور شاندار مملکت کو جو اس قدر کاوشوں اور قربانیوں سے سینچا ہے اس قیام واستحکام کیلئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا ہوگی۔اور لغزشوں سے محفوظ رہنے کے لئے اس فوج درفوج ہجوم کی تربیت بھی کرنا ہوگی۔

قوموں کی تباہیاں تو کامیابی کے بعد آتی ہیں:

جدوجہد اور کوشش کے دوران اتنی خطرناک گھاٹیاں نہیں ہوا کرتیں۔جتنی کامیابیوں کے بعد آتی ہیں۔اس وقت تو منزل

1043
سے قریب ہونے کے لئے ایک جوش، ولولہ، حرارت ہوتی ہے۔خوف ہوتا ہے۔ جو کام کے لئے سرگرم عمل رکھتا ہے۔لیکن منزل پانے کے بعد وہ اپنے عناصر اضمحلال پیدا کر کے تباہ ہو جاتی ہے۔اس لئے وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ (110:3)۔اس لئے اپنے لئے قانون خداوندی سے زیادہ حفاظت طلب کرو۔ یہ ہے وہ منزل جہاں اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳ (110:3)۔تو دیکھئے گا کہ اس پروگرام تو نے حصہ شامل کرلیا۔تو قانون خداوندی زیادہ تیزی سے تمہاری طرف لوٹ کرآئیگا۔حقیقی کامرانی کا راز اقدار خداوندی میں مضمر ہے۔

دیکھو نتیجہ ان کاوشوں کا! تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ ۝۱ (111:1) اب دیکھو معاملہ اختتام پذیر ہو گیا۔اس نظام کے سب سے بڑے مخالف ابولھب کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔

باطل نظام کی شکست کا اعلان

''سُورۃُ اللَّھَبِ (111)''

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ② سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③
وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ⑤ (111:1-2-3-4-5)

ابی لہب جو اس نظام کا مخالف تھا۔اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔آخری شکست مل گئی۔ان سب مخالفتوں کا انہدام ہوگیا۔قرآن نے نام نہیں لیا صرف کنیت سے پکارا ہے۔یہ حضور ﷺ کے چچا عبدالعزی بن عبدالمطلب کی کنیت ابولہب تھی۔جو کسی دوسرے کی نہ سنے۔یہ ہے ہر زمانے کی مذہبی پیشوائیت۔جس کا یہ نمائندہ تھا۔اَبِيْ لَهَبٍ (111-1)۔یعنی ''شعلوں کا باپ'' اس کی بیوی عروی اُمّ جمیل بن حرب بن اُمیہ جو ابوسفیان کی بہن تھی۔یہ دونوں رسول ﷺ کے شدید مخالف تھے۔یہ رات کو رسول ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھاتی تھی۔اور پروپیگنڈہ کرتی رہتی تھی۔اس نے گلے میں خوبصورت ہار پہنا ہوتا تھا جس پر بڑا فخر کرتی تھی۔یہ سورہ میں کھجور سے بٹا ہوا ہار ہے غالباً اسی کی طرف اشارہ ہے۔ابولہب مکہ کا چیف پروہت تھا۔یہ نظام خداوندی کی مخالفت کا سمبل تھا۔اس انقلاب سے اس پر براہ راست ضرب پڑتی تھی کیونکہ پیشوائیت خطرے میں تھی۔یہ مذہبی پیشوائیت جو نظامِ سرمایہ داری اور ملوکیت کی پشت پناہی کرتی ہے۔یہی ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ داری، فرعون، یا ہامان، قارون انسانیت کے تین بڑے شکاری۔

کعبے کے متولیوں کی بندر بانٹ:

یہ کعبہ کا متولی تھا۔کعبہ میں جتنی بھی چیزیں آتیں تو ان تمام متولیوں میں تقسیم ہوجایا کرتی تھیں۔یہ ان کا سربراہ تھا۔کیفیت یہ تھی کہ ایک بار سونے کا ہرن چڑھاوا چڑھایا گیا۔وہ اسے چوری کر کے لے گیا۔جس طرح محکمہ اوقاف کی جائیدادیں ابھی تک ان متولی خاندانوں کے قبضہ میں ہیں۔اب جو محنت کر کے نہ کھائے۔وہ بے حمیت اور بزدل ہوتا ہے۔حالانکہ عرب جنگجو اور بہادر تھے۔مگر اس کی حالت یہ تھی کہ ایک شخص نے ابولھب کا قرضہ دینا تھا اس کے پاس دینے کے لئے روپیہ نہیں تھا۔تو اس سے کہا کہ جاؤ جنگ بدر میں میری طرف سے جا کر لڑو اور مرنے کے لئے بھیج دیا۔جنگ بدر کے چند دنوں بعد ایک متعدی مرض میں مبتلا ہوا۔بیٹے

1043

اور بھائیوں کے ساتھ سلوک کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اسے دفنانے کے لئے بھی لیکر نہیں گئے۔ چند حبشی مزدور کرائے پر لیکر اسے ایک گڑھے میں ڈال آئے۔ خود ان کی اولاد بھی ان سے نالاں رہتی ہے۔ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾ (111:5)۔ عربی میں گردن کو حلق'' بھی کہتے ہیں۔ اور جو گردن سرفرازی اور اکڑ والی ہو۔ اسے اپنے شرف و مجد اور سرفرازی پر ناز ہو تو ایسی گردن کو جِيْدٌ '' کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اس گردن کے لئے حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾ (111:5) کہا ہے۔ ''مونج کی رسی'' کھجور کے پتوں سے بٹی ہوئی رسی'' اس میں تذلیل کا پہلو ہے۔ ایسی گردن جو کسی کے سامنے نہ جھکی ہو۔ سرفرازیوں اور اکڑ والی گردن اس کی یہ حالت ہو گی کہ یہ لوگ ذلیل ترین غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اب یہ حیرت انگیز نظام اور اس کی کامیابی جس کو یورپی مصنّفین کہ جنگ کی حکمت عملی اور پولیٹیکل نقشہ یوں بنایا کہ کامیابی مل گئی۔ مگر قرآن اس کی وجہ، اسباب و علل کی حقیقی بنیاد اگلی سورۃ اخلاص میں بتاتا ہے۔

خدا کا صحیح تصوّر

''سُورۃُ الاخلاص(112)''

کامیابی کی اسباب وعلّل کی حقیقی بنیاد:

قرآن یہاں پہنچے کے بعد نگاہوں کا رخ ایک اور حقیقت کی طرف پھر دیتا ہے۔ کہ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا عالم سباب ہے۔ اسباب وعلل کی ضرورت ہے اگر صرف یہ چیزیں کافی نہیں ہوسکتیں۔ اس کامیابی کے لیے ایک بنیاد اور ہے اگر اس بنیاد کے اوپر یہ اسباب وقتی طور پر تو کچھ کامیابیاں دے سکتی ہیں لیکن ایسا نقشہ اس نظام جیسا مرتب نہیں ہو سکے گا۔ اصل چیز ایمان ہے۔ خدا پر ایمان مگر خدا کے صحیح تصور پر ایمان۔ خدا پر ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو صحیح طور پر کچھ لیا جائے تو پھر اسلام سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اسی سے مذہب اور دین کا فرق اور ایک دوسرے سے الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ ایک چیز خدا کے صحیح تصور پر ایمان ہے وہ کیا تصور ہے جس کی رو سے خدا کو ماننا صحیح ماننا کہلاتا ہے۔ قرآن کی تعلیمات کا نقطہ ماسکہ خدا کا صحیح تصور ہے۔ مذہب میں آ کر یہ سارا تصور بدل دیا جاتا ہے۔ وہ سب سے خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (2:137) یہ ہوگا ایمان خدا پر صرف کہہ دینے سے کہ میں خدا کو مانتا ہوں، کوئی بات ہی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ تم کسی قسم کے خدا کو مانتے ہو؟

مذہب میں خدا کا تصوّر:

ایک خدا مذہب کے تصور والا ہے۔ جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ، نہ قانون نہ آئین، نہ دستور، وہ تو لا پرواہ ہے جو چاہے کرے۔ اب جو جی میں آئے کہتا ہے اور تھوڑی دیر بعد کچھ اور کر دیتا ہے اسے راجہ رنجیت سنگھ بنایا ہوا ہے۔ (1730:1839) اسے پھانسی دیدو۔ اسے جاگیر بخش دہ۔ بقول سعدی ؎

نازک مزاج شاہاں تاب سخن نہ دارد

مذہب میں کہا گیا اَلسُّلْطٰنُ الْعَادِلُ ظِلُّ اللهِ عَلَى الْاَرْضِ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت انہوں نے خدا کو اس زمین کے بادشاہ کا سایہ بنا رکھا ہے جس قسم کا بادشاہ اس قسم کا ذرا بڑھا کر خدا بنا دیا۔ ہندوؤں کے ہاں راون کے دس

سر ہونے چاہیں ۔کالی دیوی کے چار ہاتھ ۔کیونکہ قتل عام ایک ہاتھ سے نہیں ہوسکتا اس لیے اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں ۔انسانی ذہن نے جس قسم کے انسان دیکھے جب ایسا خدا بنانا چاہا تو اس کو اس ذرا بڑا بنا کر دکھا دیا ۔ مذہب یہ کرتا ہے وہ انسان کو (megnify) کرکے ذرا بڑھا کر بنا دیتے ہیں ۔گو یا وہ تخت حکومت پر بیٹھا ہوا ہے ۔یہاں بادشاہ بھی تخت پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے ۔اس کے اردگرد امیر،وزیر،مشیر سارے کے سارے بیٹھے ہوئے ہیں ۔باہر دربان کوئی اس تک براہ راست نہیں پہنچ سکتا ۔وہاں تک جانے کے لیے وسیلہ کی ضرورت ہوتی ہے مقربین کی سفارشیں ڈلوانی پڑتی ہیں ۔عرضیاں دینی پڑتی ہیں ۔ان کو نذرانہ دینا ہوتا ہے ۔اس کے حضور میں قصیدے گزارنے پڑتے ہیں ۔وہ ہی نقشہ ہے جو ایک مستبد شہنشاہ کا ہے ۔یہ ہے تصور خدا کا ۔اور انسان کی کیفیت یہ ایک مستبد کے سامنے جیسے رعایا ہر وقت ڈرتی ،کانپتی رہتی ہے ۔ایسا خدا ماننے میں انسان ذلیل ترین مقام پر آگیا ہے ۔

دین کا تصوّر:

دین میں خدا کی قوت کا اظہار قوانین کی رو سے ہوتا ہے ۔ساری کائنات ان قوانین کے تابع رواں دواں ہے ۔قادر مطلق ہونے کے باوجود ہم نے اپنے اوپر پابندی عائد کر لی ہے ہم بھی ان قوانین کے خلاف نہیں کرتے ۔اور انسان کو اختیار و ارادہ سے نواز کر فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ ۙ (18:29) اس معاشرے میں امن ہوتا ہے جہاں قانون کی حکمرانی ہو اور کوئی سفارش،رشوت اور نذرانے نہ چلے ۔ہر شے قاعدے اور قانون کے تحت ہوتی چلی جائے ۔یہ ہے خدا کا تصور ۔افراد ہی کی نہیں بلکہ اقوام کا عروج وزوال اور موت وزندگی بھی انہیں قوانین سے وابستہ ہے ۔جو قوم ان کے مطابق چلے گی سربلندیاں حاصل کرے گی اور جو خلاف ورزی کرے گی اس کو زوال سے دنیا کو کوئی طاقت نہیں بچا سکتی ۔یہ ہے خدا کا تصور ۔اب آگے بڑھیے تو خدا اور انسان کا تعلق آتا ہے ۔

حیوان اور انسان:

انسان کو ایک ذات دی گئی ہے جبکہ حیوان میں یہ چیز مفقود ہے ۔یہی بنیادی فرق قرآن نے بتایا ہے ۔خدا کی بھی ذات ہے جو مکمل ترین ذات ہے ۔انسان کو جو ذات دی گئی ہے ۔وہ غیر نشوونما یافتہ شکل میں ہوتی ہے ۔انسان اگر ان صفات خداوندی کا عکس تا حد بشریت پیدا کرے تو چھوٹے پیمانہ پر خدائی صفات کا حامل ہے ۔سورۂ اخلاص میں خدا کی ذات کی چار بنیادی خصوصیات بتائی گئی ہیں ۔تاکہ خدا کی صفات کا صحیح تصور اجاگر ہوجائے اور دوسرا یہ کہ انسان کو معلوم ہوجائے کہ میری ذات اسی وقت نشوونما یافتہ یا عکس خداوندی کا عکس سمجھی جائے گی ۔جب میرے اندر بھی یہ خصوصیات پیدا ہوجائیں گی ۔پہلی خصوصیت یہ ہے ۔ قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ‏ ① (112:1) ۔ وَاحِدٌ اور اَحَدٌ میں بنیادی فرق ہے ۔سینکڑوں انسانوں میں سے ایک انسان سامنے آئے تو وہ واحد ہوجاتا ہے ۔لیکن احدیت'' کے معنی ایک ہونا نہیں ہوتا ۔یگانہ یا انگریزی میں ''Unique'' ہوتا ہے ۔یعنی اپنے اندر وہ کچھ ہو کہ کوئی دوسرا ویسا نہ ہو اس میں اس کی انفرادیت ہوتی ہے ۔یعنی جو احساسات کی کیفیت ہوتی ہے کوئی دوسرا اس میں شامل نہ ہوسکے ۔میرا درد میرا درد ۔کوئی دوسرا اس کو محسوس نہیں کر سکتا ۔یہ

انفرادیت Induviduality'' کہلاتی ہے۔توانفرادیت Unique سے مراد کوئی اس جیسا نہیں۔

جب کوئی قوم اس صفت کو اپنے اندر منعکس کر لے تو وہ دنیا کے اندر ایک بے مثال اور یگانہ قوم بن جاتی ہے۔ یہ تمام مؤرخ بھی رسول ﷺ کی جماعت کو بے مثال قرار دیتے ہیں۔اس جیسی جماعت من حیثُ الکل تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ (112:1)۔

دوسری بنیادی صفت اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ (112:2)۔ذات کی دوسری صفت ''صمدیت'' ہے۔ایسی محکم چٹان جو اپنی حفاظت کے لئے کسی کی محتاج نہ ہو۔مگر سیلاب کی صورت میں ہر شخص اسکی پناہ میں محفوظ ہو جائے۔ یہ ہے صمدیت جو اپنی حفاظت کے لئے کسی کی محتاج نہ ہو۔اپنے پاؤں پر جم کر کھڑی ہوئی حوادث زمانہ کی متلاطم لہریں آ کر سر ٹکرا ٹکرا پاش پاش ہو کر چلی جائیں اور اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں۔جب کسی کو کہیں پناہ نہ ملے تو یہ اس کو پناہ دے۔

تیسری صفت ذات انسانی تولید کی پیداوار نہیں۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ (112:3) بڑی بنیادی حقیقت اس میں پنہاں کی گئی ہے۔حیوانات تک افزائش نسل کا سلسلہ تولید کے ذریعہ ہوتا ہے۔زندگی جہاں بھی ہے وہ اپنے جیسا پیدا کرنا چاہتی ہے۔اس سے کائنات کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔انسان کی زندگی میں بھی پیدائش تولید سے ہوتی ہے۔اس میں حیوان اور انسان مشترک ہوتے ہیں۔اس میں کوئی چیز بھی وجہ شرف انسانیت نہیں ہے۔خدا کی ذات بھی سلسلہ تولید سے بلند ہے۔انسانی ذات بھی تولید سے پیدا نہیں کی گئی۔جسم انسانی تولید کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔تولید کے بعد جسم انسانی کو فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (21:91)۔ یہ ہم نے اپنی طرف سے توانائی کا شمہ انسان کو دیا ہے۔ یہ تولید کے ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ذات تولید سے بے نیاز ہوگئی۔خدا خالق ہے (Creation) تخلیق ہے جبکہ تولید (Procreation) ہر حیوان کر سکتا ہے۔تخلیق ہر حیوان نہیں کر سکتا۔خدا اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (23:14) ہے۔اور انسان کو بھی خالق ہونا چاہئے اگر تخلیق نہیں کرتا تو حیوانی سطح پر ہوگا۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

شرف انسانیت تو تخلیق میں ہے تقلید میں نہیں ہے۔تخلیق تو (Innovation) نئی نئی چیزوں کا اختراع۔کا نام ہے۔ جہاں حالت یہ ہو ''كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلٰلَةٌ '' (ہر نئی چیز گمراہی ہے)'' تو ان میں تخلیق کہاں سے آسکتی ہے۔تقلید تو حیوانوں میں ہوتی ہے۔خدا کے ساتھ انسان کا تعلق تولیدی نہیں ہے۔ ہمارے تمام تعلقات تولید سے جڑے ہوئے ہیں۔قرآن ان تولیدی تعلقات سے بلند لے جانا چاہتا ہے۔نسل کا تعلق تولیدی ہوتا ہے۔قرآن اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔نسل،قبیلہ،خاندان، یہ سارا تولیدی ہے۔ایمان کی بنیاد پر نئی قوم بنانا یہ تخلیقی عمل ہے۔ خدا سے تعلق تولیدی نہیں ہے۔تم اس کے جنے ہوئے بیٹے نہیں ہو مگر اس کے باوجود وہ ربوبیت عالمینی کرتا ہے۔اس میں تم بھی تولیدی تعلقات سے ماوراء ہو جاؤ گے۔دنیا کے بیٹوں کو بھی اپنا بیٹا سمجھو۔اور پھر

ایمان نام ہے کہ ان دیئے ہوئے اصولوں پر یقین محکم اور عمل ۔اور کامیابیوں کا راز اس قسم کے خدا پر ایمان لانا ہے۔جو احدیت، حمدیت اوتولید سے بلند و بالا رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (1:1) ہے۔جو فرد یا معاشرہ ان صفات کا عکس ہوگا۔وہ دنیا میں بے مثال ہو جائے گا۔صرف مادی اسباب کام نہیں دیتے۔لیبارٹری میں فارمولا بھی ہونا چاہیے۔اب مسلم امت باقی اقوام سے الگ ہوگئی۔

آخر میں حفاظتی تدابیر:

اب اس نظام کے استحکام کے لئے حفاظتی تدابیر بتائی جارہی ہیں۔حفظ ماتقدم (Precautionary Measures) اب نظام متشکل ہوگیا ہے۔

❁❁❁

نظام متشکل ہونے کے بعد احتیاطی تدابیر

''سُورَةُ الْفَلَقِ(113)''

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ① (113:1)۔ عَوَذَ، مرغی کے نوزائیدہ بچے جونہی کسی چیل کا سایہ پڑے تو بھاگ کر مرغی کے نیچے پناہ لیتے ہیں۔ اس طرح نوزائیدہ بچہ کا خطرات کے موقع پر ماں کی آغوش میں پناہ لے لینا ''عَوَذَ'' کہلاتا ہے۔

کہا کہ اس انقلاب نے ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب چاروں طرف سے یہ سرکش قوتیں یورش کریں گی۔ جونہی خطرہ محسوس ہو تو بھاگ کر اس نظام کی پناہ میں آ جانا۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ① (113:1)۔ فَلَقِ ①۔ زمین میں بیج ڈالنے کے بعد وہ دو چار دن میں پھٹ جاتا ہے۔ مگر یہ تخریب تعمیر کے لئے ہو رہی ہے۔ ایسا پھاڑنا کہ اس میں سے نئی کونپل نکل آئے۔ فَلَقِ ① (113:1) کہلاتا ہے۔ اس رب کی پناہ میں آ جاؤ جس کے ہاں بظاہر تخریب تعمیر کے لئے ہوتی ہے۔ یہ جو اتنی سلطنتوں کو گرایا ہے۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم لوگوں نے تخریب کی ہے حالانکہ یہ تو ایک نئی تعمیر کے لئے تھا۔ اس لئے جب بھی ایسا خطرہ محسوس کرو تو اس رب کی پناہ میں آ جاؤ جس کی ہر تخریب تعمیر کے لئے ہوتی ہے۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ② (113:2) خدا کی پیدا کردہ تمام چیزیں اگر وحی کے تابع استعمال ہوں تو وہ خیر ہے اگر ان کو غلط استعمال کیا جائے تو یہ شر ہے۔ اس لئے اس شر سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کہ کہیں ان کائناتی قوتوں کا استعمال وحی کے خلاف نہ ہو جائے۔

اب سلطنت، دولت کی فراوانیاں ملی ہیں۔ اب ان تمام نعماء کا استعمال ایسا ہو کہ شر کا پہلو پیدا نہ ہو۔ ان کو خدا کے قوانین کے تحت استعمال کرو تو خیر ہی خیر ہے۔ یہ تعوذ ہے یہ شر کے پہلو سے محفوظ رکھنا کہ ان تمام چیزوں کا استعمال وحی کے تابع رکھو۔ جہاں کوئی چیز ڈھانی پڑے تو اس نظر سے ہو کہ اس سے بہتر تعمیر کرنی ہے۔ اور اس کی فراوانیاں افراط کی طرف نہ لے جائیں۔

شر کا دوسرا پہلو محتاجی ہے:

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ③ (113:3) اور جب ایسا اندھیرا اور تاریکی ہو تو ہر چیز پر چھا جائے جیسا کہ گڑھے میں

1043
پانی غائب ہوجاتا ہے۔یعنی اگر محتاجی ہوسامان نشوونما نہ ہوتو وہ بھی شر ہے۔جس طرح فراوانیوں کا استعمال اقدار کے تحت نہ کرنا شر بن جاتا ہے۔اس طرح سے ان کا (وَقَبَ) غائب ہوجانا شر ہے۔پھراندھیرا چھا جاتا ہے۔جب سامان نشوونما نہ ہواس لئے اس سے بھی معاشرہ کو بچائے رکھنا۔ہمارے پہلے دور میں تباہی فراوانی کی وجہ سے آئی۔پھر اگلے دور میں محتاجی،سامان زیست سے محرومی نے ذلیل کردیا۔اب تمام تدابیر کوایک ایک کر کے چھوڑ دیا۔

منافقین سے بچ کررہنا:

وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِى الۡعُقَدِۙ‏ ﴿۴﴾ (113:4) ان منافقوں سے بچ کررہنا۔وہ آکر پھونکیں مارکرارادوں کومتزلزل کرتے ہیں۔یہ عوام کی گرہوں کے اتحاد کو، پھونک مار کر پروپیگنڈے کے ذریعہ کمزور کردے گا۔ان سے شکوک وشبہات پیدا ہوکر ارادے متزلزل ہوجائیں گے۔جماعت میں،معاشرے میں اس قسم کے لوگوں سے احتیاط کرنا۔

وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ (113:5) یہ معاشرہ سے باہروالوں کے حسد کے جذبہ سے محتاط رہنا۔حَسَدَ۔ درخت کی ٹہنی کو یوں چھیل دینا۔کہ وہ کسی کام کا نہ رہے۔چاہے کچھ ملے نہ ملے مگر جس کے پاس ہے اس کے کام کا بھی نہ رہے۔سب سے بڑی تباہی اس حسد سے آئی ہے۔یہ قومیں شباشب اسلام تولے آئی تھیں۔جن کی حکومتوں،تمدنوں کوتباہ کیا گیا تھا۔ان کے دل میں شدید انتقام کا جذبہ تھا۔وہ مسلمان تو ہوگئے تھے۔اس لئے انہوں نے سوچا کہ ایسا کچھ کریں کہ ان کے پاس کچھ نہ رہے جس کے بل بوتے پر یہ عروج ملا تھا۔اس طرح یہ موجودہ اسلام بنادیا۔یہ ہے وہ حسد کا جذبہ۔قرآن کو چھڑادیا خوداپنا یانہیں۔آپ کے پاس بھی رہنے نہ دیا۔دین کو یوں چھیل دیا کہ کسی کام کانہیں رہا۔خودتو لینانہیں تھا۔آپ کے پاس بھی اصلی حالت میں نہیں رہنے دیا۔

اس لئے احتیاط سے کام لینا۔ان لوگوں کے حسد سے محتاط رہنا۔جب یہ خطرات ہوں توفوراً قانون خداوندی کی پناہ میں آجانا۔زیادہ اطاعت کرنا یہ ہے طریقہ ان سے بچنے کا۔اس اطاعت سے اس طرح حفاظت کی گوش میں آجاؤ۔

دوسری حفاظتی تدابیر بھی بتائیں جواگلی سورۃ الناس میں ہے۔

❁❁❁

حفاظتی تدابیر

''سُورۃُ النّاسِ(114)''

نوع انسانی کے وہ تین پہلو جس نے ساری انسانیت کو جکڑ کر رکھ دیا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① مَلِكِ النَّاسِ ② اِلٰهِ النَّاسِ ③ (114:1-2-3)

ساری قرآنی تعلیم کا نچوڑ ان تین آیات کے اندر ہے۔ سارا نظام ان کے اندر ہے۔ روٹی کا گوشہ جونہی انسان کے ہاتھ میں آیا تو اسے محتاج کر دیا۔ جو جی چاہا اس سے کرالیا۔ یہاں سے غلامی نے جنم لیا۔ یہ ہے پہلا مسئلہ سامان زیست کا۔

دوسرا مسئلہ سیاسی اقتدار کا ہے۔ اقتدار ہاتھ میں لیکر پھر ان کو اپنی خواہشات پر نچوایئے۔

تیسری چیز مذہبی روحانیت ہے۔ عوام کو فریب دے کر جو جی میں آیا تو کرا لیا۔ یہ مذہب کی زنجیر میں تو انسان کے قلب ودماغ پر مسلط ہوتی ہیں۔ اگر حضرت صاحب کی نگاہ بدل جائے تو گڑ گڑاتا ہے، کانپتا ہے۔ یہ اس قدر محکم زنجیریں ہیں۔ یہ ہیں تین گوشے کہ محتاج کر کے رب بن جاؤ۔ سیاسی اقتدار کے ذریعہ مَالکؐ، اور روحانی اقتدار کے ذریعہ اِلٰہؐ بن جاؤ۔ کہا یہ تینوں کے تینوں باطل ہیں۔ یاد رکھو دنیا میں کوئی اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① مَلِكِ النَّاسِ ② اِلٰهِ النَّاسِ ③ (114:1-3) نہیں ہے۔ پوری انسانیت کو محیط کر دیا النَّاس کہہ کر۔ ہر قسم کی غلامی سے چھڑا دیا۔ روٹی، اقتدار اور روحانیت کی، الوہیت کی جتنی بھی قوتیں ہیں۔ قرآن نے آ کر جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس طرح کی قوم پیدا کی اور یہ نظام دے کر رب الناس۔ صرف اس کے قوانین کی آغوش میں آ جاؤ جس کے نزدیک کسی خاص قوم، قبیلہ کی نشوونما نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ہے۔ ملک الناس اقتدار اس کے سوا کسی کا نہیں۔ اس کے قوانین کی اطاعت میں پناہ لینی چاہئے۔ جس کا قانون تمام انسانوں کو حفاظت دے سکتا ہے۔ اسی طرح الٰہُ النّاس۔ اس کے قوانین کی اطاعت کرو۔ کسی اور کو الہ نہ بناؤ۔ مذہبی پیشوائیت کو حق نہیں ہے الہ بننے کا۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ④ (114:4)، الْوَسْوَاسِ ۙ (114:4)۔ دبے پاؤں یوں آنا کہ آہٹ نہ ہونے پائے۔ جیسے شکاری شکار کی تلاش میں کہ آہٹ نہ ہونے پائے۔ کہا کہ اس قسم کی قوتیں آئیں گی کہ معلوم ہی نہیں ہو سکے گا یونہی بات کو کان میں ڈال کر خَنَّاس ہوگئیں۔ خَنَّاس کا مطلب ''آ کر چپکے سے کوئی چیز ڈال کر دبے پاؤں واپس چلے جانا'' پوشیدہ ہو جانا۔ نفسیاتی قوتیں، سیاسی سازشی قوتیں روحانی دنیا کی یہ قوتیں، یہ تمام شکاریوں کی طرح دبے پاؤں کھڑکا نہیں ہونے

1043
دیتیں۔کان میں پھونکا اور واپس جا کر چھپ جائیں۔ان قوتوں سے بچو۔ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵ (114:5) اور ایسی تعلیم جو قلوب کے اندر اتارتے رہتے ہیں۔شکاری کو پتہ ہی نہ چلے کہ میں گرفت میں آ گیا ہوں۔یہ ساری مذہبی تعلیم جو قرآن سے بے گانہ کر رہی ہے۔اور ادھر مغرب کی ساری تعلیم شرف انسانیت سے بے گانہ کر رہی ہے۔یہ ہے وساوس جو صدور الناس کے اندر ڈالے جا رہے ہیں۔دلوں میں وساوس پیدا کر کے عزم راسخ کو کمزور کر گئے۔کون ہیں یہ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶ (114:6) اپنے ہوں یا اجنبی دونوں کریں گے۔جن سے مانوس ہوتے ہو یہ بھی کریں گے۔اور غیر مانوس باہر والے بھی یہ کچھ کریں گے۔ساری ہزار سالہ تاریخ غیروں نے بھی کیا اور اپنوں نے بھی کیا۔

۞۞۞

قرآن بحرِ بےکراں، گوئٹےGoetheاورقرآن (1749-1832)

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

قرآن کے اختتام پر جب انسان پہنچتا ہے تو وداع کی یہ کیفیت بھی جدا اور جب اسے شروع کرو تو اس کے وصل کی لذت بھی ایک جدا کیفیت کی حامل ہوتی ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے

؎ وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اس لئے آخری پارہ پہ آنے کے بعد الناّس وِداع اور پھر الحمدللہ سے وصل۔ تو وداع ووصل جداگانہ لذتے دارد۔ اس کے بعد جب وہ آتا ہے تو نئی دنیاؤں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ۵ صد صفحات کی چھوٹی سی کتاب مگر کیفیت یہ ''نہ حد اس کے آگے نہ حد سامنے'' یہ ختم ہی ہونے کو نہیں پاتی۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٠﴾ (77:50)

گوئٹے(Goethe 1749-1832) کی نعت بہ حضور ﷺ اقبال نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے:

مگر گوئٹے(goethe) جو کہہ گیا ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اقبال نے کہا ہے وہ عجیب وغریب حقائق بیان کر گیا ہے۔

در خواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب
واکرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار
سیمائے اُو چوں آئینۂ بے رنگ وبے غبار
از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ او

اس کی زندگی جوئے رواں ہے کہ نا مساعد حالات اور نا موافقت زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی

موجوں میں مزید خوش خرامی پیدا کر دیتی ہے۔اس کی آواز پتھروں کے ریزوں سے نغمات تو پیدا کرتی ہوئی چلی آرہی تھی۔اور اس کی پیشانی جلوت مآب بے رنگ و بے غبار تھی۔

یہ جوئے رواں نہ صرف ہجوم تزاحم اور انبوہ تصادم کی سنگلاخ زمینوں سے ہی مستانہ وار گزرتی ہوئی آئی ہے بلکہ کشش و جاذبیت کی ہر وادیٔ رنگ تعطّر کے ہر دامن کیف پر ایک نگاہِ تبسم آلود ڈالتی کج کلہانہ انداز سے آگے بڑھتی چلی آتی ہے۔

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ مست خرام جوئے باردشت وصحرا میں زمین صالحہ کو لالہ زاروں میں تبدیل کرتی اور خس وخاشاک اور ہر کشت زبوں حال کو اپنی موجوں کی لپیٹ میں لے کر آگے بڑھتی گئی۔ایں وآں سے بے نیاز، ماحول سے مستغنی۔گردوپیش سے غیر متاثر، اپنی خودی میں مست، انسانوں کے خودساختہ قوانین وضوابط سے بے رخی برتتی ہوئی صرف اس سرمدی قانون کا اتباع کرتی ہوئی جانب منزل بڑھتی گئی۔

یکساں چوں سیل کردہ نشیب وفراز را

از کاخِ شاہ و یارہ وکشت و چمن گزر

مساوات محمدی، سیلاب تعلیم کا نشیب وفراز کی سطح کو ہموار کرتی ہوئی، طبقات کو مٹاتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔نہ تو بادشاہوں کی طرح کسی سے خراج وصول کیا۔نہ تو باغبان کی طرح اپنا حصّہ محنت کا باغ سے، اور نہ چمن کے پھولوں سے۔بے لوث اور بلا معاوضہ ماحول کو سنوارتی گئی۔

بے تاب وتندوتیز وجگرسوز و بے قرار

در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت

دور کہن کی خستہ چیزوں کو چھوڑتی ہوئی جدید دنیا کی طرف بڑھتی ہوئی چلتی گئی۔

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

❁❁❁

حصّہ دوم:　　اِعراب القرآن

قرآن کے خلاف اپنوں اور اغیار یعنی انس وجن کی سازشیں جن سے قرآن نے متنبہ کیا تھا

اِعراب کے معنی الفاظ وحروف پر زبر، زیر، پیش اور جزم لگانا۔ یہ بڑا بنیادی اور اہم کام تھا جو وحی کی ایمائیت کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا تھا۔ اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ رسول ﷺ نے بہ نفسِ نفیس یہ کام خود سرانجام دیا تھا بلکہ حکم دیا گیا "اِعْرَبُوا الْقُرْاٰنَ" قرآن پر اعراب لگاؤ۔ (بیہقی وابوعلی بحوالہ مشکوٰۃ، ص180، کنز الاعمال۔ بقیۃ الوعاء سیوطی۔ فضائل القرآن۔ ابن کثیر) از علامہ طارق برہان القرآن۔

عربی زبان وضاحت وبلاغت کی معراج طے کرتی ہوئی مبین کے قرآنی لقب سے ممتاز ہوچکی تھی اور کوئی زبان اس وقت تک "مبین" نہیں کہلاسکتی جب تک اس کے ہجا۔ اِملا اور اعراب کے نقائص سے کلی طور پر پاک وصاف تسلیم نہ کیے جائیں جب کہ مودودی نے واقعات کو غلط رُخ پر ڈال کر مسلمانوں کو ایسے المیہ سے دوچار کرنا چاہا جس کا آگے چل کر مداوا نہ ہوسکے۔ فرماتے ہیں: "65ھ تک قرآن کے حروف بلکہ اہل عرب ہی عام حروف عربی کے لیے اعراب کے نام سے آشنا نہ تھے۔ ابوالاسود دولی نے زیاد کے حکم سے پہلے پہل لفظوں کی شکل میں حروف کے اوپر نیچے اور بیچ میں ایک نقطہ رکھ کر زیر، زبر، پیش سے مسلم اہل عرب کو 45ھ اور 53ھ کے نوسالہ دور میں تاریخ میں اتنا بڑا واقعہ جو لوگوں کو پتہ ہی نہ چل سکا۔ کسی دن آشنا کیا۔ کیا ابوالاسود سے پہلے اہل عرب فنِ اِعراب سے قطعاً ناآشنا تھے۔ کیا رسول ﷺ نے ان بےخبروں کو حکم دیا تھا؟ "اِعْرَبُوا الْقُرْاٰنَ" آیئے۔ ابوالاسود کا حدود اربعہ معلوم کریں۔

ابوالاسود دولی:

کہا جاتا ہے کہ حجاج بن یوسف (719م) نے قرآن پاک کی نوک پلک درست کرنے کے لیے زیر، زبر اور پیش ایجاد کی تھی اور یہی مشہور بھی ہے۔ یہ بہت بڑے پائے کے شاعر، ادیب، دانشور اور خطیب تھے۔ اور ابوالاسود دولی یہ شیعہ مسلک کے ترجمان اور داعی تھے اور معاویہ کی شان میں ہجو کرنا ان کا نصب العین تھا۔ اس کے تاحال تین نام معلوم ہوئے ہیں۔

1- ظالم بن عمرو بن سفیان بن جندل بن یعمر بن حنش بن ثعلبہ بن عدی بن ویل۔

2- عمرو بن عثمان یا عثمان بن عمرو۔ ابن حجر نے پہلے نام ظالم کو ترجیح دی ہے۔

یہ 681م میں فوت ہوئے اور خالص شیعہ تھے (تہذیب التہذیب۔ دکن 11:12) اور مودودی کی تحقیق کے مطابق اس ظالم

نے بصرہ کے اموی گورنر زیاد (675م) کے حکم سے قرآن پر اِعراب لگائے۔ حالانکہ زیاد خود شاعر۔ دانشور اور خطیب تھا۔ اسالیب عربی اور انساب کا ماہر۔ وہ خود کیوں یہ کام نہ کر پایا۔ جب کہ اس دور میں امویوں اور علویوں کی چپقلش عروج پر تھی تو قرآن جیسی اہم کتاب کے لیے غالی شیعہ کا انتخاب کیسے کر لیا؟ اگر فرض کر لیں یہ شاندار کام ابوالاسود نے ہی سرانجام دیا تھا۔ تو تنہا اس کی دیانت پر اصول تصدیقہ کی رو سے کیسے اعتماد کیا جا سکتا تھا اور ابولاسود نے اس ذی شان کام کی سرانجام دہی کے لیے کسی "غیر شیعہ عالم" کے تعاون اور فنی مشوروں سے ہرگز استفادہ نہیں کیا بلکہ اپنے رازدار شاگرد۔ محرم پوشیدہ اور عیاں ہم مشرب و غالی شیعہ اور شراب نوشی میں بار بار سزا یافتہ شاگرد یحییٰ بن عمر عدوانی بصری (747م) کے مشوروں سے یہ کام مراحل سے گزارا۔ (تہذیب التہذیب۔ طبع بیروت 307/11)

اگر قرآنی ابہامات کو ابوالاسود نے درست کر لیا تھا تو بعد میں آنے والے حجاج بن یوسف نے اس ضمن میں کن اصطلاحات سے کام لیا تھا؟ کیا ان ہر دو کی "تصحیحات و ترمیمات" کے بعد یہ سلسلہ رُک بھی گیا تھا یا چلتا رہا ہے؟ تحقیق یہ بتا رہی ہے کہ یہ سلسلہ چلتا رہا ایسے کئی شیعہ اور قاریوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جنہوں نے قرآن میں تصریف و تحریف کے پیش نظر (945-934م) کے لگ بھگ قرآن کے اِعراب کا بارِ دگر جائزہ لے کر سینکڑوں آیات کے نئے اِعراب تجویز کیے اور ان کو عثمانؓ کے کھاتے میں ڈال دیا کہ ان تمام تر آفات کا سبب صُحفِ عثمانی ہے۔ پھر اپنی تحریفات کو بھی غلط رنگ میں تصحیحات کا نام دینا شروع کر دیا تا کہ آئندہ مصحفِ عثمانی یعنی موجودہ قرآن ہر دور میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا رہے جس کا اعتراف ابن جریر طبری (923م) کے شاگرد قاری ابن شنبوذ شیعی نے مدرسۂ فکر جاری کر کے قرآن سازی کا کام شروع کر دیا تھا اور اسی سکول کے پرزور حامی ابوبکر عطار شیعی (965م)۔ ابن شنبوذ سنیوں اور شیعوں میں زیادہ پاپولر ہے۔ گرفتاری کے بعد اعتراف کر لیا تھا کہ وہ قرآن سازی کرتا رہا ہے (قوت حموی) (1229م مارگلیوتھ جلد 300/6)۔ تاریخ ابن اثیر (1233)۔ اور ان کا ساتھی قاری اسحاق نامور محرف اور قرآن ساز تھا۔ دسویں صدی میلادی میں محمد بن مقلہ نے بھی قرآن سازی میں بڑا نام پایا۔ اس نے روایات کے بل بوتے پر نئے عزم سے تمام قرآن کے اِعراب بدل ڈالے۔ چونکہ ماہر خطاط تھا۔ محمد بن مقلہ نے (941م) تحریفی غرض کے لیے کوفی رسم الخط کو آلہ بنایا۔ اس میں ترمیمات کر کے نئے رسم الخط کی داغ بیل ڈالی اور پوری مہارت سے نئے خط میں قرآن کے لاتعداد نسخے کتابت کر کے لوگوں میں تقسیم کرا دیئے۔

(مذاہب التفسیر الاسلامی۔ ترجمہ حلیم النجار۔ طبع مصر، ص 65-64)

تخریب کاری کے نمونے:

اِعراب قرآن کو سمجھنے کے لے ذیل کی مثال سامنے رکھیں۔ حجرات آیۃ 6۔۔۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝ (49:6) اس آیہ میں فَتَبَيَّنُوْٓا (49:6) کو نشانہ بنایا گیا کہا گیا کہ یہاں نقاط غلط ہیں یہ "فَتَثَبَّتُوْا" (ث ب ت) ہے۔ حالانکہ قرآنی معاشرتی آداب بتا رہا ہے کہ افواہ پر کان نہ دھرا کریں اس سے ممکن ہے معاشرہ بڑے حادثہ کا شکار نہ ہو جائے۔ اور اس کو تبدیل کر کے اسے حمزہ۔ کسائی، خلف پڑھا

کرتے تھے۔(کتاب الایات ابوعاصم النبیل (906م) قاہرہ طبع۔1323ھ۔ص14/15)۔

ان سازشیوں نے اِعراب اور نقاط کے ردّوبدّل ''ف ت ب ی ن وْ'' کو''''فَثَبَتُوْا''(49:6) تو بنا دیا تو اس سے ان کے متن کو کیا تقویت مل سکتی تھی کیونکہ اس لفظ میں متبادل بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے جب کہ ''فَتَبَيَّنُوْا'' ہر لحاظ سے قرآنی ابلاغ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ تحقیق کی گرائی اور گہرائی کے لحاظ سے کامل واکمل اور جامع ہے۔''''فَثَبَتُوْا'' والوں نے غور نہیں کیا۔ یہاں مقصود صرف اثبات نہیں، نفی ہے خواہ اثبات دونوں کے باب میں چھان پھٹک ہے۔ ان آیات کا اہم اصول، زبان کے قواعد سے زیادہ سماع پر ہے اور سماع ہی کو تمام دنیا میں لغت، ادب اور اسالیب زبان کا ماخذ تسلیم کیا گیا ہے اور سماع صرف ''فَتَبَيَّنُوْا''(49:6) کا رس کانوں میں گھول رہا ہے۔ یہ اِعراب بھی سماع کے ذریعہ محسوس کیے گئے۔ پھر''مخرج'' میں ڈھالے گئے۔ یہ اعراب ابوالاسود سے پہلے ہی عربوں میں متعارف تھے(ابن الندیم طبع مصر ص7)۔

نقاطِ القرآن دنیا کے لٹریچر میں تنہا ادب اور انشا کے زاویہ ہی دیکھا جائے تو یہاں بھی قرآن حکیم ہر لٹریچر پر فائق نظر آئے گا اور یہ فوقیت کسی بھی زبان کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ کلی طور پر پختہ، کامل اور لسانیات کے ہر معیار پر پوری اترتی ہو۔ بول چال سے لے کر تحریر تک، ہر عیب اور نقص سے پاک ہو۔ ہر زاویہ سے عربی مبین یعنی صاف ستھری، واضح اور روشن عربی، نہ املا میں اور نہ ہجا میں کوئی الجھاؤ۔ نہ تحریر میں پیچیدگی اور نہ خواندگی میں دقت۔ اب اتنی شہادتوں کے بعد ہم تسلیم کرلیں کہ عربی کے واضعین زبان کے ایسے قواعد سے بھی ناآشنا تھے۔ جو ایجاد وتخلیق کے ان ابتدائی مراحل میں ان کے سامنے ہونے چاہئیں تھے۔ خاص کر ایسی زبان جو سراسر سماعی ہو اور قبائل کے شدید لسانی معیار کے مطابق وجود میں آئی ہو۔ جس کی سماعیات اتنی پختہ اور سائنٹیفک ہوں کہ مستقبل کے لغت، حرفی قواعد و بلاغت کے تمام اصولوں کا ماخذ بھی ہو بلکہ اسی سماعی خصوصیت کی بدولت وحی کی زبان بن جائے۔ اسے ایجاد کے وقت سے لے کر اسلام سے نصف صدی گزرنے تک قاعدے قانون کی زبان ہی تسلیم نہ کیا جائے یہ تو سراسر ناانصافی ہوگی۔ آخر وہ کون سا طریق فہمائش ہے جس سے عربی زبان سے ناآشنا لوگ بے تکلف، با۔تا۔ثا۔جیم۔حا۔خاء کے بے نقط حروف میں امتیاز کرتے تھے۔ راقم نے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو سورہ نور کی آیہ(26) بغیر نقطوں کے لکھ کر پڑھنے کو کہا تو اس نے طیب کو طبیب اور اور خبیث کو حبیب پڑھ لیا۔ اب بتائیے کہ اتنی ابہام سے پر ناقص، ناپختہ، نامکمل اور خام زبان میں قرآن کی حفاظت اور اشاعت کیونکر ممکن ہوسکتی تھی؟ ایسی زبان کو الٰہی امتیاز''مبین'' سے کیسے نوازا جاسکتا ہے؟ اس کو تو ہر حال میں صاف ستھری اور منجھی ہوئی اور مکمل زبان ہونا چاہیے اور مودودی صاحب بے سند مفروضہ پر خوف خدا سے بے نیاز ہوکر حاملین قرآن کو غلط راہ پر ڈال رہے ہیں کہ''اہل عرب حروف کے لیے نقطے ہونے چاہئیں اس کو کبھی محسوس نہ کرسکتے تھے بلکہ صحابہ رسول نے بھی نقطوں کی ضرورت عربی حروف تہجی کے لیے محسوس نہیں کی۔ پہلی مرتبہ عبدالملک کے حکم سے حجاج نے دو گمنام عالموں کے ذریعہ بے ضرورت ایجاد کرکے دنیائے عرب کو ضرورت سے آشنا کردیا(تفہیم القرآن)

صرف جھوٹی انا کے لیے کبھی ابوالاسود دولی کو ایک قدرآور شخصیت بتاتے ہیں اور کبھی حجاج بن یوسف کو۔ یاد رہے تحقیق سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے۔عرب جاہلیہ کے اشعار۔کھدائیوں سے برآمد ہونے والے کتبات، خط حمیری جو عربی خط کا ماخذ تھا عرب اسلام سے 500 سال قبل ہی نقطوں اور دیگر فنی ضروریات سے آگاہ تھے۔قرآن نے بجا طور پر ان کی زبان کو فصاحت و بلاغت کی زبان تسلیم کرکے ''عربی مبین'' کے اعزاز سے نوازا تھا۔ان شعرا کو قادرالکلام اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کے ہاں اسالیب سخن کی فراوانی تھی نہ تو وہ دریوزہ گری کے محتاج تھے نہ اظہار کے لیے کہیں سے گداگری کی ضرورت محسوس کی۔

زیادات القرآن:

کہا جاتا ہے کہ قرآن محفوظ میں بعض کلمات اور فقرے اپنے مفہوم میں تشنہ اور نامکمل رہ گئے تھے۔ جو بعض کاتبوں کی سہو کی وجہ سے رہ گیا تھا۔اور یہ اضافے عبداللہ بن عباس اور ابی بن کعب کے صحائف میں موجود تھے۔دو تین مثالیں ملاحظہ کریں:

1 سورۂ نساء:24: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ، اُجُوْرَهُنَّ کے بعد اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى پڑھا جاتا تھا کہ مُتعہ کا جواز نکالا جا سکے۔

2 سورۂ احزاب (6): اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ، کے بعد وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ۔ پڑھا جاتا تھا۔تاکہ رسول ﷺ کی ازواج اگر مومنین کی مائیں ہوئیں تو ان کا باپ بھی لازم ہونا چاہیے۔ یہ اضافہ گہری سازش ہے اور قرآن کے بھی خلاف۔ کیونکہ حضور ﷺ صرف سات بچوں کے باپ تھے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ (33:40) یعنی رسول ﷺ کسی کے حقیقی باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول ہیں۔جن کے ذریعہ باب نبوت بند ہوا۔

یہاں رسول ﷺ کی نبوتِ عمومیّہ کی نفی کی گئی ہے اور زید کو متبنّیٰ بنایا تو لوگوں نے زید بن محمد کہنا شروع کردیا تو ارشاد ہوا کہ ان کو اپنے باپوں کے نام سے ہی پکارو۔اس طرح کی سازشوں سے ان کی ساری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

تفسیر القرآن:

قرآن محفوظ چونکہ خالص عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔لہٰذا اس کی تفہیم کے لیے اہل زبان سے رجوع کرنا ضروری تھا۔ عہد نبی سے لے کر خلفائے راشدین تک ساری دنیا میں قرآن اور اسلام کی اشاعت بڑھ رہی تھی تو اگر یہ نومسلم عجمی مفسران نئے لوگوں کے لیے قرآن کی تفسیر کا قرآن سے کوئی طریقہ تجویز کرتے مگر ان عجمی نژاد مفسرین نے ہر لفظ اور آیت کی تشریح اپنے سابقہ ادیان کی روشنی میں شروع کردی اور جھوٹی روایات سے تفسیر کو پراگندہ کردیا گیا اور ان سامریوں نے دعویٰ یہ کیا کہ یہ روایات خود رسول ﷺ کا قول ہیں۔

اب قرآن کے فضائل میں روایات کا ڈھیر لگا دیا۔ آیۃ الکرسی پڑھیں تو جن تابع ہوجائیں گے۔سورۂ واقعہ پڑھیں تو

1043

بھوک نہیں لگے گی۔ قُلۡ هُوَ اللّٰهُ پڑھیے تو دنیا بدل جائے گی۔ نہ قرآن سے ان خرافات کا کوئی تعلق نہ واسطہ۔ بلکہ قرآن تو ان تمام بیماریوں کا علاج تجویز کرتا ہے تو انھوں نے قرآن ہی کو نشانہ بنایا اور اسے بیماریوں کا مجموعہ قرار دیا اس کے اعراب غلط، فقرے علالت زدہ۔ گرائمر خامیوں کا مجموعہ۔ ادب ہرزاو یہ سے مریض ان غلطیوں اور خامیوں کی اگر روایات کے ذریعہ اصلاح نہ کی جاتی تو قرآن اس قابل ہی نہ تھا کہ دانشور دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا۔ یہ تو ہم نے اس کے اِعراب درست کیے۔ نقاط صحیح سمت میں ڈالے۔ اس کے لہجے کی خامیاں دور کیں۔ تفسیری نقاط سے اس کے مقاصد کی اصلاح کی اور کیا کچھ ہے جو ہم نے نہیں کیا؟...... العرض قرآن کو مریض بنا کر خود اس کے سرجن بن گئے۔ کیا خود ساختہ فضائل کے انبار لگا دینے سے قرآنِ محفوظ کو طراوت ملے گی؟ ان فضائل میں شیعہ کا ہاتھ نمایاں ہے اور امت کو ان بھول بھلیوں میں ڈال کر قرآن کی اصل تعلیمات سے دور کر دیا اور دعویٰ ان کا یہ ہے کہ یہ کام سب سے پہلے امام رضا (868م) کے مصاحب ابو عبداللہ احمد بن محمد بن سیاء نصر اور کلبی (999م) کے استاد علی بن ابراہیم بن محمد عمار کوفی (955م) نے فضائل قرآن کے موضوع پر لکھا۔ کہتے ہیں کہ صحابی رسول ﷺ ابی بن کعب فضائل کے باب میں ان کے پیرو مرشد ہیں (642م) ان کو یہ شیعان علی کے طرف داروں میں گردانتے ہیں۔ خاص کر فضیلت عمل کا وصف ہے۔ رٹنے پڑھنے اور دم کرنے کا وصف نہیں ان لوگوں نے یہ فضائل کا کاروبار قرآنی اہداف و مقاصد کو بے نور بنانا تھا۔ اس طرح فضائل تو رہ گئے مگر روحِ قرآن ختم ہوگئی۔ اب نجات کا دار و مدار عمل پر نہیں بلکہ درود تاج اور آیۃ الکرسی کو رٹنے پر ہو گیا۔

تقسیمِ قرآن:

قرآن کو سات منزلوں میں تقسیم کرنا اور آیات کے مابین حدود کے طور پر علامات مقرر کرنا، تقسیم کہلاتا ہے۔ یہ کام نہایت احتیاط طلب ہے۔ سلف کا عقیدہ ہے کہ یہ کام وحی کے ذریعہ رسول ﷺ نے خود سرانجام دیدیا تھا۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اس میں انسانی ہاتھ شامل ہے تو اسے مفتری اور کذاب کہتے تھے (ابن حزم (1064م) کی الفصل۔ طبع مصر 42/4، جلد 18/2، اتقان طبع مصر، ص: 147/148)۔

اس طرح سے یہ طے شدہ ہے کہ یہ کام بھی ﷺ کر گئے تھے مگر منحرفین کا یہ کہنا ہے کہ مورخ ابن الندیم (990م) کے بقول اس فن پر ''اسباع القرآن'' کے عنوان سے سب سے پہلے حمزہ بن ابی حبیب کوفی (737م) نے لکھا جو خالص شیعہ تھا۔

مقطوعات وموصولاتِ قرآن:

کن مقامات پر رکنا چاہیے اور کہاں ملا کر پڑھنا چاہیے؟ یہ تمام امور نہایت احتیاط طلب ہیں اور ادنیٰ سی غفلت سے انسان معافی کے گرداب میں پھنس جاتا اور پے در پے غلطیوں کا مرتکب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ حمزہ بن حبیب کوفی جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس فن پر بھی بقول ابن الندیم اس نے لکھا ہے۔ یہ مودودی کے پیارے اور باعتماد راوی تھے اور اس کی وثاقت پر زور دیا ہے۔ جب کہ ناقدین کے نزدیک اس کی وثاقت ناقابل اعتماد ہے۔ اس نے مقطوعات اور موصولات قرآن پر دو کتابیں لکھ کر ''حدود آی

1043

القرآن'' اور قطوع القرآن وموصولہ'' اپنے فن ہیرا پھیری کو کمال تک پہنچایا۔ یہ قراءتیں اختراع کرنے کا ماہر بھی تھا۔ اس کی مثالیں ملاحظہ کریں۔ قرآن میں ہے''وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ج وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ط ''(12:24) یہ آیت یوسفؑ کی پاکدامنی کی خبر دے رہی ہے لیکن اس کے قاعدے کے مطابق (حمزہ) یوسفؑ کا دامن ہوس کاری میں آلودہ ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ بقول ہمارے اکابر کے۔ حمزہ کی قراءت یہ ہے اور وہی صحیح ہے کہ هَمَّتْ بِهٖ ج (12:24)۔ پر رکنے کی بجائے۔ وَهَمَّ بِهَا (12:24)۔ پر رکنا چاہیے۔ یعنی اگر خاتون اپنے برے ارادے سے یوسف پر جھپٹ چکی تھی تو یوسف کا بھی ایسا ہی ارادہ ہو چلا تھا۔ پس اس گناہ سے رب نے بچا لیا۔ اور ان قراءتوں سے جو ہمزہ کے اصولوں کے تحت طبع ہوئیں۔ ان میں وقف کی علامت وَ هَمَّ بِهَا (12:24) پر دی گئی ہے۔ (پاک وہند کے طبع شدہ نسخے) مگر جو قرآن مصر میں طبع ہوا تو اس پر''هَمَّتْ بِهٖ ج ''(12:24) پر وقف کیا گیا ہے جو وحی کے مطابق ہے اور حمزہ کی اس فتنہ گری کو پختہ کرنے کے لیے مفسرین نے روایات بنا کر اسے پختہ کرنے کی کوشش کی کہ یوسفؑ خاتون مصر کو لباس سے فارغ کر کے اس کے زانوں میں بیٹھ گئے اور رب کی برہان نے بچا لیا لیکن ربّ کی یہی برہان عریاں کرنے سے پہلے کیوں نہ نمودار ہوئی؟

ناسخ ومنسوخ القرآن:

علم الٰہی تمام نقائص سے پاک ہے۔ اسے بندوں کا از مہد تا لحد ضروریات کا علم ہے۔ سب پر حاوی علم، بر و بحر وخشک وتر کا علم ہے۔ اس لیے کوئی ایسی آیت نہیں اتاری جو کچھ عرصہ کے بعد باطل اور معطل قرار پائے۔ یہ تمام ناسخ ومنسوخ قرآن محکم کی حاکمانہ حیثیت کو مجروح اور متنازعہ فیہ بنانے کے لیے اختراع کیے گئے تاکہ قرآن کے متوازی شریعت کا شیطانی پروگرام سامنے لا سکیں۔ علمائے راسخین ایسے عقیدے کو جو ایمان شکن ہو۔ اپنے ایمان کا جز نہیں بنا سکتے۔ اس کے قوانین غیر متبدل ہیں اور نہ کوئی ان میں تغیر وتبدل کر سکتا ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے امام جعفر صادق کے صحابی عبداللہ بن عبدالرحمن نے ابتداء کی۔ پھر صدر اوّل کے دوسرے شیعہ عالم نے''کتاب ناسخ ومنسوخ'' لکھی۔ (ابوالحسن کے طرف سے) اور شاگرد اپنے استادوں سے سبقت لے گئے اور قرآن کو مفلوج کرنے میں ان کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں (یعنی یہ سنی امام)۔

معانی القرآن:

قرآن مجید کے الفاظ ومفردات کے محاورات، لغت اور استعمالاتِ عرب سے وضاحت کرنے کو''معانی القرآن'' کہا جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی مبارک اور بنیادی فن ہے کہ اس طرح قابل تشریح الفاظ کی تعبیر استعمالاتِ عرب کی روشنی میں کی جاتی اور غیر مستند روایات کو دیوار سے لگا دیا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء خواہ کسی نے کی ہو مگر بعد میں لغت نویسوں اور محاورات جمع کرنے والے دانشوروں نے جو معانی ومفاہیم کے مزاج، نفسیات اور معنوی روٹ سے باخبر تھے۔ انہوں نے خالی الذہن ہو کر ترقی پسند اور اجلے

خیالات کو شیوہ بنایا اور بحرِ معانی میں غوطہ زنی کر کے تابناک موتی چن کر لائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر بھی سنی کیمپ سے کوئی اہل علم لکھنے میں تقدیم اور سبقت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سب سے پہلے اس پر ربان بن تغلب شیعی (758م) نے معانی القرآن لکھی۔ اور اسی کے اتباع میں مجتہد رواسی (796م) میں ''معانی القرآن'' لکھی۔ اور عرب دانشوروں کا وہ طبقہ جو ادبیات عرب پر کامل دسترس رکھتا تھا اور اسالیب زبان وسخن کا شناسا تھا۔ وہ بھی اس میدان میں جو ہر تحقیق سامنے لے آیا اور پوری صلاحیتوں سے ''تفتیش واستقراء'' کا لوہا منوا کر سب پر حاوی ہو گیا۔ تاریخ ان کو معتزلہ کے نام سے یاد کرتی ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ لقب تجویز کرنے والے جہاں کہیں معانی کے اضطراب میں بھٹکے ان کو معتزلہ کی دستگیری قبول کرنا پڑی۔ امام بخاری مجتہد و سلفی ہونے کے باوجود ابوعبید کے ہاتھ پر معنوی بیت کرنے پر مجبور ہوئے۔ درس نظامی کی تکمیل کے لیے معتزلہ کی تفاسیر۔ کشاف اور بیضاوی کو نصاب کا حصہ بنا دیا گیا۔

امام رازی بایں ہمہ، عقل ودانش استدلات وماخذات کے لیے معتزلہ کا انتخاب کرتے رہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ معتزلہ زبان وادب کے اتنے ماہر تھے کہ بڑے بڑے شیعہ اور قرامطی جو تفسیری ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ زلزلۂ عقلیات کے ایک ہی جھٹکے نے ان کے گھروندے پیوند خاک کر دیئے گئے اور صحرائے لغت میں کوئی ان کا ہم سر نہیں تھا۔ اور معتزلہ کی نظر میں یہ سارا شیعی تفسیروں کی صلاحیتیں بلاوزن تھی اور رہان کے بارے میں لکھا معتزلہ نے ''ان من یجھل امور الجاھلیۃ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یَّفْھَمَ الْکِتٰبَ وَالسُّنَّۃَ'' ربان جیسا شخص جو نہ امور جاہلیت کا فہم رکھتا ہے اور نہ ادراک۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ قرآن اور سنت کی تفہیم کے شعور سے آراستہ ہو۔''

(جاحظ (868م) کتاب الحیوان)

امثال القرآن:

قرآن کی ضرب الامثال پر بھی لبرل دانشوروں کا خصوصی کردار ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس موضوع پر بھی خامہ فرسائی سب سے پہلے محمد بن جنید شیعی نے کی جب کہ لبرل دانشوروں نے تو اس کو کمال تک پہنچا دیا۔

متشابہات القرآن:

تشابہ اور متشابہ کے معنی ''ہوبہو'' ملتی جلتی شے۔ مگر اس کے عام معنی یہ کیے جاتے ہین کہ قرآن کا یہ حصہ فہم وادراک سے ماوراء ہے اور اس کو سمجھنا گمراہی ہے۔ اس موضوع پر بھی امام جعفر کے شاگرد حمزہ بن حبیب کوفی (773م) نے لکھا اور عقیدہ یہ تھا کہ متشابہات کو ''راسخین فی العلم'' ہی سمجھ سکتے ہیں اور وہ اہل رسول ہیں۔ اس حد تک شیعہ قابل تحسین ہیں کہ وہ کم از کم متشابہات کو قابل تحسین سمجھتے ہیں گو تعبیر کا مزاج بگاڑ کر۔

متشابہ۔ سے مراد جس کے ظاہر مفہوم کو ذہن قبول کرنے سے اِباء کرے اور وہ ایسے مفہوم کو متحمل ہو جو مجاز، استعارے، کنائے، اشارے، اور ایمائیت کے غماز ہوں یا جن کے مفاہیم متضاد بھی ہوں اور ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ کہ ''تاویل'' کے بغیر حل نہ ہوسکیں۔ یہی کلام کی پہلی وہ قسم ہے جو ماہرین لسانیات کے نزدیک اعلیٰ وخوب تر ہے اور یہی ابلاغِ سخن اور اعجاز معانی کی جان ہے۔ قرآن نے ''محکمات ومتشابھات'' کہہ کر احساس دلایا ہے کہ جن اصنافِ سخن کو بھی سامنے رکھ کر قرآن کا معارضہ کرو گے کامل اور مکمل پاؤ گے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو غور وفکر اور بحث وتمحیص کے راستے بند ہوجاتے۔

الفاظ کے عمق اور سطح کا پتہ چلانے کے معیار ''مجہول'' رہ جاتے۔ فکر کی آگ مشکلات کے جس چقماق سے روشن ہوتی وہ نہ ہوسکتی تھی۔ غرض یہ کہ سخن کا تنوع نہ ہوتا تو اظہار کے اسالیب معدوم ہوجاتے۔ اس طرح نہ افکار جنم لیتے اور نہ رہنمائی کی سمائی ہوتی۔ قرآن جو تمام اصنافِ سخن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ناممکن ہے اور ابلاغ و اظہار کا ایسا طریقہ اختیار کرتا جو انسانوں کے معلوم کردہ طریقوں سے مختلف ہوتا۔ مگر ایسا ہوتا تو اسے سمجھنے کی کیا صورت ہوتی؟ لیکن جو کج فطرت محکمات پر دست درازی نہیں کر سکتے۔ وہ متشابھات کی وسعت کے باعث اس ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ پہلودار کلام میں کیڑے نکالیں اور اسے مفہوم کا جامہ پہنائیں جو ان کی کج فطرت کی طرح فتنہ اور غلط تعبیر کا حامل ہو(آل عمران 49-48)

یہ آیت دوررس نتائج کے اعتبار سے قرآن لاریب کی بابت اس کی قطعیت کو مشکوک بنا دیتی ہے کہ بعض تو محکمات ہیں یعنی لفظ اور معنی کے لحاظ سے شبہات سے پاک ہیں اور یہی کتاب کا اصل ماخذ ہے اور متشابہات جو شکوک وشبہات پیدا کرتی ہیں لہٰذا کجرو انکی کی تاویل کے پیچھے لگے رہتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کرسکیں۔ حالانکہ ان کی تاویل کا علم صرف راسخون فی العلم یا اللہ جانتا ہے۔

اگر یہ اس کتاب کی علمی حیثیت ہے تو یہ قرآن کے اپنے دعوے کی نفی ہوتی ہے کہ یہ لاریب ہے(بقرہ:1) یعنی ایسی کتاب جس کے الفاظ ومعانی سے لے کر مفاہیم تک میں شکوک راہ نہ پاسکیں جب کہ واضح آیات کی موجودگی میں متشابھات اور مبہمات کی بہتات الجھن پیدا کرتی ہے اور تضاد کے دریچے وا ہوجاتے ہیں۔

دراصل وحی الٰہی مخاطب قوم کی زبان ومحاورات کو ملحوظ رکھ کر گویا ہوتی ہے۔ قوم کے پاس اصناف سخن کا جتنا ذخیرہ ہوتا ہے اس میں کلام کرتی ہے۔ استعارے، مجاز، حقیقت، ایجاز، تفصیل، اشارات، وحی الٰہی بھی اصناف کے انہی مزاج میں بات کرتی ہے اور یہ سب عربی مبین کا حصہ ہیں مگر چونکہ ذہنی مدارج مختلف ہوتے ہیں کوئی جاہل۔ کوئی کم علم اور کوئی فکر رسا قوم ایک مگر اس کے انسانی شناور اپنے ذوق اور ذہنی پرواز کے مطابق ایسے الفاظ چن کر لاتے ہیں کہ بعض وہ جو ان الفاظ کی باریکی کا ذوق نہیں رکھتے۔ وضاحت کے طالب ہوجاتے ہیں مگر یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان شعراء وادباء کے محاورات ناقابل فہم اور شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔

غالب کا کلام ہو یا حافظ شیرازی کا، اہل زبان کے لیے اس میں کوئی چیز ناقابل فہم نہیں ہوتی۔ متشابہات سے نہ تو قرآن

لاریبیت کی نفی ہوتی ہے نہ اشتباہ اور ابہام راہ پا سکتا ہے کیونکہ متشابہ کے معنی ہیں ہو بہو۔ ملتا جلتا۔ اور جن لوگوں نے ان کے معنی ''شکوک وشبہات'' کیے ہیں وہ نہ تو ذوقِ لطیف کے مالک تھے کہ الفاظ کی نزاکت وباریکی کو سمجھ سکتے اور نہ یہ شعور کہ اصناف سخن سے زبان کی فصاحت وبلاغت متاثر نہیں ہوتی بلکہ اس میں حسن ورونق آ جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے خود کہہ دیا کہ آیات محکمات اصل اور بنیاد ہیں تو چاہیے تو یہ تھا کہ متشابہات کو انہی روشنی میں دیکھا جاتا۔ مگر ٹیڑھے دل والے اصل کو چھوڑ کر ''ملتے جلتے'' میں راہ نکالنے لگ گئے۔ کیونکہ اصناف سخن کی اس صنف سے ان کی غلط روی کے لیے گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔ اگر یہ کج فکر نہ ہوتے تو جس طرح شعراء اور ادباء کے کلام کے بعض اسرار وحقائق کو سمجھنے کے لیے اساتذہ فن وماہرین لسانیات سے رجوع کیا جاتا ہے تو چاہیے تھا کہ راسخون فی العلم سے پوچھتے کہ وہ بہتر رہنمائی کر سکتے تھے۔

وحی الٰہی نے بعض ایسے بھی الفاظ استعمال کیے ہیں جو مختلف نسبتوں سے مختلف معانی واضح کرتے ہیں یہاں سے استعارہ مجاز اور کنایہ کا سفر شروع ہوجاتا ہے مثلاً شیر کا لفظ ایک درندہ کے لیے خاص ہے مگر یہی لفظ جب کسی انسان کی صفت کے لیے استعمال ہوگا تو اس سے مفہوم درندگی تو نہیں ہوگا بلکہ شجاعت وبہادری کا وصف مراد لیا جائے گا۔

اس طرح ہاتھ پاؤں جو دوسری مخلوق کے بعض حصوں کے نام ہیں ان کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر بھی ہوا ہے مگر نسبت کے بدلنے سے ان الفاظ کا وہ مفہوم نہیں رہے گا جو عام مخلوق کی صفت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح ''ید اللہ'' سے مراد اللہ کی قوت۔

انسان سنتا بات کرتا اور دیکھتا ہے اس طرح اللہ بھی سمیع وبصیر ہے۔ لہٰذا ایسے الفاظ جو خالق ومخلوق کی صفت کے لیے یکساں استعمال ہوئے ہوں۔ وہاں شکوک وشبہات کی بجائے اہل زبان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جو زبان کی وسعتوں اور مزاج کے شناور اور مجاز واستعارہ کے عالم ہوں یا پھر ملتے جلتے اوصاف کی حقیقت اور کنہ معلوم نہ کر سکنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ جس طرح کسی شاعر کا کلام سمجھنے کے لیے نہ صرف اہل زبان بلکہ شعری ذوق رکھنے والے سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اس طرح قرآن کی ان متشابہات کو بھی ان دانشوروں سے سمجھیں۔ قرآن آسان ضرور ہے مگر اس کی آسانی کے یہ معنی نہیں کہ اس کی زبان سمجھے بغیر سب کچھ سمجھ جائیں۔ علم کا رسوخ یہ ہے کہ معانی القرآن کے ضمن میں کہ ضرب الامثال ومحاورات اور تمام اصنافِ سخن پر دسترس حاصل ہو۔ ان متشابہات کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے ہے۔ اور اس کا حل سمجھنے کے لیے محاورات، سخن فہمی کے اصناف سمجھ میں آنا ضروری ہے۔

مجازاتُ القرآن:

الفاظ کی اصطلاحات کو اِستعارے اور مجاز کے خمیر سے گوندھا گیا ہے۔ اگر ادبیات میں مجاز کو حقیقت پر محمول کیا جاتا تو ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں اس سے مفاہیم کی بساط تہہ وبالا ہوکر رہ جاتی۔ شاعری کی تینوں اقسام رزمیہ۔ طربیہ اور المیہ میں سے آخری صنف نہایت اہم اور ادبیات کی روح ہے۔ اہل تشیع نے افسانہ کربلا کو غم وخون کے ایسے آمیزے سے ترتیب دیا ہے کہ مدتوں اس

سے دل و دماغ متاثر رہیں گے۔غم کے اظہار کے لیے ’’حزنیہ‘‘ ایسے استعارات کا انتخاب کرنا جو پاکیزگی اور اثر انگیزی کے اعلیٰ معیار پر پورے اترنے والے ہوں۔صرف شیعہ ہی کا کام تھا۔جب کہ شہادت عثمان کا واقعہ بھی کس طرح سے سانحۂ کربلا سے کم نہ تھا مگر ایک تو سنی اس ذوقِ لطیف سے محروم تھے جو اظہارِ غم کے لیے ایک بنیادی عنصر ہے۔دوسرے وہ اسلام میں کسی متبادل کے قائل نہ تھے۔وہ دین ہی کو مکمل سمجھتے اور شخصیت پرستی سے دور تھے۔بہر حال شیعہ کی حزینہ شاعری بلاشبہ ادبیاتِ قوم کی جان ہے اور دنیا اس سے استفادہ کرتی رہے گی۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عرب مجاز اور استعارے سے پہلے بھی آگاہ تھے اور اسلام کے بعد بھی ان کے استعمالات کی باریکیوں اور مقامات سے بخوبی آگاہ۔قرآن ان کی زبان میں اترا جس میں ہر صنفِ سخن کو پہلے ہی جائز مقام دیا گیا تھا۔لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ مجازات القرآن کے موضوع پر جتنا مواد میسر ہے یہ شیعہ کی ذہانت کا مرہون منت ہے لیکن دکھ یہ ہے کہ سیاسی سطح پر جس نے بھی علویوں سے ہمدردی کی تو اس کو لامحالہ شیعانِ علی کا خمیر تصور کر لیا گیا۔امام فراء نحوی (822م) ایک نابغہ عصر امام، لبرل تھے، ادب اور دانش پر پورا عبور سب سے پہلے اعجاز القرآن پر دو جلدیں لکھیں۔اس کو شیعہ گردانا گیا مگر ادبیات عرب پر وسیع نظر اور امور جاہلیت ومجازات قوم سے ایک لبرل (معتزلی) کو ہی دلچسپی ہوسکتی ہے۔محدثین کی اکثریت شیعہ ہونے کے باوجود اپنے استدلالات میں معتزلہ سے رجوع کرتے رہے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ سلف میں حصولِ علم کے لیے گروہی اساس پر نظر نہیں رکھی جاتی تھی۔معتزلی امام ابو محمد بن عبداللہ (889م) امام ابو عمر (770م) نے مجازات القرآن کے نام سے کتابیں لکھیں۔

غرائب القرآن:

غرائب سے مراد نادر اور کم شنید معانی۔سب سے پہلے ابو عبید معمر (823م) نے غرائب القرآن لکھی ہے یعنی عجیب و غریب ونکتہ ورانہ باتوں سے مفہوم لینا۔جو عام لوگوں کی سماعت میں کم ہی گونجتی ہوں۔یہ ایک نہایت احتیاط طلب اور دقیق معلومات کا متقاضی ہے کیونکہ ہر کس و ناکس بحرِ غرائب میں غوطہ زنی نہیں کر سکتا۔جن کو عربی ادب پر عبور ہو اور جو شنیدہ و ناشنیدہ محاورات وضرب الامثال کو خوب جانتا ہو وہی غرائب بیان کر سکتا ہے۔

نوادر القرآن:

کسی عبارت سے ایسا مفہوم نکالنا جس میں ’’ندرت اور قلت پائی جائے۔‘‘ یعنی وہ مفہوم نادر بھی ہو اور استعمال میں قلیل بھی ہو۔اسے ’’نادر‘‘ کہا جاتا ہے۔مثلاً بَغْتَةً ’’ناگہانی گھڑی‘‘ اب اس اچانک کا بھی تعین کر دیا کہ نزول آیت کے 1802 برس بعد قیامت آجائے گی۔یہ نوادرات لکھنے والوں۔امام حسن عسکری کے مصاحب احمد بن محمد بن سبا بصری (939م) علی بن حسین بن فضال شیعی (224م)۔نمونے ملاحظہ کریں۔

1- سورۂ مائدہ آیت (91) بے شک ابلیس تمہارے درمیان شراب نوشی اور قمار بازی کے ذریعہ دشمنی پھیلائے یہاں مشروب سے مراد ابوبکر اور قمار سے عمر لیے گئے ہیں۔

2-بقرہ میں جس گائے کے ذبح کا حکم ہے وہ عائشہؓ ہیں۔(اصول کافی۔کلینی)

3-سورۃ النساء(52-51) میں غاصب معاویہ اور عمرو بن العاص

4- نور: آیۃ 35: المصباح سے مراد حسن، المصباح مِنَ الزجاجہ سے حسین، شجر مبارکہ ابراہیم، لاشرقیہ لاغربیہ سے مراد ابراہیم، نہ نصرانی یہودی، یھدی الی النور سے مراد اہل بیت (تفسیر علامہ ابوالحسن علی بن ابراہیم)(فصیح فی شیریں کلام۔خوش بیان) اس طرح کی خرافات سے ان کے نوادرات ہیں۔(بلیغ۔کلام میں انتہا تک پہنچی ہوئی)

سنیوں کے نوادرات:

سورۂ فتح کی آیت نمبر 29 میں اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ سے مراد ابوبکر، فَاٰزَرَهٗ سے مراد عمر، فَاسۡتَغۡلَظَ سے عثمان، فَاسۡتَوٰى عَلٰى سُوۡقِهٖ سے مراد علی ہیں۔

ان کی بھی اس طرح سے خرافات ہیں۔

بلاغۃ القرآن:

قرآن فاتحہ سے الناس تک بلاغت ہے سراپا بلاغت۔حسن ہے۔تابانی ہے عرب جو خود بلاغت اور فصاحت میں یکتا تھے۔وہ بلا امتیاز قرآن کو بھی فصاحت و بلاغت کے انسانی معیار سے بہت اونچا سمجھتے تھے۔وہ ابھی وحی کی حقائق کا ادراک نہ کر پائے تھے کہ اس کی فصاحت و بلاغت کے آگے سر جھکا چکے تھے جن لوگوں نے قرآن کی بلاغت کا مذاق اڑایا وہ یہی عجمی نژاد مسلمان تھے۔اس گروہ کے سرخیل علامہ ابوالفتح عثمان شیعی (293ھ) تھے۔ اور نشۂ بلاغت میں اس قدر کھو گئے کہ قرآن میں خامیاں نظر آنے لگیں چنانچہ یوسف کی آٹھویں آیت خَيۡرٌ حفِظًا ؐ (12:64) کی جگہ خَيۡرٌ حِفۡظًا ؐ (12:64) (حا کے ساتھ زیر) ہونا چاہیے۔تاہم امام عبدالقادر جرجانی نے (1078م) اس موضوع پر ایک نہایت معرکۃ الآراء کتاب لکھ کر حق ادا کر دیا۔اصل شے حکمت ہے اور یہی صحیح راہ عمل ہے۔

ڈیڑھ ہزار سال بعد نئے قرآن کی تخلیق

روایت پرستوں نے قرآن کی حفاظت کا اعلان آسانی سے قبول نہیں کیا بلکہ برابر اس کاوش میں لگے رہے کہ ہر وہ حربہ جس سے قرآن کی لاریبیت اور مثلیت مشکوک ہو سکے، اختیار کرنا چاہیے۔ ویسے تو اختلاف قراءت کے بہانے اس موضوع پر درجنوں کتابیں ہیں مگر ان تک عامۃ الناس کی رسائی امرِ ناممکن ہے۔ اب پندرہ سو سال بعد ان کو خیال آیا کہ قرآن پاک کا ایک ایسا نسخہ شائع کرنا چاہیے۔ جو اصل قرآن کے متن کے حاشیہ پر تمام قراءتوں کی تفصیل پر مشتمل ہوتا کہ اصل قرآن کے پہلو بہ پہلو عامۃ الناس ان خانہ ساز قراءتوں سے بھی آگاہ ہوتے چلیں جو ان کے دعویٰ کے مطابق کلامِ خدا ہونے کے باوجود عالم بشریت کے سینوں سے محو ہو چکی تھی چنانچہ اس جذبہ محرکہ کے تحت شام کے بڑے قاری الشیخ محمد کریم، الشیخ محمد فہد خاروف اور علوی بن محمد نے ایسا ہی قرآن شائع کر کے غالباً پہلی بار تقسیم کیا اور ان خانہ ساز قراءتوں کے تواتر پر قاضی عبدالوہاب بن علی عرف تاج الدین السبکی (1370م) کا فتویٰ بھی شامل کر دیا ہے۔ یہ امام مرحوم قدآور عالم دین مناظر، مباحث، محقق، اسالیب گفتگو بھی قادر اور شام کے چیف جسٹس تھے۔ اور روایات نے ان کو گمراہ کر دیا تھا۔ اصول فقہ پر کئی کتابیں لکھ کر تواتر کو ایسا مفہوم پہنا گئے ہیں گو یا تواتر کا ان کو پتہ بھی نہ ہو۔ غلو کی انتہا نے خانہ ساز قراءتوں کو اصل قرآن کے ہم پلہ اور ہم مثل قرار دے کر قرآن کی لاریبیت کو مشکوک کرنے کی جسارت کر بیٹھے۔ حالانکہ اس کی مثل تو ہو نہیں سکتی۔ (لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ، اسرائیل:88)

شراب کے نشہ میں دھت الزام ثابت ہوا اور منصب سے فارغ ہو کر جیل چلے گئے۔ پھر پا بجولاں اصلی وطن مصر پہنچا دیا۔ طاعون کی وجہ سے ہلاکت ہو گئی۔

❁❁❁

''تاریخِ لغت، ادب اور اشعار جاہلیت کے تناظر میں''

ریسرچ اور تحقیق کے میدان میں شاذ و نادر ہی کوئی گروہ ایسا ہوگا جو تبلیغی مقاصد بھی رکھتا ہو اور مخالفین پر تنقید کے وقت حق و انصاف کا دامن بھی اس سے نہ چھوٹے۔ مستشرقین نے اپنے مشنری مقاصد کے پیش نظر اسلام اور قرآن پر جتنا کچھ بغرض تحقیقی مواد پیش کیا ہے۔ انہوں نے پوری پوری کوشش کی کہ قرآن کی لاریبیّت کو مشکوک کر دیا جائے۔ چنانچہ عربی ہجاء کے اٹھائیس حروف میں سے بائیس کے قریب حروف میں ان لوگوں نے ترکش کے تیر چلانا شروع کر دیئے کہ ان حروف کے نقاط اگر اڑا دیئے جائیں تو پہچان کی صورت باقی نہیں رہتی۔ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ابتدائی دور میں عربی حروف ''بے نقط'' تھے۔ یا اہل عرب ان سے آشنا ہی نہیں تھے تو قرآن کے سینکڑوں حروف اور ان سے ترتیب پانے والے الفاظ جو قاری اپنی صوابدید کے مطابق پڑھا کرتے تھے تو وہ ''تواتر'' کے مراحل میں سے کیسے گذر پائے، یا تو صحیح مانے جائیں گے یا سب کے سب غلط۔ صحیح ماننے کی صورت میں تواتر کی بات ختم ہو جاتی ہے اور غلط تسلیم کرنے کے بعد صحت کا معیار ختم ہو گیا'' گویم مشکل نہ گویم مشکل'' اب اس سے تو قرآن کی حفاظت و عصمت کا عقیدہ تار تار ہو گیا۔

ذرا یہ اپنے گمنام ماضی پر نظر دوڑائیں کہ زبانیں ارتقاء سے گزر کر تہذیب یافتہ ہوتی ہیں۔ ارتقا کے مراحل ایک ہی جست میں طے نہیں کر پاتیں انہوں نے مکارانہ حکمت عملی سے انگریزی کے ارتقائی پس منظر کو تو نہیں چھیڑا۔ مگر قرآن اور اس کی زبان پر حملہ آور ہو گئے تا کہ اس طرح قرآن کی لسانی فصاحت، جامعیت اور بلاغت کے سامنے دم نہ مار سکنے والے یہ کوتاہ قد، اپنی درماندگی پر پردہ ڈال سکیں۔ اعتراض اگر معقول ہو تو علمی بنیاد پر اس کا جواب دیا جائے گا۔ ان میں اہل انصاف مستشرقین بھی ہیں جنھون نے نہ تو جاہلی لٹریچر سے انکار کیا ہے اور نہ ہی قبل از اسلام لسانی شواہد کو مسترد کیا ہے۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض ''امی'' ان پڑھ پہ ہے کہ ان کی تحریر اتنی شائستہ نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ کسی مہذب معاشرہ خطاب کرنے کی اہل ہو سکتی۔ مقصد یہ ہے کہ اُمی جب اظہار پر قادر نہیں ہوتے تو وہ غیر اُمیوں کو کیسے خطاب کر سکتے تھے؟

امیّت:

ہمارے ہاں امیّت کو نبوت کے فضائل میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ بات غیر مسلموں کے لیے قابل اعتراض ہو جاتی ہے کہ نبی ﷺ ان پڑھ تھے مگر یہ نبوت سے قبل تھا۔ بعد میں نہیں ''وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا

1043 لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴿۴۸﴾ (29:48) تو باطل حق بجانب ہوتے شک کرنے میں)۔لیکن قرآن کے نزول کے ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً﴿۲﴾فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴿۳﴾ (98:2-3) فعل حال میں قرآن نے بتا کر ازالہ کر دیا کہ قرآن کے نزول کے بعد آپ ﷺ اِن پڑھ تھے۔ابن فارس (1004م) اس نظریہ کی شدت سے مخالفت کی ہے کہ یہ عرب ان پڑھ تھے اس نے سینکڑوں عربوں کے نام گنوائے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے علوم وفنون میں اچھی دسترس رکھتے تھے جس طرح ہم میں ہر شخص لکھا پڑھا نہیں ہوتا۔اس طرح ان میں بھی سب کے سب نہ لکھے پڑھے اور نہ ان پڑھ۔ اُمِّيُّوْنَ کا لفظ قرآن میں کتابی امیت سے بھی مراد ہے کیونکہ یہود ونصاریٰ کے پاس کتاب تھی مگر عربوں کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔''وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ط''(3:20) اب الکتٰب کے مقابل اُمّیّن کا متضاد استعمال کر کے خود اس کا معنی مقرر کر دیا۔

عربی خط کی ابتداء:

عربوں میں بھی دیگر اقوام کی طرح پڑھے لکھے بھی تھے اور ان پڑھ بھی۔ جہالت عارضی اوصاف ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے علم کے ذریعہ۔عرب روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس عربی خط کی ابتداء ہجرت سے دوسو سال پہلے ہوتی نظر آتی ہے۔کالیڈیا کا مرکز حیرہ میں اس کی ابتداء ہوئی۔حیرہ کوفہ سے ساڑھے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔شاہان عجم عربی النسل تھے۔ یمن سے نکل کر شام وفلسطین آ گئے تھے۔یہ علاقے مختلف تہذیبوں کی جنم بھومی تھے۔کوئی بھی نئی مملکت تحریر وخط کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔تو شمالی کنارے پر (فرات) آباد قدیم شہر انبار والوں سے رجوع کیا گیا۔اور انبار والوں نے خود بھی یمن ہی کے ایک قدیم خط حمیری کی نقل اتار کر کسی حد تک شائستہ بنا کر لخمیوں کی مدد کی۔یہ حمیری بھی یمن کے باشندے تھے۔جو صدیوں سے علم وفنون میں دسترس رکھتے تھے۔اور آخری وقت میں قسطنطین کے عہد (361م) میں عیسائیت قبول کی تھی۔اس طرح حمیری خط ایک مذہبی اور معاشرتی خط بن کر ایجاد کے مرحلہ میں داخل ہوا اور قحطانی عربوں کے بولان قبیلہ کے تین افراد نے اس کی تخلیق میں حصہ لیا۔اندازہ یہ ہے کہ دوسری یا تیسری صدی مسیح میں اس کا آغاز ہو چکا تھا۔جس کی تائید ان حجری نقوش کے چیتھڑوں پر لکھی ہوئی ملتی ہے۔اس کا زمانہ 210ء سے 450 تک پہنچتا ہے۔(فتوح البلدان۔مصر) تاریخ للّغات السامیہ۔کتاب المصاحف۔لندن ص504،وغیرہ وغیرہ)

عربی خط کی ابتداء کا صحیح زمانہ متعین کرنا دشوار ہے۔تیسری صدی تک جو نقوش دریافت ہوئے ہیں ان کی تعداد پانچ ہے۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

1-شمالی حجاز''سلح تہذیب اور مملکت کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ سقوط سلح کے 106 سال بعد (210م) میں جو تحریر لکھی گئی اس کا طرزِ تحریر اسلامی خط کے ابتدائی دور سے ملتا جلتا ہے۔پہلی سطر کا چوتھا لفظ''بِن'' اور پانچویں سطر کا لفظ''یعلیٰ'' اسلامی خط کے بالکل مشابہ ہے۔

2- دوسری تحریر وادی سینا سے ملی۔ جو 230م میں تحریر ہوئی۔ اس کی پہلی سطر کا لفظ سلم اور آخری سطر کا لفظ اسلامی عربی کے ہو بہو ہے۔

3- تیسری تحریر بھی وادی سینا سے ملی۔ جو 253م کی ہے۔

4- چوتھا نقش شمالی حجاز مدینہ سے 300 میل کے فاصلہ پر وادی حجر

5- یہ نقش 270ء کا الجمال کے گاؤں سے بغیر تاریخ کے ملا ہے لیکن کانٹ کے خیال میں یہ 270ء کا ہے۔

چوتھی صدی مسیحی:

اس صدی میں منطقہ حوران کے مرکزی شہر نمارہ میں عربی بادشاہ امراء القیس بن عمرو (328م) کی قبر سے دریافت تحریر ہے۔ اور یہ عربی رسم الخط کی اہمیت میں سابقہ تمام تحریروں سے زیادہ مددگار ہے اور اس کے اکثر الفاظ ساخت۔ ہئیت ترکیبی اور صورتِ خطی کے لحاظ سے اسلام کے ابتدائی رسم الخط سے عین مشابہ ہے۔ یہ تحریر عربی خط کے تدریجی ارتقاء اور تہذیبی اتار چڑھاؤ کا صحیح سراغ دیتی ہے۔

چھٹی صدی:

تا حال اس صدی کے دو نقوش برآمد ہوئے ہیں۔ پہلا خط فرات کے پاس زبد سے 511م درج ہے۔ یہ تین زبانوں، یونانی، سریانی اور عربی میں کندہ کرایا گیا ہے۔ اس کا رسم الخط اسلامی عہد کے کوفی رسم الخط کے مشابہ ہے۔ چند کے سوا اس کے تمام الفاظ عربی کے ہیں۔ دوسرا نقش (568م) کا ہے یہ شام کے ایک گرجا گھر سے نکلا ہے۔

یہ تمام نقوش ڈاکٹر ناصر الدین الاسد کی کتاب ''مصادر الشعر الجاہلی'' سے مل سکتے ہیں اور ان نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ عربی خط اسلام سے دو سو سال پہلے بلا واسطہ اور بالواسطہ چار سو سال پہلے رائج ہو چکا تھا اور واضعوں کے بلند تخلیق مذاق کی وجہ سے تمام عیوب و نقائص سے اسے صاف رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یعنی خط کی نوک و پلک کی درستی نہیں بلکہ وہ عیوب جو ایک کثیر التشابہ زبان میں ہو سکتے ہیں ان کو صاف رکھنا مراد ہے اس کے اور اسلامی عہد کا آغاز ہوتا ہے مگر مسلمانوں کی بے توجہی کہ قرونِ اوّل کا اتنا قیمتی اثاثہ یوں لاپروائی کی نظر ہو گیا کہ آج ہم پورے وثوق سے نبی ﷺ کے عہد کا لکھا ہوا قرآن کا کوئی نسخہ بھی دریافت نہیں کر پاتے تاہم عربی عہد مبارک کی تین تحریرات بھی اس وقت بھی محفوظ ہیں اور ہم عربی خط کی تاریخ کے ضمن میں نتائج اخذ کرنے میں بھٹک نہیں سکتے۔ پہلی تحریر عثمان رضی اللہ عنہ (655 م) کی ہے۔ اس پر 31ھ (640م) کی تحریر درج ہے جو قاہرہ میوزم میں ہے اور مصحف جس پر خون کے دھبے ہیں تاشقند میں موجود ہے جو فوٹو کے ذریعہ پاکستان بھی منتقل ہو چکا ہے۔

دوسری تحریر غزوہ خندق 5ھ (627م) کی جو مدینہ منوّرہ کی چوٹی سے برآمد ہوئی۔ تیسری تحریر بھی عہد صحابہ کی ہے جو 58ھ (677م) طائف کے بارانی ڈیم کی تعمیر پر کندہ ہے اس تحریر میں نقاط صاف نظر آ رہے ہیں یعنی صحابہؓ نقاط سے آگاہ تھے اور

حجاج سے 68 سال قبل نقاط ڈالے جاتے تھے۔ان تحریروں سے معلوم ہوگا کہ قرنِ اوّل کی عربی میں نہ تصنع تھا اور نہ عبارت آرائی کا تکلف اور نقاط بھی واضح۔

اور چوتھی تاریخی شہادت وہ وثیقہ جو 22ھ (642م) عمرؓ کے زمانے میں یونانی اور عربی زبان میں لکھا گیا تھا اور حروف نقاط سے مزین ہیں۔

نقطوں کی ابتداء:

ہمارے سفر کی آخری منزل شروع ہورہی ہے۔جب تک کسی معاشرہ کا پڑھا لکھا ہونا ثابت نہ کیا جائے۔جب تک مسلکی و مذہبی ضروریات کے لیے کسی تحریر اور صورت خطی کی ایجاد کو یقینی نہ بنایا جائے۔تب تک اس کی تہذیب وشائستگی اور تحریر کے اسقام کا ازالہ۔پسندیدہ بات نہ ہوسکتی تھی۔حمزہ اصفہانی (970م) کے مطابق حجاج بن یوسف نے حروف پر نقاط لگانے کا کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ سراسر مغالطہ ہے کیونکہ مندرجہ بالا چار ثبوتوں کے بعد اصفہانی کی بات ناقابل اعتبار ہوجاتی ہے۔البتہ یہ بات درست ہے کہ عرب خط کا اصل ماخذ نبطی خط ہے جس میں نقطوں کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔(اصل الخط العربی۔خلیل یحییٰ۔مصر)

عربوں نے نبطی ماخذ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ضروریات کے مطابق اضافہ کرتے رہے۔عربی خط کی ابتداء اسلام سے چار سو سال قبل ہوچکی تھی۔رسم الخط میں تغیر وتبدل زبانوں کی زندگی کا موجب ہوتے ہیں۔کوئی زبان بھی قطع وبرید کے بغیر زندہ زبان نہیں کہلاسکتی۔اس کو مرحلہ وار تبدیلیوں کی پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔اسے مہذب بنانے، درجۂ کمال تک پہنچانے اور لفظی تشابہ دور کرنے کے لیے بولان قبیلہ کے تین اشخاص نے جو زندہ جاوید عمل سرانجام دیا تھا۔لسانیات میں اس کی تاریخ ملنا محال ہے۔ان تین میں سے ''عامر بن جدرہ'' عربی خط کی ایجاد کے ساتھ ''نقطے'' ایجاد کیے تھے۔اور یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ صحابہؓ نے جب آنکھ کھولی تو وہ نقطوں سے آگاہ تھے۔لہٰذا یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ نقطوں کی ایجاد بھی اتنی ہی قدیم تھی جتنا کہ عربی حروف۔لہٰذا نقطوں کے موجد نہ حجاج (714م) تھے اور نہ ہی ابوالاسود دولی (681م)۔یہ تاریخ پر افتراء ہے۔ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے خطی تہذیب کے مطابق نقطوں کی ہیئت وساخت میں تبدیلی کی ہو۔حجاج نے چھوٹے سائز کے نقطے استعمال کرنے کی تجویز دی ہو۔مشہور مورخ اور انساب ولغہ کے ماہر علامہ احمد بن علی (1418م) لکھتے ہیں:

> ''سابقہ تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ جونہی عربی کے حروف وضع ہوئے۔ساتھ ہی نقطے بھی وضع کیے گئے کیونکہ یہ عقل ودانش سے بعید ہے کہ صوری مشابہت کے باوجود عربی حروف کو اس وقت تک نقاط سے خالی رکھا گیا جب تک مصحف پر نقطے نہیں ڈالے گئے۔''

مصحف نبوی نقطوں کی آرائش میں:

صحابہ کرام کا یہ عقیدہ تھا اور ہمارا بھی یہ ہونا چاہیے کہ قرآن میں زیر، زبر، پیش، جزم اور نقاط جیسا بنیادی کام حضور ﷺ سے

اگر پہلے تشنۂ تکمیل تھا تو حضور ﷺ خود ہی اسے تکمیل تک پہنچا گئے تھے۔سیوطی (1505م) کو اعتراف ہے کہ نبی ﷺ کا مصحف نقاط سے مزین کیا گیا تھا کیونکہ حروف ''آنکھیں اور نقاط ان کا ''نور'' تھے۔جب کہ روشنی نور سے ہی پھیلتی ہے۔انہی کے بارے میں ارشاد ہے ''اِعْرَبُوا الْقُرْاٰنَ''

یہاں اعراب سے مراد تحریر کے تمام قواعد وضوابط ہیں جو عہد نبوی میں رائج تھے۔تنہا زبر، زیر، پیش نہیں اس پر نقط ڈال دینے سے ہی دور ہو سکتے ہیں۔

نقطے حذف کرنے کی سازش:

اس سازش کا انکشاف امام شمس الدین محمد جزری (1429م) نے کیا۔''بعد میں صحابہ کرام نے مصاحف لکھنا شروع کیا تو نقاط اور دیگر علامات کو اس بنیاد پر حذف کر دیا کہ الفاظ مختلف قراءتوں سے پڑھے جاتے تھے۔ان کی بابت آگے کی آخری قراءت کو مدِّنظر رکھنا مطلوب تھا تاکہ فائنل فیصلے کے بعد ہی آخری قراءت کو تحریر کیا جائے۔لیکن نقطے پہلے سے ڈال دیئے جاتے تو ایک ہی قراءت کا تعین ہوجاتا اور دیگر قراءتیں ملحوظ رکھنے سے رہ جاتیں۔''(جو کہ قرآن ساز اداروں کو مطلوب نہیں تھا)

یہ امام جزری نظریۂ اختلاف قراءت کے پرجوش حامی تھے اور انہوں نے اپنی تصانیف میں ان کو نمایاں کیا ہے اس لیے شک وابہام پیدا کرنا ان کی مجبوری تھی مگر یہ بھی اعتراف ہے کہ نقطے حذف کرنے کا کام رسول ﷺ کی رحلت کے بعد شروع ہوا۔ یہ کبھی بھی ایسی جراءت نہیں کر سکتے تھے (بعد والے) اس سے تو قرآن کی لاریبیّت مشکوک ہوجاتی ہے۔ان تمام لوگوں یعنی جذری یا سجستانی۔حسین نوری (1902م) سب نے صحابہ کرام کو اس سازش کا عنصر قرار دیا ہے حالانکہ اس کی حفاظت کا ذمہ تو اللہ نے لیا ہے۔قرآن منزّل ہے اسے متواتر کہنا بھی انسانی معیار پر لانے کی جسارت ہے۔تنزیل کے مستحکم حصار سے تواتر کے کمزور انسانی معیار پر لانا تو اسے مشکوک بنانے کی سازش ہے۔

جب عربیت کا دوسرا دور شروع ہوا تو بولان کے تین اختراعی دماغوں نے عربی مزاج کے مطابق رسم الخط بھی ایجاد کیا اور نقطے بھی وضع کر دیئے۔اور جب یہ عربی ارتقاء کی منازل طے کر کے قرآنی عہد میں داخل ہوئی تو اس وقت کی عربی اعلیٰ مدارج کی فصاحت وبلاغت کی بلندیوں کو مس کرتی ہوئی بہت آگے بڑھ چکی تھی۔اب قرآن کے طفیل اس میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم پیدا ہوگئی تھی کہ لغت، ادب، گرائمر اور دیگر علوم عالیہ کی ماخذ بن کر زندہ زبانوں کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر چل سکتی تھی۔ایسے ہی دور میں قرآن نے اسے منتخب کیا اور قرآن کے انتخاب کے بعد پندرہ سو سال بعد کی عربی اور آج کی عربی میں سرمو فرق نہیں ملے گا۔ نہ ہجہ میں، نہ لہجہ اور نہ سٹائل میں۔یعنی قرآن سے پہلے ہی تحریری اور لسانی اسقام سے پاک ہوچکی تھی اور دنیا کی سب سے زیادہ بلند ترین سائنٹیفک زبان ہے۔

امام الہند کا تبصرہ:

پس یہ معلوم ہو گیا کہ عربی ادب کی تاریخ اس عہد سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ جو عہد عام طور پر سمجھ لیا گیا تھا کیونکہ موسیٰ سے پہلے اگر سفرِ ایوب علیہ السلام جیسی نظم عربی میں لکھی جا سکتی تھی تو یقیناً عبرانی ادب کے نشوونما سے صدہا سال قبل عربی ادب پوری طرح ترقی یافتہ ہو چکا تھا۔ بلاشبہ سفر ایوب کی عربی وہ عربی نہیں ہوگی۔ جو نزولِ قرآن کے وقت بولی جاتی تھی۔ یقیناً عرب کی کوئی ابتدائی شکل ہوگی۔ جس کی اخوات ہمیں آرامی۔ کلدانی اور آشوری کتبات کے الفاظ و اسماء میں نظر آ رہی ہیں۔ قدیم مصری بھی اس کی جھلک سے خالی نہیں۔ تاہم وہ عربی زبان ہوگی اور اسی عربی نے موجودہ عربی کے تمام عناصر و مواد بہم پہنچائے ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ عہد جاہلیت کی عربی اگرچہ صحراؤں کی عربی تھی لیکن زبان کی نوعیت بول رہی ہے کہ یہ صحرائی قبائل کی پروردہ نہیں ہو سکتی۔ اتنی وسیع، اس قدر ہمہ گیر اتنی دقیقہ سنج اور اس قدر متمول زبان۔ ضروری ہے کہ صدیوں کی متوارث اور مسلسل ادبی زندگی سے ظہور پذیر ہوئی ہو۔ جو زبان قرآن کے معانی و دقائق کی متحمل ہوگئی۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اسے غیر متمدن قبائل کی ایک بدوی زبان تسلیم کیا جائے۔ جس زبان میں امراء القیس نے اشعار کہے ہیں اس عربی کی لغوی تاریخ اس سے بھی بہت زیادہ قدیم اور بہت زیادہ متمدن ہونی چاہیے۔ جتنی اس وقت سمجھی گئی ہے۔ گزشتہ صدی تک عربی کی لغوی تاریخ کا یہ مسئلہ ایک لاینحل مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اثری تحقیقات نے بحث و تعلیل کا نیا میدان پیدا کر دیا ہے اور عربی نسل اور زبان کی تاریخ بالکل ایک نئی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔ یہ زبان جس پر زندگی و خلود کی آخری مہر قرآن نے لگائی۔ دراصل مدنی نشوونما کے اتنے مراحل سے گزر چکی ہے کہ دنیا کی کوئی بھی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سمیری اور اکادی اقوام کا تمدن، نینوا اور بابل کی علمی کامرانیاں، قدیم مصری لغات کا عمرانی سرمایہ، آرامی زبان کا عروج و احاطہ، کلدانی اور سریانی کا ادبی تمول، دراصل ایک ہی زبان کی لغوی تشکیل و تکمیل کے مختلف مراحل تھے اور اس نے آگے چل کر چوتھی صدی قبل مسیح کی عربی کا بھیس اختیار کیا۔ جو زبان حضارہ و تمدن کی اتنی بھٹیوں سے تک کر نکلی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کے اسماء و مصادر کسی مفلس اور خام زبان کے اسماء و مصادر نہیں ہو سکتے۔ آج تعجب ہو رہا ہے کہ ظہور مسیح سے آٹھ نو سو برس پہلے آشوری اور بابلی زبان میں طبق، ملک، شمس، سما، فلک، نجم، ارض وغیرہ الفاظ ٹھیک ٹھیک انہی معانی میں مستعمل تھے۔ جن معنوں میں آج مستعمل ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جدید انکشاف 1923ء نے تو ہمیں قبل مسیح تیرہ صدیاں تک پیچھے ہٹا دیا ہے۔ عربی زبان کے ابتدائی مواد نے ایک ادبی زبان کی حیثیت لے لی ہے۔ اور اس میں نہ جو موجودہ اسماء و مصادر پائے جاتے ہیں بلکہ بعض حروف نحو یہ تک موجود ہیں مثلاً حرف عطف وہی ''وْ'' ہے اور ابتدائی شکل میں Y لکھا جا رہا ہے۔ الف لام بدستور حرف تعریف ہے اور ہر اسم کے پہلے اپنی نمود رکھتا ہے مثلاً الملک، الجبل، ذی (بمعنی ذو۔ ذوالجلال وذوالقرنین) ہر جگہ نمودار ہے۔ اسم اشارہ وہی ھُوَ ہے۔ علیٰ اس معنی میں ہے۔ نیز ملک، فعل، طمع، مخن، فتح، مہو، ٹھیک انہی معانی میں بولے گئے ہیں۔ جو لغت قریش کا حصہ ہیں۔

عربی کا یہ کتبہ ایک تابوت پر منقش ہے۔ اس میں ''احیرام'' ملک بیبلس کی لاش رکھی گئی تھی جو اس کے بیٹے ''ثو بعل'' کے حکم

سے تیار ہوا تھا۔ احیرام کا نام تورات میں بھی ہے اور زمانہ 1250 ق م ہے۔ کتبہ وہی ابتدائی عربی خط ہے۔ جس کی عام طور پر فنیقی[1043] خط کے نام سے پکارا جاتا ہے جس نے آگے جا کر آرامی، سریانی اور نبطی خطوط کی شکلیں اختیار کیں۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ تورات کے نزول اور کتب کانہ بابل کی انواح سے بھی پہلے عربی زبان کے موادر و مصادر نے ایک مکتوب و مرسوم زبان کی نوعیت اختیار کی تھی۔ یعنی اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ اس میں فرامین و اعلانات لکھے جاتے تھے۔ محض بول چال ہی کی زبان نہ تھی لہٰذا اگر 1250 قبل مسیح عربی زبان کا یہ حال تھا تو یہ بات کیوں عجیب سمجھی جائے کہ حضرت موسیٰ سے پہلے ایوبؑ نے عربی میں کوئی منظوم صحیفہ لکھا تھا اور شریعت حمورابی بھی اصلاً عربی کی کتابت ہے۔

❀❀❀

قرآنی اصنافِ سخن، استعارہ، مبالغہ، کنایہ، فوائے کلام، لحن الخطاب، تاویل، صفت، مشاکلت، تشبیہات

Parables, Symbolical, Figurative, Allegorical, Metophorical

''قرآن میں اصنافِ سخن''، فکرِ صحیح لفظِ صحیح کا متقاضی ہے۔ الفاظ نے فکرِ انسانی کی تاریخ پر جو اثر ڈالا ہے۔ مستقبل میں اس کا مکمل تجزیہ یقینا چونکا دینے والا ہوگا۔ الفاظ ہمارے فکر کے تقدیری پیمانے اور فکر ہمارے عمل کا سرچشمہ! زبان بھی تاریخی عمل کی پیداوار ہے اور لسانی تبدیلیاں اس کے ''تغیر پذیری'' کے رجحان غماز! لیکن معانی کا مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ لفظ کے اظہاری امکانات اسے لغوی معانی کی حدود سے نکال کر اعتباری اور مجازی معنی کی سطح پر لے آتے ہیں۔ اعتبار یقین اور مجاز دراصل استعارے کا سفر ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ ذہن انسانی الفاظ کو منطقی اور لغوی لزوم سے نجات دلا کر انہیں برتر حقائق کے انکشاف کا ذریعہ اور ترجمان بنانا چاہتا ہے۔ اعتبار و مجاز کا یہ عمل عہد بہ عہد تبدیلیوں سے روشناس ہوتا رہتا ہے لیکن تمام اعتباری و مجازی معانی کی عمر یکساں نہیں ہوتی۔ تہذیبی و تاریخی و نفس عوامل الفاظ کے اعتباری اور مجازی معانی کے دائروں کو وسیع یا محدود کرتے رہتے ہیں۔ ذہن انسانی اعتبار و مجاز کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہے کیونکہ معنی یابی اور ادراک حقائق کا یہی ایک وسیلہ ہے جو نفس انسانی کے تشکیکی عناصر میں موروثی طور پر موجود ہے۔ قرآن پاک میں تبین مقاصد کے لیے ان تمام اصناف سخن کا استعمال کیا گیا ہے جو قوم کی ادبیات کو زندہ جاوید کی حیثیت سے برقرار رکھ سکتی ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کرنا ایک زندہ زبان کی خصوصیات لطافتوں اور خوبیوں سے انکار کے مترادف ہے۔

ادبیات کے اس معیار کو ملحوظ رکھیے تو یہ حقیقت مسلّمہ نظر آئے گی کہ قرآن پاک اس عربی زبان میں نازل ہوا۔ جو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی طرح تمام اصنافِ سخن سے مالا مال ہے۔ اس میں ایجاز (اختصار) ہے۔ اختصار ہے۔ حذف ہے۔ تقدیر ہے۔ ضرب الامثال ہیں۔ محاورے، مکررات ہیں، تصریفِ آیات، فنونِ کلام، وسیع تر استعمالات ہیں (کام میں لانا)۔ حقیقت ہے۔ مجاز ہے تشبیہات ہیں۔ استعارے ہیں۔ فحوائے کلام ہے (اندازِ گفتگو)، کنائے، مطلق الفاظ، مقید مفاہیم ہیں۔ غرضیکہ وہ

1043
سارا کچھ ہے جو اصناف سخن یا ادبیات عالیہ میں شامل ہے اوران سب پر فصاحت و بلاغت۔ اگر ایسے میں کوئی صاحب کہہ دے کہ قرآن پاک تو صرف ایک ہی صنفِ سخن پر نازل ہوا ہے تو اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہیں ہوسکتا۔ اصناف سخن کی چند تفاصیل ملاحظہ فرمائیے۔

مبالغہ کی تعریف:

علامہ بدرالدین زرکشی (1391م) لکھتے ہیں۔ (البرہان فی علوم القرآن) مبالغہ یہ ہے کہ کسی شے کی ثابت شدہ اور ذاتی صفت میں زور یا کمی پیدا کرنے کے لیے ''تعریف'' کے ایسے الفاظ لائے جائیں جو اس صفت میں مزید زور پیدا کر دیں۔ یعنی مبالغہ میں ایسی زوردار صفت کا اضافہ کیا جائے جسے سامع بھی مشکل سے قبول کرے اور عقل بھی طالب ثبوت ہو۔ مثال۔ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ، اور دل (کلیجہ منہ کو آ گیا، احزاب: 10) دل کا مقام سے ہٹ جانا تو ایسا شخص فی الفور مر جائے گا۔ دراصل خوف و ہزن کی حالت کو مبالغہ سے تعبیر ہے کہ اس سے کلیجہ منہ کو آ گیا۔

وصف میں مبالغہ:

جب یہ مبالغہ وصف میں مطلوب ہو تو اسے حرف تشبیہ سے بھی ظاہر کیا جائے گا۔ زرکشی لکھتے ہیں:

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ (77:32-33) آگ کا وصف شعلے اگلنا ہے۔ انگارے برسا رہی ہے جیسے بڑے بڑے محل گویا پیلے پیلے اونٹ۔ یہاں اس وصف کو حرفِ تشبیہ کاف سے ظاہر کیا گیا ہے جیسے۔ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ (77:32) كَاَنَّهٗ (77:33) اس طرح شعلہ کی زیادہ اونچائی کو بلند و بالا عمارت كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ (77:32) اور کم اونچائی کو كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ (77:33) اونٹ کی اونچائی کے وصف سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی گویا کہ جیسے کہ مبالغہ شخصیت کی مناسبت سے: زرکشی کہتے ہیں۔ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ (89:22) جب کسی عظیم تر ہستی کی مناسبت سے اپنے دائرہ مفہوم سے نکل کر بھی آتا ہے اور ڈانڈے اسی وقت مجاز سے جا ملتے ہیں۔ اللہ نہیں آئیں گے صرف مبالغہ کے لیے ہے کہ آنے کے آثار و علامات نمودار ہوئے کہ مبالغہ کا ایک مجاز یہ بھی ہے۔ یہاں علامات و اوصاف کو ذات ہی سے شمار کیا جاتا ہے۔

مبالغہ کلام میں حسن پیدا کرتا ہے:

مبالغہ کی اس نوع کے مطابق قرآن میں بکثرت ایسے مقام ہیں جہاں اللہ سے مراد اس کے قانون کے ہیں۔ زرکشی ہی لکھتے ہیں۔ مبالغہ کلام میں انتہائی حسن و شیرینی پیدا کرتا ہے۔ نابغہ زبیانی (604م) کہتا ہے کہ ''ہماری سفید و روشن میانیں دوپہر کو چمکیں، میانیں چمکیں، کیا خوب مبالغہ ہے تلوار تو چمکتی ہے۔ یہاں میانیں چمکیں!

مبالغہ دراصل کلام میں حسن پیدا کرتا ہے گویا یہ حسن صرف مبالغہ ہی میں منحصر نہیں ہے اور نہ ہی اس سے سچائی پر پردہ ڈالا

1043
جا سکتا ہے لیکن اگر یہ صنفِ سخن واقعی معیوب ہوتی تو قرآن میں اس کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ مبالغہ کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ لفظ کو ایسے مفہوم میں استعمال کیا جائے کہ اس کے لغوی مفہوم سے میل نہ کھائے۔ جیسے کنایہ، تشبیہ، استعارہ و مجاز۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک مفہوم کو دوسرے مفہوم میں اس طرح پیوست کر دیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ ہیبت ناک اور ہولناک صفات نمایاں ہوں۔ جیسے ''ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جس کو لہروں پہ لہروں نے چھپا لیا ہو۔ اوپر کالے گھرے بادل۔ گھٹا ٹوپ بادلوں کے اندھیروں پر اندھیرے۔(55:3)

استعارہ اور اس کی تعریف:

علامہ زرکشی لکھتے ہیں کہ یہ بلاغت کی انواع میں سے ہے اور قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ابہام کا سدِّ باب کرنے کے لیے استعارے ہی کو کام میں لایا جاتا ہے کہ یہ اصطلاح میں فصاحت کے اعلیٰ درجہ کا نام ہے (البرہان)

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝۳۵ (2:35) اور دوسری جگہ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ (2:25) تحت کے معنی نہریں درختوں کے بیچ و بیچ گزرتی ہیں۔ زمین دوز ہوں تو بہنا کیسے معلوم ہوتا لَا تَقْرَبَا (2:25)۔ نہی کا صیغہ برائے حرمت ہے نہ کہ برائے دوام۔ یہ نہی عارضی اور مختصر وقفہ کے لیے اس وقت عائد ہوتی ہے جب کسی کی بہتری کے نمودار ہونے کا یقین ہو تو ڈاکٹر اس سے پرہیز کا حکم اس وقت دیتے ہیں جب تک یہ ضرر رساں ہو۔ ایسی نہی کو نہی برائے الوقایہ (پرہیز) کہتے ہیں۔ یہ پرہیزی نہی نہ تو کسی چیز کو حرام کر سکتی ہے اور نہ دائمی طور پر ممنوع۔ ذیل میں اس کی مثالیں ملاحظہ کریں۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ (2:235) ایک حلال کام سے چار ماہ دس دن تک روکا گیا ہے زیادہ مدت کے لیے نہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ (2:222)، لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (4:43)، اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ (3:41)، قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ (18:70)، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۝۶ (74:6) فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ۝۶۰ (12:60) مِنْهُ ذِكْرًا۝۷۰ (18:70) ان سے ثابت ہوا کہ آدم کو جس شجر کی قربت سے روکا گیا تھا وہ پرہیزی روک تھی۔ حرمت والی نہیں تھی۔ هٰذِهٖ قریب کا اشارہ یعنی معلوم اور پاس تھا۔ الف لام شجرہ کا لام عہد گواہی دے رہا ہے کہ وہ شے ان کو معلوم تھی۔ الجرجانی (1084م) کہتے ہیں کہ عرب فحش بات کا لفظوں کی بجائے کنایہ میں ذکر کرتے ہیں۔ الشجرۃ کنایہ ہے، اندامِ نہانی سے یہی وہ پھل ہے جس کو کپڑے اتار کر کھایا جاتا ہے یہ لکڑی کے درمیان سوراخ (Wedges) کو بھی کہتے ہیں۔ جو چیز بیچ میں داخل ہو کر دو کو الگ کر دے (عجاج) یعنی ملی ہوئی شے میں جب کوئی شے داخل کر دی جائے اور وہ کھل جائے تو اس کھلنے والے مقام کا نام ''شجرہ'' ہے۔ کوئی شے داخل کرو یا باہر کھینچ لو۔ مقام دخول و

1043 خروج کا استعارہ الشَّجرۃ ہوگا۔ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی بلیغ کنایہ ہوسکتا ہے عورت کی اندام نہانی کا (ابن منظور) درخت کو شجرہ اس لیے کہتے ہیں کہ ایک ہی تنے سے مختلف ٹہنیاں اور شاخیں پھوٹ کر باہم گر اس طرح پیوست ہوجاتی ہیں جیسے دو وجود مل کر ایک ہوگئے ہوں۔ اصل میں وجودزن سے بھی تو نمود کائنات ہے۔ عالم بشریت اس کے دم سے لاکھوں شاخوں میں بٹا ہوا بھی ہے اور باہم گر پیوست بھی۔ شجرہ نسب اسی سے ہے۔ جو درخت کی طرح نسلوں اور برادریوں میں شاخ در شاخ منقسم ہے۔

زرکشی لکھتے ہیں ''کنایہ یہ ہے کہ جب متکلم کسی مفہوم کو ادا کرنا چاہے تو اس کے لیے اس کا وضع شدہ لغت والا لفظ استعمال نہ کرے بلکہ ایسے مفہوم کا اظہار کرے جو اس کے مترادف ہو۔ اس طریقہ سے اپنے مفہوم کو بہتر انداز سے واضح کردے کہ بول پڑے کہ ہاں یہ میرا مفہوم ہے'' مزید لکھا ہے کہ قرآن جماع کا ہر مقام پر کنایہ میں ذکر کرتا ہے مثلاً لمس، رفث، دخول، نکاح، باشروہن، لباس۔

لواطت کا کنایہ:

مامون الرشید کے چیف جسٹس یحیٰی بن اکثم الاسدی (857م) بڑے فقیہہ اور عالم لواطت کے شدید رسیا اور یہ ان کا طرۂ امتیاز بن گئی تھی۔ اس کو ''علۃ المشائخ'' یعنی خانقاہی آرٹ بھی کہتے ہیں۔ امام جرجانی کہتے ہیں کہ لواطت صوفیا کا محبوب مشغلہ ہے اور اسے جائز گردانتے تھے۔ اس طرح کئی محدثین بھی اس کا شکار تھے۔ قرآن نے کنایہ کے طور پر وَ الَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ (4:16) ''اتیان'' کو لواطت کے صیغہ میں استعمال کیا ہے۔ وَالَّذٰنِ (4:16) اور مِنْكُمْ (4:16) کے مردانہ صیغے ہیں۔ کافی مفسرین مسلم اصفہانی (934م) عبدہٗ، آزاد اور دیگر نے بھی اتیان سے کا عمل ہی لیا ہے۔ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ (7:81، 27:55، 29:28) اتیان کو لواطت کا کنایہ قرار دیا ہے۔

چپٹی بازی کا طریقہ

انسان نے شہوت رانی کے جتنے طریقے بھی ایجاد کیے ہیں ان میں چپٹی بازی بھی ہے ایک عورت اپنی کمر میں مردانہ آلہ جیسی کوئی چیز باندھ کر ملائم اور ٹھوس، دوسری سے فعل کرنے یا وہ اس سے اس چیز کا تبادلہ کرے۔ اسے ''سُحق'' کہا جاتا ہے۔ قرآن نے عورتوں کے اس فعل کو بھی اتیان کہا ہے۔ یہاں بھی کنایہ کے ساتھ قرینہ لگادیا۔ وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ (4:15) الّٰتِیْ کے قرینہ سے اتیان کو فاعلہ و مفعولہ کے عمل کا کنایہ بنایا گیا ہے۔

ملاحظہ کیا کہ وحی الٰہی نے کنایوں اور استعاروں سے جنسی مسئلہ کو شرم و حیا و شرافت کے بلند معیار اور تقاضوں کے مطابق بیان فرمادیا۔ یہ ہے بلاغت، اندامِ نہانی کے کنایہ ملاحظہ کریں۔

صنفِ نازک کے مقام خاص کے کنایے:

(41:2) اپنی جلود (یعنی فرج کے لیے جلد کا کنایہ آیا ہے) فرج سے پہلے کھال ہی تحریک جنسی کا باعث ہوتی ہے۔ حرث

اورفرج عورتوں کا کنایہ ہے ''اُتُوْا'' کا صیغہ جماع کا کنایہ ہے۔

اب آیئے اَلشَّجَرَۃ:

قرآن کی بہترین تفسیر صرف قرآن سے ہی معلوم ہوسکتی ہے۔ اب اس کنایہ کو سورہ بقرہ اور سورۂ اعراف میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔ یعنی یہاں کپڑے اتارنے سے اَلشَّجَرَۃ کا کنایاتی مفہوم اپنے فطری رنگ و روپ میں نکھر کر سامنے آ گیا ہے۔ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا (7:20) اس طرح شیطان نے قربت کا خیال ڈالا تاکہ ان کو لِيُبْدِيَ (7:20) عریاں کر کے ایک دوسرے کی پردے والی جگہیں دکھا دے۔ حَرْثٌ۔ شَجَرَۃٌ۔ فرج کے فطری کنایے ہیں۔

استعارہ کی خاصیّت:

زرکشی لکھتے ہیں کہ استعارہ کلام کے ابہام کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ باب استفعال سے ہے۔ مفہوم کی وضاحت کے لیے کوئی لفظ مستعار لینا۔ پھر اسے مبالغہ کی غرض سے تخیل اور تشبیہہ کی کسی نوع میں یوں استعمال کریں کہ ایجاز (ای جاز) کے مطابق بھی ہو یعنی استعارہ بھی اور موجز بھی (مختصر مگر جامع) جیسے میں شیر سے ملا۔ یعنی ایک بہادر انسان۔ کسی مشہور چیز کے لیے ایسا حکم ستعار لیا جائے جو مشہور نہ ہو۔ اس کی فلاسفی یہ ہے کہ اس طرح ایک ان دیکھی حقیقت کو روپ دے کر دیکھی حقیقت بنا دیا جاتا ہے تاکہ سننے والے کی سماعت سے گزر کر نظر کے سامنے نمودار ہو۔ مجاز کی یہ صنف وضاحت بیان کے لیے بلیغ ترین صنف ہے۔ اس میں تین باتیں ضروری ہیں (1) مستعار (2) مستار مِنہُ (3) لفظ مستعارلہٗ۔ یعنی معنی، آیت وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا (19:4)، اَشْعَلَ مستعار ہے۔ اَلنَّارُ مُسْتَعَارٌ مِّنْهُ، شَيْبًا مُّسْتَعَارٌ لَّهٗ۔ وہ مشابہت جو دن کی روشنی میں بڑھاپے کی سفیدی میں پائی جاتی ہے۔

کنایہ سے استعارہ:

کنایہ کے راستہ استعارہ یہ ہے کہ اس میں مستعار کا ذکر ہی نہ ہو۔ اس کے لوازم اور خواص کا اس طرح بیان ہو۔ جس سے استعارے کا اندازہ ہوسکے۔ جیسے شجاع جو پھاڑتا ہے۔ عالم جس سے لوگ چلو بھرتے ہیں۔ تو شجاع سے شیر۔ عالم سے دریا مراد ہے۔

اَلْكِنَايَةُ: کسی چیز کا نام لیے بغیر اسے طریقہ سے واضح کرنا کہ وہ اس چیز پر پوری طرح منطبق ہو۔ جیسے حَرْثٌ جو نسوانی عضو مخصوص کا کنایہ ہے۔ نام نہیں۔

''اہل بیان کنایہ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ متکلم جب بھی کسی معنی کے اثبات کا ارادہ کرے تو اس کے لیے لغت میں وضع کردہ لفظ (مثلاً فرج) کو درمیان نہ لائے بلکہ اس مفہوم کا سہارا جو وجود میں لغوی مفہوم (فرج) سے قریب یا مترادف ہو۔ کیونکہ

کنایہ اس وقت صحیح ہوگا، جب چیز کا وجود ہو مگر ذکر نہ ہو اور یہ دلیل بن کر اس کی گواہی دے۔ جس طرح فرج ''نسوانی عضو خاص کا نام ہے اور اَلشَّجَرَۃ کا کنایہ اس کو صحیح بیان کر سکتا ہے۔

کنایہ اعلیٰ ذہانت کا غماز اور عربی ادب میں اعلیٰ بلاغت کا مقام رکھتا ہے۔ عربوں کی ضرب الامثال جو فصاحت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ زیادہ تر ''کنایہ'' ہی کی مرہونِ منت ہیں۔

فحوائے کلام اور لحن الخطاب:

''ادبیات عربی کی مشہور اصناف ہیں۔ فحوائے کلام (اندازِ گفتگو) یہ ہے کہ متعلقہ بات کا لفظ ہی سے پتہ چلے اور لحن الخطاب یہ ہے کہ اس بات کا سراغ اس لفظ کے تیور سے لگایا جائے۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ (5:3)۔ مردار کا کھانا حرام ہے۔ جو فحوائے کلام سے ماخوذ ہے مگر یہ حرمت صرف کھانے تک محدود نہیں ہے۔ مردار سے استفادے کی تمام صورتوں پر حاوی ہے مثلاً کھانا، فروخت کرنا، ہاتھ لگانا، نفع اٹھانے کے تمام انواع۔ حرمت کے لفظ کے تیور ہی یہ بتاتے ہیں یا وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا (17:32)۔ یہاں فحوائے کلام (اندازِ گفتگو) سے صرف زنا سے پرہیز کرنے کا حکم ہے لیکن لحن الخطاب کی رو سے اس کے لوازم بوس و کنار۔ کپڑے اتارنا، سینہ مس کرنا۔ آغوش میں لینا بھی ممنوع ہے۔ لفظ زنا کے تیور سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

تاویل(What they actually are):

ذہانت کے اعلیٰ معیار پر فائز نابغۂ روزگار ہستیاں جس طرح عقلِ فراواں سے سرفراز ہوتی ہیں۔ اس طرح علم تاویل بھی ارزاں کیا جاتا ہے۔ قرآن میں پندرہ دفعہ اس کا استعمال حسن وخوبی کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ جن لوگوں نے اس کو گالی کا مفہوم پہنایا ہے تو ان کا علم ''سطحی'' اور ذوق انتہائی پست تھا۔ وہ اپنے تئیں اہل حدیث یا سلفی کہلانے کے باوجود تاویل الاحادیث کے ذوق سے محروم تھے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ یہ لوگ تاویل سے الرجک ہونے کے باوجود تاویل بھی کر جاتے ہیں۔ اور ان کی تاویلات بھی عقل سے عاری اور بگاڑ کا موجب ہوتی ہیں۔ خرقِ عادت چلنا یعنی الٹا چلنا ان کا شیوہ ہے۔

علامہ شوکانی (1834م) رقمطراز ہیں کہ تاویل: اَ-و-ل سے ہے۔ اٰلَ-اِلَيهِ-اَوْلاً۔ اس کی طرف رجوع کیا۔ لوٹا۔ اٰلَ عَنهُ۔ اس کی طرف سے پھر گیا۔ بنیادی معنی لوٹنا۔ رجوع کرنا۔ اَوَّلَ اللهُ عَلَيكَ ضَآلَّتَكَ۔ ''خدا تیری کھوئی چیز کو تیری طرف لوٹا دے''۔ مآل۔ وہ نقطہ یا مقام جس کی طرف کوئی بات آخر لامر لوٹ کر آئے۔ کسی بات کا آخری نتیجہ تاویل۔ کسی بات کو اس کے صحیح رخ کی طرف پھیرنا۔ اَوَّلَ الكَلَامَ تَأوِيلاً۔ اس نے بات کا نتیجہ اور اندازہ واضح کیا۔ اٰلَ عَلَى الْقَوْمِ۔ وہ قوم کا والی بن گیا۔ اٰلَ الْمَالَ۔ اِئْتَالَهُ۔ اس نے مال کی نگرانی کی۔ اَلْاِيَالَةُ۔ سیاست۔ حدود مملکت اٰل کے معنی کم ہو جا۔ نجات پانا۔ اَوَّلُ۔ اٰخِرُ کی ضد ہے سب سے پہلا اَوِلَ الرَّجُلُ۔ يَاَوَلُ۔ اَوْلاً۔ وہ سابق ہوگیا۔ پہلے نمبر پر ہوگیا۔ بنیادی معنی ابتدائے امر اور انتہائے امر۔ اُولٰی اس کی تانیث ہے۔ اٰلٌ۔ اہل وعیال۔ اٰلَ فِرْعَوْنَ اَلْاٰلَةُ۔ حالت۔ اوزار جمع اَلَاتٌ۔ تَاوِيْلٌ آخری نتیجہ جو

روشن فکر مؤول ہے وہ گویا اقلیم سخن کا بادشاہ ہے اور کلام پر حکمرانی کرتا ہے۔ دلیل ایسی دلیل جس میں ترجیع کی پوری صلاحیت ہو۔ کلام کوظاہر ہے موڑ کر ان معنوں میں بتانا جس کا احتمال یقین ہو۔ اس طرح تاویل فاسد اس سے خارج ہوجائے گی۔ کیونکہ فاسد معنی متحمل نہیں ہوسکتے۔ اصول کی کتابوں کا سب سے زیادہ سودمند اور اہم باب ''تاویل'' کا باب ہے اس سے وہی بھٹک جاتا ہے جو تاویل فاسد کو امام بنائے۔

تاویل ادبیات عرب کے مطابق ہونی چاہیے۔

تاویل کی پہلی شرط یہ ہے کہ یہ اسالیب لغت استعمالات عرب اور صاحب شرح کی فطری افتاد کے مطابق ہو۔

دوسری شرط یہ ہے تاویل کے ذریعہ جو معانی تجویز کئے گئے ہیں اس کی پشت پر ایسی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ جو اس بات کی ضمانت فراہم کرے کہ مجوزہ معنی کے لیے جو لفظ لایا گیا ہے۔ وہ اس کا متحمل ہے گو وہ لفظ مجوزہ معنی میں کم استعمال ہوا ہو۔

تیسری شرط یہ ہے اگر تاویل کا معیار قیاس پر ہے تو ضروری ہے کہ قیاس نمایاں ہو پوشیدہ نہ ہو۔ پہلی شرط میں صاحب شرح کے معمول اور فطری افتاد کی وضاحت نہیں کی گئی اس کا پتہ کیسے چلایا جاسکے گا۔ کیونکہ اس کے لیے جو الفاظ ہونگے۔ وہ روایت بالمعنی کی صف کے ہونگے۔ جس پر کسی بھی استدلال۔ خاص طور پر لسانی استدلال کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ امتیاز صرف قرآن کو حاصل ہے جو ''تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴿۸۰﴾''(56:80) ہے۔ اور ادبیات عرب کی اساس و بنیاد یعنی اس کا ہر حرف اور ہر لفظ روایت بالمعنی کے عیب سے پاک ومنزہ ہے۔ وہ ہر استدلال کی بنیاد اور ہر ماخذ کی جاتی ہے لہٰذا پہلی شرط کا آخری فقرہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔

تاویل کی قسمیں:

تین اقسام ہیں۔ اس میں جو اصول عربیت کے قریب ہے وہ ترجیع کے ادنیٰ سہارے پر بھی ترجیع کی توانائی رکھے گی۔ اور جو اصولِ عربیت سے دور کی مناسبت رکھے اس کے لیے ضروری ہے کہ ''دلیل ترجیع'' توانا رکھتی ہو۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تاویل مشکل اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ متعلقہ لفظ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تو ایسی تاویل مسترد ہوگی۔

صوفیا کی تاویلات کی طرح نہ ہوں۔ جہاں نہ مرجع (دلیل ترجیع) کی ضرورت نہ سمجھی جاتی ہے نہ طاقتور وتوانا دلیل کی۔

اِستثناء:

گروہ معلوم سے استثناء کرنا اس بات کا متقاضی ہوجاتا ہے کہ اگر مستثنٰی کئے جانے والا مستثنٰی نہ کیا جاتا تو وہ الفاظ ہی میں موجود ہوتا۔ مثلاً جَآءَنِی الۡفُقَهَآءُ اِلَّا زَيۡدٌ۔ سوائے زید کے مگر زید۔ زید کو فقہا کے گروہ سے اس لئے خارج کردیا گیا کہ اگر یہ اس قابل ہوتا تو لفظ اَلۡفُقَهَآءُ کی ذیل میں رہ جاتا۔

استثناء یہ ہم جنس سے بھی ہوتی ہے جیسے قوم اٹھ کھڑی ہوئی سوائے زید کے۔ یہ استثنائے متصل کہلاتا ہے۔ اور غیر جنس سے بھی کی جاتی ہے جیسے ''میرے پاس قوم آئی سوائے گدھے کے''۔

یہ استثنائے منقطع کہلاتی ہے۔یعنی متصل وہ ہے جس کا پہلا لفظ دوسرے لفظ کو شامل ہو مثلاً قوم کا لفظ جس طرح قوم کو شامل ہے اس طرح زید کو بھی۔اور منقطع وہ ہے جس کا دوسرا لفظ پہلے لفظ کا جزیا فرد نہ ہو۔مثلاً گدھے کا لفظ قوم کا جز نہیں ہے وہ جنس بشر سے منقطع ہے۔

صنعتِ مشاکلات (Synonyms):

مشاکلت بدیع کی ایک صنعت ہے۔علم بدیع وہ علم ہے جس میں کلام کو ظاہری حسن وخوبی سے آراستہ وپیراستہ کرنے کے طریقے سکھلائے جاتے ہیں۔اس بدیع کے مختلف اسلوبوں میں سے ایک اسلوب مشاکلت بھی ہے۔صنعتِ مشاکلت سے مراد ''ایک ہی شکل وصورت'' ایک ہی مصدر و مادہ کے دو لفظ ساتھ ساتھ بولے جائیں اور دونوں لفظوں سے الگ الگ معنی ومفہوم مراد ہوں۔

عرب میں گفتگو و کلام کو ظاہری اور خارجی حسن سے مزین کرنے کے لیے صنعتِ مشاکلت کا استعمال عام ہوتا تھا۔قرآن بھی انہی عربوں کی عام بول چال کے مطابق اترا ہے۔عربوں کے محاورات اور ان کا مقبول عام اسلوب قرآن میں موجود ہے۔ان سے عربی جاننے والا ہی لطف اندوز ہوسکتا ہے۔قرآن پاک کی جن آیات میں مشاکلت کا اسلوب ہے انہیں محض عربی لغت کی رو سے نہیں سمجھا جاسکتا۔بلکہ عربی زبان کے محاورات کی روشنی میں ان کا مفہوم ذہن میں بیٹھ سکتا ہے۔آیت ملاحظہ کریں۔بیہودہ مذاق وشان خداوندی کے بارے میں۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ (2:15)

ان آیات میں دو باتیں شان خداوندی کے خلاف محسوس ہوتی ہیں بظاہر۔ایک تو بے ہودہ مذاق کا جواب بے ہودہ مذاق ہے۔دوسرا خود ہی ان کو گمراہی میں لے جانا اور اس حال میں باقی رکھنا۔حالانکہ استھزاء کے ایک معنے دوسرے کی تحقیر کرنا ہیں۔جو ہنسی اور ٹھٹھا کو مستلزم۔جسے کوئی شریف آدمی گوارہ نہیں کرسکتا۔چہ جائیکہ ایسی ناشائستہ حرکت کا صدور ذاتِ خداوندی سے ہو۔جو آداب زندگی سکھلاتا ہے۔

اگر استھزاء کے معنی پر غور کرلیا جاتا تو یہ ترجمہ کرنے والے رسوائی کا باعث نہ بنتے۔عرب کے وسیع تر استعمالات میں اتنے محاورات موجود تھے۔جن کو قرآن پاک نظرانداز نہ کرسکتا تھا۔کیونکہ اس کو علم تھا کہ بعض الفاظ قابلِ اعتراض ہوکر بھی اہل زبان کے لیے قابل اعتراض نہ ہونگے۔سرسید فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ جو قرآنِ مجید کے ہر لفظ کے (قطع نظر انسانی محاورے سے) لغوی معنی لئے جاتے ہیں۔خدا کا کلام انسان کی زبان میں اترا ہے۔اور ان محاوروں میں بات کی گئی ہے۔قرآن بعض دفع عام بات کو بطور استدلال لاتا ہے۔اور ان محاوروں میں بات کی گئی ہے۔قرآن بعض دفعہ عام بات کو بطور استدلال لاتا ہے۔اور کبھی مخاطب کی وسعت علم وعقل وفہم کے مطابق بات کرتا ہے۔لسانیات کے اصولوں پر اس کے معنی لیے جائیں۔کبھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہم کو چڑاتا ہے تو ہم بھی اس کو چڑاتے ہیں۔حالانکہ وہ اس کے چڑانے کو اپنا چڑانا کہتے ہیں۔مقصود صرف اس شخص کی بے وقوفی کا جتلاتا ہے۔اس طرح کافروں کی بے وقوفی جتلائی گئی ہے کہ یہ مسلمانوں سے کیا مذاق کرلیا ہے خدا ان کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کو اس حال میں چھوڑ دیتا ہے۔

دراصل عربی کا یہ مشہور قاعدہ ہے کہ کسی ایک فعل پر جوسزا دی جائے اس کو اسی فعل کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ فخر الدین رازی (1210م) کہتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے ان کی استھزاء کی سزا کو۔ استھزاء سے ہی موسوم کیا ہے۔ کیونکہ عرب میں یہ رواج تھا کہ جرم کی سزا کو۔ سزا ہی کا نام دیتے تھے۔ رازی سے بھی چار سو سال قبل امام محمد بن مسلم قتیبہ فرما گئے (889م) لسانیات اور جزاء کے قانون کی رو سے۔ کسی ایک فعل کی سزا کو اس فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ اب سزا اور فعل کا لفظ اگر چہ ایک ہی کیوں نہ ہوں۔ معانی مختلف ہونگے۔ جیسے مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ (2:14) میں منافقین کے فعل استھزاء سے مراد فعل ہے۔ اور دوسرا اس فعل کی سزا۔ ادبیات کی رو سے لفظ تو ایک رہا مگر دو مختلف معنی ہوگئیں۔ جس طرح اس نے مکر کیا تو اللہ نے بھی مکر کیا۔ برائی کی سزا اسی کی طرح بری ہے۔ ابتدا کرنے والا بدی کرے گا تو خدا کی جانب سے بری سزا۔ پہلی زیادتی ظلم ہے اور دوسری اس کی سزا ہے۔

امام رضی (1012م) نے مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ (2:14) اور يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (2:15) کو استعارہ کہا ہے۔ حقیقت میں نہ منافقین نے قہقہہ بلند کر کے مذاق کیا تھا اور نہ خدا نے انسانوں جیسے قہقہے بلند کیے تھے۔ اِسْتِهْزَآءٌ کو اللہ کی صفت بنانے سے یعنی اللہ نے ان کو فعل استھزاء کی سزا دی۔ یعنی ایک ہی سلسلۂ کلام میں جب دوسرا لفظ اپنے ہم جنس پہلے لفظ کے مقابلے میں استعمال ہو تو لفظ ایک ہونے کے باوصف معنی دو مختلف ہو جائیں گے۔

کلمۂ حصر کا عمل:

کلمۂ حصر عموماً حرف اِنَّمَا سے شروع ہوتا ہے اس کی ذیل میں جن اشیاء کا ذکر ہو۔ ان کی حرمت یا حلت۔ نفی خواہ اثبات میں ''قطعیت'' کی خواہاں ہو۔ یہ تو ہوا اس کا حقیقی مفہوم۔ مگر اس کا ادبی مفہوم بھی ہے جو مبالغہ محض کو واضح کرتا ہے۔ اور وسیع تر تقاضوں کے مطابق ان اشیاء کو بھی حصر کی زد میں لانے کا موجب بنتا ہے۔ جو اِنَّمَا کی ذیل میں ذکر کردہ اشیاء کی صف میں ہوں۔ مثلاً کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو مزاج اور مرض کے پیشِ نظر۔ دوران علاج یا دائمی پرہیز کے طور پر گڑ، مچھلی، تیل، انگور وغیرہ سے منع کرتا ہے۔ تو یہ ممانعت صرف انہی اشیاء پر منحصر نہیں ہے بلکہ ان تاثیر والی حامل اشیاء مثلاً انڈا، بڑا گوشت یا شرینی بردار پھل بھی ممنوع ہونگے۔

اصل میں حصر کے تحت حرام اور حلال شدہ اشیاء کی قطعیت کسی بھی زاویہ سے چیلنج نہیں ہوسکتی۔

نکرہ مقام ''نفی'' میں:

نکرہ جب نفی کے مقام پر آئے تو محموم کا متقاضی ہوجاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہتے اللہ کے ماسوا دیگر الہ کی نفی ناممکن ہوجاتی۔

اور یہ نکرہ اگر ما کی صورت میں ہو خواہ۔ لَنْ۔ لَمْ۔ لَيْسَ اور لَا کی صورت میں محموم بھی کا فائدہ دے گا۔ یہ حرف نفی فعل پر بھی واقع ہوتی ہے اور اسم پر بھی۔ جیسے مَارَاَيْتُ رَجُلًا اِلَّا رَجُلٌ فِي الدَّارِ۔

الف ولام کا رول:

جس لفظ پر الف ولام ہونگے۔اس کے معنی میں اتنی وسعت پیدا کردیں گے کہ ہر شے کو حاوی ہو جائے گا۔اگر ایسا مضبوط قرینہ موجود ہے کہ اس سے سبھی مراد نہیں بعض عناصر یا کوئی ایک عنصر مراد ہے۔تو وہاں یہ ''اِستِغراق'' کے لیے نہیں۔الف لام برائے عہد کہلائے گا یعنی صرف وہ عنصر یا عناصر جو ذہن میں آسکتے ہوں۔ یا پہلے سے ذہن میں ہوں۔ جیسے الشجرۃ یہاں الشجرۃ برائے استغراق نہیں یعنی تمام شجر مراد نہیں۔ برائے عہد ہے۔جس سے خاص وہ شجر مراد ہے۔جو آدم وحوا کے ذہن میں بھی تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اسی سے ہی روکا گیا ہے۔اِستِغراق سے مراد پورے کا پورا غرق ہونا یعنی سارا۔

اسمائے موصولہ کے تمام حروف صیغۂ جمع کا فائدہ دیں گے۔مثلاً اَلَّذِیْ۔ اَلَّتِیْ۔ اَلَّذِیْنَ۔ اَللَّاتِیْ۔ ذُوْ۔

استنباط کرنے کی بنیادی شرط:

مسائل کے استنباط واستخراج کے لیے ادبیات عرب کا مذاق ضروری ہے۔تا کہ قرآن میں وارد۔نادر الفاظ کو بآحسن طریق واضح کرسکے۔اس کے لیے ضروری نہیں کہ استدلال کے اشعار۔ضرب الامثال اور محاوراتِ عرب سے ازبر ہوں۔بس اتنا کافی ہے کہ اسے اہل فن وادب کی ماخذ کتابوں پر دسترس حاصل ہو۔کیونکہ ان دانشوروں نے فن ادب کو قابل فہم بنانے اور اس کی نوادرات کو کھنگالنے میں عمر بھی صرف کردی ہیں۔اور ان کا یہ احسان مستزاد کہ ان نوادرات کو حروف تہجی کی ترتیب سے اس طرح ترتیب دے ڈالا ہے کہ کسی بھی لفظ کے مفہوم کے لیے دشواری اور دقت پیش نہیں آتی۔

ادبِ عربی ہی ادبِ قرآن ہے:

اس لیے یہ مسلمان پر فرض ہے کہ ادبیات عرب سے آگہی حاصل کرے۔

تضاد اور تناقض میں فرق:

تناقض اقوال میں ہوتا ہے اور تضاد افعال میں۔اہل زبان کہیں یہ نہیں کہیں گے کہ دو فعل ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔وہ کہیں گے متضاد ہیں۔

عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ جب قرآن میں کوئی چیز تمہاری سوچ سے باہر ہو تو اس کو اساتذہ سخن کے اشعار میں تلاش کرو۔یہ اشعار ہی اصل میں ادبیات عرب کے ترجمان ہیں۔

گرامر کی غلطیوں کی سازش

قرآن میں لِسانی خامیاں اور فصاحت کے منافی مواد، سازش:

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ (20:63)

اس آیت پر اعتراض یہ ہے کہ ''اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ'' (20:63) گرامر کی رو سے غلط ہے اور عربیت کے لحاظ سے غیر فصیح۔ صحیح فقرہ ''هٰذَيْنِ'' ہے۔ جبکہ قرآن نے پوری تحدی سے کہا ہے۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (39:28)

یہ اور دو تین مزید آیات کا ذکر کر کے امام رازی نے کہا ہے کہ یہاں نہ کوئی لسانی سقم ہے اور نہ فنی خرابی۔ کیونکہ معترضین نے عرب کے سب قبائل کے استعمالات، لہجوں اور محاورات کا احاطہ نہیں کیا تھا کہ غلطی نہ کر سکیں۔ نحو کے اصول اپنی جگہ بجا۔ لیکن قرآن کا یہ دعوی زیادہ قابلِ غور ہے کہ وہ عربیت کے ہر معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس میں نہ کجی ہے اور نہ خلافِ قاعدہ کوئی بات۔ فرماتے ہیں کہ اِنَّ کے عمل کے برعکس

هٰذَيْنِ کو هٰذَانِ پڑھنا ذیل کے قبائل میں شائع و رائج تھا۔ مثلاً بلحارث بن کعب۔ مراد۔ بنو ربیعہ اور بنو عذرہ کی کچھ شاخیں۔ یہ قبائل لہجے اور محاورہ میں ''عامل'' پر نظر رکھے بغیر تثنیہ کو الف نون کے ساتھ ہی ادا کرتے تھے اور دلائل کی رو سے یہی صحیح اور قوی ہے۔ تفسیرِ رازی۔ (طبع مصر)

اس کے بعد اہل تحقیق اور اساتذہ فن کے ان اشعار اور شواہد کی تفصیل دی ہے جو نہ صرف ضرورت شعری کی خاطر گرامر کے منافی تراکیب استعمال کرتے تھے۔ نثر میں بھی اپنے لہجے اور استعمال کی پابندی ناگزیر سمجھتے تھے۔ یہ تفصیل بڑے سائز کے ساتھ صفحات میں ہے۔

رازی سے قبل جسٹس عبدالجبار ہمدانی (1025م) نے بھی وضاحت کی ہے۔ بلحارث بن کعب کی زبان میں ''هٰذَيْنِ'' کو هٰذَانِ پڑھنے کا رواج تھا۔ مثلاً وہ کہتے تھے رَاَيْنَا الزَّيْدَانِ۔ جبکہ مفعولی حالت میں زَيْدَيْنِ ہونا چاہیے تھا۔ مگر بلحارث والے اپنے مخصوص طرز اور میں اسے زَيْدَانِ ہی کہتے تھے۔ مزید اِنَّ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نحوی اور اہل زمان اِنّ کو ہاں اور اثبات

1043
کے لیے بھی پیش کرتے تھے۔ پس جب لسانیات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حقائق کو چھوڑ کر مجازات سے رجوع کیا جاسکتا ہے کہ وحی الٰہی نے ایسے طرزِ کلام سے کہیں بھی نہیں روکا۔ تو یہاں کونسی وجہ مانع ہے کہ اس اصول کو بروئے کار نہ لایا جائے۔ یعنی کہ اللہ سبحانہ نے اِنَّ کہہ کر مفہوم ومراد حرف اثبات لیا ہو یعنی کہ ہاں! (طنزیہ القرآن)

رازی نے ہمدانی کے ذکر کے بعد زجاج (923م) کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمد بن یزید (899م) اور اسمٰعیل بن اسحق (896م) بھی ''اِنَّ'' کو ''ہاں'' کے معنی میں لیتے تھے۔ (تفسیرِ رازی)

بگاڑ کہاں پیدا ہوا؟:

اس تلخ حقیقت کا اعادہ بے جا نہ ہوگا کہ اہل روایات نے پہلے ہی دن سے قرآن کے ساتھ بے انصافی اور ستم ہا کو روا رکھا۔ اور پورے شرح صدر کے ساتھ اسے غیر مسلموں کے مناظرانہ طنز و تشنیع کا نشانہ بنا ڈالا ہے۔ انہوں نے اختلافِ قراءت کے وحی شکن بہانے سے قرآن کے اِعراب بدلے۔ الفاظ متبادل لائے۔ اور ہر گونہ ردوبدل کو روا رکھا۔ تاکہ قرآن اس قابل نہ رہے کہ مزعومہ کسی متضاد روایت کا مقابلہ کرسکے۔ تفصیل بہت طویل ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ آیت ہو یا اس کی ہمزاد کچھ اور آیات ان کی قرآنیت کو مشکوک بنائے اور تواتر کے حصار میں شگاف ڈالنے کے لیے ان لوگوں نے زیادہ تر ان روایات سے رجوع کر رکھا تھا۔ جن میں ''شاذ'' اور ''غیر متواتر'' قراءتوں کا مواد بکثرت موجود تھا۔ چنانچہ زیر بحث آیت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اختلاف قراءت کی زد سے نہ بچ سکی۔ کیونکہ اسے قاری ابوعمر (1052۔م) اور عیسیٰ بن عمر (966م) اِنَّ هٰذَيْنِ لَسَاحِرَانِ (20:63) پڑھتے اور اسے ہی عثمانؓ (655م) اور عائشہؓ (678م) ابن زید۔ حسن کی قراءت بتلاتے تھے۔ بلکہ ابوعمر، عیسیٰ وغیرہ بواسطہ عائشہؓ کہتے تھے کہ وہ اس اور دیگر دو آیات (5:72)، (4:161)۔

میرے بھتیجے ان آیات میں کاتبوں نے من مانا تصرف کیا ہے اس طرح ایک عمرو اور عیسیٰ۔ عثمانؓ کی طرف بھی منسوب کرتے تھے کہ آپؓ نے جب مصحف پر نظر ڈالی۔ تو کہا کہ ان میں لسانی سقم ہیں۔ جنہیں اہل زبان خود ہی درست کرلیں گے۔ ابو عمرو یہاںتک بھی کہتے تھے کہ میں اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (20:63) تلاوت کروں۔ کیونکہ یہ فنی طور پر بالکل ہی غلط آیت ہے۔ اور اسی ہی آیت کو امام قراءت بن کثیر (738م) نون کی تخفیف اور هٰذَانِ (20:63) کے نون پر شد ڈال کر یوں پڑھتے تھے۔ اِنْ هٰذٰنِ (20:63) اور عبداللہ بن مسعود (652م) جو معوذتین کو قرآن میں شمار نہیں کرتے تھے۔ اس آیت کو ''اَنَ'' کی زبر کے ساتھ اور لَسَاحِرَانِ (20:63) کو بغیر لام کے یوں تلاوت کرتے تھے۔ ''اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ'' (20:63) نحوی امام اخفش کبیر (791م) بھی اس میں معنوی تصرف کو برقرار رکھتے ہوئے نون کو شدوالا شمار کرکے یعنی اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (20:63)، اس طرح ان کو نفی کے مفہوم میں لینے کی بجائے تاکید کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے۔ اور ابن کعب (642م) اس کو ''اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ'' بھی پڑھتے تھے۔

ان روایات کو تسلیم کرنے سے نہ ایمان باقی رہا اور نہ قرآن:

محدّثین نے اس کے علاوہ جن دو دیگر آیات کو نشانہ تضحیک بنایا ہے۔ رازی نے اس کی تفصیل یوں دی ہے۔

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰی (5:69)۔ یہاں وَالصّٰبِـُٔوْنَ پر اعتراض وارد کیا ہے۔ اسے وَالصّٰبِـِٕیْنَ ہونا چاہیے تھا۔

اور وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ (4:162)، یہاں اَلْمُقِیْمِیْنَ پر جہالت کے تیر برسائے گئے ہیں۔ اس مقام پر امام رازی تڑپ اٹھے اور ایمان ان روایات کے سامنے نہ دب سکا اور مفسرین ومحدثین پر مقام دفاع کرنے کے لیے باوجود پوری جرأت سے کہنا پڑا۔

اہل تحقیق ان تمام روایات کا جو طریق احاد کے ذریعہ منقول ہیں۔ تصدیق نہیں کر سکتے۔ اس سے تو قرآن کو قطعی اور لاریب ہونے پر حرف آتا ہے۔ یہ باطل ہے اور ہم اس باطل کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ یہ انتہائی گستاخی ہے۔ اگر اس پر تمام مسلمان متفق ہیں کہ قرآن تمام شک وشبہ سے بالاتر ہے نہ گرامر کی کوئی غلطی اور نہ اور سقم راہ پا سکتا ہے لہٰذا ایسی تمام روایات جو عثمان وعائشہ سے منسوب ہیں۔ فاسد اور باطل ہیں۔

ابن الانباری نے ایک بھاری سوال اٹھایا ہے کہ صحابہؓ دراصل مثالی رہنما اور قابل اتباع تھے۔ وہ اگر موجود قرآن میں کوئی لسانی سقم پائے تو اصلاح کے بغیر امت کے سپرد نہ کرتے۔

یہ وجوہات ثابت کرتی ہیں کہ موجودہ قرآن کے ہر ہر لفظ کو تحفظ حاصل ہے اور یہ ہر لحاظ سے لاریب ہے انہوں نے ان دو معتمد صحابہ کے نام سے قرآن کو مشتبہ بنانے کی سازش تو کی مگر علیؓ کے نام سے کوئی روایت پیش نہیں کی۔

کلامِ عرب کی بنیاد سماع پر ہے اور سماع ان الفاظ کو فصیح قرار دیتا ہے:

امام العصر (1905) اور آپ کے شاگرد غلام رشید رضا (1935م) لکھتے ہیں۔

اکلام عراب کو معیاری بنانے کے لیے زبر، زیر اور پیش کو صحیح صورت میں استعمال کرنا ضروری ہے اور جس کا تعلق فنِ گرامر سے ہے۔ اور گرامر کی قابل اعتبار پہلو یہ ہے کہ اس کی رو سے تمام عربی الفاظ کی ''لسانی حیثیت'' کا اثبات ''سماع'' پر مبنی ہے یعنی اہلِ زبان کے استعمالات اس کی بنیادیں ہیں اور سماع کے ذریعہ ثابت ہو چکا ہے کہ زیر بحث الفاظ جس شکل وصورت میں استعمال کیے جاتے ہیں فصیح ہیں۔ صحیح ہیں۔ دشمنانِ اسلام کی یہ بڑی جسارت ہے کہ انہوں نے قرآن میں گرائمر کی غلطیوں کا دعویٰ کر رکھا ہے کہ وَالصّٰبِـُٔوْنَ کا لفظ اصل میں وَالصّٰبِـِٕیْنَ تھا۔

مگر قرآن پر اعراب لگاتے وقت اس کا خیال نہیں کیا گیا اور بعد میں ان غلط اعراب کی قبول کرتے ہوئے ''الصّٰبِـُٔوْنَ'' (5:69) کو اپنی غلط حالت پر ہی رہنے دیا گیا وغیرہ!!

1043
یہ ان کی جہالت کی انتہا ہے اور انہیں یہ جرأت بظاہر گرائمر کے ان قواعد سے ہوئی ہے۔ جو بجائے خود ان کی جہالت پذیری اور جہالت پسندی کا شکار ہے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ گرامر کو لغت سے بنایا گیا ہے۔ لغت گرامر سے تیار نہیں ہوئی۔ اب اگر گرامر کے کچھ ضوابط اہلِ زبان کے بعض استعمالات کا احاطہ کرنے سے قاصر رہے۔ تو اس میں لغت کا کیا قصور ہے؟ جبکہ لغت کی رو سے جو بات اہل زبان سے جس طرح ثابت ہوگی وہی صحیح قرار پائے گی۔ اور کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اہل زبان بھی الفاظ کے استعمال میں غلطی کا شکار ہو سکتے ہیں؟ ہاں یہ روایات ہے کہ ان سے مفاہیم میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھیں کہ روئے زمین پر کوئی بھی بشری زبان ایسی نہیں کہ جس نے ایک ہی جست میں ترقی کے مدارج طے کئے ہوں۔ یا اس کی مفردات، مرکبات، اسالیب استعمال اور مشتقات قوم کے تمام افراد کے اجتماع اور باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعہ تجدید کے مراحل سے گزری ہوں؟ کم از کم ماضی میں تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ یورپ کی بعض علمی اور ادبی بطور خاص لغت ترتیب دینے والی اکیڈیمیوں نے کسی حد تک یہ کام سرانجام دے لیا ہے۔ لیکن اس کے باوصف ہر ہر لفظ کے بارے میں تجسس اور استقراء پر بھی انفرادی نوعیت کا ہے۔ یعنی لیکچر یا شاعر، انہی کے کلام سے سند لے کر بات کی جاتی ہے۔

اب اگر قرآن اور اسلام سے کد رکھنے والے یہ متعصب لوگ اندھے نہ ہوتے تو ان کو یہ کلیہ کہ شعراء اور خطباء کے کلام سے سند لینا کافی ہے۔ اس پورے اعتراض سے باز رکھتا کہ رسول ﷺ بھی اہل زبان اور افصح العرب تھے۔ آپ ﷺ نے اگر ظاہر گرامر کے خلاف کوئی لفظ قرآن مجید میں رہنے دیا تو لامحالہ اس میں آپ ﷺ ہی سند ہیں۔ نہ کہ صرف ونحو کے وضع کرنے والے گرامر نویس؟ اور یہ بھی اس مفروضہ پر کہ ان کے عقیدے کے مطابق قرآن کو منزل من اللہ تسلیم نہ کر لیا جائے۔ محمد ﷺ کی تصنیف کہہ دیا جائے۔ یہ علاوہ اس کے حضور ﷺ کے ماسوا دیگر لاکھوں عربی اہل زبان بھی قرآن کی افصحیت وصحتِ الفاظ کا اعتراف کرتے ہوئے زبان کا معیار قرار دے چکے ہیں۔ جن میں غیر مسلم عرب بھی شامل ہیں۔ اور اہل زبان کی اتنی بھاری نفری کے اجتماعی فیصلہ کو یورپ کی غیر اہلِ زبان علمی وادبی مجالس اور اکیڈیمز کے مقابل۔ لازمی طور پر مضبوط اور توانا کہا جائے گا۔

بلکہ یہ لوگ اگر عقل وشعور سے کام لیتے تو یہ حقیقت دیوار بن کر حائل ہو جاتی کہ ایک غیر زبان ناقل کے مقابل۔ ایک بادیہ نشیں بدو اپنی زبان کے بارے میں زیادہ مستند اور زیادہ قابل اعتماد ہے۔ خواہ ثبوت کا ذریعہ انفرادی ہی کیوں نہ ہو۔

کاش یہ لوگ جو تعصب کی وجہ سے بینائی کھو چکے ہیں۔ کتنی ڈھٹائی سے شیکسپیئر کی انگریزی اور وکٹر ہیگو کی فرانسیسی تصانیف کو تو لسانی اسقام اور گرامر کی لسانی غلطیوں سے پاک وصاف قرار دیتے ہیں۔ جبکہ ان ہی کے اہل زبان نے ان کی لسانی لغزشوں کو محض اس بنا پر قبول کیا کہ یہ صاحبان اپنی اپنی زبان میں قادر الکلام تھے۔ (تفسیر المنار، طبع مصر)

جدید لسانیات کی روشنی میں جو کچھ رشید رضا نے وضاحت کی ہے۔ وہ انمول موتی ہیں۔ اور اس سے بہتر پوزیشن میں رازی ہے کہ انہوں نے مجرمین کے انہی گروہ پر نظر رکھی۔ جنہوں نے اس سازش وفتنہ کے لیے خام مال مہیا کیا تھا۔ اس طرح یہ آیت''

اَکَادُ اُخۡفِیۡهَا''(20:15) کونامکمل کہتے تھے جومحاورتی مفہوم تھا۔پھرقرطبی نے بھی یہ راز فاش کر دیا۔

یہ تمام راوی دشمنانِ اسلام اورغیرمسلم تھے یا مسلمان؟ آپ خود اندازہ لگالیں کہ اسلام کے لبادے میں یہ تمام کیسی کیسی سازشوں میں ملوث تھے۔ درج ذیل کچھ آیات میں جہالت۔کم علمی اورقرآن سے تعصب کی بناء پر گرامر کی غلطیاں روایات پرستوں سے لے کرموجودہ زمانے تک نکالتے رہے ہیں۔ان میں سے ہرایک کا تجزیہ علمی واستدلال کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓٮِٕكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ‌ۚ وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِۙ وَالسَّآٮِٕلِيۡنَ وَفِى الرِّقَابِ‌ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّکٰوةَ‌ ۚ وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا ‌ۚ وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ‌ؕ (2:177)

جہلا کا خیال ہے کہ اٰمَنَ کی جگہ تُؤۡمِنُوۡا۔ اٰتِی کی جگہ تُؤۡتُوۡا۔اَقَامَ کی جگہ تَقِمِ۔پھر اٰتیٰ کی جگہ تُؤۡتُوۡا اور اَلصّٰبِرِيۡنَ کی جگہ اَلصَّابِرُوۡنَ ہونا چاہیے۔گیارہ صورتوں میں فعل ماضی مضارع کے معنوں میں آتا ہے۔جس طرح یہ فعل مارضی مضارع کے معنوں میں استعمال قرآن کا خاص اسلوب ہے۔

(1)عطف بر ماضی:

وَيَوۡمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيۡهِ يَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِى اتَّخَذۡتُ مَعَ الرَّسُوۡلِ سَبِيۡلًا ﴿۲۷﴾(25:27) يَقُوۡلُ مضارع ہے اس پر قَالَ ماضی کا عطف (25:30)۔ وَقَالَ الرَّسُوۡلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِى اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا ﴿۳۰﴾(25:30) اب اس قَالَ ماضی پر فعل مضارع يَقُوۡلُ کا عطف آیا ہے۔

(2)ابتدائے کلام میں ماضی ہوتو معنی مضارع کے ہونگے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ (16:76) ضَرَبَ ماضی ابتدائے کلام میں مضارع کے معنوں میں (اللہ دومردوں کا حال بیان کرتا ہے)۔

(3)اسم موصول کے بعد ماضی مضارع کے معنوں میں آئے گا:

مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ (30:32) جوفرقہ فرقہ ہوجائیں گے۔ اَلَّذِيۡنَ اسم موصول کے بعد فَرَّقُوۡا (30:32) فعل ماضی جومضارع کا معنی دیتا ہے۔

اس طرح سورۂ بقرہ کی آیت (177) میں بھی مَنۡ اسم موصول ہے۔اس لیے اٰمَنَ۔ وَاٰتٰی۔ اَقَامَ۔ اٰتَی الزَّکٰوةَ۔ یہ تمام افعال چونکہ عطف درعطف ہیں۔اس لیے یہاں ماضی مضارع کے معنوں میں آئے گا۔

(4)ندا کے بعد:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ (22:73) حرف ندا يٰۤاَيُّهَا کے بعد ماضی مجہول ضُرِبَ مضارع کا معنی دے رہا ہے۔

(5) لفظ حَيۡثُ کے بعد ماضی مضارع کے معنوں میں:

وَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ (2:191) حَيۡثُ کے بعد ثَقِفۡتُمُوۡا فعل ماضی مضارع کے معنوں میں آ گیا ہے۔

(6) لفظ كُلَّمَا کے بعد ماضی مضارع کے معنوں میں:

كُلَّمَا دَخَلَتۡ اُمَّةٌ لَّعَنَتۡ اُخۡتَهَا ؕ (7:38) جب بھی کوئی جماعت جہنم میں داخل ہوگی اپنے جیسی جہنمی جماعت پر لعنت کرے گی (7-8-9-10) شرط۔ جزا اور ہر دو پر عطف کے بعد ماضی مضارع کا معنی دے گا۔

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَـكَفَّرۡنَا عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاَدۡخَلۡنٰهُمۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ۞ (5:65)

اٰمَنُوۡا ۔ اتَّقَوۡا ۔ كَفَّرۡنَا اَدۡخَلۡنَا ۔ چاروں ماضی ہیں۔ پہلا اور تیسرا چونکہ بالترتیب حرف کی شرط اور جزاء، دوسرا اور چوتھا بالترتیب ان کے معطوف ہیں۔ اس لیے مضارع کا معنی دیتے ہیں۔

جملہ دعائیہ اگر ماضی ہو تو مضارع کا معنی دے گا:

وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ اِلَى الۡجَـنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡهَا وَفُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا وَقَالَ لَهُمۡ خَزَنَـتُهَا سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ طِبۡتُمۡ (39:73) طِبۡتُمۡ فعل ماضی ہے (تم خوش رہو) جو دعائیہ انداز میں ماضی بن گیا۔

آیت (3:59) پر اعتراض:

ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۞ (3:59) کہتے ہیں کہ فَكَانَ ہونا چاہیے۔

فعل ماضی مضارع کے معنی بھی دیتا ہے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ۔

جب ماضی کا قصہ بیان ہو رہا ہو:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَيۡثُ يَشَآءُ ؕ (12:56) يَتَبَوَّاُ ۔ يَشَآءُ ؕ دونوں مضارع۔ چونکہ ماضی کا قصہ ہے ایسے افعال مضارع جو ماضی کی سرگذشت بیان کریں تو مضارع حکائی کہلاتے ہیں۔

اسی طرح اس آیت (9:59) ماضی کا قصہ ہے اور اس لیے يَكُوۡنُ فعل مضارع ماضی کا معنی دے گا۔ اگلا اعتراض

اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۞ (7:56) قریش کے شعراء اور قبائل بعض اوقات اِنَّ کا استعمال بطور ''ہاں'' اور ''غیر عامل'' بھی کرتے تھے۔ کلام عرب کی بنیاد سماع پر ہے اور سماع قَرِيۡبٌ کو فصیح قرار دیتا ہے۔ اِنَّ اس لیے عامل کلام کے پہلے حصہ پر تو ہوا ہے مگر دوسرے پر یہ غیر عامل ہے۔

زبان کا اسلوب فاعل کو بطور مفعولی۔ واحد کو جمع اور جمع کو واحد کی جگہ لا کر تاکید یا اس کام کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے لایا جاتا تھا۔ یہ اس عربی مبین کے ادب کی خصوصیات تھیں۔ اسی طرح آیت (63:10) میں وَاَكُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ۔

1043 اس آیہ میں یہ واستیناف ہے جس کا نہ ماقبل کے کسی لفظ پر عطف ہوتا ہے اور نہ کسی جملے پر۔ بلکہ صرف ماقبل عنوان کے کسی گوشہ کو واضع کرنا ہوتا ہے۔ یہاں ''وَاَكُنۡ (63:10)'' کا عطف کسی جملے پر نہیں ہے بلکہ صرف'' مِّنۡ مِمَّارَزَقۡنٰكُمۡ (2:254)'' آیت کے شروع میں اس امر کی وضاحت ہے کہ اس ہدایت پر چل کر صالحین میں سے ہوجاؤ۔

به افرنگی بتاں دل باختم من
زتابِ دیریاں بگداختم من
چناں ز خویش بیگانہ بودم
چو دیدم خویش را نشناختم من

یہ ہے وہ سازش جو اسلام کے لبادے میں کی گئی اور ہمیں دوسری پٹڑی پر ڈال دیا گیا۔

❋❋❋

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ یہ بھی ایک قرآنی آیت ہے

اہلِ روایات کا یہ دعوٰی کہ یہ آیت اضافی ہے غلط اور سراسر سازش ہے قرآن کی لاریبیّت پر۔

وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾ (15:9) کے دعوی کے مطابق یہ نزولی آیت ہے۔اور قرآن کا حصہ ہے۔دوسرا اعتراض کہ یہ جملہ ناقص ہے۔تام نہیں۔ یہ ہے غیر مسلموں کا اعتراض قرآن پر کہ اس کا ابتدائی جملہ یہی یعنی ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' نامکمل فقرہ ہے۔ کیونکہ جملہ کی تکمیل فاعل، فعل اور مفعول سے ہوتی ہے لیکن اس میں فعل ہی غائب ہے۔بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے پانچ الفاظ ہیں ''بہ۔اسم۔اللہ۔رحمن۔رحیم۔ب۔حرف جار۔اسم (اسمِ نکرہ)۔اللہ (اسمِ علَم)۔رحمن۔رحیم (اسمِ صفات) اب چونکہ اس جملہ میں فعل نہیں تو گرامر کی رو سے جملہ ناقص ہے تام نہیں۔لیکن ترکیب نحوی اور قواعدِ عرب کا کلیہ ہے۔ جہاں فعل مذکور نہ ہو۔ وہاں جار مجرور فعل کے ساتھ ہوتا ہے اور فعل بھی محذوف ہوتا ہے۔اور قرآن کی رو سے فعل محذوف خود بخود نکھر کر عیاں ہو جاتا ہے اب بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کا فعل محذوف ترکیب نحوی میں ملاحظہ کریں۔

ترکیب نحوی:

''ب'' حرف جار، اسم مجرور ہے اپنے سے ماقبل مذکور حرفِ جار ''ب'' کا اور مُضاف اپنے مذکر مابعد لفظ ''اللہ'' کا۔اللہ مضاف الیہ ہے اپنے ماقبل ''اسم'' کا اور موصوف ہے اپنے مابعد رحمن ورحیم کا۔دونوں صفات ''اللہ'' کی۔

اللہ موصوف ہے دونوں صفات رحمن ورحیم کا۔اور مضاف ہے اسم کا مضاف اور مضاف الیہ مجرور ہوئے ''ب'' کے اور جار مجرور ہو کر متعلق ہوئے فعل محذوف کے فعل محذوف کے بعد چونکہ مذکور ہے۔''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱﴾'' (1:1) چونکہ یہ جملہ پڑھنے یا کہنے کی چیز ہے۔اس لیے یہاں فعل محذوف ''قُلۡ یا اِقۡرَاۡ'' روزِ روشن کی طرح عیاں ہو رہا ہے۔یعنی اے رسول! تو اعلان کر دے کہ ساری حمد وستائش اللہ کے لیے ہے جو تمام عالمین کی نشوونما کرنے والا ہے۔

حکمتِ بالغہ محذوف فعل میں:

بِسۡمِ اللّٰہِ میں فعل مذکور کیوں نہیں لایا گیا۔محذوف کیوں رکھا گیا ہے۔ ہر کام مسلمان اس پاکیزہ جملے سے کرتا ہے۔اس لیے اس میں فعل اس لیے محذوف رکھا گیا ہے تاکہ ہر موقع اور ہر مقام پر الگ ایک افعال محذوف خود بخود متصور ہوتے چلے جائیں۔

1043 مثلاً جب حضور پر نازل ہوا تو مفہوم تھا ''اعلان کردے'' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ (1:1)۔ جب حضور ﷺ نے اس حکم کی تعمیل فرمادی۔ تو محذوف میں پڑھتا ہوں۔ اعلان کرتا ہوں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١'' (1:1) چونکہ ہم ہر کام کی ابتدا بِسْمِ اللّٰهِ پڑھ کر شروع کرتے ہیں۔ میں کھاتا ہوں اللہ رحمن ورحیم کے نام کے ساتھ۔ جب عورتیں گھریلو کام کاج۔ مثلاً آٹا گوندھتے وقت دودھ دوھتے ہوئے، کھانا پکاتے ہوئے تو ہر مقام پر فعل کرنے والا بدل جاتا ہے۔ یہ ہے حکمتِ بالغہ ''فعل'' کے محذوف کرنے میں۔

جمعُ القران کی داستان

تفاسیر کے آئینے میں:

قرآن فہمی کے راستہ ایک بڑی رکاوٹ یہ عقیدہ بھی ہے کہ رسول ﷺ کی وفات کے بعد قرآن کتابی شکل میں نہیں تھا۔ بلا ترتیب، پراگندہ شکل میں، ہڈیوں، پتوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی کچھ آیات کسی ایک صحابی کے پاس تھیں۔ اور کچھ کسی اور کے پاس۔ جب جنگ یمامہ میں بہت سے حافظ شہید ہوئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ قرآن جمع کیا جائے۔ چنانچہ یہ کام عثمان رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا گیا۔ انہوں نے یہ کام اپنے زیر نگرانی زید رضی اللہ عنہ سے کروایا۔ جنھوں نے نہایت عرق ریزی سے ایک ایک آیت مختلف مقامات سے تلاش کر کے بسیار تگ ودو کے بعد قرآن جمع کیا۔ زید رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا کہ آیات کم تھیں۔ تقریباً 2 عدد۔ ایک سورۂ توبہ کی اور ایک سورۂ احزاب کی۔ تو تلاش بسیار کے بعد خزیمہ انصاری کے گھر سے برآمد ہوئیں۔

قرأت کے اختلافات:

یہ تصور دیا گیا روایات کے ذریعہ کہ رسول ﷺ کے زمانہ ہی میں قرآن میں قراءت کے لحاظ سے بھی اختلافات موجود تھے۔ چنانچہ جب عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں صحیفہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے نقل کروانے لگے۔ تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سعید بن وقاص رضی اللہ عنہ، عبدالرحمن بن حارث رضی اللہ عنہ کو حکم دیا اور کہا کہ اگر تم میں اور زید بن ثابت میں جنہیں اگر کہیں قراءت کا اختلاف ہو تو اس کو قریش کی زبان میں لکھو۔

اِعراب کا اختلاف:

مودودی کے مطابق جس رسم الخط میں وحی کی کتابت رسول ﷺ نے ابتداء میں کرائی۔ اس کے اندر یہ کہ صرف اعراب نہ تھے بلکہ نقاط تک نہیں تھے۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پہلا مصحف مرتب کروایا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے جس کی نقل بعد میں شائع کروائی۔ اس میں نہ اِعراب تھے اور نہ ہی نقاط۔ کیونکہ اس وقت یہ علامات ایجاد نہیں ہوئیں تھیں۔ اِعراب اور نقاط بعد میں امیہ کے دور میں حجاج بن یوسف نے لگوائے تھے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں زمانۂ رسالت اور خلافت میں ہر قبیلہ اپنی منشا کے اعراب اور نقاط پڑھا کرتا تھا۔

1043
جب اِعراب اور نقاط جو قراءت کے اختلافات کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں تو عثمان رضی اللہ عنہ نے اس مشہور اختلاف ''پیروں کا مسح کرنا یا وضو کرنا اَرْجُلَكُمْ یا اَرْجُلِكُمْ لکھوایا تھا۔ جو بغیر اعراب ونقاط اس کی شکل ''ارجلكم'' ہے؟ میں کیسے تفریق ممکن ہے؟

قرآن نے اس سازشی نظریہ کی سختی سے تردید کی ہے۔ اور گذشتہ ابواب کی تحقیقات نے ان سازشیوں کو ثابت کر دیا ہے۔

قرآن زمانہ رسالت ہی میں صحیح کتابی شکل میں باریک جھلی والے کاغذوں پر لکھوایا گیا تھا:

وَالطُّوْرِ ۝ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝ (52:1-2-3) اور (7:14) یہ جھلی والے کشادہ کاغذوں پر سطروار لکھی ہوئی ہے۔ اب اس واضح شہادت کے بعد کیا یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں یہ ہڈیوں اور پتوں پر لکھا جاتا تھا۔ یا ہڈیوں یا پتوں کو ''کتاب'' کہا جاسکتا ہے؟

رسول ﷺ خود دست مبارک سے لکھا کرتے تھے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (29:48)

اس آیت میں عدم تلاوت اور عدم کتابت کا تصور معطوف ومعطوف الیہ کی صورتوں میں نزول قرآن سے پہلے کے دور کے بارے میں بتادیا گیا ہے اور اس کے بعد پڑھتے بھی تھے اور داہنے ہاتھ سے لکھتے بھی تھے۔

قرآن کا نسخۂ امام:

یہی وہ نسخۂ امام تھا جو ہر وقت آپ ﷺ کی دسترس میں رہتا تھا۔ جس کی طرف اشارہ کر کے حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ (6:19)

هٰذَا اسم اشارہ قریب ہے۔ اگر یہ کتابی شکل میں نہ ہوتا تو ''هٰذَا الْقُرْاٰنُ'' (6:19) کے الفاظ کبھی بھی نہ آتے۔ کیا حضور ﷺ کتاب کی بجائے ہڈیوں اور پتوں کے ٹوکرے کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

قرآن کے متعدد نسخے اس نسخۂ امام سے روزانہ آپ ﷺ کی نگرانی میں نقل ہوا کرتے تھے:

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ (25:5) (خود گھڑ لیا ہے اور پھر یہ اس کی نگرانی صبح شام اِملا کرایا جاتا ہے)

مصدر اِكْتِتَابٌ کی خبر رسول ﷺ کے متعلق دی گئی۔ یعنی دل سے گھڑ کر ہاتھ سے لکھنا یہ ہے قرآنی شہادت کہ خود دست مبارکہ سے لکھا کرتے تھے اور اسی نسخہ سے روزانہ نگرانی میں املا کرائی جاتی تھی۔ یعنی تُمْلٰى عَلَيْهِ (25:5)۔ املاء آپ ﷺ کی نگرانی لکھنے والے بہت سے لکھتے جاتے تھے۔ اس املا کی شہادت نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ (68:1)

رسول ﷺ وحی کے بعد علم سے بازیاب ہو گئے تھے اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ (96:3-4)
جونہی وحی نازل ہوتی تھی تو رسول ﷺ خود دستِ مبارک سے نسخۂ امام میں لکھا کرتے تھے اور اس کے بعد نسخۂ امام سے قرآن کریم کے متعدد نسخوں کی املاءرات دن جاری رہتی تھی اس طرح رسول ﷺ کی زندگی ہی میں آپ ﷺ کے امام نسخہ کے علاوہ متعدد مزید نسخے بھی تیار ہو چکے تھے۔ جنہیں آپ سلطنت کے جملہ مراکز کے علاوہ بیرون سلطنت بھیج کر ''یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَاْ (7:158)'' کے اعلان کی تصدیق فرمادی۔

خود بھی حافظِ قرآن تھے اور مزید حافظ قرآن بھی تیار کئے تھے:

رسول ﷺ کے حافظہ کی کیفیت یہ تھی کہ نزول وحی کے ساتھ ہی قرآن آپ کو حفظ ہو جاتا تھا۔ سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى ۙ﴿۶﴾ (87:6) اس آیت کی روشنی میں آپ ﷺ خود حافظ قرآن تھے۔ اور مزید مومن حفاظ کی خبر ذیل کی آیت سے بَلۡ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىۡ صُدُوۡرِ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ؕ (29:49) ان کے صدور میں قرآن محفوظ تھا کتابی شکل میں محفوظ کر کے خود بھی حافظ قرآن اور سارے صحابہؓ بھی۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ قرآن رسولؐ نے اپنی زندگی ہی میں کتابی شکل میں محفوظ کر دیا تھا۔ اس کا متن۔ اعراب۔ نقطے۔ رموزِ اوقاف یعنی وقفے اور ترتیب سب کچھ وہی ہے جو رسولؐ کے دستِ مبارک سے لکھے ہوئے قرآن کے نسخۂ امام کی تھی۔ جو رسول اور صحابہ کرام کے سینوں میں حافظوں کی صورت میں محفوظ تھا۔

ترتیبِ قرآن:

مفسروں کا یہ قول کہ قرآن کریم کی موجودہ ترتیب عثمان رضی اللہ عنہ کی دی ہوئی ہے مگر قرآن اس نظریہ کی سختی سے تردید کرتا ہے۔ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق جامع القرآن کا نظریہ قطعاً غلط ہے۔ رسول ﷺ نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی قرآن کو پراگندہ نہیں چھوڑا تھا۔ تو عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی اور صحابی کا جمع کرنے کا تصور تک خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے کس ترتیب سے لکھا تھا؟ ظاہر ہے جس ترتیب سے آپ ﷺ نے اسے حفظ کیا تھا اور صحابہ کو حفظ کروایا تھا۔

یاد رہے کہ ترتیب کے بغیر کسی چھوٹی سی کتاب کو بھی حفظ نہیں کیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ کہ مروجہ تفاسیر کا یہ تصور کہ قرآن رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو حفظ بھی تھا اور بے ترتیب بھی تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ حفظ و ترتیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اولین حافظ خود رسول ﷺ تھے اُسی ترتیب کو آپ ﷺ نے کتابی صورت میں بشکل مشہود لکھ کر محفوظ کیا۔ قرآن آپ ﷺ کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور بڑے سے بڑا دشمن قرآن بھی زیر زبر تک میں تغیر و تبدل نہیں کر سکا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ ﴿۹﴾ (15:9)

تحفظ ناموسِ رسالت وصحابہؓ:

روایات کا یہ تصور کہ رسول ﷺ قرآن کو پراگندہ حالت میں اسی طرح چھوڑ گئے تھے۔ ناموسِ رسالت کو بری طرح داغدار کرتا ہے جو ضابطۂ حیات قیامت تک کی پوری نوع انسانی کے لیے دیا گیا تھا آپ ﷺ اس کو اسی پراگندہ حالت میں چھوڑ گئے تھے اور بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو مرتب کرنا پڑا۔ پھر اس نظریہ کے تحت ناموس صحابہ رضی اللہ عنہم بھی محفوظ نہیں کیونکہ بقولِ روایات انہوں نے قرآن کو اس طرح الٹ پلٹ کر رکھ دیا کہ جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی تھی اسے تیسویں پارہ میں رکھا اور جو سب سے آخر میں اتری تھی اسے کتاب کے ابتدائی حصہ میں رکھا اور پھر نہ اعراب، نہ نقاط، یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے مرتب کردہ نسخہ ہائے قرآن کریم کے الفاظ پر نہ اعراب اور نہ نقاط تھے۔ دوسری طرف بخاری رسول ﷺ سے ایک بیان منسوب کر رہے ہیں کہ قرآن سات قراءتوں میں نازل ہوا ہے یعنی اس کی سات قسم کی زیریں اور عبارات زبریں تھیں۔ خود ہی اپنے بیانات کی تردید کر رہے ہیں۔

قرآن کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟:

روایات کے مطابق سب سے پہلے سورۂ علق کی ابتدائی آیات کا نزول ہوا۔ اور وحی آتے وقت مجھے گھنٹے کی آواز آتی ہے اور بہت سخت ہوتی ہے اور یاد کرنے کے بعد یہ کیفیت دور ہو جاتی ہے اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سخت سردی کے دنوں میں وحی کے نزول کے بعد آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا۔ جبکہ قرآن کہہ رہا ہے فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ (2:97) قلب اطہر پر وحی کو نازل کیا گیا۔ جبکہ گھنٹی کی آواز تو کانوں سے سنی جاتی ہے۔ قلب سے نہیں اور دوسری جگہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲ (20:2) یہ وحی کا نزول کی قسم تکلیف اور سختی کا باعث نہیں ہے۔

اور تیسرے مقام پر سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝۶ (87:6) بے شک ہم اس قرآن کو ایسا محفوظ کر دیں گے جو بھلایا نہیں جا سکے گا۔ تو حفظ کے لیے آپ ﷺ کے متعلق مشقت کا نظریہ بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

غارِ حرا سے نسبت خلوت گزین کا نظریہ جو رہبانیت ہے سراسر بہتان ہے:

آپ ﷺ تو رہبانیت کے خلاف چیلنج لے کر آئے تھے۔ معاشرہ کا بوجھ اٹھانے اور اصلاحی پروگرام کا بیڑا اٹھانے، محتاجوں کا وجود ختم کرنے اور ساری دنیا کو غلامی کے طوقوں سے آزادی دلانے آئے تھے۔

قرآن قیامت تک کے لیے ساری انسانیت کے لیے مکمل ہدایت ہے:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (6:114)

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝۸۹ (16:89)

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۱

(29:51)

ان تمام آیات میں بتادیا گیا ہے کہ قرآن مکمل تبیان، ہدایت، رحمت، بشارت اور نصیحت ہے۔ اور دن سب صفات کے ساتھ ساتھ کافی ہے کسی دوسری کتاب کا محتاج نہیں ہے۔ اور تمام نوع انسانی کے لیے قیامت تک کا ضابطۂ حیات ہے اور اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝۹ (15:9) اب اس کی حفاظت ہم کریں گے۔ کوئی زیر زبر کی تبدیلی بھی اس میں نہیں کر سکے گا۔

باقی تمام انبیاء اپنی اپنی قوم کی طرف لیکن حضور پورے نوع انسانی کے لیے قیامت تک مبعوث کیا گیا ہے۔ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ (7:59)

وَاِلٰى ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا ۘ (7:73) وَاِلٰى مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا ؕ (7:85) ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مُّوۡسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ (7:103) اور وَاِذۡ قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ (61:5)

اور رسول ﷺ کے متعلق ارشاد ہوا قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا (7:158) آپ ﷺ ساری انسانیت کے لیے کتاب کے ساتھ بھیجے گئے۔

حضور ﷺ خاتم النّبیین تھے، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، نہ نیا نہ پرانا:

قرآن قیامت تمام نوع انسانی کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے اور حضور ﷺ ساری انسانیت کے لیے قیامت تک رسول تھے۔ اور کتاب کا حفاظت کا خود ذمہ لے کر آئندہ کے لیے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰـكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ (33:40) مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں اس جہت سے پوری امت کے دینی باپ ہیں۔ کتاب کو محفوظ کر کے نبوت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ کوئی نیا نبی اس لیے نہیں آئے گا کہ ضابطہ خداوندی میں اس سلسلہ کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے اور پرانا اس لیے نہیں کہ سب وفات پا چکے ہیں۔ مَا الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ (5:75)، قَدۡ خَلَتۡ (5:75) کی خداوندی خبر کے بعد نہ عیسیٰ سے پہلے اور نہ بعد میں کوئی رسول زندہ نہیں۔ مسیح موعود کا تصور قرآنی آیات کے خلاف ہے۔

وحی کی خصوصیات

جس طرح کائنات میں ہدایت ازخود رکھ دی۔ اور تمام کائناتی قوتیں اس پر چلنے کے لیے مجبور پیدا کردی گئی ہیں۔ جبکہ انسانوں کی ہدایت کے لیے مسلسل انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے۔ علم خداوندی اور ہدایت ربانی جو انبیاء کو ملتی رہی، اسے قرآنی اصطلاح میں وحی قرار دیا گیا ہے جو رسول ﷺ پر آ کر اختتام پذیر ہو گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ وحی کو قرآن میں محفوظ کر کے اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھا لیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے ہاں وحی کی دو اقسام کا نظریہ۔ وحی متلو یا وحی جلی اور دوسری غیر متلو یا وحی خفی۔ یہودیوں سے مستعار کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ وحی متلو یا جلی، قرآن میں ہے جبکہ غیر متلو قرآن سے باہر۔ یہ تمام متضاد، گڑھی ہوئی روایات ہیں۔ یہ عقیدہ دور آمریت کی پیداوار ہے جو قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن پر تفحص سے وحی کی چند بنیادی خصوصیات روزِ روشن کی طرح سامنے ابھر کر آ جاتی ہیں۔

وحی ساری متلو ہے:

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ (13:30) ان پر یہ مَا يُوْحٰى متلو ہے جس کی تلاوت رسول ﷺ امت کے سامنے کرتے تھے۔ قرآن میں ساری کی ساری وحی متلو ہے۔ اس آیت کے پیش نظر یہ غیر متلو مسترد ہو گیا ہے۔

وحی صرف جلی اور متلو ہے۔ وحی کو قرآن سے باہر اور خفی ماننا کفر ہے۔ کیونکہ وحی ساری کی ساری جلی ہے جس کو امت تک پہنچانا رسالت کا مرکزی فریضہ تھا نہ کہ اس کو خفی رکھا جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (5:67)

اگر وحی کی خفی رکھا تو فریضۂ رسالت سے قاصر ہو جاؤ گے۔ وحی کو تو کسی صورت بھی روکا نہیں جا سکتا۔ لیکن احادیث حیا یا دل جوئی کی خاطر روکی جا سکتی تھیں۔ قرآن شاہد ہے کہ رسول ﷺ کے گھر میں لوگ کھانا کھانے سے بہت پہلے آ کر کھانا پکنے کا انتظار

کرتے رہتے تھے۔اور کھانا کھانے کے بعد دیر تک خوش گپیوں میں بیٹھے رہتے۔اگر چہ رسول ﷺ کو گراں گزرتا تو آپ حدیثوں کے ذریعہ روک سکتے تھے۔مگر ایسی سچی حدیث تک بیان نہ کی۔مگر جب یہی بات قرآن میں نازل ہوئی تو اسے تلاوت کرکے حیا ہرگز مانع نہ آئی۔پس ثابت ہوا کہ اس وحی خفی کا تصور ہی باطل ہے۔

وحی سابقہ وحی کی مصدّق ہوتی ہے:

شروع سے آخر تک وحی کا پیغام ایک ہی تھا۔کوئی اختلافی باعث نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ رسول ﷺ کو ملت ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا گیا تھا۔وحی ہمیشہ سابقہ وحی کی مصدّق رہی ہے۔اور یہ وحی کی صداقت کی نشانی تھا کہ وہ سابقہ انبیاء کی وحی کی تصدیق کرتی تھی۔وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (2:41)

اس قرآن پر ایمان لے آؤ یہ ان تمام دعووں کو سچا کر دکھائے گی جو تمہارے پاس ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (4:47)

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ (5:48)

بِمَآ اَنْزَلْتُ (2:41)، بِمَا نَزَّلْنَا (4:47)۔اور کِتٰبٌ۔تمام ایک ہی چیز ہے جو کتاب کے اندر ہے۔باہر نہیں۔

وحی ہمیشہ غالب رہتی ہے:

عقلِ انسانی کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔بسا اوقات صحیح نتائج تک پہنچنے میں خون کی ندیاں پار کرکے،صدیوں کے بعد پہنچ پاتی ہے اور بسا اوقات ناکام رہ جاتی ہے جبکہ وحی کا طریق حتمی اور قطعی ہوتا ہے جو انسانی وقت اور کاوشوں کے ضیاع کو بچاتی ہے۔ وحی ہمیشہ عقل انسانی کی امام ہوتی ہے۔جہاں عقل انسانی کسی معاملہ میں حیراں و سرگراں ہو تو وہاں وحی مسئلہ کا صحیح اور فوری حل تجویز کرتی ہے۔وحی ہمیشہ عقل انسانی کی رہ نما اور غالب رہتی ہے۔قرآن نے اس تاریک دور میں ان تمام لعنتوں،ملوکیت،پیشوائیت، سرمایہ داری،وطنیت،ذاتی ملکیت،نسل پرستی،اور مذاہب انسانی کو بہبودئ انسان کا دشمن قرار دیا۔اور آہستہ آہستہ عقل انسانی بھی انہی نتائج پر پہنچ رہی ہے جو چودہ صدی قبل وحی نے پیش کئے تھے۔اس طرح وحی انسانی عقل پر غالب اور رہنما رہی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿41﴾ (41:41)

یعنی وحی عقل انسانی سے ہمیشہ آگے اور غالب رہے گی۔انسان ترقی کی جتنی بلندیاں طے کرلے تو وحی ہمیشہ اس سے آگے رہے گی۔

وحی کی مثل بن نہیں سکتی:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ (2:23)

وحی یقین اور حق جبکہ ظن کبھی حق نہیں ہوسکتا:

ایمان و عمل کی ساری عمارت یقین پر ہوتی ہے اگر کسی معاملہ میں ذرہ بھر بھی شک و تردد ہو جائے تو دل جمعی سے ایمان و

یقین کے بغیر وہ عمل نہیں ہوسکتا۔قرآن کے علاوہ ہر شے ظن ہے۔جس پر ایمان نہیں لایا جاسکتا۔

وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا (53:28)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۚ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا (49:12)

مومنوں کو تو ظن سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ان روایات کا آغاز تو قَالَ رَسُوْلُ اللهِ اور اختتام اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ہے۔ یہی تو ظن ہے جس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (26:195) وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (16:103)

وحی میں نبی کی اپنی سوچ اور تدبر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔اس لیے وحی کے علوم ہمیشہ مبنی پر حق ہوتے ہیں۔جبکہ حضورؐ کے اقوال و افعال بشری تقاضے کی وجہ سے نسیان وسہو سے پاک نہیں ہوتے تھے۔آپ ﷺ بھی اعوذ باللہ کی دعا کر کے ساتھیوں سے مشاورت کر کے قدم اٹھاتے تھے۔

وحی میں تضاد نہیں ہوسکتا:

وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تضاد ناممکن ہے۔اگر کوئی شخص اپنی فکر سے کتاب لکھتا ہے۔تو اس میں جگہ جگہ تضادات ہونگے۔پھر ہر شخص کی فکر میں ارتقاء ضروری ہے۔اور گذشتہ نظریات سے رجوع کرنا کوئی امر بعید نہیں ہے۔اس لیے فکر انسانی میں تضاد ضروری ہے۔جبکہ وحی الٰہی ارتقا سے ماوراء ہے۔اس لیے اس میں تضاد نہیں ہوسکتا۔کیونکہ اس کا سرچشمۂ علم، علم خداوندی ہے جو ارتقاء سے بلند ہے۔

بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ (4:166) فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (11:14)

سارے قرآن میں کہیں بھی تضاد نہیں ہے۔تخلیق کائنات، تخلیق آدم، نمو دِ زندگی، کائنات کا ارتقائی دور، سیاسی، عمرانی، معاشرتی، اقتصادی۔ایک جگہ کہہ کر دوسری جگہ اس کی وضاحت کردی ہے۔مگر کسی جگہ کوئی ابہام نہیں ہے۔اور سائنس کے تمام انکشافات ہر ایک دعوی کی تصدیق کر رہی ہیں۔وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (4:82)

ان روایات میں تو ہر فرقہ کی حدیث دوسری سے مختلف ہے ان کا تضاد یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ وحی خداوندی نہیں ہیں۔

وحی کے کسی بھی حصہ کو مسترد نہیں کیا جاسکتا:

ساری وحی پر ایمان لانا ضروری ہے۔اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85) قرآن کے کسی ایک شق کا انکار کفر ہوگا۔جبکہ ایک فرقہ کی روایات دوسرا فرقہ نہیں مانتا۔

وحی کا تعلق عالمِ امر سے ہے جبکہ اقوالِ رسول کا تعلق عالمِ خلق سے ہے:

قرآن نے ''روح'' کی اصطلاح وحی کے لیے استعمال کی ہے۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (40:15)

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (16:2)

سورۃ شوریٰ میں ہے اَوْحَيْنَا فعل کا مفعول ''روح'' لا کر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کہ روح سے مراد وحی ہے۔ وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ (42:52) وضاحت کر دی کہ روح کا تعلق عالم امر سے ہے۔ عالم خلق سے نہیں۔ عالم امر میں مشیت خداوندی علّت ومعلول کی پابند نہیں ہوتی۔ عالم امر کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی مشیت، ارادہ اور مرضی پر ہوتا ہے۔ جبکہ عالم خلق کا تعلق علّت ومعلول سے ہے۔ اس میں ہر کام اس کے مقررہ کردہ قوانین کی رو سے طے پاتا ہے۔ وحی ایک موہبت عظمٰی تھی۔ جس میں صرف Objectivity ہوتی تھی۔ جبکہ اقوال رسول کا تعلق عالم خلق سے ہوتا تھا۔ جب کوئی معاملہ یا مقدمہ پیش ہوتا تو تمام کوائف کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ فرماتے تھے۔ نتیجہ بصیرت سے نکال کر اپنے الفاظ سے بیان کرتے۔ وہ فیصلہ اور الفاظ ذاتی بصیرت پر مبنی ہوتا۔ جبکہ وحی کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔

وحی کی یہ دس خصوصیات قرآن میں تدبر سے سامنے آتی ہیں۔ اس لیے قرآن ہی انہی خصوصیات کا حامل ہے اور وہی وحی ہے۔ جبکہ روایات ان میں سے کسی خصوصیت کی بھی حامل نہیں اس لیے ان کو وحی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ وحی کے مختلف طریقے درج ذیل ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ (42:51) ڈائرکٹ بات نہیں ہوسکتی۔ وحی کے ذریعہ یا پردہ کے پیچھے یا قاصد کے ذریعہ۔ اس طرح مشیت کے مطابق جس کو چاہے پیغام بھیج دے۔ اب خدا کی طرف سے ہدایت موصول ہونے کے تین طریقے بیان ہوئے ہیں۔ پہلی براہِ راست وحی دوسرا پردے کے پیچھے سے کلام۔ تیسرا پیغام کے ذریعہ وحی۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ قرآن یہ تیری قسم کی وحی ہے۔ اس طرح قرآن کی تو صرف ایک قسم کی یعنی پہلی قسم کی وحی قرار دیا گیا ہے باقی دو صورتیں اس کے علاوہ ہیں۔ یہ وحی خارج از قرآن تیسری قسم کی وحی ہے۔ جو فرشتہ کے ذریعہ ارسال ہوتی تھی۔ اس آیت سے یہ خارج از قرآن وحی کی استدلال لائی جاتی ہے۔ جو کہ غلط مفہوم ہے۔

1- مفسرین کے مطابق یہ تینوں صورتیں انبیاء سے مختص ہیں۔ حالانکہ اس آیت میں رسول یا نبی سے گفتگو کا تذکرہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ تمام نوع انسانی سے خطاب ہے اس لیے اس آیت کے مفہوم ساری نوع انسانیت کو شامل کرنا ضروری ہے۔

2- اگر یہ تینوں صورتیں وحی کی ہیں۔ تو وحی کی اصطلاح کو محدود مفہوم میں لینا ہوگا۔ یعنی ایسی وحی جو بلا آواز بلا جبریل کے ہو۔ اور دوسری قسم میں آواز کا ماننا ہوا۔ اور تیسری قسم جبریل کے ذریعہ ہونا۔ حالانکہ قرآن کی فصاحت کے مطابق قرآن جبریل کے ذریعہ نہیں آیا ہے۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (2:97)۔ اس سے مراد وحی جب بھی آئی جبریل کے ذریعہ آئی۔ اس لیے یہ کوئی تیسری قسم نہیں بن سکتی۔ جو وحی ''یا مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (42:51)'' سے الگ ہو۔

3- یہاں رسول سے مراد فرشتہ لینے کا کوئی خاص قرینہ نہیں ہے۔ کلام الٰہی کی یہ تیسری قسم بذریعہ فرشتہ تو خود ہی پہلی قسم کی وحی میں شامل ہے۔ اصل میں یہاں وحی کی نوعیت نہیں بتائی جارہی ہیں۔ یہ مکالمہ الٰہی کے تین طریقے بتائے جارہے ہیں۔ فرشتہ کا پیغام

پہنچانا بھی وحی ہے جو پہلی صورت وَحْيًا (42:51) سے مختلف نہیں ہے۔ اب اس کا صحیح مفہوم۔ یہاں پوری نوع انسانی کو وحی پہنچانے کا ذکر ہو رہا ہے۔ اب دو قسم کے انسان ہیں ایک تو ہوئے رسول اور دوسرے تمام نوع انسانی جیسا اس آیت سے ظاہر ہے۔ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (7:6) (دونوں سے پوچھا جائے گا) اب رسولوں کو ہدایت ملنے کے دو طریقے بتائے گئے ہیں۔ ایک وہ وحی جو جبریل لاتے تھے۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (2:97) دوسرا طریقہ موسیٰ کے ساتھ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (42:51) کی آواز تو سنائی دے مگر متکلم دکھائی نہ دے۔ یہ دو طریقے تو انبیاء کے ساتھ مخصوص تھے۔

اب باقی انسانوں سے کلام خداوندی کا طریقہ کیا تھا؟ کہ رسولؐ ان کی طرف پیغامِ خداوندی لاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تو رسول کے علاوہ کسی بشر سے بات نہیں کرتا تھا۔ اور وحی بھی صرف انبیاء کے ذریعہ پہنچائی جاتی تھی۔ اس سے اگلی آیت نے اس مفہوم کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ (42:52) جس طرح دیگر رسولوں کے ساتھ بذریعہ وحی کلام کرتے تھے۔ تیری طرف بھی عالم امر سے وحی کی۔ تو یہ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (42:51) موسیٰ کی طرح نہیں ہوا بلکہ جبریل کی لائی ہوئی وحی کے ذریعہ ہوا۔ اس کے بعد ہے کہ تو اس سے قبل کتاب اور ایمان کے متعلق کوئی معلومات نہیں رکھتا تھا۔ اس کے بعد ہے ۙ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (42:52) بے شک تو لوگوں کو رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے۔

حضور ﷺ کو صرف قرآن وحی کیا گیا:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ (36:69) اس آیت میں نفی اور اثبات کے حصر کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے جو بھی تعلیم دی گئی تھی وہ صرف قرآن ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کو نفی کی گئی ہے۔ هُوَ کا مرجع تعلیم یعنی جو بھی تعلیم عطا کی گئی ہے۔ وہ صرف یہ قرآن ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (41:41-42) یہاں واؤ عاطفہ نہیں بلکہ واؤ بیانیہ ہے۔ اس کو الگ الگ سمجھ لیا جاتا ہے هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ (48:28) اس میں بھی واؤ بیانیہ ہے۔ کیونکہ ھُدیٰ اور دین ایک چیز ہے۔ یعنی قرآن۔ یہ وحی اور القاء کے قائل وحی کو بجلی اور الہام و کشف کو موم بتی کہتے ہیں۔ جس ہستی کو وحی جیسی روشن ہدایت ملتی ہو۔ اسے بھلا اس موم بتی کی کیا ضرورت! دوسرا نجم کی آیات سے ''خارج از قرآن'' وحی کی دلیل لائی جاتی ہے۔ اور نظریہ یہ ہے کہ چونکہ رسول کا مطلق نطق وحی ہے۔ (ساری گفتگو) اس لیے قرآن کے علاوہ اقوال بھی وحی ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ۙ (53:3-4) مگر حضور ﷺ کے ہر نطق کے وحی ہونے کے خلاف خود قرآن اور روایات میں بہت سے دلائل ہیں۔ جب رسول ﷺ نے منافقین کو غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی اجازت دی۔ تو عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (9:43) اگر یہ اجازت وحی تھی تو رسول ﷺ سے کیوں سرزنش کی گئی۔ حضور ﷺ کے اس قول اجازت کی تصویب کیوں نہ کر دی گئی۔ اس سے ظاہر کہ یہ آپ ﷺ کا قول بشری تھا۔

دوسری مثال حضرت خویلہ بنت ثعلب کے واقعہ کی ہے۔ جب ان کے شوہر اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے ان کو ظہار کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد رجوع کرنے کی خواہش ہوئی۔ تو خود تردد ہوا۔ اور خویلہ رضی اللہ عنہا کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا۔ حضور ﷺ نے سارا واقعہ سنا تو فرمایا کہ ''ظہار'' کے بعد وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں جاسکتی۔ حضور ﷺ نے ظہار کو طلاق قرار دیا۔ لیکن خویلہ رضی اللہ عنہا بار بار اصرار کرتی رہی کہ ظہار سے طلاق واقعہ نہیں ہوئی۔ مگر حضور ﷺ اسے طلاق ہی گردانتے رہے۔ تو سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ڰ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ① (58:1)۔

اس وحی نے حضور ﷺ کے قول کی تردید کردی۔ چونکہ یہ بشری قول تھا۔ اس لیے اس کی تصویب نہ کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ ہر قول مبنی پر وحی نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح سورۂ تحریم میں حضور ﷺ نے ازواج کی خوشنودی کے لیے اپنے لیے شہد منع کردیا تھا۔ تو يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ (66:1) اس میں حضور ﷺ کے اس فعل کو نامناسب قرار دیا گیا۔

اسی طرح واقعہ افک کو لیں۔ جب وحی اترنے میں دیر ہوئی تو علی رضی اللہ عنہ اور اسامہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے جدائی کا مشورہ کرنے لگے۔ چونکہ حضور ﷺ کو بیویوں سے انتہائی محبت تھی۔ تو انہوں نے ویسا مشورہ دیا۔ ان روایات میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مہینہ بھر وحی بند رہی۔ تو جب حضور ﷺ کا ہر قول وحی تھا تو وحی اترنے میں دیر کے کیا معنی؟ تو کیا اس پورے ماہ میں حضور ﷺ نے جو کلام فرمایا۔ وہ وحی نہیں تھی۔ تو علی رضی اللہ عنہ اور اسامہ رضی اللہ عنہ کے مشورہ کی کیا ضرورت تھی؟ یہی مشورہ تو حضور ﷺ کا بشری کلام تھا۔

سورۂ نجم کی آیات کا صحیح مفہوم:

ان مفسرین نے اصل غلطی یہ کی ہے کہ هُوَ کا مرجع جو برائے ''نجم'' ہے یعنی قرآن نے يَنْطِقُ (53:3) کو قرار دیا ہے۔ اس طرح مطلق نطق رسول کا ہر قول وحی ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ هُوَ ضمیر کا مرجع اَلنَّجْم ہے وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ① (53:1) یعنی جس طرح ان ستاروں نے تمہیں نہ دھوکہ دیا ہے۔ یہ کیونکہ ان کے اندر وحی رکھ دی گئی ہے۔ اسی طرح تمہارا ساتھی بھی نہ راستے سے بھٹکا ہوا ہے نہ بہک گیا ہے۔ اور یہ وہی بولتا ہے جو اس کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ④ (53:4) میں هُوَ ضمیر کا مرجع النَّجْم ہے۔ وحی جو ستارے کو بھی دی گئی ہے جس پر تم ہزاروں سالوں سے اعتماد کر کے منزل تک پہنچ جاتے ہو جس نے کبھی نہ دھوکہ دیا ہے اور نہ بھٹکایا ہے۔

قرآن کے وحی ہونے کے دس قرآنی دلائل

پہلی دلیل:

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ (6:106)

دوسری جگہ ہے۔ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ (10:15) اتباع صرف ''مَاۤ اُوۡحِیَ'' کا ہے۔ دوسری میں حضور ﷺ کی شہادت کہ میں صرف ''مَا یُوۡحٰۤی'' (10:15) کا اتباع کرتا ہوں۔ حضور ﷺ صرف ''مَا یُوۡحٰی'' کے متبع اور عامل تھے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کے نہیں۔

نحوی لحاظ سے ''ما موصولہ'' کو مبہم گردانا گیا ہے۔ چونکہ اس میں وسعت کی گنجائش تھی اس لیے اس میں اقوالِ رسول ﷺ کو بھی وحی قرار دیا گیا ہے۔ مَا یُوۡحٰۤی (10:15) کے لیے دو شہادات پیش کی جاتی ہیں۔ ایک شہادت تو خود ''وحی'' کی ہوگی کہ ''مَا یُوۡحٰۤی'' (10:15) کیا چیز ہے؟ دوسری شہادت یُوۡحٰۤی اِلَیۡہِ یعنی حضور ﷺ ہوگی کہ ان کی طرف کونسی چیز وحی کی گئی۔

ارشاد ہے: وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا (42:7) یہ ہے اللہ کی شہادت وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ (6:19) یہ ہے حضور ﷺ کی شہادت یہ مَا یُوۡحٰۤی (6:15) قرآن ہے۔ ان شہادات کی روشنی میں حضور ﷺ نے صرف قرآن کا اتباع کیا ہے۔ غیر از قرآن قطعاً نہیں۔

دوسری دلیل:

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ ۟ (2:285)

واضح رہے کہ انبیاء پر بھی کتاب کے علاوہ کوئی اور شے نازل نہیں ہوئی تھی۔ کُتُبِہٖ میں تو مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ ہے۔ تو مومن کا ایمان تو وہی درست ہوگا جس پر صحابہ رضی اللہ عنہم اور رسول ﷺ ایمان لائے تھے۔ خود حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم ان چار چیزوں پر ایمان لائے تھے۔ ① اللہ تعالیٰ ② ملائکہ ③ کتب ④ رُسُل غیر از کتاب تو کسی چیز پر ایمان لانے کا تو ذکر ہی نہیں ہے۔ رسول ﷺ کا ارشاد

ہے: اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ ۚ (42:15) یہ قطعی حجت ہے کہ حضور ﷺ بھی کتاب پر ایمان لائے تھے۔ اگر کسی اور چیز پر ایمان لاتے تو کتاب کے ساتھ اس کا بھی ذکر ہوتا۔

حصرِ نزول:

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی ؕ (13:19) اس آیت میں اَنَّمَا کلمہ حصر ہے۔ یعنی حضور ﷺ کی طرف صرف اور صرف حق یعنی قرآن نازل ہوا۔ تو اس وضاحت کے بعد قرآن کے علاوہ کسی اور کتاب کو وحی کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

دلیل 4:

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۳﴾ (7:1-2-3) پس ظاہر ہوا کہ کتاب اور مَآ اُنْزِلَ ایک چیز ہے۔

دلیل 5:

فَاسْتَمْسِکْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْکَ ۚ اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ ۚ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ ﴿۴۴﴾ (43:43-44) ایک آیت میں اُوْحِیَ اِلَیْکَ ۚ (43:43) کی ذکر سے کردی گئی۔ ذکر کی توضیع سورۂ انبیاء میں وَھٰذَا ذِکْرٌ مُّبٰرَکٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ (21:50) تو اُوْحِیَ اِلَیْکَ ۚ (43:43)، ذِکْرٌ (43:44)۔ سے مراد قرآن ہے۔

دلیل 6:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ (2:159) مَآ اَنْزَلَ (5:48) کی وضاحت تبیین کتاب میں کردی گئی ہے۔ اس لیے مَآ اَنْزَلَ (5:48) کا تصور قرآن سے باہر باطل تصور ہے۔

دلیل 7:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْکِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ ؕ (5:48) بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (5:48) اور کِتٰبٌ۔ ایک ہی چیز کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

دلیل 8:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ (10:15) اور

جن لوگوں نے حضور ﷺ سے غیر قرآن طلب کیا تھا اور اس میں ردوبدل کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ وہ تو مکافات عمل کے منکر تھے۔ تو غیر ازقرآن کا مطالبہ تو منکرین کا شیوہ تھا۔ جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآيِٕ نَفْسِيٓ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ ۖ (10:15) کلام غیر موجب ہے اور مستثنیٰ منہ مذکور نہیں ہے یعنی یہاں اِلَّا حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ پس حضور ﷺ کی تعلیم صرف مَا يُوحَىٰ (10:15) ہے۔ دیگر متعدد مقامات پر مَا يُوحَىٰ (10:15) اور قرآن کو ایک ہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

دلیل 9:

قُلْ إِنَّمَآ أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾ (7:203) ملاحظہ کریں۔ مَا يُوحَىٰ صرف بَصَآئِرُ ، هُدًى۔ اور رَحْمَةٌ ہیں۔ جو قرآن کے لیے استعمال کی گئی ہیں صرف انہی کے اتباع کا حکم ہے۔ اگلی ہی آیت میں وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُۥ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾ (7:204) یہ مَا يُوحَىٰ (7:203)۔ جو بَصَآئِرُ اور هُدًى (7:203)۔ رَحْمَةٌ (7:203) پر مشتمل ہے اس کو خاموشی سے سننے کی تاکید کی گئی ہے۔

دلیل 10:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن نُّؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ط (34:31)) کفار نے اس قرآن کے ساتھ ساتھ سابقہ کتب کا بھی انکار کیا ہے۔ مگر کسی مِثْلَهُ مَعَهُ (13:18) کا ذکر تک نہیں۔ اگر کوئی وحی خفی ملی ہوتی تو اس کا بھی قرآن و سابقہ کتب کے ساتھ ذکر کیا جانا۔ پس ثابت ہو گیا کہ وحی صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس سے باہر کا کوئی بھی لفظ وحی نہیں ہے۔

وحی صرف قرآن میں ہے

خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔ وہ دن تاریک ترین دن تھا جس دن اس باطل نظریہ کی سازشیوں نے ابتداء کی کہ کچھ وحی کے اندر ہے اور کچھ باہر۔ یہ نظریہ اپنے جرائم اور نظریات کو سند دینے کے لیے گھڑا گیا تھا اور اس کی سرپرستی اس وقت کے مقتدر طبقہ نے کی۔ اور یہ ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اب ایک چور دروازہ کھل گیا ہر خود ساختہ اور ان کے مفاد کو پورا کرنے والا عقیدہ حضور ﷺ سے منسوب کر کے اسے وحی الٰہی کا درجہ دیدیا گیا۔ قرآن سے واضح ہوجاتا ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے۔ اس نظریہ کی تائید کے لیے قرآنی آیات اور بعد میں عقلی دلائل پیش کیے جائیں گے۔ اور آخر میں ان الزامی جوابات کو واضح کیا جائے گا۔ جو ان علماء کی طرف سے صرف قرآن محفوظ ماننے پر وارد کئے جائیں گے۔

وحی صرف قرآن میں ہونے کے دس دلائل:

(1) موسیٰ کا ارشاد ہے: اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ (12:3) اور وحی الیہ یعنی حضور ﷺ کا ارشاد ہی: اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ (6:19)

هٰذَا کا اسم اشارہ قریب ساتھ لانے سے حصر کر دیا گیا ہے کہ یہی قرآن ہم نے نازل کیا ہے اور یہی قرآنِ مجید پر نازل کیا گیا ہے۔ قرآن میں قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کو وحی کرنے کا حکم نہیں ہے۔

(2) وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (6:19)

(3) قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ (21:45) وحی اور قرآن کے الفاظ ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ (4:105) اس علم کے ذریعہ چوتھے قرآن کے ذریعہ ملا۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) اب ان آیات میں کتب اور ما انزل اللہ ایک ہی چیز ہے۔

(4) مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ (11:12) اور قرآن ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں:

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ (11:12-13)۔

پہلی آیت میں افتری کا الزام مایوحیٰ کے لیے ہے۔ دوسری آیت میں افتری کا الزام قرآن پہ ہے۔ دونوں آیات میں ظاہر ہے مایوحیٰ صرف قرآن ہے۔ دونوں آیات کے الفاظ ہی ایک جیسے ہیں۔

(5) وحی ساری کی ساری متلو ہے جو قرآن میں ہے:

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ (13:30) مطلق مَا يُوْحٰى (10:15) متلو ہے۔ سارا قرآن متلو ہے۔

(6) امت صرف قرآن کی وارث ہے۔ خارج از قرآن کی وارث نہیں:

وَالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ (35:31-32)

اس میں مِنْ تبین (بیانیہ) ہے اور کسی صورت تبعیضیہ (تبعیض) نہیں ہے۔ کیونکہ تبعیضیہ سے مراد ہوگا قرآن کا کچھ حصہ حق ہوگا اور کچھ باطل۔ کیونکہ ایسا ہو نہیں سکتا اس لیے مِنْ بیانیہ ہے اور مفہوم جو کچھ بھی وحی کیا گیا ہے اس کتاب میں آ گیا ہے۔

اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ (35:32) سے مزید وضاحت ہوگئی کہ امت مسلمہ صرف کتاب کی وارث ہے۔ اگر وحی قرآن کے علاوہ بھی ہوتی تو امت اس کی بھی وارث قرار پاتی۔ یہ آیت برہان قاطعہ ہے اس دلیل قاطعہ کے بعد کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں کہ امت مسلمہ صرف قرآن کی وارث اور اس کے اتباع کی مکلّف۔

(7) مَاۤ اُوْحِيَ (18:27) اور قرآن ایک چیز ہے:

وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (18:27)

اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۫ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ (27:91-92)

صرف مَاۤ اُوْحِيَ کی تلاوت کا حکم ہے۔ دوسری آیت میں قرآن کی تلاوت کا۔ دونوں ایک دوسرے کے متبادل استعمال ہوئے ہیں۔ پہلی آیت میں مِنْ بیانیہ ہے۔ تبعضیہ نہیں ہوسکتا۔

(8) کتاب اور مَآ اُنْزِلَ (7:3)، ایک چیز ہے:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ (6:155) دوسری جگہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (7:3) كِتٰبٌ (6:155) اور بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (42:15) یعنی قرآن کے اتباع کا حکم ہے۔

(9) نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (47:2) قرآن ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴿۲﴾ (47:2)

(10) معارضہ مِمَّا نَزَّلْنَا (2:23) کا کیا گیا ہے صرف قرآن کا نہیں:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (2:23) اس آیت میں معارضہ مِمَّا نَزَّلْنَا (2:23) کا کیا گیا ہے۔ صرف قرآن کا نہیں۔ یہ بات غور طلب ہے۔ اگر قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز بھی مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰهِ ہوتی تو اس کے مقابلہ کی تحدی میں پیش کی جاتی۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ اَوْ بِحَدِيْثٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ کا ارشاد ہوتا۔ لیکن یہاں مِمَّا نَزَّلْنَا (2:23) کو صرف سورتوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔ اور معارضہ ہے کہ منزل من اللہ وہ ہے۔ جس کا مثل نہ بن سکے۔ اور اس معیار پر تو صرف قرآن اتر سکتا ہے جس کا مثل آج تک نہیں بن سکا۔ ورنہ ان روایات کا مثل تو اس قدر کثیر تعداد میں ہے کہ اس کی صحت جانچنے کے لیے مستقل ایک علم کی ضرورت ہے اور اس کے باوجود آج تک یہ تعین نہ ہوسکا کہ ان میں صحیح حدیث کونسی ہے اور غلط کونسی؟

یہ دس دلائل قاطعہ ہیں۔ ورنہ قرآن کے دیگر بیشتر مقامات سے اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔

وحی صرف قرآن ہونے کی عقلی دلیل:

عقلی طور پر بھی یہ بات بعید از عقل ہے کہ وحی قرآن سے باہر بھی تھی تو حضور ﷺ کا فریضہ تھا کہ اس کی نشاندہی فرماجاتے۔ اور اس کی حفاظت کی تلقین بھی۔ کیونکہ ان کا سب سے اہم فریضہ تبلیغ وحی تھا۔ قرآن کو محفوظ کرکے اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے لیا۔ اگر وحی قرآن سے باہر ہوتی تو اس کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ پر ہوتی۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ (15:9) کے ذکر کے ساتھ اس کی بھی حفاظت کا ذکر فرمادیتے۔ مگر صورت یہ ہوتی کہ حضور ﷺ کے ڈھائی سو سال بعد بڑی کاوشوں سے حدیث کو مدون کیا گیا۔ اگر بقول ان کے، حدیث وحی ہے تو نصف وحی تو خدا نے محفوظ کردی اور نہ صرف ان حضرات کی کوششوں سے محفوظ ہوگئی اس طرح یہ حضرات شریکِ کارِ رسالت قرار پائے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وحی جیسی اہم چیز کو حضور ﷺ دوسروں کی صوابدید پر چھوڑ دیتے۔ بخاری نے سات لاکھ احادیث میں سے مکررات نکال کر 3600 صحیح قرار دے کر درج کردیں۔ اس کا مطلب

یہ ہوا کہ وحی کے جمع واسترداد کا حق بخاری نے استعمال کیا جو پیغمبر کے پاس بھی نہیں تھا۔ وہ کونسا ذریعہ یا معیار تھا جس سے احادیث کی اتنی بڑی تعداد مسترد کر دی؟ آج کے مزعومہ منکرِ حدیث تو چند ہزار احادیث کے منکر ہیں۔ بخاری تو لاکھوں حدیثوں کا منکر ہوا۔ اور اس الزام سے محفوظ رہا۔ یہ تو وحی کی توہین ہے کہ اس کے قبول واسترداد کا حق کسی بھی فرد کو دیا جائے۔ خواہ وہ رسول ہی کیوں نہ ہوں۔

وحی خارج از قرآن کا اقرار بھی اور انکار بھی:

یہ عجیب بات ہے کہ تمام فرقے ان احادیث کا اقرار بھی کرتے ہیں اور انکار بھی۔ اہل تشیع و اہل سنن کی تو کتابیں ہی مختلف ہیں۔ شیعہ کی اربعہ اور اہل سنت کی صحاح ستہ۔ اس طرح ایک طرف چھ صحیح اور چار غلط ہیں۔ دوسری طرف چار صحیح اور چھ غلط ہیں۔ اور عملاً سنی شیعوں کی کتب کا انکار کرتے ہیں اور شیعہ سنیوں کی کتب کی تغلیط۔ دونوں طرف اقرار بھی ہے۔ انکار بھی جبکہ وحی الٰہی اس سطح سے بلند ہوتی ہے۔ اس پر ایمان لانا لازمی ہے۔ وحی ان اعتراضات سے بالا ہوتی ہے۔ اس میں شک وظن کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ذرا سا شک وظن ایمان اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔

حضور ﷺ کا ہر قول وحی نہیں تھا:

علماء کی طرف سے جو دلائل خارج از قرآن وحی کی بابت دیئے جاتے ہیں۔ اس میں سرفہرست یہ دلیل ہے چونکہ نطقِ رسول وحی ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کا ہر قول وحی ہے۔ لہٰذا یہ احادیث وحی ہیں۔ اور تائید میں سورۂ نجم کی یہ آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ (53:3) ہر موقعہ پر پیش کی جاتی ہے۔ ''علامہ ایوب نے اپنی کتاب ''فتنۂ انکارِ حدیث'' میں لکھا ہے۔ بے شمار دلائل موجود ہیں کہ قرآن کے علاوہ دوسری وحی پر وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾ (53:3-4) کہ اس کا قول وحی ہے اگر کوئی کہے کہ وہ صرف قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا تھا۔ تو کیا یہ غلط ہے؟ اس لیے کہ قرآن کو آیت میں محذوف ماننا پڑے گا۔ اور حذف خلافِ اصل ہے۔ دوسرے هُوَ کا مرجع مذکور نہیں ہے۔ یعنی وہ نہ بھٹکا اور نہ ٹیڑھا چلا۔ عمل کی صفائی ''مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴿۲﴾'' (53:2) سے کر دی اور قول کی صفائی ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾'' (53:3) سے کر دی۔ یعنی اس کا قول وفعل منجانب اللہ ہے۔ اس کے علاوہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا یہ قول وحی ہے۔ عام طور پر یہی دلیل سرفہرست ہوتی ہے۔ لیکن یہ اعتراض اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ حضور ﷺ کے ہر نطق کے وحی ہونے کے خلاف خود قرآن اور روایات میں بے شمار دلائل موجود ہیں۔ جو پچھلے مضمون میں آ چکے ہیں۔ تو ان تمام باتوں سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ کا ہر قول وحی نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ بشر صاحب وحی تھے۔ بشر بھی اور رسول بھی (17:93)

اس لیے بشری اقوال تو وحی نہیں تھے۔ مثلاً آپ ﷺ فرماتے کہ میں بازار نہیں جاؤنگا۔ آج موسم گرم ہے۔ میں نہا رہا ہوں۔ کیا یہ اقوال وحی ہیں۔

اصل میں سورۂ نجم کی پہلی آیات میں هُوَ ضمیر کا مرجع اَلنَّجم ہے یعنی قرآن کریم، وحی۔

وحی صرف قرآن ہونے میں دوسرا اعتراض:

دوسرا اعتراض ان کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ اگر وحی خارج از قرآن تسلیم نہ کی جائے۔ تو اطاعت رسول ﷺ کیسے کیسے ہو؟ یہ بات تو ٹھیک ہے ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

ان کے مطابق اللہ کی اطاعت تو قرآن سے ہوگئی اور رسول ﷺ کی اطاعت احادیث ہوگئی مگر بقول ان کے کہ اگر قرآن بھی وحی ہے اور حدیث بھی وحی ہے تو ایک وحی کی اطاعت تو خدا کی اطاعت ہوگئی اور دوسری اطاعت رسول کی ہوگئی کیسے؟ وحی تو نبی کو خارج سے، وہبی طور پر ملتی ہے۔ اس میں حضور ﷺ کے ذاتی خیالات وجذبات کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اگر حدیث وحی ہے تو اس کی اطاعت حضور ﷺ کی اطاعت کیسے ہوجائے گی؟ عقلاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر وحی کی تقسیم جلی اور خفی میں بھی کی جائے۔ جو غیر قرآنی ہے تب بھی وحی خفی سے حضور ﷺ کی اطاعت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت رہتی ہے۔ اس لیے یہ نظریہ چونکہ حضور ﷺ کی اطاعت حدیث کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کا ماننا ضروری ہے۔ بداہتاً غلط ہے۔

اطاعت رسول کا صحیح طریقہ:

اصل یہ ہے کہ اتباعِ وحی ہی اطاعتِ رسول ہے۔ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾ (3:68) رسول ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ابراہیم کے قریب۔ اس لیے بتایا گیا ہے۔ آپ ﷺ ملت ابراہیمی کے پیروکار تھے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے متبع تھے۔ اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ابراہیم علیہ السلام کے متبع تھے۔

لیکن چونکہ رسول ﷺ کے پاس ابراہیم علیہ السلام کے روایات اور احادیث کا ذخیرہ تو نہیں تھا کہ آپ ﷺ ان کا اتباع کر کے اقربِ ابراہیم بنے۔ اس کی اصلی صورت آیت 6:106 اور 10:109 سے واضح ہوتی ہے چونکہ ابراہیم بھی وحی کے مطیع تھے اور حضور ﷺ بھی۔ اس لیے حضور ﷺ کا اتباع بعینہٖ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع تھا۔ اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتباع گویا ابراہیم علیہ السلام کا اتباع تھا۔ اس توجیہہ سے یہ بات قابل تسلیم ہے کہ چونکہ حضور ﷺ خود قرآن کے متبع تھے۔ اس لیے قرآن کا اتباع کرنے سے پس حضور ﷺ کا اتباع ہوتا ہے۔ یادرہے کہ مَا يُوْحٰٓى (7:203) اور مَآ اُنْزِلَ (5:67) کا اتباع ہی انبیاء کا اتباع ہے۔ ہر ایک نبی کو ساتھ کتاب بھی دی گئی تھی۔ کیونکہ ان کی تعلیمات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس لیے جملہ انبیاء ایک ہی تعلیم کے متبع تھے۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن کا اتباع ہی ابراہیم سمیت جملہ انبیاء کا اتباع ہے۔ اس کی اتباع ہی ملت ابراہیمی یعنی ضابطہ ابراہیمی کا اتباع ہے۔ قرآن کا اتباع اسوۂ ابراہیمی کا اتباع ہے (60:4)۔ یہی اسوۂ محمد ﷺ کا اتباع ہے (33:21)۔ جس کے لیے ان احادیث کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ اور رسول کی اطاعت سے دو الگ الگ مطاعوں کی اطاعت کا نظریہ تو شرک ہے۔ دو حاکم ماننا تو سرکشی اور بغاوت ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ (12:40)۔ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (18:26)

1043 ان آیات کے تحت اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ (4:59)۔ سے مراد الگ الگ اطاعت تو قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس میں ''واؤ'' سے مراد بذریعہ ہے۔

بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖۤ اِلَی الَّذِیۡنَ عٰہَدۡتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ؕ﴿۱﴾ فَسِیۡحُوۡا فِی الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّاعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ غَیۡرُ مُعۡجِزِی اللّٰہِ ۙ وَاَنَّ اللّٰہَ مُخۡزِی الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲﴾ (9:1-2)

سب یہ معاہدہ اللہ کا بذریعہ رسولؐ ہے اور چار ماہ کی مہلت بذریعہ رسول دی گئی اس کو وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖۤ (9:3) اس ''وَ'' بذریعہ رسول کے آئی ہے یہ اعلان حج اکبر کے دن ہوا جس میں مرکزی اتھارٹی کی طرف سے بیزاری کا اعلان ہے نیز مَّا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۱۲﴾ (33:12)۔ جو وعدہ اللہ نے ہم سے بذریعہ رسول ﷺ کیا تھا۔ اللہ خود آ کر تو وعدہ نہیں کرتا۔ یہ سارا کچھ رسول اور مَعَہٗ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

اللہ اور رسول سے مراد مرکزِ ملت ہے:

یہ دو الگ الگ مطاعوں کی اطاعت نہیں ہے۔ یہ تصور تو شدید قسم کا شرک ہے۔ یہ اطاعت لوگوں سے کروانا تو رسول ﷺ بھی اپنی اطاعت لوگوں سے نہیں کرا سکتا۔ لہٰذا اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت وہ مرکزی اطاعت قرآنی قوانین کی اطاعت ہے۔ یہ اس قدر واضح ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَا تَوَلَّوۡا عَنۡہُ وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ ﴿ۚ۲۰﴾ (8:20) یہاں اللہ اور رسول وَالَّذِیۡنَ کا ذکر ہے۔ مگر عَنۡہُ کی ضمیر واحد ہے۔ عَنۡہُمَا کی بجائے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ ۚ ((8:24 صیغہ دَعَاکُمۡ۔ واحد ہے۔ اس طرح سورۂ نور میں: وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنۡ یَّکُنۡ لَّہُمُ الۡحَقُّ یَاۡتُوۡۤا اِلَیۡہِ مُذۡعِنِیۡنَ ﴿ؕ۴۹﴾ (24:48-49) یہاں بھی اللہ اور رسول کے لیے لِیَحۡکُمَ (24:48) کا واحد صیغہ اور اِلَیۡہِ میں بھی ضمیر واحد ہے۔ قرآن میں تمام مقامات پر اللہ اور رسول سے مراد مرکزی اتھارٹی ہے۔ مرکز ملت ہے۔ یہ کوئی نیا مفہوم نہیں ہے۔ مولانا آزاد اور مودودی نے بھی یہی مفہوم دیا ہے۔

حکمت کا صحیح مفہوم:

اب کوئی سہارا نہ ملا تو ''حکمت'' کے پیچھے پڑ گئے یعنی اس سے مراد ''یہ حدیث یعنی وحی خفی'' ہے۔ قرآن سے اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ حکمت بھی مُنَزَّلٌ مِنَ اللہِ ہے اور قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ ہر قانون کی غرض و غایت ''Why of It'' حکمت کہلاتی ہے مثلاً اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ ﴿۷﴾ (47:7) اللہ کی مدد کرنے کی حکمت اللہ ہماری مدد فرمائے گا۔ اور قدموں میں تزلزل نہیں ہونے دے گا۔ کتاب و حکمت دونوں منزل من اللہ ہیں۔ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ وَالۡحِکۡمَۃِ

یَعِظُکُمۡ بِهٖ ؕ (2:231) اب کتب وحکمت ایک ضمیر واحد بہ استعمال کی ہے۔

(23:94) میں فرمایا حکمت بھی تلاوت ہوتی ہے اس لیے حکمت بھی وحی ہے جو متلو ہے۔ اور قرآن سے باہر نہیں ہو سکتی۔

جزئیات کے تعیّن کا طریقہ:

اب آخری اعتراضات کہ جزئیات کا تعین خصوصاً نماز کے ارکان کا تعین کیسے ہو؟ قرآن نے صرف قوانین اور اصول دیئے ہیں اور حضور ﷺ نے باہمی مشورہ کے بعد جزئیات اپنی فراست سے مقرر کر دیں۔ مثلاً قرآن نے مسافر پر روزہ قصر قرار دیا ہے۔ چور کی سزا قطع ید مقرر کی ہے تو کوئی ایک سوئی چوری کرے تو اس کا قطع ید نہیں ہوگا۔ زکوٰۃ کی تفاصیل قرآن نے نہیں دیں۔ اس کا نصاب اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق مقرر کیا۔ حج کا حکم قرآن نے دیا۔ جزئیات رسول ﷺ نے مقرر کیں۔ انسانی عقل رہنمائی کی محتاج ہے اور وہ رہنمائی صرف قرآن ہی دے سکتا ہے۔ جو خود بھی واضح، روشن، مبین ہے۔ اور اسے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں۔

قرآن فہمی کے قرآنی قوانین

تفاسیر کے ڈھیر:

متقدمین اور متاخرین کی تفاسیر کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور ہر ایک تفسیر کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً تفسیر ابن جریر طبری، 30 جلدیں، تفسیر امام غزالی 20 جلدیں، تفسیر امام ابن جوزی 40 جلدیں، تفسیر ابن النقیب 50 جلدیں، تفسیر الافودی 120 جلدیں، تفسیر الحدائق 500 جلدیں، تفسیر مدارک التنزیل 7 جلدیں، تفسیر کبیر 8 جلدیں، روح المعانی 9 جلدیں، تفسیر مریسی 24 جلدیں، کتاب جامع فی التفسیر 30 جلدیں، کتاب تحریر التحبیر 50 جلدیں، قاری کی زندگی ختم ہوجائے گی مگر یہ تفاسیر ختم نہیں ہونگی، اس کے علاوہ بغوی، بیضاوی، کشاف، بیجاوی، بلقیس، بقاوی، فراحی، شوکانی، ابن تیمیہ، ابن منذر، ابن حبان، ابن ابی طالب مکی وغیرہ وغیرہ جس سینکڑوں تفاسیر پانچ پانچ سات سات جلدوں پر مشتمل ایک عظیم ذخیرے کی صورت میں موجود ہیں کہ ان سب کا مطالعہ تو ایک طرف، ان کے مندرجات کو محض سرسری نظر سے دیکھنا بھی انتہائی مشکل کام ہے۔ اگر کوئی شخص ان متقدمین اور متاخرین کی تفاسیر سے استفادہ کرنے کا ارادہ کر بیٹھے جن میں ہزاروں صفحات پر مشتمل پانچ سو جلدوں کی تفاسیر بھی موجود ہیں۔ تو اس کی زندگی ختم ہوجائے گی مگر یہ تفاسیر ختم نہیں ہونگی۔ یہ تو ہوئے متقدمین، متاخرین بھی شاہ عبدالقادر، اشرف علی تھانوی، شاہ عبدالعزیز، شاہ محمود الحسن، ابوالکلام آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی فیروز الدین، مولانا احمد علی لاہوری، مولوی ثناء اللہ امرتسری، نعیمی، عزیزی، تفہیم القرآن اور جامع التفاسیر جیسی سینکڑوں تفاسیر کے ڈھیر الگ جمع ہیں۔

تفسیری اختلافات:

ان لاکھوں بلکہ کروڑوں پر پھیلی ہوئی ہزاروں تفاسیر کا اندازِ بیان واحد ہے۔ تفسیر ابن جریر طبری کو چونکہ امام التفسیر مانا گیا ہے۔ اسی لیے یہ تمام تفاسیر اسی کا پرتو ہیں۔ چونکہ طبری کا ماخذ روایات ہیں۔ جن کو احادیث رسول ﷺ مانا گیا ہے۔ اور یہ تمام تفاسیر متفقہ طور پر یہ فیصلہ نہیں دے سکتیں کہ سورہ بقرہ میں مذکورہ افراد ہاروت و ماروت شیطان تھے یا فرشتے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو رسولی تفاسیر ہی مانا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے شہادت دی ہے کہ رسول کا تفسیری انداز بھی تفسیر القرآن بالقرآن تھا۔ سارا قرآن ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول ﷺ بھی قرآنی تفسیر کے لیے قرآن کے محتاج تھے۔ کیا

حضور ﷺ اپنی رائے کے ساتھ تفسیر نہیں فرمایا کرتے تھے؟ ان حالات میں جہاں قرآن کو غیر مفصل اور روایات کا محتاج مانا جائے۔

تو یہ سوال ان حالات میں ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن اپنی تفسیر آپ کر سکتا ہے؟ اب اس سوال کے جواب کے لیے مندرجہ ذیل سطور پر بانگاہِ تعمق غور کریں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کسی کتاب کی تفسیر وہ شخص کر سکتا ہے۔ جو علمی لحاظ سے یا تو صاحب کتاب سے افضل حیثیت کا حامل ہو۔ یا کم از کم اس علمی سطح پر فائز ہو۔ جو خود صاحب کتاب کی ہے۔ چونکہ کتاب ہے خود اللہ تعالیٰ کی اس لیے کوئی فرد یا بشر علمی لحاظ سے نہ اس سے افضل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے علمی سطح کا۔ فَلِهٰذَا اس چیز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ خدا کی کتاب کا مفسر کوئی بشر ہو۔ اس لیے اعلان کر دیا کہ وہ اپنی کتاب کے خود مفسر ہیں وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ (25:33)

چونکہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی ہے اس لیے کوئی بشر علم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے نہ تو افضل ہو سکتا ہے اور نہ ہی برابر۔ کہا کہ آیات کی تفسیر و تفصیل بھی ہمارے ذمہ ہے كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ (10:24) اور قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾ (6:98) اور اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (47:24) یہ تقلید کے تالے رکاوٹ ہیں۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾ (38:29) تدبر اور تفکر سے ہی صرف عقل و دانش والے اس کو سمجھ پائیں گے۔ ان آیات بالا سے ثابت ہوا کہ قرآن پر تدبر و تفکر نہ کرنا صریحاً حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔ اور یہ تدبر قیامت تک کے لیے جاری کر دیا گیا ہے۔ جگہ جگہ تدبر، تفکر، تعقل کا حکم ہے۔ لہٰذا ذہن کو کسی سابقہ تفکر و تدبر کے کاموں کے ساتھ مقفل کر لینا قرآن کی لامحدود وسعتوں کو (زمانے کے لحاظ سے) محدود کرنے کے مصداق ہے۔

تفقہ فی القرآن کا قرآنی طریقہ:

اس کا طریقہ خود اہل علم کو قرآن نے بتا دیا ہے کہ یہ کسی غیر قرآنی کتابوں کا محتاج نہیں ہے۔ تصریف الایات: اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ (6:65) آیات کو پھر پھرلانا اور ان پر تفقہ کرنے سے بات واضح ہو جائے گی۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ (6:46)

رسول ﷺ کا طرزِ تدریس اور طریقہ تفقہ فی القرآن کے ساتھ تصریف الایات میں تھا:

پس یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ تصریف الایات سے تفقہ و تدبر فی القرآن کی شمع روشن ہوتی جاتی ہے اور تصریف آیات کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ تدبر فی القرآن میں تصریف آیات کا انداز اختیار کریں۔ یعنی ہر آیت کے مفہوم کی تصدیق دوسری آیات سے کریں۔ تفقہ فی القرآن کے قرآنی اسلوب یعنی تصریف آیات کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ تدبر فی القرآن میں تصریف آیات کا انداز اختیار کریں۔ یعنی ہر آیت کے مفہوم کی تصدیق دوسری آیات سے کریں۔ تفقہ فی القرآن کے قرآنی اسلوب یعنی تصریف آیات کو چھوڑ کر دوسرے تمام طریقے غیر قرآنی اور قرآن سے فرار قرار دیئے گئے ہیں۔ قرآنی ہدایت کے تحت آیات کی

تفسیر وتبیین کا واحد طریقہ تصریف الایات ہے تو رسول ﷺ کا طرزِ تدریس اور طریقہ تفقہ فی القرآن تصریف الایات ہی کے ساتھ تھا یا کسی تفسیر بالرائے۔ اس کا جواب قرآن نے خود دیدیا ہے۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (6:105) تصریف آیات اس لیے ہیں تاکہ تم اس سے لوگوں کو درس دو تاکہ عقلمندوں کے لیے آیات نکھر کر سامنے آجائیں۔ پس ثابت ہوا کہ رسول ﷺ کا طریقہ تدریس تصریف الایات تھا۔

حضور ﷺ کا فریضۂ تبیینِ قرآن:

تبیینِ قرآن رسول ﷺ پر فرض کیا گیا تھا۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (16:44) لوگوں کو کھول کھول کر وضاحت سے بتادیں۔ اس آیت سے بعض لوگ رسولی تفسیر یعنی روایات کا سہارا لیتے ہیں۔ اگر یہ نظریہ تسلیم کرلیں تو حضور ﷺ بالا آیت کے عامل ثابت نہیں ہوتے۔ ان روایات میں تو بسم اللہ سے الناس تک کی تفسیر ہے ہی نہیں۔ اگرچہ بخاری نے تیس پاروں کے مقابل تیس پارے دیئے ہیں لیکن کوئی پارہ کسی پارے کی تفسیر پر مشتمل نہیں۔ حالانکہ مذکورہ نظریہ کے تحت بالترتیب ہر پارہ (بخاری و روایات کا) قرآن کی تفسیر و تبیین ہوتا۔ اس آیہ کے تحت چونکہ تبیین رسول کا فریضہ ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کا فریضہ صرف پڑھ کر سنانا نہیں تھا بلکہ اس کی تشریح و تبیین بھی فریضہ تھا۔ جیسا کہ (6:105) کے تحت آپ تصریف الآیات کے ذریعہ درس دیا کرتے تھے۔ یعنی آیات کی تفسیر دوسری آیات کے ساتھ کرکے ان دو آیات (16:144) اور (6:105) کے احکام سے سبکدوش ہوجاتے چونکہ آپ کی تفسیر تصریف الایات کی صورت میں قیامت تک کے لیے خود قرآن میں موجود ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے رسول تفسیر کی شکل میں امت کو کوئی الگ کتاب نہیں دی۔ اور فریضۂ تبیین سے عہدہ برآء بھی ہوچکے۔ جبکہ ان خودساختہ رسولی تفسیروں کی حالت تو یہ ہے کہ آیت کا جو امر تفسیر طلب ہوتا ہے تو اس کی طرف تو رخ ہی نہیں کیا جاتا۔ جیسے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31) اب تفسیر طلب امر یہ ہے کہ آدم کو کونسے نام سکھائے گئے تھے؟ بخاری میں اس کی تفسیر یہ ہے کہ قیامت کے روز لوگ آدم کے پاس شفاعت کے لیے جائیں گے۔ تو وہ کہیں گے کہ ہمیں تو اپنا گناہ یاد آرہا ہے۔ تم نوح کے پاس جاؤ۔ اس نام نہاد تفسیر نے ان اسماء کا جو آدم کو سکھلائے گئے تھے، ذکر تک نہیں ہے۔ تصریف الایات کی غرض یہ ہے کہ آپ ﷺ متنازعہ مسائل اور متنازعہ الفاظ کی تشریح تصریف الآیات کے ساتھ کریں۔ جبکہ یہ رسولی تفسیر آنحضرت ﷺ کو اس عائد کردہ فرض سے غافل کرادیتی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ اللہ کے نام ہیں جو آدم کو سکھلائے گئے تھے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ان کو بارہ اماموں کے نام سکھائے گئے تھے۔ حالانکہ تصریف آیت کی تفسیر دونوں کا انکار کرتی ہے۔ یادرکھیں! حضور ﷺ سمیت قیامت تک لوگوں کے لیے آیات کی تبیین کا طریقہ (6:15) اور حضور ﷺ کے تدریس کی صراحت (6:105) میں موجود ہے۔ اس سے ہر مفسرِ قرآن کے لیے تفسیر بالرائے کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا گیا ہے۔ فلہٰذا تفسیر میں انسانی رائے کو ہرگز ہرگز کوئی دخل نہیں۔ قرآن کی تفسیر تصریف الایات کی مدد سے خود قرآن سے کرنا ہی منشاءِ خداوندی

ہے۔اور مزید کہا کہ یہ کتاب ہر مسئلہ کی خود وضاحت کرتی ہے۔کسی انسانی تفسیر کی ہرگز محتاج نہیں۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿٨٩﴾ (16:89)

قرآن کے ساتھ کوئی غیر اللہ کتب ہرگز ہرگز واجب الاتباع نہیں:

یہ تو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89) ہے یہ خود مکمل، مفصل اور مفسر ہے اور کسی بھی انداز سے غیر اللہ کتابوں کی محتاج نہیں۔ اس حکم سے اتباع صرف قرآن کا ہے باقی تمام غیر اللہ کتابوں سے روک دیا گیا ہے۔اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٣﴾ (7:3) اور ان کا بھی جو غیر اللہ کتابوں کے خیر خواہ ہیں۔اگر یہ تفسیری ضروریات کی رو سے ناکافی ہوتا۔تو وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ (7:3) کے بعد استثنیٰ کے طور پر اِلَّآ اَوْلِيَآءَ كُتُبُ التَّفَاسِيْرِ كُتُبُ الرِّوَايَاتِ آنا چاہیے تھا۔بار بار تاکید کی گئی ہے کہ یہ قرآن تفسیر کے لیے کسی بھی غیر اللہ کتاب کی محتاج نہیں اعلان خدداوندی کہ اس کی احسن تفسیر ہم خولاتے ہیں۔تفسیرِ قرآن کے لیے تفسیر القرآن بالقرآن ہی منشاءِ خداوندی ہے۔آنحضور ﷺ تصریف الایات سے درس دیا کرتے تھے (6:105) یہی انداز ہی عین رسولی انداز ہے۔بالالفاظ دیگر حضور ﷺ کی قرآنی تفسیر خود قرآن کے اندر موجود ہے۔یعنی ہر متنازعہ آیت کا مفہوم قرآن کی دوسری آیت سے اخذ کرنا ہی سنت رسول ہے۔کسی بھی آیت کی تشریح کے لیے غیر اللہ کتابوں کا رخ کرنا نہ تو منشائے خداوندی ہے نہ سنتِ رسول ﷺ۔

قرآن فہمی کے لیے قرآن کے دیئے ہوئے اصول وقواعد کا اتباع لازمی ہے:

یہ تمام تراجم وتفاسیر ایک دوسرے سے بھی مختلف ہیں۔اور اپنے دامن میں بھی اختلافات ہی اختلافات کے ذخائر سمیٹے ہوئے ہیں۔جس سے حق وصداقت کے متلاشی افراد سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں ایک طرف دعوی یہ تفاسیر رسولی تفاسیر ہیں۔دوسری طرف ایسا تضاد کہ ثنائی ہاروت و ماروت کو شیطان جبکہ موضح القرآن ان کو فرشتہ قرار دیتی ہے۔ (2:103) ولی اللہی تفسیر جس ضمیر کا مرجع سورج ٹھہراتی ہے۔ثنائی اسے گھوڑوں کی طرف لے جاتی ہے۔حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾ (38:32) فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٢﴾ (38:32) تفسیر ثنائی ان الفاظ سے خدا کی محبت لیتی ہے۔موضح القرآن انہی الفاظ سے خدا کی غفلت قرار دیتی ہے۔حتیٰ کہ ان تفاسیر میں حروف کے مقامی معنوں میں بھی فرق ہے وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ (2:102) کے ''مَا'' کو نافیہ ٹھہرا کر یہ تاثر دیتی ہے کہ ان پر کچھ بھی نازل نہیں ہوا تھا۔جبکہ اشرفی۔نعیمی۔عزیزی وغیرہ نے اس ''مَا'' کو موصولہ گردان کر یہ ترجمہ کیا کہ ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر خدا کی طرف سے جادو و نازل ہوا تھا۔(العیاذ باللہ)۔چونکہ یہ سارا روایات کا شاخسانہ ہے۔جس کو یہ رسولی تفسیر کہتے ہیں۔تمام تضادات اور شکوک و ظن سے بھری ہوئی۔کہیں لکھا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے اور ساتھ عذاب بھی دیتا ہے۔کہیں لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾ (53:39) اور کہیں جس کو چاہیے اس کا رزق فراخ کر دے۔اور جس کا چاہے تنگ کر دے۔اور دوسری طرف اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① (1:1) ساری کائنات کو رزق دیتا ہے اور وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)۔ حالانکہ مشاہدات عالم میں اس مفہوم کی عملاً تکذیب پائی جاتی ہے۔ لاکھوں انسانوں مویشیوں سمیت قحط سے ہلاک ہوجاتے ہیں۔

حقیقتِ حال:

یہ تمام تفاسیر ایک قاری کو بحرِ استعجاب میں غرق کر کے رکھ دیتی ہیں اور یہ تراجم بھی۔ کیا یہ متضاد تراجم وتفاسیر اس قرآن کے ہوسکتے ہیں جس کا دعویٰ یہ ہو کہ اس میں تضاد اور اختلاف کا ہرگز گزر تک نہیں ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾ (4:82) حقیقت یہ ہے کہ قرآنی دعووں کی پامالی کی وجہ ان اصولوں اور قاعدوں کو نظرانداز کر دینے سے ہوئے ہیں جو خدا نے خود اس کو سمجھنے کے لیے تجویز کر رکھے ہیں۔ اور ان سے اعراض برت کر قرآن کی تفسیر غیر قرآنی ماخذ نام نہاد رسولی تفسیر سے کی جاتی ہے جو فلاں فلاں کی جھوٹی نسبتوں سے رسول کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔

کیا عمرؓ قرآن کی تفسیر رسولؐ سے بہتر جانتے تھے:

یہ رسولی تفسیر تو رسول کو قرآن فہمی کے ان اصولوں سے بے خبر گردانتی ہے جو خود اس کتاب کے اندر محفوظ ہیں۔ اور ان روایات کے تحت عمرؓ قرآنی تفسیر رسولؐ سے بہتر جانتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ عمرؓ کی تفسیر کی حضور ﷺ کی تفسیر سے بہتر مان کر اس کی تائید کرتے تھے۔ ذرا دونوں کا تقابل ملاحظہ فرمائیں۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ (9:80) ان آیات میں منافقین کے لیے طلب مغفرت سے منع کیا گیا ہے جس کا عمل کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔ اللہ کے رسول سے اس قسم کے عمل کا ارتکاب ہرگز ممکن ہی نہیں۔ بخاری میں درج ہے کہ حضور ﷺ نے اس کی یہ تفسیر کردی کہ ''آپ ﷺ کو اختیار دیدیا گیا ہے کہ چاہیں تو منافقوں کے لیے مغفرت طلب کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ جبکہ عمرؓ نے اس آیت سے یہ مفہوم اخذ کیا کہ حضور ﷺ کو طلبِ مغفرت (منافقین کے لیے) سے روک دیا گیا ہے۔ اب اس پر عبداللہ بن ابی کے نمازِ جنازہ کا واقعہ ان روایات کی روشنی میں ملاحظہ کریں۔ عبداللہ بن اُبی کا بیٹا رسول ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کا کرتہ کفن کے لیے طلب کیا اور درخواست کی کہ آپ ﷺ نمازِ جنازہ پڑھیں۔ اور دعائے مغفرت بھی کریں۔ حضور ﷺ نے اسے کرتہ دیدیا اور کہا کہ مجھے خبر دینا تو میں نمازِ جنازہ پڑھادونگا۔ جب آپ ﷺ نے ارادہ کیا تو عمرؓ نے آپ ﷺ کو کھینچا کہ یہ فعل تو خدا نے منع کیا ہے۔ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ مجھے دونوں باتوں کا اختیار ہے کہ دعائے مغفرت کروں یا نہ کروں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھا تو یہ آیت اتری: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ (9:84) نہ نمازِ جنازہ نہ فاتحہ ملاحظہ کیا کہ حضور ﷺ نے ان کا مفہوم اخذ کیا۔ اس طرح خدا نے عمرؓ کی تصدیق اور آپ ﷺ کے قرآنی فہم کی تردید کردی۔ اس رسولی تفاسیر نے امت کو فرقوں میں تقسیم کردیا ہے۔ اور ہر فرقہ اس ذخیرہ سے اپنے مطلب کا مفہوم لے کر دوسروں کو جھٹلاتا ہے۔

اُمّت کے زوال کے اَسباب۔۔۔از ڈاکٹر راشد شاذ دہلی

جن لوگوں نے موسیٰ کاظم کو ساتویں امام منصوص کی حیثیت سے قبول کیا۔ تو وہ آگے چل کر اثنائے عشری کہلائے۔ موسیٰ کاظم کی وفات پر علی بن موسیٰ رضا کی قیادت میں سرگرم ہو گئے۔ جس کو عباس خلیفہ ماموں کا ولی عہد بھی نامزد کیا گیا تھا۔

جن لوگوں نے اسماعیل کو پیشوا بنایا۔ وہ آگے چل کر اسماعیلی فرقہ کے نام سے ملّقب ہو گئے۔

باقر کے عہد تک امام منقوص کے عقیدے پر ایمان لانے والے کم تھے۔ ورنہ ان کے معتمد اصحاب اور شاگرد باقر کو چھوڑ کر ان کے بھائی زید بن علی کی تحریک میں شامل نہ ہوتے۔ حالانکہ امام جعفر الصادق کی امامت پر اثناعشری اور اسماعیلی دونوں گروہ متفق ہیں۔

عقیدۂ امامت کی نظری اساس:

صحاح ستہ اور شیعی روایات میں امام غائب کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ انہی کتابوں میں اہلِ بیت کی فضیلت کی بے شمار روایات تو موجود ہیں۔ نظریۂ امامت پر تمام شیعی علماء جن کو حجت قرار دیتے ہیں۔ پانچویں صدی ہجری میں مرتب کی گئیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں عباسی خلافت کا شدید اضمحلال نظر آتا ہے۔ اور آلِ بویہ مکمل اقتدار پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ بویہ ابتداءً زیدیہ شیعہ تھے۔ مگر یہ اثناعشری کے عقیدے کے پاسبان کے طور پر متعارف ہوئے۔

شیعہ کی تمام بنیادی کتابیں بجز الکافی جس کا زمانہ 320ھ ہے۔ بویہ کی سربراہی میں ان کی سیاسی سرپرستی میں مدون ہوئیں۔ اور تمام دلائل شرعی ان بارہ اماموں کے عقیدے کو ثابت کرنے میں مصروف تھے۔ انہی ایام میں اسماعیلیوں کی سلطنت اپنا دائرہ وسیع کرتی جا رہی تھی۔ اہلِ بویہ اہل بیت کا اتباع کا دم بھرتے تھے۔ اس لیے یہ فاطمیوں کے مقابلہ میں عباسیوں کے سنی خلفاء کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ شیعانِ اہل بیت کے مابین اماموں کے تعین کے سلسلہ میں زبردست اختلافات تھے۔ حسن عسکری کی وفات کے بعد ان کے متبعین چودہ گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ زیدی اور اسماعیلی کی شاخت اس پر مستزاد آل بویہ کے لیے اسماعیلیوں کی قیادت اوّلاً تو اس لیے ناقابلِ قبول تھی کہ ان کا تعلق امامت کے لیے ایک مختلف سلسلے سے تھا۔ اور ثانیاً ایک زندہ امام کے مقابلہ میں ایک کمزور ترین سنی خلیفہ کہیں زیادہ قابلِ قبول تھا۔ کیونکہ ایسی صورت میں عقیدے، عمل اور سب سے بڑھ کر سیاسی خودمختاری کی کہیں بہتر ضمانت مل سکتی تھی۔ آلِ بویہ یہ دیکھ رہے تھے کہ اسماعیلی اور عباسیوں، دونوں نے اپنے سیاسی استحقاق کے

لیے مذہب کو کام پر لگا رکھا ہے اس آل بویہ کو کسی اپنے ریاستی اور سیاسی عقیدہ کی ضرورت تھی۔ جو ان کی حکمرانی اور خلافت عباسیہ سے ان کے تعلق کو ایک جواز عطا کر سکے۔ حسن عسکری کو ابھی نصف صدی گزری ہوگی۔ کہ منتشر شیعہ گروہ آلِ بویہ کی سرپرستی میں ایک متحدہ منشور کی تشکیل میں مصروف ہو گئے۔ اور ایک ایسے امام کا تصور جو اپنے متبعین کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ اور ان متبعین کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ ظہور امام تک عباسی خلیفہ کی بیعت قبول کریں۔ جو آلِ بویہ کی سیاسی ضرورت تھی۔ اس نظریہ کے مطابق امام کی غیبت میں ان کے متبعین کا کام اگر انتظار پاتا ہے۔ تو دوسری طرف حکمرانوں کے لیے اس بات کا جواز بھی کہ وہ امامِ عادل کی عدم موجودگی میں روزمرہ کے امور بجالاتے رہیں۔ خواہ اس کے لیے ایک جابر خلیفہ کی بیعت ہی کیوں قبول نہ کرنی پڑے۔

ابتداء میں اس غیبت کے تصور کے بارے میں کہا گیا کہ امام غائب کے ظہور کی مدت بہت طویل نہ ہوگی۔ ان کے مطابق ان کے ظہور کی نشانیوں میں السفیانی کی بغاوت، آلِ حسن کے سلسلے میں ایک شیعہ کا قتل اور خلافت عباسیہ کا داخلی انتشار۔ عباسی خلافت جب قصۂ پارینہ بن گئی۔ تو اس ''غیبت'' کے تصور کو مزید طول دیا گیا۔ اور اس کے لیے دوسرے عقلی دلائل تراشے گئے۔ آیئے خود ان شیعوں کی امہات الکتب کا ملاحظہ کریں۔ محمد بن یعقوب کلینی (329ھ)۔ ابوجعفر القمی (343ھ)۔ ان کی حیثیت شیعیت کی مؤسسین کی ہے۔ نہج البلاغہ کے مرتب ''شریف مرتضیٰ'' کا سال وفات 436ھ ہے آلِ بویہ کا اقتدار ایک صدی سے زیادہ محیط تھا۔ جو شیعیت کے اثنا عشری قالب کی تشکیل کا اصلی عہد ہے۔ اس عہد میں ان کی اساسی کتب مرتب ہوئیں۔ عقائد کی تشکیل و تدوین ہوئی۔ ماتم حسین ایک دینی رسم کے طور پر جاری ہوا۔ عیدِ غدیر کی ابتداء ہوئی۔ مشہد علی اور مشہد حسین کی شکل میں شیعی اسلام کے نئے کعبے وجود میں آ گئے۔ اس سیاسی اور سماجی پسِ منظر سے واقفیت عقیدۂ امام کی تفہیم میں خاص معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

عقلی دلائل کے لیے شیعی علماء میں المغید متوفی 1022ء اور شریف المرتضیٰ 1045ء کو اسناد کا مرتبہ حاصل ہے۔ المغید کی ''الشافی فی الامامة'' اور مرتضیٰ کی ''رسالة التّصيبة'' ان دونوں حضرات کے تعلقات بویہی حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عباس خلفاء سے بھی خوشگوار رہے ہیں۔ امام جب تک ظاہر نہ ہو جائے تو ان متبعین کے لیے جائز نہیں کہ وہ جابر حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھائیں۔ غیبتِ امام کے اس عقیدہ میں شیعہ علماء، ان کے متبعین، بویہ حکمران، اور عباسی خلفاء، ان سب کے لیے عافیت کا یکساں سامان پایا جاتا تھا۔ رہی یہ بات کہ امام کی عدم موجودگی میں، عدل کے تقاضوں سے، کیسے عہدہ برآ ہوا جائے۔ اس کا جواب بھی انتظار میں پوشیدہ تھا۔ اور جلد ہی امام کے ظہور کی توقع تھی اس لیے ان کے متبعین ان کے ظہور تک خروج سے باز رہیں۔ مرتضیٰ اور مغید کو سب سے بڑا چیلنج اشعریت نے دیا اگر امام معصوم کا وجود خدا کے لطف کا مظہر ہے۔ تو پھر ایسے امام کو پردۂ غیبت میں رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟ مرتضیٰ نے اس کا جواب دیا کہ ناسازگار حالات میں امام کا غیبت میں چلے جانا، کوئی پہلی بار نہیں ہوا۔ خود رسول ﷺ اور ان کے اہل خانہ نے معاشرے سے کٹ کر شعب ابی طالب میں پناہ لی۔ اور پھر جب جان کو خطرہ ہوا تو غار میں پناہ لی۔ امام غائب کا یہ عقیدہ جو رفتہ رفتہ مہدی موعود کی پر امید واپسی کا اعلامیہ بن کر اہلِ تشیع کے دل و دماغ پر چھا تا گیا۔ اور یہ ان شیعی

1043
روایات کا پیداوار تھا۔جن کو دیگر گروہ لائق اعتنا نہیں گردانتے تھے۔یہی وہ عہد تھا جب سنی دنیا میں اشعریت سرکاری سرپرستی میں اپنی سبقت کے لیے سرگرم تھی۔امامت کے عقلی دلائل شیعہ حلقوں سے باہر عوام کو متاثر نہ کر سکے۔جوں جوں غیبت کی مدت طویل ہوتی گئی۔تو لوگ اس نظریہ عقلی طور پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ یہ امام منظر سے کیوں غائب ہے؟

شیخ الطوسی (1067ء) نے عقلی اور سمعی کے امتزاج سے غیبت امام کو ایک با قاعدہ عقیدے کا اعتبار عطا کر دیا۔اس نے کتاب الغیبۃ میں یہ لکھا کہ راویوں نے بعض روایات میں پسند اور ناپسند کو داخل کر دیا ہے۔اس صورت میں سمعی واسطوں پر اعتبار کرنے کی بجائے عقل سے دلائل تلاش کیے جائیں۔کتاب الغیبۃ نے ایک بار پھر مسئلہ امامت پر روایت سازوں کی گرفت مضبوط کر دی۔اب اہل تشیع کو دوسرے مذہبی گروہ کی طرح اپنے آپ سے باہر دیکھنے کی ضرورت ختم ہوگئی۔یہ وہ عہد تھا جب سنی اشعریت اور فاطمی اسلام کا قالب بھی بڑی سرعت کے ساتھ متشکل ہوتا جا رہا تھا۔جب ''كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴿٣٢﴾'(30:32) والی صورت میں لوگ اپنے معروضی عقائد پر نظر نہیں ڈالتے۔

آل بویہ کے عہد میں شیعیت کے سماجی مظاہر،شیعی ثقافت،اور شیعی کتب کی علمی اور توحیدی حیثیت مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔اب شیعیت اپنے خول میں بند ہو چکی تھی۔گروہی تعصب کے اس ماحول میں تحلیل وتجزیہ نے دم توڑ دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ روایات وتفسیر کی کتابوں میں کبار مؤسسین نے جو لکھ دیا تھا۔وہ علمی گفتگو کا حوالہ بنتا گیا۔

بویہ کے عہد سے قبل،جب نہ تو امامی شیعوں کو پوری طرح اپنے نظری خدوخال متعین کرنے کا موقع ملا تھا اور نہ فاطمین مصر کی حکومت قائم ہوئی تھی۔شیعہ حلقوں میں یہ خیال عام تھا کہ مروجہ قرآن مصحفِ عثمانی ہے۔جس میں اہل بیت کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لیے آیات میں ردوبدل کیا گیا ہے۔آلِ بویہ کی سرپرستی میں پہلی بار شیعوں کو ریاستی سرپرستی حاصل ہوئی۔اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ تحریفِ قرآن کے پروپیگنڈے میں وہ شدت نہ رہی۔البتہ ان مفسرین کے دلائل حتمی طور پر حتمی دلائل کے طور پر دیکھے جانے لگے۔دلیل اسمعی تو قائم ہوگئی۔البتہ شیعی ذہنوں میں وحی ربانی کے سلسلے میں التباسات پیدا ہو گئے۔جب قرآن کے بارے میں یہ خیال عام ہو جائے کہ وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔تو متبعین کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اصل مصحف کی برآمدگی تک ان آئمہ کی راہ پر بلا سوچ وسمجھ چلتے رہیں۔روایات کے ذریعہ امامت پر دلیل قائم کرنا شیعہ ذہن کے لیے سم قاتل تھا۔یہ تمام روایات مختلف حوالوں سے یہ بتاتی تھیں کہ قرآن کی فلاں فلاں آیات دراصل یوں نازل کی گئی تھیں۔جس سے دراصل اثبات امامت پر دلیل لانا مقصود تھا۔اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ آیات شیعہ مفکرین کے مطابق مختلف شکلوں میں نازل ہوئی تھیں۔تو پھر وہ ان آیات کو اس طرح کیوں نہیں پڑھتے یا اسے مصحف کا حصہ کیوں نہیں بنا لیتے۔کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جعفر صادق کے سامنے ایک شخص نے قرآنِ مجید کے بعض الفاظ کو اس طرح سے تلاوت کیا کہ عام لوگ نہیں پڑھتے تھے۔(لَيْسَ عَلَىٰ مَا يَقْرَؤُهَا النَّاسُ) آپ نے اسے فوراً روک دیا۔اور کہا یوں پڑھو جیسا کہ لوگ پڑھتے ہیں یہاں تک قائم کا ظہور ہو جائے۔تو وہ

قرآن کو اصلی حالت میں پڑھے گا۔ اور علیؓ کے مصحف کو عام کردے گا۔ ان روایات نے شیعی ذہن میں قرآنِ مجید کے بارے میں ایک تضاد اور مخمصے میں مبتلا کر دیا ہے۔ یعنی یہ ایسی کتاب ہے جو اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہی۔ مگر نظری طور پر اسے اس شکل میں پڑھنا تا آنکہ قائم کا ظہور نہ ہو۔ ان کا مذہبی فریضہ قرار پاتا ہے۔ یہ مروجہ قرآن کو مصحف عثمانی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں اس کی حقیقت صرف تلاوت کی ہے۔ ورنہ عقائد کی تمام تر بنیادیں تو ان آیاتِ محرفہ پر ہیں۔ جن کے بارے میں تاویلی ادب میں صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے۔ قرآن کو صحف عثمانی قرار دینا۔ یا اختلاف قراءت۔ ناسخ ومنسوخ۔ شانِ نزول کی روایات سے اپنے مطلب کے مفہوم لینا یہ کہنا کہ قرآن سے بعض آیات محو کر دی گئی ہیں۔ البتہ ان کا حکم باقی ہے۔ جیسا کہ رجم یہ ایسے سنگین التباسات ہیں۔ جن کے لیے اہل تشیع کو مطعون نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقے جو دین کے متحدہ نبوی قالب خیر آباد کہتے ہوئے مختلف گروہ بندیوں کے اسیر ہو گئے ہیں۔ ان کو اپنے نظری جواز کے لیے تحریف قرآن جیسے مذموم عمل کا سہارا لینا پڑا۔ اہل تشیع کے ہاں ان کے مقابلے میں تاویل وتحریف کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ ان کے ہاں تاویل کی کمان آئمہ اہلِ بیت کے ہاتھوں میں ہے۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہی ان آیات سے آگاہ تھے ان کے اصلی معنی سے لیکن مشکل یہ ہے کہ ان آئمہ تک پہنچنے کے لیے سخت پہرہ ان روایات کا ہے۔ جن کی ثقاہت پر شیعہ علماء خود مختلف ادوار میں انگلیاں اٹھاتے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال نے اہلِ تشیع کے لیے قرآن کو پوری طرح کتاب منجمد میں تبدیل کر دیا ہے۔ قرآن کی باطنی تعبیر ہو یا شانِ نزول کی من گھڑت روایات، واقعہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ قرآن میں وہ چیزیں پڑھنے کی وہ کوشش کی جاتی رہی ہے۔ جن کے بطلان کے لیے قرآن کا نزول ہوا تھا۔ اگر کوئی آئمہ اہلِ بیت کا ثبوت قرآن سے اخذ کرلے تو ان سادہ لوح مسلمانوں جو عقل وفہم استعمال نہیں کرتے، ان التباسات پر یقین کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟

قرآن سے دلائل:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝۵۵ (5:55)

وَالَّذِيْنَ (5:55) کے واؤ کو واوٴ العطف کی بجائے واوٴ الحال سمجھتے تھے۔ یعنی اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ یعنی ولایۃ ان اہل ایمان کا حق تھا کہ وہ زکوٰۃ اس حالت میں دیتے تھے کہ اللہ کے ہاں سجدہ ریز ہوں۔

کہتے ہیں کہ حضرت علی نے ایک فقیر کو حالتِ نماز میں اپنی انگوٹھی عطا کر دی۔ سو یہ آیت ان کی شانِ نزول میں اتری۔ الباقر سے منسوب ایک روایات ہے کہ آپ ﷺ مسجد تک پہنچے ہی تھے کہ ایک سائل سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی۔ پوچھا کیا تجھے کسی نے کچھ دیا ہے۔ اس نے علیؓ کی طرف اشارہ کیا جو محوِ نماز تھے کہ اس شخص نے میری حاجت پوری کی ہے۔ طبری میں کئی روایات ہیں جن سے مجموعی طور پر یہ تاثر ملتا ہے اس میں علیؓ کا حوالہ بالواسطہ یا بلاواسطہ موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ کو علیؓ کی اس منصوص ولایتِ اظہار کے سلسلے میں تامل تھا۔ یہاں تک کہ ان کو خدا سے ان الفاظ میں مبازرت کا سامنا کرنا پڑا۔

1043
يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (5:67) تو رسول ﷺ نے اس آیت کے نزول کے بعد غدیر خم کے مقام پر علیؓ کی ولایت کا افشاء کر دیا۔ کہتے ہیں کہ باقر کی مجلس میں ایک شخص آیا۔ جس نے اس بات کی تصدیق چاہی کہ حسن بصری کا یہ کہنا صحیح ہے کہ رسول ﷺ کو ایک خاص پیغام پہنچایا گیا تھا۔ جس کے اظہار میں انہوں نے تأمل سے کام لیا۔ تو باقر نے کہا کہ کیا حسن بصری نے تمہیں یہ بات نہیں بتائی کہ خدا کی قسم وہ اس بات سے خوب واقف ہیں لیکن عمداً اس کے اظہار سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

جب قرآن سے ولایت کا یہ تصور برآمد کر لیا گیا۔ پھر یہ خیال بھی عام ہوا کہ ولایت یا امامت کے بغیر تکمیل دین نہیں ہوسکتا۔ باقر سے روایت ہے کہ اظہارِ ولایت اور اس کے قیام کے بعد ہی قرآن کی آیت ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ '' (5:3) نازل ہوئی۔ جس میں دین کی تکمیل کا مژدۂ جان فزا سنایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آیت اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ (4:59) باقر اولی امر سے اہل بیت مراد لیتے تھے۔ امامت کو امر منصوص ثابت کرنے کے لیے اولوالامر اور اہل ذکر سے آئمہ اہل بیت مراد لیے گئے ہیں۔ اور باقر سے یہ بھی منسوب ہے کہ آیت اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ (4:54) اہلِ بیت کو خدا نے اس طرح سے فضل سے نوازا ہے جس طرح اہل ابراہیم کو۔ اس لیے کتاب وحکمت اور اقتدار اہل بیت کا فطری حق ہے۔ وہ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (3:7) اور فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ (21:7) ہیں۔ یہی قرآن کے حقیقی وارث ہیں۔ خدا ان کی شان میں کہتا ہے ''ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ'' (35:32) اور اہل بیت کی محبت خدا کا مقصود ہے۔ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ (42:23)

قرآن میں نور اللہ یا روح اللہ سے مراد ائمہ اہل بیت ہیں۔ ''وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ '' (64:8) سے مراد ان کی اطاعت ہے۔ اور ''يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ '' (17:71) سے مراد ائمہ اہل بیت ہیں اور یہ روایت امام باقر سے منسوب کی گئی ہے۔ لوگوں نے جب اس آیت کے نزول کے بعد پوچھا کیا آپ ﷺ تمام لوگوں کے امام نہیں ہیں؟ فرمایا میری حیثیت تو رسول اللہ کی ہے میرے بعد میرے اہل میں ائمہ پیدا ہوں گے۔ جو مظلوم ومقہور ہونگے۔ جو ان سے محبت کرے گا ان کے احکام بجالائے گا۔ تو وہ ان میں سے ہوگا جن سے میں جنت میں ملوں گا۔ آئمہ اہل بیت کی غیر مشروط اتباع کے لیے یہ آیت بھی پیش کی گئی۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ (45:29) کتاب سے مراد ائمہ اور محمد ﷺ لیے جاتے تھے۔

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ (50:24) کے بارے میں کہا یا اس طرح سے شروع ہوئی تھی۔ یا مُحَمَّدُ یا عَلِیُّ الخ یا . . . اسی طرح وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾ (17:89) یہ ولایت علی سے انکار والے کفار ہیں۔ اس طرح کی دیگر آیات سے ولایت وامامت کا جواز نکالا گیا ہے اور ''یا مُحَمَّدٌ مِّنْ وِّلَایَةِ عَلِیٍّ'' پڑھنے کی کوشش کی گئی۔ اور كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) خَيْرَ اَئِمَّةٍ قرار پائی میں اضافہ رسول کے بعد

ثُمَّ الْاِمَامُ مِن مبَعْدِہٖ کا اضافہ کیا گیا۔

اس طرح اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (5:15) کے بعد اِنِّیْ عَهِدْتُ عَلَيْكُمْ لَآ اَمْرَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اسی طرح وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ (20:115) کے بعد محمد۔ علی۔ فاطمہ۔ حسن۔ حسین اور دوسرے آئمہ کا بھی ذکر تھا۔ ایسی اٹھارہ آیات میں سے یہ الفاظ حذف کر دیئے گئے۔

ان فرضی تاویلات اور اختلاف قراءت کی روایات سے ائمہ اہل بیت کا استحقاق ثابت ہوا یا نہیں البتہ وحی کی عصمت خود شیعہ متبعین کے نزدیک بری طرح مجروح ہو کر رہ گئی۔ اس پورے سرمایہ میں فقہی اختلاف کا پتہ دینے والی صرف دو آیات کی نشاندہی کی جا سکی۔ وہاں بھی آیت وضو میں قراءت کا اختلاف محض تلفظ اور اِعراب تک محدود ہے۔ جس کی وجہ سے اہل سنت اور جعفریہ میں اختلاف ہے۔ قرآن میں اَرْجُلَكُمْ پیروں کا دھونا۔ وَاَرْجُلِكُمْ میں مسح ہے۔

اسی طرح فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ (4:24) میں اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى کا اضافہ متعہ کو جائز ٹھہرانے کا باعث ہے۔ ان کا بنیادی مقصد شیعیت کی توثیق تھی۔

❁❁❁

بچپن میں رسولِ اکرم ﷺ کی کفالت کس نے کی تھی؟
تحقیقی مقالہ از علامہ رحمتُ اللہ طارق (برہان القرآن)

لوگوں کا بڑا اعتراض ہے کہ آپ ﷺ یتیم تھے۔ ذریعۂ معاش کچھ بھی نہیں تھا۔ گلہ بانی یا مزدوری کر کے گزر بسر ہوتی تھی۔ جب شعور کی آنکھ کھلی۔ گردوپیش نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ مذہبی اخلاقیات سب سے زیادہ ذریعۂ معاش ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ آپ ﷺ نے مذہبی رہنماؤں جیسے انداز اپنانے شروع کر دیئے اور ذریعہ معاش تلوار کو بنانے کا اعلان کر دیا۔ روایت کہ ''اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ رِزْقِیْ تَحْتَ رُمْحِیْ'' اللہ نے میری روزی نوک سنان میں رکھ دی۔ یعنی روزی کے لیے تلوار چلانا میرا مشن ہے۔ ان جیسی دیگر اور روایات کو مخالفین اسلام لوٹ مار سے تعبیر کر کے آپ ﷺ کی ذات اقدس پر طنز وتعریض کرتے رہے۔ اگر رسول ﷺ بچپن میں گلہ بانی کر کے پیٹ پالتے رہے۔ تو ابوطالب وغیرہ کس کی پرورش کرتے رہے؟ پھر گلہ بانی سے ملتا کیا ہوگا۔ جو آپ ﷺ نے اس قدر پر مشقت پیشہ اختیار کیا۔ اب سورۃ الضحیٰ ''اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ﴿۶﴾'' (93:6) اللہ نے آپ ﷺ کو تنہا پا کر لوگوں کے دلوں میں نہیں دیا۔ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ﴿۸﴾ (93:8) ''کیا اللہ نے آپ کو بہت سے لوگوں کا کفیل پا کر ان سے بے نیاز نہیں کر دیا۔ یعنی اس قدر ذرائع واسباب مل گئے کہ ان کی کفالت کوئی مسئلہ نہ رہی۔ جب کہ مروجہ تراجم تو مخالفین کی تائید کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ذریعۂ معاش کچھ نہ تھا اس طرح روایات کے آئینے میں آپ ﷺ کی بلند شخصیت داغدار ہو جاتی ہے۔ دراصل آپ ﷺ کے والد عبداللہ تاجر تھے۔ دادا بھی مکہ کے بڑے تاجر اور سردار تھے۔ عبدالمطلب ہمسایہ ممالک سے معاہدات کرنے، داخلہ اور خارجہ امور میں خود مختار حکمران تھے۔ آٹھ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بڑا بیٹا حارث فوت ہو گیا تھا۔ ان میں سے تین عبداللہ، زبیر اور ابوطالب ایک ماں کے بطن سے تھے۔ سب کاروباری تھے۔ حتیٰ کہ ابوطالب پاؤں میں لنگ ہونے کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتے تھے تو کعبہ کے دروازوں پر بیٹھ کر لوبان اور دیگر خوشبویات وغیرہ بیچ کر گذر بسر کرتے تھے۔ عبداللہ اور زبیر بھی تاجر تھے۔ شام ویمن سے سامان تجارت لا کر مکہ کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ ان دنوں بارٹر سسٹم کے ساتھ ساتھ قیصر وکسریٰ کے سکے بھی متبادل کا کام دیتے تھے۔ باپ نے سب کو تجارت پیشہ بنا دیا تھا۔ ابولہب اور دیگر نے بھی تجارت کو پیشہ بنایا۔ حضور ﷺ کے ہم عصر حمزہ اور عباس بھی تاجر تھے۔ ایک دفعہ عبداللہ تجارت کا مال لے کر لوٹے تو مدینہ میں بیمار پڑ گئے۔ زبیر تیمارداری کرنے گئے مگر

1043
جانبر نہ ہو سکے۔تو ان کو دفنانے کے بعد ان کا مال تجارت لے کر واپس آ گئے۔ بھائی کی موت کو کبھی نہ بھلایا۔ دو ماہ بعد عبداللہ کے گھر حضور ﷺ کی ولادت ہوئی۔ زبیر کو اپنے چاند جیسے بھتیجے سے بے حد پیار تھا۔ اپنے ہاتھوں سے جھلاتے اور کہتے'' یہ تو میرے بھائی کی نشانی ہے۔عیش و آرام سے جئے۔ اس کی حکومت اور مال میں کمی نہ آئے۔ اور تمام چچوں سے بے نیاز ہو اور اتنا جئے کہ بوڑھا ہو جائے۔ (قدیم مورخ ابو جعفر قدیم ہاشمی بن حبیب ہاشمی 860 عیسوی کی کتاب (المنمق یا ابن حجر کی۔ 1449م سیرت صحابہ

بلکہ عبدالرحمن اسہیلی نے لکھا ہے (1114م) حضرت زبیر کی امتیازی عادت کے ضمن میں کہ وہ آپ ﷺ کو بچپن میں ہر وقت ہاتھوں پر جھلایا کرتے تھے۔

اس زبیر کے بارے سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے منصب کا وارث ووالی انہی کو بنایا تھا۔ (لائف آف محمدؐ ص:10) کیونکہ عبدالمطلب بوڑھے ہو گئے تھے۔ رسول ﷺ کے والد بھی تاجر اور ایک بڑے مکان کے مالک تھے۔ جو آج بھی صفا سے جنوب کی طرف پانچ سو قدم پر مولدُ النّبی (جائے ولادت) کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ﷺ کی پیدائش کے بعد دادا اور تایا نے آپ کے والد کے تمام سامان تجارت کو آپ ﷺ کے نام سے اپنے سامان میں شامل کر دیا۔ اس طرح سے آپ ﷺ پیدائش کے ساتھ ہی تاجروں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ آٹھ سال تک دادا کی نگرانی میں پرورش ہوتی رہی۔ دادا کی وفات کے بعد حسب وصیت تجارت اور سرداری زبیر کو منتقل ہوگئی زبیر نے اپنے بھتیجے کو پالا پوسا اور تجارتی شعور بھی دیا۔ اور آپ ﷺ کو شام کے سفر میں اکثر ساتھ رکھتے تھے۔ اس طرح سے آپ ﷺ کو تجارت کا تجربہ اور شام اور دیگر علاقہ کے تاجروں سے شناسائی ہوگئی یہ زبیر عرب اتحاد کے بانی اور تاریخی معاہدہ حلف الفضول (معاہدۂ امن) کے بانی بھی تھے۔ ان لگا تار جنگوں سے عرب کمزور ہو گئے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت آئندہ کے جنگ بند اور جو زیادتی کرے گا سب مل کر اس کی سرکوبی کریں گے۔ (لائف آف محمدؐ) اس معاہدہ میں حضور ﷺ بھی شریک تھے۔ زبیر ایک ذی وجاہت اور با تدبیر حاکم تھے۔ فصیح اللّسان ادیب اور شاعر۔ اور آپ کعبہ کے تمام معاملات بھی خود دیکھا کرتے تھے۔ جب زبیر فوت ہوئے تو آپ ﷺ کی عمر 22-23 سال کی تھی اب چونکہ آپ ﷺ تاجر تھے۔ تو یہ سوال کہاں سے آ گیا کہ آپ ﷺ کہاں سے کھاتے تھے۔ مؤرخ بلاذری (894م) لکھتے ہیں کہ عبدالمطلب نے زبیر کو وصیت کی تھی کہ میرے بعد ان کو ساتھ رکھنا۔ آپ ﷺ دادا اور تایا کے گھر میں پلے۔ اب وہ عرصہ جو حضور ﷺ کی ولادت (571م) سے لے کر زبیر کی وفات (593م) کے درمیان عرصہ کہ جب کسی لمحہ آپ ﷺ پر ابو طالب نے دست شفقت رکھا؟ یا کوئی تحفہ بھیجا؟ یا کوئی پکی ہوئی چیز بھیجی؟ تو مخصوص مؤرخین کا یہ تاثر دینا کہ حضور ﷺ یتیمی کی کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ تو ابو طالب نے بوجھ اٹھایا اور تازیست سر پر ہاتھ رکھا؟

یہ سراسر واقعات کی تکذیب ہے، بلاذری نے اس تاثر کی تردید کی ہے:

یہ سراسر غلط ہے کہ زبیر کی وفات کے بعد ابو طالب نے یہ سعادت سمیٹ لی تھی تاریخی جھوٹ ہے۔ کیونکہ زبیر حلف الفضول

1043 کا بانی تھا اس کے بعد ہی وہ فوت ہوئے۔ اس وقت حضور ﷺ کچھ اوپر بیس سال کے کڑیل جوان تھے اور محتاج پرورش نہیں تھے۔ (انصاب الاشراف طبع مصر) یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ابوطالب نے آپ ﷺ کی پرورش کی ہی نہیں۔ دادا نے کی اور تایا نے جو ساتھ رہتے تھے دادا کے۔ اور والد کا تجارت کا ترکہ بھی شامل تھا۔

اب یہ بات صاف ہوگئی کہ آپ ﷺ کا کفیل کون تھا؟

بلاشبہ ابوطالب چچا تھے لیکن جس تایا کی نفی کر کے پرورش کو ابوطالب کے کھاتے میں ڈالنا سراسر جھوٹ ہے۔ جب زید کے بعد ابوطالب خاندان کے بڑے تھے تو بالکل مفلس اور قلاش تھے۔ اور خود علی کی شہادت ہے کہ میرے والد غریب تھے۔ اور اس نے افلاس کی حالت میں سیادت کی۔ (یعقوبی)

نہ صرف رسول ﷺ عیش و شہزادے جیسی زندگی گزارنے والے نوجوان کی کفالت کی ابوطالب میں سکت ہی نہ تھی اور اپنے بچوں کی پرورش کی بھی سکت نہیں تھی۔ جعفر طیار کی پرورش سنگین مسئلہ بن گئی تو ابوطالب کے چھوٹے سوتیلے بھائی عباسؓ بن عبدالمطلب نے ذمہ اٹھالیا۔ اور اس کے دس سال بعد علیؓ جب پیدا ہوئے تو وہ بھی مسئلہ بن گئے تو حضور ﷺ اس کو گھر لائے اور پرورش کی۔ ابوطالب افلاس کی حالت میں سرداری کے باعث اتنے کمزور تھے اور سرداری پر گرفت اس قدر ڈھیلی ہوچکی تھی کہ خاندانی نظم وضبط درہم برہم ہو چلا تھا۔ اور قریب تھا کہ اس ناداری کی وجہ سے کعبہ کا منصب۔ العمارہ والسّقایہ بھی بدنظمی کی نذر ہوجاتا تو اس خاندانی اعزاز کو بچانے چھوٹے بھائی عباس تولیت ہوئے۔ چونکہ رسول ﷺ کا تجارت میں نیک نامی کا شہرہ ہوا تو خدیجہ نے جو تازہ بیوہ ہوئیں آپ ﷺ کو شریک تجارت بننے کی دعوت دی۔ اور آپ ﷺ نے اسے بھی مالا مال کردیا اور شادی کے وقت اس قدر حق مہر دی کہ اس وقت کے رئیس اور مالدار لوگ ہی دیا کرتے تھے۔ (کتاب الجج) اور بیس اونٹ بھی حق مہر میں اور ایک اوقیہ سونا بھی شامل تھا۔

اس طرح یہ بھی غلط بیانی ہے کہ آپ ﷺ خدیجہؓ کے مال تجارت سے اتنے مالدار ہوگئے تھے کہ بوقت شادی اتنا سونا اور چوپائے حق المہر میں ادا کئے۔ یہ تو شادی سے پہلے کا دور تھا اور یہ سارا کچھ آپ ﷺ کی تجارت کا ثمر تھا۔ رسول ﷺ مہد سے لحد تک خوشحال تھے۔ خوشحال رہے، یتیمی کے باوجود مکان اپنا تھا۔ ایسے اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۞ (93:6) کے معنی پناہ دینا اور پرورش کے نہیں ہوسکتے۔ آوَی کے معنی دل میں بسانا۔ آوَيْتُ لَهٗ۔ میں نے اسے دل میں بسالیا۔ معنی ہونگے اللہ نے تم کو تنہا پا کر زبیر اور عبدالمطلب کے دل میں بسایا۔

اس طرح عائلاً کے معنی مفلس کرتے ہیں۔ کسی لغت میں اس کی سند نہیں ملتی۔ اس سے مراد کفالت کرنا۔ العیال۔ وہ افراد جن کے اخراجات کی ذمہ داری لی جائے۔ وہ سب کا سہارا تھے بات صاف ہوگئی۔ رسول ﷺ بچپن سے ہی خوشحال تھے۔ مکہ ہو یا مدینہ لوگوں کی کفالت کرتے رہے۔ مکہ میں خدیجہؓ، علیؓ، زبیرؓ، زینب، اسامہ اور دیگر کی کفالت کا بوجھ اور اس طرح مدینہ بھی یہ بوجھ اٹھاتے رہے۔ اس طرح اَغْنٰى یعنی تمام انسانی سہاروں سے اللہ نے بے نیاز کردیا۔

باقی تمام مذاہب کو صرف ایک تھوڑا سا حصہ دیا گیا تھا جبکہ قرآن تمام نوع انسانی کے لیے ہے

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُدۡعَوۡنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ وَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾ (3:23)

ان اہل کتاب کا اس قرآن کا ایک حصہ دیا گیا تھا۔تو ان کو چاہیے تھا کہ اس مکمل ضابطہ کی طرف لپک کر آتے (2:41) تو ان میں سے ایک گروہ یعنی ان کے احبار واحبان اس سے ردگردانی کرتا ہے۔تو ان کی دیکھا دیکھی یہ سارے ان سے روگردانی کرتے ہیں۔ کتاب اللہ کو ماننے سے مراد یہ ہے کہ جملہ اختلافی امور کا فیصلہ اس کی رو سے کیا جائے یہی کفر واسلام کا خط امتیاز ہے۔ (5:44) ,(16:14) ,(42:10)

کتاب کا ایک حصہ سے مراد ان کی تمام کتابیں ایسا ضابطہ نہیں رکھتی تھیں۔ جو تمام نوع انسانی کے لیے قیامت تک مکمل ہو۔ وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) دوسری بات تمام امور کے فیصلے اس کی رو سے ہونگے۔ یہی کفر اور امتیاز میں فرق ہے۔ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) اختلافات اس سے دور ہونگے۔

❁❁❁

خدا کی شہادت۔۔۔ملائکہ کی شہادت اور اہلِ علم کی شہادت

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ (3:18)

اس دعویٰ کا شہادت خود خدا دے رہا ہے۔ ملائکہ اور اربابِ علم کی شہادت۔

خدا کی شہادت:

جہاں تک خدا کی شہادت کا تعلق ہے۔ گواہ کی شہادت اس کے زبانی یا تحریری حکم کی رو سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بیان تو اس کی کتاب ہے۔ جس کا نقطۂ ماسکہ توحید لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس نقطۂ ماسکہ کی تشریح و توضیح قدم قدم پر ملتی ہے۔ کہیں دلائل و براہین سے، کہیں تاریخی واقعات سے۔ کہیں تعلیم و تلقین کے ذریعہ۔ اسلام تمام کا تمام اس محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ جہاں تک عالم خلق (محسوس کائنات) کا تعلق ہے۔ ملائکہ سے مراد فطرت کی قوتیں اور ان کے بروئے کار لانے کے عناصر ہیں۔ قرآن نے دعوئے توحید کے اثبات کے لیے جو فطرت کی شہادت پیش کی ہے۔ تو یہ بڑی عظیم حقیقت ہے۔ سائنس کا مسئلہ یہ ہے کہ قوانین فطرت کے دو اساسی اصول ہیں۔ ایک تو قانون علت و معلول۔" Law of cause and effect "دوسرا وحدتِ فطرت (Uniformity of law of Nature) یعنی قوانین فطرت ساری کائنات پر یکساں طور پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس میں یہاں سے وہاں تک وحدت ہے۔ اس سے پہلے تو اس وحدت کی شہادت کرہ ارض تک محدود تھی۔ اب تو یہ خلا نوردی سے یہ شہادت مل گئی ہے کہ جن قوانین کے مطابق انسان کرۂ ارض پر زندہ رہتا اور نقل و حرکت کرتا ہے۔ یہی قوانین چاند پر بھی کارفرما ہیں۔ وہاں بھی زندگی انہی طبعی قوانین کے تابع ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ (43:84) وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (16:51) اگر دو ہوتے یا زیادہ تو لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (21:22) اگر اور اربابِ اقتدار ہوتے تو کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ یہ قانون کی وحدت ہے جس سے کائنات میں استحکام ہے۔ یہ ساری کائنات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ یہ نتیجہ ہے وحدت قانون یا وحدت اِلٰہ کا۔ بنابریں ساری کائنات، فطرت کی قوتیں اور اس

میں نافذ العمل قوانین اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (3:18) یہ ہے ملائکہ کی شہادت۔

اربابِ علم کی شہادت:

اور یہی شہادت اربابِ علم پیش کرتے ہیں۔ قِسۡطٌ سے مراد عدل یعنی افراط وتفریط سے بچ کر درمیانی راہ اختیار کرنا۔ایک نظریہ تو اس کے وجود سے انکار کرنے والوں کا ہے اور دوسرا نظریہ مادی کائنات اور انسان کی مادی زندگی کو حدآخر قرار دینے والوں کا۔اور بالقسط یہ ہے کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔اور انسانی زندگی اس کائنات کی آخری کڑی نہیں۔علاوہ ازیں خارجی کائنات اور قانونِ مقافاتِ عمل میں ایک گہرا تعلق ہے۔قسط سے مفہوم اگر عدل ومساوات لیے جائیں تو اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (3:18) سے مراد وہ اربابِ علم وبصیرت جو قوانین خداوندی کے مطابق نظام قائم کرتے ہیں۔اور وہ نظام اقتدار خداوندی کی زندہ شہادت بن جاتا ہے۔

یہ تمام شہادات، انسان کو اس نتیجہ پر پہنچاتی ہیں کہ کائنات میں اقتدار اعلیٰ صرف ذات خداوندی کو حاصل ہے۔اور یہ تمام سلسلہ اس کے بے مثال غلبہ وقوت اور بے نظیر حکمت کے تحت سرگرمِ عمل ہے۔اور جملہ کائنات کا ایک اِلٰہٌ کے قوانین کے تابع سرگرم رہنا الاسلام ہے اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (3:19) یہ ہے خدا کا مقرر کردہ نظامِ حیات جو ساری کائنات میں کارفرما ہے۔

❁❁❁

رقصِ سلومی

یحییٰ علیہ السلام کو انجیل میں یوحنا بپتسمہ دینے والا(John, The Baptist) کہہ کر پکارا گیا۔اور ایک فقیر بادیہ نشین کی شکل میں پیش کیا گیا۔قرآن کی رو سے یہ تمام انبیاء بڑی عظیم اور قدآور شخصیات تھیں۔قرآن نے یحییٰ علیہ السلام کو سیّد اور حصور کہا ہے۔ ایک کثیر جماعت (Essenees) کا سر براہ اور مقصد رومیوں کی مستبد حکومت کا تختہ الٹنا تھا اٹلی کا نامور مؤرخ ''Craveri'' اپنی کتاب Life of Jesus میں کہتا ہے یحییٰ علیہ السلام خرابیوں کو ایک ایک کر کے گناتے۔یوم مکافات قریب ہے اور ظالموں کی حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔اس جہاد میں اگر بنی اسرائیل تمام کے تمام بھی ختم ہو جائیں تو کچھ فرق نہیں پڑے گا بلکہ خدا کوئی اور قوم پیدا کر دے گا۔جس کے ہاتھوں باطل حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔کوئی حکومت اس قسم کے انقلابی کو برداشت نہیں کر سکتی۔حتیٰ کہ انجیل میں ہے۔جب حاکم ہیروڈس نے یسوع کی شہرت سنی اور خادموں سے کہا یہ یوحنا بپتسمہ دینے والا ہے۔وہ مردوں میں سے جی اٹھا ہے۔اس لیے اس سے یہ معجزے ظاہر ہوتے ہیں۔کیونکہ اس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی کی مدد سے یوحنا کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔وہ اسے ہر چند قتل کرنا چاہتا تھا۔مگر عام لوگوں سے ڈرتا تھا جو اسے نبی جانتے تھے۔مگر جب ہیروڈس کی سالگرہ پر اس کی بیٹی نے محفل میں ناچ کر اسے خوش کر دیا۔اس پر اس نے قسم کھا کر کہا کہ تو جو مانگے گی ملے گا۔تو ماں کے سکھانے سے بولی کہ یوحنا کا سر تھال میں یہاں منگوا کر دیا جائے۔بادشاہ غمگین تو ہوا مگر وعدے سے مجبور ہو کر یوحنا کا سر منگوایا اور لڑکی کو پیش کیا گیا۔اس کے شاگردوں نے اس کی لاش لی اور اسے دفن کر دیا۔یہ قصہ پھر شاعروں کے ہتھے چڑھا۔اور رقصِ سلومی کے نام سے وجہ رنگینئ مجالس بنتا گیا۔

ادیانِ سماوی کا گمراہ کن دعویٰ فرقہ پرستی ہے، جس کی قرآن سختی سے تردید کرتا ہے

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡٓ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَآ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ۝۶۵ هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡـتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۝۶۶ مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ۝۶۷ (3:65-66-67)

تم نے ان امور کے متعلق جھگڑا کر کے دیکھ لیا جس کا پھر بھی کچھ نہ کچھ علم تھا اور بھلا جس معاملات کا تمہیں علم نہیں ہے تو اس میں کیسے بحث ومباحثہ کر سکتے ہو۔ اور منہ کی کھائی یہ یہودی و نصرانی تو خود ساختہ نسبتیں ہیں جبکہ وہ تو خالص مسلم تھا اور اس قسم کی گروہ بندیوں سے کوسوں دور تھا۔ حالانکہ وہ تو تورات و انجیل سے پہلے ہو گزرا ہے بھلا وہ کیسے یہودی و نصاریٰ ہو سکتا ہے؟ یہ ادیانِ سماوی صرف ایک ہی دین تھا۔ اسلام اور اس کے متبعین کا نام مسلم تھا۔

رسول ﷺ کا تعلق کونسے فرقہ سے تھا؟:

شیعہ، اہل حدیث، اہل فقہ، دیوبندی، بریلوی۔ ان سب کا دعوٰی یہ ہے کہ ہم رسول ﷺ کے سچے متبعین ہیں۔ قرآن ان سے کہتا ہے۔ رسول اللہ تو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ تو وہ بھلا ان فرقوں سے کیسے ہو سکتے ہیں؟ جس طرح ابراہیم كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا (3:67) تھے۔ اس طرح رسول ﷺ نے فرمایا اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۝۱۶۳ (6:163) اور یہ نام اللہ کا مقرر کردہ ہے۔ هُوَ سَمّٰٮكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَفِىۡ هٰذَا (22:78)

لہٰذا اس نام کے علاوہ کسی اور نام سے پکارنا قرآن کے خلاف ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک قرآن پر ایمان لانے کا مدعی ہے اور سنت رسول کا بھی دعوی۔ مگر ہر ایک دوسرے کو۔ جس طرح یہودی اور عیسائی ایک دوسرے کو کہتے تھے۔ وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ‌ؕ (2:113) اور پیروکار ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔

قرآن نے تو صرف اس کتاب کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ‌ ۚ (6:106) رسول ﷺ کو یہ حکم اور مومنوں کو بھی یہی حکم اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ‌ ؕ (7:3) یہی مسلک ابراہیمی تھا۔

فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا‌ ؕ (3:95) صرف ابراہیم کا مسلک وہی سیدھا اور حق پر ہے۔

ذاتی اخلاق اور سیاسی اخلاق

Private morality/ Public morality

ذاتی اخلاق وسیاسی اخلاق:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ (3:75)

ان کے ہاں چونکہ اجتماعی نظام نہیں اس لیے انفرادی طور پر ایسے افراد بھی مل جائیں گے کہ ان سونے چاندی کا ڈھیر بھی رکھ دو امانتاً تو جوں کا توں واپس کر دیں۔ اور ایسے بھی کہ ان پر ایک روپے کا بھی بھروسہ کرو تو واپس نہ کریں۔ جب تک کہ ان کے سر پر (ڈنڈا لیکر) کھڑے نہ ہو۔ یہ عقیدہ ان کے دل میں راسخ کر دیا گیا ہے کہ تم غیر اہل کتاب کے ساتھ جو بھی کرو تو کوئی الزام نہیں ہے کیونکہ اس کی اجازت خدا نے دے رکھی ہے۔ یہ سراسر افترا و کذب ہے اور یہ بات خوب جانتے ہیں۔

عصرِ حاضر کی مکیاولی کی سیاست کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ نوع انسان کو مختلف اقوام میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اور اس انسانی تقسیم نے ضابطۂ اخلاق کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے یعنی ذاتی اخلاق اور سیاسی اخلاق (Personal morality/ Public morality) (پروفیسر جوڈ) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں رحم دل اور دیانتدار ہیں۔ ان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جب نمائندہ کی حیثیت سے دوسرے ملک سے معاملہ کرنا ہو تو جہاں سب کچھ کرنا عظیم حب الوطنی ہے اور وال پول نے لکھا کہ نیک لوگ کبھی بھی کسی بڑی سلطنت کو نہیں بچا سکتے۔ اس لیے کہ سلطنت کو بچانے کے لیے جس حد تک چلے جانا بعض مقامات پر ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک نہیں جا سکتے۔

Cavour کہتا ہے اگر ہم وہی کچھ ذات کے لیے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لیے کیا ہے تو کتنے بڑے شیطان کہلائیں مذہب کی بنیاد پر بدترین قوم پرستی کی بنیاد یہودیوں نے رکھی تھی۔ جو کہ نسل پر تھا۔ وہ تو کسی اور کو آخرت میں بھی جنت میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (2:111)

یہود و نصریٰ دونوں بنی اسرائیل تھے۔ انہوں نے نسل پرستی پر ''دو اخلاقی نظریہ'' کی تخلیق کی وہ عربوں کے غیر اسرائیلیوں کو اُمیّین کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی دیانتداری صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی اور غیر اقوام کے لیے ان کا مسلک لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (3:75) تھا۔ مغربی لوگوں کے انفرادی اخلاق تو تعریف ہوتی ہے مگر قومی سطح پر یہ درندے بن جاتے ہیں۔ اور قوم کے مفاد کے لیے ہر اصول کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے جبکہ قرآن ضابطۂ اخلاق کے سلسلے میں اپنوں اور بے گانوں میں کوئی فرق نہیں رکھتا۔ یہ عہد کسی فرد یا قوم سے نہیں بلکہ خدا سے کیا ہوا عہد ہے جو ہر حال میں پورا کرنا ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (3:76-77)

اس عہد کو اللہ عہد اللہ کہہ کر پکارتا ہے حالانکہ وہ دوسرے انسانوں سے عہد کرتا ہے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ (17:34) وعدے پورے کرو۔ کیونکہ ان کی بابت یقیناً پوچھ گچھ ہوگی۔

ساری دنیا کو اس نظام کی طرف کَرْهًا آنا پڑے گا جبکہ امتِ محمدّیہ نے اس نظام کو اپنایا اور درخشندہ آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا

اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ (3:83) دین اللہ کے علاوہ کیا کوئی اور نظامِ زندگی اختیار کر سکتے ہیں۔ حالانکہ کائنات کی ہر شے طوعاً و کرھاً قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے اور اس کی طرف رجوع کی جائے گی۔

قاعدہ یہ ہے کہ ''مَنۡ'' عموماً جاندار اور ''مَا'' غیر جاندار اشیاء کے لیے آتا ہے۔ اگرچہ یہ کلیہ نہیں اس لیے مَنۡ میں جاندار اور غیر جاندار دونوں آسکتے ہیں۔ اشیائے کائنات میں انسان کو چھوڑ کر جاندار پرندے، حیوانات، جو قوانین فطرت کی اطاعت جبلی طور Instinctively کرتے ہیں اور یہ اطاعت طَوۡعًا (3:83) کرتے ہیں۔ کیونکہ دوسری جگہ اس کی صراحت کر دی۔ ارض و سماء سے کہا ائۡتِيَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيۡنَا طَآئِعِيۡنَ ﴿۱۱﴾ (41:11) تو آیت (3:83) میں کَرۡهًا (3:83) اشیائے کائنات کے لیے نہیں آیا۔ وہ تو تمام طَوۡعًا (3:83) اطاعت کرتے ہیں۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ (57:1)

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ وَالنُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيۡرٌ حَقَّ عَلَيۡهِ الۡعَذَابُ ؕ (22:18) اور جو لوگ ان قوانین سے سرکشی برتتے ہیں۔ وہ بطیب خاطر (طَوۡعًا) (41:11) اطاعت تو اختیار نہیں کرتے۔ لیکن زمانے کے تقاضے ان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ یہ ان کو كَرۡهًا (41:11) اختیار کریں گے۔ وَاِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ (3:83)۔ وہ اس طرف لائے جائیں گے۔ ان کو ایسا کرنا پڑے گا اور یہ دعویٰ حقیقت ثابتہ بن کر آجائے گا۔

هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۳﴾ (9:33)

اقوام مغرب کسی طرح سارے ناکام تجربات کے بعد رفتہ رفتہ اسی نظام کی طرف آرہے ہیں يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ (3:83) یہ اس

1043
نظام کی طرف خود نہیں آئیں گے بلکہ لائے جائیں گے۔ زمانے کے تھپیڑے ان کو مار مار کر اس طرف لائیں گے۔ جس نظام کو طَوْعًا (41:11) اختیار نہیں کیا اس کو کَرْهًا (3:83) اختیار کریں گے۔ نوع انسانی کے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہوگا۔ جو حقیقت کو از خود نہیں جانتا۔ حقیقت اس سے اپنے آپ کو خود منوا لیتی ہے۔

مغربی اقوام نے تو دین الحق کبھی اختیار ہی نہیں کیا تھا۔ وہ عقل کے تجرباتی طریق سے خراماں خراماں اسی راستے کی طرف آ رہے ہیں۔ اور جس امت نے یہ نظام قائم کیا اور درخشندہ نتائج دیکھنے کے بعد ان کو چھوڑ دیا۔

امت نے درخشندہ نتائج دیکھنے کے باوجود اس نظام کو چھوڑ دیا:

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ (3:86)

اس کا نتیجہ:

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ (3:87-88) ملاحظہ کریں کہ ان کو ساری دنیا کی پھٹکار اور ذلت کا سامنا ہے۔

مگر راستہ پھر بھی بند نہیں ہوا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ (3:89) ہاں جو تائب ہو کر دوبارہ اس راستہ پر گامزن ہو جائیں تو ان کو فراوانیاں اور حفاظت مل جائے گی۔

❁❁❁

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت

جماعت مومنین کو ایک بہت بڑے خطرے سے متنبہ کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں آج کل یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ وہ پارلیمان کے ممبر بن سکیں گے اور ان کو ووٹ کا حق حاصل ہوگا یا نہیں۔ انہیں کلیدی مناصب دیئے جاسکیں گے یا نہیں۔ آیئے دیکھیں کہ اسلامی مملکت کسے کہا گیا ہے۔ قرآن کی رو سے (24:55)

1- یہ ایمان وعملِ صالح کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ سلب ونہب وظلم واستبداد سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

2- یہ مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ دین کے تمکن کا ذریعہ ہوتی ہے۔ (24:55)

3- اس کا فریضہ قرآنی سوشل اور اقتصادی نظام وامر بالمعروف ونہی عن المنکر ہوتا ہے۔ (22:41)

4- اس میں معاملات کا فیصلہ قرآن کریم کی رو سے ہوتا ہے۔ (5:44)

جس مملکت کے مقاصد۔ اساس وبنیاد یہ ہو۔ تو کیا وہ لوگ جو ان بنیادوں پر ایمان نہیں رکھتے شریک کیے جاسکتے ہیں۔ ایمان رکھنا تو ایک طرف جو انہیں صحیح نہیں سمجھتے ہوں۔ ان کے دل سے مخالف ہوں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مملکت کے ایک حصہ کو کاروبارِ مملکت سے الگ رکھنا، جمہوریت کے خلاف ہے۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اسلامی مملکت دیگر تمام مملکتوں سے یکسر منفرد ہوتی ہے۔ اس لیے دنیا کے کسی نظام کو بھی اس مملکت کے لیے معیار قرار دینا بنیادی غلطی ہے۔ اس مملکت کا اپنا منفرد نظام ہے۔ جبکہ ہمارا نظام تو دنیا کے عام نظاموں جیسا ہے یہ اسلامی تو نہیں ہے۔ ''منکرِ مے بودن وہم رنگِ مستان زیستن'' کی روش تو اسلام میں نہیں چل سکتی۔ اسلام میں تو '' یا سراپا نالا بن جایا نوا پیدا نہ کر'' کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو تمام حقوق دیگر مسلموں کی طرح حاصل ہیں۔ لیکن انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کی کوئی حکومت بھی جو کسی آئیڈیالوجی پر مبنی ہو۔ ان لوگوں کو شریکِ حکومت نہیں کر سکتی جو اس نظریہ کو نہ مانتے ہوں۔ قرآن نے ایک اصول دیدیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١١٨﴾ (3:118) اس قوم کی اساس نسل، رنگ خون، زبان، وطن

1043 کی بجائے آئیڈیالوجی مبنی پر قرآن ہوگی۔ جبکہ دوسرے لوگ الگ اساس و بنیاد رکھتے ہیں۔ تو دو متضاد نظریات میں ہم آہنگی کیسے پیدا ہوسکتی ہے اس لیے ان کو راز دان نہیں بنایا جاسکتا۔ تو شریک اقتدار اور قومی رازوں میں کیسے کیا جاسکتا ہے۔؟

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ڻ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا
عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝١١٩ (3:119)

صدر اوّل کے بعد ان دشمنان نے اور شکل اختیار کر لی اور جو کچھ انہوں نے اسلامی مملکتوں کو مٹانے کے لیے کیا۔ مگر بڑی ڈھٹائی سے روس کے خطرہ کے لیے مسلمان سلطنتوں کی تائید کے لیے نعرہ لگایا ''Believers in God unite togather''۔

روس کی دہریت ہو یا مغرب کی خدا پرستی۔ دونوں کفر پر مبنی ہیں۔ مسلمانوں کا دوست نہ کوئی منکر خدا ہوسکتا ہے اور نہ بزعمِ خویش یہ خدا پرست۔ سب ان کے خلاف دانت پیستے ہیں۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ
كَيْدُھُمْ شَيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝١٢٠ (3:120)

یہ ہے دو قومی نظریہ۔ کیا یہ ایک ملت بن سکتے ہیں؟

نصرتِ خداوندی

اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ ۚ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾(3:160)

نصرتِ خداوندی کا مفہوم:

عربوں کے ہاں نَصَرَ الۡغَیۡثُ الۡاَرۡضَ۔ بارش نے زمین کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ قرآن میں کامیابی و کامرانی کے لیے فَلَاحٌ کی اصطلاح آئی ہے۔ یعنی کھیتی کا پروان چڑھنا کھیتی کے ثمر بار ہونے کے لیے دو جز لاینفک ہیں۔ ایک بارش (سیرابی کا ذریعہ) اور دوسرے زمین۔ اور زمین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس طرح تیار کی جائے کہ وہ بارش کو بقدرِ ضرورت اپنے اندر جذب کر لے۔ اور اس میں فصل پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ بارش تو بلاتمیز برسے گی۔ لیکن اس زمین کو اس سے فائدہ ملے گا جو اس مقصد کے لیے تیار کی گئی ہو اور جس زمین پر محنت نہ کی جائے اسے تیار نہ کیا گیا ہو۔ تو بارش کا برسنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور نہ ہی اس زمین سے جس میں زرعی صلاحیت تو ہو مگر بارش سیراب نہ کرے۔ فلاح و کامرانی کے لیے ایمان و عمل کی ہم آہنگی کی اس طرح ضرورت ہے۔ جو شخص اپنی سعی و عمل کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھے گا اس کی کوشش بارآور ہو گی۔ اس میں جو حصہ قانون خداوندی کا ہوتا ہے اسے نصرت الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف انسانی کوشش کے کردار کو بھی نصرت کہا گیا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ (47:7) اگر تم نے اپنی کوششوں کو اسی کے قوانین سے ہم آہنگ کیا۔ تو اس کا ابرِ رحمت تمہاری کھیتیاں سرسبز و شاداب کر دے گا۔ خدا کی نصرت کیا کرتی ہے۔ وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ ﴿۷﴾(47:7)

جماعت اور فرد کا تعلق ایک لفظ میں:

اس امت میں خَذَلَ آیا ہے معنی کسی جانور کا اپنے گلہ سے بچھڑ کر تنہا رہ جانا اور اس طرح ہر خطرہ کا ہدف بن جانا۔ ایک لفظ میں فرد اور جماعت کا تعلق اور عمل کا رشتہ سمٹ کر آ جاتا ہے۔

❋❋❋

الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ (3:134) اور الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ (3:134) اور عادی مجرمین کے لیے دو شرائط سزا کی

الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۚ﴿۱۳۴﴾ (3:134) یہ ہیں وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر نگاہ ڈالنے کی بجائے زندگی کی ہر حالت تنگی و آسودگی میں اپنی محنت کی کمائی کو نوع انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ صرف ضرورت از زیادہ ہی نہیں بلکہ اشتعال کی حالت میں اس کی قوت و حرارت کو تعمیری کاموں کی طرف منتقل (Sublimate) کر دیتے ہیں۔ اور اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے کہ دوسروں کی طرف سے ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ ہوتا ہے۔ اور ان کا مقصد اپنی ذات اور معاشرہ میں حسن پیدا کرنا ہے یہ روش قانونِ خداوندی کے نزدیک بڑی پسندیدہ ہے۔

اس آیت میں ایک عمیق نفسیاتی نقطہ بیان ہوا ہے۔ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ (3:134)۔ ترجمہ کرتے ہیں غصہ کو دبانے والے عصر حاضر کی سائیکالوجی کی تحقیق یہ ہے کہ غصہ یا کسی اور جذبہ کو دبانے سے Suppression or repression سے بہت اعصابی و نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور نفسیاتی علاج کے ذریعہ ان دبی ہوئی چیزوں کو باہر تحت الشعور سے شعور میں لاتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ غصہ دبا دینا قرآنی تعلیمات نہیں ہو سکتی۔ نفسیات یہ کہتی ہے کہ ان کی ذات کے توازن کے لیے جس قدر حرارت، جذبہ توانائی وغیرہ کی ضرورت ہے۔ وہ اس سے اگر زیادہ ہو جائے تو اس زیادہ از ضرورت جذبہ کا یا توانائی کا رخ کسی دوسری طرف موڑ دینا چاہیے۔ تاکہ وہاں اسے تعمیری کاموں میں کام لایا جا سکے۔ اس کو ان کی اصطلاح میں Sublimation کہتے ہیں یعنی انسانی جذبات کو پست سطح سے اٹھا کر بلند سطح کی طرف لے جانا۔ اب اس تحقیق کی روشنی میں اس آیت پر آیئے۔ عربوں کے ہاں پانی کی شدید کمی ہوتی تھی تو پاس پاس کئی کنویں کھود دیتے تھے۔ ان کو آپس میں زمین دوز نالیوں سے ملا دیتے تھے۔ (Subterraneen channels) تاکہ جب بھی کسی ایک کنویں کا پانی نیچے اتر جائے تو دوسرے کنویں کا پانی خود بخود اس طرف آ جائے۔ کیونکہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ اس طرح سے کنویں کے زائد پانی کو دوسری طرف منتقل کرنے کو وہ کظامت

کہتے تھے۔اوراس کا صحیح مفہوم Sublimation تو مومن کواگر غصہ آجائے تو وہ اس جذبہ کو تعمیری کاموں میں صرف کرتے ہیں۔

اَلۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِؕ (3:134):

اَلۡعَفۡوَ ؕ (2:219) سے مراد ناپسندیدہ بات کوزیادہ اہمیت نہ دینا اور الجھے بغیر آگے بڑھ جانا معاشرے میں عموماً پست فطرت اور دنی الطبع لوگ معاملات میں پست سطح پر اتر آتے ہیں۔قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگوں سے دامن بچا کے آگے نکل جاؤ۔ اور قیمتی صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔

وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَۙ‏ ﴿۳﴾ (23:3)

وَاِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ (25:72) اَلۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ (3:134) سے مراد قابل نا اعتناء باتوں میں الجھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔

عادی مجرمین کے لیے سزا کی دو شرائط:

وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾ (3:135)

جزاوسزا کے قرآنی فلسفہ سے واضح ہو جائے گا کہ اس کا مقصود اصلاح ہے۔انتقام نہیں۔انتقام کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے پہلی بار بھی کوئی لغزش سرزد ہوگئی ہے تو اس کی کھال ادھیڑ دی جائے۔مگر اصلاح کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ملزم اپنے کیے پر نادم ہے تو اسے اصلاح کا موقعہ دیا جائے۔قرآن نے جو لَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا (3:135) کہہ کر پہلی بار کے جرم اور عادی مجرم میں یعنی بار بار ارتکاب کرنے میں فرق کیا ہے۔ندامت اور توبہ کی رو سے اصلاح کی صورت میں سزا کی ضرورت نہیں۔سزا اس جرم کی ہوگی جس کا اعادہ بار بار کیا جائے۔

اور دوسری شرط یہ ہے کہ ''وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾'' (3:135) مجرم کو علم ہو کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے خلافِ قانون ہے۔اگر اسے اس کا علم ہی نہیں یا وہ دماغی طور پر اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو پھر بھی اس جرم کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

آدم کی تخلیق اور قرآن

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:53) زمانے کے تقاضوں سے علم انسانی جتنا بڑھتا جائے گا اور اس علم کی رو سے جو حقائق منکشف ہوں گے۔ ان میں سے ہر حقیقت کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتی جائے گی۔ قرآن کو کسی ایک دور میں سمجھا نہیں جاسکتا۔ تدریجاً یہ سلسلہ ارتقائی طور پر جاری رہنا چاہیے۔ ہر دور کے انسان کو غور و تدبر کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے تدبر اور تفکر کا حکم دنیا کے آخری انسان کو بھی اس طرح سے ہے جیسا کہ صدر اوّل کے مسلمانوں کے لیے تھا۔ اس سے پہلے اگر یہ چیزیں سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ تو اس کے لیے یہ بزرگ قصوروار نہیں ہیں کیونکہ علمی سطح اس قدر بلند نہیں ہوئی تھی۔ اور آج اگر ہماری سمجھ میں آ گئے ہیں تو اس میں ہماری کوئی کاریگری نہیں ہے۔ ہمارا کام تو تدبر و شعور ہے۔ ان انکشافات پر قرآن کی روشنی میں غور کیا تو حقائق سامنے آ گئے۔ کیونکہ علم انسانی اس دور سے آگے ہے۔ یہ بات خلافِ حقیقت ہے کہ پہلا دور سب سے اونچا تھا۔ حضور ﷺ کی یہ دعا رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ (20:114) جو کہ علم کی بلندیوں پر تھے جب علم میں اضافہ کی دعا کر سکتے ہیں تو اور کون ہوسکتا ہے جو کہہ سکے کہ اب ہمارے دل لپیٹے ہوئے ہیں اور اس میں ایک قطرہ کی بھی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

اب آج سائنس انکشافات دو اور دو چار کی طرح ثابت کر رہے ہیں کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوئی؟ ارض پہ غیر نامیاتی (In-organic) مادہ تھا۔ جس میں زندگی نہیں ہوتی۔ پانی کے ملاپ سے اس میں زندگی کی نمود ہوئی۔ پانی اور مٹی کے آمیزے کو جب حرارت ملتی ہے تو تو عملِ تخمیر یعنی Fermentation میں باریک Cells ہوتے ہیں۔ اسے لائف سیل کہا گیا ہے۔ اس سیل (Cell) کو آج بھی اس طرح سے مٹی اور پانی کے امتزاج سے تھوڑی سی حرارت بہم پہنچا کر آپ مائیکروسکوپ کے ذریعہ دکھا سکتے ہیں۔ پھل جب سڑ جائیں یا سڑا ہوا گوشت، یہ جرثومے نظر آ جاتے ہیں۔ آج بھی ہماری جسم میں لاکھوں خلیے مرتے ہیں اور ان کی جگہ لاکھوں نئے بنتے ہیں۔ یہ لائف سیل اپنی ذات میں جامع ہوتا ہے اس میں آگے کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ بعد وہ مزید حرارت وغذا لے کر جوش نمود سے پھٹتا ہے تو اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں ان کو سسٹر سیلز یا ڈاٹر سیلز کہا جاتا ہے۔ ایک حصہ کو مذکر کہہ لیں (Spermatozon) اور دوسرا مادہ (Ovum) ہوتا ہے۔ آج تک کوئی نہیں کہہ سکا کہ جب یہ خود بھی جوش نمود سے دو حصوں میں پھٹتا ہے تو ان دونوں میں الگ الگ خصوصیات کیوں پیدا ہوتی ہیں۔ مٹی اور پانی کے امتزاج سے وہ سیل تو بنتے چلے جاتے ہیں لیکن وہ واحد ہوتا ہے اس میں دو خصوصیات نہیں ہوتیں۔ یہ خلیہ مرکب ہے خمیر (Nucleus) اور پیکر

1043

(Cell-body) سے اور یہ لیس دار مادہ (Nucleus) زندگی کے تمام امکانات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ہے حیات کا نفس واحدہ یعنی نقطۂ آغاز، جس سے شجر زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ قرآن کے مطابق:

1- صفحۂ ارض پر زندگی کی ابتداء یعنی لائف پیکر کی ابتداء پانی سے ہوئی ہے۔

2- پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کا جرثومۂ اولین وجود میں آیا۔

3- زندگی کے یہ جراثیم مختلف انواع میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے لگے۔

4- ان پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقعہ ہوتی رہیں۔

5- ان طویل مراحل کو طے کرنے کے بعد سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا جسے "تخلیق بذریعہ تناسل" کہتے ہیں۔ یعنی حیوانی سطح زندگی۔

6- حیوانی زندگی اس قسم کے غیر محسوس اور طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بہ منزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔

یہ زندگی کے پیکر آگے بڑھتے گئے۔ پیکر بدلتے گئے۔ پانی میں ابتداء مچھلی وغیرہ کی شکل میں ہوئی ان میں سے ایک لہر نے ان کو خشکی پر پھینکا۔ تو اس نے نئے ماحول میں زندہ رہنے کے لیے تگ و دو کی۔ کچھ پروں والے ہو گئے۔ کچھ رینگنے والے ہو گئے۔ کچھ پاؤں پر چلنے والے۔ پھر یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ پھر یہ سلسلہ میمل (دودھ پلانے والے) جانوروں میں بڑھا۔

اس طرح سے یہ سلسلۂ نر و مادہ، حیوانات میں آیا تو اگلی بڑھتی ہوئی شکل پیکر انسانی میں جلوہ گر ہو گئی۔ یہ تمام انکشافات نظری نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ گئے ہیں۔ یہ تمام تحقیقات ان (Fossils) کو ڈھونڈ کر ہو رہی ہیں۔ تو ان کی ہر تحقیق قرآن کی تصدیق کر رہی ہے۔ اب قرآن نے کہا کہ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ ۚ‏ (32:7) زندگی کی ابتداء غیر نامیاتی، غیر حیات۔ (Inorganic) مادہ سے ہوئی۔ یعنی طِيۡنٍ۔ تُرَابٍ سے جس میں زندگی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ۚ‏ (23:12) مٹی میں سے زندگی پیدا کرنے والی اشیاء کے نچوڑ سے زندگی کے پیکر کی ابتداء کی۔ یہ از خود نہیں ہو سکتی تھی۔ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ‌ؕ (21:30) اب یہ خالص سائنٹفک صداقت بیان ہو رہی ہے۔

اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّنۡ طِيۡنٍ لَّازِبٍ‏ (37:11) چپچپی مٹی سے۔ اب ڈارون کی The origin of Species(1882) اٹھالیں۔ وہ یہی آیات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ‌ ۚ‏ (15:26) سورج کی حرارت سے یہ متغیر ہو گئی۔ كَالۡفَخَّارِ ۙ‏ (55:14) ایسا مٹکہ جو بجنے لگتا ہے۔

ابھی وہ ایک سے دو نہیں ہوئے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ (4:1) پوری انسانیت سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارا اصل (Origin) نفس واحدہ ہے۔ Original Life cell۔ جس میں ابھی دو کی تمیز نہیں ہے۔ اس کے بعد وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا (4:1) وہی نفس واحدہ پھر تمہارے ہاں جوڑا بن گیا۔ (Pair)۔ زوج سے مراد وہ دو حصے جن میں سے اگر ایک نہ ہو تو دوسرا نا تمام رہ

جائے۔(Complemantary to each other)ایک کے ساتھ دوسرا ملے گا تو پھر مکمل شے بنے گی۔ ویسے نہیں بنتے۔ یعنی ایک دوسرے کے متمم ہو گئے۔ اس سے مراد جو اپنی تکمیل کے لیے دوسرے کا محتاج ہو۔ اب بات ان دونوں کے ملنے سے آگے بڑھے گی۔ دوسری جگہ کہا مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ (71:13-14) گردشیں دے دے کر، مختلف حالتوں سے گزار کر تمہیں، اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ (71:14) مختلف حالتوں میں سے درجہ بدرجہ۔ منزل بہ منزل گزار کر تمہارے اطوار بدلتے گئے۔

تمہیں تو خدا سے وقار کی یعنی جس پر کوئی خارجی اثر نہ ہو سکے۔ ایسا توازن۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ (84:19) ایک منزل سے دوسری منزل تک بلندیوں پر چلتے جاؤ گے یعنی انسانیت کے بلند مدارج تک جانے کے لیے تمہارے دل میں کوئی ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ (71:17) جس طرح درخت ایک بیج سے پیدا ہوتا ہے شاخیں اور پھول الگ الگ مگر اصل ایک ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (6:98) جرثومہ اوّل سے پیدا کر کے نشوونما دیتا گیا۔ انسانی زندگی ایک ایک منزل لاکھوں سالوں کی رہن منت ہے۔ اس تک پہنچنے کا طریقہ کیا تھا۔ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ (6:98) زندگی کا کارواں چلتے چلتے ایک منزل میں ٹھہرتا اور پھر اگلی منزل کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اب تم اس منزل سے آگے آ گئے۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ (2:36) یہ تو عارضی قیامگاہ ہے پھر وَّمُسْتَوْدَعٌ (6:98) آنا ہے۔ انسانی بچہ رحمِ مادر میں حیوانی بچہ کی طرح پرورش پا کر ایک مقام پر پہنچ کر رحم ہی میں حیوانی بچہ سے بالکل ممتاز ہو کر خَلْقًا اٰخَرَ ؕ (23:14)، بالکل نئی کڑی جو پچھلی کڑیوں سے مختلف ہے۔ بچہ انسانی اختیار وارادہ کا مالک ہو جاتا ہے جبکہ حیوانی بچہ اختیار وارادہ کا مالک نہیں ہوتا۔ یاد رکھو اس کو حیوان کی طرح بغیر تعلیم وتربیت کے نہ چھوڑ دینا۔ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ (4:1)۔ قانون ربوبیت کے ساتھ اس کی تعلیم وتربیت کی بھی نگہداشت کرو۔ آگے ہے وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ (4:1) یوں مرد وعورت کے اختلاط سے کرۂ ارض پر کثیر آبادی پھیلا دی۔ آگے ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ (4:1) اب تم کو ان اقدار سماوی کی نگہداشت کرنی پڑے گی۔ الَّذِيْ (4:1)۔ یہ نظام تمدن۔ ربوبیت جو اس نے بتایا ہوا ہے تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ (4:1) اب تم تمدنی زندگی میں ایک دوسرے کے ضرورت مند ہوتے ہو۔ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر مستغنی نہیں ہو سکتے۔ اور یہ ضروریات بِهٖ یعنی قرآنی اقدار کی روشنی میں پوری کرو۔ اب اس کی ابتداء اَلْاَرْحَامَ ؕ (4:1) یعنی قریبی رشتہ داروں سے کرو۔ اب یاد رکھو اپنی فرائض صرف یہاں تک محدود نہ کرو بلکہ اسے عالمگیر بنا دو کیونکہ تمہارا مبداء، منبع، نفسِ واحد ہے۔ معاشرہ سارا اس طرح بناؤ کہ ارحام سے شروع کرو۔ ہر گھر کو جنت بنا دو۔ گھر کی چار دیواری رات کو گھر کہلاتی ہے مگر صبح باہر نکل جاتے ہو تو یہ چار دیواریاں پیچھے رہ جاتی ہیں اور سارے گھر باہر معاشرہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس حلقہ ارحام کو وسیع سے وسیع تر کر کے پوری انسانیت کو اس دائرہ میں لے آؤ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۱﴾ (4:1) خدا تمہاری نگرانی کرے گا۔ یعنی یہ قرآنی نظام اس بات کی نگرانی کرے گا کہ تم کیسی تمدنی زندگی گزارتے ہو۔ کیسے انسان پیدا کرتے ہو۔ خود وقار کا ولولہ رکھ کر تم اگلی زندگی میں بھی ایک شاندار زندگی کے حامل بن جاؤ گے۔

کن حالات میں دو، تین اور چار شادیوں کی اجازت ہے

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِى الۡيَتٰمٰى فَانْكِحُوۡا مَا طَابَ لَـكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ‌ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ ؕ ذٰ لِكَ اَدۡنٰٓى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ‏ ﴿۳﴾ (4:3)

قرآن کا بنیادی نقطۂ ماسکہ O یہ پہلا سبق تھا کتاب ھُدیٰ کا : کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللهِ

قرآن کا مقصود یہ ہے کہ اس عالمگیر نظام ربوبیت کا آغاز گھر کی زندگی سے ہوگا۔ جو نقشہ عائلی یا خوانگی زندگی کا ہوگا وہ وسیع پیمانے پر معاشرے کا نقشہ ہوگا۔ شام کو جب گھروں کو آتے ہیں تو وہ گھر بن جاتا ہے اور صبح جب گھر سے باہر نکلیں تو وہ معاشرہ بن جاتا ہے۔ گھروں کی دیواریں دائیں بائیں طرف سے نیچے گرادیں تو یہ تمام حدفاصل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح سے یہ آہستہ آہستہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ بن جائے گی۔ گھر کی زندگی مرد اور عورت سے شروع ہوتی ہے جس کو قرآن زوج کہتا ہے۔ ان کی تخلیق بھی ایک منبع سے ہوئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ (Complementry to each other) ہیں۔ واجب التکریم ہیں۔

بچہ کی پرورش اور نگہداشت کے تقاضے:

حیوان کبھی بھی اپنے بچہ کو کسمپرسی کی حالت میں نہیں چھوڑتا۔ اور نہ اپنے ہم جنس کو (مادہ) ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہمارے ہاں جو کمال سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کو بڑا کر دیا پرورش کر کے کمانے کے قابل ہو گئے۔ مگر یہ تو حیوان بھی کرتا ہے یہ تم نے تو حیوانی سطح زندگی کا ایک تقاضا پورا کر دیا۔ انسانی سطح زندگی کا تقاضا یہ تھا کہ تم نے اسے کیسا انسان بنایا۔ بچوں کی نفسیات کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ بچہ نے اپنی آئندہ کی زندگی میں سیرت کے اعتبار سے جو کچھ بننا ہوتا ہے۔ تو اس کی بنیادیں ابتدائی تین سال کی عمر تک رکھی جاسکتی ہیں۔ اور اسی ماحول سے اس کی شخصیت متشکل ہوتی ہے۔ شیر کا بچہ از خود شیر بن جاتا ہے مگر انسانی بچہ کو بنانا پڑتا ہے۔ اور اس میں گھر کا ماحول اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اب قرآن نے اس بچہ کو انسانی بنانا فریضہ قرار دیا ہے۔ اور محبت، رافت و رحمت (Affection) سے محرومی میں بے شمار نفسیاتی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے۔ اور آئندہ زندگی میں اس میں بدنہادیاں پیدا ہو

جاتی ہیں۔اور کئی جرائم کا عادی ہوجاتا ہے یہ اس لیے کہ بچپن میں وہ(Affection) سے محروم تھے ہلاکت سے اگر بچانا ہے تو ماں کا پیار اور باپ کی شفقت ضرور ملنی چاہیے۔ کیونکہ خوف انسانی صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لیے کچل کر رکھ دیتا ہے۔اور اس کی خودی کچل دی جاتی ہے۔Affection سے بچہ میں جذبۂ احترام پیدا ہوتا ہے۔ بچہ کو محبت و پیار اور ہر اچھے کام پر تحسین و آفریں دیں تو اس کے دل میں بھی آپ کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوجائے گا۔اور احترام کے طور پر بچہ صرف تربیت سے ہوتا ہے قرآن اس پر زور دیتا ہے۔قرآن نے جو یتیم بچوں کی نگہداشت پر اس قدر زور دیا ہے تو مسئلہ صرف اقتصادی نہیں ہے۔اصل چیز یہ محبت و پیار ہے جس سے یہ محروم نہ ہوجائیں تاکہ وہ اچھے انسان بن سکیں۔معاشرہ کا کام تو سامانِ پرورش دینا ہے اور محبت اور پیار تو ان سے مل سکتا ہے جن کے وہ قریب ہے۔اقتصادی معاملہ کی بات تو قرآن نے صاف کردی۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ② (4:2) یتیموں کا زندگی کا اصل مسئلہ فیملی لائف سے محرومی ہے اور حقوق و واجبات کا پورا پورا خیال کرنا ہے۔اصل مسئلہ اقتصادی سے زیادہ فیملی لائف دینا ہے۔ان کو گھر کی زندگی دینا ہے۔ یہ ہے اگلی آیت میں کامرانیوں کی راہیں اس نئی امت پر کھولی جارہی ہیں۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى (4:3) سارا مسئلہ یَتٰمٰی کا ہے۔اگر کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں۔ جنگ کی وجہ سے معاشرے میں مرد کم پڑ جائیں۔اور بیوہ عورتیں اور یتیم بچے (لڑکے اور لڑکیاں) بالخصوص بے شوہر عورتیں زیادہ رہ جائیں اور اس مسئلہ کا کوئی خاطر خواہ حل نہ مل رہا ہو۔ یا انفرادی طور پر ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں اور بے شوہر عورتوں کے حقوق و واجبات کو پورا نہ کرسکو۔ ان کے تقاضوں کو پورا نہ کرسکو۔ قِسْطٌ ، عَدْلٌ ۔ دونوں کے معنی انصاف ہیں۔لیکن باریک فرق کے ساتھ عدل سے مراد تو آدمیوں میں برابری کا سلوک کرنا اور قسط سے مراد کسی کے حقوق و واجبات کا پورا کرنا تو ان حالات میں فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ③ (4:3) اب مسئلہ یَتٰمٰی کا ہے اور یہ حضرات دو، تین تین اور چار چار کا مفہوم لینے والے اور مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:3) لونڈیاں۔اب جو حقیقی بچے ہوتے ہیں تو ان کو بھی جہنم کا ایندھن بنادیتے ہیں۔اِنْ۔ اگر۔شرطیہ جملہ ہے تو فَانْكِحُوْا (4:3)۔ ف جزا ہے اس شرط کی۔اگر ایسے حالات نہ ہوں تو پھر یوں نہ کرو۔ یہ تو مشروط ہے۔اگر شرط ہی نہ ہو تو جزا بھی نہیں ہوگی۔بس نکاح نامہ سے یہ آیت کا پہلا ٹکڑہ وَاِنْ خِفْتُمْ (4:3) ہی غائب کردیا۔شرط والا فقرہ نہ ہو تو جزاء کا فقرہ بے معنی ہوجاتا ہے۔قرآن اس شرط کو دوبارہ بیان کرتا ہے اگر تم ان يَتٰمٰى (4:3) میں حفاظت اور پرورش کرسکو تو نکاح کرو۔اس کے بعد دوبارہ کہا شرطیہ جملہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا (4:3)۔ اگر خدشہ ہے کہ ایسا عدل نہیں کرسکو گے تو پھر بھی نکاح کی اجازت نہیں ہے۔

يَتٰمٰى (4:3) لڑکا یا لڑکی بالغ ہونے تک کو جن کے ماں باپ مرجائیں ان کو یتیم کہا جاتا ہے۔اور وہ عورتیں اور لڑکیاں جن کی

شادی کی عمر ہو جائے تو ان کو بھی یتیم کہا جاتا ہے خواہ بیوہ ہوں یا باکرہ (کنواری) قرآن نے یہ اصطلاح یَتٰمَی النِّسَآءِ (4:127) یعنی 1043
یتیم عورتیں، وہ عورتیں جن کا نکاح نہ ہوسکا ہو خواہ بیوہ، مطلقہ یا کنواری، یہ تمام یَتٰمٰی کے اندر آتی ہیں۔ اب اس گھر پر اقتصادی مفلوک الحال آئی ہوئی ہے۔ کسمپرسی کی حالت ہے۔ گھر والی زندگی اجڑ کر رہ گئی ہے۔ اقتصادی۔ پرورش اور حفاظت فراہم کرنی ہے۔ اس کا حل کیا ہو؟ کیونکہ اس کے نتائج بڑے دوررس ہیں۔ مدینہ کی ابتدائی زندگی ہے۔ مردوں کی تھوڑی تعداد ہے۔ مرد اور وہ بھی جوان جنگوں میں شہید ہو رہے ہیں۔ اب عورتوں کے لیے حکم یہ ہے کہ صرف مسلمان سے شادی کر سکتی ہیں۔ جبکہ مسلمان مرد کے لیے تو استثنا تھا کہ اہل کتاب کی عورتوں سے شادی ہوسکتی ہے۔ جو آگے جا کر ختم کر دیا گیا تھا اور یہ تمام بڑی سلطنتیں انہی کی وجہ سے کمزور ہوگئی تھیں۔ یہ جاسوسوں کی شکل میں آجاتی تھیں۔ اب مکہ اور دیگر مقامات سے عورتیں اپنے مشرک خاوندوں کو چھوڑ کر آ گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بچے بھی تھے۔ نئی جماعت، تعداد قلیل تو ان حالات میں بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں بالخصوص بے شوہر عورتوں کے گھریلو اور اقتصادی مسائل جنم لینے لگے۔ ان کے ہاں ایک ہی بیوی کا اصول تھا فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً (4:3) اگر خدشہ ہے کہ عدل قائم نہ رکھ سکو تو پھر ایک بیوی والا قانون لاگو ہوگا۔ فَوَاحِدَۃً کہہ کر قرآن نے خود یہ قانون بتا دیا اب اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اس قانونِ وحدت زوج میں یہ ایک سہولت (Execption) پیدا کر دی۔ اب اس معاشرتی مسئلہ کا یہ حل دیا گیا اور آج بھی وحدت زوج کا ہی قانون ہے۔

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی (4:3) سوچ بچار کر واگر کوئی اور منصفانہ حل نہ ملے تو پھر وحدت زوج کا جو اصول ہوگا اس میں استثناء کی جا رہی ہے اور حالات کے تقاضوں کے تحت تم ایک سے زیادہ نکاح کر لو۔ کیونکہ ان کو حفاظت اور شفقت و رافت کی ضرورت ہے۔ تو اس اقتصادی و تمدنی مسئلہ کا یہی حل ہے۔ تنہائی کا معاشرتی حل یتیم خانے کھولنا نہیں بلکہ اپنی فیملی ممبر بنانے میں ہے۔ ان کی فیملی کو گھروں میں ضم کر دو تا کہ ان بچوں کو ماں باپ کی شفقت بھی مل سکے تا کہ یہ گوہر آبدار بن کر قوم کے لیے بڑے بڑے کام کر سکیں۔ اس لیے ان کو جزو خاندان بناؤ۔ یہ قرآن کی مشروط اجازت ہے۔ حکم نہیں ہے۔ اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ اس کے بعد کہا فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3)۔ تو حسب پسند ان بے شوہر عورتوں کو گھر کا حصہ بنا دو۔ لیکن ان عورتوں کی مرضی کے مطابق یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرۡہًا ؕ (4:19) اب نہ تو گھر کا ماحول خراب کرنا ہے کہ پہلی بیوی کے مرضی کے بغیر دوسری عورت آجائے۔ اور شادی کے لیے بلوغت کی شرط ہے۔ اب مَا طَابَ لَکُمۡ (4:3)۔ میں جو سات سال کا بچہ کیا پسند کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس طرح عورتوں کو بھی اگر یہ مرد پسند ہوں۔ اگر لڑکی یا عورت کو ذرا سی بھی ناگواری ہے تو یہ حرام قرار دیا گیا ہے اور یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ ان حالات میں اجازت جاری کرے۔

مگر اگر ایسی صورت ہو کہ یہ عدل قائم نہیں کر سکے گا۔ یعنی پہلی بیوی اگر راضی نہ ہو تو دوسری شادی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اب جذبات اور محبت میں تو یکسانیت نہیں ہو سکتی۔

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ (4:129) کہ تم پورے کے پورے ایک ہی طرف جھک کر نہ اس کو حفاظت ملی ۔ نہ شفقت اور اس کو لٹکتا چھوڑ دو۔ یہ باتیں تو ان مومنین کو کہی جا رہی ہیں ہم تو اس ایمان کی لذت سے آشنا ہی نہیں ۔ یہ دوسری شادی کی گنجائش آفت زدہ عورتوں کو سہارا دینے کے لیے رکھ دی ہے۔اور حالت یہ تھی کہ مدینہ کی عورتیں چراغ لے کر ان عورتوں کا استقبال دروازے پر کیا کرتی تھیں۔آؤ یہ تمہارے بچے میرے بچے ہیں۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ (4:3):

''جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہوئے یا معاہدے کی رو سے تمہاری ملکیت میں آ چکے ہیں'' ان سے مراد عموماً غلام اور لونڈیاں لیا جاتا ہے۔اس سے مراد'' وہ لوگ جو تمہاری ماتحتی میں کام کر رہے ہوں'' بعض آیات میں بیویوں کے لیے جس طرح اس آیت میں اس سے مراد وہ جو معاہدہ کی رو سے جو آپس میں میاں بیوی بن چکے ہوں۔اور بعض آیات میں ان سے مراد''لونڈیاں اور غلام'' ہیں اور یہیں سے انہوں نے غلام اور لونڈی کی اجازت کی سند حاصل کی۔

غلام اور لونڈیوں کی کیفیت:

اسلام کے وقت ساری دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔اور اس لعنت نے مرور زمانہ سے گویا ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ معاشرے کا انداز بھی مالک ومملوک والا چلا آرہا ہے۔ ابتداً یہ غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدیوں سے بنائی جاتی تھیں پھر باقاعدہ ان کی تجارت ہوتی تھی۔افریقہ کے علاقوں سے جانوروں کی طرح بچوں،عورتوں اور مردوں کا شکار کیا جاتا تھا۔ان کو جہازوں میں باندھ کر دنیا کی منڈیوں میں بیچا جاتا تھا اور عربوں کے ہاں بھی یہ لعنت موجود تھی۔ اسلام نے آکر وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) کا علان کیا تو اس میں یہ شرمناک لعنت کیسے آسکتی تھی؟ یہ تو موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے۔عربوں کا سارا کاروبار ان غلاموں اور لونڈیوں کی رہین منت تھا۔قرآن نے جنگی قیدیوں کو مہمان ٹھہرا کر ان سے عزت وتکریم سے پیش آنے کا حکم دیدیا۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ (47:4)

ان کو کسی شے کے تبادلہ میں بعد میں رہا کر دو۔قیدیوں کے تبادلہ میں ۔ یا تاوان کے بدلہ میں اگر کوئی حکومت نہ ہو۔ پھر اِحْسَانًا چھوڑنا ہوگا۔ جتنے دن ہوں گے تو مہمانوں کی طرح ان کو رکھنا ہوگا۔اس حسن سلوک سے دشمن نے تو ہتھیار پہلے سے رکھ دیئے ہیں مگر جنگ خود ہتھیار رکھ دے گی۔آئندہ کے لیے نہ کوئی غلام اور نہ لونڈی بنایا جاسکتا ہے۔

قرآن کی حکمت بالغہ:

قرآن زمینی حقائق کو مدنظر رکھ کر حکم نافذ کرواتا ہے۔شراب کو ام الخبائث کہا۔عربوں کی گھٹی میں تھی۔نسلاً بعد نسلاً اس کے

عادی ہو چکے تھے۔ مکی زندگی میں (2:219) میں میسرہ اور خمرہ میں اس کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں۔ آگے بڑھے (4:4) میں کہا کہ صلوٰۃ میں کم از کم نشہ کی حالت میں مت آیا کرو۔ پھر آخری حکم آیا رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ (5:90) قرآن نے اس کو ختم کرنے کے لیے پندرہ برس لے لیے۔ قرآن بتدریج منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ ہے حکمت کتاب کے ساتھ۔ عربوں کا سارا معاشرہ غلاموں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی باہر کام کرتے۔ کھیتی باڑی کرتے۔ گھروں میں لونڈیاں۔ اگر ایک ہی رات حکم نافذ کرتے تو یہ بے چارے کہاں جاتے اور سارا معاشرہ الٹ پلٹ جاتا۔ سب سے پہلے اس کا سرچشمہ بند کیا۔ اس کے بعد ذرا سی چھینک آئی قسم توڑ دی تو کفارہ کے طور پر غلام آزاد کرو۔ لونڈی آزاد کرو۔ پھر مکاتبت کی صورت پیدا کی اس کے مطابق جس غلام میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت ہے تو اسے ساتھ اتنا سرمایہ دے کر آزادی کا پروانہ دیدو۔ تاکہ وہ کاروبار کر سکے۔ یہ ہے قرآنی مکاتبت۔ اب لونڈیوں کے بارے میں ''مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ '' (4:3) ماضی کا صیغہ ہے۔ یہ نہیں کہ مستقبل میں غلام یا لونڈی بن جائیں گے۔ اس کے معنی اس وقت یا اس سے پہلے جو غلام اور لونڈیاں آ چکی ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کو آزاد کر کے یا خاندانوں کا جزو بنایا جارہا ہے اگر غلام نہ ملیں تو اتنے روزے رکھو۔ اتنے مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ اور کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ مشکل کام ہے سب سے بڑی نیکی فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ (90:13) جھکی ہوئی گردن کو سرفراز کرنا۔

کیا ایک طرف آزاد کرنے کا حکم دے کر دوبارہ غلام بنائے جاؤ؟ می نہ سزد خدائے را۔ کسی غلام کو آزاد کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ اسے پاؤں پر کھڑا کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے ہاں تو غلاموں نے بادشاہتیں بھی کیں۔

غلام (مملوک) سلطنت (1206-1290)۔ قطب الدین ایبک (1206-1211) اس کے بعد اس کا جانشین التمش۔
اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ (4:3)۔ سارے قرآن میں ماضی کا صیغہ ہے یعنی جو غلاموں اور لونڈیوں کے ضمن میں آ چکے ہیں اور غلاموں کو آزاد کر کے زیدؓ کی شادی ہاشم کی ممتاز ترین خاندان سے پھوپھی زاد زینب سے کر دی اور قریش کے ممتاز خاندان بلالؓ سے شادی کے لیے رسول ﷺ کے پاس سفارشیں لاتے تھے۔ روم کی طرف پیش قدمی کرنے والا لشکر کا سپہ سالار اسامہ بن زید مقرر ہوا۔ ابوبکر، عثمان، عمرؓ، طلحہؓ، زیدؓ، خالد بن ولیدؓ سب ان کی ماتحتی میں۔

یہ ہے سلوک اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ (4:3) کے ساتھ۔

؎ تا کس نا گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

بیویوں اور مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ (4:3) کی الگ الگ دو اصطلاحات کیوں باقی رکھیں؟ آج بھی گھر کی بچی کی ذہنی صلاحیت اور گھر میں کام کرنے والے کی صلاحیت میں فرق ہوتا ہے۔ ذہنی سطح اور تربیت میں فرق کے لحاظ سے معیار بیویوں اور لونڈیوں کا ہوگا۔ اس لیے آزاد عورت کے مقابلہ میں اس کی سزا آدھی رکھی گئی ہے۔ قرآن بار بار کہتا رہا حتیٰ کہ یہ اصطلاح ہی ختم ہوگئی۔

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾ (4:3)۔ تاکہ کثرتِ اولاد کے بوجھ تلے دب نہ جاؤ۔

قرآن نے مہر کی بجائے تحفہ کا لفظ استعمال کیا ہے:

نکاح کے معاملہ میں قرآن مرد اور عورت کو یکساں حقوق دیتا ہے یکساں ذمہ داریاں اور یکساں حقوق۔ مگر ایک معاملہ میں عورت کا پلڑا جھکا تا ہے۔ اس لیے اس کو تحفتاً ساتھ دو۔ آج کی اصطلاح میں اسے مہر کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا۔ اگرچہ یہ عربی کا لفظ ہے۔ قرآن نے اس کے لیے فَرِيْضَةً ؕ ((4:24 تو کہا ہے لیکن اس تحفہ کے ساتھ صَدُقٰتِهِنَّ (4:4) کہا ہے۔ یعنی اس بات کی سچائی کا ثبوت دیں کہ تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔ جس طرح کوئی کسی بیمار دوست کے لیے پھول لائے تو وہ محسوس شے اس کے دل کی کیفیت کا اظہار ہوتی ہے۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ (4:4)

اس کے فوراً بعد کہا نِحْلَةً ؕ (4:4) کیا زبردست انتخاب ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی عمدہ ترین رس چوس کر اس میں ذرہ بھر خیانت نہیں کرتی اور اس کو چھتہ میں لا کر جمع کر دیتی ہے۔

یہ تحفہ تمہاری محبت کا ثبوت اور اس شہد کی مکھی کی طرح جو چھتہ میں دے کر خود اس سے الگ ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ (4:20) اور یہ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ (4:4) تم اپنی صداقت کا ثبوت پیش کر رہے ہو۔ یہ تو نِحْلَةً ؕ (4:4) ہے اس میں کسی بدل یا قیمت کا تو خیال تک بھی نہیں آتا۔ یہ مہر تو ایک تحفہ ہے نہ کسی چیز کا بدل۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا (4:4) طاب سے مراد رضامندی سے۔ دوستانہ حیثیت سے مِّنْهُ نَفْسًا (4:4)۔ خود فیصلہ کرو۔ اس میں کسی دوسرے کا اشارہ تک نہ ہو۔

فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ﴿۴﴾ (4:4) پھر نہایت خوشگواری سے دوست کی طرف سے آئی ہوئی ریڑن کو بلا تامل اپنے تصرف میں ملا سکتے ہو۔ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ﴿۴﴾ (4:4) نہایت خوشگواری سے۔

نکاح کی عمر بلوغت اور بلوغت کی عمر

قرآن نکاح کو معاہدہ قرار دیتا ہے۔ جو باہمی رضامندی سے اور جبر کے بغیر ہوگا۔ اس میں باہمی رضامندی شرط ہے۔ رضامندی سے مراد عقل و ہوش سے پوری طرح کام لے سکیں اور قانوناً بلوغت کی عمر تک پہنچ چکے ہوں۔ قرآن نے عمروں کا تعین خود نہیں کیا۔ وہ اصول بیان کرتا ہے۔ مختلف آب و ہوا میں، مختلف ممالک میں فرق ہوسکتا ہے۔ وَابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ (4:6) ان کو آزماتے رہو۔ کبھی کچھ مال دے کر کہ کیسے خرچ کرتے ہیں۔ کبھی کچھ نہ دے کر کہ کوئی غلط حرکت تو نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ کیونکہ دوسری جگہ اس کا دور رس نتیجہ بتا دیا گیا ہے۔ وَ لَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡيَتِيۡمِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ حَتّٰى يَبۡلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ (6:152) اَشُدَّ کے معنی جب وہ جوانی کی عمر کو پہنچ جائیں۔ یعنی بلوغت۔ اب تصریف الایات سے قرآن خود معنی واضح کرتا ہے۔ هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ثُمَّ لِتَكُوۡنُوۡا شُيُوۡخًا ۚ (40:67) یعنی بچپن۔ پھر اَشُدَّ (جوانی)۔ پھر بڑھاپا بڑھاپے سے پہلے ہوئی بلوغت۔ نکاح کی عمر۔ قرآن نے نکاح کی عمر، جوانی کی عمر بلوغت کی عمر متعین کر دی۔ اَشُدَّ قرآن نے خود بتا دیا کہ بچپن کے بعد اور بڑھاپے سے پہلے والی عمر، یہ ہے نکاح کی عمر۔

اب کم سنی میں ان کے ہاں نکاح جائز ہے۔ اور مثال رسول ﷺ کی عائشہ کے ساتھ نکاح کی پیش کر رہے ہیں۔ اب یہ سب کچھ کہاں سے لاتے ہیں؟ آیت (15:41) کو ثبوت میں لاتے ہیں۔ جس میں تو عورت کے بارے میں بتایا گیا ہے (2:228) میں بتایا گیا کہ عدت کا شمار حیض سے شروع کیا جائے۔ یعنی شمار اتنے حیض ہوئے بجائے اس میں اتنے ماہ ہوئے۔ اب اس کا تعین حیض سے ہو رہا ہے۔ وَالّٰۤـىِٔىۡ يَـئِسۡنَ مِنَ الۡمَحِيۡضِ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشۡهُرٍ ۙ (65:4)) اب عورتیں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں۔ عمر رسیدہ عورتیں۔ اب ان کا شمار حیض سے تو نہیں ہوسکتا۔ اگر اس میں تم کو شبہ ہو تو پھر عدت کی مدت تین ماہ رکھ لو۔ کیونکہ تمہیں شبہ ہے کہ حیض سے حساب صحیح نہیں ہوگا۔

اور ایسی بھی جنہیں عارضہ کی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو۔ وَالّٰۤـىِٔىۡ لَمۡ يَحِضۡنَ ؕ (65:4) یا وہ عورتیں جو حیض کی عمر میں تو ہیں۔

مگر ان کا حیض بند ہو گیا ہو یا بیماری کی وجہ سے بے قاعدہ ہو گیا ہے قرآن نے دونوں حالتوں کو جوانی میں حیض نہ آنا اور بڑھاپے میں حیض کا بند ہو جانا قرآن نے ان دونوں کو ملفوف (Cover) کرنا تھا۔تو ایسی صورت میں تم مہینوں سے ان کی عدت گن لیا کرو۔اب لَمۡ یَحِضۡنَ ؕ (65:4) ان کے ہاتھ چڑھا۔اب کم سنی میں نکاح بھی جائز اور اختلاط بھی جائز قرار دیدیا۔اس کا ترجمہ یہ کیا''کہ جن کو حیض نہ آ رہا ہو'' تو کہا دیکھا قرآن نے نکاح کے بعد کم سنی میں حیض شروع نہیں ہوا تو پھر اس کی عدت شروع کی۔تو حیض سے قبل نکاح ہوسکتا ہے۔ یہ اس طرح غلط دلیل لاتے ہیں۔ حالانکہ لَمۡ یَحِضۡنَ ؕ (65:4) کسی وجہ سے حیض نہ آ رہا ہو۔نہ آ سکا ہو۔حالانکہ نکاح کے لیے قرآن نے خود اَشُدَّ بتادیا کہ یہ بڑھاپے سے پہلے اور بچپن کے بعد درمیانی عمر یعنی نوجوانی لَمۡ سے مراد نہ پورے ماضی میں اور نہ آئندہ آنے کی توقع ہے۔اس لیے یہ نوجوان عورت جس کا حیض نہ آ رہا ہو۔نہ ماضی نہ آئندہ۔

عبوری دور کے احکام کا قانونی اور اخلاقی پہلو ساتھ ساتھ

یہ معاشرہ ابھی ابتدائی منازل سے گزر رہا ہے۔ آہستہ آہستہ منزل کی طرف رواں دواں کہ دولت جمع ہونے ہی نہ پائے۔ بٹتی چلی جائے۔ تھوڑے تھوڑے حصے ہوتے چلے جائیں۔ یہ عبوری دور Interim Period وراثت کے قوانین سے مراد یہ احکامات ہیں۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۖ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ﴿٧﴾ (4:7) اب شروع ہی سے عہد جاہلیت کی بات نہیں، یورپ کی مہذب اقوام میں بھی وراثت میں عورت کا حصہ نہیں ہوتا تھا یہ ہندو خیرات کے طور پر کچھ دیدیتے مگر حصہ نہیں دیتے تھے اب قرآن نے اس مروّجہ روش کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اب وہ نظام مکمل شکل میں نہیں آیا اٹھتے ہوئے پہلے قدم کے طور پر اتنا بڑا انقلابی قدم باطل کے قوانین جو عورت کو محروم کر دیتے تھے۔ ختم کر کے رکھ دیا۔ اب آگے قانون کے ساتھ اخلاقیات بھی وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿٩﴾ (4:9) فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ (4:9)۔ قانونی شق کے ساتھ اخلاقی پہلو (ethical) بھی ساتھ لے آیا۔ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿٩﴾ (4:9)۔ ذومعنی باتیں مت کرو یا د رکھنا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۚ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿١٠﴾ (4:10)

تو ایسے لوگ حرص ولالچ سے پاگل ہو جاتے ہیں اور ان کی تمام کشت زندگی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

❁❁❁

قرآنی قانونِ وراثت اور مروّجہ قانونِ وراثت میں تضاد

شخصی قوانین اور پبلک قوانین کی غیر قرآنی تفریق میں ملوکیت اور پیشوائیت کا گٹھ جوڑ پبلک یا تمدنی قوانین حکومت نے ہاتھ میں لے لیے جبکہ شخصی قوانین جن کو بعد میں قوانین شریعت کہا گیا۔ مذہبی پیشوائیت نے سنبھال لیے۔ اور اس طرح اختیارات کے دو الگ الگ دائرے وجود میں آ گئے۔ اب یہ مذہبی پیشوا منبر و محراب سے بادشاہوں کے حق میں بولنے لگے اور بدلے میں ان کو تمام سہولتیں مل گئیں۔ برہمن نے راجہ کے ماتھے پر تلک لگایا۔ تاج رکھا اور راجہ نے بدلے میں جائیدادیں وقف کر دیں۔ اس طرح سے یہ ملی بھگت ہر سو جاری ہو گئی۔ یہی چیز چرچ اور سٹیٹ دو الگ الگ شعبہ ہو گئے۔ وہیں سے ہمارے ہاں آ گئی۔ اب شیطان کو خدا کا نقاب اوڑھا کر ساری عوام کو فریب دیا گیا یہ وہ ثنویت تھی جس کو قرآن مٹانے آیا تھا یہ تمام شخصی قوانین اور پبلک قوانین مل کر ایک ضابطہ بنتے ہیں۔

ہمارے ہاں قانون وراثت ایک فنی سی چیز ہے۔ جنہوں نے قانون وراثت جو قرآن نے دیئے تھے ان کو منسوخ کر دیا ہے۔ یہ مروجہ قانون وراثت ہے بالکل قرآن سے مختلف ہے۔ اور اس قانون وراثت کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ایک یونٹ یا اکائی کے حصے یا بٹہ (1:2)، (1:3) وغیرہ کا حاصل جمع کبھی ایک نہیں آتا۔ مگر اس کو خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اب انہوں نے اس کے لیے ایک قاعدہ تجویز کیا ہے۔ جس کو ''عدل'' کہتے ہیں۔ کسی حصہ کو تھوڑا کم کر دیا اور کسی کو بڑھا دیا تاکہ یہ بٹے جمع ہو کر ایک ہو جائیں۔ مثلاً (1:6) کے خدائی تقسیم میں پونے چھ اگر دیدیا تو بھی کیا فرق ہوا۔ خدا کے قوانین کو مذاق بنایا ہوا ہے اور اس پر موٹی موٹی کتابیں ہیں حالانکہ یہ کوئی اتنا مشکل حساب نہیں تھا اگر قرآن کے تحت آتا۔ آیت گیارہ اور بارہ میں سارا قانون وراثت آ گیا ہے اس قدر جامع کہ روح وجد میں آ جاتی ہے۔ اور حصہ مقرر کرتے وقت ہر جگہ مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ (4:12) متوفی کی وصیت اور قرضہ ادا کرنے کے بعد جو باقی بچے اس کو اس طرح سے تقسیم کرو ان دو آیات میں اسے تین دفعہ دہرایا گیا۔ قرضہ تو ایک بین چیز ہے اور وصیت پوری کرنے کے اور اگر کچھ باقی بچے تو اس کے متعلق یہ قانون ہے۔ اگر وصیت پورے ترکہ کو محیط ہو جائے تو تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کہیں مُتَوَفّٰی ہنگامی صورت میں وصیت کیے بغیر حادثہ سے موت کا شکار ہو جائے تو پھر یوں تقسیم

کرو۔ ورنہ سارا اختیار اس کو دیا گیا ہے جو ترکہ چھوڑ کر جا رہا ہے۔ وصیت سے مراد وہ زندگی میں طے کر جائے کہ کسی کو کتنا ملنا چاہیے۔ مثلاً دولڑکے ہیں۔لڑکے کو پڑھا لکھا کر جج بنا دیا۔ دوسری بیٹی ہے یہ شخص جانتا ہے کہ بیٹے کو ضرورت نہیں ہے۔اس لیے جو تھوڑا بہت ہے یہ اس بیٹی کو یا بیوی کو دیا جائے جس کا بعد میں کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔ وہ یہ وصیت میں لکھے گا کہ بیٹے بیٹیاں گھر میں خوشحال ہیں۔ان کو ضرورت نہیں البتہ میری بیوی کو اس کسمپرسی کی حالت میں ہے یہ اسے ملنا چاہیے۔ان کا لکھنا زندگی میں کتنی اہم چیز ہے۔ دراصل وہ شخص ہی بہتر طور پر جان سکتا ہے کہ اس کے متعلقین میں سے کون زیادہ ضرورت مند ہے۔اس لیے قرآن نے وصیت کو اس قدر اہمیت دی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ (2:180)

یعنی كُتِبَ سے شروع کر کے آخر میں حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ (2:180) کے دو بڑے انجن۔اس کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔قرآن میں بہت کم احکامات ایسے ہیں جن کی تفصیل بھی دی ہوئی ہے۔مگر وصیت کے متعلق (5:106) میں جزئیات تک کہ کیسے لکھی جائے۔گواہ۔عبارت تک دی ہوئی ہے۔اس سے زیادہ وضاحت ہو نہیں سکتی۔

قانونِ شریعت مروّجہ:

قرآن پورے ترکہ کی وصیت کا کہہ رہا ہے کہ نہیں وہ صرف ایک تہائی میں وصیت کر سکتا ہے۔ وہ بھی رشتہ داروں اور وارثوں کے حق میں نہیں کر سکتا۔کسی غیر کے حق میں کر سکتا ہے۔صرف ایک روایت ہے اور اس کے ذریعہ ان آیات کو منسوخ کر دیا ہے وہ بھی اتنی کہ ایک صحابی سعد بن وقاصؓ بیمار تھے۔رسول ﷺ ان کی عیادت کے لیے گئے تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس یہ مال ہے۔ایک ہی بیٹی ہے۔ چاہتا ہوں کہ یہ مال رفاہِ عامہ کے لیے دیدوں۔آپ ﷺ نے کہا نہیں سارا مت دو۔کچھ گھر والوں کے لیے چھوڑ دو۔انہوں نے کہا میں آدھا دے جاؤں۔آپ ﷺ نے کہا یہ زیادہ ہے۔انہوں نے کہا ایک تہائی دیدوں آپ ﷺ نے کہا کہ خیر۔اب صرف اس ایک روایت سے یہ حکم بتا دیا گیا کہ صرف ایک تہائی کی کر سکتا ہے۔ وہ بھی غیر وارثوں کے لیے۔اس روایت نے قرآن کو آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔اب یہ تمام عدالتی جھگڑے،ساری عمر گزر جائے مگر بات طے نہیں ہوتی۔قرآن نے کہا تھا کہ وصیت کر کے معاملہ نپٹا دو اگر اس وصیت میں سے کچھ لیا جائے تو پھر ان کو یوں تقسیم کرو۔اب مروجہ شریعت نے تو ان حصوں میں جھول ڈال کر ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ ان حصوں کی بٹوں کی حاصل جمع ایک نہیں آتی ۔ یہ وراثت شخصی قانون بن گیا ہے۔جس کے مطابق کچھ طے ہی نہیں ہوتا۔قرآن کے معاشی نظام کے تکمیل کے مرحلہ میں وصیت وغیرہ کی تو نوبت ہی نہیں آتی۔ اس پروگرام کی انتہا یہ ہے کہ اس میں کوئی جائیداد، کوئی دولت کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہتی۔ نہ فاضلہ دولت اور نہ زمین کی

1043 ملکیت۔تو جائیداد تو کھڑی ہو نہیں سکتی۔مگر اس منتہیٰ تک یہ بتدریج لے جاتا ہے۔تاکہ معاشرہ میں کوئی انتشار پیدا نہ ہو۔ یہ تمام احکامات اس تدریجی دور سے متعلق ہیں۔مگر آہستہ آہستہ اس کا قدم ادھر ہی اٹھتا ہے۔اس دور میں بھی وہ روپے کو جمع ہونے نہیں دیتا بلکہ بانٹتا رہتا ہے۔بکھرتے بکھیرتے اس حد تک لے جاتا ہے۔جہاں کسی کے پاس فاضلہ کچھ نہ رہے اور رسول ﷺ کی زندگی اس نظام کے منتہیٰ کے لیے ایک نمونہ ہوتی ہے۔خود ہی کہتے ہیں کہ رسول ﷺ کے پاس گھر میں ایک پیسہ بھی زائد نہیں ہوتا تھا۔نہ ترکہ، نہ جائیداد کہتے ہیں کہ صاحب! یہ تو انبیاء کی زندگی ہوئی تو گویا مومن کی زندگی اس کے خلاف ہوتی ہے۔جبکہ اتباع رسالت تو قرآن نے مومن کا فریضہ بتا دیا ہے۔اسوۂ حسنہ، بہترین نمونہ اتنا بڑا انقلاب لے آنا کہ کوئی شخص ذاتی ملکیت میں کچھ رکھے ہی نہیں، کوئی آسان کام نہیں ہے۔یہ ہے وہ مقام، اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ (9:111)۔

اسلام اور ایمان تو یہ ہے کہ دونوں انسان کے دل کے تقاضے اور آرزوئیں بن جائیں۔اس کے لیے تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ ؕ (2:129) قرآن کی تعلیم عقل وفکر کی رو سے دیتا ہے۔ان احکامات کی غرض وغایت بتاتا ہے۔پھر ان کی ذات کی نشوونمایوں کرتا ہے کہ یہ احکامات دل کا تقاضا بن جائیں۔کہ کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو تو صاحبِ ضرورت کو ڈھونڈ رہا ہے تاکہ اس کو دیدے۔اس طرح سے یہ جماعت بتدریج اس منتہیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔ جہاں رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ (98:8)۔ یہ نظام ان کی رضامندی سے طے ہوتا ہے۔جور و اکراہ سے نہیں۔ان کے بقول حضور ﷺ کا کوئی ترکہ نہیں تھا۔مگر ان کی شریعہ نے ذاتی ملکیت کو بے حد و بے حساب جائز قرار دیا ہے۔اس کے لیے صدقہ اور خیرات۔زکوٰۃ ہیں ذاتی ملکیت کے جواز کے لیے۔اگر ذاتی ملکیت نہ ہو تو ان احکامات پر کیسے عمل ہوگا۔اور جن کے پاس نہ ہوں تو وہ کیسے عمل کریں؟ اگر رسول ﷺ کے پاس نہ جائیداد نہ ترکہ۔تو کیا رسول ﷺ نے بھی آدھے قرآن کی نفی کی تھی۔اصل میں یہ تمام تدریجی احکامات ہیں۔جب قرآن کا آخری تکمیلی معاشی نظام متشکل نہیں ہوا۔اس لیے وصیت اور یتیموں کی نگہداشت و پرورش پر اس قدر تاکید کی گئی ہے۔

قرآن میں یتیموں کی وراثت اور مروّجہ شریعت:

ان کی شریعت نے یتیم بچوں کو دادا کی جائیداد سے محروم کر دیا ہے۔ایک پائی تک نہیں لے سکتے۔وہ لے گا جن کا باپ زندہ ہے۔عائلی قوانین کے پیچھے یہ جولٹھ لیے پھرتے ہیں۔ان میں یہ چیز بھی تھی کہ یتیم پوتوں کو اپنے دادا کی جائیداد سے وہ حصہ مل جائے جو ان کے باپ کو ملنا تھا کہ ان کا باپ دادا کی زندگی میں فوت ہو گیا۔اور جن پوتوں کا باپ موجود ہے ان کا کوئی حق نہیں۔

وراثت میں بیٹے کا حصّہ بیٹی سے دوگنا کیوں؟:

پہلا اعتراض تو کیا جاتا ہے یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ ٭ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ۚ (4:11) مذکر یعنی لڑکے کا

حصہ بیٹی سے دوگنا ہے۔لڑکی (1:3)،لڑکا (2:3)۔کہا جاتا ہے کہ یہاں تو مساوات کا خیال نہیں ہے حالانکہ بیٹی تو زیادہ محتاج ہے۔اگر ایسا ہے کہ وہ زیادہ مدد کی محتاج ہے تو متوفی کو وصیت میں سارے کا سارا بیٹی کو دے جائے۔دوسری چیز اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) مردوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی تمام ضروریات کے کفیل ہوں۔کیونکہ عورت حمل، تربیت اور پرورش، انسانیت کی پرورش کی ضامن۔مگر عورت کو بھی کمانے سے منع نہیں کیا گیا ہے۔لڑکی باپ کے گھر میں تو کفالت باپ کی ذمہ داری۔ خاوند کے گھر میں تو خاوند کی ذمہ داری۔ بیوہ ہو جائے تو اولاد دیکھ بھال کرتی ہے۔ چونکہ خرچ اٹھانے کی اس کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔اس لیے جہاں اس قسم کے مرد اور عورت یا بیٹے اور بیٹی میں آکر حصہ کی بات ہوگی تو وہ ایک مرد ہے جس کے ذمہ اس کی کفالت کی ذمہ داری ہے تو اس اعتبار سے قرآن نے اس کو اس سے دوگنا حصہ دیا ہے۔اگر حالات ایسے ہوں جس میں یہ پرورش کی ،سہارے کی زیادہ محتاج ہے تو وصیت کی رو سے اسے آپ سارے کا سارا دے سکتے ہیں۔ورنہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے تو اس آیت سے آگے وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ (4:11) ماں باپ دونوں میں سے ہر ایک کا (1:6) ہے۔اور (4:12)وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ (4:12)۔بہن بھائیوں میں سے بھی ہر ایک کا برابر کا چھٹا حصہ۔ یہ ہے مساوات کی بات۔اب چونکہ انتظامی ضرورت کے گھر کی ذمہ داریاں مرد پر عائد ہوتی ہیں۔عورت پر نہیں۔اس لیے عورت کو اگر آدھا بھی دیدیا جائے تو وہ یہ بھی گھر کا کاروبار چلانے کے لیے مرد کو دیدیگی۔اس سے یہ عورت کو پست سطح پر رکھنے کی دلیل لانا تو سراسر ناسمجھی والی بات ہے۔

حصوں کی قانونی وضاحت:

قرآن نے بعض وارثین کے حصے خود مقرر کردیئے ہیں۔مثلاً ماں باپ کو چھٹا حصہ۔ بیوی کو آٹھواں حصہ۔خاوند کو چوتھا۔ اب یہ مقرر کردہ حصے تو سب سے پہلے دے دیئے جائیں گے۔اور جو باقی بچے گا وہ ان پر تقسیم ہوگا۔جن کے حصے قرآن نے مقرر نہیں کیے۔مگر یہ شریعت والے بات الٹی شروع کرکے یہاں سے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ (4:11) یعنی لڑکی (1:3)، لڑکا (2:3)۔خاوند کا اتنا، بیوی کا اتنا،اس طرح سے وہ پورے نہیں بیٹھتے۔ارے بات وہاں سے شروع کرو جہاں حصے مقرر ہیں۔ اس میں کوئی دقت ہی نہیں ہوگی۔مقررہ حصے نکالتے جایئے۔ جو باقی بچے۔اس کو اس نسبت سے تقسیم کردیں کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگنا۔اس میں اولاد کا حصہ سب سے آخر میں آتا ہے۔تو اس طرح حاصل جمع ایک آجائے گا۔اگر جہاں کوئی وارث نہ ہو یا کوئی حصہ دینے کے بعد وارث نہ ہو تو باقی سارا بیت المال یعنی رفاہِ عامہ میں دیدیں۔

دونوں آیات کا ملخص:

سب سے پہلے میاں بیوی کے حصے ہیں۔ بیوی کے ترکہ میں خاوند کا حصہ یوں ہے کہ اگر بیوی کی اولاد ہو۔تو خاوند کا حصہ

(1:4) ایک چوتھائی۔ اگر بیوی کی اولاد نہ ہوتو خاوند کا حصہ آدھا (1:2) ہے۔ اور خاوند کے ترکہ میں بیوی کا حصہ: اگر خاوند اولاد والا ہوتو بیوی کا حصہ (1:8) اگر اولاد نہ ہوتو بیوی کا حصہ (1:4)۔

مُتَوَفّیٖ اگر صاحب اولاد ہے تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو (1:6) بشرطیکہ متوفی کی اولاد ہو۔ اگر اولاد نہ ہو ماں باپ ہی وارث ہوں۔ تو ماں کو (1:3)۔ اور باپ کو (2:3) حصہ ملے گا۔

اگر اس کے بھائی ہوں۔ تو ماں کا حصہ چھٹا ہے۔ یہ حصے پورے دینے کے بعد جو باقی بچے گا وہ اولاد میں اس طرح تقسیم ہوگا۔ کہ اگر اولاد میں ایک سے زیادہ لڑکے ہیں تو وہ آپس میں برابر حصہ لیں گے اگر ایک لڑکا ہے تو وہ سارا حصہ لے جائے گا۔ لڑکے لڑکیاں مخلوط ہیں۔ تو لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوگنا۔ اگر لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں۔ تو ان کے لیے ترکہ کا ((2/3 حصہ ہے۔ اگر ایک لڑکی ہے تو وہ آدھا لے جائے گی۔ دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ((2/3 لے جائینگی۔

وراثت کے سلسلہ میں کَلٰلَۃً کی اصطلاح:

اب ایک شکل رہ گئی ہے کہ اولاد نہ ہو اور بہن بھائی ہوں۔ تو اسے کہتے ہیں۔ (کَلٰلَۃ) قرآن نے اسے خود Define کردیا ہے۔ اولاد نہ ہو مگر بہن بھائی ہوں تو اس کی دو شکلیں ہونگی (1) اولاد نہ ہو۔ مگر بہن بھائی ہوں اور ماں باپ بھی ہوں۔ (2) اولاد نہ ہو۔ مگر بہن بھائی ہوں۔ اور ماں باپ نہ ہوں۔ پہلی شکل میں کہ اولاد نہ ہو۔ بہن بھائی ہوں اور ماں باپ بھی ہوں تو ترکہ کی تقسیم یوں ہوگی۔ اگر صرف ایک بہن اور بھائی ہو۔ تو ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہونگے۔ اور باقی ماں باپ کو اس طرح کہ چھٹا حصہ ماں کو اور باقی سارا باپ کو ملے گا۔

اب دوسری شکل میں اولاد نہ ہو۔ بہن بھائی ہوں اور ماں باپ نہ ہوں۔ تو اگر متوفی مرد ہے اور صرف ایک بہن ہے تو اسے ترکہ میں آدھا مل جائے گا۔ اگر ایک سے زیادہ بہنیں ہیں تو ان کو ترکہ دو تہائی ملے گا۔ اگر بہن بھائی ملے جلے ہیں تو بھائی کو دوگنا اور بہن کو آدھا ملے گا۔ اگر متوفی عورت کلالہ ہے۔ تو اس کے ترکہ کا وارث اس کا بھائی ہوگا اگر زیادہ بھائی ہیں تو وہ آپس میں برابر برابر تقسیم کردیں گے۔

اب ان دو آیات اور (177) ویں آیت میں قرآن کے دیئے ہوئے حصے۔ کہیں کوئی جھول نہیں پڑتا کلالہ کے دوسرے حصہ یعنی آیت ((4:177 میں اس آیت (4:12) دونوں کو ملالیں تو کلالہ کے حصے نکل آئیں گے۔ اور کہا ہے کہ یہ وصیت غَیْرَ مُضَآرٍّ ج (4:12) کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے نہ کی گئی ہو تو اس کا فیصلہ معاشرہ کرے گا۔ اور یہ سارا کچھ وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگا۔ انہوں نے وصیت کی آیت منسوخ تو کردی مگر قرض کی ادائیگی کو کیوں بحال رکھا۔ اگر یہ محسوس ہو رہا ہو کہ کسی پر صریحاً ظلم ہو رہا ہے۔ تو قرآن نے اپیل کی گنجائش رکھی ہے کہ عدالت میں جا کر اس چیز کو ثابت کرسکتا ہے مگر انفرادی طور پر نہیں۔

چین کی ترقی کا راز:

یہ سارا فساد زر، زمین اور زن کی وجہ سے ہے۔ چین میں زراعت کی حیرت انگیز ترقی کا راز تمام عدالتوں کا منسوخ کر دینا ہے۔ یہ تمام صبح وشام کے سالہا سال کے چکروں سے ان کسانوں کو نجات دیدی ہے۔ وہ سارا وقت کھیتوں میں گزارتے ہیں انہوں نے ذاتی جائیداد کا قانون ہی منسوخ کر دیا یوں عدالتوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

ے پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے یہ ہے جن سے قرآن نے منع کیا تھا کہ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ (20:123) اور اس تیری اور میری کا نتیجہ مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَ يَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ (2:30) فساد ہی فساد اور خونریزیاں۔ صرف واحد حل فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾(2:38) قرآنی نظام ربوبیت ہی واحد حل ہے۔

❁❁❁

انسان کی تمدّنی زندگی پر جنسیاتی اثرات مغربی تحقیق کی روشنی میں

‘‘’Sex and Culture’Dr. J.D Unwin

مغرب کی سیکولر سوسائٹی جنسی اختلاط کو افزائش نسل کا ایک ذریعہ قرار دیتی ہے۔ اور جس طرح حیوانات میں یہ تقاضا پورا کیا جاتا ہے۔ تو مغربی تمدن میں بھی تو مستقل اقدار نہیں ہوتیں۔ اور انسانی زندگی کو حیوان کی ایک بڑھی ہوئی شکل سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ اس سے ذرا پہلے وکٹورین دور میں پردہ کی اس قدر سخت پابندی تھی۔ ان کی عورتوں کا گھاگھرا گویا ٹینٹ کا ٹینٹ ساتھ جارہا ہے یہانتکہ کہ کرسی اور میزوں کی ٹانگوں کے اوپر بھی غلاف چڑھا کر رکھا کرتے تھے۔ جب انہوں نے انسان کو بھی حیوان سمجھنا شروع کر دیا۔ تو دوسرے شعبوں کی طرح جنسی اختلاط پر بھی زد پڑی تو اب جوان لڑکے بعد لڑکی کا جنسی اختلاط ان کا ذاتی مسئلہ ہو گیا اور شادی شدہ عورت کا جنسی اختلاط بھی قانوناً جرم نہیں تھا۔ اب حرامی بچہ کو بھی سوسائٹی نے قبول کر لیا۔ اب جنسی بدنہادی کو سوسائٹی کا مسئلہ قرار دیدیا گیا۔ اب اس قدر کا انحصار سوسائٹی کی قبولیت اور عدم قبولیت پر چھوڑ دیا گیا۔ اب قانون بدلوانے کے لیے ان کے ہاں طریقہ یہ ہے کہ جرم کو اتنا عام کرو کہ یہ قابلِ ناکنٹرول ہو جائے۔ تو پھر ریاست ایسے جرم کو قانوناً جائز قرار دیتی ہے۔ چنانچہ لواطت (Sodomy) کے متعلق جو قانون بنا وہ اس حالت پر پہنچ کر بنا تھا۔ تو منافقت کی بجائے اس کی کھلے عام اجازت دیدی گئی۔ اس طرح جب چاہا تو اسے بدل دیا۔

جبکہ قرآن ان اقدار کو غیر متبدل کہتا ہے۔ اگر سو فیصد سوسائٹی بھی اس کے خلاف ہو جائے تو اس قدر کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ تو ان چیزوں پر ایمان لانے والی سوسائٹی میں اگر جرم سو فیصد بھی عام ہو جائے تو ذہن کبھی بھی اس طرف نہیں جائے گا۔ کہ کوئی بات نہیں، کل کو یہ چیز جائز قرار پائے گی۔ ذہن اس کو ہر حالت میں غیر متبدل قدر تسلیم کرے گا۔

عیسائیت کی بائبل میں صرف ایک قانون ہے کہ عورت کو طلاق نہیں دی جاسکتی۔ باقی سارے عقائد ہیں۔ اس کے ہاتھوں وہ عرصۂ دراز تک نالاں رہے۔ اس کے بعد صرف یہ کیا کہ زنا کی شکل میں طلاق دی جاسکتی ہے۔ اور اگلا یہ قانون کہ اس مطلقہ عورت

سے شادی نہیں کی جاسکتی۔اس لیے تو جو جی چاہا کرلیا۔اس لیے جس طرح ہو جنسی اختلاط کرلیں۔مذہب میں چونکہ گرفت نہیں ہے اس لیے مذہبی طور پر ذہن میں کوئی شک بھی نہیں ابھرتا۔تمام قانون سوسائٹی کی قبولیت اور عدم قبولیت پر مبنی تھے۔جس کی سوسائٹی نے اجازت دیدی وہ Moral (ethical) ہوگیا۔اور جس کو معیوب کیا تو وہ Immoral ہوگیا۔روز ان اخلاقیات کے معیار بدلتے رہتے ہیں۔اب ہم پر تو یہ الزام لگاتے ہیں کہ تم اندھا دھند مذہب کی رو سے پابندی کرتے ہو۔اور عقل وبصیرت کی رو سے اس کو جانچ ہی نہیں سکتے۔اب ان کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی یہ بے باکیاں عام ہوتی جارہی ہیں۔چونکہ ابھی پرانی نسلیں موجود ہیں۔وہ ماضی سے بندھے ہوئے ہیں۔مذہب پرست بھی ہیں اور نئی نسل بالکل بے باک ہونا چاہتی ہے۔اور تھوڑی سی رکاوٹ یہ پرانے لوگ ہیں۔یہ اٹھتے گئے تو یہ نسل ان کی دیکھا دیکھی بالکل بے باک ہوجائے گی۔کیا واقعتاً ان بے باکیوں میں نقصان ہے؟ اب آیئے ان مغرب والی تحقیق اس بارے میں کیا کہہ رہی ہے جوان نوجوانوں کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔آیئے ملاحظہ کریں کہ جنس پر پابندیوں کا اثر محض ذاتی ہے یا قوم کے دیگر پہلوؤں پر بھی پڑتا ہے۔قرآن نے محض پابندی عائد کرکے ڈکٹیٹر کی طرح حکم نہیں دیا بلکہ کتاب کے ساتھ حکمت بھی بتائی ہے۔وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾ (25:68) اگر یہ پابندیاں ڈھیلی کردو گے تو پوری قومی زندگی بھی اور اس کی انفرادی زندگی بھی اضمحلال کا شکار ہوکر دوسری اقوام سے پیچھے رہ جائے گی زندگی کی دوڑ میں۔اب ان کی تحقیق ان کو کسی طرح اس آیت والے نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ ملاحظہ کریں یہ حال ہی کی ریسرچ۔

Sex and Culture، از ڈاکٹر J.D.unwin:

یورپ میں جنس بدنہادی کا لٹریچر تو ہمارے ہاں سیلاب کی طرح آرہا ہے مگر اس قسم کی تحقیق ہمارے ہاں بہت ہی کم آئی ہے۔ڈاکٹر انون نے اسی موضوع پر ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تقریباً 80 قدیم (Primitive) قبائل میں جاکر خود ان کے اندر رہ کر اس کی تحقیق کی۔کوئی قبیلہ قطب شمالی میں کوئی افریقہ میں،کوئی آسٹریلیا میں تو کوئی جنوبی امریکہ میں۔اس کے بعد سولہ مہذب اقوام کا۔پھر اس ساری تحقیق کو اس کتاب میں منضبط کیا۔

تمدنی زندگی پر جنسیاتی ضوابط کے اثرات:

اب وہ کلیہ بیان کیا کہ کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کسی قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے اب اس نے تقریباً ساری دنیا کا احاطہ کیا۔ وہ ان کے اندر رہ کر یہ تحقیق بتا رہا ہے ان کے کردار، گفتار واخلاق کے ساتھ لمبا عرصہ گزارنے کے بعد۔کہتا ہے ''اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح گر گئی تھی یا بلند ہوگئی تھی۔تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی ضوابط میں تبدیلی کی تھی۔جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھی۔جنسی تعلقات میں ضوابط کی تبدیلی کے اثرات تین پشتوں یعنی سو

سال میں جا کر نمودار ہوتے ہیں۔ جو قرآنِ حمید کا قانونِ امہال (مہلت) ہے۔ کہتا ہے کہ یہ بتدریج پہلے ضوابط کے اثرات مٹتے جاتے ہیں۔ اور پھر ان بدنہادیوں کے اثرات مرتب ہونا شروع ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ سو سال تک فطرت اس قوم کو زندہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد اس کی بدنہادیوں کے اثرات نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ (1) جس قوم یا گروہ نے پہلے کنوارپن کے زمانے میں جنسی آزادی کی چھوٹ دے رکھی تھی۔ وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔ یہ جنسی اختلاط کی بات کر رہا ہے جس میں لڑکی اور لڑکا دونوں شامل ہیں۔ (2) جن قبائل میں نکاح سے قبل جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں تھیں۔ وہ تمدنی سطح کے درمیانہ درجہ پر تھے۔ (3) تمدن کی بلند سطح پر صرف وہ قبائل تھے۔ جو شادی کے وقت عفت و بکارت (chastity) کا شدت سے تقاضہ کرتے تھے۔ اور نکاح سے پہلے جنسی تعلقات کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔ یہ قرآن کی حکمت ان پابندیوں پر بتائی جارہی ہے اور وہ لوگ جو سیکولر ہیں۔

جنسیاتی قواعد کی پابندی سے قوت فکر و عمل میں بے پناہ اضافہ جبکہ برعکس نتیجہ کے لیے تاریخ رومیوں سمیت بہت سی اقوام کی گواہ ہے:

جنسی پابندیوں سے نہ صرف قوتِ فکر و عمل میں اضافہ بن کر محاسبہ خویش کی صلاحیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو معاشرہ جنسی تسکین کے لیے اپنے مرد اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے۔ ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ رومی حیوانوں سے بدتر بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کیا کرتے تھے۔ نتیجہ ان کے پاس کوئی تعمیری کام کرنے کی صلاحیت ہی نہ رہی۔ فرائیڈ (1856-1939) کے متعلق یہ گمان غلط ہے کہ وہ بدنہادی کا امام ہے۔ اس کا نظریہ کہ اس قسم کی زائد قوت کو کسی تعمیری کام کی طرف موڑ دینا عمل تصعید (Sublimation) کہلاتا ہے۔

عربوں کی حالت:

اس نے ضمناً مسلمانوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان خصوصیات کی وجہ سے وہ ایران اور روما جیسی سلطنتوں پر چھا گئے۔ ان کی اسلام سے پہلے والی زندگی میں جنس اختلاط میں آزادی تھی۔ اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جنسی بدنہادیوں پر پابندی عائد کر دی۔ ان کے ہمسایہ میں رومن اور ایران میں ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جبکہ عرب ان پابندیوں کی وجہ سے ان پر چھا گئے۔ جب تک ان میں یہ صفت رہی کوئی تمدن ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔

جنسی تسکین کے مواقع:

اس کے لیے مواقع یعنی (Opportunity) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اور کم از کم مواقع کی شکل ''ایک بیوی اور ایک میاں'' عمر بھر کے لیے ایک ہونے اور رہنے کا عہد کریں۔ ہم تو چار بیویاں اور بے شمار لونڈیاں جائز سمجھتے ہیں۔ اس نے ان مواقع کو

ایک کرد کی مثال بتائی کہ ساری عمر اس کی ایک بیوی تھی۔مگر تحقیق سے پتہ چلا کہ اس نے چالیس مرتبہ طلاق دے کر اور بیویاں بدلی تھیں۔جبکہ پابندی ایک میاں اور ایک بیوی ساری عمر کا عہد کرلیں۔یہ بہترین شکل ہے۔

ایسی قوم رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے تقلید پرست ہوجاتی ہے:

جب کسی قوم کا معاشرہ چار چار بیویوں اور بے شمار لونڈیوں کو جائز قرار دے۔وہ ان کے جائز و ناجائز ہونے کی بات ہی نہیں کرتا۔میں تو ایک سائنٹسٹ ہوں مجھے تو ثابت ہوا ہے کہ کوئی سوسائٹی جنسی مواقع کی جتنی زیادہ گنجائش نکالتی جائے یا اس کو جائز کرے تو وہ علم وبصیرت ہونے کے باوجود اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتی۔یہی قرآن کہتا ہے لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ (7:179) ایسی قوم پھر اسباب وعلل کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔بس معاملات کے معاملہ میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے۔(یعنی اسلاف ہی کی پیروی کرتے ہیں) پھر ہر اس واقعہ کو جو سمجھ میں نہ آئے کس عجیب وغریب قوت کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔اور پھر اسے کرامات قرار دیتے ہیں۔اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو کبھی درختوں کو، آگے کہا مٹی اور اینٹ کی ان قبروں کو، پتھروں پر نشانات کو، مردوں کو زندہ بدست مردہ بنے ہوئے ہیں۔اور تو ہم پرستیوں کی تفاصیل بتائی ہیں۔نذر، نیاز، گنڈہ تعویز، قبر پرستی ان کا وطیرہ بن جاتا ہے۔اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہیں۔انسان اس معاشرہ میں پیدا ہوتے ہیں۔خواہشات پوری کرکے مرجاتے ہیں۔قبر میں گئے تو نَسْیاً منساً ہوجاتے ہیں۔یہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہوتے ہیں۔أُولَٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ (7:179) یہ قرآن کی آیات کا ترجمہ کر رہا ہے۔یہ ہے نتیجہ جنسی اختلاط میں ڈھیل دینے کا نتیجہ''زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانا'' اور اس پابندی کی ایک ہی شکل ہے اور وہ ہے وحدت زوج (Monogamy)۔

کسی بھی قوم کو ہر دور میں مقامِ عروج پر رہنے کے لیے جنسی اختلاط کو محدود کردے۔تو سب سے پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ اپنے معاشرتی اور معاشی نظام میں ایسی تبدیلیاں تاکہ اس سے یہ جنسی اختلاط کے مواقع محدود ہوکر مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حقوق دیے۔وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ (2:228) بالمعروف سے مراد ہی قانوناً مساوات کی ضمانت ہے۔اس طرح سے معاشرہ کا رخ تمدنی اور ثقافتی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی۔ اور تمدن کے اس عروج پر پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔انسان کی یہ توانیاں اس کی ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کرتی چلی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آسکتا۔

وَالّٰتِىْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِى الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ (4:15)

قرآن نے زنا کی سزا (24:2) میں سو کوڑے مقرر کی ہے۔ یہاں تو گھروں میں روکنے کا کہا ہے۔ اب اس آیت ہی کو منسوخ کر دیا۔ یہ جنسی اختلاط تو آخری درجہ ہے اس سے پہلے یہ بے باکیاں پہلے سے شروع ہو جاتی ہیں۔ قرآن تو ہدایات دے کر انتہا تک پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ مردوں اور عورتوں کو تاکید کرتا ہے کہ نگاہوں کو بے باک نہ ہونے دو۔ عورتوں سے کہا جب مردوں سے بات کرو تو ایسی بات مت کرو جس میں لوچ ہو۔ ملاحظہ کریں یہ پابندیاں۔ باہر نکلو تو یوں زینت کی نمائش نہ کرو کہ سارے معاشرے میں جنسی ہیجان پیدا کر دو۔ اگر پاؤں میں زیور ہے تو ایسی آواز نہ نکالو کہ جس سے معاشرہ میں بے باکی پھیل جائے۔ تاکہ ان پابندیوں سے اختلاط کا درجہ آنے ہی نہ پائے۔ جس طرح سارے مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اس طرح ساری عورتیں ان کی بہنیں ہیں۔ يَأْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ (4:15)۔ ایسی بے حیائی کی حرکت جو زنا کی طرف لے جائے۔ تو یہ ابتدائی چیزیں ہیں عصمت کی حفاظت کے لیے زنا کی سزا سو کوڑے اور تہمت کی سزا اسی کوڑے۔

یہ بے باک عورتوں کو گھر میں بند رکھنے کا حکم ہے۔ بغیر کسی ثبوت کے پابند مسکن رکھنا بذاتِ خود ایک جرم ہے۔ اب اگلی آیات میں مردوں کی اس حرکت کا ذکر ہے۔

وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾ (4:16)

اگر مرد اس طرح فاحشہ حرکت کریں تو ان کو سزا دو۔ وَالَّذٰنِ (4:16)۔ عربی قاعدے میں عورت اور مرد دونوں آسکتے ہیں۔ عورتوں کے بارے میں ہے کہ ان کی آزادی روک دو جبکہ مردوں کے بارے میں ہے کہ ان کو سزا دو۔

معاشرتی اور تمدّنی زندگی میں انقلاب انگیز اعلان
کہ مرد عورتوں کا زبردستی مالک بن جائے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ ۚ (4:19) آیت کے ان چند الفاظ نے انسانی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب کہ جب چشمِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو وجد میں آجاتی ہے۔اور دنیا اپنے تمام ناکام تجارب کے بعد رفتہ رفتہ اس طرف آرہی ہے۔ اور ہم مسلمان اسی نسبت سے اس سے دور ہٹتے چلے جارہے ہیں۔قرآن مرد اور عورت کے تعلقات میں نکاح، طلاق، عدت، مہر بتا کر معاشرہ میں ایک انقلابی تبدیلی کا آغاز کرچکا ہے۔اس بڑے انقلاب کو سمجھنے کے لیے اگر ان معاملات کو جو اس سے پہلے دنیا میں ہورہے تھے اگر سامنے رکھا جائے۔تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن اتنی سی بات سے کتنا عظیم انقلاب برپا کرگیا ہے۔یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ (4:19) ''تمہارے لیے قطعاً حلال نہیں ہے کہ تم عورتوں کے ان کی خواہش کے خلاف زبردستی مالک بن جاؤ'' دنیا میں اس مظلوم مخلوق کے ساتھ جو کچھ ہوتا آرہا ہے۔اس اعلان نے اس کی بیخ کنی کردی۔

قبل از اسلام مختلف معاشروں میں عورت کی حیثیت:

یہ موضوع بڑا ہی تفصیل طلب ہے اس لیے موضوع کو صرف ان اقوام تک محدود نہ کریں جن کا تعلق براہِ راست عرب سے اور بعد ازاں مسلمانوں سے ہوا۔اسلام کے قریب تر دور میں یہودیت وعیسائیت تھی۔مذاہب سے آگے جائیں تو ایک طرف رومنز او دوسری طرف ایران۔ذرا سا آگے ہندو تھے۔فلسطین میں یہودی کا خود ساختہ مذہب جو وہاں کی پیشوائیت نے بنایا تھا اور اس کو انبیاء کی طرف منسوب کردیا تھا۔فلسطین میں عائلی زندگی میں مرد گھر کا حاکم تھا۔وہ عورت کو خرید کر بیوی بناتا تھا۔جب اس سے ناراض ہوتا تو معاہدے کے تحت ان کو واپس کردیتا۔اگر ایسی صورت نہ ہوتو اسے گھر سے نکال دیتا۔نکاح کے معاملہ میں عورت کی رضامندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔اور نکاح کے بعد وہ اس چنگل سے آزاد نہیں ہوسکتی تھی۔اگر خاوند مرجاتا اور اولاد نہ ہوتی تو اس کو مجبوراً خاوند کے بھائی کے ساتھ نکاح کرنا پڑتا تھا۔اس کو نہ نکاح کے وقت اور نہ بیوہ ہونے کے بعد کوئی اختیار ہوتا تھا۔اسے یہ'' Law of Levirate ''Levir، لاطینی زبان میں دیور کو کہتے ہیں۔اسی سے یہ''Levirate'' ہے یہ قدیم عبرانی قانون تھا کہ

بیوہ کی شادی دیور (Levir) سے کردی جاتی تھی۔ (Ancient Hebrew Law)

بیوہ کے لیے تورات کا بیان اور کمانڈ مینٹس (اوامر):

عہد نامہ عتیق میں اس کی کتاب استثناء میں یہ ''Law of Levirate'' کے تحت بیوہ کو دیور سے شادی کرنی پڑتی تھی۔ طلاق کا حق صرف خاوند کو تھا۔ طلاق کے بعد وہ کسی صورت بھی اس خاوند کے ساتھ شادی نہیں کرسکتی تھی۔ یہ کمانڈ مینٹس۔ اوامرِ عشرہ (Ten Commandments) جو طور سینا پر موسیٰ کو دیئے گئے باب خروج (Exodus) یہ ہدایت نہیں ہے بلکہ اوامر ہیں جن میں استثنا نہیں ہے اور اس کے مطابق ہر حال میں، ہر زمانے میں کرنا پڑتا ہے۔ ہدایت اور اوامر میں فرق ہے۔ ہدایت تو منزل تک کسی رہنمائی کا نام ہے جس میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق ذرائع واسباب خود تجویز کرسکتے ہیں۔ اس میں جزئیات بدلتی رہتی ہیں۔ مگر ہدایت کا اصول وہ اٹل رہتا ہے۔ جبکہ اوامر میں ہر صورت میں عمل کرنا ہوتا ہے۔ قرآن تو چند احکام کے علاوہ ہدایات دیتا ہے۔ یہ ہے بنیادی فرق قرآن میں اور توراۃ میں یہ بیوہ ہونے کی شکل میں دیور سے شادی کرنا اوامر میں سے ایک امر تھا۔

رومنز میں عورت کی تمدنی حیثیت:

اس دور میں رومنز تہذیب وتمدن میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ وہاں نکاح ایک معاہدہ کا نام تھا۔ اس معاہدے کی رو سے مرد عورت کو اپنی حفاظت میں لے لیتا تھا۔ اس میں نظر آئے گا کہ رومنز کے ہاں عورت کا احترام تھا۔ یہ احکامات رومنز یا Greek کے طبقۂ اشرافیہ (Aristocrats) کے لیے تھے۔ (بالادست طبقہ) جبکہ عوام کی حیثیت غلاموں کی سی ہوا کرتی تھی۔ لیکن ان کے ہاں عورت کی عزت ماں کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ اور ہمارے ہاں بھی روایات میں جہنم میں عورتیں زیادہ ہونگی اس کے ساتھ ہی دوسری روایت ہے کہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ تو متضاد چیزیں اگر عورت بیوی ہے تو جہنمی اور اگر ماں کی حیثیت ہے تو پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ یعنی بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے تو جنت میں جبکہ بیٹے کی باپ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے جہنم میں ہوگی۔ یہ متضادات روایات۔ سارا زور امومت یعنی (Motherhood) پر ہوتا ہے اور بیوی کی حیثیت سے تو ٹیڑھی پسلی سے پیدائش ہوئی ہے۔ سیدھی کرنے سے ٹوٹ جائے گی۔

Matrimony کا مادہ (Root) اور یہودیوں کے ہاں عورت کا مقام:

انگریزی زبان میں Matrimony سے مراد شادی کے متعلق چیزیں یعنی Matrimonials لاطینی زبان کا لفظ ہے معنی Motherhood یعنی ماں کے فرائض بعد میں یہ لفظ شادی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ حالانکہ اس کے معنی ماں کے فرائض ہیں۔ تو عورت کا مقام بچوں کی ماں کی وجہ سے دیا جاتا تھا۔ اور ماں کی حیثیت سے اس کی عزت ہوتی تھی۔ بیوی ہونے کی حیثیت سے نہیں۔ زنا کی صورت میں طلاق مرد بھی دے سکتا تھا اور عورت بھی طلاق لے سکتی تھی۔ ان کے ہاں تعدادِ ازواج تو نہیں تھی مگر

لونڈیوں کی عام اجازت تھی۔

انجیل میں احکام کی بجائے صرف اخلاقیات کی چند باتیں ہیں۔انجیل میں احکامات نہیں ہیں۔اس میں صرف اخلاقیات ہیں۔مثلاً دشمن سے بھی پیار کرو۔ ہمسایہ سے بھی محبت کرو۔ یہ اخلاقیات کی باتیں ہیں اس میں شریعت اور احکام نہیں ہیں۔اور ساری انجیل یعنی عہد نامہ جدید میں صرف ایک حکم ہے۔وہ ہے عورت کی طلاق۔عیسائیت میں عورت کو سب سے زیادہ قابل نفرت شے سمجھا جاتا ہے۔یعنی گناہوں کا سرچشمہ، آدمی کو بہکانے کا ذریعہ۔شیطان کے فریب میں آنیوالی آدم کی پسلی سے نکلنے والی کا قصہ بھی یہاں سے ہے۔عیسائیت میں شادی نہ کرنا مقدس فعل ہے اور مطلقہ عورت شادی نہیں کرسکتی۔عیسائیت میں تجرد کی زندگی (Celibacy) بغیر شادی شدہ رہنے کی زندگی کو مقدس تر زندگی تصور کیا جاتا ہے۔ پادری شادی نہیں کرسکتا Nuns (راہبات) بغیر شادی کے ہوتی ہیں۔اس طرح Saint ہوتے ہی وہ ہیں جو شادی نہ کریں۔

عیسیٰ نے ان کے عقیدہ کے مطابق خود بھی شادی نہیں کی تھی۔اور عیسیٰ بھی بغیر جنسی اختلاط کے پیدا ہوئے تھے۔ان کے ہاں جنسی اختلاط یعنی عورت اور مرد کا ملاپ گناہ کبیرہ ہے۔دوسری یا تیسری صدی میں ان کے ہاں جو (Monasticism) خانقاہیت رہبانیت کی زندگی وہ اس قدر پر تشدد ہوگئی تھی کہ ان کے ہاں ایک فرقہ (Viriliscians) کا بنا۔اس فرقہ میں سب ہیجڑے تھے۔اور اس کے اندر جو بھی داخل ہونا چاہتا تھا (Castraion) خصّی کے عملّ سے مخنث کر دیا جاتا تھا۔ان کے ہاں روحانیت کی زندگی میں مرد و عورت کا اختلاط سب سے بڑا سنگِ گراں تھا۔متی کی انجیل میں ایک جگہ طلاق کا متضاد ذکر ہے۔کہ عورت اگر زنا کرے تو اسے طلاق دی جاسکتی ہے۔اور اس مطلقہ عورت سے شادی کرنے والا بھی زنا کا مرتکب ہوگا۔یعنی اس عورت سے شادی نہیں کی جاسکتی۔مگر مرد دوسری شادی کرسکتا ہے اور اس میں دوسری جگہ ہے کہ طلاق جرم زنا کی صورت میں نہیں دی جاسکتی۔ نہ مطلقہ عورت شادی کرسکتی ہے اور نہ طلاق دینے والا مرد۔عیسائیت آگے بڑھ کر سینٹ پال کا مذہب بن جاتی ہے (5-67AD) اب اس جکڑ بندی کے خلاف Protestant نے صدائے احتجاج بلند کی یہ فرانسیسی انقلاب مذہب کے خلاف بھی ایک بغاوت تھی کہ پادریوں کو دنیاوی معاملات سے الگ کردو۔تو انہوں نے کہا کہ نکاح کو باہمی رضامندی سے توڑا جاسکتا ہے۔ مذہب کو گرجا کی چاردیواری میں بند کردیا اور دنیاوی معاملات میں اس قدر آگے بڑھے۔ایران میں تو عورت کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔وہاں تو بیٹی اور بہن سے بھی شادی کی جاسکتی تھی۔طلاق مرد کے ہاتھ میں تھی۔ہندو دھرم شاستر میں پہلی چیز نابالغ کے ساتھ شادی اور وہ بھی اٹوٹ انگ۔اگر لڑکی کے ایام شروع ہوجائیں تو باپ گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔تاوقتیکہ وہ لڑکی کی شادی کر کے اسے گھر نہ بھیج دے۔بالغ لڑکی باپ کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتے۔نابالغ شادی جس میں رضامندی کا سوال ہی نہیں تھا اور یہ شادی کا اٹوٹ انگ تھا۔جو ٹوٹ ہی نہ سکے۔خاوند کے مرنے کے بعد عورت کو بھسم ہونا پڑتا تھا۔تاکہ اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ کسی دوسرے سے شادی کرسکے۔لڑکی نہ باپ کی وراثت سے، نہ خاوند کی اور نہ بیٹے کی وراثت سے کچھ مل سکتا تھا۔صرف خیرات

یعنی دان مل سکتا تھا۔ کنھیا دان یعنی جہیز کا کوئی حق نہیں دیا جاتا تھا۔

اسلام سے قبل عرب میں عورت کی حالت:

عورت کی شادی اس کے ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔ خواہ بالغ ہو یا نابالغ۔ طلاق کا حق مرد کے ہاتھ میں تھا۔ ان تمام تمدنوں اور مذاہب میں عورت نہ نکاح کا اختیار۔ نہ گھر میں اقتدار۔ نہ طلاق کا اختیار۔ بس وہ ایک جنس تھی اسے خرید کر مملوکہ ہوجاتی تھی۔ اس کو خرید کر اس کی پراپرٹی ہوجاتی تھی۔

قندیل آسمانی کی طرف سے ایک عظیم اعلان اور لفظ کَرْهًا:

کَرْهًا ط (4:19) سے مراد خارجی اسباب سے پیدا ہونے والی کراہیت۔ جبکہ کُرْهًا (46:15)۔ سے مراد اپنے اندر کی ناگواری قرآن اس رشتہ کو تزویج کا رشتہ کہہ رہا ہے۔ رفاقت۔ برابر برابر کی دو چیزیں۔ جوڑی جن سے ایک سے دوسرے کی تکمیل ہو رہی ہو۔ تو کیا ذرا سی کراہت ہو تو اس میں ازواجیت یا رفاقت کا مقصد مل سکتا ہے۔ نکاح تو معاہدہ ہے جو تراضیٔ مابین سے استوار ہوتا ہے۔ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ (4:21) پختہ معاہدہ انہوں نے تم سے لیا ہوا ہے اس کا احترام تو ضروری ہے۔ مرد اور عورت کو برابر برابر کے حقوق لَهُنَّ اور عَلَيْهِنَّ (4:15) بالمعروف سے مراد قانوناً اس کو جس قدر ذمہ داریاں اس قدر حقوق حاصل ہونگے۔

اگر تناؤ ہوجائے اس گھریلو زندگی میں تو وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ (4:35) یہ معاشرہ کا کام ہوگا۔ خِفْتُمْ (4:35) سے مراد معاشرہ سارا۔ اب رضامندی ان کی ہوگی۔ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ط (4:35) اب یہ ثالث جذبات سے الگ ہوکر معاملات کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر اکراہ کی شکل ہے تو پھر اس کو مزید نہیں چلایا جاسکتا۔ اب اس قانون کو Abuse بھی کیا جاسکتا ہے۔ نکاح میں تو مرد کو عورت کو کچھ دینا ہوگا۔ مرد یا عورت جب چاہیں الگ ہوجائیں راضی و باہم خوشی سے۔ اگر عورت اس کا غلط استعمال کریں۔ کہ عورت نے نکاح کیا اور ہفتہ بعد کراہت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد طلاق لے کر حق مہر لیا اور دوسری جگہ۔ تیسری جگہ۔ پھر یہ سلسلہ یوں غلط استعمال کرتی رہی تو اس کو روکنے کے لیے قرآن نے یہ بات کہی ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط (2:229) تو اگر نکاح توڑنا چاہو تو جو کچھ دیا ہے عورتوں کو، واپسی نہیں لیا جاسکتا۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط (2:229) فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط (2:229)۔ تو عورت کو اپنے حق میں سے کچھ دینا ہوگا۔ عدالت نے تو ان نقصانات کا ازالہ کرنا ہے۔ ان کو باندھ کر نہیں رکھا جاسکتا۔

عباسی دور میں بادشاہ کی بیعت کی شرط:

ملوکیت کے دور میں مذہبی پیشواؤں کی مدد سے بادشاہ ایک معاہدہ بیعت کے لیے لیتا تھا۔ رعایا سے یہ اقرار نامہ لیا جاتا تھا

کہ اگر میں اس سے پھر جاؤں تو مجھ پر خدا اور رسول ﷺ کی لعنت ہو۔ اس کے باوجود لوگ فلور کراسنگ کر لیتے تھے۔ چنانچہ مذہبی پیشواؤں نے معاہدہ کی نئی شکل مرتب کی۔ اوپر تو سب کچھ وہی تھا۔ وفادار ہوں گا۔ عہد شکنی نہیں کروں گا اور اس کے آخر میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ اگر میں اس کی عہد شکنی کروں تو خدا اور رسول ﷺ کے دین سے بری ہو گیا اور قیامت کے دن مشرک اور کافر گردانا جاؤں گا۔ بعد ازاں اس بیعت نامہ میں یہ اضافہ کر دیا کہ آج میرے پاس جو عورت ہے یا اگلے تیس سال تک جس عورت سے میں نکاح کروں گا۔ تو اس کو اکٹھی تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ اس بادشاہ کی مدت تیس سال سے کم ہوتی تھی۔ دوسرا بادشاہ اسی بیعت نامہ سے دوبارہ بیعت لیتا تھا۔ ابھی جو آنیوالی ہے نکاح ہی نہیں ہوا۔ اس پر بھی طلاق کا بھلا کیا جواز؟ یہ تھی اس بیچاری عورت کی حالت زار! اب یہ تمام بادشاہ مرمرا کر ختم ہو گئے مگر شریعت حقہ کے یہ احکام ہنوز ابھی باقی ہیں۔

یورپ نے بھی ان خود ساختہ جکڑ بندیوں سے بغاوت کر دی اور ردعمل کے طور پر وہ آج تک خدا۔ وحی۔ قانون مکافات سے سرے سے انکاری ہو گئے۔ یورپ کی ''History of Rationalism'' پڑھیں۔ اس دور میں اس مذہب پرست طبقہ نے مخالفین پر کس قدر جور وستم اور عذاب مسلط کر رکھا تھا۔ ذرا سا عقیدہ میں فرق آیا تو زندہ جلا دیا۔ کھالیں کھینچوا دیں آگ میں جلا دیا۔ تانکہ سارے یورپ نے بغاوت کر دی۔ آنیوالی نسلوں کے سامنے کوئی دوسرے ضوابط تھے ہی نہیں جوان کو اعتدال پر رکھتے۔ توانہوں نے مذہب کی پابندیاں کے لبادے کو اتارا تو دین وحی و خدا کو بھی تیاگ دیا۔ یہ تھا ردعمل ان تمام خود ساختہ پابندیوں کا۔

آج یورپ میں ازدواجی زندگی کی ناگفتہ بہ حالت:

اب اس آزادی کے نتیجہ میں نکاح اور طلاق مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ اب تو نکاح کی رسم بھی اڑانی شروع کر دی۔ اب نکاح کے بغیر جنسی اختلاط سے پیدا ہونیوالی اولاد جائز قرار دیدی گئی۔ اب شادی کے لیے رومانس اور اس کے بعد نتائج یہ طلاقیں عام ہیں۔ اب اس کی شہادت ایک ایسے شخص کی جو ملحد ہے۔ جنسی اختلاط کی پابندیوں کے خلاف کتاب تک لکھ دیتا ہے یہ شخص یہ برٹرنڈ رسل (1872-1970) میں کتاب ''Marriage and Morals'' معاشرہ کی طرف سے جنسی پابندیوں کے خلاف دلائل دیتا ہے کہ یہ قطعاً ناروا ہیں۔ اس کے باوجود وہ لومیرج کے نتائج پر چیخ اٹھتا ہے وہ امریکہ کے بارے میں رقمطراز ہے یہ کتاب 1929 کی ہے۔ اتنا عرصہ بعد تو وہاں دریا سمندر بن چکے ہیں۔ آج تو سارے بندھن توڑ دیئے ہیں۔

> ''In USA where the romantic view of marriage has been quoted more seriously than any where else, where law and custom alike are based upon the dreams of spinsters. The result is extreme divorce and an extreme rarity of happy marriage. Marriage is something. more serious than the pleaure of two poeple in each other company, it is an institution which gives rise to children, forms part of the intimate texture of society and has an importance un-extending for beyond the personal feelings of the husband

and wife. I think it's good that romantic love should form the motive for marriage, but it should be understood that the kind of love which will enable a marriage to remain happy and to fulfil its social purpose is not romantic but is something more intimate, affectionate and realistic. In romantic love the beloved object is not seen accurately but through a glamorous mist even after marriage provided she has a husband of a certain type but this can only be achieved if she avoids all real intimacy with her husband and preserve a sphinx-link secrecy as to her inmost thoughts and feeling as well as a certain degree of bodily privacy. such maneuvers, however, affectionate intimacy quite unmixed with illusion. ''

اب دونوں تصورات کو سامنے رکھیں ایک تو مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ جکڑ بندیاں اور دوسری طرف یہ نام نہاد آزادیاں۔ تو اس کے بعد قرآن کی رہنمائی کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ ضوابط کس طرح سے ایک اعتدال کی راہ پر گامزن کرتے ہیں کاروان انسانیت کو ایک طرف کہا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ (4:19) صرف اس کی اجازت ہے کہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) باہمی رضامندی سے، خوشگواری سے رفاقت کرو۔ نکاح کو ہم آہنگیٔ فکر ونظر قرار دیا۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نباہ نہ ہو سکے تو اس صورت میں بھی کوئی جکڑ بندی نہیں ہے۔ لیکن اس کو دونوں کے جذبات کی مرضی کے اوپر نہیں رکھا۔ معاشرہ میں دخیل کر کے مصالحت کی کوشش کر کے کسی بھی پارٹی کو معاہدہ کی شرائط کے غلط استعمال (Abuse) کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ (4:19) اگر اس کی کوئی بات ناگوار بھی گزرے تو بھی فیصلہ میں جلدی مت کرو۔ اب اس کا حل کہ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ (4:20) اب اس عورت کی جگہ دوسری عورت آرہی ہے۔ اس کی موجودگی میں نہیں بلکہ طلاق کے بعد۔ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ (4:20) وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (4:21) جبکہ ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ طریقے سے آتے تھے۔ باہم ندیوں کی طرح ملے ہوئے تھے اور اب الزام لگا کر تم اس سے یہ مال ہتھیانا چاہتے ہو۔ اگر دولت کے خزانے بھی دیئے ہو تو اُن سے کوئی چیز واپس نہ لینا۔

وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ (4:21)۔ وہ تم سے ایک مضبوط عہد لے چکی ہے۔ تم اب اس کے ساتھ یہ کر رہے ہو۔ ہاں اگر وہ اس کو غلط طور پر استعمال کرے کہ محض مہر کی رقم ہتھیا لے تو وہ ثالثی کمیٹی اس کا فیصلہ کرے گی اور اگر الگ ہونا ٹھہر گیا ہے تو حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جاؤ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ (73:10) یہ ہے ایک سجدہ قوانین خداوندی کے آگے جو ہزار مصائب سے نجات دلا دیتا ہے۔

1043
آزادی اگر بغیر پابندی کے ہوتو اس میں تصادمات کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جو سڑک پر ''بائیں چلو'' کے قانون کو توڑنے سے ہوتا ہے۔ اس قانون سے آزاد ہو جایئے جس کا جی چاہے بائیں چلے اور جس کا جی چاہے دائیں چلے آدھ گھنٹہ بعد نتیجہ سامنے آجائے گا۔ یہ پابندیاں تو زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے ہیں۔ ان کو قائم کرتے وقت بھی غور وفکر اور چھوڑتے وقت بھی جلدی نہیں بلکہ چھوڑو بھی حسن کارانہ انداز سے۔

❁❁❁

زوجیت میں ذہنی ہم آہنگی مقدم جبکہ سزا میں لونڈیوں اور آزاد عورتوں میں فرق

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ (4:25)

قرآن نے اس معاشرہ کی رو سے دو شقیں بنائی ہیں۔ ایک تو الْمُحْصَنٰتِ (4:25) جو آزاد عورتیں ہیں متمدن خاندانوں کی بیگمات۔ دوسری طرف مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (4:25) جو معاشرے میں غلام اور لونڈیاں موجود ہیں اور آئندہ کے لیے یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ عربوں کے ہاں تو سارا معاشرہ ان سے بھرا ہوا تھا اور جس کے پاس یہ تعداد زیادہ ہوتی تو وہ سب سے بڑا سردار ہوتا تھا۔ کاشتکاری، مزدوری، باہر کے تمام کام یہ غلام کرتے تھے۔ جبکہ یہ لونڈیاں داشتاؤں کی طرح رکھی بھی جاتی تھیں اور گھر کے سارے کام انہی سے لیے جاتے تھے اب قرآن کے سامنے یہ مسئلہ تھا۔ جو کام کرنے کے قابل تھے۔ ان کو آزاد کرتا گیا ان کی آپس میں شادیاں کرتا گیا۔ جو ایسے نہیں تھے ان کو خاندان کا جزو بناتا گیا۔ جب اس حکمت پر غور کریں تو لگتا ہے کہ یہ واقعی یہ کلام انسانی عقل سے ماوراء کسی بلند ترین سرچشمہ علم کی طرف سے ہے۔ اب کوئی ہمارے ہاں ریفامرز اٹھ کر مساواتِ انسانی کا اعلان کر دیں گے تو جذبات سے کام لے کر کہ یہ غلام اور لونڈیاں یکساں واجب التکریم ہیں اور ان میں کسی لحاظ سے بھی فرق نہیں کرنا چاہیے۔ جذبات کا یہی تقاضا ہے۔ لیکن جب جذبات کی جگہ حقائق سامنے لائیں گے تو اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔ قرآن کے سامنے یہی چیز تھی کہ ازدواجی انتخاب کے لیے ذہنی وعلمی سطح کا یکساں ہونا ضروری ہے۔ اب آزاد عورتوں اور ان لونڈیاں کی تربیت اور ذہن اور تمدن فرق تھا۔ یہ بے چاریاں کتنی ہی صدیوں سے غلام ابن غلام تھیں۔ نہ تربیت، نہ تعلیم۔ وہ نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھیں۔ ان کی ذہنی سطح آزاد عورتوں کے مقابلہ میں انتہائی پست

1043 تھی۔اب قرآن نے زوجیت کے لیے فکری ہم آہنگی کو جو شرط اوّل قرار دیا ہے۔تو زوج کے انتخاب میں یقیناً اس عورت کو ترجیح دے گا جو اس سے یکساں سطح پر ہوگی۔قرآن نے لونڈیوں سے نکاح کی صورت میں جذبات کی بجائے حقائق کو پیش نظر رکھا ہے۔ جب یہ کہہ دیا گیا کہ زندگی کے کسی شعبہ میں ان میں اور اُن میں کوئی تمیز نہیں ہوگی تو یہ ریفارمر کی جذباتی اور دھواں دھار تقریر ہوگی۔ اب قرآن کے سامنے ان کی ذہنی سطح بھی ہے اور اس مسئلہ کا پائیدار حل بھی دیتا ہے۔ کیونکہ داشتہ یا لونڈی کی حیثیت سے تو رکھنا مقصود نہیں ہے۔اب یہ گروہ تو دو ہیں مگر مساوات واحترام تو یکساں۔جبکہ مدارج تو اعمال سے متعین ہونگے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ط (6:132) یہ مدارج سوسائٹی میں رہے گا۔قرآن نے کہا کہ چونکہ ان کی سطح بڑی پست ہے تو ترجیح ان کو دو جو ذہنی طور پر ہم آہنگ ہوں۔تو ایسی شادیاں کامیاب ہونگی۔ دوسری صورت میں اگر لغزش کا امکان ہے تو پھر ان میں سے کسی کے ساتھ شادی قانون کے مطابق، ڈنکے کی چوٹ پر کرو۔مہر ادا کر کے، نکاح میں لاؤ۔وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ط (4:25)۔ لیکن اگر تم ضبط نفس سے کام لے کر یہ نکاح نہ کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ یہ ابھی تربیت کے مراحل سے گزر رہے ہیں اور ابتدائی ایام کی بات ہے۔اگر ہم آہنگی کی صورت نہ ہو تو پھر اپنے آپ پر کنٹرول رکھو دوسری جگہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (24:33) اپنے پر کنٹرول رکھیں۔

جنسیّات کے بارے میں فرائڈ کی لغزش:

نفسیّات کا بڑا امام Sigmand Freud (فرائڈ) (1856-1939) بلند فکر والا مگر لغزش بھی بڑی۔ کہ جنسی جذبہ بھی بھوک اور پیاس کی طرح ایک ضرورت ہے۔اس کی تسکین ضروری ہے۔اس پر کوئی کنٹرول نہ رکھا جائے۔ کیونکہ یہ رکاوٹ اعصابی پیچیدگیاں پیدا کر دیتی ہے۔اب ذرا سی بات پر جنسی جذبہ کی تسکین کا الزام لگا دیا گیا کہ چونکہ اس کے جذبہ کی تسکین نہیں ہوئی اس لیے اس نے ماں باپ کی عزت نہیں کی۔آج کا انسان تو جنسی جذبہ کے لیے حیوان کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ہمارے نوجوان بھی اس قسم کا لٹریچر پڑھنے کے بعد مادر پدر آزاد ہو رہے ہیں۔ حالانکہ فرائڈ کی یہ تھیوری مدت ہوئی ریزہ ریزہ (Explode) ہو چکی ہے۔تو ان کے ساتھی ریڈلر اور جنگ نے اس سے اختلاف کر کے ایک الگ مکتبہ فکر بنایا۔ہم تو ابھی تک ان پرانی تھیوریز پر ہی اٹکے ہوئے ہیں۔انہوں نے فرائڈ کو غلط قرار دیا ہے کہ جنسی جذبہ بھوک اور پیاس کی طرح کا نہیں ہے۔

پیاس یا بھوک از خود لگتی ہے اس کو لگانے کے لیے خیال نہیں کرنا پڑتا۔ یہ جذبہ پیاس اور بھوک کی طرح اضطراری نہیں ہے۔ خیالات کو بے باک کر دیں تو یہ جذبہ خود بھڑک اٹھتا ہے اگر اس کی پھر تسکین نہ ہو تو پھر نفسیاتی عوارض پیدا ہوتے ہیں Neuroses اور نفسیاتی کمپلیکس پیدا ہوں گے۔ یہ تو نہایت قیمتی جذبہ ہے اگر ان کو تعمیری مقاصد کی طرف موڑ دیا جائے۔ Sublimation (تطامت) تو انسان حیرت انگیز تخلیقی مراحل طے کرتا جائے گا۔قرآن نے بھوک اور پیاس کو اضطراری کیفیت کا نام دیا ہے کیونکہ اس پر اختیار نہیں ہے جب تک اس کی تسکین کا سامان نہ ہو تو یہ بھڑکتی جائے گی۔ یہاں جنسی جذبہ پر تو کنٹرول کی

تعلیم دی ہے۔سب سے پہلے خیالات پر کنٹرول کرو۔علوم حاضرہ سے قرآن کی عظمت کھل کر سامنے آتی ہے اب زوجیت کے معاملہ میں خیالات کی ہم آہنگی نہ ہوتو ساری زندگی ان دو پہیوں میں تفاوت ہوگا۔ یہ زوج نہیں بن سکیں گے یہ مساوات نہیں ہوگی۔ یادرکھوعلم والا اور بےعلم برابرنہیں ہوسکتے انسان ہونے کے اعتبار سے کیا شریف اور بدمعاش ایک جیسے ہوسکتے ہیں؟ جس طرح عالم اور جاہل میں فرق رکھنا پڑتا ہے اس طرح مہذب اور گنوار میں بھی فرق رکھنا پڑے گا۔اس لیے ثقافت یعنی ذہنی اور قلبی سطح، ذہنی ہم آہنگی کو ذہن میں رکھو۔

ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ ‌ؕ (4:25) اگر اس کولغزش کا خدشہ ہے۔تو پھر اس کا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔اس شادی کا نتیجہ پھر ذہنی ہم آہنگی نہ ہوتو پھر اس کا نقصان ہوگا۔ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ ؕ (4:25)۔اگر صبر اور کنٹرول کر کے اس نکاح سے احتراز کروتو یہ تمہارے سامنے خیروبرکت کا موجب ہوگا۔ یہ دشواریاں جو اس قسم کے رشتہ میں آئیں گی اس سے بہتر ہے کہ صبر سے کام لے کر نکاح نہ کرو۔ اگر تم عفت قلب ونگاہ کا خیال کروگے تو حفاظت بھی ہوگی اور سامان نشوونما۔تزکیہ بھی ملے گا۔آپ تو یہ کہیں گے کہ لونڈیاں ان کی سطح کی نہیں تھیں تو اس سطح کے نہ ہونے سے ان کو معاشرہ میں نقصان ہوا۔’’Disadvantagious position‘‘ قرآن کہتا ہے کہ قطعاً یہ بات نہیں ہے۔ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ‌ ؕ (4:25)۔ نکاح کے بعد اگر یہ لونڈیاں زنا کی مرتکب ہوں تو ان کی سزا آزادعورتوں کے مقابل آدھی ہوگی (24:2) کیونکہ ان کی تربیت اچھے ماحول میں نہیں ہوئی۔ یہ حرکات ان کی پہلی زندگی میں معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ ان سے اخلاق کا وہ بلند معیار متوقع نہیں کیا جاسکتا جوشریف گھرانوں کی عورتوں سے متوقع ہوتا ہے۔سزا کے تعین میں پرورش، تربیت اور ماحول کا خیال رکھنا ضروری ہے۔اس لیے معاشرہ میں اگر حالات ایسے ہوں کہ بھوک مٹانے کے لیے اگر چوری کی اضطراری کیفیت پیدا ہوجائے تو مجرم کوسزانہیں دی جاسکتی۔جس طرح عمرؓ نے چوری کی سزا چور کونہیں بلکہ اس مالک کودی تھی جو اس جرم کا باعث بنا۔دوسری بات تربیت کی ہے اس لیے لونڈی کو آدھی سزادی گئی ہے۔ایک طرف تو نکاح کے متعلق کہا کہ دونوں برابر نہیں تھیں۔تو ذہن میں عدم مساوات والی بات آگئی۔اس آیت میں آدھی سزا کا ذکر کرنے سے مقصود یہ کہ ازدواجی معاملہ میں آزاد عورتوں کو ترجیح دینا تو ان لونڈیوں کی تحقیر کرنا ہے۔ بلکہ یہ دیکھو کہ ذہنی سطح کی تفاوت کی وجہ سے آزادعورت کو ان کے مقابل دوگنی سزا ہے۔اب ذرا ایک قدم آگے بڑھیے۔تمام ازواج المطہرات کے بارے میں کہا کہ اگر تم سے ایسی بات ہوئی تو دوگنی سزا ملے گی۔غیر متمدن لونڈیوں کی سزا آزاد سے آدھی جبکہ ازواج مطہرات کی غلطی کی سزا آزاد سے دوگنی۔ ایک ہیڈ آف سٹیٹ کی یہ کیفیت ہے۔اورقرآن میں اپنے بارے میں اعلان اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۳﴾ (39:13) معمولی سزانہیں بلکہ بڑی سزا۔ایک آیت میں مساوات کے کتنے اہم اصول آگئے۔اگر استطاعت نہ ہو کہ آزادمومنہ سے شادی کرسکوتو پھر مومنہ لونڈی سے شادی کرلوتا کہ یہ معاشرہ کا جزوبنتی جائیں اس طرح سے غلامی کا خاتمہ ہوجائے وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ‌ ؕ (4:25)۔اللہ کی

1043

نگاہ تمہارے ایمان پر ہے۔ یہی معیار فضیلت ہے بَعۡضُكُمۡ مِّنۢ بَعۡضٍ ۚ (4:25)۔ اسی بناء پر تم ایک دوسرے کا جزو بن جاتے ہو۔ مومن کی حیثیت سے ایک ہو۔ مگر اس کے باوجود ذہن تفاوت اور تربیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ان کے موجودہ مالک کی اجازت سے ان کے حق مہر ادا کر کے قانوناً ان کو اپنی زوجیت میں لے آؤ۔ دھوم دھام سے تاکہ سارے معاشرہ کو پتہ چل جائے۔ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ (4:25)۔ یہ شادی کا مقصد صرف تولید ہے نہ کہ جنسی لذت اٹھانا۔ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ (4:25) نہ وہ جن کے ناجائز تعلقات ہوں یعنی نہ داشتہ کے طور پر۔ یہ محض جنسی تسکین نہیں ہے۔ وَيَهۡدِيَكُمۡ (48:20)۔ تاکہ یہ ہدایات نکھر کر، ابھر کر تمہارے سامنے آ جائیں۔

❋❋❋

روحانیّت (Spirtuality) اور باطنی علم کا غیر قرآنی تصور

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۴۹﴾ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ؕ وَ کَفٰی بِہٖۤ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۵۰﴾ (4:49-50)

یہ احبار و رہبان یعنی علماء مشائخ جو روحانی دنیا کے تصرف کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ قرآن میں روحانیت کی کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ افلاطون کا تصور تھا کہ خارجی کائنات کا دراصل اپنا کوئی وجود نہیں۔ اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ اصل میں اس سے ماوراء ایک دنیا عالم امثال کی ہے۔ (World of Ideas) یہ مرئی کائنات اس کا سایہ ہے۔ عالم امثال کا علم باطنی طریقے سے، اندر کی دنیا کو روشن کرنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے عالم محسوسات صرف ایک فریب ہے۔ اور اس سے جو علم حواس کے ذریعہ حاصل ہوگا وہ بھی سراب اور فریب ہوگا۔ حقیقی علم تمام حواس خمسہ کو بند کر کے اپنی دنیا میں جذب ہونے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ یہی علم قابل اعتماد ہوگا جبکہ محسوسات کا علم (Perceptual Knowladge) قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

اب تاریخ انسانی کی بڑی بدبختی کہ جن کے ذہن تو بہت بلند مگر نگاہیں ٹیڑھی ہیں۔ وہ اتنا نقصان پہنچا دیتے ہیں کہ صدیوں تک انسانیت پنپ نہیں سکتی۔ ان میں افلاطون (347-428ق) (Plato) بھی ہے۔ اڑھائی ہزار سال سے اس تصور عالم امثال سے، تمام اقوام عالم مذہب کی اور طریقت کی ساری دنیا متاثر چلی آرہی ہے۔ اور اس تصور نے تاریخ انسانیت میں مختلف پیراہن پہنے ہیں۔ اسی پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی۔ چنانچہ ہندو فلسفہ کی رو سے پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ کائنات برہما (خدا) کا خواب ہے۔ جس دن اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ خواب معدوم ہوجائے گا۔ یہ کائنات ایشور کی لیلا ہے (ناٹک کا کھیل) جس میں کوئی شے اپنے حقیقی رنگ میں سامنے نہیں آتی۔ بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ یہی فلسفہ ایرانی مغبچوں کے ہاتھوں شراب معرفت بن کر چھلکا۔ عیسائیوں کی خانقاہوں کو کیف آسود کر گیا۔ اس فلسفہ کے تحت کائنات کو باطل قرار دیدیا گیا اور دنیا ایک قابل نفرت شے تصور کرلی گئی۔ اور اس سے دور بھاگنے میں، ترک۔ ترک کرنے میں ہی انسانی نجات کا راز پوشیدہ سمجھا گیا۔ وہیں سے اسلام نے مستعار لے کر اپنے ہاں خانقاہیت کی رسم ڈالی۔ دین میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ مانگی ہوئی۔ مستعار چیز ہے۔

ہمارے ہاں بڑی بے تکلفی سے تین اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں کہ فلاں دور میں مادی، اخلاقی اور روحانی ترقیاں ہوئیں۔ مادی اور اخلاقی تو سمجھ میں آتی ہیں۔ مگر یہ روحانی ترقی قابل فہم نہیں ہے۔ قرآن نے رسول ﷺ کے لیے خلق عظیم کی اصطلاح دی ہے۔ روحانیت کی نہیں۔ روحانیت کیا ہے؟ ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی! یہ تو نشۂ شراب ہے جو پئے گا اسے ہی پتہ چل سکتا ہے۔ دوسرے کو پتہ ہی نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کو اس قدر بلند مقام دیا جاتا ہے کہ اس کے سامنے یہ اخلاق کی دنیا، شریعت کی دنیا، ساری پست ہو کر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ یہ مقام تو حضور ﷺ کا ہے جو انسانیت کے معراج کبریٰ پر فائز المرام ہیں۔ قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴ (68:4) اخلاق کی بلندی تو قابل فہم ہے۔ جبکہ یہ روحانیت ایک خالص یونانی تصور عیسائیت نے اپنایا۔ اس کے ہاں باپ، بیٹا اور روح القدس کے ساتھ ایک شریک لانے کی ضرورت تھی۔ پھر ہمارے ہاں یہ روحانیت (Spritualism) کی اصطلاح متعارف کی گئی۔

تزکیۂ نفس کا قرآنی مفہوم اہلِ تصوف کے تزکیۂ نفس کے بالکل برعکس ہے:

ہمارے ہاں احکام خداوندی کی اطاعت سے انسان کا اخلاق بلند ہوتا ہے۔ اور اخلاقیات کے بلندترین مقام پر آپ ﷺ تھے اور یہی مقام مومن ہے۔ اس سے ذات کی نشوونما یعنی تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ جبکہ تصوف میں نفس کشی سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ تزکیہ سے مراد بالیدگی۔ نشوونما دینا۔ نفس کو مارنا نہیں بلکہ انسانی ذات کی نشوونما جو صرف قرآن کی اطاعت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اس کی نمود انسان کے کردار سے، اخلاق کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس سے الگ کوئی چیز نہیں۔ جس کا کردار قرآنِ حکیم کی اقدار کے مطابق ہے۔ وہی مومن ہے۔ وہی متقی ہے۔ وہی مزکّی ہے۔ قرآن نے جو اس کا ذریعہ بتایا ہے روحانیت تو اس کے بالکل الٹا ہے۔ یہ تمام درویش، صوفی، قلندر، پیر، ابتدائی سٹیج میں کسی نے اللہ واسطے روٹی دیدی تو کھالی۔ جب یہ مقام بلند حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان کے عقیدت مند ان کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ وراثت میں جاگیریں آجاتی ہیں۔ ان کے ہاں وراثت میں گھری ایک جاگیر ہوتی ہے۔ یہ خود محنت کر کے کماتے نہیں بلکہ دوسرے لوگ ان کو کما کر دیتے ہیں۔ اہل طریقت کے بارے میں قرآنی ارشاد: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ (4:49) ذرا ان کو ملاحظہ کریں جو روحانیت کے اجارہ دار بنے پھرتے ہیں۔ تزکیہ نفس کے دعوی دار ہیں۔ اپنے ہی ذہن کے مطابق یہ کچھ بنے بیٹھے ہیں کہ ہم اس سے روحانیت کی منازل طے کر رہے ہیں۔ ارے! خود ساختہ تصورات سے یہ منازل نہیں ملتیں۔ بلکہ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۴۹ (4:49) انسانی ذات کی نشوونما تو قانونِ خداوندی کے اتباع سے ہوتی ہے جو اس کی سنت کے مطابق قرآن میں دیدیا گیا ہے اور جو بھی مزکی ہونا چاہے تو اس کی کوششوں کے نتیجہ میں ذرا بھر بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

قرآن انسانی زندگی کو دو حصوں میں انسانی سطح زندگی اور حیوانی سطح زندگی۔

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ﴿۴﴾ (92:4) تمہاری کوششوں کی سمت مختلف ہونگی۔ پھیلی ہوئی ہونگی مگر اصولی طور پر تم کو دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکے گا۔ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ﴿۶﴾ (92:5-6) جو محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لیے دیدیتے ہیں اور معاشرے میں توازن پیدا کر کے اپنے دعوے کو سچا ثابت کرتے ہیں۔ اور یوں تقویٰ شعار بنتے ہیں۔ حیوانی زندگی کا تقاضا لینا ہے جبکہ انسانی سطح زندگی مَنۡ اَعۡطٰی (92:5) کہ دوسرے کو کتنا دیتا ہے تو نتیجہ اس کا فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ﴿۷﴾ (92:7) تو اس کے لیے زندگی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔

دوسری کٹیگری بخل:

اس کے مقابل دوسری روش وَ اَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَ اسۡتَغۡنٰی ﴿۸﴾ وَ کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی ﴿۹﴾ (92:8-9) اور جو سمیٹ کر اپنے لیے رکھے اور سمجھ لے کہ میں دوسروں سے مستغنی ہو گیا ہوں یہ ہے جو دعوئے ایمانی کی تکذیب کرتا ہے یہ ہیں جہنمی جبکہ وَ سَیُجَنَّبُہَا الۡاَتۡقَی ﴿۱۷﴾ (92:17) جو قوانین کی نگہداشت کرے گا تو وہ اس آگ سے دور رکھا جائے گا۔

الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ (92:18) جو اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے اس کا تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے۔ جبکہ ان روحانیت والوں کی ابتداء ہی دوسروں کے ٹکڑوں سے ہوتی ہے۔ ان کے ہاں دینا نہیں ہوتا بلکہ لینا اور لینا ہوتا ہے۔ قرآن نے یَتَزَکّٰی کی بنیادی چیز یہ بتائی ہے کہ وہ دوسروں کو دیتا ہے۔ اب کمائے گا تو دے گا۔ اب یہ کرامات پر آ جاتے ہیں۔ کرامات تو ان بت پرستوں اور مشرکوں، سادھوؤں سے ایسی ہوتی ہیں جن کا تصور بھی یہ ہمارے صوفی نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہ کرامات بھی ٹیکنیکل شے ہے جس طرح جسمانی قوت کو بڑھا کر حیرت انگیز کارنامے، کرامات دکھائی جاتی ہیں اسی طرح ذہنی صلاحیتوں کو بھی مرکوز کرنے سے یہ فوق الفطرت کرامات وجود پذیر ہوتی ہیں مگر اس کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ قرآن میں صرف میٹریل اور مورال ترقی ہے۔ اخلاقی ترقی تو وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۴﴾ (68:4)۔ جبکہ مادی ترقی وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا (45:13) یہ ہے مادی ترقی اور دوسری اخلاقی ترقی کردار کی پہلی بلندی یہ ہے کہ انسان محنت کر کے، جان مار کر لوگوں کی ضروریات کے لیے کتنا دیتا ہے۔ جن کی ضروریات ان کی اپنی محنت سے پوری نہ ہوں۔ یا جو محنت سے معذور ہو گئے ہوں۔ اس سے معاشرے کے تمام جرائم ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ عیب اور جرائم کی وجہ یہ ہے مَنۡۢ بَخِلَ (92:8) ہر شخص سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر نگاہ میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو جائے کہ دین نام ہی دینے کا ہے۔ تو ان چیزوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی ہے جس کو قرآن نے تزکیہ کہا ہے بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۴۹﴾ (4:49) تزکیہ تو خدا کے قانون کے اتباع کا نام ہے جو بھی یوں حاصل کرے تو اس کی کوشش کے نتیجہ میں ذرا بھر بھی کمی نہیں کی جاتی۔ یہ جو اس قسم کا خود ساختہ نظریہ ہے۔ جس کا ذکر تک قرآن میں نہیں ہے۔ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ الۡکَذِبَ ؕ (4:50) ذہن سے چیز گھڑ کے اس کو خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی وعید ہے۔ جو قرآن نے بتا دی ہے یہ تو سراسر افتراء ہے۔ اس کا تصور تک قرآن میں نہیں آیا۔ بلکہ یہ اسے دین ہی نہیں مغز قرآن کہتے ہیں۔

ماز قرآن مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

یہ تو سارا افتراء علیٰ اللہ ہے۔ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ (4:50) اس سے خدا کا کیا بگاڑو گے اس سے ان کی ذات اضمحلال وضعف و پژمردگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی چیز ان کی تباہی کے لیے کافی ہے ایسا کھلا ہوا جھوٹ، اتنا واضح جرم اور یہ دعویٰ کہ ہم خدا کے مقرب ہیں۔ جو قوم بھی یہ تصور اپنائے گی وہ ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جائے گی جو قدرت نے انسان کے لیے پیدا کردی ہیں۔ اِثْمًا۔ اضمحلال۔ افسردگی، تکان، قوت عمل کا مفقود ہو جانا اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ (4:50)۔ ایسا اضمحلال کہ نظر آجائے گا کہ واقعی یہ قوم ہر لحاظ سے ساری دنیا سے پیچھے رہ گئی ہے ترک دنیا، جنگل میں، غاروں میں، صحراؤں میں، حجروں میں، زاویوں میں، گھیان دھیان میں بس دعا و تعویز کے لیے ان کے پاس جاؤ۔ وظیفہ لے لو، یعنی خدا سے یہ کرادیں، یعنی ان سے یہ جو چاہیں خدا سے کرا سکتے ہیں تاکہ وہ ان کی مرضی کے تابع ہو جائے۔ ذرا سا نہیں سوچتے کہ خدائے مطلق کو سائیں بوڑھے شاہ کا مجبور بنایا جا رہا ہے۔ جو خود اپنی روٹی نہیں کما سکتا۔ ان کے مجذوب خود اپنی غلاظت نہیں دھو سکتے۔ تو خدا ان کے کہنے سے مجبور ہو جاتا ہے! اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ (4:50)۔

دین میں لغزش سے حفاظت اتھارٹی کرتی ہے

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾(4:62) ویسے تو خود بھی اس اتھارٹی کی طرف روکتے ہیں فیصلے کرانے کے لیے لیکن جب کوئی مصیبت اپنی کارکردگی کی بنا پر آئے تو دوڑے چلے آئیں گے قسمیں اٹھائیں گے کہ ہمارا ارادہ تو ایسا نہیں تھا ہم تو صرف حسن کارانہ انداز سے یہ کچھ کرتے تھے تاکہ موافقت پیدا کی جائے۔ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ (4:63) لیکن اللہ دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ یعنی وہ خیالات بھی اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اب اتنا بڑا رسول ﷺ ہے جس نے نوع انسانی کو راہِ راست پر لاتا ہے تو اس سے کہا جا رہا ہے کہ ان سے اعراض برتو۔ حالانکہ یہ وہ لوگ کہ دلوں میں کچھ اور زبان پر کچھ اور ہے۔ اعراض اس لیے کہ یہ جماعت میں داخل ہو کر ضرر اور نقصان کا باعث بنیں گے۔ بس ان کو تباہ ہونے دو۔ بات یہ نہیں ہے وَعِظْهُمْ (4:63)۔ ان کو سمجھاتے رہو۔ جو کچھ ان کے دل میں ہے ہم جانتے ہیں۔ اب کہا وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾ (4:63) ان کو دوسروں سے زیادہ ہمدردی کی ضرورت ہے اس لیے ان کو شدد سے یوں سمجھاؤ کہ بات ان کے دلوں میں اتر جائے۔ اعراض تو جماعتی حیثیت سے برتا جا رہا ہے کیونکہ یہ اس جماعت کے افراد نہیں بن سکتے کیونکہ نقصان اور ضرر رساں ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ ہے اس لیے ان کو تبلیغ کرو کیونکہ یہ زیادہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾ (4:63)۔ تاکہ بات ان کے دلوں کی گہرائی تک اتر جائے۔ بات تو دل بدلنے کی ہے۔ جب تک دل نہ بدلے انسان کی روش نہیں بدل سکتی۔ ایمان دلوں کے اندر اتارنے کے لیے نبی ﷺ کو کیا کیا کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ﴿١٠﴾ (73:10) حسن کارانہ انداز سے تعلقات چھوڑ دو۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والے کی ذمہ داریاں ملاحظہ کریں۔ وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا (6:70) ان کو چھوڑ دو۔ آگے ہے وَذَكِّرْ بِهِۦٓ (6:70)۔ مگر ساتھ ساتھ قرآن کے ذریعہ ان کو نصیحت کرتے رہو۔ تاکہ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (6:70) کہیں کوئی اس لیے تباہ ہو جائے کہ صحیح بات اس تک نہ پہنچے۔ یہ ان کی اپنی بداعمالیاں ہیں مگر لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ (6:70) خدا کے سوا ان بیچاروں کا کون ہے نہ

1043 مددگار نہ سفارش۔ اللہ اکبر! کیا ایسا خدا ہو تو خواہ مخواہ مصیبتیں نازل کرتا جائے گا۔ یہ ہے ذمہ داری مُبَلّغ کی۔ جبکہ جواب میں پتھر مارے جا رہے ہیں۔ لہولہان کیا جا رہا ہے۔ جانیں جا رہی ہیں۔ میدانِ جنگ تک آ گئے ہیں۔ جینا حرام کر رکھا ہے۔ رسول ﷺ سے کہا جا رہا ہے اس کے باوجود ان ناسمجھوں کو صحیح بات کرتے جاؤ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا (4:63)۔ ذرا اس طیب غمگسار کی کیفیت تو ملاحظہ کریں۔ جس کے لیے خود خدا کو کہنا پڑ گیا فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (18:6) جن کے ہاتھوں کوئی چیز بھی محفوظ نہیں۔ گھر بار چھوڑ دیا۔ میدانِ جنگ میں آ کر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اور آپ ﷺ ان کے غم میں جان گھلا رہے ہیں۔ تبلیغ کرنے والوں کی یہ سیرت و کردار ہونا چاہیے۔ یہاں تو کفر و الحاد کے فتوے لگ جاتے ہیں۔ گالیوں کی بوچھاڑ اور آنکھوں میں لالی، نکل جاؤ مردود۔

اگر ایسا مشفق ڈاکٹر مل جائے تو کتنی خوش قسمتی ہے اس مریض کی۔

اطاعت دل کی گہرائیوں سے ابھرے تو پھر نظام میکینیکل نہیں رہتا:

پہلی چیز جو قرآن نے کہی کہ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا (4:63)۔ بات دل میں اترنی چاہیے۔ چونکہ یہ نظام ہے اس لیے یہ انفرادی نہیں ہے۔ اس لیے کہا اگلی ہی آیت میں وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (4:64) اس کی اطاعت براہِ راست نہیں ہے بلکہ ایک نظام کے تحت خدا کے قوانین کے تحت اب یہ خانقاہی تصور، گوشوں، حجروں میں عبادت کس قدر طاغوتی تصور ہے۔ یہ تو مذہب کا دیا ہوا تصور ہے۔ مذہب کے لیے تو رسول ﷺ کی ضرورت ہی نہیں بس یہی احکام اگر وہ کسی چٹان پر لکھ دیتا تو اس کے لیے ایسا کرنا کیا مشکل تھا۔ چلو رسول آ کر دے بھی گیا کتاب۔ اپنی اپنی جگہ لے کر پھر اپنے طور پر اس کی اطاعت کرتے جایئے۔ مگر دین میں ان احکام کے ساتھ ایک محسوس شخصیت ہوتی ہے۔ وہ ان قوانین کی روشنی میں ایک نظام قائم کرتی ہے۔ تاکہ اطاعت کی جا سکے۔

طَاعَ وہ اطاعت جو برضا و رغبت کی جائے۔ جو پھل پک کر درخت سے خود ٹپک پڑے اسے اَطَاعَ النَّخْلُ کہتے ہیں۔ قرآنی نظام کا مقصد ذات کی نشوونما کے لیے نظام حکومت کی تشکیل ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (4:64) اب اس نظام کے تحت زندگی نہ گزارنا اپنے پر ظلم کرتا ہے۔ اس سے مقصد صرف اور صرف اپنی ذات کی نشوونما ہے۔ قرآن میں جس مقام پر خدا کے قانون کی خلاف ورزی کو ذات کے خلاف ظلم کیا گیا ہے۔ کہا کہ اگر یہ اپنی ذات کے خلاف اگر ظلم کریں۔ تو مذہب میں تو گھر میں مصلے پر یا اللہ میری توبہ! تو بخش دے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ کہہ کر اس کو خدا اور بندے کے درمیان کوئی بات سمجھی جاتی ہے۔ یہ مذہب کا دیا ہوا غلط اور گمراہ کن تصور ہے۔ اب دیکھئے یہاں توبہ و استغفار کا تصور کیسے بدل رہا ہے۔ یہ ایک نظام ہے جَآءُوْكَ (4:64) اس کے لیے ضروری ہے کہ تیرے پاس آئیں۔ کیونکہ یہ غلطی کر کے اپنے پر ظلم کیا ہے۔ اب یہ اتھارٹی معافی کا اختیار نہیں رکھتی بلکہ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ (4:64) کہ خدا سے ہماری ان لغزشوں کا سامان حفاظت طلب کر۔ اب وہ اس کتاب کی

رو سے ہمارے لیے سامان حفاظت طلب کر۔ ہمیں بتا کہ کس طرح سے اس کا ازالہ ہوگا۔ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ (4:64)۔ یہ رسول کے پاس استغفار کے لیے آئے تو اب رسول خدا سے ان کے لیے استغفار طلب کرے یعنی یہ اتھارٹی خود مجاز نہیں ہے بلکہ کتاب کی رو سے فیصلہ لینے کے لیے آئیں۔ یہ اتھارٹی خود قوانین کی پابند ہے۔ ملوکیت تو نہیں ہے کہ جاؤ ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ رسول معاف کر دے بلکہ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ (4:64) رسول ان کے لیے خدا کی کتاب سے استغفار طلب کرے۔ قرآن نظام میں مرکز ملت کو بھی قرآن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ملاحظہ کریں نظام کے ٹکڑے کس طرح درجہ بدرجہ آ رہے ہیں۔ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۶۴﴾ (4:64)۔ تیرے پاس خدا سے سامان حفاظت طلب کرنے آئے ہیں۔ تو وہ کتاب اللہ کو دیکھ کر اگر اس زیادتی میں معافی کی گنجائش ہوئی تو پھر یہ اپنے خدا کو تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۶۴﴾ (4:64) پائیں گے۔ کیا شاندار تعلق ہے افراد کا اس نظام سے اور اس نظام کا خدا سے۔ اب اگلی آیت اسلامی نظام کی بنیاد ہے۔ یعنی قانون خداوندی کو نافذ کیا جائے چلو قرآن ہی کا نفاذ ہو جاتا ہے اور ان قوانین کے مطابق لوگ بھی چلیں۔ آج بھی کئی قوانین جن کے مطابق لوگ چلتے ہیں۔ مانتے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو شریعہ کے مطابق ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا۔ فریب دہی کی سزا۔ اب اہم سوال یہ ہے کہ کیا قوانین کے نافذ ہونے کے بعد لوگوں نے اس پر چلنا شروع کر دیا تو پھر یہ نتائج دے گا؟ یہ ہے اہم سوال۔

مگر قرآن قوانین کے نفاذ کے باوجود ایک اہم شق جس کی تکمیل ضروری ہے:

صرف قانون کے نفاذ سے حکومت خداوندی قائم نہیں ہو سکتی۔ تو قرآن اس تصور سے آگے جاتا ہے یہ ہے وہ بنیادی شق جس کی بنیاد پر اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ جھوٹ بولنا فریب کرنا۔ رشوت لینا اور حقوق غصب کر لینا قرآن کی رو سے جرائم نہیں ہیں۔ اس کے باوجود عمل نہیں ہو رہا ہے اور جہاں عمل ہو رہا ہے مگر اس قانون کی اطاعت کے باوجود تبدیلی نہیں آ رہی ہے یہ لرزہ طاری کرنے والی آیت ہے فَلَا وَرَبِّكَ (4:65) بالکل ایسا نہیں۔ قطعاً نہیں! تیرا خدا اس پر شاہد ہے۔ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (4:65)۔ یہ قطعاً ایمان والے نہیں ہو سکتے۔ آگے دو شرائط ہیں: حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ (4:65)۔ تا آنکہ اپنے ہر معاملہ میں تجھ سے فیصلہ نہ کرائیں۔ اب پہلی بات تیرے پاس آ کر فیصلہ لیں۔ فیصلہ مل گیا۔

دوسری بنیادی شرط کہ دل میں کسی قسم کی گرانی بھی محسوس نہ کریں۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ (4:65)۔ اور کیفیت یہ ہو کہ اس فیصلہ کے خلاف دل میں ذرا سی گرانی محسوس نہ کریں یہ ہے بنیاد وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ﴿۶۵﴾ (4:65)۔ اور اس کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کر لیں۔ اطاعت کریں یہ وہی اَنۡفُسِهِمۡ (4:63) ہے۔ جو قُلۡ لَّهُمۡ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَوۡلًاۢ بَلِيۡغًا ﴿۶۳﴾ (4:63)۔ ملاحظہ کریں۔ قرآن کی رو سے اطاعت ظاہرداری پابندی کا نام نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی نظام نیت اور ارادہ نہیں دیکھتا۔ ساری دنیا کے قوانین اور عدالتیں ظواہر پر چلتی ہیں اور جو قانون کا پابند ہو۔ اس سے تعرض نہیں کیا جاتا۔ جب کہ

1043
قرآن تو آگے جا رہا ہے کہ اطاعت ایسی کہ دل میں بھی اس کے خلاف گرانی تک محسوس نہ ہو۔ جب قلب میں یہ تغیر آ جائے تو اس سے ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ فِيٓ اَنْفُسِهِمْ (4:65)۔ یہ کہ دل کی تبدیلی۔ نفسیاتی تبدیلی یہ ہے اصل چیز یہ ہے بنیاد۔ ساری قوم چیخ رہی ہے کہ خدا کے لیے اخلاق درست کرو۔ زندگیوں کو درست کرو۔ اسلام کے قالب میں ڈھل جاؤ۔ یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی طرف سے ملنے والی سکینت، مؤدّت، رحمت ہی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرسکتی ہے:

اس کی وجہ کیا ہے؟ کبھی قانون کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ تاوقتیکہ انسانی نفسیات نہ بدل جائے۔ اس کے قلب و دماغ میں تبدیلی نہ آ جائے۔ قرآن کی تعلیمات قلب و نگاہ میں تبدیلی کا پروگرام ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (13:11) قوم کی حالت میکینکل چیزوں سے نہیں بدلی جاتی۔ اس کی حالت نفسیاتی تغیر سے بدلتی ہے۔ دل و نگاہ کی تبدیلی سے بدلتی ہے کہ قانون کے مطابق چلنے میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ کتنی ہی صعوبت اور تکلیف برداشت کرنی پڑے۔ مگر دل میں اس کے خلاف ذرا بھر گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ ہوگی قلب و نگاہ کی تبدیلی سے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (4:65)۔ تیرے اللہ کی قسم یہ کبھی بھی ایمان والے نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ قانون کی اطاعت اس طرح سے کریں کہ اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ ہے ایمان کا درجہ۔ جو بدوؤں سے کہا گیا تھا۔ اسلام لانے سے یہ ایمان والے نہیں ہو گئے ہیں کیونکہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ (49:14) یہ تو دل میں اترنے کی بات ہے۔ یہ نفسیاتی، قلب و نگاہ کا تغیر ہے، اگر نظام کی عمارت اس بنیاد پر اٹھتی ہے تو اسے اسلامی نظام کہہ سکتے ہیں۔ پھر کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جنگل کی تنہائیوں میں بھی کسی سے کوئی لغزش ہو گئی ہے۔ جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ تو وہ روتا ہوا عدالت کے اندر آ کر اپنی لغزش کی سزا طلب کرتا ہے۔ کوئی گواہ نہیں اس کی گرفت میں تم نہیں آ سکتے۔ کہا نہیں! میرا قلب اس کے لیے مجھے ڈس رہا ہے۔ مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ یہ ہے اسلامی نظام کی بنیاد۔ یہ نہ تو خالی قانون سازی کا معاملہ ہے اور نہ ہی اس کی تنفیذ کا۔ یہ تو نگاہ کی تبدیلی کا معاملہ ہے۔ یہ تھا پروگرام رسول ﷺ کا جو نگاہ کی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (2:129)۔ قانون کے ساتھ اس کی غرض و غایت بتانا۔ پھر وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ (2:129) انہی کی ذات کی نشوونما۔ قلب و نگاہ کی تبدیلی۔

❁❁❁

مبلّغ کا کام مؤدّت، رحمت، سکنیت (Affection)

اصل میں یہ لوگ اپنے دور کے سائیکالوجسٹ تھے۔ انہوں نے سائیکالوجی سے کام لیا اور بعد میں اس کا ڈھانچہ رہ گیا۔ رسم اذاں رہ گئی۔ روحِ بلالی نہ رہی۔ ڈھانچہ کی اطاعت تو ایک میکانکی اطاعت ہے تو اس سے تو نقصانات ہوتے ہیں۔ اب یہ موجودہ دور میں سائیکالوجی یا تحلیل نفسی (Pyscho-analysts) اعصابی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ اور یہ تمام بیماریاں دل کی بیماریاں ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کو ہوتی ہیں جن کو بچپن میں والدین کی طرف سے Affection یعنی مؤدت، محبت، شفقت، نہ ملے تو اس کی شخصیت میں کرختگی (Rigidity) پیدا ہو جاتی ہے۔ پیار و محبت نہ ملنے سے اس کی ذات میں خلا رہ جاتا ہے۔ یہ عربی میں اس کے لیے 'رحمت'' کا لفظ لائے تھے۔ رحمِ مادر میں جس لوچ سے بچہ پرورش پاتا ہے۔ اس کی مثال ہی کوئی اور نہیں دی جا سکتی۔ یہ شفقت، یہ پیار وہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ماں اس کو اپنے جسم کا حصہ اندر ہی اندر دیئے چلے جا رہی ہے اور اس قدر لوچ کہ اس میں بچہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ پھر پیدائش کے بعد جس محبت اور شفقت سے ماں اس کی پرورش کرتی ہے۔ اس دودھ میں ماں کی محبت کے چشمے بھی ہوتے ہیں مگر بوتل والا بچہ اس محبت سے محروم ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے کپڑے، اعلیٰ سکول، لیکن ماں اپنے کاموں میں مگن بچہ سے لاپرواہ۔ پرورش اور تربیت ان بوتلوں اور نرسریوں میں ہوتی ہے۔ اگر چہ وہ نظم وضبط کا پابند ہوتا ہے مگر وہ ایک بڑی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس میں خلا پیدا ہو جاتا ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ پھر اس میں سوچ کی بجائے تنگ نظری، حسد، رقابت، سب کچھ سمیٹنے کی قوت، انتقام، جھپٹ، بھائی بہن کا آپس میں لڑنا، نہ مؤدت، نہ اخوت، نہ سکنیت کا جذبہ۔ سارے رشتہ میکانکی، اور رشتہ بھی احتیاج کا۔ جب ضرورت ہٹ گئی تو وہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اصل میں نفسیات یہ کہتی ہے کہ یہ خلا محبت اور پیار سے بھرنا تھا پر اس کا علاج محبت اور پیار سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ رسول ﷺ کی ہستی ان الجھنوں کا علاج، مؤدت وشفقت ورحمت سے کرتی ہے۔ وَيُزَكِّيهِمْ ط (2:129)۔ وہ ان کی ذات کی نشوونما کرتا ہے۔ اس کا فریضہ صرف خدا کا پیغام پہنچانا نہیں ہے جو چیزیں ماں باپ نے دینی تھیں تو رسول ﷺ ان کو دیتا ہے کہا۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ (3:159) رحمت، محبت، مؤدت وشفقت یعنی صحیح لفظ ماں سے جو محبت بچہ کو ملتی ہے۔ یہ خدا چاہتا تھا اس وجہ سے یہ کہ لِنتَ لَهُمْ ج (3:159)۔ جس کی وجہ سے آپ ﷺ میں یہ سوچ ہے۔ گداز و نرمی ہے۔ نبی ﷺ کی طرف سے ملنے والی یہ مؤدت، شفقت میں ایک عظیم ہستی ہے۔ یہ رحم مادر جیسا نرم و ملائم

قالب دنیا میں کہیں نہیں مل سکتا۔ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ (3:159) کہ تیری ان کے بارے میں اس قدر ملائم سوچ ہے۔ یہ خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪ (3:159)۔ اگر کرختگی ہوتی تو یہ سب بھاگ جاتے جس طرح جس دن محتاجی ختم ہوئی، بچہ سخت گیر باپ سے بھاگ جاتا ہے کیونکہ وہاں سوچ کا فقدان ہے۔ پہلا فریضہ رسول ﷺ باپ کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔ یہ بنیاد ہے کہ ان کی نفسیاتی تربیت کی اور پھر وہ یہ ہے نظام جس میں افراد دل میں گیرائی تک محسوس نہ کریں۔

دل کو گرمانے والی درخشندہ قرآنی مثال:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (9:128) یعنی تمہاری جانوں سے مرتب ہوکر یہ رسول آیا ہے۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (9:128)۔ تمہاری ذراسی تکلیف سے اس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ ماں جب بچہ پیشاب کرے بستر پر سردیوں میں تو خود اس کی جگہ پر آجاتی ہے بلکہ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ (9:128)۔ للچائی ہوئی ماں کی طرح بڑا ہی لالچی۔ تمہارے قلب ونگاہ کے لیے جو چیز میسر آئے تو لے آتا ہے۔ آگے ہے بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (9:128)۔ یہ دونوں صفات خدا کی ہیں جو رسول کے لیے بتادیں۔ خدا کی رافت ورحمت تو رزق بکھیر دیا۔ رہنمائی دے دی یہ تو اس حد تک تھیں۔ اب عملی طور پر ان صفات کو یہ رسول اجاگر کر رہا ہے۔ تغیر نفس کے ضمن میں رحمت ورافت کے الفاظ کا یہ مفہوم جس پر یہ سائیکالوجسٹ آج پہنچا ہے۔ یہ Affection یہ ہیں۔ رافت ورحمت یعنی مؤدت وشفقت، رحمت وسکنیت۔ نرمی، لوچ، لچک، ہر ضرورت کے مطابق چیز کو دے دینا۔ رافت یوں دینا کہ اسے گراں نہ گزرے یہ ہو رہی ہے نفسیاتی تربیت عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (9:128)۔ یہ تمام نفسیات دان ان بیماریوں کا علاج اس سے کر رہے ہیں یعنی جو خلا رہ گیا ہے وہ اس روّف رحیم کے طریقہ سے یہ ہوسکتا ہے۔ جو انسان کسی کے لیے جتنا حریص ہوگا۔ یہ دل سے امڈتی ہے۔ وہ اتنا باوقار اور مطمئن ہوگا۔ جب تربیت دینے والا، ان کی ذراسی تکلیف ان کو بے چین کردے۔ ماں کی طرح حریص کے یہ بھی لے لوں اور یہ بھی لے لوں تو پھر ان کا ردّ عمل بھی تو شاندار ہوگا۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (33:6) یہ نبی ان کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہوگیا ہے۔ یہ ہیں رشتے۔ آج تو ہر ایک شاکی ہے۔ بچے سرکش، گھر میں نہ ادب، نہ قانون، نہ احترام، نہ بھائی بہن کی محبت، چار سو فساد ہی فساد۔ اب اس کا نتیجہ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (4:65)۔ تو پھر کبیدگی کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟

ازواجِ مطہرات کا تربیت میں عمل دخل اوران کا مقامِ بلند:

وَ اَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ (33:6)۔ ان کی حیثیت ماں جیسی ہے سارے مسلمانوں کے لیے۔ اسلام ایک زوجہ کے سواہر بیٹی اور ہر عورت کا مقام بطور ماں تصور کرتا ہے۔ مرد کو بھی تربیت کے لیے ماں بننا پڑے گا۔ تو عورت بھی اس فریضہ کے لیے ماں بن کر ہی یہ کردار ادا کرسکتی ہے۔ اسلام کی ہر بیٹی اور عورت اس معاشرے میں ماں بن کر کھڑی ہوجائے۔ ماں کے مقام میں خلا

1043 بھرنے کی ساری اشیاء آ گئیں۔ یہ ہے نفسیاتی تغیر جو نبی پیدا کرتا ہے۔ اب ہر وہ شخص جو اس نظام کے لیے اُٹھتا ہے۔ اس کو قائم کرتا ہے۔ اس کا سر براہ بنتا ہے تو اس کی یہ کیفیت ہو گی تو اس کا ردِّعمل بھی یہی ہوگا۔ رافت و رحمت والا تو جزا تو ایک طرف شکریہ تک کا متمنی نہیں ہوتا۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴿۹﴾ (76:9) رسول ﷺ کو کہا گیا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ (9:103)۔ ان کو شاباش دو، حوصلہ افزائی کرو۔ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ (9:103) تیری حوصلہ افزائی ان میں اضطراب دور کر کے سکون پیدا کر دے گی۔

نگاہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

اس کے برعکس یہ تمام پارلیمان، صدارتی نظام، ایسا ہونا چاہیے کہ قرآن وسنت پر مبنی ہو تو یاد رکھو کہ یہ بنیاد نہیں ہے۔ یہ سب مکینیکل ہوگا۔ ہمارے ہاں 75% قوانین وہی ہیں جو قرآن اور شریعت نے دیئے ہیں۔ پھر یہ دگرگوں حالت کیوں ہے۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے

شبِ برأت کی حقیقت ’’ابو مسلم خراسانی‘‘
قرآن پر تدّبر نہ کرنا ارتداد

ایران والوں کی نہ تو قلب ونگاہ کی ٹریننگ ہوئی جب کہ عرب بڑی سادہ سی قوم تھی۔ انہوں نے اسلام کو قلب ونگاہ کی تبدیلی کے ساتھ قبول کیا تھا۔ وہ زیادہ تصوراتی یا نظریاتی قوم تھی ہی نہیں جب کہ ایرانیوں نے شبا شب Overnightly اسلام قبول کیا تھا۔ یہ ہندو جب مسلمان ہوئے چھینک آتی تو جے نندی کہتے۔ جب کہا کہ الحمدللہ کہو۔ تو جواب دیتے کہ یہ ’’جے نندی جو نسلوں کی گھسی ہوئی ہے۔ وہ نکلے ہی نکلے گی۔ اور جو رحیم ہے وہ گھستا ہی گھسے گا۔ اس میں کچھ وقت تو چاہیے۔ ایرانیوں کے ساتھ یہ پوشیدہ جے نندیاں ساتھ لائے تھے۔ علم وفضل اور تہذیب وتمدن میں یہ سادہ عربوں سے کہیں آگے تھے۔ انہوں نے شہروں میں آکر ان عربوں سے فلسفیانہ بحثیں چھیڑ دیں کہ اگر خدا قادر مطلق ہے تو پھر ہر بات اس کی مرضی سے ہوتی ہے تو پھر انسان کو جزا وسزا کا مستحق کیوں گردانا گیا ہے۔ تو اس کا تو ہر فعل خدا کے مطابق ہوگا۔ اس کے حکم کے بغیر تو پتہ تک نہیں ہل سکتا۔ یہ سادہ لوح عرب ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ اس طرح سے یہ شکوک وشبہات کے کانٹے بوتے گئے۔ اس طرح سے ریل جو دوسری پٹڑی پر پڑی تو پھر ادھر ہی چلی گئی۔ شب برأت کو ہمارے ہاں بھی مبارک رات سمجھا جاتا ہے۔ روایات ہیں اس پر۔ جیسے بادشاہ اپنی سالگروں پر قیدیوں کو چھوڑتے تھے روایات میں آیا ہے کہ اس رات خدا لاکھوں جہنمیوں کو آزاد کر دیتا ہے۔ وہی ملوکیت کا تصور، برات فارسی کا لفظ ہے یعنی گناہوں سے آزادی‘‘ یہ مجوسی تہوار تھا اور جب برامکیوں کے ہاتھ اقتدار آیا تو انہوں نے اسے شروع کیا کہ سال بھر ہونے والے تمام فیصلے اس رات کو ہوجاتے ہیں جس کا پتہ کٹنا ہوتا ہے۔ وہ درخت سے کٹ جاتا ہے۔ ہر بات کے فیصلے اس رات کو ہوجاتے ہیں۔ وہی جبر کا عقیدہ، صاحبِ اختیار تو رہے نہیں آپ اس عقیدے سے۔ انہوں نے یہ تہوار شروع کیا۔ آتش بازی شروع ہوئی کیونکہ مجوسی قوم آتش پرست تھی۔ اس طرح سے یہ جبر کا عقیدہ جزو ایمان بنا دیا گیا۔

ابو مسلم خراسانی:

اس کا نام ابراہیم بن عثمان بن بشار تھا۔ ایرانی النسل اور بزرجمہر کی اولاد تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا اور کوفہ میں ابتدائی

پرورش پائی۔ انتہائی ذہین اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک۔ پروپیگنڈہ میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اسی نے اہل بیت کے نام سے اس قدر شدید پروپیگنڈہ کیا کہ امیہ کی سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ ابومسلم ایرانی سلطنت کے احیا کا عزم لے کر آیا تھا۔ یہ اپنے اس ارادے میں کامیاب تو نہ ہوسکا تو اس کے بعد پورا ایک خاندان اس کے احیا کا عزم لے کر عباسیوں کے ہاں آ گیا۔ یہ خاندان بھی ایرانی سلطنت کو زندہ تو نہ کرسکا مگر اس نے اس عظیم سلطنت عباسیہ میں نہ اسلام رہنے دیا اور نہ عربیت۔ دونوں کی جگہ عجمیت نے لے لی اور یہ ایرانی سازش کی بڑی نمایاں کامیابی تھی۔ یہ خاندان تاریخ میں برامکہ کے نام سے مشہور ہے۔ برامکہ کے لقب کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے مگر اکثریت کا خیال ہے کہ اس کی اصلیت ''برماگاہ'' ہے۔ یعنی ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدہ کا اعلیٰ ترین متولی یا پجاری۔ اس مندر میں چاند کے دیوتا کا مجسمہ نصب تھا اور نوبہار کہلاتا تھا۔ برامکیوں کا جدِّ امجد جاماسپ بن یشتاسپ تھا۔ جو گشتاسپ کے زمانہ میں نوبہار کا پہلا مؤید مقرر ہوا اور اس کے صلہ میں اسے پوری سلطنت کا موید موبداں (قاضی القضا) بھی بنادیا گیا۔

ہم یہ پہلے عباسی خلیفہ عبداللہ بن محمد بن علی (136-132ھ) ملقب بہ سفاح کے دربار میں خالد برمکی کو ایک نہایت بلند ترین منصب پر فائز دیکھتے ہیں۔

اس طرح سے یہ اپنے عقائد کو اسلام کا جزو بناتے گئے۔ مثلاً تقدیر کا عقیدہ اس قدر واضح آیات کے باوجود وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ‌ ؕ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَۤاءِ الۡقَوۡمِ لَا يَكَادُوۡنَ يَفۡقَهُوۡنَ حَدِيۡثًا ﴿۷۸﴾ (4:78) انسانیت کا آغاز اختیار وارادہ کے تحت اپنی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے ہوتا ہے جب کہ مجبوری اور اختیار سے محرومی تو حیوانات ونباتات کا شیوہ ہے تو اس طرح ذمہ داری سے فرار تو حیوانی سطح پر آ جانا ہے۔ کائنات کا ہر واقعہ خدا کے قانون علت ومعلول کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اگر قانون کے مطابق کرو خوشگواریاں اور اس کے خلاف مرضی سے کرلیا تو تباہیاں اور نقصانات۔ خدا تو خدا ہے جب کہ اس کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی سے مصائب آتے ہیں اور یہ مصائب اس لیے آتے ہیں کہ اس کے قانون کی روشنی میں نہیں کیا۔ خدا کی مرضی، چاہنا، اذن، وعدہ، قول سے مراد اس کا غیر متبدل قانون ہے۔

ایک دوسری جگہ ان کفار کا قول ہے۔ سَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكۡنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَىۡءٍ‌ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ حَتّٰى ذَاقُوۡا بَاۡسَنَا‌ ؕ (6:148) وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ ‌ۖ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۴۷﴾ (36:47)

دوسری جگہ ہے: وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ (42:30)

اس لیے تو سب سے بڑا چیلنج اس کتاب کا منجانب اللہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ‌ ؕ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا ﴿۸۲﴾ (4:82)

اس تدبر کے اندر یہ راز پنہاں ہے۔ اس کا مادہ ''دب ر'' ہے۔ معنی پیٹھ۔ جانور کا آخری حصہ۔ کسی بات کے آخری مقام کو سامنے رکھ کر اس کے لیے کوئی پروگرام وضع کرنا۔ نتائج، عواقب اور انجام کو پیش نظر رکھنا۔ کس تعلیم کو اس کے نتائج کے اعتبار سے دیکھنا کہ اس میں اختلاف نہ ہو جائے۔ ''دبر کے معنی پیچھے پیچھے چلنا'' پہلی چیز اس پر غور وفکر کرنے والے کو اس کے پیچھے پیچھے چلنا ہوگا۔ قرآن سے آگے نہیں چلنا کہ اس کو پیچھے لگائے۔ کہ پہلے سے خیال جما کر پھر یہ ڈھونڈنا شروع کر دے کہ اس کی تائید قرآن میں کہاں ملتی ہے۔ یہ تو قرآن کو پیچھے لگانے والی بات ہوگی۔ غور وفکر کے ساتھ اس کے پیچھے چلو گے تو نتائج۔ تعلیمات میں وحدت ملے گی۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (47:24) خود اپنا ہی تالا۔ مرتد وہ ہیں جو قرآن پر تدبر نہ کریں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾ (47:25) خوشنمایاں اور فریب انگیز امیدیں ارتداد یعنی دین سے پھر جانا ''مرتد ہو جانا، یہ لوگ پیٹھ پیچھے پھر جاتے ہیں۔ ان کے ہاں اس کی سزا قتل ہے۔ یعنی قرآن پر تدبر نہ کرنا یا ایسا تدبر جس سے اس کی تعلیمات میں اختلافات پیدا ہو جائیں تو قرآن کی رو سے ایسی قوم مرتد ہے۔ اب یہ قوم مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتی ہے اور فرقے بھی بنائے ہوئے ہیں۔ ان سب میں اختلاف ہے۔ یہ تو وحدت پیدا کرتا ہے۔ کوئی قوم بھی یہ فارمولہ استعمال کرے۔ سمندر میں، صحرا میں، اس کا نتیجہ ایک ہوگا۔ یہ ہے جسے ''Law of uniformity of nature'' (فطرت کا یکساں قانون) کہتے ہیں۔ گندم سے گندم نکلے گی۔ تدبر سے مراد یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ایک ہی نتیجہ نکلے گا۔ ساری کائنات اسی حقیقت کی شاہد ہے اگر یہ ہو جائے کہ گندم بویا تھا اور جو نکل آئے ہیں چنا نکل آیا کہیں پر۔ آگ پر پانی یہاں رکھا تو ابلنے لگا اور کہیں اور رکھا تو جم گیا تو زندگی کا کاروبار ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اسی لیے اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے نتائج میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ قوانین فطرت کی طرح بس قرآن کے بھی یہی نتائج ہوں گے۔ جو قرآن کو مانتے ہی نہیں ان کو چھوڑ دیں۔ جو قرآن کی مدعی ہے۔ اس میں اس قدر اختلاف تو اس سے غیر مسلم کس نتیجہ پر پہنچے گا۔ چونکہ وحدت نہیں مگر قرآن کا دعویٰ تو اپنی جگہ صحیح مگر یہ غلط ہیں۔ ہر ایک فرقہ اپنے اپنے قانون پر کاربند ہے۔ یہی تو شرک ہے۔

امّتِ واحدہ کا تصوّر تو مشرکین کے لیے زہر قاتل ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ (42:13) ایک ہی نظامِ زندگی تجویز کیا گیا نوح سے لے کر رسول ﷺ تک تاکہ وحدت ہو۔ اختلافات مٹ جائیں اب یہاں اختلاف چاہنے والوں کو مشرک کہا گیا ہے یہی چیز وحدت ایمان کے لیے دوسری جگہ کہی گئی۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ (30:31-32) یہی لوگ ہیں جو وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ

عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ (3:105)۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ (3:106)۔ یہ ارتداد ہے۔ شرک ہے، کفر ہے، نتیجہ اس کی رسوائی اور ذات۔ قرآنی تعلیمات کا مقصد حقائق کو نکھار کر پیش کرنا ہے۔ جب کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾ (16:64)۔ تا کہ تمام چیزیں واضح ہو کر آ جائیں اور ان کے اختلافات مٹ جائیں۔ اِلَّا لِتُبَيِّنَ۔ مقصد ہی یہ ہے کہ یہ اختلافی معاملہ کو نکھار کر سامنے لے آئے۔ الگ کر دے۔ دوسری جگہ کہا: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (42:10) اب یا تو قرآن کا دعویٰ معاذ اللہ باطل ہے یا ان کا یہ دعوے کہ ہم نے قرآن سے فیصلہ لیا ہے۔ کبوتر کی طرح آنکھ بند کرنے کا نتیجہ تباہی و بربادی اور ذات و رسوائی ساری دنیا میں اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾ (85:12) قرآن کوئی نظری چیز نہیں ہے۔ عملی طریق سے ہی اس کے نتائج وحدت کے نکلتے تھے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ (4:59) فرقہ تو شرک ہے۔ اب جو امت فرقوں میں بٹ گئی تو قرآن نے تو ان سب کو مشرک قرار دیا ہے۔ ان کی کتاب کی طرف نسبت کرنا غلط ہے۔ اب دوسری اصطلاح سنت کی رہ گئی۔ تو رسول کی نسبت بھی۔ سنت بھی تو قرآن ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ (6:159)۔ تیرا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس چیز سے بھی امت میں تفرقہ پیدا ہوا تو وہ کفر ہو جاتا ہے چاہیے مسجد ہی کیوں نہ ہو۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (9:107) کیا تم اسے مسجد سمجھتے ہو۔ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (9:107)۔ یہ تو دین کے دشمنوں کی پناہ گاہ ہے۔ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ (9:108) بھلا ان پر کامرانیوں کی راہ کیسے کھل سکتی ہے؟ مرکز ٹوٹا۔ تو اپنے اپنے طور پر فرقے بن گئے۔ جس کی اجازت ہی قرآن نے نہیں دی۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰۗؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ (42:21)۔ یہ مختلف راستے تو بارگاہ خداوندی میں قبول نہیں ہو سکتے۔ یہ تمام فرقے قرآن مجید کے ساتھ کچھ اور شامل کرنے سے وجود میں آتے ہیں۔ اسی اور یجنل پروگرام کی طرف آئیں۔ ایک اتھارٹی اور ایک ضابطہ۔ پھر ملاحظہ کریں قرآن کا دعویٰ کیسے حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ہر فیصلہ قرآن سے لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ نہ ملائیں یہ ہے وہ طریق فرقوں کو مٹانے کا یہ عقیدہ تو ہے ہی۔ عَقَدَ سے جس کے معنی ہیں گانٹھ دے لینا۔ پھر ہر گروہ اس گرہ کو باندھنا شروع کرتا ہے۔ جب یہ گانٹھ عقیدہ بن جاتی ہے تو الگ الگ فرقے وجود میں آتے ہیں۔

اس کا واحد حل مرکزی اتھارٹی ہے اور اس کا قانون قرآن ہو اور تمام اختلافات اس مرکز کو ریفر کر دیں۔ پھر وہاں سے جو فیصلہ ہو تو اس کے خلاف گرانی تک محسوس نہ کریں۔ یا پھر یورپ والا کام کرو کہ پیشوائیت کو گرجوں میں محدود کر دیا اور حکومتی معاملات میں اجازت نہیں دی۔ تو دنیا کے اندر ترقی و کامرانی دنیا کی حد تک تو حاصل کر لی، آدم کا مقام تو مل گیا۔

نظامِ حکومت میں ذمہ داری کا تعیّن اور جنگ کی شرائط

ایک تو مدافعانہ جنگ (Defensive) کی اجازت ہے۔ جب مخالفین کسی بھی صورت چین سے بیٹھنے نہ دیں۔ دوسرا سورہ النساء میں مظلوم مدد کے لیے پکاریں تو ظالم کی گردن جھکانے کے لیے جنگ کی اجازت ہے۔ دنیا کی تمام پرستش گاہوں کی حفاظت کرنا ہے اگر کوئی کسی کی مذہبی آزادی سلب کرنے کی کوشش کرے تو وہاں ان کی حفاظت میں جان تک دیدو تا کہ ان بت کدوں کی حفاظت ہوسکے۔ یہ ہے جنگ فی سبیل اللہ۔ اور جب بھی کوئی معاملہ سامنے آئے تو اسے مجاز اتھارٹی کی طرف ریفر کرو تا کہ وہ اس کی چھان بین کرسکیں۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ (4:84) یعنی یہ جنگ مدافعت اور مظلوموں کی مدد کے لیے ہوگی۔ آگے اس آیت میں ہے۔ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ (4:84)۔ جہاں تک ذمہ داری کا تعلق ہے وہ صرف تمہاری ہوگی۔ انفرادی ذمہ داری۔ تُكَلَّفُ (4:84)۔ ایسی ذمہ داری جو گرانبار اور پُرمشقت ہو۔ واحد کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ ذمہ داری ذاتی طور پر صرف تجھ پر عائد ہوتی ہے۔ یعنی انفرادی ذمہ داری (Individual Responsibility) یہ ہے اہم شق۔ دورِ حاضر میں جمہوریت یا مملکت کے نظام میں کسی فرد کی ذمہ داری کو متعین ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تک کہ اربابِ نظم ونسق بھی ذمہ داری لینے سے کترائیں گے اور ساری خرابی کی ذمہ داری ریاستی مشنری پر ڈال دیتے ہیں۔ گویا یہ باہر ہیں اور مشینری کہیں اور ہے۔ میں تو اس کا ذمہ دار نہیں ہوں، یہ تو حکومت کا فیصلہ ہے۔ ہر کوئی حکومت کو کوستا ہے۔ یہ ہے بنیادی نقص اس مغربی جمہوری نظام کا۔ کہ کس خاص فرد پر یہ ذمہ داری ڈالی بھی نہیں جاسکتی اور نہ ہی کوئی اس ذمہ داری کو قبول کرے گا۔ اور ذمہ داری کا تعین ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس میں یہاں سے وہاں تک ایک سلسلہ اور جال پھیلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاح ناممکن ہے۔ مجرم حکومت ہے جو ایک (Abstract) غیر محسوس چیز کا نام ہے۔ اب قرآن کہہ رہا ہے۔ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ (4:84) جس طرح جی چاہے ہم تم سے پوچھیں گے۔ بظاہر تو یہ معنی ہیں مگر بات اس سے زیادہ گہری ہے۔ حالانکہ اس میں تو مشاورت سے فیصلے ہوں گے اور ساری جماعت ان فیصلوں کی ذمہ دار ہوگی مگر جماعت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ تیری ذمہ داری ہے۔ ہم تم سے پوچھیں گے کہ تیرا کام یہ ہے۔ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (4:84) کہ تم

مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی کمزوریوں کو دُور کرتے جاؤ۔ تا کہ وہ مردانہ وار جہادِ زندگانی میں شریک ہو سکیں۔

حَرِّضْ کے معنی ہیں کمزوریوں کو دور کرنا۔ تمام کجیوں کو دُور کر کے نشوونما دینا۔ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ (2:129) تو ان کو قوانین کی تعلیم، ان کی غرض و غایت بتاتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ ہے ''حَرِّضْ'' یہ ذمہ داری تو تمہاری ہے اور ہم تم سے پوچھیں گے کہ ایسے وقت میں یہ کرنا حَرِّضْ تھا۔ کیوں نہیں کیا گیا۔

یعنی میں نے ان ساتھیوں کو رفاقت سے، تعاون سے یہ کرنا تھا مگر چونکہ ان میں یہ کمزوریاں کمیاں تھیں۔ اس لیے یہ نہیں ہو سکا۔ تم یہ بہانہ پیش نہیں کر سکتے۔ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (4:84)۔ ان کمزوریوں کو رفع کرنا تمہارا فریضہ ہے۔ کتنی گہری بات ہے۔ اس لیے ایک ایک لفظ کا دامن پکڑ لینا چاہیے۔ اگر تم نے یہ نظام قائم کر لیا تو عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ (4:84)۔ تو وقت دور نہیں جب ان کفار کی طرف سے پیدا کردہ مشکلات کی روک تھام ہو جائے گا تو ایسا انتظام ہو جائے گا کہ ان کی یورشوں، استبداد کی روک تھام ہو جائے گی۔ ملاحظہ کیا جنگ کا مقصود دوسروں کے استبداد کی روک تھام ہے۔ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا (4:84)۔ یہ نظام جو قائم ہو رہا ہے تو اس میں سب سے زیادہ قوت ہوگی۔ کس لیے؟ وَاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾ (4:84)۔ نَكَلَ۔ بیڑیاں ڈال کر، روکنا۔ تو یہ نظام ان کو اس استبداد سے روک دے گا۔ تو جنگ کا مقصد ظلم و ستم و استبداد کی روک تھام ہے۔

❁❁❁

مذہب اور دین میں فرق اور ہجرت کا مفہوم

جہاد صرف جنگ کا نام نہیں ہے یہ تو زندگی بھر کی جدوجہد کا نام ہے۔تگ وتاز، سعی وکاوش کا نام ہے۔ ہر حالت میں مومن کی زندگی پیہم جدوجہد کا نام ہے۔اسی پروگرام کی آخری کڑی قتال ہے۔یعنی جنگ، گویا جہاد میں قتال بھی شامل ہے۔قرآن نے دین کے دو اہم ستون جہاد اور ہجرت یعنی مجاہدین اور مہاجرین بتاتے ہیں۔اگر ان دو اصطلاحات کا مفہوم قرآن سے لیا جائے تو دین اور مذہب کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔پہلی چیز جدوجہد ہے۔مذہب میں اس کی کوئی خاص ضرورت ہی نہیں ہوتی۔کمرے میں آرام سے بیٹھ کر پرستش، بندگی، نماز، پوجا پاٹ کرلو۔اس میں کسی جہاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔نماز، روزہ، کچھ خیرات دیدیں تو اس میں جہاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔جدوجہد میں تو تمام موانعات، مخالفین، ان کے خلاف سینہ سپر ہونا پڑتا ہے۔

تصوف کا تصور جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر کا خودساختہ تصور:

شریعت میں تو چلو نماز پڑھنے کے لیے تو باہر آنا پڑتا ہے جب کہ تصوف میں اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔وہ تو حجروں، غاروں، خلوتوں، صحراؤں میں بیٹھے ہوئے الگ الگ کی جاتی ہے۔جتنا دنیا سے الگ اتنا قرب خداوندی، جب یہ چیز سامنے آئی تو انہوں نے یہ دو قسم کا تصور دیا۔شریعت میں جو کچھ کرنا پڑتا ہے خواہ جنگ ہی کیوں نہ ہو تو وہ جہادِ اصغر ہے۔جب کہ جہادِ اکبر نفس کشی کا نام ہے۔اس میں تو کسی کے ساتھ تزاحم، تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔وہ تو اس جنگ جُو کو ؎

اُو کُشتۂ دُشمن است، ایں کشتۂ دوست

ایک دوست کے ہاتھوں کا مارا ہوا اور دوسرا دشمن کے ہاتھوں کا مارا ہوا۔

دین میں تو باطل کے ہر نظام کو الٹ کر رکھ دینا ہوتا ہے اور اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنا ہے تو اس کے لیے کس قدر سعی و کاوش کی ضرورت پڑے گی۔یہی مسلسل جدوجہد جہاد کہلاتا ہے اور پھر اس کا آخری گوشہ میدان جنگ میں جا کر جان بھی قربان کرنی پڑتی ہے۔مذہب میں تو بڑے سے بڑا نام محض فریب نفس ہے۔جہاد اکبر یا اس سے بھی بڑا کوئی نام رکھ لیں۔ اَسۡمَآءٌ سَمَّيۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (53:23)۔اب یہ دین کی جدوجہد کسی خاص قطعہ زمین میں ہوگی۔سب سے پہلے اس کا آغاز تو وہیں پر شروع کردیں۔اگر حالات سازگار نہ ہوں تو پھر اس فضا کو چھوڑ کر دوسری سازگار فضا کی طرف سب کچھ گھر بار، مال و دولت،

زمین وجائیداد، وطن چھوڑ کر اس فضا میں چلا جانا یہ ہے ہجرت فی السبیل اللہ کہلاتی ہے۔ فی سبیل اللہ سے مراد انسانیت کے مفاد کے پیش نظر۔ اس سے مراد وہ تارک وطن نہیں جو صرف اپنے مفاد کے لیے دوسرے ممالک میں جا کر بس بھی جاتے ہیں اور آتے جاتے بھی رہتے ہیں۔ پہلا قدم تو السابقون الاولون کا ہے وہ جا کر اس سازگار فضا میں یہ نظام قائم کریں۔ اگر فضا واقعی سازگار ہے تو باقی لوگ بھی وہاں جا کر ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اگر کہیں نظام قائم ہو گیا ہے تو پھر ان لوگوں پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی ان کا دستِ بازو بنیں۔ یہ کوئی پوجا پاٹ تو نہیں ہے جہاں چاہا تو کر لی۔ یہ تو ایک نظام کے تحت زندگی گزارنے کا نام دین ہے۔ دین میں حالات کے مطابقت ہجرت کرنا لازم قرار دیا گیا ہے اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰٓـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ‌ؕ (4:97)۔ اب ان لوگوں پر ہجرت لازمی تھی مگر یہ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اور اپنی ذات کا نقصان کر رہے تھے، اگر اسی حالت میں موت آجائے تو کیا پھر موت کے فرشتے آ کر ان سے پوچھیں گے۔ کیوں تمہیں کیا ہو گیا تھا جو اس غیر خداوندی نظام میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ (4:97) جواب دیں گے کہ ہم تو اس قدر مجبور کر دیئے گئے تھے کہ اس ظالم نظام کو الٹ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے اس غیر خداوندی نظام میں محکوم ہو کر رہ گئے تھے۔ اب جواب ملے گا قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا‌ؕ (4:97)۔ چلو یہاں تو کمزور تھے تو کیا خدا کی زمین اس قدر وسیع نہیں تھی کہ تم وہاں جا کر صحیح نظام زندگی کے تحت زندگی گزارتے۔ تم سے یہ مواخذہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں کمزور تھے اور اس لیے تمہارے بس سے باہر تھے مگر فِيۡمَ كُنۡتُمۡ‌ؕ (4:97)۔ تم کو کیا ہو گیا تھا کہ یہاں سے ہجرت کر کے کشادہ اور سازگار حالات کی طرف چلے جاتے۔ دوسری جگہ ہے يٰعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِىۡ وَاسِعَةٌ فَاِيَّاىَ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾ (29:56)۔ عبادت کے مفہوم واضح ہو گئے۔ محکومیت، اطاعت نہ کہ پرستش، اب یہ پرستش تو ہر جگہ، غلامی میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے تو ایک خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ نماز، روزہ وحج وشخصی قوانین کی آزادی تو ملکہ وکٹوریہ (1819,1901) کے منشورِ عظیم (Magna Carta) میں بھی دی گئی تھی۔ عقائد وعبادات دونوں کی آزادی ہے۔ نظام خداوندی کے قیام کے لیے خطۂ زمین کا حصول لازمی شرط ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۖ (24:55) ایمان اور عمل صالحہ یا لازمی نتیجہ اس دنیا میں حکومت ہوگی۔ یہ ہے استخلاف فی الارض کا ہے۔ کے لیے وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِيۡنَهُمُ الَّذِى ارۡتَضٰى لَهُمۡ (24:55) تاکہ یہ منتخب شدہ نظام حیات کو تمکن مل جائے۔ اور وَلَيُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا‌ؕ (24:55)۔ یہ سارا کچھ کا ہے کے لیے ہے يَعۡبُدُوۡنَنِىۡ لَا يُشۡرِكُوۡنَ بِىۡ شَيۡـئًـا‌ؕ (24:55)۔ محکومیت صرف میری اور اس میں صرف قرآن کی حکومت۔ اس کا اطلاق صرف آزاد مملکت کے لیے ہے۔ وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰ لِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾ (24:55)۔ ایسا نظام ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد اس سے انکار کر دیں۔ تو یہ ہیں جو صحیح قالب سے نکل گئے ہیں اور یہ ہے وہ يَعۡبُدُوۡنَنِىۡ (24:55)۔ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾ (24:56) مسلم اور غیر مسلم میں فرق وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) ہم نے تو صلوٰۃ کے معنی نماز لے

لیا۔ عبادت کے معنی پرستش لے لیا۔ شعیب کے قوم نے کہا قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ (11:87)۔

ہجرت کا بنیادی مقصد باطل نظام کی جگہ حق کا نظام قائم کرنا ہے:

ہجرت کا مطلب باطل کی جگہ حق کا نظام تاکہ قرآنی نظام کے مطابق زندگی گزاری جائے۔ مسلمانوں سے کہا جارہا ہے اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً (4:97) تو جہاں حالات سازگار تھے وہاں کیوں نہیں چلے گئے۔ تو ان کا انجام جو ناتوانی کا سہارا لے کر غیر خداوندی نظام کے تحت زندگی گزاریں گے تو ٹھکانا جہنم ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾ (4:97)۔ طاغوتی نظام میں زندگی گزارنا تو صلاحتیں چل کر ختم ہوجاتی ہیں۔ غیر قرآنی نظام میں مومن کی زندگی تو جہنم کی زندگی ہے۔

غیر قرآنی معاشرہ میں مجبور لوگوں کے لیے انتظام کی نوعیت

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ (4:98)۔ مرد عورت اور بچے جو واقعی کمزور کردیئے گئے نہ پاسپورٹ نہ ویزا، کہ وہاں سے نکل سکیں۔ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ (4:99)۔ عنقریب ایسی صورت ہوگی کہ خود ان کی ذمہ داریوں سے آگے بڑھ جائے گا۔ يَّعْفُوَ (4:99) آگے بڑھنا اور کچھ اور حفاظت عطا کرنا۔ صرف معاف کرنا معنی نہیں ہوتے۔ اب یہاں الْمُسْتَضْعَفِيْنَ (4:97) کی دو کیٹیگیری ہیں ایک تو وہ کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی کہ اس نظام کو الٹ دیں۔ اور جانے کا راستہ بھی نہیں مل سکتا تو ان سے آگے بڑھا جاتا ہے۔ اور ان سے یہ نظام الٹنے کی بات نہیں کی جاتی۔

اب یہ مکہ کے مسلمان جو یہاں رہ گئے تھے اور جنہوں نے ہجرت کر کے وہاں نظام قائم کردیا تھا ان میں یہ قوت تھی اب خدا کی طرف سے ان مجبور لوگوں کی مدد کا طریق کار کے وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ (4:75) اب دوسرا راستہ قرآن نے دیا اور مدینہ والوں نے جا کر واقعی ان کے لیے راستہ پیدا کیا۔ قریش کی قوت کو توڑا تو وہ بھی اس مملکت اور نظام کے اندر شامل ہوگئے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا، ورنہ گلشن:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ (4:100) دوسری جگہ بہت سی پناہ گاہیں اور کشائش کی راہیں ملیں گی۔ یا ہے تو نکلو وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ (4:100) ان ہجرت اور ہجرت رسول اور اللہ کے لیے فرق ہوگیا۔ ایک تو اپنے مفادات کے لیے جس طرح کولمبس (1451-1506) کو پورا براعظم مل گیا۔ اس کے بعد یورپ کی تمام آبادیوں نے ہجرت کی۔ اور اب ساری دنیا میں پھیلتے چلے جا رہے ہیں پر یہ تو استعماریت قائم کرتے ہیں۔ قوموں کو محکوم رکھنا۔ سلب ونہب۔ ان کے وسائل پر قبضہ کرنا۔ لیکن ابتدا میں ان کو بھی

تکالیف سے گزرنا پڑتا ہے مگر قرآن والی ہجرت تو صرف انسانیت کے مفاد کے لیے ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت بطورِ اسوۂ حسنہ ہے:

نبی ﷺ اور ابراہیم علیہ السلام کو ہمارے لیے نمونہ قرار دیا ہے سب سے پہلے اپنے ہی وطن میں باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ پھر قوم کے ساتھ اور آخر میں بادشاہ سے ٹکرا گئے۔ کوشش کی مگر جب دیکھا کہ وہاں امکان نہیں ہے تو وہاں سے ہجرت کی: اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ (29:26) اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (37:99) جہاں نظام ربوبیت کے مقام کے امکانات زیادہ روشن ہیں جبکہ یہاں تو قرآن نے اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (4:100) کہہ دیا دونوں کہہ دیا کہ وہاں یہ نظام قائم ہو گیا تھا۔ یعنی خدا کے قوانین رسول ﷺ کی وساطت سے وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ (4:100) تو فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ (4:100)۔ اگر نظام کے مقام سے پہلے موت آ گئی تو اس کا معاوضہ اللہ پر واجب ہو گیا۔ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۰۰﴾ (4:100)۔ تو حفاظت اور سامان نشوونما بھی ملے گا۔

❁❁❁

آنے والے دور میں حلال وطیب کی وسعت اور تقاضے

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ (4:160)۔ یہودیوں کے جرائم کی وجہ سے ان کو ایک اور سزا جو ملی۔ حلال وطیب میں بعض چیزیں مثلاً ناخندار جانور اور گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام کر دی گئی۔ حَلَّلٌ سے مراد رسیاں کھول دینا آزاد کرنا، رسیاں کھول دینا، پابندیاں اٹھا دینا، اس کے برعکس حَرَامٌ (ح رم) کسی تک پہنچنے سے روک دینا۔ حفاظت پیدا کرنا۔ پابندی عائد کرنا، ممانعت عائد کرنا، ممانعت دو وجوہات سے۔ ایک تو کسی شے کی عزت وتکریم وتعظیم کی بناء پر اس تک ہاتھ بڑھانے سے کسی کو روک دینا۔ احترام کا مادہ بھی 'ح رم' سے ہے۔ لفظ حرام بھی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مسجد الحرام۔ محرم الحرام۔ حرمات کے چار ماہ احترام کی وجہ سے کسی چیز تک نہ آنے دینا۔ یا کوئی شے نفرت یا نقصان کا باعث ہو۔ ان میں سے کسی ایک وجہ سے 'کسی چیز کا روک دینا۔ نہ پہنچنے دینا' مثلاً ماں، بیٹی یا بہن سے نکاح حرام ہے۔ یہ حرمت ہے ان کے احترام کی وجہ سے۔ اور یہ شے کہ لحم خنزیر حرام ہے۔ یہ حرمت اس کے نقصان کی بنا پر ہے۔ نفرت کی بنا پر ہے۔ احترام کی بنا پر نہیں ہے۔ تو یہ حرام کا لفظ دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی دونوں معنوں میں احترام کے لیے اور حرام ہونے کے لیے بھی۔

اب یہودیوں پر ان کے جرائم کی سزا کی بناء پر حلال وطیب حرام قرار دیدی گئیں تھیں۔ روک دی گئیں تھیں۔ پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

قرآن نے انسان کو محض انسان ہونے کی وجہ سے واجب التکریم قرار دیا ہے وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) تو تکریم کا تقاضا ہے کہ وہ کسی غلامی اور محکومی میں نہ رہے۔ اس لیے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی پر از خود من مانی پابندیاں عائد کرے۔ پابندیاں عائد کرنے کا نام ہی تو غلامی ہوتا ہے۔ اور یہ دین کا نقطۂ ماسکہ ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۷۹﴾ (3:79) چاہے نبی کیوں نہ ہو وہ کسی کو محکوم بنالے۔ پابندیاں عائد کر دے۔ حریت انسانی کے لیے اس سے بڑا منشور انسان کے لیے نہیں آیا۔ اور ربانی بننے کے لیے اس کتاب کی رو سے جس کی تم تعلیم اور درس تدریس دیتے ہو۔ پابندی

1043
صرف وہ ہے جو قرآن نے عائد کی ہے۔ ہر انسان آزاد ہے مگر آزادی بلا پابندی سرکشی ہے۔ جس طرح سفر بلا تعین منزل آوارگی کہلاتا ہے۔ پابندی دو قسم کی ہے۔ ایک ڈاکٹر پرہیز کے لیے جو پابندی لگاتا ہے یہ پابندی حفاظت کے لیے ہے اور منفعت بخش ہے۔ ایسی پابندی کہ ٹریفک کے اصولوں کی پاسداری یا برسات کے موسم میں کھیرے نہ کھانا، یہ پابندی حفاظت کے لیے ہے۔ دو دن گوشت کا ناغہ تو یہ تمدنی پابندی ایک مصلحت کے تحت ہوتی ہے۔ اب یہ جو شرعی پابندیاں کہ فلاں فلاں چیز حرام ہے۔ یہ تو پوری قوم پر قیامت تک کے لیے حرام قرار دے رہا ہے۔ اس سے زیادہ بڑی غلامی اور کیا ہو سکتی ہے کہ کسی انسان کا فیصلہ قیامت تک لوگوں کو پابندی میں جکڑ کر رکھ دے۔ وہ اس کو ذرا بھی تبدیل نہ کر سکیں۔ اور اس سے انحراف کی سزا قیامت میں جہنم تجویز کیا جائے۔

قرآن نے دیگر مذاہب کے خلاف بالکل برعکس بات کی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴿۱۷۲﴾ (2:172)۔ تمام سامانِ زیست۔ رزق سارا حلال ہے۔ اگر تم نے صرف اس کی غلامی کا طوق ڈالا ہے اگر صرف اس کی محکومی کرنی ہے کسی اور کی محکومی میں نہ جکڑے جاؤ۔ صرف یہ اشیاء حرام قرار دی گئیں ہیں۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ (2:173) دوسری جگہ اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (6:145) بہتا ہوا لہو جو ذبح کرنے کے بعد بھی بعض جانوروں میں رہ جاتا ہے وہ بہتا ہوا لہو نہیں ہوتا اس لیے اس کی تخصیص کر دی۔ صرف تین طبعی اشیاء (1) مردار (2) بہتا ہوا لہو (3) خنزیر کا گوشت۔ اور چوتھی چیز کا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ (2:173)۔ جس کو اللہ کے سوا کسی اور طرف منسوب کر دیا جائے۔ اضطراری حالت میں حرام شے کے استعمال کی اجازت آگے اسی آیت میں فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ (6:145)۔ اضطراری کیفیت مگر سرکشی نہ ہو اور جس قدر ضرورت ہو اتنا لذت کے لیے نہیں۔ صرف چار چیزیں حرام ہیں اور یہی اس کے اندر استثناء ہے۔

اب کس تہدی سے، حتمی طور پر کہا جا رہا ہے کہ حلال و حرام کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ (6:145) یعنی جو چیز میری طرف وحی ہوئی ہے اس میں میں ان چار کے علاوہ کسی اور کو حرام نہیں پاتا، مردار، بہتا ہوا خون، لحم خنزیر۔ اور جو شے بھی جو خدا کے سوا کسی اور طرف منسوب کی جائے۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ (6:145)۔ وہیں اضطراری حالت میں اس قدر گنجائش رکھ دی ہے۔

چار چیزوں کے علاوہ کوئی شخص بھی کسی شے کو حرام قرار نہیں دے سکتا؟

اب صراحت کے ساتھ کہہ دیا گیا کہ وحی کی رو سے صرف یہ چار چیزیں حرام ہیں۔ اس کے بعد یہ کہہ دیا کہ خدا کے سوا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی شے کو کسی کے لیے حرام قرار دے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط (7:32) اب خدا نے خواہ کھانے پینے کی اشیاء ہوں یا زیب وزینت کی، حرام قرار نہیں دیا تو کون ہے جو ان کو حرام قرار دے اور یہ ہمارے احبار واحبان آ کر اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ کون ہے جو ان کو حرام کرے۔ اس نے تو چار چیزیں حرام کی ہیں مگر انہوں نے اس میں سینکڑوں چیزیں شامل کر دی ہیں۔ مَنْ حَرَّمَ (7:32)۔ کون حرام قرار دے سکتا ہے۔ جی ہم حرام قرار دیتے ہیں۔ کسی چیز کا کھانا نہ کھانا حلال چیزوں میں سے ہر انسان کی مرضی پر منحصر ہے۔ (66:1) میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہا يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ج (66:1)۔ اب آپ نے کوئی شے اپنے اوپر پابندی لگا دی تو بتا دیا گیا کہ چونکہ تم رسالت کے منصب پر ہو تو بعد میں یہ آنے والوں کے لیے شریعت بن جائے گا۔ جس طرح یعقوب علیہ السلام نے ناپسندیدگی کی وجہ سے کسی چیز کا ناپسند کیا تو یہودیوں نے اسے شریعت بنا لیا۔ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ط (3:93) جس طرح یعقوب علیہ السلام نے ناپسندیدگی کی وجہ سے چھوڑا تو یہودیوں نے اسے ابدی طور پر حرام سمجھ لیا اس طرح سے اے رسول ﷺ اگر آپ ﷺ نے بھی پابندی لگائی تو یہ شریعت بن جائے گی۔ اس لیے حرام وحلال کا مسئلہ خدا کے ہاں اس قدر اہم ہے کہ وہ کہتا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو حق حاصل نہیں کہ اس پر پابندی لگائے یا حرام قرار دے۔ اب ان چار چیزوں کے علاوہ کوئی اور شے قرآن نے حرام قرار نہیں دی۔

حَلٰلًا ساتھ طَيِّبًا کا اضافہ:

ضروری نہیں کہ ہر حلال شے کو ضرور کھایا جائے۔ اس لیے اس کے ساتھ طِيِّبًا کا اضافہ کیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡصلے (2:168) حلال کے ساتھ جو خوشگوار ہو۔ مزاج کے مطابق ہو۔ پسندیدہ ہو۔ تکلیف دہ نہ ہو، اب حلال میں سے اپنی چوائس ہے۔ بعض چیزیں مزاج کے اعتبار، طبع کے اعتبار سے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ بعض اشیاء کسی کے ذوق لطیف پر گراں گزرتی ہیں۔ بعض چیزیں غیر شعوری طور پر چڑھ جاتی ہے۔ لہو اور مردار تو ہر ایک پر آ گیا۔ اب جو بکرا ذبح کیا اللہ کے نام پر

حلال ہوا، بہتا ہوا لہو تو حرام ہے۔ مردار تو ویسے ہی حرام ہے۔ خنزیر کا تو نام بھی مسلمان نہیں سن سکتا۔ اب ان کے علاوہ جتنی حلال اشیاء مثلاً کتا، بلی، چھپکلیاں، گرگٹ، چوہے، ذہن میں بھی نہیں آ سکتا کہ یہ حلال ہیں۔ حالانکہ دیگر کچھ اقوام شوق سے کھاتی ہیں۔ ہم مزے سے گائے کا گوشت کھاتے ہیں مگر ہندوؤں کی طبیعت اس سے اِبا کرتی ہے۔ ان کے ہاں جینی تو گوشت کی شکل نہیں دیکھ سکتا۔ اب یہ معاشرے میں توارث سے چلا آ رہا ہے۔ اب ہمارے بچپن سے چوہیا، گرگٹ، چھپکلی، بلیاں کتے طیب نہیں رہے۔ طبعاً ان کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اب حلال کے ساتھ طیب بھی کہا ہے۔ ہوسکتا ہے کوہستان میں مسلمان قوم کے لیے کتا طیب ہو تو آپ اس کو ان کے لیے حرام قرار نہیں دے سکتے۔ کسی شے کے حلال ہونے اور طیب ہونے کا فرق ملاحظہ کر رہے ہیں۔ جس قوم میں کوئی شے طیب ہو تو قرآن نے اسے حرام قرار نہیں دیا۔ جنگ میں تو خچر، گھوڑے، گدھے ذبح کر کے کھائے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اگلی نسل کے لیے وہ چیز طیب ہو جائے۔ یہ طیب ہونا یا غیر طیب ہونا یہ تو انسان کا طبعی ری ایکشن ہے۔ اب یہ چار چیزیں تو ابدی طور پر حرام ہوگئیں باقی تمام حلال ہیں۔ اگر کوئی ان حلال اشیاء میں طیب سمجھے تو کھائے، طیب نہ ہو تو نہ کھائے۔

آنے والے دور میں حلال وطیب کی وسعت اور تقاضے:

یہ قرآن کا حلّت وحرمت کا بیان ایک عظیم چیز رکھتا ہے۔ کھلی ہوئی گنجائش دے دی گئی ہے۔ اس طرح سے حلال کی رسیاں کھولنا انسانیت پر ایک بڑا احسان ہے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ بہت سی چیزیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی ہیں۔ شاید ختم ہو جائیں۔ پھر یہ چیزیں کھانے پینے کے لیے باقی نہیں رہیں گی۔ وہ چیزیں باقی رہیں گی جن کو ہم نہیں کھاتے۔ جن قوموں نے اپنے اوپر پابندی عائد نہیں کی۔ وہ تو آسانی سے ان چیزوں کو کھائیں گی۔ گدھے، گھوڑے، خچر، کتے وغیرہ۔ اگر یہ پابندی خدا کی طرف سے عائد ہو جاتی تو اتنی چیزوں کے ختم ہونے کے بعد کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ اگر اضطراری حالت میں بھی وہ اشیاء کھانی پڑیں جو ہمارے ہاں طیب نہیں ہیں تو آہستہ آہستہ وہ ناگواریت مٹ جائے گی اور یہ تمام طیب میں آ جائیں گی۔ جن قوموں نے اپنے اوپر گوشت حرام کر دیا ہو تو وہ مقامات جہاں سبزیاں نہ ہوں بحر منجمد شمالی کے اندر، صحراؤں، سمندروں میں مہینوں، برسوں تک اگر رہنا پڑ گیا تو اس کا پتہ چلے گا کہ صرف تین چیزوں کو حرام قرار دے کر باقی تمام کو جو حلال قرار دینا ہے یہ انسانیت کے لیے کس قدر منفعت بخش امر ہے۔

ہمارے ہاں تو لمبی لمبی فہرستیں مرتب کی ہوئی ہیں مفتیان کرام نے قُلْ مَنْ حَرَّمَ (7:32) زینت کی چیزیں اور کھانے پینے کی۔ اب ان کے ہاں ریشم پہننا حرام، چاندی سونے کا زیور حرام، جنت مین تو یہ تمام چیزیں اطلس وریشم کے لباس، سونے اور چاندی کے برتن، گوشت ہی گوشت، سبزی کا تو ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ اناج کا، جب کہ یہ ان کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ یہ دھڑلے سے ان تمام چیزوں کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ یہودیوں پر تو ان کے جرائم کی وجہ سے بطور سزا عذاب دیا گیا فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ (4:160)۔ اب یہ ان حلال اشیاء کو مسلم امہ پر سزا کے طور پر حرام قرار دے رہے ہیں

1043
جب کہ قرآن نے تاکید کی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ (5:87) یہ تو حد سے گزر جانے والی بات ہوگی۔ کتنا تاکیدی حکم ہے فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ (16:114) شرط یہ ہے کہ ان کو وہی تسلم کرے گا جو صرف اللہ کی اطاعت پر ایمان رکھے۔ اس کی غلامی کرے۔ جو شے ہم نے حلال قرار دے دی ہے اسے حرام قرار نہ دینا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (16:116) فہرستیں نہ مرتب کر لینا۔ جو منہ میں آیا کہہ دیا کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے۔ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ؕ (16:116) یہودیوں پر ناخندار پرندے، گائے اور بکری کی چربی ان کے جرائم کی وجہ سے سزا کے طور پر حرام قرار دی گئی تھی۔ آپ کی شریعت میں سارے ناخندار پرندے حرام ہیں۔ یہودیوں پر دس چیزیں حرام قرار دی گئیں تھیں۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ (6:146) تمام ناخندار پرندے ان کے جرائم کی سزا کے طور پر، جب کہ ہم نے از خود اپنے اوپر ان سزاؤں کو وارد کر لیا ہے۔

بیان کردہ حرام چار چیزوں کو حرام قرار دینے کی وجۂ جواز

اس کیوں کا جواب قرآن نے خود دے دیا ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ کیوں کا جواب بصیرت، مشاہدہ، مطالعہ کے اوپر ہے کہ وہ ان کو اس کسوٹی پر پرکھے۔ اس ''کیوں'' کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اب ان تمام ڈاکٹرز جنہوں نے غذائیات، سائیکلوجسٹ، سوشیالوجسٹ، انتھروپالوجسٹ کو سامنے رکھیں۔ پوری انسانی تاریخ ملاحظہ کریں۔ جب سے یہ ہمارے سامنے آئی ہے کسی قوم کی تاریخ ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ مردار خور، خون پینے والا، خون آشام، یہ الفاظ ہر قوم، ہر زمانہ، ہر ملک، ہر تاریخ میں بڑی قابل نفرت قرار دی گئیں۔ جہاں بھی انسان ذرا تمدن کے دائرے میں آیا ہے۔ ان کی تاریخ میں یہ چیزیں قابل نفرت گردانی گئی ہیں۔ محاورے، تمثیلات اور تشبیہات انہی کے گرد ہوں گی۔ خنزیر کو ہمیشہ گالی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے پوری انسانی تاریخ میں یورپ والے ٹیبل پر سور کو کھا کر اور گالی بھی دے رہے ہوتے ہیں۔ یہویوں کے ہاں تو تھا ہی حرام، عیسائیوں کے ہاں بھی حرام تھا۔ یہودیوں سے نفرت کی بناء پر ان عیسائیوں نے سور کو حلال قرار دیا اور ختنہ کو ختم کر دیا۔ انجیل میں تو گالی ہے۔ انسانیت کا عالمگیر جذبہ ان چیزوں کے خلاف چلا آ رہا تھا۔ قرآن نے ان عالمگیر جذبات کا احترام کیا۔ جن کے خلاف طبع اباء کرتی ہے۔ اسے قرآن نے حرام قرار دیا۔ یہ اقدار مشترک، ہر جگہ، ہر زمانہ، ہر قوم میں مشترکاً قابل نفرت پائی جاتی ہیں۔

انسانی اختیار وارادہ کی نعمت ایک انمول گوہرِ تابدار ہے
ظالم کا حساب فوراً کیوں نہیں ہو جاتا

دنیا میں مستبد اور ظالم قوتیں اور بالادست افراد اس قدر مظالم ڈھاتے ہیں مگر کمزور اور مفلوج کچھ نہیں کر سکتا۔ تو یہ آسمانوں پر بیٹھا خدا کیا کرتا رہتا ہے۔ وہ بس دیکھتا رہتا ہے کہ مظلوموں پر قیامتیں ڈھاتے رہیں۔ اس کو چاہیے کہ ان کو روک دے۔ خدا کیوں ظالم کا ہاتھ ظلم سے پہلے پتھر کا نہیں بنا دیتا؟ تو مایوسی میں پھر ایسے خدا کو ماننے سے بھی انکار ہو جاتا ہے جو مدد کو نہیں آتا۔ یہ ہیں وہ سوالات جو ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔

یہ انسانی اختیار وارادہ ایک نعمتِ گوہر آبدار ہے: قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں مجبور پیدا کی گئی ہیں اور جس قانون کے تابع انہوں نے زندگی بسر کرنی ہے وہ ان کے اندر رکھ دی گئی ہیں جب کہ انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے اور اس کو رہنمائی دے دی گئی ہے۔ جی چاہے تو انفرادی یا اجتماعی طور پر بھی اس کے خلاف چلو یا اس کے مطابق چلو۔ یہ تمہارے اختیار وارادہ پر ہے جس قسم کی روش اختیار کرو گے تو اس قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ یہ ہے بہت بڑا انقلاب خارجی کائنات اور انسانی زندگی میں۔ اگر خدا مداخلت شروع کر دے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اختیار وارادہ سلب کر لیا۔ اور وہ انسان کو بھی مجبور کر دے کہ وہ بھی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً اس روش پر چلے جس پر تم چاہتے ہو کہ ان کو چلنا چاہیے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ظالم کے ہاتھ کو کوئی مافوق الفطرت قوت ظلم سے روک دے۔ مگر پھر یہ بات کسی ایک فرد یا معاشرے تک نہیں رہے گی بلکہ ساری نوع انسانی کو یوں پیدا کرنا ہوگا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہ کر سکے۔ اسے بھی دیگر چیزوں کی طرح خدا کی مرضی کے مطابق چلنا پڑے گا۔ تو کیا تم یہ پسند کرو گے تمہیں بھی پتھروں کی طرح مجبور کر دیا جاتا۔ حیوانات کی طرح ایک ڈگر پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا جاتا۔ اور اختیار کو سلب کر لیا جاتا۔ تو کوئی شکایت کنندہ اگر ٹھنڈے دل سے سوچے تو وہ سب یہ کہہ دے گا کہ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔ وہ یہی کہے گا کہ ظالم کا ہاتھ روک دینا چاہیے۔ اس کا ارادہ تو سلب کر لینا چاہیے تھا۔ سوال انفرادی تخصیص کا نہیں ہے کہ کسی کا ارادہ تو خدا سلب کر لے اور کسی کو صاحبِ اختیار رہنے دے۔ ایک نوع، ایک مخلوق کے لیے ایک ہی قانون کارفرما ہوگا۔ کوئی بھی نہیں چاہے

گا کہ یہ ارادہ سلب کرلیا جائے۔ یہ آزادی کی جدوجہد کا تو نام ہی حق خود ارادیت ہے۔ کس کے ارادے پر پابندی عائد کرنا ہی تو غلامی کہلاتا ہے۔ انسان کی ساری تاریخ یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے پر کس قسم کی پابندی گوارا نہیں کرتا۔ اس کے لیے لمبی لمبی جنگیں ہوتی ہیں۔ لوگ جان تک دیدیتے ہیں۔ حق خود ارادیت کہ میرے اختیار و ارادہ پر کوئی پابندی نہ لگائی۔ اگر کسی انسان کو کہہ دیا جائے کہ اب دو گھنٹوں کے لیے کمرے سے باہر نہیں جاسکتے تو انسان خارج سے یہ دباؤ برداشت نہیں کرسکتا۔ چھوٹے بچہ کو ذرا روک کر دیکھیں۔ ان میں بھی سرکشی کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ آزادی کا سلب کرنا تو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔

خارجی کائنات کی مانند انسان کو مجبور پیدا کرنا خدا کی مشیت میں نہیں تھا۔ جب باہر کی کائنات جو اس قدر اطمینان سے تعمیری نتائج کے لیے سرگرم عمل ہے تو ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ نوع انسانی کے لیے یہ شکل اختیار کیوں نہیں کی گئی۔ ان میں سے ہر ایک ایک ہی روش، ایک ہی ڈگر پر چلتے جاتا تو کیا یہ ہمارے لیے مشکل تھا۔ إِنْ يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا (4:133)۔ یہ ہماری مشیت میں اگر ہوتا تو انسان کی تخلیق بھی باقی چیزوں کی طرح ہوتی اور ہم اس کو صاحبِ اختیار و ارادہ ہی نہ پیدا کرتے۔ تو ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں ہے کہ اس قسم کی نوع کو مٹا کر دوسری قسم کی نوع کو پیدا کر دیا جائے مگر یہ ہماری مشیت میں نہیں تھا۔ وہ صرف عالم امر میں جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ (3:40) کسی کو اس میں دخل نہیں دینے دیتا مگر انسانوں کی دنیا میں عالم خلق میں اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (41:40) یہاں تمہاری مشیت چلتی ہے جو مرضی ہے کرو۔ وہاں تم دخل نہیں دے سکتے اور یہاں ہم دخل نہیں دیں گے۔ اگرچہ دے سکتے ہیں وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا (4:133) قَدِيْرًا۔ یعنی مسلسل قدرت رکھتے ہیں آج بھی ہے۔ خارجی کائنات کے پیمانے یہ ہیں کہ وہاں اختیار و ارادہ نہیں دیا جب کہ تمہارے سامنے دو امکانات ہیں۔ جو چاہے اختیار کرلو۔ یہ پیمانے ہم جب چاہیں مقرر کرسکتے ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے مگر مجبور نہیں ہے۔ اس نے اپنے اوپر خود پابندی عائد کردی ہے کہ عالم خلق میں وہ بھی ان قوانین میں مداخلت نہیں کرے گا۔ یہ اس کی مشیت نے طے کردیا ہے۔ اس لیے تمہاری مرضی کے مطابق تو وہ نہ کسی کا ارادہ سلب کرتا ہے۔

نہ دخیل ہوتا ہے۔ اب اس آیت میں فوراً ارادہ کی بات آ گئی۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا (4:134) تم تو قریبی مفاد کی طرف کے لیے ہو۔ آؤ تمہیں ایسا نظام دیں یہ پیش یا مفاد بھی حاصل ہوجائے گا اور مستقبل کا بھی۔ اب کہو کہ کونسی چیز اچھی ہے۔ كَانَ يُرِيْدُ (4:134)۔ میں اشیائے کائنات کے لیے آخرت نہیں ہے وہ تو مجبور ہیں ان کے لیے صرف مفاد عاجلہ ہے۔ جب کہ تمہارا اختیار و ارادہ ہے جو تم سلب کروانا نہیں چاہتے تو معاشرہ اس پروگرام کے تحت تشکیل دو تا کہ یہ سلب ونہب ختم ہوجائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٢٧﴾ (2:127)

ابنِ خلدون

عبدالرحمن ابوزید المقلب (1332ء/732ھ، وفات 1406ء/808ھ)

اندلس میں 1332ء کو پیدا ہوئے۔ ابن خلدون نے کئی درباروں میں کام کیا۔ خطیب اور معلّم بھی رہا۔ اور کئی دفعہ موردِ عتاب ٹھہرایا گیا اور قید ہوا۔ آخر بادشاہوں کی صحبت سے اجتناب کیا۔ قلعہ ابن سلام میں تاریخ لکھنی شروع کر دی (808ھ/1406ء) قاہرہ میں وفات پائی۔

''کتابُ العِبر'' اس کی شہرت یافتہ کتاب اور اس کا جو مقدمہ لکھا گیا ہے۔ وہ فلسفہ تاریخ اور عمرانیات میں بڑی عظیم دستاویز ہے۔ اس نے حساب اور منطق پر لکھا لیکن شہرت تاریخ دان کی حیثیت سے ہوئی۔ اس کے مقدمہ کو مغرب میں بڑی اہمیت ملی اور مغربی فلسفی اور تاریخ دان اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

ٹائن بی کے خیال میں مقدمہ اپنی نوعیت کا عظیم کام ہے۔ رابرٹ فلنٹ کے خیال میں نظریہ ساز کی حیثیت سے تاریخ میں کوئی بھی ابن خلدون کے ہم مرتبہ نہیں۔ (کیونکہ مقدمہ کے اصول اس نے قرآن سے مرتب کئے تھے)

تاریخ بطورِ سائنس:

ابن خلدون کے نزدیک مطالعۂ تاریخ کا مقصد واقعات بیان کرنا نہیں بلکہ انسان کے ماضی کا تجزیہ کرنا ہے تاریخ کے مطالعہ سے انسان کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ اور معاشرے کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ کے سائنسی تجزیہ کے لیے ضروری ہے کہ تعصب سے گریز کیا جائے۔ مشاہدہ اور مآخذ پر حد سے زیادہ یقین۔ غلو و مبالغہ، واقعات کو مناسب متن میں نہ دیکھنا۔ امراء کی خوشنودی۔ غلط تمثیل وغیرہ تاریخ کے مطالعہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں ہیں۔ جن سے ایک مؤرخ کو اجتناب کرنا چاہیے۔

مؤرخ میں نظریاتی یا علمی غرضیکہ کسی قسم کا تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ اسے اپنی تحقیق کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر رکھنی چاہیے اور اسے جغرافیہ، محلِ وقوع آب و ہوا، معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی حالات کو بغور دیکھنا چاہیے۔

ابن خلدون کے مطابق عمرانیات اور تاریخ لازم و ملزوم ہیں۔ تاریخ کا موضوع معاشرتی زندگی ہے۔ تاریخ معاشرے کی مادی اور فکری ثقافت کا مطالعہ کرتی ہے۔ معاشرہ مختلف اشکال بدلتا رہتا ہے۔ خانہ بدوشوں کا معاشرہ، فوجی حکومت کا معاشرہ اور

1273
شہری زندگی کا معاشرہ۔مذہب افراد کو اکٹھا رکھتا ہے۔کیونکہ یہ رشتہ بڑا مستحکم اور مضبوط ہے یعنی آئیڈیو.جی کی بنیاد پر واحد ہوسکتا ہے۔

اشخاص کی طرح سلطنت و ریاست کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ان کی رائے میں ریاست اور سلطنت کی عمر تین اجیال سے متجاوز نہیں ہوتی۔جیل تقریباً چالیس برس کا ہوتا ہے پہلے اور دوسرے جیل میں تہذیب عروج پر ہوتی ہے اور تیسرے جیل میں زوال شروع ہوجاتا ہے۔

اصولِ عمرانیات:

مقدمہ میں عمرانی اصولوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔معاشرہ اصولوں پر چلتا ہے اور ایک ماہر عمرانیات ان اصولوں کے پیش نظر معاشرے کے بارے میں پیش گوئی کرسکتا ہے۔ان اصولوں کا تعلق معاشرے سے ہے۔افراد سے نہیں۔یہ اصول معاشرتی مواد سے اخذ کیے جاتے ہیں۔جو ماضی کے واقعات کے مطابق اور حاضر کے مشاہدے سے اخذ کیا جاتا ہے۔معاشرہ نامیاتی عضو بدن کی طرح زندہ ہے۔معاشرتی صورتیں بدلتی رہتی ہیں یہ تبدیلی مختلف لوگوں کے ربط متنوع ثقافت اور تہذیب وتمدن سے پیدا ہوتی ہے۔معاشرے کے مطالعہ میں جغرافیہ، آب و ہوا کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور مذہب اور تعلیم کی اہمیت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔عمرانیات میں کلچر کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ثقافت کے مطالعہ سے پہلے کائنات میں انسان کا مقام متعین کرنا بھی لازمی ہے انسان عمرانِ بدوی (Urban) سے سفر شروع کرتا ہے اور پھر عمرانِ حضروی، ریاست، شہر، معاش زندگی اور علوم۔جب لوگ معاشی طور پر خوشحال ہوتے ہیں تو پھر علوم وفنون ترقی کرتے ہیں۔کلچر کا یہ مطالعہ خلدون نے سائنس بنا دیا ہے۔معاشرہ تین بڑے عوامل ہیں۔دین، جغرافیہ اور وسائل حیات یہ تینوں اصول معاشرہ اور اس کی ثقافت کو متعین کرتے ہیں۔اور بحث کا ماحصل یہ ہے۔

محصولات کی کثرت عمرانی کوششوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ظلم وجبر سے عمرانی تگ ودو میں رکاوٹ آتی ہے۔

دین کے اصولوں سے سیاسی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

علوم وفنون کی تحصیل انسان کا فطری تقاضا ہے۔

نظریۂ ارتقا:

ابن خلدون انسان کو ارتقاء کی ایک کڑی سمجھتا ہے ارتقا کا یہ عمل یوں جاری رہتا ہے کہ ہر نوع کا آخر ملی نوع کے افق اول میں تحلیل ہونے کی پوری پوری استعداد رکھتا ہے تا آنکہ یہ سلسلہ حیوانات تک پہنچتا ہے۔پھر حیوانان کی بے شمار اقسام اور کڑیاں ہیں جن میں کوئی ایک کڑی تکوین وتدریج کی منزلیں طے کرتی ہوئی انسانیت کے افق کو چھوجاتی ہے۔

ارتقاء کا یہ سلسلہ انسان تک آکر رک نہیں جاتا بلکہ جاری رہتا ہے۔نبوت اس ارتقاء کا تقاضا ہے۔

منطق:

مسلم فلاسفر نے منطق کو بڑی اہمیت دی ہے لیکن خلدون کی رائے اس کے برعکس ہے۔ اس کے خیال میں منطق ایک آلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ منطق کے علم کے بغیر بھی ہم منطق کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہیں اس سے غیر صحت مند فکر کا پتہ تو چل جاتا ہے لیکن صداقت معلوم نہیں ہوتی۔

مابعد الطّبیعات:

کانٹ کی طرح خلدون بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مابعد الطبیعات انسانی علم محدود ہونے سے معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفہ مذہب کے لیے خطرہ کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ مسلم فلاسفہ نے مذہب اور فلسفہ میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود بھی فلسفہ کئی لحاظ سے مذہب کے لیے مضر ہے۔ فلسفہ ایک طویل فکری جستجو کا نام ہے جو منزل بہ منزل کئی شکوک پیدا کرتا ہے جو تضادات پیدا کرتا ہے جو مذہب کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

انسانی عقل محدود ہے۔ وہ اشیاء اور واقعات میں علت و معلول کا رشتہ تلاش کرتی ہے اور بالآخر علت اولیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔ فلسفی اسے خدا کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ عقل کی انتہا ہے۔

❁❁❁

مجدّد الف ثانی امام ربانی شیخ احمد سرہندی

مجدد الف ثانی شیخ سرہندی 1564ء (971ھ) سرہند میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ عبدالاحد جو عبدالقدوس گنگوہی کے مرید تھے۔خواجہ باقی اللہ سے فیضان پایا۔ جہانگیر نے ان کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ جلد ہی رہا کر دیا اور 1664ء میں فوت ہوئے۔''معارف الدّینہ، مکاشفات غیبیہ'' وغیرہ ان کی کتابیں ہیں۔

تجدید دین کے سلسلے میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ اس بنا پر الف ثانی کہا جاتا ہے اکبر کے دین الٰہی کے خلاف جہاد کیا۔ تصوف کو غیر اسلامی افکار سے پاک کیا۔ اور ان کو قرآن وحدیث کی روشنی میں مدون کیا۔

صوفی کے احوال ومقامات پیش کیے اور نظریۂ قیومیت پیش کیا، وحدت الوجود کی تعبیر نو کر کے وحدت الشھود پیش کیا۔

مجدد الف ثانی ابن عربی سے متاثر تھے۔ اور ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کی گئی تعبیر پیش کی۔ اور اسے قرآن وسنت میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ باطنی مدارج میں ''قیومیت'' کا نظریہ دیا۔ ابن عربی نے قطب۔ ابدال کا نظریہ دیا۔ آپ نے قیومیت کا نظریہ پیش کیا۔

نظریۂ قیومیّت:

صوفی مختلف مدارج طے کر کے ''قیومیت'' کے درجہ پر فائز ہوتا ہے۔ قطب اور ابدال کی طرح قیوم کو بھی تمام کائنات پر حکمرانی حاصل ہوتی ہے۔ اور کوئی چیز اس کی مرضی اور حکومت کے بغیر نہیں ہوتی۔ مجدد الف ثانی کو قیوم اوّل کہتے ہیں۔

قیّوم کی تشریح:

وہ شخص جس کا ماتحت تمام اسماء وصفات شیونات اور اصول ہوں۔ اور تمام گزشتہ وآئندہ مخلوقات کے عالمِ وجودات انسان، وحوش، پرند، نبات، ہر ذی روح، پتھر، درخت، بحر وبر کی ہر شے، عرش، کرسی، لوح، قلم، ستارہ، ثوابت، سورج، چاند، آسمان، بروج تمام اس کے سائے میں ہوں۔ افلاک وبروج کی حرکت وسکون، سمندروں کی لہروں کی حرکت، درختوں کے پتوں کا ہلنا، بارش کا برسنا، پھلوں کا پکنا، دن رات کی پیدائش، آسمان کی موافق ناموافق گردش، یہ سارا کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ ایک قطرہ ایسا نہیں جو اس کی اطلاع کے بغیر گرتا ہو۔ زمین پر حرکت وسکون اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ تمام رنج وغم وخوش اہل زمین کو اس کے حکم سے ملتا ہے کوئی لمحہ، دن، ہفتہ، مہینہ، سال ایسا نہیں جو اس کے حکم کے بغیر اپنے آپ میں نیکی بدی کا تصرف کر سکے۔ غلہ کی پیدائش،

1273 نباتات کا اگنا، غرضیکہ جو بھی تصور میں آ سکتا ہے وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر ظہور میں نہیں آتا۔

روئے زمین پر جس قدر عابد، زاہد، ابرار، مقرب، تسبیح، ذکر، عبادت گاہوں میں، جھونپڑیوں، کٹیوں، پہاڑ اور دریا کے کنارے، زبان، قلب، روح سے مشاغل اور معتکف ہیں۔ سب قیوم کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ گو ان کو اس بات کا علم نہ ہو۔ اور جب تک ان کے یہ مراقبے، عبادت، قیوم کے ہاں قبول نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے ہاں قبول نہیں ہوتی۔ (روضۃ القیومیہ، از رودِ کوثر)

وحدت الشہود:

شیخ احمد سرہندی اپنے نظریۂ وحدت الشھود کی وجہ سے مشہور ہیں۔ وہ ابن عربی کے وحدت الوجود کو علم الیقین تک محدود قرار دیتے ہیں۔ جبکہ وحدت الشھود کو عین الیقین کے مقام پر سمجھتے ہیں۔ اور ان کے لیے توحید وجودی اور توحید شہودی کی اصطلاحیں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور منصور حلاج کے نعرۂ انا الحق کی تعبیر بھی توحید شہودی کے اعتبار سے کی ہے۔ اور اسے غلبۂ حال کہا ہے۔ ان کے نزدیک توحید شہودی شریعت کے مطابق ہے۔ مکتوب میں اس نظریہ کو یوں واضح کیا ''توحید شہودی ایک کو دیکھنا ہے۔'' یعنی ایک کے سوا خالق کو کچھ مشہود نہیں ہوتا۔

اور توحید وجودی ایک کو موجود جاننا اور اس کے غیر کو نابود سمجھنا اور غیر کی معدوم جاننے کے باوجود اس کا مظہر جاننا ہے۔ پس توحید وجودی علم الیقین کی قسم سے ہے۔ اور توحید مشہودی عین الیقین کی قسم سے ہے۔ انا الحق کا نعرہ کو توحید مشہودی پر محمول کیا جائے۔ اور تضاد کو دور کر دیا جائے۔ جب ماسوائے حق ان کی نظر سے محو ہو گیا۔ تو غلبۂ حال کے وقت یہ الفاظ ان سے سرزد ہوئے۔

اور حق کے سوا اس کے غیر کو ثابت نہ کیا۔ تو انا الحق کے معنی کہ حق ہے اور میں نہیں ہوں۔ اور جب وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھتا۔ تو اثبات نہیں کرتا نہ یہ کہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور اس کو حق کہتا ہے۔ تو اس جگہ کوئی یہ نہ کہے کہ اثبات نہ کرنا نفی تک پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ توحید وجودی ہے۔ کیونکہ اثبات نہ کرنے سے نفی لازم نہیں آتی۔ بلکہ اس مقام میں حیرت ہے۔ اور وہ کام سب کے سب ساقط ہوتے ہیں۔ اس طرح بایزید بسطامی کا نعرہ ''سبحانی ما اعظم شانی'' میں حق تعالیٰ کی تنزیہہ ہے نہ اس کی اپنی تنزیہہ کہ وہ بالکل اپنی نظر سے دور ہو چکا ہے۔ یہ ہے عین الیقین جو مقام حیرت ہے۔ جب تک اس مقام سے ترقی کر کے حق الیقین تک پہنچتے ہیں۔ تو ایسی باتوں سے کنارہ کرتے ہیں اور حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے (دختر اول مکتوب 43)

بعض لوگ وحدت الوجود اور وحدت الشھود کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں یہ غلط ہے وحدت الشھود تو وحدت الوجود کی اگلی منزل ہے اور توحید شہودی بھی عین الیقین تک محدود ہے جسے مقام حیرت کہتے ہیں اور حق الیقین کی منزل اس سے آگے ہے۔

تذکرۂ غوثیہ میں وحدت الشّھود کی تشریح:

وحدت الشّھود سے مراد کہ وجود کائنات اور ظہورِ آثار وصفاتِ مختلفہ واحد مطلق کی ذات وصفات کا ظل وعکس ہے جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے۔ اور یہ ظل عین صاحبِ ظل نہیں ہے بلکہ ایک مثال ہے وحدت الشھود تصوف میں ایک اضافہ ہے اور تصوف پر گہرے اثرات مرتب کئے اس فکر نے (یہ ہیں ٹامک ٹوئیاں قرآن سے دور ہونے کی وجہ سے صوفیا کی۔ راقم)

’’شاہ ولی اللہ‘‘

(1703ء-1762ء)

تاریخی نام عظیم الدین، ولی اللہ کے نام سے شہرت پائی۔ حالات زندگی خود انفاس العارفین میں لکھے ہیں۔ مندرجہ ذیل کتابیں مشہور ہیں۔

فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن۔ الفوز الکبیر فی اصول تفسیر۔ حجۃ اللہ البالغہ التفہمات الالہیہ۔ انفاس العارفین وغیرہ۔

تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف پر کتابیں لکھیں۔ تاریخ فلسفہ اسلام میں بلند مقام سے بقول شبلی ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد عقلی تنزل شروع ہوا تو کئی صدیوں کے بعد شاہ ولی اللہ پیدا ہوا۔ شاہ ولی اللہ کو مجتہد کی حیثیت حاصل ہے اور ان کا عمرانی فلسفہ ابن خلدون سے کم نہیں۔

عمرانیات:

شاہ ولی اللہ مغل دور کے زوال کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ اس نے مسلمانوں کی بدحالی کا مشاہدہ کر کے اس بدحالی کا عمرانی تجزیہ پیش کیا۔ اور اس فلسفۂ تمدن کو اس نے ’’ارتفاقات‘‘ کے عنوان کے تحت لکھا۔ ان کے نزدیک یہ عمرانی اصول یونیورسل ہیں لیکن اس کی صورتیں مختلف ہیں۔ تو فساد کا سب سے بڑا عامل معاش ناہمواری ہے اور معاشرہ میں انصاف نہیں رہتا۔ اور معاشرہ معاش عدم مساوات کا شکار ہو جاتا ہے تو اخلاقی انحطاط اس معاشرہ میں پھیل جاتا ہے۔

اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے اور تقلید کے رجحان کی مذمت کی ہے۔

اخلاقیات:

اخلاقیات عمرانی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں چار بنیادی اخلاق ہیں۔ (الاخلاق بالاحوال و بالعلوم)

(1) طہارت (2) عجز و خضوع (3) سماحت (4) عدالت

لذتوں سے اجتناب، انتقام اور بخل سے گریز سماحت کہلاتا ہے۔

شہوانی اور کھانے پینے کی خواہشات کا اثر قبول نہ کرنا عفت ہے۔
ترک عمل اور تن آسانی سے مغلوب نہ ہونا اجتہاد ہے۔حرص سے بچنا قناعت ہے۔شرعی حدود سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔ یہ تمام اخلاق سماحت کے تحت آتے ہیں۔

تصوّف:

تصوّف کے چار ادوار ہیں۔ابتدائی دور عبادت اور شریعت کے اتباع کا جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور تھا۔دوسرا دور جنید بغدادی، شہرابوسعید ابن الخیرہ ابوالحسن خرقانی اور چوتھا دور محی الدین ابن عربی۔جس میں تصوف ایک قاعدہ علم بن جاتا ہے۔اور اس میں فلسفہ شامل ہوجاتا ہے۔(یہ خیالات ان کے اپنے ہیں۔صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں یہ غیر قرآنی نظریہ نہیں تھا۔مصنف)

علم الکلام:

اشاعرہ سے متاثر ہیں۔ان کے نزدیک شریعت کے احکام حکمت سے خالی نہیں۔وہ عالم مثال کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ عالم موجودات میں ایک ایسا عالم ہے جو مادی نہیں۔ جہاں تمام اشیاء ظہور میں آنے سے پہلے موجود ہوتی ہیں۔ان کے نزدیک قبر کا عذاب وغیرہ بھی عالم امثال سے ہے۔

سرسید احمد خان

(1817ء-1898ء)

دہلی میں پیدا ہوئے۔مختلف مقامات پر جج کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کر کے مسلمانوں کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

ان کے اکثر مضامین ''تہذیب الاخلاق'' میں چھپے۔لیکن فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے ان کی تین کتابیں بڑی اہم ہیں۔تبیین الکلام۔خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن جو نامکمل ہے۔خطبات احمدیہ، سر ولیم مور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔تعبیین کلام میں مختلف مذہبی مسائل کے حوالے سے اناجیل اور قرآن میں مطابقت پیدا کی گئی ہے۔تفسیر القرآن ابھی نامکمل تھی کہ سرسید وفات پا گئے۔انہوں نے جابجا اس میں بائبل سے حوالے دیئے ہیں۔

مذہبی فکر:

اس نے معتزلہ کی روشِ فکر اپنائی۔اور جدید علم کلام کی ضرورت پر زور دیا۔

جس سے یا تو علم جدیدہ کو باطل کر دیں یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق ٹھہرائیں۔تفسیر القرآن میں انہوں نے تقریباً 52 مسائل کو زیر بحث کیا ہے اور معتزلہ کے استدلال کو اپنایا ہے۔اور تقلید پرستی کے رجحان کے برعکس تحقیق واجتہاد کی راہ اپنائی۔ ایک خط میں لکھا کہ میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہیں چھوڑیں گے۔اور خاص اس روشنی کو جو قرآن سے ملتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم پر دسترس حاصل نہ کریں گے تو یہ مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔اس لیے میں تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا۔وہ عقل پرست ہیں ان کے خیال میں عقل وفکر کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

کیونکہ عقلی معیار ان کے ہاں عین فطری ہے۔فطرت کے قوانین اٹل اور قطعی ہیں۔اس لیے قرآن فطری اصولوں سے متصادم نہیں ہو سکتا۔وہ فطرت، عقل اور مذہب کو ایک سمجھتے ہیں۔انہوں نے تخلیق آدم، ابلیس، معراج، جنت و دوزخ عذاب قبر وغیرہ کی عقلی تعبیر پیش کی ہے۔وہ ان تصورات کو تمثیل اور استعارہ قرار دیتے ہیں۔وہ جن اور فرشتوں کی مخلوق پر بھی یقین نہیں رکھتے۔بلکہ

اسے بھی استعاری زبان میں پیش کیا ہے۔

ان پر عقل پرستی اور فطرت پرستی کا الزام ہے۔ اس لیے ان کو نیچری کہا جاتا ہے۔

تعلیمی افکار:

اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ علوم مروجہ کی تعلیم بھی ضروری ہے اور سائنس سے استفادہ کے لیے مغربی علوم کا حصول ضروری ہے۔ علی گڑھ کے نصاب میں اسلامی اور مغربی علوم دونوں کو برابر کی اہمیت دی گئی۔ تعلیم نسواں کے زبردست داعی تھے۔ اس تعلیمی تحریک نے معاشرتی اور سیاسی زندگی کو ایک نئی جہت دی۔

سیاسی افکار:

رسالہ ''ابطال غلامی'' میں لکھا کہ اسلام میں غلامی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی کتاب رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں ان کے سیاسی رویہ پر روشنی پڑتی ہے ان کو دو قومی نظریہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

اخلاقی افکار:

مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط پر خاص توجہ دی۔ اور اخلاقی تربیت کے لیے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں مضامین لکھے۔

''علامہ اقبال''

(1877ء-1938ء)

مولوی میر حسن سے عربی فارسی کا درس لیا۔عربی میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہے۔گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے 1905 میں انگلینڈ۔جرمنی سے ''مابعد الطبیعات کا ارتقا ایران میں'' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر Ph.D کی ڈگری لی۔1909 میں لنکز ان سے بار ایٹ لا کیا۔

بانگ درا، بال جبریل،ضرب کلیم، ارمغان حجاز، پیام مشرق، اسرارِ خودی اور رموز بے خودی، زبور عجم، جاوید نامہ، شاعری میں،نثر میں علم الاقتصاد فلسفۂ عجم اور تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔سات خطبوں پر مشتمل 1930ء میں شائع ہوئی۔

ان کے خطوط،مضامین اور ملفوظات بھی اہم سرمایہ ہیں۔یہ لیکچر فلسفہ کی کتابی شکل میں 1930ء میں شائع ہوئی۔

خودی:

ان کے فلسفہ میں خودی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔یہ کائنات ہر لحہ تغیر پذیر ہے اور اس کی تخلیق میں اضافہ ہو رہا ہے۔کائنات کا ہر ذرہ خودی رکھتا ہے اور انسان بھی خودی کا حامل ہے۔اثباتِ خودی (integration) انسان کا فرض ہے اسرارِ خودی کے دیباچہ میں اس کی تشریح یوں کی ہے۔

یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔یہ پر اسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود قوتوں کی شیرازہ بند ہے۔یہ خودی یا انا یا میں جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر لیکن اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔مگر جس کی مطابقت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی۔کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے۔یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے۔اخلاقی اعتبار سے افراد واقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔یہ خودی وحدتِ وجدانی ہے۔جو انسان کی تمام منتشر اور غیر محدود قوتوں کی شیرازہ بند

1273 ہے۔خودی نفسیاتی اور منطقی حقیقت ہے۔نعرۂ انا الحق میں خودی کا اثبات تھا۔خودی ہر لمحہ نئے نئے مقاصد تخلیق کرتی ہے۔اس سے اس کی زندگی ہے۔فطرت کی تسخیر اس کا مقصود ہے۔خودی عشق سے استحکام پاتی ہے۔عشق اسے ہر لمحہ سرگرم رکھتا ہے۔ خودی اور عشق بعض جگہ ہم معنی ہیں۔عشق ایک محرک قوت ہے۔جو خودی کو ہر لمحہ سرگرم عمل رکھتی ہے۔ابن سینا کی طرح اقبال میں عشق کو اصل حیات اور اصولِ کائنات سمجھتے ہیں۔خودی کی تربیت کے تین مراحل ہیں۔اللہ اور رسول کی اطاعت خودی کا پہلا مرحلہ ہے۔دوسرا ضبط نفس بمعنی قوانین خداوندی کی پابندی۔تیسرا مرحلہ نیابت الٰہی جہاں خودی کی تکمیل ہوتی ہے۔ انسان خدا کی نیابت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔(انسان کو خدا کی نیابت نہیں مل سکتی۔مصنف)

مردِ مومن:

اقبال کی خودی کا کمال اور نتیجہ مرد مومن ہے۔تکمیل خودی سے انسانِ کامل بنتا ہے۔مرد مومن میں خدا کی صفات کا عکس ہوتا ہے یہی خودی کا مقصود ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

یہ نطشے کے فوق البشر (Suppermem) سے مختلف ہے کہ خدا کا رفیق ادنیٰ ہے اور الوہی صفات کا حامل ہے۔ جبکہ نطشے ان حقائق کا ہی انکاری ہے۔

خودی اور زمان:

خودی کا زمانہ استدام محض ہے۔استدام محض وقت کے بارے میں فرانسیسی فلاسفر برگسان نے نظریہ پیش کیا۔جو زمان مسلسل کے برعکس ہے۔اسی زمانِ حقیقی یا زمانِ محض (Absolute Time) یہ زمانہ ماضی حال اور مستقبل میں منقسم نہیں۔اقبال استدام محض کو خودی کا زمانہ کہتا ہے۔جو کہ Serial Time کے برعکس ہے۔

خودی کا زمانہ استدامِ محض ہے۔خودی زمانۂ خالص میں زندہ ہے۔زمان مسلسل میں نہیں خودی کے دو پہلو، انائے بصیر اور انائے فعال۔انائے فعال زمان مسلسل سے اور انائے بصیر زمان خالص سے تعلق رکھتی ہے۔

اقبال برگسان کے نظریۂ دوران کے قائل ہیں۔لیکن خودی کو زمان کے تابع نہیں سمجھتے بلکہ ان کی رائے میں زمان کا اسناد خودی سے ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک برگسان کی غلطی یہ ہے کہ اس نے زمان خالص کو خودی پر مقدم ٹھہرایا حالانکہ زمانہ خالص کا اسناد خودی یا نفس سے ہی ہوسکتا ہے۔اس لیے کہ مکانِ محض ہو یا زمانِ محض ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ اشیاء یا حوادث کی کثرت کو سہارا دے سکیں۔یہ صرف ایک قائم و دائم انا کا خود اپنی ذات میں بصیرت کا عمل ہے۔جو استدام کی کثرت یعنی آفات

1273
لامتناہیہ کے اس سلسلے کو جس میں ہم اس کو منقسم پاتے ہیں۔ایک ترکیب نامی میں جوڑتے ہوئے پھر کل میں بدل دیتا ہے۔ استدام محض کی زندگی خودی کی زندگی ہے۔اور خودی عبارت ہے''میں ہوں سے۔''

لہٰذا زندہ وہ ہے جو''میں ہوں''، انا الموجود کہہ سکے۔پھر یہ انا الموجود ہی کا وجدان ہے۔جس سے مدارج ہستی میں ہماری جگہ متعین ہوتی ہے۔

خودی زمان حقیقی میں زندہ رہتی ہے۔زمان حقیقی اس کی خلاقیت اور فعالیت کو بڑھاتا ہے اور یہ تخلیقی عمل آزادی کا عمل ہے۔جو زمان مسلسل کی زنجیروں سے حاصل کی جاتی ہے۔خودی زمان کے تابع نہیں بلکہ زمان خودی کے تابع ہے۔مردمومن زمان کو بھی مسخر کرلیتا ہے۔کیونکہ وہ خدائی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔

زمان حقیقی کی زندگی زمان مسلسل کی زنجیروں سے آزادی اور اس لیے لمحہ بہ لمحہ خلاقی کی زندگی ہے۔اس کا ہر عمل سرتا سر آزادی اور ابداع کا عمل ہے اس لیے تخلیق کا فعل بھی آزادی کا فعل ہے۔(تشکیل جدید الٰہیات)

اقبال زمان کو ایک خلاق قوت سمجھتے ہیں۔اس لیے ان کو آن سٹائن کے نظریہ پر بھی اعتراض ہے کہ نظریۂ اضافیت میں بھی زمان ایک مکانی اکائی بن کر رہ گیا ہے اور اس کی خلاقی ختم ہوگئی ہے۔ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس اعتراض کو اقبال کی غلط فہمی قرار دیا ہے۔

خودی اور خدا:

خودی عرفان الٰہی کا پہلا مرحلہ ہے۔مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔اور انسان خدا کو بھی اپنی صورت پر تراشتا ہے۔(جو قرآن سے ٹکراتا ہے۔قرآن نے عرفان کا مطالبہ ہی نہیں کیا۔مصنف)

ترا شیدم صنم بر صورتِ خویش
بہ شکلِ خود خدا را نقش بستم

ذات باری تعالیٰ ایک لامحدود خودی ہے۔اقبال خدا کو بھی انائے مطلق اور ایک لامحدود خودی کے روپ میں دیکھتا ہے۔انائے مطلق لامتناہی تخلیقی سرگرمیوں لامحدود امکانات پر مشتمل ہے۔یہ کائنات جس کا جزوی اظہار ہے۔انسانی خودی انائے مطلق میں ضم نہیں ہوسکتی بلکہ علیحدہ اپنا وجود قائم رکھتی ہے اقبال انا الحق کو اثبات خودی کا اعلان سمجھتے ہیں۔اور انسانی خودی اور خودیٔ مطلق کے تعلق کے بارے میں فرماتے ہیں۔

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے

نظریۂ اخلاق:

اخلاقیات میں اقبال نطشے کی طرح غلامانہ اخلاق کو یک قلم رد کرتے ہیں۔ ان کا مردِ مومن شاہین صفت ہے۔ وہ حریت بشر کے بہت بڑے داعی ہیں۔ اخلاق کا معیار خودی ہے۔ جو اخلاق نفی خودی کا باعث بنتے ہیں۔ اخلاق سیّۂ ہیں۔ جو اخلاق اثبات خودی میں معاون ثابت ہوں اخلاق حسنہ ہیں۔ خیر وشر کا معیار بھی خودی ہے۔ خیر وشر میں ابلیس کے کردار کو ضروری گردانا گیا ہے۔ ٹکراؤ کے بغیر اثبات خودی نہیں ہوسکتا۔

مزے اندر جہاں کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

خیر وشر کے انتخاب میں انسان مکمل طور پر آزاد ہے۔ آدم کی پہلی غلطی آزادیٔ انتخاب کا پہلا فعل ہے۔ اختیار ایک وجدانی تجربہ ہے۔ اور خودی اپنے اعمال میں مکمل طور پر آزاد ہے۔

جب کسی غائی عمل میں میں اپنی سعی اور کوشش کی بدولت کامیابی حاصل کرلیتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ میری ذات بھی اپنی جگہ پر علیت کا ایک سرچشمہ ہے۔ اور اس لیے مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنے کی قدرت حاصل ہے۔

اقبال تقدیر کے روایتی تصور سے بغاوت کرتا ہے۔ ان کے نزدیک تقدیر پہلے سے لکھا ہوا فیصلہ نہیں بلکہ وہ زمانہ ہے جو علت ومعلول کی ترتیب سے آزاد ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جسے ہم محسوس کرسکتے ہیں۔ وہ نہیں جو ہمارے تصور میں آتا ہے جس کا ہم شمار کرتے ہیں۔ بہ حیثیت تقدیر زمانہ ہی ہر شے کا جوہر ہے۔

اجتماعیّت:

اقبال مغرب کے انفرادیت پرستوں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ وہ فرد کے لیے جماعت کا وجود رحمت سمجھتے ہیں۔

؎ فرد ربطِ جماعت رحمت است
جوہر اُو را کمال از ملّت است
فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں

اقبال کے فلسفہ اجتماعیّت کی بنیاد توحید پر ہے۔ اور توحید فرد اور جماعت کا مقصود ہے اس لیے فرد اور جماعت میں کوئی تضاد نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے مقاصد کے حصول کے لیے مدد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ فرد واحد جماعت کے مقصد میں وحدت ہے تضاد نہیں۔ اجتماعی انا کی تربیت حریت۔ مساوات اور اخوت پر ہونی چاہیے۔

1273 اسلام بطور ایک سیاسی نظام کے اصولِ توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریق ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لیے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لیے اور چونکہ ذات باری تمام زندگی کی روحانی اساس ہے اس لیے اس کی وفاداری سے مراد کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت کا وفادار رہے۔

اسلامی معاشرے کی اساس توحید پر ہے وہ مغربی وطن پرستی کے تصور کو رد کرتا ہے۔ اقبال ملت اسلامیہ کے اتحاد کے علمبردار تھے۔ اور اس سلسلے میں جمال الدین افغانی کے ہم خیال تھے۔

مذہبی مشاہدہ:

اقبال مذہبی مشاہدے کو علم کا منبع سمجھتے ہیں۔ ذاتِ باری کے علم کا ذریعہ صرف مذہبی مشاہدہ ہے۔ جو انسان کا قدیم ترین سرچشمۂ علم ہے۔ مذہبی مشاہدہ حضوری ہوتا ہے۔ یوں تو ہر تجربہ حضوری نوعیت کا ہوتا ہے لیکن مذہبی مشاہدہ اس اعتبار سے حضوری نوعیت کا ہوتا ہے کہ ہم خدا کو اس طرح جانتے ہیں۔ مذہبی مشاہدہ نا قابل تجزیہ کلیت ہے۔ صوفی تجربہ کے دوران ذات باری سے بہت قریب ہوتا ہے۔ یہ تجربہ نا قابل ابلاغ بھی ہے۔ اس مشاہدے میں موضوع و معروض کا امتیاز شکل ہو جاتا ہے۔ (یہ سراسر قرآن کے خلاف بات کی گئی ہے)

مذہبی مشاہدے کے دوران زبان مسلسل سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن بالکل منقطع نہیں ہوگا۔ یہ تجربہ بالکل منفرد ہونے کے باوجود بھی عام تجربہ سے مماثل ہے اور علم کے منبع کے طور پر اتنا ہی دقیع اور حقیقی ہے۔ جتنا کوئی اور تجربہ ہوسکتا ہے۔ (سراسر قرآن کے خلاف بات کی گئی ہے) مذہبی مشاہدے سے مطالعہ کی ابتداء حضور کے زمانے سے ہوچکی تھی۔ مذہبی مشاہدے کو نفسیاتی طور پر پرکھا نہیں جاسکتا (یہی تو فریب اور دھوکا ہے) اور نفسیاتی طریقہ اس کی علمی حیثیت کو واضح نہیں کرسکتا۔ (قرآن تو علم کے لیے دلیل مانگتا ہے جو اس مشاہدے کے پاس نہیں ہوتی۔ تو اس کا فریب چاک ہو جاتا ہے) اقبال نے اس کے دو معیار بیان کئے ہیں۔ عقلی اور نتیجیت (Pragmatism) معیار میں مذہبی مشاہدے کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور نتیجیت (Pragmatism) میں اس کے افادے پر بحث کی جاتی ہے۔ پہلا طریقہ فلاسفہ کا ہے۔ دور دوسرا پیغمبروں نے اختیار کیا (یعنی)۔

تصورِ دعا:

علامہ دعا کو وقوفی عمل کہتے ہیں۔ جس میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس وسیع تر زندگی میں ہماری بے نام سی شخصیت کے لیے بھی کوئی جگہ ہے۔ اقبال عبادت کو عملی مشاہدہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے اجتماعی عبادت کا طریقہ رائج کیا ہے۔ دعا خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی۔ ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں

وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے۔ یہ انکشاف وتجسس کا وہ عدیم المثال عمل ہے جس میں طالب حقیقت کے لیے نفی ذات بھی اثباتِ ذات کا لمحہ بن جاتا ہے۔ بلکہ وہ اس میں اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہو کر بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات کی زندگی میں ہیچ نہیں۔ایک فعال عنصر کی ہے۔ 1273

دعا میں انسان اپنے سے برتر ہستی کا ادراک کرتا ہے اس کی عظمت کو تسلیم کرتا ہے۔اور اس برتر ہستی کے ربط سے اپنی انفرادیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔اس لیے نفی ذات، اثباتِ ذات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دعا کی حالت میں اسے خدا کے وجود پر یقین کامل ہوتا ہے کامل یقین سے اسے اثباتِ ذات کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

دعا معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے۔اس لیے اجتماعی دعا یا عبادت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔کیونکہ یہ انسان کے وژن کو وسیع کرتی ہے اور اسے زیادہ فعال بناتی ہے۔

اقبال اور ''فلسفۂ مابعد الطّبیعات'' اور جاوید نامہ

حقائق مابعد الطبیعات میں اقبال مائل بہ تصوف جبکہ پیغامات میں کافی حد تک قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے۔

اقبال کی سب سے مشکل کتاب جاوید نامہ ہے۔ ان کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' فلسفہ کے اعتبار سے بلند پایہ کتاب ہے اور مشکل بھی۔ لیکن جاوید نامہ اس سے مشکل تر۔ کیونکہ ایک تو نثر میں ہے جس میں فکر کو مربوط طریقے سے پیش کیا جاسکتا ہے جاوید نامہ نظم میں ہے اور اس میں فکر مربوط نہیں رہتی اور شاعری کی کچھ کمزوریاں اور دشواریاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ اس لیے بعض مقامات پر تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے قرآن نے خود توجیہہ بیان کر دی ہے۔

اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ (26:225)

(ان کی کیفیت اس جھوٹی پیاس والے اونٹ کی طرح ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرے مگر اس کی پیاس کہیں بجھنے نہ پائے۔ جذبات کا پرستار اور جذبات بھی غیر تعمیری اور جھوٹے) ان سے کوئی شاعر نہ بچ سکا اور نہ ہی اقبال بچ سکا۔ یہ بات درست ہے کہ فکری ارتقاء ہوتا ہے۔ اور اس ارتقا کو تضاد نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں تو ساری کمزوریاں آہستہ آہستہ دور ہو کر فکری بلندیاں ملتی ہیں۔ لیکن اقبال کے ہاں ایک ہی دور میں تضادات کی بھرمار ملتی ہے۔ غزل میں تو یہ شعر دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور قافیہ ایسا چپکتا ہے کہ جونہی سامنے آیا تو اس سے جان نہ چھڑا سکے۔ تو قافیہ کے لیے مضمون لانا پڑتا ہے۔

بچپن میں تربیت صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔ بعد ازاں تصوف کے متعلق خود کہہ کہ ''یہ اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے'' مگر آخری وقت تک وہ اس دلدل سے خود کو نکال نہ سکے۔ اور جب اس سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہاں وہ عمدگی سے بلندی پر چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پھر وہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک عادت راسخ ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ وہی چیز ان کے ہاں موجود ہے غیر شعوری طور پر وہ اس راہ کو اپنانے پر مجبور پاتے ہیں۔ پھر احساس ہوتا ہے تو اس میں سے نکلتے ہیں اور اس کی توجیہات پیش کرتے ہیں۔ کہیں عجمی اسلام اور کہیں عربی اسلام میں تفاوت، کہیں عجمی صوفی اور حقیقی صوفی۔ کہیں حافظ اور رومی میں فرق۔ حالانکہ حافظ و رومی میں طرز بیان کا فرق تو ہوسکتا ہے مگر بنیادی طور پر تو دونوں ہی تصوف کے نام لیوا ہیں۔ ایک کے بیان میں جلال

1273
وتوانائی اور دوسرے میں عجز وانکساری۔اس سے دو مختلف تصوف تونہیں ہو گئے۔قرآن نے بتایا ہے کہ انسانی علم سے ماوراسرچشمہ صرف وحی اور وہ خاصۂ نبوت ہے غیر از نبی کو وحی نہیں مل سکتی۔اب نبوت کا تو خاتمہ ہو گیا اس کے بعد ہمارے لیے سرچشمۂ علم تو قرآن کے حقائق ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے انسانی فکر، شعور، مطالعۂ فطرت، مشاہدات، تجربات یعنی وہ تمام چیزیں چونکہ شعور سے تعلق رکھتی ہیں۔اس سے ماوراء چلے جائیں تو فکر، دلیل، برہان و منطق نہیں رہے گی۔دعوی ان کا یہ ہے کہ مشاہدہ کیا ہے تو اس کی کوئی دلیل نہیں دیتے قرآن میں اس کا ذکر تک نہیں ہے۔جبکہ دلیل کے بغیر مشاہدہ قرآن تسلیم ہی نہیں کرتا۔

معراج کے سلسلہ میں پیش کردہ روایات کی بنیاد پر ابنِ عربی، ابوالعلامعری اور طٰہٰ حسین کے تاثرات:

جاوید نامہ تحریر کرنے کا طریق ہمارے ہاں معراج کے متعلق روایات کی رو سے ایک دور میں آیا۔اور یہ ایک ڈرامائی انداز ہے۔کہ رسول ﷺ آسمانوں پر جا کر وہاں گزرتے ہوئے لوگوں سے ملتے ہیں۔واپس آکر ان کی باتیں بیان کرتے ہیں۔پھر آخر میں آنسوئے افلاک جا کر خدا سے ملتے ہیں۔یہ بازگشت ہمارے ہاں ایک دور میں پھیلی تھی۔اور ان روایات کی بناء پر صوفیا میں سے اکثر نے اپنے اپنے مشاہدات بیان کیے۔زیادہ تفصیل (شیخ اکبر محی الدین) ابن عربی (1240-1165ء) نے ''فتوحات مکیہ'' میں بیان کیں۔اس نے اپنے ساتھ دو راہبر لیے۔ایک فلسفی اور دوسرا عالم دین۔وہ افلاک پر جا کر اپنے مشاہدات اس کتاب میں بیان کرتا ہے گویا یہ اس کی اپنی واردات ہیں۔اس کا دعوی ہے کہ یہ میری اپنی ذاتی واردات ومشاہدات (Personal experience) ہیں۔اس کا سنِ وفات 638ھ یعنی 1240ء ہے۔

ابوالعلامعری:

اس سے بھی قبل ابوالعلامعرّی وفات (1058ء) ایک اندھا عرب کا شاعر، ادیب۔ایک بڑا عالم، اس نے بھی ایک ذاتی معراج نامہ لکھا ہے۔اگرچہ اس کا طریقہ کار ذرا مختلف ہے۔اس زمانے کے علماء نے شعراء پر اعتراضات کئے اور کہا کہ یہ سب جہنم میں ہوں گے۔معرّی اوپر گیا تو جنت میں بڑے بڑے شعراء سے ملا۔واپس آکر اپنی مشہور کتاب ''رسالۃ الغفران لکھا'' یعنی ان سب کی مغفرت ہو گئی۔عربی میں اس پائے کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔

دوسرا اندھا طٰہٰ حسین ہے۔جو کہتا ہے کہ ادب کے اعتبار سے ہم اس کتاب کو قرآن کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔قرآن کے مقابل نہ تو ادبی لحاظ سے اور نہ تعلیمات کے لحاظ سے کوئی کتاب پیش کی جا سکتی ہے۔سراسر غلط کہا ہے۔

اٹلی کا شاعر اور افسانہ نویس ''دانتے'' کے مشاہدات:

اس کے بعد اٹلی کے مشہور شاعر اور افسانہ نویس ''دانتے'' نے مقدس طربیہ ڈرامہ (Divine comedy) لکھا۔اس نے اس کا نام صرف کامیڈی رکھا۔بعد میں اس کے عقیدت مندوں نے اسے مقدس طربیہ ڈراما کا نام دیدیا۔یہ ابن عربی سے سو

1273 سال بعد کا دور ہے۔ 1321ء میں دانتے کی وفات ہوئی۔ یہ مشاہدات نہیں بلکہ ادبی انداز میں ڈرامہ تحریر کرتا ہے۔ جس کی اساس ایک لڑکی بیڑس (Beatrice) پر رکھی۔ جس سے اسے محبت ہوجاتی ہے اور وہ لڑکی مرجاتی ہے۔ جس کی تلاش میں وہ اپنے شاعر دوست (virgil) کی رہنمائی میں مختلف افلاک سے گزرتا ہوا جنت میں جاتا ہے۔ وَرجل کے علاوہ یونانی فلسفی اور مزید تین چار ساتھی اس کے ہمرکاب ہوجاتے ہیں وہ جنت میں بیڑس کو پالیتا ہے۔ یہ مقدس ڈرامہ ہماری ان روایات کا چربہ ہے۔ پلاٹ وہی ہے۔ قریباً چربہ بھی وہی ہے۔ لیکن وہ صوفیا کی طرح واردات بیان نہیں کرتا۔ بلکہ ایک ادیب کی طرح ڈرامہ کا پلاٹ لکھتا ہے۔ اور ادب میں یہ ایک شاہکار ہے۔ اس کا اپنا مقام ہے۔ مگر اس کی خباثت مسلمانوں کے متعلق دوسروں سے کم نہیں۔ وہ ڈرامہ میں رسولؐ اور مسلمانوں کو جس مقام پر دکھاتا ہے وہ اس قابل نہیں کہ بیان کیا جاسکے۔ بحرحال یہ اس کا کام تھا جو اس نے کیا۔

ابنِ عربی نے وحدت الوجود کا تصور افلاطون سے لیا اور سارا لٹریچر متاثر کردیا:

مولانا روم (1287-1207) نے اس قسم کا کوئی معراج نامہ نہیں لکھا لیکن وہ اپنی واردات کو حکایات کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ یہ بھی ابن العربی کا چربہ ہے۔ یاد رکھیں یہ ابن عربی اور ہے اور دوسرا ابن العربی ''احکام القرآن'' والا اور ہے۔ اس فتوحات مکیہ والے کا دماغ بہت بڑا اور گردن ٹیڑھی تھی۔ جس طرح افلاطون دنیا کو غلط راستہ پر ڈال گیا (347BC) کیونکہ اس کا دماغ بھی بہت بڑا اور گردن ٹیڑھی تھی۔

افلاطون کے بعد دوسرا اس قسم کا جینیس (نابغہ) وہ ابن عربی ہے۔ بڑا ادیب اور عالم بھی ہے۔ گردن بھی ٹیڑھی ہے۔ اس نے وحدت الوجود افلاطون سے سے لے کر دیا۔ اگرچہ افلاطون کے دلائل ایک مسلمان کو اپیل نہیں کرسکتے تھے۔ اور عربی نے ان کو اسلامی دلائل کے رنگ میں وحدت وجود کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا۔ اس قصہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ جس طرح دانتے بیڑس پر عاشق ہو کر آسمان پر پہنچے۔ یہ ابن عربی بھی حج کرنے مکہ گئے۔ اور ایک بدو لڑکی پر عاشق ہوگئے۔ اور وہیں بیٹھ گئے۔ چنانچہ اس کو سامنے رکھ کر ساری ''فتوحات مکیہ'' لکھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ دانتے نے بیڑس کو مجازی محبوب کہا۔ ابن عربی نے اسے محبوب حقیقی قرار دیدیا۔ اب یہ مجاز اور حقیقت کا فرق کرتے جارہے ہیں۔ وہ ایک دیانتدار نہ بات کررہا ہے اور یہ سب کچھ لے کر آگیا۔ مگر اس کم بخت ابن عربی کا منطق چونکہ بڑا مدلل ہے۔ جو بڑے بڑوں کو بہا کرلے گیا ہے اس کا نتیجہ اس کو بھی گویا کوئی ہزار برس گزر گئے۔ وہ مسلمانوں کے سارے ادب کو متاثر کر گیا ہے۔ چار سو تصوف بکھر گیا۔ اسی کی غلط نگہی اور گمراہی ہے۔

ایرانی شاعری اور ہماری شاعری وحدت الوجود پر ہی استوار ہوتی ہے:

جب یہ شاعری ایران میں آئی تو اہل ایران کو تو ایسی چیز خدا دیتا۔ ان کی تو خواہش یہ تھی کہ اسلام کو اس کے اصل سے ہٹایا جائے۔ ایرانی شاعری وحدت وجود کی شاعری ہے وہی ہمارے ہاں درآئی۔ یہاں بھی سارے شعراء کا محور وحدتِ وجود ہے۔ محبوب و معشوق کے متعلق جو جی میں آئے کہتے جایئے تو یہ سارا محبوب حقیقی کے متعلق ہوگیا۔ یہ مذہب ہمارے ہاں دین میں سند ہوگیا۔

دانتے اور ابنِ عربی کی فکر اور اقبال کا جاوید نامہ:

اقبال نے یہ تصور غالباً دانتے سے نہیں بلکہ ابن عربی سے لیا ہوگا۔ کیونکہ اس کی نظر ابن عربی پر تھی۔ اس خیال کے تحت انہوں نے معراج نامہ لکھنا چاہا مگر اس کا نام معراج نامہ نہیں رکھا کیونکہ رسولؐ سے اتنا عشق تھا کہ ان کی غالباً یہ خواہش رہی کہ اپنے تصورات کو معراج سے تعبیر کریں۔ اس لیے اس کا نام ''جاوید نامہ'' رکھا ہے۔ لیکن طریقہ اس کا بھی وہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اقبال اس کو اپنی اندرونی واردات کہہ کر نہیں بیان کرتا۔ بلکہ وہ اپنی علمی کیفیات کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس لیے اسے علم کی بلندیوں پر لے گیا ہے۔ اگر علمی اعتبار سے پرکھنا ہو کہ اقبال کتنا بلند تھا تو جاوید نامہ دیکھنا چاہیے۔ علم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ''بدھ اور بروٹ'' فلاسفر زمانے سے ابتدا کرتا ہوا آج تک کی دنیا کے ہر خطہ میں گزرنے والے ہر مذہب سے وابستہ بڑے لوگوں کے نقطۂ نظر سے بحث کرتا چلا جاتا ہے۔ اور ہر مکتبہ فکر کے نظریات۔ ان کا فلسفہ، عقیدہ، مذہب، کچھ اس وضاحت سے پیش کرتا ہے کہ انسان سینکڑوں کتابوں سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں ایمائیّت ایک مستقل مرحلہ ہے:

اقبال جس سے ملاقات کرتا ہے تو اس سے ترغیب و اشاریات یعنی ''Suggestion'' کی بات کرتا ہے۔ جو شاعری میں ہے اور ایمائیت (Suggestiveness) کے اندر ہے۔ وہ تو کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ مگر جب تک اس کے فلسفہ پر عبور نہ ہو۔ اس وقت تک وہ مصرعہ سمجھ میں نہیں آتا۔ پیر رومی کو مرشد بنانے کی وجہ اس کی شاعری کے اندر توانائی ہے وہ اسے پیر و مرشد بناتا ہے بجائے اس کہ وہ ستاروں کا نام لیتا۔ یہ نظامِ شمسی کے سات ستاروں میں سے (کروں) چھ کے اندر جاتا ہے۔ ان کو فلک پکارتا ہے۔ اس کے بعد یہ آنسوئے فلک چلا جاتا ہے۔ وہ مقام جہاں یہ رومی اور دانتے کو بھی پیچھے چھوڑ کر اکیلا آگے جاتا ہے۔ اکیلا جانا آنسوئے فلک۔ اس نے ڈانٹے سے یہ تصور نہیں لیا تھا۔ معراج کی روایات میں ایک مقام پر جبریل کہتا ہے کہ اگر اس مقام پر ایک قدم بھی آگے بڑھا تو ''فروغِ تجلی بسوزد پراں'' تو میرے پر جل جائیں گے۔ اس لیے میں آگے نہیں جا سکتا۔

اقبال کے ہاں ''زمان و مکاں'' بنیادی موضوع ہے:

حضور ﷺ بھی تنہا گئے اقبال بھی سب کچھ چھوڑ کر تنہا جاتا ہے۔ واپسی پر آ کر یہ مشاہدات بتا رہا ہے جو اس کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتے۔ بنیادی موضوع ہی زمان و مکان کا فلسفہ (Time/Space)۔ اقبال برگسان کا نظریہ پسند کرتا ہے۔ (1859-1941)

اقبال سے قبل بھی ہمارے فلاسفرز نے ٹائم کے فلسفہ پر بڑی تنقید کی ہے۔ امام اشعری نے سب سے پہلے اور اہم تحقیق رومی کی ہے۔ اقبال نے ان کا مطالعہ کر کے موضوع کو آگے بڑھایا۔

زمان ومکان کا فلسفہ اور تصوف:

سارے تصوف کی بنیاد ''زمان و مکان'' کے فلسفہ پر ہے۔ ایک ٹائم۔ زمان یا زمانہ تو وہ ہے جس کو ہم فہم عامہ (Common Sense) کہتے ہیں یعنی صبح ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے۔ وقت کی مثال تسبیح کے دانوں سے دی جاتی ہے۔ یہ واقعات (Events) اس کے دانے ہیں اور اس میں ''تاگا'' یہ ٹائم ہے اس تاگے میں یہ دانے ایک ایک کر کے گرتے ہیں۔ ارمغان حجاز میں۔

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں۔ ریگ رواں کی تشبیہ دی ہے۔ اب دو واقعات کے درمیان ایک بعد۔ فاصلہ (Interval) رہ جاتا ہے۔ خلا رہ جاتا ہے۔ اقبال کے مطابق اس میں مطلق زمان (Pure Time) ہوتا ہے یہ وقت ہے۔ جس کا شعور یوں ہوتا ہے کہ صبح ہوئی۔ شام ہوئی۔ دو بجے۔ چار بجے۔ اکبر فلاں سال میں آیا۔ اس کے بعد جہانگیر آیا۔ یہ تمام حوادث۔ واقعات سے ہیں۔ جو وقت میں بظاہر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

یہ سلسلہ وار زمانہ (Serial Time) کہلاتا ہے۔ یہ سیریل ٹائم عام شعور کی سطح پر ہوتا ہے۔ اصطلاح یہ ہے فلسفہ کی سلسلہ وار زمانہ، کارگر ذات کے لئے، سلسلہ ہائے تسلسل کی مانند ہے۔

یہ اس ذات کے یا شعور کے دو حصے کرتے ہیں۔ کارگر اور قدر افزا۔

(Serial time is continuum for the effective self.)

ان میں کارگر وہ ہوتا ہے جس کو عام طور پر ہم شعور کہتے ہیں۔ اصطلاحاً اسے سریل ٹائم کہتے ہیں۔ برگسان کے مطابق سیریل ٹائم زمان کے گز پر گرہوں کے نشان لگے ہوئے ہیں جو ہم نے پیمائش کے لیے لگا رکھے ہیں ورنہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ مکان (Space) کے بارے میں بھی ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر دو چیزیں ہمارے سامنے کھڑی ہوں تو اضافی طور پر (Relatively) ان کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے۔ ہم اس کو تو ماپ سکتے ہیں۔ وہ مکان تو ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ (Space)

اگر چیزیں نہ ہوں یا یہ ایک چیز ہے اور دوسرا اس کے آگے کچھ نہیں ہے تو اس طرح سے تم مکان کو ذہن میں بھی نہیں لا سکتے۔ مکان تو اس وقت ہمارے ذہن میں آتا ہے جب دو مادی چیزیں (محسوس اشیاء) اس طرح رکھی ہوں کہ ایک کے بعد دوسری ہو۔ حتیٰ کہ وہ رکھی ہوئی بھی اس طرح سے ہوں۔ کہ اگر ایک کے سامنے دوسری ایک لائن میں ایسے رکھی ہوئی ہو اور ہم اس پہلی کے پیچھے کھڑے دیکھ رہے ہوں تو وہ دوسری چیز ہمیں نظر نہیں آئے گی۔ اور اگر وہ ذرا سی اونچی ہے، نظر بھی آ رہی ہے تو درمیان میں مکان نظر نہیں آئے گا۔

شعور کی سطح سے ہٹ کر زمان ومکان کے وجود کی نوعیت:

اگر شعور کی سطح مختلف ہو جائے۔ تو صبح و شام، رات اور دن، ماہ و سال سب ختم ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح حالت نیند میں یہ سب سلب ہو جاتے ہیں نیند کی حالت میں چونکہ کوئی دوسرا شعور ہوتا ہی نہیں اس وقت ہمیں (Time) کا احساس

نہیں ہوتا۔ اگر شعور اس طرح سے بدلے کہ یہ سلسلہ وار زمان (Serial Time) نکل جائے تو اس ٹائم کا نام بلا مدت زمانہ (Duration-less Time) ہے۔ اضافی چیزیں (Relative) نکل جائیں اور (Abstract pace) غیر محسوس مکان آجائے۔ تو یہاں سے عرش تک کچھ فاصلہ نہیں رہتا۔ جس طرح کہا ہے کہ رسولؐ واپس آئے تو کنڈی ہل رہی تھی۔ یعنی شعور کے بدل جانے سے زمان و مکان کا تصور اس تصور سے بدل جاتا ہے جو شعور کی سطح سے پرے ہوتا ہے۔ اس لیے سمجھانے کی خاطر روایات کو استعمال کر کے بتایا جاتا ہے کہ ایک ثانیہ کے اندر حضور ﷺ اتنا کچھ طے کر کے واپس بھی آئے۔ تو اس میں Time نہیں رہتا۔ یہ فاصلہ لمبائی (Space) نہیں رہتا۔ یہ سب کے سب وہیں ہوتے ہیں۔ شعور کی تبدیلی سے زمان و مکان کا یہ محسوس اور بسیط (Concrete and Abstract) بدل کر، زمان و مکان بلا زمان و بُعد۔ Duration-less اور Distance-less رہ جاتے ہیں۔ اقبال اس کے متعلق کہتا ہے۔

از شعور ایں است کہ گوئی نزد دور

(یہ نزدیک و دور تو شعور کی وجہ سے ہے)

چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

(معراج کیا ہے؟ شعور کے اندر انقلاب)

تصوف میں معراج کا مفہوم:

یہ شعور کا انقلاب تصوف میں مراقبوں اور ریاضتوں سے ملتا ہے۔ زمان و مکان کا بُعد کم ہونا شروع ہوجاتا ہے اور کم ہوتے ہوتے اس مقام پر آجاتا ہے جہاں نہ صبح و شام کی تمیز اور نہ نزد و دُور کا کوئی فرق رہتا ہے۔ وقت بلا دورانیہ ہوجاتا ہے اور مکان سمٹ جاتا ہے۔ اور وہاں پہنچ کر اس کا آخری منتہا هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3) ''وہ زمان و مکان کی نسبتوں سے ماوراء ہے۔ سب سے اول بھی وہی سب سے آخر بھی وہی نہ اس کے لیے ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ لیکن اس کا غلبہ غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے (قانون ہوتا ہی غیر مرئی اور غیر محسوس) مگر اس کے نتائج محسوس اور مرئی ہوتے ہیں۔ یعنی جملہ کائنات اس کی صفات خالقیت و الوہیت کی مظہر ہے۔ مگر اس کی ذات نگاہوں سے پنہاں ہے اس لحاظ سے وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی الٰہیات کی اصطلاح میں وہ Transcendent بھی ہے اور Immanent بھی اوّل و آخر یوں ہے کہ زمان کے لحاظ سے وہ بلا مدت Duration less ہے اور ظاہر و باطن مکان کے لحاظ سے وہ بلا فاصلہ (Distance less) ہے یہ ہے اس کا انتہائی مقام۔

جب انسان اپنے اندر خدائی شعور پیدا کرتا جاتا ہے۔ تو زمان و مکان کی اصطلاحات واضح ہونے لگتی ہیں۔ اور یہ مطلق (Absolute) چیزیں اس کی دسترس میں آنے لگتی ہیں۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ بیٹھے ہوئے ہزار سال کے آنے والے

واقعات اپنے سامنے دیکھ لیتا ہے۔ کیونکہ آنے والا ہزار سال ان کے لیے ہے جن کے شعور کی سطح ابھی تک سیریل ٹائم میں ہے۔ جب وہ سلسلہ وار ٹائم سے اونچا چلا جاتا ہے تو جس طرح نہ خدا کے سامنے کوئی شے اوّل ہے نہ آخر، نہ Past ہے، نہ present اور نہ Future۔ جس کو اقبال ''ابدلاباد حالتِ موجود'' (Eternal Now) کہتا ہے۔ وہ خدا کے سامنے موجود حالت ہے۔ اس طرح انسان اپنے اندر ایسی شعوری تبدیلی پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے لیے بھی یہ مکان و زمان کی حد بھی ہٹتی چلی چلی جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ روایات میں جو مشہور ہے کہ حضرت صاحب یہاں اور نماز مکہ میں ادا کی۔ تو اس کی وجہ یہ شعوری تبدیلی ہے۔ تم اس لیے نہیں مانتے کہ تم اس فاصلہ کو شعور کی سطح سے جانتے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت صاحب نے آنے والے واقعات کی آگاہی دی۔ کیونکہ وہ اس شعوری سطح پر پہنچ گیا ہے جہاں یہ ماضی۔ حال اور مستقبل کا سلسلہ وار زمانہ یعنی سریل ٹائم ختم ہو جاتا ہے اور صرف ایک حال (Now) اس کے سامنے ہوتا ہے۔ اس لیے قیامت تک کے واقعات اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ ہے اقبال کے ہاں تصوف اور معراج کا بنیادی موضوع۔ یہ انقلاب اندشعور ہے۔ اور شعور کے بدلنے سے زمان و مکان کا تصور بدل جاتا ہے۔ لہٰذا جو باتیں تم موجودہ تصور کے تحت ناممکن قرار دیتے ہو تو اس تصور کے تحت وہ ممکن ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے فلسفہ معراج، تصوف جاوید نامہ میں اقبال کا۔ مگر قرآنی نقطۂ نگاہ سے یہ سب افسانہ ہے۔

زمان و مکان کے سلسلہ میں قرآن کی رہنمائی اور نمودِ صالحیّت:

وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ (3:190) کو قرآن آیت اللہ قرار دیتا ہے۔ وہ لیل و نہار کے اس فرق کو وہ تاریخ میں سلسلہ وار زمانہ کہتا ہے۔ مثلاً نوحؑ آئے۔ اس کے بعد ابراہیمؑ، پھر آخر میں محمد ﷺ آئے۔ ان زبانوں میں جو Time ہمارے لیے اس تمام فرق کو، اس زمان و مکان کو، اسی طرح رکھتا ہے۔ جس طرح سلسلہ ہمارے سامنے آتا ہے یا ہمارے شعور کی سطح پر آتا ہے۔ دوسرے شعور کا تو اس میں ذکر ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز تھی تو نبی ﷺ کے ساتھ تو یہ ہوسکتی تھی۔ ان کی واردات میں ہم قطعاً شریک نہیں ہوسکتے۔ کوئی غیر از نبی شریک نہیں ہوسکتا۔ باقی جو کچھ بھی ہے۔ جس کو آپ انقلاب اندر شعور کہتے ہیں۔ وہ انسان جب (Mind) کی کوئی صلاحیتیں ہیں۔ خبر نہیں کہ ابھی کتنی ہیں۔ ان کے متعلق پر ابھی تحقیق ہی نہیں ہوسکی ہے۔ جب تحقیق ہوگی تو سمجھ لیں گے، کہ صلاحیتیں قلبی (Mental Faculties) پیدا ہو کر ان لوگوں سے مختلف ہو جاتی ہیں جن کی ہنوز پیدا نہیں ہوتیں۔ یہ تو ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں ہے کہ بڑے سے بڑا سوال کھڑے کھڑے ایک منٹ میں بتا دیتے ہیں۔ وہ بے چارہ کسان ہے پانچ بار 20 ہوئے پھر چھ بار۔ اور اس کے سات 20 ہوئے تو پھر بھول جاتا ہے۔ یہ ذرا سا فرق روزمرہ زندگی میں نظر آجاتا ہے۔

قرآن موجودہ زندگی کے شعور کے علاوہ کسی دوسرے شعور کو متعارف ہی نہیں کرتا۔ قرآن ہماری موجودہ زندگی کی صلاحیتوں کو جلا قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے شعور کا صفحۂ ارض پر ذکر نہیں کرتا۔ وہ آخر میں جا کر شعوری سطح کو بدل کر بیان کرتا

1273
ہے۔ کہتا ہے کہ جب وہ اٹھیں گے تو پوچھیں گے کہ ہم وہاں کتنا عرصہ رہے؟ کوئی کہے گا کہ صاحب! کچھ دن رہے، کوئی کہے گا کہ دن کا کچھ حصہ رہے پھر وہ کہیں گے کہ اس سے پوچھو جس کو حساب یاد ہو۔ وہ کہے گا کہ صاحب! ہم علمِ خداوندی میں رہے۔ یعنی موجودہ شعوری حالت باقی رہے گی۔ سب کچھ یاد ہوگا۔ پہچان بھی ہوگی۔ لیکن وہاں ٹائم کا تصور قرآن کے مطابق موجود تصور کے ماتحت نہیں ہوتا۔ جس طرح خدا کا ایک دن، پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۝ - یہ تمہارے تصور کے مطابق جس کو تم پچاس ہزار سال کہتے ہو خدا کے نزدیک تو ایک آن ہوتی ہے یا ایک دن ہوتا ہے۔ (22:47) تو اس میں تصور کا فرق ہے۔

جنتِ ارضی اور قلبی صلاحیتوں کی اہمیت:

اس صفحۂ ارض کے بعد کی زندگی میں جو ٹائم کا تصور ہے اس میں مکان کا تصور بھی شامل ہے۔ موجودہ شعور میں ہر دو کیفیات کے اندر وہ تبدیلی تو بتاتا ہے۔ کیونکہ جنت کے متعلق کہا ہے کہ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ (57:21) اس کی وسعت زمین و آسمان کو محیط ہے۔ اور جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ (3:133) جنت کی جو وسعت ہے وہ سموات والارض ہے۔ اگر سماوات والارض ساری جنت ہے تو پھر جہنم کہاں ہے؟ یہ کہاں ہے؟ کا سوال پیدا ہوا جب ہم ان کو مقامات تصور کر لیں۔ ہمارے موجودہ شعور کے مطابق اگر یہ ساری جنت ہے تو جہنم کہیں نہیں ہو سکتی۔ اگر کہیں جہنم ہے تو ساری جنت نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب مکان کا یہ تصور بدل جائے گا۔ تو پھر آپ کے گمان کی تصویر کچھ اور ہو جائے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے مثال دے کر بات سمجھائی ہے۔ کوئی آنکھ محسوس نہیں کر سکتی کہ اس کی ٹھنڈک کے سامان ہم نے کیا رکھے ہیں؟ جب کوئی آنکھ اس سطحِ ارض پر ابھی اس کا احساس کر نہیں سکتی تو اسی سطحِ ارض کے اوپر شعور میں جو اقبال یہ تبدیلی بتا رہے ہیں۔ اس کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ جو کچھ بھی ہے۔ انسان کی اپنی قوتِ ارادی ہے۔ جو قلب (Mind) کی صلاحیتیں ہیں یہ ان کی نشوونما ہے۔ جن کا دین سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ نہ خدا سے، نہ روحانیت سے، نہ رسولؐ سے۔ جس کا جی چاہے یہ کچھ کر سکتا ہے۔ مشرک بت کے سامنے کرتا ہے۔ آپ خدا کے سامنے کر لیتے ہیں۔ اس میں نہ شرک و توحید کا فرق ہے۔ نہ کفر و اسلام کا۔ یہ ایک فن ہے اور ہر فن کی طرح اسے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

یہ انقلاب اندر شعور اپنے ہی قلب کی کچھ صلاحیتیں ہیں۔ ان سے جو کچھ ہوتا ہے ان کو کرامات کہتے ہیں۔ اور جن سے یہ سرزد نہ ہوں تو ان کی صلاحیت کی نشوونما نہیں ہوتی نہ اس کے علاوہ ایسا صورت نہیں کہ شعور کی یہ تبدیلی، وہ تبدیلی ہے جس کو ہم خدا کی طرف منسوب کر دیں کہ اس کے نزدیک نہ اول اور نہ آخر میں کوئی فرق ہے۔ نہ ظاہر اور باطن میں کوئی فرق ہے۔ قرآن تو کہتا ہے۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4) تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے، نہ صرف خدا کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے مکان کے اندر جو بلا بُعد (Space-less) ہو جاتا ہے۔ تو یہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4) صرف خدا کی ذات کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ اس صفحہ ارض کے اوپر، یہ شعوری تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

انسان طبعی زندگی کے بعد قلبی صلاحیتوں کی نشوونما اور خاصۂ نبوّت :

ان کے بعد شعور کی کیفیت کیا ہوگی؟ آج اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا یہاں تو بحث انسان کے اپنے ہی قلب یا قلبی صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔

نشوونما سے طبعی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں کہ نبوت قطعاً ایک الگ شے ہے۔ہم اس کو (Conceive) سمجھ ہی نہیں سکتے۔اس نبوت میں جو کچھ تھا۔وہ تھا۔لیکن چونکہ وہ ختم ہوگئی۔لہٰذا اس کے بارے میں بحث نہیں ہوسکتی۔کہ کیا یہ کسی اور کے لیے بھی ممکن ہے یا نہیں۔کیونکہ جب وہ خاصۂ نبوت ہے اور نبوت ختم ہوگئی تو اس کے امکانات وممکنات وہیں ختم ہوگئے۔اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا تعلق ان چیزوں سے نہیں ہے جن کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس میں مقداری (Quantative) فرق ہے۔کمیت کا فرق نہیں ہے یا صرف نوعیت کا فرق ہے۔(Qualitative)۔یہ درجہ کا فرق نہیں ہے تو سراسر مختلف کیفیت ہے۔یہ اس سے ایک یکسر الگ خصوصیت ہے:

تصوف وطریقت والے ڈگری (درجہ) کا بتاتے ہیں کہ نبی کے شعور میں جو تبدیلی ہوتی ہے۔وہ درجے کے اعتبار بہت اونچی ہوتی ہے۔اوران میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ ہوتی تو انہی شقوں کی ہیں۔لیکن وہ ذرا کم درجہ کی ہوتی ہیں۔یہ بات قطعاً غلط ہے۔کوئی درجہ بندی نہیں ہوسکتی۔اس میں ڈگری کا فرق ہی نہیں کیا جا سکتا۔مقداری فرق بھی نہیں ہوسکتا۔کیونکہ یہ تو یکسر ایک الگ خصوصیت تھی جو ختم ہوگئی۔تو خاتمہ کے بعد اس میں سے کسی کو کچھ بھی نہیں مل سکتا۔نہ اس کے حصے ہوسکتے ہیں۔نبوت کے برعکس یہ قلبی (ذہن) صلاحیتیں ہیں جو آگے جاتی ہیں انہی کی نشوونما کی جا سکتی ہے۔اس لیے بقول ان کے اس کا تعلق روحانیت سے ہوتا ہے۔مطالعہ اور عملی تجارب کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو کچھ روحانیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔یہ ایک فن ہے۔جس طرح جسمانی کسرت سے انسان کی طبعی قوتوں میں ناقابل یقین حد تک اضافہ ہو جاتا ہے۔اسی طرح اس قسم کی ذہنی مشقوں انسان کی قوت ارادی اور تخیل میں ایسا اضافہ ہوجاتا ہے۔جس کا عام حالات میں تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔چونکہ جسمانی قوت کا مشاہدہ محسوس طور پر ہوسکتا ہے۔اس لیے اسے کوئی فوق الفطرت تصور نہیں کرتا۔لیکن قوت ارادی غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتی ہیں۔اس لیے اس کے مظاہر فوق الفطرت سمجھے جاتے ہیں۔جو قومیں علمی میدانوں میں ترقی کر گئی ہیں۔وہ اس حقیقت سے واقف ہوگئی ہیں۔جہاں ہنوز توہم پرستی کا دور دورہ ہے۔وہاں اسے روحانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کی مناجات کے موضوع کو اگر سمجھ لیا جائے تو''جاوید نامہ'' سمجھ میں آجاتا ہے۔روحانیت کا لفظ قرآن میں کہیں بھی نہیں ہے۔یہ ہے قابل غور بات! لیکن معراج کی جو مروجہ بنیاد ہے۔اس کی رو سے اس کا نام''جاوید نامہ'' ہی کیوں نہ رکھ لیں۔کیونکہ اس میں یہ سب کچھ موجود ہے۔''انقلاب اندر شعور'' میں زمان ومکان کا تصور ہے۔مختلف ہوجاتا ہے۔جبکہ اقبال اس کی

1273 بنیادوں پر چلتا ہے۔ جاوید نامہ کی پہلی مناجات میں سارا موضوع آ گیا ہے۔ اگر اس بنیاد کو نہ سمجھا جائے تو جاوید نامہ کی پہلی مناجات ہی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ اصطلاحات کا فرق ہے کہ اقبال نے ''انقلاب اندر شعور'' کہہ دیا۔ شعور تو عقل ہی ہوتا ہے۔ اور اہل تصوف اس کو روحانیت کہتے ہیں۔ جبکہ اہل مغرب اس کو عقل خالص (Pure-intellect) کہتے ہیں۔ ہم ان تمام چیزوں کو قلبی صلاحیتیں (Mental Faculties) کہتے ہیں۔ جب آپ عقل کہیں گے تو اس کا تعلق قلبی (Mental) ہو جائے گا۔ فوق العقل (Supra Rational) کوئی چیز نہیں رہے گی۔ ان کے ہاں شعور سے ماوراء کوئی چیز، کوئی نئی دنیا آ جاتی ہے۔ آپ شعور یا عقل کی جتنا چاہے نشوونما کر لیں اسے متعین کرتے چلے جایئے۔ وہ منطقی قوانین کے زیر اثر ہی رہتا ہے۔ عقل کی کتنی ہی بلند صورت کیوں نہ ہو۔ وہ ہمیشہ منطق کے قوانین کی شرائط کے مطابق ہی رہے گا۔ وہ ہمیشہ عقل کے تابع ہوگا۔ (Reason) جبکہ اقبال کا ''انقلاب اندر شعور'' تصوف میں جا کر منطق کے قوانین سے ماورا ہو جاتا ہے۔ ''کیونکہ یہ ایسا ہے اس کے بعد یوں ایسا ہوگا''۔ یہ ہے۔ (Law of logic)

منطق کا قانون:

وحی یا خاصۂ نبوت کے علاوہ قانون منطق سے ماورا ''شعور کے اندر انقلاب'' جیسی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اقبال کے ہاں یہ چیز کہ ''یہ کیوں ہے'' جیسا کہ نبی نہیں بتا سکتا تھا کہ وحی کیسے آ گئی؟ یہ خاصۂ نبوت قانون منطق سے ماوراء ہے۔ اس طرح یہ کہتے ہیں کہ تصوف کی رو سے شعور میں انقلاب آئے گا جو قانونِ منطق سے ماوراء ہوگا۔ جونہی ماورا ہوا تو وہ فوق الانسان ہو گیا (Supera Human) فوق العقل (Supera Rational)۔ فوق الطبیعاتی (Supera Physical) ہو گیا۔ یعنی ان کرامات کا ظہور ہو گیا۔ لیکن ان کے بقول عقل میں تغیر واقع ہوا۔ شعوری تغیر جب بھی فوق العقل ہوا۔ جب بھی فوق الطبیعاتی ہوا۔ منطق کے قانون کو اس نے للکارا۔ اور یہ تغیر اس پر حاوی ہوا۔ تو یہ نبوت ہو گیا۔ نبوت کا شعور منطق کے قانون سے ماوراء ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا کس طرح اور کیونکر ہو سکتا ہے لیکن نبوت کے انقلاب کا جو متن و مواد ہے وہ ہمیشہ منطق کے قانون کی شرائط مطابق ہوتا ہے۔

تصوّف کی پوری بنیاد، نبوّت کی مہر کو توڑنے کے درپہ ہے:

تصوّف کی حیرت ناک بات یہ ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ بھی منطق کے قانون کی شرائط کے مطابق نہیں ہوگا۔ اور اس کے اندر باطنی معنی ٹھونستے چلے جاتے ہیں باطنی معنی تو منطق سے ماوراء ہو جاتے ہیں۔ قانون منطق سے ماوراء صرف نبوت ہو سکتی ہے۔ یہ تصور ختم نبوّت کی مہر کو بھی توڑ دیتا ہے۔ جس قسم کا شعور کے اندر انقلاب اس کا مواد، واردات یا تجربات ہیں۔ وہ قانون منطق سے ماوراء چلے جاتے ہیں اسے نبوّت بنا دیتے ہیں کمیت کے درجہ کا فرق (Qualitative) کہہ کر اور وہ احتراماً یا خوف سے کہ کہیں

1273
رسول کے مقام پر ہی نہ جاملیں۔ ورنہ ابن عربی اس سے بھی تکلف نہیں برتتا اعلانیہ کہتا ہے کہ جس مقام سے نبی لیتا ہے۔ اس مقام سے ہم لیتے ہیں۔ یعنی سیدھی سی بات ہے نہ نبوت کا مواد منطق کے قانون کے تابع ہے اور نہ ہم منطق کے تابع۔ اس لیے تو یہ تمام صوفی استدلال اور دلیل و برہان کے خلاف لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ استدلال تو قانون منطق ہے اپنے تجارب کو قانون منطق کے سامنے نہیں کرتے۔ کہتے ہیں یہ تو ظاہریت پر مبنی ہے۔ یہ تو باطل ہے اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ تصوف کی بنیاد میں دلیل و برہان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ دلیل و برہان سے حاصل کردہ علم ان کے خیال میں بڑا ہی کمزور ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ اپنی واردات کو اس مقام پر لے جاتے ہیں جہاں وہ قانون منطق کے تابع نہیں رہ سکتیں۔ اور نبوت کا تو خاصہ یہی ہے یعنی اس کے متعلق نہیں بتایا جاسکتا کہ وہ ان کو کیسے ملی؟ اس کے علاوہ ہر فکر کے متعلق بتایا جاسکتا ہے۔ یہ اپنے اس علم کو قانونِ منطق سے بالاتر لے جاتے ہیں۔ یہی تو دعویٰ نبوت ہے ان کے علم کو ذرا قانون منطق کے ساتھ لائیے تو لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

علامہ کی اصطلاحات:

اقبال کے ہاں یہاں سے وہاں تک ثنویت (Duality) چلی آ رہی ہے۔ مثلاً عقل و عشق، خرد اور دل، ذکر و فکر، سوز و ساز یہ متضاد اصطلاحات جو اس کی وضع کردہ ہیں۔ عشق، دل، ذکر، سوز یہ تمام اصطلاحاتی قوانین منطق سے ماوراء ہیں۔ ان کے مقابل اصطلاحات خرد، فکر، عقل یہ ساری قانون منطق کے تابع آتی ہیں۔ جہاں جہاں ان میں ٹکراؤ ہوگا تو اقبال بھی عقل، خرد، فکر اور خبر کے پیچھے لٹھ لے کر پھریں گے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ رہ ہے، منزل نہیں ہے

صوفی کی واردات قانونِ منطق سے بالاتر:

صوفی قانون منطق سے ماوراء ہیں۔ قرآن کی رو سے نبوت کے علاوہ اور کوئی علم انسانی قوانین منطق سے ماوراء نہیں جاسکتا۔ اس لیے جہاں جہاں یہ منطق کے پیچھے پڑے ہوں تو جان لیں کہ وہ اپنے اس سرچشمۂ علم کا دعویٰ کر رہے ہیں جو قانون منطق سے بالاتر چلا جاتا ہے۔ جو چیز قانون منطق سے ماوراء ہوگی تو اس کے مظاہر کرامات یا معجزے ہوں گے۔ لیکن یہ جس کو تجارب واردات (Experiences) کہتے ہیں۔ وہ قوانین منطق کی شرائط کے مطابق نہیں ہوتے۔ یہ ہے بنیادی فرق۔ اس لیے ان کا سمجھنا اقبال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ جاوید نامہ (1929-1932) تین سال میں لکھی گئی تھی۔ اور جو دو شعر نکال

دیئے گئے تھے اس ایڈیشن میں وہ یہ ہیں۔

خیالِ من با تماشائے آسماں بود است
بدوشِ مہ و بآغوش کہکشاں بود است

میرا خیال آسمان سے اوپر کی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ چاند مرے کندھوں پر تھا اور کہکشاں میری آغوش میں تھا۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ما
کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بود است

یہ نہ سمجھنا کہ جو کرہ ارض ہے یہی ہمارا نشیمن ہے بلکہ ہر کبھی بسی ہوئی دنیا تھی یا اب بھی بسی ہوئی دنیا ہے۔

یعنی جو بسی ہوئی دنیا ہے میں اس کے اندر جا رہا ہوں نہ کہ اس کے اندر جو اجڑ گئی ہے۔ میں اس اجڑی ہوئی بستی میں نہیں جا رہا ہوں۔

چونکہ اس قسم کے لوگ اپنے زمانے سے آگے ہوتے ہیں وہ واقعی ذہنی طور پر تنہا تھے۔ اس احساس نے ان کو زندگی بھر پریشان کئے رکھا۔ ابتدا میں یہ بات کرتے ہیں: (ارمغان حجاز)

من شاید نخستی آدم از عالمِ دیگر

میں شاید کسی اور دنیا کا پہلا آدم ہوں۔ یہ تنہائی کی انتہا ہے۔ یہ ابتدا ہے اور انتہا یہ۔

ے چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک۔ (جب میں نے اپنا رخت سفر اس خاک سے باندھا)

ے ہمہ گفتند باما آشنا بود۔ (سب کہنے لگے کہ یہ تو ہمارا شناسا تھا)

ے ولیکن کسی ندانست ایں مسافر چہ گفت وبا کہ گفت واز کجا بود

(اس نے کیا کہا کس سے کہا اور کہاں سے آیا تھا)

ایک رونا تنہائی کا ہے جبکہ دوسرا رونا وحدت الوجود کے صوفی کا ہے کہ روح انسانی خدا کی روح کی جدائی میں تڑپ رہی ہے۔ اصل سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہے ڈاکٹر Jung (ژنگ) (1961) لکھتے ہیں تنہائی کے معنی یہ ہیں جو باتیں اس کے نزدیک نہایت اہم ہوتی ہیں کوئی ایسا نہیں ہوتا جس کو یہ باتیں سمجھا جاسکے۔ یا تنہا وہ ہے جس کے بعض خیالات دوسرے لوگ قابل قبول نہ سمجھتے ہوں۔ اصل یہ ہے کہ جب کسی شخص کا علم دوسروں سے بڑھ جائے تو وہ تنہا رہ جاتا ہے۔

تنہائی ایک نابغہ کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک عذاب ہے۔

شریکِ درد سوزِ لالہ بودم

ضمیرِ زندگی را وا نمودم
ندانم باکہ گفتم نکتۂ شوق
کہ تنہا بودم و تنہا سرودم
من اندر مشرق و مغرب غیرم
کہ از یارانِ محرم بے نصیبم
غمِ خود را بگویم بادلِ خویش
چہ معصومانہ غربت را فریبم

ابنِ عربی کے تصوّف میں فلسفیانہ دلائل:

یہی تصوف ایران، بدھ مت، عیسائیوں کی خانقاہوں میں جا پہنچا۔لیکن مسلمانوں نے جب ایران میں خانقاہیں۔ بنائیں تو ان کے ہاں یہی تصوف تھا۔ان کے پاس وحدت الوجود کے لیے دلائل نہیں تھے۔ یہ ابن عربی نے اس کے لیے فلسفیانہ دلائل دیئے۔ دنیا اس کی عظمت کو تسلیم کرتی ہے جبکہ یہی ان کی کمزوری تھی۔ حیرانگی یہ ہے کہ یہ صوفی عقل کو ناقص سمجھتے ہیں مگر سارے دلائل عقل کے بل بوتے پر دیتے ہیں۔ ابن عربی نے عقلی دلائل سے وحدت الوجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں تک تو فلسفہ ہے۔ اس کے بعد یہ ثابت کرنے کے لیے عقلی دلائل دیئے کہ عقل کی رو سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے سند مانا جائے۔

اقبال کی مُناجات:

(دعا، عرض، التجا، خدا کی بارگاہ میں اسے حاضر جان کر دعا کرنا، یہ مُناجات کہلاتا ہے)

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ
ہر زماں گرمِ فُغاں مانندِ چنگ

ہر لمحہ ستار کی طرح محو فغاں رہتا ہے۔ رومی نے ''نَے'' کہا ہے۔ ہفت رنگ سے مراد اس میں جاذبیتیں، تنوع ہے۔ کیوں گرم فُغاں ہے؟

آرزوئے ہمنفس می سوزدش
نالہ ہائے دل نواز آموزدش

ایک ہم نفس کی آرزو ہے پس یہ اسے جلاتی رہتی ہے۔ یہی شے اس کو نالا ہائے دل تو سکھاتی رہتی ہے۔ آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

لیکن ایں عالم کہ از آب و گل است

کے تواں گفتن کہ دارائے دل است

یہ دنیا تو مادی دنیا ہے۔ یہ کس طرح یہ دل کا محبوب ہوسکتی ہے؟

درائے دل، دل کی ملکیت، دل کا محبوب، یہ دل کی ہم نفس نہیں ہوسکتی مادی دنیا اور دل کی دنیا میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے اس دنیائے ہفت رنگ میں ہم نفس کیسے مل سکتا ہے۔؟

بحر و دشت وکوہ و کہ خاموش و کر
آسمان و مہر و مہ خاموش و کر

(کہ۔ کاہ کا مخفف۔ گھاس۔ تنکا اور کر سے مراد بہرہ)

(سمندر، صحرا، پہاڑ اور زمین سارے خاموش اور بہرے ہیں)

گرچہ برگردوں ہجومِ اختر است
ہر یکے از دیگرے تنہا تر است

(ہجوم اختر۔ ستاروں کا ہجوم۔ اس جہان ہفت رنگ کی خاموشی اور تنہائی کا ذکر ہو رہا ہے)

ہر یکے مانندِ ما بیچارہ ایست
در فضائے نیلگوں آوارہ ایست
کارواں برگِ سفر ناکردہ ساز
بیکراں افلاک و شبہا دیرباز

ساز کردن۔ سامان سفر تیار کرنا۔ اب اس قافلہ کی کیفیت یہ ہے کہ بیکراں۔ سفر ہے اور سامان سفر ابھی تک تیار ہی نہیں کیا۔ دیر باز۔ سستی سے حرکت کرنا۔ راتیں حرکت کے اعتبار سے بڑی سست ہوتی ہیں۔

ایں جہاں صید است و صیادیم ما
یا اسیرِ رفتہ از یادیم ما

ہم شکار ہیں اور یہ دنیا شکاری ہے۔ ہم اس میں گرفتار ہیں یا ایسا قیدی جن کو قید کرنے کے بعد بھلا دیا گیا ہے یعنی دنیا ایک جیل خانہ ہے۔ اس میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔

زار نالیدم صدائے برنخواست
ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست؟

میں زار و قطار رویا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ یہاں آدم کے بیٹے کا ہم نفس کہاں ہوگا۔؟

وحدت الوجود:

اب اس جہاں میں تو ہم نفس نہیں مل سکتا تو زبان ومکان سے ماوراء جانا چاہیے۔

دیدہ ام روزِ جہانِ چار سوئے
آنکہ نورش برفروزد کاخ و کوے

یہ محدود جہاں چاہااس میٹریل ورلڈ کا روز یعنی پیریڈ دیکھ لیا ہے جس کے نور سے یہ محلات اور کوچے روشن ہو جاتے ہیں۔

از رمِ سیارۂ او را وجود
نیست اِلا اینکہ گوئی رفت و بود

اس کا وجود سوائے گردش کرنے کے کچھ نہیں ہے۔یعنی اگر گردش نہ ہو اس سیارے کی تو یہ رات دن ختم ہو جائیں۔اس کے سوا کچھ نہیں بس یہ تھا اور چلا گیا یہ جو سیریل ٹائم ہے یہ تو ہے بس۔صبح دس بجے تھے گوئی رفت و بود، اس کی کیفیت یہ ہے وہ تھا اب نہیں ہے اور آئندہ وہ نہیں ہوگا۔

اے خوش آں روزے کہ از وایام نیست

مبارک ہوگا وہ دن جس میں یہ سیریل ٹائم نہ ہوگا۔از ایام نیست۔دنوں میں اسے نہ گنا جائے۔سیریل ٹائم میں نہ ہو۔

صبح اُو را نیمروز و شام نیست

جب اس کی صبح ہو تو نہ دوپہر ہو اور نہ شام یعنی وہ جہاں چارسو میں گھرا ہوا نہ ہو۔

روشن از نورش اگر گردد رواں

یعنی اس بلا دورانیہ زماں کی روشنی سے جان یا روح روشن ہو جائے۔اب تبدیلی شعور سے ہمارے حواس میں کیا تبدیلی ہو؟

صوت راچوں رنگ دیدن می تواں

آواز کو رنگ کی طرح دیکھا جاسکتا ہے یعنی آواز کو رنگ کی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔آواز کی طرح رنگ سنائی دے گا۔یعنی آنکھ اور کان کا فعل بدل جائے گا۔

غیب ہا از تابِ او گردو حضور

تو غیب حضور بن جائے گا۔یعنی اس کے نور سے مستقبل حال بن جائے گا۔

نوبتِ او لایزال و بے مرور

ایسے دن کے آشنا کا وقت ہمیشہ رہنے والا اور کبھی نہ ختم ہونے والا بن جاتا ہے۔اقبال اسے ''Eternal Now'' کہتا ہے۔(نوبت: کسی چیز کا وقت۔باری۔نقارہ)

اے خدا روزی کُن آں روزے مرا

روزی کن۔میرے نصیب کردے۔ایسا دن جس میں سریل ٹائم نہ ہو۔حواس بدل جائیں۔نہ صبح ہو نہ شام، یہ انقلاب شعور ہو۔

وار ہاں زیں روزِ بے سوزے مرا

مجھے اس بے سوز دن سے رہائی دیدے۔

یعنی یہ جو مادی دنیا میں گھرا ہوا ہے۔ ایام بے سوز ہے۔ اور ''وارہاں'' رہا کردے۔

آیۂ تسخیر اندر شان کیست؟

قرآن کی آیۂ تسخیر کس کی شان میں آئی ہے؟

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط (45:13)

اب یہ کمرے میں بیٹھ کر اس واردات سے صاحب تسخیر فطرت ہو گئے۔ اب نہ زمان رہا یہ مکان تو اس سے اونچے ہو گئے۔

ایں سپہر نیلگوں حیران کیست؟

یہ نیلا آسمان حیرانگی سے کسی کو دیکھ رہا ہے؟

راز دانِ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کہ بود

(وہ کون تھا جس کو وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31) کا راز دان بتایا۔ اب یہ اسما کے علم کو وہی لا ہوتی علم لیتے ہیں۔ جس سے یہ باطن کے واردات طے ہو جاتے ہیں۔

مست آں ساقی و آں صہبا کہ بود

ساقی اور صہبا اس کا نشہ کس کو آیا۔ صہبا۔ صہب۔ سرخ و سفید شراب۔

برگزیدی از ہمہ عالم کرا

کون ہے جس کو ساری کائنات میں تو نے برگزیدہ یعنی افضل قرار دیا ہے۔

کردی از رازِ دروں محرم کرا؟

(کس کو یہ اندرونی راز سکھانے سے محرم کر دیا؟)

اے ترا تیرے کہ ما را سینہ سفت

(تیرے تیر نے تو ہمارے سینہ کو چیر ڈالا۔)

حرف اُدعونی کہ گفت با کہ گفت

(مجھے پکارو کا حرف کس سے کہا تھا؟)

قرآن میں ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط (40:60) انسان کا بلانا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اس کے برابر کا ہو۔ بلانے کی قوت تو نے اس کو دی ہے۔ اس کے بعد کہا کہ میں اس کا جواب دونگا۔ ان کا یہ فلسفہ مارٹن بیوبر کا ہے ''One who can't say I, can't say thou'' اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب اس میٹریل دنیا سے اونچا ہو جائے۔ ''تو'' بلانے سے یہ ادراک تو کافی نہیں ہو سکتے۔ ان حواس سے اونچا جانا ہوگا۔ تو تیرے بلانے سے یہ ثابت ہوا کہ یہ جہانِ بلا بُعد اور بلا وقت میں ممکن ہے۔

روئے تو ایمانِ من قرآنِ من

(ترا چہرہ میرا ایمان ہے، میرا قرآن ہے۔یعنی خدا کا دیدار کرنا چاہتا ہے۔حالانکہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103) یہ تو حواس سے بالا ہے۔اس لیے یہ وحی احد قرآن کی قیود کو پس پشت ڈال کر اب کس کو دیکھنے کے متمنی ہیں۔)

جلوہ داری دریغ از جانِ من

(جب تو میرے لیے یہ کچھ ہے تو پھر اس جلوہ سے دریغ کیسا۔دریغ سے مراد الگ کرنا ہے۔نہ دینا۔چھپا کر رکھنا۔)

از زیانِ صدِ شعاعِ آفتاب
کم نمی گردد متاعِ آفتاب

سورج کی سینکڑوں شعاعوں کے نقصان سے بھی کبھی سورج کی روشنی کی متاع میں کمی تو نہیں آتی۔وحدت الوجود کے سلسلہ میں آفتاب اور اس کی شعاعوں کی غلط منطق: یہ کہنا کہ آفتاب کی سو شعائیں اگر کسی کے اندر جذب ہو جائیں تو آفتاب کی متاع میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔یہ بڑی غلط منطق ہے۔آفتاب کی متاع میں کمی واقع ہوتی ہے جو کرن بھی نکلے۔یہ الگ بات ہے کہ اس کی متاع اتنی زیادہ ہے کہ کروڑوں سال لگ جائیں ''یہ کہنا غلط ہے'' کم نمی گردد شعاعِ آفتاب۔اگر خدا، انسان اور آفتاب کا تعلق ہے تو ہر وہ کرن جو خدا کے سرچشمہ آفتاب سے نکلے گی۔انسان اگر اسے جذب کرے گا تو وہاں کمی ہو جائے گی۔یہی دلیل وحدت الوجود کے خلاف ہے۔اگر وہ خدا کی ذات کا حصہ ہے تو جو یہاں آتا ہے۔تو حصہ الگ ہونے کے بعد تو ذات میں نقص رہ جاتا ہے۔وہ کل نہیں رہ سکتا۔خواہ وہ آفتاب کی ایک کرن ہی کیوں نہ ہو۔سارا تصوف تشبیہات پر چلتا ہے۔دلیل پر نہیں۔تشبیہ جتنی برجستہ ہوگی اتنی ہی وہ کھب جائے گی۔شاعری تشبیہ کے اندر اکملیت (Perfecion) پر پہنچتی ہے۔شاعری ہے ہی تشبیہ اس طرح تصوف کی پیش کردہ تشبیہات منطق کے سامنے بالکل بے معنی ہیں۔اقبال بلا مدت زمان و بلا بُعد مکان سے اونچا ہو کر جانا چاہتا ہے کیونکہ اس میٹریل دنیا میں تو ان حواس یعنی ادراک سے ممکن نہیں ہے تو اس سے ان کا مقصد کہ ایک دوسرا ذریعہ علم بھی ہے وہاں پہنچنے کے بعد تیرا چہرہ سامنے آسکتا ہے قرآن کے بقول تو نہیں آسکتا تو تو سامنے آنے سے دریغ نہ کر۔

اقبال کی پہلی تصنیف اَسرارُ و رموز یعنی اَسرارُ خودی اور رموزِ بے خودی کا پہلا حصہ اسرارِ خودی 1915ء میں اور دوسرا ''رموزِ بے خودی'' 1918ء میں چھپا۔رموز کے آخر میں لکھتا ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔قرآن سے لکھا ہے اگر ایک حرف بھی اس سے باہر ہو تو مجھ پر لعنت ہو۔تو خود ان کا یہ بیان پابند ہو گیا کہ اس کے کلام کو پرکھنے کی کسوٹی قرآن مجید ہے۔اس لیے اس کے کلام کو قرآن کے سامنے پیش کریں جس چیز کی تائید وہاں سے ملے تو کہیں گے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔جہاں بات اس کے خلاف جائے گی تو کہیں گے کہ عہد کی پابندی کے باوجود ان سے سہو ہو گیا ہے۔وہ بات کو سمجھا نہیں۔اقبال پیغمبر تو نہیں ہے کہ اس کے ہر لفظ کو تسلیم کرنا ہمارا جزوِ ایمان ہو۔

یاد رکھیں کہ حقائق مابعد الطبیعات میں اقبال قرآن سے دوسری طرف نکلا ہے مگر پیغامات میں اقبال بڑی حد تک قرآن کے ساتھ ہے۔اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

فلسفہ مادیّت (Materialism) یا ثبوتی Positiveism یعنی ثبوتیّت

دوسرا فلسفۂ مثالیّت (Idealisticism) ہے

''Word of illusions or idea'' افلاطونی فلسفہ کہ یہ دنیائے محسوسات درحقیقت موجود ہی نہیں۔ یہ محض سراب ہے۔اصل دنیا اس سے ماوراء ہے۔ یہ محسوس دنیا اس کا سایہ ہے۔اور جو قومیں اس میں آگے بڑھیں اس نقطۂ نظر کو مثالی فلسفہ کہا جاتا ہے۔

اب فلاسفی کی دو اقسام ہوگئیں۔ ایک تو مادیت۔ ثبوتیت۔ یعنی Positiveism یا (Materialism) یا (Concretism)۔ یعنی کائنات مبنی پر حقیقت ہے۔فلسفہ یونانی تو تصوف نے اپنایا۔اوران کا رویہ کائنات سے بے تعلقی کا رہ گیا۔اور یہ ہماری تباہی کی اصل وجہ ہے۔انہوں نے اسے ''سب کچھ خدا ہی کے مختلف روپ ہیں'' جو کچھ نظر آ رہا ہے۔ یہ موجود نہیں ہے۔ یعنی واجب الوجود صرف خدا کی ذات ہے۔ یعنی ضرورت سے ماوراء موجود رہنا ہے۔ فلسفہ میں ضرورت سے ماوراء (Off Neecssity) کے معنی مطلقیت کے ساتھ لابدی (Absolutely Must) ہوتے ہیں اس کی ہستی مطلقاً از بس لا ینفک یعنی ''Absolutely Must'' ہے اس کے علاوہ کوئی اور شے موجود نہیں ہے۔

موجود کے معنی وجود والی۔ تو اب لَا مَوْجُوْدٌ اِلَّا اللہُ یا لَا مَوْجُوْدٌ غَیْرَ اللہِ۔ تصوف والے یہ فقرہ عموماً استعمال کرتے ہیں۔ کوئی شے Exist نہیں کرتی۔ یہ سب وہی خدا ہے۔ اس کائنات کی باہر کی چیزیں بھی وہی خدا ہیں۔ اس کے بعد یہ سارے انسان بھی وہی ہیں تو بھی وہی۔ میں بھی وہی۔ ہر انسان وہی ہے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر
خود گلِ کوزہ خود رند و سبوکش
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار
برآمد، بشکست و رواں خود

یہ خدا مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔

1273 یہی افلاطونی نظریہ ایرانی آتش کدوں سے ہوتا ہوا ہندوستان میں ویدانت بنا۔ دنیا مایہ اور فریب ہے۔ کسی نے کہا ایشور کا خواب ہے۔ یہ اس کی رچائی ہوئی لیلا ہے یعنی تماشہ ہے۔ لیکن آتما، پرم آتما ہے۔ آتمائیں باقی ساری اس آتما کا جزو ہیں۔ یعنی وہی ''ہمہ اوست''

ہمارے ہاں وحدت الوجود یعنی وجود صرف ایک خدا کا اور کوئی وجود نہیں ہے صرف اس کے روپ الگ الگ ہیں۔ یہ فلسفہ ہمارے ہاں جاگزیں ہوا۔

اور خالص کفر کا فلسفہ عین مغزِ دین بن گیا۔

ماز قرآن مغزرا برداشیتم
استخواں پیشِ سگاں انداخیتم

(ہم نے دین کا مغز پالیا ہے باقی سب ہڈیاں ہیں جو کتوں کے آگے ڈال دی ہیں۔)

یہ ہمہ اوست۔ وحدت الوجود۔(Pantheism) میں جب انسان Exist نہیں کرتا تو پھر انسانی ذات ہی ختم ہوگئی۔ اور دین کا اصل محور و معیار تو یہ ذات ہے۔ خیر و شر کا سارا تصور تو ذات کے تصور سے وابستہ ہے۔ تو اس تصوف نے تو آ کر سارا سلسلہ ہی ختم کر کے رکھ دیا۔

جبکہ فلسفۂ مادیت کے ہاں تو مادہ ہی موجود ہے اور ماورائے مادہ کچھ موجود ہی نہیں ہے اور دوسری طرف انتہا پسندوں کے نزدیک خدا اور شخصیتیں کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ یہ مادی دنیا ہے اور مادہ کی مختلف اشکال ہیں۔ اس میں بھی وہی وحدت الوجود کا تصور ہے کیونکہ خدا کا تصور، جو ہدایات دے رہا ہے اور انسان کو ذات دینے والا ہے جب یہ تصور درمیان سے نکل گیا تو گویا یہ بھی وحدت الوجود کا تصور ہو گیا۔ مادیت میں کوئی جذباتی چیز نہیں تھی۔ تصوف نے اس میں جذبات کی آمیزش کر دی اور اس کا نام وحدت الوجود رکھ دیا۔ نتیجہ کے اعتبار سے بالکل وہی چیز ہے یعنی انسان کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کا خدا نہیں ہے اور انسان سے تعلق بھی نہیں ہے۔ اس لیے خدا کے متعلق دو چیزیں آئیں۔ ایک تو یہ کہ خدا اس کائنات سے ماوراء الماوراء ہوا (Transcendence of God) ان کی اصطلاح میں عرش پر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ اس کائنات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ہے ماورائیت (Transcendence) فلاسفی میں اس قسم کے خدا کو ماننا الٰہیت کہلاتا ہے۔ اس سے تجسیم خدا صاحبِ جسم یعنی (Personal God) کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا نظریہ کہ خدا کائنات میں ہر جگہ ہے۔ اگر کائنات میں خون کی طرح بہہ رہا ہے یہ اس طرح سے تشبیہاً کہتے ہیں۔ یہ ہوا Immanance of God ماوائیت خدا۔ ہمہ اوسیتِ خدا یعنی خدا ہر جگہ موجود ہے۔ یعنی کائنات اور خدا ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ خدا کائنات سے الگ اور نہ کائنات خدا سے الگ کوئی وجود رکھتی ہے۔ یہی (Pantheism) کا عقیدہ ہے۔ یعنی ہر شے خدا ہے۔ یہ (Theism) ہے۔ ہمہ از اوست نظریہ۔ Theism بھی خدا کی احدیت کو کہتے ہیں۔ Deism میں بھی God ہے وہ خدا جسے الٰہیت (Deism) کے اندر تجسیم خدا ''Personal God'' کہتے ہیں۔ God is Concieved as a person۔ اب یہ تجسیم تو کسی خاص مکان میں ہونا چاہیے۔ اس لیے خدا کا ادراک تجسیم کیا

1273 جاتا ہے۔ اور یہ خدا کا ادراک جو بطور ایک تصور ہے۔...... ماوائیتِ خدا کے اندر آتا ہے۔ ایسا خدا کائنات کے اندر ہے۔ اگر وہ ماوراء ہے تو مکان میں الگ ہو گیا۔ اب وہاں بیٹھا ہے کائنات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی اس کے لیے Space الگ ہوگئی۔ یہ دونوں تصورات بھی غلط ہیں۔

قرآن نے کائنات کو بالحق یعنی ٹھوس، محسوس نتیجہ خیز، بامقصد قرار دیا اور صرف خدا کو اس کا خالق قرار دیا:

قرآن نے دو دو الفاظ میں ان باطل عقائد کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس افلاطونی نظریہ کو ایک لفظ میں کاٹ دیا۔ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ (29:44) یہ ارض وسما بالحق یعنی ان کا وجود Exist کرتا ہے وہ خالق ہے اور یہ اس کی محسوس، ٹھوس، بامقصد تخلیق ہے۔ یہ نہ سراب ہے۔ نہ تماشہ بلکہ مقصد ہے۔ نتیجہ خیز ہے۔ خالق یعنی فاعل مخلوق سے الگ ہو گیا۔

ذات خداوندی زمان و مکاں کی قید سے ماوراء ہے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ خالق بھی ہو اور مخلوق بھی۔ خالق مخلوق سے الگ ہو گیا۔ ہمہ اوست اور ماورائیت ''Immanence and Transcendence''، ہمہ اوسیّت وہ مخلوق تو ہو نہیں سکتا اور نہ کسی مکان کے اندر آسکتا ہے۔ کہا هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3) اس کے بعد یہ بھی غلط ہے کہ وہ کائنات سے ماورا تجسیمی ہو کر بیٹھ گیا۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ (57:4) وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں جہاں بھی ہو۔ دونوں نظریۂ باطل کاٹ دیئے۔ نہ تو وہ تجسیمی خدا ہے جو کسی مقام کے اندر محدود ہے۔ ہمہ اوستِ کائنات ہے لیکن اس سے خارج نہیں ہے بلکہ

(He is inside the universe but not bound within it)

کسی خاص مقام میں محدود نہیں ہے۔

قرآن کی رو سے دونوں تصوّرات باطل ہیں۔ اس کی رو سے خدا Immanent ماوائیّت۔ ہمہ اوست ابھی ہے۔ اور (Transcendent) ماورائیت کائنات بھی ہے۔ کائنات کے اندر مگر اس میں محبوس نہیں۔ کائنات سے باہر مگر اس سے خارج (Exclude) نہیں۔ وہ کائنات کا خالق اور اس کی مخلوق کائنات۔ اس کی الوہیاتی توانائی کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ اسے خدا کا امر (Directive) کہا جاتا ہے۔ اسے Time میں ابدیت حاصل ہے۔ (Eternity)

اس لیے هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (57:3) اس کی شان ہے۔ وہ مکان (Space) میں لامحدودیت (Infinity) کا مالک ہے۔ اس لیے وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3) اس کی صفت ہے۔ وہ کائنات سے الگ ہو کر نہیں بیٹھا اور نہ کائنات کی ہر شے خدا ہے اس لیے تجسیمی خدا Personal God اور وحدتِ وجود (Pantheism) کے دونوں تصورات غلط ہیں غیر قرآنی ہیں۔

خدا کی تخلیق کردہ انسانی ذات کے لیے ایک معیار:

قرآنی تصور کے تحت انسان تخلیق ہوا اب اس کو ایک شخصیت یعنی ذات عطا کر دی گئی۔ (پرسانلٹی) اور شخصیت بھی خدا کا

1273

حصہ نہ رہی کیونکہ یہ مخلوق ہے۔ یہ خدا سے الگ ایک چیز ہوگئی۔ اب انسانی ذات کا تصور خیر وشر کا تصور دیتا ہے۔ خیر ذات کو تقویت (Integrate) جبکہ شر اس کو (Disintegrate) کرتا ہے اب خیر وشر کے لیے ذات معیار بن گئی۔ اب اس کی نشوونما کے لیے کوئی فوق التجسیم معیار (Supra-Personal Standrad) ہونا چاہیے۔ جس سے ماپ کر یہ ہر وقت دیکھتی رہے کہ اس کی نشوونما ہو رہی ہے یا کمزوری آ رہی ہے۔ لیکن اس معیار کو لازماً فوق التجسیم ہونا چاہیے۔ یعنی انسانی ذات سے بالاتر۔ یہ معیار خدا کی ذات ہے۔ جو نشوونما یافتہ ذات انسانی کے ادراک کا اہم ترین بنیادی وصف ہے۔ اب ایک ذات خاصیت وا کملیت کے لحاظ سے اعلیٰ ہے اور دوسری نچلی سطح کی ہے۔ اس لیے انسانی ذات محدود (Finite) پیمانہ کے اندر خصوصیات رکھے گی اور لامحدود معیار خدا کی شخصیت کا ہے۔ اب انسانی شخصیت کے لیے ایک سٹنڈرڈ مل گیا۔ ساتھ ہی خیر وشر کا پیمانہ بھی قرآن میں دیدیا گیا تاکہ خیر سے ذات کو مضبوط کرے اور شر اس کو پژمردہ کردے۔ اب یہ چیز بھی مل جانے سے کائنات بالحق ہوگئی۔ یہ ہے مثبت تصور جو قرآن نے آ کر دیا۔

❁❁❁

اَسرارِخودی میں افلاطونی نظریہ ’’ہمہ اوست‘‘ کی مخالفت مگر دوسری جگہ تضاد

اقبال افلاطون کو اپنی پہلی کتاب ’’ اَسرارِخودی‘‘ میں ’’ازگروہِ گوسفنداں قدیم‘‘ کہہ کر خوب رگیدتا ہے۔ (بھیڑیوں کے گروہ سے) مگر یہاں نجانے اقبال کوکیا ہوجاتا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ کائنات میں ہر آن تغیرات آتے ہیں مگر خدا کی ذات ان تغیرات سے ماوراء ہے۔ جبکہ انسانی ذات نشوونما پاکر مستحکم ہوتی ہے۔ تغیر ذات کی فلاسفی یہ ہے کہ اگروہ کوئی شے ہے تو پہلے اس میں تغیر آتا ہے۔ پہلے اس کا وجود معدوم ہوجاتا ہے پھر اس کی تشکیل نو ہوتی ہے مگر باردیو کے الفاظ میں انسانی ذات کچھ یوں ہے کہ تغیر میں عدم تغیر کا نام ذات ہے۔’’changelessness in change‘‘ اور برگسان کے الفاظ میں ہم میں تغیر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر۔’’We change without ceasing to exist‘‘

یہی تصور اقبال کے ہاں ملتا ہے۔اس جہاں تغیر میں شخصیت کی ایسی نشوونما کہ یہ تغیرات اس پر اثر انداز نہ ہوں۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

تغیر کی فلاسفی کی رو سے جس چیز کو ثبات ہے وہ چیز تغیر ہے۔لیکن ذات کے بارے میں ’’بااضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ‘‘ یعنی جسمانی تلاطم خیزیوں کی مثال صدف یا سیپ سے دی جاسکتی ہے۔لیکن جسم انسانی تغیرات کے تابع آتا ہے۔لیکن اس کے اندر جوذات ہے۔سیپ کے اندر موتی، یہ تلاطم خیزیاں اس پر اثرانداز نہ ہوں یہ قرآن کے بالکل مطابق ہے۔

اقبال پر تصوف کا اثر اکثر وبیشتر دکھائی دیتا ہے۔اور وہ غیر شعوری طور پر آتا ہے۔ جو شاعری کے لیے بڑا مفید ہوتا ہے۔ اس میں پھر کہیں افلاطونی نظریہ کی اور کہیں نظریہ مثالیت کی بھی تائید ملتی ہے۔کبھی ویدانت اور کبھی ’’ہمہ اوست‘‘ کی تائید مل جاتی ہے اور رومی تو ’’ہمہ اوست‘‘ کا بادشاہ ہے اور بعض جگہ اقبال ہمہ اوست کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

عصرِ حاضر راخرد زنجیر پاست
جانِ بے تابے کہ من دارم کجا است؟

1273
خرد موجودہ زمانے کے پاؤں کی زنجیر ہے۔یعنی دور حاضر کا انسان عشق کے جذبہ سے ناواقف ہے وہ ہر بات میں عقل پر بھروسہ کرتا ہے۔ یہ ہے، میٹریلسٹک تصور یہ ہے مغربی تہذیب۔ اقبال بال کٹوانا، ان کی موسیقی اپنانا، ان کا لباس، ان مظاہر کی اکبر الہ آبادی بھی مخالفت کرتا ہے مگر اقبال ان مظاہر کو چھوڑ کر تصور مادیت کے خلاف جاتا ہے۔''خرد زنجیر پاست'' خرد کی اپنی محدود بندشیں پیش ہوتی ہیں ان سے آگے یہ نہیں جاسکتی۔ کیونکہ اس کی معلومات کا دارومدار حواس پر ہے اور حواس ایک خاص حد سے آگے نہیں جاسکتے۔ اس لیے ان سے حاصل معلومات بھی محدود ہونگی۔ یہ ہے وہ پاؤں کی زنجیر۔ جبکہ اس کے مقابل وحی تو زنجیر پا نہیں ہوگی اگلے شعر میں یعنی مجھ جیسی سوز سے معمور ذات دور حاضر میں کہاں ملے گی؟

علم تا از عشق برخوردار نیست
جز تماشہ خانۂ افکار نیست

یہ علم بھی فکر کی دنیا میں پھرتا رہتا ہے اس کا عشق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایں تماشہ خانۂ سحرِ سامری است
علم بے رُوح القدس افسونگری است

یہ علم تو سامری کے جادو خانہ کا تماشہ ہے۔ اور روح القدس کے بغیر یہ علم تو صرف جادوگری ہے۔ سحر سامری کہنے سے وہی افلاطونی نظریہ کہ جو چیز نظر آتی ہے وہ حقیقت میں نہیں ہے یہ نظریہ سراسر غیر قرآنی ہے قرآن نے علم انسانی کو ادراک کے ذریعہ حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾ (17:36)

علم تمہارے حواس کا پیدا کردہ ہے۔ اس لیے اسے سحرِ سامری کہنا افلاطونی نظریہ کی توثیق ہے۔ اب تصوف میں جا کر پھنس جاتا ہے۔ اور اسے روح القدس، سوز وگداز یا علم کے ساتھ عشق کی آمیزش کہتا ہے۔ جبکہ میں ان تمام اصطلاحات کو وحی سے تعبیر کرتا ہوں۔ قرآن تو ساری تعلیمات اور محسوسات کو اس دنیا تک محدود رکھ کر بعد کی زندگی کو تمثیلاً بتاتا ہے۔ اب اقبال ''آنسوئے افلاک'' اس ارضی دنیا میں جانا چاہتا ہے جبکہ قرآن اس سے روکتا ہے۔ اقبال جس علم کے حصول کا متمنی ہے وہ صرف رسولوں کو حاصل ہوسکتا تھا اب یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا ہے۔ اگر قرآن کے علم کے ساتھ انسانی علم کی آمیزش ہو تو پھر ٹھیک ہے مگر یہ کہنا کہ علم کا جو ذریعہ رسولوں کو حاصل ہوا جو اَسرار ان پر افشاں ہوئے مجھ پر بھی ہو جائیں تو اس سے مراد تو صوفیانہ واردات ہی ہوسکتی ہیں۔ وحی تو ہو نہیں سکتی۔ ابن عربی کا بھی تو یہی دعویٰ ہے کہ ہم اس مقام سے لیتے ہیں جہاں سے اور رسولوں نے لیا۔ یہی تو جھگڑا ہے ان سے۔ خالی علم تو رہنما نہیں ہوسکتا اسے تو وحی کے تابع ہونا چاہیے۔ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ (6:119)
ان اکثریت کی باتیں اپنے خیالات ہوتے ہیں اس کی بنیاد وحی کے بغیر ہوتی ہے۔ آگے خبر کو لتاڑا ہے جو حواس خمسہ سے ملتا ہے۔

ایں جہانِ کوہ ودشت و بحر و بر
ما نظر خواہیم اُوگوید خبر

یعنی خبر کا کوئی اعتبار نہیں اصل تو نظر ہے قرآن میں اس نظر کو اہمیت نہیں بلکہ اصل مقام تو خبر کا ہے۔ جو اُولی الالباب کہلاتے ہیں۔

زیرِ گردوں خویش را یا بم غریب
زآنسوئے گردوں بگو فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ
تا مثال مہرومہ گردد غروب
ایں جہات و ایں شمال وایں جنوب

دنیائے مکاں اس طرح غروب ہوجائے جس طرح چاند سورج غروب ہوجاتے ہیں۔ ''فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ ''(2:186) والی کیفیت میں یہ زماں ومکاں کے تصورات مٹ جائیں۔

از طلسمِ دوش و فردا بگذرم
ازمہ و مہر و ثریا بگذرم

زماں کی لامحدودیت پہنچ کر یعنی وحدّت الوجود میں پہنچ جاؤں۔

آنیم من جاودانی کن مرا
از زمینی آسماں کن مرا
ضبط در گفتار و کردارے بدہ
جادہ ہا پیداست رفتارے بدے

(راستے ظاہر ہیں ان پر رفتار عطا کر)

نوجوانوں سے مخاطب:

برجواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرشاں پایاب کن ژرفِ مرا

(شاں۔ایشاں۔ان کے لیے، پایاب۔آسان، ژرف۔گہری سوچ)

زندگی کے متعلق اقبال کا فلسفہ

اقبال کے فلسفہ کا استاد میکٹیگرٹ (Mctaggart) کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال اس سے متاثر تھا:

اس کا فلسفہ یہ تھا یہ کائنات افراد کی رفاقت وشراکت کا نام ہے۔(Universe is the association of individuals) زرفاقت وشراکت یعنی Association کا نام کائنات ہے۔اقبال نے اسی فلسفہ کو پیش کیا ہے۔

زندگی کلی طور پر انفرادی ہے۔اور خدا بھی ایک فرد ہے۔ ہمارے ہاں فرد کا تصور تو نہیں آسکتا مگر اس کے ہاں خدا کا تصور فرد کا ہے(An individual)

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۞ (112:1) احد کے معنی یہ انفرادیت کرتا ہے۔کہتا ہے کہ اگر ہم اسے عالمگیر (Universal) مان لیں تو اس میں احدیّت نہیں آسکتی۔ اسے احد اس وقت کہا جائے گا جب وہ ایک الگ مرکز تجارب ہو جائے گا یا اس کی الگ انفرادیت ہوجائے گی۔ کیونکہ واحد تو صرف نمبر کے لیے ہے۔ یہ درست ہے جو اس نے کہا کہ وہ ایک ہے۔قرآن نے جب ''احد'' کہا تو اس سے مراد احدیت ہے انفرادیت نہیں ہے۔اس لیے'' خدا بھی بحیثیت انفرادی زندگی ہے اور زندگی تو جہاں کہیں بھی ہے۔ انفرادی ہے۔منفرد ہے۔عالمگیر زندگی نام کی کوئی شے نہیں ہے۔''

اب اس فرد کے اندر یہ زندگی کیسے آگئی؟ اہل تصوف کے مطابق وہ جو واجب الوجود خدائے واحد (Individual God) اس کی خودی نے چاہا کہ میں غیب سے حضور میں آجاؤں۔حضور سے مراد محسوس پیکر یعنی خودی کے اندر جو تقاضا تھا اس سے وہ محسوس پیکروں یعنی اس زندگی کے اندر آگئی۔

بر ضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی
برکنارہ برفگندی دُرِ آب دارِ خود را

میں تو تیرے ضمیر کے اندر سو رہا تھا تو با جوش خودنمائی اس موج سے اچھل آئی اس موج نے اس درِ آبدار کو کنارے پر خود ہی پھینک دیا۔یوں خودی اس مادی پیکر میں آگئی۔

نخستیں روز آفرینش نکوہش می کند آسمان زمین را۔(کائنات کی پیدائش کے پہلے دن آسمان زمین کو ملامت کر رہا ہے۔)

1273
زندگی کے معنی خود خدا ہے۔ لائف کیپٹل ''L'' سے اور لائف جب ان پیکروں میں آ جاتی ہے تو اس کے لیے چھوٹا ''L'' ہے۔

زندگی از لذتِ غیب و حضور
بست نقشِ ایں جہاںِ نزد و دور

زندگی نے غیب وحضور کی لذت سے یہ نزدیک و دور جہاں پیدا کیا۔ یعنی زماں (Space) کی دنیا وجود میں آ گئی۔ یہ اس خودی کا تقاضا تھا۔

زندگی کے متعلق اقبالی فلسفہ:

تخلیق کائنات کے سلسلے میں تارِ نفس کی ایک کڑی زمان کے مرحلہ میں آ کر کئی شاخوں میں بٹ گئی۔

آں چناں تارِ نفس از ہم گسیخت
رنگِ حیرت خانۂ ایام ریخت

اس نے یوں تار نفس کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیا۔ یعنی وحدت الوجود نے گسیخت ے مراد الگ الگ کر دیا کہ حیرت خانہ ایام الگ الگ ہو گئے۔ پہلے تو جہاں نزد و دور یعنی مکان تھا اب یہ خانہ ایام (زمان) کی کیفیت ہو گئی۔ یعنی زندگی کا تار جب اس کی طرح ٹوٹا اور ٹوٹنے کے بعد اس کے بکھرنے والے مختلف دھاگوں سے یہ دنیائے زماں وجود میں آ گئی۔ لائف وحدت الوجود تھی اس کے ٹوٹنے والے دھاگوں سے حیرت خانہ ایام وجود میں آ گیا۔

ہر کجا از ذوق و شوقِ خودگری
نعرۂ من دیگرم تو دیگری

جہاں جہاں خودی ہے اس میں تعمیر خویش کا ذوق وشوق ہے یعنی میں اور ہوں اور تو اور ہے کا نعرہ ہے۔ یہ جو تو اور ہے اور میں اور ہوں کی تفریق ہے یہ خودی کے ذوقِ خودگری کی وجہ سے ہے۔ امیر خسرو نے (1325ء) نے دوسرے انداز میں کہا تھا۔

تا کس نہ گوید بعد ازیں
من دیگرم تو دیگری

یعنی ایسے مل جائیں کہ بعد میں کوئی نہ کہہ سکے کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی فرق ہے۔ یہ تو وصل ہو گیا۔ اقبال نے صرف اتنا ٹکڑا ''من دیگرم تو دیگری'' لیا ہے یعنی یہ (Invidualisation) یعنی تفرید و تخصیص یہ ذوق وشوقِ خودی کی وجہ سے ہے۔

کائنات میں زندگی کی نمود:

ماہ و اختر را خرام آموختند
صد چراغ اندر فضا افروختند

1273 وحدت الوجود نے مختلف پیکروں میں ظہور کیا تو اس نے چاند اور ستاروں کو چلنا سکھا دیا اسی طرح سے فضا میں سینکڑوں چراغ روشن ہو گئے۔ یہ سب ذوقِ خودی سے ہوا۔

بر سپہر نیلگوں زد آفتاب
خیمۂ زربفت یاسیمین طناب

پھر اس نیلگوں فضا میں سورج بنایا۔ زربفت کا خیمہ یا چاندی کی طنابیں تان دیں۔

از افق صبحِ نخستیں سر کشید
عالمِ نوزادہ را در بر کشید

افق سے پہلی صبح نے سر ابھارا۔ اور نئی کائنات کو آغوش میں لے لیا۔

مُلکِ آدم خاکدان بود و بس
دشت او بیکاراوانوے بود و بس

آدم کا گھروندہ بس مٹی کا تھا۔ اور اس کا صحرا بے کاراواں تھا۔ یعنی کوئی ریگستان نہیں تھا۔

نے بکوہے آبجوئے در ستیز
نے بصحرائے سحابے ریز ریز

کوئی ندی پہاڑ سے نبرد آزما تھی اور نہ صحرا میں کوئی بادل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پھر رہا تھا۔

نے سرودِ طائران در شاخسار
نے رمِ آہو میانِ مرغزار

نہ تو پرندوں کے گیت شاخوں پر تھے اور نہ کسی ہرن کی چوکڑیاں سبزہ زاروں میں موجود تھیں۔

بے تجلی ہائے جانِ بحر و برش
دودِ پیچاں طیلسانِ پیکرش

اس کائنات کے بحر و بر تجلی کے بغیر تھے۔ لپٹا ہوا دھواں چادر کی طرح اس کے پیکر سے اٹھتا ہوا تھا۔ (طیلسان، چادر کو کہتے ہیں) اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ (21:30) اسی نبولہ۔ (Nubula) ہیولہ کو لیا ہے۔ (پیچان۔ اٹھتا ہوا)

❁❁❁

ظہورِ آدم اور وحی کا سفر

ظہورِ آدم گوہر تابناک دنیائے ادب میں فکر کی اتنی بلندی،

تدبر کی گہرائی اور لاجواب شعریت اقبال کے ہاں:

یہ اشعار دنیائے ادب میں گوہر تابناک کی حیثیت رکھتے ہیں۔فکر کی اس قدر بلندی۔تدبر کی گہرائی اور لاجواب شعریت تو فطرت کی دین تھی اقبال کے ہاں:

سبزہ بادِ فرودیں نادیدۂ
اندر اعماقِ زمین خوابیدۂ

سبزے کو ابھی موسم بہار نظر نہیں آیا تھا۔وہ زمین کی گہرائیوں میں سویا ہوا تھا۔
(فرودیں،موسم بہار)

طعنۂ زد چرخِ نیلی بر زمین
روزگارِکس ندیدیم ایں چنیں

آسمان نے زمین کو طعنہ دیا کہ اتنا خراب حال میں نے کسی کا نہیں دیکھا۔

چوں تو در پہنائے من کورے کجا؟
جز بقندیلم ترا نورے کجا؟

میری پہنائیوں کے اندر تجھ جیسی اندھی چیز بھی کوئی اور ہے۔مری روشنی کے علاوہ ترے پاس کیا ہے؟

خاک اگر الوند شد جز خاک نیست
روشن و پائندہ چوں افلاک نیست

مٹی اگر ہمالیہ کا پہاڑ بھی بن جائے تو کیا ہوا مٹی، مٹی ہوتی ہے۔ وہ افلاک کی طرح روشن اور ہمیشہ قائم رہنے والی تو نہیں ہوسکتی۔

یا بزی باساز و برگِ دلبری
یا بمیرد از ننگ و عارِ کمتری

اے زمین! یا تو دلبری کے ساتھ زندگی گزار یا اپنی کمتری میں مرجا۔ یعنی اس زندگی سے تو مرجانا بہتر ہے۔

شد زمیں از طعنۂ گردوں خجل
نا امید و دل گران و مضمحل

زمین اس آسمانی طعنہ سے بڑی شرمندہ ہوئی۔ ناامید اور مضمحل ہوگئی۔

پیشِ حق از دردِ بے نوری تپید
تا ندائے آنسوئے گردوں رسید

بے نوری کے درد سے تڑپ اٹھی۔ تا آنکہ آسمان سے (ندا) آواز آئی۔

اے امینے از امانت بے خبر
غم مخور، اندر ضمیرِ خود نگر

کیا ڈرامائی انداز ہے!

روزہا روشن زغوغائے حیات
نے از اں نورے کہ بینی در جہات

سورج کا اپنی روشنی پر اترانا کچھ نہیں ہے یہ تو جہات یعنی اطراف روشن کرتا ہے جبکہ تیرے دن تو زندگی کے ہنگاموں سے روشن ہیں۔

نورِ صبح از آفتابِ داغدار
نورِ جاں پاک از غبارِ روزگار

(غبارِ روزگار سے مراد زمانہ)

صبح کی روشنی تو اس داغدار سورج کی وجہ سے ہے جبکہ وحی زمانے کے گرد وغبار سے پاک ہے۔

نورِ جہاں بے جادہہا اندر سفر
از شعاعِ مہر و ما سیّار تر

شستۂ ایں از لوحِ جاں نقش امید؟
نورِ جان از خاکِ تو آید پدید

انسان بغیر راستوں کے یعنی راستوں سے بے نیاز محو سفر ہے۔ وہ سورج و چاند کی شعاعوں سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔ کیا تو نے نور جاں کی تختی سے امید کا نقش دھو دیا ہے؟ تیری مٹی سے تو ایک حیرت انگیز مخلوق آدم پیدا ہوگا۔ مایوسی کی کیا بات ہے۔

وحی کی روشنی میں عقل انسانی کا سفر:

عقلِ آدم برجہاں شبخوں زند
عشقِ اُو بر لامکاں شبخوں زند

عقل انسانی کائنات کو مسخر کرلے گی۔ اور اس کا عشق ماوراء جہاں کو بھی تسخیر کرلے گا۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ (55:33)

ے راہداں اندیشۂ اُو بیدلیل
چشم اُو بیدارتر از جبرئیل

اس کا فکر بغیر دلیل کے راستہ جانے گا۔ (منطق سے دھڑام) نیچے آگیا۔ وہاں اس کی آنکھ بھی جبریل سے زیادہ بیدار ہوگی۔

خاک و در پرواز مانندِ فلک
یک رباطِ کہنہ در راہش فلک

یہ ہے مٹی مگر فضاؤں میں محو پرواز جبکہ یہ فضا ایک پرانی سرائے ہے۔

می خُلد اندر وجودِ آسماں
مثلِ نوکِ سوزن اندر پرنیاں

یہ آدمی وجود آسماں میں اسی طرح کھٹک رہا ہے۔ جیسے ریشم میں سوئی چھپائی جا رہی ہے۔

داغہا شوید ز دامانِ وجود
بے نگاہِ اُو جہاں کور و کبود!

یہ تو آہستہ آہستہ وجود سے داغ دھوئے گا۔ کیونکہ اس کے بغیر تو یہ ساری دنیا اندھی اور تاریک ہے۔

ے اگرچہ کم تسبیح و خونریز است اُو
روزگاراں راچوں مہمیز است او

1273
گرچہ فرشتوں کے مقابل کم تسبیح ہے اور خونریزیاں بھی کرتا ہے مگر کائنات یا زمانہ اس کی ایڑی کی چوٹ سے چل رہا ہے۔

چشمِ او روشن شود از کائنات
تا بہ بیند ذات را اندر صفات

کائنات سے اس کی نگاہ روشن ہو جائے گی۔ یہانتکہ کہ خداوندی صفات ذات میں مشہود کر لے۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سید جملہ موجودات را

جو کوئی ذات کے جمال کا عاشق ہوا تو وہ ساری کائنات کا سردار بن جائے گا۔

یہ شعر مثنوی مولانا روم سے لیا گیا ہے۔ عشق کے اندر جمال ذات ہے۔

زمین کی فریاد خدا نے سنی تو زمین سے خدا نے کہا کہ مت گھبرا۔ تیرا مقام تو بلند ہے اس میں وہ آدم پیدا ہو گا اور نور جان لیکر آئے گا۔ جس سے نظام حیات کی تکمیل ہو گی۔ اب ملائکہ نے یہ بات سنی تو ملائکہ کی زبان سے نغمہ ادا کیا گیا۔

نغمۂ ملائکہ:

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمین از کوکبِ تقدیرِ او گردوں شود روزے

مٹھی بھر آدم ایک دن ملائکہ سے بڑھ جائے گا اور یہ زمین اس کے تقدیر کے ستارے سے آسمان ہو جائے گی کمال ہے اس بلندی میں۔

خیالِ او از سیلِ حوادث پرورش گیرد
زگردابِ سپہر نیلگوں بیروں شود روزے

ان کا خیال جو حوادث کے سیلاب سے پرورش پاتا ہے۔ ایک دن وہ اس نیلے آسمان بھنور سے نکل جائے گا۔ اب آگے دو اشعار ایسے ہیں کہ پورے لٹریچر میں جواب نہیں ہے ان کا:

یکے در معنی آدم نگر! از ماچہ می پرسی؟
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

ایک بار آدم کے معنی پر غور کر مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ ابھی تک یہ معنی طبیعت میں کھٹک رہے ہیں۔ ایک دن موزوں ہو جائیں گے۔ آدم سے مراد گوندھی ہوئی مٹی۔ جس سے صراحی۔ پیالہ بنایا جاتا ہے۔ ان کی فلاسفی میں مشیّت یا امر کی ایک سٹیج ہوتی ہے (The becoming and Being) دو منازل ہوتی ہیں۔ ھنوز اندر طبیعت می خلد۔ (ابھی تک طبیعت میں کھٹک رہے

1273
ہیں یہ معنی) ایک امر یا مشیت کی ایک سٹیج ہوتی ہے۔ اس پر پھر انسان کے وجود کی ساری سٹیج آتی ہے۔ امر یا مشیّت کی پہلی سٹیج (Becoming) ہے اور دوسری سٹیج وجود کی سٹیج ہے (Being) جس پر اخر الامر کچھ بننا ہے۔ وہ ہے اندرونی منزلِ مقصود (Destiny) جو ''ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے'' وہ اس کے بعد کی چیز ہے یہ ہے جو آگے کہی گئی ہے۔

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزدان را دل از تاثیر او برخوں شود روزے

پیش پا افتادہ مضمون اس طرح موزوں ہوگا کہ یزداں کا دل بھی اس کی تاثیر سے پرخوں ہو جائے گا۔ یہ ہے جو آخر میں جا کر ہونا ہے۔ یہ تماشہ ملائکہ نے دیکھا تو یہ کیا مخلوق سن رہی ہے؟ یہ تو یُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ (2:30)

جبکہ ہم: وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ (2:30) یہ آدم تو فساد ہی فساد ہے جبکہ ہم تو تیرے ہر کام میں بلا چوں و چراں لگے ہوئے ہیں۔

جواب دیا گیا: قَالَ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۞ (2:30) تم یہ پروگرام نہیں سمجھ سکتے۔

رومی کے الفاظ:

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود، آنم آرزو

کہ میں نے بہت تلاش کیا اس کو مگر وہ نہ ملا، اس نے کہا جو نہیں ملتا مجھے اس کی تلاش ہے۔

دنیائے تصوف کی تین اصطلاحات شاہد اوّل، شاہد دوم اور شاہد سوم اور تصوّف کی گمراہی آیہ ’’اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؕ ‘‘ (7:172) میں

انجمن روزِ الست آراستند
بروجودِ خود شہادت خواستند
زندۂ یامردۂ یا جاں بلب
ازسہ شاہد کن شہادت را طلب

تین مراحل (1) یا تو زندہ ہے (2) یا مردہ (3) جاب بلب۔ کھڑا ہے۔ نہ مروہ ہے نہ زندہ یہ تین وجود خداوندی کے شاہد ہیں۔ کہا کہ ان سے شہادت طلب کر۔ تین مراحل میں جو جاں بلب یعنی عالم برزخ میں ہے۔ نہ تو زندہ اور نہ مردہ اس کی شہادت کیسے ہوگی؟ الست کے وعدہ کی بنا پر ہر انسان میں خدا کے وجود کی شہادت موجود ہے تو جس نے بلیٰ کہہ دیا وہ شاہد ہوگیا۔ اب ان تینوں کی شہادت کا طریقہ الگ الگ ہوگا۔ اب ان شہادات کا تعلق شعور سے ہے۔ اب معراج پر دلیل آئے گی اور محمود و نا محمود (خیر وشر) بھی آنا ہے۔ اقبال نے جو بنیادی نظریہ دیا ہے کہ اپنے وجود کے ثبوت کے لیے کسی دوسرے گواہ کی شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہی جو روزِ ازل کا پیمانِ الست ہے۔ تمام روحوں کو پیدا کر کے ان کو اکٹھا کر کے ان سے کہا گیا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؕ (7:172)؟ قَالُوْا بَلٰی ۚ (7:172) جی ہاں کیوں نہیں! اس طرح سے خدا نے اپنے وجود کی تصدیق کرائی۔ تو تصوف سے ہمارے ہاں یہ اصطلاح بن گئی مست الست۔ یوم الست۔ اب الست کے بعد مومن اور کافر کا سوال نہیں ہے۔ چونکہ ہر روح نے اقرار کرلیا اب اس کو تو منکر نہیں کہہ سکتے۔ یہ تفریق مومن اور کافر کی یہ تو پیکروں کی وجہ سے ہے۔ تو یہ تمام پیکر اپنی اصلی شکل میں آ کر، مومن بن جائیں گے۔ حالانکہ یہ آیت تسلسلِ ذریتِ آدم ہے نہ کہ ذات خداوندی کا اقرار۔ کہ تمام نامساعد حالات کے باجود آدم مٹا نہیں ہے۔

یہ ہے تصوّف کا عقیدہ کہ خدا اپنے وجود کی شہادت لاتا ہے۔ شہادت دینے پر جب تمام روحیں پیکروں کو چھوڑ دیں گی تو پھر سے اقرار کرنیوالی روحیں مومن ہو جائیں گی۔ آیت سورۂ اعراف (7:172) وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ

1273 ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ بنی آدم سے ان کی پشت کو چلایا اور خود ان کو اپنے آپ پر شہادت ٹھہرایا تو اگلی چیز یہ ہے'' کہ کیا یہ میرے وجود کی شہادت نہیں دیتی۔''

انسان کی تخلیق ہوئی تو اس کے خلاف تخریبی قوتیں بہت زیادہ تھیں اس کو صرف عقل کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں دیا گیا۔ جو ابھی عہد طفولیت میں تھا۔ اتنے آلام ومصائب کا نہتا ہو کر مقابلہ کرتے کرتے آگے بڑھا۔ بڑی بڑی انواع مقابلہ نہ کر سکیں اور ناپید ہو گئیں۔ مگر یہ انسان اس طرح سے مسلسل بدستور چلا آرہا ہے۔ اس کی ذریت میں تسلسل واقع ہوا ہے یہ مٹا نہیں۔ کیونکہ یہاں پر خدا کی ربوبیت کارفرما ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس قدر نامساعد حالات کے باوجود یہ نوع اس طرح سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ چیز خود اس کی شہادت دیتی ہے کہ یہاں کسی کا نظام ربوبیت بڑی استحکام کے ساتھ کارفرما ہے۔ اگر یہ پروگرام نہ ہوتا فطرت کا تو کسی مقصد کے لیے۔ تو کبھی باقی نہ رہ سکتا۔ جس طرح مہیب اور دیو ہیکل مخلوقات ناپید ہو گئیں۔ ان کا آج بھی سراغ نہیں ملتا البتہ چند ڈھانچے آج بھی دستیاب ہیں۔ قرآن خدا کے ظہور کے مختلف دلائل۔ علامات لاتا ہے ان میں سے بڑی مدلل دلیل یہ بھی ہے کہ انسان جیسا نہتا جانور اس قدر مہیب اور خطرناک تخریبی قوتوں کے اندر رہ کر ہزارہا سال سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ اور تناسل کے ذریعہ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہاں اس کی ربوبیت کارفرما ہے؟ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے؟ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ (7:172)۔ میری ربوبیت کے لیے کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے؟

انسانی زندگی کی بقا کا یہ طویل پروگرام ایک مقصد کی تکمیل کی شہادت دیتا ہے:

اگر یہ خالی الذہن ہو کر اس دلیل پر غور کریں تو ان کو کہنا پڑے گا۔ بَلٰی۔ یہ ٹھیک ہے یہاں ایک زبردست قسم کا ربوبیت کا پروگرام کارفرما ہے کہ اس طرح سے نوع انسانی چلی آرہی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

آیہ کا قرآنی مفہوم:

اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (7:172)

یہ دلیل اس لیے دی جارہی ہے کہ کل جب محاسبہ ہو تو تم یہ نہ کہہ دو کہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ جس سے ہم سمجھ سکتے کہ یہ سب کچھ ایک پروگرام کے تحت ہو رہا ہے جو ہمیں باقی رکھا گیا ہے یہ تمہارا وجود اس لیے باقی رکھا ہے۔ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ (7:172) عَلٰی تو خلاف جاتا ہے کہ کیا یہ اس کے خلاف شہادت نہیں ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ نہیں ہم تو اتفاق سے وجود میں آ گئے۔ اس قدر ایک پلان کے تحت نوع انسانی کا یوں مسلسل آگے بڑھنا، پھلنا پھولنا ارتقائی منازل طے کرنا۔ آگے بڑھنا اور بلند ہوتے چلے جانا یہ سارا ربوبیت میں آجاتا ہے۔ اس قدر حوادث سماوی کے ماتحت باقی رکھا۔ کیا کوئی مقصد نہیں ہے۔ زندگی مرنے کے بعد باقی نہیں رہے گی۔ تاکہ یہ نہ کہو کہ تمہارے پاس شہادت نہیں تھی۔

تصوف نے تو اپنے ہاں اس آیت کا مفہوم ہی بدل دیا:

توکیا موت کے بعد موجودہ زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اورتم مکافات عمل سے نہیں گزرو گے؟

اب اس آیت کو لے کر عہد الست، مستِ الست اور قلندرِ الست جیسے خودساختہ مفہوم لے لیے۔ ان کے خیال میں اپنے وجود کے لیے کم ازکم یہ ضروری ٹھہرا کہ اپنے سے جو غیر ہے اس کو شاہد ٹھہرایا جائے۔ اس کی ابتدا خود خدا نے کی ہے۔ کیا ہمیں یہ واقعہ یاد ہے؟ یعنی جس واقعہ کا علم شعور میں نہ ہو تو اس قسم کی شہادت تو عام عدالتوں میں بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ تمام روحوں نے شہادت دی تھی۔ مگر مجھے تو یہ شہادت یاد نہیں ہے لیکن ان کے ہاں یہ ایک مسلمہ بنا ہوا ہے۔ ان کا سارا زور وحدت الوجود کی شہادت پر ہوتا ہے۔ اپنی ذات کو تسلیم کرنے پر نہیں یہ سب سے پہلے سقراط (469BC) نے کہا تھا ''Know thyself'' اپنی ''میں'' کا عرفان حاصل کرو ہمارے ہاں جو ہے ''مَنۡ عَرَّفَ نَفۡسَهٗ فَقَدۡ عَرَّفَ رَبَّهٗ'' یہ اپنے آپ کو پہچاننا یہ ہے تصوف کی بنیاد حالانکہ آگے ارسطو (384BC) نے یہ کہا تھا کہ اپنی ''میں'' کو بارز کرو۔ عیسائیت نے کہا کہ اپنی ''میں'' پر ندامت کرو اس کی (Renewal) تجدید کرو یعنی ان کے ہاں Renewal بذریعہ (Repentance) ندامت ہے۔ بدھ ازم نے کہا کہ ''میں'' کو تیاگ دو (Renounce) جبکہ قرآن نے ''میں کو ابدی'' بنانے کا کہا۔

Immortalise youreself by self expression and self formation.

''اسلوب بیان اور تشکیل خویش سے ابدی بناؤ۔''

قرآن خدا پر ایمان کا تقاضا کرتا ہے نہ کہ معرفت کا ''اب میں'' سے سقراط کی بات جو چلی تھی بہت آگے چلی گئی۔ قرآن میں معرفت کا کوئی لفظ نہیں ہے یہ غیر قرآنی ہے یہ یونانی فلسفیوں نے دیا ہے۔ ان کے ہاں شریعت کا اگلا درجہ طریقت اور اس سے اگلا معرفت یعنی اپنی ذات کو پہچان کر خدا کی ذات کو پہچانو۔ قرآن نے یہ تقاضا ہی نہیں کیا۔

تین قسم کی شہادات:

اب مولانا روّم کا تصوف ؎

انجمن روزِ الست آراستند
بروجودِ خود شہادت خواستند

(خدا نے روز الست انجمن آرائی کر کے اپنے وجود پر شہادت مانگی آراستند۔ خواستند جمع کا صیغہ خدا کے لیے استعمال کیا ہے۔)

زندۂ یا مردۂ یا جاں بلب
از سہ شاہد کن شہادت را طلب

1273
(زندہ و مردہ) مردہ یا جاں بلب سے شہادت طلب کر، شاہد اول شعور خویشتن، شاہد ثانی شعور دیگرے اور شاہد ثالث ذات حق۔ پہلا شاہد، شاہد اول شعور خویشتن۔ پہلا گواہ اپنا شعور (Consciousness) یہاں تک ٹھیک ہے، شعور لا کر۔ یہ تو انسانی شعور ہوا جبکہ شعور سادہ (Simple Consciousness) حیوانی دنیا میں کارفرما ہے۔ اب پہلا شاہد۔

خویش را دیدن بنورِ خویشتن

اپنے آپ کو نور حق سے دیکھنا یعنی اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ شعور حاصل کرنا۔ معرفت یا پہچاننے کا سوال نہیں ہے۔ انسانی اپنے (self) ذات یا خودی کو پہچان نہیں سکتا۔ وہ صرف اس کا شعور حاصل کر سکتا ہے بس یہیں سے فرق آ گیا۔ سارے قرآن میں اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴿۱۶۹﴾ (7:169) اَفَلَا تَشۡعُرُوۡنَ آیا ہے۔ اَفَلَا تَعۡرِفُوۡنَ کہیں بھی نہیں آیا۔ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ﴿۲۱﴾ (51:21) بصیرت سے کام لو۔ حیوانی زندگی میں شعور ذات نہیں ہوتا۔ وہاں صرف شعور سادہ ہے۔ شعور ذات اس امر کی شہادت ہے کہ ہماری زندگی حیوانی زندگی سے مختلف ہے۔

شاہد ثانی شعورِ دیگرے
خویش را دیدن بنورِ دیگرے

دوسرا گواہ دوسروں کا شعور ہے یعنی خود کو دوسروں کے نور سے دیکھنا ہے۔

سقراط نے یہ بات ٹھیک کہی کہ انسانوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک میرا۔ مجھے (Iam یا ME) ہے دوسرا اس کے علاوہ سارا کچھ Non-ME (غیر میرا یا مجھے) یہ ہیں بڑی عمدہ کیٹیگریز۔ اب ''ME'' ہے تو ہوگئی ''I'' یہ اتنا کچھ (Non-ME) (غیر میرا، مجھے) ہے وہ ہوا (Thou) تم۔ یہودی کے تصوف کے بارے میں بیوبر مارٹن اپنی کتاب ''Thou and I'' میں رقمطراز ہیں جو ایسی نہیں کہہ سکتا۔ وہ ''تم'' بھی نہیں کہہ سکتا۔

یہ دو شقیں رہیں گی۔ پہلے اپنے آپ کو ایک شق کے اندر لایئے۔ اب یہ جو میں اور تم ہے ان دونوں کے اندر ''Me and non-me'' ہے۔ یہ دو شقیں ہیں۔ اسی لیے میں نے کہا کہ تضاد کے عمل سے یا (Contrast) عمل تقابل سے تم اپنے وجود کی شہادت اس طرح دے سکتے ہو کہ دوسرے کے وجود کو ثابت کرو۔ ''خویش را دیدن بنورِ دیگرے۔'' لیکن اس کے ہاں خود اس کا تضاد موجود ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ ''تو ہے تجھے جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے'' اب جس کو تو اپنے متعلق شہادت میں پیش کر رہا تھا۔ باہر سے اسے آوازیں دیتے گئے تو وہ چلا گیا۔ بتایا گیا کہ جی وہ یہاں نہیں ہے۔ اور جب صورت یہ ہے کہ تو ہے۔ تجھے جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے۔ تو یہ اٹھارویں صدی کا (Idealism)۔

فلسفۂ مثالیّت (فلسفۂ مثالیت وتصوّریت) (idealism):

فلسفۂ مثالیّت وتصوریت جسم (Body) انسانی نفس (Mind) ہی کی کرشمہ سازی ہے۔ یہ مکتبۂ فکر فلسفۂ مثالیّت و

1273 تصوّریت کے نام سے مشہور ہے۔اس کے دو مکاتب فکر ہیں ''Subjective idealism'' یعنی خارجی دنیا کے متعلق ہمارا علم درحقیقت اپنی ہی کیفیات کا علم ہوتا ہے۔جن کو (Ideas) کہتے ہیں۔لاک (1704)۔ برکلے (1752) ہیوم (1776) اس مکتبۂ فکر کے امام ہیں۔

Objective idealism:

خارجی اشیاء خود ہمارے تخیلات کا ہی پرتو ہیں۔مگر ان کا انحصار کسی خاص فرد کے تخیلات سے نہیں ہے۔یعنی یہ تصورات تمام انسانوں کے دل میں موجود ہیں۔لہٰذا یہ خارج میں موجود ہیں۔ ہر فرد کے پیدا کردہ نہیں۔اس کے امام کانٹ (1804) ہیگل (1831) ہیں۔ یہ فلسفۂ مثالیت انیسویں صدی کے آخر تک خاصہ مقبول رہا۔مگر بیسوی صدی میں اس کے خلاف رجحان پیدا ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی تردید میں نیا مکتبۂ فکر آ گیا۔Modren Reealism کہتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ تصور غلط ہے کہ اشیاء کا وجود مشاہدہ کرنے والے کے دل کی پیداوار ہے۔اشیاء موجود فی الخارج ہیں۔اس کے امام پروفیسر جی۔ای۔مور (1958)۔ برٹینڈرسل (1970) اور پروفیسر جی ڈی بروڈ ہیں۔

اب یہ جو اٹھارویں صدی کا فلسفہ مثالیت (Idealism) آ گیا۔ساری افلاطون کے فلسفہ میں آ گئی۔یعنی جو کچھ نظر آتا ہے۔یہ محض تصورات کی دنیا کے اندر ہے۔فی الحقیقت یہ موجود نہیں۔ یہ ہے فلسفہ مثالیت وتصوریت اور جس کو اقبال نے اپنا فلسفہ بنا کر پیش کر دیا کہ ''تو'' ہے اور تجھے جو کچھ نظر آتا ہے ''نہیں'' ہے، اب اگر یہ مسلمہ ہے کہ تجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے۔نہیں ہے تو یہ کہنا:

شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے
خویش را دیدن بنورِ دیگرے

دوسرا گواہ۔دوسروں کا شعور (Consciousness) ہے یعنی خود کو دوسروں کے نور سے دیکھنا ہے تو دیگر کی نفی کر رہا ہے مگر اس دیگر کو ''اپنے وجود کو'' تم بطور شہادت پیش کر رہے ہو۔ دو متضاد تصورات یکجا نہیں کیا جا سکتا۔اب تیسرے گواہ کا تصور در آیا: اب فلسفۂ مثالیت وتصوریت کی فلاسفی اس کے تصور سے ٹکرا رہی ہے کہ ''میں'' (I) کے لیے ''تو'' (Thou) بے حد ضروری ہے۔ اب یہ ''خود'' اور ''خدا'' دونوں الگ الگ کر کے، پھر آگے لے جاتے ہیں۔ اس طرح ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (40:60) میں ''میں'' اور ''تُو'' ''تُو'' کہہ کر تو انھوں نے دو کر دیئے تھے۔اس لیے اس کو دو وجود شامل کر لیتے ہیں۔انہوں نے تصوف میں تو ایسا کر لیا مگر دوسری طرف ان کے فلسفہ کی دھجیاں بکھر گئیں۔ کیونکہ وہاں یہ فلسفۂ مثالیت پورا نہیں اترتا۔اگر یہ چیزیں Exist کر رہی ہیں۔اور یوں Exist کرتی ہیں کہ ان کا وجود تمہارے وجود کی شہادت بن رہا ہے۔

اقبال کی غلط نگہی: ؎

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق
خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

1273 تیسرا گواہ ذات حق کا شعور ہے۔یعنی خود کو نور حق سے دیکھتا ہے اب یہ تیسرا شاہد آ گیا کہ اپنے آپ کو خدا کے نور سے دیکھنا ہے۔قرآن کہتا ہے:

لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ ۚ (6:103)

نگاہیں غیر محسوس ذاتِ خداوندی تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ادراک نہیں کر سکو گے۔اہل تصوف کہتے ہیں۔ہم ادراک کی تو بات نہیں کرتے۔ہم تو اس ''معرفت'' کی بات کر رہے ہیں جس میں ادراک کا،اس آنکھ کا تصور ہی نہیں ہے۔پھر اس شعر میں تو ''دیدن'' کا لفظ استعمال کیا ہے دیدن تو ''ادراک'' ہے۔یہاں اقبال غلطی کھا گیا ہے۔پھر بنورِ ذات حق یعنی خدا کے متعلق تو کچھ بھی تصور نہیں کر سکتے۔چہ جائیکہ اس کے نور کو اپنی ذات کے لیے بطور ایک شہادت پیش کریں۔جس نور کا شعور ہی نہیں کیا جا سکتا۔اسے تصوف کا جامہ پہنا دیا۔اب یہ فوق المنطق بات ہے۔فوق المنطق ہوئی تو تصوف کا روپ دھار گئی۔تصوف کے مسلّمات وہ ہمیشہ supra-logical ہوتے ہیں۔شاہدِ ثالث شعورِ ذات حق کس بشر کو بھی شعورِ ذاتِ حق نہیں ہو سکتا۔انسان کا خدا سے تعلق صرف اس کی صفات کی حد تک ہے۔قرآن کہتا ہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ ۚ (42:11)

جس کی کوئی مثال نہیں دے سکتے۔وہ کیسے شعور میں آ سکتا ہے؟ ساری بات تو اپنے وجود کی شہادت پر ہے۔اب اس وجود کی کیفیت کیا ہے؟ اصل میں یہ اپنا Self اور اس کا Self ایک رکھتے ہیں۔اس Self کے یہ حصے ہیں۔جو ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں۔اس لیے کیپٹل کے ساتھ ''S'' آئے گا۔اور جس میں یہ خدا کے لیے Self and non-Self نہیں لائیں گے۔بلکہ یہ Self ایک ہی ہوگا۔جو ہمارے ان پیکروں میں ہے۔وہ اصل ہے یہ اس کے حصے ہیں جو مختلف جگہ آئے ہوئے ہیں۔لہٰذا وہ دو مختلف ہستیاں Entities نہیں بنتیں۔لیکن جب My-self میں S کو سمال لکھیں گے اس صورت میں "I" کو الگ رکھتے ہیں اس طرح یہ (I and thou) الگ الگ رہیں گے۔

❁❁❁

بُعد و جہت یعنی (Dimensions) کا تصور

زندگی کی ابتدائی سطح پر شعورِ محض (Simple consciousness) انسانی فکر اور شعور ذات Self consciousness پر آجاتا ہے۔اس کی تقسیم یوں کی جاتی ہے۔ڈاکٹر بک (Dr.Bucke) نے شعور کو تین سطحوں میں تقسیم کیا ہے۔

i۔شعورِ سادہ جو حیوانات میں پایا جاتا ہے۔

ii۔شعور ذات جو انسانوں میں پایا جاتا ہے۔

iii۔کائناتی شعور Cosmic برگزیدہ ہستیوں میں پایا جاتا ہے۔کتاب Cosmic Consciousness) اس کے برعکس اوسپنسکی (Ouspensky) نے شعور کی چار سطحیں کی ہیں۔

1۔ یک بُعدی (One-Dimensional)

2۔دو بُعدی۔(Two-Dimensional)

3۔سہ بُعدی (Three-Dimensional)

4۔چہار بُعدی (Four-Dimensional)

اوسپسکی (Ouspesky) کی کتاب (Tertium organum)

تمام کیڑے مکوڑے یک بُعدی۔صرف یک جہت جانتے ہیں۔اس سے زیادہ جہات وابعاد کا تصور ان کے ہاں نہیں ہوتا۔

تمام حیوانات دو بُعدی ہوتے ہیں۔ان کے صرف لمبائی۔ چوڑائی (length and width) کا تصور ہوتا ہے۔ گہرائی کا تصور نہیں ہوتا۔(Depth)

سہ بُعدی انسان کے درجہ پر آتی ہے۔جسے ہم حقیقتاً گہرائی کہتے ہیں۔یہ تصوراتی چیز ہے۔

ایک دوسرا تصور یہ بھی ہے کہ جیسے ہم حقیقتاً گہرائی کہہ رہے تھے۔اس کا وجود ختم ہوگیا۔یہ زمین (Depthless) بلا

گہرائی ہے جہاں شعور ہوتا ہے۔

وہاں Worms (کیڑوں مکوڑوں) کی زندگی ہوتی ہے۔صرف لکیریں ہوتی ہیں۔ان کے نزدیک یہ ساری کائنات خطِ مستقیم (Straight Line) سے عبارت ہے۔اس سے آگے ان کیڑے مکوڑوں کا شعور جا ہی نہیں سکتا۔ یہ یک بُعدی (One Dimension) ہوتے ہیں۔ برگسان، بک، اور سپنسکی کہتے ہیں کہ یہ لکیریں ہی ہیں۔جن کو ہم نے لمبائی چوڑائی کہا ہے۔اگر لکیریں اس قسم کی بن گئیں تو یوں ہوگیا۔ یہ مادہ اور زندگی کے باہمی تعلق کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔وجود کی ہیئت ایسی نہیں ہے حیوانات کی سطح دو بُعدی ہے۔ان کو طول اور عرض کا احساس ہوتا ہے۔تیسرے بُعد کا احساس ہی نہیں ہوتا۔(گہرائی)

تصوف میں شعور خویش کی بیداری پر کسی قسم کا بُعد و جہت (Dimension) باقی نہیں رہتا:

انسانوں میں زندگی سہ بُعدی ہے۔ یہ طول و عرض کے ساتھ بلندی۔ گہرائی یا موٹائی کا بھی احساس رکھتے ہیں۔ جبکہ حیوانات گہرائی کا احساس نہیں رکھتے۔ان کو صرف طول وعرض کا احساس ہوتا ہے۔اس لیے ان کی تمام کائنات سطح (Surface) سے مرتب ہوتی ہے۔ گہرائی آپ کے تصور میں ایک تیسری بُعد و جہت بن کر آئی ہے۔ یہ طول وعرض کے ساتھ بلندی۔ گہرائی اور موٹائی کا بھی احساس رکھتا ہے۔ یہ سطح کے علاوہ مکعب (Cube) کا بھی تصور کر سکتا ہے۔ یہ ابعاد کی بحث بڑی فنی بحث ہے۔اس کو یوں سمجھئے کہ ہم کسی سطح کو دیکھ سکتے ہیں اور سطح کی موٹائی نہیں ہوتی۔ وہ صرف طول وعرض کے خطوط سے گھری ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ جس طرح نقاط (Point) کو ملا دینے سے لکیر (Line) بن جاتی ہے۔اس طرح جب لکیروں کو ساتھ ساتھ ملایا جائے تو سطح بن جاتی ہے۔مکعب میں ہم اس کی مختلف سطحوں کو دیکھتے ہیں۔ان سطحوں کو ہم چھو سکتے ہیں۔اس سے زیادہ نہیں۔اس طرح دراصل یہ تیسری نہیں بلکہ دو بُعدی ہیں اب سوال یہ ہے کہ یہ بُعد ثلاثہ کہاں سے پیدا ہوگئی؟ تمہارے اپنے شعور نے ایک اور Dimension پیدا کر دی۔ کہتے ہیں کہ شعور کے بیدار ہونے سے ایک اور بُعد اربعہ آجائے گی۔جس میں نہ لکیر ہوگی نہ طول، نہ چوڑائی، نہ گہرائی، اس کو یہ بُعد اربعہ (Fourth Dimension) کہتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ٹائم سپس (زمان ومکاں) ایک دوسرے میں جا کر مل جاتے ہیں۔ یہ آئن سٹائن کی تھیوری اضافیت (Relativity) آگئی۔اس نے سائنسی بات کی ہے۔جبکہ ان کے ہاں یہ سارا کچھ خالی طور پر اندر ہی اندر واقعہ ہوتا رہتا ہے۔

نظریۂ اضافیت:

نظریۂ اضافیت کی رو سے اتنا ہی تسلیم نہیں کیا گیا کہ زمان ومکان کی حیثیت اضافی ہوتی (Relative) ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ زماں ومکان الگ الگ چیزیں نہیں ہیں اس سے پہلے فاصلوں کا تصور ابعاد ثلاثہ (Three Dimension) سے کیا جاتا تھا۔Minkowsky نے ثابت کیا کہ چونکہ طول حرکت کے ساتھ بدلتا ہے۔اس لیے ہر ایک پیمائش میں مکانی فاصلہ (Space

1273

Distance) کے ساتھ ساتھ زمان کے وقفہ ''Time intervel'' کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔اس لیے اب ابعاد تین نہیں بلکہ چار ہیں۔اسی تصور کے تحت اب ابعاد کا نام ''Space Time Continuum'' قرار پایا گیا۔

تصوف کا تصور:

ے ورنہ چوں مورو ملخ در گل بمیر : (ورنہ مکھیاں اور کیڑوں کی طرح ہی مٹی میں مرجا۔مورو ملخ یعنی مکھی اور کیڑے)

ے از طریق زادن اے مردے نکوے: آمدی اندر جہاں چار سوے۔

کس طریقہ سے اے نیک مرد تو دنیا میں آیا ہے۔اس چار جہت کے جہاں میں پیدا ہوا پہلی دفعہ۔

ے ہم بروں جستن بزادن می تواں: (اگر تو یہاں سے دوڑ کر جائے تو ایک اور پیدائش ہو جائے گی۔)

ے بند ہا از خود کشادن می تواں۔ (اس طرح یہ زنجیریں خود سے کھول سکتا ہے۔)

ے لیکن ایں زا دن نہ از آب و گل است
داند آنمردے کہ او صاحبدل است

یہ نئی پیدائش چونکہ آب وگل یعنی مادی نہیں ہے۔یہ تو وہی جان سکتا ہے جو دل والا ہو۔

آں زمجبوری است ایں از اختیار
آں نہاں در پردہ ہا ایں آشکار

پیدائش تو مجبوری کی ہے مگر یہ دوسری اختیار کی ہے۔وہ پیدائشی پردوں میں جبکہ یہ نئی پیدائش ظاہری طور پر ہوتی ہے۔

آں یکے با گریہ، ایں باخندہ ایست
یعنی آں جویندہ ایں پایندہ ایست
(پایندہ۔پالینا)

جب روتا ہوا آتا ہے۔اور یہ ارادہ والی پیدائش تو خوشیوں کے شادیانے بجاتا ہے۔

گو ہر زندگی پالینے کی وجہ سے۔جبکہ وہ خوش کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔

آں سکوں و سیر اندر کائنات
ایں سراپا سیر بیروں از جہات

پیدائش میں تو کائنات حرکت وٹھہراؤ ہے۔اور دوسری پیدائش والا ماوراء جہات کرتا ہے یعنی زمان ومکان سے ماوراء ہو جاتا ہے۔

ے آں یکے محتاجئ روز و شب است
واں دگر روز و شب اورا مرکب است

وہ پیدائش تو روز وشب کی محتاج جبکہ نئی پیدائش دن رات اس کا گھوڑا ہیں۔

؂زادنِ طفل از شکستِ اشکم است
زادنِ مرد از شکستِ عالم است

بچہ شکم کے شکست سے جبکہ مرد کا پیدا ہونا جہاں کی شکست سے عبارت ہے۔

؂ہر دو زادن را دلیل آمد اذاں
آں بلب گویند و ایں از عینِ جان

دونوں جگہ پیدائش کے لیے اذاں دی جاتی ہے۔ایک ہونٹوں اور دوسری جان سے۔

جانِ بیدارے چو زاید درِ بدن
لرزہا افتند دریں دیرِ کہن

اس کی پیدائش سے اس پرانے جہاں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

منصور حلاج (309-244ھ) کی کتاب طواسین

علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں چاند کی ایک فرضی وادی کو طواسین کا نام دیا ہے۔ قرآن کے مقطعات ''طسٓ ہیں''، منصور حلاج نے (طا۔س) کی جمع طواسین بنائی۔ ان صوفیا کے ہاں طواسین ''طورِ سینا'' کا مخفف ہے۔ ''ط'' طور کے لیے ہے۔ س ''سینا'' کے لیے۔ تو طواسین ان کے ہاں وہ مقام ٹھہرا جہاں خدا بے نقاب ہو کر سامنے آتا ہے۔ جہاں گرچہ جلوہ نمائی نہ بھی ہو تو بہر حال یہ مقام ہے جہاں گو یا وہ باتیں کرتا ہے۔ خدا سے ہمکلامی ہوتی ہے اور اس کے جلوے سے نگاہیں فیضیاب ہوتی ہیں۔ ہر ایسے مقام کو تصوف میں ''طواسین'' کہتے ہیں۔ اقبال نے چار پیغمبروں کا ذکر کیا ہے۔ طور سین، ان چار پیغمبروں کے ''طسینوں'' کی جمع ہوگئی۔ طسین گوتم۔ طسینِ زرتشت۔ طسینِ مسیح۔ طسینِ محمدؐ۔

❁❁❁

رسولؐ کے مقامِ بلند کو بیان کرنے کا ایک لاثانی اقبالی انداز

فطرتِ شاعر سراپا جستجو ست
خالق و پردگارِ آرزو ست
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل
ملتے بے شاعرے انبارِ گِل
سوز و مستی نقشبند عالم است
شاعری بے سوز مستی ماتمے است

(نقشبند عالم۔کائنات کی آرائش وتزئین۔اس کو ایک صورت میں لانا۔Form)

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است
گفتم از پیغمبری ہم باز گوے
سِر او بامردِ محرم باز گوے

(رومی سے پوچھا)

گفت اقوام و ملل آیاتِ اوست
عصر ہائے ما ز مخلوقاتِ اوست

یعنی پیغمبر اپنے پیغامات سے زمانے کو جس طرح ڈھالتا ہے۔ ہمارا عہد اس سے بنتا ہے۔ امت رسول سے متعین ہوتی ہے صرف خدا کو ماننے سے نہیں بنتی۔قوم وملت پیغمبر کی نشانی ہوتی ہے۔

ازدمِ اُو ناطق آمد سنگ و خشت
ماہمہ مانندِ حاصل او چو کشت

پاک سازد استخوان و ریشہ را

بالِ جبریلے دہد اندیشہ را

وحی طبعی زندگی کو بھی پاکیزہ بناتی ہے۔اور جبریلی پروں سے بلندیوں کی طرف پرواز کرتی ہے۔زندگی کے ساتھ فکر اور نظریہ بھی ملتا ہے۔

ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات

از لبِ او نجم و نور و نازعات

(لب او۔یعنی الفاظ اس کے نہیں ہوتے بلکہ یہ وحی خداوندی ہوتی ہے)

آفتابش را زوالے نیست نیست

منکرِ اورا کمالے نیست نیست

(مثبت اور منفی دونوں چیزیں اس میں آگئیں)

رحمتِ حق صحبتِ احرارِ او

قہرِ یزداں ضربتِ کرارِ او

صحابہ کی محبت حق کی رحمت ہے اور ایسی ضرب جو بڑھتی جائے۔ پیچھے نہ ہوئے۔عربوں کے ہاں جنگ کی دو حکمت عملیاں تھیں۔"فر" فرار سے ہے یعنی حملہ کے بعد واپس لوٹ آنا۔اور"کر" تکرار سے یعنی جنگ کرتے چلے جانا۔ضرب پیہم۔یعنی یہ"کر" ہے اردو میں تو"کروفر" شان وشوکت ہے۔مگر یہ کروفر اصل معنی سے ہٹ گئے ہیں۔ضربت کرار۔ایسی ضرب جو پیہم ہو۔بڑھتے چلے جائیں۔ پیچھے نہ ہٹیں۔

انسانی عقل خواہ کتنی بلند ہو جائے وحی کی محتاج ہوتی ہے:

اگرچہ باشی عقلِ کُل از دِلے مرم

زانکہ او بیند تن و جان را بہم

اگر تو عقل کل بھی ہے تب بھی خود سے دور نہ بھاگ۔مرم۔رمیدم سے رم ہے جو امر ہے۔اور"مرم" نہی ہے۔زانکہ یعنی چونکہ یہ عقلِ کل دیکھتی ہے تن و جان کو ایک ساتھ۔تن و جان یعنی دنیا و دین کو الگ الگ نہ دیکھ۔یہ ثنویت ہے۔عقلِ کل تو تن کو ہی دیکھتا ہے۔اگر وحی کے ساتھ رہے گا۔تو تن و جان ساتھ ہو جائینگے۔اس لیے عقلِ کل ہونے کے باوجود وحی ضروری ہے۔

❁❁❁

زرتُشت

زرتُشت کے متعلق صحیح تاریخی معلومات دنیا کے کسی گوشہ میں نہیں ملتیں۔تاریخ حیات تو ایک طرف،آپ کا زمانہ بھی یقینی طور پر طے نہیں ہوسکا۔اس میں اس کے باہمی تضاد و تناقص ہے۔کہ حقیقت یکسر افسانوں کی چادروں میں لپٹی ہوئی مستور ہے۔''The crisis of modern world'' کے مصنّف (Rene Guenon) رین گینان کے مطابق زرتشت کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ ایک ایسے منصب کا نام ہے جس میں ''نبوت اور قانون سازی'' کا مفہوم پایا جاتا ہے۔اس لیے زرتشت بہت سے گزرے ہیں۔جن میں آخری زرتشت کا زمانہ (600ق) ہے۔زرتشی آپ کا نام ابراہیم بتاتے ہیں۔

اب جو کہانی ملتی ہے تو یہ ایران میں پیدا ہوا۔اصلی نام افتشام یا اسپتام تھا(Spitama)۔اس نے بھی گوتم بدھ کی طرح شادی کی۔پھر ترک دنیا کر کے جنگلوں میں چلا گیا۔یہ دو خدا۔ایک نیکی اور دوسرا بدی کا مانتا تھا۔گوتم بدھ اور اس کے ہاں ایک ہی فلسفہ ہے۔ایران میں زرتشت بن گیا اور وہ ''گوتم سدھارتھا'' وہاں تبت میں گوتم بدھ بنا۔دونوں کی ابتداء بالکل ایک جیسی ہے۔یہ بھی اعلیٰ شخصیت کا حامل تھا۔زرتشت فیثاغورث (500BC) کا شاگرد اور منوچہر بادشاہ کی کونسل کا رکن تھا۔کسی بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا۔خاندانی نام اسپٹاما تھا۔گوتم بدھ ہندوستان کے راجہ کپل وستو کا بیٹا تھا۔جو جنگل میں چلا گیا اور اسے بڑ کے درخت کے نیچے ''بدھی'' ملی تھی۔(بدھی یعنی روشنی)

زرتُشت کے لفظ معنی ہی ''سنہری روشنی کا مالک'' زر''سنہری'' اور ''تُش'' روشنی۔زرتُشت ''سنہری روشنی رکھنے والا'' جب اس نے یہ تعلیمات دینی شروع کی تو اس کو ملک بدر کر دیا گیا۔یہ باغتر (آج کل ترکستان) چلا گیا تھا۔بلخ کا وہ علاقہ جو ایران سے مشرق کی سمت ہے۔اور ذوالقرنین نے وحشی قبائل سے ان لوگوں کی جان چھڑائی تھی۔اس کی اپنی کوئی کتاب نہیں ملتی مگر اس سے منسوب کردہ کتاب کا نام 'اوستا'' ہے۔اس میں یہ فلسفہ ملتا ہے۔زرتشت نے کہا کہ خیر و شر کا منبع خدا ہے۔مذہب زرتشت (مجوس پارسی) آتش پرستی میں ہر چیز کا منبع خدا ہے۔یعنی اگر خیر و شر دونوں کا سرچشمہ خدا ہے تو پھر اس کی شانِ الوہیت باقی نہیں رہتی۔یہ ہے مشکل زرتشت کی! اگر اس کو مان لیا جائے کہ شر کا بھی سرچشمہ ہے تو اس کی الوہیت باقی نہیں رہتی۔اس لیے کہا کہ میں تو اسے نہیں مانوں گا۔

1273 اگلی چیز جو کہی کہ اس سے انکار تو نہیں کیا جاسکتا کہ شر موجود ہے۔ ہاں البتہ یہ خدا کا پیداہ کردہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔اس میں خدا کی الوہیت پر حرف آتا ہے۔ دیکھا! گوتم بدھ سے بھی ایک قدم آگے بڑھا ہوا ہے۔ پھر اس کا حل کیا ہے؟ حل یہ ہے کہ خیر ایک ہستی مان لی جائے۔ اوراس کے مقابل میں شر دوسری مستقل بالذات ہستی مان لی جائے۔ خدا کو اس سے بچانے کے لیے اس نے دو ہستیاں مان لیں کہ کہیں وہ خالق شر نہ قرار پائے۔ اس نے ایک دوسرے کے سامنے دو متضاد ہستیاں مان لیں۔

خیر (Or-Mazd, Or-Muzd) ''اہرمزد'' خیر کا مظہر اور نور کا سرچشمہ ہے۔ اسے (Ahura-Mazda) بھی کہتے ہیں۔ یہ پہلوی زبان سے ماخوذ ہے ''اہرا مزدا'' معنی ''روح دانش'' (Wise spirit) ''Ahura'' (اہرا) روح۔ (Spirit) اور Mazda (مزدا) دانش اس کے مقابل اہرِ من (Ahriman) شر اور تاریکی کا پیکر۔ یہ (Anra Meinue) (انرامین یو) سے ماخوذ اہرِ من ہے۔ یہ شر کا خدا ہے۔ (Anra Mainue) کے معنی شرِ روح۔ یہ ایرانی مادہ انس (Ans) بمعنی شر۔ نفرت اور (Mainyu) بمعنی روح اس سے اہرِ من بنتا ہے۔

ان دو مستقل ہستیوں میں باہمی کشمکش جاری ہے۔ یزدان (Mazda) سے نکلا ہے نیکی کا خدا ان کے ہاں اہرمزدا۔ منبع خیر ہے۔ اس کے مقابل اہرمن ہے جو ''انرامین یو'' سے ماخوذ ''اہرمن'' ہے۔ یہ شر کا خدا ہے۔ اس کی کتاب ''اوستا'' ہے جو ژند زبان میں تھی۔ یہ زبان پہلوی زبان سے پہلے رائج تھی۔ آج کل اس کا شمار مردہ زبانوں میں آتا ہے۔ فلاسفی یہ ہے کہ شر اور خیر دو مستقل بالذات وجود ہیں۔ ان میں ہمیشہ کشمکش جاری رہے گی۔ ان کے وجود ہی سے عیسائیت کے روح اور مادہ کے باہمی تضاد کی عمارت قائم ہے۔ اس سے نیکی اور اس کا تصور قائم ہوتا ہے۔ یہ وہی عمارت ہے جس نے ہندوستان میں آکر (روح) آتما کو (اہرمزد) کا جزو اور مادہ (پراکرتی) کو مایا (سراب) یعنی فریب نگاہ بنا کر دکھایا۔ پھر تصوف کے ہاں شر تو نقاب میں دین اور دنیا کی تفریق کا موجب بنا۔ اوران کو جداگانہ زندگی میں تقسیم کرنے کا باعث ہوا۔ لیکن اس سارے قصہ کا منتہائے مقصود کیا نکلا؟ اہرِ من کی طرح مقصود بالذات ہے۔ یزدان کی طرح یہ دونوں مستقل بالذات ہیں یہ ثنویت اس کے مذہب کی بنیاد ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دونوں آخر کار کہاں پہنچے؟ یہ اس مصیبت سے تو نکل گیا کہ خدا کو منبع شر قرار نہ دیا جائے۔ مگر اس کا حل نہ دیا کہ پھر کیا کیا جائے؟ آخر وقت تک وہ اس بات پر ڈٹا رہا کہ پاکیزہ روحوں کی اہرِ من سے کسی قسم کا خوف نہیں۔ اہرمزد کا فیصلہ ہے کہ نیکی کو آخری فتح ہوتی ہے یہ ہے زرتشت کا فلسفہ۔

خلاصۂ تعلیمات بدھ

خیر وشر کی یہ ساری بحث درحقیقت گوتم بدھ کا پہلا مکتب فکر ہے اس نے شر والی بحث ہی ختم کردی۔ کہ خدا کی کوئی ہستی نہیں ہے۔ یہ Exist ہی نہیں کرتی۔ انسان کے خیالات کی پیدا کردہ ہے۔ اب اس شر کو مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ ترکِ ترک کے اپنے عمل سے اپنے آپ کو معدوم (non-Exist) بھی کرلیتا ہے۔ اس نے خیر اور شر کے مسئلہ کو یوں سلجھا کر اپنے آپ کو فریب یا اطمینان دلا دیا۔ کیا وہ مثبت چیز دنیا چاہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ خیر بھی موجود ہے اور شر بھی موجود ہے۔ یہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی قرار دیتا ہے۔ میں اس قسم کا خدا نہیں مان سکتا۔ ایسا خدا ماننے سے بہتر ہے کہ خیر کے خدا کو رکھ لیا جائے۔ اور مقابل میں ایک شر، مستقل بالذات ہی سہی، اس کو کھڑا کردیا جائے۔ اس نے یوں اپنے طور پر شر اور خیر کی گھتی یوں سلجھائی۔

اقبال تصوف کے خلاف پورے جوش وخروش سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا اسے ''طاسین زرتشت'' میں کہہ گیا ہے۔ اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تصوف اگرچہ مجوسی نقطۂ نظر ہے مگر مجوسیوں کے ہاں ہی پہنچ کر اقبال نے اسے کو مطرود (Condemn) کیا ہے۔ غالباً اقبال اس زرتشت کی اصلی تعلیم نہیں سمجھتا۔ یہ تعلیم بعد میں ان کے ہاں آئی ہے۔

دراصل جھوٹ ہمیشہ سچائی کے لبادے ہی میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ بے نقاب ہوکر سامنے آ ہی نہیں سکتا۔ ابلیس کا حربہ بدی کو سب سے بڑی نیکی بتائے۔ اور جو اس فریب کو حقیقت سمجھ بیٹھے وہ سب سے بڑا فریب خوردہ ہوتا ہے۔ کھلی ہوئی برائی سے تو ساری دنیا بچتی ہے مگر وہ چیزیں جو بظاہر نیکی نظر آتی ہیں۔ ان کے اندر چھپی ہوئی برائی سب سے زیادہ تخریبی ہوتی ہے۔ اقبال نے یہ نکتہ قرآن سے لیا تھا۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) اس فریب میں نہ آنا کہ نیکی منہ کو قبلہ رخ ہونا ہے مغرب کو منہ کیا یا مشرق کو۔ یہ قطعاً نہیں ہے اور مذہب کی دنیا نے اس کو کتنا بڑا نیکی کا کام بنایا ہوا ہے اب دیکھیں اہرِمن، یزداں سے مخاطب ہے۔

طاسینِ زرتشت:

آزمائش کردن اہرِمن زرتشت را:

اقبال کا ابلیس شیطان ہے۔ ابلیس نہیں جو سراسر مایوسی ہے۔ اہرِمن یزداں سے مخاطب ہے۔

از تو مخلوقاتِ من نالاں چوں نے
از تو مارا فرودیں مانند دَمے

تیری وجہ سے میری مخلوق فریادہ کندہ ہے اور تیری وجہ سے بہار خزاں بن گئی ہے۔

در جہاں خوار و زبونم کردۂ
نقشِ خود ز خونم کردۂ

(تو نے دنیا میں مجھے خوار وذلیل کردیا ہے۔تو نے اپنے نقش سے مجھے میرے خون سے رنگین کردیا ہے)۔

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھو اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو

یعنی تیری ایسی کی تیسی کہ:

نقشِ خود رنگیں ز خونم کردۂ
زندہ حق از جلوۂ سینائے تست
مرگِ من اندر یدبیضائے تست
تکیہ بر میثاقِ یزداں ابلہی است
برمرادش راہ رفتن گمرہی است

(یزداں کے وعدوں پر اعتبار کرنا حماقت ہے۔اس کے مقصد کے راستہ پر چلنا ہی تو گمراہی ہے)۔

زہرہا در بادۂ گلفام اُوست
اَرّہ وکرم وصلیب انعامِ اوست

اس کی گلابی رنگ کی شراب میں زہر ملا ہے۔اس کے انعامات تو آرہ۔کٹہرا اور سولی ہیں۔یہ تینوں تلمیحات بہ قصص پیغمبر ہیں جو حق کا ساتھ دینے کی پاداش میں مختلف اذیتوں سے گزرے اس کے بعد خدا والا بن کر کیا کرنا ہے؟

جز دعاہا نوح تدبیرے نداشت
حرف آں بیچارہ تاثیرے نہ داشت

(دعا کے علاوہ نوح کے پاس کوئی تدبیر نہیں تھی اور بیچارے کی بات میں کوئی تاثیر نہیں تھی)

کہا تھا نوح نے لَا تَذَرۡ عَلَى الۡاَرۡضِ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ (71:26) بسنے کے لیے نہ چھوڑنا ان نافرمانوں کو۔

شہر را بگذار و در غارے نشیں
ہم بہ خیل نوریاں صحبت گزیں

شہر کو چھوڑ کر کسی غار میں بیٹھ اور فرشتوں کی صحبت میں بیٹھ جاؤ۔تیرا کام ہی نہیں اس دنیا میں۔

از نگاہِ کیمیا کن خاک را
از مناجاتے بسوز افلاک را

طاسینِ مسیح

اور مسیحیّت میں طالسطائی کا کردار:

پہلا طاسین گوتم بدھ کہ سارا کچھ شر ہی شر ہے۔علاج اپنے آپ کو مٹا دو۔فنا کر دو تو شر مٹ جائے گا۔دوسرا طاسین زرتشت آیا تھا۔اس نے کہا کہ خیر و شر دو مستقل بالذات ہیں۔ان کا ٹکراؤ کرو۔خیر خیر ہی ہے۔شر شر ہی رہے اس میں ثنویت آ گئی اب تیسرا طاسین عیسیٰ ہیں۔عیسائیت نے شر کے وجود سے انکار تو نہیں کیا۔شر اور خیر کو دو مستقل بالذات خدا بھی تسلیم نہیں کئے جا سکتے۔یہ شرک ہے کہا کہ شر اور خیر دونوں خدا نے پیدا کیے ہیں پھر اکلوتے بیٹے کی قربانی دیکر شر کو ختم کر دیا اور خیر کو باقی رکھا یوں اپنی دانست میں خیر و شر کا مسئلہ حل کر دیا۔

مسیحیّت میں طالسطائی:

اقبال مسیحیّت میں طالسطائی (1910-1828) کو کیوں لایا ہے؟ طالسطائی کا باپ روس کا بڑا نواب، بہت بڑا جاگیردار اور بہت بڑا سرمایہ دار تھا۔یہ 1828ء میں یسنا یہ کے مقام پر پیدا ہوا۔چھوٹا ہی تھا کہ باپ مر گیا۔ساری نوابی اور دولت اس کے حصہ میں آئی بہت ہی پڑھا لکھا شخص تھا۔جس نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔

طالسطائی نے 1862ء میں صوفیا سے شادی کی۔وہ اس کے مزاج کے برعکس تعیّش پسند نکلی۔جس کی وجہ سے وہ بے حد پریشان رہا۔اب صوفیا تہذیب مغرب کی نمایندگی کر رہی ہے اس جاوید نامہ میں۔وہ اس زمانے کی الٹرا ماڈرن ہے۔جس کو تہذیب مغرب کہا گیا ہے۔طالسطائی جنگ میں بحیثیت سکینڈ لیفٹیننٹ جاتا ہے۔جنگ کریمیا میں جانے کے بعد اس نے کتاب ''War and Peace'' لکھی۔یہ پہلی کتاب تھی اور اسے بڑی شہرت ملی۔وہ اپنی بیوی صوفیا سے پریشان ہے اینا کرنینا (Anna Karenna) اس کا شہرہ آفاق ناول ہے۔اس ناول کی ہیروئن اسی کی بیوی ہے جس کے ہاتھوں یہ نالاں ہے۔اور اس ناول میں اس نے شدت سے اس کا اظہار کیا ہے اور شوپن ہار کی کتاب ''The World as will and reperesentation'' پڑھنے کے بعد یہ خدا پرست بن گیا۔اور مسیحیت کو اپنے او پر طاری کر لیا۔اس نے انجیل کو یونانی زبان

سے روسی میں ترجمہ کیا۔ یہ صلیب کو گلے میں نہیں لٹکا تا تھا بلکہ سچ کی طرح صلیب کو اپنے کندھوں پر کھینچتے ہوئے پھرتا۔ پھر اس نے ایک کتاب ''Kingdom of God is within you'' اور دوسری لکھی ''What is religion''۔ انہی دو کتابوں کی بدولت مذہبی دنیا میں اس کو شہرت ملی۔ مذہب کیا ہے؟ اس نے مسیحیت کو جس طرح سمجھا وہ تمام اس میں بیان کر دیا۔

پہلی مسیحیت پال (5-67-AD) نے دی ہے۔ دوسری مسیحیت طالسطائی نے دی۔

اقبال نے طالسطائی کو نمائندہ بنا کر یہاں رکھا۔ پھر اس کے بعد طالسطائی نے اعتراف کیا (Confession) اپنے زمانے کے سارے شہر اور سارے خیر، خرابیوں اور اچھائیوں کا اعتراف کر رہا ہے۔ اس کی پہلی تمام زندگی جاگیرداری اور نوابیت پر مشتمل تھی۔ اس میں خرابیاں اور برائیاں موجود تھیں۔ اس کے اعتراف میں نظر آ رہا ہے۔ دراصل وہ اپنے عہد پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ اس کی دو کتابیں ''Anna Krenna'' اور ''War and Peace'' روسی تہذیب کے دو بڑے ستون گنے جاتے ہیں۔ دراصل اقبال کا سارا پیغام تہذیب مغرب کے خلاف ہے۔ اس سے پیشتر تہذیب مغرب کے خلاف صرف ٹالسٹائی نے لکھا تھا۔ اقبال کو ٹالسٹائی اس لیے پسند تھا کہ آخر میں جا کر وہ اشتراکی ہو گیا۔ ساری جاگیر اور دولت غریبوں اور مزدوروں میں بانٹ دی۔ جس پر اسے سارے کنبہ کے سوائے اس کی سب سے چھوٹی بیٹی لیگزانڈرا کے سب نے لعن طعن کی۔ پھر 1910 میں یہ بیوی کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلا گیا۔ وہ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے پر عزم تھا۔ اس کے بعد غالباً 20 نومبر 1910ء میں ایک ریلوے سٹیشن کے ایک پلیٹ فارم کی بنچ پر تنہا اور کسمپرسی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اسے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ صبح وہ اسی بینچ پر بیٹھا ہوا مردہ پایا گیا اقبال دو وجوہات کی بنا پر اس کو لایا ہے۔ اقبال یہودیوں کا کیریکٹر دینا چاہتا تھا کہ انہوں نے مسیح کی کیسے مخالفت کی۔ اور دوسرا یہ بتانا کہ مسیح کے نام لیوا یورپی عیسائی ہیں انہوں نے عیسائیت کی کسی قدر مخالفت کی۔ جاوید نامہ میں ''رویائے حکیم طالسطائی'' ہے۔ طالسطائی کا خواب۔ اس نے عہد نامہ جدید کا ترجمہ بھی کیا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اس میں سے فوق الفطرت چیزیں نکال کر اس کو روسی زبان میں پیش کیا۔ اہل روم جو اس بناء پر دعویٰ جتا رہے ہیں وہ سراسر غلط ہے، اس کام کی حقیقی بنیاد طالسطائی نے رکھی تھی۔

طاسینِ محمدؐ، انسانیّت کا آخری سہارا اور خیر و شر کا ابدی حل

اب یہاں بتایا گیا کہ خیر خدا کی طرف سے آتا ہے۔ رسول کا پیغام خیر ہی خیر تھا۔ ابوجہل یعنی عمرو بن ہشام بن مغیرہ کو اس میں خیر نظر نہ آیا۔ اسے شر ہی شر نظر آ رہا ہے۔ بات یہ ہے تم نگاہِ محمدؐ سے دیکھو تو خیر اور نگاہ ابوجہل سے دیکھو تو شر ہی شر ہے۔ کائنات میں خیر ہی خیر ہے مگر اس کا استعمال اسے خیر اور شر بنا دیتا ہے۔ اس لیے وحی کی نگاہ میں دیکھو گے تو دوسروں کی فکر کرو گے اور انفرادی مفاد بعد میں۔

''نوحہ روحِ ابوجہل در حرمِ کعبہ'' یہ شخص کعبہ کا پردہ تھامے آہ و فغاں کر رہا ہے یہ شخص عرب جاہلیہ میں فوج کے شعبہ کو منظم کرتا تھا۔ اقبال نے عرب جاہلیہ کی بات بتائی ہے۔

ایران میں مزدک کے تصورات اور نوحہ روحِ ابوجہل در حرمِ کعبہ:

مزدک رسول ﷺ سے ذرا پہلے نوشیرواں کے زمانہ میں گزرا ہے اسی نے ایران میں اشتراکیت پھیلائی۔ زن۔ زر۔ زمین۔ تین کو متاعِ عام کر دیا تھا۔ افلاطون نے بھی اشتراکیت میں زر اور زمین کے ساتھ زن کو عام کر دیا تھا مزدک قدیم ایرانی فلسفی اور مذہب زرتشت کا پیروکار تھا۔ اس نے زر۔ زمین اور زن کو فساد کی جڑ قرار دیا۔ زمین کاشتکاروں میں تقسیم کر دی اور دوسروں کو بھی معاشی مساوات کا درس دیا۔ امیری غریبی کی برابری کا سبق دیا۔ پہلے پہل کچھ ہمدردیاں بعد میں حکومت نے پیرکاروں سمیت قتل کر دیا کہا جاتا ہے کہ کارل مارکس نے بنیادی تصوّرات بھی یہیں سے لیے تھے مگر یہ بالکل ہے غلط کارماکس سے پہلے بھی شاہ ولی اللہ اور دیگر مسلم سکالر نے یہ نظریات قرآن سے اخذ کر کے پیش کیے تھے۔

❁❁❁

نوحۂ روحِ ابوجہل درحرمِ کعبہ

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود
نوجوان را ازدستِ ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است
ایں دو حرف لا اِلٰہ خود کافری است
تابساطِ دین آبا درنورد
(درنورد یعنی لپیٹنا۔مٹانا)

ہمارا سینہ محمد ﷺ کی وجہ سے داغ داغ ہے کیونکہ اس کے نظریات نے کعبہ کا چراغ گل کر دیا ہے۔ملوکیّت کا خاتمہ ہوگیا۔سارے نوجوانوں کو اچک لیا اس جادوئی حکم لا اِلٰہ سے اور ہمارے بتوں کے ساتھ وہ کیا جو نا قابل بیان ہے۔

با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد
پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام ازوئے بگیر اے کائنات
دل بہ غائب بست و از حاضر گسست
نقش حاضر را فسونِ او شکست
دیدہ بر غائب فروبستن خطاست؟
(فروبستن۔مرکوز کرنا۔دیدہ۔آنکھ)

1273

اس نے غائب کے ساتھ دل لگایا اور حاضر سے منہ موڑ لیا۔ اور یہ تو اندھوں کا کام ہے کہ سامنے کوئی نہ ہو اور اس کو سجدہ کیا جائے۔

آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست

جو نظر نہیں آتا وہ کہاں ہے۔ لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ (6:103)

پیش غائب سجدہ بردن کوری است

(کوری۔ اندھا)

دینِ نو کور است وکوری دوری است

خم شدّن پیشِ خدائے بے جہات

(بے جہات۔ بے تعین۔ جس کی مثال نہ ہو)

بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰت

(کبھی ایسی صلوات میں مزہ ہو سکتا ہے)

مذہبِ او قاطع ملک و نسب

از قریش منکر از فضلِ عرب

اس کے مذہب نے تو رنگ و نسل کی جڑ کاٹ دی۔ قریش اور عرب کی فضیلت کا منکر ہے یہاں چھوٹے بڑے، کالے گورے میں کوئی تمیز نہیں۔ کالوں کو گوروں سے ملا دیا ہے۔

در نگاہِ او یکے بالا و پست

با غلام خویش و بر یک خواں نشست

قدرِ احرارِ عرب نشاختہ

با کلفتانِ حبش در ساختہ

(کلفتان۔ بدصورت۔ در ساختہ۔ موافقت)

احمراں باسواداں آمیختند

آبروئے دودمانے ریختند

(دودمانے۔ خاندان)

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است

خوب می دانم کہ سلمان مزدکی است

ابنِ عبداللہ فریبش خوردہ است

رستخیزے بر عرب آوردہ است

(رستخیزے۔ چڑھائی۔ حملہ)

عترتِ ہاشم زخود مہجور گشت

(عترت۔ خاندان۔ مہجور۔ دور)

یہ تو سلمان مزدکی کا سبق ہے اور ہاشمی خاندان کی عزت خاک میں مل گئی ہے۔

ز دو رکعت چشمِ شاں بے نور گشت
عجمی را اصلِ عدنانی کجاست

(کوئی بھی عجمی عدنان کی نسل سے نہیں ہے۔ عدنان جدامجد قریش کا)

گنگ را گفتار سحبانی کجاست؟

بر نیائی اے زبیر! از خاکِ گور

چشمِ خاصانِ عرب گرویدہ کور؟

(زبیر بڑا شاعر تھا)

اے تو مارا اندریں صحرا دلیل
بشکن افسونِ نوائے جبریل

(نوائے جبریل۔ رہنمائی۔ قرآن)

باز گو اے سنگِ اسود باز گو
آنچہ دیدم از محمد باز گو

(باز گو یعنی پھر بیان کر)

اے ہبل! اے بندہ را پوزش پذیر

(پوزش پذیر یعنی عذر قبول کرنے والے)

عبداللہ کے بیٹے نے فریب کھایا اور ہم پر جنگ مسلط کر دی۔ یہ تو اندھے ہیں جو دو رکعت نماز ادا کر کے ایک ہی صف میں ان دیکھے خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اے ہبل! تم خود یہ داستان سناؤ۔

خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر
گلۂ شان را بگر گاں کن سبیل

تلخ کن خرمائے شاں رابر نخیل
(خرمائے شاں: ان کی کھجوریں)

صرصرے دہ باہوائے بادیہ
اے منات اے لات ازیں منزل مرو
گرز منزل می روی از دل مرو
اے ترا اندر دو چشمِ ما وثاق
مہلتے اِنْ کُنْتَ از مَعَتُ الْفِرَاق
(وثاق۔گھر)

(اگر جانا ہی ہے تو تھوڑا اٹھہر جا یہ مصرعا جاہلیت کے سب سے بڑے شاعر امراء القیس کا ہے)

یہ آخری شعر امراء القیس کا ہے۔ اب یہ ایک مصرعہ اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر کا کہ اب یہ نظام تہہ و بالا ہونے کو ہے۔ یہ سب خیر ہی خیر ہے جو ابوجہل کی نظر میں شر ہے یوں خیر وشر کا مسئلہ حل کر دیا۔

❁❁❁

سورۂ نجم کی قدر و منزلت، جمال الدین کی زبانی

قرأتِ آں پیرِ مردے سخت کوش
سورۂ والنجم آں دشتِ خموش

جمال الدین افغانی کو سخت کوش کہا ہے کیونکہ اس کی ساری زندگی مشقت میں گزری۔ ایک دن کا چین نہ ملا۔ آزاد ہے تو عالم اسلام کی تگ و دو ہے۔ مکیں ہے تو پابند سلاسل۔

قرأتے کزوے خلیلؑ آید بوجد
روحِ پاک جبریل آید بوجد

ایسی آواز کہ جبریل بھی وجد میں آجائے۔ اور قبروں سے اللہ کی آوازیں بلند ہو جائیں۔

دل ازد در سینہ گردد ناصبور
شورِ الااللہ خیزد از قبور
اضطرابِ شعلہ بخشد دود را
سوز و مستی می دہد داؤد را
آشکارا ہر غیاب از قرأتش
بے حجاب اُمّ الکتٰب از قرأتش

یہ قرآت تو اس قدر دلکش ہے کہ دھویں کو شعلہ اور داؤد کو سوز و مستی عطا کر دے۔ اس کی قرأت سے ساری چیزیں مشہود ہو گئی ہیں اور یہ قرآن بے حجاب ہو کر آ گیا ہے۔

کارل مارکس اور جمال الدین افغانی

جمال الدین افغانی اشتراکیّت کا جو دہریّت والا پہلو ہے۔ اس پر تنقید کرتا ہے اس کا رسالہ ردِ دہریت میں ''مادیت'' کے نام سے ایک مضمون ہے۔ وہ دہریت کے خلاف تھے مگر اس میں پیش کردہ معاشی نظام کے خلاف نہیں تھے۔ اور ملوکیت کے خلاف تھے۔ اس کے دو پیغام تھے دہریت اور ملوکیت نہیں ہونی چاہیے۔ اقبال کے ہاں کارل مارکس کی مخالفت کا طریق اور اس کے حقیقی مقام کی وضاحت:

؎ صاحب سرمایہ از نسل خلیل
یعنی آن پیغمبرِ بے جبریل

کارل مارکس (81-1818) یہودی النّسل۔ بنی اسرائیل سے تھا۔ اسرائیل یعقوب کا لقب تھا یہ ابراہیم کے پوتے تھے۔ ان کے اولاد ابراہیم کی نسل سے ہے۔ چونکہ اقبال کے ہاں کارل مارکس کے لیے ایک نرم گوشہ ہے۔ اس کو رد بھی کرتا ہے تو یوں جیسے پولیس لاٹھیوں پر روئی باندھ کر لاٹھی چارج کرتی ہے۔ اس لیے اسے یہودی کہہ کر نہیں پکارا۔ وہ تو بڑی قابل نفرت شے ہو جاتی ہے۔ خلیل کے ساتھ تو ایک محبت کی نسبت ہے۔ جہاں کارل مارکس کا ذکر آئے گا۔ اقبال بڑے نرم انداز میں اس پر تنقید کرے گا۔ اپنی کتاب ''The Capital'' کی نسبت سے وہ ''صاحب سرمایہ'' ہے اس سے مراد سرمایہ دار نہیں ہے جیسے صاحبِ قرآن رسولؐ کو کہتے ہیں۔ اس کو بے جبریل کہا ارمغان حجاز میں اس کو:

وہ کلیمِ بے تجلّی وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر لیکن در بغل وارد کتاب

اقبال نے کارل مارکس کے خلاف جو لکھا ہے۔ وہ کسی کٹر اسلام پسند کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ پیغمبر نا تواں گفت کہا۔ اگرچہ جبریل ساتھ ہوتو پیغمبر ہو گیا۔ اصل میں یہ تو انسانیت کے لیے بہت بڑا پیغام ہے لیکن بے جرئیل۔ یہاں اقبال کی عظمت کھلتی ہے۔ دل میں نرم گوشہ جبکہ دوسری طرف قرآن اسے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ اب دیکھئے یہ دونوں رعایتیں کتنی خوبصورت رکھتا ہے۔

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

1273
مارکس کی معاشی اور معاشرتی حالت قابل رحم جبکہ ذہنی طور پر وہ فکر بلند کا حامل نبی تو وہ ہوتا ہے جس کا قلب و دماغ دونوں مومن ہوتے ہیں۔ یہاں قلب او مومن کارل مارکس کے دل میں انسانیت کا درد موجود ہے۔ ہمارے دور میں کارل مارکس جتنا دردمند سخن نواز شاید ہی کہیں اور پیدا ہوا ہو۔ اس کی زندگی ملاحظہ کریں کہ ایک وقت کی روٹی کے لیے اس غریب کے توبہ توبہ، پرخچے اڑ گئے۔ قلب اوَ مومن لیکن دماغش کافر است۔ دماغ اس قدر بلند کہ ''The Capital'' میں جو پیغام دیا ہے۔ چند معیشت کے بڑے بڑے دماغ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ کہ وہ بات کیا کہہ گیا ہے؟ ایک نہایت بلند و بالا دماغ! جو کو بھیک کے ٹکڑے نہیں ملے۔ در بدر مارا مارا پھر رہا ہے۔ انگلینڈ کے (Slums) کچی آبادی میں رہا مکان کا کرایہ تک نہیں دے سکتا تھا۔ کبھی کسی نے جھونپڑی سے نکال دیا۔ اپنی تحریر شدہ چیزوں کو لیے لیے پھرتا۔ کوئی چھاپنے پر تیار نہ ہوتا۔ ورنہ وہ اپنے قلم کے زور سے چاہتا تو پوچھو نہیں کہ کیا کچھ کما سکتا تھا۔ یہ انسانیت کا درد ہے جو اسے لیے لیے پھرتا ہے۔ یہ حق تھا اس کا کہ کیمونسٹ کی چھاپ کے خوف کے باوجود اقبال نے اس کو Quote کیا ہے۔ ایسا کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ کیمونزم سے باہر اتنا بڑا اندرانہ تحسین کسی مارکسی کو نہ مل سکا۔ اب اس کا تعارف کروا رہا ہے۔

ؔغربیاں گم کردہ اند افلاک را

(اہل مغرب نے افلاک کو گم کر رکھا ہے)

در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نہ نگیرد جانِ پاک
جزبہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساوات شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اند دل است
بیخ او در دل نہ در آب و ِگل است

سب کو ایک جیسی روٹی دیدینے سے تو اخوت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ملوکیت وشتراکیت دونوں کورگیدا ہے۔

ہم ملوکیت بدن را فربہی است
سینہ بے نورِ او از دل تہی است

(اس کا بے نور سینہ دل سے خالی ہے۔ ملوکیت اگرچہ بدن کو موٹا کرتی ہے)

مثلِ زنبورے کہ برگل می چرد
برگ راگذارد و شہدش برد

(اس مکھی کی مانند جو پتوں کو چھوڑ کر رس چوس لیتی ہے۔شہد لے جاتی ہے)

شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں
بر جمالش نالۂ بلبل ہماں

(مکھی کے شہد چوسنے سے پھول کے شاخ پتے و رنگ اسی طرح رہتے ہیں۔اور جمال پر نالۂ بلبل اسی طرح رہتا ہے)

از طلسم و رنگ و بوئے او گذر

(یعنی شہد نہ ہونے کے باوجود اسی طرح کا رہنا تو طلسم ہے)

ترکِ صورت گوے و در معنی نگر
مرگِ باطن گرچہ دیدن مشکل است

(پھول کا ظاہر باقی جبکہ باطن شہد سے خالی ہے۔اس طرح ملوکیت میں لوگوں کا حال۔اندر سے خالی روح مردہ۔یہ مرگ ظاہر آسان۔مرگ باطن دیکھنا مشکل ہے)

مرگِ باطن گرچہ دیدن مشکل است
گل مخواں اورا کہ در معنی ِگل است

(اس کو پھول نہ کہہ۔وہ تو باطن میں مٹی ہے)اشتراکیت اور ملوکیت کا فرق سامنے آ گیا۔

ہر دورا جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس، آدم فریب

(ناشکیب۔غیر مطمئن)

زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیانِ ایں دو رنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست
آں بُرد جاں را زتن، ناں را ز دست

(اشتراکیت علم، دین اور فن کے ذریعہ توڑ پھوڑ کرتی ہے۔جبکہ ملوکیت تن سے جان اور ہاتھ سے روٹی لے جاتی ہے۔یہ دونوں انتہا پر لے جاتے ہیں۔ایں خدا نانے دہد جانِ برد جبکہ ملوکیت ''آں برد جاں را زتن ناں را ز دست'')

غرق دیدم ہر دو را در آب و ِگل
ہر دو راتن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن باساختن
در گِلے تخمہ دل انداختن

(زندگی تعمیر وتخریب ہے۔سوختن۔(تخریب)۔سوختن باساختن یعنی مٹی میں ایک دل ڈال دیا۔یہ ہے زندگی)اصل حیات مٹی میں ایک گل پیدا کرنا۔یہ دل سب کچھ ہے یعنی اصل طبعی زندگی سے ماوراء یعنی نفس انسانی۔ذات۔اس کو دل سے تعبیر کرتا ہے:

سید حلیم پاشا کی زبانی:

غربیاں را زیر کی سازِ حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات

(دین کا سارا نچوڑ اس میں آ گیا۔یعنی عقل اور وحی کے ملاپ کا دوسرا نام دین ہے)

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِعشق از زیرکی محکم اساس

(دونوں ضروری ایک دوسرے کے لیے)

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ

(بنہ۔ثبت کر۔قدم اٹھا)

عشق را بازیرکی آمیزدہ
شعلۂ افرنگیاں غمخوردہ است

(اٹھو!اور ساری دنیا میں قرآن اور عقل کے ملاپ کی تبلیغ کر کیونکہ مغربی تہذیب تو تباہی کے دہانے پر ہے)۔
(غم خوردہ یعنی داؤ پر لگی ہوا۔ٹوٹا)

چشمِ شاں صاحب نظر،دل مردہ است
زخمہا خوردند از شمشیرِ خویش
بسمل افتادند چوں نخچیرِ خویش
سوز و مستی را مجو از تاکِ شاں

ان کی تقلید نہ کر کیونکہ وہ اپنی تلوار سے خود زخمی ہو گئے ہیں۔لادینی سے مسائل بڑھ رہے ہیں اس کا علاج صرف قرآنی تعلیمات ہیں۔اب تو وارث کتاب ہے۔اس روشنی کو سارے عالم میں منور کر دے۔

(تاک سے مراد انگور)

لا دینی و لاطینی، کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا لا غَالِبَ اِلَّا ھُو
زندگی را سوز و ساز از نارِ تست
عالمِ نو آفریدن کار تست

مصطفی کمال پاشا کو حلیم پاشا کی زبانی نصیحت

مُجدد۔یعنی تجدید کرنے والا جبکہ ''مُتجدِّد''، یہ تجدد سے ہے یعنی بری شے۔

مصطفی کو از تجدّد می سرود
گفتِ نقشِ کہنہ را باید زدود
نو گردد کعبہ را رختِ حیات
گر ز افرنگ آیدش لات و منات

(باید زدود یعنی مٹانا چاہیے)

(کعبہ کا سامان حیات نہیں ہو جاتا۔ اگر اس میں فرنگیوں سے لات ومنات آجائیں)

ترکِ را آہنگِ نو در چنگ نیست
تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

(اس سے ترکی کے ساز نے نیا سُر پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کے تمام تجددات سوائے افرنگ کی پرانی چیزوں کے کچھ نہیں ہے۔ نقل اور تقلید تو سراہنے والی شے نہیں ہے۔)

سینۂ او را دمے دیگر نبود
در ضمیرش عالمے دیگر بنود

(اس کے جہاں میں کوئی نیا عالم نہیں)

لاجرم با عالم موجود ساخت
مثلِ موم از سوز ایں عالم گداخت

اس میں شک نہیں کہ مادی ترقی ترکی نے موافق کرلی۔ مگر اس عالم سوز سے وہ موم کی طرح پگھل گیا۔

چوں مسلماں اگر داری جگر
در ضمیرِ خویش و در قرآن نگر

صد جہانِ تازہ در آیات اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست

(قرآن کی آیات میں موجود جہانوں میں ایک جہاں دورحاضر کے لیے کافی ہے۔اگرحقیقت تک رسائی والا دل ہےتو قرآن سارے زمانے کی امامت کرتا ہے۔)

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست
ہر جہاں اندر بر او چوں قباست

(بندۂ مومن تو خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔اس کے پہلو کا ہر جہاں اس کے لیے قبا ہے برش۔اس کا پہلو)

چوں کہن گردد جہانے دربرش
می دہد قرآں جہاںِ دیگرش

(جب اس کے پہلو میں ایک جہاں بوسیدہ ہو جائے تو قرآن اس کو دوسری تمعض دیتا ہے)

اب اقبال افغانی سے مخاطب ہے۔

زورقِ ما خاکیاں بےناخداست
کس نداند عالمِ قرآن کجاست

(ہماری کشتی ناخدا کے بغیر ہے۔کوئی نہیں جانتا کہ قرآن کون سے جہاں میں حکمرانی کررہا ہے۔)

افغانی کا جواب:

عالمے درِ سینۂ ما گم ہنوز
عالمے درِ انتظار قم ہنوز

(اس قُم کہنے والے کے انتظار میں ہے یہ ساری دنیا جو قرآنی نظام سے انقلاب لے آئے)

عالمے بے امتیاز خون و رنگ شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
(کرانش۔اس کا کنارہ)
عالمے پاک از سلاطین و عبید چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
(جس میں کسی خون ورنگ کی تمیز نہیں)

عالمے درِ سینۂ ما گم ہنوز
عالمے درِ انتظار قم ہنوز

(اس قُم کہنے والے کے انتظار میں ہے جس میں انسان کی حکومت انسان سے ختم ہوجائے گی)

عالمے بے امتیازِ خون و رنگ شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر تخمِ او افگند در جانِ عمرؓ
لا یزال و وارداتش نوبنو برگ و بار محکمتش نوبنو

(ایسی تعلیم جس نے عمرؓ کو فاروق اعظم بنا دیا)

اثبات وتغیر دونوں کا مجموعہ ہے لا یزال اور نو بنو۔ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝٢٤ تُؤۡتِيۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍۢ بِاِذۡنِ رَبِّهَا ؕ (14:24-25)

باطنِ او از تفسیرِ بے غمے ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے
اندرونِ تست آں عالم نگر می دہم از محکماتِ او خبر

(یعنی محکمات تو غیر متبدل جبکہ ظواہر ہر دور میں تبدیل ہوتے رہیں گے)۔

❁❁❁

پہلا قرآنی سبق مقامِ آدم سے روشناس ہونا ''احترامِ آدمیّت'' ہے

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (17:70)

خشکی اور تری سب کو مسخر کر سکتا ہے۔

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق ابنِ آدم سرّے از اَسرارِ عشق

(رازوں میں سے وحی کا راز ابن آدم کے پاس ہے)۔

سِرّ عشق از عالمِ ارحام نیست

(خون کے رشتوں سے سرِ عشق نہیں ہے نہ ہی حام وسام وروم سے ہے)

او زسام و حام و روم و شام نیست

(وہ نسل اور وطن کی نسبتوں سے ماوراء ہے)

کوکبِ بے شرق وغرب وبے غروب

(لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ 24:35)

در مدارش نے شمال و نے جنوب

(زمان ومکان سے ماوراء ہے)

حرفِ اِنِّیْ جَاعِلٌ تقدیرِ او از زمیں تا آسمان تفسیرِ او

مرگ وقبر وحشر ونشر احوالِ اوست نور و نارِ آں جہاں اعمالِ اوست

او امام و او صلوٰت و او حرم او مِداد و او کتاب و او قلم

خردہ خردہ غیب او گردد حضور نے حدودِ او را نہ ملکش راثغور

(خردہ خردہ یعنی ٹکڑے ٹکڑے بتدریج اور ثغور سے مراد حدود)

از وجودش اعتبارِ ممکنات اعتدالِ او عیارِ ممکنات
(یعنی یہ تمہارے ہاتھوں سے ہوتا ہے عیار سے مراد کسوٹی ہے)

ممکنات کا اعتبار سے اس کے وجود سے ہے۔ یعنی وہ اس کے ہاتھوں سے بارز ہونگی۔ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴿۳۳﴾ (2:33) (ممکنات) اوراس کی کسوٹی۔ پیمانہ آدم ہے اعتدالِ او۔ جب ذات میں توازن بدوش ہوگا۔ تو وہ توازن اس کی کسوٹی ہوگی۔ دنیا میں بھی میزان اور قیامت میں بھی میزان۔ بشرطیکہ آدم متوازن شخصیت ہو۔

من چہ گویم ازیمِ بے ساحلش غرق اعصار و دھور اندر دلش
(اعصارودھور۔کئی زمانےاس کےدل میں غرق ہیں)

آنچہ در عالم نگنجد آدم است اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ(55:33)
آشکارا مہر و ماہ از جلوتش نیست رہِ جبریل را در خلوتش
(جبریل کی بھی وہاں تک رسائی نہیں ہے۔سورج و چانداس کی جلوت سے آشکارا ہیں)

حکومت الٰہی:

برتر از گردوں مقامِ آدم است اصلِ تہذیب احترامِ آدم است
بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام نے غلام اورا نہ او کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس ملک و آئینش خدا داد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش زحق زشت و خوب و تلخ نہ نوشینش زحق
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ درنگاہش سود و بہبودِ ہمہ
عادل اندر صلح وہم اندر مصاف وصل و فصلش لایراعی لایخاف
(دوستی ودشمنی میں نہ معافی نہ رعایت اور نہ خوف)
غیر حق چوں ناہی و آمر شود زور در بر ناتواں قاہر شود
اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو دامنِ قرآں بگیر آزاد شو
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (3:103)

❁❁❁

تیسرا شق محکماتِ عالمِ قرآنی۔۔۔ارض ملکِ خدا است

سرگزشتِ آدم اندر شرق و غرب بحرِ خاکے فتنہ ہائے حرب وضرب
(سارے جھگڑے زمین کے لیے شرق ومغرب میں سارے انسانوں کی تاریخ یہی ہے)
یک عروس و شوہر او ماہمہ آں فسونگر بے ہمہ ہم باہمہ
یہ جادوگر ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے بغیر بھی۔ وہ تو کسی کی بھی نہیں ہوسکتی)
عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است نہ از آنِ تو نہ از آنِ من است
باطنِ الارض للہ ظاہر است ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کا فراست

یہ ارض ظاہر بھی رکھتی ہے اور باطن بھی شریعت والے اس کو ظاہری طور پر ملکیت قرار دیتے ہیں۔ وہ قرآن اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کہتے ہیں یہ معنوی ہے اور معاشرے میں ظاہری طور پر اس پر ملکیت آجائے گی۔ قرآن نے تو اسے خدا کے ساتھ شرک قرار دیا ہے۔

من نگویم در گزر از کاخ و کوے دولتِ تست ایں جہانِ رنگ وبوے
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر صیدچوں شاہیں ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود را بکہسارش بزن نورے از خود گیر وبہ نارش بزن
از طریقِ آزری بیگانہ باش برمرادِ خود جہانِ نوتراش

حکمت خیرِ کثیر:

قرآن نے کتاب کے ساتھ حکمت کا اصطلاح دی ہے۔ جس کو اَلْحِکْمَۃَ دی گئی تو گویا خیر کثیر دیدیا گیا۔

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
علم و حرف و صوت را شہپر دہد پاکئ گوہر بہ ناگوہر دہد

(علم حرف وصوت کو بال و پر جرئیل عطا کر دیتا ہے۔ اوران موتیوں کو جو اپنی آپ کھو چکے ہیں پا کئی آب عطا کرتا ہے۔)

علم رابر اوجِ افلاک است رہ
تاز چشم مہر برکند دنگہ

تاز چشم مہر برکند دنگہ نسخۂ او نسخۂ تفسیر کلُ

یہاں تک کہ وہ سورج کی آنکھ سے بھی نگاہ چھین لیتا ہے اس کا نسخۂ، نسخہ جاری کی کل تفسیر بیان کرنے کا نسخہ ہے۔ برکند۔ اکھیڑ کرلانا ہے۔

دشت را گوید حبابے دہ ، دہد بحر راگوید سرابے دہ، دہد

(یعنی صحراؤں اور سمندروں سے جس طرح چاہے کام لے لے۔)

چشمِ او بر وارداتِ کائنات تا بہ بیند محکماتِ کائنات

(کائنات کے تغیرات پر اس کی نگاہ ہوتی ہے تا کہ وہ محکمات تک دیکھ سکے۔ یعنی کائنات کی۔ Ultimate-Reality)

دل اگر بندد بہ حق، پیغمبری است گرزحق بیگانہ گردد کافری است

(پیغمبری سے یہاں مراد علم ہے علم کا حق سے دل لگانا پیغمبری ہے اگر بے گانہ ہوجائے تو کفر ہے)

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است نورِ او تاریکئ بحر و بر است

(آج کا علم جو تاریکی سے بدتر ہے جو انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔ یعنی علم بغیر وحی کے شر ہے۔)

می برد سرمایۂ اقوام را قوتش ابلیس را یارے شود

(اقوام سے ہر قسم کا سرمایہ چھین لیتا ہے اس کی قوت ابلیس کی مددگار ہوجاتی ہے۔ جو علم وحی کے تابع نہ ہو۔)

نور نار از صحبتِ نارے شود کشتنِ ابلیس کارے مشکل است

(صحبت نار سے یعنی شیطان کی صحبت سے اس علم کا نور نار بن جاتا ہے۔)

زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است خوشتر آں باشد کہ مسلمانش کن

(خیر وشر کے مسئلہ کو حل کر دیا کہ شر کو مسلمان کر دو تو خیر ہوجائے گا۔)

کور را بینندہ از دیدار کن بولہب را حیدرِ کرار کن

پیشِ مالک عالمِ فرسودہ است ملّت اندر خاکِ او آسودہ است

رفت سوز از سینۂ تاتار و کُرد یا مسلماں مُرد یا قرآں بُمرد

سید حلیم پاشا جواب دے رہا ہے۔ ملائیت کے بارے میں

دینِ حق از کافری رسوا تر است   زانکہ ملا مؤمنِ کافرگر است
شبنمِ ما درنگاہِ ما یم است   از نگاہِ او یمِ ما شبنم است
از شکر فیہائے آں قرآں فروش   دیدہ ام روح الامین را در خروش

اسلام کو کافری سے بھی زیادہ رسوا کر دیا ہے کیونکہ ملائیت سب کو کافر بنانے پر تلی ہوئی ہے۔اور یہ قوم تو مردہ ہوگئی ہے اس لیے یا مسلمان مر گئے ہیں یا قرآن کو مار دیا ہے۔

(شکر فیہا یعنی روز نئے رنگ ہونا۔خروش کے معنی واویلا کرنا شور مچانا)

زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ   نزدِ او اُمّ الکتب افسانۂ

(یعنی جو کتاب زمین والوں کے لیے اتاری گئی ہے۔اس سے ملا بے گانہ ہے۔اس آسمان قرآن کی روشنی نہ ہونے سے اندھرے میں ہے۔ساری ملت کو اس تنگ نظر نے فرقوں میں بٹ دیا ہے۔ان کے مدارس یہ کتاب سمجھنے سے عاری ہیں۔کافر کا جہادِ تسخیرِ کائنات جبکہ ان جہادفتنہ اورفساد۔)

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی   آسمانش تیرہ از بےکوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گر   ملت از قال واقولش فرد فرد
مکتب و ملا و اَسرارِ کتاب   کور مادرزاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر فکرِ و تدبیرِ جہاد   دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد

اب ملا کے مقابل مردِ حق لایا ہے:

مردِ حق جانِ جہانِ چارسوئے   آں بخلوت رفتہ را از من بگوے

(مرد حق تو جہان چارسو کی جان ہے۔اس خلوت اختیار کئے ہوئے کو کہہ دو میری طرف سے۔)

اے ز افکار تو مومن را حیات   از نفسہائے تو ملت را ثبات
حفظِ قرآنِ عظیم آئینِ تست   حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست
تو کلیمی چند باشی سرنگوں   دست خویش از آستیں آور بروں

(چند یعنی کب تک۔دست کلیمی کو آستین سے باہر نکال اور موسیٰ کی طرح قوم کو آزادی دے۔اس لیے اس قرآن کی آواز کو دور دور تک پھیلاؤ۔)

سرگذشتِ ملّتِ بیضا بگوے　　　　با غزال از وسعتِ صحرا بگوے

(ملت بیضا۔ روشن ملت کو ہرن کی طرح وسیع صحرا دکھا دے)

فطرت تو مستنیر از مصطفی است　　　　باز گو آخر مقامِ ما کجا است

مردِ حق از کس نگرد رنگ و بو　　　　مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو

ہر زماں اندر تپش جانے دگر　　　　ہر زماں اورا چوں شانے دگر

جز حرم منزل ندارد کارواں　　　　غیرِ حق درِ دل ندارد کارواں

کس نمی داند ز اَسرارِ کتاب　　　　شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب

(رسول اللہؐ کے سواءِ حسنہ سے سبق لے اور ایک مردحق کی طرح فرنگی تہذیب کا رنگ نہ اپنا کیونکہ اس قرآن کے اسرارِ رموز کوئی بھی نہیں جانتا۔ مغرب ومشرق دونوں اس سے نابلد ہے)

روسیاں نقشِ نوی انداختند　　　　آب و ناں بردند و دیں بر درباختند

حق ببیں، حق گوے وغیر ازحق مجوے　　　　یک دو حرف از من بآں ملت بگوے

مغرب اور مشرق دونوں قرآنی اَسرار سے نابلد ہیں اس لیے گمراہ ہیں۔ روسیوں نے روٹی کی خاطر دین بیچ دیا۔ اس لیے میرا یہ پیغام ملت تک پہنچادو۔

❁❁❁

افغانی کا پیغام بہ ملّت روسیہ ۔ ایک شاندارِ پیغام

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دل او آتشِ سو زندہ نیست — مصطفی در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد

(نخورد۔ فائدہ اٹھانا۔ دُرد۔ تلچھٹ۔ آج کا مسلمان قرآن سے بے بہرہ ہے)

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوتِ گرفت — دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

(نہال۔ پودہ نے قوت پکڑی تو اسے ملوکیت میں بدل دیا)

از ملوکیت نگاہ گردد دگر — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

علامہ کا پیغام قوم روس کو کہ تو نے کیا کر دیا؟:

تو کہ طرح دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی

(پرداخت سے مراد اٹھالینا)

ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں — قصیریت را شکستی استخواں

(تم نے بھی ہڈیاں قصر و قسرا توڑ دیں)

پائے خود محکم گذار اندر نبرد — گرد ایں لات و ہبل دیگر مگرد

(نبرد یعنی نبرد آزما ہونا۔ مگرد کے معنی طواف کرنا پرانے نظام کے گرد)

آج نوعِ انسانی کو دوبارہ تنذیر کے بعد تبشر کی ضرورت ہے، تنذیر و تبشیر:

ملّتے می خواہد ایں دنیائے پیر — آں کہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر

(یہ پرانی دنیا اب ایسی ملت کی تلاش میں ہے جو نذیر بھی ہو اور بشیر بھی)

بازی می آئی تو اقوامِ شرق بستہ ایامِ تو باایّامِ شرق

(تو دوبارہ مشرق کی طرف آ۔ ترے زمانے مشرق کے زمانوں سے وابستہ ہیں۔)

یہ انقلاب تو صرف لا تک محدود تھا:

تو بجاں افگندۂ سوز دگر در ضمیرِ تو شب و روزے دگر

(افگندہ۔ یعنی پیدا کرنا نئے نظام کو اختیار کیا ہے)

کہنہ شدِ افرنگ را آئین و دیں سوئے آں دیرِ کہن دیگرِ مبیں

(ان کا نظام فرسودہ ہو گیا ہے۔ اس کی طرف نہ دیکھ)

اب لا کے بعد اِلّا کی طرف آ ؤ۔

کردۂ کارِ خداونداں تمام بگذر از لا جانب اِلّا خرام

در گذر از لا اگر جویندۂ تا رہِ اثبات گیری زندۂ

(اب تجھے لا سے اِلّا کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے)

(تو تجھے زندگی مل جائے گی)

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے جستۂ او را اساسِ محکمے؟

ام الکتب آخری سہارا ہے انسانیت کا۔ کیا تو نے اس نظام کا جذبۂ محرکہ تلاش کر لیا ہے۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب فکر را روشن کن از اُمّ الکتٰب

(تو نے پرانے نظاموں کا ایک ایک باب دھو دیا ہے۔ اب اس قرآنی نظریہ سے روشنی حاصل کر)

باسیہ فاماں یدبیضا کہ داد؟ مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد؟

(سیاہ رنگ والوں کو ید بیضا کسی نے دیا؟ عالمگیر بنانے کے لیے ان کے نقش قدم پر چل قیصر و کسریٰ کی نفی کی خوشخبری کس نے دی۔)

در گذر از جلوۂ ہائے رنگ و بو خویش را دریاب از ترکِ فرنگ

گر ز مکرِ غربیاں باشی خبیر روبہی بگذار و شیری پیشہ گیر

چیست روباہی تلاشِ ساز و برگ شیر مولا جوید آزادی و مرگ

1273

جز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فکرِ قرآن اختلاط ذکر و فکر فکر را کامل ندیدیم جز بذکر
(مغرب کی شاطرانہ چالوں سے باخبر ہو جا۔صرف قرآن ہی مداوا کرسکتا ہے اور مغرب کو سراسر فریب ہے۔)
ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب کارِ جاں است ایں نہ کارِ کام ولب
(کام ولب۔یعنی دہن)
(اس میں تو جان مارنی پڑتی ہے۔)
اے شہیدِ شاہدِ رعنائے فکر با تو گویم از تجلی ہائے فکر
(اے فکر کے شاداب محبوب پر مرٹنے والے۔)
چیست قرآں؟ خواجہ راپیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے سازو برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا (2 9: 3)
از ربٰو آخر چہ می زاید؟ فتن کس نداند لذتِ قرض حسن
(ربٰوے سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔می زاید۔پیدا ہونا قرآن تو سرمایہ دار کی موت کا پیغام ہے۔اور بے کسوں کا سہار۔سرمایہ دار سے خیر کی کوئی اُمید نہیں۔یادرکھوں کے ربٰوے دنیا میں سب سے بڑا فتنہ ہے)
از رِبا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

کمیونزم قرآنی معاشی نظام کی بگڑی ہوئی شکل ہے:

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
(متاع بندہ ہے مگر ملکیت خدا کی ہے۔یعنی وہ سامان جو صرف سفر کے لیے ہو)
بندۂ مومن امیں حق مالک است غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است
كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ ۝٢٦ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ ۝٢٧ (55:26-27)
رایتِ حق از ملوک آور نگوں قریہ ہا از دخلِ شاہ خوار و زبوں
(ملوک کی مداخلت سے بستیاں کی بستیاں اجڑ گئیں۔اللہ کا جھنڈا ملوک نے سرنگوں کر دیا۔)
وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ (27:34)
آب و نانِ ماست از یک مائدہ دودۂ آدم كَنَفۡسٍ وَّاحِدَةٍ
(دودہ سے مراد خاندان)

قرآن کے دورِ اولی میں مذہبی پیشوائیت اور ملوکیت کا خاتمہ ہو گیا تھا:

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویاست ایں

(خدا کی طرح ظاہر بھی اور پنہاں بھی یعنی صرف خارجی تبدیلی نہیں بلکہ اندر تک بدل دیتی ہے۔ یہ زندہ ہمیشہ بولنے والی اور وقت کے سارے تقاضوں کے مطابق ہے۔)

اندرو تقدیر ہائے غرب و شرق — سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

(اس کو سمجھنے کے لیے بجلی کی تیزی والا فکر پیدا کر۔)

بامسلماں گفت جاں برکف بنہ — ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

(ضرورت سے زیادہ نہیں رکھ سکتے)

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ (9:111)

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219)

لیکن اب ان روسیوں سے کہا:

آفریدی شرح و آئینے دگر — اندکے بانورِ قرآنش نگر

(ذرا ان کو قرآن کی روشنی میں دیکھو۔)

از بم و زیرِ حیات آگا شوی — ہم از تقدیر حیات آگہ شوی

(ذرا زندگی کی اونچ، نیچ پر نگاہ ڈال تو تقدیر زیست سے آگہی مل جائے گی۔)

اقبال آج بھی مایوس نہیں ہے:

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نواہا باقی است

(قرآنی ساز کے نغمے تو موجود ہیں مگر ہماری محفل میں وہ شراب وساقی نہیں ہے نہ قرآن اور نہ قرآن دینے والا امام۔ شخصیت کا ہونا لازم ہے)۔

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزراں زخمہ در

یہ قرآن اگر ہم اسے فائدہ نہ اٹھائیں تو کوئی اور قوم آکر اس سے مستفیض ہوگی۔

ذکرِ حق از امتّاں آمدِ غنی　　　از زماں و از مکاں آمد غنی

(یہ قرآن زبان ومکان سے بے نیاز ہے یہ کسی قوم، جگہ یا زمانہ کا محتاج نہیں ہے۔)

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست　　　احتیاج روم و شام اورا کجاست

حق اگر از پیشِ ما بردارش　　　پیشِ قومے دیگر بگذاردش

(اگر اللہ تعالیٰ قرآن ہم سے اٹھالے گا تو وہ اسے کسی دوسری قوم کے سامنے رکھ دے گا۔)

یہ نغمہ فصلِ گل ولالہ کا نہیں پابند:

از مسلمان دیدہ ام تقلید وظن　　　ہر زماں جانم بلرزد دربدن

(مسلمان کی حالت دیکھ کر ہر لمحہ میری روح تڑپ اٹھتی ہے)۔

ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　　آتشِ خود بر دلِ دیگر زند

(اس دن سے ڈرتا ہوں جب اللہ مسلم کو قرآن سے محروم کردے۔ اور اپنی یہ تعلیمات کی کسی اور قوم میں دل میں جاگزیں کردے۔)

❁❁❁

گردش در شہر مَرغدیں "صحیح قرآنی معاشرہ"

مرغدِین و آں عماراتِ بلند　　　من چہ گویم زاں مقامِ ارجمند
(ارجمند یعنی بلند شان والی عمارات کا شہر)
ساکنانش درسخن شریں چوں نوش　　　خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے دردِ سوزِ اکتساب　　　رازدانِ کیمیائے آفتاب
ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور　　　چوں نمک گیریم ما ز آبِ شور
(وہ اس توانائی سے چاندی اور سونا سب بنا لیتے ہیں۔)
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر　　　کارہا راکس نمی سنجد بزر
(علم و ہنر کا مقصد لوگوں کی خدمت ہے۔ یہاں کاموں کو سونے میں کوئی نہیں تولتا۔)
کسی ز دینار و درم آگاہ نیست　　　ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
بر طبیعتِ دیوِ ماشیں چیرہ نیست　　　آسمانہا از دخانہا تیرہ نیست
سخت کوش دہقاں، چراغش روشن است　　　از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
(یعنی اس کے ماحصل سے اس کو محروم نہیں کیا جاتا۔ یہ لینڈ لارڈز کے سلب ونہب سے محفوظ ہیں۔)
کشت و کارش بے نزاعِ آبجوست　　　حاصلش بے شرکتِ غیر از وست
(ان کے کھیت پر پانی کے جھگڑے نہیں ہوتے۔ محنت کے ماصل میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا۔)
اندراں عالم نہ لشکر نہ قشوں　　　نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
(نہ کوئی کسی کو مار کر روزی حاصل کرتا ہے اور نہ فوج اور لشکر کا دخل ہے۔)
نے قلم در مرغدین گیرد فروغ　　　از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ
نے بہ بازاراں ز بےکاراں خروش　　　نے صدا ہائے گدایاں دردِ گوش
کسی دریں جا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولا حاکم و محکوم نیست
(اس نظام میں نہ کوئی حاکم نہ محکوم نہ روزی کی محتاجی۔)

مسئلہ تقدیر کا حل

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر　　خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرنو خواہی رواست　　زِانکہ تقدیراتِ حق لاانتہاست
ارضیاں نقدِ خودی درباختند　　نکتۂ تقدیرِ را نشاختند

(ارض والوں نے خودی کی نقدی ہار دی۔)

رمزِ باریکش بحرفے مضمر است　　تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا　　سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

(اگر خاک ہوجاؤ تو تجھے ہوا کی نذر کردیا جائے گا۔ اگر پتھر ہوجاؤ تو تجھے شیشے پر ماریں گے۔ خاک سے ذلت اور پتھر کو استحکام آجاتا ہے۔)

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست　　قلزمی؟ پائیندگی تقدیرِ تست
ہر زماں سازی ہماں لات و منات　　از بتاں جوئی ثبات اے بے ثبات

(تو ہر زماں وہی لات و منات بناتا ہے۔ جبر کا مجوسی عقیدہ ہے)

تا بخود ناساختن ایمانِ تست　　عالمِ افکارِ تو زندانِ تست

(جب تک تیرا ایمان ہے کہ اپنے آپ سے بنا کر رکھتا ہے۔ تو تیرے افکار کا عالم تیرے لیے قید خانہ رہے گا۔)

رنج بے گنج است، تقدیر ایں چنیں　　گنجِ بے رنج است، تقدیر ایں چنیں

(اگر عقیدہ یہ ہے کہ محنت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جب تیری تقدیر ہی ایسی ہے۔ یہ تو جبر کا عقیدہ ہے کہ اس میں تو رنج ہے خزانہ ملتا ہی نہیں ہے۔ اور خزانہ بے محنت کے مل جاتا ہے اگر تقدیر ایسی ہے تو یہ عقیدہ بھی نادرست ہے۔)

اصلِ دیں این است اگر اے بے خبر　　می شود محتاج ازو محتاج تر

(اگر بے خبر دیں کی اصل یہ ہے تو اس سے محتاج زیادہ محتاج ہوجاتا ہے۔)

وائے اں دینے کہ خواب آرد ترا | باز در خوابِ گراں دارد ترا
سحر وافسوں است یا دیں است ایں؟ | حَبِ افیوں است یا دین است ایں؟

(یہ تو مزید خواب میں رکھنے والا عقیدہ ہے۔)

زندگانی چیست کانِ گوہر است | تو امینی صاحبِ او دیگر است

(یہ زندگی تو کسی اور نے دی ہے تا کہ صلاحیتوں کو بارز کرو۔)

صلاحیتوں کا روشن کرنا:

طبع روشن مردِ حق را آبروست | خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اوست
خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است | مزدِ خدمت خواستن سوداگری است

(نشو ونما یافتہ عقل مرد حق کی عزت وآبرو ہے۔اس کا مقصود خلق خدا کی خدمت ہے جو پیغمبروں کی روش ہے۔)

اشتراکیت کا تضاد اب مادی تصور حیات کو لایا ہے

ہمچناں ایں باد و خاک و ابر و کِشت باغ وراغ و کاخ و کوے و سنگ وخشت
(ہمچناں۔اسی طرح سے)
اے کے می گوئی متاعِ ما زِ ماست مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارض حق را ارضِ خود دانی بگو چیست شرحِ آیۂ لَا تُفۡسِدُوۡا؟

(اس طرح سے یہ ہوا، مٹی، بادل، کھیت، یہ باغ وراغ، محل وآبادی پتھر واینٹ جن کے متعلق تو کہتا ہے کہ یہ ہماری ملکیت ہے۔ یہ تیری خام خیالی ہے یہ تو سب کچھ خدا کا ہے یہ تو زمین پر فساد پھیلانے والا نظریہ ہے۔)

ابن آدم دل بابلیسی نہاد من ز ابلیس ندیدیم جز فساد
(آج ابن آدم حق سے دل ہٹا کر ابلیس کے ساتھ لگا دیا ہے۔)
کس امانت را بکارِ خود نبرد اے خوش آں کو مِلکِ حق باحق سپرد
(کسی نے کسی کی امانت کو اپنے لیے استعمال نہیں کیا۔)
بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست
(آن۔ملکیت۔بردۂ۔تو لے گیا۔)
اگر تو باشی صاحبِ شے، می سزد اگر نباشی، خود بگو کے می سزد
(کے سے مراد کیسے)

(اگر واقعی تو کسی شے کا مالک ہوتا تو پھر یہ بات تجھے زیب دیتی۔ اگر تو مالک نہیں ہے تو کیا یہ تجھے زیب دیتا ہے۔)

مِلکِ یزداں را بایزداں بازدہ تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
(خدا کی ملکیت ہے۔اسے واپس کردے تاکہ ترے کاموں کی الجھنیں دور ہوسکیں۔)
زیر گردوں فقر و مسکینی چراست؟ آنچہ از مولاست، می گوئی زماست
تو قدرِ خویش ندانی بہا ز تو گیرد وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

(تو اپنی قدر و منزلت نہیں جانتا۔ قیمت تو تجھ سے لگتی ہے۔ وگرنہ چمکدار لعل پتھر کا ایک ٹکڑا ہے۔)

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود　　　　ایں زمان و آسماں دیگر شود

(تو ان اشیاء کو اپنی ملکیت سمجھنے کی بجائے جس طرح اس کے اصل مالک نے کہا ہے اس انداز سے دیکھو تو یہ زمین و آسماں بدل جائے گا۔)

❁❁❁

غالب کے اشعار جو حلاج کی زبان سے بیان ہوئے، نعت کے بہترین اشعار

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　　　آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفی او را بہا است　　　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفی است

(جہاں کہیں تو رنگ و بو کا جہاں دیکھتا ہے ہر وہ جہاں جس کی خاک سے آرزو پھوٹتی ہے۔ یعنی جس میں کمال کو پہنچنے کی آرزو ہے یا تو اس کی قیمت حضورؐ کی تعلیمات کی سبب ہیں یا پھر وہ ابھی حضور ﷺ کی تلاش میں ہیں۔)

❁❁❁

نیٹشے(1844-1900 Nietzshe)

کے بارے میں اقبال کہہ رہا ہے

قلبِ اُو مومن دماغش کافر است

ایمان قلبی کی بناء پر ہی تو وہ اس کو کائنات سے ماوراء بھیجنا چاہتا ہے۔ جبکہ دماغی کفر کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل نہیں کرسکتا۔ اقبال کو نیٹشے سے بڑی عقیدت تھی اور اس کا خاصا اثر لیا ہے اور فلسفۂ خودی میں برگسان سے بھی متاثر ہے۔ یہ اقبال کے پیام میں جو قوت وجلالت ہے یہ نیٹشے سے اخذ کردہ ہے۔

نیٹشے ایک Genius ہے۔ اتنا بلند پایہ فلاسفر شاید ہی ہمیں کہیں ملے۔ اقبال اس کو ’جانِ بے تاب‘ کہتا ہے۔ اس کے اندر تڑپ، اضطراب، آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ آب وگل کے پیکر، ختم ہو جائیں اور کوئی ایسا انسان پیدا ہو جائے جس کو فوق البشر (Ubermensch) ’’ایوبرمینش‘‘ کا تصور دیا۔ فوق البشر کو وہ خدا دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر عیسائیت کا انسان کامل کا جو تصور اس کے سامنے آیا۔ وہ سراپا عاجزی، کمزوری، مایوسی اور ضعیف کا تھا۔ اس کے تحت وہ فوق البشر، شر یا عقاب بننے کے برعکس درندگی اور قوت قاہرہ کا مالک بنا۔ اب اس میں جمالیت اور لوچ کا فقدان ہے۔ ایسا فوق البشر جو لا محدود جلالی قوتوں کا پیکر ہو۔ اگرچہ وہ منکرِ خدا ہے مگر خدا کی شانِ جبروت کو اپنے مافوق البشر میں دیکھنا چاہتا ہے۔ عیسائیت کو جس طرح نیٹشے نے کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ کسی اور نے نہیں کیا۔ اس سے پیشتر اگرچہ یورپ میں خالص (Eithics) کے کئی فلاسفر گزرے ہیں جنہوں نے اس عقیدے پر ضرب لگائی لیکن ’’Nietzshe‘‘ نے جس طرح اس کو تباہ کیا ہے اس کے بعد یہ پنپ ہی نہ سکی۔

نیٹشے کی لازوال کاری ضرب عیسائیت کے متعلق کچھ نہ پڑھئے صرف نیٹشے کی ایک کتاب پڑھ لیں اس کے بعد بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ زندگی کی نفی کی بجائے اس کے اثبات پر کیوں یقین رکھتا تھا۔ یعنی وہ (Philology) علم لسان کی بنا پر اسے نہیں پرکھتا۔ بلکہ وہ خالص (Ethics) کی بنا پر یہ کہتا ہے کہ عیسائیت دنیا میں اس شرط پر باقی رہ سکتی ہے کہ اسے فلسفۂ بقا

1273
کے تابع کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے (1888ء) ’’The Antichrist‘‘ نامی کتاب کے دیباچہ میں عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ تمہارا ’’Christ‘‘ یہودیوں کے ہاتھ سے بچ کر آسماں پر چڑھ گیا۔ وہ نیٹشے کے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا۔

نٹیشے عیسائی اخلاقیات سے اتنا برگشتہ ہے کہ اس کے خلاف اس کی کتاب "Good and Evil Beyond" عجب تصور ہے۔ کہتا ہے کہ خیر وشر سب بکواس ہے۔ وہ عیسائیت کی جس کو نیکی سمجھتے ہیں۔ انسانیت کی بربادی قرار دیتا ہے۔ شر کو ’’Original-sin‘‘ قرار دیا ہے۔ بعد ازاں خود کو مصلوب کروا کر جو کفارہ ادا کیا۔ اس پر تنقید کر کے کہتا ہے کہ ایمان لانے کا طریقہ غلط ہے کیونکہ جو خود کو نہ بچا سکا وہ تمہیں کیا بچائے گا؟

اس لیے اس نے ’’Good and Evil Beyond‘‘ میں ایسی کائنات کی تخلیق کرتا ہے جہاں موجودہ خیر وشر کوئی معیار نہیں رکھتے۔ اور وہ چاہتا بھی ہے کہ یہ معیار نہ رہیں۔ یہ ہے الجھن اس کی۔ مگر تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں؟ یہاں پہنچ کر اسے صحیح معیار نہیں ملتے۔ چنانچہ وہ خالص قوت کو معیار قرار دیتا ہے۔

نیٹشے کی قوت ارادی اور حقیقت کے تصورات کی نوعیت:

اب اس کے پاس Willpower ہے۔ شوپنہار کا (1788-1860) فلسفہ قوتِ ارادی ہے۔ (Will) مگر یہ قوت ارادی بلا مقصد ہے۔ اس کے برعکس نٹیشے کی قوتِ ارادی با مقصد ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ قوتِ ارادی موت کے بعد پھر ایک نئی زندگی تخلیق کرتی ہے جو پہلی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔ ایک نسل کو تباہ کر کے دوسری نسل کو وجود میں لاتی ہے۔ جو پہلے سے زیادہ صاحب قوت و استطاعت ہوتی ہے۔ اس کا فلسفہ (Etenral Recurrance) ’’ابدی بازگردی‘‘ کا فلسفہ ہے۔ جس نے افلاطون اور عیسائیت کے نظریات کو رد کر دیا ہے یہ ایک دوری انقلاب ’’Transvaluation of Values‘‘ جو بار بار ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ فوق البشر (Superman) وجود میں آجائے گا۔ یعنی کائنات کا سارا مقصد مٹی کے ان تمام جسموں کو عبور کر کے ان میں سے ایک فوق البشر پیدا کرنا ہے۔ اس فوق البشر کے لیے پہلے وہ ’’Super-Human Race‘‘ فوق البشر نسل پیدا کرتا ہے۔ نازیوں نے اس فلسفہ کو وجۂ جواز بنایا۔ آخر میں اس نسل سے ایک سپرمین پیدا ہوگا۔ یہی کائنات کا مقصد ہے۔ وہ سپرمین انسانِ کامل ہوگا۔ جو انتہائی جرأت اور جلال کی قوتوں کا مظہر ہوگا۔ اس میں کوئی رحم، لوچ، ذرا سی بھی نرمی نہیں ہوگی۔ نیٹشے رحم اور نرمی کو بالکل نہیں مانتا۔ حالانکہ وہ آرٹ کا بڑا قائل ہے، دلدادہ ہے، خاص کر میوزک کے متعلق کہتا ہے کہ موسیقی کے بغیر زندگی ایک غلطی ہے۔ آرٹ میں بھی وہ صرف قوت کو مانتا ہے۔ آرٹ اگر جمالیات کو ظاہر کرتا ہے تو اس کے نزدیک وہ آرٹ نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ قوت کو دیکھنے کا متمنی ہے اس کا یہ پہلو مسیحیت کے فلسفہ اخلاق کے خلاف بغاوت ہے نطشے کی کتابیں:

1) The Birth of Tragedy out of the spirit of music.

1273 2) The Gay science (1882).
3) Thus Spoke Zarathustra.
4) Beyond Good and Evil.
5) On the Genealogy of Morality.
6) The Antichrist.
7) Ecce Homo.
8) The will of power.

نیٹشے اور اقبال میں فرق:

نٹشے کا جبروت اور وجلال کا پہلو اور مسیحیت سے اختلاف کی وجوہات اقبال کو بے حد بھا گئیں۔ نیٹشے خدا کا منکر ہے۔لیکن خدائی صفات انسان میں دیکھنا چاہتا ہے۔ جو اس کا فوق البشر ہے۔اس اعتبار سے اقبال نے منصورِ حلاج کا درجہ دیا ہے۔کہ منصور انا الحق کہہ کر اپنے آپ کو خدا بناتا تھا۔جبکہ نیٹشے فوق البشر (Ubermensch) کو خدائی صفات کا حامل دیکھنا چاہتا ہے۔اقبال اس کے تصور فوق البشر کی وجہ سے اسے پسند کرتا تھا۔

نٹشے کی کرب بھری داستان حیات میں آخری خواہش:

یہ 15 اکتوبر 1844ء شہر ''Lipzig'' کے قریب ''Rocken'' نامی (راکن) قصبہ میں پیدا ہوا۔Philology یعنی علم لسان اس کا مضمون تھا۔لیکن وہ آل راؤنڈر تھا۔1889 تا 1879 اس نے یونیورسٹی آف (Basel) بے سیل میں پروفیسری کی۔فالج گرنے کے بعد اس پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔زندگی کا بیشتر حصہ اس نے ٹی بی کے مریض کی حیثیت سے گزارا۔وہ ایسا بے بس تھا جس کا کوئی سہارا نہ ہو۔باپ کارل لیڈوِگ نٹشے بچپن میں ہی مر گیا تھا۔ایک بہن الزبتھ فارسٹر نیطشے تھی۔جو اس کی تیمار داری کرتی تھی۔ان خطوط میں وہ تمام بیماریاں ہیں جو اس نے بہن کے نام لکھے۔وہ بہن کے نام لکھتا ہے یہ طبیب کیا جانیں کہ مجھے کیا مرض ہے؟ اگر تم کہیں سے دو آدمی ایسے پیدا کر دو جو میری بات کو سمجھ جائیں تو تمہارا بھائی آج اچھا ہو جائے گا۔

حقیقت میں وہ اس بات پر دال برداشتہ تھا کہ وہ اپنے دور سے بہت آگے ہے۔اس دور میں اس کو کوئی صحیح طور پر نہ سمجھ سکا۔وہ چیخ کر کہتا تھا کہ میرا علاج چھوڑ دو۔ان سب کو جواب دیدو۔نہ یہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ میں ان سے اچھا ہوسکتا ہوں۔کہیں سے ایسے لوگ پیدا کر دو جو میری بات کو سمجھ سکیں۔میں بس اتنا ہی چاہتا ہوں۔پھر تم دیکھو میں کیسے اچھا ہوتا ہوں۔اپنے متعلق اس کو اس قدر یقین تھا کہ آخری لمحوں میں اس کی بہن نے کہا کہ اب تو یہ نظر آرہا ہے کہ فطرت تمہاری زندگی جلد ختم کر رہی ہے۔وہ اپنی آخری کتاب ''Thus Spoke Zarathustra'' لکھ رہا تھا جو اس سے پوری نہیں ہوئی تھی۔وہ بہن کو لکھتا ہے کہ تم نے مجھے یہ کیا کہہ دیا ہے؟ فطرت تمہاری طرح بے وقوف عورت نہیں ہے کہ وہ اتنا بھی سمجھ نہ پائے کہ اگر میں یہ کام نا تمام چھوڑ گیا تو کوئی دوسرا

نہیں کر سکے گا۔اس لیے ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں یہ اپنا کام مکمل نہ کرلوں یہاں سے چلا جاؤں۔

نیٹشے کی زبان اور حقیقت جو اقبال کو بھا گئی:

یہ عجیب شخص تھا۔اس نے جرمن زبان میں لکھا ہے۔اس نے اپنی الگ زبان وضع کی تھی۔جس کے متعلق وہ دیباچہ میں رقمطراز ہے کہ وہ عام زبان میں گفتگو نہیں کرسکتا۔یہ عام زبان اس کی متحمل ہی نہیں ہوسکتی تھی۔اس کی زبان الگ ہونی چاہیے۔اس لیے میں الگ زبان وضع کررہا ہوں۔وہ شخص حقیقت کے اس قدر قریب آ کر یہ سب کچھ کہتا ہے۔اوراس کی کتاب جو اس کی موت کے بعد چھپی اس کا تو پوچھو ہی نہیں۔اس کا ترجمہ وہ حق ادا نہیں کرسکتا''The Will of Power''اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کا مقام نہایت معتبر اور بلند تھا۔پیام مشرق میں اقبال نے نیٹشے کے متعلق تین نظمیں کہیں،بڑی نظم میں شوپنہار کا فلسفہ ہے۔نیٹشے پہلے شوپنہار کا شاگرد تھا۔یہ انتہائی مایوسی کا فلسفہ ہے گوتم بدھ کا پیروکار ہے جس کی فلاسفی کو شوپنہار واضح کرتا ہے۔وہی نروان اس کا ماحصل ہے۔وہی ظلمت وہی''Passimism''۔

نیٹشے شوپنہار کو سمجھا تا تھا کہ کہاں غلطی کررہے ہو۔یہ نظم پیام مشرق 248 صفحہ(1948) پر ہے''اس نظم کا نام''شوپن ہارونیٹشے'' ہے۔

مرغے ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید　　　خارے زشاخِ گل بہ تنے نازکش خلید

(خلید یعنی چبھا)

بدگفت فطرتِ چمنِ روزگار را　　　از دردِ خویش وہم زغمِ دیگراں تپید

(ایک پرندہ اپنے گھونسلہ سے اڑکر باغ کی سیر کو گیا۔اس کے نازک جسم میں پھول کی شاخ سے ایک کانٹا چبھا۔اس نے زمانے کے چمن کی فطرت کو کوسا کہ یہ دکھ دینے والی ہے۔وہ اپنی تکلیف اور دوسروں کے غم میں تڑپا۔)

اصل میں یہ سارا ذاتی سانحہ ہوتا ہے جیسے بدھ کے ساتھ ہوا۔شوپنہار کا دماغ بہت تیز ہے۔اس نے اسے فلسفہ بنا دیا۔اور کروڑھا انسانوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔اقبال نے نیٹشے کے بت خانہ کو حرم میں تبدیل کر دیا۔یعنی قوت کے فلسفہ کو جلال کے فلسفہ کو جمال سے امتزاج دیدیا۔

داغے ز خون بیگنہے لالہ را شمرد　　　اندر طلسمِ غنچہ فریبِ بہار دید

گفت اندریں سرا کہ بنائیش فتادہ کج　　　صبح کجا کہ چرخ در و شامہا نہ چید

(اس نے لالہ کے خون کو کسی بے گناہ کا خون شمار کیا ہے۔اس نے غنچہ کے طلسم میں بہار کا فریب دیکھا ہے۔اس نے کہا کہ اس گھر کی بنیاد ہی ٹیڑھی ہے۔ایسی صبح کہاں جس سے آسمان نے شامیں نہ چنی ہوں۔یعنی دنیا رہنے کا مقام نہیں ہے اس کی ہر خوشی میں غم چھپا ہے۔اس کی صبح ہی نہیں ہوتی۔)

نالید تا بحوصلۂ آں نواطراز　　　خوں گشت نغمہ و زدُو چشمش فرو چکید

1273
(وہ بہت رویا۔تا آنکہ اس نوا پیدا کرنے والے پرندے کے حوصلے کے مطابق نغمہ خون بن گیا۔اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔)

سوزِ فغانِ اُو بدلِ ہدہدے گرفت   بانوکِ خویش خار ز اندامِ او کشید

(اس پرندے کی فریاد کا سوز ایک ہدہد نام کے پرندے کے دل پر اثر کر گیا۔اس نے اپنی چونچ سے اس پرندے کے جسم سے نکال لیا۔)

گفتش کہ سودِ خویش زجیبِ زیاں برار   گل از شگافِ سینہ زرناب آفرید

(زرناب۔سونا)

(اس نے کہا اپنا فائدہ اس نقصان کی جیب سے نکالو۔یہ ہے اس کا فلسفہ، حالات نامساعد آتے رہیں۔ ہر نامساعد حالت سے جو کوئی سود ہو تو اس میں سے نکل سکتا ہے۔)

(تو دیکھ رہا ہے کہ گلاب کے پھول نے پھٹے ہوئے سینہ سے خالص سونا پیدا کر لیا ہے۔اب یہ کرنا چاہیے۔)

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی   خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

(اگر جسم تیرا خستہ ہو گیا ہے تو فکر نہ کر بلکہ اسی درد سے علاج پیدا کر۔کانٹوں کا عادی ہو جا کہ سرتا پا باغ بن جائے۔)

پیامِ مشرق میں دوسری غزل بھی اس نے نیٹشہ پر لکھی:

از سُستیٔ عناصرِ انسان دلش تپید   فکرِ حکیم   پیکرِ محکم   تر آفرید

(اس کا دل انسان کے عناصر کی سستی پر تڑپ اٹھا۔تو اس کمزوری پر اس حکیم کے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی۔اس نے کہا چونکہ موجودہ پیکر ان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ان سے زیادہ محکم تر پیکر ہونا چاہیے۔)

افگند در فرنگ صد آشوبِ تازۂ   دیوانۂ   بکارگہِ   شیشہ‌گر   رسید

(یہ تو پڑھنے والا ہے! مزہ آ گیا! اقبال نے ان کے تمام فلسفہ، تاریخ، آرٹ، مذہب اور ساری سیاست کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے یوں بکھرے ہیں کہ کوئی دیوانہ شیشہ بنانے والے کے کارخانہ میں گھس گیا ہے جس کے پاؤں میں کوئی شے سلامت نہیں رہتی، اتنی سخت تنقید۔)

اگلی نظم بہ عنوان نیٹشہ پیامِ مشرق:

گر نوا خواہی از پیشِ او گریز   در نئے کلکش غریوِ تندر است

(نئے کلکش۔اس کے قلم کی بانسری)، (غریوِ تندر۔بجلی کے کڑاکے)

(اگر تو اس کی شاعری سے کوئی نوا چاہتا ہے تو اس سے گریز کر۔ کیونکہ اس کی قلم کی بانسری میں بجلی کی آواز ہے۔ اس نے انقلاب انگیز باتیں کی ہیں۔)

نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد　　　　دستش از خونِ چلیپا احمر است

(اس کا نشتر مغرب کے دل میں اتر گیا۔ اس کا ہاتھ گرجا یا صلیب کے خون سے رنگ ہے۔ خدا کا تو منکر ہو گیا مگر اس سے محبت کتنی ہے۔ اقبال کو۔)

آنکہ بر طرحِ حرم بتخانہ ساخت　　　　قلبِ او مومن دماغش کافر است

نیٹشے وہ ہے جس نے کعبہ کی بنیادوں پر بت خانہ بنایا ہے۔ اس کا دل تو مسلمان ہے لیکن اس کا دماغ کافر ہے۔ اقبال نے پیام مشرق میں اس پر فٹ نوٹ لکھا ہے کہ اس نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے۔ کافر اس لیے کہ خدا کا منکر ہے۔ بعض اخلاقی نتائج میں یہ قرآن کے قریب ہے۔ ''قلب او مومن دماغش کافر است'' اس قسم کا جملہ اُمیّہ ابن الصلت عرب شاعر کی نسبت کہا تھا۔ رسول ﷺ نے:

''اٰمَنَ لِسَانُہٗ وَ کَفَرَ قَلْبُہٗ''

سب کرنے کا کام یہ ہے۔

خویش را در نارِ آں نمرود سوز　　　　زانکہ بستانِ خلیل از آزر است

اس نمرود کی جلائی ہوئی آگ میں خود کو جلا دے۔ یوں اس کو حرم میں تبدیل کر کے خلیل بن جا آزر بمعنی آتش لیا ہے۔ اقبال نے نیٹشے کے قدرت و جبروت کے فلسفہ کو لے کر اس میں بس جمال کا امتزاج کیا ہے یوں اس کے بت خانہ کو حرم میں تبدیل کر دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے آگ کے شعلوں کو گلزارِ خلیل بنا دے۔ چنانچہ اقبال نے اس طرح اسے بدل ڈالا۔

نیٹشے کا فلسفہ:

ہر کجا استیزۂ بود نبود　　　　کس نداند سرِّ ایں چرخِ کبود

اس کائنات میں ہر جگہ بود نبود کی جنگ جاری ہے۔ کوئی شخص اس نیلے آسمان کا بھید نہیں جانتا۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ چاہتا ہے کیا ہے؟ بس ایک مسلسل جنگ جاری ہے۔

ہر کجا مرگ آورد پیغامِ زیست　　　　اے خوش آں مردے کہ داند مرگ چیست
ہر کجا مانندِ باد ارزاں حیات　　　　بے ثبات و باتمنائے ثبات
چشم منِ صد عالمِ شش روزہ دید　　　　تا حدِ ایں کائنات آمد پدید
ہر جہاں را ماہ و پروینے دگر　　　　زندگی را رسم و آئینے دگر

وقت ہر عالم رواں مانند زو دیر باز ایں جا و آں جا تندرو
(زو یعنی ندی)

(یہاں آہستہ وہاں تیز چل رہا ہے وقت)

سالِ ما ایں جا مہے آجا دمے بیش ایں عالم بآں عالم کمے

(جو یہاں زیادہ نظر آتا ہے وہاں وہ کم ہے۔ یعنی پیمانوں میں فرق ہے۔)

بر ثغورِ ایں جہانِ چون و چند بود مردے با صدائے درد مند

(چوں و چند یعنی اسباب و مقدار کی آخری حدود پر)

بود مردے با صدائے درد مند! دیدۂ او از عقاباں تیز تر

دمبدم سوز درونِ او فزود برلبش بیتے کہ صدبارش سرود
(صدبارش۔ساتھی سینکڑوں)

نہ جبریلے، نہ فردوسے، نہ حورے نہ خداوندے کفِ خاکے کہ می سوز د جانِ آرزومندے

(اسے نہ جبریل اور نہ خدا بھی اطمینان دلا سکتا تھا کہ وہ کف خاک جو جان آرزومندی سے جل گئی تھی)

من بہ رومی گفتم ایں دیوانہ کیست؟ گفت ایں فرزانۂ المانوی ست

درمیانِ ایں دو عالم جائے اوست نغمۂ دیرینہ اندر نائے اوست

باز ایں حلاجِ بے دارورسن نوعِ دیگر گفتہ آں حرفِ کہن

حرفِ او بے باک افکارش عظیم غربیاں از تیغ گفتارش دونیم

ہم نشیں بر جذبۂ او پے نبرد بندۂ مجذوب را مجنوں شمرد

(پے نبرد۔ سمجھ نہ سکے کہ وہ کیا کہہ گیا ہے)

عاقلاں از عشق و مستی بے نصیب نبضِ او دادند در دستِ طبیب

با پزشکاں چیست غیر از ریو و رنگ وائے مجذوبے کہ زاد اندر فرنگ

(اس کو طبیبوں کے حوالے کر دیا۔ ان کے پاس نمائش و دھوکہ ہی ہوتا ہے۔)

ابن سینا بر بیاضے دل نہد رگ زند یا حَبِّ خواب آور دہد

(بیاض کھولی اور فصد کھولدی یا نیند لانے والی گولی دیدی۔)

بود حلاجے بشہرِ خود غریب جاں زملا برد و کُشت اُوَ را طبیب

مردِ رہ دانے نبود اندر فرنگ پس فزوں شد نغمہ اش از تارِ چنگ

(ساز کے تاروں سے زیادہ)

راہر و راکس نشاں از رہ نداد صد خلل در وارداتِ او فتاد

(اس ساز کو منزل کا صحیح پتہ کس نے نہ بتایا۔ اس لیے اس کی واردات میں سینکڑوں خلل پیدا ہو گئے۔ یہ اس کا پاگل پن نہیں تھا بلکہ واردات قلبی تھا۔)

نقد بود و کس عیارِ او را نکرد کاردانے مردِکار او نہ کرد

(وہ خالص سونا تھا کسی نے اسے کسوٹی پر پرکھا ہی نہیں وہاں کوئی ایسا سمجھدار ہی نہیں تھا جو اس کو کام کا آدمی بنا تا۔)

عاشقے در آہِ خود گم گشتۂ سالکے در راہِ خود گم گشتۂ

مستیٔ او ہر زجاجے را شکست وائے سنگِ کہ صنم گشت و بہ مینا نہ رسید

(افسوس وہ پتھر جو بت بن گیا اور مینا تک نہ پہنچ سکا۔)

نیٹشے کی غلطی اقبال کی زبانی:

مستیٔ او ہر زجاجے را شکست از خدا ببرید و از ہم خودگسست

(اس کی جذبہ نے ہر شیشہ توڑ دیا۔ خدا سے بھی بے تعلق ہوا۔ اور اپنے آپ سے بھی رشتہ توڑ لیا۔)

شاخِ نہال صدرۂ خار وخسِ چمن مشو منکرِ اگر او شوی منکرِ خویشتن مشو

خواست تا بیند بچشمِ ظاہری اختلاط قاہری بادلبری

(وہ ظاہری آنکھ سے دلبری اور قاہری کے اختلاط کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ کیفیات تو دل کے اندر دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ وہ تو اس قسم کا محسوس انسان دیکھنا چاہتا تھا۔)

خواست از آب و ِگل آید بروں خوشۂ کز کشتِ دل آید بروں

(اس فوق البشر کو آب وگل سے برآمد کرنا چاہتا تھا۔ وہ خوشہ جو دل کی کھیتی سے باہر آنا چاہیے۔)

نیٹشے کا صرف لا کی حد تک محدود رہ جانے کی بنا پر کبریائی کی نعمت سے محرومی:

آنچہ اُو جوید مقامِ کبریا ست ایں مقام از عقل وحکمت ماور است

زندگی شرحِ اشاراتِ خودی است لا و الاّ از مقاماتِ خودی است

اُو بہ لا درماند و تا الا نہ رفت از مقامِ عبدہٗ بیگانہ رفت

(درمانده۔ پھنسا رہا، خدائی صفات انسان میں تلاش کی۔ یہ مقام آب وگل سے نہیں ملتا وہ اصل میں مقامِ عبدہٗ سے بیگانہ تھا۔)

میوہ از بیخِ شجر دور تر چوں بے خبر و ہمکنار باتجلّی

(حالانکہ اس اصل جڑ کا پیدا کردہ میوہ ہوتا ہے لیکن اس سے جڑ بے خبر ہے کہ اوپر کیا لگا ہوا ہے)

چشمۂ او جز رویتِ آدم نخواست نعرہ بے باکانۂ زد، آدم کجا است!

(وہ خاکی میں فوق البشر دیکھنے کا متمنی تھا اس نے بے باکانہ یہی نعرہ لگایا تھا۔ کہ آدمی کہاں ہے؟ فوق البشر کہاں ہے؟)

ورنہ او از خاکیاں بیزار بود مثلِ موسیٰ طالبِ دیدار بود

ورنہ یہ تو خوخاکیوں یعنی آدمیوں سے بیزار تھا۔ اور غلطی یہ ہے کہ سپر مین کو خاکیوں میں تلاش کر رہا ہے حالانکہ مثل موسیٰ وہ بھی دیدار کا طالب تھا)۔

❁❁❁

شرف النّساء(1726ء)

یہ نواب زکریا گورنر لاہور (1726ء) کی بہن اور نواب عبدالصمد کان کی بیٹی تھی۔ جو شاہ عالم کے زمانہ میں پنجاب کا گورنر تھا۔ سکھوں کو اس سے بڑی پرکاش تھی۔ شرف النساء نے ساری زندگی تجرّد میں گزاری جب وہ قرآن پڑھتی تو تلوار ہاتھ میں رکھتی تھی اور ماں سے کہا کہ جب میں مرجاؤں تو سادہ سی قبر بنانا اور اس کے اوپر قرآن اور تلوار رکھنا۔ لاہور باغبان پورے میں اس کا مقبرہ تھا۔ اس پر قرآن اور تلوار رکھا ہوتا تھا۔ سکھوں نے 1840ء میں اسے مسمار کر دیا۔ قرآن اور تلوار وہاں سے لے گئے تھے۔ اقبال کو تو قرآن اور تلوار سے عشق ہے۔ اقبال نے اس خصوصیت کی بنا پر شرف النساء کو لیا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک اصلِ زندگی تلوار اور قرآن ہے اس دور میں تلوار کے ساتھ قرآن اور قرآن کے ساتھ تلوار ہونی چاہیے تھی۔ اور اس زمانہ میں اس قسم کا خیال پیدا ہو جانا بذات خویش بڑی بات تھی۔

گفتم ایں کاشانۂ از لعلِ ناب　　آنکہ می گیرد خراج از آفتاب
(ناب یعنی خالص)

ایں مقام، ایں منزل ایں کاخِ بلند　　حوریاں بر درگہش احرام بند
(درگہش یعنی اس کی درگاہ پر حوریں حرام بندہ کر کھڑی ہیں)

قرآن اور تلوار کے مجموعہ میں مسائل کا حل:

قلزمِ ما ایں چنیں گوہر نزاد　　ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد
(ہمارے سمندر نے اس قسم کا موتی پیدا ہی نہیں کیا اور کسی ماں نے ایسی بیٹی نہیں جنی)

خاکِ لاہور از مزارش آسماں　　کس نداند رازِ اُو را در جہاں
آں سراپا ذوق و شوق و درد و داغ　　حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ
آں فروغِ دودۂ عبدالصّمد　　فقر او نقشے کہ ماند تا ابد
(دودہ۔ خاندان، اس کا فقر ہمیشہ چمکتا رہے گا لاہور کی زمین اس کی وجہ سے آسمان بن گئی ہے۔)

1273

تاز قرآنِ پاک می سو زد وجود — از تلاوت یک نفس فارغ نبود
در کمر تیغِ دوُرو قرآں بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست

وہ ہرلحہ قرآن کی تلاوت میں مگن اور قمر میں دوُ وتلوار اور اللہ کی یاد میں مگن رہتی تھی۔

خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز
برلبِ او چوں دم آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید

(کائنات کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو نوازنے کا تمام کام قرآن وتلوار کے باہمی ربط میں ہے)۔

گفت اگر از رازِ من داری خبر — سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگراند — کائناتِ زندگی را محور اند

(سارا دین اس میں آ گیا یعنی اسلام قرآن اور تلوار کا مجموعہ ہے۔)

اندریں عالم کہ میرد ہر نفس — دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقت ِ رخصت باتو دارم ایں سخن — تیغ و قرآں را جدا از من مکن
دل بہ آں حرفے کہ می گویم بنِہہ — قبرِ من بے گنبد و قندیل بہ

(بہ۔بہتر، ماں سے کہا کہ جب میں مرجاؤں تو اس قرآن اور تلوار کو مجھ سے جدا نہ کرنا چاہے میری قبر بغیر گنبد اور چراغ ہی کیوں نہ ہو)

مومناں را تیغ با قرآن بس است — تربتِ مارا ہمیں ساماں بس است
عمر ہا در زیرِ ایں زریں قباب — بر مزارش بود شمشیر و کتاب

(قباب قبہ کی جمع گنبد)

مرقدش اندر جہان بےثبات — اہلِ حقّ را داد پیغامِ حیات
تا مسلماں کرد باخود آنچہ کرد — گردشِ دوراں بساطش درنورد

(درنورد۔الٹانا،مسلمانوں کے اعمال کی وجہ سے اُن کی بساط اُلٹ گئی)

مردِ حق از غیرِ حق اندیشہ کرد — شیرِ مولا روبہی را پیشہ کرد
از دلش تاب و تب سیماب رفت — خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را بَبُرد — اندراں کشور مسلمانی بمُرد

(اور یہ شیر سے لومڑی بن گئے سکھ آئے اور وہ تلوار اور قرآن لے گئے کیونکہ مسلمان قوم بحیثیت مجموعی مردا ہوگئی تھی۔

ہندی بھرتری ہری

مغبوں اور مغبچوں کی کیفیت ایرانی آتش کدوں میں:

مغبچے: ایران میں شراب خانوں میں مُغَب جو اصل میں ایرانی آتش کدوں کے پجاری ہوتے تھے۔ چونکہ ان کی عبادت کا جزو شراب ہوتا تھا۔ اس لیے وہی مغب'' ساقی گری بھی کرتے تھے۔ وہ ان کی عبادت کا حصہ تھا۔ اس کے بعد جب یہ پوجا پاٹ والی بات ختم ہوگئی تو مغب کا لفظ صرف ساقی یا شراب پلانے والے کے لیے استعمال ہونے لگا۔

جب ایران میں امرت پرستی عام ہوئی تو مغبوں کے بچے مغبچے تھے۔ جن کے ہاتھوں سے یہ آخر میں شراب کے پیالے پیتے تھے۔ تو یہ مغبچہ آتش کدے کے مغب تھے۔

ہندی برتری ہری:

''برتر'' قدیم زمانے میں علاقہ اجین (بھارت) کا راجہ تھا۔ اس نے زندگی کا پہلا سارا حصہ عیش ونشاط میں گزارا۔ اور راج پاٹ اپنے بھائی ''وکرم کو دیدیا'' اس دوران اس کی چہیتی رانی نے اس سے جنسی بے وفائی کی۔ جس کا اس کو شدید صدمہ پہنچا اور وہ زندگی کے مشاغل سے لاتعلق ہوگیا۔ اس کے بعد وزراء وامراء نے اس کی شادی کسی اور لڑکی سے کر دی۔ مگر اس کو عورتوں سے بدگمانی رہی۔ تو اس نے اس کو آزمانا چاہا۔ ایک دفعہ شکار پر گیا۔ وہاں سے اپنے خون آلودہ کپڑے محل یہ کہہ کر بھجوائے کہ راجہ کو بھیڑیئے نے کھالیا ہے۔ اس کی بیوی نے وہ کپڑے سنبھال لیے سنگھاسن (تخت) سے اتری۔ چتا جلائی اور جل گئی۔ جس وقت یہ پلٹا تو وہ چتا میں جل رہی تھی۔ اس واقعہ کا اس قدر شدید اثر ہوا کہ اس نے دنیا ہی چھوڑ دی۔ بیراگی اختیار کر کے جنگلوں میں چلا گیا۔

نیپال میں ایک رشی منی، جوگی گورکھ ناتھ تھا۔ وارث شاہ نے ہیر وارث شاہ میں اس کو رانجھے کا گرو بتایا ہے۔ یہ گورکھ ناتھ رانجھے اور بھرتری ہری دونوں کا گرو تھا۔ بھرتری ہری جب نیپال میں جا کر اس کا چیلہ ہوا تو اس نے تمام علوم بھی پڑھے اور ویدانت سے وابستگی کی بدولت اس نے تصوف، ویدانت، بن باس اور جوگ پر متعدد کتابیں لکھیں۔ شاعر تھا۔ موسیقی اور مصوری کا دلدادہ

1273
تھا۔اس کا شاعری کا ترجمہ ہوا ہے۔میرے خیال میں اقبال نے وہ پڑھا ہوگا۔وگرنہ اصل زبان تو خود ہندوؤں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔یہ اس بھرتری ہری کا شعر ہے جو بال جبریل کی پیشانی پر ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

نکتہ آرائے کہ نامش برتری است فطرتِ او چوں سحابِ آزری است

(نکتہ سنج ہے۔اس کا بادل آگ برساتا ہے یعنی جوش وحرارت)

بادشاہے یا نوائے ارجمند ہم بہ فقر اندر مقامِ او بلند

(بلند شاعری کا حامل، جو ایک بادشاہ ہے)

نادر فکر والا برتری

نقشِ خوبے بندد از فکرِ شگرف　　　یک جہاں معنی نہاں اندر دو حرف
کارگاہِ زندگی را محرم است　　　اوجم است وشعرِ او جامِ جم است
(وہ زندگی کے کارخانہ سے باخبر ہے۔ وہ جمشید ہے اوراس کے اشعار جامِ جم ہیں۔ شگرف یعنی نادر فکر والا)
ما بہ تعظیمِ ہنر برخاستیم　　　باز باوے صحبتے آراستیم
(آرٹ کی تعظیم کے لیے ہم اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پھر اس کے ساتھ ایک محفل آراستہ کی)
اے کہ گفتی نکتہ ہائے دلنواز　　　مشرق از گفتارِ تو دانائے راز
شعر را سوز از کجا آید، بگوے　　　از خودی یا از خدا آید، بگوے!
تیرے اشعار میں اس قدر سوز گداز کہاں سے آیا خودی سے یا وحی سے۔

اب برتری کا جواب:

آں دلِ گرمے کہ دارد در کنار　　　پیش یزداں ہم نمی گیرد قرار
(در کنار۔ پہلو میں۔ میں ایسا گرم دل رکھتا ہوں جو خدا کے سامنے بھی آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔)
جانِ مارا لذّت اندر جستجوست　　　شعر را سوز از مقامِ آرزوست
ایں خدایانِ تنک مایہ زسنگ اندوزخشت　　　برترے ہست کہ دور است از دیر وکنشت
(یہ ہندو تو اینٹ اور پتھر کے خدا پوجتے ہیں۔ جب کہ خدا دیرو، یہودیوں کی عبادت گاہوں سے بلند ہے)۔
پیشِ مکافاتِ عمل سجدہ گزار　　　زانکہ خیزدعمل دوزخ واعراف وبہشت
عمل سے ہی دوزخ اور جنت اور بلند مقام ملتا ہے۔

❁❁❁

خوشحال خان خٹک (1042-1100ء)

خوش سرود آں شاعرِ افغاں شناس آنکہ بیند، باز گوید بے ہراس!
آں حکیمِ ملّتِ افغانیاں آن طبیبِ ملتِ افغانیاں
رازِ قومے دید و بےباکانہ گفت حرفِ حق باشوخئ رندانہ گفت!

خوشحال خان کے اپنے اشعار:

اُشترے یابد اگر افغانِ حُر بایراق و ساز و باانبارِ دُر
(یراق ساز: قیمتی ساز وسامان اور باانبار در: ہیروں کے انبار)
ہمت دونش ازاں انبار دُر (موتیوں کے ڈھیر کو ازاں جان کر یہ افغان صرف گھنٹی پر جھپٹا ہے۔)
می شود خوشنود بازنگِ شُتر (خوشنود۔خوش ہوجانا۔زنگ۔گھنٹی)

سلطان ٹیپو شہید(1749-1799ء)

''ٹیپو کے پیغام میں موت وحیات کا پیغام'':

سلطان شہید اقبال سے مخاطب ہے۔

اے شناسائے حدودِ کائنات　　در دکن دیدی ز آثارِ حیات

(کیا دکن میں زندگی کے آثار ہیں۔لوگ غلامی پر رضامند ہو گئے ہیں؟)

اقبال کا جواب:

تخمِ اشکے ریختم اندر دکن　　لالہ ہا روید ز خاکِ آں چمن

رودِ کاویری مدام اندر سفر　　دیدہ ام در جانِ او شورِ دگر

(لوگ بیدار رہو رہے ہیں۔دریائے کاویری میں شور برپا ہے) ٹیپو کا پیغام جس میں موت وحیات کی حقیقت بتا دی ہے۔

رودِ کاویری یکے نرمک خرام　　خستہ شاید کہ از سیرِ دوام !

در کہستان عمرہا نالیدہٖ　　راہِ خود بامژہ کاویدۂ

(کاویدہ: کھودنا)

اے مرا خوشتر ز جیحوں و فرات　　اے دکن را آبِ تو آبِ حیات

(خوشتر: زیادہ حسین)

آہ شہرِے کو در آغوشِ تو بود　　حسن نوشیںِ جلوہ از نوش تو بود

(حسن نوشیں جلوہ: تیرے جلوے کا بہترین حسن)

کہنہ گرویدی شبابِ تو ہمہ　　پیچ و تاب و رنگ و آب تو ہماں

(ہماں: اس طرح سے)

موجِ تو جز دانۂ گوہر نزاد   طرۂ تو تا ابد شورید باد

(طرہ۔کنارہ)

اے ترا سازے کہ سوزِ زندگی است   ہیچ می دانی کہ ایں پیغام کیست؟

آنکہ خاکش مرجع صد آرزوست   اضطرابِ موجِ تو از خونِ اوست

آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود   مشرق اندر خواب و او بیدار بود

اے مومن وتو موجے از رودے حیات   ہر نفس دیگر شود ایں کائنات

زندگانی انقلابے ہر دمے است   زانکہ او اندر سراغِ عالمے ست

تار و پود ہر وجود از رفت و بود   ایں ہمہ ذوقِ نمود از رفت و بود

(ہر وجود کا تار و پود، رفت و بود یعنی کائنات کی ہر شے حالت تغیر میں ہے۔ ذوق نمود۔اس کی نمود دوسری شکل میں ہو جاتی ہے)

جادہ ہا چوں رہرواں اندر سفر   ہر کجا پنہاں سفر، پیدا حضر

(راستے بھی مسافروں کی طرح حالت سفر میں ہیں۔ یہ کہیں سفر پنہاں اور قیام ظاہر ہے یعنی ہر شے تغیر میں ہے۔)

کارواں و ناقہ و دشت و نخیل   ہرچہ بینی نالد از دردِ رحیل

در چمن گل مہمان یک نفس   رنگ و آبش امتحانِ یک نفس

موسمِ گل ؟ ماتم و ہم نائے نوش   غنچہ در آغوش و نعشِ گل و بدوش

(موسم گل کیا ہے؟ ماتم بھی اور عیش ونشاط بھی۔خوشی نئے غنچہ کے کھلنے پر اور موت کس کے مرجھانے پر ہے)

از خس و خاشاک تعمیرِ وجود   غیرِ حسرت چیست پاداشِ نمود

(اس کائنات کی ہر شے خس وخاشاک کی طرح جل کر تعمیر کر رہی ہے)

در سرائے ہست و بود آئی؟ میا   از عدم سوئے وجود آئی؟ میا

(کیا تو اس ہست و بود کی سرائے میں آنا چاہتا ہے تو مت آ)۔

در بیائی چوں شرار از خود مرو   در تلاش خرمنے آوازہ مشو

(اگر تو آ گیا ہے تو پھر چنگاری کی طرح خود سے نہ گذر۔ کسی خرمن کی تلاش میں زندگی کو بے کار نہ سمجھ بلکہ اسے کسی مقصد کے تحت بسر کر)

تاب و تب داری اگر مانندِ مہر   پانہہ بند در وسعتِ آبادِ سپہر

(نہہ: پاؤں رکھ)

(خود بھی روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشن کر۔ اگر سورج جیسی گرمی اور چمک ہے)

زندگی، عمر، موت:

کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز ماہیاں را در تہِ دریا بسوز

(پہاڑ، پرندہ، باغ وصحرا میں جلادے۔ دریا کی تہہ میں مچھلیوں کو جلادے۔ یعنی ٹکراؤ سے خودی میں مقام پیدا کر)

سینہ داری گر در خوردِ تیر در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر

(شاہین کی طرح زندہ رہ اور شاہین کی طرح مر، بزی، رہ اور بمیر۔ مر)

زانکہ در عرضِ حیات آمد ثبات از خدا کم خواستم طولِ حیات

(زندگی کو واشگاف کرنے سے ثبات ملتا ہے۔ زندگی جی عمر نہیں۔ اس کا ثبات کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھی خدا سے عمر نہیں زندگی مانگی ہے)

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟ یک دم شیری بہ از صد سالِ میش

(میش۔ بھیڑ)

زندگی کے لیے رسم، دین اور مسلک کیا ہے؟ شیر کا ایک لمحہ بھیڑ کے سو سال سے بہتر ہے)۔

(جب Wolsley نے لکھا تھا کہ ایسے تو کس طرح جی لے گا؟ ہم سے صلح کرے۔ اس کے نیچے سلطان نے لکھا اور بھیجا کہ شیر کا ایک دن گیدڑ کے سو سال سے بہتر ہے)

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست موت نیرنج و طلسم و سیمیاست

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ

(جیسے شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے تو مردِ حق موت پر اسی طرح جھپٹا ہے)

ہر زماں مردِ غلام از بیمِ مرگ زندگی او را حرام از بیمِ مرگ

(بیم۔ خوف)

بندۂ آزاد را شانِ دگر مرگِ او را می دہد جانے دگر

او خود اندیش است مرگِ اندیش نیست مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

(آزاد کی موت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی)

انسان معراجِ کمال کی تلاش میں:

بگذر از مرگے کہ سازد بالحد زانکہ ایں مرگ است مرگ دام و دو
(دام: پرندہ۔ دو: درندہ)
مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک آں دِگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
(برگیرد: اٹھتی ہے)
آں دگر مرگ! انتہائے راہِ شوق آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر مرگ پورِمرتضیٰ چیزے دگر
(پورمرتضیٰ: علی کا بیٹا)
جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست ترک عالمِ، اختیار کوئے دوست
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت جنگ را راہبانیَ اسلام گفت

(وہ ہستیؐ۔ جنگ کو قوموں کی رہبانیت کہا ہے۔ وہ رہبانیت جس میں آدمی دنیا سے الگ تھلک ہو جاتا ہے۔ وہ اسلام میں حرام ہے)

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را
(شہید تو اپنا خون دے کر اس نکتہ کو سمجھ لیتا ہے)۔

❁❁❁

انسان آج بھی معراجِ کمال کی تلاش میں ہے

بآدمے نہ رسیدی، خداچہ می جوئی زخود گریختۂ آشنا چہ می جوئی؟
(گریختہ۔بھاگا ہواتو)

دگر بشاخِ گل آویز و آب ونم درکش پریدہ رنگ ! زبادِ صبا چہ می جوئی؟
(پھر پھول کی شاخ سے الگ اور پانی ونم جذب کر۔اے اڑے ہوئے رنگ والے! تو بادِصبا کیا تلاش کرتا ہے؟ یعنی جو شجر سے ٹہنی ٹوٹ جائے وہ سوکھ جاتی ہے اس لیے پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ)۔

دو قطرہ خون است آنچہ مشک می نامند تو غزلِ حرم در خطا چہ می جوئی
(اے حرم کے ہرن! ملک خطا میں کیا تلاس کررہا ہے۔اگر وحی کارفرما ہوتو کامیابی ورنہ حرم ہو یا خطا دونوں جگہ تو مُشک سے محرم رہے گا)

عیارِ فقر ز سلطانی و جہانگیری است سریرِ جم بطلب بوریا چہ مئی جوئی؟
(فقر کی کسوٹی سلطانی و جہانگیری ہے۔بادشاہ جمشید کا تخت مانگ۔بوریا کیا تلاش کرتا ہے۔اصل فقر تو سلطانی ہے جو ساری کائنات اس کی محتاج ہو)۔

سراغِ او ز خیابان لالہ می گیرند نوائے خوں شدۂ ما زچہ می جوئی؟
(اس کا سراغ تو لالہ کی کیاریوں سے اگاتے ہیں۔ہماری خون شدہ نوا کو ہم سے کیا ڈھونڈتا ہے یعنی میری نوا سے دوسروں پر بھی اثر ہوا ہے یا نہیں۔یہ ہے تیری کسوٹی)۔

نظر ز صحبتِ روشندلاں بیفزاید ز درد کم بصری توتیا چہ می جوئی؟
(نظر اور بصر میں فرق کیا ہے یہاں توتیا۔سرمہ)

قلندرم و کراماتِ ما جہاں بینی است ز ما نگاہ طلب کیمیا چہ می جوئی؟
(میری کرامات جہاں بینی ہے۔ہم سے نظر خود شناس طلب کر۔سونے کی کیا حیثیت ہے،اس کے مقابلے میں تمام کائنات تیرے قدموں میں ہوگی)۔

عالمِ ناسوت Concrete world،

عالمِ لاہوت Transcendent world

عالم لاہوت۔ عالمِ جبروت، عالم امر، تین عالم ہوتے ہیں۔

فرد از توحید لاہوتی شود ملّت از توحید جبروتی شود

(فرد اگر توحید پر ہو تو لاہوتی ہو جاتا ہے۔ اگر ملت توحید لے آئے تو یہ جبروتی ہو جاتی ہے۔)

بے تجلّی نیست آدم را ثبات جلوۂ ما فرد و ملت را حیات

ہر دو از توحید می گیرد کمال زندگی ایں راجلال آں را جمال

(فرد کے لیے زندگی جمال اور قوم کے لیے جلال)

ایں سلیمانی است، آں سلمانی است آں سراپا فقر و ایں سلطانی است

(جلال سلیمانی، سلیمانؑ، جب کہ سلمانی محمد ﷺ کی طرف اشارہ ہے)

آں یکی را بیند ایں گردد یکی در جہاں با آں نشیں با ایں بزی

(وہ یعنی فرد ایک کو دیکھتا ہے تو یہ ایک ملت بن جاتی ہے۔ جہاں میں اس کے ساتھ بیٹھ اور اس کے ساتھ زندگی بسر کر یعنی توحید پر مبنی قوم کے ساتھ زندگی گزارنا)۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ باہزاراں چشم بودن یک نگاہ

(لا الہ کہنے والے! کہا تو جانتا ہے ملت کیا ہوتی ہے۔ ملت کی مثال ہزاروں آنکھوں کے ساتھ شریک نگاہ کا ہونا ہے۔ افراد طرح طرح کے مگر مطمع نظر ایک)

اہلِ حق را حجت و دعوٰی یکے است خیمہ ہائے ماجدا دلہا یکے است

(ان اہل حق کی دلیل بھی ایک اور دعویٰ بھی ایک۔ خیمے تو جدا جدا مگر دل ایک)

ذرّہ ہا از یک نگاہی آفتاب یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب

از تجلی ہائے توحید است ایں　　ملتے جوں می شود توحید مست

(یک نگاہی سے آفتاب بن جاتے ہیں)۔

یک نگاہی را بچشمِ کم مبیں　　از تجلّی ہائے توحید است ایں
ملتے چوں می شود توحید مست　　قوت و جبروت می آید بدست
روحِ ملت را وجود از انجمن　　روحِ ملت نیست محتاجِ بدن
تا وجودش را نمود از صحبت است　　مُرد چوں شیرازۂ صحبت شکست

(جب صحبت کا شیرازہ بکھر گیا تو قوم مردہ ہوگئی۔ صحبت سے مراد اجتماعی زندگی)

مردۂ از یک نگاہی زندہ شود　　بگذار از بےمرکزی پائندہ شو
وحدتِ افکار و کردار آفریں　　تاشوی اندر جہاں صاحب نگیں

(صاحب نگیں: اعلون)

فرد اور جماعت کا باہمی تعلق:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است　　اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو باہمہ رو

(انفرادیت کو بھی قائم رکھنا ہے اور جماعتی زندگی بھی گزارنی ہے۔ وابستہ بھی رہ اور سب کے ساتھ چل اور انفرادیت کو بھی قائم رکھ۔ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾ (89:29-30)

تو فروزندہ تر از مہرِ منیر آمدۂ　　آنچناں زی کہ بہر ذرّہ رسانی پرتو

(تو سورج سے بھی زیادہ روشن ہے۔ اس طرح زندگی گزار کہ ہر ذرہ تک تیری دھوپ پہنچے (یعنی ہر آدمی تجھ سے مستفیض ہو)

چوں پرِکاہ کہ در رہگذرِ باد فتاد　　رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو
از تنک جامیٔ تو میکدہ رسوا گردید　　شیشۂ گیر و حکیمانہ بیاشام و برو

(تیری کم ظرفی کی وجہ سے میخانہ رسوا ہوگیا۔ ہوشمندوں کی طرح پی اور جا)

مثنوی ''پس چہ باید کرد'' (1935-1936)

اقبال کا ماخذ صرف قرآن تھا۔۔۔عقل اور وحی

اقبال کا ماخذ:

کوئی نطشے کا نام لیتا ہے۔ دوسرا برگسان کا۔ کوئی سپنوزا کا کوئی الیگزنڈر کا۔ آیئے خود اقبال سے پوچھ لیں تا کہ کوئی ابہام نہ رہے۔

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است — ایں دو قوت اعتبارِ ملت است
غیرِ قرآن غم گسارِ من نہ بود — قوتش ہر باب را برمن کشود
گوہر دریائے قرآن سفتہ ام — شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
(سفتہ ام: یعنی چھیدنا)
گر دِلم آئینہ بے جوہر است — در بحرفم غیرِ قرآن مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

دعویٰ تو میرا یہ ہے کہ

گر دُرِ اسرارِ قرآن سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کُن پیشِ خدائے عزوجل — عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا — آب نیسانم گہر گرداں مرا
(آب نیسانم: بہار کے بارش کا قطرہ)

عقل اور وحی، اقبال کے متعلق غلط فہمیاں اس مثنوی میں صاف کر دی گئی ہیں:

اہل مغرب کا فیصلہ تھا کہ عقل کے علاوہ کوئی اور سر چشمۂ علم نہیں اس لیے انسانی معاملات بہ تمام و کمال تنہا عقل کی رو سے

طے ہو سکتے ہیں۔

ہیکل کے الفاظ میں:

ہم دنیا کے متعلق صحیح علم اور اس کے مسائل کا حل صحیح طور پر صرف عقل کی رُو سے دریافت کر سکتے ہیں۔ عقل انسان کے لیے نعمت عظمیٰ ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اس کو ہدایات سے ممتاز کرتی ہے۔ وحی یا معتقدات کا تصور دانستہ یا نادانستہ طور پر یکسر فریب پر مبنی ہے۔ Riddle of the universe; BY: ERNST HAECKEL

اقبال نے اس تصوّرِ حیات کی پر جوش اور پر زور تردید کی اور کہا کہ عقل کو وحی کے تابع رکھنا ضروری ہے اور اس مثنوی ''پس چہ باید کرد'' کی ابتدا ان چار اشعار سے کی ہے۔

سپاہِ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق — کہ حرم در خطرے از بغاوتِ خرد است

اقبال کے ہاں آپ کو عقل و عشق، خبر و جنوں، خیر و نظر، ذکر و فکر جیسی تقابلی اصطلاحات عام ملیں گی۔ عشق، جنوں، نظر، ذکر، وغیرہ سے مراد وحیِ خداوندی ہے۔ اور اس کی رو سے عطا شدہ علم ہے۔ جب کہ عقل و خرد، خبر و فکر سے مفہوم وہ فکرِ گستاخ جو سرکشی کرتی ہے اپنے آپ کو وحی سے مستغنی سمجھ کر۔ تو اس سے بات واضح ہو جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں کا فلسفیانہ ذوق رکھنے والا طبقہ اس سے کچھ اور مراد لے کر قدیم متکلّمانہ بحث میں الجھ جاتا ہے۔ فلسفہ کی دنیا میں دو سرچشمے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ایک عقل اور دوسرا وجدان۔ صوفیانہ کشف والہام، وجد و حال، سب وجدان کے دائرے میں آ جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ وحیٔ نبوت اس سے یکسر الگ حقیقت ہے۔ وجدان کے حامی عقل کے مخالف ہیں۔ فلسفی اور صوفی کی جنگ بڑی قدیم ہے۔ صوفی پائے استدلال کو سخت بے تمکین قرار دیتا ہے اور استدلالی فلسفی صوفی کی باطنی کیفیت کو واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔

چونکہ اقبال بھی باطنی وارادات کا قائل ہے تو لوگ اقبال کو وجدانیوں کی صف میں کھڑا کر کے عقل کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں۔ اقبال کی پوزیشن اس باب میں منفرد ہے۔ وہ عقل کے مقابلہ میں عشق لاتے ہیں تو اس سے مراد وحیٔ نبوّت ہوتی ہے نہ کہ صوفیانہ وارادات اور عقل سے مراد وہ عقل جو وحی سے سرکشی برتے نہ کہ مجرد عمل۔

اس لیے کہ قرآن تو کشف والہام جیسے وجدان کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ اکتسابی علم کا ذریعہ عقل اور اس کے مشاہدات کو قرار دیتا ہے اور غیر اکتسابی علم کا ذریعہ وحی کو جو خاصۂ نبوّت ہے۔ اور نبوّت چونکہ رسول اکرم ﷺ پر ختم ہو چکی ہے اس لیے اب علم کا ذریعہ قرآن اور اس کی روشنی میں کام کرنے والی عقل کے سوا کچھ اور نہیں۔ جب کہ وہ عقل کو بلند مقام عطا کرتا ہے اور عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو بدترین مخلوق بلکہ جہنمی قرار دیتا ہے۔

اقبال کا دعویٰ:

اقبال کا دعویٰ کہ اس نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ کہا ہے اس کی روشنی میں کہا ہے۔ اس لیے ہو نہیں سکتا کہ اقبال اس قدر اہم اور بنیادی مسئلہ میں قرآن کی تعلیم کے علی الرغم عقل کی تنقیص کرے اور وجدان کو اس کے مقابلہ میں یقینی علم

1273 اور قابلِ اعتماد راہ قرار دے۔ یہ پیش نظر رہے کہ علامہ دانش کی ایسی بلندیوں کے باوجود بالاخر انسان تھے۔ اور ہر انسان کی طرح غلطی ان سے بھی ہوسکتی ہے۔ اس سے ان کے مقام کی بلندی میں فرق نہیں آجاتا۔ انہوں نے بہ ہیئت مجموعی جو کچھ کہا ہے وہ قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے۔

اقبال اور قرآن کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں عشق ونظر وغیرہ سے مراد قرآن کریم ہے اور عقل سے مراد مغرب کا وہ نظریہ جو وحی کی رہنمائی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ان کی ساری تنقید اور تنقیص اس نظریۂ حیات پر ہے اور وہ اس سے دین کے مقتضیات کو خطرہ میں سمجھتے ہیں اور اُمّت مسلمہ کو اس خطرناک اور تباہ کن نظریہ سے آگاہ کرتے ہیں اور قرآن سے دلائل لاکر اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ اُورا جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرداست

لوگ خواہ بخواہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ عقل اور وحی دو متضاد عناصر ہیں۔ جو ایک دوسرے میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ یہ صحیح بات نہیں، وحی کی قبا ایسی ہے کہ عقل کی قامت پر موزوں آتی ہے۔ وحی خود کو عقل سے منواتی ہے۔ لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ انسانی عقل کی جو سطح ہو۔ وہ اسی کے مطابق دلائل دے کر اسے حقیقت کا قائل کراتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ عقل، زندگی کے غیر متبدل اصولوں کو دریافت نہیں کرسکتی۔ یہ کام وحی سرانجام دیتی ہے لیکن جو اصول وحی نے پیش کیے ہیں۔ وہ سمجھے عقل ہی کی رو سے جاسکتے ہیں۔ اس لیے عقل اور وحی میں وہی رشتہ ہے جو انفرادی آنکھ اور سورج کی روشنی میں ہے۔ انسانی آنکھ سورج کی روشنی کے بغیر بےکار ہے اور جس روشنی سے فائدہ اٹھانے والی کوئی آنکھ نہیں وہ روشنی اپنا مقصد پورا نہیں کرتی۔

بآں مقام رسیدم چوں در برش کردم طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

میں وحی سے اپنی فکر کو ہم آہنگ کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ عقل میرے در و بام کے طواف کرنے کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتی ہے۔ (بَرآغوش، بَرَش، اس کے ہم آغوش ہونا۔ ہم آہنگ ہوجانا یعنی وحی سے ہم آغوش ہوگیا۔ ہم رنگ ہوگیا)۔

حقیقت یہ ہے جب عقل وحی کے پیش کردہ حقائق کا ادراک کرلیتی ہے تو اس کی عظمتوں سے آشنا ہوجاتی ہے تو محسوس کرتی ہے کہ وہ کس قدر بلند اور باعظمت ہوگئی ہے۔ عقل کے لیے وحی کا اتباع باعث ہزار فخر ومباحات ہے۔ اس قوم کے مقام کے کیا کہنے جو وحی کی رہنمائی میں عقل سے کام لے کر سفرِ حیات طے کرے۔ یہی قوم امامت اقوام کی سزاوار ہے۔ وحی ہر مقام پر عقل کی نگرانی کرتی ہے کہ وہ کہیں غلط موڑ مڑ نہ جائے یا کہیں گڑھے میں نہ جاگرے۔ اس لیے چوتھے شعر میں کہا ؎

گماں مبر کہ خرد را حساب ومیزان نیست نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

اگر عقل کو انسانی معاملات میں آخری اتھارٹی تسلیم کیا جائے۔ تو پھر دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو اس کا فیصلہ کر

سکے کہ عقل نے جو قدم اٹھایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔لیکن اگر اسے وحی کے تابع رکھا جائے تو وحی قدم قدم پر اس کا احتساب کرتی 1273
رہتی ہے۔اس لیے قرآن نے جماعت مومنین کو شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) کہا ہے۔یعنی اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران۔ان کی نگرانی دراصل وحی کی نگرانی ہے۔

اگر عقل کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو انسانی جذبات، رجحانات، میلانات اور مفادات کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے۔اس طرح ایک فرد یا گروہ کے مفادات کا ٹکراؤ، دوسرے فرد یا گروپ کے مفادات سے ہوتا ہے۔اس کا نتیجہ فساد فی الارض ہے۔لیکن اگر عقل، وحی کے متعین راستہ پر گامزن ہو جائے تو وہ نوعِ انسانی کی ربوبیّت عامہ کا موجب بن جاتی ہے۔جس سے یہ دنیا جنت بن جاتی ہے۔

یہ ہے اقبال کے پیغام کا ماحصل جسے اس نے انتہائی ایجاز و جامعیت سے اس مثنوی میں پیش کیا ہے جو (1935-36) میں لکھی گئی تھی۔

پیرِ رومی (وحدت الوجود اور اقبال)

پیر رومی اقبال سے کہتے ہیں:

امتّاں را زندگی جذبِ دروں کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد بے جنون ذو فنون کارے نکرد

قوموں کی زندگی کا راز ان ابدی اصولوں پر ہے جو وحی کی رو سے ملتی ہیں۔ سطح بیں افراد جو نہ ان اصولوں کی محکمیّت سے آگاہ ہیں اور نہ اس ایمان کی قوت سے اور اسے دیوانہ پن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں آبرو پر جان دینا جنون ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی قوم ان اصولوں پر یقین محکم کے بغیر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کرسکتی۔

جنون کے لیے ذوفنون ہونا ضروری ہے اور یہ ہے وہ خصوصیت جو اس جنون کی منفرد بناتی ہے۔ عام جنون میں تو عقل ماؤف ہوجاتی ہے لیکن قرآن کی رو سے ایمان اور عقل کے امتزاج کا نام دین ہے۔ اقبال اسے "عشق بازیرکی آمیختن" کہتا ہے۔ قرآن نے اس دنیا اور دوسری دنیا کو جنّتٰن کہا ہے۔ ذَوَاتَآ اَفۡنَانٍ ﴿۴۸﴾ (55:48) جس میں علم وفنون کی تعمیری شاخیں سرسبز وشاداب رہیں۔

وحدت الوجود اور اقبال:

رخ سوئے دریائے بے پایاں نہ کرد خویشتن را در صدف پنہاں نہ کرد

اس نے اپنا رخ دریائے بے پایاں (ناپید کنار) کی طرف نہیں کیا تا کہ اس کی جداگانہ ہستی دریا میں نہ گم ہوجائے۔ اس نے آغوش صدف تک میں خود کو پنہاں نہ کیا فلسفۂ خودی یہ ہے۔

بخود محکم گزار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحرِ نورش

دوسری جگہ ہے:

بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست

اس حقیقت کو انہوں نے قطرۂ شبنم کی مثال میں ۔ رخ سوئے دریائے بے پایاں نہ کرد

اقبال کے متعلق یہ کہنا کہ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ یہ تو بہتان ہے۔ رومی کا جوش وخروش۔ حرکت اور گرمی پسند آ گئی تھی۔ ورنہ اقبال اور رومی کی منزلیں الگ الگ ہیں۔

سب سے پہلا کام اس قوم کے کرنے کا:

پس نخستیں بایدش تطہیر فکر بعدازاں آساں شود تعمیرِ فکر

پہلا کام تمام غیر قرآنی نظریات سے الگ ہوکر خیالات کی پاکیزگی پر توجہ دے تو پھر اس میں قرآنی فکر کا پیدا کرنا آسان ہوگا۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

حکمت کلیمی:

در نگاہش قصرِ سلطان کہنہ دیر غیرتِ او برنتابد حکمِ غیر

حکم صرف اللہ کا۔ تمام غیر خداوندی نظام اس کی نگاہوں میں بت خانہ ہوتا ہے۔

حکمتش برتر ز عقل ذوفنوں از ضمیرش اُمتے آید بروں

حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

یعنی اس شخص کی حیثیت صرف احکام خداوندی نافذ کرنے کی ہوتی ہے۔

بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج سے مراد یہ نہیں کہ اس حکومت میں نہ فوج ہوتی ہے نہ حکومت اور نہ آمدن۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر ذاتی اغراض کے لیے نہیں بلکہ حکومت خداوندی کے لیے ہوتے ہیں۔

لرزہ براندام:

بحر و بر از زورِطوفانش خراب از نگاہِ او پیامِ انقلاب
درسِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ می دہد تادِلے در سینہ آدم نہد
عزم و تسلیم و رضا آموزدش در جہاں مثلِ چراغ افروزدش
من نمی دانم چہ افسوں می کند روح را در تن دگرگوں می کند
بندۂ در ماندہ را گوید کہ خیز ہرکہن معبود راکن ریز ریز
مردِمومن از کمالاتِ وجود از وجود و غیرِاُو ہر شے نمود
گر بگیرد سوز و تاب از لا الہ جز بکامِ او نہ گرود مہر و مہ

(بکام او۔اس کی آرزو)

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ:

نکتہ می گویم از مردانِ حال — امتاں را لا جلال الاّ جمال
لا و الاّ احتسابِ کائنات — لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیر جہانِ کاف ونون — حرکت از الا زاید از اِلا سکون

یہ دونوں اصول مل کر کائنات کو اس کی منزل کی طرف لے جارہے ہیں، پہلا مرحلہ حرکت اور دوسرے میں نظام کی پابند ہو کر سکون حاصل کر لیتی ہے مگر حرکت جاری رہتی ہے تعمیر کے لیے۔

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست — ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
پیشِ غیراللہ گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات
بندہ را باخواجہ خواہی درستیز — تخمِ لا درمشتِ خاکِ او بریز

(اگر چاہتے ہو کہ محکوم حاکموں کے خلاف اٹھ جائیں تولا کا تخم ان کے دلوں میں بودو)

لا مقامِ ضربِ ہائے پے بہ پے — ایں غوِ رَعد است نے آوازِ نے

(اس کے نعرہ انقلاب میں بجلی کی سی کڑک اور بادل کی سی گرج ہوتی ہے جو کائنات میں تھرتھری پیدا کر دیتی ہے)۔
(چودہ صدیاں قبل عرب کی قوم نے اس نظریہ کو اپنایا، عام کیا اور بلند ہو گئے۔)

باتو می گویم ز ایّامِ عرب — تابدانی پختہ و خامِ عرب
ریز ریز از ضربِ او لات و منات — در جہات آزاد از بندِ جہات
ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او — قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او
عالمے در آتشِ اُو مثلِ خس — این ہنگامۂ لا بود و بس
اندریںِ دہر کہن پیہم تپید — تا جہانے تازۂ آمد پدید
بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست — ہرچہ ہست از تخمِ ریزیہائے اوست
اینکہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند — از کنارِ جوئے اُو آوردہ اند
نوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست — از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رُست

روسی انقلاب:

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی باخواجگی آمد بجنگ

روس را قلب و جگر گرویدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظام کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لاسلاطین ، لاکلیسا، لا الٰہ
فکرِاُو در تند باد لا بماند — مرکب خود را سوئے الّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے الّا میں خرامد کائنات
لا و الّا ساز و برگِ امّتاں — نفئ بے اثبات مرگِ امّتاں

اہلِ شریعت کومخاطب:

اے کہ اندر حجرۂ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
ایں کہ می بینی نیرزد با دو جَو — از جلال لا الٰہ آگاہ شو
(نیرزد: قیمت کا نہ ہونا)
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست — جملہ موجودات را فرمانروا است

فقر اور اقبال

فقر:

اقبال نے اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے جو جدید اصطلاحات وضع کیں۔ ان میں ''فقر'' کی اصطلاح کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ فقر سے ان کی مراد گداگری۔ محتاجی خانقاہیت یا رہبانیت نہیں ہے۔ اس سے مراد ایسا استغناء جو خدا کی صفتِ صمدیت کو علیٰ حدِ بشریت منعکس کرتا ہے۔ استغناء سے مراد کہ انسان کی طبیعت ایسی تربیت یافتہ ہو جائے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی جاذبیت بھی اس کے پاؤں میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔ اسے دنیا کی کوئی مادہ کشش اپنے نصب العین سے دور نہ کر سکے۔ دنیا کی زیبائش و آرائش سے مستفیض ہونا تو مومن کا حق ہے مگر ان میں سے کوئی چیز اس کے مقصد میں حائل نہیں ہوسکتی۔ مومن کی یہ کیفیت ''فقر'' کہلاتی ہے۔

چیست فَقر اے بندگانِ آب و گل یک نگاہِ راہ بیں و یک زندہ دل
(زندہ دل یعنی متحرّک دل)

(متحرک دل جس میں نت نئی آرزوئیں اور نئے مقاصد مگر نگاہ راہ بیں کے ساتھ وہ بلند مقصد جو قرآن متعین کرتا ہے)۔

فقر کارِ خویش را سنجیدن است ہر دو حرفِ لاَ اِلٰہ پیچیدن است
(پیچیدن۔ الجھے معاملات کو سلجھائے)

فقرِ خیبر گیر بانانِ شعیر بستۂ فتراکِ او سلطان و میر
(فتراکِ او یعنی اس کا شکار)

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست ما اَمینیم، ایں متاعِ مصطفیٰ ست
فقر بر کروبیاں شبخون زند بَر نوامیسِ جہاں شبخون زند
(شبخوں۔ تسخیر کرنا)

(کروبیاں کائناتی قوتیں۔ نوامیس۔ ناموس کی جمع۔ شرف و عزت)

بر مقامِ دیگر اندازد ترا | از زجاج الماس می سازد ترا
برق و ساز اُو ز قرآنِ عظیم | مردِدرویشے نہ گنجد در گلیم

(گنجد: سمانااورگلیم کے معنی گدڑی)

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن | یک دمِ او گرمیٔ صد انجمن
بے پراں را ذوقِ پروازے دہد | پُشّہ را تمکینِ شہبازے دہد

(پشّہ، مچھر)

باسلاطین درفتد مرد فقیر | از شکوہِ بوریا لرزد سریر

(درفتد۔الجھنا)

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر | وارہاند خلق را از جبر و قہر

(وارہاند۔چھڑانا)

(وہ مستانہ وار اپنی دعوتِ انقلاب کو عام کرتا ہے)۔

می نگیرد جز بآں صحرا مقام | کاندرو شاہیں گریزد از حمام

(حمام۔کبوتر)

(اس میں شاہیں کبوتر سے دبتا ہے ایسا نظام قائم کرتا ہے)

قلب اُو را قوت از جذب و سلوک | پیشِ سلطان نعرۂ اُو لاملوک

(جذب وسلوک۔ایمان اوراعمال صالح)

آتشِ ما سوزناک از خاکِ اُو | شعلہ ترسد از خس و خاشاک اُو
آبروئے ما ز استغنائے اوست | سوزِما از شوقِ بے پروائے اوست

(اس کا پختہ ایمان ہمارے دلوں کو حرارت دیتا ہے)

خویش را اندر ایں آئینہ بیں | تاترا بخشند سلطانِ مُبین

(ایسا مردمومن ماڈل بناؤ۔جوایسی قوت بخش دے تاکہ دنیا میں سکہ بٹھادے)

مسلکِ خانقاہیت جوغیر قرآنی تصور ہے:

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو | ترکِ ایں دَیرِکہن تسخیرِ اُو

(تم ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے ہو۔اسے دین کا ماحصل قرار دیتے ہو۔اس تعلیم کو چھوڑ دو۔یہ توغیر قرآنی سبق ہے۔مومن

کا ترک تو کائنات کی تسخیر اور اسے عام کرنا ہے)۔

کمالِ ترک نہیں آب وگل سے مہجوری　　کمالِ ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

صحیح تعلیم یہ ہے:

راکبش بودن از وارستن است　　از مقامِ آب وگل برجستن است

(وَارستن۔آزادی پانا، برجستن ۔مقام پانا، بلندی حاصل کرنا)

(اگرتم اس مادی دنیا سے مغلوب ہوتو یہ غیر اسلامی ہےتو یہ دلدل ہے۔اگرتم اس پر غالب ہوتو مادی الائشوں کا ترک ان کوکرتابع تسخیر کرتا ہے)۔

صیدِ مومن ایں جہان آب و گِل　　باز را گوئی کہ صید خود بہل

(بہل یعنی ترک کرنا)

(باز کو کہہ رہاہے کہ شکار کو چھوڑ دے۔کتنا غلط ہے)

حل نہ شد ایں معنیٔ و مشکل مرا　　شاہیں از افلاک بگریزد چرا؟

(چرا یعنی وہ کیوں ایسا کرے)

وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد　　مرغکے از چنگ ِ او نامد بدرد

در کنامے ماند زار و سرنگوں　　پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود　　نے رباب و مستی و رقص و سرور

(پوری کائنات پرشُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) نہ کہ قوالی۔وجدوحال)

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات　　بندہ از تاثیرِ او مولا صفات

(یہ ہے فقر کہ خدا کے رنگ میں رنگ جانا)

فقرِ کافر خلوتِ دہشت و در است　　فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است

(ترک دنیا اور حجروں میں بیٹھ جانا یہی تو کفر ہے)۔

آں خدا راجُستن از ترکِ بدن　　ایں خودی را بر فسانِ حق زدن

(تصوف میں ترکِ دنیا سے خدا کو تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ تو خودساختہ مذہب ہے۔قرآن نے کہد یا۔اسلام تو قوانین خداوندی کے اتباع سے ذات کو مستحکم کرتا جاتا ہے)

آں خودی راکشتن و وا سوختن — ایں خودی راچوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر — از نہیب او بلرزد ماہ و مہر
(نہیب۔ہیبت)
فقرِ عریاں گرمئ بدر و حنین — فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسین
وائے ما وائے ایں دَیرِ کہن — تیغ لا در کف نہ تو داری نہ من
(ہماری بدنصیبی اور بدنصیبی اس طاغوتی جہاں کی)۔

نوجوانانِ ملت کو خطاب

دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جواں — ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں
(پرداز۔آراستہ کرنا)
تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن — اے مسلماں! مُردن است ایں زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را — جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را
بر عیارِ مصطفی خود را زند — تا جہانے دیگرے پیدا کند
آہ زاں قومے کہ از پابہ فتاد — پیر و سلطان زاد و درویشے نزاد
(اس میں بادشاہ تو پیدا ہوئے مگر ایک مردِ مومن بھی نہ پیدا ہوسکا)
داستانِ او مپرس ازمن کہ من — چوں بگویم آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ھا گردو گرہ — ایں قیامت اندرون سینہ بہ
(بہ۔بہتر ہے)
مسلمِ ایں کشور از خود نا امید — عمرہا شد باخدا مردے ندید
لاجرم از قوت دیں بدظن است — کاروانِ خویش را خود رہزن است
اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ ﴿۲۸﴾ (14:28)
از سہ قرن ایں امتِ خوارو زبوں — زندہ بے سوز و سرورِ اندروں
پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق — مکتب و ملائے اُو محرومِ شوق
(دوں نہاد یعنی سیرت میں پختگی نہ ہونا)
زشتیٔ اندیشہ او را خوار کرد — افتراق او را ز خود بیزار کرد

(افتراق: فرقے۔فکر کی بدنہادی)

طبعِ او بے صحبتے مردِ خبیر خستہ و افسردہ و حق ناپذیر
بندۂ او کردۂ مولاستِ اُو مفلس و قلاش و بے پرواست اُو
(جیسے کوئی آقا اپنے غلام کو نکال دے)

نہ بکف مالے کہ سلطانے برد نے بدلِ نورے کہ شیطانے برد
(اس کو توجہ کا مستحق گردانے)

شیخِ اُو لُردِ فرنگی را مرید گرچہ گوید از مقامِ بایزید
(جو اپنے آپ کو بایزید کے مقام پر سمجھتا ہے)

گفت دیں را رونق از محکومی است زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شُمرد رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد
(غلام احمد قادیانی)

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد می شناسی عصرِ ما باما چہ کرد؟
(نہیں جانتا تو کہ زمانہ کیا چال چل گیا ہے)

عصر ما، ما را ز ما بیگانہ کرد از جمالِ مصطفی بےگانہ کرد
سوزِ اُو تا از میانِ سینہ رفت جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
باطن ایں عصر را نشاختی داواِوّل خویش را درباختی
(داواِوّل یعنی جوئے کا پہلا داؤ۔درباختی ہار گیا)

تا دماغ تو بہ پیچاکش فتاد آرزوئے زندہ در دل نزاد
(پیچاکش۔اس کے پیچ میں پھنس گیا ہے)

احتساب خویش کن از خود مرو یک دو دم از غیرِ خود بیگانہ شو
افرنگ ز خود بے خبرت کرد، وگرنہ اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری
ایں چمن در بسے شاخِ بلند برنگوں شاخ آشیانِ خود بلند
(بسے: کئی)

نغمہ داری در گلواے بےخبر جنسِ خود بشناس و با زاغاں مپرَ

(زاغاں: کوے)

اندرونِ تُست سیلِ بے پناہ	پیشِ اُو کوہِ گراں مانند کاہ
من نہ ملا نَے فقیہہِ نکتہ ور	نَے مرا از فقر و درویشی خبر
در رہِ دیں تیز بین و سُست گام	پختۂ من خام و کارم ناتمام
تا دل پر اضطرابم دادہ اند	یک گرہ از صد گرہ کشادہ ام
از تب و تابم نصیبِ خود بگیر	بعدازیں ناید چوں من مردِ فقیر

(ناید، نہیں آئے گا)

''مردِ حُر''(قرآنی فقر والا)

مردِ حُر محکم ز وِرد لا تخف ۔۔۔ مابہ میداں سر بجیب اُو سر بکف
مردِ حُر از لا الٰہ روشن ضمیر ۔۔۔ می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
مردِ حُر چوں اشتراں بارے برد ۔۔۔ مردِ حُر بارے بُرَد خارے خُرد
(خارے خرد یعنی کانٹے کھاتا ہے)

جاں اُو پائیندہ تر گردد زموت ۔۔۔ بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت
ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج ۔۔۔ گیرد آں درویش از سلطان خراج
(جو راستے میں مشکلات کو آسان سمجھے)

گرمئ طبع تو از صہبائے اوست ۔۔۔ جوئے تو پرورده از دریائے اُوست
(پرورده۔ پرورش پانا)

بادشاہاں در قبائے حریر ۔۔۔ زرد رُو از سہمِ آں عریاں فقیر
سرِّ دیں مارا خبر اُو را نظر ۔۔۔ اُو دروں خانہ، مابیرونِ در
نے مُغاں را بندہ، نے ساغر بدست ۔۔۔ ماتہی پیمانہ اُو مستِ الست
دارد اندر سینہ تکبیرِ اُمّم ۔۔۔ در جبینِ اُوست تقدیرِ اُمّم
قبلۂ ما گاہ کلیسا، گاہ دَیر ۔۔۔ اُو نخواہد رزق خویش از دستِ غیر
(گاہ۔ کبھی)

ما ہمہ عبدِ فرنگ اُو عبدہٗ ۔۔۔ اُو نہ گنجد در جہانِ رنگ و بو
(گنجد۔ سمانا)

صبح و شام مابہ فکرِ ساز و برگ ۔۔۔ آخرِ ماچیست؟ تلخیہائے مرگ

1273

در جہانِ بے ثبات اُو را ثبات   مرگِ اُو را مقاماتِ حیات

اہلِ دل از صحبتِ ما مضمحل   گل زِ فیضِ صحبتش دارائے دل

(محض آب و گل کا پیکر اس کی صحبت میں ایسا ہو جائے کہ ہر ایک کا دل اس کی طرف کھینچتا جائے)۔

کارما وابستۂ تخمین و ظن   اُو ہمہ کردار و کم گوید سخن

ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست   فقرِ اُو از لا الٰہ تیغے بدست

ماپرِ کاہے اسیرِ گرد باد   ضربش از کوہِ گراں جوئے کشاد

محرمِ اُو شو ، ز ما بیگانہ شو   خانۂ ویراں باش و صاحبِ خانہ شو

صحبتِ از علم کتابی خوشتر است   صحبت مردانِ حُر آدم گراست

مردِ حُر دریائے ژرف و بیکراں   آب گیر از بحرِ اُو نے از ناوَداں

(ناوداں۔پرنالہ)

روز صلحِ آں برگ و سازِ انجمن   ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن

(بادفرودیں۔بہار)

روزِ کیں آں محرم تقدیرِ خویش   گور خود می کندد از شمشیرِ خویش

می نہ روید تخمِ دل از آب وگل   بے نگاہے از خداوندانِ دل

(روید۔روئیدگی)

اندریں عالم نیرزی باخسے   تا نیاویزی بدامانِ کسے

(نیاویزی۔تو نہ رہے)

(یاد رکھ جب تک تو اس قسم کے مردِ حُر کے ساتھ نہ رہے تو تیری قیمت پرِ کاہ جتنی بھی نہیں یہ جماعتی زندگی ہے۔ نیاویزی۔ تو نہ رہے۔ نیرزی۔ تیری قیمت)

مغربی تہذیب اور اقبال

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست | چشم اُو یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہِ نیست
اوُ نداند از حلال و از حرام | حکمتش خام است و کارش ناتمام

(وحی کے بغیر یورپ کی حکمت تباہی ہے)

اُمتے بر اُمَّتے دیگر چرد | دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد
از صغیفاں نان ربودن حکمت است | از تنِ شاں جان ربودں حکمت است
شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است | پردۂ آدم دری سوداگری است

(یہ درندگی تجارت کے پردے میں کی جاتی ہے)

ایں بنوک ، ایں فکرِ چالاکِ یہود | نورِحق از سینۂ آدم ربود

(ربود۔لے جائے)

تاتہ وبالا نہ گردد ایں نظام | دانش وتہذیب و دینِ سودائے خام
آدمی اندر جہان خیر و شر | کم شناسد نفع خود را از ضرر
کس نداند زشت وخوبِ کار چیست؟ | جادۂ ہموار و ناہموار چیست؟
شرعِ برخیزد ز اعماق حیات | روشن از نورش ظلام کائنات
گر جہاں داند حرامش را حرام | تا قیامت پختہ ماندِ ایں نظام

(حرامش: وحی کے حرام کو ہی حق وباطل کا معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔)

نیست ایں کار فقیہاں اے پسر | با نگاہے دیگرے اُو رانگر
حکمش از عدل است تسلیم و رضا ست | بیخ اُو اندر ضمیرِ مصطفیٰ ؐ است

از فراق است آرزوہا سینہ تاب — تو نمانی چوں شود، اُو بے حجاب
از جدائی گرچہ جاں آید بلب — وصلِ اُو کم جو، رضائے اُو طلب

(نُما۔نموُ ون، دکھانا سے فعل امر، نما بطور لاحق خوشنما۔ رہنما۔ راستہ دکھانے والا۔علامہ ان ذیل اشعار میں اہل تصوف کو کہتے ہیں کہ خدا سے وصال ناممکن ہے اگر خدا کسی کے سامنے بے حجاب آ جائے تو وہ خود باقی ہی نہ ہے۔ یہ مسلک غلط ہے۔ ہمیں خدا کی رضا مانگنی چاہیے۔)

مصطفی داد از رضائے او خبر — نیست در احکامِ دیں چیزے دگر

(رسول ﷺ کی وساطت رضائے خدا بتا دی گئی ہے انسان اپنی مرضی سے یہ راستہ چنے اور رضا حاصل کرے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے خدا سے وصال کا)۔

تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریا است — فقر و شاہی از مقاماتِ رضا است
از شریعت اَحسَنُ التّقویم شو — وارثِ ایمانِ ابراہیم شو
می شود از جبر پیدا اختیار — لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا
پس طریقت چیست اے والا صفات — شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات
فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں — جزبہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی دینِ تو مجبوری است — ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است
(مہجوری۔چھوڑنا)

(آخری شعر میں ایک بلند حقیقت بتا دی کہ اگر دین کے احکام کی تعمیل رسماً کی جائے تو اس سے تو قربِ خداوندی حاصل نہیں ہوتا۔ اور انسان خدا سے دور ہو جاتا ہے)۔

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار — بر نمی آید ز جبر و اختیار
(تا یعنی جب تک)

(انسان جب تک حق وصداقت کو آشکارا نہ دیکھے یعنی وہ وحی کے احکام کو زندگی کا تقاضا نہ بنائے تو وہ جبر واختیار کی الجھن سے کبھی نہیں نکل سکتا)۔

اب اربابِ تصوف سے مخاطب ہے:

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم   تا کجا در حجرہ می باشی مقیم
در جہاں اَسرارِ دیں را فاش کُن   نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن
کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس   نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس

(اپنے حجروں سے نکل کر اس قرآن کا پیغام دنیا بھر میں پھیلا دو تا کہ اس سے ہر قسم کی محتاجی اور غلامی کی تمام قسموں کا خاتمہ ہو جائے)

مکتب و ملا سخن ہا ساختند   مومناں ایں نکتہ را نشاختند
زندہ قومے بود از تاویل مُرد   آتشِ اُو در ضمیرِ اُو فسُرد
عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید   در شریعت کم سواد و کم نظر

(یعنی میں سے ہر ایک قرآن اور حدیث کے عالم ہونے کا مدعی ہے۔ مگر حرام کہ ان کو پتہ ہو کہ شریعت کا مقصود و منزل کیا ہے۔ بڑے کوتاہ نگاہ کور ذوق۔ یہانتکہ ایک جھوٹا پیغمبر بھی بنا لیا ہے۔)

علامہ کی قلب پرُسوز کیفیت'' اور موجودہ لیڈر''

عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس — منبر شاں منبرِ کاک است و بس

(ان کے ہاں روایت ہو یا درایت۔مقصد اس سے ہوس پرستی ہے۔ان کے نزدیک یہ منبر نا بنائی کی دکان ہے اور بس)

زیں کلیماں نیست، امید کشود — آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود؟

کارِ اقوام و ملل ناید درست — از عمل بنما کہ حق در دست ِ تُست

(قوم کی اصلاح ان مدعیان دیں سے نہیں ہوسکتی۔قرآن کا معاشی نظام نافذ کر کے اس کے درخشندہ نتائج لوگوں کو دکھا دو کہ حق وصداقت صرف تمہارے پاس ہے)۔

موجودہ قیادت:

اے جواں دامانِ اُو محکم بگیر — در غلامی زادۂ آزاد میر

داغم از رسوائی ایں کارواں — در امیرِ اُو نہ دیدم نورِ جاں

تن پرست و جاہ پرست و کم نگاہ — اندرونش بے نصیب از لا الہ

در حرم زادہ و کلیسا را مرید — پردۂ ناموس ما را بردرید

(بردرید: باہر نکالنا)

دامن اُو را گرفتن ابلہی است — سینۂ اُو از دلِ روشن تہی است

اندریں رہ ، تکیہ بر خود کن کہ مرد — صیدِ آہو با سگِ کورے نکرد

(سگ کور: اندھے کتی)

آہ از قومے کہ چشم از خویش بست — دل بہ غیراللہ داد، از خود گسست

(گسست: کٹ جانا)

تاخودی در سینۂ ملت بمرد کوہ کاہی کرد و باد اُو را ببرد
(تو بے حس ہو گیا جیسے ہوا جہاں چاہے لے جائے۔ پہاڑ تنکا ہو گیا۔)

گرچہ دارد لا الٰہ اندر نہاد از بطونِ اُو مسلمانے نزاد
آنکہ بخشند بے یقیناں را یقین آنکہ لرزد از سجودِ اُو زمیں
آنکہ زیرِ تیغ گوید لا الٰہ آں برد آں سوزِ مشتاقی نماند
تم نے لا الٰہ کو چھوڑ دیا ہے۔ (نماند: نہ رہی)

درحرم صاحبِ دِلے باقی نماند

اے مسلماں! اندریں دیرِ کہن تا کجا باشی بہ بند اَہرِمن
زیستن تاکے بہ بحر اندر چو خس سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس
بخود خزیدہ و محکم چوں کوہسار زئی مُزی چوں خس کہ ہوا تیز وشعلہ بے باک است

❀❀❀

علامہ کے قلب کی پرسوز کیفیت

گرچہ دانا حالِ دل باکس نگفت | از تو دردِخویش نتوانم نُہفت
(نُہفت: چھپایا)

تا غلامم در غلامی زادہ ام | ز آستانِ کعبہ دُور افتادہ ام

چوں بنامِ مصطفی خوانم درود | از خجالت آب می گردد وجود
(آب می گردد: پانی پانی)

عشق می گوید کہ اے ''محکومِ غیر'' | سینۂ تو از بتاں مانندِ دَیر

تانداری از محمدؐ رنگ و بو | از دورِداو میالا نامِ اُو
(میالا نام اُو یعنی داغدار نہ کر)

از قیامِ بے حضورِ من مپرس | از سجودِ بے سرورِ من مپرس

مردے آزادے چو آید در سجود | در طوافش گرمِ او چرخِ کبود
(کبود۔نیلا، چرخ، آسمان)

ازغلامے لذّتِ ایماں مجو | گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو

مومن است و پیشۂ اُو آزری است | دین و عرفانش سراپا کافری است
(عرفانش: شریعت وطریقت)

در بدن داری اگر سوزِ حیات | ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت

گر نداری خونِ گرم اندر بدن | سجدۂ تو نیست جُز رسمِ کہن

عیدِ آزاداں شکوۂ مُلک و دیں | عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔۔۔
علامہ اس اُمّت کو اب علاج بتا رہے ہیں

آدمیّت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
(برچید: چننا۔ بپا ہونا)

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق؟
باز روشن می شود ایامِ شرق

درِ ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گزشت و آفتاب آمد پدید
(پدید: آرہا ہے)

یورپ از شمشیرِخود بسمل فتاد
زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد

گرگے اندر پوستین برّۂ
ہر زماں اندر کمینِ برّۂ

مشکلاتِ حضرت انسان ازوست
آدمیّت را غم پنہاں ازوست

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بےمنزل است

ہرچہ می بینی ز انوارِ حق است
حکمتِ اشیا ز اسرارِ حق است

ہر کہ آیاتِ خدا بیند حُر است
اصل ایں حکمت ز حکمِ اُنظُر است

بندۂ مومن ازو بہروزتر
ہم بہ حالِ دیگراں دل سوزتر
(بہروزتر: خوشحال)

علم چوں روشن کند آب و گِلش
از خدا ترسندہ‌تر گردد دلش

علمِ اشیا خاکِ ما را کیمیا است
آہ! در افرنگ تا ثیرش جدا است

عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت
چشمِ اُو بے نم، دل اُو سنگ و خشت
(عیار: کسوٹی)

علم ازو رسواست اندر شہر و دشت
جبریل از صحبتش ابلیس گشت

دانشِ افرنگیاں تیغ بدوش — درِ ہلاکِ نوعِ انسان سخت کوش
باخساں اندر جہانِ خیر و شر — در نسازد مستیٔ علم و ہنر
(نسازد: راس نہ آنا)
آہ از افرنگ و از آئینِ اُو — آہ ! از اندیشۂ لادینِ اُو
علمِ حق را ساحری آموختند — ساحری نے، کافری آموختند

ہر طرف صد فتنہ می آرد نفیر — تیغ را از پنجۂ رہزن بگیر
(می آردنفیر۔ہجوم کرکے) (پنجۂ رہزن۔علم ڈاکوؤں کے ہاتھ)
اے کہ جاں را با ز می دانی زتن — سحرِ ایں تہذیبِ لادین شکست
(تم مغرب کی برعکس انسان زندگی کوصرف طبعی زندگی نہیں سمجھتے بلکہ انسانی ذات بھی مانتے ہو)۔
روحِ شرق اندر تنش باید دمید — تا بگردد قفلِ معنی را کلید
(مغرب کے بدن میں مشرق کی روح پھونک دی جائے تا کہ اس سے رموز انسانی کے بند تالے کھل جائیں)۔
عقلِ اندر حکم دل یزدانی است — چوں زدل آزاد شُد شیطانی است
(یزدانی: وحی کے تابع)
زندگانی ہر زماں در کش مکش — عبرت آموز است احوالِ جبش
(جب اٹلی نے حملہ کر کے جبشہ کو اٹلی کا حصہ بنالیا1953ء میں)
شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال — برّہ را کردہ است بر گرگاں حلال
(برّہ یعنی بکری کا بچہ اور گرگاں۔بھیڑیے)

(یہ فتویٰ یورپ کے حاملین شریعت نے دیا ہے)۔
نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد — از کفن دزداں، چہ امیدِ کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکرو فن — صیدِ تو ایں پیش و آں نخچیرِ من
اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو — اے مومنِ خود کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تُست — آبروئے خاوراں در دستِ تُست

این کہن اقوام را شیرازہ بند — رایت صدق و صفا راکن بلند
اہل حق را زندگی از قوت است — قوتِ ہر ملت از جمعیت است
رائے بےقوت ہمہ مکر و فسوں — قوّتِ بے رائے جہل است و جنوں

ایشیا کی خصوصیّت

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست — ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را بادلبری آموختیم — شیوۂ آدم گری آموختیم
ہم ہنر ہم دیں زخاکِ خاور است — اشکِ گردوں خالی پاکِ خاوراست
ہر صدف را گوہر از نیستانِ ماست — شوکت ہر بحر از طوفانِ ماست

ہم نے ہی اس عشق کو دلکشی اور جاذبیّت کے طور طریقے سکھائے ہیں۔

(نیستان: بہار کا باش کا قطرہ)

روحِ خود در سوزِ بلبل دیدہ ایم — خونِ آدم در رگِ گل دیدہ ایم
فکرِ ما جویائے اسرار وجود — زد نخستیں زخمہ برتارِ وجود
اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں — آں یدبیضا برآر از آستیں
خیز و از کار امم بکشا گرہ — نقشۂ افرنگ را از سرنبہ

(سرنبہ۔دورکر)

نقشے از جمعیتِ خاور فگن — داستادنِ خود را ز دستِ اہرمن

(داستادن۔واپس لے۔اپنے آپ کو اہرمن یعنی ابلیس پھندوں سے چھڑاؤ) داستادن۔واپس لینا)

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ — تا کجا در قید زُنّارِ فرنگ

(زُنّار۔فریب)

زخم ازو، نشتر ازو، سوزن ازو — ما و جوئے خون و امیدِ رفو
خود بدانی بادشاہی قاہری است — قاہری در عصرِ ماسودا گری است
تختۂ دکان شریکِ تاج و تخت — از تجارت نفع و از شاہی خراج

(آج کل باگ ڈور ان تاجروں کے پاس ہے بادشاہ تو ٹیکس لیتا ہے یہ تو خراج کی شکل میں لوٹ لیتے ہیں)۔

آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است — بر زبانش خیر اندر دل شراست
بے نیازِ از کارگاہِ اُو گذر — در زمستان پوستین او مخر
(مِستان: سردی)

کشتنِ بےحرب وضرب آئین اوست — مرگ ہا در گردش ماشین اُوست
بوریائے خود بہ قالینش مدہ — بیذقِ خود را بہ فرزینش مدہ
(بیذقِ یعنی چھوٹا مہرہ، فرزینش یعنی بڑا مہرہ)

گوہرش تف دار و درلعلش رگ است — مُشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است
(تف دار۔ جھوٹے نگ۔ رگ۔ عیب)

صدگرہ افگندۂ درکارِ خویش — از قماشِ او مکن دستارِ خویش
(قماش: بلمل)

ہوشمندے از خم اوے نخورد — ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد
وقت سودا خند خند و کم خروش — ما چو طفلانیم او شکرفروش
(کم خروش۔ غصہ)

محرمِ از قلب و نگاہ مشتری است — یارب ایں سحری است یا سوداگری است
(مُشتری۔ خریدار۔ محرم۔ جانتا ہے)

تاجرانِ رنگ و بو بردند سود — ما خریداران ہمہ کور و کبود
(سرخی پاؤڈر لاکر لوٹ کرلے جاتے ہیں)

آنچہ از خاک تو رُست اے مردِ حُر — آں فروش وآن بپوش وآں بخور
اے ز کار عصرِ حاضر بے خبر — چرب دستی ہائے یورپ را نگر
قالی از ابریشم تو ساختند — باز او را پیشِ تو انداختند
چشمِ تو از ظاہرش افسوں خُورَد — رنگ وآبِ او ترا از جا بُرد
(ان کی چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہوجائیں)۔

وائے آں دریا کہ موجش کم تپید — گوہرِ خود را از غواصاں خرید
(غواصاں۔ غوطہ لگانے والے)

درحضور رسالتِ مآب ﷺ (پس چہ باید کرد؟)

اس زمانہ میں اقبال شدید بیمار تھے۔گلا بیٹھا ہوا تھا۔علاج کی غرض سے بھوپال گئے (اپریل 1936ء) امت مسلمہ کے ساتھ قلبی لگاؤ تھا۔رسول ﷺ سے جو والہانہ عشق تھا۔اس کیفیت میں یہ اشعار کہے ہیں:

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ — وارہاں ایں قوم را از ترس مرگ
(وارہاں۔نجات دلادے)
سوختی لات ومناتِ کہنہ را — تازہ کر دی کائناتِ کہنہ را
در جہانِ ذکر و فکر انس و جاں — تو صلوٰتِ صبح تو بانگ اذاں
(انتہائی شدت جذبات میں یہ کہا ہے)
لذتِ سوز و سرور از لا الٰہ — درشبِ اندیشۂ من نور از لا الٰہ
نے خداہا ساختیم از گاؤ خر — نے حضورِ کاہناں افگندہ سر
(یہ تیری تعلیمات کا صدقہ ہے)
نے سجودے پیشِ معبودان پیر — نے طوافِ کُوشکِ سلطان و میر
(کوشک۔محلات)
ایں ہمہ از لطف بے پایان تُست — فکرِ ما پروردۂ احسانِ تُست
ذکر تو سرمایۂ ذوق و سرور — قوم را دارد بہ فقر اندرِ غیور
اے مقام و منزلِ ہر رہرو — جذبِ تو اندر دل ہر رہرو
(اب موجودہ حالت ملت کی بتارہے ہیں)۔
سازِ ماگردید بے صوت آنچناں — زخمہ بر رگ ہائے او آمد گراں
(آنچناں۔اس حدتک) (زخمہ۔نغمہ)

1273

در عجم گردیده وہم در عرب — مصطفی نایاب و ارزاں بولہب
ایں مسلمان زادۂ روشن دماغ — ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
(مسلمان زادۂ: مسلمانوں کی نئی نسل)

در جوانی نرم و نازک چوں حریر — آرزو در سینۂ اُو زود میر
ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام — حریتِ اندیشۂ او را حرام
مکتب ازوئے جذبۂ دیں در ربود — از وجودش این قدر دانم کہ بود
ایں زخود بے گانہ، ایںِ مست فرنگ — نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ
ناں خرید ایں فاقہ کش با جانِ پاک — داد مارا نالہ ہائے سوزناک
شیخ مکتب کم سواد و کم نظر — از مقام اُو نہ داد اُورا خبر
آتشِ افرنگیاں بگداختش — یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش
مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست — در دِلش لا غالب الا اللہ نیست
از فرنگی می خرد لات و منات — مومن و اندیشۂ اُو سومنات
قُمْ بِاِذْنِي گوے و او را زندہ کن — در دِلش اللہ ھو را زندہ کن
ماہمہ افسونئ تہذیبِ غرب — کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو ازاں قومے کہ جامِ او شکست — وانما یک بندۂ اللہ مست
(تو اس قوم سے ہے کہ اس کے جام وسبو توڑ چکا ہے)۔
تا مسلماں باز بیند خویش را — از جہانے برگزیند خویش را
(تا: تا کہ)

اے وہ ذاتِ گرامی! تو ہم بے کسوں کے لیے ساز و سامانِ حیات ہے۔ تُو اس قوم کو موت کے ڈر سے نجات دلا دے یہ ہے سب سے بڑی دعا جو علامہ نے اس قوم کے لیے مانگی ہے۔ آپ نے زمانہ کہنہ کو الٹ کر انسانیت کو جدید نظریات سے متعارف کروایا اور ایسی انقلاب انگیز تعلیمات کے خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں، اس وجہ سے یہ اُمّت ہر قسم کے شرک سے پاک رہی اور نہ ہی دنیاوی فرمانروا کے سامنے سر جھکایا۔ یہ سارا کچھ آپ ﷺ کی بے مثال تعلیمات کی وجہ سے ہوا۔ ہم مسلمانوں کی موجودہ حالت تو نہ گفتہ بہ ہے۔ حرکت و حرارت ناپید ہو چکی ہے کہیں بھی اسلامی اقدار کا چال چلن نہیں ہے۔ نئی نسل ذہین ہے لیکن ان کے دل نورِ ایمانی سے تہی ہیں۔ نہ زندگی کا کوئی مقصد ہے اور نہ منزل۔ یہ تمام نفسیاتی

1273

بیماریاں ایک صدی کی غلامی کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں۔غلط تعلیمات کی وجہ سے دین کا تصور تک مٹ چکا اور یہ محض آب و گِل کے پیکر بن کر رہ گئے ہیں۔مغرب کی تقلید اندھا دھند کی جارہی ہے۔آرزو پست اور مقصد انتہائی ذلیل، بلند اقدار سے نابلد، اس تعلیم کی وجہ سے ان پر ہر وقت موت کا خوف طاری رہتا ہے محض روٹی کی خاطر در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ دماغوں میں مغرب کے بت بس گئے ہیں۔

اب علامہ رسول اللہ ﷺ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس مردہ قوم کو دوبارہ زندگی عطا کر دی جائے اور ایک ایسا مردِ حق پیدا کر دے تاکہ یہ اُمت دنیا میں اپنی گم شدہ جنت پھر پالے اور اعلون کے مقام پر فائز ہو جائے۔

اَسرارِخودی

علاّمہ اقبال کی سب سے پہلی کتاب ''اَسرارخودی اور رُموز بیخودی'' ہے۔اقبال کا فلسفہ ہی فلسفۂ خودی ہے۔خودی ہمارے تصوف کی ایک پرانی اصطلاح ہے۔اور سب سے زیادہ قابلِ نفرت۔اس سے صوفیا کی مراد ہوتی ہے۔انانیت یعنی کسی فرد کا دعویٰ کہ ''میں'' ہوں۔فرد کا اپنی ہستی یا ذات کا ادّعا تصوف میں سب سے زیادہ مغبوض ہے۔جس کی رو سے زندگی کا مقصود فنائے ذات ہے۔ یہ انسانی خودی خدا اور انسان کے درمیان سب سے بڑا پردہ ہے جو حائل ہے اور یہی سنگِ گراں روحانی ترقیوں میں رکاوٹ ہے۔

ڈبویا مجھ کو ہونے نے   نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا؟

اب اس کا علاج یہ بتاتے ہیں کہ جس قدر جلد ہوسکے اپنے آپ کو مٹا دیا جائے۔چنانچہ تصوف کی تمام ریاضتیں اسی مقصد کے حصول کی کوششیں اور اس کے تمام مقامات واحوال اسی مٹ جانے کے جذبہ کی کیفیات ہیں۔جب کہ اقبال کے ہاں یہی خودی ''سب سے بڑی گراں متاع ہے۔

اگر یک ذرّہ کم گردد ز انگیز وجودِ من   بایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانہ را

اس کے نزدیک،زندگی کا مقصد تحفظ اور استحکامِ خودی ہے۔خیر وہ ہے جو خودی کو مستحکم کرلے۔جب کہ شر سے خودی میں ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔حیات جاوید خودی کے استحکام سے حاصل ہوتی ہے۔جب کہ صوفی کے نزدیک ''عشرتِ قطرہ'' دریا میں فنا ہوجانے کا نام ہے۔یعنی انسانی ذات کا خدا کی ذات کے اندر جذب ہوجانا۔فنا ہوجانا۔جب کہ اقبال

بخود محکم گذر اندر حضورش   مشو ناپید اندر بحرِ نورش

یہ خودی کیا ہے؟:

مادی نظریۂ حیات کی رُو سے انسانی زندگی بس اسی آب وگل کی زندگی ہے۔جسم کی مشینری طبعی قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔انہی قوانین کے تحت موت انسان کا خاتمہ کردیتی ہے۔قرآن اس تصور کو جہالت پر مبنی تصور قرار دیتا ہے۔انسانی جسم کو ایک اور شے بھی دی گئی ہے۔جو غیر نشوونما یافتہ ہے۔اس میں آگے بڑھنے اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت ہے۔اور یہ

1273 قرآنی معاشرہ میں بھی نشوونما پا کر مستحکم ہوسکتی ہے۔اس کا نام ''انسانی ذات، نفس، شخصیت، انا، ایغو یا خودی ہے۔یہی اپنے مظاہرہ کا عمل، آرزؤں کا مرکز، اس کے مقاصد کا محور اور اس کے تمام اعمال کا سرچشمہ ہے۔

اس کے اثبات سے اس کا وجود اور اسی کی صلابت اور پختگی سے اس کا اثبات ہے۔اس کے سرچشمے سے اس کے ارادے ابھرتے ہیں اور اس کی قوت سے یہ فیصلہ کرتی ہے۔جب اس میں پختگی آتی ہے تو عقل اور اس کے متعین کردہ پروگرام کے لیے اسباب و ذرائع تلاش کرتی ہے۔اور علم اس کے مقاصد کے لیے راستے روشن کرتا ہے۔جب یہ اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لیے داخل اور خارجی تمام قوتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے، ایں و آں سے بے خبر، مصروفِ جادۂ پیمائی ہوجاتی ہے تو اس کا نام وہ ''جنون'' جس کے بغیر دنیا کے تمام نقشِ ناتمام رہ جاتے ہیں۔

انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ حیوان کسی شے کی تخلیق نہیں کرسکتا۔وہ صرف افزائش نسل بذریعہ تولید کرسکتا ہے۔جب کہ انسان اپنے تخلیقی کارناموں سے خالق کائنات کے پروگراموں میں اس کا رفیق بن جاتا ہے اور کائنات کو حسین سے حسین تر بناتا جاتا ہے۔لیکن یہ تخلیق خودی کی بیداری سے ہوسکتی ہے۔اور تخلیق کے لیے بلند مقصد سامنے ہو۔لہٰذا انسانی زندگی تخلیقِ مقاصد کا نام ہے لیکن مقصد حیات محض خودی کی بیداری نہیں بلکہ اس کی تادیب و تربیت بھی ہے۔سرکش خودی کائنات میں فساد پیدا کرتی ہے۔ اس کی تربیت ان قوانین کی رو سے ہوسکتی ہے جو غیر متبدل طور پر خالق نے قرآن میں دیئے ہیں۔یہ ذات میں از خود موجود نہیں ہوتے بلکہ انبیاء کی وساطت سے ملتے ہیں۔ان قوانین کی اطاعت ایک معاشرہ میں ہوسکتی ہے۔جب ایک فرد اپنی ذات کو اس نظام کے تابع رکھتا ہے تو اقبال اسے ''بیخودی'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔یہ فنائے ذات کا نام نہیں بلکہ خودی کی نشوونما کے لیے نظامِ خداوندی کی اطاعت ہے۔اس اطاعت سے قوت اور اس جبر سے اختیار ملتا ہے۔یہ قرآن کی زبان میں ''سلطان'' ہے۔اس سے خودی حدود و فراموش اور قیود نا آشنا ہوتی چلی جاتی ہے اور ''اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (55:33) سے بھی آگے جاسکتی ہے۔اس نظام کا نام اسلام ہے۔انفرادیت اور تجرد کی زندگی یکسر غیر اسلامی زندگی ہے۔ایک قرآنی نظام کے تابع اجتماعی زندگی ہی کا نام ''اسلام'' ہے۔اس کا فکری مرکز قرآن ہے۔اطاعت کا مرکز اس کا امیر۔اور نظام کا مرکز خانہ کعبہ اور سارے نظام کا مقصد ساری انسانیت کی نشوونما ہے۔

قرآن نے دیگر افرادِ انسانیہ کی رزق و نشوونما کے لیے ہدایات دے دی ہیں۔اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے جنتی معاشرہ جب کہ خلاف ورزی کرنے سے تباہی اور بربادی کا جہنم۔اقبال نے یہ سارا تصور قرآن سے لیا۔اور اسے ساری انسانیت کے لیے پیش کیا۔اگرچہ الفاظ اور اصطلاحات تو وہی ہیں جو تصوف میں چلے آرہے تھے مگر ان اصطلاحات کو جداگانہ معنی دیئے ہیں۔اب اس خودی کے اسرار و رموز اس میں بیان کردیئے ہیں۔

❁❁❁

دیباچۂ اسرارِخودی

یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات، مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ ''خودی'' یا ''انا'' یا ''میں'' جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی۔ کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیزی کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد واقوام کا طرزِ عمل اس ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہوگی جس کے حکما اور علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد واقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا۔ جس قدر ان کی افتادِ طبع پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج اقوام زیادہ تر اس نتیجہ پر مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔

مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا۔ جن کی طرف ان کی فطرت متقاضی تھی۔ ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات ونظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے۔ اس قوم کے موشگاف حکماء نے قوت عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے۔ اور بالاخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انا کی حیات کا یہ مشہور تعطل جو تمام آلام ومصائب کی جڑ ہے، عمل سے متعین ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ انسانی انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گزشتہ طریقِ عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور جب تک یہ قانون اپنا عمل کرتا رہے گا۔ وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔

انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت میں لفظ کلام کی جگہ لفظ عمل پڑھتا ہے۔ (ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام ہی خدا تھا) تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ، اس نکتہ کو دیکھتی ہے۔ جس کو ہندو حکماء نے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس عجیب وغریب طریق پر ہندو حکما نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت یا باالفاظ دیگر جبر واختیار کی گتھی کو سلجھایا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی قابل تحسین ہے۔ بالخصوص اس

1273
وجہ سے ایک بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں۔ جو اس قضیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔یعنی جب انا کی تضمین عمل سے ہے تو انا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے۔اور وہ ترک عمل ہے (تضمین۔ضامن بننا) یہ نتیجہ انفرادی اور اجتماعی طور پر نہایت خطرناک تھا اور اس بات کا متقضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو۔ جو ترکِ عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کرے۔

بنی نوع انسان کی ذہن تاریخ میں ''سری کرشن'' کا نام ہمیشہ ادب واحترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اس فلسفہ اور روایات پر تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترک کُلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے۔ بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔سری کرشن کے بعد ''سری رام نوج'' بھی اس راستے پر چلے۔مگر افسوس کہ جس عروس معنیٰ کو سری کرشن اور سری رام نوچ بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔سری شنکر کے منطق طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا (چھپا دیا) اور سری کشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم ہوگئی۔

مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک زبردست پیغامِ عمل تھی۔ گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے۔مگر مسئلہ انا کی تحقیق وتدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ میں ایک عجیب وغریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی۔اس نقطۂ خیال سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔ جس نے مسلمانوں کے دل ودماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔شیخ اکبر کے علم وفضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے۔اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔وحدالدین کرمانی اور فخرالدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اسی رنگ میں رنگین ہوگئے۔ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی۔ جو جزو سے کُل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔انہوں نے جزو اور کُل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے ''رگِ چراغ'' میں ''خونِ آفتاب'' کا اور ''شرارِ سنگ'' میں ''جلوہ طور'' کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے وحدت الوجود کے اسباب میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا اور ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق یعنی دل کو اپنی آماج گاہ بنالیا۔اور ان کی حسین وجمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔سب سے پہلے علماء میں غالباً ابن تیمیہ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میدان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔مگر افسوس واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ملا محسن کشمیری نے کتاب دبستان میں اس کا تھوڑا سا تذکرہ کیا ہے۔جس سے اس کے خیالات کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ شعراء میں شیخ علی حزیں نے یہ کہہ کر ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' اسی بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقتِ حال سے آگاہ تھے۔مگر وہ بھی اپنے آپ کو اس ماحول سے محفوظ نہ کر سکے۔مرزا بے دل لذتِ سکون کے اس قدر دلدادہ کہ ان کو جنبش نگاہ تک گوارا نہیں۔ ے

1273

نزاکت ہا است در آغوشِ مینا خانۂ حیرت مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشہ را

مغربی اقوام قوت عمل کی وجہ سے تمام اقوام عالم میں ممتاز ہیں اور اس وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کا لٹریچر و تخیلات اہل مشرق کے لیے بہترین رہنما ہیں۔

اگرچہ مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتداء ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظام وحدت الوجود سے ہوتی ہے لیکن مغربی طبائع پر رنگ عمل غالب تھا اور وحدت الوجود کا یہ طلسم جس کو ریاضی کے طریق استدلال سے پختہ کیا گیا تھا، دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ جس طرح رنگ و بو کے لیے مختص حواس ہیں۔ اس طرح انسانوں میں ایک اور حاسہ بھی ہے۔ جس کو ''حس واقعات'' کہنا چاہیے۔ ہماری زندگی واقعات گردوپیش کے مشاہدہ کرنے اور اس کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عملی پیرا ہونے پر منحصر ہے۔ نظامِ قدرت کے پر اسرار بطن سے واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور ہوتے رہیں گے مگر بیکن سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعاتِ حاضرہ جن کو نظریات کے دلدادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے برآ گاہِ حقارت دیکھتے ہیں اپنے اندر حقائق و معارف ایک گنج گراں مایہ پوشید رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انگریز قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں ''جس واقعات'' دیگر اقوام کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے (تاویل الحدیث)۔ کوئی دماغ یافتہ فلسفیانہ نظام جو واقعاتِ متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو۔ انگلستان کی زمین آج تک مقبول نہیں ہوا۔ اس لیے ان کے حکماء کی ادبیات دنیا میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ مشرق دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنے قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں۔ یہ ان کا مسئلہ حیات اور الممات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔ یہ لفظ اس مثنوی میں بھی یعنی ''خودی''، بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے اس کا مفہوم ''محض احساس نفس یا تعین ذات'' ہے اور مرکب لفظ ''بے خودی'' میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔

❁❁❁

فلسفۂ خودی کی اقبال کی خود تشریح
پروفیسر نکلسن کے جواب میں

اَسرارِ خودی کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا تھا۔ اور اس مثنوی کے بعض فلسفیانہ نکات کی تشریح خود علامہ اقبال نے کی تھی۔ اس تشریح کو پروفیسر نکلسن نے مقدمہ میں شامل کر لیا تھا۔ اس لیے اس تشریح کو سامنے لایا جا رہا ہے کہ ''خودی'' کے متعلق علامہ اقبال کا نظریہ کیا تھا۔ یہ تشریح ارشاد الحق صاحب نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے ''حکمت اقبال'' میں شائع کیا تھا۔

یہ مسئلہ کہ علم (تجربہ) محدود مراکز سے حاصل ہوتا ہے اور ہمیشہ لفظ ''یہ'' کے محدود جامہ میں ملبوس ہوتا ہے۔ آخر میں جا کر ناقابلِ تشریح ہو جاتا ہے۔ یہ پروفیسر براڈے کے الفاظ ہیں۔ لیکن جب وہ ان ناقابل تشریح مراکز علم سے آگے بڑھتا ہے تو اس کی ایک وحدت نظر آتی ہے۔ جس کا نام وہ ''مطلق'' رکھتا ہے۔ جس میں تمام مراکز علم اپنی محدودیت کو کھو دیتے ہیں۔ اس بنا پر اس کی رائے میں محدود مرکز محض ایک ظاہری شکل ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت کا ثبوت ہمہ گیری ہے۔ یعنی حقیقت وہی ہے جو کل کو محیط ہے اور چونکہ تمام محدودیت اضافی ہوتی ہے لہٰذا اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ مؤخر الذکر محض فریب نظر ہے۔ (براڈے غالباً ہیگل کے اثر سے فرد کی حقیقت کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فرد کوئی مستقبل حیثیت نہیں کرتا کیونکہ وجودِ مطلق کا ایک جزو ہے (علامہ اقبال اس خیال کے سختی سے مخالف ہیں)۔

میرے خیال میں تجربہ کا یہ ناقابل توجیہہ محدود مرکز کائنات کی حقیقت اساسی ہے۔ تمام زندگی انفرادی ہے۔ حیات کلی کا کہیں وجود نہیں۔ خدا خود ایک فرد ہے اور وہ سب افراد میں یکتا اور بے مثل ہے۔ کائنات بقول میکٹیگرٹ افراد کی ایک انجمن ہے۔ اس میں ہم اپنی طرف سے یہ اضافہ کرتے ہیں کہ جو نظم و ترتیب ہم اس میں پاتے ہیں۔ وہ ازلی نہیں ہے اور وہ بذات خود مکمل ہے۔ بلکہ یہ ہماری جبلی اور شاعرانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ہم رفتہ رفتہ فساد سے کون کی طرف جا رہے ہیں اور اس کے حصول میں ہم خود معین ہیں۔ اس انجمن کے ارکان معین نہیں۔ ہمیشہ نئے نئے رکن وجود میں آتے اور اس عظیم الشان کام میں تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح کائنات کا فعل ابھی تکمیل تک نہیں پہنچا

1273 ہے۔ ابھی اس کی تکوین جاری ہے۔ لہٰذا کائنات کے متعلق کوئی کلی تصدیق نہیں قائم کی جاسکتی کیونکہ یہ کائنات ابھی ''کُل'' کی حیثیت نہیں رکھتی۔ عمل تخلیق جاری ہے اور انسان بھی اس میں بقدر اس کے حصہ لیتا ہے۔ وہ کم سے کم فساد کے ایک حصہ میں کون قائم کرنے میں امداد کرتا ہے۔ قرآن کی اس آیت سے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ (23:14) خدا کے سوا اور خالقوں کا امکان ظاہر ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کائنات اور انسان کا یہ تصور فلسفۂ ہیگل کے جدید انگریز شارحین اور وحدت الوجود کی تمام اقسام کا مخالف ہے کیونکہ ان کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا آخری نصب العین اور اس کی نجات اس میں ہے کہ اپنے آپ کو کائنات کی زندگی میں فنا کر دے جب کہ انسان کا اخلاقی نصب العین نفی خودی نہیں ہے بلکہ اثباتِ خودی ہے اور جوں جوں اس کی انفرادیت اور یکتائی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اس نصب العین کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ''۔ یعنی اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرو۔ اس طرح انسان جس قدر اس یکتا ترین ذات سے مماثلت حاصل کرتا جاتا ہے وہ فرد بھی اس طرح بے مثل و یکتا ہوتا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ حیات کیا ہے؟ حیات انفرادی ہے اور اس کی اعلیٰ شکل ''انا'' یعنی خودی ہے۔ جس کا فرد ایک واحد اور ایک مستقل مرکز ہوتا ہے۔ انسان جسمانی اور روحانی حیثیت سے غیر مشترک اور کافی بذات مرکز ہے۔ لیکن وہ ابھی کامل فرد نہیں ہوا ہے۔ جس قدر اس کی خدا سے بُعد ہوتا ہے۔ اسی قدر اس کی انفرادیت کم ہوتی ہے۔ کامل ترین انسان وہی ہے جو اَقْرَبُ اِلَى اللّٰهِ ہو۔ اس سے مراد خدا میں فنا ہو جانا نہیں ہے۔ برخلاف اس کے خود خدا کو وہ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ حقیقی انسان اس مادی دنیا کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے بلکہ اس کی تسخیر کے بعد خود خدا کو اپنی ''انا'' میں جذب کر لیتا ہے۔

حیات ایک آگے بڑھنے والی جاذبہ حرکت ہے۔ اس کو جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کو جذب کر لیتی ہے۔ اور اس طرح ہمیشہ اپنا راستہ صاف رکھی ہے۔ اس کی ماہیت یہ ہے کہ وہ مسلسل خیالات اور خواہشات کی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اپنی توسیع اور بقاء کے لیے اس نے کچھ آلات مثلاً حواس و ذہن وغیرہ کے ایجاد یا بذریعہ ارتقا پیدا کر لیے ہیں۔ جو اس کی رکاوٹوں کے جذب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

آرزو صیدِ مقاصد را کمند دفترِ افعال را شیرازہ بند

مولانا روم نے اس خیال کو واضح کیا ہے۔ بچپن میں حضور ﷺ ایک بار جنگل میں غائب ہو گئے تھے۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ مارے غم کے آپے سے باہر ہو گئیں۔ جب حضور ﷺ کی تلاش میں جنگل میں ماری ماری پھر رہی تھیں۔ تو ندا آئی۔ رنج مت کرو۔ وہ گم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ساری دنیا اس میں گم ہو جائے گی۔

در رضایش مرضئ حق گم شود ایں سخن کے باورِ مردم بود

خودی کی آزادی:

زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ نیچر ہے۔ لیکن یہ شر نہیں ہے کیونکہ وہ زندگی کو قوائے باطنی کے اظہار کے

لائق بناتی ہے۔''انا'' کو آزادی اس وقت نصیب ہوتی ہے۔ جب اس کے راستے تمام رکاوٹیں دور ہوجائیں۔ یہ کچھ تو مختار ہے۔ کچھ مجبور، کامل آزادی اس ذات واحد کے قرب سے حاصل ہوتی ہے۔ جو سب سے زیادہ آزاد ہے یعنی خدا مختصر یہ کہ حیات عبارت ہے۔آزادی کی جدوجہد سے۔

خودی ''انا'' اور تسلسلِ شخصیت:

انسان میں مرکز حیات ''انا'' خودی یا شخص ہے۔شخصیت اطناب کی ایک حالت ہے۔اطناب یعنی Tension کا ترجمہ ہے۔نفس کی وہ حالت جب اسے خودی کا احساس قوی ہو اور اس کا تسلسل اس حالت کے قیام سے وابستہ ہے۔اگر اطناب کی حالت نہ رہے تو ''استرخا'' پیدا ہوجاتا ہے۔

اِسترخا (Relaxation) نفس کی وہ حالت جب اس میں یہ احساس کمزور ہو چونکہ خودی (شخصیت) یا حالتِ اطناب انسان کی سب سے گراں قدر کامیابی ہے لہٰذا اس کو خبردار رہنا چاہیے کہ پھر استرخا کی کیفیت نہ طاری ہوجائے۔

جو چیز کشیدگی کی حالت کو قائم رکھنے میں معین ہوتی ہے۔وہی ہمارے غیر فانی بننے کا موجب ہوتی ہے۔اس طرح شخصیت کا تصور ہمارے سامنے قدر و قیمت کا ایک معیار پیش کرتا ہے۔اس سے خیر و شر کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔جو چیزیں خودی کو مستحکم کریں وہ ''خیر'' ہیں اور جو کمزور کردیں وہ ''شر'' ہیں۔

آرٹ، مذہب اور اخلاقیات پر خودی ہی کے نقطۂ نظر سے رائے قائم کرنی چاہیے۔عربی شاعری پر نبی ﷺ کے اعتراضات کے زیرِ عنوان (1916ء) ''نیو ایرا'' میں علامہ اقبال فرماتے ہیں۔''انسانی جدوجہد کا آخری مقصد حیات ہے۔جس سے مراد ایک شاندار طاقت ور اور کثیر العمل زندگی ہے۔تمام انسانی آرٹ اس آخری مقصد کے لیے ہونے چاہئیں اور ہر شے کی قیمت اس کی حیات بخش قوت کے لحاظ سے متعین ہونی چاہیے۔اعلیٰ ترین آرٹ وہ ہے جو ہماری خفتہ قوتِ عمل کو بیدار کردے۔اور ہم کو زندگی کی مشکلات سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لائق بنادے۔جو چیز خواب آور ہے اور ہم کو گرد و پیش کی اس حقیقت سے غافل کردینے والی ہے۔جس کو مسخر کرلینے پر انحصارِ زندگی ہے۔وہ زوال اور موت کا پیغام ہے۔آرٹ میں افیون نوشی نہیں ہونی چاہیے۔ تحصیل فن برائے فن'' کا اصول دورِ انحطاط اور پستی کی ایجاد ہے۔جو ہم کو فریب میں لاکر قوت و حیات سے بے بہرہ کردینا چاہتا ہے۔

افلاطون پر جو میرے اعتراضات ہیں۔وہ دراصل ان تمام فلسفیانہ نظامات پر وارد ہوتے ہیں۔جو زندگی کو چھوڑ کر موت کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔جس میں زندگی کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادہ کو نظر انداز کردیا جاتا ہے اور بجائے اس کو مسخر کرنے کے اس سے بھاگنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم از گروہِ گوسفندانِ قدیم

1273

غیر فانیت جس طرح ''انا'' کی آزادی میں مادّہ کا عقدہ پیش آتا ہے۔اس طرح (غیر فانیت) کے سلسلے میں وقت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ برگسان کے مطابق وقت کوئی غیر محدود خط نہیں جس سے ہم سبھوں کو خواستہ ناخواستہ گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تصور مخلوط اور مروج وقت کا ہے۔خالص وقت کوئی طول نہیں رکھتا۔شخصی لافانیت ایک آرزو ہے۔کوشش سے اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اس زندگی میں خیال وعمل کے وہ طریقے استعمال کریں۔جو اطناب کی حالت کو قائم کرنے میں معین ہوں۔ بودھ مذہب، عجمی تصوف اور اس قبیل کے دوسرے نظاماتِ اخلاقی یہ غرض پوری کرنے سے قاصر ہیں۔لیکن یہ کلیۃً بے کار بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک مدت دراز سعی وعمل کے بعد کچھ دیر کے لیے خواب آور دواؤں کی حاجت پڑ ہی جاتی ہے۔اس قسم کے اعمال و افکار گویا ایّام زندگی کی راتیں ہیں۔ پس اگر ہمارے اعمال اطناب کی حالت کو قائم کرنے کے لیے ہوں۔تو اغلب یہ ہے کہ موت سے بھی اس کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔مرنے کے بعد استرخا کا جز زمانہ ہے۔صرف وہی ''انا'' باقی رہیں گے جو موجودہ زندگی میں بہت محتاط رہے ہوں۔اگر چہ ارتقاء حیات میں تکرار و اعادہ کا گزر نہیں تاہم بقول ولڈن کار، برگسان کے اصول کے مطابق، حشر اجساد بھی بالکل ممکن ہے۔ وقت کو لمحوں میں تقسیم کر کے ہم اس میں مکان کا مفہوم پیدا کر دیتے ہیں اور اس کی پھر تسخیر مشکل معلوم ہوتی ہے۔ وقت کی حقیقی نوعیت اس وقت معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم اپنے عمیق تر خودی پر غائر نظر ڈالتے ہیں۔حقیقی وقت خود زندگی ہے۔ جو بقاء دوام حاصل کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس حالت اطناب کو قائم رکھے جس نے اس کو تا ایں دم قائم رکھا ہے۔ہم وقت کے محکوم اس وقت بنتے ہیں جب تک وقت کو ایک مکانی چیز سمجھتے ہیں۔ مکانی وقف ایک زنجیر پا ہے۔جس کو زندگی نے اپنے لیے اس واسطے اختراع کر لیا ہے کہ موجودہ ماحول کو جذب کر سکے۔حقیقتاً ہم وقت کی پابندی سے آزاد ہیں۔اور وقت سے بے قیدی کا احساس ہم کو اس زندگی میں بھی ہوسکتا ہے البتہ یہ احساس بالمکاشفہ عارضی ہوگا۔

خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔ یہ لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔اس سے مراد خواہش جذب و تسخیر ہے۔ اس کی اعلیٰ ترین شکل تخلیق قُدور و مقاصد اور ان کے حصول کی سعی ہے۔عشق عاشق اور معشوق دونوں کو منفرد کر دیتا ہے۔خدا کی بے مثل و یکتا ترین ذات کے حصول کی کوشش، طاقت کو مشخّص (منفرد) بناتی ہے۔اور ضمناً یہ مفہوم مطلوب کی فردیت پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ کوئی چیز طالب کی فطرت کو تسکین نہیں دے سکتی۔

سوال، یعنی فقدان عمل:

جس طرح خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے اس طرح سوال سے وہ ضعیف ہوتی ہے۔ ہر وہ شے جو بغیر ذاتی کوشش کے حاصل ہو، سوال ہے۔ ایک دولت مند کا لڑکا جو دولت ورثہ میں حاصل کرتا ہے وہ بھی سائل ہے۔اسی طرح وہ شخص بھی جو دوسرے کے خیالات کو اپنے خیالات بناتا ہے۔پس خودی کو مستحکم کرنے کے لیے ہم کو چاہیے کہ عشق (عملِ جاذبہ کی قوت) پیدا کریں اور ہر

1273 قسم کے سوال یا فقدانِ عمل سے بچیں۔ رسول ﷺ کی زندگی سے تو ہر ایک کو مکمل جاذبہ کا سبق مل ہی سکتا ہے۔ خود کو یکتا و بے مثل بنانے کے لیے تین مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔

1- اطاعتِ قانون 2۔ ضبطِ نفس جو احساس نفس و خودی کا آخری مرتبہ ہے، 3- نیابت الٰہی۔

مقام محمدی ﷺ، خلافت و نیابت:

نیابت الٰہی اس دنیا میں ارتقاء انسانی کی تیسری اور آخری منزل ہے۔ نائب حق خلفیۃ الارض ہے یہ کامل ترین انا ہے۔ جو بنی نوع انسان کا نصب العین اور زندگی کی جسمانی و روحانی معراج ہے۔ اس میں ہماری حیاتِ نفس کے تمام انتشارات ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ اعلیٰ ترین قوتِ عمل، اس میں اعلیٰ ترین علم سے ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں خیال و عمل اور عقل و جبلت ایک ہوتے ہیں۔ وہ نسل انسانی کا ثمر آخر بھی ہے اور ارتقاءِ حیات کی تمام صعوبتیں اور تلخیاں اس لیے گوارا ہوسکتی ہیں کہ ان کا آخری انجام اس کی شکل میں ظاہر ہونے والا ہے۔ بنی نوع انسان کا وہ حقیقی حکمران ہے۔

اس کی حکومت اللہ کی حکومت فی الارض ہے۔ وہ فطرت کے خزانے سے دوسروں کو زندگی کی دولت عطا کرتا ہے۔ اور اپنے قریب تر لاتا جارہا ہے۔ جس قدر ہم منازل ارتقا طے کرتے جاتے ہیں اس قدر اس کے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ اس کے تقرب سے میزانِ حیات میں اپنے آپ کو بلند کرتے جارہے ہیں۔ نوع انسانی کا ذہنی اور جسمانی دونوں حیثیتوں سے ترقی یافتہ ہونا اس کی آمد کا ایک لازمی مقدمہ ہے۔ ارتقاء انسانی ایک آئیڈیل قوم کے وجود میں آنے کی خبر دے رہی ہے جس کے افراد کم و بیشتر ایسے بے مثل و یکتا ہوں گے جن میں اس کے نائب حق کے والدین ہونے کی صلاحیت ہوگی۔ پس ''حکومتُ اللہ علی الارض'' سے مراد وہ جمہوریت ہوگی جس کے افراد کم و بیشتر یکتا ہوں گے اور جس کا صدر وہ یکتا ترین فرد ہوگا۔ جس کا امکان اس دنیا میں ہوسکتا ہے۔ نیٹشے کو اس آئیڈیل قوم کی ایک جھلک نظر آئی۔ مگر اس کی دہریت اور امارت پسندی نے اس کے سارے فلسفہ کو مسخ کردیا۔

فلسفۂ خودی پر اعتراضات کا جواب علامہ اقبال کی طرف سے:

جب پروفیسر نکلسن نے مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو مسٹر ڈکنسن نے فلسفۂ خودی پر کچھ اعتراضات کیے۔ علامہ اقبال نے ان اعتراضات کا جواب ایک خط کی صورت میں دیا جو نکلسن کو لکھا گیا تھا۔ یہ تشریحات ان کے تصورِ خودی سے متعلق بہت سے اہم گوشوں کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ ہے ترجمہ اس خط کا جس کو چراغ حسن حسرت نے ترجمہ کیا تھا۔

محترمی ڈاکٹر نکلسن!:

شفیع کے نام آپ نے جو مکتوب تحریر فرمایا ہے اس سے معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی کہ اسرارِ خودی کا ترجمہ انگلستان میں قبولِ عام حاصل کررہا ہے۔ بعض انگریزی تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نیٹشے کے خیالات میں پایا جاتا

1273 ہے، دھوکہ کھایا ہے اور غلط راہ پر چلے گئے ہیں۔ ''دی اینتھم'' والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ وہ کافی حد تک غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحبِ مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ اس نے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے اگر اسے اُن کی صحیح تاریخِ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشوو ارتقاء کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا۔

وہ انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خلطِ مبحث کر کے میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے بیس سال قبل، انسانِ کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب تو نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا اور نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔ یہ مضمون انڈین ''انٹی کیوری'' میں شائع ہوا۔ اور جب 1908ء میں میں نے ایرانی الٰہیّات پر ایک کتاب لکھی تو اس مضمون کو اس میں شامل کر لیا گیا۔ انگریزوں کو چاہیے کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لیے جرمن مفکر کی بجائے اپنے ہم وطن فلسفی یعنی الیگزانڈر کے افکار کو رہنما بنائیں۔ جس کے گلاسکو والے خطابات پچھلے سال شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا باب ''خدا اور الوہیّت'' وہ پڑھنے کے قابل ہے۔

''گویا انسانی ذہن کے نزدیک الوہیت دوسری اعلیٰ تجربی قوت ہے۔ جسے کائنات عالمِ وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ قیاس واجتہاد کی رہنمائی سے ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ بطنِ گیتی میں اس قسم کی قوت موجود ہے۔ لیکن اس قوت کے متعلق نہ تو ہم جانتے ہیں اور نہ اسے محسوس کر سکتے ہیں اور نہ ہمارا ذہن اس کے تصور پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نامعلوم خدا کے لیے قربان گاہیں تعمیر کر رہا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے؟ اس کا احساس کیسے ہوتا ہے؟ اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں۔

الیگزانڈر کے خیالات میرے عقائد کی نسبت زیادہ جسارت آمیز ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری وساری ہے۔ لیکن میں الیگزنڈر کی طرح یہ نہیں مانتا کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ گر ہوگی۔ جو وقت کے تابع ہوگا۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اعلیٰ واکمل انسان کے پیکر میں ظاہر ہوگی۔ خدا کے متعلق میرا عقیدہ الیگزانڈر سے مختلف ہے۔ لیکن اگر انگریز ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کر کے انسان کامل کے تخیل پر اپنے ایک ہم وطن کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں تو ان کو یہ عقیدہ اس قدر اجنبی نہیں معلوم ہوگا۔

مجھے ڈکسن کی تنقید بدرجۂ غایت دل چسپ معلوم ہوتی ہے۔ مناسب ہے کہ اس کے متعلق چند باتیں کروں۔ مسٹر ڈکنسن کے مطابق میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے آمال قرار دیا ہے۔ انہوں نے مجھے مکتوب کے ذریعہ بات بتائی ہے۔ یہ غلط فہمی ہے ان کی کہ میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت کا قائل نہیں ہوں۔

1273
جب ایک قوم کو حق وصداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جس کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔ مسٹر ڈکنسن نے صحیح فرمایا ہے کہ جنگ خواہ حق وصداقت کی حمایت میں ہو یا خواہ وہ ملک گیری یا فتح مندی کی خاطر، تباہی اور بربادی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لیے اس کے استیصال کی سعی کرنی چاہیے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاہدے لیگیں اور کانفرنسیں استیصالِ حرب نہیں کرسکتیں۔ کامیابی کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مللِ مستعمر جن ملتوں کو تمدن وتہذیب میں اپنا ہمسر نہیں سمجھیں۔ ان کو اپنے جور وتعدی کا تختہ مشق بنانے کے لیے زیادہ پرامن وسائل اختیار کریں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے معاشرتی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھائے۔ ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے اور بین الملی اخلاق کی بنیاد مستحکم اور استوار کردے۔ پروفیسر میکنزی کی کتاب ''انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی'' کے یہ دو آخری پیراگراف کس قدر صحیح ہیں۔ بس انہیں لفظ بہ لفظ نقل کر دیتا ہوں۔

''کامل انسان کے بغیر سوسائٹی معراج کمال پر نہیں پہنچ سکتی اور اس غرض کے لیے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں۔ بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ معماحل کرنے کے لیے ہم نور وحرارت دونوں کے محتاج ہیں۔ غالباً عہد حاضرہ کے معاشرتی مسائل کا فلسفیانہ فہم وادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں۔ ہمیں معلم بھی چاہیے اور پیغمبر بھی۔ ہمیں آج اسکن۔ کارلائل یا ٹالسٹائی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو ضمیر کو زیادہ مشدد اور سخت گیر بنانے اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غالباً ہمیں ایک مسیح کی ضرورت ہے۔ یہ قول صحیح ہے کہ عہد حاضر کے پیغمبر کو محض بیاباں کی صدا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ عہدہ حاضرہ کے بیابان آباد شہروں کے گلی کوچے ہیں۔ جہاں ترقی کا بازار مسلسل گرم ہے۔ اس عہد کے پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی ہنگامہ زار میں تبلیغ کا بازار مسلسل گرم رکھے۔ اس عہد کے پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی ہنگامہ زار میں تبلیغ کرے۔ غالباً ہمیں پیغمبر سے زیادہ عہدِ نو کے شاعر کی ضرورت ہے۔ یا ایک ایسے شخص کا وجود مفید ہوگا۔ جو شاعری اور پیغمبری کی دوگونہ صفات سے متصف ہو۔ عہد ماضی کے شعراء نے ہمیں فطرت سے محبت کی تعلیم دی۔ انہوں نے ہمیں اس قدر ژرف نگاہ بنادیا ہے کہ ہم مظاہر فطرت میں انوار ربانی کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی ایک ایسے شاعر کے منتظر ہیں۔ جو ہمیں اس وضاحت کے ساتھ پیکر انسانی میں صفاتِ الٰہی کے جلوے دکھادے۔ ہائنے نے ازراہ تفنن اپنے آپ کو ''روح القدس'' کا سپاہی کہا تھا۔ ہمیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہو جو درحقیقت روح القدس کا سپاہی ہو۔ جو اسی حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے کہ ہمارے بلند ترین نصب العین روزمرہ کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں۔ اگر اس زندگی کو ترقی دینے کی سعی کی جائے تو ہمیں محض راہبانہ ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقعہ نہیں ملے گا۔ بلکہ ایسا اعلیٰ وارفع مقصد حاصل ہوجائے گا۔ جو تمام خیالات، تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو ترقی کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے۔''

انگریزوں کو چاہیے کہ اس نوع کے خیالات کی روشنی میں انسانِ کامل کے متعلق میرے افکار کا مطالعہ کریں۔ ہمارے عہد نامے اور پنچایتیں جنگ و پیکار کو صفحۂ ہستی سے نہیں مٹاسکتیں۔ کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کرسکتی ہے اور اس شعر

میں میں نے اس کو مخاطب کیا ہے۔

باز در عالم بیار ایامِ صلح جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے ''فلسفۂ سخت کوشی'' کا ذکر کیا ہے۔ میرے عقیدے میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے۔ جو تصادم کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کر کے ''کُل'' کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں اور یہ تصادم لامحالہ ان کی شیرازہ بندی اور ارتباط پر منتج ہوگا۔ دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے علو و ارتقاء کے لیے تصادم نہایت ضروری ہے۔ نیٹشے بقائے شخص کا منکر ہے۔ جو شخصی حصول بقا کے آرزومند ہیں تو وہ ان سے کہتا ہے کہ کیا تم ہمیشہ کے لیے زمانہ کا پشت بنے رہنا چاہتے ہو۔ اس کے علم سے یہ الفاظ اس لیے نکلے ہیں کہ زمانے کے متعلق اس کا تصور غلط تھا۔ اس نے کبھی مسئلہ زماں کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بخلاف اس کے میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور متاع گراں مایہ ہے جس کے حصول پر وہ اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے۔ ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سے تو انسان کو استحکام و استقلال ملتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو، جس کا دائرۂ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو۔ مردود قرار دیا ہے۔ تصادم سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری ہے۔ حالانکہ اس باب میں نیٹشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے۔ جدید طبقات کی رو سے مادی قوت کے جزولاتجزیٰ نے ہزار ہا سال تک ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ پھر بھی وہ فانی ہے اسے مٹایا جا سکتا ہے۔ قوت ذہن یعنی جسم انسانی کے ذرّہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ صدہا برس کی مسلسل جدوجہد اور تصادم کے بعد وہ موجودہ صورت تک پہنچا ہے۔ پھر بھی عوارضِ ذہنی کے مظاہر مختلفہ سے اس کی بے ثباتی اور عدم استحکام ظاہر ہے۔ اگر وہ بدستور قائم اور باقی رہنا چاہتا ہے تو یقیناً وہ ماضی کے درس عبرت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اسے لامحالہ ان قوتوں سے قیام کی خاطر استمداد کرنی پڑے گی۔ جو آج تک اس کے استحکام کی ضامن رہی ہیں۔ ممکن ہے فطرت کا ارتقا ان قوتوں میں اصلاح کر دے یا مٹا دے۔ اور اس کے استحکام و بقا کے لیے ایسی قوتیں عرصۂ شہود میں لے آئے۔ جن سے انسان آج تک نا آشنا رہا ہے۔ میرے نزدیک اس نوع کے انقلاب کا زمانہ ابھی بہت دور ہے۔ میں نے محض اخلاقی زاویۂ نگاہ سے تصادم کو ضروری قرار دیا ہے۔ افسوس کہ ڈکنسن نے سخت کوشش کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔

آگے مسٹر ڈکنسن نے کہا ہے کہ میرا فلسفہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر لیکن باعتبار اطلاق و انطباق، مخصوص و محدود، ایک حیثیت سے یہ بات درست ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر و فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اسے اگر موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطبِ اوّل نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے۔ جو ایک مستقل عقیدہ اور متعین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونہ اور تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے اور وہ سوسائٹی اسلام ہے۔ اسلام رنگ و نسل کا جو انسان کے نصب العین میں سب سے بڑا

1273

سنگ گراں ہے۔نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔انسان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ ونسل کا عقیدہ ہے اور جولوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں۔ان کا فرض ہے۔ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علَم جہاد بلند کریں۔بدقسمتی یہ ہے یہ قومیت کا عقیدہ دنیائے اسلام میں استیلاء پا رہا ہے اور مسلماں عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں۔جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔حالانکہ ان کو سارے بنی نوع انسان کی نشوونما کی تعلیم دی گئی ہے۔نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم، حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک عارضی اور وقتی پہلو ہے۔اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو قابل اعتراض نہیں۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے محبت ہے لیکن ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔دراصل عملی حیثیت سے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔کیونکہ تنہا یہی قوم میرے مقاصد کے لیے موزوں واقع ہوئی ہے۔مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی خاص گروہ سے مختص ہے۔اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطعِ نظر کر لیتا ہے: تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (3:64) ڈکنسن کا ذہن یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خونریزی کا درس دیتا ہے۔خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ سارے انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔بشرطیکہ وہ نسل و قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں۔اور ایک دوسرے کی شخصیت کو تسلیم کر لیں۔انجمن، عہد نامے جس کا ذکر مسٹر ڈکنسن نے کیا ہے۔ملوکیت خواہ جمہوری لبادہ میں کیوں نہ ہو۔انسان کو فوز و فلاح سے آشنا نہیں کر سکتی۔انسانی فلاح تو مساوات اور حریت میں پنہاں ہے۔ضرورت اسی امر کی ہے کہ سائنس کا محل استعمال قطعی طور پر بدل دیا جائے۔ان خفیہ سیاسی منصوبوں سے احتراز جن کا مقصد کمزور و زبوں حال اقوام یا جو حیلہ گری یا عیاری میں چنداں مہارت نہیں رکھتیں۔صفحۂ ہستی سے نابود کر دی جائیں۔اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی دوسری اقوام کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں۔انہوں نے بھی فتوحات کیں۔یہ بھی اعتراف ہے کہ ان کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے کہ اسلام نے کشور کشائی اور ملک گیری سے منع کیا ہے جہاں بھی کشور کشائی میں کامیابی ہوئی وہ اس کے بلند مقاصد کے لیے مُضر ثابت ہوئی اس طرح وہ اقتصادی اور جمہوری اصول نشوونما نہ پا سکے جو ان کا بڑا مقصود تھا۔اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی مگر ساتھ ہی ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا۔اور اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں کہ اسلامی اصولوں کی گیرائی کا دائرہ کس طرح وسیع ہے۔

اسلام کا مقصد یقیناً یہ ہے کہ دوسری اقوام کی جداگانہ حیثیت مٹا ڈالے اور ان کو اپنے اندر جذب کر لے بلکہ اسلام کی سیدھی سادی سی تعلیم جو الٰہیات کے پیچیدہ مسائل سے پاک اور عقل انسانی کے عین مطابق واقع ہوئی ہے۔اس عقدہ کی گرہ کشائی کر سکتی

1273
ہے۔اسلام میں ایسے اوصاف پنہاں ہیں۔جن کی بدولت وہ کامیابی کے بامِ بلند پر پہنچ سکتا ہے۔چین کو دیکھیے کہ کس طرح سیاسی قوت کی پشت پناہی کے بغیر اسلام کے تبلیغی مشن نے غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی۔اور لاکھوں انسان فوج در فوج اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔

میں بیس سال سے دنیا کے افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں تو مجھے وہ صلاحیت مل گئی ہے کہ میں حالات وواقعات پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے غور کر سکوں۔

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوت وطلب تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے۔اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے۔جس کا مقصد وحید ذات پات رتبہ ودرجہ، رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔

اسلامی دنیوی معاملات میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے۔پھر انسان میں بے نفس اور دنیوی لذائذ ونعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور حسنِ معاملات کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اس قسم کا رویہ اختیار کیا جائے۔یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے۔اور یہ متاع اسے ہمارے ہی صحبتِ فیض سے حاصل ہو سکتی ہے۔

میں اسرار خودی کے دیباچہ میں مغربی مفکرین کے افکار کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے تاکہ انگلستان کے لوگ میری بات بہ آسانی سمجھ لیں۔ورنہ قرآن کریم، صوفیا اور مسلمان فلاسفہ کے افکار سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔میرا یہ دعویٰ ہے کہ ''اسرار'' کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور فلاسفہ کے افکار ومشاہدات سے ماخوذ ہے۔اور تو اور ''وقت'' کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لیے نئی چیز نہیں۔

قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسانی معاش ومعاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات کے مسائل سے ہے۔عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے۔جن کا مبتدا اور سرچشمہ قرآن ہے۔تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے۔بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ اہل مغرب اسلامی فلسفہ سے ناآشنائے محض ہیں۔اے کاش! مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلاسفہ کو اس حقیقت سے روشناس کرا دیتا کہ مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات کس قدر ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔

❀❀❀

ڈاکٹر صاحب کی مثنوی میں افلاطون اور خواجہ حافظ کو بز و گوسفند لکھا

راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گو سفندے در لباسِ آدم است — حکم اُو بر جانِ صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ اُو وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجودِ گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
کارِ اُو تحلیل اجزائے حیات — قطعِ شاخِ سرو رعنائے حیات

خواجہ حافظ شیرازی کے بارے:

ہوشیار از حافظِ صہبا گُسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
(گسار دن سے فعل امر گسار۔ پی)
نیست غیر از بادہ در بازارِ اُو — از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
آں فقیہِ ملتِ مےخوارگان — آں امامِ ملتِ بےچارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است — عِشوہ و ناز و ادا آموخت است
دل ربائی ہائے او زہراست وبس — چشمِ او غارتِ گرِ شہر است و بس
اُو بُزِ یونانِ زمیں زیرک تراست — پردۂ عَودش حجابِ اکبر است
(عود۔ واپس)
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن دارد حشیش

1273

محفلِ او در خورِ ابرار نیست　　ساغر اُو قابلِ احرار نیست
(درخورِ۔قابل)
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر　　الحذر از گو سفنداں الحذر

خواجہ حافظ کے کلام کے متعلق اس قسم کی آراء پہلے سے بھی چل آتی ہیں۔علامہ اقبال اس کے اول ناقد نہیں ہیں۔ اورنگزیب عالمگیر نے بھی عام منادی کی تھی۔کہ دیوان حافظ کو کوئی نہ پڑھے۔مولانا حالی نے حیات سعدی میں لکھا کہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس میں سب سے زیادہ گائی جاتی ہیں۔اس کا کلام عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی،صورت پرستی اور کام جوئی کو دین و دنیا سے افضل بتاتی ہے۔یہ عقل وتدبر مآل اندیشی،ننگ و ناموس، جاہ ومنصب کی مذمت کرتی ہے۔رسوائی اور بدنامی کوعشق کی بدولت جو حاصل ہوتمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہےتوکل وقناعت کے نشہ میں ہستی کو مٹا دینا۔جو ہرانسانیت کو خاک میں ملا دیتا۔دنیا و مافیہا کے زوال وفنا کا تصور دینا حقائق اشیاء پر غور وفکر نہ کرنا،کفایت شعاری اور انتظام کا دشمن رہنا۔ایسے مضامین توتباہی اور بربادی کا سامان ہیں نوجوان نسل کے لیے۔شاعر کی فصاحت وبلاغت اور کلام کا آسان ہونا توسحر انگیز بن کرنسلوں کوتباہ کر دیتا ہے۔

ایک آدمی کا دعوی تھا کہ یہ حافظ آتش پرست تھے۔حالی نے اس لیے لکھا:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر　　عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر　　فلک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں تاراج سارا　　وہ ہے ہف نظرِ علمِ انشا ہمارا

اصل مرکز بحث یہ ہے کہ علامہ صاحب کے مطابق اسلام ایک حقیقی متحرک پیغام عمل ہے۔مسلمانوں کے جمود کی وجہ بیرونی عنصر کا رنگ آکر غالب ہوگیا ہے اور وہ تصوف ہےتصوف نفس کشی سکھاتا ہے جبکہ اسلام اصلاحِ نفس کا خواہاں ہے۔ اس نفس کشی نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو باطل کر دیا ہے۔اوراس زہر کا اثر سارے ادبیات پر ہوگیا ہےجس کا اثر قوم کے جذبات اورقوائے نفسانیہ پر ہوا ہے۔نفی،خودی کا مسئلہ مغلوب قوموں کی ایجاد ہے۔تاکہ بھیڑوں کی تعلیم شیروں کو دے کرمخفی طور پر غالب قوم کو کمزور کر دیا جائے۔یونان میں فلسفۂ اشراق اورایران میں تصوف پھیلا ڈاکٹر صاحب کے بقول:

1۔تصوف رہبانیت کی پیداوار ہے۔

2۔اسلام تصوف کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔

3۔تصوف نے قرمطی تحریک سے فائدہ اٹھایا ہے۔

4۔تصوف قیودِشرعی کوفنا کرنے کا نام ہے۔علامہ صاحب کے بقول میرے آباؤاجداد کا مشرب تصوف تھا اورخود میرا

1273 میلان بھی تصوف کی طرف تھا۔ فلسفہ یورپ پڑھنے کے بعد اسلامی تصوف کی صداقت میرے دل میں مضبوط ہوگئی تھی۔ کیونکہ فلسفہ یورپ بحیثیت مجموعی منجرّ بہ تصوف تھا۔ قرآن پر تدبر اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ میں شدید غلط فہمی کا شکار تھا۔ فلسفۂ یورپ اور تصوف بھی غلط ثابت ہوا۔ اس واسطے میں نے اسے ترک کر دیا۔ تصوف کا مسئلہ عینیت ''افلاطون کے مسئلہ'' اعیان سے بھی زیادہ عجیب وغریب ہے ''ہمہ اوست'' کے نظریہ نے ایک ایسی ہمہ گیر عینیت کی بنیاد ڈالی کہ ہر ذرہ عین آفتاب ہوگیا۔ خالق اور مخلوق متحد ہوگئے۔ چند امثال:

''اَنَا الْحَقُّ۔ سُبْحَانِیْ مَآ اَعْظَمُ شَانِیْ'' سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَشْیَآءَ وَھُوَ عَیْنُھَا۔ خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ۔ خود برسر بازار خریدار برآمد۔ فرعون اور موسیٰ کے امتیازات بھی مٹ گئے۔

ان حالات میں اسلام کا عین تصوف اور تصوف کا عین اسلام ہونا کیا حیرت انگیز ہے؟ یہ جنگ بدستور جاری ہے۔ جب کوئی شخص علمی تحقیقات سے صحیح بات پیش کرتا ہے تو اسے دشمن اسلام قرار دے کر کافر کر دیا جاتا ہے۔ عقیدہ وہی صحیح ہے جس کی بنیاد علم یقین پر ہو۔ سرچشمہ اسلام یعنی قرآن وحدیث، تصوف کے لفظ تک سے ناآشنا ہیں۔ یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ کوئی مستشرق کہتا ہے کہ ابتداء میں جو اہل زاہد تارک الدّنیا اور گوشہ گیر ہو کر عبادت وریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کو لوگ صوفی سے پکارتے تھے۔ اس زمانہ میں تصوف اخلاص کا نام تھا۔ جس کو حدیث احسان کہتی ہے۔ یہی وہ تصوف ہے جس کی مدح سرائی غزالی وغیرہ نے کی ہے۔

تاتاریوں کے حملوں کے بعد اُمت کے فاتحانہ جذبات مٹ گئے۔ حوصلے پست اور ہمتیں ختم تو میلانِ خاطر زہد اور ترک دنیا کی طرف بڑھ گیا۔ بوریائے فقیر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز سمجھا گیا۔ شریعت اور طریقت دو جداگانہ راستے قرار پائے۔ ان میں پوست اور مغز کی تفریق کی گئی۔ علماء وفقہا بے بصر قرار دیدیئے گئے۔ اور پھر شاعری نے تو پھر ساری قوم میں یہ زہر گھول دیا۔

شوکت اسلام کے زوال کے اسباب تو پہلی صدی ہجری سے شروع ہوگئے تھے۔ جمہوریت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ پوری قوم غلام ہوگئی۔ مسلمان بے گناہ قتل کر دیئے جاتے تھے۔ آئمہ اور علماء بیشتر زیر عتاب یا زیر زنجیر یا قتل کر دیئے جاتے تھے اور حق گو زبانیں جبر وخوف سے بند کر دی گئیں۔ اس طرح سے یہ معاشرہ حریت سے محروم کر دیا گیا۔ حریت فکر اور حریت عمل سلب ہوگئے۔ اتنا سخت شکنجہ کہ ایک زمانہ میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اہل علم اس خوف سے کہ کہیں کوئی دشمن ان پر تہمت لگا کر قتل نہ کرادے اپنے صحتِ عقیدہ کی سند قاضی سے لے کر ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ اس میں تو اصلی اسلام مزید ملاوٹ زدہ ہوگیا۔

رموز بے خودی میں موجودہ اسلام کے بارے میں لکھا ہے۔

مسلم از سرِّ نبی بے گانہ شد   باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
از منات و لات و عزیٰ و ہبل   ہر یکے دارد بتے اندر بغل
شیخِ ما از برہمن کافر تر است   زانکہ اور راسو منات اندر سراست
رختِ ہستی از عرب برچیدہٗ   در خمستانِ عجم خوابیدہٗ
شل ز برفافِ عجم اعضائے او   سرد تر از اشکِ اُو صہبائے او
ہم چو کافر از اجل ترسندہٗ   سینہ اش فارغ ز قلبِ زندہٗ

حالانکہ قرآن میں نصِ قطعی موجود ہے۔

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ (4:141)

اس سے محروم کیوں ہو گئے۔اس کا جواب قرآن دیتا ہے۔

اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ (25:30)

گر تومی خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن
صوفی پشمینہ پوشِ حال مست   از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش   در نمی سازد بقرآں محفلش

❁❁❁

خودی کا مفہوم

اقبال کے مطالعہ میں یہ بات یاد رکھیں کہ ان کی شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کلام اقبال کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معنی سمجھ میں نہ آئیں اقبال کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آ سکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز یا درویش، قلندر، مردِ حُر یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن جو اصطلاح فکرِ اقبال کا محور ہے وہ ''خودی'' ہے۔ اقبال سے پہلے یہ لفظ غرور اور تکبر کے معنوں میں مستعمل تھا۔ لیکن اقبال نے اسے بالکل جداگانہ معنی پہنا دیئے۔ یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس کے قدیمی معانی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے۔ جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آ جائے تو اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ سوال یہ ہے کہ ''کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت، یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریب تخیل؟'' دنیا کی ہر قوم کے مفکرین اس مشکل سوال کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ افلاطون اور اس کے اتباع میں حکمائے ایران اور ہند اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلی کا وجود ہے۔ اس لیے انسانی ذات یا انا محض فریب ہے۔ یہ فریب عمل کے زور پر قائم ہے۔ اور عمل کی بنیاد پر ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کردے۔ اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلّی کے بحر میں گم ہو جائے۔ اس فنائے ذات کا نام نجات ہے۔ اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی فلسفۂ حیات ہمارے ہاں ''وحدت الوجود'' کے نام سے رائج ہوا۔ جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن قوم کو خاک کے آغوش میں سلا دیا۔ اقبال نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا جس کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے۔ اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے۔ جس سے انسانیت کی انفرادیت یا شخصیت متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے جوں جوں انسان اس فرد کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے۔ جس کو انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں۔ وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ ''خدا کے مانند'' ہونے سے مراد کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس اور اس طرح انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ

1273 قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی، موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہوجاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہوجاتی ہے۔ بنابریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام ہو، خیر ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہوجائے، شر ہے۔

ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ تخلیق مقاصد یا تولید آرزو ہے۔ آرزو عین حیات اصل قوت ہے۔ کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔ (یعنی دعا) اس لیے قرآن میں اجتماعی دعاؤں کا ذکر ہے۔ دوسرا مرحلہ حصولِ مقصد کے لیے جہد مسلسل ہے۔ اس تپش و خلش کا نام عشق ہے۔ اس جدوجہد کی کامیابی کے لیے تین شرائط ناگزیر ہیں۔

اول اطاعت:

اطاعت سے مراد قرآن کی کامل اطاعت جس کے لیے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اور معاشرہ کے بغیر یہ ناممکن ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبط نفس پیدا ہوجاتا ہے۔

دوسری شرط:

ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں بلکہ امالہ یا کظامت (زائد قوتوں کا رخ دوسری طرف بدل دینا) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے۔ جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیر فکر و عمل اور تہذیب نفس سے انسان نیابت الٰہیہ کا حق دار ہوجاتا ہے۔ اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے مراد وہ قوت مجریہ جو دنیا میں قوانین خداوندی کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے۔ (نیابت الٰہی سے یہ مراد نہیں کہ انسان خدا کا قائم مقام اور جانشین بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو) یہ مقامِ مومن ہے جو استحکام خودی کا آخری نقطہ ہے اس مقام پر پہنچ کر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی اس کیفیت کو ''فقر، درویش یا قلندری'' کہا گیا ہے۔ یعنی سب کچھ مسخر کرنے کے بعد وہ استغنا جو اللہ کی صفت صمدیت اور ''غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ'' کا مظہر ہو ان افراد پر مشتمل جماعت کا نام امت مسلمہ ہے۔ قرآن کا مقصود یہی امت تھی۔

میانِ اُمّتاں والا مقام است — کہ آں امّت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کار آفرینش — کہ خواب و خستگی بُرَوے حرام است

اور

باغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرہ بازے زودِ گیرے
امیرِ او باسلطانی فقیرے — فقیرِ اُو بہ درویشی امیرے

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143)

اسرارِ خودی

خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

یہ آدم جس کی تلاش ہے۔ ہنوز آب وگل میں ہے۔

یکے در معنی آدم نگر! از من چہ می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پرخوں شود روزے
مہ وستارہ سے آگے مقام ہے جس کا وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

اقبال کواس آدم کے ملنے کا قوی یقین ہے۔ پیامِ مشرق کے دیباچہ میں فرمایا: ''فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے اپنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کررہی ہے'' حقیقت یہ ہے کہ زمانے کے تقاضے بھی اس طرح کشاں کشاں دنیا کو قرآنی حقائق سے قریب تر لاتے جارہے ہیں کہ کچھ بعید نہیں کہ وہ معاشرہ جسے ابنِ آدم کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے سازگار بننا ہے۔ جلد ہی وجود میں آجائے۔ اور زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ اَسرارِ خودی کے تمہید کے سرعنوان نظیری کا یہ شعر ہے:

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود، دار کنم

کائنات میں تو نہ کوئی شے شر ہے اور نہ باطل۔ اشیائے کائنات کسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ یہ ان کا استعمال ہے جو ان کو خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ اگر یہ کائناتی قوتیں اور اسبابِ فرد کے استحکامِ خودی یا نوعِ انسان کی ربوبیت عامہ کے لیے استعمال کی جائیں تو یہ خیر میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ اگر ان کا نتیجہ ضعفِ خودی یا ابنِ آدم کی سامانِ پرورش سے محرومی ہوجائے تو یہی شر بن جاتی ہیں۔ لہٰذا اشیائے کائنات تو خام مسالہ ہیں۔ جسے ہم اپنے پروگرام کے لیے جس طرح جی چاہے استعمال کریں۔ یہی صورت افراد کی بھی ہے۔ جس انسان میں جس قسم کی صلاحیت کی فراوانی ہے۔ اسے اپنی صلاحیت کو اس قسم کے کام میں صرف کرنا چاہیے۔ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ صلاحیت کو اپنی ذات کی پختگی اور ربوبیت عامہ کا موجب بنے۔ اس طرح کائنات کے حسن میں تعمیری اضافے کرتی چلی جائے۔ یہ ہے وہ تلقین جو علامہ جوانوں کو دیتے ہیں۔

آفریدند اگر شبنمِ بے مایہ ترا خیز و برداغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
(چکیدن۔ قطرہ قطرہ ٹپکنا)

اگرت خارِ گلِ تازہ رسے ساختہ اند ترا — پاس ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابان تو برکند تُرا — صفتِ سبزہ دِگر بارِ دمیدن آموز

(رسے، رسیدن سے پہنچا۔ برکند، کاٹنا)

دنیائے مذاہب اور تصوف صرف ایک قسم کی صفات، عاجزی، درماندگی، پیار و محبت، جو صفات ان کے خلاف ہو۔ وہ ان کو دباتا اور فنا کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا خدا متضاد صفات کا حامل ہے۔ رؤف و رحیم کے ساتھ ساتھ جبار و قہار بھی ہے۔ اور یہ تمام صفات حسن و توازن کے ساتھ اور ان کا ظہور صرف خیر کے لیے ہوتا ہے۔ تضاد میں اس قسم کا کامل توافق یہ ہے مفہوم ''اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى'' (7:180) کا اور مومن اپنے اندر اپنی صفات کو (علیٰ قدر بشریت) اجاگر کرتا جاتا ہے۔ اس لیے وہ کسی خاص ٹائپ کی صفات کا حامل نہیں ہوتا بلکہ ان تمام متضاد صفات کا مجموعی پیکر ہوتا ہے۔ اگر ان صفات میں حسین تناسب نہ رہے تو نتیجہ شر اور فساد رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر ان میں پورا پورا اعتدال و تناسب رہے تو یہ کائنات میں خیر اور صلح کا مظہر بن جاتی ہیں دیکھنا یہ ہے کہ کس مقام پر کس قسم کی صفت کا ظہور رہنا چاہیے۔ اور یہ رہنمائی صرف قرآن نے دی ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (48:29)

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اس لیے اقبال نے مثنوی کی تمہید نظیری کے شعر سے کی ہے۔

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی — چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

اسلام میں منبر اور دار کا اپنا اپنا مقام ہے۔ اور اپنی اپنی ضرورت اور مصلحت۔ بغیر دار کے منبر محض واعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ منبر اور دار دونوں کا مجموعہ اسلام ہے۔

ایں دو قوّت حافظ یک دیگراند — کائناتِ زندگی را محور اند

مثنوی کے ابتدائی دو اشعار:

راہِ شب چوں مہرِ عالمتاب زد — گریۂ من بر رُخِ گلِ آب زد
اشک من از چشمِ نرگس خواب شست — سبزہ از ہنگامہ‌ام بیدار رست

''جب مہر عالم تاب نے رات کی تاریکیوں پر چھاپا مارا۔ صبح ہوئی تو میرے آنسوؤں نے پھولوں کا منہ دھلایا۔ اور نرگس کی آنکھ سے خواب کو دور کیا اور میرے نالہ کے ہنگامہ سے سبزۂ خوابیدہ بیدار ہو گیا۔''

اقبال کو اپنے مقام اور پیام سے ابتداء ہی سے آگہی تھی۔ کیونکہ یہ مثنوی اسرارِ خودی سب سے پہلا مرتب کلام ہے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کے فکر و عمل پر پوری طرح سے تاریکی مسلط تھی۔ اور کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ عین اس غلام دور

1273
میں اقبال کے پیغامِ حیات بخش سے ساری فضا معطر ہو جاتی ہے۔آج پاکستان اور دنیائے اسلام میں فکرِ جدید کی جو رو نظر آتی ہے وہ اسی حکیم الامت کی جگر کاوی کا نتیجہ ہے۔

چونکہ اقبال نے اس حقیقت کو قرآن کے غائر مطالعہ سے پایا تھا اس لیے فریضہ کے طور پر خواب آور امت کے لیے بانگِ اذاں بنے اور اسے پھر سے ''اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کے نعرۂ حیات آور سے جگایا۔ یہ فی الواقعہ نوائے سروش تھے۔اقبال کو جتنی مقبولیت ملی اس کی نظیر ہی شاید کہیں اور ملے کیونکہ اس نے زندگی کے تندوگرم حقائق پیش کیے تھے۔اور بنیاد قرآن کی محکم تعلیم پر تھی۔

باغباں زور کلام آموزد مصرع کارید و شمشیرے دِرَود

باغباں نے میرے زورِ کلام کو آزمایا۔اور ایک مصرعے کو بویا تو اس تخم سے شمشیر خارا شگاف اگ آئی۔مستقل اقدار کا بیج، قوتوں کے پھل لاتا ہے۔یہ ہے وہ شجرِ طیّب۔

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14:24)

در چمن جز دانہ اشکم نِکشت تارِ فغانم بپُودِ باغ رِشتُ

اس لیے اس نے باغ میں میرے گریۂ سحری کے آنسوؤں کے علاوہ اور کچھ نہ بویا۔اور میرے نالۂ نیم شبی کے تانے کو باغ کے بانے میں بن کر اس سے ملت کے لیے شرف و مجد کی نئی چادر بنائی (پُود۔وہ ڈور جو کپڑا بننے کے لیے تانے کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے، رِشت۔اگانا)

اس باغبان کی ذرہ نوازیوں کا صدقہ ہے کہ:

ذرّہ ام مہرِ منیر آنِ من است صد سحر اندر گریبانِ من است

میں ذرہ ہوں مگر پوری کائنات کو روشن کر دینے والا سورج میری آن یعنی ملکیت ہے یا میرا ایک لمحہ ہے۔آن کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔

خاکِ من روشن تراز جامِ جم است محرم از نازادہائے عالم است

نازاد۔جو ظاہر نہ ہوں اور جو پیدا نہ ہوں۔یعنی جامِ میں تو صرف موجودہ دنیا دکھائی دیتی ہے مگر میری فکر ان اسرار و رموز سے بھی واقف ہے جو ابھی شھود میں نہیں آئے۔کیونکہ میری فکر عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (13:9) یعنی قرآن کی فکر سے مستنیز ہے۔

فکرم آں آہو سرِفتراک بست کو ہنوز از نیستی بیروں نجست

میری فکر تو اس ہرن کو بھی شکار کر لیتی ہے، جو ابھی پردۂ عدم سے باہر نہیں آیا۔

سبزۂ ناروئیدہ، زیبِ گلشنم گل بشاخ اندر، نہاں در دامنم

(ناروئیدہ، نہ پھوٹا ہوا ابھی۔)

1273 اس سے مراد یہ نہیں کہ اقبال غیب کے علم کا مدّعی ہے۔ اس سے مراد جو شخص وحی کی روشنی میں کارگہٗ کائنات پر غور وفکر کرتا ہے اس کے سامنے وہ حقائق بے نقاب ہو جاتے ہیں جو دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے یکسر مستور ہوتی ہیں۔ جس طرح ایک موسم شناس ہوا کے رخ سے آنیوالے طوفان کا پتا بتا دیتا ہے۔ کیونکہ یہاں تو سب کچھ غیر متبدل قوانین کے تحت ہو رہا ہے جو دیدہ وران قوانین کو سمجھ لیتا ہے۔ تو اس کے لیے ان اسباب وعلل سے نتائج کا پتہ دیدینا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔

حادثہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا بھی مرے آئینۂ ادراک میں ہے

آئینہ ادراک سے مراد عقل وشعور نہ کہ لاہوتی قسم کا غیب دانی کا علم۔ اب وہ کائنات کے سربستہ رازوں کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اب کائنات کے حقائق بیان کرکے آرٹ کی اس بساط کو الٹ دیا ہے جو قوموں کو صرف ان کی رنگینیوں میں الجھائے رکھتا ہے۔

محفلِ رامش گری برہم زدم زخمہ بر تارِ رگِ عالم زدم

(رامش گری۔ موسیقاری، زخمہ، مضراب) میری نوائے انقلاب نے رقص وسرود کی ان پرانی محفلوں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ یہ میری مضراب نے پوشیدہ نغموں کو عالم میں مشہود کر دیا ہے۔

بسکہ عودِفطرتم نادرنواست ہمنشیں از نغمہ ام ناآشناست

(بسکہ چونکہ۔ عودِفطرت۔ میری فطرت کا نغمہ)

درجہاں خورشیدِ نوزائیدہ ام رسم و آئین فلک نادیدہ ام

رم ندیدہ انجم از تابم ہنوز ہست ناآشفتہ سیمابم ہنوز

ابھی تک ستارے میری حرارت سامابینوں سے مائل بہ حرکت نہیں ہوئے۔ ابھی میرا سیماب متحرک نہیں ہوا بلکہ جامد ہے۔ یعنی جہاں میں انقلاب بیان کرنے آیا ہوں۔ وہ ابھی تک خوابیدہ ہیں۔ ان میں زندگی کی کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔

بحر از رقصِ ضیایم بےنصیب کوہ از رنگ حنایم بےنصیب

سورج جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی پہلی کرنیں سمندر کی سطح پر ناچتی ہیں لیکن میں طلوع ہو چکا ہوں مگر عصرِ حاضر کا سمندر میری فکر کی شعاع کے رقص سے ناآشنا ہے۔

جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کی لالہ گوں سرخی پہاڑوں کو حنا آلود کر دیتی ہیں۔ شفق تمام سو پھیل جاتی ہے۔ مگر زمانہ میری فکر کی بلندیوں سے ابھی ناآشنا ہے۔

خوگرِ من نیست چشمِ ہست و بود لرزہ بر تن خیزم از بیمِ نمود

اس دنیا کی آنکھ ابھی تک مجھ سے بالکل ناآشنا ہے۔ اس لیے میرے بدن پر لرزہ طاری ہے کہ میں اس ناآشنا دنیا کے سامنے کیسے آؤں؟

بامم از خاور رسید و شب شکست شبنمِ نَو بر گل عالم نشست
انتظارِ صبح خیزاں می کشم اے خوشاں زرتشتیانِ آتشم

عام قاعدہ ہے کہ جب رات کی تاریکیاں چھٹ کر صبح کا سپیدہ نمودار ہونے کو ہو تو صبح کا انتظار کرنے والے خود اٹھ جاتے ہیں اور آفتاب کی نور پاشیوں سے متمتع ہونے لگتے ہیں لیکن میں ابھی تک صبح اٹھنے والوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ میرے سوز قلب کی قلم تو روشن ہے لیکن میری اس آگ کا پرستار ابھی پیدا نہیں ہوا کتنے خوش بخت ہونگے وہ جو اس حرارت سے اپنے سینہ کو آتشکدہ بنالیں۔

نغمہ ام او زخمہ بے پروا ستم من نوائے شاعر فرداستم

میں وہ نغمہ ہوں جو بلامنت مضراب فضا کو مرتعش کر رہا ہے، میری بات آنیوالے سمجھیں گے۔

عصرِ من دانندۂ اَسرار نیست یوسفِ من بہر ایں بازار نیست
ناامیداستم ز یارانِ قدیم طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

میں یاران قدیم سے ناامید ہوں۔ ان کی عمریں جمود و تعطل میں گزری ہیں۔ میرا سینہ اس کلیم کے لیے سوزاں ہے یہ اس کلیم کے انتظار میں جل رہا ہے کہ وہ ضرور اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ اقبال کو احساس تھا کہ میرا پیغام قبل از وقت ہے۔ اس کے لیے زمانہ تیار نہیں ہوا ہے ابھی۔ اصل میں ہر انقلاب آفریں پیغام اپنے زمانہ سے قبل آیا کرتا ہے۔ وہ اگرچہ عام دنیاوی معیار کے مطابق تو ناکام چلا جاتا ہے مگر اس کا پیغام تخم صالح کی طرح زمین گیر ہو جاتا ہے۔ پھر وہ شجر طیب کی طرح رفتہ فتہ پھولتا پھلتا ہے۔

چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند با ما آشنا بود
لیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت وبا کہ گفت و از کجا بود؟
پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند جہانے را دگرگوں کرد یکے مردِ خود آگاہے
قلزمِ یاراں چوں شبنمِ بے خروش شبنمِ من مثل یم طوفان بدوش
نغمۂ من از جہان دیگر است ایں جرس را کاروان دیگر است
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد چوں خود بربست و چشمِ ما کشاد
رخت باز از نیستی بیروں کشید چوں گل از خاک مزارِ خود دمید

کتنے ہی شاعر ہیں کہ ان کی پیدائش ان کی موت کے بعد ہوئی انہوں نے ہماری آنکھ اس وقت کھولی جب اپنی آنکھ بند کر لی۔ جب وہ اس عالم موجود سے عالم عدم چلے گئے تو انہوں نے اپنا رخت سفر وہاں سے باندھا اور یوں اٹھ کھڑے ہوئے جس طرح خاک سے پامال شدہ بیج نکلتا ہے۔

کارواں ہا گرچہ زیں صحرا گذشت مثلِ گام ناقہ ، کم غوغا گذشت

جس طرح ریت میں اونٹنی کا پاؤں بغیر آواز کے اٹھتا ہے۔

عاشقم ، فریاد ایمانِ من است　　شورِ حشر از پیش خیزانِ من است
قطرہ از سیلابِ من بیگانہ بہ　　قلزم از آشوبِ او دیوانہ بہ
(بہ سے مراد ہو جائے)

درنمی گنجد بجو، عمّانِ من　　بحرہا باید پئے طوفانِ من
(بے حد سمندر: چاہئیں اور طوفان کے لیے۔)

غنچہ کز بالیدگی گلشن نشد　　درخورِ ابرِ بہار من نشود
(درخور: قابل ہونا)

برق ہا خوابیدہ درجانِ من است　　کوہ و صحرا بابِ جولانِ من است
(باب جولان: کھیل کے میدان)

پنجہ کن با بحرم از صحراستی　　برقِ من درگیر اگر سیناستی

میرے بحر فکر پر ہاتھ ڈال اگر صحرا کی سی وسعت ہے۔ اگر طور سینا جیسا ہے تو پھر میری بجلیوں کی تاب لا سکے گا۔

چشمۂ حیوان براتم کردہ اند　　محرم رازِ حیاتم کردہ اند
(براتم میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے　　حیات کا راز۔ قسمت میں میری لکھا گیا)

ذرّہ از سوزِ نوایم زندہ گشت　　پرکشود و کرمکِ تابندہ گشت

میری نوائے پرسوز کی حرارت سے ذرہ میں زندگی آ گئی۔ اس پر کشائی کی اور جگنو شب تاب بن گیا۔ یعنی کسی دوسرے کا محتاج نہ رہا بلکہ دوسروں کے لیے شمع راہ بن گیا۔

ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت　　ہم چو فکرِ من دُرِّ معنی نہ سفت
(سفت یعنی پرونا)

سِرِّ عیشِ جاوداں خواہی بیا　　ہم زمیں ہم آسمان خواہی بیا

آ تجھے میں حیات جاوید اور مملکت ''لَا يَبْلٰى'' کا راز بتاؤں۔ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی اور سامان زندگی کا دوام چاہتا ہے۔ ابلیس نے آدم کی اس ہوس عیش جاودانی سے فائدہ اٹھایا نسل کے لیے سب کچھ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ تو ان کے درمیان بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ لیکن آدم سے کہا گیا کہ مایوس نہ ہونا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿١٢٤﴾ (20:123-124) اقبال نے اس کو دو فقروں میں بیان کر دیا ہے، ہم

زمین ہم آسمان خواہی بیا۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201) یہ ہیں زمین وآسمان کی برکات۔

پیرِ گردوں با من ایں اسرارِ گفت از ندیمان رازہا نتواں نہفت

(میں نے ان کو قرآن سے لیا اور ان رازوں کو اپنے ہم مشربوں سے چھپایا نہیں جا سکتا۔)

ساقیا برخیزد و مے درجام کن محو از دل کاوشِ ایام کن

(کاوش فکر و آلام)

اقبال کا ساقی خدا اور رسول ہے۔ وہ اس سے یہ یعنی قرآن مانگتا ہے تا کہ دنیا کے تمام فکر و آلام دور ہو جائیں۔ یعنی ایسی شراب

شعلۂ آبے کہ اصلش زمزم است گر گدا باشد پرستارش جم است

یہ شراب تو گداگر کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

می کند اندیشہ را ہوشیار تر دیدۂ بیدار را بیدارتر

عام شراب تو عقل پر پردے ڈالتی ہے۔ مگر یہ تو فکر انسانی کو تیز تر کر دیتی ہے۔ اور چشمہ بیدار کو وہ بصیرت عطا کرتی ہے۔ جس سے وہ مستور حقائق کو دیکھ لیتا ہے۔

اعتبارِ کوہ بخشند کاہ را قوتِ شیراں دہد روباہ را

یہ قوی مضمحل نہیں کرتی یہ تو کمزور تنکے میں پہاڑ جیسی خود اعتمادی اور بے حوصلہ لومڑی کو عملی قوت دیتی ہے۔ یہ تو اشداء علی الکفار بناتی ہے۔

خاک را اوجِ ثریا میدہد قطرہ را پہنائے دریا میدہد

(پہنائے۔وسعتیں)

یعنی انسانی ذات فنا کی بجائے اس قدر مستحکم ہو کہ دریا کی وسعتیں پیدا کر کے بے کنار ہو جائے۔ یہ ہے فلسفہ استحکام خودی یا حیات جاوید کا۔

خامشی را شورشِ محشر کند پائے کبک از خونِ باز احمر کند

ایک کمزور چکور کے پنجوں میں ایسی قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ باز کا شکار کر لیتا ہے۔

خیز و در جامم شرابِ ناب ریز بر شبِ اندیشہ‌ام مہتاب ریز

اس نایاب شراب کو میرے جام میں انڈیل اور میری تاریک فکر کو رشک صد مہتاب بنا دے۔

تا سوئے منزل کشم آوارہ را ذوقِ بیتابی دہم نظارہ را

اقبال کا مقصود تو:

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست سوئے قطاری کشم ناقۂ بے زمام را

گرم رو از جستجوئے نوشوم روشناسِ آرزوئے نوشوم
چشمِ اہلِ ذوق را مرّدم شوم چوں صدا در گوشِ عالم گم شوم

اہل ذوق کی آنکھوں کی پتلی بن جاؤں جس طرح کان میں آواز گم ہو جاتی ہے۔

قیمتِ جنسِ سخن بالاکنم آبِ چشم خویش در کالا کنم
(کالا مال اسباب تجارت)

میں جنس سخن کی قیمت کو بڑھا دوں۔ اس کا طریقہ یہ ہے میں آنکھوں کا پانی اس مال و اسباب میں ملا دوں، (کالا۔ تجارت کا سامان) (مُردُم۔ آنکھ کی پتلی)

باز برخوانم ز فیضِ پیرِروم دفترِ سربستہ ، اَسرارِ علوم

اب مرشد رومی کے فیض سے علوم و معارف اور کائنات کے سربستہ راز کھولوں۔ اقبال پر ابتدا ہی سے رومی کا اثر تھا۔ اور آخر تک قائم رہا۔ یہ اس تصوف زدہ ماحول کا اثر تھا۔ اس لیے تصوف اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ بعد میں حقیقت آشکارا ہو گئی تو اس کی بڑی مخالفت بھی کی۔ مگر یہ مخالفت Ethics of Mysticism تک جا سکی۔ نفسِ تصوف تک نہ جا سکی۔ حالانکہ تصوف اسلام میں ایک عجمی پودا تھا۔ اقبال کی یہی وہ کمی ہے جس کی وجہ سے اس کے ہاں تصوف کے خلاف اتنا کچھ ملتا ہے۔ وہاں تصوف کے حق میں بھی بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ اخلاقیات تصوف میں بے چارگی۔ عاجزی اور درماندگی ہے۔ اس کے برعکس رومی میں جوش و جرات، ولولہ، حرکت ہے اس لیے اقبال نے رومی کو اپنا مرشد بنایا ہے۔ لیکن اس سے پیغام کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ شاید اقبال نے نہیں لگایا۔ رومی میں جوش و حرارت سہی مگر بنیاد تو تصوف پر ہے۔ ان کا عقیدہ تو ختمِ نبوت کی نقیض ہے۔ یہ ہے بڑی کمی اقبال کے پیغام میں۔ شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ چونکہ اس کا تعلق حقائق سے زیادہ لطائف سے ہوتا ہے اس لیے اس میں مضمون آفرینی کی گنجائش ہوتی ہے۔

تصوّف برائے شعر گفتن خوب است (حزیں)

جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار من فروغِ یک نفس مثل شرار
(فروغ: چمک۔ یک نفس: ایک لمحہ)
پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
موجم در بحرِ او منزل کنم تا دُرِّ تابندۂ حاصل کنم
من کہ مستیہا ز صہبائش کنم زندگانی از نفسہائش کنم
شب دلِ من مائل فریاد بود خامشی از یاربّم آباد بود
(یاربّم یعنی یاربّ کے نعرہ سے)

شکوہ آشوبِ غم دوراں بدم از تہی پیمانگی نالاں بدم
ایں قدر نظارہ‌ام بے تاب شد بال و پر شکست و آخر خواب شد
(یہ نظارہ پھڑ پھڑایا کہ اس کے بازو ٹوٹ گئے اور میں سو گیا) خواب میں دیکھا
روئے خود بنمود پیر حق سرشت کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانۂ ارباب عشق جُرعہ گیر از شراب تابِ عشق
(جرعہ: گھونٹ)
خند را سرمایۂ صد نالہ ساز اشکِ خونیں را جگر پرکالا ساز
اپنی ہنسی کو سینکڑوں نالوں کا سرچشمہ بنا دے۔ اور خون کے آنسوؤں کو جگر کا ٹکڑا بنا دے۔
تا بکے چوں غنچہ می باشی خموش؟ نکہتِ خود را چو گل ارزاں فروش
چوں جرسِ آخر زہر جزو بدن نالۂ خاموش را بیروں فگن
تو تو کارواں ہے جس کے رگ و پے میں فغاں پوشیدہ ہے۔
آتش استی بزمِ عالم برفروز دیگراں راہم ز سوزِ خود بسوز
فاش گو اَسرارِ پیر مے فروش موجِ مے شو کسوتِ مینا بپوش
تو ان میکدوں کا اَسرار فاش کر دے جو پیر مے خانہ جانتا ہے۔ شراب کی موج بن جا اور حقیقت کو لباس مجازِ میں پیش کر دے۔
نالہ را اندازِ نو ایجاد کن بزم را از ہائے وہو آباد کن
خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را از قُمِ خود زندہ تر کن زندہ را
(لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا)(36:70)
اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پری داری بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را
آشنائے لذتِ گفتار شو اے درائے کارواں بیدار شو
(درائے کارواں۔ بانگ درا)
زیں سخن آتش بہ پیراہن شدم مثلِ نے ہنگامہ آبستن شدم
رومی کے پیغام نے کپڑوں میں آگ لگا دی ہے میں عشق کی بالسری بن کر اٹھا تا کہ بستی میں ہنگامہ پیدا کروں۔
بر گرفتم پردہ از رازِ خودی وا نمودم سِرِّ اعجازِ خودی
(اعجاز: معجزہ)
بود نقشِ ہستیم انگارۂ ناقبولے، ناکسے، ناکارۂ

1273
میری ہستی ایک نقش ناتمام تھی جس کی کوئی قدر و منزل نہیں تھی۔

عشق سوہاں زد مرا ، آدم شدم عالمِ کیف و کم عالم شدم

عشق نے مجھے تراشا۔ حشو وزوائد الگ کر کے ایک پیکر دیا۔ اور اس وسیع و عریض کی تمام تصویر کا علم مل گیا۔ کائنات کے اس علم کی وجہ سے۔

حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام در رگ مہہ گردشِ خوں دیدہ ام
(مہہ۔ چاند)

بہرِ انسان چشم من شبہا گریست تا دریدم پردۂ اَسرارِ زیست
از درون کارگاہِ ممکنات بر کشیدم سرِّ تقویمِ حیات
(برکشیدم۔ کھول دیا)

من کہ ایں شب راچو مہ آراستم گردِ پائے ملتِ بیضا ستم
ملتے در باغ و راغ آوازہ اش آتشِ دلہا سرود تازہ اش
(باغ وراغ: کونے کونہ میں دنیا کے۔)

ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد خرمنِ از صد رومی و عطار کرد
چھوٹے ذرے بوئے اور وہ آفتاب کا ڈھیر بن گئے۔

آہِ گرمم ، رخت برّ گردُوں کشم گرچہ دُودَم از تبارِ آتشم

میں ایک گرم آہ کے سوا کچھ نہیں میں زمین کی پستیوں کو چھوڑ کر بلندیوں کو سر کر رہا ہوں۔ اگر چہ میں محض دھواں ہوں۔ لیکن نسبت آگ کے خاندان سے ہے۔ اسی لیے مجھ میں آتش نورانی اور شعلہ صفتی ہے۔

خام ام از ہمتِ فکرِ بلند رازِ ایں نُہ پردہ در صحرا فگند
(فگند۔ پھینک دیا)

قطرہ تا ہم پایۂ دریا شود ذرّہ از بالیدگی صحرا شود

اس میں تصوف کے برعکس قطرہ دریا میں فنا نہ ہوتا ہے بلکہ مزید بلندیاں ہیں۔ یعنی مملکت فرد کے لیے ہے نہ کہ فرد مملکت کے لیے۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست بت پرستی ، بت گری مقصود نیست
شاعری کے بارے میں دوسری جگہ کہا ہے۔

من اے امیرِ امم داد از تو خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند

1273 قرآن نے اسلوب بیان کی مذمت نہیں کی بلکہ اس ذہنیت کی مذمت کی جس کا نصب العین ہی ہے نہ ہو۔ اور اگر اس کو وحی کے تابع رکھا جائے تو یہ پیغمبرانہ اسلوب ہے۔

ہمارے ہاں شعر کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا۔ اسے محض تفریح سمجھا جاتا ہے۔ اگر علامہ نثر میں لکھتے تو کہیں زیادہ مفید ہوتا۔ اسے محض تفریح سمجھا جاتا ہے۔ خود علامہ نے آخر میں اس کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اور وہ فقہ اور مطالعہ قرآن کے متعلق نثر میں کتابیں لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جو افسوس ہے پورا نہ ہوسکا۔ ان کے اشعار میں اس قدر احتیاط کے باوجود بہت سی متضاد باتیں آگئی ہیں، وجہ شعر پر جذبات غالب ہو جاتے ہیں اور مضامین آفرینی کا خیال تضادات کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ اس سے علامہ کی پیغام رسانی کا مقصد مجروح ہو گیا ہے۔ اور ان کی فکر مربوط اور ہم آہنگ انداز سے سامنے نہیں آئی۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ وہ شعر میں کہہ گئے ہیں۔ کسی اور کو نصیب نہیں ہوسکتا۔ مثنوی رموز بے خودی میں ''بحضور ﷺ رحمت العالمین'' کے تحت لکھا ہے۔

گر دِلم آئینہ بے جوہر است   در بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا   بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام   با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا   آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اس مثنوی کے بارے میں۔

ہندی ام از پارسی بیگانہ ام   ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام

اردو کے بارے میں کہا:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است   طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت   خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت

فارسی نے میری فکر پر جادو کر دیا۔ اس لیے میرا قلم نخل طور کی شاخ بن گیا۔ ہندی بلند خیالات کی متحمل نہیں ہوسکتی صرف فارسی ہی متحمل ہوسکتی تھی۔

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام   درخورد بافطرتِ اندیشہ ام
(درخورد، ہم آہنگ ہو گی میری فکر کی فطرت سے)

خوردہ برمینا مگیر اے ہوشمند   دل بذوقِ خوردۂ مینا بہ بند
یہ نہ دیکھو کہ صراحی کیسی ہے۔ دیکھو کہ اس کے اندر شراب کیسی ہے یعنی الفاظ کے پیچھے نہ جاؤ بلکہ پیغام کو دیکھو۔

❁❁❁

خاتمۃُ الکتٰب ''اس دعا کے ساتھ''

اے چوں جاں اندر وجودِ عالمی   جانِ ما باشی و از ما می رمی

اس شعر میں خدا اور کائنات کا تعلق بتایا گیا ہے۔ فلسفی خدا کو کائنات سے ماوراء Transcendent یعنی کائنات سے باہر خدا۔ اس کا نتیجہ Deism ہے۔ اس سے تجسیم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ کائنات اور خدا حقیقت کے دو رخ ہیں۔ نہ خدا کائنات سے الگ اور نہ کائنات خدا سے الگ وجود رکھتی ہے۔ یہ ہے Immenence اس کا نتیجہ وحدت الوجود Pantheism ہے۔ یعنی ہر شے خدا ہے۔ Transcendent قرآن کی رو سے دونوں تصورات غلط ہیں۔ خدا Immenent بھی ہے اور Transcendent بھی۔ کائنات کے اندر مگر اس میں محبوس نہیں۔ کائنات سے باہر مگر اس سے خارج نہیں وہ کائنات کا خالق اور اس کی مخلوق اس کی الوہیاتی توانائی کے بل بوتے پر چل رہی ہے یہ خدا کا امر (Directive Force) کہلاتا ہے اسے زمان میں ابدیت Eternity حاصل ہے اس لیے ''هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ'' (57:3) اس کی شان ہے۔ اور مکان میں لامحدودیت کا مالک ہے ''وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ'' (57:3) وہ کائنات سے باہر کہیں الگ نہیں بیٹھا۔ اور نہ ہی ہر شے خدا ہے۔ اس لیے تجسیم اور وحدتِ وجود کے دونوں تصورات غلط ہیں۔ غیر قرآنی ہیں۔ علامہ نے اس مشکل مسئلہ کو ایک مصرعہ میں حل کر دیا ہے۔

اے چوں جاں اندر وجودِ عالمی

یعنی خدا کائنات میں اس طرح ہے جس طرح انسانی جسم میں جان ہے۔ جان مادہ کی پیداوار نہیں ہوتی نہ ہی وہ جسم کے اندر محبوس ہوتی ہے کہ جسم کے فنا ہو جانے سے جان بھی فنا ہو جائے لیکن وہ جسم سے باہر بھی نہیں ہوتی۔ جسم اس کے زور پر زندہ اور نامی ہوتا ہے۔ جان نگاہوں سے دیکھی نہیں جاسکتی۔ اس لیے وہ باطن ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ظہور (Menifestation) اس قدر نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود محسوسات و مدرکات کی حدود سے ماوراء ہوتی ہے لیکن اس کی توانائی کے مظاہر محسوس اور مدرک ہوتے ہیں۔ اب اقبال نے اس حقیقت کو ایک

اور انداز سے واضح کیا ہے۔

جانِ ما باشی و از ما می رمی

تو ہماری جان بھی ہے اور اس کے باوجود ہم سے دور دور رہتا ہے۔قرآن کے مطابق خدا انسان کی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔مگر کوئی نگاہ اس کا ادراک نہیں کرسکتی۔وہ قریب بھی ہے۔بعید بھی۔ہم روح خداوندی کے بغیر کچھ بھی نہیں لیکن ہم خدا بھی نہیں۔وہ ہر وقت ہر مقام میں ہے۔لیکن مکان وزماں کی نسبتوں سے منزہ اور معریٰ بھی ہے۔

نغمہ از فیضِ تو از عودِ حیات   موت در راہ تو محسودِ حیات

ساز حیات میں نغمہ تیرے فیض کرم سے ہے۔اور تیرے راستہ میں جان دیدینا خود زندگی ایسی موت پر حسد کرتی ہے۔
(عود،ساز،بربط،موسیقی کا ساز)

باز تسکینِ دلِ ناشاد شو   باز اند سینہ ہا آباد شو

میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر وہی کامرانیوں اور تسکین آمیزیوں کا دور واپس آجائے تاکہ پھر شادابیٔ قلب ونظر بن جائے۔جس طرح رسول ﷺ کے دور میں انسانوں کے ویران سینے آباد ہوکر بے قرار قلوب کے لیے وجہ تسکین بن گئے تھے۔

باز از ما خواہ ننگ و نام را   پختہ ترکن عاشقانِ خام را

ایک بار پھر اگر ایسا ہوجائے کہ تیرے راستہ میں اپنا عزت وناموس قربان کردیں تاکہ اپنے دعویٰ ایمانی کا ثبوت دے سکیں۔

از مقدر شکوہ ہا داریم ما   نرخِ تو بالا و ناداریم ما

بے عملی کی وجہ سے ہم تقدیر کا شکوہ کرتے رہتے ہیں۔حالانکہ تجھے حاصل کرنے کے لیے بڑی قیمت دینی پڑتی ہے۔مال و دولت وآرام وآشائشیں قربان کرکے جبکہ ہمارے پاس نہ تو ایمان ہے اور تہی دامن ہیں۔

از تہیدستان رُخِ زیبا مپوش   عشقِ سلمان و بلال ارزاں فروش
چشمِ بے خواب و دلِ بے تاب دہ   باز مارا فطرتِ سیماب دہ
(سیماب۔پارہ)

آیتے بنما ز آیاتِ مبیں   تاشود اعناقِ اعداء خاضعین

اپنی کھلی ہوئی آیتوں میں ایک آیت دکھادے۔تاکہ تیرے دین کے دشمنوں کی گردنیں جھک جائیں۔

کوہ آتش خیز کن ایں کاہ را   ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

یہ حالت کیوں ہوئی؟

رشتۂ وحدت چو قوم از دست داد   صد گرہ بر روئے کارِ ما فتاد

مصیبت ختم ہوئی تو ہر کام میں سینکڑوں رخنے پڑ گئے۔یعنی فرازیاں ختم ہوگئیں۔

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم ہمدم و بے گانہ از یک دیگریم

ستاروں کی طرح بکھرے زندگی ہے۔ایک دوسرے سے الگ الگ نصب العین ہے۔

باز ایں اوراق را شیرازہ کن باز آئینِ محبت تازہ کن

باز مارا برھماں خدمت گمار کارِ خود باعشقانِ خود سپار

ہم سے پھر وہی کام ہے جو ایک مرتبہ لیا گیا تھا۔(گماریدن سے فعل امر، گمار، کام پر لگا)

رہبراں را منزلِ تسلیم بخش قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

ہمارے کارواں ملت کو اس منزل سے ہمکنار کردے جہاں ہر ایک تیرے قانون کے سامنے جھکتا ہے۔

عشق را از شغلِ لا آگاہ کن آشنائے رمزِ الااللہ کن

منکہ بحرِ دیگراں سوزم چوں شمع بزمِ خود گریہ آموزم چو شمع

یا رب آں اشکے کہ باشد دلفروز بے قرار و مضطر و آلام سوز

کارش در باغ و رؤید آتشے از قبائے لالہ شوید آتشے

اس کو یعنی آنسو کو باغ میں بوؤں تو آگ نکلے۔اور حرارت کو ٹھنڈک میں بدل دے۔

دل بدوش و دیدہ بر فرداستم درمیان انجمن تنہاستم

میرا دل تو امت کے ماضی سے وابستہ مگر نگاہ اس کے مستقبل پر ہے۔

در جہاں یا رب ندیم من کجاست؟ نخل سینایم کلیمِ من کجاست؟

ظالمم بر خود ستم ہا کردہ ام شعلہ را در بغل پروردہ ام

شعلۂ غارت گرِ سامان ہوش آتشے افگندہ در دامانِ ہوش

عقل را دیوانگی آموختہ علم را سامانِ ہستی سوختہ

آفتاب از سوز اُو گردوں مقام بر قبا اندر طوافِ اُو مدام

ہمچو شبنم دیدۂ گریاں شدم تا امینِ آتش پنہاں شدم

شمع را سوزِ عیاں آموختم خود نہاں از چشمِ عالم سوختم

شعلہ ہا آخر ز ہر مویئم دمید از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

عندلیبم از شررہا دانہ چید نغمۂ آتش مزاجے آفرید

سینۂ عصرِ من از دل خالی است می تپد مجنوں کہ محمل خالی است

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست　　آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظارے غم گسارے تا کجا؟　　جستجوئے رازدارے تا کجا
اے ز رُیتِ ماہ و انجم مستیز　　آتشِ خود را زجانم بازگیر
ایں امانت بازگیر از سینہ ام　　خارِ جوہرِ برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدمِ دیرینہ دہ　　عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ
موج در بہر است وہم پہلوئے موج　　بست با ہمدم تپیدن خوئے موج
بر فلک کوکب ندیمِ کوکب است　　ماہ تاباں سر بزانوئے شبِ است
ہستی جوئے بجوئے گم شود　　موجۂ بادے بوئے گم شود

ندی ہمدم کی تلاش میں چلتی رہتی ہے تا آنکہ دریا میں گم ہوجائے۔اس طرح نسیم سحری اپنے آپ کو بوئے گل میں ضم کردیتی ہے۔

ہست در ہرگوشۂ ویرانہ رقص　　میکند دیوانہ با دیوانہ رقص
گرچہ تو در ذاتِ خود یکتا ستی　　عالم از بحرِ خویش آراستی
من مثالِ لالۂ صحرا استم　　درمیان محفلے تنہا استم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے　　از رموزِ فطرتِ من محرومے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ　　از خیال ایں و آں بیگانۂ
تا بجانِ اُو سپارم ہوئے خویش　　باز بینم دردلِ اُو روحِ خویش
سازم از مشتِ گِل خود پیکرش　　ہم صنم او را شوم ہم آزرش

اس طرح من تو شدم تو من شدی کا پیکر بن جائیں پرستیدہ بھی اور پرستار بھی۔

مثنوی رموزِ بیخودی

جہد کن در بیخودی خود را بیاب　　　زود تر و اللہ اعلم بالصواب
(رومی)

اَسرارِ خودی میں یہ بتایا گیا کہ انسان صرف طبیعی جسم کا نام نہیں جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ بلکہ جسم کے ساتھ ذات، نفس یا خودی کی صلاحیت بھی اس میں رکھ دی گئی ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما کی جائے تو اسے حیات جاوید مل سکتی ہے۔ اور یہ نشوونما صرف معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے۔ انفرادی طور پر نہیں۔ اس طرح دو مستقل عناصر یعنی فرد کی انفرادیت اور معاشرہ کی اجتماعیت تو فرد اور معاشرہ کا باہمی تعلق کیا ہے؟ فرد، معاشرہ کے لیے ہے یا معاشرہ فرد کے لیے؟ کیا معاشرہ کے استحکام کے لیے افراد کو قربان کر دینا چاہیے یا معاشرہ کا فریضہ افراد کا تحفظ ہونا چاہیے یہی سوالات شروع ہی سے انسانی توجہات کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے افلاطون نے اپنی کتاب (Republic) جمہوریت میں اس سوال کو اٹھایا۔ اس کے مطابق وجود معاشرہ کا ہے۔ فرد کا نہیں۔ یہاں تک کہ کسی بچہ کو بھی اس کے باپ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے ان کو معاشرہ کی مشترکہ اولاد سمجھا جائے۔ اس تصور کی عملی شکل یہ ہوگی کہ اعلیٰ طبقہ میں کوئی عورت کسی خاص مرد کی بیوی بن کر نہ رہے۔ بلکہ تمام عورتیں مشترکہ طور پر مردوں سے اختلاط رکھیں۔ یہ کمیونزم کی انتہائی شکل تھی۔ اور اس تصور کا اتنا حصہ کہ فرد اپنی حیثیت نہیں رکھتا اس تصوف میں جا کر پروان چڑھا جس کا بیج خود افلاطون نے بویا تھا۔ جس نے فرد کی خودی کو سب سے بڑا شر قرار دے کر اسے فنا کرنے کی تلقین کی اور ساتھ ہی اجتماعی زندگی کو بھی قابلِ نفرت قرار دے کر تزکیہ نفس دفنائے ذات پر یعنی معاشرے سے ہٹ کر تجرد کی خلوت گاہوں ہی میں ہو سکتا ہے۔ تو اس لحاظ سے تصوف فرد اور جماعت، دونوں کا منکر ہے۔ فلہٰذا انسان کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ تصور۔ عیسائیت اس تصور کی علمبردار اس کے خلاف لوتھر نے احتجاجی تحریک (Protestantism) بلند کی۔

سیاست میں افلاطونی تصورِ جمہوریت کے خلاف ملوکیت (Monarchy) نے بغاوت کر کے رعایا کی حیثیت کو خارج کر دیا۔ حیثیت صرف بادشاہ کی اور رعایا اس کے غلام۔

1273 ایسی ملوکیت کے خلاف انقلابِ فرانس صدائے احتجاج بن کرا بھرا۔اور جمہوریت کا دوبارہ نعرہ لگا دیا اس کا ردِّعمل ہیگل کا فلسفہ جس نے اسٹیٹ کو معبود بنا کر رکھ دیا اور افراد مملکت اس کے پرستار۔اس فلسفہ کی رو سے مملکت ایک مکتفی فی الذات انائے مطلق ہے جس کے نزدیک شر اور خیر کی کوئی مستقل قدر نہیں۔زمین پر خدا کا وجود صرف مملکت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔فرد کا مقصود حیات مملکت کے دیوتا کے استھان پر بھینٹ چڑھ جانا ہے اور بس۔

اس فلسفہ کا ردِعمل اب یہ ماڈرن تصوف کی شکل میں، دراصل کشمکش حیات سے فرار اور شکست خوردگی کا مظاہرہ ہے (Escapeism)۔

دیکھا ذہنِ انسانی کی ٹامک ٹوئیاں !اب قرآن نے اعلان کر دیا۔

1۔ ہر انسانی بچہ واجب التکّریم وتوقیر ہے۔

2۔ ہر فرد ایک الگ انفرادیت رکھتا ہے۔اور اس کی قدر ومنزلت اس قدر گراں بہا کہ جس نے ایک انسان کو تلف کر دیا گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا۔اور جس نے کسی ایک زندگی کو بچا لیا۔گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو زندہ کر دیا۔

3۔ذات انسانی کی نشوونما زندگی کا مقصود ہے۔اور چونکہ یہ نشوونما جماعت یعنی معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے۔اسی لیے فرد کی تکمیل ذات کے لیے معاشرہ کا وجود لاینفک ہے۔

4۔معاشرہ کا فریضہ ہر فرد معاشرہ کی نشوونما ہے۔اسی لیے وہ ہر ایک کے لیے یکساں مواقع فراہمی کرے تاکہ اس کی نہ صرف ضروریاتِ زندگی بلکہ مضمر صلاحیتیں نشوونما پا سکیں۔

5۔معاشرہ اس ہیت اجتماعیہ کا نام ہے۔جس میں تمام افراد مندرجہ بالا اصولوں کی صداقت پر دل سے یقین رکھیں اور بلا جور واکراہ باہم مل کر ایک دوسرے کا دست بازو بن جائیں۔

6۔معاشرہ کا کام اشیاء کا نظم ونسق ہوگا۔نہ کہ انسانوں پر حکومت کرنا۔اسی لیے کسی بڑے سے بڑے فرد کو بھی یہ حق حاصل نہیں خواہ وہ نبی اور حاکم ہی کیوں نہ ہو، کہ دوسرے فرد سے اپنا حکم منوا سکے۔اس لیے اس معاشرہ میں نہ کوئی محتاج ہوتا ہے اور نہ محکوم۔کیونکہ محتاجی اور محکومی کی چٹانوں سے ٹکرا کر ذات انسانی پاش پاش ہو جاتی ہے۔

7۔اس معاشرہ کے تمام افراد غیر متبدل قوانین کے تحت باہمی مشاورت سے زندگی بسر کرتے ہیں جس سے ان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔یہ اطاعتِ خداوندی کہلاتی ہے۔اطاعت سے مراد درحقیقت خود انسانی ذات کے تقاضوں کی تسکین ہے جس طرح پیاسا طبعی تقاضہ کے تحت پانی پی کر پیاس بجھاتا ہے۔

8۔اس معاشرہ کی سالمیت، تحفظ اور استحکام، جو افراد کی ذات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ان انفراد کا فریضہ ہے۔لیکن فرد اسی معاشرہ کی حفاظت میں جان تو دے سکتا ہے۔مگر اس کی ذات کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔واضح رہے کہ انسانی جان مقصودِ

1273
بالذات نہیں بلکہ ایک بلند نصب العین ''انسانی ذات کی تکمیل'' کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے اس نصب العین کی کی خاطر جان دیدینا لازمی ہوجاتا ہے۔

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

اقبال نے اس قرآنی تصور کو ''رموز بیخودی'' میں پیش کیا ہے۔ یہ تصوف کی خودی نہیں ہے۔ جس سے مراد فنائے ذات ہے۔ بلکہ اس کی ذات کی نشوونما معاشرے میں گم ہوکر پروان چڑھ سکتی ہے۔ گم ہونے سے مراد یہ نہیں کہ ذات کو معاشرے پر قربان کردے بلکہ اگر اس کی ذات کا ایک ذرہ بھی کمزور پڑ جائے تو معاشرہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اسے برقرار رکھا جاسکے۔ مقصد یہ ہے کہ ذات کی نشوونما خانقاہوں میں انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف معاشرہ کے اندر ہی ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ کسی بھی وقت فرد سے بڑھ کر قدر و قیمت اختیار کرلے تو وہ طاغوتی معاشرہ بن جاتا ہے۔ جس کا مٹانا فرض ہوجاتا ہے۔

اے ترا حق خاتمِ اقوام کرد بر تو ہر آغاز را انجام کرد

نبی ﷺ خاتم النبین اور امت خاتم الاقوام ہے۔ نہ اس کے بعد کوئی نبی نہ امت آئے گی۔ اس لیے ملت اسلامیہ کو خاتم الاقوام کہا گیا ہے۔ جس پر آغاز کا انجام کردیا جائے۔

اے نظر بر حسنِ تر سازادۂ اے ز راہِ کعبہ دُور افتادۂ

مطلوب و مقصود کعبہ قرار دیا تھا لیکن تم نے اس سے منہ موڑ کر عجمی تصورات اپنا لیے۔ اور اپنے نصب العین سے دور ہوگیا۔

اے فلک مشتِ غبار کوئے تو اے تماشا گاہِ عالم روئے تو

ہمچو موج آتش تہِ پا می روی تو کجا بہرِ تماشہ می روی

دوسروں کے پیچھے بھاگنا شروع کردیا اور اس اضطراب کے ساتھ گویا پاؤں تلے چنگاری آگئی ہو۔ اب کرنے کا کام یہ ہے۔

رمزِ سوز آموز از پروانۂ در شرر تعمیر کن کاشانۂ
طرح عشق انداز اندر جانِ خویش تازہ کن با مصطفی پیمانِ خویش
خاطرم از صحبت ترسا گرفت تانقابِ روئے تو بالا گرفت

میں غیر قرآنی تصورات سے رنجیدہ ہوگیا۔ میں تیرے چہرے سے یہ نقاب ضرور اتاروں گا۔

ہمنوا از جلوۂ اغیار گفت داستانِ گیسو و رخسار گفت

(ہم عصر شعرا اور مفکر بس غیروں کے قصیدے اور زلف و گیسو کی فرضی داستانیں، سنانے میں لگے ہوئے ہیں)

بر درِ ساقی جبیں فرسودہ او قصہ مُغ زادگاں پیمودِ او

(پیمود: پیمانے کے قصے)

من شہیدِ تیغِ ابروئے توام خاکم و آسودۂ کوئے توام
از ستائش گستری بالاترم پیش ہردیواں فرو ناید سرم
(میں قصیدہ خوانیاں نہیں کرتا اور نہیں جھکاتا اپنا سر)

از سخن آئینہ سازم کردہ اند و ز سکندر بے نیازم کردہ اند
(سکندر، خارجی ذرائع)

بارِاحسان برنتابد گردنم در گلستان غنچہ گردد دامنم
(دامن سمیٹ لیتا ہوں)

سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں آب خود می گیرم از سنگِ گراں
گرچہ بحرم، موجِ من بیتاب نیست برکفِ من کاسۂ گرداب نیست
پردۂ رنگم شمیمے نیستم صیدِ ہر موجِ نسیمے نیستم
در شرار آبادِ ہستی اخگرم خِلعتے بخشد مرا خاکسترم
(اخگرم: کوئلہ دہکتا ہوا)

بر دَرَت جانم نیاز آوردہ است ہدیۂ سوز و گداز آوردہ است
(ہدیہ: تحفہ)

ز آسمانِ آبگوں یم می چکد بر دلِ گرمم دمادم می چکد
میرے دل پر الہامات کی بارش ہوتی ہے۔ میرے ذہن آسمانی پرنا درخیالات کا مسلسل نزول ہوتا ہے۔
من زجو ، باریکتر می سازمش تابہ صحن گلشنت اندازمش
(جو باریکتر ۔ جو سے یعنی باریک انداز مش میں اس کی طرف پھینکتا ہوں)
زانکہ تو محبوبؐ یار ماستی ہمچو دل اندر کنارِ ماستی
(کنار: پہلو)

باز خوانم قصۂ پارینہ ات تازہ سازم داغہائے سینہ ات

❁❁❁

ارکانِ اساسی ملّیہ اسلامی، پہلا رکن توحید ہے

توحید:

نبی کا پیغام منتشر افراد کو ایک نظریہ کے تحت ملت بناتا ہے یہ ملت چند ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ سب سے پہلا اور اہم رکن توحید ہے۔ توحید سے صرف یہ مراد نہیں کہ خدا کو ایک مانا جائے اس سے مراد جس طرح خارجی کائنات میں خوش اسلوبی سے قوانین خداوندی کی کارفرمائی ہے۔ اس طرح سے انسانی زندگی میں بھی ان کی کارفرمائی ہونی چاہیے۔ اس لیے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرائے۔ یہ ہے حقیقی آزادی جو توحید پر ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح دنیا کے تمام انسان جب اس ضابطۂ حیات کو اپنا لیں تو وہ ایک ملت بن کر ایک ہی مرکز کے تابع اس طرح One-World-Govt وجود میں آجائے گی۔ دنیا میں سارا فساد اس لیے ہے کہ ہر قوم اپنے عقل سے نظام قائم کر کے اس قوم کا تحفظ کرتی ہے۔ قوموں کے مفادات کا یہ تصادم عقول کی جنگ ہے۔ اگر ان عقول کو تابع وحی کر دیا جائے تو اساس و بنیاد مشترک ہونے کی وجہ سے تمام فسادات ختم ہو جائیں گے۔

در جہانِ کیف و کم گردید عقل — پے بہ منزل بُرد از توحید عقل

یہ عقل تو اس مقصد تک پہنچانے نہیں دیتی۔ اور کسی منزل تک نہیں پہنچتی۔ ماری ماری پھرتی ہے۔

ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست — کشتی ادراک را ساحل کجا است

اہلِ حق را رمزِ توحید ازبر است — در اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا مضمر است

حقیقت شناس نگاہ مومن اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ توحید سے مقصود کیا ہے۔ جو اس آیت میں مضمر ہے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ (19:93) كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿١١٦﴾ (2:116)

یہ ہے توحید کا عملی مفہوم۔

تا زِ اسرارِ تو بنماید ترا — امتحانش از عمل باید ترا

اس اطاعت سے مقصود کوئی ذاتی اطاعت نہیں بلکہ مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہے مگر یہ زبانی کلامی نہیں ہے بلکہ عمومی طور پر ثابت کرنا پڑتا ہے۔

دیں ازو، حکمت ازو، آئیں ازو   زور ازو قوت ازو تمکیں ازو
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد   عاشقاں را برعمل قدرت دہد
پست اندر سایئش گردد بلند   خاک چوں اکسیر گردو ارجمند
قدرتِ او برگزیند بندہ را   نوعِ دیگر آفریند بندہ را
(برگزیند فضیلت)
در رہِ حق تیز تر گردو تگش   گرم تر از برق خوں اندر رگش
(تگش تگ ودو)
بیم و شک میرد عمل گردد حیات   چشم می بیند ضمیر کائنات
(بیم یعنی خوف)
چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود   کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود
(کاسۂ دریوزہ یعنی کاسۂ گدائی)
ملتِ بیضا تن و جان لاالہ   سازِ مارا پردہ گردانِ لاالہ
(ساز ما یعنی میرے نغمے اس مضراب سے
پیدا ہوتے ہیں)
لا الہ سرمایۂ اسرارِ ما   رشتہ اش شیرازۂ افکار ما
(اسی رشتہ سے افکار کی شیرازہ بندی ہوتی ہے)
حرفش از لب چوں ، بدل آید ہمے   زندگی را قوت افزاید ہمے
(ہمے۔حب)
نقشِ او گر سنگ گیرد دل شود   دل اگر از یادش نسوزد گِل شود
اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ (2:74)
چوں ، دل از سوز غمشِ افروختیم   خرمنِ امکان ز آہے سوختیم
(جہاں مستعار کو پھونک ڈالا)
آبِ دلہا درمیان سینہ ہا   سوز اُو بگداخت ایں آئینہ ہا
شعلہ اش چوں لالہ و رگ ہائے ما   نیست غیر از داغِ اُو کالائے ما
(کالائے یعنی سرمایہ اور دولت)

اسود از توحید احمر می شود خویش فاروقؓ و ابو ذرؓ می شود
دل مقامِ خویش و بیگانگی است شوق را مستیِ ز ہم پیمانگی است
(ہم پیمانگی یعنی مستی ایک ہی پیمانہ)

دل میں محبت اورنفرت کے متضاد جذبات ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ نظریہ اپنالے تو وہ اپنا اور جو نہ اپنائے تو وہ غیر خواہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ دنیا کے تمام بادہ نوش اس میخانہ کے ان میں ایک ہی سرمستی ہے۔

قوم را اندیشہا باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے
(قوم مشترکہ نظریات اورنصب العین سے ایک بنتی ہے)۔

جذبہ باید در سرشتِ او یکے ہم عیارِ خوب و زشتے او یکے
(عیار، کسوٹی)

گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر نیست ممکن ایں چنیں انداز فکر
(انداز فکر اس قسم کا نظریہ)

ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ از ابیکم گیر گر خواہی دلیل

ابراہیم علیہ السلام کو جو توحید کے نمایاں علمبردار تھے۔ قرآن نے تمام مومنوں کا آبؑ (باپ) قرار دیا ہے۔ اور اسلام تو مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَٰهِيمَ ۚ (22:78)

باوطن وابستہ تقدیر اُمم بر نسب بنیاد تعمیرِ اُمم
(دنیا میں امت کا اشتراک وطن ونسل ہے)

اصلِ ملت در وطن دیدکہ چہ؟ باد و آب و گِل پرستیدن چہ؟
(تو کیا محض پانی اور مٹی کی کرے گا پرستش جو باعث تذلیل ہے۔)

بر نسب نازاں شدن نادانی است حکمِ او اندر تن و تن فانی است

یہ جسم تو اندر سے تغیر پذیر ہورہا ہے۔ اور تین برس کے بعد بالکل بدل جاتا ہے۔ تو وہ شے جو باقی نہ رہے وہ کسی طرح اساس ملت بن سکتی ہے۔

ملت ما را اساس دیگر است ایں اساسِ اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغایب بستہ ایم بس زبندِ ایں و آں وارستہ ایم

اگر چہ ہم محسوس پیکروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل غیر محسوس نظریۂ توحید سے وابستہ ہیں لہٰذا دنیا میں جس قدر محسوس معیار قومیت ہو سکتے ہیں۔ ہم ان سب سے آزاد ہیں۔

رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است چوں نگاہ ہم از نگاہِ ماگم است

یہ غیر محسوس رشتہ ہے جس طرح ستارے ایک دوسرے کے ساتھ بندے ہیں۔ یہ رشتہ اس قدر غیر مرئی ہے جیسے نگاہ کا رشتہ خود نگاہ کو بھی دکھائی نہیں دیتا۔

تیر خوش پیکانِ یک کیشیم ما یک نما، یک بیں، یک اندیشم ما
(کیشیم۔ترکش)

مدعائے ما، مآلِ ما یکیست طرز و اندازِ خیال ما یکیست

ما ز نعمت ہائے اُو اخواں شدیم یک زباں و یک دل و یکجان شدیم

فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (3:103) یہ ہے توحید جو تشکیل ملت کے لیے اساس اولین ہے۔

❁❁❁

سب سے انوکھا نظریہ، رسول ﷺ سے قبل دنیا کی حالت

دنیا میں ہر قوم کا مطمع نگاہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔سب سے بڑا وطن پرست وہ ہے جو دوسری اقوام کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کو خوشحالیوں سے ہمکنار کردے۔قومیت کے اس نظریہ نے نوع انسانی کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں۔جبکہ امتِ مسلمہ کا مقصود یہ تھا کہ تمام نوع انسانی کو ہر قسم کی غلامی سے چھڑا کر انہیں صحیح آزادی، مساوات اور اخوت کے رشتہ میں پرودے۔اس امت کا فریضہ سارے نوع انسانی کی پرورش ہے اس کے نزدیک بلا رنگ و نسل، مذہب، وطن تمام انسان واجب التکریم ہیں۔امت مسلمہ ان انسانی حقوق کی نگہداشت کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔علامہ اقبال نے اس نظم میں بعثت سے پہلے دنیا کی کیا حالت تھی اور حضور ﷺ نے آ کر کیا انقلاب بپا کر دیا۔

بود انسان در جہاں انساں پرست ۔۔۔ ناکس و نابود مند و زیردست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش ۔۔۔ بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر ۔۔۔ بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ او ہمہ پیرِ کنشت ۔۔۔ باج بر کشتِ خرابِ اُو نوشت
(اورنگ یعنی تخت)

ایک طرف بادشاہ ان سے باج وصول کرتا دوسری طرف مذہبی پیشوائیت خدائی ٹیکس لیتے تھے۔اگر بادشاہ کا انکار کرے تو جیل اور ملا کا انکار کرے تو جہنم۔

(اورنگ۔تخت۔کُنشت۔مندر)۔

در کلسیا اسقفِ رضواں فروش ۔۔۔ بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش بُبرد ۔۔۔ خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
(باآتش سپرد۔آگ کی نظر کرنا)

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ ۔۔۔ نغمہ ہا اندر نئے اُو خوں شدہ

تا امینے حق بحق داراں سپرد — بندہ گاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد — کوہکن را پائیہ پرویز داد
(شعلہ ہا کشاد۔شعلے بیدار کیے)
اعتبارِ کاربنداں را فزود — خواجگی از کارفرمایاں ربود
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست — نوعِ انساں را معیارِ تازہ بست
(بست محفوظ کردیا)
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید — بندہ را باز از خداونداں خرید
زادنِ او مرگِ دنیائے کہن — مرگِ آتش خانہ و دیر و شمن
حریت زاد از ضمیر پاک او — ایں مئے نوشیں چکید از تاک اُو
(سکھایا۔اس سے قبل)

انسان آزادی کے کیف وسرور سے یکسر ناآشنا تھا۔اس ساقی بادہ توحید نے اسے اس لذت اندوز کیا۔

نقش نو بر صفحۂ ہستی کشید — امتے گیتی کشائے آفرید
(گیتی کشا۔دنیا کو کھول کر رکھ دیا)
امتے از ماسوا بے گانۂ — بر چراغِ مصطفیٰ پروانۂ
(لاالہ کے علاوہ تمام سے بے گانہ)
امتے از گرمئ حق سینہ تاب — ذرّہ اش شمعِ حریمِ آفتاب
کائنات از کیفِ او رنگیں شدہ — کعبہ ہا بت خانہ ہائے چیں شدہ
مرسلان و انبیاء آبائے اُو — اکرمِ اُو نزد حق اتقائے او

یہ حسب ونسب کی خود ساختہ نسبتوں سے بلند ہو کر ایک ملت بن گئی۔اور مختلف اقوام کے انبیائے کرام اس ملت کے آباؤ اجداد ہو گئے۔اس نے تعظیم کے پیمانے بھی بدل دیئے۔سب سے زیادہ قابل تکریم وہ شخص ٹھہرا جس نے قوانین کی پابندی کی۔

کُلُّ مُؤمِنٌ اِخوَۃٌ اندر دلش — حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ — درنہادِ او مساوات آمدہ
(نہاد۔قائم کردیا)
ہمچو سر و آزاد فرزندانِ اُو — پختہ از قَالُوا بَلیٰ پیمانِ اُو
سجدۂ حق گُل بسیمائش زدہ — ماہ و انجم بوسہ بر پائش زدہ

ایک خدا کے سامنے جھکنے والے اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے سامنے سربسجود اور یہ قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز۔

ملت کا آئین قرآن ہے

مذہب اور دین میں یہ فرق ہے کہ مذہب میں زندگی انفرادی جبکہ دین اجتماعیت کا نام ہے۔ اور وجۂ اجتماعیت دین میں قرآن ہے۔ یہ ہے وہ رشتہ جوان منتشر اجزاء کو یکجا کر کے ان کو امت بنا دیتا ہے۔ جب تک اس کے افراد اس حبل اللہ سے متمسک رہیں گے یہ اس امت کے اجزاء ہونگے۔ جب یہ رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گا وہ بھی منتشر افراد کا گروہ بن جائیں گے۔ مختلف اقوام نسلی اشتراک کی بنا پر اتحاد قائم کرتے ہیں۔ ہم نے تو مدت سے اس حبل المتین کو گم کر رکھا ہے۔

ملتے را رفت چوں آئیں زدست — مثلِ خاک اجزائے او ازہم شکست
ہستئ مسلم ز آئیں است و بس — باطن دینِ نبی ایں است و بس
برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد — گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد
نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے — ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستے
(ضبط یعنی نظم وضبط)

در گلوئے ما نفس موجِ ہواست — چوں ہوا پابندِ نے گردد نواست
تو ہمی دانی کہ آئیں تو چیست؟ — زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
نسخۂ اَسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
(ثبات یعنی قیام وبقا)

حرفِ اُو لا ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ اُو — درفتد با سنگِ جام از زور اُو
(سودائے خام یعنی خام تمنائیں)

می برد پابند و آزاد آورد — صیدِ بنداں را بفریاد آورد
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ اُو رَحۡمَةٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ
ارج می گیرد ازو نا ارجمند — بندہ را از سجدہ سازد سربلند
(ارج یعنی دامن)

رہزناں از حفظِ اُو رہبر شدند — از کتابے صاحبِ دفتر شدند
دشت پیمایاں زتابِ یک چراغ — صد تجلّی از علوم اندر دماغ
(دشت پیمایاں یعنی صحرانشیں)

آں جگر تابِ بیاباں کم آب — چشم او احمر ز سوزِ آفتاب
خوشتر از آہو رمِ جمّازہ اش — گرم چوں آتش دم جمّازہ اش
(جمّازہ یعنی اونٹنی)

رختِ خواب افگندہ در زیرِ نخیل — صبحدم بیدارِ از بانگِ رحیل
دشت سیرِ از بام و در نآشنا — ہرزہِ گردد ازِ حضر نآشنا
(رشت سیر صحرانورد۔ اور ہرزہِ گردد۔ بلا مقصد)

تا دلش از گرمئ قرآں تپید — موجِ بیتابش چو گوہر آرمید
خواند ز آیاتِ مبینِ اُو سبق — بندہ آمد خواجہ رفت از پیشِ حق
از جہانبانی نوازد سازِ اُو — مسندِ جم گشتِ پانداز او
(پانداز یعنی پاؤں کے نیچے)

شہرہا از گردِ پائیش ریختند — صد چمن از یک گلش انگیختند
اے گرفتارِ رسومِ ایمان تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
قطع کردی اَمۡرِ خود را در زُبُر — جاوہ پیمائی اِلٰی شَيۡءٍ نُّكُرٍ

تیرا ایمان چند رسومات ہیں زندگی غیر قرآنی نظریات کا جیل خانہ ہے۔ تم نے خدا کے حکم کے برعکس خود کو فرقوں میں بانٹ دیا ہے۔ فَتَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ زُبُرًا ؕ (23:53) اور يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيۡءٍ نُّكُرٍ ۙ (54:6)

❁❁❁

طریقت

صوفی پشمینہ پوش حال مست　　از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی دردلش　　درنمی سازد بقرآں محفلش
از کلاہ و بوریا تاج وسریر　　فقرِاو خانقاہاں باج گیر

وہ طریقت اور یہ شریعت۔

شریعت:

واعظِ دستان زن افسانہ بند　　معنئ اُو پست و حرفِ اُو بلند
(حرف بلند یعنی الفاظ بڑے بڑے)

از خطیبِ و ویلمی گفتارِ اُو　　با ضعیف و شاذ و مرسلِ کارِ اُو

ان کے وعظ افسانے۔خطیب بڑے بڑے پرشکوہ الفاظ مگر معنی پست۔روایات کی بحثیں بہ روایت ضعیف۔وہ قوی۔
یادرکھو!

از تلاوت برتو حق دارد کتاب　　تو از کامے کہ می خواہی بیاب
(کامے یعنی خواہش،آرزو)

قرآن کا اتباع فرض ہے اسے نصب العین بناؤ تو اس کے بعد جو چاہو تو ملے گا۔

قرآنی تعلیمات کی خصوصیات

شارعِ آئینِ شناسِ خوب و زِشت بہرِ تو ایں نسخۂ قدرت نوشت
از عمل آہن عصب می سازدت جائے خوبے در جہاں اندازدت

شارع جو خیر وشر کے قانون سے خوب واقف ہے۔ اس نے قرآن کا آئین تجھے طاقت ور بنانے کے لیے لکھا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے سے تم فولادی عصب کے مالک بن جاؤ گے۔ اس طرح تم دنیا میں امت وسطیٰ بن جاؤ۔

خستہ باشی استوارت می کند پختہ مثلِ کوہسارت می کند
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات شرعِ اُو تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا آنچہ حق می خواہد آں ساز وترا
صیقلش آئینہ سازد سنگ را از دل آہن رباید زنگ را
تاشعارِ مصطفیٰ از دست رفت قوم را رمز بقا از دست رفت
آں نہالِ سربلند و استوار مسلمِ صحرائی اشتر سوار
پائے در وادئ بطحا گرفت تربیت از گرمئ صحرا گرفت
آنچناں کاہید از بادِ عجم ہم چونَے گردید از بادِ عجم
(کاہید۔ ناتواں)
آں کہ کُشتم شیر راچوں گو سفند گشت از پامالِ مورے درد مند
(مورے۔ چیونٹی)
آنکہ از تکبیرِ او سنگ آب گشت از صفیرِ بلبل بے تاب گشت
(صفیر یعنی آواز)
آں کہ عزمش کوہ را کاہے شمرد باتوکل دست وپائے خود سپرد

ہاتھ پاؤں توڑ کراس بے عملی کا نام توکل رکھ دیا۔

آنکہ ضریش گردنِ اعدا شکست   قلبِ خویش از ضربہائے سینہ خست

(اللہ ہو کی ضربوں سے خود اپنا سینہ توڑ دیا۔)

آنکہ گامش نقش صد ہنگام بست   پائے اندر گوشۂ عزلت شکست

(عزلت۔خلوت کدے)

آنکہ فرمانش جہاں را ناگزیر   بردرش اسکندر و دارا فقیر

کوششِ اُو با قناعت ساز کرد   تابہ کشکولِ گدائی ناز کرد

شیخ احمد رفاعی نے مرید سے کہا۔

با مریدے گفت اے جانِ پدر   از خیالات عجم باید حذر

زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت   از حدِ دینِ نبی بیروں گشت

اے برادر ایں نصیحت گوش کن   پندِ آں آقائے ملّت گوش کن

قلب را زیں حرف حق گرداں قوی   باعرب در ساز تا مسلم شوی

عجم سے مراد غیر قرآنی اور عرب سے مراد قرآنی۔

❁❁❁

نصب العین نہ ہوتو سفر آوارگی کہلاتا ہے

توحید سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کائنات میں جس ہستی کا قانون نافذ ہے تو انسانی دنیا میں بھی وہی ضابطہ اور قانون ہونا چاہیے اور یہ قرآن ہے۔اوراس کی نشرو اشاعت امت مسلمہ کا نصب العین ہونا چاہیے۔تو علامہ یہ بات ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ انسانی کلام حروف والفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔اگر بولنے والے کے ذہن میں کوئی مقصد اور مدعا ہوتو ان حروف والفاظ میں ربط پیدا ہو جاتا ہے۔اس طرح یہ کلام بامعنی بن جاتا ہے۔لیکن مدعا کی عدم موجودگی اسے بے ربط اور بے معنی بنا دیتی ہے یہی کیفیت کائنات کی ہے۔

با تو آموزم زبانِ کائنات　　　حرف و الفاظ است اعمالِ حیات

چوں ز ربط مدعائے بستہ شد　　　زندگانی مطلع برجستہ شد

(برجستہ نمایاں۔بلند)

آؤ تمہیں زبان کائنات سکھاؤں۔زندگی کے تمام اعمال کی مثال ان حروف والفاظ جیسی ہے اگر وہ مدعا کے رشتہ سے وابستہ ہیں۔اوراس طرح زندگی ایک مرصع غزل کا حسین اور نمایاں مطلع بن جاتی ہے۔

مدعا گردد اگر مہمیزِ ما　　　ہمچو صرصر می رود شبدیز ما

(شبدیز۔گھوڑا)

اگر مقصد با مدعا (جذبۂ محرکہ) زندگی کا جذبۂ محرکہ بن جائے تو پھر ہمارے عمل کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔

مدعا رازِ بقائے زندگی　　　جمعِ سیمابِ قوائے زندگی

یہ تو زندگی کی قوتوں کو پارے کی طرح جو بے تاب و منتشر ہوتا ہے۔استحکام دیدیتی ہے۔

چوں حیات از مقصدے محرم شود　　　ضابطۂ اسباب ایں عالم شود

تو کائنات کے اسباب وعلل میں ایک نظم پیدا ہو جاتا ہے تو یہ تمام اسباب صحیح نتائج تک پہنچا دیتے ہیں۔

خویشتن را تابع مقصد کند　　　بہر اُو چنید، گزیند، رد کند

(اس مدعا کے لیے)

تو وہ ہر شے اسی مدعا کے مدنظر چنتی، پسند کرتی اور رد کرتی ہے۔ یعنی یہ مقصد اس کے خیر و شر کا تعین کرتا ہے۔

ناخدا را بیمِ روی از ساحل است　　اختیار جادۂہا از منزل است

ملاح کشتی کو سمندر میں اس کا رخ ساحل کی طرف رکھ کر کرتا ہے۔ جس طرح مسافر کے لیے مختلف راستے ہیں مگر وہ منزل تک جانے والا راستہ منتخب کرے گا۔

دست و پائے قوم را جنباند اُو　　یک نظر صد چشم را گرداند اُو
شاہدِ مقصود را دیوانہ شو　　طائف ایں شمع چوں پروانہ شو
گر بقدرِ یک نفس غافل شدی　　دور صد فرسنگ از منزل شدی

اس حقیقت کو شاعر قتی نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم　　مہمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم　　و صد سالہ راہم دور شد

(جا رہا تھا کہ پاؤں سے کانٹا نکالوں تو مہمل نظروں سے پنہاں ہو گیا اور اس طرح منزل سے ایک صدی دور ہو گیا)

ایں کہنِ پیکر کہ عالم نامِ اوست　　ز امتزاجِ اُمہات اندامِ اُوست

اس مادی کائنات کا وجود مختلف عناصر سے ہے، یہ بھی سامنے مقصد رکھتی ہے اور ان عناصر کو مختلف گردشیں دے کر منزل پہ منزل آگے بڑھائے تا کہ اس کی تدبیر نیا پیکر وجود میں لائے۔

نقشہا آورد و افگند و شکست　　تابہ لوحِ زندگی نقشِ توبست

کتنے قسم نوع کی تخلیق کرنی پڑی۔ آگے بڑھایا اور کتنے مٹا دیئے اور کتنا عرصہ لگا۔

نالہ ہا در کِشتِ جاں کاویدہ است　　تا نوائے یک اذاں بالیدہ است

اب انسان کی طبعی زندگی کے بعد معنوی زندگی کی طرف آیئے۔ وہاں بھی سلسلہ نظر آئے گا۔ انسان کے ذوق تجسس نے کتنی صحرانوردیاں کیں جو وہ ان حقائق تک پہنچا۔

مدتے پیکار با احرار داشت　　با خداوندانِ باطل کار داشت
(کارداشت۔ ساتھ دیا)

تخمِ ایماں آخر اندر گل فشاند　　بازبانِت کلمۂ توحید خواند

تا آنکہ ایمان کا تخم بویا جا سکتا۔ اور تمہاری زباں پر کلمہ توحید آیا۔

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ　　انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
(ادوار تمام دائروں کا مرکز)

چرخ را از زورِ اُو گردندگی — مہر را پائیندگی رخشندگی

بحرِ گوہر آفرید ازِ تابِ اُو — موج در دریا تپید از تاب اُو

(تپید۔اس کے قانون سے تڑپتی مچلتی)

خاک از موجِ نسیمش گُل شود — مشت پر از سوزِ اُو بلبل شود

(مشت پر یعنی تھوڑی سی)

شعلہ در رگ ہائے تاک از سوزِ اُو — خاکِ مینا تابناک از سوزِ اُو

(سوزِ اُو یعنی قانون خدا)

نغمہَ ہائش خفتہ در سازِ وجود — جویدت اے زخمہ ور سازِ وجود

یہ زخم ورتو ہے تو ہی وہ مضراب زن ہے اے مسلمان! جس کی ان نغموں کو تلاش ہے۔

صد نوا داری چوں خوں در تن رواں — خیزد مضرابے بہ تارِ اُو رسا

زانکہ در تکبیر راز بُودِ تُست — حفظ و نشر لا الٰہ مقصودِ تُست

غالب کرنا دوسرے نظامہائے زندگی پر۔

تا نہ خیزد بانگِ حق در عالمے — گر مسلمانی، نیاسائی دمے

(نیاسائی۔آرام سے نہ بیٹھ)

جب تک سارے عالم میں حق کی آواز بلند نہ ہوجائے۔

می نہ دانی آیۂ اُمُّ الکتب — امتِ عادل تُرا آمد خطاب

آب و تابِ چہرۂ ایّامِ تو — در جہاں شاہد علی الاقوام تو

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ(2:143)

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ — از علومِ اُمّیے پیغام دہ

اُمّی پاک از ہَوٰی گفتارِ اُو — شرح رمزِ مَا غَوٰی گفتارِ اُو

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۗ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ۔ (53:2-4)

تا بدست آورد نبضِ کائنات — وانمود اَسرارِ تقویمِ حیات

از قبائے لالہ ہائے ایں چمن — پاک شُست آلودگیہائے کہن

(زندگی اس قانون سے وابستہ ہے جو حضور ﷺ نے پیش کیا)

در جہاں وابستۂ دینش حیات — نیست ممکن جز بآئینش حیات
اے کہ می داری کتابش دربغل — تیز تر نِہہ پا بہ میدانِ عمل
فکرے انسان بت پرستے بت گرے — ہرزماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آزری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است
(انداخت۔روشن)
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند — پیش پائے ایں بتِ ناارجمند
(پیش پائے اس کے حضور)
ایکہ خوردستی ز مینائے خلیل — گرمئ خونت ز صہبائے خلیل
(خوردستی میتا یعنی پینا پڑا خلیل کی شراب)
برسرِ ایں باطلِ حق پیرہن — تیغِ لَا مَوْجُوْدٌ اِلَّا هُوَ بزن
جلوہ در تاریکی ایام کن — آنچہ بر تو کامل آمد عام کن
(کامل آمد۔دین کامل)
لرزہ از شرمِ توچوں روز شمار — پرسدت آں آبروئے روزگار
(آبروئے روزگار یعنی ساری دنیا کے سامنے)
حرفِ حق از حضرتِ ما پردہِ — بس چرا بادیگراں نسپردہِ
(نسپردہ: کیوں نہ سپرد کیا)

میرے رسول ﷺ سے جو پیغام لیا تھا۔اسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچایا۔

سورۂ اخلاص کی تشریح

(1) اَللّٰہُ اَحَدٌ (112:1):

رنگِ اُو بر کُن مثالِ اُو شوی — در جہاں عکسِ جمال اُو شوی
آنکہ نامِ تو مسلماں کردہ است — از دوئی سوئے یکی آوردہ است
خویش را ترک و افغاں خواندہٖ — وائے بر تو آنچہ بودی ماندہٖ
صد مِلل از ملتے انگیختی — بر حصارِ خود شبخوں ریختی
یک شود توحید را مشہود کُن — غائبش را از عمل موجود کُن
لذّتِ ایماں فزاید در عمل — مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

(ہر قسم کی گروہ بندی اور تعصّبات سے ماوراء معاشرہ توحید کہلاتا ہے جس میں صرف قانونِ واحد یعنی قرآن کا نظریہ رو بہ عمل ہو اس طرح سے تمام انسان ایک ہو جاتے ہیں یہ ہے توحید کا مطلب۔)

(2) اَللّٰہُ الصَّمَدُ (112:2) :Freedom خو کفیل اور ساری دنیا کے سہاروں کی محتاجی سے آزادی۔

مسلم استی بے نیاز از غیر شو — اہل عالم را سراپا خیر شو
پیشِ منعم شکوۂ گردوں نکرد — دستِ خویش از آستیں بیروں مکن
راہ دشوار است ، ساماں کم بگیر — در جہاں آزاد زِی ، آزاد میر

اگر ذرائع کم ہوں تو ضروریات کو کم کر لو۔

سبحہ اَقْلِلْ مِنَ الدُّنْیَا شمار — از تُعِشْ حُرًّا شوی سرمایہ دار

عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ عسرت کے ایام میں ضرورتوں کو کم کر کے آزادانہ زندگی بسر کرو۔

تا توانی کیمیا شو ، گِل مشو — در جہاں منعم شود سائل مشو
از پیامِ مصطفٰی آگاہ شو — فارغ از اربابِ دُوْنِ اللہ شو

(صمد والا معاشرہ دنیا میں کسی کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ یہ عالمگیر ربوبیت کا عظیم فریضہ دنیا کہ کونے کونے میں راج کر دیتا ہے۔)

(3) لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝۳ (112:3):

قیمتِ یک اَسْوَدش صد احمر است — قومِ تو از رنگ و خوں بالا تر است

قطرۂ آب وضوئے قنبرے ‏ ‏ در بہا برتر زخونِ قیصرے

(قنبرے یعنی غلام)

حالانکہ قرآن میں تو سب کا خون برابر ہے۔

فارغ از باب و اُم و اَعمام باش ‏ ‏ ہمچو سلیماں زادۂ اسلام باش

جس طرح سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا سلیمان ابن اسلام۔

نیست از روم و عرب پیوندِ ما ‏ ‏ نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم ‏ ‏ زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم

عشقِ اُو سرمایۂ جمعیت است ‏ ‏ ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است

عشق درجاں و نسب در پیکر است ‏ ‏ رشتۂ عشق از نسب محکم تر است

اُمتِ اُو مثلِ اُو نورِ حق است ‏ ‏ ہستیٔ ما از وجودش مشتق است

نورِ حق راکس نجوید زاد و بود ‏ ‏ خلعتِ حق راچہ حاجت تارو پود

نورحق سے یہ پوچھنا کہ اس کی جائے پیدائش اور وطن کون سا ہے۔ جس طرح حق کی پوشاک کا تانا بانا کچھ نہیں ہوتا۔ اس طرح اس روشنی کی زادو بوم کوئی نہیں ہوتی۔

ہر کہ پا دربند اقلیم و جدِ است ‏ ‏ بے خبر از لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ است

(ایسا معاشرہ تمام تعصّبات، نہ رنگ، نہ نسل، نہ زبان، نہ پاسپورٹ، نہ ویزہ)

(4)وَلَمۡ یَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴿۴﴾(112:4):

(ایسا معاشرہ جو سب سے بلند ہو اور دنیا میں کوئی اس کی ہمسری نہ کر سکے)

مسلم چشم از جہاں بربستہ چیست؟ ‏ ‏ فطرتِ ایں دل بحق پیوستہ چیست

مومن ساری دنیا سے صرفِ نظر کرتا ہے اور تمام توجہات اطاعت خداوندی کی طرف کر دیتا ہے۔

رشتہ با "لَمۡ یَكُنۡ" باید قوی ‏ ‏ تو در اقوام بے ہمتا شوی

(بے ہمتا یعنی ممتاز یکا و بے مثال، اعلون)

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک ‏ ‏ بندہ اش ہم نسازد باشریک

اس کے بندے بھی لاشریک ہوتے ہیں ان کی برابری کوئی نہیں کر سکتا۔

مومنِ بالائے ہر بالا ترے ‏ ‏ غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

خرقہ "لَا تَحْزَنُوْا" اندر برش — اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تاجے بر سرش
مئ کشد بارِ دوعالم درش اُو — بحر و بر پروردۂ آغوشِ اُو

ساری دنیا کی نشوونما کا ذمہ لیتا ہے۔

بر غوِتندر مدام افگندہ گوش — برق اگر ریزد ہمی گیرد بدوش

کائناتی قوتوں سے ٹکرلے کر، ان کو مسخر کرتا ہے۔

پیشِ باطل تیغ و پیش حق سپر — امر و نہی اُو عیارِ خیر و شر

(سپر یعنی ڈھال)

در فضائے ایں جہانِ ہائے ہو — نغمہ پیدا نیست جز تکبیرِ اُو
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم — ہم بقہر اندر مزاجِ اُو کریم

(بذل یعنی عطا و بخشش)

سازِ اُو در بزمِ ہا خاطر نواز — سوزِ اُو در رزمِ ہا آہن گداز
در گلستان باعنادل ہم صفیر — در بیاباں جرّہ بازِ صیدگیر
زیرِ گردوں می نیاساید دلش — ہر فلک گیرد قرار آب و گلشن
تو بہ پروازے پرے نکشودۂ — کرمک استی زیرِ خاک آسودہٖ
خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمین افتندۂ — در بغل داری کتاب زندۂ
تا کجا در خاک می گیری وطن؟ — رخت بردار و سرِ گردوں فگن

زمین کی پستیوں سے اٹھ اور آسمان کی بلندیوں کو چھو لے۔ یہ ہے تیرا مقام۔

❁❁❁

عرض بحضور ﷺ رحمۃ للعالمین

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی   جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

حضور ﷺ کے ظہور قدسی سے انسانیت عہد طفولیت سے بلوغت تک پہنچ گئی اور تو نے انسانیت کے زندگی کے خواب کو ایک نئی اور صحیح تعبیر عطا کر دی۔

اے زمیں از بارگاہت ارجمند   آسماں از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن زتابِ روئے تو   ترک و تاجک و عرب ہندوئے تو

روشنی جہاں بھی ہے وہ آپ ﷺ کے جلوہ کی رہین کرم ہے۔شرق وغرب کے انسان تیرے حلقہ بگوش ہیں۔

از تو بالا پایۂ ایں کائنات   فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
درجہاں شمعِ حیات افروختی   بندگاں را خواجگی آموختی
بے تُو از نابودیہا نجل   پیکران ایں سرائے آب و گِل
تادم تُو آتشے از گِل کشود   تودہائے خاک را آدم نمود
زرّۂ دامن گیر مہر و ماہ شد   یعنی از نیروے خویش آگاہ شد
(نیرؤے یعنی قیمت)

تا مرا افتاد بر رویت نظر   از اَب و اُم گشتہ محبوب تر
عشق در من آتشے افروخت است   فرحتش بادا کہ جانم سوخت است
نالۂ مانندِ نَے سامانِ من   آں چراغِ خانۂ ویرانِ من
از غمِ پنہاں نگفتن مشکل است   بادہ درمینا نہفتن مشکل است
(نہفتن نہ چھپانا)

مسلم از سِرّ نبی بیگانہ شد   باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

از منات و لات و عزیٰ و ہبل ‌ ‌ ‌ ہر یکے دارد بتے اندر بغل

شیخِ ما از برہمن کافرتر است ‌ ‌ ‌ زانکہ اُو راسو منات اندر سراست

رختِ ہستی از عرب برچیدۂ ‌ ‌ ‌ در خمستانِ عجم خوابیدۂ

شل ز برفابِ عجم اعضائے اُو ‌ ‌ ‌ سرد تر از اشکِ اُو صہبائے اُو

ہمچو کافر از اجل ترسندۂ ‌ ‌ ‌ سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ

نعشش از پیشِ طبیباں بردہ ام ‌ ‌ ‌ در حضورِ مصطفیٰ آوردہ ام

(نعشش یعنی لاش اس کی)

مردہ بود از آبِ حیوان گفتمش ‌ ‌ ‌ سرّے از اَسرارِ قرآں گفتمش

محفل از شمعِ نو افروختم ‌ ‌ ‌ قوم را رمزِ حیات آموختم

گفت بر ما بندد افسونِ فرنگ ‌ ‌ ‌ ہست غوغائیش ز قانونِ فرنگ

اے بصیری را رِدا بخشندہ ‌ ‌ ‌ بربطِ سلمیٰ مرا بخشندہ

بصیری شاعر نے خواب میں چادر حضور ﷺ سے لی تو اس کا اندھا پن دور ہو گیا جبکہ مجھے بھی بربط سلمے یعنی یہ سلامتی والا راگ، قرآن ملا ہے۔

ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را ‌ ‌ ‌ اینکہ نشناسد متاعِ خویش را

گر دِلم آئینہ بے جوہر است ‌ ‌ ‌ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

اے فروغت صبحِ اعصار و دھور ‌ ‌ ‌ چشم تو بینندۂ ما فی الصّدور

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ‌ ‌ ‌ ایں خیاباں را ز خارم پاک کُن

تنگ کن رختِ حیات اندر برم ‌ ‌ ‌ اہلِ ملت را نگہدار از شرم

میرا عرصہ حیات تنگ کر دے۔ مجھے ذلیل و رسوا کر دے اور ملت کو اس ذلّت سے بچا لے۔ اگر قرآن سے باہر کوئی بات کی ہو۔

سبز کشتِ نابسامانم مکن ‌ ‌ ‌ بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن

مجھ سوخت کی کھیتی کو ہرا نہ کر۔ اور مجھے ابر بہار کے قطرہ تک سے محروم کر دے۔

خشک گرداں بادہ در انگورِ من ‌ ‌ ‌ زہر ریز اندر مئے کافورِ من

اگر کوئی بات بھی اس میں غیر قرآنی ہو۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ‌ ‌ ‌ بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

گر درِ اَسرارِ قرآں سُفتہ ام　　با مسلماں اگر حق گفتہ ام
ایکہ از احسانِ تو ناکس، کس است　　یک دُعایت مُزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّوجل　　عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدہ　　بہرہ از علمِ دیں بخشیدہ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا　　آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

علامہ کی ایک آرزو:

رخت جاں تا در جہاں آوردہ ام　　آرزوئے دیگرے پروردہ ام
ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است　　محرم از صبح حیاتم بودہ است
از پدر تا نامِ تو آموختم　　آتش ایں آرزو افروختم
تا فلک دیرینہ تر سازد مرا　　در قمارِ زندگی بازد مرا
آرزوئے من جواں تر می شود　　ایں کہن صہبا گراں تر می شود
ایں تمنا زیر خاکم گوہر است　　درِ شبنم تابِ ہمیں یک اختر است

میرے جسد خاکی میں ایک گوہر ہے اور زندگی کی شب تاریک میں ستارہ سے روشنی ہے۔

مدتے با لالہ رویاں ساختم　　عشق با مرغولہ مویاں باختم

زندگی بھر حسین گھنگھریالے بالوں والے دوستوں سے عشق کیا۔

بادہا با ماہ سیما یاں زدم　　بر چراغِ عافیت داماں زدم

ان کے ساتھ مصروف بادہ نوشی بھی رہا اس طرح یہ سب لٹتا رہا۔

برقہا قصید گرد حاصلم　　رہزناں بردند کالائے دلم

(کالائے یعنی مال ومتاع)

ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت　　ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت

مگر یہ آرزو میرے دل سے نہ گئی۔ اور یہ خالص زر میری گرہ سے نہ گیا۔

عقل آزر پیشہ ام زنّار بست　　نقشِ اُو در کشورِ جانم نشست
سالہا بودم گرفتارِ شکے　　از دماغِ من لاینفکے
ظلمتم از تابِ حقّ بیگانہ بود　　شامم از نورِ شفق بیگانہ بود

1273 مدتوں میں شک وشبہات کی وادیوں میں سرگرداں رہا۔فلسفہ نے مجھ سے یقین کی دولت چھین لی۔اور مجھے گرفتار بے یقین کر دیا۔ایک زمانہ تک میرے اندھیرے قلب میں نورِحق کی ایک کرن بھی روشن نہ ہوئی۔

ایں تمنا در دِلم خوابیدہ ماند　　در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند

ان شکوک میں بھی یہ آرزو میرے دل سے جدا نہ ہوئی۔ بلکہ یوں پرورش پاتی رہی جس طرح صدف میں گوہر آب دار پرورش پاتا ہے۔

آخر از پیمانۂ چشم چکید　　در ضمیرِ من نواہا آفرید

(چکید یعنی ٹپک پڑا)

اے زیادِ غیرِ تو جانم تہی　　برلبش آرم اگر فرماں دہی

میرے دل میں آپ ﷺ کی یاد کے سوا کچھ نہیں اگر اجازت ہوتو اس آرزو کولب پر لاؤں۔

زندگی را ز عمل ساماں نبود　　پس مرا ایں آرزو شایاں نبود

مجھ بےعمل انسان کو زیب نہیں دیتا کہ اس قسم کی آرزو دل میں رکھے۔

شرم از اظہارِ اُو آید مرا　　شفقتِ تو جرأت افزاید مرا

ہست شانِ رحمتِ گیتی نواز　　آرزو دارم کہ میرم در حجاز

(گیتی یعنی کائنات،دنیا)

مسلمے از ما سوا بیگانۂ　　تا کجا زناریٔ بت خانہ

حیف چوں او را سر آید روزگار　　پیکرش را دَیر گیرد در کنار

از درت خیزد اگر اجزائے من　　وائے! امروزم خوشا فردائے من

مسلمان تو اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔اور تو غیروں کی غلامی کر رہا ہے۔زندگی تو یوں ہی گزر رہی ہے۔اگر موت کے بعد لاش بھی اس بت خانہ میں دفن ہوجائے تو یہ بڑا تاسف انگیز ہوگا۔حالانکہ جسم کہیں بھی دفن ہو کیا فرق پڑتا ہے۔

فرّخا شہرے کہ تو بودی درآں　　اے خنک خاکے کہ آسودی درآں

(فرّخا یعنی مبارک)

مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من　　پیشِ عاشق ، ایں بود ''حب الوطن''

اب دعا پھر دہراتے ہیں۔

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش   مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بے تابِ من   بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر   دیدہِ آغازم، انجام نگر

تا کہ آسمان سے بعد ہزار فخر کہہ سکوں کہ زندگی کا آغاز بھی دیکھا تھا اور انجام دیکھ کس قدر پر سکون ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ (2:127)

❁❁❁

(Bibliography)

فہرست کتب جن سے استفادہ کیا گیا

☆ امام زہری، طبری اور تصویر کا دوسرا رخ — از علامہ تمنا عمادیؒ
☆ تاریخ الامت — از علامہ اسلم جیراج پوریؒ
☆ لغات القرآن — علامہ غلام احمد پرویزؒ
☆ تفسیر القرآن — سر سید احمد خانؒ
☆ برھان القرآن — علامہ رحمت اللہ طارقؒ
☆ تذکرہ — علامہ عنایت اللہ خان مشرقیؒ
☆ یورپ پر اسلام کے احسانات — علامہ غلام جیلانی برقؒ
☆ ملفوظات شاہ ولی اللہ — عبید اللہ سندھیؒ
☆ قرآن فہمی کے قرآنی اصول — علامہ اظہر عباس
☆ فتنۂ انکارِ قرآن — محترم عزیز اللہ بوہیو
☆ تحفۂ بابل ونینوا۔ ارمغانِ عجم — علامہ عزیر احمد صدیقی
☆ اسلامی انسائیکلوپیڈیا — سید قاسم محمودؒ
☆ قرآن اور فطرت — ڈاکٹر سید عبد الودودؒ
☆ اَسرار و رموزِ نفسیات — پروفیسر ساجدہ زیدی
☆ فرائڈ کی نفسیات — شہزاد احمد
☆ تاریخ الاممؒ والملوک ابن جریر طبری — محمد بن جریر بن رستم طبری، محمد بن جریر بن یزید طبری
☆ احادیث۔ بخاری۔ مسلم۔ داؤد
☆ بائبل قرآن اور سائنس — ڈاکٹر مورس بکائے
☆ خلافتِ معاویہؓ و یزیدؒ — علامہ محمود احمد عباسی
☆ اَسرارِ خودی و رموزِ بیخودی — علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ
☆ مثنوی پس چہ باید کرد؟ — علامہ اقبالؒ
☆ جاوید نامہ — علامہ اقبالؒ

